خود نوشت
برگد
صدف مرزا

صدف مرزا شاعرہ، مصنفہ، مترجم اور صحافی ہیں۔ گزشتہ تیس برس سے نیلز بوہر اور ہانز کرسچن اینڈرسن کے دیس ڈنمارک میں مقیم ہیں۔ جہلم کالج سے بی اے کیا اور چار برس تک کالج کی نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں میں بہترین طالبہ رہیں۔ ایف اے اور بی اے میں ٹاپ کر کے دو مرتبہ گولڈ میڈل کی حقدار قرار پائیں۔ مباحثوں، مشاعروں، مذاکروں اور پنجابی ٹاکروں میں پاکستان بھر سے جہلم کالج کے لیے انعامات وٹرافیاں جیت کر لائیں۔ کالج میگزین کے لیے مضامین، نظمیں اور افسانے لکھے۔ زمانہ طالب علمی میں افسانہ نویسی میں متعدد انعامات حاصل کیے۔ سال دوم کی طالبہ کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لیا اور بھاری اکثریت سے جیت گئیں۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے بی ایڈ کی ڈگری حاصل کی جبکہ کوپن ہیگن یونیورسٹی کالج سے چار برس تعلیم حاصل کی اور ڈینش، انگریزی، تاریخ اور غذائیت کے اختیاری مضامین کا انتخاب کیا۔ درس وتدریس کے بعد یورپ کی سرزمین پر پہنچیں تو ڈنمارک کی کئی تنظیموں سے منسلک ہوئیں اور گزشتہ دس برس سے یورپین لٹریری سرکل سے وابستہ اور صدارتی نشست پر مسندنشیں ہیں۔ اب مکمل طور پر تخلیقی اور تحقیقی موضوعات پر کام کر رہی ہیں۔ صدف مرزا، عالمی سطح پر پاکستان کے مثبت اور تعمیری کردار اُجاگر کرنے کی غیر رسمی سفیر ہیں۔ پاکستان کی ساٹھ سالہ یومِ آزادی پر ان کا ترانہ ’’اے وطن تجھ کو کروں پیش میں سرمایۂ تن‘‘ یورپ کی فضاؤں میں گونجتا رہا۔

اپنی سوانح حیات "برگد" کی مانند صدف مرزا بہ ذاتِ خود بھی ایک ایسا
برگد ہے جو ابھی جوان ہوا ہے، جب کہ اُس کی ہر شاخ پر بلبلیں بولتی تھیں، جُھنڈ کی
کونجیں، کوکتی تھیں، اُڈاریں اور سات سمندروں کے پار کہیں کھو گئیں۔ پھل سرخ ہو کے
ٹپکتے ہیں، ڈنمارک ہے۔ تمام عمر، ہر کسی بھی پودے کو جڑ سے اکھاڑیں تو اُس کی
جڑوں کو ہوا لگ جاتی ہے اور وہ کبھی اپنی زمین میں نہیں پنپتا جب کہ اس
برگد کو ہوا تو لگی لیکن اس نے پھر بھی اس زمین میں جڑیں پکڑ لیں، جو بہت
گہرائی تک پہنچ گئیں، اور یوں وہ پہلے کی نسبت زیادہ گھنا اور سایہ دار ہو گیا۔
اب اس کی شاخوں پر نہ صرف آزادی پسند پکھیرو کوکتے تھے بلکہ ڈنمارک کے ادب،
شاعری، ثقافت اور فلسفے کے موتی پرندے بھی چہچہانے لگے تھے۔ یہ برگد بانو کرچھیں
ایک شہرزاد کی مانند داستان گو ہو گیا۔ صدف مرزا ایک خود سر سی عورت ہے، ہر
لمحہ مرنے مارنے پر تیار۔ "خنجر بہ کف"۔ لیکن وہ یہ خنجر اپنے ہی ذہن کی شہ رگوں
میں اتارتی ہے۔ خود اپنے آپ کو تحلیل کرتی رہتی ہے متبادل کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔
"برگد" ایک ناول، ایک آپ بیتی، ایک اعتراف، رواں اور نوشتہ نثر، اور
ادب میں ایک چراغ کی مانند روشن ہو گیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ

لاہور۔

۱/۲/۲۰۱۹

اے بابل توں قبلہ کعبہ دِل تے جان میری دا
دائم اسم شریف تُساڈا وِرد زبان میری دا
دَر تیرے دی خاک اسانوں سُرمہ عَین نورانی
تخت تیرا کوہِ طور تے، چہرہ چشمہ فیض ربّانی
ظِل اللہ وجود تُساڈا، چھَتر میرے سِر سایا
قدم تیرے دی دھوڑ مبارک چاہاں تاج بنایا

(میاں محمد بخش)

تمہارے نام کی نسبت سے نیک نام ہوں میں

صدف مرزا

جہلم۔ پاکستان

Bargad
by Sadaf Mirza
Jhelum: Book Corner. 2019
832p.
1. Autobiography - Urdu Literature
ISBN: 978-969-662-222-2

مہتمم اعلیٰ: شاھد حمید

ناشر: گگن شاھد • اَمر شاھد

اشاعت: دسمبر ۲۰۱۹ء

خودنوشت: صدف مرزا

حروف خوانی: حافظ صفوان محمد چوہان

سرورق: محمد شکیل طلعت

مطبع: فائن پرنٹرز، لاہور

Sale Center:
Book Corner Showroom
Opposite Iqbal Library, Book Street, Jhelum, Pakistan
00 92 544 278051 00 92 314 4440882
bookcornershowroom bookcornerjhelum
info@bookcorner.com.pk www.bookcorner.com.pk

وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا

دُنیا کے ہر اس والد کے نام

جس نے اپنے بیٹوں کی طرح اپنی بیٹیوں کو بھی اپنے نام اور شناخت کا حوالہ سمجھا

ہر اس والد کے نام

جو نام اور نسل کے غرور اور افتخار کو دورِ جاہلیت کی یادگار بنا ڈالتا ہے

جو اپنے خون کی حرمت ہر صورت میں قائم رکھتا ہے

خواہ وہ ایک شیرِ نر کی رگوں میں آگ کے شعلوں کی طرح بھڑکتی پھرے

یا اس کی بیٹی کی رگوں میں نئی نسلوں کی امین کی طرح

سیراب کر دینے والی زرخیز بارش کی رم جھم کی طرح رواں ہو

بضعۃ الرسول، سیّدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا

سے لے کر امامِ اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تک

اپنے والد کے نام کو زندہ رکھنے کی روایات بکھری پڑی ہیں

بیٹیوں کے نام سے زندہ رہنے والوں کی عظمت کے نام

انتسابِ ثانی

میرے داماد بیٹے

مبین عارف

کے وجود سے پھوٹتی شفقت کی آبشار کے نام

میری زیست کی عظیم ترین مسرت میری نواسی

آئمہ صوفیہ عارف

کی ہمکتی مہکتی کلکاریوں کے گلزار کے نام

کلیوں جیسے ہونٹوں سے

بابا کا نام چھونے کے احساسِ تحفظ وافتخار کے نام

شام کے سائے لمبے ہوتے ہی

دروازے پر بابا کی آہٹ لیتے انتظار کے نام

بابا کے گھر کو لوٹتے تیز قدموں

پھیلے بازؤوں کے حصار کے نام

فہرست

مرے کلام میں بابل وہ استعارا ہے
صدفؔ مجھے جو مری زندگی سے پیارا ہے

ترا علاج قلم کے سوا کچھ اور نہیں

دنیا کے اُن تمام عظیم برگدوں کے نام
شجر کی طرح ہمیشہ چھایا اور تحفظ کا استعارہ
شجر... جو کٹ بھی جائے تو
کبھی کشتی بن کر دریا پار کرواتا ہے
کبھی برفانی موسم میں آتش کی حدت اور روشنی
کبھی وہ تخت جس پر آپ براجمان ہوں
کبھی وہ تختہ جس پر جہالت کو سولی دی جائے

اس کتاب کا مقصد نہ تو آباء پرستی ہے اور نہ خود کو نجیب الطرفین ثابت کرنے کی ہمکتی ہلکان کرتی کوشش۔ اس کا واحد مقصد خود کو یہ یاد کرانا اور آئندہ نسل کو متعارف کرانا ہے کہ نسلوں کی مضبوط بنیاد رکھنے والے ایسے بزرگ بھی ہوا کرتے تھے جو اپنی ذات اور مفاد سے بلندتر ہو کر سوچ سکتے تھے اور جن کی زندگی کا مقصد نئی نسل کی آبیاری تھا۔

مجھے آپ بیتی لکھنے کا کبھی مبہم سا بھی تصور نہیں رہا۔ آپ بیتی یا اپنے حالات وہ لوگ لکھتے ہیں جنھوں نے زمانے کو کچھ دیا ہو یا کچھ کر کے دکھایا ہو، لیکن تایا جان نے ایک بالکل مختلف بات کی۔ کہنے لگے کہ ”اپنے حالات وہ لوگ بھی لکھ سکتے ہیں جو اپنی قوتِ ارادی اور خوش امیدی کے سہارے زیست کے تیرہ و تاریک کنوئیں سے باہر نکل سکیں، اپنی زندگی کی نامرادی اور تابڑ توڑ غموں کی سیاہ طویل سرنگ کے آخری دہانے پر امید کی روشن شمع کو دیکھ سکیں۔ کوئی اور فیض یاب ہو یا نہ ہو لیکن انسان اپنے ذہن کو گھٹا بننے سے ضرور بچا لیتا ہے۔“

میری زندگی میں جب کبھی کوئی صبر آزما مقام آیا، ابا جی نے ایک ہی حکم دیا، ''لکھو''۔ پھر وہ اقبال کے مصرعے میں خفیف سی تبدیلی کرتے، ''تیرا علاج قلم کے سوا کچھ اور نہیں''۔ ان کا ایمان تھا کہ قلم انسان کو خودترسی، حوصلے چھینتی بے بسی اور گلہ آمیز گفتگو سے بچا لیتا ہے۔ اس قلم کی قسم خود کاتبِ تقدیر نے کھائی ہے۔ پھر جب وہ کسی کو حرف وصوت کی صلاحیت دے تو اسے کفرانِ نعمت کا مرتکب نہیں ہونا چاہیے۔

ابا جی ڈنمارک کے جغرافیے کو جان گئے تھے۔ ایک دن کہنے لگے: ''آپ کو اللہ کا احسان مند ہونا چاہیے کہ آپ وہاں رہتی ہیں جہاں سے اپنے پڑوس میں بسنے والا سمندر روزانہ دیکھ سکتی ہیں۔ سمندر کی شان وشوکت اور آسمان کی وسعت، شفاف فضا اور چہچہاتے پرندے، یہ بتاؤ کتنے لوگوں کو یہ آسائشیں میسر ہیں؟ اب جو جی چاہتا ہے لکھو، کیونکہ یہ باتیں صرف عوام کے لیے نہیں لکھی جا رہیں۔ یہ اپنی ذات کی خاطر، خود کو ذہنی سکون فراہم کرنے کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ اپنے اندر بہتے ہوئے وہ تمام مخصوص اور غیر مخصوص خیال کاغذ پر نکال کر دھر دو، پھر بعد میں پڑھنا۔ ہمارے لیے بھی لکھو۔ بچوں کے لیے لکھو۔ اس پر تحقیق کرو اور مغربی مفکرین اور محققین کو پڑھو۔ یہ موضوع لے کر ان پر تحقیق کرو۔ از مہد تا لحد تحقیق وجستجو کا عمل جاری رہے تو انسان حقیقی معنوں میں زندہ رہتا ہے۔''

''اپنے ہمسایہ ممالک کی زبانیں سیکھو۔ آپ کے پاس وقت ہے۔ آپ کے پاس امکانات سے روشن ایک نئی زندگی ہے، وقت ہے، مواقع ہیں۔ ان کو استعمال کرو۔ الفاظ کی قوت خیالات سے نمو پاتی ہے۔ خیالات، مشاہدات اور تصورات کو الفاظ کی قوت میں پرو دو۔ شاعری خود کو منتشر کر کے جمع کرنا ہے یا شاید جمع ہوتی حالت سے منتشر ہونا ہے۔ جو جی میں آئے لکھو۔ لیکن لکھنے سے پہلے پڑھنا ضروری ہے۔ جو میسر ہو پڑھو۔ قدیم کتب، عقائد، ماضی کے خزانے کھنگالو۔ موجودہ اور موثر اہلِ علم کو سنو اور خود میں علوم جمع ہونے دو، پھر لکھو۔''

''شہد کی مکھی کو قدرت نے بھی مثال دینے کے لیے چنا۔ کمال دیکھو کہ پھول پھول پھرتی ہے، رس چوستی ہے، لیکن پھول کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا، اس کے چہرے کا رنگ نہیں اڑتا، اس کے بدن کی باس قائم رہتی ہے۔ شہد کی مکھی جس پھول سے رس کشید کر لیتی ہے اس پر نشان چھوڑ جاتی ہے کہ دوبارہ اس کی نازک پتیوں میں سوئی کی نوک نہ چبھوئی جائے۔ اپنے چھتے میں پہنچتی ہے تو اپنے لعاب کے ساتھ اس رس کو ملا کر شہد جیسی بے نظیر چیز پیدا کرتی ہے جس کا فائدہ دوسرے اٹھاتے ہیں۔ آپ نے اپنے لیے بچے

پالے لیکن شہد کی مکھی نے رس جمع کرنا سیکھا۔ اب اسے داخلی احساسات کے ساتھ ملا کر شہد بناؤ اور لکھو۔'' برسوں بعد جب میں نے ڈینش نظامِ تعلیم میں قدم رکھا اور تدریس کے دوران شہد کی مکھی اور اس کی زندگی اور رہن سہن کے بارے میں پروجیکٹس پر کام کیا تو مجھے حیرت اور مسرت کے احساسات نے گھیر لیا۔ بزرگوں کی دی گئی مثالوں میں زندگی کے بڑے حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں۔

میں ابا جی کے پرعزم چہرے کو دیکھتی رہتی۔ وہ اتنے پرسکون کس طرح رہتے ہیں؟ بدترین حالات میں بھی شعلوں کے اندر سے ققنوس تلاش کر لیتے ہیں۔ دل میں کوئی وہم نہ گماں، نہ کوئی احساسِ زیاں، پوری دنیا کو اپنے بدن کا حصہ سمجھتے ہوں گے شاید۔

ابا جی نے اخبار چہرے سے ہٹایا۔ ''چپ کر کے نہ بیٹھا کرو۔ اتنا لمبا سفر کر کے آئی ہو۔ ہنسا بولا کرو۔ فارغ بیٹھنے کا کیا مقصد ہے؟ یا پڑھو یا پھر کچھ نہ کچھ لکھتی رہا کرو۔''

میں اب باقاعدہ ''لکھو لکھو'' کی گردان سے جیسے چڑنے لگی۔ ''اب میں کیا لکھوں۔ میرا دل نہیں چاہتا۔''

میں نے تین ماہ کے دوران پہلے ابا جی کو اور پھر امی جی کو یہ جہانِ فانی چھوڑتے دیکھا۔ شکوے شکایات اور ناشکری فطرتِ انسانی ہے اور جب انسان غم کے طوفان کی لپیٹ میں آجائے تو خود کو ازلی بدقسمت تصور کرنا اس کی سرشت ہے۔ شاید میرے ساتھ بھی قدرت نے یہی سنگین مذاق کیا۔ ممکن ہے یہ دیکھنے کے لیے کہ ابھی تک بزرگوں میں وہ دم خم باقی ہے یا نہیں جو صرف بلندی کی طرف نظر کیے رکھیں اور پیچھے مڑ کر پامال زینے کو نہ دیکھیں؟ ان کے جانے کے بعد تایا جان کا حکم تھا ''لکھو''۔

ڈینش زبان و ادب پر تاریخ کی کتاب نے مجھے باقی سب بھلائے رکھا۔ جب وہ مکمل ہوئی تو ''برگد'' کی تکمیل کی دھن نے میری باقی کاوشوں کو روک دیا۔ کبھی عدیم الفرصتی حائل ہوئی تو کبھی ابا جی کی زندگی کا آخری باب تحریر کرتے اشکوں کی روانی، جسے کوئی لفظ قبول نہ ہوتا۔ کبھی یادیں یوں زندہ اور سانس لیتی محسوس ہوتیں کہ قلم کا دم گھٹنے لگتا۔ کھلکھلاتا بچپن ہرنوں کی مانند ذہن کے دشت میں چوکڑیاں بھرنے لگتا۔

یہ تحریریں اپنے بزرگوں کے انہی احسانات کو گننے اور یاد رکھنے کی ایک سعی ہے جن کی وجہ سے ایک بہتر انسان بننے کی خواہش ہمیشہ میرے دل میں زندہ رہی۔ ان کے احسانات میں شامل تھا کہ انھوں نے صنفی امتیاز کے بغیر سب پر تعلیم کے دروازے کھولے۔ وہ میرے لکھے ایک ایک بے مایہ حرف پر اپنی داد و تحسین کی طلسمی انگلی رکھ کر اس کو اسمِ اعظم بناتے رہے۔

میں کبھی طویل، اجاڑ اور بیابان جیسی شاہراہ زیست کو بے دلی سے دیکھتی تو ان کا ایک ایک حرف تسلی ارادوں کے پھول کھلا دیتا، ان کی دعائیں کارواں کے اونٹوں کے گلے میں گھنٹیاں باندھ دیتیں اور حدی خواں نئی دھن چھیڑ لیتا۔ فاصلے سمٹ کر ایک نئی جستجو کی مٹھی میں بند ہو جاتے۔ راستوں میں نئے راستے کھلنے لگتے۔ مجھے خود بھی خبر نہ ہوئی کہ کب میں نے آزردگی اور پژمردگی، زود رنجی اور رفتگاں کی یاد کی بے قراری کو بے اختیاری کی کیفیت میں لکھنا شروع کیا۔ ان مختصر اقتباسات کو بھرپور پذیرائی حاصل ہوئی۔

میں نے فیسبک پر ایک ابتدائی تحریر لکھی:

''میرے عزیز دوستو! اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سے صرف وہ لکھنے کی کوشش میں مصروف ہوں جو میرے بچپن سے والدین کی جدائی تک میرے شعور و لاشعور کا حصہ رہا، جس نے میری ذات کو شکست و ریخت کا شکار بننے کے بجائے بے ستون عمارت کی طرح اپنے سہارے پر کھڑے ہونا سکھایا۔ شخصیت سازی میں جو کردار بچپن اور والدین ادا کرتے ہیں وہ ماحول کبھی نہیں بدل پاتا۔ میں آپ کی حوصلہ افزائی کی مقروض ہوں۔ اس کوشش میں ہوں کہ رفتہ رفتہ وہ سب کچھ قلمبند کرسکوں جو اپنے والدین کی دعا کے صدقے میں اگلی نسل تک پہنچانے کے لیے کوشاں ہوں۔''

ابا جی کہتے: ''آپ خوش بخت ہیں کہ لکھنے کو آپ کے پاس نہ جانے کیا کیا ہے۔ مصنف تو جگ بیتی کو اپنے تصور اور احساس کی طاقت سے زندہ کر لیتا ہے جب کہ آپ کے پاس تن بیتی کی اصل قوت موجود ہے۔ اس خام طاقت کو ضائع نہ ہونے دینا۔ اسے جلا دینے والا شعلہ نہیں، جلا دینے والا نور بنا دو جو ہر چیز کو روشن کرتا ہے جلاتا نہیں۔''

میں خاموشی سے ان کا روشن چہرہ دیکھتی رہتی۔

''خود شناسی بڑی دولت ہے جانِ پدر۔ آپ کے پاس دو مختلف تہذیبوں اور زبانوں کا علم ہے۔ سفر کے مواقع ہیں۔ کثیر الثقافت معاشرے کی رنگین دنیا کی معاشرت آپ کے سامنے ہے۔ اس کو قلم بند کرنا شاعری سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ شعری وفور تو وہبی ہے، وہ تو جاری رہے گا لیکن یہ نثری تخلیقی عمل ارادے کی قوت سے جاگے گا۔ اسے تحریر کرنا آپ کی پہلی ترجیح ہونا چاہیے۔''

کبھی مجھے لگتا کہ زندگی بھی غارِ حرا کی روشن رات جیسی ہے اور اِقراء سے متاثر ہو کر جو حکم مجھے دیا گیا وہ یہ تھا کہ پڑھو اور لکھو یعنی ''اِقراء کتا بک۔''

ابا جی کی غیر مشروط شفقت، ان کے فخر کی آمیزش سے روشن یقین اور ان کے عطا کیے

بے پایاں اعتماد کے سبب ان جیسی ہی بے کراں ہمت، حُریت اور آزادی سے میں نے ایک مرتبہ پھر زندگی کی گیلی مٹی کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسی یقین اور اعتماد کی دی ہوئی طاقت تھی جس سے میں نے اپنی زندگی میں دوبارہ سربلند اور بے طلب ہوکر جینا سیکھا۔

امی اور ابا جی کے جانے کے بعد مجھے ان بکھری ہوئی یادوں کو سمیٹنے میں دس طویل برس لگے۔ زندگی کے بارے میں لکھنا ایک فطری عمل ہے لیکن اپنی زندگی کے نشیب و فراز، مسرت و اضمحلال، فیصلوں، فاصلوں اور نتائج کو تحریر کرنا کچھ ایسا سہل نہیں۔

یادیں سمندر کی لہروں کی طرح ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے زوردار تھپیڑے کی صورت آتی ہیں اور آنکھوں کے ساحل بھگو کر لوٹ جاتی ہیں۔ یادوں کو تحریر کرنا ان دنوں کو زندہ کرنے کے مترادف ہے۔ کبھی کوئی موضوع ایسا شروع ہوجاتا جس کی تکمیل میں کئی دن قلم اوندھے منہ خاموش پڑا رہتا۔ لیکن میں نے ابا جی کے حکم کے مطابق شہد کی مکھی کی طرح زندگی کے پھولوں سے تجربات و مشاہدات کا رس جمع کیا اور پھر انھیں اندرونی بے کلی بھرے جذب اور بے بس آزردگی میں گوندھ کر شہد کی صورت نئی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔

اس عمل سے کسی اور کو کچھ فرق پڑے نہ پڑے، مجھے واقعی سکون کی دولت ملی جس نے مزاج میں تلخی اور تحریر میں برہمی نہیں آنے دی۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں بہت سوں کو ایک جانی پہچانی کیفیت کا احساس ہو، کیونکہ میرا ایمان ہے کہ ہر گھر میں ایسے بزرگوں کا وجود پانی کے میٹھے چشمے کی طرح ہوتا ہے۔

نجانے کتنی مرتبہ آنکھوں میں دھواں بھر گیا اور بینائی چھین کر لے گیا۔ بارہا گلے میں ان تمام رندھے ہوئے آنسوؤں کا گولہ اٹکا جو ابا جی کو تکلیف نہ دینے کے خیال سے کہیں اندر ہی اندر سمندر تخلیق کرتا رہا۔ کئی مرتبہ ان کی یادوں نے گدگدی کی۔ کبھی مسکراہٹ اور کبھی بے ساختہ ہنسی کی صورت ان کے بابرکت وجود کا احساس میرے دل میں دھڑکتا رہا۔ کتنے الفاظ حوصلہ بخش گئے اور کتنے ہی الفاظ اظہار کی قدرت رکھنے کے باوجود ہونٹوں پر انگلی رکھے خاموش رہنے پر مجبور رہے۔

میری سماعتوں میں آج بھی ابا جی کی آواز زندہ ہے:

"بیٹا! زبان سے کہی ہوئی بات ہوا میں تحلیل ہوجاتی ہے لیکن قلم جو مہریں لگاتا ہے وہ آپ کی ہستی کے مٹی ہونے کے بعد بھی سانسیں لیتی رہتی ہیں۔ سو جب بھی قلم اٹھاؤ تو زندگی کو اس کی عنایات سے شمار کرنا، اور ایسا ضرور ہوگا کہ کسی ایک نعمت کا وزن زندگی کی تمام آزمائشوں سے بھاری

ہوگا۔ جب کچھ لکھنے بیٹھوتو لوگوں کی غلطیوں زیادتیوں اور ناانصافیوں کو ذہن سے نکال کر تخیل اور فکر کی اڑان بلند کرنا۔ دنیا میں پہلے ہی قدم قدم پر ابتلا اور تباہی ہے۔ اپنا قلم امید، حوصلے اور مثبت اندازِ فکر کے فروغ کے لیے اٹھانا۔ ہمیں اللہ نے تبدیلی لانے کے لیے پیدا کیا ہے خواہ وہ اپنے قدموں کے گرد بنے دائرے جتنی ہو۔''

میں نے مقدور بھر کوشش کی کہ زندگی کی تسبیح میں آبدار موتی ہی چن کر پروتی رہوں۔ میں نے وہ نعمت اپنے بچوں کی صورت میں اپنے گرد وپیش کو معطر اور اپنے گزشتہ اور آئندہ دنوں کو منور کرتے دیکھی ہے۔ یہ حقیر کاوش ان ہی نعمتوں کے شکرانے کا ایک اظہار یہ بھی ہے۔

اس کتاب کے نام کو تو ابا جی کی ذات کی طرح سادہ رکھنے کا سوچا اور ''میرے پیارے ابا جی'' تجویز کیا۔ میری کتب کے نام ہمیشہ آخری لمحے میں قبا بدل لیتے ہیں۔ ابا جی اور تایا جان نے ڈینش شعر و ادب کی کتاب کا نام ''زبانِ یارِ من ترکی'' تجویز کیا۔ پھر جدت و ندرت کی خاطر اسے ''زبانِ یارِ من ڈینش'' کر دیا۔

لیجیے صاحب، ہم قائل ہوگئے کہ ابا جی اور ان کے لالہ جی بجا کہتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل کراچی قیام کے دوران قبلہ مشتاق احمد یوسفی سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ بات ڈینش ادب اور تراجم تک پہنچی۔ کتاب کے مضامین اور ابواب سن کر بہت خوش ہوئے لیکن نام سن کر توقف فرمایا، ''اچھا ہے لیکن ـ ـ'' مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ اپنے نرم لہجے میں فرمایا،

''اگر آپ اس کو 'زبانِ یارِ من دانش' کر دیں تو یہ ذومعنی بھی ہو جائے گا۔''

لیجیے قبلہ، ''جو حکم میرے آقا'' کے مصداق ابھی پبلشر کو زحمت دیتے ہیں۔ اور اب کے، نام میں جدت وندرت کے ساتھ ذُومعنویت اور پہلو داری کی انفرادیت بھی شامل کر دیتے ہیں۔

''برگد'' کی وجہِ تسمیہ بھی ایسا ہی ایک چھوٹا سا واقعہ بنا۔

اوائل نومبر 2014 کی ایک زرد سہ پہر کو نئی دہلی کی بلند چھتوں اور شاعرانہ آرائش والی ایک نشست گاہ میں ڈاکٹر عبداللہ، جاوید اختر اور میں ایک تکون کی صورت میں بیٹھے تھے۔ جاوید اختر اپنی کمر کی تکلیف کے باعث اپنی خاص کرسی پر تشریف فرما تھے۔ ہماری پہلی ملاقات 2009 میں امریکہ میں ڈاکٹر عبداللہ کی رہائش پر صبح ناشتے پر ہوئی جب مشاعرہ میں آنے والے تمام شعرا انور مسعود، امجد اسلام امجد، منظر بھوپالی اور سلیم کوثر موجود تھے۔ تب شبانہ اعظمی بھی ساتھ تھیں۔ لیکن اب وہ دہلی میں موجود نہیں تھیں بلکہ اپنے پروگراموں کے سلسلے میں یورپ جا چکی تھیں۔

ڈاکٹر عبداللہ نے مہمان نوازی کی انت کرتے ہوئے مجھے نہ صرف دہلی کی یادگاروں سے ہمکلام ہونے کا موقع دیا بلکہ جاوید اختر سے میری ملاقات کا اہتمام بھی کر ڈالا۔ جاوید اختر کو میری ڈینش شعر و ادب کی کتاب کے بارے میں علم تو تھا، سو دریافت کیا کہ آج کل کیا لکھ رہی ہوں۔ میں نے بتایا کہ اپنے والد کے بارے میں ایک کتاب تحریر کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں۔

''اچھا۔ نام کیا رکھا ہے؟'' انھوں نے بھرپور دلچسپی دکھائی۔ جو لوگ جاوید اختر سے مل چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کے مزاج میں سادگی اور مخاطب کی بات مکمل توجہ سے سننے کی خوبی شامل ہے۔

''نام سادہ سا ہے'' میں نے آہستہ سے کہا۔۔۔ ''میرے پیارے ابا جی۔''

''صدف مرزا'' انھوں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا، ''کیا یہ نام حتمی ہے؟''

''جی حتمی تو نہیں، لیکن میرے ذہن میں ایک سادہ سے نام کے طور پر یہی خیال ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو پھر کچھ اور بھی سوچو۔ یہ نام ایک عام سی بیٹی تو تجویز کر سکتی ہے لیکن 'نہیں' جیسی نظم کہنے اور جرات سے پڑھنے والی صدف مرزا اس عام سے عنوان کے پیچھے نہیں کھڑی ہو سکتی۔''

میں ایک لمحے کے لیے تو بالکل گنگ رہ گئی۔ مجھے نہ صرف ان کی یادداشت کی داد دینا پڑی بلکہ اس احساس نے ممنون کر دیا کہ انھیں میری نظم کا عنوان بھی یاد ہے۔ میں نے ایک لحظے کے بعد کہا، ''برگد۔ پہلے میں نے یہ نام سوچا تھا، پھر خیال آیا کہ یہ ایک عام استعارہ ہے۔ دراصل پہلے میری کتابوں کے نام ابا جی تجویز کیا کرتے تھے۔''

جاوید اختر بغیر کچھ کہے اٹھے، اپنی کتاب اٹھا کر اس کا ایک صفحہ کھولا اور ایک نظم پر انگلی رکھ دی: ''برگد''۔ ڈاکٹر عبداللہ اور میں خاموشی سے انھیں دیکھتے رہے۔

''چلیے پھر آج ہم کتاب کا نام بدل دیتے ہیں۔ آپ نے اسے نیا نام دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں۔۔۔ میں نے صرف توجہ دلائی ہے۔ نام آپ کے ذہن کے بینک میں نہ صرف موجود تھا بلکہ آپ نے اسے فہرست میں بھی شامل کیا ہوگا۔'' وہ سہولت سے بولے، ''میرے پیارے ابا جی' ایک ایسی بیٹی کی طرف سے دیا گیا عنوان لگ رہا تھا جس نے بس صرف ابا کے آنگن میں زندگی بسر کی ہو۔ آپ اسے وہ نام دیجیے جو ایک باشعور شاعرہ اور مصنفہ کی سوچ میں ابھرے۔''

میں ان دونوں احباب کی کرم فرمائی کیسے بھول سکتی ہوں۔

اس دن کے بعد میں نے اس کتاب کو ''برگد'' کے نام سے ہی موسوم کیا۔ اساطیری

درخت جو اپنی پہلی کونپل سے لے کر اپنی صدیوں کی زندگی تک ایک خاص اہمیت کا حامل ہے، جس کے وجود سے نئی شاخیں پھوٹتی ہیں اور زمین کے دردزہ سہتے اور درخیزی جنم دیتے وجود کو تھام لیتی ہیں۔ جس کی شاخیں آسمان کی طرف لپکتی ہیں لیکن جڑیں زمین میں مضبوطی سے پیوست رہتی ہیں۔ برگد، جس کا سایہ گھنا بھی ہے اور ٹھنڈا بھی، جس کی آغوش پھیلتی ہی چلی جاتی ہے جو مسافروں کے لیے دھوپ میں سر جھکائے لب بستہ کھڑا رہتا ہے۔ میرے لیے ابا جی وہی اساطیری درخت تھے جو تاریخ و اساطیر میں مذکور ہیں۔

میں ابھی بھارت میں ہی تھی جب تایا جان نے رختِ سفر باندھ لیا۔ مجھے پاکستان سے کسی نے خبر نہیں دی۔ یہ اطلاع میں نے اخبار میں پڑھی۔ وہ شام میری زندگی کی مشکل ترین گھڑیوں میں سے ایک تھی۔

ہجر ترا جے منگے پانی، میں کھوہ نیناں دے گیڑاں
جی کردا تینوں کول بٹھا کے، درد پرانے چھیڑاں

مجھے کئی دن یہی محسوس ہوتا رہا کہ اب بساط لپیٹ دی گئی ہے۔ ابا جی کی خوشبو دیتا آخری وجود رخصت ہو گیا۔ اب کسی سے پرانے دردِ مشترک کا کوئی سلسلہ نہیں رہا۔ ایک ہجر کی کیفیت اور بے سروسامانی، بے زمینی بے مکانی کا عالم دل کو محصور کرتا رہا۔ پھر وفورِ تخلیق کے انہی حیات افروز لمحوں میں برگد پر نظم سرزد ہوئی اور "تمھارے نام کی نسبت سے نیک نام ہوں میں"۔

اس مصرع کو غزل کرنے کا مشورہ احباب نے دیا لیکن میرا قلم گنگ ہی رہا۔ میں محبت اور احسان مندی کے اسی پل پر کھڑی اس پل کا انتظار کروں گی جب ذہن اور دل کے مقامِ اتصال کی سعید ساعت میں مزید لکھنے کا اِذن ہو گا۔

میری یہ کتاب یادوں کے اسی سلسلے کی کڑیاں جوڑنے کی سعی ہے۔ ابا جی اپنی شخصیت میں سادگی، بے نیازی، بے ریا و بے لوث حسنِ سلوک، اور نافع انسان کا کلیہ، خود تکلیف اٹھا کر کسی کو آسانی فراہم کرنے کا جذبہ، عزمِ مصمم، حق بات کو لگی لپٹی کے بغیر کہہ دینے کا حوصلہ اور زندگی کے ساتھ ناجائز سمجھوتہ نہ کرنے کی دھن، اپنے فیصلے اپنے ہاتھ میں رکھنے کا اختیار اور ہر اختیار رکھنے کے باوجود ایک منکسرانہ بے اختیاری، عجز و حلم جیسی معجز صفت فطرت لے کر آئے تھے۔ میری ذات کو انھوں نے جیسے کسی آئینہ ساز کی نظر سے دیکھا، جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں۔

ان کی اسی آئینہ گری نے شکستہ شیشے کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ پھر مجھے

سکھایا کہ ہمارا معاشرہ شکستہ شیشے کو چور چور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے خائف نہیں ہونا۔ ٹوٹتا وہی ہے جو "لوگ کیا کہیں گے" کے پتھر سے ڈر گیا۔

ابا جی جب تک ہمارے درمیان موجود رہے، مجھے مختلف موضوعات پر لکھنے کی ترغیب دیتے رہے۔ ان کے الفاظ جیسے زندہ ہوکر رقص کرنے لگتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ عمر جوں جوں زینے طے کرتی ہے، علم اور تجربہ اس کے جمال اور بہاؤ میں اضافہ کرتا ہے۔ تخلیق ایک خواب کی طرح ہے۔ اگر اس کی تعبیر جلد ممکن نہ ہو تب بھی وہ قلب و ذہن میں روشنی کی کرن کی طرح مخفی رہتا ہے، اور پھر جب اس خواب کو موقع ملتا ہے تو وہ نور کی رفتار سے ہی تخلیق کی قوت کو مہمیز کرتا ہے۔

عمرِ رفتہ کی یادوں کی قندیل ہاتھ میں ہو اور مشاہدے کے سرسبز و شاداب نخلستان سے گزر ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی میں تجربے کی تن بیتی کا عطا کردہ ضبط بھی شامل ہو جائے تو آزمائش و ابتلا کی بھٹی کی تپش کی شوریدہ سر چنگاریاں انسان کی ذات کے اندر اسے منور کرتی اور کندن بناتی آگ کو آخری سانس نہیں لینے دیتیں۔ جب زیست میں اپنے فرائض سے احسن طریقے سے سبکدوش ہونے کا حیات بخش احساس ملے اور فراغت اور سہولیات کا جانفزا سکون بھی نعمت کی صورت عطا ہو جائے تو پھر تخلیقی صلاحیتوں کو صیقل نہ کرنا اور قلم نہ اٹھانا گناہِ کبیرہ میں شمار ہوتا ہے۔

میری خوش بختی یہ بھی رہی کہ مجھے براہِ راست بزرگوں سے روابط کے مواقع ملے۔ بزرگوں کی محفل اور ان کا احترام ان سے سیکھنے کی لگن اس فیض کو بڑھا دیتی ہے کہ

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

میں آج بھی زندگی کے طویل سفر میں پیچھے مڑ کر دیکھوں تو راستے میں ان کے ہاتھوں کے جلائے چراغ جگمگاتے دکھائی دیتے ہیں۔ میں کسی بھی آزمائش کی سرنگ میں آگے کی جانب دیکھوں تو اس کے آخری دہانے پر ان کے شفقت بھرے چہرے پر مسکراہٹ کسی آفتابی کرن کی طرح روشن نظر آتی ہے۔ حالات سے ہار نہ ماننے کا درس، خود ترسی کے شیطانی پھندے سے بچنے کے لیے عزم و ہمت کی آیات کا روشن حصار کرنا اور خود کو باشعور اور خود دار و خودنگر بنانے کا درس انھوں نے اپنی زندگی کی عملی مثال سے سکھا دیا۔

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض
نہیں دیتے شعلہ شرر کے عوض

زیست کی بلندی کی طرف جاتے زینے پر سر اٹھا کر دیکھوں اور اپنے ساتھ ہم سفر اپنی نئی نسل، اپنے بچوں کی کامیابیوں اور ان کی ذہنی نشو و نما کو دیکھوں تو مجھے ابا جی کے احسانات اور ان کی حکمت بھری شفقتوں کے طلسمات اپنی اگلی نسل تک بکھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ آج بھی میں ابا جی کے تصورِ زمان و مکان کو متحیر ہو کر سوچتی ہوں کہ وقت ان کے لیے کتنا بیش قیمت تھا۔ ان کی ذہنی اڑان اپنے وقت کے افق سے پرے تھی۔

تحقیق و تراجم پر عرق ریزی سے کام کرنا مشکل نہیں بس اس کے لیے ارادے کی طاقت درکار ہے۔ شاعری از خود پہاڑوں سے گرتے جھرنے کی طرح اونچی نیچی راہوں پر گنگناتے ہوئے اپنے راستے متعین کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کی سیال قوت کے سامنے بند باندھنا ناممکن ہے۔ اپنے گرد و نواح میں پھیلی ناہموار زندگی بزبانِ خود داستانیں سناتی ہے، کردار آنکھیں، چہرے اور لہجے بدل بدل کر اپنا تعارف خود کرواتے ہیں۔ ان کو کسی افسانے یا کہانی میں پرونا کوئی پیچیدہ عمل نہیں۔ لیکن جب اپنے ہر موئے تن پر بیتی زندگی کے قدم گننے کی ضرورت آن پڑے اور آزمائشوں، بیماریوں اور خفتہ زخموں کا شمار کرتے ہوئے انھیں بیدار کرنا پڑ جائے تو سوچ، قلم اور اظہار کو بیک وقت اپنے قابو میں رکھنا سہل نہیں۔ دس برس میں مکمل ہونے والے منتشر افکار کو یکجا کرنا اور ترتیب دینا وہ بھاری پتھر تھا جو برسوں میرے ارادے کے آنگن میں گڑا رہا۔ یونیکوڈ اور اِن پیج کی تمام تر تکنیکی کٹھنائیوں کا سامنا کرتے ہوئے ان اقتباسات کو ایک مربوط صورت دینا میرے محترم دوست سہیل پرواز جنھیں احباب محبت سے آغا جی بھی کہتے ہیں، کی عنایت ہے۔ ورنہ شاید ابھی کئی برس تک موسم سرما کی پہلی برف باری کے نازک پھاہوں کی صورت یہ داستان کہیں فضا میں ہی بکھری رہتی۔ اس تخلیقی سفر کے اختتامی فرض کی ادائیگی میں ان کے خلوص اور محنت کا شکریہ ادا کرنا میرے قلم کی استطاعت سے وراء ہے۔

ان تمام دوستوں کی یاد اس میں شامل ہے جن کے ساتھ زندگی کا ایک بھی ہنستا ہوا لمحہ بانٹ کر جیا۔ وہ سب عزیز چہرے جو زندگی کی تنگنائے میں روشنی کے میناروں اور مرغانِ بادنما کی صورت میں رہے، جن کے جذبے، پیغامات اور دعائیں مجھ تک پہنچتی رہیں، وہ جن کی رفاقت نے ثابت کیا کہ خاردار راستے ہمیشہ نہیں بچھے رہتے بلکہ کہیں آگے گلستان بھی منتظر ہوتا ہے۔ ہاتھ تھامنے والے اور خود سے ملوا دینے والے بے لوث دوستوں کی حوصلہ افزائی زندگی کے دشوار راستے سہل تمحل کر دیتی ہے۔

حافظ صفوان کی باادب قسم کی سرزنش، برگد کے پہلے ڈرافٹ کا مطالعہ اور زبان و ثقافت کی سگندھ میں بسے مشورے اور پیہم تشجیع، فیسبک کے دوستوں میں میرے بے حد محترم دانشور سید سلطان عباس، جو فیسبک کے منتشر افکار کو اخبار کی زینت بنا کر میری حوصلہ افزائی کرتے، محترم مجید اختر جیسی مشفق شخصیت جن کی اعلیٰ ظرفی اور عظیم حوصلے سے حوصلہ افزائی کے الفاظ میرا سرمایہ بن گئے: ''صدف، ماں کی عظمت اور فضیلت پر تو ہمیشہ لکھا گیا ہے لیکن یہ جو تم اپنے اباجی پر لکھتی ہو یہ کتاب اردو زبان میں پہلا دل پذیر اظہار یہ ہوگا۔ جلدی کرو، اسے مکمل کر دو۔''

میرے وہ تمام اَن دیکھے دوست جو فیسبک پر اپنے قیمتی تبصروں میں کتاب کا مطالبہ کرتے اس طویل سفر میں میرے ہمراہ رہے۔

سو مرے دوستو!

میرے سب الفاظ گنگ ہیں۔

میں یہ لفظ لکھتی رہی... اور میرے اشکوں میں آپ کے نام شامل رہے۔ لیکن یہ کسی مجبور کے بے آواز اور مٹی میں مل جانے والے قطرے نہیں۔ یہ روشنی کا بھانبڑ لگا دینے والے شعلے ہیں جن سے آگ لے کر کئی اور الاؤ روشن ہوں گے، اور ان کی روشنی میں ہر اس باپ کے نام کی کہانیاں سنائی جائیں گی جس نے اپنی بیٹیوں کے راستے روشن کیے اور نئی نسلوں کی بنیاد رکھی۔ سو میری یہ کتاب ان تمام باپ، تایا، چاچا، اور بھائیوں کے نام بھی ہے جو عورت کو تکریم دینے اور نسلوں کی امین سمجھنے کے قائل ہیں۔

کتاب میرے شہر کے معروف ناشر بک کارنر سے چھپے گی۔ وہی جگہ جہاں سے کالج واپسی پر ہم کتابوں اور کارڈوں کی خریداری کے لیے کالج وین کے ڈرائیور کا صبر آزماتے تھے۔

یہ کتاب کسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں لکھی گئی۔ ہسپتالوں، ہوائی اڈوں، یونیورسٹیوں، گھر کی نشست گاہ میں بیٹھے ہوئے، چلتے پھرتے، وقتی واقعات اور حالاتِ حاضرہ کے موضوعات پر یونہی مضامین لکھتے لکھتے سب اقساط ایک دوسرے میں ضم ہوتی چلی گئیں۔ اس لیے اس میں ربط یا کڑیوں سے کڑیاں ملتی دکھائی نہیں دیں گی۔ بس یادوں کا حملہ اور احساسات کی شدت تھی جسے بساط بھر کوشش سے لفظوں میں ملبوس کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی صنف کیا ہے یا اسے کس پیمانے پر دیکھا جائے گا، یہ بھی میرا مسئلہ نہیں ہے۔ میرا مقصد اصلاحِ معاشرہ کے لیے کتب لکھنا بھی ہرگز نہیں رہا لیکن میرے قارئین کی رائے میرے لیے اہم ہے۔ دس برس کے دورانیے پر مشتمل اس کتاب کو

کون کس نظر سے دیکھتا ہے، میری کسی یاد سے یا کسی کے تذکرے سے کہاں اپنے بزرگوں کی شناخت کھوجتا ہے، یہ میرے تجسس اور ذوق وشوق کو مہمیز کرے گا۔

میرا کام ختم ہو چکا۔ میری صرف یہ تمنا ہے کہ ان الفاظ کو پڑھنے والی آنکھیں میرے بابل کے لیے دستِ دعا بلند کریں اور اپنے پیاروں کی قدر دانی کرنا سیکھیں۔

انتسابِ ثانی میرے داماد بیٹے مبین عارف اور میری زندگی سب سے بڑی خوشی آئمہ صوفیہ عارف کے نام ہے۔ اس بچی کے ساتھ میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ وہ سارے خواب، ارمان اور خواہشات جو اپنے بچوں کو پالتے ہوئے ذمہ داریوں اور فرائض کے طاقِ نسیاں پر لپیٹ کر رکھ دیے تھے، سلسلہ وار نئی پوشاک پہنے میرے گرد رقصاں ہو گئے۔ کبھی کبھار بھولے سے کسی احساسِ زیاں کا کوئی سنپولیہ جو سر اٹھا ہی لیا کرتا تھا، اس عصا کی موجودگی سے ختم ہو گیا۔

مبین عارف کے روپ میں مجھے زندگی نے ایسی نعمت اور انعام سے نوازا جس کا تصور بھی ناممکن تھا لیکن جس کا تشکر بھی مجھ پر تاحیات واجب ہے۔ ابا جی کی زندگی کے فلسفے کے خوشبودار گلاب ایک کامیابی کی صورت میرے آنگن میں کھل اٹھے۔ میں نے ایسے ہی احسان مندی کے عالم میں ایک دن ابا جی کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ درست کہتے تھے کہ زندگی کی کسی ایک بند گلی کو اپنی ناکامی تصور مت کرنا، خدمت اور خلوصِ نیت سے اپنا یقین ختم نہ کرو اور اپنی اولاد کی تربیت میں شامل رکھو کہ صلے کی امید کے بغیر جہاں تک ہو سکے خلقِ خدا سے حسنِ سلوک کرنا چاہیے، اس کا صلہ سکونِ دل کی صورت میں ملتا ہے۔ مبین عارف میری زندگی میں قلبی اطمینان کا وہی سبب ہے جو ابا جی کی دعاؤں کی قبولیت کا ثبوت ہے۔

شاید ان ہی کیفیات کی عکاسی لاشعوری طور پر مبین عارف کے لیے ایک نظم کی صورت میں ذہن پر نازل ہوئی --

دیکھتے دیکھتے
زندگانی میں یک دم کہیں
ریگزاروں سے چلتی ہوئی
گرم لو کی سلگتی ہوئی جاں گسل اک فضا میں

دلربا ہوش اڑاتے
سرابوں کی کچھ جھلکیاں
التباسی مراعات پاتے ہوئے
کھلکھلاتے ہوئے
زندگی میں کہیں
چاند کی چودھویں رات کی چاندنی کے
روپہلے ستاروں کے دھاگے سے بن کے
تازہ آسودگی کی ضیا پاشیوں سے چھلکتی ہوئی اک رِدا تان دے تو
اپنے ہونے کے احساس کی نرم حدت کا
جاں بخش، دلکش، حسیں مان دے تو...

میں اشکوں کے قطروں کے جامِ جہاں میں
نئی نور صبحوں کی روشن بشارت کی
خود کو مبارک جو دوں
اور

میں اپنی خود ہی بلائیں جو لوں
اپنے ہنستے ہوئے آنسوؤں کو
ہتھیلی میں اپنی سمیٹوں...
تجھے زندگی کی دعائیں جو دوں

ننھے قدموں سے لیکن بڑے ناز سے
ساتھ چلتے ہوئے
ترے ہاتھ کی
ایک انگلی سے لپٹی

مری زندگانی کی انمٹ خوشی ہے
تری آنکھ سے نور برساتی شفقت کی خوشبو لٹاتی
یہ پھواروں میں بھیگی
میری زندگی کے نئے آنے والے دنوں کے اجالے کی پہلی نقیبہ
ہمکتی ہوئی میری زہرہ جبیں ہے

میری جان
یہ نرم کونپل سی انگلی
ترا ہاتھ تھامے
ترا شفقتوں سے بھرا
روشنی سے سجا
یقیں کے خزانے کی کنجی کو تھامے
ترا ہاتھ تھامے
نئے فیصلوں کے
فسانے لکھے گا

یہی ہاتھ ہوگا
کہ جس کی لکیریں
نئے فیصلوں کے فسانے لکھیں گی
یہی ہاتھ ہوگا
جو نسلیں بدلتا
جو خوشبو میں ڈھلتا جو پانی پہ چلتا...
نئے اک زمانے کی بنیاد رکھنے
یہیں آ رکے گا
یہ ہاتھ آنے والے سنہرے زمانوں

خوشی کے جہانوں کی
متوازی چلتی ہوئی
کائناتوں کے اسرار سے پر فضا میں
تری رہنمائی کے روشن اشارے
تیری جراتوں سے بھری ایک تھپکی پہ نازاں
نئے کچھ ترانوں کی اصوات کی غیر فانی
دھنوں میں
وہ لوحِ ازل پر
ایک فتحِ مبیں کے نئے فیصلوں کی
ضمانت بھی دے گا۔

بچی کو باپ کے لاڈ وہ اعتماد دیتے ہیں کہ وہ دنیا کے کسی امتحان میں ناکام نہیں ہوتی اور کوئی رکاوٹ اس کا راستہ نہیں روکتی۔ میں اپنی نواسی کو باپ کے کاندھے سے لٹکا دیکھتی ہوں تو مجھے ان دونوں پر بے پناہ پیار آتا ہے۔ مبین کو کانفرنس پر لندن جانا تھا اور وہ پہلی دفعہ تین دن دور رہے۔ دونوں ماں بیٹی میرے پاس آگئیں۔ عام طور پر وہ رات نہیں رہتی تھیں۔ ایک آدھ مرتبہ میں نے کہا کہ چند دن رہ جاؤ تو کہنے لگی امی، جب یہ صبح اٹھتی ہے تو اپنے بابا کے پاس لیٹتی ہے، پھر مسکرا کر دکھاتی ہے۔ یہ دونوں کا کوالٹی ٹائم ہوتا ہے۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی، مبین اسے صبح اٹھتے ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا بالکل ٹھیک ہے۔ میں جاہل نانی اماں کی طرح بلاوجہ بچوں کو ''نانکے'' بلا کر بٹھانے کی قائل نہیں ہوں۔ ان کا پہلا رشتہ اپنے باپ کے ساتھ مستحکم ہونا چاہیے۔

اب جب نواسی صاحبہ تین دن قیام کرنے آگئیں تو اس کے ماموں کے دل کی کلی کھل گئی۔ روز صبح اس کے جاگنے کے انتظار میں باہر بیٹھا رہتا۔ رات کو اس نے آئمہ کو میرے ساتھ سوتے دیکھا تو فوراً بہن سے جا کر کہنے لگا کہ بے بی کو اٹھا لاؤ۔ امی دیر سے سوتی ہیں، کبھی گولی کھا لیتی ہیں، کہیں نیند میں اسے کچل ہی نہ دیں۔ مجھے عالیہ کے بے ساختہ ہنسنے کی آواز آئی۔ اس نے کہا کہ امی جی نے تمہیں اس وقت نہیں کچلا جب تم دو سال کے تھے اور امی آپریشن کے بعد درد کش ادویات میں مارفین تک کھاتی تھیں۔ لیکن ماموں صاحب کی تشویش نہ گئی۔ اس نے مجھ پر کبھی گلی

یقین نہ کیا اور رات کو اٹھ اٹھ کر ہمیں دیکھتا رہتا۔

ادھر سے آئمہ کے بابا جانی کو بھی قرار نہیں آ رہا تھا۔ روز شام کو ویڈیو کال ہوتی اور آئمہ ہمک ہمک کر ہنس ہنس کر دکھاتی۔ تین دن بعد مبین کی واپسی ہوئی تو وہ اپنے بال بچے کو لینے آئے۔ چار مہینے کی بچی نے دروازہ کھلتے ہی باپ کی آواز سن کر صوفے پر لیٹے لیٹے کسی تیراک کی مانند ہاتھ پاؤں چلانا شروع کیے۔ پھر جونہی مبین نے اسے اٹھایا وہ باپ کے گلے سے لپٹتی، اس کے منہ پر ہاتھ لگاتی، پوپلے منہ سے ہنستی اور تیزی سے ہاتھ پیر چلاتی غوں غاں کرتی خوشی کا اظہار کرتی رہی۔ اب اسے ماں کی بھی پروا نہیں تھی۔ میری آنکھوں میں خوشی اور حیرت کے آنسو آ گئے۔

بلاشبہ ایک اچھا باپ وہ بلند ستون ہے جس کے اوپر ایک بیٹی کھڑی ہو کر بلندی کا سفر شروع کرتی ہے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے فیصلہ کیا کہ یہ کتاب دنیا کے ہر اس باپ کے نام ہے جو اپنی بیٹی کی انگلی تھام کر اسے چلنا اور لکھنا سکھاتا ہے۔ ہر وہ باپ جو انسانوں کے بنائے ہوئے اس سماج کی ہر ملعون اور مطعون رسم و روایت کے پھانسی گھاٹ پر اپنی بیٹی کو کھڑا دیکھ کر گونگا بہرہ بن کر نہیں گزر جاتا بلکہ صفیں الٹنے کی جرات رکھتا ہے۔

یہ کتاب اسی لیے میرے بڑے اور قانونی بیٹے مبین عارف اور اس کی نورِ نظر آئمہ صوفیہ عارف کے نام ہے کیونکہ میں دنیا کا ایک بہترین باپ اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میں دیکھنے کو رہوں یا نہ رہوں، شفقت اور محبت کی یہ روشنی مبین عارف کی نسلوں میں چلے گی۔

اس کتاب کے صفحۂ قرطاس پر بکھرنے اور پتی پتی ہو کر سنورنے کی ساری محبت بھری محنت دو متحرک، فعال اور خوش خصال جوانانِ رعنا، امر شاہد اور گگن شاہد کی ہے۔ اگرچہ ان کی پیدائش سے بھی پہلے میں بک کارنر پر کتابیں لینے جاتی رہی جہاں ان کے والد محترم شاہد حمید صاحب بے حد شائستہ اور مہذب انداز میں کتابوں کا تعارف کراتے، علم دوست اور سخن شناس تھے۔ بہت رش میں بھی توجہ سے پہلے ہماری فرمائشیں پوری کرتے۔ کارڈز، رسالے اور کتب نکال کر دینے کا فریضہ نہایت خندہ پیشانی سے ادا کرتے۔ لیکن میرے والد صاحب کے لیے میری کتاب بک کارنر جہلم سے شائع ہونا صرف میری خواہش نہیں تھی بلکہ ان برادران کی بے کنار محنت بھی شامل ہے۔ کتاب میں اضافی واقعات لگوانے، پھر تفصیل سے پڑھنے اور مزید مشورے دینے کی عنایت بھی ان ہی کے سر جاتی ہے۔

امر شاہد مسلسل اس بات پر مشورے دیے جا رہے تھے کہ کتاب میں ادبی زندگی کے

حوالے سے بھی تمام واقعات شامل کیے جائیں جن کا تعلق اُردو ادب سے ہو اور ایک ادیب کی رائے بھی ترجیحی طور پر ہو۔

میرا مسلسل انکار بدلنے نہیں پایا تھا کہ اس بکھیڑے کی کیا ضرورت ہے۔ اصل چیز تو ڈنمارک کی معاشرت اور پاکستان کے ساتھ اس کا موازنہ ہے۔ لیکن دو دن کی گپ شپ میں اس مستقل مزاج نوجوان نے مجھے قائل کرلیا کہ اس روش سے ہٹ کئی پہلو اور کئی جہات رکھتی کتاب پر ایک ادیب کی رائے شامل ہو۔ کتاب کی ترتیب، نئے واقعات، نئی تجاویز، یعنی کام بڑھتا گیا۔ میں صبح دس بجے اپنے بھتیجے ڈاکٹر زعیم اللہ مرزا کے ساتھ بک کارنر کے دفتر پہنچ گئی...

''لو بھئی نوجوانو، آج نہ میں گھر جاؤں گی اور نہ ہی کسی اور کو جانے کی اجازت ملے گی، ہو جایئے سب شروع۔''

میرے لیے یہ دو دن تاریخی ہیں۔ ایک خوبصورت یاد ہے۔ آج جب میں ڈھلتی ہوئی شام بک کارنر کے دفتر میں کتاب کے ہر باب کی ترتیب اور تجسیم ہوتے دیکھ رہی ہوں تو مجھے یہ سب اپنے خواب کے ہم سفر محسوس ہوتے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ انسان اپنے خواب تنہا پروتا ہے۔ موتیوں کی لڑیاں لیے کتنے ہاتھ دست بدست اور قدم بقدم ہمراہ ہوتے ہیں۔

یہ دو دن بک کارنر نے میری نہ صرف میزبانی کی اور گھر کے بنے لذت بھرے کھانے سے مہمان نوازی بلکہ بار بار گرم چائے اور ٹھنڈا پانی پیش کرتے رہے۔ کمپوزر راشد حسین نے بے حد محنت اور صبر سے تمام صفحات کی درستی اور ترتیب کا کام انجام دیا۔ میں ان تمام اصحاب کی دلی طور پر ممنون ہوں۔ یقیناً یہ میرے اس خواب کی تعبیر میں میرے رفقاء ہیں جو شاید میری عمر بھر کی کمائی ہے۔

صدف مرزا

جہلم (پاکستان)

جولائی 2019ء

ای میل: sadaf.mirza84@yahoo.com

بتائیں تم کو ماں جائے ہم اب ہنسنے سے ڈرتے ہیں

مجھے آج بھی یاد ہے وہ چوبیس جولائی کی ایک عجیب سی دل کو سہاتی ہوئی صبح تھی۔ سورج اپنی آنکھوں میں ایک عجب مغائرت لیے ہوئے تھا۔ چمکیلی صبحوں سے عشق ہونے کے باوجود میں نے اٹھ کر کمرے کے پردے برابر کر دیے۔ بچے مجھے مسلسل آ کر آوازیں دے رہے تھے۔

''امی! آپ کے لیے ناشتہ بنا دوں؟'' میرے بیٹے نے کوئی تیسری دفعہ آ کر پوچھا۔

''نہیں۔۔۔ مجھے تنگ نہ کرو، میرا دل ڈوب رہا ہے۔'' میں نے اسے پھر منع کیا۔

''امی چلیے میں آپ کو گانا سناتا ہوں'' اس نے حسبِ معمول شوخی کا مظاہرہ کر کے مجھے بہلانا چاہا، ''دل ڈوبا، دل ڈوبا۔''

''شور نہ کرو بیٹا۔۔۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا'' میں نے اس کی آواز میں آواز ملانے کے بجائے خلافِ معمول بیزاری کا مظاہرہ کیا۔

''دل دل پاکستان، جاں جاں پاکستان'' اس نے میری ناگواری کی پروا کیے بغیر پرفارمنس جاری رکھی۔ ''امی مجھے دل کے ذکر والے بس دو ہی گانے آتے ہیں۔'' کوئی اور وقت ہوتا تو ہم دونوں مل کر گانے گاتے لیکن اس دن مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بس میں شتر مرغ کی طرح سر چھپا کر خود کو تسلی دینا چاہتی تھی۔

''شور نہ کرو'' میری بیٹی نے فوراً کمرے میں آ کر حسبِ معمول آپا آپا کھیلنا شروع کر دیا۔ اس نے نویں جماعت کے بعد دسویں جماعت کیے بغیر کالج شروع کرنا تھا اور وہ ابھی سے کتابوں کا ڈھیر لگائے بیٹھی تھی۔

''باہر نکلو'' وہ بھائی کو تقریباً دھکیلتے ہوئے باہر لے گئی۔ پھر آہستگی سے میرے پاس آئی،

''کیا بات ہے امی؟ سوئی کیوں نہیں ساری رات؟'' میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے میری رضائی درست کی۔ پانی کا گلاس لا کر ساتھ والی تپائی پر رکھا، ''پیاری امی! سونے کی کوشش کریں۔'' میں نے رضائی سر کے اوپر تک اوڑھ لی اور واقعی فرمانبرداری سے سونے کی کوشش شروع کر دی جیسے میں صرف اسی بات کی منتظر تھی کہ وہ مجھے سونے کے لیے کہے۔

پتہ نہیں وہ بھیانک خواب تھا یا شاید جاگتے میں کوئی مجھے خوف ناک تصاویر دکھا کر دہشت زدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سفید چادروں میں لپٹا ایک بدن جس کے چاروں جانب سے لال لال خون ٹپک رہا تھا۔ ایک جانب سے کالے سیاہ بال دکھائی دے رہے تھے، جیسے اسے کسی نے لا کر میرے بستر کی ایک جانب ڈال دیا ہو۔ خوف اور دہشت سے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے اپنی پشت پر پسینے کی نمی رینگتی محسوس ہو رہی تھی۔ بچے بھاگتے ہوئے میرے کمرے میں آئے۔

''امی! کیا ہوا ہے؟ امی، امی!'' خوف کا وہ مہیب، دل کے اندر خونی پنجے جماتا عفریت مجھے اب بھی یاد ہے۔

''لائٹ جلاؤ، لائٹ جلاؤ'' میں نے وحشت زدہ ہو کر بھیگی ہتھیلیوں سے رضائی ہٹائی، بستر جھاڑا۔

''امی! آپ نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہے۔ آنکھیں کھولیں، امی پانی پییں۔''

''پردے ہٹا دو، کمرے میں ذرا روشنی آئے'' میں نے اٹھ کر وقت دیکھا۔ تقریباً دس بجے تھے۔ میں بچوں کے سامنے بہادر بننے کی کوشش میں تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ مجھ پر خوف کا شدید حملہ ہو چکا تھا۔ میری ساری زندگی خطرے کا الارم بجاتے اس خوف سے جنگ رہی کہ یا اللہ جو ہونا ہے بس ہو جائے۔ یہ اضطراب اور خوف بھری بے قراری کا عذاب تو حقیقی عذاب سہنے سے بھی مشکل ہے۔ دل کی حالت طوفان آنے سے پہلے مضطرب پرندے جیسی تھی جو بے بسی سے شور کرنے اور پھڑ پھڑانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا یا شاید جنگل کو آگ لگنے سے پہلے کا وحشت بھرا سناٹا، موت کے اچانک شب خون مارتے حملے سے زیادہ کربناک صورت ہے شاید۔

لیکن وقت نے مجھے سکھایا کہ خوف کے آکٹوپس کی طرح بے خوفی بھی وہ ہزار سروں والا عفریت ہے جو احساسِ زِیاں سے لاتعلق کر کے ایسے فیصلے کروا لیتا ہے جس سے داخلی دنیا میں بھونچال آ جاتا ہے کہ کبھی جب ڈر نہیں لگتا تو بے حد ڈر سا لگتا ہے۔

نہیں، ذرا رکیے۔ میں آپ کو اس صورتِ حال کے پس منظر سے آگاہ کرتی ہوں تا کہ

آپ بھی باقی لوگوں کی طرح مجھے ذہنی مریض قرار نہ دیں۔ اگرچہ مجھے میرے ڈاکٹر اور باقی متعلقہ افراد حیرت ناک حد تک بہادر کہتے ہیں۔ میں چھ چھ گھنٹے کے طویل آپریشن کے بعد بھی عام لوگوں سے زیادہ متحرک تھی۔ دو برس کے بیٹے کی انگلی تھام کر ہسپتال کے چکر لگانا معمولی بات تھی۔ جب بھرے پرے مشترکہ خاندان میں رہتی تھی تب بھی میرے لیے پچاس لوگوں کا کھانا بنانا بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ لیکن اب معمولی سی بات میرے اعصاب پر یوں اثر انداز ہوتی کہ کئی دن معمول کے کام بھی تکمیل کو ترستے رہتے۔ وقت اور حالات انسان کو اس کی بے بسی کا احساس دلا دیتے ہیں۔ وہ صرف ایک کمتر ذرہ ہے جس پر کبھی سورج چمکے تو وہ ہیرے کی سی ضیا دیتا ہے ورنہ ذرہ۔

آج سے صرف ایک مہینہ پہلے صبحِ کاذب کی خاموشی میں جب اجالا ابھی کہیں آنکھیں مل رہا تھا اور دنیا گہری نیند میں بے فکری کے مزے لوٹ رہی تھی کہ ہمارے ہمسائے نے ایک قیامتِ صغریٰ برپا کر دی تھی۔

قصہ یوں ہے کہ اس کی اور ہمارے گھر کی دیوار مشترک تھی۔ چار بے حد معصوم بچے جن کی شامیں میرے گھر گزرتی تھیں، کبھی پڑھنے کے لیے، کبھی بچوں سے مل کر ٹی وی دیکھنے کے لیے اور کبھی کھیلنے کے لیے۔ ان کی ماں ڈینش تھی اور باپ کانگو کا تھا جسے حادثے کے بعد لوگ کالا کہنے لگے۔ بچے پندرہ سال سے دو سال کی عمر تک کے تھے۔ سب سے بڑی می می (میمی) اور پھر دو بھائی اوپر تلے کے چودہ اور تیرہ برس کے غالباً، سب سے چھوٹا سائمن تو ایک طرح سے میرے ہاتھوں میں پلا۔ بے حد چمکیلی ہلکی بھوری آنکھیں، باپ سے ورثے میں ملے چھوٹے سپرنگ کی طرح بل کھاتے بال اور ماں کی طرف سے چمکتی سنہری رنگت۔ ابھی وہ مکمل باتیں کرنے سے قاصر تھا اور سر کے اشاروں سے رنگ برنگی بوتلوں سے جوس کا انتخاب کرتا۔ رنگوں پر انگلی رکھ کر مالٹے اور رس بھری کے جوس کی طلب کرتا۔ پاپ کارن کھانے ہوتے تو مائکرو ویو اوون کے پاس کھڑے ہو کر اشارے کرتا۔ ایک دفعہ میں نے سب بچوں کو ایک ہی جگ میں بلو بیری کا شربت بنا دیا اور کھڑکی سے باہر پکڑا دیا۔ وہیں سے بچے لے کر گراؤنڈ میں کھیلنے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد سائمن غصے سے تھپ تھپ کرتا آیا۔ جوتوں کے بغیر ننھے منے ننگے پاؤں، نیکر سے جھانکتا چوٹ لگا گھٹنہ اور عجیب سی ٹی شرٹ پہنے، پھولا ہوا منہ، ننھی سی ناک چڑھائے اس نے بے ربط لفظوں اور اشاروں سے بتایا کہ اسے یہ شربت پسند نہیں۔

''اچھا، اندر آؤ سونے کی ڈلی''۔ ڈینش میں بچوں کو لاڈ سے سونے کی ڈلی کہا جاتا ہے۔

میں نے اسے بتایا، ''دیکھو الماری میں میرے پاس مالٹے والے رنگ کا شربت نہیں۔'' اس نے ننگا پاؤں پٹخا، ''نائے، نائے'' اس کی عادت تھی کہ جو لفظ اسے آتے تھے ان کو دو دفعہ دوہراتا تھا۔

''اچھا، اچھا، ابھی دیکھتے ہیں۔ کچھ کرتے ہیں'' اچانک سیانے کوے کی طرح ایک ترکیب ذہن میں آئی۔ میں نے ٹھنڈا پانی بوتل میں بھرا۔ پھر اس میں چینی ملائی اور زرد فوڈ کلر نکال کر شامل کر دیا۔

سائمن چپ چاپ کھڑا ساری کارروائی دیکھتا رہا۔ ذرا سی زبان باہر نکال کر اس نے مشروب چکھا۔ پھر اثبات میں سر ہلا کر قبولیت اور آمادگی ظاہر کر دی۔ میں نے بوتل کو پورا بھر دیا۔ اس کی ترچھی، غصیلی آنکھوں کا زاویہ بدل گیا۔ پھولے ہوئے گالوں پر ڈمپل نمودار ہوئے اور بوتل لے کر ہنسی خوشی دوبارہ دھپ دھپ کرتا واپس چلا گیا۔

جب میں پاکستان گئی تو میں نے اپنے بھائی کو بچوں کے لیے کپڑے لانے کا کہا۔ سائمن کے لیے سرخ اور سفید جھنڈے کے رنگوں کی نیکر اور شرٹ کے ساتھ ہمرنگ سینڈل تھے۔ سائمن تو خوشی سے پاگل ہوگیا۔ ہینگر ہاتھ میں پکڑے گول گول دائروں میں ناچنے لگا، پھر ''موووواآ.... موووواآ'' (امی امی) کہتا گھر بھاگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ماں ہنستی مسکراتی آئی۔ سائمن نے میرے لائے ہوئے کپڑے پہن رکھے تھے۔ کہنے لگی کہ میں نے اسے کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا۔ بس چلائے جا رہا تھا ''سی۔۔۔اُسامہ ز مووواآ'' (دیکھو اُسامہ کی امی)۔

اس کی ماں ہنسنے لگی۔ تمھیں علم ہے یہ بدمعاش تمھارے آنے جانے کے اوقات پر پوری نظر رکھتا ہے۔ اسے سب خبر ہے کہ اب اُسامہ کی امی اپنی جاب سے واپس آئے گی، پھر سب کو کھانا دے کر دوبارہ پڑھنے جائے گی، پھر ہمارے ساتھ کھیلے گی۔

''اچھا'' میں نے اس کے سر پر چمٹے چھوٹے چھوٹے سپرنگوں جیسے بالوں کو چھیڑا۔ ننھے جاسوس، سونے کی ڈلی، مجھے دیکھتے رہتے ہو، چھوٹے پلے۔ جواب میں اس کی کھن کھن کرتی ہنسی بے قابو ہو کر پورے گھر میں پھیل گئی۔

اس کی ماں کو کوئی مزمن مرض لاحق تھا اور اسے ہسپتال کی طرف سے اسی بیماری کے شکار مریضوں کے گروپ کے ساتھ سپین بھیجا جا رہا تھا تا کہ ایک دوسرے سے بیماری کو برداشت کرنا سیکھیں اور ان میں سورج اور روشنی سے ہمت بھی آئے اور پژمردگی دور ہو۔ ہفتے بعد خاتون واپس آئی تو اس کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ اسے وہاں اپنے گروپ میں کوئی نیا ساتھی مل گیا تھا جو اس

کی بیماری اور حالات زیادہ بہتر سمجھتا تھا چنانچہ اس نے اعلان کر دیا کہ وہ سیٹا کو چھوڑنا چاہتی ہے۔
اچانک ہنستی بستی جنت میں پھنکارتا سانپ پھن لہرائے جھومنے لگا۔ ڈینش معاشرے میں یہ کوئی ایسی انہونی نہیں۔ ہمارے مشرقی معاشروں کی طرح جیسے کسی بھی شادی شدہ مرد کو گھر، اولاد، بیوی سب کچھ ہوتے ہوئے کوئی نیا ساتھی حواسوں پر سوار ہوجاتا ہے اور وہ نئے راستے منتخب کرلیتا ہے ویسے ہی یہاں عورت کو بھی یہ بات بالکل اپنا حق معلوم ہوتی ہے کہ اگر اس کا دل کسی نئی رفاقت کو بے تاب ہوتو وہ اس کی صداؤں پر رک سکتی ہے۔ اس کا حل قانونی علیحدگی ہے۔ کسی کا قتل، خودکشی یا کوئی بھی انتقامی صورت قابلِ قبول نہیں ہے۔

چونکہ ہماری دیواریں ملحق تھیں سو اکثر میں اوپر بالکونی میں کھڑے ہوکر ان کے باغیچے میں جھانک کر بچوں سے گپ شپ کرتی تھی۔ ہر روز شام کو چیخ پکار اور جھگڑوں کی آوازیں آنے لگیں۔ بچے سہم گئے۔ سائمن کی آنکھوں کی قندیلیں بجھ گئیں۔

سیٹا اکثر شام کو مجھے بلانے آجاتا۔ وہ بچوں کی ماں کے الگ راستے کے انتخاب کے فیصلے اور پرانی زندگی کو مسترد کرنے کے اس اختیار کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ''دیکھو! تم اس سے بات کرو۔ ہمارا گھر اور بچے تباہ ہوجائیں گے۔ میں پاگل ہونے والا ہوں۔''

ہم نے مقدور بھر کوشش کی۔ بات چیت کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش بھی کی۔ میں نے اسے بچوں سمیت کھانے پر بلایا اور میمی کی پسند کا مرغ پلاؤ بنایا۔ بچوں نے کھانا یوں کھایا جیسے کسی جنازے پر آئے ہوں۔ کھانے کے بعد میں نے اپنی عقل کے مطابق اس سے بات کی کہ اتنے پیارے بچے، نوجوانی کی حدود میں داخل ہو رہے ہیں، انھیں والدین کے سائے کی ضرورت ہے۔

اس کا جواب آج بھی میری سماعتوں کے تہہ خانے میں ایک بازگشت کی طرح گونجتا ہے۔ ''دیکھو! مجھے اب اس سے محبت نہیں رہی۔ میں اس یکساں، طویل اور بے رنگ زندگی سے عاجز آگئی ہوں۔ میں اس کی بیوی نہیں، سو جب چاہوں راستہ بدل سکتی ہوں۔ قانونی طور پر ہمیں طلاق کے کاغذات کی تو ضرورت ہی نہیں۔''

میرے سارے دلائل ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ گر پڑے، ''لیکن بچے؟ ان کا کیا ہوگا؟''
میرا پہلا سوال ان معصوم بچوں کے مستقبل کا تھا۔

''تم ہماری زندگی نہیں سمجھ سکتیں۔ جس طرح ہم لوگ تمھارا کلچر نہیں سمجھ پائے جس میں لوگ بے محبت کی زندگی جیے جاتے ہیں اور بچوں کی خاطر ایک خواب گاہ اور ایک چھت کے نیچے

رہتے ہیں۔ عورتیں پٹتی ہیں، خوار ہوتی ہیں، عدالتوں میں جاتی ہیں، جب حکومت کے پیسے اور وقت ضائع کر چکتی ہیں تو بچوں کی انگلی تھامے راضی نامہ کر لیتی ہیں۔" وہ اخباروں اور ٹی وی پروگراموں کے حوالے دینے لگی۔ میں ششدر اس کی باتیں سنتی رہی۔

"دیکھو این!" میں نے مصالحت بھرے انداز میں کہا، "عورت مشرق کی ہو یا مغرب کی، ماں بن کر قدرت اس کے ہارمون کے نظام میں مامتا بھر دیتی ہے۔ اور وہ فطری طور پر ان کو سوچنے لگتی ہے۔ اس میں ہم اپنی معاشرتی زندگیوں کو دوش نہیں دے سکتے۔ پھر جب تمھاری صورتِ حال میں چار بچے ہو جائیں اور خاوند سے کوئی سنجیدہ مسئلہ بھی نہیں سوائے اس کے کہ اب تمھیں اس سے محبت نہیں رہی۔"

"اب نئی محبت پیدا ہو گئی ہے ناں۔" اس نے پورے سکون سے بتایا۔

"تو اولاد کی محبت؟؟؟ وہ کس خانے میں ہے؟" میں نے اسے چائے بنا کر دی۔

اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے چائے کی پیالی سے گھونٹ بھرا، "اچھی ہے۔" اس کے انداز کلی طور پر مطمئن تھے جیسے میں نے اس سے کسی پسندیدہ رنگ کے بارے میں پوچھا ہو۔

"زندگی رواں دواں رہتی ہے۔ چند سال میں تو وہ ویسے بھی گھر چھوڑ جائیں گے۔ ان کی اپنی زندگی ہوگی۔" وہ اپنے کلچر اور معاشرتی تربیت کی رو سے بالکل حق بجانب تھی۔ جیسے ہمارے ہاں مرد اپنی بیوی بچوں کی موجودگی کے باوجود عشق کے کوچے میں جا بھٹکتا ہے اور نیا ہمسفر منتخب کر لیتا ہے۔ سب اسے "عشق پر زور نہیں" کے مترادف قبول کر لیتے ہیں۔ بس ایسے ہی یورپ کی عورت راستہ بدلنے کا حق مساوی طور پر استعمال کرتی ہے اور مرد کو اسے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

یہ میری اس سے آخری گفتگو تھی۔ رس ملائی کھلانے کے بعد میں نے برتن سمیٹے۔ آج بچوں نے ساتھ لے جانے کے لیے چاول بھی نہیں مانگے تھے ورنہ ہمیشہ بڑی طشتری میں کھانا لے کر جاتے۔

"دہی بڑے بھی ڈالو" منجھلا بیٹا کہتا۔ "نم نم، مزے دار ہوتے ہیں۔"

"تم لوگوں کا چکن روسٹ بالکل فرق ہوتا ہے۔" میمی ہمیشہ کہتی۔

اس سے چھوٹا بھائی کھیر شوق سے کھاتا تھا۔ مجھے نہیں خبر کہ میں کیسے اس کہانی کا خلاصہ پیش کروں۔ آج ایک عرصے کے بعد بھی دل کا وہی عالم ہے۔ الفاظ ویسے ہی بے بس اور گونگے کھڑے ہیں۔

سیٹا اگلے چند دن مجھے آتے جاتے کہتا رہا، ''ذرا شام کو دوبارہ بات تو کرو اس سے۔'' ان دنوں میرا غذائیت اور اس کی تھیوری کا امتحان تھا۔ تین گھنٹے کے اس امتحان کی تیاری نے میرا دماغ گھمایا ہوا تھا۔ میں شام کو بچوں سے فارغ ہو کر سیمناریم جاتی تھی تاکہ وہاں کے باورچی خانے میں باقی گروپ کے ساتھ مشق ہو سکے؛ کس کس چیز میں کتنے حرارے، کون سے وٹامنز، کتنی حرارت پر پکے کہ غذائیت محفوظ رہے، کس عمر کی کتنی غذائی ضرورت ہے؟ مجھے تو خواب میں بھی یہی لیکچرز دکھائی دیتے۔

ہمسائیوں کی خانہ جنگی عروج پر تھی۔ بچے گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ کئی مرتبہ پولیس تصفیہ کرانے آچکی تھی۔ یہاں بلاضرورت کوئی کسی کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ سو ہم لوگ ایک دیوار پار رہنے کے باوجود بالکل اجنبی ہونے کی کوشش میں مصروف تھے۔ میمی مجھے دیکھتی تو اس کا مدقوق چہرہ سوال بن جاتا۔ اس کی قلقل کرتی چاندی کے سکوں کی جھنکار کی سی ہنسی بے صدا ہو چکی تھی۔

مجھے وہ شام کبھی نہیں بھولے گی جب میں جلدی میں گھر سے نکلی تو میمی سامنے ہی لگے جھولے کے پاس بنچ پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی لپک کر آئی، ''ہائے'' وہ پارکنگ تک میرے ساتھ چلنے لگی، ''کہاں جا رہی ہو'' اس نے عجیب انداز میں پوچھا۔

میں نے بتایا کہ میرے پاس کتابیں پوری نہیں، لائبریری جانا ہے۔

''اچھا''، اس نے مایوسی سے کہا۔ ''اگر وقت نہیں ہے تو پھر تم جاؤ۔''

''میمی!'' میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا، ''تم میرے ساتھ چلو۔ میں کتابیں نکلوا لوں تو پھر تمھیں ایک شوارمہ کھلا دوں گی۔''

''نہیں'' اس نے بے رغبتی سے کہا، ''مجھے بھوک نہیں۔''

دو دن بعد بچوں کے ٹیک وانڈو کی کلاس کا دن تھا۔ ہم دونوں ہمسائیوں میں سے ایک ان کو چھوڑنے جاتا اور ایک واپس لاتا۔ میں عموماً سہ پہر کو چھوڑ آتی اور رات کو سیٹا واپس لے آتا۔ اس دن سیٹا نے کہا کہ آج میں چھوڑ آتا ہوں، واپس تم لے آنا۔ وہ قدرے بہتر موڈ میں تھا۔

''میں بھی اب شادی کروں گا تو کسی پاکستانی عورت سے ہی کروں گا۔ وہ تمھاری طرح سارا دن مہمانداری کرتی رہا کرے گی، ملازمت بھی کرے گی اور بچے بھی پالے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ جب وہ بھی تمھیں ناکوں چنے چبوائے گی تو پوچھوں گی۔ ازدواجی مسائل کہاں نہیں ہوتے؟'' میں نے کوشش کی کہ ہم نارمل بات چیت کریں۔

''نہیں، میرا یقین ہے کہ پاکستانی عورت بہترین بیوی اور ماں ہوتی ہے۔ میرے کچھ

پاکستانی دوست ہیں اس لیے میں جانتا ہوں۔ بس اب میں بھی پاکستانی عورت سے شادی کروں گا۔‘‘

یہ بات خوش آئند تھی کہ وہ حقیقت کو قبول کرنے لگا تھا اور زندگی کے ہم رکاب ہوکر آگے قدم بڑھانے کے ارادے ظاہر کرنے لگا تھا۔ اپنے تینوں بڑے بچوں اور میرے بیٹے کو لے کر وہ چلا گیا۔ واپسی پر میں انھیں لینے گئی۔

کراٹے سنٹر کے ساتھ ہی بہت بڑا میکڈونلڈ تھا۔ اُسامہ نے فرمائش کی، ’’امی آج میکڈونلڈ جانا ہے۔ سب مل کر مزہ کریں گے۔‘‘ پھر وہ آہستہ سے اردو میں بولا۔ امی جی میرا دل چاہتا ہے کہ ان بے چاروں کو میکڈونلڈ لے جائیں۔‘‘

’’چلو۔۔۔ٹھیک ہے، میکڈونلڈ چلتے ہیں۔‘‘ تینوں بچوں کے چہرے پر رونق آگئی۔ میں نے گاڑی موڑ لی۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ مجھ سے پٹر پٹر باتیں کرنے والی میمی اب چپ رہنے لگی تھی۔ اکثر میں اسے انگریزی کا ہوم ورک کرنے میں مدد دیتی، یا پھر کسی ڈینش نظم پر بات ہوتی تو وہ بلا تکان بولتی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے گریز کر رہی ہے۔ میکڈونلڈ میں چاروں بچے میرے ساتھ کھڑے تھے۔ کاؤنٹر پر موجود نوجوان لڑکے نے مسکرا کر پوچھا، ’’سب تمھارے بچے ہیں؟‘‘

’’ہاں، پلیز بچوں کو ذرا ان کی مرضی کے مینو دے دو۔‘‘

اُسامہ نے مچھلی کا آرڈر دیا۔ باقی تینوں نے برگر لیے۔ اس نوجوان نے پھر مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھا اور پیشہ ورانہ بشاشت سے بولا، ’’یہ سارے فرشتے تمھارے نہیں ہوسکتے۔‘‘

’’اچھا، چلو فرشتے میرے ساتھ تو ہیں ناں؟‘‘ میں نے بھی خوش دلی سے جواب دیا۔

چونکہ گلاس دوبارہ بھرنے کی سہولت مفت دستیاب تھی سو بچے دیر تک وہاں بیٹھے کولڈ ڈرنکس بار بار بھر کر پیتے رہے۔ ان کے ہنسنے بولنے کی آوازیں بہت سکون بخش تھیں۔ میمی بھی اب ان سے گپ شپ لگا رہی تھی۔ چونکہ مئی کے مہینے کی آخری راتیں تھیں اور اندھیرا تو ہوتا نہیں تھا سو ہم بے فکری سے ساڑھے دس بجے تک بیٹھے رہے۔ مجھے آج ان کے چہرے دیکھ کر تسلی ہوئی تھی۔ وہ قدرے مطمئن تھے۔ اگرچہ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ پریشان ہیں۔ میمی کا طرزِ عمل بہت اجنبی تھا۔ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا، ’’میری جنگجو لڑکی! مجھ سے بھی کوئی بات کرو۔‘‘

’’اچھا‘‘ اس نے سر موڑ کر کہا، ’’میں ذرا ٹیکوانڈو کی بات کر رہی ہوں‘‘ یہ اس کا فطری انداز نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ بے حد زندہ دلی سے مجھ سے گپ شپ کرتی لیکن مجھے اب جیسے مسلسل نظر انداز کر رہی تھی جیسے خود کو کوئی بات کرنے سے روکنا چاہتی ہو۔ میں نے مزید بات کرنا مناسب نہ

سمجھی لیکن لاشعوری طور پر میری نظریں اور سماعت ان کی طرف تھی۔

''تم کتنے خوش قسمت ہو'' بڑے بھائی نے کہا، جو نسبتاً کم گو تھا، ''تمھاری امی کتنی اچھی ہیں۔''

''توبہ کرو'' میرے بیٹے نے گلاس میں زور زور سے سٹرا گھمایا، ''جب ہمیں اردو پڑھانے بیٹھتی ہیں تو ایک نہیں سنتیں۔ پابندیاں لگاتی ہیں۔ ہر کام گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ۔ ہم تو گھنٹے سے زیادہ ٹی وی بھی نہیں دیکھ سکتے۔''

''ہاں لیکن تمھیں پیار بھی تو بہت کرتی ہیں؟'' منجھلے نے کہا۔

میمی خلافِ معمول چپ تھی۔ اس وقت تک میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ ہمارا آخری کھانا تھا (The Last Supper)۔ وہ جمعے کی رات تھی۔ جمعے کی رات کو مجھے امتحان سے پہلے کی تیاری کرنا تھی۔ میں نے شام کا کھانا بنا کر بچوں کو کھلایا اور جلدی جلدی بیگ میں کتابیں ٹھونسیں۔ بچوں کو حسبِ عادت ہدایات دیں اور پارکنگ کی طرف بھاگی کیونکہ وقت کی پابندی گروپ ورک میں بہت ضروری تھی۔ ہم دو لوگ مل کر مرغی کے بارے میں پروجیکٹ بنا رہے تھے۔ جلد کے ساتھ ہو تو کتنے حرارے، جلد کے بغیر ہو تو حراروں میں کتنی کمی ہو گی؛ گلنے کا وقت، گوشت کی خصوصیت، پکوان کی رنگا رنگی، فارمی مرغی کی پرورش کے مسائل، دیسی مرغی کا صحت پر اثر، ولایتی انڈے اور دیسی انڈوں کا فرق، غرضیکہ ہزاروں باتیں تھیں۔ مجھے مرغی بھی حلال خریدنا تھی۔ تیزی سے پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں سیٹا ملا۔ وہ پارکنگ سے چلتا ہوا گھر کی طرف آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی رک گیا، ''تمھیں پتہ ہے ناں میرے بچے پولیس لے گئی ہے؟'' اس نے تقریباً روتے ہوئے بے بسی سے فریاد کے انداز سے کہا۔ ''ان کی ماں بھی بھاگ گئی ہے۔''

''سیٹا!'' میں نے اسے بہت تحمل سے سمجھانے کی کوشش کی، ''مجھے بے انتہا اذیت ہوتی ہے یہ بات سوچ کر، لیکن میں کیا کہوں؟''

''تم میری بات سن سکتی ہو؟ صرف پانچ منٹ؟ میں آج بچوں کو گھر لے آؤں گا ویک اینڈ کے لیے۔''

میں نے دروازہ کھول کر بیگ پچھلی سیٹ پر پھینکا، ''آج نہیں، مجھے پہلے ہی تاخیر ہو گئی ہے۔ کل آرام سے بات کریں گے بلکہ بچوں کو کھانے پر ہماری طرف بھیج دینا۔'' میں نے چابی گھمائی۔

''پلیز پانچ منٹ'' اس نے شیشے پر دستک دی، ''میری بات سن لو ذرا۔ میں پھر بچوں کو لینے جا رہا ہوں۔'' میں نے شیشہ نیچے کیا۔ اس کے تاریک چہرے پر عجیب بے بسی رینگ رہی تھی۔

''کہا ناں، کل چھٹی ہے، آرام سے بات کریں گے۔'' پتہ نہیں کیوں مجھے اس سے غیر اختیاری سا خوف محسوس ہوا۔ کوئی بات مجھے مشکوک کر رہی تھی یا شاید چھٹی حس متنبہ کر رہی تھی۔ میں نے شیشہ اوپر چڑھایا اور اسے ہاتھ ہلا کر چل دی۔

کلاس میں پہنچ کر پہلے تو لیکچر سنا اور پھر گھڑی سامنے رکھ کر دو گھنٹے کے اندر امتحان کے کھانے بنانے کی مشق کی۔ کمپیوٹر کی سلائیڈ کے تکنیکی کام کرتے ہوئے وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ رات کو دیر سے واپسی ہوئی۔ سیٹا کا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ شاید بچوں کو نہیں لایا تھا۔ اس کی گاڑی تو باہر کھڑی تھی۔ میمی کے کمرے میں بھی تاریکی تھی۔ بچوں کا سوچ کر ایک شدید زخمی سا احساس پیدا ہوا جیسے کوئی فلم چل رہی ہو اور کسی دردناک موڑ پر بجلی بند ہو گئی ہو۔

میں نے اپنے گھر کے باہر رنگ برنگے ٹیولپ لگائے تھے اور پاکستان سے موتیا بھی منگوایا تھا جو گرمیوں میں باہر لگاتی اور سردیوں میں اندر لے آتی۔ دروازے کے باہر کھڑے ہو کر میں نے اس کے گھر کا جائزہ لیا۔ موسم میں معمول کی ہلکی سی خنکی تھی اور سبزے کی نیم خوابیدہ خوشبو رینگ رہی تھی۔ مجھے گھر کے معمول کے کام ختم کرتے دیر ہو گئی۔ بستر پر پڑ گئی تو سیٹا کے مسئلے کا سوچنے لگی۔ دھیان بھٹک گیا۔ معلوم نہیں کب میری آنکھ لگ گئی۔

میری نیند اس معاملے میں بہت عجیب ہے کہ میں نے کبھی الارم نہیں لگایا۔ جب اٹھنا چاہوں اتنے بجے خود ہی آنکھ کھل جاتی ہے۔ فجر کی نماز صبح تین بجے ہوتی تھی۔ تین بجے ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ الیکٹرانک گھڑی کی لال آنکھ مجھے گھور رہی تھی۔ چند ثانیے مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کہ میری آنکھ ایسے کیوں کھلی ہے؟ پھر ایک عجیب سا بھیانک شور کانوں سے ٹکرایا جیسے بدروحیں مل کر چیخ رہی ہوں۔ شاید کوئی باہر ہنگامہ کر رہا ہے؟ میرے نیم خوابیدہ ذہن نے اس شور کی توجیہہ پیش کی۔ لیکن اس علاقے میں تو بڑی سڑک ہے ہی نہیں۔ پھر یہاں کوئی بدمست ہو کر ایسے کیونکر پھر سکتا ہے؟ میکانکی انداز میں اٹھ کر میں نے دروازہ کھولا اور بالکونی میں آئی۔ اب مجھے ادراک ہوا کہ ساتھ والے گھر میں سارے بچے چیخیں مار رہے تھے۔ ''نائے فا، نائے فا'' نو فادر، نو فادر، سائمن کی کربناک چیخیں تلوار سونتے حملہ آور ہو گئیں۔

''ہیلپ۔ مدد، مدد'' میمی کی ہذیانی آواز سر کٹے بھوت کی طرح چکراتی ہوئی باہر آئی۔

شاید میں نے چیخ کر انھیں آواز دی تھی، ''سیٹا! کیا کر رہے ہو؟ بچے کیوں چیخ رہے ہیں؟'' جواب میں زوردار دھماکے کے ساتھ ملحقہ بیڈروم کا دروازہ بند ہو گیا۔ میں ابھی حواس باختہ کچھ نہ سمجھنے

کی حالت میں وہیں کھڑی تھی کہ پہلا دھماکہ ہوا اور شعلوں کا دائرہ دیوانہ وار کھڑکی کے راستے باہر کو لپکا۔ شیشے ٹوٹنے کی تڑتڑاہٹ اور دائروں میں زقندیں بھرتے شعلے مجھے ہوش میں لے آئے۔

مجھے نہیں خبر میں نے کیا سوچا، لیکن بجلی کی طرح ساتھ والے کمرے سے میں نے اپنی خوابیدہ بیٹی کو ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ سامنے کمرے سے بوکھلائے ہوئے اُسامہ کا ہاتھ تھاما اور نیچے دوڑ لگا دی۔ گھر سے باہر نکلتے ہی دوسرا دھماکہ ہوا۔ اور جب تک میں نے بچوں کو گھر سے ملحقہ گھاس کے میدان میں کھڑا کیا تو تیسرا دھماکہ ہو چکا تھا۔

یہاں گرمیوں کی راتوں میں گھپ اندھیرا کبھی نہیں ہوتا، بس ایک ملگجا سا اجالا رہتا ہے۔ داغ دار سی روشنی جس میں رات کا ہر لمحہ عجب پراسرار اور دھندلا سا دکھائی دیتا ہے۔ سیٹا کے گھر کے شیشے فضا میں اڑ رہے تھے؛ صوفہ، برتن، نجانے کیا کیا آگے پیچھے لوگوں کے گھروں سے ٹکرا رہا تھا۔ ایک قیامت برپا ہو چکی تھی۔ اکا دکا گھروں میں روشنیاں ہوئیں۔ میں نے دیوانہ وار ساتھ والے گھر میں دوڑ لگائی۔ ان کا بچہ بہت چھوٹا تھا۔ میں دروازے کی اطلاعی گھنٹی دباتی چلی گئی۔

''دروازہ کھولو، جلدی باہر نکلو'' خدا جانے میں کیا کہے چلی جا رہی تھی۔

ذرا سی دیر میں پورا محلہ باہر جمع ہو چکا تھا۔ ایمبولینس اور فائر بریگیڈ کا شور، لوگ چیخ پکار کر رہے تھے۔ محلے میں ایک پاکستانی فیملی بھی تھی۔ ان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دونوں بچوں کو وہاں پہنچایا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میرے بچے محفوظ ہیں تو پھر مجھے اپنا ہوش آیا۔ اچانک احساس ہوا کہ میرے پیروں سے خون بہہ رہا تھا۔ شاید کرچیاں چبھ گئی تھیں۔

درد کا احساس وہ آخری چیز تھی جو میں نے محسوس کی تھی۔ اس کے بعد تاریکی کی ایک طویل چادر ہے جس کے پار میں آج بھی نہیں دیکھ سکتی۔ ہوش اور بے ہوشی کے دوران مجھے بازوؤں میں چبھتی سوئی کا احساس ہوتا اور پھر تاریکی چھا جاتی۔

صبحِ صادق کے نوخیز ششدر اجالے میں ہم تینوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہراساں کھڑے تھے۔ میں بہادر نظر آنے کی کوشش میں خود کو تسلیاں دیے جا رہی تھی کہ بس ابھی دن نکل آئے گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دھماکوں کی بھیانک چیخیں اور سیٹا کے گھر کے کھنڈر سے روئی کے گالوں کی طرح اڑتے ہوئے صوفے، سائمن کے جلے ہوئے جوتے، میمی کی ادھ جلی کتابیں، بڑے لڑکوں کے ادھ جلے کھلونے، ماتمی دھوئیں سے سیاہ در و دیوار، اور نجانے کیا کیا جنون زدہ عفریت کی طرح دندناتا پھر رہا تھا۔ یہ بہت دنوں بعد علم ہوا کہ ایک صوفہ اڑ کر آمنے سامنے بنے

گھروں کی درمیانی گزرگاہ کو عبور کرتا سامنے رہنے والے کے گھر کی شیشے کی دیوار سے جا ٹکرایا اور اس کے بعد ایک زوردار دھماکہ جس کے اختتام پر ایک خوفناک چھناکا جس نے گھر کے بیرونی شیشے کی دیوار کو چور چور کر دیا۔

میری ماہرِ نفسیات نے مجھے آہستہ آہستہ بتایا کہ کیسے سیٹا نے پٹرول اور آگ سے دھماکہ کر کے اپنا پورا گھر اڑا دیا تھا۔ اس کے گھر کے دائیں بائیں دونوں گھر خالی کروا لیے گئے ہیں۔ تمھارا گھر بھی اب رہنے کے قابل نہیں رہا۔ جب تک انشورنس نئے گھر کا بندوبست نہیں کرتی تمھیں ہوٹل میں رہنا ہوگا۔

مختلف ہوٹلوں کی رہائشیں اور ایک دوسرے کو حوصلہ دینے کی کوشش میں نڈھال ہوتے ہم تینوں بھیگتی ہوئی شام میں ہوٹل کی لابی میں بیٹھ جاتے۔ سیٹا کا گھر تو خیر کھنڈر بنا ہی تھا مگر اس کے ساتھ ہی آس پاس کے دونوں گھر بھی رہنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ڈنمارک کی تاریخ میں یہ ہولناک واقعہ تھا۔ اخبارات سرخیاں لگا رہے تھے۔ پولیس دو مرتبہ ہوٹل میں مجھ سے بات کرنے آئی تھی لیکن میری یادداشت کے سامنے ایک سیاہ پردہ تھا۔ اسی سیاہی نے مجھے مزید کرب سے بچائے رکھا۔ پولیس افسر نے شاید بچوں کے بارے میں سوال کرنا چاہا جس نے میری بمشکل نارمل ہوتی دھڑکن کو پھر سرپٹ دوڑا دیا۔ ''سوری، ہم دوبارہ زحمت نہیں دیں گے۔'' پولیس پلٹ گئی۔

''امی! اب کیا ہوگا؟ ہم لوگ اب کہاں جائیں گے؟ امی! آپ کب ٹھیک ہوں گی؟''

عالیہ تو چپ چاپ بیٹھی بظاہر ٹی وی دیکھتی رہتی لیکن اُسامہ کے سوالات مجھے اندر ہی اندر دہشت زدہ کرتے رہتے کیونکہ خود مجھے بھی اپنے ضبط کی لڑکھڑاتی دیواروں کا اندازہ ہو چکا تھا۔ جسمانی درد سے میرا ہمیشہ سے دوستانہ تعلق رہا ہے، سو اس کی ٹیس آہ بن کر لبوں تک نہ آتی اور جواباً ہونٹ بھی اس کی وحشت کا تذکرہ نہ کرتے۔ دردکش ادویات میرے بیگ کے کونے میں موجود رہتیں اور باہمی افہام و تفہیم سے کئی سال گزر گئے۔ لیکن اب یہ معاہدے منسوخ ہونے کو تھے۔ اب درد میں ایک لاشعوری خوف کی آمیزش بھی ہو چکی تھی، ناگہانی کا خوف، دائم موجود رہنے والی بے قرار کرتی، خلش بڑھاتی تشویش جس کے ساتھ زود حسی اور کم حوصلگی کا شامل ہونا ناگزیر تھا۔ درد کی گولیوں میں دل کی دھڑکن کو نارمل کرنے اور اعصابی سکون کی ادویات شامل ہو چکی تھیں۔

پتہ نہیں کتنے دن گزر چکے تھے۔ تاریکی کی دبیز چادر اب ہر وقت کے آنسوؤں میں بدل گئی۔ دکھائی اب بھی کچھ نہیں دیتا تھا۔ پیروں میں شدید درد، اٹھ کر چلنا محال ہو چکا تھا۔

اگرچہ میری سائکارٹرسٹ اور ڈاکٹروں کے ایک پینل نے نہایت اطمینان سے مجھے ذہنی طور پر تیار کر کے بتایا کہ سیٹا اپنے چاروں بچوں کو ساتھ لے کر بہتر جگہ پر چلا گیا ہے لیکن اس کے باوجود معلوم نہیں میری زندگی کے کتنے دن اندھیروں کی نذر ہو گئے اور کتنی راتیں نیند کی دوا کھانے کے باوجود جاگتے اور روتے گزریں۔

مجھے جب ہوش آتا تو میں ہائے ابا جی ہائے ابا جی پکارتی۔ ایک ہی بات کرتی کہ بس کہیں سے ابا جی آ جائیں، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس وہ کہیں سے ان بچوں کو واپس لے آئیں گے جن کے بدن کا سونا کوئلے میں تبدیل ہو گیا تھا۔

کیلنڈر کے مطابق ایک مہینے کے بعد مجھے آہستہ آہستہ سانس لینے کی سہولت ہوئی۔ پھر دل کی دھڑکن نارمل ہوئی۔ پھر تین بجے کے بعد چند گھنٹے نیند آنا شروع ہوئی۔ آج بھی تین بجے تک میں ساری دنیا کو سنبھالے رہتی ہوں کہ مبادا میں نے پلک جھپک لی تو کوئی حادثہ ہو جائے گا۔ خوف کے ناگ ذہن میں پھن پھیلائے پھرتے۔ ہوٹل سے ایک گھر، پھر وہاں سے دوسرے گھر، ایک ہسپتال سے دوسرے ہسپتال میں، ایک ماہرِ نفسیات سے دوسرے تک، ایک دوا سے دوسری دوا، بالآخر دماغ نے تسلیم کر لیا کہ قیامت آئی ضرور تھی مگر اب نئی زندگی ہے جس میں میرے بچوں کو میری ضرورت ہے۔ یکم جون سے چوبیس جولائی کے اس مہیب دن تک ہر روز دلِ وحشی کو سمجھاتے گزر جاتا کہ اب مجھے ان بچوں کی خاطر اٹھنا ہے۔ وقت نے مجھے دکھا دیا تھا کہ اس قیامت کے بعد میرے علاوہ ان کا کوئی نہیں تھا۔

اگرچہ ادویات، ماہرِ نفسیات اور مسلسل خود کو سمجھانے کی تھراپی کے بعد میری طبیعت بہت سنبھل چکی تھی، بظاہر میں سارے کام بھی انجام دیتی، لیکن اکثر جب کسی ملنے والے سے بات کرنا چاہتی تو اچانک کوئی کہیں سے بڑا سا نقاب پہن کر بالکل میرے سامنے کھڑا ہو جاتا اور ہر چیز دھندلا جاتی۔ میں ذہنی الجھن کا شکار ہو جاتی کہ میں نے اس مخاطب کو کہیں نہ کہیں دیکھا ضرور ہے مگر اس کا نام کیا ہے، یہ معلوم نہیں۔ کچھ لکھنا چاہتی لیکن لکھ نہ پاتی۔ الفاظ اجنبی ہو جاتے۔ سب سے زیادہ خوف زدہ کرنے والا احساس تو لگاتار مکمل بات نہ کر پانے کا تھا۔ ڈینش زبان مجھے کلی طور پر بھول گئی اور اردو کے الفاظ بھی ذہن میں تو گھومتے لیکن مناسب وقت پر موزوں الفاظ زبان پر نہ آتے۔ ایک عجب دل اور ذہن کو سہاتی ہوئی بے بسی سے میں ذہن میں کالے دائروں کی صورت چکراتے الفاظ کو قابو کرنے کی کوشش کرتی۔ یوں لگتا جیسے اللہ نے جو کچھ دیا تھا وہ فرداً فرداً واپس لے

رہا ہے۔ گاڑی چلانا بھی ناممکن ہوگئی۔

راستے اجنبی، نام اجنبی، چہرے اجنبی اور الفاظ سب کے سب کسی تیز رفتار تیر کی طرح کمان کی جکڑ سے بھاگ نکلے تھے۔ کہیں زور سے کوئی گھر کا یا گاڑی کا دروازہ بند کرتا تو مجھے اس بھیانک صبحِ صادق کا جھٹپٹا یاد آجاتا جب میرے چیخ کر پکارنے پر سیٹا نے ٹھاہ کرکے دروازہ پٹخ دیا تھا۔ بند ہوتے دروازے کا شور میرا سانس بند کرنے لگتا اور میرا تنفس کا نظام بگڑ جاتا اور پوری طاقت لگا کر سانس لینا پڑتا۔

ایک دن بچے مجھے قریبی سنٹر میں لے گئے۔ خوب رونق تھی۔ بچے غبارے لیے گھوم رہے تھے۔ ''امی آپ یہاں بنچ پر بیٹھ جائیں۔ میں آپ کے لیے آئسکریم لاتی ہوں'' عالیہ نے مجھے ایک بنچ تک پہنچا دیا۔ دفعتہً عین میری کمر کے پیچھے ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ میں نے غیر اختیاری طور پر چیخنا شروع کر دیا، ''بھاگو، سب بھاگ جاؤ، سب جل جاؤ گے۔''

پھر زمین و آسمان کے درمیان آگ کا الاؤ روشن ہوگیا۔ بچوں کی بین کرتی آوازیں، دھماکے سے بند ہوتا دروازہ، دم گھٹنے کا شدید احساس اور نظامِ تنفس نے پھر کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اور پھر ایک روز میری آنکھ ہسپتال میں کھلی۔ کسی بچے کے غبارہ پھٹنے کے معمولی شور نے مجھے اسی کربناک صبح میں دھکیل دیا۔ کئی مہینوں ایسے واقعات میرے تعاقب میں سر کٹے بھوتوں کی طرح چلتے رہے۔ مجھے خود اپنی ذات ایک تماشے کی طرح محسوس ہوتی۔ کبھی ٹرین کے گزرنے سے دہشت زدہ، کبھی کسی کے اونچا بولنے سے ہراساں، ذرا سی بلند آواز سے دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح چرمرانے لگتا۔

میرا شعور ایسے واقعات کو دوہرانا نہیں چاہتا۔ میں اقساط میں ایک جملہ لکھتی ہوں۔ مجھے دکھائی بھی کچھ نہیں دیتا۔ بس کٹہرے میں کھڑا اپنا وجود دکھائی دیتا ہے۔ اس رات اگر میں رک جاتی، اگر میں اس کی بات سن لیتی، میں یقیناً اسے قائل کر لیتی کہ زندگی بہت قیمتی چیز ہے۔ دراصل سارا قصور ہی میرا تھا۔ مجھے اپنے امتحان اپنی تعلیم اور اپنے کیریئر کی فکر پڑی تھی، میں نے ان معصوم بچوں کی خبر نہیں لی۔ میں نے سننا ہی نہیں چاہا کہ ان کا باپ کیا کہنا چاہتا تھا۔ میں رک جاتی تو مجھے اس کے ارادے کا اندازہ ہوجاتا۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم میں پولیس کو ہی فون کر دیتی۔

سائکاٹرسٹ نے مجھے جی بھر کر رونے دیا۔ پھر اس نے ٹشو پیپر میری طرف بڑھایا، ''ایسے لوگ جب تہیہ کر لیتے ہیں کہ اب ان کو چلے جانا ہے تو ان کو آہنی زنجیریں بھی نہیں روک سکتیں۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ تمھاری بات اسے روک لیتی؟''

بچوں کو انھوں نے بالخصوص سمجھایا تھا کہ اپنی ماں کو گھر سے نکالا کرو۔ میں چلتے چلتے راستہ بھول جاتی۔ دیر تک یاد ہی نہ آتا کہ کہاں جانا ہے۔ بلا کی یادداشت رکھنے پر تایا جان مجھے بلی کہا کرتے تھے، لیکن اب یہ حالت تھی کہ میں اپنے گھر کا دروازہ پہچاننے سے بھی قاصر تھی۔

لیکن میرا گھر تھا ہی کہاں؟ مجھے تو شاید چار دیواروں اور ایک چھت نما پنجرے میں زبردستی کا قیام کرنا تھا۔ دنیا داری نبھانا تھی۔ میری بھوک پیاس کا احساس ختم ہو چکا تھا اور وزن تشویش ناک تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ میرے ڈاکٹرز کو بڑی اچھی طرح اندازہ تھا کہ مجھے تسلی دینے اور سنبھالنے کے لیے میرے بچوں کا اور ابا جی کا کارڈ چلے گا۔ ان کو استعمال کریں گے تو میں اٹھ کھڑی ہوں گی۔

''دیکھو بہادر لڑکی! تم ٹھیک ہو گی تو بچے سنبھلیں گے۔ پھر تم مل کر اپنے وطن جانا اور اپنے والدین سے ملنا۔ ان کو دیکھ کر تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

''اچھا'' میں حوصلے کی کترنیں جوڑنے لگتی۔ لیکن خوف تو جیسے میرے خون میں دوڑنے لگا تھا۔ پھر 24 جولائی تک میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ بچے میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے کر جاتے، ہر ممکن بہلانے کی کوشش کرتے۔ باقاعدگی سے دوا کھاتی اور ہر رات کو سونے کی کوششیں کرتے ہوئے خود کو سمجھاتی کہ میں بہت بہادر ہوں۔

پھر اچانک یہ بھیانک دن آ گیا جس کی وضاحت کے لیے مجھے سیٹا والا واقعہ بیان کرنا پڑا اور جس کی طویل کالی رات میں ایک لمحے کے لیے میری آنکھ نہیں لگ پائی حالانکہ میں اپنی ذات کے ساتھ مکالمہ کرتی رہی کہ میں آخر کس چیز سے خوفزدہ ہوں؟ جو ہو چکا ہے اب اس سے برا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اب تو طبیعت سنبھلنے کے دن ہیں اور بچوں کی خاطر زندگی کے باقی سارے کام بھی تو چل ہی رہے ہیں۔ شاید یہی نظامِ دنیا ہے کہ نہ تو یہ زندگی رعایت دیتی ہے اور نہ ہی آپ سے منسلک خود غرض لوگ کسی لحاظ یا رعایت کے قائل ہوتے ہیں، تو پھر یہ غم اور خوف لے کر بستر میں چھپنے سے کیا ہوگا؟

اس دن میں نے کوشش کی کہ کسی طرح اٹھ کر سورۃ یاسین پڑھوں لیکن بستر سے اٹھتے ہی شدید چکر اور ابکائیاں آنے لگتیں۔ میں نے بچوں سے کہا کہ میرے پاس بیٹھیں اور بس باتیں کریں۔ میرا دل ڈوب رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ دل چلتے چلتے رک جاتا۔ یااللہ اب اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا؟ لوگ موسمِ گرما کے لباس پہنے گھوم رہے تھے اور میں رضائی لپیٹے دھوپ میں لیٹی تھی۔ دس سے چار بجے تک عجیب تڑپ تھی۔ ٹھنڈے پسینے سر سے پاؤں تک بھگو دیتے اور

ماتھا صاف کرنے کے لیے ہاتھ ہلانا دشوار تھا۔ دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ سانس لینے میں دوبارہ دقت ہونے لگی۔ یااللہ جو ہونا ہے ہوجائے، بس تو مجھے میرے قدموں پر کھڑا کر دے۔ آنسوؤں کی دھند نے سب کچھ تاریک کر دیا تھا۔ میری بیٹی خاموشی سے میرے پاس بیٹھی جو اسے سمجھ آتا کرنے کی کوشش کرتی۔ کبھی سر دباتی، کبھی پانی لاکر پاس رکھتی۔

چار بجے بیرونی دروازے پر بیل ہوئی تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

''عالیہ!'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، ''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''امی کیا ہوگیا ہے؟'' اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا، ''آپ تو بہت بہادر ہیں۔'' لیکن میرے دل کو قرار نہیں آ رہا تھا۔

''امی پھوپھو آئی ہیں، ساتھ میں چاچو بھی ہیں۔'' میرے بیٹے نے اطلاع دی۔

میری گھبراہٹ نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اور پھر خیالوں میں آنے والی خون میں لتھڑی اور کفن میں لپٹی لاش نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ میرے بھائی کا کار کے حادثے میں انتقال ہو چکا تھا۔ ٹھیک اس وقت جب یہاں دن کے دس بجے تھے، میرے ماں جائے نے وہاں آخری سانسیں لیں تھیں اور سڑک کے ایک پیاسے کونے میں اس کا لہو جذب ہوتا رہا۔ کہتے ہیں جب اسے قبر میں اتارا گیا تو سفید چادر سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ میرا دلارا ویر جس نے کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی، خاموشی سے سب کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

ابھی کل کی بات تھی وہ مجھے فون پر بتا رہے تھے کہ اللہ جن لوگوں کو آزمائش و ابتلا کے لیے چنتا ہے وہ عام لوگ نہیں بلکہ آہنی اعصاب کے مالک ہوتے ہیں اور امتحان کی آگ ان کے لیے گلزار ہو جاتی ہے۔

کبھی کہتے، ''کیسی ماں ہو تم جسے بچے سنبھال رہے ہیں؟ ماں تو عرشِ الٰہی ہلا دیتی ہے اور تم ہو کہ زمین پر مضبوطی سے کھڑی نہیں ہو سکتیں۔ چلو شاباش اٹھ جاؤ۔ مکان کا کیا ہے اور بن جائے گا۔ جن بچوں کی قسمت میں ایسے ہی دنیا سے جانا تھا آپ ان کو کیسے روک سکتی تھیں؟''

میں ان کی بات سن کر خود کو سنبھالنے لگتی۔ ہر روز پاکستان سے کسی نہ کسی کا فون آجاتا اور ڈھارس بندھنے لگتی۔ بالآخر جب میرے شعور نے جلتے مکان کے دھماکوں اور شعلوں کو قبول کر لیا تو یکم جون کے بعد چوبیس جولائی کا یہ کربناک دن میرے سامنے آرکا تھا۔

مجھے پھر لوڈو کے کھیل میں سیڑھی چڑھتے ہی سانپ نے ڈس لیا۔ میری حالت پھر اسی

ابتدائی نقطے پر جا کھڑی ہوئی۔ میری ماں کی حوصلہ مند آواز بھی شکستہ ہوگئی۔

''میں نے کہا تھا اسے مت بتانا، منع کیا تھا کہ زخم پر مزید زخم نہ لگاؤ، ابھی ٹھہر جاؤ، اسے انجان ہی رہنے دو، مگر میری کوئی نہیں سنتا۔''

میری ماں کو کیا خبر تھی کہ میرے ماں جائے کے خون کے قطرے مجھے میرے بستر کی براق چادر پر دکھا دیے گئے تھے۔ کوئی نہ بھی بتاتا تو میرا ڈوبتا دل اور اکھڑتے سانس پیشین گوئی کر چکے تھے کہ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ لٹ چکا ہے۔

ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ عزیز بھائی فون پر کہہ رہے تھے کہ میری پیاری بہن تم بہت بہادر ہو۔ زندگی کا کوئی سانحہ بھی بلاوجہ نہیں ہوتا۔ یہ دھچکے مضبوطی کی طرف دھکیلتے ہیں۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ ہم جس ہوٹل میں قیام پذیر تھے وہاں کے نمبر پر بھائی کا فون آیا تھا۔ ہم تینوں فون کے گرد یوں بیٹھے تھے جیسے وہ فون سے باہر نکل آئیں گے۔

''امی عزیز ماموں کا فون ہے'' میں ہوٹل کی لابی میں بیٹھی تھی کہ میری بیٹی نے اطلاع دی۔ ان دنوں ہمارے گھر پہلی بھتیجی ماہ نور نے قدم رکھا تھا۔ سب بھائیوں گے گھر بیٹے ہی تھے اور اٹھارہ سالوں میں تین بھائیوں کے گھر سات بھتیجوں کے بعد ماہ نور کی آمد ہوئی تھی اور بھائی اسی کو دیکھنے آئے ہوئے تھے اور ہم سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

چند منٹ کی بات میں وہ اپنے مدھم اور دھیمے لہجے میں یہی سمجھاتے رہے کہ آپ سب سلامت ہیں، یہی اللہ کا سب سے بڑا کرم ہے۔ ان حادثات کو نئے امکانات کی طرح دیکھنا چاہیے۔ تعمیرِ نو کا حوصلہ خدا خود عطا فرما دیتا ہے۔ بس آپ نے یہ نہیں بھولنا کہ آپ ایک ماں ہیں جو مجازی خالق کی طرح ہمت اور حوصلہ دیتی ہے۔ بھائی نے یہ بھی کہا تھا، ''آپ کے صبر و حوصلے کی تو سب مثال دیتے ہیں۔''

میں جی جی کرتی رہی۔ مجھے اپنے قلانچیں بھرتے بے فکر بچپن کی یاد آنے لگی۔ عزیز بھائی تعلیم کے سلسلے میں ہمیشہ گھر سے باہر رہے۔ جب کبھی آتے تو عید کا سماں ہوتا۔

ایک نظم جو مجھے ذاتی طور پر بے حد پسند ہے اور جسے ابا جی اور تایا جان مل کر پڑھا کرتے تھے، وہ ''محاورہ مابین بندہ و خدا'' ہے۔ عزیز بھائی جب بھی اسلام آباد سے گھر آتے ہم دونوں مل کر اسے پڑھتے۔ اگرچہ وہ عربی زبان روانی سے بول سکتے تھے اور پھر حافظِ قرآن ہونے اور اسلام آباد کے نمایاں ترین ایل ایل ایم، قانون دان کی حیثیت سے جانتے تھے کہ کب کس طرح

میری شرارتوں کو زیر کرنا ہے۔

پیر و مرید میں عزیز بھائی رومی کے مکالمے والا حصہ اٹھا لیتے اور میں اقبال کا حصہ سامنے رکھ لیتی۔ پھر مکالمہ شروع ہو جاتا۔ مجھے اپنے مکالمے بے حد پسند تھے۔

''تو شب آفریدی چراغ آفریدم''

پھر میں ترجمہ کرتی،

''بنائی رات تو نے تھی، دیا میں نے بنا ڈالا''

عزیز بھائی کہتے تم انسان کے کہے اشعار پڑھو کیونکہ یہ تمھیں ہی زیب دیتے ہیں کہ ہر بات کے انکار اور توڑ جوڑ میں لگی رہتی ہو۔

ابا جی اکثر منصف کے فرائض انجام دیتے اور میں بضد رہتی میں نے بھائی لوگوں سے اچھا پڑھا ہے۔ مجھے زبانی یاد ہے وہ اوپر سے دیکھ کر پڑھتے ہیں۔ میرے دلائل ان کی وکالت کو ہرا دیتے یا شاید ان کی محبت خود ہار کر مجھے جیتنے کا راستہ دے دیتی۔

عزیز بھائی نے شادی کے بعد بڑے کمرے میں دیوار کے ساتھ لمبی خوبصورت الماری بنوائی اور اس کے دروازے باہر کو کھلنے کی بجائے سلائیڈ کی طرح آگے پیچھے ہوتے۔ شفاف شیشے کے عقب سے کتابیں جھانک رہی تھیں۔ میں نے فوراً شیشے کے پٹ کھولنے کی کوشش کی لیکن ان کے درمیان مخفی کیمرے کی طرح چھپا ننھا سا تالہ میرا منہ چڑانے لگا۔

''مجھے پہلے ہی پتہ تھا'' عزیز بھائی بولے۔ اور کوئی میری کتابیں چھیڑے نہ چھیڑے تم ضرور چوری کرو گی۔ میں نے بندوبست کر رکھا ہے۔

کبھی عالیہ ہسپتال آتی تو عزیز ماموں کی کوئی نہ کوئی بات یاد کرتی۔

''امی جی یاد ہے ماموں ہم سے کرکٹ کھیلتے تھے اور جان بوجھ کر آہستہ دوڑتے تھے کہ ہم ان سے جیت جائیں۔

امی جی یاد ہے ماموں آپ کے لانگ ڈریس کا مذاق کرتے تھے اور آپ کو مائی کہتے تھے۔ امی جی یاد ہے ماموں آپ کے لیے شال لائے تھے۔''

میں اس کے متفکر چہرے کو دیکھتی رہتی پھر خود کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتی۔ ماہِ اگست کے ابتدائی دن تھے۔ میں روز کیلنڈر دیکھتی۔ یا اللہ! ذرا وقت کی رفتار تیز کر دے۔ یہ پہاڑ جیسے لمحے روئی بنا کر اڑا دے۔ تو کن فیکون کا مالک ہے، کوئی معجزہ دکھا دے اور غموں کی یہ کالی راتیں ایک دم

ڈھل جائیں۔ وقت کا شرارتی بچہ کسی اڑن کھٹولے پر سوار ہوکر کسی نامعلوم جزیرے پر جا اترے جہاں کسی کو خودکشی کا خیال نہ آتا ہو، جہاں کسی کی گاڑی کسی چپ چاپ رستے میں بچھی ناگن سی سڑک کے کنارے نہ الٹتی ہو، جہاں کسی کے بچے راتوں کو خوفزدہ ہوکر ماں کی آغوش نہ ڈھونڈتے ہوں، دردکش ادویات کے مسکن سہارے کچھ نہ بگاڑ سکتے ہوں۔

ہسپتال کی سفید دیواریں کفن جیسی ہی لگتی ہیں۔ زندگی کا پنڈولم یقین و بے یقینی کے درمیان لرزتا رہتا۔ دل کی دھڑکن ڈوبنے لگتی اور سانس اکھڑنے لگتی۔ سانس لینے کے لیے کوشش کرنا پڑتی۔ ڈاکٹروں نے اپنی تسلی کے لیے ہسپتال میں داخل کرلیا۔ پیٹ کے ایکسریز ہوتے، گلوکوز کی بوتل لگتی، خون چیک کیا جاتا اور پھر ادویات بدل دی جاتیں۔ معلوم نہیں کس طرح پیٹ میں کی گئی سرجری میں زخم ہوگئے تھے۔

میں سارا دن خود اپنے ساتھ اور ہسپتال کی تنہائی کے ساتھ برسرِ پیکار رہتی۔ ''یااللہ! تو نے اتنے طویل دن کیوں بنائے ہیں؟'' مجھے لگتا کہ میں سورج کے اس گولے کو پہیے کی طرح دھکیل کر سمندر میں پھینکتی ہوں لیکن چند گھنٹوں کے بعد ہی وہ دوسرے کنارے سے اگ آتا ہے اور سیسفس کی سزا کی طرح یہ عقوبت ہر روز مجھے ازسرِنو سہنا پڑتی ہے۔

موسمِ گرما میں ڈنمارک کے دن بے حد طویل ہوتے ہیں۔ رات کی تاریکی تو بس دھندلکے کی صورت ذرا کی ذرا عروسِ نو کے سے ناز کے ساتھ زمین پر اترتی اور پھر ان لمحات کو رات کا نام دے کر صبح کے اجالے میں مدغم ہوجاتی ہے۔

میرا سانس پھر اکھڑنے لگتا۔ یااللہ! یہ رات اتنی ظالم کیوں ہوتی ہے؟ کمبخت ایک ہی نقطے پر منجمد رہتی ہے۔ چلتی ہی نہیں۔ بس فضول باتیں کرتی ہے۔ یکطرفہ مکالمے سناتی ہے۔ ایسے میں برّی نظامی کی غزل یاد آتی، ''سپاں وانگوں ڈنگدیاں راتاں۔''

میری بیٹی ہسپتال میں مجھے ملنے آئی۔ گھر کی آتشزدگی کے واقعے کے بعد بچے کملا کر رہ گئے تھے۔ ماموں کی ناگہانی موت اور پھر میرے ہوش وحواس کی گمشدگی نے انھیں وقت سے پہلے بزرگ بنا دیا تھا۔ اس کا معصوم سرخ وسفید چہرہ غم، اداسی اور بے یقینی کے کڑے پہرے کی زد میں تھا لیکن وہ کمال حوصلے سے مجھے سمجھانے لگتی۔

''امی آپ فکر مت کریں۔ آپ ٹھیک ہوجائیں گی۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ سانس رکنا اور دم گھٹنا کوئی جسمانی بیماری نہیں۔ یہ شدید غم میں جسم کا ردِعمل ہے۔ پلیز امی نانو سے بات کریں۔

آپ کو سکون ملے گا۔''

لیکن مجھے امی جی سے بات کرتے ہوئے خوف آتا۔ بھائی کا نام لیتے ہوئے ڈر لگتا۔ لوگوں کا تعزیت کے لیے آنا ایک تازیانے کی طرح میری روح پر برستا۔ وہی پرانا گھسا پٹا فسانہ، بہت افسوس، بہت افسوس، بہت افسوس۔ میری سانس پھر ڈوبنے لگتی۔

''مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔ نہ ہی مجھے کسی کی کوئی بات سننی ہے۔ میں خود سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ اب میں خود سے ملنا چاہتی ہوں۔ اب مجھے خود سوچنا ہوگا کہ میں اس بحرِ ظلمات سے باہر کیسے نکلوں۔''

وہ گھنٹوں میرے سامنے بیٹھی میرا منہ دیکھتی رہتی۔ ''امی آپ ٹھیک ہوجائیں گی تو ڈاکٹر آپ کو گھر بھیج دیں گے۔''

''کون سا گھر؟'' میں نے خاموشی سے اسے دیکھا۔ کھڑکی سے جھانکتی ایک کرن اس کے نصف چہرے اور بالوں پر پڑ رہی تھی۔ اس کے ہلکے بھورے دراز بے ترتیب بال سنہری ہو رہے تھے۔ ''میرا بچہ'' مجھے اس پر بے انتہا پیار آیا۔

''میری جان آپ سمجھتی ہوں گی کہ امی نے ہتھیار ڈال دیے ہیں؟ ایسا نہیں ہے میرے بچے۔ مجھے خود کو مجتمع کرنے میں ذرا سا وقت لگ رہا ہے۔'' اس نے مجھے زور سے گلے لگا لیا۔ اپنی اولاد سے ایسی پرجوش اور محبت بھری ہم آغوشی کا لطف اور طلسم صرف وہ لوگ جان سکتے ہیں جنھوں نے یہ لمحہ جیا ہو۔ جیسے کئی ہزار ہارس پاور میرے جسم میں منتقل ہو رہی ہو، جس سے آسودگی تو ہوتی ہے لیکن اس سے بیداری بھی ملتی ہے۔ میں نے اس کا ماتھا چوما۔ وہ شام گئے تک میرے پاس بیٹھی رہی۔ پھر میں نے اسے کہا کہ آپ کو بس (Bus) لے کر گھر جانا ہے۔ روشنی میں ہی چلی جائیں ورنہ مجھے مزید فکر لاحق رہے گی۔ اس نے تابعداری سے سر ہلایا اور بیگ اٹھا کر رخصت ہوگئی۔

''تمھارا دماغ نہیں سوتا جلدی۔ اور اگر سو بھی جائے تو آدھی رات کو بیدار ہو جاتا ہے۔'' شام کو ڈیوٹی پر آنے والا ڈاکٹر کہتا، ''تمھیں خود کوشش کرنی ہے۔'' اس نے ہاتھ کی پشت سے میرے گال مشفقانہ انداز میں تھپکے۔ پھر ہاتھ پر لگی ڈرپ میں کوئی انجکشن ڈالا۔ سامنے میز پر رکھے چارٹ پر کچھ لکھا۔ ''ٹی وی دیکھا کرو'' وہ جاتے جاتے ایک لمحے کے لیے رکا اور مڑ کر بولا، ''اسی لیے تمھارے کمرے میں رکھوایا ہے کہ دھیان بٹے۔ کوئی مسئلہ ہو تو یہ بیل دبا دینا۔ نرس تمھیں آکر دیکھتی رہے گی۔'' اس کی روزمرہ کی ہدایات کا جواب میں نے بھی عادتاً خاموشی سے دیا۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب ابا جی کا ہاتھ مجھے اپنی پیشانی پر محسوس ہوا۔ میں نے بہت واضح طور پر انھیں سورۃ بقرہ کی آخری آیات پڑھتے سنا۔ سارا بچپن، علی الصبح ان آیات کی تلاوت کی آواز سے ہی تو آنکھ کھلتی تھی اور رات سورۃ حشر کی آخری آیات پر ہوتی تھی۔ ابا جی میرے بستر پر ہی جگہ بنا کر بیٹھ گئے۔

''آپ تو میرا بہادر بیٹا ہیں۔ بس اب اٹھ جائیں۔ بہت کام ہیں آپ کے کرنے والے۔''

ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ابھی تک پیشانی پر ان کے ہاتھ کی حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ ان آواز ابھی تک فضا کی لہروں میں مرتعش تھی۔ کوئی مہربان سی خوشبو یہاں وہاں بانہیں پھیلائے ایستادہ تھی۔ میں نے فوراً بتی جلائی۔ میری نظر نے جیسے سارے کمرے کی تلاشی لی۔ کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا کہ میرا دل پھول سا ہلکا ہو گیا۔ جیسے کسی نے غم کی بھاری چٹان آہستہ سے سرکا دی ہو۔ نجانے کس پہر نرس میرے ہاتھ کی نسوں میں پیوست سوئی اتار کر جا چکی تھی۔ میں نے اٹھ کر جوتا پہنا اور کمرے سے ملحقہ غسل خانے میں جا کر وضو کیا اور بڑا تولیہ زمین پر بچھا لیا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے کیا مانگا، کیا کہا اور کیا پڑھا۔

مذہبی چوبداروں کے نزدیک شاید وہ مقبول نماز بھی نہ ہو لیکن مجھے بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے میرا نیا جنم ہوا ہو۔ میں نے شاید زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور بے یقینی، بے صبری اور حالتِ انکار سے نکل کر پہلی دفعہ سارے حادثات کے وقوع کا یقین کیا۔ قیامتیں آ کر گزر چکی تھیں۔ اب میرے لیے کوئی قیامت نہیں تھی۔

میں نے میز پر پڑا کاغذ اٹھایا۔ اس پر ساری تفصیلات درج تھیں۔ حتیٰ کہ میں نے پانی کا جو گلاس پیا اس کا وزن بھی درج تھا۔ میرے ذہن نے واضح طور پر اس نیم وحشی تاریکی کو شکست دے دی تھی۔ کہیں سے سنہری روشنی کا مدھم غبار اٹھا اور میرے خیال اور سوچ کی کلونس چھٹنے لگی۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے کاغذ کی پشت پر لکھنا شروع کر دیا۔ خود کار مشینی انداز میں لکھتی گئی اور پھر سکون سے بتی بجھا کر سو گئی۔ صبح میری آنکھ کھلی تو کمرہ روشنی سے بھرا ہوا تھا۔ میں نجانے کتنی دیر سوتی رہی۔ مجھ سے ملاقات کے لیے آنے والا تو کوئی تھا ہی نہیں کہ تعزیت کرنے والوں کو علم ہی نہیں تھا میں کہاں ہوں۔ انہی دنوں میں نے ڈاکٹروں کو لکھوا دیا تھا کہ میرے ہسپتال کی تفصیلات اور معلومات کسی کو بھی فراہم نہیں کرنیں۔ بچے شام کو فراغت پاتے تو چکر لگاتے اور پریشان ہو کر واپس چلے

جاتے۔ دونوں ابھی چھوٹے تھے اور ڈرائیونگ لائسنس نہیں تھا۔ بس پر آتے جاتے۔ شاید ان کو دیکھ کر بھی مجھے ملال ہوتا رہتا۔

میں نے اس صبح اٹھ کر پہلی دفعہ چائے کی طلب محسوس کی۔ پھر ایک دم میرے ذہن میں جیسے جھماکا ہوا۔ میں نے تو رات کو کچھ لکھا تھا؟ لیکن میز تو خالی پڑی تھی؟ میں نے فوراً بیل بجائی ایک مرتبہ، لیکن کوئی ردِعمل نہیں ہوا۔ صبح کا وقت ہسپتال میں بہت مصروفیت کا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر معمول کا راؤنڈ لیتے، نرسیں مصروف، صفائی کا عملہ اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ میں نے دوبارہ بٹن دبایا۔ پھر تیسری مرتبہ بٹن پر انگلی رکھ دی۔ باہر کوریڈور میں تو جیسے قیامت آ گئی۔ بھاگتے قدموں کی آوازیں ایک دم میرے کمرے میں آ رکیں۔ زرد چہرے کے ساتھ صبح کی ڈیوٹی پر مامور نرسوں کے چہرے نمودار ہوئے۔ پیچھے پیچھے ڈاکٹر آیا۔ یہاں تین مرتبہ بیل کا مطلب انتہائی سنجیدہ اور ہنگامی حالت ہوتی ہے۔

''کیا ہوا، کیا ہوا؟'' نرس نے میری کلائی تھامی۔

''میرا کاغذ'' میں نے بمشکل اپنی بات پوری کی، ''یہاں میز پر پڑا تھا۔''

اب بھاگتے قدموں کا رخ اس کمرے کی جانب تھا جہاں کاغذات تلف کیے جاتے تھے۔ دس منٹ کے بعد میرے ڈاکٹر کا فاتحانہ مسکراتا چہرہ نمودار ہوا اور اس کے ہاتھ میں وہی رات والا کاغذ تھا، ''یہ لو پکڑو۔ کیا جناتی زبان لکھی ہے تم نے اس پر۔''

میں نے کاغذ الٹایا:

گلہ گزار ہو زباں، کبھی نہ یہ خدا کرے
عبادتوں کا ہو زیاں، کبھی نہ یہ خدا کرے
جلے کسی کا آشیاں، کبھی نہ یہ خدا کرے
جدا ہو کوئی راز داں، کبھی نہ یہ خدا کرے
نہ راستوں کے موڑ پر جلائیں بجلیاں کبھی
ہری بھری یہ کشتِ جاں، کبھی نہ یہ خدا کرے
نہ خاک و خون میں ملیں رواں دواں جوانیاں
کسی پہ ٹوٹے آسماں، کبھی نہ یہ خدا کرے
کسی ضعیف کندھے پر اٹھے جنازہ بیٹے کا

لٹے کسی کا کارواں، کبھی نہ یہ خدا کرے
وہ لوریوں کو بھول کر، یا خواب سب سمیٹ کر
کفن سیے کسی کی ماں، کبھی نہ یہ خدا کرے
خود اپنے ہی سہاگ کے لہو سے چنری لال ہو
کسی کی ٹوٹیں چوڑیاں، کبھی نہ یہ خدا کرے
گنوا کے اپنے بھائی کا ہی مان کوئی یوں صدفؔ
مری طرح ہو بے اماں، کبھی نہ یہ خدا کرے

اجاڑیں جن کو یوں صدمے وہ دل بسنے سے ڈرتے ہیں
بتائیں تم کو ماں جائے ہم اب ہنسنے سے ڈرتے ہیں
میرے بابل کے گلشن سے ازل کے ہاتھ نے توڑا
وہی اک گل کہ گلچیں تک بھی جس پہ ناز کرتے ہیں

میں نے مڑا تڑا کاغذ یوں سینے سے لگایا جیسے کسی گم گشتہ خزانے کا نقشہ ہو۔

''بس اب تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' بارہ بجے کھانے کے وقفے کے بعد ڈاکٹر نے آ کر کہا، ''تم ترجمہ کر سکتی ہو کہ تم نے کیا لکھا ہے؟''

''نہیں، آج شاید نہ کر سکوں۔ لیکن یہ میرے بھائی کے بارے میں ہے۔''

''مکان جلنے پر کچھ نہیں لکھا؟''

''میں خود سے نہیں لکھ سکتی۔ بس جب طبیعت ازخود رواں ہوئی تو خود بخود کچھ نہ کچھ لکھا جائے گا۔''

''اچھا، میں انتظار کروں گا۔ بہت حیرت انگیز اور غیر معمولی صلاحیت ہے کہ انسان کس طرح شعر کہتا ہے۔ وہی لفظ ہیں جو ہم روز سنتے ہیں، بس ان کی ترتیب بدل دیتا ہے تو وہ کچھ اور ہی بن جاتے ہیں۔''

''ہاں میں بھی منتظر ہوں کہ کب کچھ لکھا جاتا ہے۔'' میں نے اخلاقاً ہی کہہ دیا حالانکہ ان دنوں میرا جی چاہتا تھا کوئی مجھ سے بات نہ کرے، کوئی سامنے نہ آئے۔ رکے یہ وقت کی گردش، زمیں محور سے ہٹ جائے۔ اگلے دن مجھے گھر بھیج دیا گیا۔

••

ڈاکٹر کی اجازت ملتے ہی میں نے پاکستان کا رخ کیا۔ اسلام آباد ایئر پورٹ پر چھوٹا بھائی حماد کھڑا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے رہے۔ مجھے بس وہ دن یاد آ گئے جب عزیز بھائی اسلامک یونیورسٹی سے ایل ایل ایم کر رہے تھے۔ ان دنوں موبائل فون تو ہوتے نہیں تھے۔

عزیز بھائی نے امی جی کو فون پر کہا، ''اس سے کہیے میں فیصل مسجد کے پاس ملوں گا۔''

ڈیڑھ برس کی عالیہ کی انگلی تھامے، ہم فیصل مسجد کے سائے میں ملے۔ میں نے چادر پیشانی تک کھینچ لی۔ عزیز بھائی نے کبھی تبلیغ جھاڑنے کا فریضہ انجام نہیں دیا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ کبھی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ لیکن کسی بھی حکم نامے کے بغیر ایک جھجک رہتی۔ ایک باوقار رعب تھا جو خود اپنے محاسبے پر آمادہ کرتا۔ ظہر کی اذان ہوئی تو بھائی نماز کے لیے چلے گئے۔

''ماموں، ماموں۔'' عالیہ نے پیچھے سے آواز دی۔

''ابھی آیا''، انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے تسلی دی۔

فیصل مسجد وہیں کھڑی تھی۔ اس کے سائے تلے ملنے کا وعدہ کرنے والا کہیں اور چلا گیا تھا۔ وہی مہربان مشفق مسکراہٹ، ''ابھی آیا''۔

میں نے اپنے خیالات سے چونک کر حماد کو دیکھا،

''بس صرف تم آئے ہو؟''

''کیا کسی اور کے آنے کی توقع تھی آپ کو؟'' اس نے جوابی سوال کیا۔

''نہیں''۔ توقعات رکھنا تو خیر میرا مسئلہ ہی نہیں۔''

گھر کی آتش زدگی کے اعصاب شکن حادثے اور چند ہفتے بعد عزیز بھائی کے روح کُش واقعے کے بعد پاکستان جانا نہ صرف جسمانی اور جذباتی طور پر بہت ہمت طلب اور صبر آزما تھا بلکہ ذہنی طور پر مفلوج کر دینے والا حادثہ تھا۔

میں بچوں کو چھوڑ کر آئی تھی۔ حالانکہ اس سے قبل بھی میں اکیلے آ چکی تھی لیکن ابا جی نے خلافِ عادت سوال اٹھایا، ''اکیلی کیوں آئی ہو؟'' یہ سوال کسی اور پس منظر میں ہوتا تو میرے پاس سو تاویلات موجود تھیں لیکن اس مرتبہ جواب اشکوں نے دیا۔ ابا جی نے متفکر ہو کر مجھے دیکھا۔ بولے کچھ نہیں۔ پھر نجانے کیا سوچ کر چند لمحے کے توقف کے بعد کہا، ''اللہ کی رضا میں راضی رہنا چاہیے۔

جس کی چیز تھی وہ لے گیا۔ لیکن اس حالت میں اکیلے سفر نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

حماد نے بھی یہی سوال پوچھا تو میں نے چڑچڑا ہوکر ڈانٹ دیا۔ وہ چھوٹا تھا، خاموش ہوگیا۔ لیکن گاڑی میں بیٹھ کر اس نے آہستہ سے پھر پوچھا ''باجی کیا کوئی ایسی بات ہے جو میرے علم میں نہیں ہونی چاہیے؟''

''زیادہ وکالت نہ جھاڑو'' میں نے پھر ناراض ہوکر کہا۔

''اپنی حالت دیکھی ہے آپ نے؟ کم از کم بچوں کو ہی ساتھ لے آتیں۔'' وہ متاثر ہوئے بغیر بولا۔

میں نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ گاڑی ائیر پورٹ سے نکلی تو میں اسے کہا کہ ''میں ذرا اسلام آباد فیملی کی طرف جانا چاہتی ہوں۔'' اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

''سیدھا گھر چلتے ہیں باجی، آپ کو آرام کی شدید ضرورت ہے۔ ان کو ائیر پورٹ کا راستہ آتا ہے ناں؟ علم بھی تھا ناں کہ آپ اتنے ہولناک حادثے کے بعد تنہا آرہی ہیں۔'' اس نے بڑبڑا کر اپنا احتجاج درج کروایا۔

''گاڑی موڑو'' میں نے ڈرائیور سے کہا۔

''یہ حکم امی جی کا دیا ہوا ہے حماد! حادثات اور بھائی کا غم اسے ترک کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ ابھی امی جی کو کیا جواب دوں گی؟'' وہ خاموش ہوگیا۔ لیکن یہ احساس آج بھی میرے سکون کو زندہ رکھے ہوئے ہے کہ میں نے آدابِ معاشرت کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔

واپسی پر جب گاڑی گھر کے سامنے پہنچی تو آج خلافِ معمول ابا جی سڑک پر منتظر نہیں ملے۔ میرے دل کو دھچکا لگا لیکن ہمیشہ کی طرح 'اے جانئیں بولن دی' کے مصداق میں نے خاموشی کو ہی نگہبان بنایا۔

میں نے اندر قدم رکھا۔ ابا جی اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ ''میرا بیٹا آ گیا۔ بہادر پتر ہے میرا۔'' مجھے ملنے کے لیے ابا جی ہمیشہ اٹھ کر کھڑے ہوجاتے۔ پیشانی چومتے اور اپنے پاس بستر پر جگہ بناتے، ''یہاں بیٹھو۔''

ان کی طبیعت بہت ناساز تھی۔ کمزور سے بازو پر ڈرپ لگی تھی۔ شاید گرمی کی حدت اور ناگہانی غم کی شدت سے وزن بہت کم ہو چکا تھا۔ خیر وزن تو ابا جی کا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ قلتِ طعام اور قلتِ منام ان کا شیوہ تھا۔ اب ضعیف کاندھوں پر جوان بیٹے کا جنازہ اور عمر بھر کی کمائی لٹ جانے کا

غم، لیکن زبان پر شکوے کا ایک حرف تک نہیں۔ چہرے پر بلا کا سکون اور لہجے میں ایسی ٹھنڈک اور مٹھاس جیسے ساری عمر کسی دکھ کی پرچھائیں نہ پڑی ہوں۔

میں دم بخود سوچتی رہی کہ میں ان جیسی کیوں نہیں ہوسکتی۔ میرا جسمانی، ذہنی اور جذباتی ردِعمل کیوں ایسی شدت سے ظاہر ہوا ہے کہ میرے پیاروں کی جان پر بن آئی ہے۔ میری جرات نہیں ہوتی تھی کہ ان کے صابر و شاکر چہرے کی طرف دیکھ سکوں۔ میں گود میں دونوں ہاتھ رکھے ان کو ایسے دیکھتی رہی جیسے آج ہی کلائیوں پر اگے ہوں۔

ابا جی ایک ہی بات دوہرا رہے تھے، ''جان پدر، الحمدللہ علیٰ کل حال۔ اُس کی چیز تھی۔ جب چاہتا لے جاتا۔ شکر کی توفیق مانگو۔ صبر کی دعا کرو اور بس۔ وہ میرا خوددار بیٹا تھا جس نے مختصر عمر میں اپنی ذہانت اور اہلیت کی داد پالی اور بلاوا آیا تو کمان سے چھوٹے تیر کی طرح چل دیا اور بس۔ کل من علیہا فان۔''

اس حادثے کے بعد امی جی سے بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ لاکھ کہتیں، اسے کہو مجھے آواز سنا دے۔ مجھے یوں لگتا اس سارے دکھ اور حادثے کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ کیسے ان سے کہوں کہ اب صبر ہی آخری چارہ ہے۔ جس آغوش کی چھاؤں میں ہم دونوں کھیلے اس کی چھایا تقسیم ہوگئی ہے۔

جب امی جی میری شرارتوں سے تنگ آتیں تو کہتیں، ''عزیز الرحمٰن کو کپڑے بدل کر جس جگہ بٹھا دو وہ خاموشی سے بیٹھ جاتا، نہ رونا، نہ تنگ کرنا۔ اس شطونگڑی کی ہر وقت نگرانی کرنا پڑتی۔ یہ وہاں سے بھی گر جاتی جہاں سے گرنے کا امکان تک نہ ہوتا۔ چلنے کی بہت جلدی تھی اسے۔ نو مہینے کی عمر میں بھاگنے دوڑنے لگی۔''

میں امی جی کی باتیں سن سن کر ناراض ہوتی، ''اب عزیز بھائی دیر سے چلے تو میرا کیا قصور؟ میری سپیڈ کوئی میرے اختیار میں ہے؟ جب عالیہ ساڑھے آٹھ مہینے کی عمر میں چلی اور مجھے اس کے تعاقب میں قدم گننے پڑے تو امی جی سن کر ہنستی تھیں...

''ہن پتہ لگیا ناں؟''

امی جی ہمیشہ بتایا کرتیں، ''میرے عزیز نے ہر کام ساجھ سبھاؤ سے کیا۔ جتنی یہ لڑکی اتھری اور بے امنی تھی اُتنا ہی یہ بیبا بچہ تھا۔'' لیکن یہ بیبا بچہ جاتے جاتے کیسے کیسے دکھ بو گیا تھا کہ امی جی زندگی ہی بدل گئی۔

••

ابا جی کے ساتھ گزرے ایک ایک لمحے کو تصور نجانے کتنی مرتبہ دوہراتا ہے۔ تخیل ان بابرکت لمحات سے نئی اڑان سیکھتا ہے۔ ابا جی کے ساتھ ایک ایسا سفر بھی کرنا پڑا جس کی یاد آج بھی دل چیر جاتی ہے۔

جانے کتنی مرتبہ کمپیوٹر کی سکرین دھندلی ہوئی، جانے کتنی مرتبہ انگلیاں فگار ہوئیں اور جانے کتنی ہی مرتبہ دل میں درد کی تیز لہر نے تباہی مچائی۔ میں جب لکھنے کے لیے قلم اٹھاتی ہوں تو ابا جی کے الفاظ میری سماعتوں میں یوں گونجتے ہیں جیسے ہوا کی لہروں نے انھیں موتیوں کی صورت اپنی ہتھیلی پر اٹھا رکھا ہو اور اب ان کی مالا پرو کر مجھے واپس کر رہی ہو کہ لو اس سے اپنی تحریر کی آرائش کر لو۔

ابا جی اس ڈاکٹر سے ملنا چاہتے تھے جس نے حادثے کے بعد ان کی دیکھ بھال کی۔ شاید پیاسی سڑک کے اس گوشے کو دیکھنا چاہتے تھے جس نے ان کے جگر گوشے کے لہو سے اپنی پیاس بجھائی۔ بھابی عدت میں تھیں۔ حادثے میں ننھے وجیہہ کا بازو ٹوٹ گیا تھا۔ ہمیں ہر صورت ان کے پاس جانا تھا۔

ابا جی کی شفقت کی بے قراری مجھے اب تک یاد ہے۔ بار بار میرے سر پر ہاتھ رکھتے، ماتھا چومتے، ”میرے بچے! بہت فکر تھی پردیس میں اکیلی تھی۔ آزمائش در آزمائش۔ زندگی میں اتنی ذمہ داریوں کے ساتھ اس سانحے کی چوٹ بھی سہنا پڑی میرے بچے کو۔ کیہہ کردا کیہہ کردا دلبر کیہہ کردا۔ بیٹا راضی برضا رہنا ہی ہوتا ہے، جبر سے بھی اور صبر سے بھی۔ تو کیوں نہ صبر اور شکر سے ہی استعانت طلب کی جائے؟“ میرے پاس جواب میں کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

”شکر میرے معبود کا جس نے آپ سے ملا دیا۔ اب مجھے حوصلہ ہو گیا ہے۔ اب میں وجیہہ الرحمٰن کے پاس جاؤں گا۔“

اللہ کسی دشمن پر بھی یہ وقت نہ لائے کہ وہ جواں سال بھائی کے جانے کے بعد اس کے معصوم بچے کو دیکھیں اور اس کی رفیقۂ حیات کے آنسو گنیں۔ مجھے صرف درد کی ایک کیفیت یاد ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ مجھے چھوٹے سے جہاز میں شدید گھٹن ہو رہی تھی۔ فضائی میزبان بہت مہربان تھی۔ بار بار مجھے پانی اور چائے کی پیشکش کرتی رہی۔ لنچ باکس لے کر آئی تو میں نے انکار کر دیا۔ زبردستی پانی کی بوتل لے کر آ گئی، ”میڈم پانی تو پی لیجیے۔“ اس نے اصرار کیا، ”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ کم از کم پانی ہی پی لیں۔“ وہ جو بھی تھی، جہاں بھی ہے، اللہ اسے سلامت رکھے۔

ہم گھر کیسے پہنچے مجھے یاد نہیں۔ ہاں مجھے یہ یاد ہے کہ ابا جی نے جہاز سے ملا لنچ باکس نکال کے وجیہہ کو دیا۔ اس کے معصوم چہرے پر ہنسی کی کرن چمکی، ''دادا ابو! ہم نے گھر میں آپ کا کھانا بنایا ہے۔'' ابا جی تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے زنبیل سے کچھ نہ کچھ نکال کر دیتے اور وہ ایسے ہنستا جیسے بچوں کی بات پر بڑے ہنستے ہیں۔

''دادا ابو! میں یہ نہیں کھاتا۔ میری امی گھر میں کھانا بناتی ہیں۔''

''دادا ابو! یہ تو بے بی والا کھلونا ہے۔'' پھر وہ ہنستے ہوئے بولا، ''یہ تو بہت پہلے بابا نے مجھے لا کر دیا تھا۔''

گھر میں اس کی دیکھ بھال کے لیے جو بچہ رکھا تھا ابا جی کو اس کے لیے بھی تحفہ خریدنا یاد تھا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں عار نہیں کہ ان کی ہمت اور صبر میرے لیے ناقابلِ یقین حد تک قابلِ رشک تھا۔ میرے لیے اس اذیت سے فرار کا آسان ترین راستہ مائیگرین اور لو بلڈ پریشر تھا۔ میں دردکش دوا لے کر بے سدھ پڑ گئی۔ ابا جی بے چینی سے میرے آگے پیچھے پھرتے، اپنے ہاتھ سے دوا کھلاتے، بسم اللہ کہہ کر پانی دیتے۔ اللہ شافی کہہ کر ہومیوپیتھک میٹھی گولیاں اور نجانے کون کون سے خمیرے کھلاتے۔ ''بس ایک چمچہ کھا لو پھر سو جانا۔ یہ خمیرہ یاقوتی جواہر دار ہے۔ پانی میں گھول دیا ہے۔ فوراً اثر کرے گا۔ بس دو گھونٹ پی لو۔''

چینی پر کیمفر چھڑک کر ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو گئے، ''میرا بچہ بس یہ کھا لو ذرا اٹھ کر۔'' اب سوچتی ہوں تو اپنی خودغرضی پر ندامت ہوتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں ان کا خیال رکھتی، کوئی خدمت کر پاتی، الٹا ان کو پریشان کیا۔ رات کو ایک مہربان لمس اپنی پیشانی پر محسوس ہوتا، آہستگی سے نبض چیک کرتے، آیت الکرسی کا حصار کرتے۔ ''سونے کی کوشش کرو۔ نیند بہت سی بیماریوں کا قدرتی علاج ہے۔''

مجھے وہ چند کرب ناک دن یاد نہیں ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی سیاہ چادر سی تنی ہے جس کے پار دیکھنا میرے لیے ممکن نہیں۔ لیکن ایک جانگداز سا احساس ہے کہ ابا جی بہت بلند حوصلگی سے اس آزمائش سے گزرے۔ ایک دن مجھے سمجھانے لگے، ''بیٹا کیا سوچتی رہتی ہو؟ کیوں پریشان ہو؟ اللہ کے احسانات گنو۔ ان لوگوں کا سوچو جن کے پاس کھانے کو بھی کچھ نہیں۔''

میں نے ایک دن ہمت کر کے کہہ ہی دیا، ''ابا جی میں آپ کا سوچتی ہوں اور امی کو دیکھ کر گھبرا جاتی ہوں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' ابا جی میرے پاس بیٹھ گئے۔

''میرے بچے، میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب کسی پر کوئی آفت آئے تو وہ میری طرف دیکھ لے۔ وہ درِ یتیم جو پیدائشی یتیم اور چھ برس کی عمر میں والدہ سے بھی محروم ہو گئے۔ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں دفنایا اور دنیا کو حوصلہ بانٹا۔ خود ترسی سے زیادہ نامراد کوئی چیز نہیں۔ خود کو قائل کرنا سیکھو کہ مجھے بے شمار نعمتوں سے نوازا گیا ہے۔ ان کا حساب کرو تو ناشکری کی نوبت ہی نہ آئے۔''

••

ہر انسان کی زندگی میں ہمیشہ مسائل موجود رہتے ہیں۔ اب وہ ان کو اپنی ذات تک محدود کرتا ہے یا پھر نوشتۂ دیوار بناتا ہے، یہ اس کی شخصیت اور ذہنیت پر منحصر ہے۔ امی جی سے جو واحد چیز مجھے ورثے میں ملی وہ شاید یہی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اپنے مسائل کو آوازۂ خلقِ خدا نہ بننے دیا جائے۔ لیکن اس مرتبہ میرا مزاج، قوتِ برداشت اور تحمل، سب نفسیاتی خوف اور جذباتی ٹراما کی ہوائیں لے گئیں۔ سیٹا کی لگائی آگ اور دھماکوں نے شاید میرے اندر کے خفتہ آتش فشاں کو بیدار کر دیا تھا۔ اب صرف کہیں پر ایک آخری قطرے کے ٹپکنے کی دیر تھی اور خوشی خوشی کا کھیل کھیلنے والی بستی تاراج ہونے کو تھی۔

پاکستان آنے کے چند دن بعد حوصلے کی تڑخی زمین کے نیچے دہکتا لاوا بے قابو ہو گیا۔ بات تو عام سی ہی تھی جو ہمیشہ سن لی جاتی تھی، مطالبے بھی وہی عام سے تھے جو ہمیشہ مان لیے جاتے تھے، حکم نامہ بھی وہی روایتی تھا جس کے نیچے پڑھے بغیر دستخط کرنے کا دستور تھا، لیکن اس مرتبہ مجھے علم تھا کہ کسی بھی ازدواجی زندگی میں جدائی کا موڑ قتل یا خودکشی نہیں ہوتی۔ سو اس شب میں نے حکم نامہ چاک کر دیا اور عرض نامہ لکھنے کے بجائے جوابی حکم نامہ بھجوا دیا۔

اگلی صبح ایک ایسے دھماکے سے ہوئی جو شاید سیٹا کے کیے گئے دھماکے سے بھی شدید تر تھا۔ امی جی حیران پریشان آنے والے مہمانوں سے بات چیت کر رہی تھیں جس کا کوئی سرا اُن کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ بڑے بھائی جان عدالت سے واپسی پر پہلے ابا جی کے پاس آیا کرتے تھے۔ چھوٹی بھابی میرے کمرے میں آئی، ''باجی اُدھر گیسٹ روم میں بٹھایا ہے سب کو۔'' کوئی جواب نہ پا کر کھڑی دیکھتی رہی۔ اسے ہنستی کھیلتی باجی کی عادت تھی جو ان کے بچوں کی طرح ان کو تنگ کرتی تھی۔ بھائی جان میرے پاس بغیر کچھ بولے بیٹھ گئے۔ حماد ان دنوں لاہور ہائی کورٹ میں ہوتا تھا اور عزیز بھائی کے حادثے کی وجہ سے گھر میں موجود تھا۔

آخر میں امی جی اندر آئیں، ''یہاں ہو کیا رہا ہے؟ کوئی مجھے بھی بتائے گا؟''

میرا جی چاہا کہ میں چیخ کر ان کو بتاؤں کہ آپ جو ہر وقت خدمت اور خاموشی کے منتر سکھایا کرتی تھیں وہ ہر جگہ کارگر نہیں ہوتے۔ آپ جو دنیا بھر کی لڑکیوں کے پلو سے گھر داریوں، گول روٹیوں، تحمل، حِلم، صبر اور قناعت کے سکے باندھا کرتی ہیں ناں، آج کی منڈی میں وہ سب سکے بدل چکے۔ نئی کرنسی چل پڑی ہے۔ اصحابِ کہف کے سکے متروک ہو گئے امی۔''

لیکن میں نے ان ہی کی سکھائی چپ کی چادر اوڑھے رکھی۔ وہ میرے پاس بیٹھی تفکر بھری خاموشی سے مجھے دیکھتی رہیں۔ شاید سوچ رہی ہوں گی کہ ہماری تو نسلوں میں کوئی ایسا نہیں تھا، یہ کہاں سے پیدا ہو گئی۔

ابا جی سے مکالمہ کرنے کے لیے مجھے الفاظ کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ان کی طبیعت ناساز تھی، بلڈ پریشر کم ہو چکا تھا اور بے حد نقاہت تھی۔ گھر والوں کی مکمل کوشش یہی تھی کہ انھیں زیادہ سے زیادہ آرام دیا جائے اور کوئی پریشانی والی بات نہ کی جائے لیکن جہاندیدہ ابا جی کو اندازہ ہو گیا کہ ضرور کوئی ایسی بات ہے جو ان سے پوشیدہ رکھی جا رہی ہے۔ میرے کمرے کا دروازہ بڑے کمرے میں کھلتا تھا۔ جب انھوں نے باری باری سب کو میرے کمرے میں آتے دیکھا تو بولے۔

''کیا بات ہے؟ کیوں بیزار کر رہے ہو سب اُسے؟ سونے دو، خود ہی بہتر ہو جائے گی طبیعت۔'' پھر انھوں نے مجھے آواز دی، ''کیا بات ہے بیٹا؟ یہاں میرے پاس آجاؤ۔''

میں نے نہ تو جواب دیا اور نہ ہی اٹھ کر ان کے پاس گئی۔ یہ ایک ایسی ناقابلِ یقین بات تھی کہ چند لمحوں کے بعد وہ اٹھ کر خود میرے پاس آگئے۔ ''مسئلہ کیا ہے؟'' جواب میں کوئی کچھ نہ بولا۔ انھوں نے سب کو کمرے سے باہر نکلنے کا حکم دیا اور میرے پاس بیٹھ گئے۔ ''میرے بچے، ہوا کیا ہے؟'' انھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا

''ابا جی میں واپس نہیں جانا چاہتی۔'' حوصلہ پا کر میں نے اوپر دیکھے بغیر فیصلہ سنا دیا۔ میرے سر پر رکھا ہوا ان کا نحیف ہاتھ ایک لمحے کے لیے لرز گیا مگر دوسرے ہی لمحے مجھ سے کوئی سوال کیے بغیر انھوں نے کہا،

''ٹھیک ہے۔ مگر تم کھانا ضرور کھا لو اور آرام کرو۔''

جاتے ہوئے وہ اپنے پیچھے کواڑ بھیڑ گئے، ''کوئی میری بچی کو تنگ نہ کرے اور اب اگر کوئی بات کرنے آئے تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔ میں دیکھ لوں گا۔''

کتنے برس بیت گئے ہیں لیکن آج جب میں ان کے بارے میں لکھنے بیٹھتی ہوں تو تصور

میں ان کا چہرہ اور سماعت میں من وعن ان کی باتیں گونج رہی ہیں۔ ایک ایک لفظ سنائی دیتا ہے۔
''میرے بیٹے کو اس نے واپس بلا لیا جس کی امانت تھی، تمھارے بھائی کو خود اپنے ہاتھوں کفن بھی دیا اور مٹی کے سپرد بھی کیا، مگر وہ رب کی رضا تھی سو سرِ تسلیم خم ہے'' ابا جی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔
''لیکن دنیا کی کسی طاقت کو ایک لمحے کے لیے یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ میری بیٹی کو زندہ مار دے۔ سالوں نہیں، مہینوں نہیں، ہفتوں نہیں، حتیٰ کہ دنوں تک کی بھی ناجائز پابندیاں لگا کر انسانوں کو غلام بنانا دنیا کے کسی مذہب کی تعلیم نہیں اور اگر کوئی اسے یہ فرسودہ تفسیر دے کر نافذ کرنا چاہے تو اس سے پہلی بغاوت میں کروں گا۔'' شدید غصے میں ان کا نحیف جسم لرز رہا تھا۔

اس لمحے کی اذیت شاید میں خود بھی تا عمر نہ بھلا سکوں۔ وہ وقت ایسی کوئی بات کرنے کا نہیں تھا جس سے ان کو تکلیف پہنچتی مگر کوئی فیصلہ سنانے کا پل بھی وہی تھا۔ ابا جی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا، کوئی اعتراض نہیں، کوئی نصیحت نہیں، کوئی وعظ نہیں، بس میرے سر پر نہایت شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولے، ''میرے بچے! تم خود صاحبِ اولاد ہو۔ خوب سمجھتی ہو کہ صرف اولاد ہی ایک ایسی شے ہے جس کی تکلیف کوئی بھی انسان جیتے جی برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی اولاد کی خاطر وہ سمجھوتے کرتا ہے۔ لیکن صبر میں اور غلامی میں فرق ہے۔ جس اولاد کو ایک فریق بچانے کی کوشش کرے اور دوسرا اُسے عسکری ہتھیار بنا لے اس میں صرف ذہنی مریض پیدا ہوتے ہیں۔ اب مجھے تمھاری طویل بیماری کی وجوہات سمجھ آ گئی ہیں۔ میں نے کیکر پر انگور چڑھا دیا تھا۔ میں نے چھوٹے گملے میں بڑا درخت لگانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اب مجھے ہی اس غلطی کا ازالہ کرنا ہے۔ انسانوں کے سامنے سر جھکانا ظلم ہی نہیں گناہ ہے۔ نہ عمر بھر میں نے سر جھکایا ہے اور نہ ہی تمھیں جھکنے دوں گا۔ عورت کی ذہانت اور اس کی ذات میں موجود خوبیوں کو سراہنے کے لیے اعلیٰ ظرفی کی ضرورت ہوتی ہے، جو شاید کہیں خون میں ملتی ہے تعلیم و ترقی کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ باصلاحیت عورت اگرچہ دیے کی مانند ہے لیکن ہاتھوں میں چراغ لے کر پھرنے سے روشنی نہیں پھیلتی، اسے جلانے اور ہواؤں سے بچانے کا فن آنا چاہیے۔''

مجھے ایسے لگا کہ میں بھائیوں سے جھگڑا کرنے کے بعد ان کے پشت کے پیچھے چھپ گئی ہوں اور اب کوئی بھی مجھے یہاں آ کر نہیں ڈھونڈھ سکے گا۔ بعد میں جو قیامت آنی ہے آتی رہے۔ ابا جی نے کسی کو کوئی سوال، کوئی استفسار، کوئی بات یا اعتراض کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ بس ایک پل میں فیصلہ سنا دیا، ''میری بیٹی کی زندگی اس کی اپنی ہے، کسی اور کی ملکیت نہیں۔ وہ اس کو اپنی اور اپنی

اولاد کی بہتری کے لیے جیسے چاہے گزارے۔ ڈولی سے جنازے تک کی تلقین وہی کرتے ہیں جو بیٹیوں کے صرف جنازے اٹھانے پر یقین رکھتے ہیں۔''

میرے دل کو پھر پچھتاوے کا نیشِ عقرب رہ رہ کر ڈسنے لگا۔ یہ کس غلط موڑ پر آ کر کس بے محل لمحے میں ابا جی تک بات پہنچی۔ کچھ لوگوں کی حیثیت آپ کی زندگی میں ایک صفر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ آپ اپنی قیمت کتنی ہی بڑھا لیں، وہ آپ کو صفر کرتے جائیں گے۔ دل، ذہن سوچ، فکر، ہمت، حوصلہ، قوتِ فیصلہ سب صفر۔ لیکن اب تو کچھ اور کہنے کو تھا ہی نہیں۔ فیصلہ تو ہو چکا تھا، بھلے صفر لاکھ بائیں جانب مقدار بڑھاتا جاتا۔ اب بازی پلٹ دینے کا پل تھا، فیصلے کا پل۔

••

ابا جی کو میں نے ہمیشہ کمزوروں اور مظلوموں کا ساتھ دیتے دیکھا۔ اپنے آرام وسکون کو تج کر لوگوں کے مسائل حل کرتے دیکھا۔ ان کا شعار تھا کہ ہمیشہ مصالحت اور یگانگت کا راستہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتے۔ مجھے اندیشوں کے ہزار سروں والے ناگ خوف زدہ کر رہے تھے۔ ان پر جو دباؤ ڈالا جائے گا مجھے اس کا بھی اندازہ تھا۔ اور ابا جی کے مزاج کے مطابق یہ پریشانی بھی کہ انھوں نے پوری دنیا کی مخالفت مول لینی ہے۔ اگر انھیں خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو پھر کیا ہوگا؟

وہی ہوا۔ خاندان، دوست احباب، حتیٰ کہ بیرونِ ملک سے سفارش نامے آنے لگے۔

''مرزا صاحب، آپ کے خاندان کی بچیوں کی تو ایک زمانہ مثال دیتا ہے۔ گھرانوں کو جوڑ کر رکھتی ہیں، خدمت گزار ہیں۔'' میں آخری سانس تک ابا جی کا جواب نہیں بھلا سکوں گی۔ انھوں نے اپنی نرم اور شفیق آواز میں فیصلہ کن الفاظ میں کہا:

''اب بھی اس خاندان کی بچی کی لوگ مثال دیں گے۔ ڈولی بھیج کر جنازے کا انتظار آپ کیجیے۔ کم از کم میں تو عملِ جراحت کا قائل ہوں۔ ناسور بن جائے تو انسان خود اپنے بدن کا حصہ کٹوا دیتا ہے۔''

اگلے چند دن مجھے پلِ صراط پر اپنی ذات کے ساتھ مکالمہ کرتے ہوئے گزرے۔

یہ مری زیست کسی اور کی بسر کردہ،
مرے فسانے کسی اور نے کیے تحریر
نصیب میرے کے ماتھے پہ دستخط کس کے؟

مگر لکھیں گے نئی اک کتاب اب کے ہم

شاید یہ وقت مناسب نہیں تھا؟ شاید مجھے ابا جی سے کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ شاید آگہی کا عذاب ان کی ذات تک نہ پہنچتا تو اچھا تھا۔ لیکن ایک دن ابا جی نے مجھے رات کو اپنے پاس بٹھا لیا، ’’کسی اندیشے کو دل میں جگہ مت دینا۔ تمھارا باپ زندہ ہے ابھی۔ ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ اس فیصلے کا یہی وقت مناسب تھا۔ جس گھر کو بچانے کی بے سود یک طرفہ سعی ہو رہی تھی، اس کو اللہ نے خود جلا دیا۔ اس لیے ہر حال میں شکر واجب ہے۔ ویسے بھی آپ کا گھر نہیں، مکان آتش زدگی کا شکار ہوا ہے۔ گھر تو اب بنے گا۔ آپ دیوار میں دروازے نکال سکتی ہیں اور انھی دیواروں پر چھت بھی ڈال سکتی ہیں۔ اگر آپ کسی کے فرائض خود انجام دے کر ڈگریاں دلوا سکتی ہیں تو اپنی اولاد کو بھی ڈگریاں لے کر دے سکتی ہیں۔ قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔ یا بادشاہ بن جاؤ یا جوہری۔ اس سے کم پر راضی ہونے والے گوہر شناس نہیں ہو سکتے۔ آپ خود بھی آج کے بعد بلندی کا سفر طے کریں گی۔ کنوئیں سے نکلنے میں بہت دیر کر دی۔ آپ کو خدا پر توکل اور کامل یقین کے بعد صرف اپنی ذات پر یقین کرنا ہے۔ اپنی صلاحیتوں پر یقین کرنا سیکھ لو۔‘‘

میں ششدر ان کی بات سنتی رہی۔ ابا جی کے چہرے پر کوئی اندیشہ نہیں تھا، کہیں کوئی غم کا سایہ نہیں، بلکہ ایک عزم کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

’’زندگی میں کوئی آزمائش بلا مقصد نہیں آتی۔ اللہ کسی بہتر سمت میں سفینہ موڑنے کے لیے اسے طوفانوں سے گزارتا ہے۔ انسان کو اللہ نے دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور نیک برتاؤ کا حکم دیا ہے۔ میرے بچے میری ایک بات یاد رکھنا کہ نیکی کی قدر کرنے کے لیے نیک دل ہونا اور نیک خصلت ہونا ضروری ہے ورنہ ایک فریق خواہ کوئی بھی قربانی دے، خدمت کرے، غلیظ القلب لوگ سے اپنا حق سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے کنارہ لازم ہے۔ جن لوگوں کا اندازِ فکر منفی ہو، دوسروں کی ذات کو وہ صرف اپنی سہولت اور آسائش کے لیے استعمال کریں، ان کو زندگی سے نکالنا بہت ضروری ہوتا ہے تا کہ ان کو خبر ہو سکے کہ انھوں نے کیا گنوایا اور آپ کو علم ہو سکے کہ آپ نے اپنی ذات کے ساتھ کیا زیادتی کی۔‘‘

انھوں نے بولتے بولتے رک کر مجھے دیکھا۔ پھر میرے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا،

’’اپنے بچوں کی صورت میں اللہ نے آپ کی زندگی واپس کر دی ہے۔ ان کو جو چاہو بنا لو کیونکہ آپ سب کچھ کر لینے پر قادر ہیں۔ جو شخص کوزہ گری کا ہنر اپنی اولاد پر نہ دکھا سکے اس کا ہنر

بے فائدہ ہے۔ یہ عمل اپنے گھر سے شروع ہوتا ہے۔ اپنی اولاد کو انسانوں سے حسنِ سلوک اور محبت سکھاؤ۔ اللہ نے آپ کو قلم دیا، میں دیکھتا ہوں اب اس پر کون قدغن لگاتا ہے۔ اپنی زندگی کی زمام اپنے ہاتھ میں لو اور اپنے ذہن سے ان دھماکوں اور دھمکیاں دیتی بیماریوں کی بیخ کنی کر دو۔''

میں خاموشی سے بیٹھی ان کی بات سنتی رہتی۔ ابا جی کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ صحت اور سکون کی دولت کہیں سے لاکر میرے قدموں تلے ڈھیر کر دیں۔ ابا جی کے حوصلے اور ثابت قدمی جیسی کوئی مثال میں نے آج تک نہیں دیکھی۔

انھیں علم تھا کہ ان کی ہزار تسلیوں کے باوجود میری طبیعت بہت بگڑ رہی تھی سو تہجد کے لیے اٹھے تو میرے پاس آ بیٹھے، ''بیٹا زیرِ زمین جانے والے جہان کے آزار سے آزاد ہو جاتے ہیں لیکن زمین کے اوپر چلنے والے حوصلے کی وجہ سے چلتے ہیں۔ تمھاری زندگی اب سے ایک تکون ہے: تعلیم، تم اور تمھارے بچے۔ نیکی کی قدر صرف نیک ارواح کر سکتی ہیں۔ ایک گھونٹ پانی پلانے والے کا احسان تارنا مشکل ہے لیکن جن کے دلوں پر قفل لگے ہوں وہ انسانوں کو غلام بناتے ہیں اور اس غلامی سے آزادی سب سے بڑی نعمت ہے۔ تم دیکھنا ایک دن ایسا آئے گا یہ بچے چھتنار درخت بن جائیں گے۔

بس اٹھ جاؤ میرا بچہ، اور نفل ادا کرو کہ مکان کی آتشزدگی، دھماکے، موت اور مسلسل غم کے باوجود آپ اپنے پیروں پر کھڑی ہیں۔ بلکہ اس حالت میں بھی جب آپ کو مکمل آرام، سکون اور جذباتی سہارے کی ضرورت تھی، آپ نے دوسروں کے فرائض ادا کیے۔ کیا یہ معجزہ نہیں کہ اتنی بڑی قیامت سے گزار کر اس نے آپ لوگوں کو سلامت رکھا؟ یقیناً وہ آپ سے بڑے کام لینا چاہتا ہے۔ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کر کے اپنے پیچھے اچھے انسان چھوڑ جانا اہم ترین کام ہے۔''

پتہ نہیں ابا جی کیا کہہ رہے تھے لیکن میرے سارے وجود کو ایک ہی بات کا کرب بے دردی سے جھنجھوڑ رہا تھا، ''آپ کو اس دکھ سے بچانے کے لیے ہم تینوں کے بس میں جو کچھ تھا ہم نے کیا۔

آپ کیا سمجھتی ہیں آپ کی مسلسل بیماری سکھ دے رہی تھی ہمیں؟ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اتنی دور پردیس میں پتہ نہیں کیسے بیماری کاٹی ہوگی کسی مدد کے بغیر؟ پتہ نہیں میں کس طرح غافل رہا؟ لیکن نہیں، اب نہیں۔''

اس ''اب نہیں'' نے مجھے حرفِ انکار سکھایا۔ انگریز ایک محاورہ بولتے ہیں، ''مجھ سے کہا

گیا کہ چھلانگ لگاؤ، اور میں نے حیل و حجت کے بغیر کہا: کتنی بلند؟'' لیکن اب نہیں۔

''لکھو'' یہ ابا جی کا دوسرا حکم تھا، ''جو جی میں آتا ہے لکھو۔ ذہن سے ہر چیز نکال کر کاغذ پر رکھ دو۔ بہت نقصان کرلیا تم نے اپنا بھی اور ہمارا بھی۔ لکھو، اور اپنے فیصلے خود کرو۔ بھلے وقت انھیں غلط ثابت کرے۔ ترا علاج قلم کے سوا کچھ اور نہیں۔''

میرے لیے یہ حکم کسی تاریک غار میں پھیلتی روشنی جیسا تھا۔ تقاضہ کیا جا رہا تھا کہ لکھو۔ جو بھی لکھو، الٹا سیدھا، جیسا جی چاہتا ہے لکھو۔ اور اس تھیراپی کے ذریعے ذہن کی تاریکی دور ہو اور اس میں روشنی بھر جائے، جو صرف آپ ہی کو نہیں ان سب کو بھی عزم و ہمت کی منزل تک لے جائے جو آپ جیسے حالات میں ہیں۔

بہت سال بعد جب مجھے ڈینش مصنفہ جینے نے کہا کہ ''صدف، تم یہ کہانی ڈینش میں کیوں نہیں لکھتیں؟ ڈینش میں نظمیں لکھو، جہاں رہتی ہو اس ملک کی زبان میں لکھو'' تو مجھے ابا جی بہت یاد آئے۔ میں نے کہا، ''جینے! میں تو سمجھی تھی ابا جی وفات پا گئے ہیں، تم کہاں سے آ گئی ہو؟''

••

''لکھنے سے دو فوائد ہوں گے'' ابا جی نے ایک بار مجھے قائل کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک تو تحلیلِ نفسی اور دل کا بوجھ الفاظ کا لبادہ اوڑھ لے گا۔ زبان پر گرفت ہوگی۔ دوسرے آپ کی یادداشت بحال ہوگی۔ آپ کو خود بخود جزئیات یاد آئیں گی۔ اس حادثے اور غم کو چھوٹا مت سمجھو بیٹا۔ یہ آپ کی زندگی کے ساتھ ساتھ جائے گا لیکن اس سے نمٹنا سیکھنا ہوگا۔ آپ اس واقعے کو لکھیں۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ لوگوں کی باتوں کا غم نہ کریں۔ اگر آپ کو شدید ڈپریشن ہے یا بے خوابی کا مرض ہے تو یہ بالکل نارمل بات ہے۔

غیر معمولی بات یہ ہوتی کہ اتنا بڑا حادثہ ہوجانے کے بعد بھی انسان کے معمولات میں فرق نہ پڑے۔ غم، زود رنجی، انتہائی حساسیت، گھبراہٹ اور خوف اس کا فطری ردِعمل ہے اور پھر اب آپ کو سمجھ لینا چاہیے کہ آپ عام ذہن اور عام فطرت لے کر پیدا نہیں ہوئیں۔ آپ کو خاص دل اور خصوصی عنایات کا حامل بنایا ہے خالقِ کائنات نے۔ آپ کو عام عورتوں کی طرح شکایات و ناشکری کی داستان سنانے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ آپ صرف لکھیں اور لوگوں کو علم ہونا چاہیے کہ کوئی غم بھی زندگی کی انتہا نہیں ہوتا۔ اس المناک حادثے سے جینے کے نئے قرینے ملتے ہیں۔''

پھر ابا جی نے ذہنی سکون کے لیے مجھے نجانے کون کون سی اعصابی تقویت کی ادویات

کھلائیں۔ خشخاش، بادام، سونف، دار چینی، چھوٹی الائچی اور کالی مرچ اور جانے کیا کچھ ملا کر تیار کر دیتے۔ خود بھی کھاؤ اور بچوں کو بھی کھلاؤ۔ کہاں تک ان کی ایک ایک بات یاد کروں؟ علم و حکمت کے موتی۔ نثر میں شاعری یا شاعرانہ گفتگو۔ وہ اپنی وسعتِ مطالعہ سے حاصل کیے گئے نتائج بے حد سادگی سے بیان کر دیتے۔ وعظ، نصیحت اور فلسفے کی گتھیوں کی الٹ پلٹ کے بغیر، میں ان کی گل پاشی کی گل چینی کرتی رہتی۔

''خود شناسی خدا شناسی ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ اب آپ کو خود شناسی اور خود اپنی ذات کو مرکز بنانے کی ضرورت ہے۔ اپنی صحت، اپنی تعلیم، اپنے بچے اور اپنا گھر آپ کی توجہ کا طالب ہے۔ بیرونی دنیا سے آپ کا کوئی علاقہ نہیں۔''

••

''آپ جانتے ہیں ناں اس کی صحت کے مسائل کتنے سنجیدہ ہیں؟'' امی جی نے آہستہ سے کہا۔

''پہلی بات تو یہی ہے کہ میں سمجھ کیوں نہ پایا کہ یہ مسائل ہیں کیوں؟ ایک کِھلا ہوا پھول مرجھانے لگے تو اس کے اسباب کیوں نہ دریافت کیے گئے؟ اس کی بیماری سے سمجھوتہ کیا ہی کیوں گیا؟ اگر اسی بیماری کے ساتھ اس نے بیس بندوں کی خدمت انجام دی ہے تو وہ اپنے دو بچوں کو بھی پال سکتی ہے اور یقیناً پہلے سے بہتر پال لے گی۔ اب جب اس پر سے فالتو بوجھ کا عذاب اتر گیا تو ان شاءاللہ یہ بیماری بھی نہیں رہے گی۔''

ابا جی کا لہجہ دوٹوک اور غیر متزلزل تھا۔ امی جی خاموش رہیں۔

''میری بیٹی کسی کے احسان کے بغیر رہنا جانتی ہے۔ اس کا امتحان ختم ہوا۔ اب ان کی آزمائش شروع ہوگی جو اس کی خدمات کے عادی تھے۔ یہ میرے رب کا قانون ہے کہ ہر ناشکرے انسان سے نعمت چھین کر اس پر اس جیسی ہی مصیبت مسلط کر دی جاتی ہے۔ یہ میری بچی کی نئی زندگی کی ابتدا ہے۔ میں رہوں یا نہ رہوں اسے کوئی بھی کسی بھی مسئلے میں تنگ نہ کرے۔ وہ اپنے فیصلے خود کر سکتی ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ وہ خود فیصلہ کرے اور میں اس پر عمل درآمد کروانے کا فریضہ انجام دوں۔''

میں ایسی اور اس جیسی دوسری باتیں سنتی اور یہی باتیں میرے حوصلے کو نئی اڑان سکھاتیں۔ ہمت کو نئی جہات ملتیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ زندگی کے ہر میدان میں ابا جی

کی تائید نے ہی مجھے اعتماد اور اعتبار دیا۔ جہاں عجز کا تقاضہ سکھایا کہ دوسروں کو خود سے بہتر سمجھو وہیں خودداری اور خوداعتمادی کا یہ درس بھی کہ کوئی آپ کی ذات کی مقررہ حدود سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو اس کے پر جل جانے چاہییں۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے ڈنمارک کے ادبی لحاظ سے تقریباً بنجر اور معاشرتی اعتبار سے گھٹن اور حبس بھرے ماحول میں رہ کر بھی اپنی حدود کی پاسداری کی اور استقامت کے ساتھ مسلسل کام کر کے الحمدللہ ابا جی کی تربیت کو سرخرو کیا۔ کثافت آلودہ شور کو آوازِ سگاں سے زیادہ اہمیت نہ دی اور ''سگانِ کوئے لعنت پر فقط لعنت برستی ہے'' نظم کا 'خراجِ عقیدت' پیش کر کے کان بند کر لیے۔

••

ابا جی کو شاید مجھ پر غصہ بھی تھا یا شاید غم اور غصہ دونوں باہم خلط ملط ہو گئے تھے۔

''چلو نکلو اب اس کنوئیں سے باہر۔ خدمت میں اور غلامی میں فرق ہوتا ہے۔ جس مخدوم کو خادم کی قدر نہ ہو اور وہ اس کی توقیر اور تشکر کرنے کے بجائے خدمت کو غلامی کی حد تک بڑھا دے اس سے فاصلہ ہی اچھا۔ نیکی ضرور کرو لیکن کسی صلے یا ستائش کی تمنا نہ کرو۔ اکثر نیکی کر کے دریا میں ڈالنے کا محاورہ بدل کر نیکی کرنے والے کو دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔''

ابا جی کا موقف تھا کہ بچوں کو بالخصوص بیٹیوں کو اپنے والدین پر یہ یقین ہونا چاہیے کہ وہ ان کی ہر بات سننے اور سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ ان کے اور اولاد کے درمیان میں معاشرے کی تعمیر کردہ شیشے کی دیواریں نہیں ہونی چاہییں۔

مجھے اس خیال سے ہمیشہ طمانیت ہوتی کہ میں نے ابا جی کو زندگی میں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا، کیا تعلیم کا میدان کیا زندگی کا۔ ہمیشہ ان کا سر بلند رہا۔ ابا جی نے ایک دفعہ پھر اعتماد کی کلید میرے ہاتھ میں تھمائی۔

''دیکھو بیٹا! میرا سر اب بھی بلند ہے۔ جو کوئی میرے پاس آتا ہے اپنا سر جھکا کر معافی مانگنے آتا ہے۔ لیکن یہ فیصلہ میرا نہیں، آپ کا ہے اور بالکل درست ہے۔ میں نے آپ کے بھائیوں سے بھی کہہ دیا ہے کہ میں رہوں یا نہ رہوں لیکن آپ کی زندگی کے فیصلے ہمیشہ آپ کے ہی ہوں گے۔ مجھے کل بھی اپنی بیٹی پر فخر تھا اور آج بھی ہے۔ جب فیصلہ کر لیا تو اس پر قائم رہنا اور اسے صحیح ثابت کرنا آپ کا کام ہے۔''

ان فیصلوں کو درست ثابت کرنے اور اپنے بچوں کو ایک شادمانی بھری زندگی دے کر

نافع انسان بنانا میری زندگی کا نصب العین بن گیا جس میں کہیں بھی کسی اور مقصد کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔

••

اسی دوران خاندان میں ایک پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق شادی بھی تھی۔ ابا جی نے کہہ دیا تھا کہ سوگ تین دن کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اپنے اور دوسروں کے معاملات میں رکاوٹیں ڈالنا صرف جہالت ہے۔ میرے بیٹے کو جانا تھا سو وہ چلا گیا۔ اب کاروبارِ دنیا کو روکنے کی حماقت کی ضرورت نہیں۔ مجھے بھی حکم ہوا فوراً اٹھو اور بچوں کی خوشی میں شامل ہو۔

میں نے بے دلی سے اٹھ کر موتیا رنگ کا سوٹ پہنا۔ امی کو ہول اٹھنے لگے، ''بے وسبیاں دی رن، نہ کج ہتھیں نہ کج کن۔ (بے ہنر لوگوں کے گھر کی عورت، نہ کچھ ہاتھ میں پہنا، نہ کان میں) جاؤ کپڑے بدل کر آؤ۔''

میں جا کر پرانا عنابی لہنگا پہن آئی تو امی میرا ناقدانہ جائزہ لے کر قدرے توقف سے بولیں، ''ہاں اب ٹھیک ہے۔''

ابا جی وقت کی پابندی کے ساتھ تیار تھے۔ صرف اپنے گھر کے لوگ تھے۔ میں ساری شام دزدیدہ نظروں سے انھیں دیکھتی رہی۔ کالی شیروانی میں متبسم چہرہ، سب مہمانوں کا استقبال کرتے، سب سے ملتے اور مزاج کے مطابق ہر ایک سے فرداً فرداً حال دریافت کرتے نظر آرہے تھے۔ شادی میں صرف قریبی عزیز واقارب تھے۔ سب کو یکجا دیکھ کر بہت خوش تھے۔ کئی مرتبہ بات چیت چھوڑ کر میرے پاس آئے...

''کھانا کھایا ہے؟''

''جی ابا جی''

''طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' انھوں نے میری پیشانی کو چھوا۔

''جی ابا جی''

''بچوں سے بات ہوئی؟''

''جی ابا جی''

''تھک گئی ہو تو گھر چلی جاؤ''

''جی اچھا''

مجھے واقعی کئی دن سے پہلے بھائی کی تعزیت اور پھر عیادت کو آنے والے مہمانوں سے ملاقات کی وجہ سے سونے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ میں فوراً گھر آ گئی۔ حسبِ معمول امی جی کے کپڑے پہنے اور سونے کے لیے کمرے میں چلی گئی کہ کم از کم کچھ دیر تو سکون اور تنہائی ملے اور خود سے ملاقات ہو سکے ورنہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے دنیا ہماری زندگی بسر کرنے لگی ہے۔ سونے سے پہلے سات سمندر پار بچوں کی آوازیں اور شرارتیں یاد آئیں اور پھر ان کا محبت سے لبریز انتہائی ذمہ دارانہ انداز، ''امی! آپ ہماری فکر چھوڑیں اور صرف اپنا خیال رکھیں۔ چند ہی دن کی تو بات ہے۔'' لیکن سوائے میرے کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ چند دن میرے لیے چند صدیاں بن کر گزرے۔ ان بچوں کی تعلیم و تربیت، ذہنی اور جذباتی ضروریات اور ایک طویل سفر لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ کوئی تشویش، کوئی اندیشہ اور کسی ملال کی ہلکی سی گرد بھی میرے قریب سے نہ گزری۔

عورت پر اس کی ممتا کو ایک استحصالی ہتھیار بنا کر طاری کر دینے والوں کو علم ہونا چاہیے کہ بچے ماں کی طاقت ہوتے ہیں کمزوری نہیں۔ آنے والے وقتوں میں جب بچے آشیانہ خالی کر جایا کریں گے تب یہی جذباتیت اس کی زندگی اجیرن نہ کرے بلکہ عورت کو ہر حال میں تمام عمر خود اپنی ذات کے بل بوتے پر ایک فعال زندگی گزارنی چاہیے۔ ممتا کا ڈھکوسلہ اب ختم ہو جانا چاہیے کیونکہ زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر برس کے بعد اس ڈرامے کا اختتام ہو ہی جاتا ہے۔ پھر اماں جی صرف عید، شبرات، جمعرات اور برسی پر ہی یاد آتی ہیں۔ اور رہی سانجھی ماں کی تدفین، تو اس کے مظاہرے بھی ہم نے دیکھ رکھے ہیں!!!

اس احساسِ تحفظ کے ساتھ کہ ابا جی ہیں ناں، میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ نیند جو نجانے کتنے مہینوں سے ادویات کے باوجود ضدی بچے کی طرح روٹھی رہتی تھی، بس ابا جی کی ایک بات کہ ''گھر جا کر سو جاؤ'' کے بعد مہربان بادلوں کی طرح امڈ کر آئی اور میں اگلے روز صبح دس بجے تک سوتی رہی۔

یقیناً عزیز بھائی کی رحلت کے اچانک حادثے اور پھر میری طبیعت کی شدید خرابی نے ان کے اعصاب پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ میں نے انھیں اپنی زندگی میں کبھی اتنا پریشان نہیں دیکھا تھا اور یہیں سے مجھے اپنی غیر معمولی قوتِ برداشت اور ضبط کی وجہ سمجھ آئی۔

محبتیں جتنی مافوق الفطرت طاقت بخشتی ہیں اتنا ہی کانچ کی دیوار سے بھی زیادہ کمزور اور خائف بھی کر دیتی ہیں۔ مجھے بھی اپنے باپ سے عشق نے سوکھی گھاس کے ایک تنکے کی مانند کر دیا

تھا۔ میرے حوصلے بھی ریت کی دیوار تھے۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ ابھی تو ان کے لاڈلے بیٹے کا کفن بھی میلا نہیں ہوا، ابھی تو قبر کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی اور ابھی تو ان کے دل کی دراڑوں سے لہو رستا ہوگا۔ میں نے خاموشی میں عافیت جانی۔

آنکھ کھولتے ہی، شعور کی آنکھ کھلنے سے قبل باپ کے شفیق ہاتھوں کا لمس بچوں کا زندگی سے پہلا تعارف ہوتا ہے۔ جذبات کی حدت بھرے یہ ہاتھ اور زندگی کو پھولوں کی سیج بنانے کی کوشش میں مشقت کرتا باپ شاید ہر بیٹی کا پہلا محبوب ہوتا ہے۔ بیٹی کا پہلا عشق جو گدا بھی ہو تو بیٹی کو شہزادی بنائے رکھنے پر بضد رہتا ہے۔

مجھے بھی اس عشق نے ہمیشہ سپر ڈالنے پر مجبور رکھا۔ پتہ نہیں کون سے لوگ عورت کی آزادی اور خود مختاری سے ہراساں رہتے ہیں؟ اس کے جذباتی فیصلوں سے خائف ہوتے اور اس کے راستے میں دیواریں تعمیر کرتے ہیں؟ بس اس کے پیروں میں محبت کی زنجیر ڈال دو اور پھر دیکھو کہ اس آزادی سے بڑا کوئی زندان نہیں۔ وہ اپنی ذات کو بھی فراموش کر دے گی اور ایک سمندر سے سمٹ کر بخوشی ایک آبجو میں سما جائے گی مگر اسے آبِ زم زم کی روانی بھی دے گی۔ مجھے اسی عشق نے اپنی ذات کی نفی پر استقلال سے ڈٹ جانے پر مجبور کر دیا۔

مرے تو پاؤں میں زنجیر تیرے عشق کی تھی
وگرنہ مجھ کو یہ دیوار روکتی کب تک

••

''آپ چند مہینوں کی مہلت اور وقت مانگتے ہیں جب کہ میری بیٹی کے چند سانس بھی مہلت کے قابل نہیں۔ یہی حالات اور وقت کے سدھرنے کا عمل ہے۔ جس کو نعمت کی قدر ہوتی ہے وہ اسے آزمائش کی بھٹی میں نہیں ڈالتے نہ ہی کسی کی فطرت کے حسن کو اپنی ذہنی آلائش سے داغدار کرتے ہیں۔ یاد رکھیں جس خاندان اور انسان کی بدفطرتی کو خدمت، خلوص اور منہ توڑ جواب دینے کی اہلیت کے باوجود خاموشی بھی نہیں بدل سکتی تو پھر اس کو کوئی طاقت تبدیل نہیں کر سکتی۔ خدا بھی نہیں بدلتا بلکہ فطرت خود اس کا انتقام لیتی ہے۔''

''آپ کسی کو بددعا مت دیں'' امی جی کی آواز آئی۔

''نہیں، بددعا دینا میرا شعار نہیں کیونکہ بددعائیں بے بس لوگ دیتے ہیں۔ شکایات بداعتماد لوگ کرتے ہیں، اور دھمکیاں جاہل لوگ دیتے ہیں۔ مجھے میرے خدا نے فیصلے کی طاقت عطا کی

ہے سو میں نے فیصلہ کیا ہے۔''

قریبی مسجد سے مغرب کی اذان کی صدا بلند ہوئی، ''اللہ اکبر، اللہ اکبر۔''

''چلو یار نماز پڑھ آئیں۔'' تایا جان جو اب تک خلافِ معمول خاموش بیٹھے تھے، بولے اور اس کے بعد پھر طویل خاموشی۔

میں بند دروازے کے پیچھے سونے کی ناکام کوششیں کر رہی تھی۔ کتنے دنوں کے بعد مجھے بغیر کسی دوا کے درد سے شفا ہوئی اور قسطوں میں مہربان ہوتی نیند کی پری نے ایک دم کوئی چھڑی لہرائی۔ والدین کے مہربان سائے کی رحمت کیا نعمت ہوتی ہے یہ بھلا مجھ سے بہتر کون جان سکے گا؟

••

ابا جی کا توکل اور صبر و ہمت پہلے سے کہیں زیادہ تھا۔ ''لکھو، جانِ پدر۔ لکھو۔'' ابا جی ہر مرتبہ فون پر کہتے۔ ''غم کو ناسور بننے سے بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ لکھتی جاؤ۔ جو یاد لاشعور کے اندھے کنوئیں سے سر ابھارتی ہے اسے فوراً الفاظ کے پنجرے میں بند کرتی جاؤ۔ بس یہی ایک طریقہ ہے اس کنوئیں سے نکلنے کا۔ یاد رکھنا! باہر سے کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ آپ کو خود ہی کوشش کرنا ہے۔ میرے بچے! اللہ جب کسی کو غم و آلام کے بھڑکتے دریا سے گزارتا ہے تو وہ کسی عظیم مقصد کے لیے تیار کرتا ہے۔ کوئی بھی حادثہ انسان کو کندن بنائے بغیر نہیں گزرتا۔''

عزیز بھائی کی رحلت کے بعد ایک دن ابا جی کے پاس بیٹھی تھی۔ انھوں نے رومی کے اشعار پڑھے، ''زخم وہ مقام ہے جہاں سے روشنی داخل ہوتی ہے۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔

ابا جی نے کتاب الٹ کر رکھ دی۔ ''میرے خیال میں تو یہ بے حد خوبصورت اور فکر انگیز لطیف نکتہ ہے؟''

جی، جی، ابا جی... میں نے فوراً تائید کی۔

پھر؟ انھوں نے استفہامیہ نظریں ڈالیں۔

''ہنس اس لیے رہی ہوں کہ کچھ لوگوں کے دل زخموں سے اس طرح چھیدے جاتے ہیں کہ ان میں جگہ ہی نہیں بچتی... وہ تو پھر روشندان ہوں گے رومی کی ڈکشن میں؟''

میں نے ان کے ہاتھ کی کتاب دیکھنے کی کوشش کی جس میں اردو میں رومی کا ترجمہ لکھا گیا تھا۔ ابا جی اپنے مخصوص انداز میں خفیف سا مسکرائے۔

''وہ مینارۂ نور ہوتے ہیں۔ انھیں صرف روشنی بانٹنا اور راستہ دکھانا آتا ہے۔ ان کے زخم

نور بن جاتے ہیں اور آپ کو علم ہے ناں، نور شعلہ نہیں جو جلانے کی صفت بھی رکھتا ہے۔ نور تو سراسر بردَت ہے، ٹھنڈک اور تسکین بخشتا ہے۔ آپ کا کام ہے لکھنا تا کہ ان لوگوں تک بھی روشنی کی کرنیں پہنچ سکیں جو اپنے دل و دماغ کے سارے روزن بند کر کے بیٹھے ہیں۔'' ابا جی نے کہا کہ ''شاہین کے نئے پر اسے نئی زندگی اور نئی جوانی دیتے ہیں۔ اونچی اڑان اور نئی توانائی کے لیے اس کرب اور اذیت سے گزرنا ضروری ہوتا ہے جس سے شاہین اپنی حیاتِ نو کے لیے گزرتا ہے۔ اسی طرح انسانوں کو بھی قدرت کسی بڑے مقصد کے لیے تیار کرتی ہے۔ اتنی آزمائشیں آنا بلاسبب نہیں۔ اس میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت موجود ہے۔''

''تمھیں خدا نے پروں کے ساتھ پیدا کیا ہے تو رینگنے پر مصر کیوں ہو؟'' ابا جی فون کرتے تو رومی اور اقبال کے اشعار سنانے کی کوشش کرتے۔ اب مجھے ان اسباق سے چڑ ہونے لگی تھی۔ ان کو کیا علم کہ اپنی ساری دنیا کو اپنے ہاتھ میں لے کر ازسرِ نو تعمیر کرنا کیسا ہوتا ہے۔ یہ کن فیکون کا کھیل نہیں ہے۔ یہ راستہ انحراف کی گلی سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس میں تکفیر کے دھبے ہوتے ہیں، راندہَ درگاہ ہونے کا داغ سہنا پڑتا ہے اور بہشتی لباس ترک کر کے اپنی مرضی سے نام نہاد جنت کو خیر باد کہنا ہوتا ہے۔ یہ بال و پر ایسے ہی نہیں ملتے، لاروے سے تتلی تک کے سفر میں ریشم کے سخت خول کو توڑنا بھی شامل ہے۔

کبھی مجھے لگتا شاید ابا جی نے ساری عمر یہ کتابیں اس لیے پڑھی ہیں کہ ان کا علم مجھ پر انڈیل سکیں۔ کبھی میں ناراض ہو جاتی، میں نہیں سنتی یہ سب ہمت بندھاتی باتیں۔ ان کا شفقت بھرا ہاتھ میرے سر پر آ رکتا۔ ''میری بہادر بیٹی ہو''، اور میں شکستگی کی پژمردگی کو بھول کر ازسرِ نو اس بہادری کے تاج کو سنبھالنے لگتی۔

••

یکم جنوری کی انتہائی سرد رات تھی۔ گھٹنوں تک برف کے ڈھیر سڑک کے اطراف میں عذاب کے فرشتوں کی مانند کھڑے تھے۔ گھر جلنے کے بعد ہمیں انشورنس کمپنی کی طرف سے عارضی رہائش کے لیے مسلسل ہوٹلوں اور نئی جگہوں پر منتقل ہونا پڑتا۔ ایک ہوٹل سے دوسرے ہوٹل تک، ایک رہائش گاہ سے دوسرے ٹھکانے تک، رنگ برنگے ہسپتالوں کی انتظار گاہوں سے لے کر طرح طرح کے ماہرینِ نفسیات تک، زندگی لٹو کی طرح گھومتی رہی۔ بچے مختلف راستوں سے بس اور ٹرین پر سکول، کالج تک جاتے رہے۔ جب کبھی مجھ میں ہمت ہوتی میں گاڑی میں انھیں چھوڑ دیتی۔ لیکن

شدید نفسیاتی دباؤ، خوف اور درد کش ادویات کے استعمال کے باعث مجھے ڈرائیو کرنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ مجھے مانوس راستے بھی اجنبی لگتے۔ بارہا ایسا ہوتا کہ میں اپنے ہی گھر کے سامنے سے بے اعتنائی سے گزر جاتی۔

پھر مجھ سے کار کا ایک ہولناک حادثہ ہوا۔ برف پر پھسلتی گاڑی شیشے کے دروازے سے جا ٹکرائی جس میں کوئی جانی نقصان تو نہ ہوا لیکن اس کا اثر اور دھچکا اتنا شدید تھا کہ بہتری اسی میں جانی کہ اب گاڑی نہ ہی چلائی جائے۔ یہ ایک نئی معذوری تھی جس سے شدید ڈپریشن پیدا ہوا، بے اعتمادی اور خوف بڑھ گیا۔ میز پر پڑی گاڑی کی چابی اور باہر کھڑی گاڑی کی موجودگی اس احساس کو سہ چند کر دیتی۔

بالآخر ایک سال کی خانہ بدوشی اور بے سروسامانی کے بعد ہمیں مقامی کمیون کی طرف سے ایک مستقل اپارٹمنٹ دے ہی دیا گیا۔ اس اپارٹمنٹ میں زندگی کو نئے سرے سے ترتیب دینا تھا۔ اسی شہر کی چند گلیاں چھوڑ کر تین خاکستر مکان پہلو بہ پہلو ایستادہ تھے۔ سیٹا اور بچے تو جا چکے تھے مگر زندگی اپنا سفر بلندی سے گرتے پتھر کی مانند جاری رکھے ہوئے تھی۔ اس ہولناک آتش زدگی اور دھماکوں بھری رات کو اب زندگی سے نکالنے کے جتن کرنا تھے۔

''امی! گھر میں کچھ اور سیٹ ہو یا نہ ہو، لیکن مجھے جلدی سے لکھنے کی میز لا کر دیں۔ میں زمین پر بیٹھ کر نہیں لکھ سکتا۔ میرے سکول کا کام بہت زیادہ ہوتا ہے۔'' اُسامہ نے اپنی مشکل بیان کی۔ ہم تینوں جنوری کی سرد دھوپ میں ایک دوسرے کے سامنے کمرے کے فرش پر بیٹھے بازار سے منگوایا پیزا کھا رہے تھے۔

''ایسا نہیں لگتا کہ ہم پکنک منا رہے ہیں؟'' میں نے اسے کوک کا گلاس بھر کر دیا۔

''امی جی! آپ اور آپ کی پکنک'' وہ منہ بسور کر بولا، ''سب سے پہلا کام گھر میں پیزا بنانے کا کریں گے۔''

''توبہ، توبہ، روٹیاں، روٹیاں۔ ڈِھڈ نہ پیاں روٹیاں تے سبھے گلاں کھوٹیاں''

ہماری صاحبزادی نے فرش پر بچھے گدے پر لیٹے لیٹے لقمہ دیا، ''امی جی نانو کہتی تھیں ناں؟''

''ہاں بھئی، کچھ لوگوں کا قبلہ و کعبہ روٹی ہوتی ہے'' میں نے جلدی جلدی برتن سمیٹتے ہوئے جملہ پھینکا۔ ''چلو نکلو جلدی کرو۔ آپ کی شاپنگ کر کے آتے ہیں۔''

ایک دکان پر چمچماتی سائیکل دیکھ کر اُسامہ بولا،''مجھے یہ سائیکل اچھی لگ رہی ہے۔''
''او کے''، میں نے کھڑے کھڑے اس کی سائیکل پیک کروائی۔
وہ پریشان ہوگیا،''امی میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''
''لیکن میرا یہی مطلب تھا'' ہم نے باہر نکل کر کولڈ ڈرنک خریدی اور شدید سردی ہماری مطمئن ہنسی سے موسمِ گرما میں بدل گئی۔

••

دوا اور دعا سے علاج معالجہ اپنی جگہ پر تھا اور ابا جی کی حوصلہ دیتی مطمئن قانع آواز بھی ہمراہ تھی لیکن کئی سال گزرنے کے بعد بھی، بلاناغہ، ہر شب تین بجے تک بیٹھ کر میں جیسے حادثے کی گھڑی کو ٹالتی رہتی۔ کمرے کے اندھیرے میں بے آواز برقی گھڑی کی لال آنکھ مجھے گھورتی۔ میں کبھی امی جی کے بتائے ہوئے اسماء الحسنیٰ کا ورد کرتی، کبھی سائکارٹرسٹ کی ہدایت کے مطابق اپنے بچپن کی کوئی بہت اچھی سی بات سوچنے لگتی۔ لیکن ہولناک دھماکے، لرزہ خیز چیخیں اور سائمن کی ''تائے فا۔۔۔ نائے فا'' میرے لاشعور میں کہیں گھات لگائے، کنڈلی مارے بیٹھی رہتی اور آنکھ لگتے ہی زہریلے لال ہرے دھبے پٹاری سے نکلے سانپوں جیسے خواب پھنکارنے لگتے۔

اس رات بھی یہی ہوا۔ میں نے سونے کی ہر ممکن کوشش کی اور بالآخر جب میری آنکھ لگ گئی تو میمی کا اداس چہرہ اور اس کے بالوں کی نوکوں اور انگلی کی پوروں سے بل کھاتا دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح مجھ سے سوال کیا،
''تم تو ہمیں بچا سکتی تھیں ناں؟ تم نے بھی ہمارے لیے کچھ نہیں کیا۔ یہ دیکھو، میرے پیر کوئلہ بن گئے ہیں، دیکھو، دیکھو۔''

عقب سے سائمن کی معصوم اور اپنی بقا کی جنگ لڑتی آخری چیخ سنائی دیتی،''اساماز موآ۔ اساماز موآ آ، (اُسامہ کی امی)۔''

خوف کے مارے میں نے آنکھیں کھول دیں،''نہیں یہ لمبی بیماری کی طویل رات شاید کبھی نہیں کٹے گی۔ یہ اندھیری رات کوئی اندھی سرنگ نہیں کہ جس کے آخری سرے پر روشنی نظر آرہی ہو۔ یہ تو کوئی پاتال ہے جس سے ابھرنے کا کوئی راستہ ہی نہیں سجھائی دیتا۔''

شاید بلیک ہول جو میری زندگی سے خوشی کی روشنی کی ہر کرن چاٹ گیا، دلدل کی سی گہرائی اور گھپ گور تاریکی کے سمندر میں، میرے بیٹے کا معصوم چہرہ تصور میں ابھرا جس کی آواز

دروازے میں چابی گھماتے اور ہینڈل ہلانے سے پہلے ہی آجاتی،

''امی، امی!!'' وہ اندر آ کے چند قدم بھی پار نہیں کرتا۔ اس کا جی چاہتا کہ دروازے سے داخل ہوتے ہی اسے جواباً اپنی ماں کی آواز سنائی دے۔ میں نے شدید سردی میں چہرے پر سے پسینہ پونچھا۔ پھر پنجوں کے بل، بے آواز قدموں سے جا کر اس کا دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوئی تو فاختئی ریشم کے پردوں اور دبیز قالین سے مزین کمرے میں اسے پرسکون نیند میں کھویا ہوا پایا۔ میں نے نہایت خفیف انداز اور اہتمامِ شفقت سے اس کا ماتھا چوما۔

''جی امی؟'' اس کی نیند بہت باہوش اور ہلکی تھی، ''امی آپ ٹھیک ہیں ناں، کیا بات ہے؟'' وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کچھ نہیں بیٹا، میں آپ کو دیکھنے آئی تھی'' میں نے آہستگی سے اس کے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور ساتھ والے کمرے کو بے آواز احتیاط سے کھولا جہاں میری بیٹی بے فکری کی نیلی نیند میں مدہوش تھی۔ میں نے دھیرے سے اس کا لحاف اور تکیہ درست کیا۔ ساتھ ہی شیشے کی میز پر اس کی کتابیں بکھری تھیں۔ ہلکی سی روشنی میں نہ جانے کس چیز کا عکس دیوار پر پڑ رہا تھا۔ اس نے ذرا سا بے آرام ہو کر کروٹ لی اور پھر سو گئی۔

وہ رات خود اپنے قلب و ذہن سے جنگ کی رات تھی۔ اینٹی ڈپریشن ادویات سے شدید نفرت کے علاوہ مجھے بچوں کی جسمانی، ذہنی، جذباتی اور اقتصادی تمام تر ذمہ داریاں بھی شاید تھکانے لگی تھیں۔

دنیا کے ترقی یافتہ ترین ملک میں ہر سہولت سے آراستہ یہ زندگی ہی مجھے بوجھ لگنے لگی۔ میں بالکونی میں بے مقصد بیٹھنے کے بعد واپس اپنے کمرے میں آئی جو اس وقت تک بے حد سرد ہو چکا تھا۔ چاند کی کرنوں نے اپنے پیر سمیٹ لیے اور چرخا کاتتی بڑھیا نے اپنے دودھیا دھاگے پٹاری میں ڈالے۔ آسمان پر رہ کر زمین پر اپنے جادو کے ڈورے ڈالنے والی پرائی روشنی پر اتراتا نور کا گولہ، چاند دیوتا، اپنا نشیبی سفر طے کرنے لگا تھا۔ میں نے ڈائری اٹھائی اور نہ جانے کیا لکھنا شروع کر دیا۔ ترا علاج قلم کے سوا کچھ اور نہیں۔

ڈاکٹروں نے مجھے نیند کی گولی دینا بند کر دی تھی۔ پتہ نہیں انھیں کیا خدشات لاحق تھے۔ میری ماہرِ نفسیات معالج بے حد محتاط انداز میں سوال کرتی، ''کبھی خودکشی کا خیال تو نہیں آتا تمھیں؟'' مگر جب سے اسے میرے بارے علم ہوا کہ میں شاعرہ ہوں تو اس کا رویہ میرے ساتھ یکسر تبدیل

ہو گیا۔ میری ہر بات کے جواب میں وہ بے حد چوکنا لیکن نہایت نپے تلے انداز میں سوال کرنے لگی۔

ڈپریشن کی دوا کی مقدار زیادہ کر دی گئی اور نیند کی گولی روک دی گئی۔ میں نے بارہا اسے بتایا کہ میرا ڈپریشن بے بنیاد نہیں ہے اس لیے میں اسے نفسیاتی عارضہ نہیں مانتی۔ میرے ساتھ زندگی نے مشکل کھیل کھیلا ہے اور مجھے وہ سوالات حل کرنے کے لیے دیے گئے ہیں جن کا نصاب مجھے پڑھایا ہی نہیں گیا۔ مجھے یقین ہے کہ میری مایوسی اور بد دلی وقتی ہے۔ وقت کا مرہم ان حادثات کو قصۂ پارینہ ضرور بنائے گا۔ بے فکر رہو، میں شاعرہ ضرور ہوں لیکن میں خودکشی کرنے والوں میں سے نہیں۔

••

ابا جی نہ ہوتے تو نجانے آج میں کہاں ہوتی۔ بہت سی ڈینش شاعرات و مصنفات کی طرح ذہنی امراض کے شفا خانے میں؟ ایمیلیا سکھام اور ہیلگا جوہانسن کی طرح ذہنی امراض کے ہسپتالوں میں یا پھر خودکشی کی ناکام کوششیں کرتے یا پھر ٹووے ڈٹ لیوسن کی طرح، جس کی خودکشی کے بعد بیٹی کو لاش ملی؟ یک لخت میری نظروں کے سامنے میری بیٹی کا معصوم چہرہ آن رکا۔ میرے پورے بدن میں ٹھنڈے پسینے اور خوف کی لہر دوڑ گئی۔

لیکن نہیں۔ میرا ہاتھ تو ابا جی کے ہاتھ میں تھا، جو مجھے اپنی مہربان مٹھاس بھری آواز میں یاد دلاتے کہ میں کون ہوں؟ ابا جی کے ساتھ ایسی وابستگی تھی کہ میں ہر بات ان سے بلا جھجک کہہ دیتی۔ ایک دن میں نے بتا ہی دیا کہ مجھے اکثر ڈراؤنے خواب آتے ہیں۔ کئی راتوں تک نیند اچاٹ رہتی ہے اور زندگی بالکل بے معنی لگتی ہے۔ میں یہ سب دوائیاں کھا کھا کر تنگ آ گئی ہوں۔

ابا جی نے کمال شفقت سے مجھے حوصلہ دیا، ''گھبرانے کی اور شرمندہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔ کوئی بھی انسان جو ان حالات سے گزرے گا اس کے لیے یہ بالکل عام ردِعمل ہے۔ رات کو انگور اور خشخاش کھایا کرو۔ کام بس اتنا کرو جتنی ہمت ہو۔ اور ہاں، ایسے لوگوں سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں جو آپ کی حالت اور کیفیت سمجھے بغیر بیانات جاری کریں۔''

یہ میری خلوت نشینی کا آغاز تھا جس نے مجھے ہمیشہ راحت بخشی۔

••

جب کبھی ابا جی کو ڈینش شاعرات میں خودکشی کرنے والی شاعرات کی داستانیں سناتی تو وہ ہنستے ہوئے کہتے، ''کوئی اچھی مثال بھی ڈھونڈو گندی مکھی لڑکی! مکڑی بن جاؤ۔ ڈینش خواتین کی جد و جہد سے ایسے کردار نکالو جو عزم و ہمت کی مثال ہوں۔ بلندی سے گرنے کا مطلب شکستگی ہی نہیں

ہوتا، نئے زینے کی تعمیر بھی ہوسکتا ہے جس پر آپ کے بعد لوگ بلندیوں کا سفر طے کریں گے۔ اپنی اولاد کے منہ میں چڑیوں کی طرح چوگا ڈالنے والی ماں کے مقابلے میں ہفت ہزاری باپ بھی ہیچ ہے۔ ہم منہ کا نوالہ چھیننے کے لیے نہیں آئے بلکہ اپنے نام کی مہر والے دانے بھی بکھیرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہمیں غیر اللہ سے سہارا مانگنے نہیں بلکہ اس کے بندوں کو سہارا دینے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ہماری بچپن کی کہانیوں میں پانی کا پیالہ اگلے ساتھی تک بڑھا دینے کی داستانیں شامل ہیں۔ بس یہ نہیں بھولنا کہ زیور اور جائیداد کمزور عورت کے ہاتھ کا اسلحہ ہے۔ تم زیور کو مٹی کا ڈھیلا سمجھنے والی ایک ماں کی اولاد ہو۔ تمھیں اٹھنا ہوگا جانِ پدر۔ ان بچوں کی ماں اور باپ تم ہی ہو۔ تم بادشاہ نہیں ہو لیکن بادشاہ گر ہو۔''

••

ابا جی مجھے ہمیشہ ڈاکٹر کے پاس جانے اور اسے ہر بات بتانے پر زور دیتے تھے۔ میں نے ایک دن تفصیلی ملاقات کا وقت لے ہی لیا۔ ڈاکٹر نے بے حد تحمل اور سکون سے میری بات سنی۔ خوابوں، خوف اور دل کی دھڑکن کی بے اعتدالی کی تفصیل سن کر کچھ چیک اپ لکھ کر دیے۔

''پوسٹ ٹرامیٹک سٹریس ڈِس آڈر ہے یہ۔'' ڈاکٹر نے آہستہ سے میرے ہاتھ کو چھوا، ''یہ کوئی ایسی انہونی یا پریشانی والی بات نہیں۔ پے در پے حادثات انسانی ذہن کو منتشر کر دیتے ہیں۔ پھر آپ تو عام لوگوں سے زیادہ حساس ہیں۔ اس پر مستزاد ایک طویل بیماری سے نبرد آزما ہیں۔ آپ کو ریلیکسنگ کی دوا کھانا پڑے گی۔ اینٹی ڈپریسنٹ ادویات کا کورس کرنا ہوگا۔ اور آپ کی قوتِ ارادی کی تو ہم داد دیتے ہی ہیں۔ گھر کے دھماکے کے بعد آپ کو مکمل جسمانی آرام اور ذہنی سکون چاہیے تھا جو ظاہر ہے بھائی کے ایکسیڈنٹ اور جدائی سے جاتا رہا۔''

''پھر اس جذباتی دھچکے کے بعد مزید پریشانی اور غیر معمولی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر نئے فیصلے کرنا اور اپنے بچوں کو ایک مثالی ماں دینا قابلِ تحسین بات سہی، لیکن اب رک کر یہ بات مان لیں کہ انسان کے جسم کی برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ بھی مان لیں کہ آپ جسمانی طور پر بھی پیٹ کے ایک سنجیدہ عارضے کی مریضہ ہیں۔ ملازمت کرتی ہیں، پڑھتی ہیں، بچے پالتی ہیں، اور کیا چاند پر جھنڈا گاڑنا ہے؟'' وہ بہت سنجیدگی سے سوال کرتا۔

ایک طویل عرصہ تک مجھے نفسیاتی معالج کے پاس بھیجا جاتا رہا۔ یہی ڈاکٹر تھی جس نے بالآخر ایک تفصیلی رپورٹ لکھ کر قائل کیا کہ مجھے صرف لکھنا چاہیے۔ ''باقاعدہ تدریس کا کام اب تمھارے

بس کا روگ نہیں۔ تمھیں سب سے پہلے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تم ایک قیامت سے گزر کر آئی ہو۔ اگرچہ تم نے ذمہ داریاں نباہنے کی کوشش کی ہے لیکن دماغ اور بدن بیک وقت تھک چکے ہیں۔''

میری ملازمت کے اوقات نصف کروانے میں ان ڈکٹرز کا ہی ہاتھ تھا۔ اس نظام کو یہاں ''فلیکس جاب'' کہا جاتا ہے جہاں گھنٹے تو کم ہو جاتے ہیں لیکن تنخواہ اور مراعات وہی رہتی ہیں۔

میں اپنی ماہرِ نفسیات ڈاکٹر کی شخصیت سے بھی شدید متاثر تھی۔ اس نے ایک چھوٹے بچے طرح میرا خیال رکھا۔ اس کا کلینک عمارت کے اندر تھا اور مجھے باہر گاڑی تک جانے میں دقت ہوتی۔ وہ خود مجھے دروازے تک چھوڑنے آتی۔ گرم جوش انداز میں بتاتی کہ ''تم بہت بہادر ہو بھئی، بہت مثبت ذہنی روش ہے تمھاری۔''

ہماری آخری ملاقات پر اس نے جو بات کہی وہ مجھے آج بھی اسی طرح یاد ہے۔ ''تمھارے روشن بچپن اور تمھارے والد کے ذہنی سہارے نے تمھیں بچا لیا ورنہ یہ بیماری اور حادثے اچھے اچھوں کے قدم اکھیڑ دیتے ہیں۔ میرے پاس اس سے پہلے کبھی کوئی مریض ایسا نہیں آیا جو اتنی شدت سے خوف کے اس گڑھے سے نکلنے کے لیے کوشاں ہو۔'' اس کی حوصلہ افزائی مجھے نئی امید دیتی۔

''اور ہاں، تمھیں کوئی نفسیاتی عارضہ نہیں ہے۔ تمھیں محبت کی بیماری ہے''، وہ ہنستی، ''انسانوں سے محبت، ہمسایوں سے، بچوں سے بے لوث اور بے غرض محبت۔ تو پھر جب ایسے غیر معمولی حادثات ہوں گے تو درد تو ہوتا ہے ناں۔ شکست و ریخت بھی ہوتی ہے، اعصابی جنگ ہوتی ہے تو سنبھلنے میں وقت لگتا ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ ایشیائی معاشرے میں ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی بہت قابلِ فخر سلوک نہیں ہوتا لیکن آپ نے یاد رکھنا ہے کہ آپ ذہنی مریض نہیں ہیں، زخمی ہیں تو بس علاج تو کروانا ہوگا۔''

اس ممتا بھری ڈاکٹر نے مجھے تمام تر سہولیات اور ابتدائی مرحلے پر ایسی ریٹائرمنٹ لے کر دینے کے تمام انتظامات کیے جس سے میں اپنی مرضی سے پروجیکٹس کے تحت اتنا کام ہی کروں جسے کرنے پر جسم اور ذہن دونوں آمادہ ہوں۔

آخر میں اباجی کی طرح نرمی سے بولی:

''تم یہ ساری داستان لکھو۔ ڈینش زبان میں بھی لکھو تا کہ ڈنمارک کو علم ہو یہاں کتنی بہادر عورت رہتی ہے۔ سارے تصورات بدل دو بے چاری ایشیائی عورت کے۔''

••

آج دس برسوں کے بعد میں جب یہ سب کچھ لکھنے بیٹھی ہوں تو مجھے یہ ساری باتیں یاد آرہی ہیں اور پھر اسی عجیب سے احساسِ جرم نے دل کو آ گھیرا ہے جس سے ابا جی کو شدید نفرت تھی، ''کسی کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ اس خود ترسی اور احساسِ جرم سے انسان کو باہر نکلنا چاہیے اور ایک نئی تعمیر کا عزم ہونا چاہیے۔ تعمیرِ نو پہلے سے زیادہ بہتر ہوتی ہے، زیادہ خوش ادا ہوتی ہے اور اپنی مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔ اپنی مرضی کے فیصلے کرنا سیکھو۔ تم دیکھ لو وہ گھر جل گیا۔ حکومت دوبارہ تین ایک جیسے گھر پھر بنا دے گی۔ جب تک انسان کی سانس چل رہی ہوتی ہے، دنیا میں کچھ بھی ایسا نہیں جو دوبارہ حاصل نہ ہوسکے ماسوائے ایک اس انسانی سانس کے۔''

میرے تصور میں ابا جی کا ایک بے حد مضبوط اور غیر متزلزل حوصلہ، مستحکم لہجہ اور ثابت قدم رویہ تھا۔ شاید اللہ نے ان کو غمگین اور محزون ہونے والا دل دیا ہی نہیں تھا۔ لیکن ان کے جانے کے بعد ایک روز امی نے مجھے بتایا کہ جب تم عزیز کی رحلت کے بعد پاکستان سے ہوکر چلی گئیں تو ایک روز تمھارے فون کا انتظار کرتے رہے۔ فون آنے میں تاخیر ہوگئی تو ٹیلی فون سرہانے رکھ کر اخبار پڑھنے لگے۔ جب چہرے کے سامنے پھیلا اخبار گیلا ہوکر پھٹ گیا تو امی کو محسوس ہوا کہ بیٹے کو کندھا دینے والے، اس کا جنازہ پڑھانے والے اور اسے لحد میں اتارنے والے مرزا صاحب بیٹی کی تکلیف سے قطرہ قطرہ پگھل کر موم بن چکے تھے۔

••

''شہرِ خموشاں میں آتے رہنا چاہیے۔'' ابا جی نے میرا ہاتھ تھاما ''مردہ مٹی کو پوجنے نہیں، عبرت حاصل کرنے، انا کے وحشی درندے کو پابہ زنجیر کرنے کے لیے۔''

میں ان کے ساتھ ساتھ چلتے عزیز بھائی کے مرقد پر پہنچی ''ابا جی! میرا دل نہیں کرتا قبرستان میں قدم رکھنے پر۔'' میں نے اختلاف کیا، ''میرا احساسِ زیاں جاگنے لگتا ہے۔''

''یہ دیکھو بیٹا، یہ شہر ہے۔ اس میں کوئی اَسرار نہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھید بھری خاموشی ہے۔ اس کنجِ خموشاں میں سب کے لبوں پر تالے ہیں اور سب کی چھاتی پر سلیں دھری ہیں۔ سب کی ہڈیاں راکھ ہوچکی ہیں یا ایک مشتِ خاک، جس کو کیڑے مکوڑوں کی دنیا میں حشرات جتنی اہمیت بھی نہیں۔ جانور، بلی، کتا، بجّو، جو چاہے جب چاہے آکر بکھیر دے۔''

میں ان کے سامنے کھڑی بس خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی اور آج جب میں یہ تحریر

کرنے بیٹھی ہوں تو مجھے نہ صرف ان کی موجودگی محسوس ہوتی ہے بلکہ ذہن کے نجانے کس خانے میں جیسے ریکارڈ شدہ آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے میری موجودگی سے بے خبر ہیں اور صرف اپنے آپ کو کچھ یاد کروا رہے ہیں۔

''دیکھو، ایک پھونک تنفس کی مار ہے سب کچھ۔ کیا کج کلاہ، کیا خوش ادا، بے وفا یا باوفا، سعادت مند یا خودسر، زمین پر سر اٹھا کر یوں چلنے والے کہ اس کے سینے میں شگاف ڈال دیں گے۔ بس پانچ چھ فٹ کے بدن میں دوڑتی پھرتی ایک پھونک بھر سانس جو ساتھ چھوڑ دے تو یہاں تک پہنچنے کے لیے بھی وہ سانس والوں کے محتاج ہیں۔

دنیا کے کسی قبرستان میں چلے جاؤ سب نشانِ عبرت ایک جیسے ہیں۔ عشرت کدوں سے نکلنے والے، جھگی اور جھونپڑی سے اٹھنے والے، یہاں آ کر سب برابر ہیں۔ کوئی کسی کو وی آئی پی استقبال نہیں ملتا، کہیں سے ہٹو بچو کی صدا نہیں آتی۔ بے بس، لٹھے کے چند گز کپڑے میں لپٹے اور کافور لگے سب یہاں دوسروں کے کندھوں پر سوار پہنچتے ہیں۔ وہ جس کو جہاں لٹا دے، دم مارے بغیر لیٹ جاتے ہیں۔ کوئی دعویٰ، کوئی عہدہ ساتھ نہیں آتا۔ کوئی حصہ، کوئی وراثت، زمین جائیداد، علم، رزق، کاروبار، سب ان دیواروں سے باہر رہ جاتا ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ آپ زندگی بھر ایک چھت کے نیچے نہیں بیٹھنا چاہتے، ان کے پہلو بہ پہلو رکھ دیے جاتے ہیں:

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

یہ قبرستان ایک طرح سے ہمارا خاندانی قبرستان ہے۔ ابا جی کے سارے دور نزدیک کے رشتے دار سب اختلافات و تنازعات کے باوجود یہیں دراز ہیں۔

مجھے امریکہ، برطانیہ اور ڈنمارک کے گورستان یاد آ گئے۔ امریکہ میں ہمارے سامنے ایک ملتان کی فیملی رہتی تھی۔ ان کی والدہ پاکستان سے آئیں تو نیویارک اتریں۔ گھر تک پہنچنے کے لیے ڈرائیو کے دوران کہنے لگیں واہ مجھے تو یہاں کے پارک اور باغیچے پسند آئے ہیں۔

''نانی اماں'' ان کا سات سالہ نواسہ بولا، ''یہ قبرستان ہیں۔''

اچانک مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ یہ سوچ کر کہ جیسے پوری ایک نادیدہ دنیا خاموشی سے ہمیں دیکھ رہی ہو؛ بابا جان، چاچا جان، بھائی، جیسے سب سن رہے ہوں، بس جواب دینے سے قاصر ہوں۔ کوئی بتلاؤ کہ یہ خاک تماشہ کیا ہے؟

''ابا جی! واپس چلیں'' میں نے واقعتاً گھبرا کر کہا،

''چلو'' وہ فوراً باہر کی طرف چل دیے اور مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ وہاں لے جانے کا مقصد کیا تھا؟

••

میں نے ہوش سنبھالتے ہی ان کو اور امی کو تہجد گزار پایا۔ آخرِ شب کی خاموشی میں اٹھتے اور راز و نیاز میں مصروف ہو جاتے۔ کبھی ان کی زبان سے شکوہ نہیں سنا تھا۔ ابا جی اسی بات پر قانع تھے کہ ہم خوش نصیب لوگ ہیں کہ اللہ کے بندوں کی مدد کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے اوپر اس کے احسانات کا شمار نہیں کر سکتے۔

''اللہ سے مکالمہ کرنا چاہیے'' ابا جی کہتے، ''باخدا دیوانہ باشد با محمد ہوشیار۔ وہ جس نے اپنی مخلوق کو پیدا کیا ہے وہ ان کے حال سے واقف ہے۔ جب امتدادِ زمانہ سے تھکنے لگو اور زندگی کے نت نئے امتحان برداشت اور تحمل کے طائر کے پر قطع کر دیں تو اس سے بات کرنی چاہیے۔ تھکنا اور راستے میں بیٹھ رہنا کم ہمت لوگوں کا کام ہے۔''

''میں کم ہمت ہی ٹھیک ہوں ابا جی، مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔ جب وہ علیم بذات الصدور ہے تو وہ جانتا ہے کہ دل پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ مجھے بغیر مانگے ہی وہ سب دے سکتا ہے جس کی شاید کبھی آرزو بھی نہ کی ہو۔''

بہت دنوں بعد میں نے انھیں کہتے سنا: ''ایہہ تے یاراں والی گل نہ ہوئی۔'' پتہ نہیں وہ کس سے مخاطب تھے۔ میں نے آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھولا۔ ''یار ایہہ تے یاراں والی گل نہ ہوئی۔ میرا بیٹا تو نے لے لیا۔ دنیا کا سب سے بھاری وزن میں نے اٹھایا، اسے لحد میں اتارا، جنازہ پڑھایا، قبر کو مٹی دی، اور تو جانتا ہے میں نے اف نہیں کی۔ لیکن میری بچی کو تو زندگی اور ہمت عطا فرما دے۔ یہ وزن اٹھانے کی سکت نہیں مجھ میں۔ لا یکلّف اللہ نفسًا الّا وسعھا۔ میرے معبود مجھے میرے نفس کی وسعت سے زیادہ کا مکلف نہ کرنا۔ ابا جی کے سجدے طویل ہوتے گئے۔ لہجہ مضبوط ہوتا گیا۔ فیصلہ بے لچک رہا اور تحمل کی وسعت لامحدود۔ ابا جی نے ہی مجھے فیصلہ کرنا اور پھر اس پر ڈٹ جانا سکھایا۔ حرفِ انکار کہنا اور پھر اس کی حرمت قائم رکھنا۔ ان حیات افزا جاگتی ہوئی راتوں میں، میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ابا جی کسی جذباتی خلفشار اور سماجی دباؤ کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر تیار نہیں ہوئے۔ ''میری بیٹی کی زندگی اور فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے۔''

••

میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ ابا جی شاید ضرورت سے زیادہ ہی ازدواجی معاملات اور مسائل کے حل میں ساس بہو کا جھگڑا ڈھونڈ نکالتے ہیں اور ایک ہی بات دوہراتے ہیں کہ ہمیں اپنے رویے بدلنا ہوں گے ورنہ نئی نسل کے لیے بہت آزمائش کا دور شروع ہوجائے گا۔ یہ رویے ہی ہوتے ہیں جو مخاطب کو براہِ راست مساوات کے درجے پر اپنے جیسا انسان سمجھتے ہیں۔ کریہہ رویے، وہ جو عورت کو بہت کمتر، بہت ہیچ جان کر سکیڑتے سکیڑتے ایک حقیر سا نقطہ بنا کر معاشرے کے کینوس کے کسی کونے پر چپکا دیتے ہیں۔ اختیار اور اقتدار جب نااہل لوگوں کے ہاتھ آتا ہے تو انسانوں کے اندر کوئی نیا فرعون پرانا نعرہ لگاتا ہے کہ انا ربکم الاعلیٰ، تو اللہ اس کے لیے کوئی موسیٰ بھی پیدا کر دیتا ہے۔ ذات کی گہرائی سے جب کوئی نمرودیت جنم لیتی ہے تو آگ کے الاؤ ضرور بلند ہوتے ہیں۔ لیکن کسی بلند بخت کے لیے یہی نار، گلزار بننے کو بھی ہمہ وقت آمادہ ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نسبِ ابراہیمی ہر کسی کا مقدر نہیں ہوتا۔ سو دنیا میں یہ جو ہر سو نفرتوں کی آگ دہک رہی ہے اور جنگوں اور بمباری کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے یہ سب اسی نمرودیت، فرعونیت اور یزیدیت کے اظہار کی غلیظ شکلیں ہیں۔ لیکن ہم اسے محض بڑی طاقتوں کا کھیل کہہ کر بری الذمہ نہیں ہوسکتے کیونکہ بعینہٖ اسی انداز کے کھیل گھروں کی مملکتوں میں بھی جاری ہیں۔ کوئی بھی نقطے جتنی بڑی طاقت ملکوں کو برباد کرتی ہے، گھر والوں کو آگ لگاتی ہے، نسلوں کو تباہ کرتی ہے اور شعلوں بھری ایسی خلیج حائل کر دیتی ہے جسے کسی کے پچھتاوے کے آنسو بھی سرد نہیں کر سکتے۔

ساس اور بہو کے ازلی جھگڑوں میں بیٹی کے سسرال سے فسادات کے دوران میاں اور بیوی کے اختیارات، اطاعت گزاری کے دوران پھٹتے چولھے، کھانے میں کم نمک یا زیادہ مرچ پر حالات کی چکی میں پس جانے والی عورتیں، محبت کرنے والی ماں کے روپ میں داماد کو پھٹکارتے اور بیٹی کو کلیجے سے لگاتی عاقبت نااندیش عورتیں، گول گرم روٹی اور تازہ دم کی ہوئی چائے کے احکامات کی حکم عدولی پر گھر کی چار دیواری سے دھتکاری ہوئی عورت، صرف والدین کے خوابوں کی تکمیل کرنے کے لیے مزاجوں میں شرق وغرب کے بُعد باوجود ایک ازدواجی رشتے میں بندھے بچے، نوجوانوں کی غفلتوں اور نفرتوں کا شکار بے بس بڑھاپا، معصوم نونہال اور مرد و زن جن سے مل کر محوری ظلم کا شکار ایک ایسا معاشرہ بنتا ہے جہاں یہ سب اپنی اپنی دنیا میں جنگی حربوں اور ہتھیاروں کا ہدف ہیں۔

تو حل کیا ہے؟ کیا جنگ ایک اور خونیں جنگ سے، اور ظلم مزید ظلم سے مٹے گا؟ مجھے اکثر ابا جی کی باتوں کی سمجھ نہیں آتی کہ وہ عالمی سطح سے بات کر کے اسے گھریلو سطح پر کیوں جوڑ دیتے تھے۔

بہترین حل یہی ہے کہ آپ اپنی ذات کی حد تک، کبر و اِستکبار کی کونپل کو اسی لمحے جڑ سے کچل ڈالیں کیونکہ جب یہ تناور شجر بن جائے تو پھر فقط پچھتاوے ہاتھ آتے ہیں۔ عزیز بھائی کے جانے کے بعد، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ابا جی کے لیکچر چلنے لگے۔

''امی جی، ابا جی کو کیا ہوگیا ہے؟'' میں نے ایک دن باقاعدہ تشویش سے پوچھا۔

''مجھے کچھ نہیں ہوا جانِ پدر'' ابا جی بات کو اچکتے ہوئے بولے۔ ''جب سے میں نے اپنے ہاتھ سے جوان بیٹے کو لحد میں اتارا ہے، مجھ پر منکشف ہوگیا ہے کہ یہ مال و دولتِ دنیا اور رشتہ و پیوند صرف سانس بھر کا کھیل ہے۔ بس یہ تنفس کی روشنی کو بدن سے نکلنے دو پھر ایسی تاریکی پھیلتی ہے کہ تدفین کے لیے بھی دوسروں کے محتاج ہو جاؤ۔ کوئی مٹی دے یا نہ دے، کفن نصیب ہو یا نہ ہو۔ جتنے دم رگوں میں زندگی کی روانی ہے اسے غنیمت سمجھو اور اپنی ذات کو حرص، ہوس، انتقام، اور پچھتاوے سے حتی الوسع دور رکھو۔ جہاں تک ممکن ہو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے بوند بھر روشنی لے لو کہ جس نے کوڑا پھینکا، اس کی عیادت کو جانا ہے۔ دوسروں کو معاف کرنا اپنی ذات کے لیے راستے سہل کرنا ہے۔ اور پھر یہ بھی تو احسان ہے کہ اللہ کسی کو معاف کرنے والا بنائے، دست بستہ معافیاں مانگنے سے پناہ دے۔''

میں کبھی کبھار یہ سوچتی ہوں، کاش اس وقت علم ہوتا کہ یہ لیکچرز کتنے قیمتی ہیں اور ایک وقت وہ بھی آئے گا جب میری زندگی ایک ایک لمحے کا تصور کر کے ایک ایک لفظ دوہرائے گی۔

••

ابا جی نے عمر بھر ایسے لوگوں کی پنچایت میں راضی نامے کروائے جو زمین جائیداد پر ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے تھے۔ شاید انھیں یہی خیال دامن گیر تھا کہ اپنی زندگی میں ہر چیز کا فیصلہ کر جائیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ خاندان ہی میں سے کسی نے ابا جی سے کہا کہ اچھے وقتوں میں پلاٹ خرید لیتے تو اچھا تھا۔ ابا جی نے جواب دیا ''میں نے اپنی اولاد کو تعلیم دلوانے میں سارے وسائل صرف کیے ہیں۔ اب یہ خود پلاٹ خریدتے پھریں۔ اور ویسے بھی انسان کی بنیادی ضرورت ایک چھت ہے۔ باقی سب اضافی اور دنیاداری کا لالچ ہے۔''

عزیز بھائی کے حادثے کے بعد ایک دن لیٹے لیٹے جانے ان کے خیال میں کیا آئی۔ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ میں فون پر بچوں سے بات کر رہی تھی۔ رسیور رکھا تو کہنے لگے:

''بات سنو۔ ادھر آؤ میرے پاس۔''

میں چونک اٹھی۔ انداز بہت سنجیدہ تھا۔ میں پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔

''یہاں آجاؤ۔'' انھوں نے بستر پر جگہ بنائی۔

''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس دنیائے فانی میں کچھ بھروسہ نہیں کب چراغِ زندگی بجھ جائے۔''

مجھے سمجھ آ رہی تھی کہ یہ تمہید ہے لیکن کس بات کی؟

''میں نے اپنے بڑے بچوں کی تعلیم اور عملی زندگی میں قدم جمانے میں بھرپور مدد کر دی۔ آج آپ سب اپنے اپنے مقام پر کھڑے ہیں۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ مکان آپ کے چھوٹے بھائیوں کے نام کر دیا جائے۔ آپ پھر واپس چلی جائیں گی۔ آپ سے اجازت بھی لینی ہے اور مشورہ بھی۔'' انھوں نے بہت سہولت سے کہا۔

''اجازت؟ میری کیا مجال آپ کو کوئی اجازت دوں ابا جی۔ آپ کے عمر بھر کے خون پسینے کی کمائی ہے۔ آپ کلّی طور پر مختار ہیں۔ جسے چاہیے اس کے نام کریں۔''

''تو ٹھیک ہے۔ پھر بسم اللہ کرو اور سب سے پہلے دستخط کر جاؤ۔''

اگلے دن نہ جانے کس قسم کا کاغذ آیا۔ اس دن عطا بھائی ابا جی کے پاس بیٹھے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ عزیز بھائی کی طرح امی کے پیروں کی طرف بیٹھتے اور پاؤں دباتے۔

''لایے جی اپنا طلسمی کاغذ اور ہمارے دستخط۔ سب سے پہلے اس پر میں نے دستخط کیے۔ پھر عطا بھائی نے کاغذات اپنے سامنے سرکا لیے۔ ابا جی نے اپنا وصیت نامہ جاری رکھا۔

''عزیز الرحمٰن کا پلاٹ اس کے بیٹے وجیہہ الرحمان کا ہے۔ میرا پوتا جس باپ کا بیٹا ہے اس کی طرح بہت ذہین نکلے گا۔ اس کا خیال رکھنا۔''

''ابا جی!'' میں نے آرام سے کہا، ''اب یہ وصیت نامہ ختم کیجیے۔ مجھے پریشانی ہونے لگی ہے۔ آپ نے تو ابھی اپنے پوتوں کے سر پر خود سہرے باندھنا ہیں۔''

''نہیں بیٹا۔ میں نے جو دیکھنا تھا دیکھ لیا۔ بس وجیہہ الرحمٰن کا خیال رکھنا ہے۔ وہ میری آنکھوں کا نور ہے۔''

یہ پڑی ہے تیری دنیا۔ جس انسان کا دامن خدا نے طمع اور ہوس کے دھبوں سے مطہر رکھا ہو اسے دنیا چھوڑنے کی تیاری نہیں کرنا پڑتی اور دمِ واپسیں کوئی ملال نہیں ہوتا۔

••

ہمارے گھر کے سامنے ایک ڈینش فیملی تھی۔ سٹین کسی فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ بڑی بیٹی سین اور پھر دو بیٹے سکول جانے والے تھے۔ سب سے چھوٹا بیٹا بے حد پیارا تھا اور سیڑھیوں پر آتے جاتے اکثر ہیلو ہائے ہوجاتی تھی۔ لیکن میں نے بھی اب سوچ رکھا تھا کہ ہمسائیوں اور ان کے بچوں سے دور رہنا ہے۔ دراصل حادثات اتنا دکھ نہیں دیتے جتنا محبت اور حادثات کا شکار ہونے والوں سے قربت روح کی عمارت منہدم کرنے کے درپے ہوتی ہے۔ میں نے بات رسمی سلام دعا سے آگے نہیں بڑھنے دی، نہ ہی حسبِ معمول ان کو گھر آنے کی دعوت دی اور نہ فالتو بات چیت کی۔ میرے تصور میں ابھی سیٹا اور اس کے چار بچے اسی طرح زندہ تھے۔ اب مجھے سیکھنا تھا کہ مزید محبت اور خوف نہ پالا جائے۔

ایک روز دروازے پر اطلاعی گھنٹی کے جواب میں دروازہ کھولا۔ سامنے تینوں بچے اپنے باپ کے ساتھ پھول، پھلوں اور چاکلیٹ سے بھری خوبصورت ٹوکری لے کر کھڑے پائے۔

میرا دل چاہا دھڑام کر کے دروازہ بند کر دوں لیکن تیسرے اور چھوٹے بیٹے کی معصوم سبزی مائل نیلی آنکھوں میں بھی مسکراہٹ تھی۔ وہ منتظر نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اب میرے پاس ان کو اندر آنے کی دعوت دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ شام کو ابا جی کو فون کر کے روداد بیان کی کہ آج پھر ہمسائے آٹکرائے، تو وہ بولے، ''اللہ کی رحمت ہوتے ہیں ہمسائے۔ ویسے بھی انسانی دماغ اچھے واقعات زیادہ یاد رکھتا ہے اور سانحات کی یاد پر گرد ڈالتا رہتا ہے۔''

ابا جی نے گھر کے دھماکے کے بعد کے خوف اور آزردگی سے نکالنے میں ڈاکٹروں اور ادویات سے کہیں بڑا کردار ادا کیا تھا۔ ہمیشہ مجھے سمجھاتے، ''دیکھو بچے، وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ جوں جوں ایسے واقعات پر گزرتے لمحوں کی گرد پڑتی ہے وہ معدوم ہوتے چلے جاتے ہیں۔''

''اچھا! لیکن ابا جی یاد ہے ناں، آپ نے ہی بتایا تھا کہ اقبال نے اپنی والدہ مرحومہ کی یاد میں لکھا تھا:

وقت کے افسوں سے تھمتا نالۂ ماتم نہیں
وقت زخمِ تیغِ فرقت کا کوئی مرہم نہیں

ابا جی یقیناً مسکرائے ہوں گے۔ ''اچھا، درست۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حافظہ ٹھیک ہو رہا ہے تمھارا۔ چلو اب واپس اپنی زبان و بیان پر کام کرو۔ تلفظ بہت خراب ہو چکا ہے اور مطالعے میں وسعت کی بھی ضرورت ہے۔''

''توبہ۔ اف۔ ابا جی؟'' میری شاعری کے غبارے کا حجم کم ہونے لگا۔ یہ ناقدین بھی

ناں، سوئی چبھونے میں دیر نہیں کرتے۔

''آزمائشیں زندگی کو بہتر بنانے کے لیے آتی ہیں۔ خلا میں جب جہاز بھیجے جاتے ہیں تو مدار میں داخل ہونے کے لیے وہ راکٹوں کے محتاج ہوتے ہیں جو یکے بعد دیگرے جل جل کر علیحدہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نئی بلندیوں اور دنیاؤں کا سفر ایسے ہی ہوتا ہے۔''

''شکر ہے ابا جی آپ نے عقاب والا شعر نہیں پڑھا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

آنے والے دنوں میں یہ تینوں بچے میری زندگی کا حصہ بن گئے۔ سین کو پاکستانی بوائے فرینڈ مل گیا۔ وہ صوفے پر پسر کر آرام سے فرمائش کرتی...

''صدف! دیکھو مجھے آلو گوشت اور چاول بنانے سکھا دو۔''

''صدف مجھے اس نظم کی سمجھ نہیں آئی۔'' اس کا درمیانی ہونہار بیٹا کہتا۔ اسے علم تھا میں سکول میں بچوں کے ساتھ ڈینش مضمون پر خصوصی کام کرتی ہوں۔

چھوٹو کی اپنی فرمائشیں تھیں۔ ''صدف مجھے پڑھانا مت، مجھے بس نان بنا دو۔''

میرے پاس انکار کا حق ہی نہیں چھوڑا انھوں نے۔ اکثر ویک اینڈ پر جب سین باپ کے پاس رہنے آتی تو مجھے ضرور ملتی۔ ایک مرتبہ ان کی نانی نے مجھے اپنی سالگرہ پر بلایا تب مجھے علم ہوا کہ ان کی ماں بھی انھیں چھوڑ کر ایک نئے ہمسفر کے ہمراہ نئے گھر میں جا چکی تھی۔

مارے خوف کے میری گھگھی بندھ گئی۔ لیکن سین کہنے لگی کہ میرے والدین دونوں ڈینش ہیں اور اس کلچر کو سمجھتے اور اس کا احترام کرتے ہیں۔ جیسے پاکستانیوں میں خاوند ایک بیوی کی موجودگی میں مزید بیویوں کے انتخاب کے لیے آزاد ہے اور تم لوگ اسے تسلیم کرتے ہو، حتیٰ کہ مردوں کی گرل فرینڈز کے بارے میں جانتے بوجھتے ان کو نظر انداز کرتے ہو۔ جیسے میرا پاکستانی بوائے فرینڈ ایک ڈینش سے دوستی رکھ سکتا ہے لیکن اس کی بہن یہ ''گناہ'' نہیں کر سکتی۔

سٹین اور اس کا خاندان چونکہ ہمارا کلچر سمجھتا تھا اس لیے ان کے ساتھ بہت دوستانہ تعلقات رہے۔ سٹین اور اس کے بچے اکثر بازار جاتے ہوئے پوچھتے کچھ سودا منگوانا ہو تو بتا دو۔ ایک شام اس کے بیٹے کو چوٹ لگی تو وہ اسے لے کر ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ چلا گیا۔ رات گیارہ بجے اس کے بیٹے کا فون آیا، ''پلیز میرے لیے کھانا بنا کر دروازے کے باہر رکھ دینا۔ مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔ میں نے چاول کھانے ہیں۔''

''درد اور چاولوں کا باہمی تعلق کیا ہے؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''بس تم بنا دو ناں، مجھے درد جو ہو رہا ہے۔ یہ تعلق کافی ہے۔'' اس نے ناراض لہجے میں کہا۔

سٹین کی والدہ اسّی برس سے اوپر تھیں۔ اور بقول سٹین، شدید نسل پرست تھیں۔ جب بچوں نے انھیں بتایا کہ نئے پڑوسی پاکستانی اور مسلمان ہیں تو انھوں نے شور مچا دیا کہ اس فیملی سے دور رہنا۔ وہ پہلے ہی اپنی پوتی سے نالاں تھیں۔ اکثر پوتوں سے کہتیں کہ ان ہمسایوں سے بچ کر رہنا۔ آنے والے سالوں میں ان کی رائے کچھ مثبت ہونا شروع تو ہوئی لیکن ان کی سوئی وہیں اٹکی رہی کہ مسلمان شدید دقیانوس اور ظالم ہوتے ہیں، بیٹیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔

چند سال بعد اتفاق ہوا کہ انھیں غذا کی نالی کا سرطان ہو گیا جس کی وجہ سے وہ کھانا نہیں کھا سکتی تھیں۔ میں نے ان کے لیے چکن سوپ بنا کر بھیجا جو انھیں بہت پسند آیا۔ انھوں نے شکریہ کہلا بھیجا۔ میں نے سبزی، مرغی اور دال کا مختلف اقسام کا پتلا سوپ بنا کر ایک ایک کپ کی صورت میں فریز کیا۔ اس کے اوپر تاریخ اور سوپ کی تفصیلات لکھیں اور ان کو بھجوا دیا۔ جواب میں انھوں نے بھی مجھے لال گلاب بھجوا دیا۔

چند مہینے کے بعد مجھے اپنی صحت کے مسائل کی وجہ سے ہسپتال جانا پڑا۔ سٹین نے مجھے ٹیکسٹ بھیجا کہ میری ماں تمھارے ہی ہسپتال کی نچلی منزل پر ہے اور بس اب اس کی زندگی کے آخری ایام ہیں۔ میں نے اسے پوچھا کہ کیا میں ان سے ملنے جا سکتی ہوں۔ جواب آیا شوق سے جاؤ۔ میں نے فوراً اپنا گاؤن پہنا اور ان کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ جواب ملنے پر آہستہ سے دروازہ کھولا۔

سامنے بستر پر دراز ایک نحیف و نزار ڈھانچے نے ہاتھ اٹھایا اور ترشی سے کہا:

''تم غلط جگہ آ گئی ہو، نکلو یہاں سے، جاؤ۔۔ جاؤ۔''

تیلی سی کلائی پر اٹکے چھوٹے سے استخوانی ہاتھ نے مجھے جیسے اشارے سے دھتکارا۔ میرے قدم وہیں پر منجمد ہو گئے۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ پلٹ جاؤں لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے انھیں کہا،

''میں آپ ہی کو دیکھنے آئی ہوں۔ میں سین اور سٹین کی بلڈنگ میں رہتی ہوں۔''

''اوہ، اچھا'' فضا میں بلند کمزور سا ہاتھ آہستہ سے نیچے ہو گیا۔ درشت لہجہ یکلخت نرم پڑ گیا۔

''آ جاؤ، آ جاؤ'' وہ اٹھ نہیں سکتی تھیں لیکن انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا۔

"تم رائٹر ہوناں؟ سٹین نے مجھے بتایا تھا۔ ہاں سوپ کے لیے بہت شکریہ۔ تم بہت اچھا کھانا بناتی ہو۔ سیبین مجھے بتاتی ہے کہ تم عام مسلمانوں جیسی نہیں ہو۔ مختلف ہو۔ تم ان سے بہت پیار کرتی ہو۔"

مجھے سمجھ نہیں آئی کہ میں اس بیان پر خوشی کا اظہار کروں یا شرمندہ ہو کر چپ ہو جاؤں۔ اس کے بعد میری ان سے چند ملاقاتیں ہوئیں۔ بہت محبت سے ملتیں اور پرانے قصے سناتیں۔ پھر ان سے زیادہ بولا نہیں جاتا تھا۔ میں ان کے پاس بیٹھ جاتی اور ہم دونوں خاموشی کی زبان میں باتیں کرنے لگتیں۔

مجھے ان کے جانے کا بہت غم ہوا۔ لیکن جب مجھے سٹین نے اور بچوں نے ان کی وصیت کے مطابق ان کے کمرے میں کئی سالوں سے رکھے پلاسٹک کے پھول دیے تو مجھے بے انتہا مسرت ہوئی۔

••

عزیز بھائی کے جدا ہونے کے بعد ابا جی نے اپنا کمرہ چھوڑ کر مستقل ٹھکانہ بڑے کمرے کو بنا لیا۔ ہزار ان کی منت سماجت کی جاتی کہ آپ گھر کے دوسرے حصے میں جو کمرے ہیں وہاں آرام کیا کریں تا کہ آئے گئے کا شور آپ کے آرام میں مخل نہ ہو۔ امی کے خوبصورت باغیچے پر اب کمرے اور ملحقہ غسل خانے تعمیر کیے جا چکے تھے۔

ابا جی کا نظریہ تھا کہ بیٹوں کو بیاہنے سے پہلے ان کی رہائش قاعدے کی ہونی چاہیے تا کہ آنے والی بچی کو سہولت دی جا سکے اور ایک گوشۂ عافیت اس کا اپنا ہو۔ بہت سے جھگڑوں کی ابتدا ہی اس سے ہوتی ہے کہ استطاعت رکھنے کے باوجود اور وسائل کے ہوتے ہوئے بھی ایک نئے فرد کو لا کر ایک کمرے میں محبوس کر دیا جائے اور وہ واحد غسل خانے کے استعمال کے لیے گھر کے باقی افراد کے ساتھ قطار میں لگ جائے۔

ان کا موقف بہت واضح تھا کہ مجبوری کی صورت میں ایسے گھرانوں میں عورتوں کی تربیت لازم ہے کہ بہتر طریقے سے مسائل کا حل نکالیں۔ نئی آنے والی بچی کی سہولت کا خیال رکھا جائے۔ بچے معاشی طور پر اپنا آشیانہ تعمیر کرنے کے قابل ہو جائیں تو بصد مسرت و افتخار انھیں رخصت کریں تا کہ بیٹے الگ ہونے کو جرم نہ سمجھیں اور اماں اور بیوی کے درمیان پنگ پونگ نہ کھیلیں۔

ابا جی نے ہمیشہ دوسروں کا آرام اور سہولت پیشِ نظر رکھی۔ خود جب بھی گرمیوں کی رات کو کبھی دیر سے گھر آئے، بے آواز قدموں سے خود دودھ میں باقر خانی ڈال کر کھا لیتے اور جہاں جگہ ملی جا کر خاموشی سے دراز ہو گئے۔ کبھی کسی کو زبان بندی کا حکم نہ دیا، کبھی کسی پر نہ گرجے برسے کہ میرے آرام کرنے کا وقت ہے شور نہ مچاؤ۔ کسی بیٹے کی التجا بھری پیشکش کو قبول نہ کیا کہ ابا جی

میرے پاس آ کر رہیں۔ ابا جی وہاں الگ کمرہ خالی پڑا ہے، اے سی لگا ہے، غسل خانہ ملحق ہے، آپ کو وضو کی سہولت ہوگی۔ سردیوں میں وہاں براہِ راست گرم پانی آتا ہے۔ چلیے اس کمرے میں آرام کریں۔ لیکن انھوں نے کبھی چند قدم دور اس کمرے کو اپنا ٹھکانہ نہیں بنایا۔ انھیں پسند تھا کہ اپنے بچوں اور اہلِ خانہ کے درمیان بیٹھیں۔

••

گھر کی آتش زدگی کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا بلکہ اس نے ڈنمارک کو حقیقی معنوں میں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ سیٹا کے کئی پاکستانی دوست تھے۔ اس کے بقول وہ ایک راسخ العقیدہ عیسائی تھا اور ہر اتوار کو اپنے بچوں سمیت کلیسا بھی جایا کرتا تھا۔ یہوا کی مقامی سربراہ سوزی اس کی قریبی دوست تھی۔ اس نے باقاعدہ طور پر میرے ساتھ رابطہ کیا اور سیٹا کی اور بچوں کی باتیں کرتی رہی۔ اکثر وقت بے وقت آ ٹپکتی۔ کبھی ہاتھ میں ایک ننھا سا پھول لیے، ''دیکھو میں تمھاری خاطر اپنے گھر سے لائی ہوں۔'' وہ بہت اہتمام سے تنہا پھول کو شیشے کے گلدان میں سجاتی۔

''اٹھو ناں، باہر نکلا کرو۔ دیکھو آنکھوں کو کتنے حلقے پڑے ہیں تمھارے۔''

وہ مجھے بہانوں سے باہر چلنے کے لیے اکساتی۔

''تمھارا چہرہ اداس ہو کر ذرا اچھا نہیں لگتا۔ تم ہنستی ہوئی بہت خوبصورت لگتی ہو۔ پریشان نہ رہا کرو۔''

وہ نرمی سے میرے بالوں کو تھپتھپاتی۔

''سوزی ابھی میرا دل نہیں چاہ رہا۔ تم چائے پی لو۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔ وہ سمجھ گئی کہ اب اسے رخصت ہو جانا چاہیے۔ اس نے اہتمام سے بیٹھ کر چائے پی۔ ایک دو بسکٹ اٹھا کر ٹھونگے اور بولی:

''میں تمھیں بائبل پڑھ کر سنایا کروں گی۔ دیکھنا تمام غم، پریشانی اور بیماری جاتی رہے گی۔''

میرے پاس خاموشی سے سننے کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔

چند دن گزرے تو سوزی پھر آن دھمکی۔ میں نے دروازہ نصف کھولا اور کوشش کی کہ اسے بتاؤں کہ میرے سر میں شدید درد ہے اور وہیں دروازے سے ہی ٹہلا دوں۔ لیکن اب کے اس کے ساتھ ایک دبلی پتلی بلکہ نحیف و نزار ہندوستانی بچی موجود تھی۔

''صدف، ہماری یہ ساتھی رمنا انڈیا سے آئی ہے۔ یہ تم سے اردو میں بھی بات کرے

گی۔'' سوزی نے اسے یوں میرے سامنے پیش کیا جیسے اس نے ہندوستان دریافت کیا ہو اور میرے لیے کوہِ نور لے کر آئی ہو۔

''اچھا، اندر آجائیں''۔ میرے پاس پورا دروازہ کھولنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ رمنا سے گپ شپ کی۔ اتفاق سے گھر میں اُسامہ کے ہاتھ سے بنے سبزی کے فلافل اور عربی حمس پڑا تھا۔ دونوں نے شوق سے کھایا اور چلی گئیں۔

اس کے بعد میں محتاط ہوگئی۔ میں نے دروازے پر بجنے والی گھنٹی کا جواب دینا چھوڑ دیا بلکہ اطلاعی گھنٹی ہی اتار دی۔ چند ماہ خیریت سے گزر گئے۔ ایک دن میں گھر سے نکلی اور سامنے کی سڑک پار کر کے سوئمنگ ہال کی طرف چل دی۔ ابھی میں نے شیشے کے بڑے داخلی دروازے سے اندر قدم رکھا تو کسی نے چیخ مار کر کہا،

''ہائے صدف، تم کہاں چلی گئی تھیں؟ ادھر آؤ۔ تمھیں ایک بڑا اور گرم جوش معانقہ دوں۔ ہم انسانوں کولمس کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''اچھا میری ماں''۔ میں نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ سفید رنگ کی ٹی شرٹ اور نیلے سکارف میں سوزی کی نیلی آنکھیں ہنس رہی تھیں۔ وہ فٹنیس سنٹر میں ملازمت کرنے لگی تھی۔ لو جی، موسی نسیا گورتوں تے گوراَ گے کھلی۔ اس خاتون نے قسم کھا رکھی تھی کہ میرے تعاقب میں رہے گی۔ میں نے اخلاقاً اس کے جن جپھے کا مقاطعہ نہ کیا۔ اس کی گرفت سے نکلتے ہوئے میں نے یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، لیکن وہ مسلسل بولے گئی۔

''صدف میں تمھارے لیے بہت پریشان رہی۔ میں تمھارے گھر آنا چاہتی ہوں۔ سوچو تو بھلا کیا اچھی خبر ہے میرے پاس۔ اب ہمارے پاس اردو میں بھی بائبل آگئی ہے۔ تمھیں بہت آسانی ہوگی۔'' اس نے موبائل نکالا۔

یااللہ! حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے۔ میں نے بے بسی سے سوچا۔ فٹنیس سنٹر کے قریب رہتے ہوئے اس سے چھٹکارا ممکن نہیں تھا۔ اسے علم تھا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور میں گھر ہی میں ہوتی ہوں۔ آخری دفعہ جب وہ آئی تو اس کے ہاتھ میں اپنا تبلیغی لٹریچر بھی تھا۔ اس نے مجھے اردو کی بائبل دی اور کئی انفرادی مضامین کے کتابچے بھی۔ پھر اس نے اپنی بائبل کھولی اور رضاکارانہ ہی پڑھنے لگی،

''شیطان تمھیں تمھارے ماضی کے طعنے دے تو اسے اس کے مستقبل کی خبر دو۔''

دیکھو پیاری صدف، اس ڈپریشن کا علاج بائبل پڑھنا ہے۔تم جب چاہو میں تمھارے پاس آسکتی ہوں۔'' اس نے فیاضانہ پیشکش کی۔

''سوزی!'' میں نے اب کے واقعی لجاجت سے کہا۔''دیکھو، نفسیاتی مریض وہ ہوتا ہے جسے مرض کے اسباب معلوم نہ ہوں۔ مجھے علم ہے میں کیوں بیمار ہوں۔ مجھے ان پانچ زندگیوں کے راکھ ہوجانے کا ملال ہے جو تاحیات رہے گا لیکن مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ زخم بھرنے ہی والے ہیں۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتو وہ ایسا ہی ردِعمل دے گا۔ چلوتم چائے پیو اور گھر کا بنا ہوا پنیر کیک کھاؤ۔''

چائے پینے کے دوران میں نے اسے بتایا کہ مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں اور انھیں مقدس گردانتے ہیں۔ قرآن میں ان کا تذکرہ ہے اور ان کی والدہ کے نام کی ایک پوری سورت ہے۔''

''ہاں مجھے علم ہے، سورۃ مریم۔'' اس نے گھنگھریالے بالوں سے بھرا سر ہلایا۔ سرخ بالوں کے حصار میں کسی بے پناہ جذبے کی شدت سے چمکتی آنکھوں میں ایک عزم تھا۔ دنیا کو مسیحی تعلیمات سکھانے کا نصب العین، لوگوں کو بائبل کی تفہیم اور تدریس کا فریضہ انجام دینے کا جنون۔ اس سلسلے میں وہ نہ تو کسی کے رویے سے شکستہ دل ہوتی نہ کسی کے انکار کو قبول کرتی، اور ہنستی مسکراتی چند ہفتوں بعد پھر آٹپکتی۔

اتنے میں فون کی بیل بجی۔ دوسری طرف ابا جی تھے۔ میں نے تقریباً مشتعل ہوکر کہا، ''ابا جی وہ مبلغہ پھر آئی ہے۔ ذرا اس سے نمٹ لوں۔ پھر فون کرتی ہوں۔''

''نہیں میرے بچے، وہ آپ کے گھر ایک پیغام کے ساتھ آئی ہے۔ اسے تحمل سے سن لیں اور سبق سیکھیں کہ مسلمانوں کو بھی اسی استقلال کے ساتھ اپنے دین کی اشاعت اور قرآن کی تفہیم کی کوششیں کرنا چاہییں۔ آپ کو تو اس کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اس نے آپ کو سوچنے اور مدلل جواب دینے کا موقع دیا۔ اس نے آپ کو بائبل پڑھ کر سنائی۔ آج اسے قرآن کی ایک آیت کا تحفہ دے کر بھیجیں۔ اسے بتائیں کہ مومن بھی مصیبت اور آزمائش میں اللہ ہی کو یاد کرتا ہے۔ طیش میں آنا کسی مسئلے کا حل نہیں بلکہ مزید مسائل کا باعث بنتا ہے۔''

میں فون بند کر کے آئی تو میرا انداز بدل گیا تھا۔

''تم نے اپنے والد کو میرا سلام کہنا تھا'' سوزی نے کہا،''جب وہ ڈنمارک آئیں گے تو میں ان کو بھی بائبل پڑھ کر سناؤں گی۔ یقیناً وہ میری بات سمجھیں گے۔'' سوزی یوں بولی جیسے ابا جی

کو بائبل پڑھانا اس کے بچپن کا شوق تھا۔ پھر اس نے سلسلۂ تکلم وہیں سے جوڑا جہاں منقطع ہوا تھا۔

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ پھر اسے مفصل بتایا کہ جو لوگ اسلام کی اصل روح کو سمجھتے ہیں وہ کسی سے برا سلوک نہیں کرتے اور ہمیشہ خوش رہتے ہیں کیونکہ اپنی ذات کے ساتھ امن کے معاہدے ہر خارجی عہد نامے سے ضروری ہیں۔

میں نے اس کے بعد گھر تبدیل کر لیا اور بہت خوش ہوئی کہ اب اس سے جان چھوٹی۔ لیکن میری قسمت کہ سوزی میرے گھر کے قریب ایک بڑے شاپنگ مال میں آ ٹکرائی۔ وہ اپنی روایتی گرم جوشی سے ملی۔ مجھے چار و ناچار بتانا پڑا کہ یہاں رہتی ہوں۔ بیٹی کی شادی ہوگئی ہے۔

''واہ۔ مبارک ہو۔ اچھا ایڈریس اور موبائل نمبر دو۔ کسی دن ملتے ہیں۔'' حسبِ معمول اس کا لہجہ بشاش تھا اور چہرہ پر عزم۔

''اڈ جا نڑی'' میں نے دل ہی دل میں اسے جھاڑا۔

پھر وہ ایک اطالوی مبلغہ کو لے کر میرے پاس آئی اور اب کے اس نے بتایا کہ ہم نے سارا اردو تبلیغی لٹریچر آن لائن کر دیا ہے۔ میں تمھیں وھاٹس ایپ پر اردو میں بائبل کی آیات بھیجا کروں گی۔ تمھیں بہت اچھا لگے گا اور دل کو سکون ہوگا۔''

''یااللہ، یاارحم الراحمین''، میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر سوزی کی جھلملاتی بے نیاز آنکھوں میں ایک نئے عہد کی جھلک دیکھی۔ وہ موبائل پر اردو بائبل کھولتی، اس میں آیت نمبر دیکھتی، پھر ڈینش بائبل سے وہی آیت نکالتی اور دونوں آیات پیسٹ کر کے مجھے بھیج دیتی۔ اب میں نے تحمل سے اسے برداشت کرنا سیکھ لیا تھا۔

تب سے آج تک سوزی میرے ساتھ کسی نہ کسی انداز میں جڑی رہتی ہے۔ کسی نہ کسی طرح مجھے کھوج نکالتی ہے اور کسی نہ کسی طرح مجھے اردو بائبل کے اقتباسات وھاٹس ایپ کے ذریعے بھیجتی رہتی ہے۔

••

دنیا کے فاصلے واقعی سمٹ چکے۔ ایک کلِک کا کھیل ہوگیا سب کچھ۔ میں نے ایک دن فیسبک پر این کو دیکھ لیا۔ چشم زدن میں اذیت اور آتش و آہن کا وہ تمام خارزار میری یاد کے ننگے پاؤں میں دوبارہ پیوست ہوگیا۔

رابطہ ہوا۔ اس نے بتایا کہ وہ سب کچھ تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر چکی ہے۔ جو کام علیحدگی

اور طلاق کی وقتی اذیت سے حل ہوسکتا تھا اسے دھمکیوں، دھماکوں اور غیر انسانی رویوں سے حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ زندگی کے قدم رکتے تونہیں۔

میں نے اسے کہا کہ میں کوشش کر رہی ہوں کہ اس رات کی وحشت ناک یاد کو قلم بند کر کے اپنے ذہنی اور جذباتی نظام سے نکال دوں۔ کہنے لگی:

''بالکل، ضرور لکھو، جس زبان میں تمھارا جی چاہے لکھو۔ تم ایک بہادر عورت ہو، زندگی کو اپنے کنٹرول میں رکھنے والی، اسی لیے آج قلم تھامے ہوئے ہو۔ مجھے نہیں علم تم کیا لکھتی ہو لیکن فیس بک پر تمھاری مسلسل تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمھارے پاس لکھنے کو بہت کچھ ہے۔''

اسے کون بتائے کہ دکھ دریا سے پار اترنا شاید یہ بھی مجبوری ہے۔ لیکن ایک بات تو بہرکیف طے ہے کہ زندگی کے امتحانات اپنی جگہ، لیکن خودکشی کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈینش میں جو کتاب لکھنے کا ارادہ ہے اس کا نام ہی، ''قتل یا خودکشی، موت جس نے مجھے جینا سکھایا'' ہے۔

••

بچپن دوڑتا پھرتا ہے ہرنوں سا

پرانی یادیں ہوا کے لطیف اور خوشگوار جھونکوں کی طرح ذہن کی کھڑکی پر دستک دے رہی ہیں جیسے مجھے خوابِ غفلت سے جگانے کی کاوش میں مصروف ہوں۔ زندگی کے زینے جس قدر بھی پیچ دار ہوں، بچپن کی پہلی سیڑھی کی ہموار سطح، ہاتھ تھام کر زینہ زینہ طے کرتے ہاتھ، گرنے سے سنبھلنا سکھاتے وجود اور قدم مضبوطی سے رکھنا سکھاتی ہستیاں، قسمت کے باقی مراحل سے نمٹنے کا ہنر آسان تر کر دیتی ہیں۔ یہی بچپن اگر شفقت، محبت، توجہ اور حوصلہ افزائی سے عاری ہو تو زندگی کا ایک حصہ ضرور تاریک رہتا ہے جسے بعد میں کمائی جانے والی روشنی بھی اجالے میں نہیں بدل سکتی۔

فرائیڈ نے یہ نظریات بہت دیر سے بیان کیے۔ اس سے بہت پہلے فطرت یہ مظاہر پیش کر چکی تھی۔ زندگی میں شادمان اور مسرور رہنا، یا اسے منفی انداز میں دیکھنا، یاسیت، پژمردگی کے رجحان کا زیادہ ہونا، کہیں نہ کہیں اندرونی اور داخلی کیفیات سے آتا ہے۔ مجھے اپنے گھر کی آتش زدگی کے سنگین حادثے سے گزرنے کے بعد ایک طویل عرصہ ماہرِ نفسیات کے پاس جانا پڑا۔ ایک دن اس نے کہہ دیا کہ تمھارے خوش باش بچپن کی یادوں نے اور تمھارے والد کی توجہ نے تمھیں مستقل ڈپریشن کے کنوئیں میں نہیں گرنے دیا۔ مسکراتا ہوا بچپن آپ کے رویے تعمیر کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تم اپنے بچپن کی یہ سب یادیں لکھو۔

جب میں نے قلم اٹھایا تو سب سے پہلے جو یاد میرے ذہن میں ابھری وہ چاندنی اور خوشبو کی تھی، یا شاید چاندنی رات میں خوشبو کے بھیگے ہوئے جھونکوں کی تھی۔ دائیں اور بائیں پہلو میں نہر اور دریا، وسط میں چاندنی سے نہایا ایک آنگن، پھولوں، پھلوں، درختوں اور سبزیوں کی مخلوط خوشبو سے لبریز اس آنگن میں آوازیں چہکتی تھیں۔ بیرونی دروازے کے کھلنے اور بند ہونے سے

مہمان اور اجنبی لوگ گھر میں یوں داخل ہوتے جیسے خارجی زندگی ازخود اپنا تعارف کروانے کے لیے حاضر ہوگئی ہو۔ گھر کے اندرونی دروازے کھلتے تو الماریوں پر، کھڑکی کے سامنے کی سل پر، بستر، تکیے اور میز پر کتابیں، اخبارات اور رسائل دکھائی دیتے۔ شعور کی آنکھ بیدار ہونے کی یاد تک میں نے اس چھوٹے سے گھر میں بچوں، عورتوں، مریضوں، دوستوں اور رشتے داروں کی آر جار دیکھی۔ تھوڑی سی چیز کو بانٹ کر کھانا سیکھا۔ کتابوں اور علم کو تقسیم ہوتے دیکھا۔ اس گھر میں باہر کی دنیا سے الگ دنیا بستی تھی جس میں ابا جی کی اور امی کی آوازیں اس دنیا سے تعارف کرواتی تھیں۔

ابا جی رات کو ڈھلی چاندنی میں صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ جاتے اور کہانیاں پرسکون چاندنی کی طرح بکھر جاتیں۔ تایا جان کے باغیچے سے اٹھتی رات کی رانی کی خوشبو چاندنی میں گھل کر مجھے دکھائی دینے لگتی۔ چاند آسمان کے نصف میں آ کر ٹھہر جاتا۔ صحن کی دیوار کے ساتھ دربانوں کی طرح کھڑے پپیتے کے درختوں کا سایہ متحرک محسوس ہوتا۔ پھر آہستہ آہستہ چاندنی واپس آسمان کی طرف چل دیتی۔ پہلے سیڑھیوں پر سمٹ کر بیٹھ جاتی، پھر اس سے اگلی سیڑھی پر، پھر چوبارے کی سحر زدہ اینٹوں کی آنکھوں پر ذرا رک کر انگلیاں پھیرتی اور پھر ایک دم نجانے کہاں چھپ جاتی۔ بچپن کی بے شمار راتیں میں نے اس کے آنے اور جانے کے راستوں کا سراغ لگاتے گزار دیں۔

••

ابا جی کی زندگی کی واحد عیاشی ستاروں بھرے آسمان والا صحن تھا۔ ایسا گھر جس کے آنگن میں بیٹھے ہوئے ہوا آپ کو چھو کر گزرے۔ تنگ چھوٹے گھروں اور گلی محلے کی رہائش سے شاید ان کا دم گھٹتا تھا۔ چھت پر چلے جاؤ تو ایک طرف نہر سے آتی گنگناتی ہوائیں اور دوسری طرف دریائے جہلم کی لہروں کو چوم کر آتی عطر بیز ہوائیں باہم گفتگو کرتیں۔ مجھے ایسے لگتا جیسے چاند ان کی باتیں مکمل صیغۂ راز میں رکھنے کے وعدے پر سنتا ہے۔ ستارے ہونٹوں پر انگلیاں رکھے آدابِ محفل نبھاتے ہیں۔ میں بچپن میں جب یہ اوٹ پٹانگ باتیں کرتی تو میرا چچا زاد بھائی وثوق سے کہتا:

''یہ بڑی ہو کر پاگل ہو جائے گی۔'' میں خلافِ معمول چپ رہی۔ حالانکہ میں دل میں یہی سوچتی کہ تم جیسوں کو تو میں پاگل بنا کر رہوں دو منٹ میں۔

''بڑے ہو کر نہیں، ابھی پاگل ہے'' باقی لقمہ دیتے، اور میں جب تک شکایتوں کی پتنگ کے پیچھے مبالغہ آمیزی کی ڈور باندھ کر ان کی جھاڑ پونچھ نہ کروا لیتی آرام سے نہ بیٹھتی۔

••

ذہن کے تہہ خانے کو اترتے زینے کے آخری سرے پر کھڑی ان یادوں کی صدائیں کان لگا کر سنتی رہتی ہوں جو دور کہیں لاشعور کی دلدل سے ابھرتی ہیں۔ ایک شیریں لحن...

''اٹھو میرا بچہ۔۔۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔''

لحاف کو کانوں کے گرد کس کر لپیٹنے کے باوجود مدھر آواز گھر میں گونجتی، ''جانِ پدر! وقت کم رہ گیا ہے۔ بچووو! اٹھ جاؤ، نماز جاتی رہے گی۔'' پھر خاموشی چھا جاتی۔

مستعد قدم مسجد کا رخ کرتے جہاں برسہا برس کے معمول کے مطابق پہلے سے ہی پہلی صف میں کھڑے اپنے لالہ جی کے کندھے سے جا کندھا ملاتے۔

واپسی پر ان کی آواز کا لحن، پکار کی مٹھاس شاید مسجد میں ہی کہیں رہ جاتی۔ سب کو سوتا پا کر صورِ اسرافیل گونجتا، ''الو دئیو پٹھیووو! سورج نکل آیا ہے، نحوست ختم نہیں ہوئی۔

دھڑا دھڑ، سب گرتے پڑتے اپنے مقابر سے نکل بھاگتے۔ دونوں غسل خانوں کے دروازے بند ہو جاتے۔

بڑے بھائی جان اکثر امی جی سے شکایت کرتے پائے جاتے...

''فجر کی نماز دوپہر کو ہوتی تو کتنا اچھا تھا۔ اب اگر سورج آدھی رات کو نکل آئے تو کیا ہم سب بھی آدھی رات کو اٹھ کر بیٹھ جائیں؟''

ادھر دیوار کے پار سے تایا جان کے کمرے سے ایک دلکش صدا تعاقب کرتی: ؎

گل از رخت آموختہ نازک بدنی را بدنی را بدنی را
بلبل ز تو آموختہ شیریں سخنی را سخنی را سخنی را
ہر کس کہ لب لعل ترا دیدہ بہ دل گفت
حقّا کہ چہ خوش کندہ عقیقِ یمنی را یمنی را یمنی را

••

مجھ سے زیادہ گرمی کبھی برداشت نہیں ہوتی تھی اور میرے لیے خصوصی طور پر شربتِ صندل بنوایا جاتا تھا۔ کبھی کالج سے واپسی پر ابا جی کہتے کہ شکنجبین میں ادرک کے چند قطرے بھی ڈال دیا کرو۔ ایرانی اس کو شہد اور سرکے سے ملا کر بناتے ہیں۔ حکماء اس میں ادرک اور دار چینی کے قطرے ڈالنے کی تجویز دیتے ہیں۔

گھر میں جمائے دہی میں دودھ ڈال کرلسی بنائی جاتی اور میرے چچازاد بھائی چھیڑتے،
''ایہہ کڑی تے ادھ رڑ کے پینیدی اے۔''

ابا جی کو ہمیشہ اس بات کا بہت خیال ہوتا کہ بچے پھل ضرور کھایا کریں۔ موسمی پھل ہمیشہ گھر میں موجود ہوتے۔ مجھے ہمیشہ سے گرمیوں میں آم پسند رہے۔ خوب ٹھنڈے آم ہونے چاہییں اور کٹے ہوئے ہوں۔ ایک دفعہ گرمیوں میں بجلی تا دیر بند رہنے لگی۔ ان دنوں ہمارے کالج میں نفسیات کے پریکٹیکل ہو رہے تھے۔ میں سب سے آخر میں گھر آتی۔ ابا جی نے میرے لیے دو آم برف کے کولر میں ڈال دیئے۔ گھر آتے ہی مجھے فوراً نکال کر دیئے۔ بعد میں حسبِ معمول دہی کی لسی کا بڑا گلاس دینا۔ آج بھی میں ان کی شفقتوں کا سوچتی ہوں تو شدت سے احساس ہوتا ہے کہ وہ سراپا تسکین و راحت کا پیکر تھے۔

شام کو امی جی نے اپنے محبوب پودوں سے لیموں اتارنے۔ ان کی عجیب عادت تھی کہ اپنے پودوں کے پھل تک گنے ہوتے تھے۔ میں تنگ کرتی کہ امی پتے بھی گنا کریں۔ شام کو امی جی نے اہتمام کے ساتھ لیموں توڑے اور شکنجبین بنانے کے لیے برف نکالی تو کولر سے آموں کی مہک اٹھی۔ امی جی ناراض ہوگئیں کہ اتنے بڑے کولر کی ساری برف میں آم کی خوشبو اور ذائقہ آ گیا ہے، اب جس چیز میں بھی ڈالوں گی آم کی خوشبو آئے گی۔''

ابا جی ہمیشہ کی طرح تحمل سے بولے، ''بے چاری اتنی گرمی میں آئی تھی۔ آپ کو علم ہے کہ اسے یخ آم ہی اچھے لگتے ہیں۔''

••

ہمارے بالمقابل اے ڈی ادیب (اللہ دتہ ادیب) صاحب کا خاندان رہائش پذیر تھا۔ اے ڈی ادیب صاحب کو علمی و ادبی سرگرمیوں کا بے انتہا شوق تھا۔ ابا جی اکثر ان سے کہا کرتے کہ اے ڈی ادیب صاحب سکول تعمیر کیجیے۔ جہلم کے پل پر مشاعرہ کرنے کی ریت انھوں نے ہی ڈالی تھی اور وہ اس سلسلے میں ابا جی سے باقاعدہ مشورہ کرنے آئے۔ کہنے لگے، ''مرزیاں دے بغیر مشیرہ (مشاعرہ) تے ہونڑا ای نئیں۔''

ابا جی اور ان کے لالہ جی بہت ذوق شوق سے گئے۔ انور مسعود صاحب کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا۔ میری شدید خواہش کے باوجود مجھے جانے کی اجازت نہ ملی۔

''میں کیوں نہیں جاسکتی ابا جی؟'' میں نے اپنا راگ الاپنا شروع کیا۔

''اس لیے کہ خواتین کے لیے انتظامات نہیں ہیں۔''

کورا جواب سن کر میرا منہ بقول امی کے، ہا کی جتنا لمبا ہو گیا۔

میں ابا جی کے ایک دوست کی بیٹی کی شادی کا واقعہ بھی نہیں بھولی۔ قریبی گاؤں کے ابا جی کے یہ دوست اپنی فوج میں ملازمت کے زمانے میں جنرل ضیاءالحق کے دوست تھے۔ کرنل صاحب وفات پا چکے تھے لیکن جب ان کے اہلِ خانہ نے بیٹی کی رخصتی کے موقع پر جنرل ضیاءالحق کو بلایا تو وہ شرکت کے لیے آ گئے۔ ابا جی جنرل صاحب کے اس عمل سے بے حد متاثر ہوئے اور گھر آ کر کہنے لگے کہ باقی جو بحث مباحثے ہیں وہ اپنی جگہ، لیکن ایک مرحوم دوست سے دوستی نباہنے کا یہ جذبہ مجھے تو بہت متاثر کر گیا ہے۔

••

یہ اس شام کا ذکر ہے جب خوب بارشیں ہو رہی تھیں۔ موسم ذرا سا بدلا۔ مجھے تایا جان کے گھر سے سوندھی سوندھی خوشبو آئی۔ میں نے دیوار سے ہی آواز دے کر پوچھا ''کیا ہو رہا ہے؟''

''پکوڑے بن رہے ہیں''، جواب ملا۔

میں نے فوراً اپنی کتاب الثانی اور حسبِ عادت دیوار پھلانگ کر دوسری طرف اترنے کی کوشش کی۔ پتہ نہیں کمبخت دیوار بھی مجھے خوار کروانے کی سازش میں شامل تھی۔ میرے زمین پر لینڈ ہوتے ہی میرے پیچھے میری اقتدا میں دیوار بھی زمین بوس ہو گئی۔ وہ تو شکر ہے میری جست کی رفتار اس سے تیز تھی۔ ہمارا ننھا بھتیجا اور آج کا چائلڈ سپیشلسٹ ڈاکٹر احسان اللہ مرزا، اپنی موٹی موٹی آنکھیں پھاڑے حادثے کا واحد عینی شاہد تھا۔

''امی، دیوار اور پھوپھو دونوں گر گئے ہیں۔''

وہ پھولی سانسوں سے بھاگتا ہوا اندر گیا۔ آن کی آن میں حواس باختہ امی اور باجی خالدہ، حفیظہ، جائے واردات پر آ موجود ہوئیں۔ میں نے کوشش کی کہ چھلے ہوئے گھٹنے اور مڑی ہوئی کہنی کی تکلیف چہرے پر نمودار نہ ہو۔

''ساڈا رستہ روک نئی سکدے پئے چڑھاون کنداں''

میں نے آرام سے کپڑے جھاڑے اور پنجابی تقریر کا رٹا ہوا ایک شعر پڑھا۔

امی نے محاورتاً نہیں حقیقتاً جوتا اتار لیا، ''بے ہودہ توں جُتی کیتھوں ساڈے گھر پیدا ہو گئی ایں؟ یہ کیا حرکت ہے (امی نے ویسے لفظ لچھن استعمال کیا تھا) کہ جب کوئی کام کہا، چھڑاپی مار کے

ادھر۔ کام چور کہیں کی۔"

ہم نے بازو پر سے مٹی جھاڑتے ہوئے کانوں پر ہاتھ مار کر مسلسل ہوتی ہوئی بے عزتی نما کوئی چیز جھاڑی، "امی، آپ ہی کہتی ہیں اللہ کی مرضی کے بغیر پتہ نہیں ہلتا۔ اگر یہ دیوار ہلی ہے تو اللہ کی مرضی۔"

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا
جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا

••

ابتدائی بچپن سے ہی میں نے دونوں گھروں میں ہر طرح کے پرندوں اور پالتو جانوروں کی موجودگی دیکھی تھی۔ طوطے، چڑیاں، خرگوش، مرغیاں، کبوتر، بلیاں، کتے اور مور وغیرہ ہمارے لیے اجنبی نہیں تھے لیکن جب کبھی کوئی سہیلی آتی تو اس کے لیے یہ گھر کم اور چڑیا گھر زیادہ ہوتا تھا۔

ایک میسنی سی کونج تو ہمارے گھر میں میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی سے موجود تھی جو ہمارے مرحوم تایا زاد بھائی ڈاکٹر احسان مرزا کی نشانی تھی جسے وہ شکار کے دوران کہیں سے لے کر آئے تھے۔ کونج کہانی اتنی مرتبہ دوہرائی گئی کہ اس کی تمام تر صفات ہمیں ازبر ہوگئیں۔ شاعری اور کونج کا سدا بہار ساتھ رہا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے وہ اداس آنکھوں اور لمبی سی گردن والی ملگجی سی بوڑھی کونج کبھی پسند نہ آئی۔ باغیچے میں یوں پھرتی جیسے سب پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے اور موقع ملتے ہی مخبری کرے گی۔

پھر تایا جان کہیں سے سرخاب لے آئے۔ گھر میں سرخاب کی آمد کی ایک الگ ہی کہانی تھی۔ ہم سکول سے آئے تو ہمیں بھی بڑے فخر سے بتایا گیا کہ یہ سرخاب ہے۔ بستہ پھینک کر اس کا معائنہ کرنے کے لیے پہنچے۔ عجب ہونق، بدنما سا پرندہ تھا۔ بلکہ پہلی نظر میں تو یوں لگا جیسے کسی گھریلو مرغی کو پرانی بارشوں کے پانی سے دھلی بدرنگی سی چادر اوڑھنے کے لیے دے دی گئی ہو۔ اس کی چال بھی عجیب مضحکہ خیز تھی۔ سست اور بے ڈھنگی سی۔ پرندوں والی نزاکت، ادا یا حسن کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ ہمارے ذوقِ جمالیات کو یقیناً ٹھیس پہنچی ہوگی۔ اس سے زیادہ حسین تو ہماری بطخیں ہیں۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ سرخاب کا پر، محاورہ کیوں بنا ہوگا؟

ہماری ہی طرح گھر میں موجود دو پرانی "ٹرکی" بھی اسے بغور دیکھ رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں، ہونہہ، ہم اتنے حسین اور کبھی کبھار انڈوں سے نوازنے والے جوڑے کے سامنے اس

''کوجے'' کی کیا حیثیت۔

تایا جان نے جب سرخاب کے متعلق شعر سکھانے کی کوشش کی تو میں نے احتجاجاً سیکھنے سے انکار کر دیا اگرچہ میرے پرندوں اور جانوروں کے تمام تر شوق تایا جان کے گھر ہی پورے ہوتے۔ امرود کے پیڑ کے نیچے بندھی بندریا ''شیلا'' سے تو مجھے ویسے ہی خدا واسطے کا بیر تھا۔ بھائی لوگ ہنستے کھیلتے مجھے تنگ کرتے اور کہتے کہ تم دراصل اس بندریا سے جلتی ہو۔ آتے جاتے منہ چڑانا اور خوخیانا اس کا مشغلہ تھا اور جب کبھی شومیِ قسمت اس کی رسی کھل جاتی تو وہ اگلی پچھلی کسر نکال لیتی۔ جو اس کے ہاتھ لگتا اسے مار پیٹ کر بال کھینچ کر انتقاماً گزشتہ شرارتوں اور احتیاطاً آئندہ کی 'ممکنہ' زیادتیوں کا حساب برابر کر لیتی۔ پھر دواخانے کا کوئی ملازم آ کر اس کو جتنوں سے قابو کر کے باندھ دیتا۔

میں نے بچپن میں تایا جان کے گھر رنگ برنگے پودوں کے ساتھ دو کتے بھی دیکھے۔ ٹائیگر تو بالکل کالا کتا تھا۔ دن کو اسے باندھ کر رکھا جاتا اور رات کو کھول دیا جاتا۔ ڈبو البتہ بھورا اور سفید دھبے دار نخریلا سا کتا تھا۔ ٹائیگر چند ہفتے کا تھا جب اسے گھر لایا گیا۔ اس نے تمام عمر وفاداری سے چوکیداری کرتے گزار دی۔ جب ضعیف ہو گیا تو حکما نے مشترکہ فیصلہ کیا کہ اب اس بے چارے کو عمر کی قید سے آزاد کر دینا چاہیے۔ ایک دوپہر کو اسے کسی خواب آور دوا کی بھاری مقدار دی گئی۔ بچوں میں سے صرف عرفان بھائی کو علم تھا کہ اب ٹائیگر کبھی نہیں جاگے گا۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔

امی جی شام کو کھیر بنا کر لے گئیں تو ان کو رو رو کر بتایا کہ جب میں مرتے ہوئے ٹائیگر کو آواز دی تو اس نے آخری مرتبہ بہت نقاہت سے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر سر ڈال دیا۔ ان دنوں اس پر ایسے غم کی چھاؤنی چھائی تھی کہ میں نے مصمم ارادہ کیا کہ اب کبھی اس دکھیارے سے جھگڑا نہیں کروں گی۔ یہ الگ بات کہ یہ ارادہ ریت کی دیوار ثابت ہوا۔

وسیع صحن میں انگور کی بیل، جو لگتا تھا جیسے احتراماً سر جھکائے کھڑی ہو، موسم آتا تو انگوروں کے گچھوں کے وزن سے مزید کمر خمیدہ ہو جاتی۔ اس کے سائے میں پانی کی ٹونٹیاں اور سنک تھا۔ بابا جان ہمیں نیچے لے کر آتے۔ اس کے پتے دیکھو۔ اور انگوروں کے خوشے دیکھو۔ پھر اکثر سرد آہ کھینچ کر کہتے: ''یہ میرے احسان کے ہاتھوں سے لگائی گئی تھی۔''

اگرچہ بابا جان کو داستانیں سنانے کا شوق تھا لیکن ڈاکٹر بن کر عین عالمِ شباب میں داغِ مفارقت دینے والے بھتیجے (احسان اللہ مرزا) کی کہانی وہ کبھی نہ سناتے۔

••

میرے بچپن کی یادوں میں املتاس کی نازک زرد ڈالی، ہار سنگھار کے پھول، رات کی رانی کی خوشبو برساتی شاخیں، پپیتے کے نر اور مادہ پیڑ، کیلے اور امرود کے درخت، ہمیشہ سرسبز رہتے ہیں۔ گلاب، موتیا، اور نجانے کتنے رنگوں کی سبزیاں صحن کے باغیچے میں استراحت فرماتی رہتیں۔ املتاس کی ڈالی تو مجھے اتنی پسند آئی کہ میں نے اس پر ٹوٹے پھوٹے شعر بھی کہے۔

کرشمے دکھاتی ہے املتاس کی ڈالی
روٹھوں کو مناتی ہے املتاس کی ڈالی
منظر کو سجاتی ہے املتاس کی ڈالی
گل کھلتے ہیں امید کے رنگوں کو پہن کر
کیا رنگ جماتی ہے املتاس کی ڈالی
مفلس کی جوانی کا سا جوبن ہے سراسر
ہر دل کو لبھاتی ہے املتاس کی ڈالی

ابا جی کو درختوں اور پودوں سے بہت محبت تھی۔ بلکہ ان کے سب بھائیوں کو ہی قدرتی جڑی بوٹیوں اور پھولوں پودوں سے لگاؤ تھا۔ کچھ تو شاید خاندانی پیشہ ہونے کی وجہ سے اور کچھ ذوقِ جمالیات کی بنا پر گھر کے صحن میں پھول، پودے اور درخت موجود رہے۔

میں نے اپنے بچپن میں گھر میں لگے ہوئے درختوں میں پپیتے کے درختوں کی بہتات پائی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ قطار میں دربانوں کی طرح خاموش کھڑے درخت جن کے کمزور تنے سے جھولنے کی کوشش میں میرا بازو تیسری مرتبہ ٹوٹا، آج بھی میرا دایاں بازو کہنی کے قریب سے ہلکا سا ترچھا نظر آتا ہے۔

ڈنمارک میں ڈاکٹر نے جب پہلی دفعہ خون کے ٹیسٹ لینے تھے تو اس نے بازو کو کہنی سے اوپر ربڑ سے باندھا۔ پھر بازو سیدھا کیا، اسے الٹایا، پلٹایا، پھر حیران ہو کر کہنے لگی،

''یہ کہنی کیسے ٹیڑھی کی تم نے؟''

ہم نے گوش گزارا کہ بہت بچپن کی ایک یادگار ہے۔ اسے فکر لاحق ہوگئی۔ اس نے دونوں بازو جوڑے، کہنیوں کو ایک دوسرے کے برابر رکھا، پھر ان کو دو تین انداز میں جنبش دے کر پوچھا، ''لکھتے ہوئے مسئلہ تو نہیں ہوتا؟''

''نہیں''، میں نے اسے تسلی کروائی کہ بازو ٹوٹنے کے بعد بھی بیڈمنٹن اور والی بال کھیلنے

سے بھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

''اچھا، ہے تو عجیب بات، لیکن چلو اچھی بات ہے کہ تم اور تمھارا پپیتا بازو ٹھیک ہو لیکن ہڈی کمال جوڑی ہے سرجن نے۔''

مجھے جہلم کی ایک چھوٹی سی گلی میں بیٹھا منحنی سا سرجن یاد آ گیا اور اس کے ساتھ ہی بازو ٹوٹنے کا دلخراش واقعہ بھی، جیسے ٹیس ابھی اُٹھی ہو۔

امی جی کو بھی اپنی سہیلیوں کو گھر کے ''کھیتوں'' کی سبزیاں اور اپنے پپیتے بھیجنے کا بہت شوق تھا۔ بے حد اہتمام سے پپیتا کاٹتیں، پھر ابا جی دیر تک اس کے پکے ہوئے نارنجی مائل گودے اور جیلی کی طرح کے کالے موتیوں کی تعریف میں سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم پڑھتے رہتے۔ رنگت اور لذت کو سراہتے۔ ایک دن میں نے کہا ایسا لگتا ہے قدرت نے پیلی طشتری پر سیاہ موتی سجا کر رکھ دیے ہیں، جیسے کسی نے قلم میں کالی روشنائی بھر کر پپیتے میں چھڑک دیا ہو۔

کہنے لگے، پپیتے پر ایک نظم لکھو اور اسی طرح بیجوں کو سیاہ موتی کہہ کر پرو دو۔

مجھے جو اوٹ پٹانگ سمجھ آئی میں نے موتیوں اور پپیتے کو کالے دھاگے میں پرو دیا۔ ابا جی بے انتہا خوش ہوئے۔ اہتمام کے ساتھ اس نظم کو اپنی جیبی ڈائری میں رکھ لیا۔ وہ پپیتا نوش فرماتے، پھر ان کے طبی خصائص پر ایک پرمغز علم افروز درس دیا جاتا اور آخر میں امی جی کی سہیلیوں کو بھجوا دیا جاتا۔

یہ الگ بات ہے کہ مجھے ان میسنے قسم کے درختوں سے ہمیشہ عداوت رہی۔ اتنا قد نکالے کھڑے ہیں اور ایک ذرا سا میرا وزن نہیں سہار سکے، لے کر بازو توڑ ڈالا۔ میری دلدوز قسم کی پنجابی تک بندی پر ابا جی بہت ہنستے، ''اچھا پپیتے کی ہجو کہنے کا ارادہ ہے؟''

میں کیہہ کیتا، توں کیہہ کیتا
کجھ نہ کھادا، کجھ نہ پیتا
کجھ نہ کیتا، فیر پلیتا
میاں مسیتا، کھا پپیتا

رہا یہ چپ چپیتا، میسنا، گھنا سا پپیتے کا درخت، تو اس سے تو میری ذاتی دشمنی رہی ہے۔ جن دنوں آخری مرتبہ میرا بازو ٹوٹا تو میں دیوار پر کھڑی ہو کر پپیتے کے تنے سے جھولا لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس وقت مجھے یہ علم نہیں تھا کہ ان دربانوں جیسے درختوں کے بازوؤں میں اتنی قوت

ہرگز نہیں ہوتی کہ کسی کو جھولا جھلا سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں درخت کے تنے سمیت زمین بوس ہوگئی۔ آنکھوں کے آگے اچانک آنے والے اندھیرے کے پردے کو ہٹا کر مجھے احساس ہوا کہ میرا مظلوم بازو تیسری مرتبہ پھر شکستگی کے عمل سے گزر گیا ہے۔

میں نے کلائی کو دوسرے ہاتھ سے سیدھا کیا لیکن درد کی تیز لہر سے کہیں زیادہ کربناک جملہ ہماری پیاری تائی جان کی طرف سے آیا۔ وہ سامنے ہی اپنے کچن گارڈن سے پالک یوں چن رہی تھیں جیسے مروارید کی لڑیاں بنائیں گی۔ مجھے درخت سمیت سربسجود دیکھ کر ان کے ہاتھ رک گئے، پھر ایک دم دل پر ہاتھ رکھ کر بولیں: ''ہائے میرے پپیتے دا درخت، ہنے تے کندتوں اُچا ہویا سی۔'' (ہائے ہائے میرا پپیتے کا درخت، ابھی تو دیوار سے اونچا ہوا تھا۔)

دونوں گھروں میں موجود افرادی قوت حرکت میں آئی اور حکماء کی بیویوں نے فرمایا کہ کلائی میں موچ آگئی ہے۔ اسے ہلدی کی پٹی باندھو۔

''امی جی!'' میں نے فریاد کی، ''میرا بازو تڑوانے کا وسیع تجربہ ہے۔ میری کہنی سیدھی نہیں ہو رہی، بازو ٹوٹ گیا ہے۔'' امی جی نے ناک چڑھا کر سنی ان سنی کر دی اور میری کہنی کے گرد ململ کی پٹی لپیٹتی رہیں۔

میری زندگی میں گر کر لگنے والی وہ آخری چوٹ تھی۔ شاید میری صنفی حمیت جاگ اٹھی کہ بہت ہوگیا۔ ہر کس و ناکس سے طعنے کھائے، درخت مجھ سے زیادہ ''حرمت و فضیلت'' لے گیا، یا شاید ابا جی کی بھاگ دوڑ اور پریشانی سے ندامت ہوئی اور میں نے سوچ لیا کہ اب حفاظتی اقدامات ایسے ہونے چاہییں کہ یہ نامراد درخت تو زمین بوس ہوں لیکن میں سلامت رہوں۔ یہی حکمتِ عملی آئندہ زندگی میں میرے بہت کام آئی۔

میٹرک کے امتحانات کے بعد جب مجھے ابا جی نے حکم دیا کہ سکول میں بچوں کو پڑھایا کرو تو میں بچوں سمیت ایسی احتیاط سے درخت پر چڑھتی کہ میرے بازو پر خراش تک نہ آئے لیکن درخت کو کیریوں سے محروم کر دیا جائے۔ ہمارے کالج میں بھی بیرونی بڑے گیٹ کے پاس آم کے درخت تھے جس پر طالبات کی حریصانہ نظریں لگی رہتیں لیکن یہاں میں نے کوئی خطرہ مول نہ لیا کیونکہ ٹیلی فون کی وجہ سے اساتذہ کا ابا جی سے براہِ راست رابطہ تھا۔ خوار ہونے سے بہتر تھا کہ اس مشن امپاسبل کی طرف دیکھا ہی نہ جائے۔

●●

میرے بچپن میں میرے دو بڑے حریف تھے۔ ایک تو عرفان بھائی جس کی ذہانت سے میں جلتی رہتی۔ کبھی جھگڑے کرتی، کبھی بابا جان کو شکایات کرتی۔ اور دوسرے ہمارے گھر میں قیام پذیر چچازاد اعجاز بھائی، جس سے میری قطعی طور پر نہیں بنتی تھی کیونکہ اسے بڑا ہونے کا بہت زعم تھا۔

ہمارے گھر میں چونکہ بابا جان، تایا جان اور چچازاد اور تایا زاد بہن بھائیوں کا آنا جانا ایسا عام اور فطری تھا کہ ہوش سنبھالنے سے پہلے تو میرا یہی خیال تھا کہ ہم سب بہن بھائی ہیں، لیکن جب چاچا جان نذیر آتے تو وہ ان کو ابا جی کہتا، تب مجھے سمجھ آئی کہ یہ ہستی بھی عرفان بھائی کی طرح مخالف مورچے میں شامل ہے۔ دوسرے اس کا دل بابا جان کے پاس جانے کو بالکل نہیں کرتا تھا تو عرفان بھائی اس کو بلانے آجاتے۔ دواخانے جانا ہے، کلینک پر بیٹھنا ہے، پنڈی کالج سے کوئی دوست نوٹس لے کر آیا ہے، مجھے علم تھا کہ یہ سب بہانے ہیں اور یہ مجھے کبھی اپنے ساتھ نہیں لے کر جائیں گے۔

میں نے خود ہی چھٹی کے بہانے گھڑے ہوئے تھے۔ بابا جان پیاس لگی ہے، بابا جان نیچے جا کر چائے لے آؤں۔ بابا جان باجی نے ذرا صائمہ اور احسان سے کھیلنے کا کہا تھا، چلی جاؤں؟ جونہی بابا جان اثبات میں سر ہلاتے میں ایسے غائب ہوتی کہ اگلے دن ہی واپسی ہوتی۔

••

سردیوں کی طویل راتیں ہمارے گھر میں درس و تدریس اور داستانوں کی راتیں ہوا کرتی تھیں۔ گھر میں ٹی وی رکھنا ابا جی کے اصول کے خلاف تھا، ''وقت کا ضیاع ہے اور افراد کو دور کرتا ہے۔ لوگ آپس میں بات کرنے کے بجائے ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر یک طرفہ مکالمہ کرنے والا ٹیلیویژن دیکھتے ہیں۔ اپنے ذاتی اختیار اور پسند ناپسند کے بغیر وہ سب دیکھتے ہیں جو ٹی وی دکھانا چاہے۔'' اس لیے موسمِ سرما کی راتوں میں اکٹھے بیٹھ کر مونگ پھلی اور خشک میوہ جات کھانا، کتابیں پڑھنا اور کہانیاں سننا ایک معمول کی بات تھی۔ بہترین خستہ بھنی ہوئی مونگ پھلی میری پسند ہے لیکن مجھے چھیلنے سے بہت خار آتی۔ ابا جی چھیل چھیل کر مٹھی میں دانے جمع کرتے جنھیں وہ خاموشی سے میری مٹھی میں منتقل کر دیتے۔

عمر گزر گئی لیکن مونگ پھلی کا سحر قائم رہا۔ کہیں نہ کہیں اس یاد اور اس لذت کی اسیر رہی۔ آج بھی میرے سفر کے سامان میں مونگ پھلی کے پیکٹ اور ادرک کی چائے کا ڈبہ پڑا رہتا ہے۔ ابلا پانی ڈال کر جب چاہو چائے بنالو۔ ابا جی کے جانے کے بعد ہزار چھلی ہوئی مونگ پھلی پڑی رہتی۔ کبھی کھانے کا لطف نہ آیا۔ ابا جی کی مونگ پھلی کے دانوں سے بھری بند مٹھی میرے ہمراہ

رہی۔ کہاں چھیل چھیل کر اور پھر ختم ہونے پر چھلکوں میں سے دانے دریافت کرنے کی کوشش جس کے مزے کا کوئی مول نہیں تھا۔ مونگ پھلی کے 'توڑے' منگوائے جاتے۔ چکوال سے ان کے دوست سرما کی ابتدا ہی میں کچی مونگ پھلی اور ریوڑیاں بھیج دیتے۔ رات کے کھانے کے بعد امی جی بڑے شوق سے ریت یا نمک کڑاہی میں ڈال کر ان کو بھون لیتیں۔ ابا جی عشا کی نماز پڑھ کر آتے تو بڑے کمرے میں سب بیٹھ کر خشک میووں اور ادرک والی چائے سے لطف اندوز ہوتے جو مجھے اس زمانے میں قطعی طور پر پسند نہیں تھی۔

••

اگرچہ گھر میں ٹی وی نہیں تھا لیکن ہمیں کبھی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ شام کو ابا جی اپنی تدریسی جماعت کا آغاز کرتے۔ انھوں نے اپنے ہی قواعد وضوابط کے مطابق تدریس کے طریقے نکال رکھے تھے۔

جب کپڑے کا پورا تھان گھر میں آتا تو اس کے اندر سے ایک موٹا گتہ نکلتا۔ ابا جی اس کے چوکور مربع کاٹ کر اس پر اپنے قلم سے حروفِ تہجی لکھتے۔ کچھ پر صرف، آ، جا، با، تا، وغیرہ لکھا ہوتا۔ میں، آ، کے آگے حروفِ تہجی لگا لگا کر لفظ بنانے کی کوشش کرتی۔ آن، آج، آل وغیرہ۔

ابا جی لاہور سے الفاظ کے کھیل لائے۔ ایک حرف رکھا جاتا تو اس کے سامنے سابقے اور لاحقے، دوسرے حروف لگا کر ایک لفظ بنایا جاتا اور ایک بڑے تھیلے میں ڈال دیا جاتا۔

••

ابا جی سے چھوٹے میرے پیارے ہنس مکھ چاچا جان نذیر سے میرے بے حد دوستانہ مراسم تھے اور ان کے مزاج میں بچوں سے محبت گندھی ہوئی تھی۔ بے انتہا خوش مزاج۔ ہر مرتبہ پہلے سے سنائی کہانی اور لطیفہ بھول جاتے اور دوبارہ اسی ذوق شوق سے سنانے کی کوشش کرتے تو میں اڑ جاتی کہ چاچا جی سو مرتبہ سنا چکے ہیں، اب کچھ نیا سنائیں۔

''اچھا''، وہ سوچنے لگتے، پھر وہی کہانی نام بدل کر سنانے لگتے۔ بادشاہ کا ملک بدل جاتا، شہزادی کا نام نیا رکھ لیتے، لیکن میں واقعات پکڑ لیتی تو ہنسنے لگتے، ''چل، فیرنس جا۔''

چچا جان کا نام بھی ابا جی کا ہم قافیہ تھا: نذیر احمد مرزا۔ ان کی آواز اور شکل بالکل ابا جی جیسی تھی۔ کئی مرتبہ لوگ دھوکہ کھا جاتے اور میں چاچا جی کو اکساتی کہ ایک دن ڈرامہ کرتے ہیں کہ آپ ابا جی بن کر ان کے دوست کے پاس جایئے۔ لیکن وہ نہیں مانے۔ ''بھئی تمھارا کیا ہے؟ تم تو

لالہ جی کے گھر بھاگ جاؤ گی۔ میرا کیا بنے گا؟" حالانکہ ان کی مماثلت اس قدر تھی کہ ایک مرتبہ ابا جی کے کسی دوست کے گھر کوئی دعوت تھی۔ ابا جی نے معذرت کر لی اور بتایا کہ انھیں گجرات جانا ہے۔ اسی دن چچا جان آ گئے۔ جب وہ نماز پڑھنے مسجد گئے تو ایک صاحب انھیں پریشان ہو کر غور سے دیکھ رہے تھے۔ پھر رہ نہ سکے اور کہا، "مرزا صاحب، آپ کو تو گجرات جانا تھا۔"

مجھے اس واقعے کے بعد بہت شوق ہوا کہ چچا جان کو ساتھ ملا کر کوئی ڈرامہ کیا جائے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح چچا جان کو یہ شاندار تھیٹر کرنے پر رضامند کر لوں لیکن وہ اپنے لالہ جی سے اور ڈرامے کے نتائج سے اتنا ڈرتے تھے کہ صاف انکار کر دیتے۔

انھیں کبھی کبھار سگریٹ پینے کی عادت ہو گئی۔ ایک دفعہ ہم چاچا جان کے گھر بیٹھے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوتے ہی چاچا جان مجھے لینے آئے اور میں ان کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر آئی۔ وہ خوبصورت دن حافظے کے در و دیوار سے سنہری آرائشی تصاویر کی مانند آویزاں ہیں۔ شام کا وقت تھا اور تازہ تازہ چھڑکاؤ کے بعد سوندھی سوندھی مہک نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ چاچا جی مزے سے چارپائی پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ اتنے میں دور سے بڑا بیرونی دروازہ کھلتا نظر آیا۔ اور ساتھ ہی ابا جی نے اندر قدم رکھا۔ دور سے ان کے سلام کی آواز تو نہیں سنائی دی البتہ چاچا جان کا کسی بچے کی طرح پریشان ہو کر سگریٹ پھینک کر فوراً کھڑے ہونا یاد ہے۔ ساتھ ہی ہراساں انداز میں بولے، "لالہ جی آ گئے۔" اور ہمارا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ ان کی کیفیت کو بس یاد کیا جا سکتا ہے، لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

"دند نہ کڈھو بے شرمو"، لالہ جی کو تمباکو نوشی سخت ناپسند ہے اور انھیں علم بھی نہیں ہے کہ میں تمباکو نوشی کرتا ہوں۔

ایک دن میں بیگ میں چھپائے نمک مرچ کو کاغذ پر نکال کر اور چرائی ہوئی کیریوں کے ساتھ اپنے شاگردوں کے ہمراہ پکنک منانے میں مشغول تھی کہ ہمارے چچا زاد بھائی نے چھاپہ مار کر مالِ مسروقہ سمیت رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا اور رپورٹ پیش کرنے کے ساتھ مطالبہ کیا، "تایا جی اس کو سکول سے نکال دیں۔ یہ بچوں کی اخلاقیات خراب کر دے گی۔"

یہ الگ بات ہے کہ کئی مرتبہ شکایت ہونے کے باوجود میں نے موقع محل کی مناسبت سے اس کی بساط بھر "اخلاقی مرمت" کی تھی جس کا خمیازہ میں نے عمر بھر اس کے ساتھ خاندانی دشمنی کی صورت میں بھگتا۔ ہر موقع پر میری شکایات اور خامیاں گنوانے میں وہ صفِ اول میں رہتا۔ میں بھی

خاموشی سے اس کے نوٹس پھاڑ دیتی۔ کبھی اس کے بند جوتوں میں پانی ڈال دیتی، کبھی سفید قمیص پر سیاہی گرا دیتی اور مان کر نہ دیتی کہ مجھ معصوم کا کوئی قصور ہے۔

••

کبھی کبھی مجھے یوں لگتا کہ ہمارا گھر شاید ہوسٹل ہے جس میں کوئی نہ کوئی تعلیم کی غرض سے ٹِکا رہتا ہے۔ چچا جان نذیر مجھے جتنے پیارے تھے، ان کے دخل در معقولات کرنے والے فرزندِ ارجمند سے اتنا ہی بیر تھا، یا شاید وہ باقی سب کی طرح مجھ سے جلتا رہتا تھا۔

بابا جان نے مجھے ہزار مرتبہ منع کیا کہ سیدھے راستے سے گھر جایا کرو لیکن میں ہمیشہ سیڑھیوں اور دیوار کے مختصر راستے کو ترجیح دیتی۔ بھائی لوگ بھی یہی کرتے لیکن شومیِ قسمت میرا پاؤں پھسل گیا اور میں سیڑھیوں کے بجائے لڑھک کر زمین پر لینڈ ہوئی۔ اس مرتبہ چوٹ کا نشانہ میرا پیر تھا۔ میرے پاؤں کی موچ پر ابا جی نے لیپ کر کے کپڑا باندھا۔ اگرچہ میرا رونا پیٹنا جاری تھا، ہائے ابا جی درد ہو رہا ہے، ہائے میرا پاؤں۔ لیکن میں نے سوں سوں کرتی ناک کے ساتھ پوچھا، ''ابا جی یہ کیا لگایا ہے؟''

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتے، پاس بیٹھا میرا چچا زاد بھائی جو یقیناً میری حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا، بولا، ''تایا جی اس کو حکیم بنایئے گا لیکن امراض کا علاج نہیں بس ٹوٹے کو جوڑنے کی لیوی (لئی) کے نسخہ جات دیجیے گا۔ بازو ٹوٹ جائے، موچ آ جائے، نکسیر پھوٹ پڑے، دانت ہلنے لگیں اور گھٹنے میں پانی پڑ جائے تو کیا کرنا ہے؟ میں خلافِ معمول کچھ نہ بولی۔ ابا جی مسکرائے، ''وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے۔''

••

''چل، سو مرجا۔'' اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''چمگادڑ کہیں کی۔ اور یہ جاسوسی ڈائجسٹ مجھے دے دو۔ میں پڑھوں گا۔ گاؤں میں ملا ہی نہیں۔''

''کیوں تمھیں کیا ہے؟ اپنی آنکھوں سے جاگتی ہوں ناں۔ اور میرے سو جانے کے بعد کیا آپ الو بن جائیں گے؟''

''بحث نہ کرو۔ سو مر جاؤ۔ کتنا فضول بولتی ہو تم۔''

''چلو میں سو جاتی ہو۔ تم مر جاؤ۔'' میں نے فوراً فرمائش کے انداز میں کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، امی کی کمرے میں آمد ہوئی اور سیاق و سباق کے بغیر میرا جملہ سنتے ہی وہ اپنا

جوتا تلاش کرنے لگیں۔ ساتھ ہی میری شان میں قصیدہ بھی فی البدیہہ شروع ہوگیا۔

''یہ کس پر چلی گئی ہے میرے اللہ! کس منحوس کا جوٹھا میٹھا کھا لیا تھا۔ بیڑہ ترنیے، تیری زبان اگے خندق اے۔''

پھر اپنے عزیز دیور کے جابر بیٹے کو تشفی دینے لگیں ''چل میرا بچہ دفع کرو اس بدزبان کو، اس کو تو بگاڑا ہوا ہے سب نے تقریریں کروا کروا کر۔ دووے چیزاں بھیڑیاں، گل وی تے بوتھا وی۔'' (یعنی دونوں چیزیں بُری ہیں بات بھی اور چہرہ بھی)۔

''چھڈو تائی جی'' وہ شہہ پا کر مزید بے نیازی سے گویا ہوا۔

''کدی اِلاّں دیاں دعاواں نال باز وِی مردے نیں'' (کبھی چیلوں کی بددعاوں سے باز بھی مرتے ہیں؟)

بلھے شاوا، امی کا فضیحتا تو میرے سر سے گزر گیا لیکن اس کی چیلوں اور باز کی مثال میرا دل جلا گئی۔ ظاہر ہے وہ بزعمِ خود باز تھا اور میں چیل، لیکن میں نے یہ جنگ اور بدلہ کسی اور وقت پر اٹھا رکھا۔ جھڑکیاں کھا کھا کر مجھے کچھ عقل آ ہی گئی تھی۔

''بھائی جان'' میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''جب آپ نے پہلے مجھے سومر جاؤ کہا تو نہ تو آپ کی تائی جان کو افسوس ہوا نہ آپ کو فرق پڑا کیونکہ آپ کی جان زیادہ قیمتی ہے۔ اس کی شان میں گستاخی اور جسارت قابلِ گرفت ہے، مجھے سومر جا کہنا تو عام بات ہے۔''

''میں نے سنا نہیں بھائی نے تمھیں کیا کہا'' امی جی کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں متحرک ہوگئیں۔ ''لیکن اس نے جو بھی کہا، اس کا جواب بے ہودگی اور بدتمیزی نہیں ہوسکتا۔ چلو بھائی سے معافی مانگو۔''

ایک تو یہ منحوس قسم کی معافی کا تصور میرے بچپن سے افعی کی کنڈلی جیسا رہا۔

''میں کیوں مانگوں معافی؟'' جب کہ میں دل میں اس کو برا تصور ہی نہیں کرتی پھر اس بات کی معافی کیوں مانگوں جس میں میرا قصور ہی نہیں؟ صرف رفع دفع کرنے کے لیے معافی مانگو یا امی کو خوش کرنے کے لیے تو اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ بس گھر میں پڑھنے کی غرض سے آنے والے لوگوں کی دل شکنی نہ ہو پھر جو مجھ سے بڑا ہے وہ کچھ بھی کہہ لے، سراسر ناانصافی ہے۔ لیکن میں نے ان خیالات کی بقراطیت سے امی کو آگاہ نہیں کیا۔

البتہ زندگی نے چند ہی سال آگے چل کر مجھے اپنے بے لاگ انداز میں سکھایا کہ ایسی

معافی انسان کی تضحیک اور اسے بے توقیر کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اس کا اصلاح سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ دباؤ اور دھونس کے ذریعے آپ کو باور کروانا ہے کہ آپ اپنی اوقات میں رہیں۔

امی جی نے بڑے کمرے میں پڑا فریج کھولا، ''لو میرا بیٹا سیب کھاؤ''۔ وہ شیشے کی پلیٹ میں ننھی سی چھری سے نفاست سے سیب کاٹنے لگیں۔

''تائی جی اسے کہیں رسالہ دے۔''

''شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور'' امی جی کے ہاتھ سے چھری اور سیب بیک وقت گرے۔ ''بھائی کو کہہ رہی؟''

''نہیں... میں تو سیب کو اقبال پڑھا رہی ہوں''۔ میں نے رسالہ بند کر کے ہاتھ میں دبوچا اور کمرے سے باہر نکل گئی...

••

محبتوں سے گندھی جن شاداب روحوں میں میرا بچپن گزرا تھا ان کے ہاں سادگی، وضع داری اور سفید پوشی کے باوجود کبھی کوئی مہمان یا سائل خالی ہاتھ نہ جاتا۔ ابا جی اپنے سامنے پڑی دودھ پتی کی پیالی اٹھا کر مہمان کے آگے سرکا دیتے۔ بابا جان کے پاس شام کو چائے کے وقت کوئی نہ کوئی آ کر بیٹھ رہتا۔ گول ٹرے میں چائے کے گہرے بھورے مگ اوپر بھیجے جاتے۔ خندہ پیشانی سے سب کو تناول ماحضر دیا جاتا۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ پورے خاندان میں کسرِ نفسی اور مہمان نوازی بابا جان کی وجہ سے آئی یا کہیں خون میں دوڑ رہی تھی۔ گھر میں کوئی بھی آ جاتا، مہمان نوازی ایک فرض کی طرح سب پر عائد تھی۔ ابا جی کہتے کہ مہمان نوازی، عزت اور اہمیت کے پھول وہی دے سکتا ہے جس کے دامن میں یہ دولت ہو۔

گرمیوں میں سکول سے واپس آتے تو بڑے کمرے میں پنکھے کے نیچے دستر خوان تیار ہوتا۔ کھانا ہمیشہ اکٹھے کھایا جاتا۔ اس دوران کوئی بھی آ جاتا اس کے لیے یہ عام بات تھی کہ ہاتھ دھو کر ساتھ بیٹھ جائے۔ مجھے یہ دستر خوان اس لیے بھی ہمیشہ اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے لاشعوری طور پر زندگی میں امی اور ابا جی کی تربیت کے بنیادی اصول شامل ہوتے گئے۔ یہی اصول ہمارے تایا جان کے گھر میں رائج تھے۔ جو مہمان آ جائے وہ جو دال پات بنا ہو کھا کر جائے۔

گرمیوں کے جھلتے سلگتے دن تھے۔ سکول سے نکل کر گھر آتے ہوئے دھوپ براہِ راست چہرہ سینکتی۔ اگرچہ ایک طویل خاموش گلی کا متبادل راستہ موجود تھا لیکن ادھر سے آنے کی اجازت نہیں

تھی۔ جلتے بھنتے اسی سیدھے اور بہتے ہوئے راستے سے گزرتے ہوئے گھر پہنچتے۔ سکول سے نکلتے ہی دائیں ہاتھ پر ایک تنور تھا جس سے روٹیوں کی اشتہا انگیز خوشبو مرے پہ دُرے کی طرح محسوس ہوتی۔ ایسی ہی ایک حدت بھری دوپہر کا ذکر ہے کہ سکول سے گھر پہنچی اور بستہ پھینک کر ہاتھ دھوئے اور سیدھی کھانے کے لیے پہنچی۔ امی جی نے حسبِ معمول دسترخوان لگا رکھا تھا۔ میری پسند کا مرغی آلو کا سالن بنا تھا۔ ماش کی بھنی ہوئی دال بھی تھی اور گھر میں اگائی گئی بھنڈی کی سوغات بھی پیاز ٹماٹروں کے ساتھ سجی تھی۔ درمیان میں چنوں والے پلاؤ کی بڑی سی طشتری دھری تھی۔ ساتھ تندور کی روٹیاں تھیں۔ پودینے کی چٹنی اور باقی اچار اور دہی کے لوازمات موجود تھے۔

دوپہر کو آٹا تندور پر بھیج دیا جاتا۔ ابا جی کو گرمی میں گھر میں روٹیاں پکانے کے اہتمام سے کوفت ہوتی تھی کہ خواتین سخت گرمی میں کھڑی روٹیاں پکاتی رہیں۔ کبھی دیر سویر ہو جاتی اور ابا جی گرم گرم کھانے پر نہ پہنچ پاتے تو وہ اکثر شوربے میں روٹی بھگو کر کھا لیتے لیکن حرفِ شکایت کبھی لب پر نہ آیا۔ مجھے آج تک تندوری روٹی اسی خوشبو اور ماحول کی یاد دلاتی ہے۔ اب تو خیر کوپن ہیگن میں بھی تندوری روٹی ملتی ہے۔ ایک وقت تھا کہ لندن میں ایرانی ریستوران میں مٹی کا تندور دہکا کرتا تھا جس میں دیسی لوگ کم اور گورے زیادہ پائے جاتے تھے۔

ذکر چل رہا تھا اس دوپہر کا جب میں سکول سے پہنچی۔ ''واہ بھئی۔۔ امی جی آج یہ دعوت کس سلسلے میں؟'' مجھے علم تھا کہ بھنڈی تو گھر سے اتاری گئی تھی اور مجھے شدید ناپسند تھی۔

''آپ کی نانی اماں آئی ہیں،'' امی جی نے کہا ''اور ادھر تایا جان کی طرف گئی ہیں۔''

مجھے نانی اماں کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ یہ کوئی بات ہے کہ پہلے تایا جان کے گھر چلی جاتی ہیں۔ بیٹی آپ کی ادھر رہتی ہے۔ یہ بعد میں پتہ چلا کہ ہمارے ابا جی اور نانی اماں کزنز تھے۔ نانی جان خاص مغلوں والی عادات لیے ہمارے کشمیری نانا کے گھر جا بسی تھیں، اور امی جی ہمارے محترم دادا جان مرحوم اور کشمیری دادی کے گھر آ گئی تھیں۔ عجیب اتفاق یہ تھا کہ خاندان میں مغلوں اور کشمیریوں کا ادل بدل کئی پشتوں سے چل رہا تھا۔ تایا جان اپنے دادا کی اور ننھیال کی کہانی سناتے بھی تو مجھے خاص دلچسپی نہ ہوتی۔ اب نانی اماں جب بھی آتیں پہلے اپنے بڑے لالہ جی کے گھر حاضری دیتیں جو کہ ان کے تایا زاد بھائی تھے۔

''امی''، میں نے ایک دن پریشان ہو کر پوچھا، ''آپ نے اپنے ماموں سے شادی کر لی تھی؟ یہ کیا بات ہوئی؟ کیسے گڑبڑ رشتے ہیں''۔ بعد میں ہماری تایا زاد بہن ہماری ممانی جان بھی بن

گئیں۔ اب میں نے رشتے میں منطق ڈھونڈنے کی کوشش ترک کر دی۔

ابھی سب دسترخوان پر بیٹھے ہی تھے کہ دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔ پتہ چلا کہ ساتھ والے گاؤں سے ایک بچے کو لایا گیا ہے جس کا جسم گھریلو حادثے میں جل گیا تھا۔ ابا جی کھانا چھوڑ کر فوراً باہر نکلے۔ امی جی کو ہول اٹھنے لگے کیونکہ کسی عورت کے رونے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ مریض کا پورا خاندان بھی ساتھ تھا۔

ابا جی نے اندر پیغام بھجوایا کہ فوراً کھانا باہر بھیج دیں۔ تایا جان کے باغیچے کے پاس بنے برآمدے میں دری بچھا دی گئی اور ہمارا دسترخوان اُٹھا کر مریض کے ساتھ آئے ہجوم کو بھیج دیا گیا۔

بازار سے مزید تندوری روٹیاں منگوائی گئیں اور آلو مٹر بھی شامل کر دیے گئے۔ میرا موڈ سخت بگڑ گیا، ''میں نے کوئی نہیں کھانی دال اور آلو مٹر اور بھنڈی۔''

دسترخوان سے اٹھ کر میں سیدھی تائی جان کے پاس پہنچی اور اپنے ماں باپ کے مظالم سنائے۔ انھوں نے آرام سے میری بات سنی پھر فرمایا، ''پھر کیا ہوا؟ دانے دانے تے بندے دی مہر ہوندی اے۔ اللہ کرے ان کا بچہ بچ جائے، چل توں چاول کھالیہہ۔'' تائی جان نے حل نکالا۔

''میں نے مرغی آلو ہی کھانا ہے۔'' میں بضد رہی۔

نانی اماں اوپر بابا جان کے پاس پہنچی ہوئی تھیں ورنہ ان کی جھاڑ بھی شامل ہو جاتی۔

''چل میں تینوں انڈہ بنا دینی آں'' (چلو میں تمھیں انڈہ بنا دوں۔) تائی جان نے مینو پر اضافہ کیا۔ میرا موڈ مزید خراب ہوا،

''چلیے آپ مجھے انڈہ بنا دیں۔ پھر مرغی کے نیچے رکھ دیں تا کہ وہ مجھے ٹھونگے مار مار کر الٹ پلٹ کر دوبارہ مرغی بنا دیں۔ پھر آپ مجھے پکا دیں، پھر مریضوں کو کھلا دیں۔''

امی جی کے بقول ٹرٹر کرنے کے بعد میں نے بالآخر اسی نامراد انڈے سے روٹی کھالی۔ رُکھی سوکھی کھا فریدا ٹھنڈا پانی پی۔

••

میرے بچپن میں ہمارے گھر آ کر رہنے والے بے شمار کرداروں میں سے ایک بے حد اداس آنکھوں اور رنجیدہ سے لہجے والی خاتون ایسی تھیں جن کو شاید میں کبھی فراموش نہ کر سکوں۔

سفید ململ کا دوپٹہ اور موٹے شیشوں کی پلاسٹک کی کمانی والی عینک، ان کا رنگ، شاید امتدادِ زمانہ سے، شدید سیاہی مائل تھا۔ کمزور کلائیوں پر بھاری کالے کپڑے کا تھیلا، گول گلے کی

تھیلا نما قمیص اور پیروں میں پلاسٹک کی چپل جس کے سیاہ رنگ میں سے ان کے پیروں کو الگ سے دیکھنا ممکن نہ ہوتا۔ قریبی گاؤں سے پیدل چل چل کر آنے کی وجہ سے ان پر ایک مٹیالی سی تہہ جم چکی تھی۔ جب وہ جوتا اتار کر صحن میں لگی ٹونٹی کے نیچے پیر دھونے بیٹھتیں تو ان کے پیروں پر چپل کا نشان الگ سے دکھائی دیتا۔ وہ خوب مل مل کر جوتے سمیت پیر دھوتیں۔

طویل بیوگی کاٹنے کے بعد اپنی اکلوتی بیوہ بیٹی کو بھی ساتھ لاتیں۔ ''لالہ جی، اس کو کہیں کام پر لگوا دیں۔'' ان کی بیٹی عام خواتین کی نسبت زیادہ طویل قد و قامت کی مالک تھیں اور پھر دوہرے بدن کی وجہ سے ذرا پھیل کر چلتیں تو ایک عجیب ناپسندیدہ سا تاثر پیدا ہوتا، بلکہ جب اچانک سامنے آ کر کھڑی ہوتیں تو خوف آمیز ناگواری کا احساس ہونے لگتا۔ ساتھ ہی ان کی نواسی بھی میمنے کی طرح کدکڑے لگاتی اندر داخل ہوتی۔ وہ عجیب متحرک، بے چین اور بے امنی روح تھی۔

جب میں نے ان کو پہلی دفعہ دیکھا تو صحن میں رکھی چارپائی پر تینوں نسلیں براجمان تھیں۔ سامنے میز پر پانی کا جگ اور گلاس پڑے تھے۔ خربوزے کی قاشیں اور چند گنڈیریاں بھی۔

جب وہ گرم دوپہر میں اکیلی آتیں تو اکثر ایک ہی فرمائش دوہراتیں، ''بھابی، اگر گرم روٹی مل جائے تو۔'' امی جی شاید نماز پڑھنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ انھوں نے ارادہ ترک کیا اور توا چولھے پر رکھ دیا۔ شام کو کالے چنے، سفید ابلے چاول، پودینے کی چٹنی، دہی اور گھر کے ٹماٹر مولی رکھے تھے۔ امی جی نے گرم گرم پھلکے اتارے اور دسترخوان میں لپیٹ کر میز پر رکھ دیے۔ ''آپا، کھانا کھا لیں، میں ذرا نماز پڑھ لوں۔''

انھوں نے سر اور کانوں کے گرد کسے دوپٹے کو مزید کس کر لپیٹا۔ شام ہونے کو تھی اور عام طور پر وہ اس وقت چلی جاتی تھیں۔ لیکن عجیب سی بات تھی کہ تینوں خواتین رکی رہیں۔ ابا جی نماز کے بعد گھر آئے۔ وہ مغرب کا کھانا بہت ہلکا کھاتے تھے۔ کبھی دودھ اور رس کھا لیے۔ کبھی ابلے چاولوں پر دہی ڈال لیا۔ میں ان کے کمرے میں فل سپیڈ پر پنکھا چلائے انگریزی کی کتاب میں سسپنس ڈائجسٹ رکھے پڑھنے میں مشغول تھی۔ ابا جی ساتھ والے کمرے میں پتہ نہیں امی جی سے کہہ رہے تھے کہ خود سے مخاطب تھے، ''ستار العیوب، اللہ کی صفت ہے۔ ان کو اوپر سونے کی جگہ بنا دیں۔ ہر آنے والا اپنا رزق خود لے کر آتا ہے۔''

''امی جی کی آواز آئی، پکا کر دینے کی حد تک مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن ان کے قیام میں کوئی بہتری نہیں۔''

اگلے دن ان کی نواسی کو امی جی نے میرے کپڑے نکال کر دیے جو اس نے نہا دھو کر پہن لیے۔ میں سکول سے گھر آئی تو وہ میرا جوڑا پہنے فرش پر چوکڑا مارے اکیلی ہی لوڈو کھیلنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اس کی والدہ اور نانی جا چکی تھیں۔ اس نے آتے ہی میرا انٹرویو لینا شروع کیا۔ کتنے سال کی ہو؟ کس جماعت میں پڑھتی ہو؟ ہمارے گاؤں کی فلاں فلاں لڑکی بھی اسی سکول میں جاتی ہے۔ میں ان دونوں لڑکیوں کو جانتی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتی، امی جی کی آواز آئی، ''چلو جلدی کرو، کپڑے بدلو اور کھانا کھا کر بابا جان کے پاس جاؤ۔ وہ بلا رہے ہیں۔''

خلافِ معمول مجھے نہ تو اس سے بات کرنے کا کہا گیا نہ ہی اسے پڑھانے کا عظیم فریضہ سونپا گیا اور دوپہر کو ہی بابا جان کی طرف چلتا کیا گیا۔ مجھے بھی وہ کوئی خاص پسند نہیں آئی تھی۔ سو میں نے اٹھ کر تایا جان کے گھر کی راہ لی۔ اگلے دن اس کی نانی پھر آ موجود ہوئیں۔ پسینے میں شرابور اور بے حال۔ اتنی گرمی میں نجانے اتنی دور سے کیسے چل چل کر آتیں۔ امی جی نے جلدی سے دہی میں چینی اور ٹھنڈا پانی ملا کر ان کو دیا۔

کسی دن یہ ہمارے متھے لگ جائیں گی، میں نے ان کی بگڑتی حالت دیکھ کر سوچا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ان کے پیشانی تک کھینچے ململ کے سفید دوپٹے اور جھریوں بھرے چہرے پر چمکتے پسینے کے قطرے دیکھ کر ترس آتا تھا۔ کام چوری کے سارے ریکارڈ توڑنے کے باوجود میں نے ٹرے میں آلو گوشت کی پلیٹ، روٹیاں اور چٹنی لا کر ان کے سامنے رکھا۔ زیرِ لب بڑبڑا کر انھوں شاید کوئی دعا دی اور یوں کھانا کھانے لگیں جیسے مشقت کرنے آئی ہوں اور کام ختم کرنا چاہتی ہوں۔ امی جی کے ساتھ سر جوڑے پست آواز میں باتیں کرتی رہیں۔

ان کی بیٹی کو ابا جی نے کسی کے گھر ملازمت دلا دی تھی۔ گھر کے کام کاج کے علاوہ بچوں کو سکول سے لانا لے کر جانا بھی شامل تھا۔ امی جی ان کو چھوڑنے دروازے تک گئیں۔ وہ ان کی آخری ملاقات تھی۔ نسل در نسل مشقت کی زندگی گزارتی ایک بے بس سی بوڑھی عورت میرے ذہن کے کسی کونے میں موجود رہی اور ترحم کا ایک جذبہ بھی۔

''ابا جی اگر میں ان خاتون کی کہانی لکھوں تو کوئی بہت اچھا موڑ اس میں ڈال دوں؟''

''اچھا، وہ کیسے؟'' ابا جی نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

''جیسے اچانک وہ کہیں بے ہوش ہو کر گر گئیں۔ ایک بہت امیر کبیر اور اچھے آدمی نے ان

کو اٹھایا اور گھر لے گیا۔ اس کی اپنی والدہ نہیں تھیں۔ اس نے ماں کی طرح گھر میں رکھا۔''

''ہاں ۔۔ ہو تو سکتا ہے۔ لیکن ان کی بیٹی اور نواسی؟ ان کا کیا کرو گی؟''

''ان کی بیٹی کو ملازمت مل گئی ہے ناں۔ وہ اپنی بیٹی کو پڑھا لے۔ کپڑے سینے بھی سیکھ لے۔''

''پھر امیر آدمی نے ان کی اماں کو حج بھی کروا دیا۔'' اب میں نے کہانی میں اضافی آسودگی ڈالی۔ ابا جی نے کہا۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔ اس کی اچھی سی کہانی بنا کر لکھو۔''

جب میں نے اپنی مرضی کی تقدیر لکھی، اور ان کو ہنستے کھیلتے دکھایا۔ ابا جی نے کہانی پڑھی۔ پھر چپ کر کے بیٹھے رہے۔ جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر دیا، جو امی جی نے مجھ سے وصول کر لیا۔ کہانی بابا جان کو بھجوا دی گئی۔

ابا جی نے ابتدائی بچپن سے مجھے ان خواتین کے بارے میں کہانیاں پڑھنے کو دیں جنھیں تاریخ نے یاد رکھا لیکن معاشرے نے بھلا دیا۔ فاطمہ بنتِ عبداللہ پر سکول کے زمانے میں تقریر کی۔ ڈراموں میں فاطمہ کا کردار بھی ادا کیا۔ امی جی نے اپنے سفید بڑے دوپٹے سے مجھے لبادہ بنا کر دیا اور نقاب لینا سکھایا۔ ابا جی کی محبوب داستان بی بی زینب رضی اللہ عنہا کی تھی۔ دربار میں گونجتی ایک بہادر اور بے باک آواز جس کے نطق و تکلم کی فصاحت اسے خون میں ملی، جس کی جرات اور حریت نے مردوں کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔ پھر اسما بنتِ ابوبکر رضی اللہ عنہما کی بے جگری کی کہانی، ایک بانوے برس کی ماں تہتر برس کے بیٹے کو جان دینے کا درس دیتی ہے، اور پھر ایک ظالم بادشاہ کے سامنے اس سے مکالمہ کرتی ہے۔ میری کہانیوں میں ان دو کرداروں کا عکس رہا اور شاید مجھے یہ مثالیں دی ہی اس لیے گئیں کہ کچھ سیکھوں۔ میں نے اور کچھ حاصل کیا ہو یا نہ کر پائی، البتہ جراتِ انکار میری فطرت میں آ بسی۔

••

ابا جی کو اپنے دوست احباب کے ساتھ جو انسیت تھی اس کی وجہ سے گھر میں ہر وقت کسی نہ کسی کا آنا جانا لگا رہتا۔ بقول امی جی کے، رونق لگی رہتی ہے۔ یہ واقعہ ان دنوں کا ہے جب ابا جی کے ایک دوست ملک صاحب کی وفات ہوگئی تو ان کی فیملی واپس چکوال چلی گئی۔ وہاں جا کر ان کی بیگم بہت علیل ہو گئیں۔ انھوں نے امی کو فون کیا اور اپنی داستانِ علالت جانے کس انداز میں سنائی کہ ان کو علاج معالجے کے لیے فوراً گھر بلا لیا گیا اور تاوقتِ صحت اپنے پاس ہی رکھنے کا اعلان کر دیا تاکہ ان کی دیکھ بھال بھی اچھی طرح سے ہو اور وہ اپنا غم بھی بھول جائیں۔ خیر ہمیں اس بات

سے کوئی غرض نہیں تھی کہ گھر میں کون آتا ہے، نہ ہی ہمیں اس بات سے فرق پڑتا تھا کہ کون نہیں آتا، جب تک کوئی ہمارے معمولات اور سرگرمیوں میں دخل نہیں دیتا تھا۔

لیکن مسئلہ یہ ہوا کہ ہماری مریضہ خالہ جان کو ہر بات میں دخل دینا بہت محبوب تھا۔ جو کوئی ان کے پاس سے گزرتا اس سے ہم کلام ضرور ہوتیں۔ ایک دن ہماری کم بختی آئی۔ گرمی کے دنوں میں سب عام طور پر محوِ خواب ہوتے۔ ہمارے پاس پڑھنے کے لیے کوئی رسالہ نہ بچا تو حسبِ عادت ہم نے سوچا کہ تایا جان کے گھر چلتے ہیں، وہاں سے یقیناً سسپنس ڈائجسٹ، مسٹری، سب رنگ یا ابنِ صفی کا کوئی نہ کوئی ناول ضرور مل جاتا جو سب بھائی لوگ مشترکہ طور پر پڑھتے اور ان کو وہاں جمع کیا جاتا تاکہ بزرگوں کی دست برد سے محفوظ رہیں۔ اللہ بخشے بابا جان کہا کرتے تھے کہ جو لوگ ہر رسالے کے باہر صرف عورت بنا دیتے ہیں ان کا ادب کس نوعیت کا ہوگا۔ خبردار جو یہ رسالے پڑھے۔ یہ جو ہماری الماریاں بھری ہوئی ہیں کتابوں سے، ان کا مطالعہ کرو تاکہ کچھ حاصل بھی ہو۔ بزرگوں سے مباحثے اور مذاکرات کرنے سے کہیں بہتر تھا کہ ایسے رسائل اور ناولوں کا گودام کسی محفوظ جگہ منتقل کر دیا جائے۔

جونہی ہم نے اپنے کمرے سے باہر جھانکا، بڑے کمرے کے سامنے والے پلنگ پر دراز خالہ جان نے فوراً ہم سے پوچھا، ''کہاں جا رہی ہو؟''

''ہم نے عرض کیا کہ ہم اپنے تایا جان کے گھر جا رہے ہیں۔''

''اتنی بھری دوپہر ہے۔ آرام سے بیٹھو، اس وقت کہیں نہ جاؤ۔'' وہ ایسی قطعیت کے ساتھ بولیں جیسے ہم نے ان سے جانے کا اجازت نامہ مانگا ہو۔

''ہم جب چاہیں اپنے تایا کے گھر جا سکتے ہیں، ہمیں اس سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔'' ہم نے حسبِ عادت جواب دینا ضروری سمجھا۔

انھوں نے اپنی اچھی بھلی جمی جمائی عینک ایک ہاتھ سے دوبارہ ناک پر جمائی۔ پھر اس کے عقب سے گھور کر ہمارا معائنہ کیا اور تحکمانہ انداز میں گویا ہوئیں، ''اچھا، چلو مجھے پہلے پانی لا دو۔ پھر جانا۔''

''ہم تو خود مانگ کر پانی پیتے ہیں۔ آپ کو کہاں سے لا دیں؟'' ہم نے بے نیازی سے جواباً فرمایا۔

موٹے موٹے شیشوں والی عینک کے پیچھے ان کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے گردش

کرتے کرتے رک گئیں۔ دوسرے ہی لمحے برق رفتاری سے چلتی گاڑی کے پہیے کی طرح تیز تیز گھومیں...

''بھابی۔۔ بھابی۔۔۔۔۔! یہ آپ کی بیٹی تو پتہ نہیں کس پر گئی ہے۔ سارا خاندان کیسا بیبا ہے۔ یہ لڑکی تو آپ کی بیٹی لگتی ہی نہیں۔'' ایک تو ان کا لب ولہجہ خاص قسم کا تھا، الفاظ کو ذرا سا گولائی کا رخ دے کر تیز تیز بولتیں، سارے الف واؤ بن کر گول گول سماعتوں میں چکراتے پھرتے اور سننے والے کو چکر آنے لگتے۔ ہمیں تو باقاعدہ یوں لگتا جیسے کانوں میں چھوٹے چھوٹے کنکر اٹک گئے ہوں اور انگلی سے کان کھجانا لازم ہو گیا ہو۔

ہم نے اس واردات کو قطعی غیر اہم سمجھا اور امی جی کے تشریف لانے سے قبل ہی چلتے بنے۔ لیکن جب ہمارے پیچھے ہی عین اس وقت ہمارے بھائی صاحب کو دوڑایا گیا جب ہم نئے مہینے کا رسالہ اپنے تایا زاد بھائی سے بزورِ بازو چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ''گھر چلو ذرا، ابھی تمھیں پتہ چلے گا کہ تم کتنی بدتمیز ہو۔'' بھائی نے حتی الوسع سنسنی پھیلانے کی کوشش کی۔

''کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟''

''تم گھر تو چلو۔ پھر ابا جی بتائیں گے تمھیں۔''

اب ہمارے اوسان خطا ہوئے۔ امی کی ڈانٹ تو ایک معمول کی بات تھی۔ جس دن ہم اس سے محروم رہتے عجیب سی پریشانی ہونے لگتی کہ آج کسی چیز کی کمی ہے۔ جب تک روزانہ ایک دفعہ ہماری شان میں نالائق، نکمی اور جاہل جیسے اسمائے صفت نہ دوہرائے جاتے، اپنی ذات کے ساتھ اپنا ہی تعارف ادھورا لگتا۔ خیر ہماری پیشی ہوئی۔ امی ان کے ساتھ پلنگ پر براجمان تھیں اور غالباً ان کو بتا رہی تھیں کہ یہ لڑکی پیدائشی طور پر ہی ایسی ہے۔ آپ اس کی بات کا برا نہ مانیں، اس کو اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ اس نے کتنی غلط حرکت کی ہے۔ آپ دل کو نہ لگائیں۔ یہ شربت مفرح پییں۔ لالہ جی کے اپنے دوا خانے کا ہے۔ شیشے کے بڑے سے گلاس میں سے جھلکیاں دکھاتا لال شربت اور بیچ میں ٹوٹے گلاس کی کرچیوں جیسی برف۔ یقیناً میری یزیدیت کی تلافی کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ابا جی نے براہِ راست مجھے کبھی نہیں ڈانٹا تھا۔ ہمیشہ امی سے کہتے اس بے وقوف کی بچی سے کہو عقل کے ناخن لے۔ باقی گوشمالی امی اپنے ذوق وضرورت کے مطابق کر لیتیں۔

''چلو خالہ جان سے معافی مانگو'' امی نے انتہائی غصے سے کہا، ''تمھارے ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں پورا گھر سنبھالتی ہیں، پوری مہمانداری آتی ہے انھیں، اور تم جاہل کی جاہل، خود کیا کسی کی

مہمانداری کرو گی، تم تو دوسروں کی محنت پر بھی پانی پھیر دیتی ہو۔" بلکہ ایک دفعہ تو یوں ہوا کہ ہماری بچپن کی ایک سہیلی (سلمیٰ) کی شادی میٹرک کے فوراً بعد ہوگئی اور وہ ملک سے باہر سدھار گئیں۔ دو سال بعد جب واپسی ہوئی تو دو بے انتہا پیارے گول مٹول بچوں کی والدہ ماجدہ بھی بن چکی تھیں۔ ہمیں ملنے آئیں تو امی بچوں پر صدقے واری ہونے لگیں اور اسے اتنی شاندار کارکردگی پر شاباشیاں دینے لگیں۔ ہم بچوں سے کھیلنے میں مشغول رہے اور ان کی خالص زنانہ باتیں نہ سن پائے۔ اس کے جانے کے بعد امی کے حربی آلات میں مزید اضافہ ہوگیا۔

"تمھارے ساتھ کی لڑکیاں بچے تک سنبھال لیتی ہیں اور تم کالج پہنچ گئیں، عقل نہ آئی۔" ہمیں ہمیشہ وہ لطیفہ یاد آجاتا جسے سنانے کی جسارت کبھی نہ کر پائے۔ ایک سردار جی، جن کی ڈاڑھی ذرا زیادہ ہی 'طویل' تھی، سائیکل پر کہیں جا رہے تھے۔ اچانک سائیکل سامنے سے آتی ایک خاتون سے ٹکرائی۔ وہ محترمہ آگ بگولہ ہو کر بولیں، "اتنی لمبی ڈاڑھی ہے تمھاری، شرم نہیں آتی؟"

سردار جی بڑی متانت سے بولے، "بی بی! یہ میری ڈاڑھی ہے، بریک نہیں۔" اب امی کو کون سمجھاتا کہ کالج جا کر پڑھنے سے گھر اور بچے سنبھالنے کی عقل نہیں آتی۔ طعنوں کو ناکافی جانتے ہوئے وہ دھمکیاں دینے پر اتر آئیں۔

"آج تم سے ابا جی خود بات کریں گے، تم ٹھہر جاؤ ذرا۔"

ہماری قسمت مہربان تھی کہ ہمارے حاضر ہونے سے پہلے ہی کوئی مریض ابا جی کو بلا کر لے گیا ورنہ ابا جی کے سامنے شرمندگی زیادہ ہوتی۔ ساتھ ہی یقیناً امی کے طعنے شامل ہوتے، "اور پڑھاؤ اس کو یہ الٹی پلٹی شاعری، اور بھیجو اس کو رنگ برنگے کالجوں میں تقریریں جھاڑنے کے لیے۔ زبان کے آگے خندق ہے۔ کسی چھوٹے بڑے، آئے گئے کا کوئی خیال ہی نہیں۔ اس کے ساتھ کی بچیوں کو دیکھو، چھوٹے بہن بھائیوں کی بھی تربیت کرتی ہیں۔"

اور ایک مہمان خاتون کے سامنے تو یہ باتیں بالکل ناقابلِ برداشت ہوتیں۔ ہم نے شکر ادا کیا کہ بلا ٹل گئی اور دل ہی دل میں عہد کیا کہ اب جب تک یہ خالہ مریضہ یہاں موجود ہیں، کوشش کریں گے کہ کوئی ایسی بات نہ ہو پائے کہ جھگڑا عدالتِ عالیہ تک جائے۔

رات کو بجلی بند ہونے کی وجہ سے ابا جی چھت پر بیٹھے تھے۔ معمول تو یہی تھا کہ میں رات کو ہمیشہ ان کے پاس بیٹھتی۔ وہ اقبال کا کلام نکالتے اور اس میں سے کچھ نہ کچھ پڑھ کر سناتے۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی انھیں بے حد پسند تھی۔ پچھلے دنوں انھوں نے جو نظم سنائی اس کے ترجمے

تشریح اور تاریخ پر بات کرتے ہوئے مجھے شاباش ملی تھی اور ابا جی بے حد خوش ہوئے تھے۔ ویسے بھی ابا جی کو اور ان کے جملہ برادران کو خوش کرنا کوئی خاص مشکل نہیں تھا۔ بس ذرا پڑھنے لکھنے کی باتیں کرتے رہو اور بلند عزائم کا وقتاً فوقتاً اظہار کر دو کہ ہم بڑے ہوکر مدرسے اور مکاتب کھولیں گے، لوگوں کی مدد کیا کریں گے اور بڑا آدمی بن کر کم از کم دس افراد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کریں گے، ان سیاسی بیانات سے ان حضرات کو سب کچھ بھلایا جا سکتا تھا اور وہ ہمارے وطن کی خوش فہم عوام کی طرح ہم سے امیدیں وابستہ کر لیتے۔ اس دن بھی ہم نے سوچا کہ فوراً ابا جی کو ان کے پسندیدہ اشعار سنا دیں گے اور معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔

مومن از عشق است و عشق از مومنست
عشق را ناممکنِ ما ممکن است
عقل سفاک است و او سفاک تر
پاک تر چالاک تر بیباک تر

لیکن انھوں نے یہاں تک نوبت ہی نہیں پہنچنے دی، بغیر کسی تمہید کے بولے، ''آپا اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر آئی ہیں۔ مجھے بھائی صاحب اور آپ کی امی کو بھابی کہتی ہیں۔ آپ کو اس گھر میں ان کا مقام سمجھ جانا چاہیے۔ اتنا نامعقول جواب دے کر آپ نے ان کا دل دکھایا ہے۔ جا کر معافی مانگو۔''

ہمارے لیے، جو خاندان بھر کی خواتین سے جھاڑ کھانے لیکن ابا جی اور ان کے جملہ برادران سے شاباشیاں لینے کے عادی تھے، پہلی دفعہ اتنے ٹھنڈے لہجے میں بس اتنا کہنا ہی کافی تھا۔ ہم نے جا کر مؤدب ہوکر معافی مانگی۔ آم کاٹ کر ان کو پیش کیا بلکہ پیشکش کی کہ آپ چاہیں تو ہم آپ کو ملک شیک بنا کر بھی دے سکتے ہیں۔ انھوں نے پہلے تو مشکوک نظروں سے ہمیں گھورا، پھر بڑے شاہانہ انداز میں صرف سر کو نفی میں جنبش دینا کافی سمجھا۔ ضرور دل ہی دل میں خوش ہو رہی ہوں گی کہ ہمیں انسان بنانے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔ اس ٹریلر کے بعد ہماری باقاعدہ ذمہ داری لگائی گئی کہ روزانہ ان کے کمرے سے گزرتے ہوئے پوچھنا ہے کہ:

کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟
آپ کو گرمی تو نہیں لگ رہی؟
گھر کے لیموں توڑ کر سکنجبین بنا کر دوں؟
آپ کو پھل کاٹ دوں؟

چائے پییں گی؟

میٹھے دہی کی لسی بنا دوں؟

آپ نے دوا کھا لی ہے؟

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتیں۔ گول گول آنکھیں حسبِ معمول تیزی سے اپنا طواف پورا کرتیں۔ وہ اپنے سر کے گرد پگڑی نما دوپٹہ کھول کر پھر باندھتیں (خدا جانے وہ ہر وقت دوپٹے سے سر کیوں باندھے رکھتی تھیں۔ عجیب سا نیم بل کھاتا دوپٹہ جس کو سر کی ایک جانب گرہ دے کر باندھا جاتا) اور اسے زور سے گرہ دیتے ہوئے بڑی بے اعتنائی سے کہتیں، ''نئیں، کڑیے، توں جا۔''

خدا خدا کر کے جب وہ تندرست ہو کر چلی گئیں تو ایک دن ان کا ذکر کرتے ہوئے امی مجھے سمجھانے لگیں، ''دیکھو، وہ بے چاری اکیلی ہو گئی ہیں۔ پھر ان کی بیٹی بھی کوئی نہیں بے چاری۔'' انھوں نے رک رک کر کئی مرتبہ چچ چچ کر کے افسوس کی کیفیت کی شدت میں اضافہ کیا، ''صرف بیٹے ہی بیٹے ہیں اور وہ بھی سارا دن باہر کام کاج پر۔ کوئی پوچھنے والا بھی نہیں۔''

اب پھر مجھ سے رہا نہ گیا، ''لیکن امی، آپ تو کہہ رہی تھیں کہ وہ فلاں بے چاری۔ اس کے اب چھٹی بیٹی ہوئی ہے۔ بے چاری کا بیٹا کوئی نہیں؟ مجھے ان متضاد بیانات کی سمجھ نہیں آتی۔''

''تمھاری سمجھ میں آنا ضروری بھی نہیں۔ اللہ دونوں نعمتوں سے مالا مال کرے، جو بھی کمی ہو اس سے تکلیف ہوتی ہے۔'' ہم نے بہتری اسی میں جانی کہ مزید اس فلسفے کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔

ابا جی فوراً بیچ میں بولے، ''ہمارے لائق جو بھی خدمت ہو ہم کریں گے۔ آخر ہمارے دوست کی بیگم ہیں۔ بڑی آس لے کر بہن بھائیوں کو چھوڑ کر ہمارے پاس آتی ہیں۔ میں تو ویسے بھی دوستی کو قبر کی دیواروں تک نبھانے کا قائل ہوں۔''

اس سے پہلے ہم خود کو روک پاتے، بے اختیار منہ سے نکل گیا، ''اسی لیے ملک چاچا کو قبر کی دیواروں تک پہنچایا ہے۔''

امی نے وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ نہ ہی کہی جائیں تو بہتر ہے لیکن ابا جی کے چہرے پر بکھری خفیف سی مسکراہٹ نے بتا دیا کہ وہ ناراض نہیں ہوئے۔ لیکن امی سے براہِ راست مخالفت مول لینی مناسب نہیں سمجھی۔ فوراً بولے، ''چلو اب بھاگ جاؤ۔''

خالہ صاحبہ کے مکمل طور پر صحت یاب ہونے کے درمیان نجانے کتنے مقاماتِ آہ و فغاں آئے۔ کبھی مجھے لگتا کہ وہ میری حرکات و سکنات کا جائزہ لینے پر مامور ہوں۔ ان کی روایتی سوچ اور

اندازِ فکر کو سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ یہ لڑکی ہے تو پھر ان سب لڑکوں کے ساتھ کیوں ہر کام میں شامل رہتی ہے۔ ہر بات میں بولنا اس کا فرضِ اولین کیوں ہے اور لالہ جی اور ان کے لالہ جی اس کو کچھ کہتے کیوں نہیں۔ دھیمے لہجے میں امی جی کو بتاتی رہتیں کہ ہماری طرف تو بیٹیوں کو اونچی آواز میں بولنے نہیں دیتے کجا بڑوں کے سامنے دانت نکالنا اور اچھلتے کودتے دیواریں پھلانگتے اِدھر اُدھر جاتے رہنا۔ اِدھر اُدھر وہ یوں کہتیں جیسے ہم باقاعدہ غیر قانونی طور پر انڈیا کا بارڈر پار کر کے دن میں کئی دفعہ آتے جاتے ہوں۔

ایک دن دستر خوان پر بیٹھے ہوئے ابا جی کے دوست کی بیگم ملکانی صاحبہ نے فرمایا کہ کھانا کھاتے ہوئے بیٹیوں کو کئی بار کسی نہ کسی کام سے اٹھانا چاہیے تاکہ ان کو خدمت کی عادت پڑے۔ ابا جی کو طیش تو آیا لیکن پی گئے۔ جیب سے رومال نکال کر ناک صاف کی۔ یہ عجیب بات تھی کہ ابا جی کو کھانا کھاتے ہوئے ناک سے ہلکا سا پانی آنے لگا تھا۔ امی جی بتاتی ہیں کہ ہمارے دادا جان کو بھی بڑھاپے میں کھانا چباتے ہوئے ہلکی سی نمی ہوتی اور وہ ناک صاف کرتے تو دادی اماں تبصرہ کرتیں کہ ناک بہنا کون سی بیماری ہے۔

ابا جی نے رومال جیب میں رکھا پھر آرام سے بولے، ''بہن جی، آپ کے صرف بیٹے ہیں۔ آپ ان کو بھی کئی مرتبہ اٹھاتیں تھیں؟ نہیں ناں؟ بلکہ بھاگ بھاگ کر اس نائب اللہ کی خدمتیں کرتیں اور منہ میں نوالے ڈالتی تھیں۔ یہ سب ماؤں کا کیا دھرا ہے کہ عورتوں پر کھانے کی پلیٹیں پھینکنے والے موذی پیدا ہوتے ہیں۔ کم بختو، دستر خوان پر پہلے سے ہی ہر چیز لے کر کیوں نہ بیٹھو۔ بچیوں کو مرض سے پہلے ہی کونین کی گولیاں کھلانے کا مقصد کیا ہے؟ بجائے اس کے کہ بیماری کی بیخ کنی کی جائے، آپ محنت سے مریض پیدا کیجیے۔''

مجھے ان مہمان خالہ کی وجہ سے بہت ڈانٹ پڑتی تھی۔ میری تو مراد بر آئی۔ میں نے گھٹنوں میں منہ دے کر ہنسنا شروع کر دیا۔ امی کی فہمائشی نظریں بھی میرا کچھ نہ بگاڑ پائیں۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ اس دن آلو بینگن اور بھنڈی قیمہ بنے تھے۔ مجھے اس وقت دونوں چیزیں پسند نہیں تھیں اور میں دستر خوان پر مجبوراً بیٹھی تھی کیونکہ ابا جی صرف دوپہر کا کھانا اہتمام سے کھاتے تھے اور رات کو بس ہلکی اور سادہ غذا کھانا ان کی عادت تھی۔ دوپہر کے کھانے پر سب کا حاضر ہونا ضروری تھا۔ کھانا پسند ہو یا نہ ہو، دستر خوان پر بیٹھے رہو اور کھانے میں شریک بھی رہو۔ سو میں بظاہر مودب بنی امی جی کے پاس بیٹھی تھی۔

''اٹھو یہاں سے'' امی جی نے گھرکا۔ میں نے بصد شکر حکم کی تعمیل کی اور اٹھ کر ملحق

کمرے میں بھاگ گئی۔

ایک شام کو امی جی عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں کہ محترمہ ماکانی خالہ صاحبہ خود اٹھ کر غسل خانے کی طرف چل پڑیں۔ ابھی انھیں شدید کمزوری تھی۔ گرنے کا خدشہ رہتا۔ ابا جی نے فوراً امی جی کو آواز دی۔ میں پپیتے کے درختوں والی دیوار پر کھڑی پکے ہوئے پپیتے اتار رہی تھی۔

''جلدی نیچے اترو'' ابا جی نے مجھے بھی حکم دیا،

''چھلانگ نہ لگانا'' دوسرا حکم آیا ''سیڑھیوں سے اترنا۔ اور کوئی مصیبت نہ پڑ جائے۔ خالہ جان کے پاس آ کر کھڑی رہو۔''

''جی اچھا'' جتنی دیر میں حکم کی تعمیل کرتی امی جی عجلت سے باہر نکلیں اور ان کو سہارا دے کر سنبھالنے لگیں۔

''اب میں تو نیچے نہ آؤں ناں ابا جی؟'' میں نے وہیں کھڑے کھڑے سعادت مندی سے پوچھا۔

''نئیں توں اوتھے ای کھلو۔ الیکشناں توں بعد ٹلیں۔ جاہل'' (نہیں تم وہیں کھڑی رہو الیکشن کے بعد نیچے اترنا۔ جاہل) جواب امی جی کی طرف سے آیا۔

''امی جی آپ ہی نے تو کہا تھا کہ پکے ہوئے پپیتے احتیاط سے اتارنا تا کہ چھلکا زخمی نہ ہو۔'' میں نے یاد دلایا۔

''تو کیا تم پپیتے پکا رہی ہو۔ زمانہ پہلے کہا تھا، ست ناکارہ لڑکی! نیچے اترو اور خالہ جان کے بستر کی چادر بدلو۔'' امی جی نے انھیں تولیہ پکڑایا اور کرسی کو قبلہ رو کیا تا کہ وہ نماز ادا کر لیں۔

''میں نرس ہوں؟ سارے کام میں ہی کروں۔ گھر ہے کہ ہسپتال ہے۔'' میں دل ہی دل میں بڑبڑاتی نیچے اتری۔ اتنی تمیز مجھے آ چکی تھی کہ سارے راز و نیاز دل ہی دل میں بس اپنے دل سے ہی کرنے ہیں۔ باآوازِ بلند کہنے سے مزید خواری کا خطرہ تھا۔

••

سکول میں کچھ لڑکیوں کا ایک اور فرقہ سے تعلق تھا۔ محرم کے دنوں میں دو فرقوں کی طالبات کا آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ ایک ہم جماعت جس کے والد محلے کی مسجد کے پیش امام بھی تھے، اس نے انتہائی وثوق سے دوسرے فرقے کی لڑکیوں کے بارے ایسی عجیب و غریب باتیں کیں کہ میں خوف و پریشانی میں مبتلا ہو گئی۔ گھر آ کر ابا جی سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی اور بڑی

فکر مندی سے سوال کیا، ''ابا جی ہم شیعہ ہیں، سنی یا بریلوی؟''

''یہ آپ سکول کی لڑکیاں کس قسم کی باتوں میں پڑ گئی ہیں؟ کہاں سے سیکھتی ہیں؟ ابھی سے تفرقے بازی؟ میرا خیال ہے کہ میں مسز مرزا کو ملتا ہوں جا کر۔''

سکول کی ہیڈ مسٹرس مسز مرزا انتہائی علم دوست خاتون تھیں اور چند مرتبہ گھر بھی آ چکی تھیں۔ میں گھبرا گئی، ''ابا جی میں نے تو صرف سنا تھا، میں تو لڑائی کرنے والوں میں شامل نہیں تھی۔'' میں نے فوری صفائی پیش کی۔

اب اقبال کی کتاب کی تلوار نیام سے باہر نکل آئی اور کچھ مخصوص اشعار لکھنے کی سزا سنائی گئی۔ پورا ہفتہ میں نے روتے پیٹتے رات کو بیٹھ کر وہ اشعار نکالے۔ اس سے اگلے ہفتے مجھے وہ پڑھنا سکھائے گئے اور کاپی پر بار بار لکھنے کا حکم ہوا۔ ابا جی نے بابا جان کو بھی میرا کارنامہ سنا دیا تھا۔ رہی سہی جھاڑ انھوں نے پلا دی۔ پھر سکول کی بزمِ ادب میں اقبال اور کربلا پر مجھ سے مضمون پڑھوایا گیا۔ اس سزا کے فیوض و برکات بعد کی زندگی میں ظاہر ہوئے۔ کالج کے زمانے میں بین الکلیاتی مذاکروں اور مباحثوں میں ان شعروں سے خوب کام لیا گیا۔

••

میرا کمرہ جسے بس تکلفاً ہی میرا کمرہ کہا جاتا، کے ایک کونے پر چھت تک کتابوں کی الماری تھی جسے خسیس ہونے کی وجہ سے میں نے تالہ لگا رکھا تھا۔ اگر کسی کو کتاب مستعار دیتی بھی تو اپنی ڈائری پر لائبریری کی طرح حساب رکھتی اور جب تک کتاب واپس نہ آ جاتی میں حریص قرض خواہ کی طرح یاد دلاتی رہتی۔ اس الماری کے آگے امی جی کے جہیز کا بھاری رنگین پائیوں والا پلنگ جس پر موٹی سفید رنگ کی چادر اور تین چار تکیے پڑے ہوتے، ساتھ سائیڈ پر رکھی برسوں پرانی لکڑی کی گول میز جس پر سفید ہی میز پوش پڑا ہوتا اور ایک نیا کالے رنگ کا ٹیبل لیمپ جو مجھے میٹرک پاس کرنے پر عزیز بھائی نے تحفتہً دیا تھا۔ سونی کا چھوٹا سا ایک ریڈیو، مائیکروفون اور چند کتابیں رکھی تھیں۔ میں رات گئے چپکے چپکے گانے سنا کرتی اور جب تک قومی ترانہ نہ بجتا ریڈیو بند نہ ہوتا۔

دوسرے حصے میں آمنے سامنے دو چار پائیاں بچھی تھیں۔ کسی بھی اتفاقی اور ہنگامی مہمان اور ابا جی کی فرضی، تکنیکی اور منہ بولی بھانجی کے آنے کی صورت میں اسے میرا روم میٹ بنا دیا جاتا۔

گھر میں مرد حضرات زیادہ تھے اور تایا زاد بھائیوں کا بھی آنا جانا ہوتا۔ ایسی صورت میں میرے کمرے کا دروازہ بند ہوتا اور وہ بے چاری حبسِ بے جا میں بیٹھ کر میری بور کتابیں پڑھتی

رہتیں۔ البتہ خواتین امی جی کے ساتھ بڑے کمرے میں بلاتکلف براجمان ہوتیں۔ میرے کمرے کا دروازہ اگلے ایک کمرے میں کھلتا جو بیک وقت بطور بیڈ روم اور سٹور استعمال ہوتا تھا۔ دو بڑی پیٹیاں جن میں بستر، تکیے، چادریں، نئے جائے نماز، امی کے سینت کر رکھے قیمتی جوڑے اور شالیں رکھے تھے۔ ان کے اوپر مزید صندوق جن میں عجیب وغریب قسم کی امانتیں رکھی ہوتیں۔ جب کوئی چیز نکالنا پڑتی تو اچھا بھلا سیاپا پڑ جاتا۔ ایک بندہ پیٹی کا ڈھکن کھولے کھڑا ہوتا اور امی اس میں سر ہی نہیں، آدھا دھڑ ڈالے، اپنی جمع پونجی سے کچھ نہ کچھ نکالتی رہتیں۔

ایک بار میرے سامنے پیٹی کی صفائی کرنے لگیں تو فرمایا چلو ذرا تم پیٹی کے اندر اترو اور اس کے کونوں پر نیم کے پتے اور فینائل کی گولیاں رکھو۔ میں نے پوری بات سننے سے پہلے ہی کانوں کو ہاتھ لگایا اور باہر بھاگ گئی۔ امی جی نے حسبِ عادت مجھے کام چور اور ہڈحرام، مہارانی وغیرہ کے القاب سے نوازتے ہوئے پڑوس سے آئی بچی کو جو اکثر برتن وغیرہ بھی دھو دیتی اور جسے میں پڑھانے کے فرائض انجام دیتی تھی، پیٹی میں اتارا اور کام مکمل کروایا۔

اس کمرے کے ایک کونے پر مستقل ایک بستر لگا رہتا جو کسی بھی بے وقت آئے بن بلائے مہمان کے کام آجاتا۔

بعض اوقات قریبی رشتے داروں کے آنے کی صورت میں اس کا دروازہ جو اسے نشست گاہ کے ساتھ ملاتا تھا، کھول دیا جاتا اور کھانے کے بعد ادھر ہی آرام کرلیا جاتا۔

میرے بے دریچہ کمرے کے دروازے میری مرضی کے خلاف مہمانوں کے لیے کھلے رہتے۔ مجھے شروع سے ہی ٹیبل لیمپ کی روشنی میں پڑھنے کی عادت تھی۔ کالج کے زمانے میں میرے پاس محلے ہی کی ایک دو طالبات پڑھنے آجاتیں اور امی جی کو سلام کرنے کے بعد غڑاپ سے میرے کمرے میں گم ہوجاتیں۔ ہزار امی کہتیں لڑکیو باہر دن کی روشنی میں نکل کر بیٹھو، چھت پر چلی جاؤ، کم از کم چائے ہی باہر آکر پی لو، لیکن اس کمرے میں جانے کیا تھا کہ جو آتا گھس کر یہیں بیٹھتا۔

کئی دفعہ ابا جی بھی اپنی کرسی یہیں رکھ لیتے۔ سامنے کے بڑے کمرے میں امی جی کی مسند، نماز کا تخت پوش، کرسیاں اور ایک بستر لگا رہتا۔ تخت پوش کے ساتھ ٹیلی فون سٹینڈ تھا۔ ابا جی کے پاس دوا خانے پر آنے والی خواتین اسی کمرے میں آرام کرتیں اور دھوپ ڈھلنے کا انتظار کرتیں۔ ٹیلی فون سننے آنے والی خواتین بھی یہیں بیٹھ کر خوب اونچی آواز میں اور ہاتھوں کے اشارے سے فون پر باتیں کیا کرتیں۔ اس بڑے کمرے کا دروازہ ابا جی کی نشست گاہ میں کھلتا جس

میں چھت تک لگی الماری میں ان کی کتب کا ڈھیر تھا۔ صوفے، میز اور ایک کونے پر لگے بستر نے بیک وقت اسے ابا جی کی خواب گاہ، مہمان خانہ اور ان کا کتب خانہ بنا رکھا تھا۔ اس کمرے کا ایک دروازہ باہر راہداری میں کھلتا اور داخلی دروازے سے قریب پڑتا۔ سو جب ابا جی کے دوست اقارب آتے تو درمیانی دروازہ بند کر دیا جاتا اور گرما گرم بحث کے دور لب سوز چائے کے ادوار کے ساتھ چلتے۔ مجھے کبھی یہ سمجھ نہیں آتی تھی کہ ہمارے گھر میں ہر کمرے کا دروازہ دوسرے کمرے میں کیوں کھلتا ہے۔

شاید لالہ جی نے گھر کا نقشہ ایسے ہی بہتر سمجھا تھا۔ ابا جی فوراً لالہ جی کی سمجھ بوجھ کا حوالہ دے کر بتاتے۔ سامنے کے کھلے صحن میں امی جی نے رنگ برنگے گلاب، موتیا اور اپنی مرضی کی سبزیاں اگا رکھی تھیں۔ تایا جان کے گھر کے ساتھ ملحق دیوار کے سامنے پپیتے کے درخت دربانوں کی طرح قطار میں کھڑے تھے۔

••

ابا جی عورت کو مارنے والوں کے شدید خلاف تھے۔ ''ارے کم بختو، بزدلو مارنا ہے تو جا کر باہر کسی پولیس کانسٹیبل کو مارو، کسی افسر پر ہاتھ اٹھاؤ، یا غنڈوں کے منہ لگو۔ طلاق کے خوف سے لرزتی، سال بسال بچہ پیدا کرتی اور اسے پالتی پوستی نحیف ونزار عورت پر ہاتھ اٹھا کر کون سی مردانگی ثابت کرتے ہو؟'' ابا جی کا مثالی صبر وتحمل جواب دے جاتا اور وہ شدید سرزنش کرتے۔

اپنی ایک مریضہ بنگالن آپا کو وہ گھر لے آئے۔ اس کے تلے اوپر کے دو بچے بھی ساتھ تھے جن کو لے کر وہ بڑے کمرے میں پنکھے کے نیچے بیٹھ جاتی۔ اس کمرے کا ایک دروازہ میرے حجرے میں کھلتا تھا۔ اب دوپہر کو پڑھنا ناممکن تھا۔ وہ اپنے بنگالی لہجے میں ابا جی کو موماں جی (ماموں جی) کہتی جو اس کے منہ پر بہت سجتا۔

''واہ جی واہ، میں ماما سارے شہر دا، میں ہتھ لایاں نئیں ٹھہر دا'' چاچا جان نذیر اپنی خوبصورت آواز میں ترنم سے کہتے اور پھر اپنی آپا کے ساتھ مل کر ہنستے۔ مجھے آگ لگ جاتی۔

''آپ لوگ میرے ابا جی کا مذاق کر رہے ہیں۔'' حالانکہ چاچا جان نذیر مجھے ہمیشہ اپنا دوست کہتے، نہ کوئی کتاب پڑھاتے، نہ کوئی شعر سکھاتے۔ امی کے ساتھ بیٹھ کر ابا جی کی شکایات لگاتے۔

''آہو کڑیے۔ کر رہے ہیں۔۔۔ فیر'' چاچا جان ہنستے۔۔۔''اور لالہ جی کرتے کیا ہیں؟ ان کا بس چلے تو گھر کو دار الامان میں بدل دیں۔''

بنگالن آپا میرے بچپن کا بہت اہم کردار ہے۔ نام تو ان کا نجانے کیا تھا لیکن ہم سب ان کو بنگالن آپا کہتے ہیں۔ ان کے دو معصوم خرگوشوں جیسے بچے بھی ان کی طرح بڑی بڑی آنکھیں اور تپلی پتلی گردنیں نکالے چپ چاپ بیٹھے رہتے۔ ان سے کھیلنا مجھے بہت اچھا لگتا۔ ان کی عجیب و غریب اردو کی مجھے سمجھ بھی نہیں آتی تھی۔ دبلی پتلی بے حد کمزور چہرہ اور ان پر بڑی بڑی آنکھیں جو نہ صرف عجیب لگتیں بلکہ کبھی خوف ناک بھی ہوتیں۔ میں اکثر سوچتی کہ وہ ہنستے ہوئے کیسی لگتی ہوں گی۔ شاید اتنی ہی قابلِ رحم یا پھر شاید ان کو ہنسنا آتا ہی نہیں تھا۔ یہ پہلی دفعہ ہوا کہ میں نے ان کی بول چال کی نقل نہیں اتاری ورنہ لوگوں کے لہجوں کی نقلیں اتارنا میرا محبوب مشغلہ تھا جس پر میری سرزنش ہونا عام بات تھی۔

پھر ایک دن دوپہر کو وہ کھانے کے بعد برتن دھونے کی کوشش کرنے لگیں تو امی جی بے حد ناراض ہوئیں اور ان کو ڈانٹ کر اندر بھیجا۔ وہ بڑے کمرے کے فرش پر بچوں کے ساتھ بیٹھ کر رونے لگیں۔ میرا شروع سے ایک سنجیدہ مسئلہ یہ رہا کہ میں کسی کو بھی روتا نہیں دیکھ سکتی۔ بس یوں لگتا ہے کہ دل ابھی ڈوب جائے گا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا رسالہ رکھا اور بھاگتے ہوئے امی جی کے پاس گئی۔ ''امی جی جلدی آئیں، بنگالن آپا کو نجانے کیا ہوگیا ہے؟''

امی جی آکر اس کے پاس بیٹھ گئیں اور تسلی دینے لگیں جو نجانے اسے سمجھ آئی یا نہ آئی۔ البتہ رات کو اس کا نتیجہ نکل آیا۔ ابا جی نے اس کے شوہر کو بلوا بھیجا۔ شوہرِ نامدار منہ لٹکائے ابا جی کے پاس صلح صفائی کے لیے آئے۔ معافی مانگی اور آئندہ کے لیے محتاط رہنے کا وعدہ کیا۔

میں نے ابا جی کو پہلی دفعہ شدید غصے میں دیکھا۔ ضبط کرنے کی کوشش میں ان کا جسم اور ہاتھ لرز رہے تھے۔ ''الو کے پٹھے کو خدا کے آگے جان نہیں دینی؟ اس مظلوم عورت کے پیروں میں بچوں کی زنجیر ڈال کر پنجرے کے دروازے کھول دیے۔ تم اس بچی کو لاوارث سمجھتے ہو اور خدا رسول کا خوف تمھیں ہوتا تو تم مار پیٹ کر گھر سے نہ نکالتے۔ پھولوں جیسے بیٹوں کی ماں ہے۔ لیکن اب یہ سن لو کہ آج یہ لاوارث نہیں ہے۔ یہ میری بیٹی ہے۔ یا تو اسے عزت آبرو کے ساتھ گھر لے جاؤ یا فیصلہ کرلو کہ اب اس بچی سے تمھارا کوئی تعلق نہیں تاکہ اس کے مستقبل کے لیے کچھ اور سوچا جائے۔ اور دوبارہ اس کمزور بیمار عورت پر ہاتھ اٹھانے کے بجائے کسی مرد کو تھپڑ مارنا پھر دیکھنا کیا بھاؤ بکتی ہے۔ بس مردانگی یہی ہے کہ اپنے ساتھ نکاح کی زنجیر میں بندھی اور مجبوریوں کے قید خانے میں چھپی عورت کو مار پیٹ لیا؟''

دو دن بعد چھوٹے خرگوشوں جیسے پھدکتے بچے نہا دھو کر تیار تھے اور بنگالن آپا امی سے لپٹے روئے جا رہی تھیں اور اپنی زبان میں نجانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ امی ان کو تسلی دے رہی تھیں کہ میں خود آ کر تمھاری خیر خبر لیتی رہوں گی۔

ایسے نجانے کتنے واقعات میرے ذہن میں رنگین کترنوں کی طرح اڑتے پھر رہے ہیں کہ اگر صرف ان کو قلم بند کرنے لگوں تو کتاب میں کچھ اور لکھنے کی گنجائش ہی نہ رہے۔

••

گھر میں ہم سب بہن بھائی کبھی کبھار ہی جمع ہوتے۔ لاہور، اسلام آباد، گجرات اور پنڈی کے مختلف اداروں میں تقسیم بہن بھائی چھٹیوں کے مطابق ہی گھر آتے۔ میرا کالج ختم ہوتے ہی میرا مدار بدل گیا۔ قسمت مجھے اس چہچہاتے دائرے سے نکال کر پردیس کے سناٹے میں لے آئی۔ موسمِ گرما کی طویل دوپہروں کو کھڑکی سے دکھائی دیتے درخت پر چڑیوں کی تعداد گنتے ہوئے مجھے ایک چھوٹے سے قصبے کا درختوں سے بھرا اور پھولوں سبزیوں والا آنگن ہمیشہ یاد رہا۔ اس میں بکھرے بے فکری کے قہقہوں، شرارتوں اور جسارتوں نے ہمیشہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنے کی ہمت دی۔ بچپن کا طلسم کدہ کسی بھی انسان کے ہمراہ شاید آخری سانس تک جاتا ہے۔

••

حماد کی پیدائش میرے شعور کا سب سے خوبصورت واقعہ ہے۔ ان دنوں چچا جان شریف کی دونوں بیٹیاں بھی پاکستان تھیں۔ میں کھڑپینچ قسم کی آپا بنی کسی کو ہاتھ نہ لگانے دیتی۔ سکول سے واپس بھاگنے کی پڑی رہتی۔ گھنگھریالے بالوں والا حماد اکثر تائی جان کے گھر پایا جاتا اور تائی جان اسے لاڈ اٹھاتے ہوئے خوب کھلاتی پلاتیں۔ جب میرے ہاتھ لگتا تو جتنی نظمیں مجھے آتی تھیں میں اسے گا گا کر سناتی رہتی۔ ایک دن ابا جی جیسے تنگ آ کر بولے:

”تیری بہن بڑی پلیت ای
گاندی پھردی تیرے گیت ای“

خدا جانے کیسے میرے منہ سے نکلا:

”تیرا ابا بڑا کوڑا ای
پاندا کھدر دا جوڑا ای“

ابا جی پہلے تو حیران پریشان میرا منہ دیکھتے رہے۔ پھر اٹھ کر مجھے پیار کیا اور اپنی ڈائری

میں اس دن کی تاریخ ڈال کر دونوں اشعار لکھے۔

••

چھوٹی ڈائری ہر وقت ابا جی کی جیب میں ہوتی جس میں اہم ٹیلی فون نمبر اور حساب کتاب درج ہوتا۔ قلم ہر وقت جیب سے لگا رہتا جو کبھی کوئی ادھار مانگ کر واپس نہ کرتا تو کبھی کوئی چرا لیتا۔ میرا جھگڑا جاری رہتا سو میں نے قلم پر نام لکھوا کر دیا مگر کوئی عیار قسم کا عاشق جو بھیس بدلنے پر قادر تھا ان سے بٹور کر لے گیا کہ مرزا صاحب نام والا قلم آپ کی یاد دلائے گا۔

••

سکول کے زمانے سے ہی میں نے ڈراموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ امی جی یومِ اقبال کے موقع پر سکول آئیں۔ میں نے اقبال کی نظم ''ایک خواب'' میں اس بچے کا کردار ادا کیا جس کا چراغ اس کے ماں کے آنسوؤں نے بجھا دیا تھا۔

امی جی سکول میں تو چپ کر کے ڈرامہ دیکھ کر آ گئیں، گھر آ کر بولیں، ''یہ رڑھ گئی وہاں ایسے ڈرامہ کر رہی تھی جیسے اسے مرے ہوئے بھی کئی سال گزر چکے ہوں۔''

پھر بے وقوف نوکر کا کردار، گاؤں کے مکھیا کی نافرمان بیٹی جو سکول جانا اور لکھنا پڑھنا چاہتی تھی، کبھی بگڑی ہوئی بچی جسے سکول جانا اچھا نہیں لگتا تھا، مجھے یاد ہے کہ دسویں جماعت میں مجھے ایک مظلوم بہو کا کردار ادا کرنے کا کہا گیا جس سے میں نے صاف انکار کر دیا۔ مجھے غریب استانی کا کردار زیادہ پسند تھا جو رات کو پڑھنے کی خاطر گلی کے لیمپ کی جانب حسرت بھری نظروں سے دیکھتی تھی۔ ایک پری جو بچوں کے خواب میں آ کر کتابوں کا تحفہ دیا کرتی تھی۔ بچپن کے سنہرے دن آج بھی ستاروں کی طرح روشن ہیں۔

••

ہمارے نانا جان انتہائی صاحبِ علم اور درس و تدریس سے وابستہ تھے لیکن ان کی مثال بابا جان وغیرہ کے سامنے ایسے ہی تھی جیسے کسی آبشار کے ساتھ کوئی نرم خو ندی بہہ رہی ہو۔

ہمارے وکیل ماموں جان کے ساتھ بھی ہم سب کی بہت دوستی تھی۔ وہ بھی جوئے نغمہ خواں کی طرح مدھم دھیمے لہجے میں بولنے والے تھے۔ امی جی اپنے زمانے میں ایک تو لاڈلی بہت تھیں دوسرے نانا جان کے مزاج میں بیٹیوں سے بے پناہ محبت شامل تھی۔ امی جی کو جب مزید آگے پڑھنے کے لیے اپنی پھوپھی صاحبہ کے گھر رہنے کے لیے بھیجا گیا اور ساتھ چاولوں، دانوں اور گڑ کی

بوریاں بھیجی گئیں، ایک کام کرنے والی ساتھ گئی لیکن کسی معمولی بات پر بگڑ کر کتابیں بستہ وہیں چھوڑ کر گھر آ گئیں۔ نانا جان نے اپنی لاڈلی بیٹی سے کہا کوئی بات نہیں۔ چلو گھر میں پڑھ لیا کرنا۔ امی جی کو نانا جان نے زبان و ادب کی تعلیم دی۔ ہماری نانی جان کو بھی انھوں نے نہ صرف قرآن خود پڑھایا بلکہ ترجمہ، تفسیر اور نماز و طہارت کے مسائل پڑھائے جنھیں وہ سادہ انداز میں یوں بیان کرتیں کہ مجھے ہنسی روکنا مشکل ہو جاتی۔ جہاں کہیں زورِ بیان کے لیے مزید لائل کی ضرورت ہوتی، جا کر ''میاں جی'' سے پوچھتیں۔

میرے ددھیال کے بابوں اور میرے عظیم نانا جی کے درمیان فرق صرف وہی سمجھ سکتا ہے جس نے بیک وقت نیاگرا فال کا جاہ و جلال اور شوکت و ہیبت بھی دیکھ رکھی ہو اور جھیل سیف الملوک پر چاندنی رات کو رقص کرتی لہروں کے قدم بھی گن رکھے ہوں۔ نانا جان کو سب لوگ قاضی صاحب اور میاں جی کہا کرتے تھے۔ جب ہوش سنبھالنے پر میاں جی کا کلام سننے کو ملتا تو میں دیر تک یہی سمجھتی رہی کہ یہ نانا جان کا کلام ہے۔

مجھے بس بچپن میں ایک ہی دفعہ اپنے نانا جان کے پاس جانے کا اتفاق ہوا۔ ان کے لہجے کی مٹھاس، ان کی کم گوئی اور ان کی خوبصورت نیلی آنکھوں میں جھلکے مارتی ایک خوبصورت نور بھری ٹھنڈک؛ وہ اپنی خوبصورت نیلی آنکھوں کو اخبار اور کتابوں پر مرکوز کیے پڑھتے رہتے۔ گجرات شہر کے گرد و نواح کے سارے دیہاتوں سے لوگ ان کے پاس آیا کرتے۔ کسی کو کچھ پڑھنا ہوتا یا کوئی بھی علمی اور دینی نکتہ یا سوال کی وضاحت چاہیے ہوتی تو نانا جان کے پاس آتے۔ بہت دیر بعد مجھے علم ہوا کہ نانا جان فارسی پر بھی دسترس رکھتے تھے اور کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔ ایک دن شام کو کچھ لوگ گھوڑے پر بیٹھ کر ان سے ملنے آئے۔ اگلے دن علم ہوا کہ وہ شہر جا کر امتحان دینے والے تھے۔ نانا جان کے پاس تیاری کی غرض سے آئے تھے۔

گاؤں میں بجلی نہیں تھی اور یہی حسن دیکھنے کے لیے میں ضد کر کے آئی تھی۔ شام کو ٹھنڈی ہوائیں چلتیں۔ چڑیوں کے غول فضا میں یوں دائرہ بناتے جیسے کسی نے انھیں خوب مشق کروانے کے بعد ہم آہنگی کا مظاہرہ کرنے کے لیے فضا میں اتارا ہو۔ چڑیوں کا غول اڑتے اڑتے اچانک ہی سمت بدلتا اور فضا میں کالے لہریے بن جاتے، جو ذرا سا چکراتے اور پھر دائرہ بنتا جو نیم کروی شکل اختیار کرتا اور پھر ایک ہموار سیدھی لکیر کی صورت سیدھا اڑتا۔ کبھی ان پر کسی خاص زاویے سے دھوپ پڑتی تو سارے پرندے یک دم روپہلی روشنی میں نہا جاتے جیسے کسی نے چاندی کے بے شمار پر ہوا میں اچھال

دیے ہوں جو نیچے گرنے سے قبل ہوا میں ہی لوٹیں لگا کر دوبارہ ہلکے بھورے ہو گئے ہوں۔

کبھی ایک پرندہ اس میں آگے آجاتا اور تیر کی صورت میں باقی چڑیاں پیچھے اڑنے لگتیں۔ میں منہ اوپر کیے فضا میں پیش کیے جانے والا فری شو دیکھ رہی تھی۔ نانی اماں شاید آوازیں دے رہی تھیں جو میرے کانوں تک نہیں پہنچیں۔ پاس آکر بولیں:

''ایسے ہی بوتھا اوپر اٹھا کر رکھا تو کنوئیں میں جا گرو گی۔''

دو دن میں نے کسی خواب کی طرح گزارے، پھر رونا پیٹنا شروع کر دیا کہ بس اب مجھے گھر جانا ہے۔ ''لو اس کو آنے کا بھی شوق تھا اور اب جانے کی بھی جلدی۔'' تب میں نے محسوس کیا کہ فصلوں کھیتوں آموں کے باغ اور اس کے کونے پر غوں غوں چلتے کنویں کے حسن کے باوجود مجھے اپنی نہر اپنا دریا جہلم اور دریا سرائے عالمگیر کے درمیان میں سانس لیتا اپنا منا سا قصبہ یاد آنے لگا۔

''نانا جی، مجھے گھر بھیج دیں۔ بس اب میں گھر جاؤں گی۔'' میں نے نانا جان کے پاس بیٹھ کر فریاد کی۔

''یہ بھی تو گھر ہے''، وہ اپنے مخصوص شیریں لہجے میں بولے۔

''نہیں ں ں ں۔۔۔'' میں نے ٹھنکنا جاری رکھا۔ ''یہاں رات کو کتے بھی بھونکتے ہیں۔''

''ہاں، رات ان بے چاروں کے لیے دن ہوتا ہے ناں۔'' نانا جان مصالحت سے بولے۔

''مجھے گھر جانا ہے۔ یہاں بچے بھی نہیں ہیں جن سے کھیلوں۔'' میں نے نیا مسئلہ پیش کیا۔

''اچھا، جاؤ اپنی نانی اماں کے ساتھ چنے بھنوانے چلی جاؤ۔ ان میں گڑ ڈال کر کھا لینا۔''

''نہیں، وہ تو آپ کے ہمسائیوں کا گھوڑا بھی کھاتا ہے۔''

''اچھا میں تمھیں کچھ پڑھ کر سناتا ہوں'' وہ اپنی خوبصورت نیلی آنکھوں کو ایک کتاب پر مرکوز کر کے بولے۔

''نہیں۔۔۔'' میری بیزاری بڑھتی گئی۔ ''میں نے گھر جانا ہے، میرا دل نہیں لگتا یہاں۔ یہاں پڑھنے کو کوئی کتاب ہی نہیں ہے۔'' میں نے ان کی بیزار کن بھاری کتب کو دیکھا۔

''اے بلائے،'' (لفظ 'بلا' کو بڑے خاص انداز میں لاڈ سے ادا کرتے گویا بیک وقت مجھے بلا ثابت کرنا چاہتے اور بلا کا دل دکھانا بھی مقصود نہ ہو۔ ہو ناں ہو، یہ بلا کے لاڈ کا نام ہوگا۔) کتابیں تو بہت ہیں یہاں، کل چھت پر جا کر دیکھنا۔ نانی اماں سے کہو کمرہ کھول دیں۔''

شام ہو چکی تھی اور چھت پر جا کر وہ جادوئی کمرہ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ رات میں نے تقریباً

جاگتے ہوئے گزاری۔ وہاں بے شمار ستارے تھے اور بہت زیادہ روشن تھے۔ مجھے آج بھی ایسے لگتا ہے کہ میرے بچپن کے زمانے میں آسمان زیادہ نیلا اور ستارے زیادہ چمک دار تھے۔ جہلم کے دریا کا پانی بھی زیادہ شفاف تھا۔ صبح جب سورج کے نکلتے ہی میں اوپر کمرے میں گئی، نانی اماں بڑبڑاتی رہیں، ''تیرے ماموں کا کمرہ ہے، کوئی خرابی نہ کرنا۔''

انھوں نے دروازہ اتنی احتیاط سے کھولا جیسے کسی مقدس مقام میں داخل ہو رہی ہوں۔ میں اچک کر یوں دیکھ رہی تھی جیسے یہ محل کا وہ دروازہ ہے جس کے عقب میں ایک طلسمی باغ ہوگا۔ دروازہ کھلا۔ زمین سے لے کر چھت تک کتابوں سے ٹھونسا ہوا کمرہ جس میں ہر طرح کے اردو ڈائجسٹ سیارہ ڈائجسٹ الماری میں تھے۔ ارے، میری ساری کوفت جاتی رہی۔ جیسے جادو کے زور پر جنگل میں منگل کا سماں ہوجائے۔ یہ ہمارے وکیل ماموں جان مختار ملک کا خزانہ تھا جو کراچی پڑھتے تھے۔ یہی ماموں جان بعد میں تایا جان کے داماد بنے۔ مجھے بچپن سے ہی ان سے بہت پیار تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ سحر انگیز کمرہ بھی تھا۔

میں صبح چھت پر چڑھی۔ ظہر ہوگئی۔ نانی اماں کی آوازوں پر آوازیں، ''ینچے آ، روٹی کھا جا روٹی کھا جا۔''

پھر وہ خود اوپر آئیں، ''توں کردی کی ایں پئی کڑیے'' آ کے انھوں نے سر پیٹ لیا۔ میں نے سرہانے چن کر مہینوں کی ترتیب سے رسالے سجا رکھے تھے اور ایک پڑھنے میں مشغول تھی۔ نانی اماں ناراض ہونے گئیں، ''چل تھلے، رحمتے نیں بھٹی تائی اے، تے دانے بھنان چلیے'' (نیچے چلو، رحمتے نے بھٹی دہکالی ہے۔ آؤ دانے بھنانے چلیں۔)

میں نے صاف انکار کر دیا۔

نانی اماں ناراض ہونے لگیں، ''مجھے سمجھ نہیں آتی کہ تجھے مصیبت کیا ہے؟ کیوں ان کتابوں میں سر دیا ہوا ہے؟''

''اوے بھلیے لوکے!'' میاں جی اپنے مخصوص نرم لہجے میں بولے، ''آپ کا سمجھنا ضروری بھی نہیں۔ پڑھتی ہے تو بس پڑھنے دو اسے۔ سمجھ آئے یا نہ آئے، یہ اس کا مسئلہ نہیں۔ پڑھ رہی ہے تو بیٹھ کر پڑھنے دو۔'' میں نے شہہ پا کر بھنے ہوئے مکئی کے دانے اپنے سامنے رکھا چھابہ اٹھایا اور ان میں گڑ ملا کر کھانے لگی۔

نانی اماں کی سہیلیاں ان سے پوچھتیں، ''اے چپہ ساری کڑی کتاب بھی پڑھ لیتی ہے یا

ہمیں ''دھپھا'' لگا رہی ہے۔'' ان میں سے ایک بھاگ کر اپنے بھتیجے کو بلا لائیں جو شہر سے آیا تھا۔

وہ میرا امتحان لینے کسی فارنز سینسر بورڈ کے ممبر کی طرح بیٹھ گیا۔ چنی سی آنکھوں والا، لم ڈھینگ جو چونکہ شہر سے آیا تھا، مجھ سے بڑا تھا، اس لیے چوتھی جماعت میں پڑھتی ایک پدی سی چپہ سی لڑکی کا امتحان لینے کا اہل تھا۔ کتاب تو اس کے پاس تھی ہی نہیں۔ ماموں جان کے طلسمی کمرے سے رسالہ منگوایا گیا۔ لم ڈھینگ نے رسالہ کھولا، ''یہاں سے پڑھو''، میں نے فر فر پڑھ کر عبارت سنا دی۔

''ٹھیک پڑھیا سہ؟'' اس کی پھوپھی نے اشتیاق سے یوں پوچھا جیسے نفی میں جواب ملتے ہی بہن برکتے کو کہیں گی کہ کہا تھا ناں کہ یہ پدی تمھیں ویسے ہی تنگ کر رہی ہے۔

''ہاں، پڑھ تو ٹھیک ہی لیا ہے اس نے،'' وہ اپنی شاہی مسند چارپائی سے اٹھ گیا۔

''کیسے پڑھ سکتی ہو؟ کتنے سال کی ہو؟ کس جماعت میں جاتی ہو؟''

میں چونکہ اپنی بے عزتی پر ناراض اور اپنی کامیابی پر خوش تھی اس لیے اسے کوئی جواب دیے بغیر نانا جان کی طرف بھاگی کہ جا کر ان کو بتا سکوں کہ نانی اماں کی سہیلیاں بے چاری شرمندہ بیٹھی ہیں۔

••

نانی اماں میرے لیے کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک سہیلی دریافت کر لائیں، ''جاؤ زیبی سے کھیلو۔ وہ بھی تمھاری عمر کی ہے لیکن تمھاری طرح افلاطون نہیں ہے۔'' نانی اماں نے فخر سے اس اچھی بچی کا تعارف کروایا۔

میں نے زیبی کی طرف دلچسپی سے دیکھا، وہ بھی جواباً مسکرا دی۔

''باہر چلیں؟ میرے ماموں کی زمینوں میں ڈوڈے (چنے) لگے ہیں ہرے ہرے، وہ کھاتے ہیں جا کر۔'' وہ بڑے فخر سے بولی۔

میں دل میں سوچنے لگی کہ یہاں چنے، مکئی، گڑ اور چنوں کے علاوہ بھی کوئی سرگرمی ہے؟ کچھ اور سوجھتا ہی نہیں کسی کو۔ لیکن میں نے کمال فراست سے کام لیتے ہوئے انکار کا خطرہ مول نہیں لیا کہ کہیں یہ اکلوتی سہیلی بھی نہ جاتی رہے ورنہ ساری شام گھر میں نانی اماں کی گھرکیاں اور میاں جی کی پیش بندیاں سہتے گزر جائے گی۔

زیبی کے پاس تو دلچسپی کی بے شمار چیزیں نکلیں۔ مثلاً اس کے ماما جی کے کھیت میں ان ڈوڈوں کے علاوہ شتالہ بھی تھا، مرغیاں اور خرگوش بھی تھے۔ پھر بیری کا ایک درخت بھی تھا جس پر لال اور ہرے پروں والا پرندہ پھدکتا پھر رہا تھا۔ رات کو وہاں مینڈکوں کی راجدھانی قائم ہو گئی جن

کو پہلی دفعہ اتنی تعداد میں چھلانگیں لگاتے دیکھ کر چیخ مار کر میں نے بھی ان ہی کی طرح چھلانگ لگا دی تھی لیکن زیبی مجھے مرعوب کرنے کے شوق میں مینڈک کو پکڑ کر اپنے ہاتھ پر بٹھانے کے چکر میں رہی۔ وہاں میں نے ایک ننھے سے مینڈک کو اچھل کر ایک مکوڑے کا شکار کرتے بھی دیکھا تھا۔

اگلی صبح زیبی شاید آنکھ کھلتے ہی وارد ہوگئی۔ اس نے پھولے سانسوں میں مجھے آواز دی۔ آنکھیں شوق اور خوشی سے چمک رہی تھیں، ''چلو چلو۔ ابھی تک سو رہی ہو۔ جلدی چلو، میرے ماموں کے گھر میں انڈوں سے چوزے نکلے ہیں۔ ابھی ابھی نکلے ہیں۔ بہت خوبصورت ہیں۔''

میں جو نانی اماں کے حکم پر تر تراتا بھاری بھرکم پراٹھا کھانے کے خیال سے منہ بنا رہی تھی، اٹھ کر فوراً اس کے ساتھ بھاگی۔

''او بے وقوفے، منہ تو دھولو، لاؤ تمھاری کنگھی تو کر دوں۔''

لیکن ہم دونوں سنی ان سنی کر کے بگٹٹ بھاگیں۔

زیبی کے ماما جی کے گھر ننھے منے پیلے پیلے دو چوزے بندوں سے چھپتے پھر رہے تھے۔ اس کی مامی جی اور مامے کا پتر ان کی حفاظت کر رہے تھے۔ اتنے پیارے روئی کے گالے دیکھ کر میری ساری بیزاری جاتی رہی۔ زیبی کی مامی کے شور شرابے کے باوجود ہم دونوں سائے کی طرح چوزوں کے تعاقب میں رہیں اور اس کے مامے کا پتر ہمیں بلی اور چیل کے خطرات سے آگاہ کرتا رہا۔ اس نے ہمیں چوزوں اور ان کی والدہ کے لیے بنایا گیا ''کھڈا'' بھی دکھایا۔ اس معصوم سے دن کی حیرت اور خوشی مجھے آج بھی یاد ہے۔

میاں جی نے اس زمانے میں حج کیا تھا جب لوگ بحری جہاز سے حج کے لیے جایا کرتے تھے اور محض پیسے کے زور پر گھروں کے باہر الحاج کے بورڈ نہیں لگایا کرتے تھے۔ شام کو لوگ ان سے ملنے آیا کرتے تھے، ''اینہاں اکھیاں سرکار دا روزا ویکھیا اے'' (ان آنکھوں نے سرکار کا روضہ دیکھ رکھا ہے۔) نانا جان کے پاس بیٹھ کر یوں روداد سنتے جیسے جنت سے واپسی پر کسی محیر العقول تجربے کی داستان سن رہے ہوں۔ شاید اس زمانے میں ان کو ایسے ہی محسوس ہوتا ہو کہ اس مقدس مقام کی زیارت کرنے والا مستند جنتی ہوتا ہے۔

ایک بہت بوڑھے سے بابا جی ان کے ہاتھوں اور پیروں کو چھو کر اپنی آنکھوں اور ہونٹوں سے لگاتے۔ نانی جان نے بتایا کہ وہ اکثر اپنے پوتے کے ہمراہ قریبی گاؤں سے پیدل چل کر آتے ہیں۔ میں نے انھیں دیکھ کر سوچا کہ اگر یہ چلتے چلتے راستے ہی میں مر گئے تو کیا ہوگا۔ اب سوچتی ہوں

شاید وہ پیدل حج کرنے کی نیت سے آتے ہوں اور شاید ان کی اس مشقت پر کعبہ بھی سَرک کر کہیں آگے پیچھے طواف کرتا ہو۔

مجھے یاد ہے کہ نانا جان کے سہونترے والے گھر میں نلکہ ہوتا تھا اور شام کو لوگ وہاں پانی بھرنے آتے تھے۔ جو عورتیں کسی وجہ سے کنوئیں پر نہیں جاسکتی تھیں حالانکہ گھر کے سامنے ہی آموں اور جامن کا باغ تھا اور اس کے بائیں کونے پر ہاتھ سے گھمانے والی چرخی والا کنواں بھی تھا۔ میں نے نانی اماں کے کئی کٹورے اس کنوئیں سے پانی بھرنے کی کوشش میں اس میں پھینکے۔ نانی اماں ہر آئے گئے کو اپنے ان چمکتے ہوئے ''کولے'' کی لفظی تصویر کشی کر کے میری نامراد حرکت کی کہانی سناتیں۔

پھر نانا جان کوٹلے منتقل ہو گئے جہاں مالٹوں کا باغ مہکتا تھا۔ پودوں، پھووں اور پھلوں کی رنگین مہک سنہری دھوپ میں مدغم ہو کر کوئی عجیب سا رنگ تخلیق کرتی جسے آج بھی میرا تخیل چھو کر دیکھ سکتا ہے، قوتِ شامہ اس لَپٹ کو دماغ تک پہنچا سکتی ہے، لیکن قلم بیان نہیں کر پاتا۔

مجھے ایک خواب کی طرح یاد ہے کہ شاید نانا جان کسی حادثے میں بیمار ہو گئے تھے اور علاج کی غرض سے آئے تھے۔ ابا جی شام کو ان کے پاؤں دابتے اور اپنے ہاتھ سے دواخانے کے خصوصی تیل کی مالش کرتے۔ جب میں بڑی ہوئی تو امی جی نے بتایا کہ ان کی ٹانگ اور کولہے کی ہڈی میں چوٹ تھی جس کا درد کم نہیں ہوتا تھا جس کے لیے حکماء نے خصوصی تیل بنایا جس کی مالش کی جاتی۔ دو ہفتے کے بعد نانا جان اپنے پیروں پر چل کر گھر چلے گئے۔

ہماری تایا زاد بہن ہماری ممانی بن گئیں۔ اب نانا جان کے گھر کے پھیرے زیادہ ہو گئے۔ خوبصورت چکنے فرش والے بڑے سے برآمدے میں پلنگ پڑا تھا۔ نانا جان سفید براق بستر پر سفید کرتا پہنے براجمان ہوتے۔ چمکتی سفید رنگت، خوبصورت گھنگھریالے سفید بال، نیلی آنکھیں اور شام دیر گئے تک مطالعہ کرتے نانا جان جو آخری عمر تک بابا جان کی طرح چاند کی روشنی میں بھی پڑھ سکتے تھے جن کی بصارت روشن رہی، چمکیلے دانت پوری صحت مندی کے ساتھ قائم رہے۔ نانا جان نماز کے وقت اس شاہی تخت سے اترتے۔ پھر طویل قیام و سجود کے بعد واپس بیٹھتے۔ ماموں جان نے دوبئی سے قاری باسط کی تلاوت کی کیسٹ اور ٹیپ ریکارڈ بھی منگوا رکھا تھا۔ اس کی سائیڈ بدلتے رہتے اور مدھم آواز کے ساتھ آواز ملا کر پڑھتے رہتے۔

اللہ غریقِ رحمت کرے، ہماری نانی اماں بے حد پیاری اور زندہ دل خاتون تھیں۔ پیاری یوں کہ ہمارے ساتھ مل کر ہر بات میں حصہ لیتیں۔ بس ذرا اپنی مرضی کی مالک تھیں۔ مجال ہے جو

کوئی بات ناگوار گزرے تو اس کا برملا اظہار نہ کریں۔ ابا جی ان کے تایا زاد بھائی بھی تھے۔ جب آتیں تو خوب رونق لگتی۔ نازک سی نانی اماں ایک مرتبہ ابا جی کے پاس بیٹھی کسی بات پر الجھی ہوئی تھیں۔ اپنے مزاج کے مطابق خفا ہوگئیں۔ اٹھیں، جوتا پہنا اور دھمکیاں دیتیں تایا جان کے گھر کو چل پڑیں۔ ابا جی بستر سے اٹھ کر ننگے پاؤں پیچھے بھاگے۔ ہماری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ ہم نے یہ منظر دیکھا۔ ابا جی سے پہلے ہی میرے بھائی نے ان کو بیرونی دروازے سے پہلے جا لیا اور دھان پان نانی اماں کو گود میں اٹھا کر اندر لے آئے۔ کھلکھلاتی ہوئی اسے تھپڑ رسید کرتی کھڑی ہوگئیں۔ دوپٹہ کھینچ کر ماتھے تک کیا اور کہنے لگیں میں تے مخول پئی کردی ساں (میں تو مذاق کر رہی تھی)۔ ابا جی نے کہا بہن، بات یہ ہے کہ آمنے سامنے بیٹھ کر جو جتنا چاہے بحث کرے لیکن کسی پچھلے تنازعے کا حوالہ دینا بھی درست نہیں۔ جو مسئلہ آج کا ہے صرف اس مسئلے پر بحث کی جائے۔ اختلاف کرے یا لڑے جھگڑے، لیکن ناراض ہوکر میں کسی کو نہیں جانے دیتا، نہ ہی میں دن کی ناراضگی پر رات کو سرد جنگ کی حالت میں سونے کا قائل ہوں۔ اگلے سانس کی کس کو خبر آئے کہ نہ آئے۔ صبح سو کر اٹھنے پر رات کی تلخی کا تذکرہ کیا۔ رات گئی بات گئی۔ یہ باتیں میرے ذہن کی تختی پر پتہ نہیں کب کندہ ہوگئیں۔

میں جب عالیہ کو ساتھ لے کر پاکستان آئی تو نانی اماں نے کہا کچھ دن کوٹلے آ کر بھی رہو۔ عالیہ خوش ہوکر درختوں کے درمیان گلہریوں کی طرح بھاگتی پھرتی۔ نانی اماں ایک دن نالاں ہوکر کہنے لگیں کہ اچھی بھلی پریوں جیسی بچی دی ہے اللہ نے، اس نے پھر بھی منہ کتابوں میں ہی دے رکھا ہے۔ کبھی کہتیں، ''شکل دیکھی ہے اپنی، اتنی کمزور تو ہمارے ماچھیوں کی لڑکیاں بھی نہیں ہیں۔ ظاہر ہے ساری طاقت تو کتابیں چوس جاتی ہیں۔''

میں خاموشی سے گھر سے اتارے مالٹوں پر نمک اور کالی مرچ ڈال کر کھاتی رہتی۔ یا پھر نانی اماں کا پراٹھے پر رکھا سفید مکھن کا ڈھیلا دیکھ کر سوچتی رہتی اسے کیسے کھاؤں۔ نانی اماں ساگ میں بھی یہ سفید مکھن گھسا دیتیں، دال پر بھی یہ پتلا سا پانی بن کر تیرنے لگتا، اور مرغی کے ساتھ جو پھلکا بنایا جاتا اس پر سنہری سا محلول بنا چمٹا رہتا۔ چند دن بعد میں نے بوریا بستر سمیٹا اور گھر کا راستہ لیا۔ نانی اماں ساتھ آگئیں۔ عالیہ کو وقت پر سوتے جاگتے دیکھتیں تو حیران ہوکر کہتیں، لگتا ہی نہیں تیری بچی ہے، کیسی پیاری عادات ہیں۔ میں نے کہا شکر ہے کہ وہ آپ کی باتیں نہیں سمجھ سکتی ورنہ مجھے نجانے کیا کیا کہتی۔

جس آنگن میں میرا بچپن دوڑتا پھرتا تھا وہیں عالیہ ننھے ننھے قدموں سے ہرنی کے بچے کی

طرح گھومتی پھرتی۔ اسے اپنی ماں، نانی اور پڑنانی کی گود نصیب ہوئی۔ نانی اماں کے کان پورے چھدوائے گئے تھے جن میں وہ سونے کی باریک بالیاں پہنتیں۔ عالیہ حیران ہوکر دیکھتی، پھر ان میں اپنی انگلیاں پھنسانے کی کوشش کرتی۔ نانی اماں کہتیں کہ کبھی ماں کے کان میں کچھ دیکھا ہوتو حیران نہ ہو۔ پھر مجھ پر الٹ پڑتیں، کیوں نہیں پہنتی ہو کان اور گلے میں کوئی زیور، کتنی کو بجی لگتی ہو۔ پہلے تو کسی کو سانس نہیں لینے دیتی تھیں تم۔ میں چپکے سے جا کر ٹاپس پہن آئی تو نانی اماں کی تیوری اتری۔

میں ان کی گود میں اپنی بچی کا ہمکتا ہوا بچپن دیکھ کر خود کو تلاشنے لگی۔

••
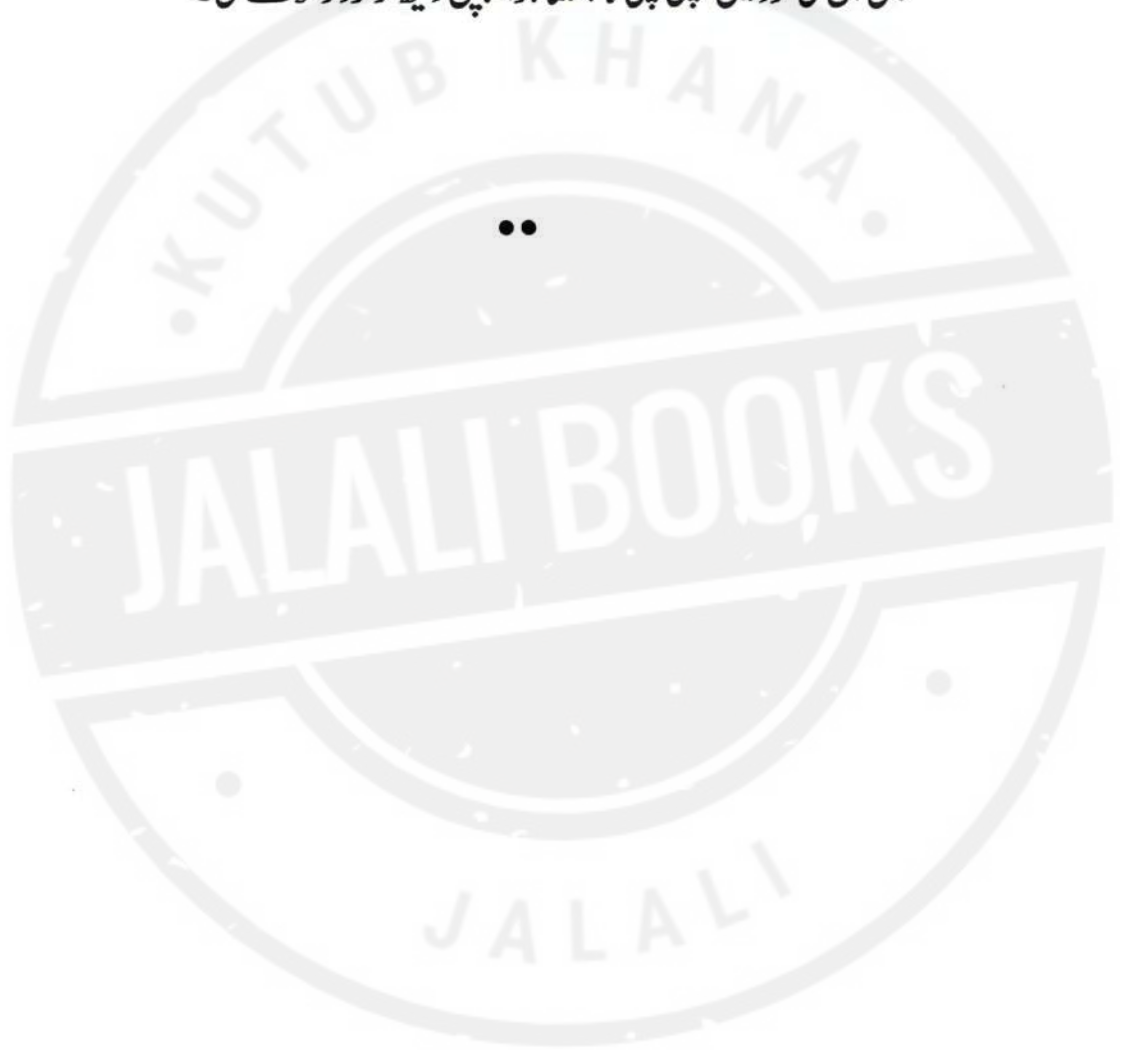
جہلم کے پانیوں کی روانی ہے رقص میں

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے کالج میں نیا نیا قدم رکھا اور بین الکلیاتی مباحثوں اور مذاکروں میں نئی طالبات کو بھی لیا جانے لگا۔ چونکہ میرا نام پہلے ہی مذاکرے اور مباحثے میں انعام لینے کی وجہ سے اردو سوسائٹی کی مس منہاس تک پہنچا تھا سو جب گجرات کالج سے دعوت نامہ آیا تو جو خواہش مند تھے اور جو لوگ انعام حاصل کر چکے تھے ان سب کو انھوں نے بلایا۔ مس منہاس جو فارسی پڑھایا کرتی تھیں اور کالج کی بہت بااثر اور بارعب شخصیت تھیں، کالج کے مقابلے میں تو خود سب لوگوں کو ایک ایک دو دو سطریں دے کر اور پڑھا کے دیکھ رہی تھیں۔ ہم سے پہلے فورتھ ایئر کی ایک سوسائٹی کی صدر جن کا نام لینا مناسب نہیں، انھوں نے عبارت پڑھی تو انھوں نے ایک لفظ سَپاس گزار پڑھا۔ آخر میں جب نتائج کے بعد انتخاب ہوا اور ہم سب اپنی اپنی عبارات پڑھنے لگے تو میں نے کہا کہ یہ لفظ سَپاس نہیں سِپاس ہوتا ہے۔

میں نے شاید بھرپور تیقن سے کہا۔ مس منہاس نے اپنے کندھے پر جمے جمائے ساڑھی کے پلو کو دوبارہ ٹھیک کر کے جمایا، بائیں ہاتھ سے عینک کی دائیں کمانی درست کی اور میری طرف دیکھ کر بولیں، ''اردو کس نے پڑھائی تمھیں؟''

میں ذرا سی پریشان ہوگئی کیونکہ ان کی شخصیت کا رعب ہی کچھ ایسا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا، ''بابا جان نے۔''

''کہاں ہوتے ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟'' انھوں نے اگلا سوال پوچھا۔ چند ثانیوں کے لیے مجھے ایسے لگا کہ میں بابا جان کے کمرے میں ان کے سامنے کھڑی ہوں۔ مجھے ان کی آواز بھی سنائی دی۔ میری آنکھیں ایک دم پانی سے بھر گئیں، ''وہ نہیں ہیں۔''

''لیکن تمھیں اس بات کا یقین کیسے تھا کہ لفظ سَپاس نہیں سِپاس ہوتا ہے؟'' وہ علم دوست اور متجسس ذہن کی مالک تھیں۔ میں نے آٹھویں کلاس میں بابا جان کا سکھایا ہوا شعر پڑھا۔

سِپاس شرطِ ادب ہے ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر
ذرا سا اِک دل دیا ہے، وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا

اس کے بعد یہ نقطۂ آغاز تھا۔ مس منہاس نے براہِ راست ابا جی سے بھی رابطہ کیا۔ ہمیشہ انھوں نے میرے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔ میرے لب و لہجے کی اور شاعری میں میری دلچسپی کو سراہا اور ان کی حوصلہ افزائی ہمیشہ شامل رہی۔ انھیں حیرت ہوتی کہ مجھے اقبال کی طویل نظمیں اور کلاسیک شعرا کے اشعار کیسے یاد ہیں۔

لیکن اس دن جب میں اس خبر کے ساتھ گھر آئی کہ مجھے گجرات کالج کے مباحثے میں جانے کے لیے چن لیا گیا ہے تو ایک نئی افتاد میرے لیے تیار تھی۔ حسبِ معمول شام کو پڑھنے بیٹھے تو پورے دن کی روداد سناتے ہوئے میں نے بڑی شوخی سے ابا جی کو بتایا کہ فورتھ ایئر کی ایک باجی تھیں، انھوں نے سِپاس کو سَپاس پڑھا تو میں نے ان سے کہا کہ یہ لفظ غلط پڑھا آپ نے، میں میری بات صحیح ثابت ہوگئی کیونکہ میں نے انھیں سِپاس شرطِ ادب والا شعر سنا دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہمیشہ کی طرح ابا جی مجھے شاباش دیں گے لیکن انھوں نے سامنے رکھی کتاب بند کر کے اس میں کاغذ کا تراشہ رکھا، قلم بند کر کے جیب سے لگایا اور پھر بہت آرام سے پوچھا، ''لیکن آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کو اس طرح سے ٹوکنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ کی استاد وہاں بیٹھی تھیں، وہ کہہ دیتیں؟''

میں ذرا حیران ہوئی۔ پھر میں نے کہا، ''لیکن وہ ہم سب ایک دوسرے کی بات کر رہے تھے کہ کس نے کیسا پڑھا۔''

''یہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھے یہ بتائیں کہ محفل میں اس کو ٹوک کر اور پھر شعر پڑھ کر اپنی بات کو صحیح منوا کر اور ثابت کر کے کہ آپ کو صحیح لفظ آتا تھا، آپ کو حاصل کیا ہوا سوائے اس کے کہ وہ بھری بزم میں شرمندہ ہوئی کہ وہ سالِ چہارم کی طالبہ ہیں اور ان کو فرسٹ ایئر کی ایک بچی نے اس طرح سے ہرا دیا؟''

ظاہر ہے میری بولتی بند ہوگئی۔ پھر ابا جی نے کہا، ''دیکھو بیٹا، ہمیشہ یاد رکھنا کہ اپنی بحث اور گفتگو میں جیتنے سے بہتر ہے آپ کسی انسان کا دل جیتیں۔ سرِ بزم کسی کو ایسے براہِ راست ٹوکنا

انتہائی بدتہذیبی، بداخلاقی ہوتی ہے اور خود پسندی کی علامت ہے۔''

وہ دن شاید ایک بالواسطہ تربیت کا دن تھا۔ اب دانۂ اسپند کی اچھل کود کا رویہ ختم کرنے کا وقت تھا۔

جہلم کالج نے ہمیشہ مجھے یہ اعزاز دیا کہ جب کبھی بین الکلیاتی پروگرام ہوتے تو میرا نام سب سے پہلے لکھا جاتا۔ جب بی اے میں پہنچی اور میرے امتحانات کے وقت لاہور کالج برائے خواتین سے دعوت نامہ آیا تو امی جان نے صاف انکار کر دیا کہ یہ نہیں جائے گی کیونکہ یہ اگر چلی گئی تو پڑھے گی کس وقت۔ ویسے بھی اتنی آوارہ گرد کہ شہر شہر مارے مارے پھرنے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں۔ میں نے کالج جا کر بتا دیا کہ ہماری اماں نے کرفیو نافذ کر دیا ہے۔

ابا جی کو وہاں سے پرنسپل کا فون آیا اور انھوں نے کہا کہ دیکھیے یہ تیسرا سال ہے مسلسل ٹرافی لیتے ہوئے، لہٰذا اس بچی کو جانا پڑے گا۔ اور ابا جی نے بڑے آرام سے اجازت دے دی۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے۔ ہماری بھابی عشرت مرزا جو کالج میں کیمسٹری کی استاد تھیں، ان سے کہا گیا کہ اپنی نند صاحبہ کو رات کو ہی کالج پہنچا دیجیے تاکہ وہ اپنی تیاری مکمل کر لیں۔ امی جی سے جھڑکیاں کھاتے اور بھابی سے شاباش لیتے ہم لوگ رات کو کالج کے ہوسٹل پہنچے۔ چار دن کے کامیاب معرکے کے بعد گھر آ کر میں نے مرزوں کی عزت بچانے کے لیے صرف پڑھائی پر توجہ دی۔

جہلم سے ملحق چھوٹے سے قصبے سرائے عالمگیر سے ایک عام سے سکول سے پڑھی ہوئی مس مرزا نے جب دوبارہ پوزیشن حاصل کی اور ایف اے کے بعد ایک مرتبہ پھر سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے تو پھر پورا شہر چونکا۔ ابا جی نے چاچا جان کو انگلینڈ فون کیا تو فرطِ مسرت سے ان کی آواز کھنک رہی تھی۔ ان دنوں فون بے حد مہنگا ہوتا تھا اور باقاعدہ کال بک کروا کر فون کیا جاتا تھا۔ ابا جی نے چاچا جان کا حال احوال بھی نہ پوچھا اور ان کو میرے نمبر بتانے لگے۔

ملٹری کالج جہلم والوں کی بیٹیوں نے گھر جا کر بتایا کہ ایف اے میں ٹاپ تو سرائے عالمگیر کی ایک لڑکی نے کیا ہے۔ اکثر لوگ ملٹری کالج کو جہلم شہر کے ساتھ ملاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملٹری کالج نہر کے اور دریا کے درمیان سرائے عالمگیر میں واقع ہے اور تایا جان کے دواخانے سے چند قدم کے فاصلے پر۔ اب تو سرائے عالمگیر کے باسیوں کی تفتیش بھی شروع ہو گئی۔ ملٹری کالج کے ایک پروفیسر مشتاق، اخبار تھامے تایا جان کے پاس آئے اور بولے، ''مرزا صاحب سرائے

عالمگیر کی ایک بچی نے ایف اے میں ٹاپ کیا ہے اور انگریزی میں کانونٹ سے پڑھی بچیوں سے زیادہ نمبر لیے ہیں۔ میری بیٹی نے بتایا ہے کہ وہ مباحثے اور مشاعرے بھی پڑھتی ہے؟''

تایا جان نے کہا کہ آپ بالکل صحیح جگہ پر پہنچے ہیں۔ وہ میری ہی بھتیجی ہے۔ شام کو گھر آئے تو بڑے فخر سے کہنے لگے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ بڑے شہر اور بڑے ادارے، بڑے کالج اور بڑی یونیورسٹیاں آپ کو کامیاب کراتی ہیں لیکن بڑا ادارہ نہیں بلکہ بڑا ارادہ آپ کو کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے اور بڑا ذہن اپنے آپ کو منواتا ہے۔ پھر انھوں نے تمام جرنیلوں، کرنیلوں، مصنفین اور ان شعرا کے نام گنوائے جو مفلسی اور غربت کی آغوش سے نکلے اور صدارتوں اور وزارتوں تک جا پہنچے۔

ایف اے کے بعد ہی میری وابستگی انگریزی کی استاد محترمہ عابدہ نسرین سے بڑھی۔ انھوں نے مجھے پڑھنے کے لیے مزید کتب دینا شروع کیں۔ پھر ان ہی کی ترغیب پر میں نے انگریزی مباحثے میں بھی شرکت کی جس کا عنوان Tolerance Encourages Evil تھا۔

میں نے سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس امتحان میں قدم تو رکھ دیا لیکن اب مصیبت یہ آن پڑی کہ تقریر کیسے لکھی جائے اور تلفظ کیسے سیکھا جائے۔ موضوع کی موافقت میں نکات لکھے گئے۔ ابا جی کو رہ رہ کر اپنے عزیز ترین بھائی کی یاد آتی رہی۔ آپ کے چچا یہاں ہوتے تو آپ کے لیے کوئی بات بھی مسئلہ نہ ہوتی۔

ابا جی کی عادت تھی کہ وہ زیادہ دیر کسی مسئلے کو اپنے اوپر طاری نہ کرتے بلکہ فوراً اس کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کرتے۔ اگلے دن مغرب کی نماز کے بعد وہ گھر آئے۔

''آج میں کوٹیاں گیا تھا''، انھوں نے ساتھ کے چھوٹے سے گاؤں کا نام لیا، ''مجھے یاد آ گیا کہ شاہ جی پاکستان سیٹ ہونے کے لیے آئے ہیں۔ ان کی دو بیٹیاں بھی ساتھ ہی آئی ہیں۔ کل سے آپ ان کے پاس شام کو تقریر کی تیاری کرنے جائیں گی۔''

''چلو جی''، ابا جی میرے لیے ولایت پلٹ اساتذہ ڈھونڈ لائے تھے۔ پھر ہر شام میری کلاس لگنا شروع ہوئی۔ میں اکثر خود کو کوستی۔ امی جی کی بات یاد آتی، اک ناں تے سو سکھ۔ تقریر کو زبانی رٹا گھوٹا لگاتے، ہاتھ ہلاتے، منہ ٹیڑھا کر کر کے مطلوبہ صوتی نتائج برآمد کرنے میں میرے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ لیکن جب مہینے بعد مس عابدہ نسرین کا خوشی سے دمکتا چہرہ اور کومل آواز نے سراہا، ''ارے لڑکی تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ ویل ڈن۔ بس اب رکنا نہیں۔'' وہ دن انگریزی ادب کے ساتھ میرے عشق کا پہلا تعارف تھا۔

••

جب جہلم کالج میں پورا پاکستان مدعو ہوتا تو میں مہمان مقررین کے ساتھ ہوسٹل ہی رہتی۔ ان دنوں ہوسٹل میں کسی گاؤں سے آئے ایک بزرگ ملازم ہوا کرتے تھے جو پوٹھوہاری بولی بولتے۔ میس کی ہیڈ گرل نے انھیں شاید سودے کی فہرست دی، وہ انڈے لانا بھول گئے۔ ہیڈ گرل نے کہا، ''بابا جی انڈے کتھے نیں؟ انڈے دئیو''، بابا جی تو بگڑ گئے اور بے تکلف پوٹھوہاری لہجے میں اسے بے نقط سنائی جس کا مشتعل اختتامی جملہ تھا، ''ایہیہ کیہہ بانڑی ایں، بابا کتھوں انڈے دیوے؟ اینج بھایا کرو، بابا جی، انڈے آ آ آنڑ دئیو۔'' (یہ کیسے بات کرتی ہو؟ بابا کہاں سے انڈے دے؟ کہا کرو بابا جی انڈے لا دیں)۔اس کے بعد تو ''انڈے آ آ آنڑ دئیو'' کی نقل اتارنا ہمارا مشغلہ ٹھہرا، ''ارے جہلم میں تو انڈے آ آ آنڑ دئیو' کے حکم پر انڈے آتے ہیں۔

ایک اور خوبصورت کردار کالج کی کینٹین میں نان کباب لگانے والے بزرگ بھائی جی، کا تھا۔ اینٹوں کے چولھے پر بڑا سا گول توا رکھے بھائی جی سارا دن گرما گرم کباب بناتے۔ منگل اور بدھ کو آلو کی ٹکیاں بنائی جاتیں۔ وہ انڈیا کے کسی علاقے سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ ان کا بیٹا شہید ہوگیا تھا اور وہ اپنی پوتیوں کے کفیل تھے۔ کمزور سے، گہرے سانولے اور ماتھے پر شکنوں والے بھائی جی، مدھم سے لہجے میں لڑکیوں سے کہتے رہتے، ''ارے نان کی ٹوکری کھراب نہ کرو، اوپر سے نان اٹھاؤ، ساہی (شاہی) نان ہیں۔''

کینٹین کی صفائی پر ایک ماں جی مقرر تھیں۔ ایک مرتبہ وہ کسی وجہ سے دواخانے آئیں تو گھر امی جی کو ملنے بھی آ گئیں۔ خدا جانے ان کی کیا گفت وشنید ہوئی کہ امی جی نے ان کے لیے اور بھائی جی کے لیے خوب گٹھڑی بنا کر دی۔ پھر بھائی کو حکم ہوا کہ ان کو کالج چھوڑ کر آؤ۔ اس کے بعد وہ مہینے میں ایک آدھ بار ضرور آتیں۔ امی جی ''بھس کے بھاؤ'' خریدے دودھ سے ان کے لیے کچھ نہ کچھ بنا کر رکھتیں اور بے حد راز داری سے خدا جانے کیا کیا سمگل کرتیں۔ ہمارے تایا زاد بھائی، ڈاکٹر احتشام کی بیگم باجی عشرت، جو جہلم کالج ہی میں کیمسٹری کی استاد تھیں، اکثر امی جی سے مذاق کیا کرتیں، ''چچی جی کا بس چلے تو فوڈ انسپکٹر بن جائیں۔''

••

کالج کے زمانے میں ہی ہماری ایک استاد محترمہ تنویر معصوم نے کہا کہ آپ کو باقاعدہ سُر سیکھنا چاہیے۔ آپ کی آواز میں بہت پوٹینشیل ہے۔ میں نے خوشی خوشی گھر آ کر ذکر کیا۔ ابا جی کھانا

کھا رہے تھے۔ ذرا سی دیر کو ان کا ہاتھ رک گیا لیکن وہ خاموش رہے۔ امی جی فوراً بولیں، ”بس ایہہ مراثناں آلا کم رہ گیا، باقی سارے کرتوت تے ہین ای مراثیاں آلے“ (بس یہ میراثیوں والا کام رہ گیا تھا، باقی تمام کرتوت تمھارے ہیں ہی میراثنوں والے) رات کو ہم پڑھنے بیٹھے تو انھوں نے بالکل عام لہجے میں کہا۔ ”بیٹا میرا خیال نہیں کہ آپ کو گانے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ صرف قلم اٹھانا اور سٹیج کی حکمرانی کرنا ایک بہت بڑا مقابلہ ہے۔“

میرا خیال تھا کہ ابا جی فوراً آیات نکال کر اور غیر اسلامی قرار دے کر اپنا ردِ عمل ظاہر کریں گے۔ لیکن ان کا آرام سے اتنا کہہ دینا ہی میرے لیے بہت تھا۔ بعد میں مجھے زندگی میں بہت دفعہ یہ مواقع ملے کہ میں باقاعدہ گائیکی سیکھوں لیکن پتہ نہیں کیا چیز مجھے روکتی رہی، حالانکہ گانا اور میں دو لازم و ملزوم چیز رہے۔ ہمیشہ بچوں کی لوری سے لے کر باورچی خانے اور غسل خانے تک میرا فن اپنے عروج پر رہا۔ اب میں اپنی ننھی بھتیجی ماہ نور اور مہر کو اسی ذوق شوق سے گاتے سنتی ہوں تو امی کی یاد آتی ہے۔ میں نے کہا، ”ماہ نور، چلو ہم دونوں مل کر موسیقی کا گروپ بنائیں۔“

اس کی اماں فوراً بولی، ”مرزا میراثی گروپ۔“

میں نے ہارتہ مانتے ہوئے ان کے تھانیدار ابا سے کہا کہ مجھے بہت شوق ہے کہ بچیاں ضرور باقاعدہ سر سنگیت سیکھیں۔

”اچھا، اچھا“، پہلے تو انھوں نے اپنا خالص ”پلسیانہ“ جواب دیا۔ جب میں نے اصرار جاری رکھا اور بہناپا دکھا کر رعب ڈالنے کی کوشش بھی کی تو انھیں یاد آیا کہ ان کا کوئی کولیگ باجہ لے کر بیٹھتا ہے اور اکثر کسی استاد کو بھی بلاتا ہے۔ میں نے کہا، پلیز ذرا اس استاد کو ہی بلا دیں۔ ایک آدھ دن ٹال مٹول میں گزر گیا۔ پھر بولے، ”مجھے نہیں علم وہ استاد کہاں گیا ہے، اب نہیں آتا وہ دفتر۔“

”لو جی“، میں نے ان کی بیگم سے کہا، ”پولیس مقابلے میں چک دیا فنکار کو، ظلم ہے۔ فن ضائع ہوگیا مرزا فیملی کا۔“ لیکن مجھے علم ہے کہ کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔

میری ایک بے حد شریر بھتیجی ڈاکٹر عاصمہ رضوان ایک دن مایوس ہوکر بولی، ”پھپھو، مولاناؤں اور علاماؤں کے علاوہ ہمارے خاندان میں کوئی معتبر ہی نہیں۔ بس ان کو ہی پڑھتے رہو۔ ہمارے خاندان میں شادی اور ماتم کا فرق صرف کپڑوں سے چل سکتا ہے، باقی سادگی اور خموشی بس ایک سی ہے۔“

••

''میرا جی چاہتا ہے کہ ان بادلوں سے اپنے لیے سفید کپڑے بناؤں''، میں نے اجلے اجلے چمکیلے بادلوں کو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دیکھا تو دل میں خیال آیا۔ ''ایسا سفید رنگ ہمارے کپڑوں میں کیوں نہیں ہوتا جس میں سے روشنی بھی جھانکتی ہو؟ یہ آسمان رات کو کالا اور چاندی رنگ کے ستاروں سے نہ دمکتا بلکہ دن کو نیلے رنگ پر تیز سیمابی تارے دمکتے۔ چاند کی چاندنی کے رنگ کے کپڑے کیوں نہیں بنائے جاسکتے؟ آسمان کو کالا اور سفید نہیں ہونا چاہیے تھا بلکہ شفاف نیلے آسمان پر روپہلے ستارے چمکنا چاہییں تھے۔''

میری الجھی باتیں سن کر امی جی کو غصہ آتا، ''اس لڑکی کا دماغ یقیناً خراب ہے، کیسی عجیب وغریب، اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہے؟''

شاید بچپن کی یہی الجھی سلجھی سوچیں ایک عمر سے نیلے اور سلور کپڑوں کی صورت میں میرے ساتھ ہیں۔ میرے لاشعور میں نیلا رنگ ایک بنیادی رنگ بن کر ثبت ہوگیا۔ قوسِ قزح دیکھنے کا جنون اور بابا جان کا سمجھانا کہ قوسِ قزح بنتی کیسے ہے، یہ بھی انہی دنوں کی یادگار ہے۔ شفق کی سرخی اور دریا کے کنارے شام کو پھیلی گہری اداسی، پیڑوں کے مغموم سائے اور لہروں کی عجب آبدیدہ سست روی ہمیشہ میرے ہمراہ رہی۔ صاف نیلے آسمان پر اڑتے سفید جھاگ سے بادل مجھ پر عجیب ازخود رفتگی کی کیفیت طاری کر دیتے اور موسمِ سرما کی آہستگی سے رخصت ہوتی اداس شام، جھاگ جیسے بادل اور شام کی زرد الوداعی کرنیں دل کو کسی اور ہی دنیا میں لے جاتیں۔ ایک دن شام کو ڈوبتا سورج اور چڑیوں کی مسلسل چہکار سنتے ہوئے میں شاید بآوازِ بلند سوچ بیٹھی، ''دل چاہتا ہے سورج تک چلی جاؤں یا آسمان، یا پھر پاگل ہو جاؤں۔'' جواب میں مجھے وہ کچھ سننے کو ملا کہ میں نے خاموشی سے صرف رنگ برنگی نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔

پھر جب ملک چھوڑا تو سمندر کا ساتھ ہوگیا۔ پانیوں اور چاند ستاروں کے ساتھ میری پرانی شناسائی رہی ہے۔

••

''ابا جی۔۔ای۔ای۔ای ای'' میں نے ضرورت سے زیادہ مٹھاس بھرے لہجے میں جی ای ای کو طول دیا۔

''اصل بات بتاؤ'' انھوں نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

کیا مصیبت ہے، میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ کوئی خاص شنوائی

نہیں ہوگی لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔ امی کے آنے سے پہلے پہلے اپنی بات منوانا ضروری تھی۔
''ابا جی۔۔ ای ای ای، میرے پیارے ابا جی۔''
''جی!'' انھوں نے بالآخر کتاب تکیے پر رکھ دی اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر استفہامیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔
''ابا جی۔۔۔ لاہور کالج میں سہ روزہ پروگرام ہیں، جانا ہے۔''
''اچھی بات، ضرور جاؤ، کس نے روکا ہے آپ کو؟ مسئلہ کیا ہے؟''
میں کرسی سے اٹھ کر ان کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ''مجھے مشاعرے کے لیے نئے کپڑے چاہییں۔''
''تو امی سے کہو''، انھوں نے معمول کے انداز میں بات ختم کی۔
''وہ نہیں بنا کر دیتیں''، میں نے دل گداز انداز میں فریاد کی، ''کہتی ہیں پہلے والے پہنو جو صرف ایک مرتبہ پہنے ہیں۔''
ابھی امی سے میں دوبئی والا جوڑا بٹورنے کی کوشش کر چکی تھی جو ماموں جان دے کر گئے تھے مگر انھوں نے صاف جواب دیا کہ بھاگ جاؤ، تمھارے تو روز ہی کوئی نہ کوئی ٹنٹا چل رہا ہوتا ہے۔
''اچھا''، وہ اٹھ کر بیٹھ گئے، جیب میں ہاتھ ڈالا اور جتنے پیسے تھے میری ہتھیلی پر رکھ دیے۔ میں نے جلدی سے مٹھی بند کر لی۔ شام کو محلے کی جو بچی انگریزی پڑھنے آتی تھی اس کی والدہ کپڑے بھی سیتی تھیں۔ خیال تھا کہ ان سے جلدی سے سوٹ سلوا لیا جائے گا ورنہ ٹیلر کا پھیرا ڈالنا پڑے گا۔ اچانک پیسے گننے کا خیال آیا اور مٹھی کھولی۔ میں نے پیسے گنے، ''ابا جی! یہ تو کم ہیں۔ اس میں میچنگ جوتا تو آئے گا ہی نہیں؟'' میں نے نیا مسئلہ پیش کیا۔
''بات سنو، چپ کر کے لے لو۔ ابھی تمھاری امی آ گئیں تو یہ بھی ضبط ہو جائیں گے۔''
اتنے میں امی شام کی چائے لے کر آ گئیں۔ ان کی ہمیشہ سے عادت تھی کہ ابا جی کے سارے کام خود کرتیں۔ میں نے بعد میں جب دنیا کو اور رنگ میں دیکھا تو مجھے حیرت ہوتی تھی کہ امی جی اتنی مستعد، اتنی چاق و چوبند اور فعال تھیں کہ کسی سے اپنا کام کروانا یا بلاوجہ کی خدمت کروانا انھیں پسند ہی نہ تھا۔ اپنے ہاتھوں سے نفاست اور سلیقے سے سارے کام کرتیں۔ انھوں نے آتے ہی بھانپ لیا کہ میں نے اپنی بات منوالی ہے۔
''پروگرام کے لیے نیا جوڑا ضروری ہے؟'' امی جی نے ابا جی کے سامنے دوبارہ پوچھا

تاکہ مجھے اچھی طرح ڈانٹ پڑ سکے۔

''باقی میں نے پہلے بھی پہن رکھے ہیں۔سب نے دیکھے ہوئے ہیں۔'' میں نے مسکین شکل بنا کر مجبوری بیان کی۔

''اچھا؟ تو تمھیں نہیں پہلے سے دیکھا ہوا دنیا نے؟'' انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا، ''یہی فٹے منہ لے کر جاتی ہو پورے پاکستان میں۔''

اب مجھے زیادہ پروا نہیں رہی تھی کیونکہ امی جی کی جھاڑ جھپاڑ معمول کی بات تھی۔انھیں اندیشہ ہائے دور و دراز ستاتے اور مجھے آرائشِ گیسو اور پیرہن کی فکر رہتی۔ یہ الگ بات کہ جب میں جانے لگتی تو کپڑوں سے میچ کر کے گرم شالیں نکال دیتیں جو انھوں نے نجانے کہاں کہاں سے جمع کر کے رکھی ہوتیں۔فکر تب ہوتی جب امی جی کچھ نہ بولتیں۔ پھر میں ان کے آگے پیچھے پھرتی رہتی اور جب معمول کے مطابق ڈانٹ ڈپٹ ہو جاتی تو راوی چین لکھنے لگتا۔

••

میرے امتحانات کے دوران ابا جی کو بہت فکر ہوتی کہ فلاں کتاب پڑھی ہے؟ فلاں کتاب بھی احتیاطاً دیکھ لینا، وغیرہ وغیرہ۔ وہ رات کو دیر تک جاگنے کے سخت خلاف تھے۔کہا کرتے کہ بیٹا رات کو جلدی سویا کرو اور صبح جلدی اٹھ کر مطالعہ کیا کرو۔ رات بارہ بجے سے پہلے کی نیند نصف رات بعد کی نیند سے بہتر ہوتی ہے۔ میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرتی اور کہتی کہ جی اچھا، لیکن مطالعے کا مزہ آتا ہے جب باقی دنیا کے ہنگامے خوابیدہ ہوں۔ ''سورج جاگنے سے پہلے بھی سب ہنگامے خفتہ ہوتے ہیں۔ اللہ نے رات کو آرام اور دن کو معاش کے لیے بنایا ہے۔''

''جی اچھا'' کہہ کر میں مزید دلائل سے بچنے کی کوشش کرتی لیکن ان کے دن رات کا تصور میری زندگی میں شامل نہ ہو سکا۔علی الصبح ناشتہ کرنے پر پھر تکرار، ''خالی پیٹ چائے پینے کی کیا تک ہے؟ دیر سے ناشتہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟ گھر کی صحنک میں جمایا گیا دہی، اس میں آدھا گلاس دودھ، یہ گلاس پی لو پھر کالج جانا۔''

''ابا جی، باہر کالج وین آ گئی ہے'' میں بھاگتی دوڑتی بیگ کتابیں اکٹھی کرتی جس سے انھیں بہت چڑ تھی، ''رات کو ہر چیز تیار کر کے سویا کرو۔''

''یک لقمۂ صبحگاہی بہ از مرغ و ماہی'' صبح کھایا گیا ایک لقمہ مرغ اور مچھلی سے بہتر ہے۔

تایا جان اپنے بھائی کی تائید کو موجود تھے، ''بیٹا صبح کبھی خالی پیٹ نہیں رہنا چاہیے۔''

میں ہمیشہ نالاں رہتی، ''اللہ کسی کو ڈاکٹروں حکیموں کے گھر پیدا نہ کرے۔ دن کا آغاز نسخوں مربوں سے ہوتا ہے۔''

''لوگوں کو باشعور کرنا ضروری ہے۔'' تایا جان نے اندازہ لگا لیا کہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔

''جی تایا جی''، میں سعادت مندی سے کہتی کہ بات کو وہیں روکنے کا یہ تیر بہدف نسخہ تھا۔

''غذا اور پرہیز ایسی چیز ہے جس کے لیے بہت سا پیسہ اور بے شمار وسائل ضروری نہیں ہوتے۔''

''جی بالکل۔''

''صبح کوئی نہ کوئی پھل ہی کھا لینا چاہیے اگر اور کسی چیز کو دل نہ چاہے، یا دہی کھا لینا چاہیے۔'' پھر دہی کے فضائل شروع ہو جاتے۔ دہی نہ صرف داخلی طور پر جسم اور ہڈیوں کے لیے مفید بتایا جاتا بلکہ اس میں پیرانہ سالی کا مقابلہ کرنے کے خواص کا تذکرہ بھی ہوتا۔ جلد کے امراض کا علاج، قدرتی طور پر کھیتوں میں کام کرنے والوں کے بالوں اور جلد کا دفاع کرنے والا، وغیرہ وغیرہ۔ بچپن سے ان ہی خطبات کا اثر تھا کہ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے کے مصداق مجھ میں حکیمانہ جراثیم سرایت کر چکے تھے۔ بازاری کریموں، لوشن اور رنگ برنگے شیمپوز کے بجائے ہمیشہ دیسی نسخہ جات استعمال کیے۔

حیرت کی بات یہ ہوئی کہ وہی ساری باتیں میں اپنے بچوں سے کرتی رہی۔ انھیں ناشتے کی عادت، دودھ اور دہی استعمال کرنے کی عادت اپنانے میں وہی سارے دلائل دیتی جو مجھے دیے جاتے تھے، ''بیٹا دودھ پیا کرو''، ہم نے اپنے بیٹے سے کہا، ''بڑے ہو جائیں گے جلدی سے، قد لمبا ہوتا ہے۔''

''اچھا؟، اس نے دودھ کا گلاس پیچھے سرکایا۔ ''لوئی تو سکول لنچ میں بھی دودھ پیتا ہے''، اس نے ایک چینی ہم جماعت کا نام لیا، ''وہ کیوں بڑا نہیں ہوتا؟''

••

ابا جی میرے قلم میں خود روشنائی بھرا کرتے بلکہ دو فالتو قلم بھی ساتھ رکھ دیا کرتے تھے۔ مجھے رنگ برنگی روشنائی سے لکھنا بہت پسند تھا۔ شاید اسی لیے مجھے ہمیشہ رنگ برنگی پنسلوں کے تحائف ملا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہمارے سب سے چھوٹے چاچا جان نے سعودی عرب سے ایک پنسل بھیجی جس میں بیک وقت کئی رنگ استعمال کیے جا سکتے تھے، گولائی میں سرخ سبز کالا نیلا رنگ دکھائی دیتا۔ جو رنگ استعمال کرنے کو جی چاہتا اسے نیچے کو دبا دینے سے قلم اسی رنگ سے لکھنے لگتا۔ میری رنگ برنگی

یادوں میں چاندی رنگ کے اس قلم کی یاد بہت واضح ہے۔ میں نے اسے چند دنوں میں اس قدر استعمال کیا کہ اس کی دھنک رنگ سیاہی بے رنگ ہوگئی۔ مجھے کتنا عرصہ اس قلم کے خاموش ہونے کا صدمہ رہا اور زندگی پھر رنگ برنگی روشنائیوں کے استعمال پر آرکی۔

ایک دفعہ میں نے قلم میں سرخ روشنائی بھری تو کچھ روشنائی انگلیوں پر لگ گئی۔ ابا جی کہنے لگے یہ کیا گند مچایا ہوا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ابا جی میں قلم میں خونِ جگر بھر رہی ہوں۔ انھیں بہت ہنسی آئی، کہنے لگے کہ قلم میں خونِ جگر جب تک اندر سے شامل نہ ہو وہ نہ تو قلمکار کو فائدہ دیتا ہے نہ پڑھنے والے فیض یاب ہوسکتے ہیں۔ ہماری قوم کا مسئلہ ہی یہ ہے کہ وہ سیاہی کی دوات سے خونِ جگر تلاشتی ہے۔ کئی روز تک سب گھر والوں نے سرخ سیاہی کی دوات سے خونِ جگر کی کشید کرنا میری چڑ بنائے رکھی۔ لیکن ابا جی نے مجھے اقبالؒ کی نظم ''شاعر'' پڑھائی:

شاعرِ دل نواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اُس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری
شانِ خلیل ہوتی ہے اُس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اُس کی قوم جب اپنا شِعار آزری
اہلِ زمیں کو نُسخۂ زندگیِ دوام ہے
خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری
گُلشنِ دہر میں اگر جُوئے مئے سخن نہ ہو
پُھول نہ ہو، کَلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

••

''اسے کھانا ادھر میرے ہی کمرے میں دے دیں۔'' ابا جی امی کو آواز لگاتے۔

امی کو خدا جانے اتنے محاورے کہاں سے آتے تھے۔ فوراً بولتیں، ''یہ گاؤ ماتا کی طرح جو مرضی کرے، اسے کوئی ہنر آئے یا نہ آئے، بس بیٹھی ٹرٹر کرتی رہے۔''

لیکن کھانا وہیں آجاتا اور میں ابا جی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتی اور پھر فوراً ہی اس سے اگلا سبق شروع ہوجاتا۔

''ابا جی''، میں آہستہ سے پوچھتی، ''امی جی نے ہندی اساطیر کہاں سے پڑھ رکھی ہیں۔''

''ابھی بتاتی ہیں تمھیں آکر، فکر نہ کرو'' ابا جی ہنستے۔ ہمارے نانا جان کے کچھ شاگرد سردار

تھے۔ امی بہت چھوٹی تھیں تو فرمائش کرتیں کہ میاں جی میں نے ان کے بال دیکھنے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ خاندان وہاں سے ہجرت کر گئے لیکن نانا جان کی وفات پر سکھ جنرل تعزیت کے لیے آیا۔ فیسبک پر ملٹری کالج جہلم کے کتنے لوگ رابطہ کرتے ہیں۔ یہ ایک الگ داستان ہے۔

••

ابا جی نے بابا جان کی رحلت کے بعد مجھے خود فارسی شاعری پڑھانا شروع کی۔ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نظم انھوں نے نجانے کتنی مرتبہ میرے ساتھ بلند آواز میں پڑھی۔ ابا جی کی محبوب غزل اقبال کی فارسی غزل تھی:

صورت نہ پرستم من بت خانہ شکستم من
آن سیلِ سبک سیرم ہر بند گسستم من
در بود و بنود من اندیشہ گمانہا داشت
از عشق ہویدا شد این نکتہ کہ ہستم من

ابا جی نجانے کس کیفیت میں یہ اشعار پڑھتے اور بابا جان کی طرح گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتے۔ ان سے سن سن کر ایک شعر مجھے بھی محبوب ہو گیا۔ ابا جی کہتے، ذرا اس شعر کی اصل روح کو سمجھو، یہ قوم اقبال کے قوالوں کے دامن میں ڈال کر بھول گئی۔

در دَیر نیازِ من، در کعبہ نمازِ من
زنار بدوشم من، تسبیح بدستم من

ابا جی کی خواہش پر میں نے اس کا فوری ترجمہ کیا جو انھیں بہت پسند آیا۔ بولے کہ ترجمہ اصل سے قریب ہونا چاہیے۔

مندر سے نیاز میرا، کعبے میں نماز مری
زنار ہے کاندھے پر، مرے ہاتھ میں تسبیح ہے

ابا جی نے کہا کہ بدوشم من کا مطلب اختصاص کے ساتھ میرے کاندھے پر، ہے۔ اسے دوبارہ لکھو، بدوشم، اور بدستم ہی میں اس کا حسن پنہاں ہے۔ اور مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کس وقت یہ غزل میری بھی محبوب ہو گئی۔ اس کے علاوہ میری دوسری پسندیدہ نظم اقبال کی ''از خوابِ گراں خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز''، تھی جو ابا جان نے بہت شروع میں مجھے یاد کروائی تھی۔

تایا جان جب شام کو آتے تو باقاعدہ ہوم ورک کی طرح ہمارا کام ہوتا کہ ان نظموں کو

پڑھیں۔ میں بیٹھی از خواب گراں خیز پڑھ رہی تو تایا جان نے اضافہ کیا، ''مفعول مفاعل فعولن۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ یہ کیا جناتی قسم کی زبان اور الفاظ ہمارے گھر میں بولے جاتے ہیں۔

تایا جان کو چونکہ عربی پر عبور تھا اور عربی زبان کے افعال بچپن سے سیکھے تھے، وہ ان الفاظ کو نشان زد کرتے، کہ اس کی آواز چھوٹی ہے، اسے ایک الف کے برابر پڑھا جائے گا اور مد دو الف کے برابر۔ جب تک یہ اعراب اور صوتیات کا علم نہیں ہوگا، مکتوبی حالت سے تلفظ درست نہیں آئے گا۔

میں نے کتاب بند کر دی۔ اب کوئی بتائے مجھے کیا فائدہ ان افعال اور اصوات کا۔ لیکن اس علامت کی سمجھ مجھے تب آئی جب میرے نئے نئے جوان ہوتے بیٹے نے شرارتیں شروع کیں۔ میں اس سے خفا ہو کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور اب اسے مصیبت آن پڑی کہ ماں کسی طرح بات کرے لیکن میں نے بھی خاموشی اختیار کیے رکھی۔ رات کو سونے سے قبل اس نے میرے کمرے میں جھانکا۔ کمرہ چاندنی سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے اسے گھور کر دیکھا تو باچھیں پھیلانے لگا...

''میری شاعرہ اماں چاندنی میں بیٹھی ہے۔'' پھر کمرے میں آ کر اس نے کھڑکی سے پردہ سرکایا۔ چاند کی طرف دیکھا اور اداکاری کرتے ہوئے شعر کے انداز میں پڑھنے لگا، ''میں اندر آیا''۔۔ عرض کیا ہے، ''میں اندر آیا، میں نے پردہ ہٹایا، باہر چاند چمکایا، بڑا مزہ آیا، فاعلاتن فاعلات۔ آداب، آداب۔'' اس نے مسخروں کی طرح جھک کر آداب کہا۔

''یہ چاند چمکانا کیا ہوتا ہے؟'' بے اختیار میری ہنسی چھوٹ گئی۔

اس نے موقع غنیمت جانا اور ایک ہی جست میں آ کر میرے پاس لیٹ گیا، ''یاد ہے امی نانا ابو کہتے تھے فاعلات فاعلات؟''

••

مجھے ہے حکمِ اذاں۔

ایک بے حد عزیز دوست نے سوال کیا، ''ایک سوال پوچھوں،۔۔۔۔ ڈرتے، ڈرتے؟''

''ضرور پوچھیے مگر یہ ڈراوے کا پھندنا لگائے بغیر۔ سوال نہ ہوں تو افہام و تفہیم اور جستجو کا سفر منزلوں کو پڑاؤ کیسے سمجھے؟''

''آپ قادیانی ہیں؟''

''نہیں۔۔۔۔''

''شیعہ ہیں؟''

''نہیں تو۔''

''وہ دراصل آپ فسادات کے دوران سب سے پہلے مذمت کی پوسٹ لگاتی اور نظم لکھتی رہی ہیں، تو میں نے سوچا شاید۔''

''خیر۔۔۔تسلی ہوگئی؟ امید ہے افاقہ ہوگا؟''

بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن کل اسلام آباد سے محتاط انداز میں پھر ایک سوال آیا، ''آپ مرزائی ہیں؟''

یا وحشت! کیوں یہ سوال پوچھا جا رہا ہے بار بار؟

بہرحال مجھے یہ تجسس ہوگیا کہ مجھ سے مسلسل کچھ لوگوں نے براہِ راست اور کچھ نے بالواسطہ یہ سوال ڈاکٹر مہدی پر میری پوسٹ کے بعد کیا ہے۔ اتفاق سے ڈاکٹر مہدی کے عزیز ہمارے ہمسائے رہے ہیں۔ اگلی شام ان کا فون آگیا۔ کہنے لگیں، ''صدف آپ کی نظم نے دل کو بہت ڈھارس دی کہ ابھی کچھ لوگ ظلم کو ظلم کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔''

پھر انھوں نے بتایا کہ وہ ہمارے عزیز ہیں۔ ویک اینڈ پر میں ان کے گھر تعزیت کے لیے گئی تھی۔ چند ماہ پہلے بھی مجھے اسی گھر پرسہ دینے جانا پڑا تھا۔ ان کے دو ماموں مسجد میں نماز کے دوران وحشیانہ حملے کا شکار ہوگئے تھے۔''

اور مجھے اپنا ڈینش ہمسایہ یاد آگیا۔ جن دنوں خاکوں کے فسادات بھڑکے تھے اور مظاہرے کیے جا رہے تھے تو وہ پھول اور چاکلیٹ لے کر معافی مانگنے آگیا تھا۔

''میری قوم کے ایک فرد نے آپ کے دل دکھائے ہیں۔ میں خدا کو نہیں مانتا لیکن میں کسی کے اعتقادات کی تضحیک کو ظلم سمجھتا ہوں۔ مجھے بھی کبھی گنتی نہیں آئی کہ مجھے کس کس سے معافی مانگنا ہوگی۔''

بات یہ ہے کہ اگر اتفاق سے اللہ نے آپ کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے، آپ سوال اٹھا سکتے ہیں، آواز بلند کر سکتے ہیں، چند الفاظ لکھ سکتے ہیں، تو ان کو تحریر نہ کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھے اس سوال کا جواب لینے کے لیے اپنے بچپن میں جانا پڑے گا جہاں دھندلی یادوں سے ایک واضح منظر جھانکتا ہے۔ ہمارے گھر کے قریب ایک خاتون رہا کرتی تھیں جنھیں سب باجی کہتے تھے۔ وہ اکثر شام کو آجاتیں۔ امی جی سے کتاب رسالہ وغیرہ لے جاتیں۔ ابا جی کو پتہ نہیں

کس حساب سے ماموں جان بلایا کرتیں۔ انھیں ہر بندہ اپنی خواہش اور سہولت کے مطابق پکارتا تھا۔ ان کے دو بچے تھے اور نجانے وہ کس شہر سے آکر یہاں مقیم ہوئیں۔ ان کے شوہر کی ملازمت جہلم میں تھی اور کہا جاتا تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اچانک خبر آئی کہ ان کے شوہر کا دماغی توازن خراب ہوگیا ہے۔ وہ ملازمت پر نہیں جاتے۔ گھر سے نہیں نکلتے۔ وغیرہ۔ باجی امی جی کے پاس آتیں اور چپکے چپکے چادر کے پلو سے آنکھیں پونچھتی رہتیں۔ شاید ان کے شوہر اپنا مسلک چھوڑنا چاہتے تھے اور جماعت کے خوف سے ناکام ہوکر ذہنی توازن کھو بیٹھے، شاید کسی دوسری عورت کا مسئلہ تھا، شاید کسی کی بددعا تھی، جتنے منہ اتنی باتیں سننے کو آتی تھیں۔

امی جی ہر مہینے کے پہلے جمعے کو صلوٰۃِ تسبیح پڑھانے کا اہتمام کرتی تھیں۔ خواتین جمع ہوتیں، نماز پڑھتیں، گپ شپ کرتیں اور چل دیتیں۔ ایک دن چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔

آپ کے گھر یہ عورت آتی ہے۔ یہ مرزائی ہے۔

مرزائی کافر ہوتے ہیں۔ گھر میں نہ گھسنے دیا کریں۔

ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھ سکتیں، یا آپ اسے کلمہ پڑھنے پر مجبور کریں۔

میری یادوں کی کتاب کا ایک اور صفحہ الٹا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ امی جی نے ایک بڑی پلیٹ میں چاول ڈالے، اوپر ایک دوسری پلیٹ دی، دونوں کو ایک دسترخوان میں باندھا اور کہنے لگیں،

''جاؤ بھاگ کر باجی کے گھر دے آؤ، دیر نہ کرنا، میں یہیں دروازے میں کھڑی ہوں۔''

عموماً ہمیں اس طرح کے کاموں کے لیے باہر نہیں بھیجا جاتا تھا لیکن امی کے پاس جو خاتون مدد کرنے اور پڑھنے آتی تہیں وہ موجود نہیں تھیں اور امی جی کو جلدی تھی کہ کسی طرح گرم گرم کھانا باجی کے بچوں تک پہنچ جائے۔

''بھاگ کر جاؤ اور دس منٹ میں پلیٹ دے کر واپس آجانا۔''

''باجی بیمار ہے۔ شاباش۔ جانا آنا کرنا بس،'' امی جی نے دوبارہ تاکید کی۔

ہمارا گھر چونکہ بڑی اور کشادہ سڑک پر تھا جہاں سے ایک ذیلی گلی اندر کو جاتی تھی، امی جی کو ادھر بھیجنا پسند بھی نہیں تھا لیکن رہ بھی نہ سکیں۔

دو گھر چھوڑ کر تیسرا لکڑی کے دروازے والا گھر ان کا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے تھامی بڑی ٹرے نما پلیٹ نیچے رکھی اور دروازے پر دستک دی جس کا کوئی جواب نہ آیا۔ پاس کھیلتے ایک بچے نے کہا،''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ یہ لوگ کافر ہیں، اور پاگل ہیں۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔''

اتنے میں دروازہ کھلا اور باجی کا چہرہ نمودار ہوا۔ مجھے دیکھا تو پورا دروازہ کھول دیا۔ ٹرے میرے ہاتھ سے لے لی اور سر پر پیار کیا۔ بولیں کچھ نہیں۔ میں نے امی جی کے حسبِ ہدایت گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ دروازہ کھولا تو امی ادھر ہی کھڑی تھیں۔

''کیا کر رہی تھیں باجی؟'' امی جی پریشان دکھائی دیتی تھیں۔

''پتہ نہیں۔ انھوں نے سر باندھا ہوا تھا۔'' میں نے بتایا۔ پھر فوراً ہی سوال پوچھا

''امی، وہ پاگل ہیں اور کافر ہیں؟''

امی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''دو منٹ باہر گئی اور یہ کیا سیکھ کر آ گئی ہو۔''

پھر مجھے آرام سے کہنے لگیں، ''مسلمان کسی کو کافر نہیں کہتے۔ اچھی بات نہیں ہے۔ وہ خود بھی بیمار ہیں اور ان کے بچے بہت چھوٹے ہیں۔''

امی پر اعتراضات جاری رہے۔ ایک دن میں نے ان کو سخت غصے میں کہتے سنا، ''تسیں میری قبر وچ تے نہیں پینا۔ میں دے لواں گی جواب۔'' (آپ نے میری قبر میں تو نہیں لیٹنا۔ میں جواب دے لوں گی۔)

بعد کی تفصیلات یہ تھیں کہ باجی نے نرسنگ کا کورس کیا ہوا تھا۔ ابا جی کی وفات پر ملیں تو کہنے لگیں کہ ''ماموں جی نے دوائیاں بھیج دی تھیں چپکے سے، اور بہت مدد کی، خاموشی سے راشن ڈال جاتے، دوائیاں فراہم کر دیتے اور اپنی مریض عورتوں بچیوں کو رقعہ لکھ کر میرے پاس بھیج دیتے اور میں باجی سے لیڈی ڈاکٹر بن گئی۔''

دوسرا واقعہ جو مجھے روزِ روشن کی طرح یاد ہے، یہ میرے کالج کا سالِ دوم کا واقعہ ہے۔ ان دنوں کالج الیکشن ہو رہے تھے۔

مباحثوں میں شرکت اور چھوٹا موٹا لکھنے لکھانے کی وجہ سے کالج میں سب ہی جانتے تھے۔ ایک روز ابا جی نے خواہش کا اظہار کیا، ''میں چاہتا ہوں آپ انتخابات میں حصہ لیں۔''

امی نے سنا تو شور مچا دیا، ''کسے کم دا نہ چھڈ یو اس کڑی نوں (کسی کام کا نہ چھوڑیے گا اس لڑکی کو)۔'' لیکن ابا جی اور ان کے لالہ جی اور دونوں بھائیوں کے جملہ برادران ذوق شوق سے انتخابی مہم کی تیاری کرنے لگے۔ ابتدا کے ایک ہفتے تک تو کسی دوسرے امیدوار کا نام ہی نہ آیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر ابا جی کچھ بجھ سے گئے اور بولے، ''بلا مقابلہ کا کیا مزہ؟ کوئی مقابل ہو تو انتخاب کا پتہ بھی چلے۔''

اگلے ہی روز اللہ نے ان کی سن لی۔ ہماری ہم جماعت ایک طالبہ نے اپنا نام پیش کر دیا۔ بس پھر کیا تھا، تابڑ توڑ نعرے، بینر، اشعار۔ سونے پہ سہاگہ کہ ابا جی کی تحریر بے انتہا خوبصورت تھی۔ انھوں نے انتخابی مہم کو چار چاند لگا دیے۔ خود ایک بڑے بورڈ پر لکھا:

ہمارے نام سے لرزاں ہے گردشِ دوراں
ہمارا عزم جواں ہے، ہمارے ساتھ چلو

میرے پوسٹرز پر ان کی خوشخط عبارت جگمگاتی،

کلی کلی ہمیں پہچانتی ہے، جانتی ہے
نسیم بن کے رہے، ہم اگر چمن میں رہے

وہ دن ایک دلکش اور انمٹ نقش بن کر حافظے کی دیواروں پر محفوظ ہو گیا۔ انتخابات کا نتیجہ بھاری اکثریت کے ساتھ میرے حق میں رہا۔ طالبات کا شور شرابا اور ہنگامے سرد پڑے تو احباب کی فرمائش آئی کہ پارٹی ہونی چاہیے۔ سو پارٹی ہوئی، لیکن ساتھ ہی ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ پارٹی میں ذکر ہوا کہ آپ کو نہیں پتہ کہ آپ کی مخالف تو خارج از اسلام فرقہ سے تعلق رکھتی تھیں؟ ایک اور نے رائے کا اظہار کیا کہ انھیں تو کالج سے نکال دینا چاہیے۔ ابا جی کے کان تک بات پہنچی تو انھوں نے شدید ردِعمل کا اظہار کیا۔ مجھے بلا کر شدید تنبیہہ کی کہ میں ایسے کسی متعصب گروہ کی ایسی کسی سوچ کا ہرگز کوئی اثر نہ لوں۔

ابا جی بولے، ''اس نے براہِ راست آج تک آپ سے کچھ نہیں کہا بلکہ فون کر کے مبارک دی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے گھر والوں نے بھی فون پر تہنیتی کلمات کا اظہار کیا۔ ہم ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں سے رابطہ رکھ سکتے ہیں تو حقوق العباد کے حوالے سے ان لوگوں سے کیوں نہیں؟ کیا آپ زبردستی کسی کو کلمہ پڑھا سکتے ہیں؟ آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کتنی دفعہ کسی کو بزورِ شمشیر اسلام کا پیغام دیا؟ پتہ نہیں کس شریعت کے پیروکار ہیں یہ لوگ اور کس اسلام کی تعلیمات کا پرچار کر رہے ہیں؟''

تو میرے عزیز دوستو، مجھے انسانوں سے محبت سکھائی گئی ہے۔ جبلت و اکتساب کے اس کھیل میں بہت سے گھروں میں نفرت اور کدورت شیرِ مادر کے ساتھ خون میں شامل ہوتی ہے۔ اس اکتساب کا نتیجہ سڑکوں پر بہنے والا لہو، مساجد میں ہونے والے دھماکے اور دنیا میں بدنام ہونے والا دینِ اسلام ہے۔ جس حد تک میرا اختیار ہے، میں الفاظ کی فاختہ کی چونچ میں زیتون کی ڈالی دے اڑاتی رہوں گی۔ آپ ایک نہیں ہزار مرتبہ ہزار سوالات پوچھا کیجیے، اعتراض اٹھائیے، وہ آپ کا اختیار، اور نابینا اندھا دھند جبر اور زیادتی خواہ وہ کسی بھی نام پر، کسی پر بھی ہو، اس کے خلاف لکھنا میرا

فیصلہ ہے۔ ہم سب کی آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں فریقِ مقابل کی ناک شروع ہوتی ہے۔

ابا جی کے جانے کے بہت سال بعد جب یہ جھگڑے پھر پوری طاقت سے ابھرے اور شیعہ، سنی اور قادیانی قتلِ عام کا آغاز ہوا تو میں نے سوچا، بہت اچھا ہوا، ابا جی یہ سب دیکھنے سے پہلے چلے گئے۔

••

جن دنوں افغان مہاجرین کے قافلے پاکستان آ رہے تھے اور تقریباً ہر شہر ہی میں ان کے خاندان آباد ہو گئے تھے تو ابا جی کے پاس کچھ بزرگ مریض آنا شروع ہوئے۔ حسبِ عادت سب سے پہلے انھوں نے بچوں اور خواتین کی تعلیم کا سبق دینا شروع کیا۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ میری ذمہ داری لگائی گئی کہ آپ نے روزانہ شام کو ایک گھنٹہ ان بچوں کو پڑھانا ہوگا۔ میری دلچسپی کا کام تھا اس لیے میں نے اپنے ہی تدریسی اصول نکالے۔ ان کو اردو کے الفاظ اپنے پختون لب و لہجے کی وجہ سے کہنے میں دقت ہوتی اور بے حد معصومانہ دلکش اور منفرد انداز میں وہ دوچشمی 'ھ' کے الفاظ ادا کرتیں۔ ان میں سے ایک بچی کا نام مجھے آج بھی یاد ہے۔ مہر گل کی آنکھیں ایسی تھیں جیسے کسی نے زمرد کوٹ کر ان میں بھر دیا ہو اور شہابی رنگت پر اخروٹی رنگ کے بال پھیلائے جب وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر اور سر کو ہلا کر یہ الفاظ ادا کرتی تو میں بہت محظوظ ہوتی۔ میں نے اپنی ڈائری میں ان کے لیے جملے لکھ کر رکھے ہوتے تھے:

''میں چھوٹا چھوٹا پھول پھل کھاتی ہوں۔ کھانا کھا کر تھوڑا تھوڑا کھیلتی ہوں۔ کھیتوں میں کسان کھڑا تھا۔ کھیرے کھا کر کھیل کو جا۔ بھائی اور بھابی راستہ بھول گئے۔''

اس کی معصوم سبز آنکھیں مجھے حیرانی سے دیکھتیں۔۔۔ پھر بے یقینی سے الفاظ ادا کرتیں:

''مے چوتا چوتا پول پل کاتی اوں۔
کانا کا کر تورا تورا کیلتی اوں۔
کیتوں میں کسان کڑا تھا۔۔۔
کیرے کا کر کیل کو جا۔''

ایک دن میں حسبِ معمول اپنی مختصر سی جماعت کو باہر بیٹھی پڑھا رہی تھی۔ امی جی سے نہ رہا گیا۔ جھڑ کنے لگیں، ''تم سیدھی طرح ان کو بازار والا قاعدہ کتاب کیوں نہیں پڑھاتیں، خود کیوں بقراط بنتی ہو؟ بددعائیں دیں گی تمھیں۔ ثواب کے بجائے الٹا گناہ کماتی ہو۔''

مجھے اپنی امی کی تجارت اور سود و زیاں کی کبھی سمجھ نہیں آتی تھی۔ اب ہر بات میں کیا کچھ نہ کچھ کمانا ضروری ہے؟

ابا جی فوراً بولے، ''اس کو اپنا کام کرنے دیں۔ میری بیٹی زبان 'ایجاد' کر رہی ہے۔''

امی جی بہت ناراض ہوئیں، کہنے لگیں، ''میں ان معصوموں کو پڑھا دیا کروں گی۔''

یہ الگ بات تھی کہ وہ سب معصوم صاف کہنے لگیں کہ ہم تو باجی سے ہی پڑھیں گی، ''باجی بوت اچّا ہے۔ ام سے مذاق بی کرتا اے۔''

••

میں نے تعلیمی زندگی میں بھی کبھی کسی روایتی نقش کی پیروی نہیں کی۔ میٹرک کے بعد ایک مشورہ اسلامی جامعہ کے ہوسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے کا بھی دیا گیا۔ ''نہیں'' میں نے صاف انکار کر دیا کیونکہ میرا واسطہ کچھ ایسی قابلِ احترام بیبیوں سے پڑ چکا تھا جن کا تمام تر دین اور اسلام کی تبلیغ، بھری بزم میں ہنستی کھیلتی بچیوں کو دوپٹہ نہ لینے پر ٹوکنا، ہراساں کرنا، نماز کا وقت ہوتے ہی آمریت بھرے انداز میں ملامت کے آغاز سے ہوتا، جو یقیناً دین سے محبت کے جذبات پیدا نہیں کر سکا۔ میں نے اس امکان کو اپنی فطرت کے مطابق نہیں سمجھا۔ زبردستی اور بالجبر کوئی کسی کو کچھ نہیں سکھا سکتا۔ ایسے ہی لوگوں نے نہ صرف اپنی اولادوں کو ذہنی اور نفسیاتی مریض بنایا بلکہ اسلام کی تاریک اور غیر حقیقی صورت بھی پیش کی۔

کالج شروع کرنے والی طالبات کے لیے سیدھے سبھاؤ تاریخ، اسلامیات اور ایجوکیشن کے مضامین فرض کر لیے گئے تھے۔ بہت ہوا تو عربی یا فارسی رکھ لی جائے۔ میں نے یہ تمام مضامین پڑھنے سے صاف انکار کر دیا۔ مجھے نفسیات اور ادب پڑھنا تھا۔ اگر اس وقت جہلم کالج میں جرنلزم کا مضمون میسر ہوتا تو میں ضرور پڑھتی۔ رہ گئی عربی اور فارسی تو وہ بابا جان کے التفات کی بدولت مجھے اتنی آتی ہے جتنی لوگ چار سال میں سیکھتے ہیں۔

''ٹھیک ہے بھئی آپ کی مرضی جو جی چاہے پڑھو'' ابا جی نے کہا، ''کیا فائدہ وقت ضائع کرنے کا اگر دلچسپی ہی نہیں ہے۔''

••

ابتدا میں تو ابا جی مجھے تقاریر لکھ کر دیتے رہے۔ موضوع کے حق اور مخالفت میں نکات لکھے جاتے پھر ان کی ادائیگی سکھائی جاتی۔ اس کے بعد حکم ہوا خود لکھو۔ گو اس خود لکھنے کے عمل میں

پہلے پہل دشواری ہوئی تاہم بعد میں مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ خود مجھ میں کہیں چھپے بیٹھے ہوں۔ ڈراموں کے طویل ڈائیلاگ ہوں، تقریروں کے مترادفات و متضادات سے بھرپور متن ہوں یا لمبی نظمیں، سب کچھ ابا جی کی وجہ سے مجھے زبانی یاد کرنا پڑتا۔

''ارے اوپر سے دیکھ کر اور طوطے کی طرح سپاٹ چہرے سے الفاظ کی ادائیگی کیا معنی رکھتی ہے؟'' وہ ناراضگی سے کہتے۔

عام گھرانوں میں بیٹیوں کو خاموش رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ خصوصی طور پر ہنسنے اور باتیں کرنے سے احتراز کر کے سماجی مقبولیت کمانا سکھایا جاتا ہے۔ مجھے اس کے برعکس بروقت، برمحل بولنا اور خود اعتمادی اور دلائل سے بات کرنا سکھایا گیا۔ کسی شعر، کٹیلے جملے، برمحل تبصرے پر داد ملتی۔ فی البدیہہ اشعار کہنے پر دس روپے کا نوٹ ملتا۔

••

انسانی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ نیکی کر کے اس کے بدلے میں نیکی ہی کی توقع رکھتا ہے۔ لیکن بعض اوقات فطرت ہی کچھ لوگوں کے خمیر میں یہ بات ڈال دیتی ہے کہ انھیں صرف کارِ خیر انجام دینا ہیں اور بدلے میں کسی صلے کی پروا ہی نہیں کرنی۔ میں نے کالج کے زمانے میں ابا جی کے کہنے کے مطابق کسی کی مدد کی۔ اپنے تیار کردہ نوٹس دیے، مل کر پڑھائی کی اور جب بھی اسے ضرورت ہوتی وہ ہمارے گھر آجاتی۔ ایف اے پاس کرنے کے بعد صورتِ حال ایسی ہوئی کہ اس نے نہ تو میری کتابیں واپس کیں اور نہ فون پر ہی رابطہ رکھا۔ میں ابا جی کے پاس دفترِ شکایات کھولے بیٹھی تھی، ''دیکھیے ابا جی، ہم نے تم سے کیا کِیا، اور تم نے ہم سے کیا کِیا؟ اسے کم از کم میری کتابیں تو واپس کرنا چاہییں؟''

''کیا آپ نے اس سے نیکی کسی مفاد کی خاطر کی تھی؟'' ابا جی نے میری گلہ گزاری کو نظر انداز کرتے ہوئے آرام سے پوچھا۔

میں نے ایک ثانیے کے لیے سوچا، ''نہیں ابا جی۔''

''تو پھر رولا کیا ہے بیٹا؟'' وہ اپنی مخصوص بے نیازی سے بولے۔ رہی دنیا اور دنیا داری تو بس یاد رکھو، ''ادھی لعنت دنیا تائیں، ساری دنیا داراں ہُو۔''

جب انسان خیر کا کام کر کے خوش ہو اور دوسروں کو فائدہ ہو تو باطنی اطمینان اور ظاہری طور پر لوگوں کا فائدہ دونوں اس کے لیے سکون کا باعث ہوتے ہیں۔ خاندانوں اور معاشروں میں

بگاڑ پیدا ہی اس لیے ہوتا ہے کہ مثبت قدم اٹھانے والے اور دوسروں سے نیکی کرنے والے بدلے میں داد وتحسین کے طلب گار بن جاتے ہیں۔

''بھئی جو آپ کے پاس تھا وہ آپ نے دیا اور جو کسی دوسرے کے پاس تھا وہ اس نے لوٹا دیا۔ بات ختم۔ ہاں یہ ضرور ہو کہ منفی لوگوں پر اپنی زندگی کے دروازے بند کرتی جاؤ۔ تجزیہ، تصفیہ اور تذکرہ صرف معاملات کو بگاڑنے کے مترادف ہے۔ خواہ مخواہ زخم کریدنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اکثر قدرت کی طرف سے آپ کے دوستوں اور تعلق داروں کی بھی چھانٹی ہوتی ہے۔ قدرت ایسے اسباب پیدا کر دیتی ہے کہ آپ کو ان کے اصل چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ بس جو لوگ آپ کی دل آزاری کا باعث ہوں اور آپ کو نیکی اور خیر سے تائب ہونے کا درس سکھا رہے ہوں ان سے کنارہ کشی کر کے اپنا سفر جاری رکھیں۔

سورۃ رحمٰن میں یقین دہانی کی گئی ہے نا کہ ھَل جزاء الاحسان الا الاحسان۔ تو نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ نیک امر آگے سفر کرتا ہے یا آپ چاہتی ہیں کہ جو احسان آپ نے کیا وہ پلٹ کر صرف آپ ہی کی طرف آئے؟ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اللہ انسانوں کی بے فیضی کے بعد بھی ایسے انسان کو مزید احسان کرنے کی توفیق دے؟ جزا کی تمنا چھوڑ کر مزید نیکی کے ذریعے ہی ''اس ٹھگاں دے ٹھگ نوں ٹھگ۔''

''میں آئندہ کسی کو اس طرح نہیں پڑھاؤں گی'' میں نے اپنا غصہ دکھانا جاری رکھا۔

''واہ وا، کیا بات ہے، یعنی ایک برے رویے کو آپ نے مزید برا کیا۔ ایک کے برتاؤ کی سزا ناحق کسی دوسرے مستحق کو دی۔''

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گزر بادہ و جام سے گزر

ابا جی نے دوبارہ کتاب اپنے چہرے کے سامنے کر لی جو واضح اشارہ تھا کہ جاؤ اب ٹلو۔ شاید یہی واقعات میری شاعری کے موضوعات بھی بن جاتے۔

یہ تجارت ہے خدایا کہ عبادت تیری
لوگ سجدوں کا بھی اب تجھ سے صلہ مانگتے ہیں

●●

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

میرے سوال کرنے کی عادت سے امی جی بہت سے نالاں رہتیں لیکن ابا جی نے ہمیشہ مجھے اطمینان بخش جواب دینے کی کوشش کی۔ سورۃ رحمٰن ان کی پسندیدہ سورۃ تھی اور اکثر صبح اس کی تلاوت کرتے۔ میں نے انہی سے سن سن کر یاد کی۔ جب ترجمہ پڑھا رہے تھے تو میں نجانے کیا کیا سوال کرتی۔ ایسے موقعوں پر اگر امی جی پاس ہوتیں تو منع کرتیں۔

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبالؔ
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند!

لیکن ابا جی مجھے اس زمانے کی عرب تہذیب و ثقافت کے حوالے سے جواب دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اسلامی تاریخ اپنے شوق اور تجسس سے پڑھی۔ ادیان کا تقابل مجھے عزیز بھائی نے پڑھایا۔ اردو مباحثوں میں جب خروجِ جنت کا الزام عورت پر ڈالا جاتا تو ابا جی نے ہی مجھے بتایا کہ قرآن میں اس غلطی کا ذمہ دار دونوں کو کہا گیا ہے جس کے لیے ''ھما'' کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ ''فازلھما الشیطان'' (پس بھٹکایا ان دونوں کو شیطان نے)۔ اور پھر جب میں ٹرافی لے کر آتی تو اپنے کمرے کی الماری میں رکھوا دیتے۔ اس بندۂ گستاخ کا منہ بند کرنے کے بجائے سوالات کا جواب دیں۔

ایک مرتبہ میرا ایک مضمون پڑھ کر کسی نے مجھے ان باکس میں لکھا کہ میں یقین کر ہی نہیں سکتا کہ ایک پانچ چھ سال کی بچی اقبال کی نظمیں زبانی یاد کر سکتی ہو۔ آج جب میں مہر کو لہک لہک کر کلامِ اقبال سناتے ہوئے دیکھتی ہوں تو مجھے اپنے بچپن کا ماحول یاد آجاتا ہے۔ اگر آج ابا جی اپنے بچوں کے بچوں کو دیکھ سکتے تو داد کا صحیح حق وہی ادا کر سکتے تھے۔ اب فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں تدریس کا تمام تر کام ابا جی کا جنون تھا اور اب بھائیوں نے یہ فریضہ سنبھال رکھا ہے۔

••

مزرع تسلیم راہ حاصل بتول
مادراں را اسوہ کامل بتول
بتول باش و پنہاں شو ازین عصر
کہ در آغوش شبیر بگیری

یعنی بتول (حضرت فاطمۃ الزہراء) بن کر زمانۂ حاضر کی نگاہِ بد سے اوجھل ہو جاؤ (پردہ

اختیار کرو) تاکہ تم اپنی آغوش میں شبیر (سید الشہداء حضرت امام حسین ؓ) کو پال سکو۔

''ابا جی!'' میں نے تقریر کے لیے نکات نوٹ کرتے ہوئے کہا،''سب اچھی ماں بننے کے اصول سکھاتے ہیں، اچھا باپ بننے کے آداب عام کیوں نہیں؟ نپولین بونا پارٹ بھی اچھی مائیں مانگ کر اچھی قوم دینے کی تجارت کرتا ہے لیکن اچھی مائیں بنانے والے کارخانے آخر ہیں کہاں؟''

ابا جی نے اپنے ہاتھ سے اخبار رکھا، عینک اتاری گویا اب مفصل وعظ کے لیے تیار ہو گئے۔''بی بی تاریخ پڑھو تاریخ، چھٹی صدی عیسوی میں دنیا بھر میں عورتوں کے حالات پر نظر کرو اور پھر اس وقت کی عرب عورت کی معاشرت کا مطالعہ کرو۔ حصولِ علم اور تجارت کی اجازت، اور وراثت کے احکامات سے عورت کی زندگی میں انقلاب آیا۔ وہ زندگی کے ہر مقام میں مرد کے شانہ بشانہ رہی۔ معاشرتی نشیب و فراز نے نیا رخ اختیار کر لیا۔ مذہب، سیاست، معاشرت اور اقدار میں سب سے وزنی استحقاق معیشت کو حاصل رہا ہے۔ عورت کو ملکیت تصور کر لیا گیا تو اسے بھی مال مویشی، زمین جائیداد کی قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے لیے کسی ایک مذہب یا کسی ایک سماج کی طرف انگشت نمائی مناسب نہیں۔

آن کہ شیراں را کند روباہ مزاج
احتیاج و احتیاج و احتیاج

اسی چھوٹے سے شہر میں وہ وقت بھی آیا کہ لوگوں کے کنوارے لڑکوں نے بچوں والی ماؤں سے شادی کر کے یورپ کے ویزے لگوانا شروع کر دیے، جب کہ یورپ کی عورت کی ترجیحات یکسر مختلف ہوتی ہیں۔ وہ اقتصادیات سے شروع ہو کر اقتصادیات پر ہی ختم ہوتی ہیں۔ وہاں کی عورت اپنی ذات، وجود اور ساری بات ہی اقتصادیات سے شروع کرتی ہے۔ وہ یا تو اپنے خوابوں کا سودا کر کے اپنی اولاد کے لیے سہولتیں، رہائش اور آسائشیں خریدتی ہے یا پھر یورپ امریکہ کے ویزے کے سہانے خواب دکھا کر اپنے لیے چند سال کا شوہر خریدتی ہے۔

••

میں نوٹ بک پر اشعار لکھتے ہوئے ابا جی کی خواہشات اور عزائم ذہن میں لائی تو مجھے لگا کہ علامہ اقبال بھی حکیم الامت نہیں بلکہ صرف حکیم ہی تھے۔

چشم را بینائی افزاید سہ چیز
سبزہ و آبِ رواں و روئے خویش

کالبد را فربہی می آورد
جامہ قز، جانِ بے غم، بوئے خویش
اے برادرِ من ترا از زندگی دادم نشاں
خواب را مرگِ سبک داں، مرگ را خوابِ گراں

(پیامِ مشرق)

آنکھ کی بینائی تین چیزوں سے افزائش پاتی ہے:
سبزہ، آبِ رواں اور حسین صورت۔ بدن کو فربہی مائل بناتا ہے:
ریشمی لباس، بے فکر جان اور خوشبو۔
اے میرے بھائی میں نے تمھیں زندگی کا نشان بتا دیا ہے۔
نیند ہلکی سی نیند سمجھ اور موت کو گہری نیند۔

''یعنی اقبال پوری قوم کو سبزے پر چہل قدمی کرتے دیکھنا چاہتے تھے تاکہ ان کی نظر تیز ہوجائے۔ خود ان کی اپنی بینائی از حد خراب تھی لیکن قوم کو صحت مند دل و دماغ دینا چاہتے تھے۔ صبح پوری قوم اٹھ کر ندی کے کنارے ٹہلنے جایا کرے تاکہ بہتا پانی ان کے دلوں کو فرحت و اطمینان بخشے۔ اچھی صورت اور خوشبو کی ترغیب دی گئی۔ یہ تو بہت حکیمانہ شعر ہے''

میں نے عالمانہ رائے کا اظہار کرنے کی جسارت کی۔

''آپ کو خوشخط لکھنے کو کہا ہے، لیکچر دینے کو نہیں۔''

''جی ابا جی۔۔۔۔!'' میں نے سعادت مندی سے کہا، ''لیکن سچ پوچھیں تو علامہ اکثر میرے تصور میں خمیرہ گھولتے، معجونیں کوٹتے، اور چہار عرق انڈیلتے ہی نظر آتے ہیں۔''

••

پتہ نہیں کس موسم کی ایک سہانی صبح تھی۔ سہانی اس لیے کہ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ابھی تک خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔ اچانک زوردار دھماکے سے دروازہ کھلا اور ایک بے ہنگم شور کمرے میں داخل ہوا...

''اٹھو۔۔۔۔اٹھو، کب تک سوتی رہوگی''۔

حالانکہ ہمارا غیر تحریری معاہدہ تھا کہ امتحانات کے بعد میں ابا جی کے سکول میں پڑھاؤں گی لیکن مجھے چھٹی والے دن صبح ہرگز نہ جگایا جائے۔ جب میں خود اٹھ جاؤں تو پھر جو معرکہ

سر کرنے کو کہیں گے کر دوں گی۔ کیا یاد آ گیا! ہائے۔ ابا جی کے آنگن کی وہ بے پروا نیندیں۔ جب جی چاہا سو گئے۔ ایسی پرسکون نیند کہ خوابوں کا پرندہ بھی نہ پر مار سکے۔ جب تک خود اجازت نہ دو، بیداری کا سورج بھی طلوع نہیں ہوتا تھا۔

خیر بات ہو رہی تھی اس خوبصورت صبح کی، جس کا سورج بھی ابھی نہیں دیکھا تھا۔ فجر کے وقت حسبِ معمول ابا جی کی آواز آتی رہی، ''وقت کم رہ گیا ہے بیٹا، نماز نکل جائے گی''۔

امی کی مانوس شرط لگاتی پکار، ''نماز پڑھ لو، پھر سو مر جانا''۔

مارے باندھے اٹھ کر اٹھک بیٹھک کی۔ اس دور کی نمازیں صرف ابا جی کی نمازیں ہوا کرتی تھیں۔ جب وہ خفا ہوتے تو کچھ بھی اچھا نہ لگتا۔ امی جی کی نصیحتیں کہ طلوعِ آفتاب سے پہلے سورۃ یٰسین کی تلاوت کی بہت فضیلت ہے۔ مجھے کبھی سمجھ نہیں آئی کہ پہلے ہی کیوں؟ جب دل چاہے تب کیوں نہیں''؟ خیر نیند کا سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں منقطع ہوا تھا۔

دھڑ، دھڑ، ---- دھڑ، دھڑ، ---- اچانک یوں شور مچا جیسے کسی لشکر کے جگانے کی خاطر صور پھونکا گیا ہو۔

''کیا قیامت آ گئی ہے'' ہائیں! میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو ابا جی، امی، بھائی، تایا جان، دونوں تایا زاد بھائی سامنے کھڑے نظر آئے۔

تو کیا میں وفات پا گئی ہوں؟

''اٹھو، اٹھو۔ تمھارا رزلٹ آ گیا ہے'' سب کی ملی جلی آوازیں کانوں سے ٹکرائیں۔

''ہیں؟'' اب تک میری نیند ہرن ہو چکی تھی، ''کیا بنا۔ کتنے نمبر آئے ہیں؟''

''تم نے ٹاپ کیا ہے جاہل۔ رضوان برادرز پر گزٹ آیا تو انھوں نے پورے شہر کو خبر کر دی ہے۔ کہنے لگے کہ لوگ اپنا رزلٹ پوچھنے درجنوں پھیرے ڈالتے ہیں، فون کرتے ہیں، پر مرزیاں دے گھروں کسے پچھیا ای نہیں''۔

ابا جی کا روشن چہرہ اور اس پر کھلے مسرت کے گلاب۔

''اے نالائق! تو تو پاس ہو ہی گئی'' میرے تایا زاد دشمن نما دوست بھائی نے فقرہ کسا۔

''چل چنگا ہو گیا اے، سوائے شہر شہر پھرن تے شعر پڑھن دے ہور توں کیتا وی تے کج نئیں'' یہ امی کے تاثرات تھے۔

''محنت تو یہ لڑکی کرتی نہیں، پھر بھی ہمیشہ خوش کر دیتی ہے'' اب تایا جان کی باری تھی،

جن کی ستائش میں پہلے میری نالائقی کی یقین دہانی ہوتی تھی۔

''کاش آج لالہ جی حیات ہوتے'' ابا جی بولے، اور میں اس رم جھم کے قطروں سے گوہر کشید کر رہی تھی۔

''چل اب تم اگلے دو دن سوئی رہنا'' بھائی نے چھیڑا۔

تایا جان نے حسبِ معمول پھر کہا، ''بیٹا تمھیں میڈیکل کالج جانا چاہیے تھا۔''

''لو جی، پھر وہی؟ بھئی اس کے لیے جس صبر و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے بھلا وہ مجھ میں کہاں؟ اور ویسے بھی کسی کو تکلیف میں دیکھنا میرے بس کا روگ نہیں۔ خدانخواستہ اگر کبھی یہ ممکن ہوا بھی تو میں انتہائی نالائق ڈاکٹر ثابت ہوں گی۔'' میں نے یقین دہانی کرانے کی کوشش کی۔

چند ہفتوں بعد چاچا جی کو لندن سے آنا تھا۔ یوں تو سارے چچا امی جی کے بہت لاڈلے تھے مگر یہ بہت دلارے تھے۔ دن گن رہی تھیں۔ وہ آتے تو ان کی پسند کی سبزیاں، چٹنیاں بنا کرتیں، کرتے سِلا کرتے۔ ہزار وہ کہتے کہ آپا وہاں سردی میں کرتے کا موسم ہی کب آتا ہے لیکن امی بھلا کہاں سنتی تھیں؟ چاچا جان آئے۔ مجھے یاد ہے انھوں نے سب کو تحفے تحائف دیے۔ مجھے امتحان پاس کرنے کی خوشی میں کتابیں ملیں۔

••

میری پہلی مادرِ علمی ابا جی تھے۔ انھوں گھر میں چار وکیلوں کی تربیت کی اور جب کبھی کسی بحث میں کوئی بھائی ان سے کہتا ابا جی وکیل میں ہوں کہ آپ، تو فوراً جواب ملتا، ''وکیلوں کا باپ میں ہوں کہ تم؟''

گھر کا ماحول ہی ایسا تھا کہ ہر موضوع، ہر شعبے اور ہر علمی و ادبی میدان پر بات اور مطالعہ عام تھا۔ اختلافِ رائے کو سنا جاتا۔ سو مجھے شعر و ادب، مذہب و سیاست، طب و لسانیات، عربی، فارسی، اردو، پنجابی سب کچھ طشتری میں کٹے پھل کی صورت میں ملا۔ اسلام آباد یونیورسٹی میں علامہ اقبال ذہنی آزمائش کا مقابلہ تھا جس میں شرکت کے لیے سٹوڈنٹ نوید جنجوعہ کے ساتھ میرا انتخاب کیا گیا۔ دو ہفتے کے دوران ابا جی نے میرا سونا جاگنا اپنے اختیار میں لے لیا۔ کتاب 'زندہ رود' اور 'ری کنسٹرکشن آف ریلجس تھاٹ ان اسلام'، انسانی حقوق کا عالمی منشور، فارسی کلام کی چیدہ چیدہ نظمیں اور ان کا پس منظر پڑھایا۔ شام کو تایا جان تشریف لاتے۔ ان کی قوتِ حافظہ کے سامنے پورے خاندان کی نئی نسل پانی بھرتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی پرزیوں پر سوالات تحریر تھے جو تھانے میں

باندھے کسی مجرم کے بیان کی طرح پوچھے جاتے اور فر فر جواب دینا لازم ٹھہرا۔ ڈیکلریشن آف ہیومین رائٹس یعنی انسانی حقوق کا آفاقی منشور، سیاسی نظام، شیطان کی مجلسِ شوریٰ، غرض کیا کیا نہیں تھا جو زیرِ بحث آتا۔ اس پروگرام کی نظامت انور مسعود نے کی اور ہم انعام لے کر کامیاب لوٹے۔

مسز ملک، مس چودھری، مس منہاس، سب کو ابا جی سے بات کر کے انتہائی مسرت ہوتی اور اس بات پر حیرت بھی کہ انھیں تعلیمِ نسواں اور خواتین کے ذہنی افق کو وسیع تر کرنے کی سیمابی تمنا کیسے بے قرار رکھتی ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب جہلم کالج کے ساتھ میرا نام لازم و ملزوم سمجھا جاتا تھا۔ اگر صرف میں اپنی اس عظیم درسگاہ اور عظیم اساتذہ کا تذکرہ کرنے لگوں تو ایک اور کتاب تیار ہو جائے۔ میں اس شہر کی ہواؤں کی خیر مانگتی رہتی ہوں جس نے مجھے سٹیج پر کھڑے ہونا سکھایا۔ علم دیا اور اس کے ابلاغ اور اظہار کے مواقع دیے۔ اسی کالج نے ہمیشہ مجھے اپنا سفیر قرار دیا۔ جب میں نے ایف اے اور بی اے میں ٹاپ کیا تو مسز ملک نے کھڑے ہو کر مجھے پیار کیا۔ وہ عربی کی استاد تھیں اور ہمارا تلفظ درست کرنے پر مامور تھیں۔ مس جعفری، مسز شاہینہ خالد جنھوں نے سالِ اول میں قدم رکھتے ہی مجھے نمائندگی کے انتخاب میں چاروں سیکشنز میں کھڑا کر دیا۔ جب میں نے بھاری اکثریت سے عہدہ حاصل کیا تو مسکرانے لگیں۔

''مجھے علم تھا۔ آپ میں قیادت کا سپارک ہے۔'' ان کا سرخ و سفید، معصوم لیکن انتہائی پروقار چہرہ مسکراہٹ کی روشنی سے جگمگاتا رہتا۔

پنجابی ٹاکروں کی طرف مجھے کھینچ کر لانے والی مسز شمیم نیاز جو ایک بہترین شاعرہ اور بے مثال معلمہ تھیں۔ لیکچر دینے پر آتیں تو طالبات کے سروں پر پرندہ بیٹھ جاتا۔ شعر سنانے کی لہر اٹھتی تو کلاسیکی ادب سے جدید شعرا تک کا کلام اذہان میں انڈیل دیتیں۔ صبح اسمبلی کی بلاشرکتِ غیرے انچارج تھیں۔ جونہی میں نے سالِ اول کی نمائندگی کا انتخاب جیتا، اگلے دن بغیر کسی نوٹس کے اسمبلی میں مجھے سٹیج پر بلالیا، ''آج پانچ منٹ کی گفتگو آپ کریں گی۔''

میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ''میری تو کوئی تیاری ہی نہیں'' میں نے منمنانے کی کوشش کی۔

''آپ کو تیاری کی ضرورت ہونی بھی نہیں چاہیے۔ جس میدان میں قدم رکھا ہے یہ اس کا تقاضہ ہے۔ پڑھا کریں اور پھر فی البدیہہ بولا کریں۔''

یہ ان کا ہی فیضان تھا کہ میرا ادبی شوق پنجابی زبان اور مباحثوں کی شاہراہ سے گزرتا سرائیکی اور ہندکو شاعری کے کوچوں تک آ پہنچا۔ انگریزی کی بے مثال استاد مس عابدہ نسرین جن کے

پیچھے ہم طالبات دیوانوں کی طرح گھومتیں اور جو شدید گرمی میں پنکھا بند کر کے انگریزی پڑھاتیں۔ میری کامیابی پر ایک ڈنر ان کے ساتھ، ان کے گھر پر کرنے کا اعزاز بھی مجھے حاصل ہوا۔

••

ایف اے اور بی اے میں ٹاپ کرنے پر جب کالج کے آڈیٹوریم میں آویزاں بورڈ پر میرا نام لکھا گیا تو ڈیبیٹنگ سوسائٹی کے اساتذہ نے ابا جی سے کہا، ''اللہ کا شکر کہ اس نے ہمیں سرخرو کیا، ورنہ اسے غیر نصابی سرگرمیوں میں مشغول کر کے تعلیمی محاذ پر پسپا کرنے کا الزام ہمارے سر آتا۔ یہ عزت و اکرام مبارک ہو۔''

''وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر۔'' ابا جی ہنس کر بولے، ''آپ جیسے محسنین کی کاوشیں نہ ہوتیں تو یہ صرف کتابی کیڑا ہوتی۔ میں آپ کا احسان مند ہوں۔''

ابا جی پر ہوتا تو مجھے باقاعدہ انتخابات کے ذریعے سیاست میں بھیجتے۔ ''چنگا ہویا اے کہ یہ ملک سے باہر نکل گئی۔ پتہ نہیں کیا اوٹ پٹانگ لکھا کرتی یہاں رہ کر۔'' امی جی کو تو بھائی فاروق چودھری کے قتل کے بعد باقاعدہ سیاست سے نفرت ہو چکی تھی۔ سرائے عالمگیر کی معروف ادبی، سماجی اور سیاسی شخصیت جو بعد میں وزیرِ قانون کے عہدے تک پہنچے۔ بڑے بھائی جان کے بے حد قریبی دوستوں میں شامل تھے۔ میں ایف اے میں پڑھتی تھی جب انھوں نے پہلی دفعہ انتخابات میں حصہ لیا اور ابا جی نے مجھے پولنگ ایجنٹ کے طور پر بٹھایا۔ ان کے باوقار گھرانے کی خواتین کا ہمارے گھروں میں آنا جانا تھا اور ابا جی ان کا بہت احترام کرتے۔ پھر وہی ہوا جو سیاست کے کھیل میں ہوتا ہے۔ ان کی گاڑی پر گولیوں کی برسات ہوئی اور ختم فسانہ ہو گیا۔ ہمارے گھر میں بھی صفِ ماتم بچھ گئی۔ جب تک ابا جی سلامت رہے ہمیشہ ایک بیٹے کی طرح ہی ان کا ذکر کرتے، ''بہت نقصان کیا ظالموں نے، بہت قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں۔''

••

مولوی اسماعیل میرٹھی، مولوی عبد الحق، مولوی نذیر احمد، علامہ شبلی، مولانا سلیمان ندوی، مولوی محمد حسین آزاد، مولانا عبد الحلیم شرر اور نجانے کون کون سے علمائے کرام اور مصنفین کی کتب بھری رہتیں۔ میں ہمیشہ کی طرح بآوازِ بلند بیزاری کا اظہار کرتی، ''یا اللہ کیا علم اور مطالعہ ان مولویوں، مولاناؤں اور علاموں کے دائروں سے باہر بھی نکلے گا؟''

''مولوی اس زمانے میں سکالر کو کہتے تھے۔ محقق، تدبر کرنے والا اور اپنے علم کے نچوڑ

سے عوام الناس کو فیض پہنچانے والا'' ابا جی نے میری تصیح کی۔

''جی ابا جی'' میں نے جلدی سے تائید کی۔

''توزکِ اردو۔ اس کا دیباچہ اونچی آواز سے پڑھو۔'' اردو زبان کے لیے جوش کی نظم کی فوٹو کاپی کہیں سے لے آئے۔ ابا جی کو فوٹو کاپی مشین اور فیکس مشین کی ایجاد بے حد پسند تھی۔

••

ابا جی نے اپنی جرابیں تہہ کیں۔ پھر ان کو تکیے کے نیچے رکھا۔ متناسب انگلیوں والے دبلے پتلے چھوٹے چھوٹے پاؤں جو اپنے قد کی مناسبت سے چھوٹے تھے۔

''لائیے ابا جی آپ کو پیروں پر لوشن لگاؤں'' میں نے پیشکش کی۔

''نہیں بھئی، میرے ہاتھ سلامت ہیں'' انھوں نے پیر سمیٹے۔

''امی جی تو بابا جان کے پیروں پر مالش کر دیتی ہیں'' میں نے قدرے خفگی سے دلیل پیش کی۔

''بابا جان بیمار ہیں'' ابا جی نے جوابی دلیل پیش کی۔

''گویا بیمار ہونا ضروری ہے؟'' میں سوال داغا۔

''نہیں لیکن اپنے کام خود کرنا ضروری ہیں'' وہ بھی محاذ پر جم کر کھڑے رہتے۔

''اللہ یہ توفیق دے کہ ہم کسی کے کام آسکیں۔ اپنے محتاجوں کا محتاج نہ کرے۔ صرف اپنے در کا سائل رکھے۔'' انھوں نے ہمیشہ کی طرح اپنی خواہش دوہرائی۔

••

ابا جی نے ہمیشہ مشاعروں اور مباحثوں میں میری شرکت کی حوصلہ افزائی کی۔ بہت لوگوں کو اعتراض ہوتا کہ بچی پورے پاکستان میں گھومتی پھر رہی ہے۔ دوسری بچیاں بھی دیکھا دیکھی ایسے ہی پھرنا چاہتی ہیں۔ ابا جی کہنے لگے یہ میری بیٹی ہے اور جانتی ہے کہ قلم اور کلام کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔ ابا جی کو شاید کبھی اندازہ ہی نہیں ہوا ہوگا کہ انھوں نے جو بات کہہ دی وہ پتھر پر لکیر ہو جائے گی۔ پھر ساری زندگی اس قلم اور کلام کی حرمت کا فریضہ عائد ہوگیا۔

''جو لکھنا ہے اپنی طاقت استعداد پر۔ اگر اللہ نے آپ کو ایک ٹانگ سے محروم رکھا ہے تو اولمپک کھیل میں دوڑنے کی ضد کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ جب اللہ نے شعر و سخن کی طاقت نہیں دی تو مشاعرہ بازیوں کی کیا ضرورت ہے؟ پھر بلاوجہ کی ادبی رشتہ داریاں جوڑتے رہنا کہ فلاں بھائی، ڈھمکاں چچا اور ماموں وغیرہ فلاں سے گھریلو تعلقات ہیں تو مشاعرے میں بلایا گیا۔''

یہاں بھی بچپن ہی کی تربیت کام آئی۔ ابا جی مجھے احساس دلاتے رہتے کہ تم ایک لکھاری ہو، شاعرہ ہو، استاد ہو اور بس۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ادبی دنیا کی خرافات میں کسی کو اپنا گاڈ فادر بننے ہی نہیں دیا، اگرچہ بزرگوں کا ادب ہماری گھٹی میں شامل کر دیا گیا تھا۔ ابا جی کہا کرتے تھے کہ اہلِ عرب کی کہاوت ہے سفید بالوں کا احترام لازم ہے۔ میں نے کہا تو گنجوں کے لیے کیا حکم ہے؟ ہنس کر بولے ''ایشیا کے بزرگوں میں گنج عام ہے اور یہ بمعنی مال و دولت نہیں۔''

••

ہمارے رشتے کی ایک پھوپھو جان کو پنجابی زبان و بیان پر انتہائی عبور تھا۔ چھریرے بدن کی پروقار پھوپھو فیروز جب آتیں تو میں ان کے پاس بیٹھ جاتی اور فرمائش کرتی کہ پھوپھو جی مجھے پنجابی محاورے سنائیں۔ اور جواباً وہ ایسی ایسی پھلجھڑیاں چھوڑتیں کہ سب نہ صرف ہنستے بلکہ ان کی یادداشت کی داد بھی دیتے۔

''جم مکی نہ تے نک نانکے تے'' (بچہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوا تو اعلان کر دیا کہ بچے کی ناک ننھیال پر ہے۔)

''کوہ نہ ٹری تے بابا میں تریہائی'' (کوس چلی نہیں کہ ابا جی مجھے پیاس لگی ہے۔)

میرے کالج کے زمانے کی تقریروں کی پنجابی محاوروں سے خوب آرائش ہوتی اور مجھے باقاعدہ ''جہلم دی جٹی'' کے نام سے پکارا جانے لگا۔

امی جی کے محاورے اور دو دھاری ضرب الامثال پنجابی ٹاکرے میں تڑاتڑ مخالفین کے چھکے چھڑانے کے کام آتے۔ جہلم کالج کے بڑے ہال میں اس وقت دھات کی کرسیاں رکھی تھیں۔ طالبات تالیوں کو ناکافی سمجھتے ہوئے ان کرسیوں کی یوں دھنائی کرتیں جیسے پاکستانی ''پلس'' مشتبہ کو کوٹتی ہے۔ اوپر گیلری میں لڑکیاں بیٹھ کر سیٹیاں بجاتیں اور پکڑی جانے سے پہلے بھاگ جاتیں۔

مجھے کالج جاتے ہوئے سرائے عالمگیر اور جہلم کو ملانے والے پل پر گاڑی کا چلنا بہت اچھا لگتا تھا مگر مجھے کبھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ یہ مناظر دیکھ کر اندر ہی اندر کہیں کیا ہو رہا ہے؟ خوابیدہ، خاموش، آخری نیند سے جاگنے کے احساس میں داخل ہوتے ہوئے شجر اور دریا کی لہروں کا نرم خرام کوئی بلبلہ بھی شوخی کرتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے ابا جی سے ایک دن ذکر کیا کہ ہر صبح وہاں سے گزرتے ہوئے بے اختیار میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ لکھوں۔ کہنے لگے اپنے پاس ایک چھوٹی سی ڈائری رکھا کرو اور جو ذہن میں ابھرتا ہے اسے قرطاس کو سونپ دیا کرو۔ پھر انھوں نے خود ہی مجھے ایک ننھی

سی نیلی جلد والی ڈائری لا کر دی جس میں میں نے بے ربط نظمیں اور منتشر نثر لکھنا شروع کر دی۔ موسمِ گرما کی اترتی ہوئی زرد رُو اداس دھوپ میں بلاوجہ دل میں پھیلتی پژمردگی کا شدید تاثر جسے کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔

ستاروں بھرے آنگن کی خاموش سوئی ہوئی رات کے دامن میں جاگتے ستارے دیکھنے کی مسرت صرف محسوس کی جاسکتی ہے۔ سمندر کے کنارے رہتے ہوئے، موسمِ گرما کی شام کو، سیر کے دوران شور مچاتے مہاجر پرندے، دن بھر کی تپیا کے بعد رخصت ہوتے سورج، سکون سے اُبلتے سمندر کی ہم آہنگی اور لہروں سے بغلگیر ہوتا ہوا افق کا کنارہ جس عجیب زود حِس قسم کی آزردگی سے دوچار کرتا ہے اس کو الفاظ کی گرفت میں لانا آسان نہیں۔ خوش قسمتی سے بڑے آنگن میں پھولوں پودوں اور سبزیوں کی ملی جلی مہک کے درمیان صاف آسمان دکھائی دیتا۔ مدوجزر کے گھنگرو لہروں سے باندھے اس گنگناتے پانی کی روانی، اس پر سایہ کناں نیلے آسمان کی ضوفشانی جس کا رنگ موسم کے ساتھ بدلتا جاتا اور اس کے مزاج کے مطابق باوفا جہلم بھی اپنا رنگ تبدیل کر لیتا۔ یہ لہریں کبھی مٹیالی، کبھی روپہلی، کبھی نقرئی اور کبھی طلائی ہو جاتیں۔ میرے لیے یہ دریا محض ایک دریا نہیں تھا، جرات و وفا کا استعارہ بھی تھا جو میری شاعری سے جھلکتا بھی رہتا۔

جہلم کے پانیوں کی روانی ہے رقص میں
کردار غرق ان کی کہانی ہے رقص میں

بین الکلیاتی مباحثوں کے دوران جب پورا پاکستان جمع ہوتا تو طالبات اپنے اپنے تعارف کے لیے شہروں کے اشعار گھڑا کرتی تھیں اور ٹپے گایا کرتی تھیں۔ بیت بازی کے مقابلے ہوتے اور میرا تحریف کیا گیا ٹپہ بہت مشہور ہوا:

شعراں دی دے واری
میں کڑی جہلم کالج دی، شعراں توں نئیں ہاری

میری نظم، جہلم جہلم تو بہتا جا، انہی دنوں کی تخلیق ہے۔ کالج کے دوران ہماری نظمیں غزلیں اسی طرح نازل ہوا کرتیں، کبھی کسی طرح مصرع پر غزل کہہ دی، کبھی کسی موضوع پر نظم کہہ دی۔ اٹک کالج کے پروگراموں کے دوران ہماری مشاعرے میں شمولیت نہیں تھی کیونکہ اچانک ہی فیصلہ ہوا کہ اردو مباحثے کی ٹیم ضرور جانی چاہیے۔ سائنس کی ایک استاد مس عارفہ ہمارے ساتھ تھیں۔ مباحثے میں مجھے اول انعام ملا۔ رات کو ہم حسبِ معمول شعر و شاعری اور گانے بجانے

کے لیے جمع تھے تو مس عارفہ بولیں، مشاعرے کی نظم کا عنوان ''امانت'' ہے۔ پشاور سے محسن احسان کی بیٹی آئی ہوئی ہیں۔ سب شاعرات کو تو لکھی لکھائی شاندار نظمیں ملی ہیں اس لیے ہمیں بے حد اچھی نظمیں سننے کو ملیں۔ ریہرسل میں، کتنا افسوس ہوا کہ جہلم کالج مقابلے میں شامل ہی نہیں۔

رات کو سونے کے لیے کمرے میں آئے تو مس عارفہ کا جملہ اور نظم کا عنوان میرے ذہن میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا، میں نے کہا پلیز لائٹ تو جلائیں۔ اٹھ کر ایک نظم امانت لکھی جس کا مرکزی خیال پاکستان تھا۔ مجھے وہ یاد تو نہیں اور نہ ہی کوشش کے بعد بھی مل سکی لیکن اس کا آغاز کچھ یوں تھا:

اک شخص نے مجھ کو سونپی تھی
رنگیلے سپنوں کی تعبیر
نہ ہی کوئی وعدہ لیا مجھ سے
نہ ہی کوئی باندھی زنجیر

باقی تمام نظمیں بھی زیادہ تر رومانوی ہی تھیں۔ لڑکیوں نے ابتدا سن کر نعرہ لگایا، ہوٹ کا قہقہے اگلتا ریلا بھی ساتھ ہی امڈا

''ہائے ہائے، بے چاری، زنجیر بھی نہ باندھی، چل بھاگ جا''

نظم آگے بڑھتی رہی، اس شخص کی دلبری، دلداری، امانت کے لیے راتوں کو جاگنا، دنیا بھلا دینا، زمانے سے ٹکرا جانا اور پھر مر جانا وہ عام موضوعات تھے جن پر توجہ مرتکز نہیں ہوتی۔

اک بارِ امانت دے کے مجھے
وہ راہیِ ملکِ عدم ہوا
یہ دنیا جس پہ ناز کرے
یزداں کی وہ ایسی قسم ہوا

وہ شخص ملا مجھے خواب میں رات
کچھ تنہا سا، پریشان سا تھا
وہ امانت لٹنے کے ہاتھوں
ناراض سا کچھ پریشان سا تھا

وہ شخص، مرا محبوب تھا جو
وہ پاکستان کی جان بھی تھا
جو امانت اس نے دی مجھ کو
وہ امانت پاکستان ہی تھا۔

نظم کا رخ بدلتے ہی داد و تحسین کا غلغلہ چھت پھاڑنے کو تھا، کرسیاں پیٹی جانے لگیں، سیٹیاں بجائی گئیں، آوے ای آوے، جہلم آوے، چھاوے ای چھاوے جہلم چھاوے۔

انعام لے کر جب میں سٹیج سے اتری تو مس عارفہ کی اشکوں بھری بے یقین آنکھیں سب کو بتا رہی تھیں، میرا یقین کیجیے یہ نظم اس نے رات کو ہمارے سامنے لکھی ہے، یقین کیجیے ہمارا تو نام ہی نہیں تھا مقابلے میں، سچ مانیے۔

لیکن کسی کو ان کی بات پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ایسے بنی بنائی، گھڑی گھڑائی، ڈھلی ڈھلائی نظم کیسے راتوں رات لکھ لی گئی۔ یقیناً آپ لوگ تیاری سے آئے تھے اور ہمیں سرپرائز دیا ہے۔ اس تشکیک اور تحسین کے درمیان ملنے والی کامیابی کی داد الگ، لیکن مجھے صرف اس بات کی خوشی تھی کہ جہلم کا نام مقابلے میں شامل ہوگیا تھا۔ رات کو ہمارے گھڑے ہوئے گانے گائے گئے، کالج کے میس سے پرات منگوا کر بجائی گئی۔

اٹک کالج کے ساتھ جو دلکش ترین یادیں وابستہ ہیں وہ پشاور کی تین بہنوں سے ملاقات تھی۔ ہم انھیں زیب سسٹرز کہنے لگے۔ ان کا خوبصورت پختونی لہجہ اور اقبال کا فارسی آمیز کلام ایک عجیب سی مسرت دیتا اور میں پوری کوشش کرتی کہ میں اپنی ہنسی دبا سکوں۔ اٹک کالج سے ابتدا کی گئی یہ دوستی محبت میں بدل گئی۔ ہماری خط کتابت شروع ہوئی تو ابا جی اکثر خط گھر لاتے اور کہتے، کیسی باقاعدگی سے یہ بچیاں خط لکھتی ہیں۔

اسی کالج میں ثمینہ تبسم سے ملاقات ہوئی۔ کالج کے ایک خاموش کونے میں وہ پوری سنجیدگی سے اپنی تقریر یاد کرنے میں مصروف تھیں۔ میں بھی اپنے کاغذات لے کر پہنچی۔ سلام دعا کے بعد تعارف ہوا اور رات کی نظم امانت کے بعد وہ ہمارے کمرے میں آئیں۔ میں بھی جہلم آ رہی ہوں۔

اس کے بعد سے وہ ہمارے گھر کا فرد تھی۔ ابا جی کو تو لکھنے پڑھنے والی بچیاں ویسے ہی آسمان کا ستارہ لگتی تھیں۔

زندگی اپنے نشیب و فراز اٹھاتے گراتے ہمیں ملک سے باہر لے آئی۔ عزیز بھائی کے انتقال کے بعد وہ ڈنمارک آئی۔ ابا جی سے ہر روز بات ہوتی۔ ابا جی باقاعدہ اس کے ممنون تھے۔ جب وہ یو کے اپنی امی اور بہن سے ملنے آئی تو ابا جی نے کہا اسے وہیں جا کر مل کر آئیں۔ میری ایک پوسٹ ملاحظہ کیجیے:

پچیس برس پہلے جب ہم مشاعرے ''لڑتے'' اور مباحثے ''کھیلا'' کرتے تھے۔ دنیا کتنی خوبصورت تھی۔ تمھاری نظم میرا اعزاز ہے۔

رتبہ!!!

اسے کم زور مت سمجھو

وہ بے چاری نہیں ہے

اسے تقدیر کی گردش نے جب گردش میں ڈالا ہے

ہر اک مشکل کو سر کر کے

خود اپنے پاؤں پہ چل کے

ہر اک طوفاں سے نکلی ہے

وہ غم کے ساحلوں سے سیپیاں چنتی ہے خوشیوں کی

وہ دکھ کے بادلوں میں سائباں بن کے ابھرتی ہے

اسے کمزور مت سمجھو

وہ بے چاری نہیں ہے

دکھاؤ مت اسے تم خواب جنت کی بہاروں کے

ڈراؤ مت اسے تم ذکر کر کر کے جہنم کا

اسے خود خالقِ تقدیر نے تخلیق کے فن سے نوازا ہے

وہ دامن میں لیے پھرتی ہے اس دنیا کی قسمت کو

وہ اپنے نرم آنچل میں پناہ دیتی ہے نسلوں کو

اسے کمزور مت سمجھو

وہ بے چاری نہیں ہے

یہ گزرے کل کی باتیں ہیں کہ جب رسموں رواجوں کے
بھیانک ناگ اس کو خوں رلاتے تھے
یہ گزرے کل کی باتیں ہیں کہ جب کردار پہ تہمت لگا کے
تم اسے اس کی نگاہوں سے گراتے تھے
یہ گزرے کل کی باتیں ہیں کہ سمجھوتے کی چادر میں لپیٹی کاٹھ کی پتلی سمجھ کے
تم اسے اپنے اشاروں پہ نچاتے تھے
یہ گزرے کل کی باتیں ہیں
وہ اپنے عزم وہمت سے
اب اپنی راہ میں حائل انا کے بت گرا دے گی
وہ بے نام ونشاں رستوں کو سنگِ میل کر دے گی
اسے کمزور مت سمجھو
وہ بے چاری نہیں ہے
(ثمینہ تبسم)

جب ثمینہ کی پہلی کتاب شائع ہوئی تو اس نے کتاب کا فلیپ لکھنے کا اعزاز مجھے دیا۔
''نیا چاند'' اس شام میں مسلسل سر درد سے بستر میں گھسی ہوئی تھی، اچانک ثمینہ کا فون آیا،
''صدف میری کتاب پر تمھارا فلیپ ہونا چاہیے۔''
ہزار میں نے تاویلیں دیں، ''بی بی کسی بڑے نام سے ''لگھی'' ڈلوا لو، میں کس شمار قطار میں۔''
''فضول نہ ہانکو، بس ابھی اٹھو۔''
اب میں کہتے کہتے رہ گئی کہ میں ایک دفعہ حماقت کر چکی ہوں، ایک خواہ مخواہ کا سطحی دیباچہ لکھ کر۔ اب مجھے افاقہ بھی ہے اور عقل بھی آ گئی ہے۔ لیکن اس نے ایک نہ سن کر دی۔ جب کہ میری پوری دیانتدارانہ رائے میں ادبی کاروبار میں میرا فلیپ لکھنا خسارے کا سودا ہے۔ خاتون نہ مانیں، اس سے پہلے کہ میں وہ الفاظ پیش کروں میں ثمینہ کے ساتھ وابستہ وہ گزرے ماہ وسال کی لڑیاں گن لوں۔
ثمینہ کی کتاب میں شامل کئی نظموں نے دیر تک آنکھوں میں دھواں بھرے رکھا۔ دیر

تک مجھے کالج کی وہ مہذب اور بے حد محتاط لہجے والی لڑکی یاد آتی رہی جو مباحثہ بھی مہذب انداز میں لڑتی جب کہ میرا لہجہ کبھی دھیما یا مصلحت کوش نہ ہوتا۔ مخالفین کے اعتراضات کے جواب سے لے کر دلائل تک میں ذاتی جنگ کی طرح لڑتی، ''پتہ نہیں تجھ میں اتنا پارہ کیوں بھرا ہے؟'' ثمینہ اپنے پرسکون انداز میں چڑ کر پوچھتی۔ ''بس ایسی ہی ہوں میں۔''

''اس کے باپ اور بابوں نے بگاڑا ہے اسے۔'' امی جی ثمینہ کی تائید کرتیں۔ پھر اس کے ہاتھ کے آرٹ بھرے ملبوسات کی داد دیتیں، ''اک توں اے، سوئی چ تاکا پانڑا نئیں آوندا۔'' وہ سیدھے سبھاؤ سنا دیتیں۔ ''میں نے ایک دنیا کو سلائی سکھائی۔ تو نے کچھ سیکھ کر نہ دیا۔''

میرا جی چاہتا کہ پوچھوں امی جی اس نے سوئی میں دھاگہ ڈال کر کون سا کمال کر لیا ہے۔ ان پر بس نہ چلتا تو ثمینہ پر چڑھ دوڑتی،

''اے سلیقہ بیگم، قرینہ خاتون، حمیدہ بانو، تم ادھر مت آنا۔ میں تمھیں وہیں آ کر مل لیا کروں گی۔''

پھر واہ کینٹ سے تقریبات کا بلاوا آیا، اور حسبِ معمول میرے ترلے شروع ہو گئے۔

''امی جی بس تین نئے سوٹ بنا دیں، قسمے، صرف تین، پھر کبھی نہیں کہوں گی۔''

''یہ کون سی تیاری میں شامل ہے''، تایا جان عینک کے اوپر سے گھورتے۔

''پہلے اپنا تلفظ ٹھیک کرو تم، جوڑوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا بی بی، سر کے اندر کچھ ہونا چاہیے۔''

واہ کالج میں گزارے دن ہماری زندگی کے یادگار دن ہیں۔ وہاں پشاور کالج کی زیب سسٹرز بھی تھیں جن سے ہم دونوں کی دوستی ہو گئی۔ میں ان کے پختونی لہجے کی نقل اتارتی۔

جہاں میں اہلِ ایماں سوورت خورشید جیتے ہیں
اِدر دوبے۔۔ ادر نکلے۔۔۔ ادر دوبے۔۔ اِی در نکلے

''کچھ شرم کرو صدف''، ثمینہ کی سرگوشی انھیں بھی سنائی دیتی۔ اور دونوں بہنیں خوب ہنستیں۔

''بھئی ہم نے زلفِ بنگال تو سنی تھی۔ زلفِ جہلم اب ''دیکی'' ہے۔ وہ میری لمبی چٹیا کو تقریباً کھینچ کر دیکھتی۔ پھر ہم نے طویل عرصہ خط کتابت کی۔ اور آخر زندگی نے ہمیں دھندلکے میں لپیٹ لیا، لیکن ان سے ملنے کی حسرت آج بھی دل میں کہیں کسمساتی رہتی ہے۔

وہاں میں نے پہلی دفعہ کالی ساڑھی پہنے کشور ناہید کو دیکھا۔ وہ کالج کی پرنسپل کی رشتے دار بھی تھیں، اور جہاں تک مجھے یاد ہے انھوں نے مجھے داد بھی دی تھی۔

جب مجھے انعام کے لیے سٹیج پر بلایا گیا اور میں نیچے اتری تو دوسرے کالجز کی طالبات کی مبارک باد لیتے ہوئے ثمینہ کی آنکھیں بھیگی ہوئیں تھیں، حسبِ عادت مجھ سے رہا نہ گیا۔

''اے ملکۂ جذبات، شمیم آرا بیگم، معاف کر دے، تو جیسے کنیا دان کی تیاری کرتی ماں کے ٹسوے نہ بہا'' اور جواب میں ہمیشہ کی طرح مجھے جھاڑ پڑتی۔

جس دن ثمینہ کو آنا ہوتا، امی ابا جی کی خوشی دیدنی ہوتی۔ ابا جی سب چھوڑ کر اپنی کتابیں لے کر آ جاتے، اور مجھے ان کے ساتھ راز دار دوستوں کی طرح باتیں کرتے دیکھ کر ثمینہ ہمیشہ کہتی، ''تم بہت خوش قسمت ہو، باوجود اس کے کہ تم بہت بدتمیز ہو۔''

ظاہر ہے کہاں ثمینہ کا ریشم کے گچھے جیسا نرم و گداز لہجہ کہاں میرا بھائیوں کے ساتھ رہ رہ کر ان ہی کی طرح دوٹوک اور سیدھے سبھاؤ آر پار کرتا انداز۔ امی جی بڑے اہتمام سے کھانا پکاتیں۔ پھر اس کے اچھی بچیوں والے اطوار دیکھ دیکھ کر کہتیں، ''پتہ نہیں کن خوش نصیبوں کے گھر جائے گی''، میری طرف سے تو ظاہر ہے ان کو اندیشہ ہائے دور و دراز تھے۔

سوئی میں دھاگہ ڈالنا نہ آنے سے انڈہ نہ ابالنے تک کی خامیاں، اور نری ٹرٹر سے بلاوجہ کھی کھی تک کی بدعادات۔ جب کہ ثمینہ تو ایسی خیر النساء بیگم تھی اور ارجمند آرا، تہذیب خانم وغیرہ۔

لوگوں کو ہماری دوستی پر ہمیشہ حیرت بھی ہوتی، اور ہنسی بھی آتی، ابا جی کہتے...

''میری دونوں بیٹیاں شعلہ و شبنم۔''

جہلم جہلم تو بہتا جا
ہر قرن کہانی لہروں کی
چپکے چپکے ہی کہتا جا
سب سہتا جا...تو بہتا جا
جہلم جہلم

تیرے پانی کے ہر قطرے میں
خوابیدہ کئی ستارے ہیں
تیری مٹی کے ہر ذرے میں

پوشیدہ لاکھ انگارے ہیں
جہلم جہلم، تو بہتا جا

تیرے باسی دیس کے رکھوالے
تیرے ٹھنڈے میٹھے پانی کی
تاثیر سے شاعر متوالے
جہلم جہلم تو بہتا جا

ہر قرات کہانی لہروں کی
چپکے چپکے ہی کہتا جا
سب سہتا جا... تو بہتا جا
جہلم جہلم

بار آور تیرے بطن میں ہیں
مدفون خزائن کے ڈیرے
اکناف ترے کے کنگروں پر
خورشید لگاتا ہے پھیرے
نور افشاں تیرا اجیارا
عطر آگیں تیرے اندھیرے

یہ گاتی ہوئی لہریں تیری
شاہوں کے جلال کی شاہد ہیں
راجوں اور مہاراجوں کے
ہر فن وکمال کی شاہد ہیں
دارا کو جو روند کے آیا تھا
یہ اس کے زوال کی شاید ہیں

جہلم جہلم تو بہتا جا
سب سہتا جا... بس بہتا جا
جہلم جہلم.........

خوابیدہ تری امواج پہ جب
بوسوں کی کریں بارش کرنیں
اور شام ڈھلے تھپکی دے کر
خوابوں کی دھریں آتش کرنیں
تو نور کا دھارا بنتا ہے
شرمیلی شفق کی لالی سے
جنت کا کنارہ بنتا ہے
جہلم جہلم تو بہتا جا
سب سہتا جا... بس بہتا جا

تو ایک مطیع دلدار سا بھی
ہنستا گاتا غمخوار سا بھی
ترا غیظ و غضب دکھلاتا ہے
قہار سا تو جبار سا بھی

تیرے زرخیز کناروں پر
کئی صدیاں سانسیں لیتی ہیں
کئی گھوڑے ہاتھی جھولتے ہیں
کئی نسلیں دعائیں دیتی ہیں
ان لفظوں میں تو رہتا جا

••

بادشاہ تو نہیں، بادشاہ گر ہیں ہم

میرے سر پر تنے سائبانوں کے سر پر بھی اک سائبان تھا جیسے ہفت افلاک کہ ایک کے بعد ایک پرت کھلتی چلی جائے۔

بابا جان کو شعور کی آنکھ کھولتے ہی اپنے گھر میں ایسے ہی خاموش حکمران کی صورت پایا۔ ایک معلم، مدرس، اتالیق، ہر لفظ اپنے مترادفات کے ساتھ باباجان کے تدریسی انداز کے سامنے دست بستہ منتظر رہتا۔

ان کا اوڑھنا بچھونا، شب و روز صرف علم کی ترسیل کے لیے تھے۔ شاعری ان کا واحد شوق جس پر وہ خود ہی سر دھنتے کسی اور دنیا کے باسی معلوم ہوتے۔ یہ ہمارے بڑے تایا جان تھے جن کو سارا خاندان بابا جان کہا کرتا تھا۔

تہذیبی شعور کتابوں اور فلسفہ پڑھنے پڑھانے سے کبھی نہیں آتا۔ تہذیب گھر کی فضا میں رچی ہوتی ہے جو سانسوں کے ساتھ زندہ رہنے کے انداز میں سما جاتی ہے۔ آپ اس انداز سے ہزار گریز اور فرار کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر پاتے۔ کہیں لاشعور سے وہی انداز نمودار ہو کر آپ کی شخصیت کا جزو بن جاتے ہیں۔ مجھے کبھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ اچھے بھلے بیٹھے باتیں کرتے ابا جی، بابا جان یا تایا جان کے آتے ہی اٹھ کر کیوں کھڑے ہوجاتے ہیں۔ جب تک بابا جان نہ بیٹھتے، ابا جی بھی کھڑے ہی رہتے۔ ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا کہ یہاں اور کرسیاں بھی تو پڑی ہیں۔ بابا جان بھی بیٹھ جائیں گے۔ آپ کیوں کھڑے ہوتے ہیں؟

''لالہ جی بڑے ہیں بیٹا'' ابا جی سوالوں سے کبھی تنگ نہیں آتے تھے۔ ''میں ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہوتا ہوں۔ بڑے بھائی باپ کی جگہ ہوتے ہیں۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں ان کی

عنایات سے ہوں۔ آپ لوگ جو بھی بن جائیں، یہ آپ کی شناخت رہیں گے۔'' پتہ نہیں، مجھے خود بھی اس کا شعور نہیں ہے کہ کب گھر میں سب ان کی آمد پر اٹھ کر کھڑے ہونے لگے۔

میں بابا جان کے ساتھ جب سوال و جواب کا سلسلہ کرتی تو ابا جی مسکراتے جاتے اور کہتے، ''لڑکی ہماری جرات آج تک نہ ہوئی کہ ان سے اونچی آواز میں بات کرسکیں۔ تم کھڑے کھڑے کیسے کہہ دیتی ہو، کہ یہ نہیں پڑھوں گی، وہ نہیں بنوں گی، دنیا میں کیا صرف ڈاکٹر ہی ایک پیشہ ہوتا ہے۔ حساب نہیں پڑھوں گی۔''

بابا جان کی عادت تھی کہ وہ ابا جی کی طرح کھلکھلا کر نہیں ہنستے تھے۔ بس خفیف سا مسکرا دیتے۔ میری اس انکار کرنے جسارت پر کبھی ناراض نہ ہوتے، ہلکے سے مسکرا کر کہنے لگے، ''کرنے دو انحراف، اس بھوتنی کی یہی عادت اسے کبھی ممتاز کرے گی۔ ہم نہ ہوں گے یہ دیکھنے کے لیے۔''

پھر وہ چلے گئے اور جب کبھی تعلیمی مدارج میں کامیابی ملتی، ابا جی ان کی بات یاد کرتے۔ امی جی فوراً بولتیں، ''کسی زعم میں نہ رہنا، بابا جان کی محنت اور دعا کا سایہ ہے تم پر، اور بس۔''

••

بابا جان کا اردو پڑھانے کا انداز ہر روز بدل جاتا۔ ایک دن ہمیں زیرِ اضافت پڑھانے لگے۔ انھوں نے میرے تایا زاد بھائی کی کاپی پر لکھا ''اسپِ عرفان''، پھر اس کی وضاحت کرنے لگے: یہ جو ''پ'' کے نیچے زیر ہے، اسے زیرِ اضافت کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے ''کا، کے، کی۔'' اردو میں اس کا مطلب ہوگا ''عرفان کا گھوڑا۔'' فارسی میں پہلے مفعول آتا ہے پھر فاعل، لیکن اردو میں پہلے فاعل آتا ہے پھر زیرِ اضافت یعنی ''کا، کو، یا پھر کی'' لگتا ہے اور پھر مفعول۔'' بابا جان نے انتہائی انہماک سے دونوں جملوں کے فاعل کے نیچے لکیر کھینچی۔

''ہائیں'' مجھے زیرِ اضافت اور قواعد و انشا بھول گئے؟ اسپِ عرفان، میرے تصور میں ہنہناتا ہوا گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگا۔ میں نے کتاب الٹ دی، ''نہیں بابا جان، اسپِ عرفان نہیں ہوسکتا۔ میرے نام کے ساتھ زیرِ اضافت بنائیں۔'' میرے فوری مطالبے کے جواب میں بولے، یہ دیکھو ''کتابِ دختر'' اور ''صندلیِ تو''، یعنی تمھاری کرسی بھی۔'' انھوں نے یقیناً خوفِ فسادِ خلق کے پیشِ نظر ایک محتاط سا جملہ بتانے کی کوشش کی۔

''نہیں۔ کتاب نہیں، میں نہیں لیتی کتاب وتاب، کرسی ورسی'' میں نے جملہ مسترد کر دیا۔

''اب کاغذ پر لکھا جا چکا ہے ' اسپِ عرفان' اس نے بھی کتاب رکھ دی، اب یہ ایسے ہی

رہے گا۔ بابا جان نے لکھ دیا اب گھوڑا میرا ہے۔''

''نہیں، بابا جان فارسی میں کیسے لکھتے ہیں؟ وہ اپنے گھوڑے پر اپنی کتاب سمیت سفر کر رہی تھی'' میں نے نیا جملہ بنا کر پیش کیا۔

بابا جان کو اندازہ ہوگیا کہ اب نقضِ امن کا اندیشہ ہے اور مذاکرات ناکام ہوں گے۔ فوری حکم ہوا ''چپ کر کے بیٹھ جاؤ ادھر تم دونوں۔ اور سب لوگوں کے نام کے ساتھ زیرِ اضافت بناؤ۔ میدانِ جنگ، مخلوقِ خدا، زیرِ نگرانی۔ سب کے نیچے زیر لگا کر دکھاؤ۔''

••

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر کبھی شبنم کبھی آنسو ہوا

بابا جان اس شعر کو وظیفے کی طرح دوہراتے اور مجھے کبھی سمجھ نہ آتی کہ اس میں ایسی کیا بات پوشیدہ ہے؟ بظاہر بیکار سے تین قطرے گوہر، شبنم اور آنسو۔ لیکن بہت دیر بعد مجھے بھی زندگی نے یہ شعر دوہرانا سکھا دیا۔ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو۔ بابا جان نے کورس کی کتاب کبھی نہیں پڑھائی۔ بس ہر روز ایک نیا موضوع اور اس پر پورا لیکچر تیار ہوتا۔ آخر میں اقبال کا کوئی نہ کوئی شعر ضرور سیکھنا ہوتا۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے، لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

میں لہک لہک کر پڑھتی جب کہ پلے ایک لفظ بھی نہ پڑتا اور نہ ہی کسی لفظ کا مطلب آتا لیکن زبانی اشعار آتے گئے اور اس کی افادیت مجھے کالج کی زندگی میں معلوم ہوئی۔ بابا جان جب کتاب کا سبق سنا چکتے تو بھی ان کا دل چھٹی دینے کو نہ چاہتا۔ بابا جان ہمیں نیچے باغیچے میں لے جاتے۔ اپنے نفاست سے تراشے ہوئے ناخنوں والے ہاتھ سے ایک پتہ توڑ کر میری ہتھیلی پر رکھتے،

''یہ دیکھو، یہ پتہ اس درخت کے بدن کا حصہ تھا۔ درخت بھی ہماری طرح جاندار ہیں۔ حواس رکھتے ہیں، بس ان کے اعصاب نہیں ہوتے اور یہ انسانوں کی طرح بھاگ دوڑ نہیں کر سکتے، لیکن صدیوں تک زندہ رہ سکتے ہیں، چھاؤں بانٹتے ہیں اور چیر دیے جانے کے بعد بھی نفع دیتے ہیں۔''

کبھی کبھار مجھے ایسے لگتا تھا کہ بابا جان ان درختوں، پھولوں اور پودوں سے ہمکلام ہونے کی قدرت رکھتے ہیں۔ یہ بات ان سب بھائیوں میں مشترک تھی۔ پھول، پودے، درخت، نباتات اور جڑی بوٹیاں۔ شاید حکمت سے تعلق ہونے کی وجہ سے ان کی غیر معمولی دلچسپی ہر چیز پر غالب رہتی۔ بابا جان اپنا پسندیدہ سعدی شیرازی کا ایک شعر سناتے جاتے ۔

برگِ درختانِ سبز از نظر ہوشیار
ہر ورقش دفتری است معرفتِ کردگار

(صاحبِ عقل و دانش کے سامنے سبز درختوں کا ایک ایک پتہ کردگار کی معرفت کے لیے ایک بڑی کتاب ہے)۔

باغیچے میں کیلے اور پپیتے کے درخت تھے۔ بابا جان کی محبوب جگہ یہی تھی، ''یہ دیکھو پپیتے میں نر اور مادہ درخت ہوتے ہیں۔'' میں بھاگنے کے بہانے تلاشتی، ''بابا جان کل نہ پڑھ لیں، مذکر اور مونث؟'' لیکن ان تک شاید میری آواز نہیں پہنچتی تھی یا شاید وہ کسی اور دنیا میں ہوتے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیاں بابا جان کی لگائی گئی کلاس کی وجہ سے غارت ہو جاتیں۔ یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی کہ ہم نے پھول پتے درخت اور ان کی کھاد میں رینگتے کیڑوں تک کا مشاہدہ کیوں کرنا ہے؟

''یہ جو کیڑے ہیں، انھیں بے مصرف نہ سمجھو۔ یہ زندگی کے دائرے بناتے ہیں۔ مرنے کے بعد انسانوں کو کھاتے ہیں۔ ایسا کرو ایک کہانی لکھو ان پودوں اور کیڑوں پر۔''

میرا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا لیکن بابا جان کی گھرکیوں سے بچنے کے لیے کھانس کھانس کر ہنسی کو روکا۔ میں نے فی البدیہہ شعر کہہ ڈالا ۔

زندگی کا دائرہ بناتے ہیں
یہ کیڑے جو انسان تک کو کھاتے ہیں

لو بھلا کوئی پھولوں کے رنگ اور خوشبو پر تو کچھ لکھے، اب کیڑوں مکوڑوں پر کہانیاں اور شعر کون کہتا ہے؟ بابا جان مجھے اس کا جواب بھی شعر میں دیتے۔

ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا کوئی چھوٹا یہ اس کی حکمت ہے

گھر آ کر امی کو بتایا، پھر شعر سنایا اور بابا جان کی تدریس کے خلاف باتیں کرنے لگی، ''امی جی! بابا جان کا بس چلے تو وہیں بیٹھے کیڑوں سے باتیں کرتے رہیں۔ پودوں اور پھولوں سے

کہانیاں سنتے رہیں۔'' امی جو ان کی لاڈلی تھیں اور بغور ان کی باتیں سنا کرتی تھیں، مجھ پر چڑھ دوڑتیں، ''تم ناقدرے ناشکرے لوگ ہو۔ دنیا اتنی دور سے ان کے پاس علم حاصل کرنے آتی ہے اور تم لوگوں کے سامنے دریا بہتا ہے مگر قدر نہیں۔ بے شرمو۔''

چھٹی جماعت میں تھی تو بابا جان نے ریشم کا کیڑا اور شہتوت کے درخت کا سبق شروع کیا۔

''توت کا درخت دیکھا ہے کبھی؟'' اس دن سب بھائی لوگ بھی شامل تھے۔ میرے علاوہ یہ بہشتی درخت سب نے دیکھ رکھا تھا۔

''پہلے مجھے درخت دکھائیں'' میں نے حسبِ عادت ضد شروع کر دی۔

''اسے لے جاؤ۔ شمس آباد کے راستے میں دائیں ہاتھ پر بڑا درخت ہے توت کا۔ اور ہاں پتے توڑ لانا تھوڑے سے'' بابا جان نے میرے چچا زاد بھائی کو حکم دیا۔

''بابا جان کیڑے بھی ہوں گے اس پر؟'' مجھے تشویش ہوئی۔

''تمھیں نہیں کھائیں گے۔ اللہ کی شان ہے۔ سارا دن باندری بنی درختوں اور دیواروں پر پھاندتی پھرتی ہے، اب فکر لاحق ہوگئی کہ کیڑے ہوں گے۔ جاؤ بھئی دکھا لاؤ اسے۔''

بھائی بڑبڑاتا ہوا اٹھا۔ سیڑھیوں سے نیچے آتے ہی ہماری جنگ شروع ہوگئی، ''درخت دیکھنا ضروری تھا؟ آرام سے نہ بیٹھا کرتو۔''

''بتاؤں جا کر بابا جان کو؟'' میں نے دھمکی دی۔ دس پندرہ منٹ کے راستے پر درخت تھا، لبِ سڑک ذرا سی اونچائی پر۔ شام ڈھل رہی تھی اور درخت کے پتے سنہری سے ہو رہے تھے۔ سورج کا نارنجی گولہ جیسے ایک ہی جگہ پر ساکت کھڑا تھا۔ چڑیوں کا چہچہا اور عقب میں کسی چیز کا کھیت تھا۔

''میں درخت پر چڑھ کر دیکھ لوں؟'' میں نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

کیونکہ اس کے تیور ایسے ہی تھے جیسے واہگہ یا بہاول نگر ہیڈ سلیمانکی بارڈر پر پاکستان اور ہندوستان کے دو حریف فوجی آمنے سامنے کھڑے ہوں۔

''درخت دیکھو، پتے لو اور گھر چلو'' اس نے حکمیہ انداز میں کہا جو مجھے چڑانے کے لیے کافی تھا۔ میں نے سفارتی حکمتِ عملی لپیٹ کر وہیں لبِ سڑک رکھی، ''کرلو جو کر سکتے ہو'' اور میں نہ صرف درخت پر چڑھی بلکہ سبز سبز کیڑوں جیسے توت بھی توڑے، پتے توڑے، البتہ ریشم کے تھان مجھے دکھائی نہیں دیے۔

••

''کوئی انگریزی ٹھیک نہ پڑھے تو مجھے افسوس نہیں ہوتا لیکن جب کوئی غلط اردو بولتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے اسے الٹا لٹکا دوں۔'' بابا جان غصے سے نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے لیکن میں تو صرف الٹا لٹکنے کے امکانات اور اس کے ایڈونچر میں الجھ گئی تھی۔ کیسا لگے گا اگر انسان یہاں بابا جان کے ''حجرے'' کے پاس ہی الٹا لٹکا ہو؟ یہ ساری کتابوں کی دیواریں جن میں حکمت، فلسفہ، مذہب، فارسی، شاعری اور نجانے کون کون سی کتابیں، جن کے نام بھی میں صحیح طرح سے نہیں پڑھ سکتی اور یہ لمبے لمبے صفحات جن پر لکھ لکھ کر اور پرزوں کی صورت میں کاٹ کاٹ کر بابا جان نجانے کوئی جادوئی، جناتی یا سفلی علوم کے نقشے بناتے تھے۔ یہ سب کچھ اگر ہوا میں الٹا معلق ہو تو کچھ بھی پڑھنے کے قابل نہ رہے۔

یا پھر اگر بندہ لان میں الٹا لٹکا ہو تو سارے نایاب قسم کے محبوب پودے الٹے ہو کر کیا سماں پیش کریں گے؟ بابا جان کا وہ فوارہ جو پاگلوں کی طرح چک پھیریاں کھا کھا کر کلیاں کرتا پھرتا تھا اور جس کی خوبصورتی کے قصیدے بابا جان پڑھا کرتے اور اسے عجیب وغریب قسم کی تشبیہات دیا کرتے تھے، کیسا نظر آئے گا؟ سب سے بڑھ کر یہ صاف شفاف نیلا آسمان گھومتا ہوا کیسا دکھائی دے گا؟ اور پھر یہ اڑتے پرندے، کسی رقاصہ کی سی نزاکت سے ہوا کے سینے پر ڈولتی پتنگیں کیسی لگیں گی؟ کبھی کبھار یہ جو کوئی جہاز بھولے بھٹکے سے سر پر سے گزر جاتا ہے، کیسا لگتا ہوگا، اور سب سے بڑھ کر خود بابا جان اپنی کیسری رنگ کی پھولوں والی بیل کے پہلو میں الٹے بیٹھے کیسے لگیں گے؟ یہ تصور کرتے ہی مجھے ہنسی آ گئی۔

''دانت کیوں نکال رہی ہو؟'' بابا جان نے کڑک کر پوچھا۔

جان کی امان پانے کے وعدے پر ہم نے مناسب الفاظ کے پیرہن میں سارے خیالات بیان کر دیے۔ خفیف سی کھانسی، جیسے کوئی ہنسی روکنے کی کوشش کرے، پھر حسبِ معمول بولے، ''بھتنی کہیں کی، جاؤ بھاگ جاؤ۔ چائے لے کر واپس آ جانا۔''

••

بابا جان کو محاورات پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ وہ بیٹھے کوئی بات کر رہے تھے کہ امی جی نے کہا ''افراتفری مچ گئی۔'' کہنے لگے کہ آپ کو پتہ ہے کہ افراتفری ہوتا کیا ہے؟ میرے ذہن میں جو آیا میں نے کہہ دیا، ''بابا جان جیسے تفریح ہوتی ہے سکول میں۔'' ''اچھا تم لوگ بتاؤ'' وہ باقیوں سے سوال پوچھنے لگے۔ الٹے سیدھے جوابات سننے کے بعد کہنے لگے، ''یہ دو الفاظ افراط اور تفریط سے نکلا ہے یعنی کمی یا زیادتی ہونا، توازن نہ رہنا، اعتدال کے بغیر ترازو کی طرح جھولنا۔'' اس کے

بعد کتنے ہی محاورات کا پس منظر بتایا۔ کہنے لگے کہ زبان اور محاورات خواتین کا ورثہ ہے اسی لیے مادری زبان کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ پنجابی میں اکثر خواتین کسی مشکل کام کو بیان کرنے کے لیے 'جفر جالنا' کہتی ہیں جس کا پس منظر جعفر کے نام کے دیے جلا کر منت ماننا یا پھر خضر کے نام کے دیے روشن کرنا ہے۔

امی کے محاوروں سے میری ہمیشہ جان جلا کرتی لیکن ابا جی بھی اپنے لالہ جی کی تائید میں کہا کرتے کہ زبان تو زندہ ہی عورتوں کے دم سے ہے، وہی استعمال کرتی ہیں تو زبان رواں رہتی ہے۔ اس کی توجیہہ کرتے ہوئے کہتے دراصل عورتوں نے طعنے بہت مارنے ہوتے ہیں، لڑائیاں جھگڑے اور طعنوں کی صورت میں وہ زبان کا استعمال اور محاورات کا استعمال خوب کرتی ہیں تاکہ مخالفین کا کلیجہ جلایا جاسکے۔ اردو اور پنجابی میں شاید اسی لیے ہر رشتے کے الگ نام ہیں تاکہ طعنہ درست شخص کو جا کر لگے، غلط فہمی کا امکان نہ رہے۔

••

بابا جان کو بھائی جان رضوان سے تو خیر انسیت ہوگی لیکن ان کو باجی خالدہ سے بہت محبت تھی۔ اکثر مجھے انگریزی کی کتاب دے کر نیچے بھیجتے، جاؤ، باجی سے پڑھ کر آؤ۔ وہ ان کی تعلیم و تربیت کے بھی بہت مداح تھے۔ ایک دن امی جی سے باتیں کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ''خالدہ کا رشتہ ہم نے سفر کاٹ کاٹ کر لیا ہوا ہے۔ بہت ہی بیبی بچی ہے۔ اس کا خیال رکھا کریں۔'' ان دنوں لاہور جانے والی ٹریفک اور صبح جا کر شام کو واپسی ہو جاتی ہے۔ بابا جان باجی خالدہ سے بہت شفقت سے پیش آتے۔

''ایم اے، بی ایڈ کر کے، اتنے بڑے شہر سے اور اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہمارے گھر آ کر ایسے رچ بس گئی جیسے یہیں کی جم پل ہو۔'' بابا جان کہتے اور امی جی تائید کیا کرتیں۔ وہ خود بھی باجی خالدہ کی والدہ کے حسنِ اخلاق اور انکسار سے بہت متاثر تھیں اور اکثر اس کا تذکرہ کرتیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب بھی وہ لاہور سے باجی خالدہ کو ملنے آتیں تو دوپہر کو آرام کرنے کے بعد ہمارے گھر ضرور آتیں۔ امی جی ہمیشہ سنایا کرتی تھیں کہ خالدہ کی والدہ بتاتی تھیں کہ خالدہ بھی اپنے چچا کے بچوں کے ساتھ ایسے ہی پلی بڑھی ہے۔ خاندان جب آپس میں محبت سے جڑ کر رہتے ہیں تو ان کی عزت بڑھتی ہے۔

بابا جان نے ابا جی کی طرح کبھی کھل کر تو خواتین کی تعلیم و تربیت کے بارے میں افکار ظاہر نہیں کیے تھے یا شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ میرے سکول کے زمانے میں ہی دنیا سے

رخصت ہوگئے اور مجھے غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا لیکن وہ تعلیمِ نسواں کے علمبردار تھے اور امی جی کو فارسی پڑھانے کی بھی کوشش کرتے رہتے۔ جب باجی حفیظہ کی شادی ہوئی اور وہ گھر آئیں تو مجھے کہتے اب تم انگریزی حفیظہ سے پڑھا کرو بلکہ اس سے کہو کہ تمھیں انگریزی بول چال سکھائے۔ مجھے بعض اوقات بہت کوفت ہوتی۔ ایسے لگتا کہ بابا جان کا کام صرف یہ ہے کہ جو ان کے پاس پھٹکے وہ اسے کتاب پڑھنے کو دیں۔

امی جی نے بابا جان کی دی ہوئی بے شمار اردو کتب کا مطالعہ کر رکھا تھا اور وہ اکثر بابا جان کے پاس بیٹھتیں۔ان کے آخری ایام میں امی جی ہر روز ان کے پاس جاتیں۔ میں نے ابا جی سے زیادہ امی جی کو بابا جان کے پاس جاتے اور ان کے علم وفضل سے مستفید ہوتے دیکھا۔ امی جی کو بابا جان اور تایا جان ہمیشہ ''چنّاں'' کہہ کر بلاتے کیونکہ ہمارے دادی دادا انھیں ایسے پکارا کرتے تھے۔ بابا جان نے کبھی امی جی کا نام نہیں لیا، اپنی بیٹیوں کی طرح ان سے شفقت کرتے۔

چونکہ ہمارے دادی دادا جان کے آخری دن امی جی کے ساتھ گزرے اور امی جی کو ہی یہ سعادت حاصل ہوئی کہ وہ ان کی خدمت کرسکیں اور آخری لمحات میں ان کے قریب ہوں، شاید اس وجہ سے سب بھائی امی جی سے بہت پیار کرتے۔ چچا جان شریف تو باقاعدہ احسان مندی کا اظہار کیا کرتے تھے۔

بابا جان بھی امی جی کے پاس بیٹھ کر تذکرہ کیا کرتے، ''چنّاں توں جنت کما لئی اے۔'' مجھے بابا جان ہی سے علم ہوا کہ ہمارے دادا جان ہماری نانی اماں کے تایا زاد بھائی تھے کیونکہ میں بابا جان سے پوچھتی کہ آپ میری نانی اماں کو بہن کیوں کہتے ہیں۔ بابا جان ہمارے نانا جان کے علم و فضل کے معترف تھے۔

امی جی اس معاملے میں بہت خوش نصیب تھیں کہ ان کی بے پناہ تکریم کی گئی۔ خاندان کو جوڑ کر رکھنے کی صلاحیتوں کو سراہا گیا۔ میں کالج جاتی تھی جب تائی جان طویل علالت کے بعد وفات پا گئیں۔ ان کے بعد امی جی کو ہمیشہ سب نے خاندان کا بزرگ سمجھا۔

••

رات کو بجلی بند ہوگئی۔ آسمان روشن ہوگیا۔ لوگوں کو بجلی بند ہونے سے کوفت ہوتی لیکن مجھے ایک عجیب طرح کے سکون کا احساس ہوتا۔ زمین کی بڑبڑاتی آوازیں خاموش ہوجاتیں اور آسمان کے جھلملاتے ستاروں کی دنیا بولنے لگتی۔ رنگ برنگے درختوں اور پھولوں کی ملی جلی خوشبو تیز تر

ہو جاتی۔ بعض اوقات مجھے لگتا کہ بابا جان ہر خوشبو کو ایک دوسرے سے الگ کر کے پہچان سکتے ہیں۔ یہ رات کی رانی ہے، یہ موگرہ ہے، کیلے کے درختوں کی جھنڈ کی اپنی مہک ہوتی ہے اور امرود کے درخت سے ایک مخصوص خوشبو کی لپٹ اٹھتی ہے۔ پانی کو چھو کر آنے والی ہوا میں تازگی کے ساتھ ایک خاص بو ہوتی ہے۔ جب تازہ گھاس کاٹی جاتی ہے تو اس سے ایک الگ ہی مہک اٹھتی ہے۔ گاؤں کے درختوں سے شام کو ایک مخصوص باس اٹھتی ہے۔ ایسی ہی ایک جھلملاتی رات کو بابا جان نے ہمیں چھت پر بلا لیا اور شعر پڑھا اور پھر اس کا مطلب پوچھا:

نہ بڑھائیو انگور کے نرخ
کہ یوں نقصان میخانے کا ہوگا
مگس کو باغ میں جانے نہ دیجو
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

ظاہر ہے ہم میں سے کسی کو بھی نہ آیا۔ تایا جان نے مفہوم کا سراغ دینے کے لیے لفظ، ''مگس'' کا مطلب بھی بتایا۔ اب شہد کی مکھی باغ میں جا کر پروانوں کو کھائے گی؟ شہد کی مکھی پھولوں سے رس چرا کر لے جاتی ہے پھر اس کا شہد بناتی ہے۔ اب شہد کا پروانوں کے مرنے سے کیا تعلق۔ پہلے تو بابا جان نے شعر سمجھایا، پھر بولے کہ کل میں آپ کو شہد کے چھتے کا موم منگوا کر دکھاؤں گا۔ پھر شہد کا خالی چھتہ آیا۔ اسے ایک بڑی طشتری میں بابا جان نے اپنے سامنے یوں رکھا جیسے یہ براہِ راست آسمان سے نازل ہوا ہو۔ اس میں بنے چھوٹے چھوٹے گھر دکھائے گئے۔ پھر شہد کی مکھیوں کے سماجی طبقات کا تذکرہ ہوا۔ ملکہ مکھی سے کارکن مکھی تک کے فرائض بتائے گئے۔ ان میں ایک نکھٹو مکھی بھی ہوتی ہے۔ عرفان بھائی نے ہنسی دباتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''لیکن وہ نَر مکھی ہوتی ہے اور چھتے کی ساری غذا کا بیشتر حصہ کھا جاتی ہے'' بابا جان نے واضح کیا۔ اب کھلکھلا کر ہنسنے کی باری میری تھی۔

''قرآن نے شہد کی مکھی کو مونث بتایا ہے'' بابا جان نے کہا۔ آخر میں سورۃ النحل کی آیت کا ترجمہ پڑھایا گیا۔ مجھے کبھی یہ سمجھ نہیں آتی تھی کہ ہر لفظ کی تذکیر و تانیث سیکھنا کیوں ضروری ہے۔

ڈینش تعلیمی نظام کے دوران سکول میں بچوں کو پہلی جماعت سے ہی ایک مضمون ''نیچرل تکنیک'' پڑھایا جاتا ہے جس میں بچوں کو بے حد سہل انداز میں فطرت کے ان مظاہر سے روشناس کروایا جاتا ہے جن کا روزمرہ زندگی سے بھی تعلق ہو۔ کئی دہائیوں کے بعد مجھے معاون استاد کے طور

پر شہد کی مکھی کے پروجیکٹ پر کام کرنے کا موقع ملا۔ شہد کی مکھی پر دستاویزی فلم بھی دکھائی گئی، رنگا رنگ شہد کی بوتلیں خریدی گئیں، مکھیاں اور چھتے دکھائے گئے۔ میں نے بچوں کو بتایا کہ شہد کا ذکر قرآن میں بھی ہے۔

ڈینش تعلیمی نظام میں آٹھویں نویں جماعت کے بچوں کا تنقیدی شعور بہت متحرک ہوتا ہے۔ انھیں پڑھانے کے انداز میں سوال کرنا اور اختلاف کرنا سکھایا جاتا ہے۔ قرآن میں شہد کی مکھی کا ذکر ہوا تو بائبل میں بھی شہد اور مکھیوں کا تذکرہ ڈھونڈا گیا۔ تعلیم میں تاریخ اور سماجیات کا تعلق بھی جوڑا گیا اور میں فرطِ حیرت سے بیٹھی بابا جان کی شاداب روح کے درجات کی بلندی کی دعائیں کرتی رہی۔

••

احکام ترے حق ہیں، مگر اپنے مفسر!
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش!
میں بندۂ مومن ہوں، نہیں دانۂ اسپند

یہ بابا جان کی تدریس کا ہی احسان تھا کہ ہمیں شعر فہمی کے ساتھ زبان کے پیچ وخم سمجھنے کی بھی توفیق ملی۔ ''دانۂ اسپند کیا ہوتا ہے بابا جان؟'' پہلے تو انھوں نے زبانی مثال دینے کی کوشش کی، اسپند کے دانوں کو جلایا جائے تو وہ تڑختے ہیں... ''تھوتھا چنا، باجے گھنا'' (خالی برتن کی آواز زیادہ ہوتی ہے) پھر ''ڈھول کا پول'' محاورہ سمجھایا گیا۔ لیکن شاید خود ہی اپنی تدریس سے مطمئن نہ ہوئے اور اوپر سے ہی آواز دے کر امی جی سے پوچھا، ''چناں! حرمل رکھا ہے گھر میں؟ ذرا ان بچوں کو جلا کر دکھانا۔''

ہم امی جی کے پاس جا کر یوں بیٹھ گئے جیسے ابھی ان کالے دانوں کے جلنے اور چٹاخ پٹاخ کی آواز کے ساتھ ہی کوئی جن نمودار ہوگا۔ ان اچھلتے کودتے اور پٹپٹاتے دانوں کا تماشہ دکھانے کے بعد دوبارہ ہمارا سبق شروع ہو گیا۔

بابا جان کو سائنس سے بے انتہا شغف تھا۔ موقع ملتے ہی سائنسی اصول سمجھانے لگتے۔ اب اس سائنسی تجربے کے بعد فوری سوال ہوا کہ بتائیں یہ مکئی کے دانے یا حرمل کے دانے بھنتے ہوئے چٹختے کیوں ہیں۔ پھر خود ہی تفصیلی جواب بتایا کہ یہ دانے بیج ہیں۔ ہر بیج کے اندر درخت بننے کی پوٹینشل (Potential) پاور ہوتی ہے۔ جب آگ کی حرارت سے بیرونی طاقت کا دباؤ بڑھتا

ہے تو بیج کے اندر موجود طاقت باہر آنے کو زور لگاتی ہے۔ بیرونی خول کے ٹوٹنے سے چٹخنے کی آواز آتی ہے۔ کئی برس بعد جب مائیکرو ویو اوون میں پاپ کارن بنانے کی تکنیک آئی تو بابا جان کی باتیں ایسے یاد آنے لگیں جیسے کہیں ریکارڈر کا بٹن دب گیا ہو۔ بابا جان نے بتایا کہ ان دانوں کو مجوسیوں کے زمانے سے جادو اور آسیب کا اثر اتارنے کے لیے دھونی کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ دانے جلائے جاتے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ ان سے بدروحیں دور بھاگتی ہیں۔ بابا جان کی باتیں سنتے وقت مجھے کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ میں ان تمام روایات کا تقابل کبھی یورپ میں بدروحوں کو بھگانے کے لیے جلائی جانے والی نباتات سے کروں گی۔

بابا جان سائنس پڑھاتے ہوئے جو تجربات کرواتے تھے ان سے مجھے بہت دلچسپی تھی۔ موم بتیاں، دیا سلائیاں اور پانی سے کیے گئے تجربات سے مجھے ایک تجربہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ بابا جان نے کہا نیچے جاؤ اور ایک بالٹی میں پانی ڈال کر اسے تیزی سے گھماؤ۔ اس طرح کے خیالات مجھ میں بجلی بھر دیتے۔ مجھے ایک جگہ بیٹھ کر گردانیں اور کلیدِ مصادر رٹنے کا کوئی شوق نہ تھا۔ میں حسبِ عادت سیڑھیوں کے بجائے چھت اور دیوار کے راستے سے سیدھا صحن میں لینڈ ہوئی۔ امی جی جلدی سے دودھ والی بالٹی دے دیں۔ بابا جان نے پانی گھمانے کا کہا ہے۔ تجربہ تو جادوگری کی طرح تھا بالٹی کا پانی مجال ہے جو گرے۔ اب جو میرا تجربہ شروع ہوا تو امی جی کی دُہائی پر ختم ہوا کہ یہ کس قسم کی پڑھائی ہے جو پورے صحن کو چھپڑ بنا گئی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ بابا جان سائنس کی کتاب پڑھاتے ہوئے ایصالِ حرارت اور ترسیلِ حرارت کا تصور سکھا رہے تھے۔ وہ ایک جیسی پانچ کتابیں لائے ان کو قطار میں کھڑا کیا۔ پھر مجھے کہنے لگے، اس ایک کتاب کو دھکا دو۔ جونہی میں نے پہلی کتاب کو ہاتھ لگایا، باقی ساری کتابیں بھی گرتی چلی گئیں۔

''اسے کہتے ہیں ترسیل، ایک سے دوسری چیز تک سلسلے وار ردِعمل چلتا چلا جائے۔'' میں گھر آ کر کتنے دن کتابوں کی قطار بناتی اور پھر ان کو دھکہ دے کر دیکھتی رہتی۔ امی جی اعتراض کرتیں تو میں کہتی، ''بابا جان نے پڑھایا ہے ان سے کہیں۔''

دائیں ہاتھ میں پنسل لے کر اسے پہلے صرف دائیں آنکھ سے اور پھر صرف بائیں آنکھ سے دیکھ کر فاصلے کی شد بد بھی بابا جان کے تجربات نے ہی سکھائی تھی۔

●●

موسمِ برسات کے بعد جب بابا جان باغ میں جانے کا کہتے تو مجھے بہت کراہت آتی۔
''بابا جان دیکھیے، یہاں کیچوے پھرتے ہیں، مجھے بہت گندے لگتے ہیں۔''
''کچھ نہیں کہتے، بے ضرر ہوتے ہیں، ذرا سا نمک ڈالو تو پانی بن کر بہہ جاتے ہیں''
باباجان نے تو ان کی بے ثباتی سمجھانے کے لیے کہا۔ میں حسبِ عادت اٹھ کر نیچے بھاگی۔ دونوں ہاتھوں میں نمک کی مٹھیاں بھریں اور کیچوؤں کی تلاش میں باغیچے میں پہنچی۔

بابا جان نجانے کس پودے کے گرد چونے کا دائرہ بنا رہے تھے جیسے محکمہ جنگلات میں بھرتی ہوگئے ہوں۔ میں نے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے کرلیے۔ بابا جان بھی مجھے دیکھ کر چونکے کیونکہ میں تو چھٹی ملنے کے بعد ادھر کا رخ نہیں کرتی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' پھر میرے چھپائے ہاتھوں کی طرف دیکھا،''کیا ہے ہاتھوں کو؟ دکھاؤ۔''
میں نے بدستور ہاتھ کمر کے پیچھے چھپائے رکھے۔
''نمک لائی ہوں بابا جان، کیچوؤں پر ڈالنا ہے۔''
بابا جان درختوں کے گرد اپنے دائرے لگانے کا کام بھول گئے،''اس بھوتنی کے سامنے بندہ اب بات بھی نہ کرے۔ ویسے ان سے کراہت آتی ہے۔ تو جب وہ مریں گے تمھارے سامنے تو پھر کراہت نہیں آئے گی؟ چلو پھینکو ادھر نمک۔''

جو کھولوں سینہ مجروح تو نمک چھڑکے
جراحت اس کو دکھانے کا کچھ مزا بھی ہے

بابا جان کونے پر لگی ٹونٹی سے ہاتھ دھونے چل دیے۔ لیکن مجھے جب بھی موقع ملتا میں مٹھیوں میں نمک بھر لیتی اور گنڈوئیوں کی تلاش میں رہتی۔ عرفان بھائی نے ایک دن مجھے پوچھا ''اے قاتلہ، ان کیچوؤں نے کیا بگاڑا ہے تمھارا؟ کیوں انسان و حیوان کے پیچھے پڑی رہتی ہو؟''
میں نے کہا ''جو کوئی بھی میرے ساتھ فساد کرنے کی کوشش کرے گا، میں ایسے ہی نمک گراؤں گی اس پر ان شاء اللہ۔''

••

ہمارے شہر کی معروف ادبی شخصیت میجر سرور اقبال اکثر گرمیوں کی شاموں کو بابا جان کے پاس آجاتے۔ رات گئے تک بزم آرائی ہوتی۔ وہ دن ہمارے لیے عید کی طرح ہوتے کیونکہ بابا جان کو اپنی باتوں سے فرصت ہی نہ ہوتی۔ ایسی ہی ایک شام کو، میں بابا جان کے پاس اکلوتی

شاگرد کے طور پر بیٹھی تھی۔ لڑکے ابھی تک پڑھنے کے لیے نہیں پہنچے تھے۔ مجھے غصے کے ساتھ ساتھ حسد بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک میجر صاحب تشریف لے آئے۔ بابا جان یکسر بھول ہی گئے کہ میں مظلوم بھی کسی گنہگار کی طرح کمرے میں موجود ہوں۔ بابا جان اور میجر صاحب نے باتوں ہی باتوں میں علامہ اقبال کی نظم، مکالمہ جبریل و ابلیس نکال لی۔ میجر صاحب جبریل کے اشعار پڑھتے اور بابا جان ابلیس کے مکالمے دوہراتے۔ دونوں صاحبان خود ہی اشعار پڑھتے پھر خود ہی داد دیتے، کبھی چند الفاظ دوہرا کر سر دھنتے۔ مجھے شاید انھوں نے جادو کے زور سے مکھی بنا کر دیوار پر لگا رکھا تھا۔ نیچے سے شربت بنا کر ملازمہ کے ہاتھ اوپر بھیج دیا گیا تھا جو جگ سے جھانک رہا تھا اور میری ہی طرح بے توجہی کا شکار تھا۔

بابا جان چونکہ ابلیس کے اشعار پڑھ رہے تھے، سو میرا بے مہار تخیل بابا جان کی موٹی موٹی آنکھوں، چھوٹی سی سفید داڑھی کے اوپر کہانیوں میں پڑھے شیطان کے سینگ لگا کر دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ ان کے پڑھنے کا انداز، بایاں ہاتھ سینے پر رکھے، دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت بلند کر کے دبنگ آواز میں کہتے

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

پھر میجر صاحب کے دبے دبے جواب،

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو

اگرچہ میری سمجھ میں مکمل طور پر نہیں آئے لیکن مجھے ابلیس کا پلڑا بھاری محسوس ہوتا رہا۔ نظم کئی مرتبہ دوہرائی گئی۔ پھر درمیانی وقفہ آیا اور دونوں حضرات نے شربت پیا، تازہ دم ہوئے، پھر فارسی میں جانے کیا کچھ بولتے رہے اور خود ہی محظوظ ہوئے۔ پھر دونوں جبریل و ابلیس کا روپ دھار بیٹھے۔ اب اس تھیٹر سے میری دلچسپی ختم ہوگئی۔ عاجز آکر میں نے کہا، یا تو آپ لوگ مجھے چھٹی دیں، یا نظم کوئی اور پڑھیں۔

بابا جان یوں چونکے جیسے میں انھیں ابھی دکھائی دی ہوں، ''نظم کوئی اور کیوں پڑھیں بھئی؟''

''اس لیے کہ یہ نظم اب مجھے یاد ہوگئی ہے اور بور ہے'' میں نے ناراض ہوکر جواب دیا۔

میجر سرور نے مجھے گھور کر دیکھا پھر ہنس پڑے، ''اچھا، چلو ذرا سناؤ شاباش، ہم بھی تو دیکھیں۔''

میری سماعتوں پر چونکہ مسلسل گولہ باری ہوئی تھی سو میں نے اشعار سنا دیے۔ بابا جان نے تو مسرت آمیز مسکراہٹ سے کام چلا لیا لیکن میجر سرور متحیر رہ گئے۔ واپسی پر وہ ابا جی کے پاس رکے اور حیران ہو کر کہا، ''یہ کیا بلا پیدا ہو گئی مرزیاں دے خاندان وِچ؟''

ابا جی کہنے لگے، ''پیدا تو نہیں ہوئی تھی، لالہ جی نے بنا دی ہے۔''

پھر کالج کے دوران میں نے اسی کرداری نظم پر ابلیس کے مکالماتی اشعار ادا کیے۔ کالی لمبی عبا پہنے میں اپنے سر پر سینگ تلاش کرتی رہی۔ چچا جان نے گوئٹے کے شیاطین اور اقبال کے ابلیس کے تضادات پر لیکچر دیا۔

••

بابا جان نجانے کہاں کہاں سے اشعار نکال کر لاتے

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے
پودے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے
آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

موسمِ بہار میں کونپلیں نکلتیں تو وہ ہمیں ہنکا کر نیچے باغیچے میں لے جاتے۔ پائیں باغ کا، جیسا کہ میں نے اسے نام دے رکھا تھا، لکڑی کا دروازہ کھولتے ہم سب بکری کے میمنوں کی طرح اپنی اپنی کاپی پنسل اٹھائے پیچھے پیچھے چلتے جاتے، کیلے کے درختوں کے جھنڈ کے نیچے اور رنگ برنگے ننھے پودں، پھولوں کی شاخوں اور کونپلوں کے درمیان۔

''ان پودوں کے نام لکھو'' بابا جان کا حکم ہوتا، ''یہ بھی انسانوں ہی کی طرح ہوتے ہیں۔ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، بڑھتے ہیں، اداس ہوتے ہیں، خوش ہوتے ہیں۔ دن کی روشنی میں غذا بناتے ہیں اور رات کی تاریکی میں اس غذا کو استعمال بھی کرتے ہیں۔''

''جی بابا جان۔''

پھر کیلے کے درخت کے پتوں کا معائنہ کرنے کے لیے کہا جاتا، امرود کے درخت کے پتے توڑ کر لانے کا حکم ہوتا، ''چلو اب اوپر چلو۔''

اب ہم جیسے قطار کی صورت آئے تھے ویسے ہی واپس اوپر ان کے حجرے کی طرف چل دیتے۔

''پتوں کو ہم کیا کریں گے؟'' ہمارے سب سے چھوٹے چچا جان کا بیٹا فاروق بولا۔ وہ

کچھ عرصہ پہلے ہی گاؤں سے ہمارے پاس رہنے آیا تھا تاکہ بابا جان سے پڑھ سکے۔ ابھی اس نے باقی بھائیوں کے ساتھ پارٹی بازی نہیں کی تھی اس لیے میری اس سے بہت دوستی تھی۔

''یہ پتے سکھانے کے بعد آپ کھائیں گے'' میں نے اسے سنجیدگی سے آگاہ کیا۔

''ہیں، میں کیوں؟''

''اس لیے کہ پچھلے سال ہم لوگ کھا چکے ہیں، اب آپ کی باری ہے۔'' اس کی آنکھیں کچھ پھیل گئیں اور متوقع خوراک کے تصور سے منہ بن گیا۔

''اس کی باتوں میں نہ آنا'' ہمارے بھائی نے اسے تسلی دی، ''تمھیں پتہ ہے ناں یہ فضول الٹی سیدھی باتیں کرتی ہے۔'' اس نے پاگل کہتے کہتے سرحدی جھڑپ کے خدشے کے سبب خود کو روک لیا۔ مجھے اپنے باقی چالاک قسم کے بھائیوں میں سے فاروق بھائی کی سادگی اور معصومیت بہت پسند تھی۔ ایک دن بابا جان انگریزی پڑھاتے پڑھاتے اسے باغیچے میں لے گئے۔ بابا جان نے اس کے ہاتھ میں کھرپہ دیا اور انگریزی کے لفظ، ڈِگ، ڈَگ، ڈُگ، کی فارمز سکھانے لگے۔ وہ بے چارہ کھرپہ چلاتے اور ڈِگ، ڈَگ، ڈُگ، کرتے میں تندہی سے مشغول تھا۔ میں نے دیوار سے اتنی احتیاط سے جھانکا کہ میں تو بابا جان کو دیکھ لوں لیکن وہ مجھے نہ دیکھ پائیں۔

سامنے کا منظر دیکھتے ہی میں نے امی جی کی طرف دوڑ لگائی، ''امی جی اس کی جان چھڑائیں بابا جان تو چھٹی دیں گے ہی نہیں۔''

امی جی فوراً دادرسی کو پہنچیں۔ بقول ان کے بے چارہ معصوم جو بالکل اپنی دادی کی طرح سادہ کبوتر تھا اور ہم کوّوں میں آن پھنسا تھا۔

فاروق بھائی کے گھر چونکہ صرف مردانہ فوج تھی اور بہن کوئی نہیں تھی اس لیے اسے میرا بہت خیال ہوتا جب کہ عرفان بھائی اور اعجاز بھائی اسے بتاتے رہتے کہ یہ بہت ''فسادن'' ہے۔ سب سے ڈانٹ پڑوائے گی تمھیں۔ لیکن فاروق بھائی سے میری ہمیشہ دوستی رہی۔ میں ثابت کرتی رہی کہ جو میرے ساتھ امن پسندی سے رہے گا، میں بھی اس کی سرحدی خلاف ورزی نہیں کروں گی لیکن جو طاقت کے غرور میں چڑھائی کرے گا اس کی ناکہ بندی کی جائے گی۔ بابا جان ہماری بحث سن کر مسکراتے رہتے۔

••

بابا جان کو اپنا ہار سنگھار کا پودا بہت پسند تھا۔ مجھے اس پودے کا نام بہت اچھا لگتا۔ بابا

جان انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کی درمیان اس کی شاخوں کو اٹھاتے....

''اس پودے کا اصل حسن دیکھنا ہو تو علی الصبح جاگو۔''

نیم شب میں کھلتے پھول اپنی بسنتی ڈنڈیوں سمیت چند گھنٹوں کی زندگی کے بعد زمین بوس ہو جاتے، جیسے پروانوں کے ڈھیر بکھرے ہوں۔ تائی جان ان کو جمع کرتیں۔ حکماء کی بیویاں زردہ دم دیتے ہوئے یہ پھول چاولوں میں ٹھونس دیتیں۔ باقی بیبیاں اس منفرد سی خوشبو کا منبع ڈھونڈتی رہتیں۔ امی ان کو بتاتیں کہ یہ پھول عورتوں کو ضرور کھانے چاہییں، عرق النساء سے محفوظ رکھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ عرق النساء کا نام سنتے ہی میرے ذہن میں عورتوں کو ابال کر عرق نکالنے کا خیال آیا جیسے دواخانے میں گلاب کی پتیوں کا نکالا جاتا۔ ہمارے گھروں میں جیسے دواخانہ اگا ہوا تھا۔ یہی پھول مہندی کا رنگ بڑھانے کے لیے اور دیسی ابٹن میں استعمال ہوتے تھے۔ رنگ سازی میں ان کا پاؤڈر کیمیکل سے بچاتا ہے۔ ڈنمارک میں تعلیم کے دوران ہمارے ایک ایرانی دوست نے بتایا کہ وہ اس پھول کو یاسمنِ شبِ گل کہتے ہیں۔ ہندی والے اسے پری جات کے نام سے پکارتے ہیں۔

چنبیلی، موتیا اور رنگ برنگے گلاب اپنی الگ دنیا بسائے رہتے۔ باباجان فرداً فرداً ہر پودے اور درخت کے پاس یوں کھڑے ہوتے جیسے پیادہ حج کر کے آنے والے زائرینِ مدینہ واپس آ کر ایک ایک کو مقدس واردات سنا رہے ہوں۔ شہادت کی انگلی سے پتے کو صاف کرتے، جھاڑتے۔ ایک دن میں نے تنگ آ کر کہا ''امی لگتا ہے باباجان ایک ماں کی طرح بہتی ناک صاف کر رہے ہیں پودوں کی۔''

جواب میں مجھے جھڑکیاں سہنا پڑیں۔

••

کالج میں جب ہمیں میر تقی میر پڑھایا جا رہا تھا تو یہ اشعار میرے ذہن کے کسی فراموش کردہ کونے کھدرے سے ایک دم نکلے اور صبح کی چڑیوں کی مانند چہکنے لگے۔ میرے بچپن کی جبری بیگار کے دنوں کی یادگار۔ باباجان یہاں بھی میرے ساتھ تھے ؎

بے دل ہوئے، بے دیں ہوئے، بے وقر ہم اَت گت ہوئے
بے کس ہوئے، بے بس ہوئے، بے کل ہوئے، بے گت ہوئے
ہم عشق میں کیا کیا ہوئے، اب آخر آخر ہو چکے
بے مت ہوئے، بے ست ہوئے، بے خود ہوئے، میّت ہوئے

کیا روئے قیدی ہیں اب، رویت بھی بن گل کچھ نہیں
بے پر ہوئے، بے گھر ہوئے، بے زر ہوئے، بے پت ہوئے

''بابا جان یہ تو لگ رہا ہے کہ کسی کے جرم کی فہرست تیار ہو رہی ہے، یہاں یہ سابقے ہیں؟''
''تو آپ کیا سمجھتی ہیں کوئی بھی زبان بس ایسے ہی آجاتی ہے؟ عربی، فارسی اور ہندی کے الفاظ کی اس میں آمیزش ہے۔ زبان کی اصل جڑ پکڑنا ضروری ہے۔ اس کے قواعد و انشا پردازی بھی ان ہی زبانوں سے ملی ہے اور اردو میں جذب ہوگئی ہے۔''

''اچھا یہ لفظ دیکھو'' انھوں نے حسبِ معمول پہلے سے تیار شدہ الفاظ ہمارے سامنے رکھے۔ عالِم اور عِلم کو کاغذ کی ایک طرف لکھتے، پھر عالَم اور عَلَم اور اَلَم، کو درمیان میں کھینچی لکیر کی دوسری جانب لکھا جاتا۔ اسی طرح مِلک، مَلَک، مُلک۔

''ذرا سورۃ الناس سناؤ۔ شاباش۔ اب دیکھو مَلِک الناس، طوطے کی طرح قرآن نہیں پڑھنا ہوتا۔ اس کے اندر سے ہر طرح کا علم سیکھنا ہوتا ہے۔ زبان دانی دیکھو اس میں۔ تانیث اور تذکیر کے صیغے ہوتے ہیں۔ واحد، جمع کے ساتھ دو کا صیغہ بھی ہوتا ہے۔''

''یا اللہ، مجھے ان اسباق سے نجات عطا فرما'' میں عاجزی سے دعا کرتی جو کبھی قبول نہ ہوتی۔
بندر خوخیاتا ہے، گھوڑا ہنہناتا ہے۔ چنگھاڑنا، دھاڑنا، غرانا، بلبلانا۔ پھر انھوں نے مجھے یہ اصوات جملوں میں استعمال کرنے کو کہا اور میں نے بغیر کسی تاخیر اور کسی کا نام لیے جملہ بنا ڈالا، 'شور نہ کرو، کیوں ہنہنا رہے ہو۔'

الفاظ معانی، مترادفات، متضادات، واحد جمع، مذکر مونث، سابقے لاحقے، ضرب الامثال، محاورات اور کہاوتیں، غرضیکہ بابا جان کے ہاتھ جو کچھ آتا اس کی لسی بنا کر ہمارے دماغوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے رہتے۔

بابا جان کے پاس ایک بوسیدہ سی کتاب تھی جس پر انھوں نے خاکی رنگ کا غلاف چڑھا رکھا تھا اور اس پر نیلے رنگ کی روشنائی سے ''نظمیاتِ نظیرؔ'' لکھ رکھا تھا۔ بابا جان نے اس کتاب کو تو مجھے ہاتھ نہیں لگانے دیا البتہ اس پر سے پوری نظم اپنے ہاتھ سے نقل کر کے ہمارے سامنے رکھی۔ نظم مجھے تو بس چوں چوں کا مربہ لگی لیکن بابا جان نے اس کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔
شاعر نے چڑیوں کی چہکار کو بھی حمدِ باری تعالیٰ سے تشبیہہ دینے کی خوبصورت کوشش کی۔
نظم کا عنوان ہی قرآن کی آیت سے لیا گیا ہے۔

وَ اِن من شیئٍ الا یسبح بحمدہٖ ولکن لاتفقہون تسبیحہم۔
سب چیزیں خداوندعالم کی حمد وتسبیح کرتی ہیں، لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے۔

(سورۃ الاسراء:٤٤)

وقتِ سحر کو روحیں کیا کیا ہوں ہوں ہوں ہوں کرتی ہیں
ہوں ہوں ہوں ہوں کر کر ذکرِ کن اور فیکوں کرتی ہیں
مرغے بولیں ککڑوں ککڑوں مرغیاں کوں کوں کرتی ہیں
طوطیاں بھی سب یاد میں اس کی بھوں بھوں بھوں بھوں کرتی ہیں

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں کیا؟ سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

پنکھ بڑھا گڑھ پنکھ اسی کے غم کو تپ میں تپتے ہیں
عنقا اور سیمرغ اسی کی فرقت کے بیچ تڑپتے ہیں
سارس گدھ حواصل بزے بگلے پنکھ کلپتے ہیں
پنکھ پکھیرو جتنے ہیں سب نام اسی کا جپتے ہیں

سانجھ سویرے چڑیاں مل کرچوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں کیا؟ سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

قمری بولے حق سرہ بلبل بولے بسم اللہ
کبک ٹیٹری چاروں قل، اور تیتر بھی سبحان اللہ
دادر مور پپیہے، کوئل کوک رہے ہیں اللہ اللہ
فاختہ کو کو تیہو، ہو ہو، طوطے بولیں، حق اللہ

سانجھ سویرے چڑیاں مل کرچوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں کیا؟ سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

شکرا چیخ اور لگھڑ باشے، اور ترمتی، باز کوئی
کونج، کبوتر، سبزک، جھانپو، کلکل، سارو، مار چوئی
لعل پڑھے صم بکم جس پہنے پوشاک سوئی
پدڑی، پدی، پودنے شکر خورے بولیں توئی توئی

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں کیا؟ سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

چیل کٹی السجل کہے ہے، چلوں چلوں، مت جان میاں
کوے کاں کاں کرتے ہیں الآں کم کان میاں
مر مر بولے مرغابی کل من علیہا فان میاں
جتنے پنکھ پکھیرو ہیں سب پڑھتے ہیں قرآن میاں

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں کیا؟ سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

ہنس، ہما، سرخاب، تدرویں بولیں یا رحمٰن، میاں
سارو، ہریل، اور لٹورے، دھیڑیا حنان، میاں
ققنس، تیتر، چکوہ، چکوی بولیں یا منان، میاں
ہدہد بولیں احد احد کچھ تو بھی تو کر دھیان میاں

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں کیا؟ سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

بوم چغد اور سبزک ابابیل اور چکوریں شام چڑی
کنجھن، جھپاں، لوے، کلنگ اور غوغائی کی دھوم پڑی
تتلی، ٹڈی، ڈانس بھنبھیری، کتری بھنوری اور پڑی
مکھی، مچھر، بھنگے بول رہے ہیں سب گھڑی گھڑی

سانجھ سویرے چڑیاں مل کرچوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

تن تن، اور لم ڈھیک، ممولا حق حق تار پروتے ہیں
اگن، بئے، چنڈول، ابلقے یاد میں اس کی روتے ہیں
طائر تو سب تخم محبت اس کا دل میں بوتے ہیں
پنچھی اس کی یاد کریں، ہم پاؤں پسارے سوتے ہیں

سانجھ سویرے چڑیاں مل کرچوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں کیا؟ سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

کس کس کا نام لوں غرض، ہیں جتنے طائر خورد و کبیر
کوئی کہے یا حیَ توانا، کوئی کہے، یا ربِ قدیر
پنکھی تو سب یاد کریں، اور ہم غفلت میں رہیں اسیر
ہم سا غافل اب دنیا میں کوئی نہ ہو گا آہ! نظیر

سانجھ سویرے چڑیاں مل کرچوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں کیا؟ سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

''نظم میں سے قرآن کی آیات کے حوالہ جات الگ کرنے ہیں۔ تمام زبانوں کا ابتدائی ادب اکثر مذہب ہی کے حوالوں سے ہوتا ہے۔''

بابا جان بتاتے رہے اور میں جلدی چھٹی لینے کی دھن میں کچھ سمجھے بغیر جی اچھا، جی اچھا کرتی رہی۔ بابا جان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تین صفحات پر مشتمل یہ نظم ہمارے سامنے رکھی ہوئی تھی۔ بابا جان نے سرخ روشنائی کی دوات نکالی اور ہولڈر میں نب بدل کر خوش خطی کے مزید کمال دکھائے۔

اب کے انھوں نے ہر پرندے کے نام کے نیچے سرخ لکیر کھینچی، ''ان الفاظ کو کہتے ہیں خط کشیدہ الفاظ۔ یہ دیکھو خط۔۔۔۔ اور۔ ررر۔۔۔۔'' وہ لکیر کھینچتے کھینچتے ساتھ ہی ہونٹوں کے زاویے سے اپنا انہاک ظاہر کرتے، ''یہ میں نے لکیر کھینچی۔ اسے کہتے ہیں کش یعنی کشیدہ۔ اب جو اٹھتا ہے وہ خودکشی لفظ بولتا ہے۔ وہ ہوتا ہے کُش، مطلب مارنا، جیسے جراثیم کُش ایسے ہی جیسے حکیم دوا بناتے ہیں تو اسے کُشتہ کہتے ہیں۔

میں نے کھلے دروازے سے جھانکتی چندھیاتی دھوپ سے بچنے کے لیے سر پر کتاب رکھی تو بولے، ''یہ کیا کر رہی ہو؟ دھیان سے نہ پڑھنا، بس وقت ضائع کرنا۔'' میرے سامنے آج بھی وہ منظر اسی طرح رواں ہے۔

''گرمی لگ رہی ہے بابا جان، بجلی جو بند ہے'' میں مسکین سی شکل بنا کر کہتی۔

''وہ تو میرے لیے بھی بند ہے'' بابا جان اپنی روایتی بے پروائی سے کہتے، ''یہ لو اب ان سب پرندوں کے نام اپنی کاپی پر اتارو۔''

''بابا جان! یہ نظم تو ہماری کتاب میں شامل ہی نہیں اور اتنی لمبی بھی ہے؟'' میں اپنی طرف سے منطقی انداز میں کہتی۔

''تو میں نے کب کہا ہے کہ شامل ہے؟'' بابا جان اپنے سامنے رکھی کتاب کے صفحات الٹاتے۔

''آج چھٹی نہ کر لوں بابا جان؟ کل سب لڑکے بھی آ جائیں گے پھر آپ کو دوبارہ نہیں پڑھانا پڑے گا۔ ہم مل کر پڑھ لیں گے؟'' میں نے نظم کو ہاتھ لگائے بغیر تجویز پیش کی۔

''نہیں میری فکر نہ کریں۔ کل آپ ان سب نالائقوں کو پڑھائیں گی۔''

میں حسرت بھری آہ بھر کے سوچنے لگی کہ چھٹی جماعت کی سب لڑکیاں کتنی خوش رہتی ہیں۔ صرف نصابی نظمیں پڑھتی ہیں اور رات کو ٹی وی دیکھتی ہیں۔ ابا جی نے گھر میں ٹی وی بھی نہیں رکھا۔ شام کو کہانیاں پڑھاتے رہتے ہیں۔ میں نے دل مسوس کر کاپی کھولی۔ یہیں پر پہلی دفعہ میں

نے ان تمام پرندوں کے بارے میں پڑھا۔

''ہما، سیمرغ، ققنس، یہ کیا ہے بابا جان؟'' میں نے پریشان ہوکر پوچھا۔

''یہ سب اساطیری پرندے ہیں۔'' جواب سوال سے بھی مشکل تھا۔ اب اساطیر اور دیومالا کی میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی۔

''وہ کیا ہوتے ہیں؟''

اب وہ میری دلچسپی جگانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انھوں نے اطمینان سے کتاب پہلو میں رکھی اور مجھے ان کی کہانیاں سنانے لگے۔ گھر آ کر پہلے تو میں نے حسبِ معمول ابا جی کو ان کے لالہ جی کے ظلم کی کہانی سنائی، پھر نظم نکال کر دکھائی۔

''ارے واہ!! اتنے پرندے؟ یہ سب نام تو مجھے بھی نہیں آتے تھے'' وہ مجھے خوش کرنے کے لیے بولے، ''آپ یہ نظم زبانی یاد کر کے اپنے سکول کی بزمِ ادب میں بھی پڑھ سکتی ہیں۔''

ابا جی بھی آخر بابا جان ہی کے پروردہ تھے۔ پھر انھوں نے مجھے نظم میں موجود آیات نکال کر الگ صفحے پر لکھ کر دیں اور ان کا مطلب بھی لکھا:

چیل کہتی ہے:

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ (الأنبياء، 104:21)

اس دن ہم (ساری) سماوی کائنات کو اس طرح لپیٹ دیں گے جیسے لکھے ہوئے کاغذات کو لپیٹ دیا جاتا ہے، جس طرح ہم نے (کائنات کو) پہلی بار پیدا کیا تھا ہم (اس کے ختم ہو جانے کے بعد) اسی عملِ تخلیق کو دوہرائیں گے۔ یہ وعدہ پورا کرنا ہم نے لازم کرلیا ہے۔ ہم (یہ اعادہ) ضرور کرنے والے ہیں۔

گویا نظم کے مطابق چیل اور کوے اللہ کا کلام پڑھتے ہیں؟ مطلب امی جی کا طعنہ ناکام ہوگیا کہ کاں کاں نہ کیا کرو۔ کانوں کے کیڑے نکال کر کھا گئی ہو۔ البتہ لوگوں کے نام ڈالنے کے لیے میرے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہو چکا تھا، لم ڈھینگ، چنڈول، جھانپو، لگڑ بھاشہ وغیرہ، جس پر بعد میں میری عزت افزائی بھی ہوتی لیکن

تمھی نے اہلِ ہنر، یہ ہنر دیا ہے مجھے

یہ الگ بات ہے کہ جب سائنس، کائنات کی ابتدا و انتہا کی تھیوریز پڑھنا شروع کیں تو یہ سمجھنے میں بہت وقت لگا کہ چیل کی زبان سے اتنا بڑا فلسفہ بیان کروانے کی کیا ضرورت تھی۔

''طوفانِ نوح کے وقت ان سب پرندوں کی جوڑیاں بچ گئی تھیں۔سبحان تیری قدرت۔''

''لیکن بابا جان جب دنیا بنی تھی اس وقت تو اردو زبان تھی ہی نہیں؟''

پھر مزید گفتگو شروع ہوئی کہ کون سا پرندہ کیا کہتا ہے۔

''فاختہ جو گھگو گھو کہتی ہے اصل میں یوسف کھوہ ہے۔ چھپکلی منحوس ہے کیونکہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو اس نے پھونکیں ماری تھیں۔مکڑی مقدس ہے کیونکہ اس نے غارِ ثور پر جالا تان دیا تھا۔''

ابا جی ہنستے اور مجھے بتاتے کہ جب زبانیں مذہب کے شکنجے میں آتی ہیں تو شجر، حجر، چرند، پرند، ارض و سما سب اس کی مرضی کا رنگ اختیار کرتے ہیں۔

مجھے یہ نظم اس لیے بھی ایک حسین یاد کی طرح لگتی ہے کہ اس کو باآوازِ بلند پڑھنے کے ساتھ ساتھ جو پرندوں کی بولیوں اور ان کی باتوں کی کہانیاں سنائی جاتیں، حضرت سلیمان علیہ السلام کی داستان، ہدہد کی خبریں اور پھر ابا جی اور بابا جان کی باتیں، منطق الطیر کا ذکر ہوا جو بابا جان کی سنائی کہانیوں کی وجہ سے میرے ذہن میں محفوظ رہا۔

شیخ فرید الدین عطار نیشا پوری رحمہ اللہ کی بارھویں صدی کی کتاب، ''پرندوں کی بولیاں'' جو بابا جان کے پاس بیش قیمت سرمائے کی طرح محفوظ تھی، پرانی داستانیں بچوں کو سنائی جاتیں اور آخر میں مجھے کہا جاتا کہ پرندوں کے درمیان مکالمے لکھو، نظمیں بھی لکھو کہ چڑیاں اور طوطے آپس میں کیا باتیں کرتے ہیں۔

''بھائی کیوں نہیں لکھتے؟'' میں ہمیشہ کی طرح اعتراض کرتی۔

''لو وہ بے چارے کوئی شاعر ہیں۔ان نظموں کو زبانی یاد کرو، روانی سے پڑھو، اس سے ایک اندرونی آہنگ پیدا ہوتا ہے جو فاعلات فاعلات کے گورکھ دھندے میں الجھنے نہیں دیتا۔''

بابا جان شاید مجھے بہلانے کو کہتے، لیکن ان کی دی ہوئی فوقیت اور ترجیح نے مجھے معاشرتی مخالفت کے باوجود ہمیشہ اپنا پہلا حوالہ اور تعارف شاعری سمجھنے پر مصر رکھا۔

اگرچہ بعد میں افسانہ نگاری، نثری کاوشیں، کالم، مضامین وغیرہ پر بھی میں نے طبع آزمائی کی لیکن بچپن سے جو شاعری کے حوالے سے مجھے انفرادیت دی گئی وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔ میں

نے بچوں کی نظمیں لکھیں۔ تدریس کے زمانے میں جب بچوں کی جدید نظمیں کہنے کی ضرورت پیش آئی تو میرے ڈینش کولیگ ان کا ترجمہ سن کر بہت محظوظ ہوتے۔

بلی کی ای میل میں چوہوں کی تصویریں آئی ہیں
اب بلی آپا کہتی ہیں یہ چوہے میرے بھائی ہیں

پھر میں نے ایک بھیڑ اور بھیڑیے کا مکالمہ لکھا جسے کرداری نظم کی صورت میں ڈرامہ بنا دیا گیا۔ میرا یہ شوق میری پیشہ ورانہ زندگی میں بہت کام آیا۔ نظیر اکبر آبادی کا نام تب سے میرے ذہن میں کہیں کھدا ہوا ہے۔ بچوں کے ادب پر ضرور لکھنا چاہیے اور جب میں نے ڈینش زبان پر کام کرتے ہوئے بچوں کے ادب پر پروجیکٹ بنایا تو زبانی لیکچر میں اس نظم کا حوالہ بھی دیا جس پر سینئرز کی آنکھیں کھلی رہ گئیں،

''اچھا اردو زبان تو بہت ثروت مند ہے۔''

''ہاں، زبان تو سرمایہ دار ہے۔ بولنے والے قلاش ہیں'' میں نے جل کر کہا۔

اس وقت ہماری کلاس میں ایک لڑکی کمیلا نے کہا کہ اس بارے میں انگریزی میں کچھ ڈھونڈ کر دو میں اس پر کام کرنا چاہتی ہوں۔ صوتیات، اساطیر، تو میں تمھاری اس ابتدائی ترجمانی سے سمجھ سکتی ہوں مگر اردو زبان کیسے استعمال ہوئی، یہ تم بتا سکتی ہو۔ یہ ایک تاریخی پروجیکٹ ہوگا، ڈینش لٹریچر والے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ میں نے جوش میں آ کر محمد حسن کی ''میکرز آف انڈین لٹریچر'' ساہتیہ اکیڈمی کے 1973 میں شائع کردہ کام کا سراغ لگایا۔ لیکن پھر گھر کی آتشزدگی نے سب کچھ ایک سیاہ سلگتی ہوئی چادر کے پیچھے چھپا دیا۔

سب کچھ میری ذاتی زندگی کی ترجیحات کی نذر ہوگیا۔ میرے لیے میرے بچوں کی تعلیم و تربیت اور انھیں اردو سکھانا اتنا اہم تھا کہ ان امکانات کو رد کر کے آگے بڑھنا ہی تھا لیکن میرے ذہن کے کسی فراموش کردہ کونے میں یہ امکان اب آرام کی نیند سویا ہوا ہے۔

پرندوں کی بولیوں والی نظم کے ساتھ ساتھ مشہورِ زمانہ 'سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ' اور 'آدمی نامہ' امی جی کو زبانی یاد تھا بلکہ کئی مرتبہ مجھے یوں لگتا تھا کہ جو کچھ گھر میں پڑھا پڑھایا جاتا ہے وہ امی جی کے نصاب میں بھی شامل ہوتا ہے۔

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں، مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا، بھینسا، بیل، شتر، کیا گونی پلا سر بھارا
کیا گیہوں، چاول، موٹھ، مٹر، کیا آگ دھواں، انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

گر تو ہے لکھی بنجارا اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا ایک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر، مصری، قند، گری، کیا سانبھر میٹھا، کھاری ہے
کیا داکھ، منکا، سونٹھ، مرچ، کیا کیسر، لونگ، سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

یہ بدھیا لادے، بیل بھرے، جو پورب پچھم جاوے گا
یا سود بڑھا کر لاوے گا، یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا
دھن دولت، نانی، پوتا کیا، اک کنبہ کام نا آوے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

جب چلتے چلتے رستے میں یہ کون تیری ڈھل جاوے گی
اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نا چرنے آوے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے، سب حصوں میں بٹ جاوے گی
دھی، پوت، جنوائی، بیٹا کیا، بنجارن پاس نہ آوے گی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کچھ کام نا آوے گا تیرے یہ لعل زمرد سیم و زر
جب پونجی بات میں بکھرے گی، پھر آن بنے گی جان اوپر
نقارے، نوبت، بان، نشاں، دولت، حشمت، فوجیں، لشکر
کیا مسند، تکیہ، ملک، مکاں، کیا چوکی، کرسی، تخت، چھپر
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر آن نفع اور ٹوٹے میں کیوں مرتا پھرتا ہے بن بن
ٹک غافل دل میں سوچ ذرا، ہے ساتھ لگا تیرے دشمن
کیا لونڈی، باندی، دائی، دوا، کیا بندا، چیلا، نیک چلن
کیا مندر، مسجد، تال، کنویں، کیا گھاٹ سرا، کیا باغ چمن
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیوں جی پر بوجھ اٹھاتا ہے، ان کونوں بھاری بھاری کے
جب موت کا ڈیرا آن پڑا، پھر دونے ہیں بیوپاری کے
کیا ساز، جڑاؤ، زر، زیور، کیا گوٹے دھان کناری کے
کیا گھوڑے زین سنہری کے، کیا ہاتھی لال عماری کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

مغرور نہ ہو تلواروں پر، مت پھول بھروسے ڈھالوں کے
سب پٹہ توڑ کے بھاگیں گے، منہ دیکھ اجل کے بھالوں کے
کیا ڈبے موتی ہیروں کے، کیا ڈھیر خزانے مالوں کے
کیا بغچے تاش مشجر کے، کیا تختے شال دوشالوں کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب مرگ پھرا کر چابک کو یہ بیل بدن کا ہانکے گا
کوئی تاج سمیٹے گا تیرا، کوئی کون سیئے اور ٹانکے گا
ہو ڈھیر اکیلا جنگل میں، تو خاک لحد کی پھانکے گا
اس جنگل میں پھر آہ نظیر اک بھنگا آن نا جھانکے گا

••

ایک دن بابا جان مجھ پر ایسی عنایت فرمانے لگے جو بھائیوں پر نہیں کی تھی۔ میں شام کو پڑھنے گئی تو بولے، ''میں آپ کو یہ کتاب پڑھنے کے لیے دے سکتا ہوں، بس یہیں میرے سامنے بیٹھ کر پڑھ لینا، تمھارے بھائیوں کو نہیں دی۔''

بابا جان نے مجھے یوں رجھانے کی کوشش کی جیسے گھروں میں آکر کپڑا بیچنے والی پٹھانیاں اپنے نادر و نایاب قسم کے شاہی کمخواب کے جوڑے ارزاں قیمت پر یہ کہہ کر فروخت کرنے کی کوشش کریں کہ صرف آپ کے لیے یہ جوڑا رکھا تھا، کسی اور بی بی کو نہیں دکھایا پورے شہر میں۔ میں ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''یہ حمدیں صرف تمھاری ماں کو دی ہیں وہ بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر، اسے شوق ہے لیکن مسکین گھر داری اور تم لوگوں کو پالنے میں وقت ہی نہیں نکال سکتی۔''

بابا جان یوں بولے جیسے ہماری نانی اماں کبھی امی جی کو کہتیں ''پہلے خود کھانا کھایا کرو پھر بے شک سارا دن مہمان نوازی کیا کرو۔'' مجھے کبھی یہ بات بہت عجیب لگتی لیکن بہت سال بعد میں نے بھی اپنی بیٹی سے بعینہٖ یہی بات کہی، ''پہلے وقت پر کھانا کھا لیا کرو پھر پڑھائی ہوتی رہے گی۔'' پھر جب آئمہ صوفیہ پیدا ہوئی تو اس کی ماں نے پورے دو برس اسے شیرِ مادر کی نعمت مہیا کی، اگرچہ وہ میری آنکھوں کا نور ہے، لیکن میں اس کی ماں سے یہ کہنا نہ بھولتی کہ پہلے خود تسلی سے کھانا کھایا کرو پھر اس بلی کو دودھ پلا لینا۔''

بابا جان بھی شاید کہیں اندر سے امی جی کو ایک ماں کی طرح پیار کرتے تھے اسی لیے ان کو خود بھی پڑھنے کا کہتے اور کتابیں دیتے رہتے اور ہم سب کی تعلیمی ذمہ داری بھی اپنے سر اٹھا رکھی تھی۔

''اس میں بہت شاندار نظمیں ہیں۔ یہ دیکھو قران کی آیات سے عنوان رکھے گئے ہیں اور ہندی کی آمیزش سے زبان کو وسعت دی گئی ہے۔ یہ دیکھو۔''

بابا جان اس خاکی غلاف والی کتاب کو ہلاتے، پھر انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے

درمیان پکڑ کا احتیاط سے صفحات الٹتے...

"اے برتر از خیال و قیاس وگمانِ ما" اس حمد میں کیسی سادگی ہے، فارسی میں سعدی کے اشعار سے عنوان لیا گیا ہے...

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم

اے ہر خیال و قیاس و گمان و وہم سے برتر! اور ہر اس چیز سے بھی برتر جو ہم نے کہی یا سنی یا پڑھی۔ ان اشعار کی اصل بھی قران کی آیت ہے، اس کے عنوان کی آیت دیکھو۔

یارب ہے تیری ذات کو دونوں جہاں میں برتری
ہے یاد تیرے فضل کو، رسمِ خلائق پروری
دائم ہے خاص و عام پر، لطف و عطا حفظ آوری
کیا انسیاں کیا طائراں کیا، وحش کیا جن و پری
پالے ہے سب کو، ہر زماں تیرا کرم اور یاوری
تو خالقِ ارض و سما، تو حاتمِ قدرت نما
ہے حکم تیرا جا بجا، عرش تا تحت الثری

اس پوری حمد میں صفاتِ باری تعالیٰ کا تذکرہ ہے اور بقول بابا جان کے جو ایک مرتبہ ان شعرا کو پڑھ لیتا ہے پھر اس کی نظر میں جدت کے نام پر سرقہ نہیں سماتا۔

جب میں یہ اشعار لکھنے بیٹھی تو تایا جان کی مدد درکار تھی۔ بابا جان نے اس کی تفسیر ایک آیت سے جوڑی تھی۔ اس کی تلاش اور تحقیق بھی کسی پی ایچ ڈی کے مقالے سے کم نہ تھی۔ بالآخر میرے پیارے محترم تایا جان نے اس مسئلے کو حل کیا اور اپنے روایتی تنقیدی شعور کے ساتھ مجھے نکما قرار دینے کی روایت کا اعادہ بھی کیا، کہنے لگے علامہ تقی عثمانی کی تفسیر میں سورۃ الروم میں اللہ کی وحدانیت کے بیان میں ان اشعار کا تذکرہ ہے۔ ان ہی اشعار کی اصل پر مزید شاعری کی گئی، یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس آیت کی تفسیر کی،

اے بروں از وہم وقال و قیل من
خاک برفرق من و تمثیل من

لیکن جیسے تم ان تمام شعرا کو پڑھتی رہتی ہو ناں جن کی چند چیزیں دیکھیں تو سمجھ آ جاتی ہے

کون سا مصرع کہاں سے اٹھایا ہوا ہے۔

میں نے حسبِ عادت تایا جان کی باتوں سے اپنے مطلب کا موتی اٹھا لیا اور باقی کی جھاڑ کو ہاتھ جھاڑ کر جھاڑ ڈالا۔

اس حمد سے اگلی حمد بھی علم وفضل، تخیل، قدرت الکلامی کا نمونہ ہے

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى (الحشر:24)

اس ارض و سما کے عرصے میں یہ جتنا ھچم کھچّا ہے
یہ ٹھاٹھ تجھی نے باندھا ہے، یہ رنگ تجھی نے رچّا ہے
کوئی خالق، باری، رب، مولا، رحمان، رحیم، اللہ، تنگری
کیا دانا، بینا، ہوش بھرا، کیا ناداں بھولا کچّا ہے
کل عالم تیری یاد کرے، تو صاحب سب کا سچّا ہے
کوئی الک، روپ، کرتار کہے، نرکال، ترنجن، نر دھاری
کوئی رام رام کہہ کر سمرے، کوئی بولے شیو شیو ہری ہری
کوئی دانا دنیت، دیو اٹل، کوئی راچھس، دیوت، جن پری
کل عالم تیری یاد کرے، تو صاحب سب کا سچّا ہے

بابا جان کے متعلق لکھتے ہوئے میں نے پرانی کتب پڑھیں۔ نظیر کی نظمیں ڈھونڈیں اور ان میں سے بابا جان کی پسندیدہ ترین حمدیہ نظمیں نکالیں اور تایا جان کی مدد سے ان کی تلمیحات پڑھ کر قرانی آیات تک رسائی حاصل کی۔ نظیر کی حمد نگاری کا بخوبی مغربی ادب کے دیوتاؤں کی حمد سے لے کر عیسائیت کے حمد نگار شعرا کے مقابل رکھ کر مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ڈنمارک کے ابتدائی چار بڑے شاعر اپنی حمد نگاری کے لیے معروف ہیں۔ ان کی شاعری سے تقابلی جائزہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ بین الثقافتی، بین المذاہب اور لسانی اعتبار سے نظیر کا مقام آج کی گلوبل دنیا میں بھی بہت بلند ہے۔ اگر پاکستان میں پی ایچ ڈی عام شخصیات سے بالاتر ہوکر ایسے شعرا کا عالمی ادب سے موازنہ کیا جاسکے تو طالب علموں کے لیے نئے آفاق تک رسائی کے راستے کھلے ہیں۔

پھر میں نے نظیر کی باقی حمدیہ نظمیں بھی پڑھیں۔ کبھی مجھے ایسے محسوس ہوتا کہ بابا جان اپنے جانے کے بعد بھی مجھے اس کتاب کی صورت میں مزدوری پر لگا گئے، اب پھر تخیل میں ان کی باتیں، لب ولہجہ، ان کا انداز اور ان کی تدریس سے خوشہ چینی کرتے ہوئے مجھے ازسرِ نو ان دنوں کو

تصور میں زندہ کرنا یا شاید میں ان بے فکر، کدکڑے لگاتے، سورج کی کرنوں جیسے بچپن میں واپس چلی گئی جس نے میری سماعتوں سے دھاکوں، دھمکیوں اور بچوں کو ساتھ لے کر دربدر انشورنس کے مکانوں میں کھائے گئے دھکوں سے آزاد کر دیا۔ جن دنوں بچوں کو ہر مرتبہ نئی رہائش کے ساتھ نیا بس روٹ سیکھنا پڑتا، مجھے بھی ہر مرتبہ پرانے ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے نئے راستے سمجھنا پڑتے جب کہ میری یاداشت میں سے سمت اور راستے کی حِس بالکل ختم ہو چکی تھی۔

انڈیا جانے کا سنہری موقع ملا تو میں نے کئی نادر کتب خریدیں۔ نظمیاتِ نظیر برسوں میرے سرہانے پڑا رہا اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس شاعر سے اور اس کے علم وفضل سے مجھے عشق ہو چلا ہے۔ مجھے بہت دوستوں نے مشورہ دیا کہ آپ نظیر پر پی ایچ ڈی کر ڈالیں لیکن سند یا ڈگری کی مجھے نہ خواہش تھی نہ ضرورت، شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے بھرپور دلجمعی سے اسے پڑھا۔ پھر مجھے سمجھ آ گئی کہ ہماری امی جی کو اتنی باتیں، اتنی امثال اور ایسے محاورات و اساطیر سے مزین جھاڑ جھپاڑ کیسے آتی تھی۔ بابا جان کا تدریس سے عشق آج ان کے رخصت ہونے کے چالیس برس بعد بھی میرے ہمراہ ہے۔ وہ صرف میرے معلمِ اول ہی نہیں آج تک راہنما بھی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے ہمیشہ اپنے پیروں پر رفتار اور اپنے پَروں پر پرواز کا تعین کرنے کا اعتماد حاصل رہا اور میں نے شاعری کی دنیا میں کسی عروض دان کو گاڈ فادر نہیں بننے دیا۔

••

گرمیوں کی چھٹیاں ہوتیں تو سب لوگ سیر سپاٹوں پر نکلتے۔ اب ہم کہاں جائیں؟ ہماری اماں ہمیں صبح ناشتہ کروا کر بابا جان کی طرف ہنکا دیتیں جب کہ شام کو مغرب کے بعد بابا جان خود بلوا لیتے۔ لاکھ روؤ پیٹو، بہانے بناؤ، اور ابا جی اس معاملے میں یوں خاموشی اختیار کرتے جیسے وہاں موجود ہی نہیں ہیں۔ بابا جان سب باتوں سے بے نیاز ہمارے لسانی ذخیرے میں اضافے کے لیے کوشاں رہتے۔ کوئی ایک لفظ دے کر اسے مکمل کرنے اور ایک سے زیادہ الفاظ بنانے کا کام تھما دیتے۔

''بے: اب اس کے سامنے الفاظ لکھو۔''

لڑکے بغیر کسی جھجھک کے، مزے سے الفاظ بنانے لگے۔ بے شرم، بے حیا، بے غیرت۔''

''بابا جان لگتا ہے کہ یہ پڑھائی نہیں بلکہ دشنام طرازی سکھائی جا رہی ہے۔''

''کیوں؟، ذرا دماغ استعمال کرو اور لکھو، بے گناہ، بے خطا، بے ضرر، بے قصور۔'' پھر

اگلا لفظ دیتے اور کہتے، ''اب 'با' سے الفاظ بناؤ۔''

''با اصول، باضمیر، باوقار، باحیا، بارعب'' ہم جھٹ سے لکھ کر دکھا دیتے۔

••

بابا جان جیسے مدرس اور معلم کی روح میرے اندر بھی کہیں خیمے تان کر بیٹھ گئی۔ پاکستان، ڈنمارک، امریکہ، برطانیہ جہاں بھی مجھے موقع ملا میں نے تدریس کے نظام کو بغور دیکھا۔ اب جب میرے بچے میرا مذاق کرتے ہیں کہ امی کا بس چلے تو گھر سکول بن جائے تو مجھے ابا جی کی بہت یاد آتی ہے جنھوں نے گھر کو واقعی مدرسہ بنا رکھا تھا۔

درسِ ادیب اگر بوَد زمزمۂ محبتی
جمعہ بہ مکتب آورد طفلِ گریزپای را

نظیری نیشاپوری

(اگر معلم کا درس کوئی محبت کا نغمہ ہو تو وہ جمعہ یعنی تعطیل کے دن بھی مکتب سے گریزاں بچے کو مکتب میں لے آئے)

میرا دل ہمیشہ یہ کہنے کو مچلتا کہ بابا جان میں تو کسی دن بھی یہاں آ کر پڑھنے کو تیار نہیں ہوں۔ میری کیا سزا ہے؟

تدریس میں محبت اور مزاح بابا جان کی خصوصیت تھی۔ شاگرد سے یوں سوال کرنا کہ جیسے آپ اس سے کچھ سیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنے بچوں کو اردو اور قرآن پڑھنے کہیں نہیں بھیجا بلکہ اڑوس پڑوس میں جو بچہ ہاتھ آ جاتا اسے بھی پڑھانے کی کوشش رہتی۔ شاید یہ اندر لگے اس درخت کے برگ و بار تھے جن کی آبیاری بابا جان نے اپنی زندگی کا مقصد بنا رکھا تھا۔

••

زمانۂ طالبعلمی میں حساب کے مضمون سے میری جان جاتی تھی۔ نہیں شاید یوں کہنا چاہیے کہ بابا جان کے جانے کے بعد مجھے ریاضی مضمون سے نفرت ہوگئی۔ میٹرک کے امتحانات تک ابا جی کو باضابطہ فکر نے آلیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی ترقیِ معکوس! کہاں اعلیٰ ترین نتائج اور کہاں صرف پاس ہونے کو معیار قرار دے رہی ہو۔ آخر چند ہفتے مجھے بھائی افضل راٹھور سے پڑھایا گیا جن کا بطور طالبعلم ہمارے گھروں میں آنا جانا تھا۔ پتہ نہیں اب حساب ایک چیلنج تھا یا زندگی میں پہلی دفعہ ٹیوشن پڑھنے کی شرمندگی، میرے نتائج نے ایک مرتبہ پھر ابا جی کو حیران کر دیا۔ بیٹا کیا تھا اگر

پہلے ہی محنت کر لیتیں۔ لیکن مجھے مسرت اس بات کی تھی کہ کالج میں حساب نہیں پڑھنا پڑے گا۔ ابا جی یہ معمہ ہی سلجھاتے رہ گئے کہ ریاضی سے یک بیک اتنی پرخاش کیا ہوگئی۔۔۔۔ یہ راز کئی دہائیوں کے بعد کوپن ہیگن کے کمپیوٹر کورس کے دوران کھلا۔ بالکل ابتدائی کورس کے بعد جب میں نے فوری طور پر نہ صرف بنیادی استعداد حاصل کر لی بلکہ اردو کمپیوٹنگ کی طرف بھی رجحان ہوا اور مختصر مدت میں ڈیزائننگ تک ذاتی کوشش سے بغیر کسی استاد کے سیکھ لی۔ سکول میں آئی ٹی کا استاد کئی مرتبہ حیران ہو کر پوچھتا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ حساب سے بیزاری ظاہر کرتی رہیں اور کمپیوٹر سیکھنے میں سائنٹفک اذہان کو پیچھے چھوڑ دیا؟ پھر ایک دن اس نے ایک عجیب سوال کیا، ''کیا تمھیں ریاضی کے اساتذہ پسند تھے؟''

''نہیں'' غیر ارادی طور پر بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''ہاں، یہی تمھارا مسئلہ رہا ہے یقیناً'' اس نے اپنے اندازے کی تائید میں سر ہلایا۔

پھر میں نے منطقی انداز میں سوچنا شروع کیا اور علم ہوا کہ بابا جان کی جدائی کے بعد سکول میں ایک تو استاد بہت تبدیل ہوئے، دوسرے عین حساب کے پیریڈ میں بیڈمنٹن کی کھلاڑیوں کی پریکٹس شروع ہو جاتی جس کی بہترین کھلاڑی ہونے کی وجہ سے مجھے پریکٹس کے لیے جانا ہوتا اور آخری وجہ ایک استاد کا ضرورت سے زیادہ مطلق العنانی رویہ تھا۔ نیز ان کی بھرپور کوشش تھی کہ اپنی ایک منظورِ نظر کو جماعت میں اول درجے پر کھڑا کر سکیں۔ ان کے آپس میں گھریلو تعلقات بھی تھے اور وہ گاؤں سے آکر ان کے گھر ہی رہتی تھیں۔ انھیں یہ بھی خبر تھی کہ ان کے گھر میں بچیوں کو پڑھانے کا رواج نہیں تھا اور میٹرک کرتے ہی اس کی شادی بھی ہو جائے گی۔

کئی مرتبہ بغیر وجہ کے ڈانٹتے ہوئے ''لیاقت'' اور ''اہلیت'' کو طعنے کی صورت میں پھینکا۔ اب گھر آکر استانی صاحبہ کی شکایت کا فائدہ ہی نہیں تھا۔ کوئی شنوائی نہ ہوتی کیونکہ استاد کا درجہ کسی پیر و مرشد جیسا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ صرف مجھے سدھرنے کا کہا جائے گا۔ البتہ اس مرض کی تشخیص کے بعد میں نے سکول میں معاون استاد کے طور پر تدریس کے گھنٹے لیے اور باقاعدہ طالبعلموں کی مدد کے بہانے حساب پڑھا اور خود میرے لیے حیران کن بات یہ تھی کہ مجھے اس تعلیم کے حصول میں لطف آنے لگا۔ بابا جان کی بات یاد آئی کہ شاعری کی کوئی ایک تفہیم اور تشریح نہیں، یہ انسانوں کے ذہن کے مطابق بدل جاتی ہے لیکن حساب ہمیشہ ایک ہی نتیجہ دے گا: ٹھوس اور منطقی، اسی لیے حساب میں پورے نمبر ملتے ہیں۔ سائنس اور ریاضی الجبرے سے ان کو خصوصی لگاؤ تھا۔

مجھے اردو گنتی اور حساب میں جو مشکل ترین بات لگتی تھی وہ رقوم کو پڑھنا تھا۔ سینکڑہ اور ہزار، دہ ہزار کے بعد میری گنتی ختم ہوجاتی۔ یہ بابا جان کا احسان تھا کہ انھوں نے مجھے کروڑ، دہ کروڑ، ارب، دہ ارب اور کھرب تک کی گنتی لکھنا پڑھنا اور بولنا سکھائی۔ میں نے ارب کو پہلی دفعہ عرب لکھا تو بابا جان ہنس پڑے، پھر کہنے لگے ہاں ارب کی گنتی تک عرب ہی پہنچے تیل بیچ بیچ کر۔

••

بابا جان کے ہاتھ میں سید سلیمان ندوی کی کتاب تھی۔ ''چلو یہ اقتباس پڑھو۔۔۔ یہاں سے۔'' انھوں نے صفحے پر انگلی رکھی۔ کتاب پر نشان لگانا ان کو سخت ناپسند تھا۔

''یا اللہ یہ کیا عذاب ہے؟ کس عالم نے کہا ہے کہ عربی ضرور پڑھنی ہے؟'' میں نے حسبِ عادت منہ بسور کر کہا۔

''جیسے انگریزی اردو میں نہیں پڑھی جاتی، جان مارتے ہیں لوگ کہ صحیح تلفظ ہو، اسی طرح اردو کا بھی اپنا ایک تلفظ ہے۔ زیر زبر کے فرق سے معنی و مفاہیم بدل جاتے ہیں۔ اردو آئی جو عربی سے ہے۔ پھر فارسی آئی اور اسے تحریر کرنے کے لیے بھی اردو ہی کا قالب اور پیرہن اختیار کیا، وہاں سے زبان کی ترویج ہوئی اور حکومت کی سرپرستی اور سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے رواج پا گئی۔

میں نے چند ثانیے غور وخوض فرمایا۔ پھر ارشاد کیا، ''تو بابا جان یہ جو علاقائی زبانیں ہیں ان کے ساتھ جنگ وجدل رہے گا؟''

''یہی تو مسئلہ ہے کہ زبانوں کی بقا کی جنگ میں وہی زبان جیت پاتی ہے جسے سرکاری سرپرستی حاصل ہو، جو تعلیم وتدریس اور رابطے کی زبان ہو۔ جس کے ساتھ معیشت بھی ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو۔ انگریزی بین الاقوامی اور ایسی زبان ہے جسے کم وبیش سب سمجھتے ہیں۔ اگر آپ درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہونا چاہتی ہیں تو تلفظ اور اس کے ماخذ پر محنت کرنا ہوگی، مطالعہ وسیع کرنا ہوگا۔ اور یہ جو طوطے چڑیا اور بلیوں بونوں کی نظمیں لکھتی رہتی ہو ان پر بھی محنت کرنا ہوگی۔''

مجھے اپنی نظموں کی توہین بہت بری لگی اور میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

''اچھا تو آپ دوبارہ غور وخوض فرما رہی ہیں؟ ارشاداتِ عالیہ کا منتظر ہوں'' ابا جی کو میرے اوٹ پٹانگ بیانات پر بہت ہنسی آتی۔

''نہیں اب میں کچھ نہیں فرمانا چاہتی'' میں نے ناراضی دکھانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ فارسی، عربی پڑھنے سے اردو بہتر ہوگی۔ پنجابی،

سرائیکی، سندھی پڑھنے سے نہ صرف ذہانت کو جلا ملے گی بلکہ ان زبانوں میں ادب کا جو نایاب و نادر ذخیرہ ہے اس تک بھی رسائی ہوگی۔ رہا تلفظ کا معاملہ، تو وہ مشق سے ٹھیک ہوگا۔''

••

میں نے اپنے سامنے رکھی عبارت کو بلند آواز سے پڑھا۔

''رکو، رکو'' باباجان جان برافروختہ ہوکر بولے، ''شمس الجہلاء، اسے تَ حک کُم، نہیں تحکّم پڑھو، اور پھر اسی وزن پر ترحم، تشدد اور تردد وغیرہ۔ اس کو فعولن کے حوالے سے یاد رکھو تو غلطی نہیں ہوگی۔''

انھوں نے اسم، مشتق اور افعال پر ایک لیکچر دے کر سمجھانے کی کوشش کی، جو نہ تو میں نے سمجھ کر دی اور نہ ہی میرے پلے پڑ سکتی تھی۔ البتہ سب بچوں میں لے دے کر عزیز بھائی کو عربی زبان سے محبت بھی ہوئی اور بہت حد تک عبور بھی حاصل کیا۔ پھر حافظِ قران ہونے کی وجہ سے ان کے لیے عربی زبان بہت آسان رہی۔

باباجان ہمیشہ کہتے کہ اردو تلفظ کو درست رکھنا ہے تو اعراب لگا کر مسئلے کا حل نکالیں اور قاعدہ سمجھ کر لفظ یاد کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ تلفظ یا املا غلط ہو۔

''جی باباجان'' میں بظاہر پوری نیاز مندی سے کہتی لیکن مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ عربی سے الفاظ اتنی مار پیٹ اور ٹھونک ٹھانک کر ادھر لانے کی کیا تک ہے۔ کوئی آسان طریقہ نہیں ہوسکتا کیا۔ لیکن جب میں نے مغربی زبانوں کی تاریخ اور ارتقا دیکھا اور یورپ میں لاطینی، فرانسیسی اور جرمن کا راج دیکھا اور مقامی زبانوں پر اس کے اثرات دیکھے تو مجھے سمجھ آ گئی کہ ہر زبان کے پیچھے صدیوں سے رائج دوسری زبانوں کے گلستان سے بیج اور پودے لا کر لگانا ناگزیر ہوتے ہیں۔

••

باباجان چھت پر کیسری پھولوں والی بیل کے پاس کرسی بچھائے بیٹھے تھے۔ نجانے کون سے مہینے کا صاف شفاف آسمان تھا۔ میرے سامنے ان کے ہاتھ کی جگمگاتی تحریر والا کاغذ پڑا تھا۔ ''رفت رفتند رفتی رفتید رفتم رفتیم'' پھر مجھے حکم ہوا کہ، کرد، ہست، بود کے الفاظ لے کر اس صورت میں گردان بنا کر دکھاؤ۔ اس طرح کا پورا ایک گوشوارہ تھا جو مجھے نہ صرف مکمل کرنا تھا بلکہ اسے باآوازِ بلند پڑھنا بھی تھا۔ ابھی بھائیوں میں سے کوئی بھی نہیں پہنچا تھا اور مجھے یہ غم بھی کھائے جا رہا تھا کہ وہ سب چالاک کتنے مزے میں ہیں اور میں ان کے درمیان تنہا۔ ہمیشہ باباجان مجھے قید کر لیتے ہیں اور

کوئی بچانے بھی نہیں آتا۔ ہمارے سکول کی سب لڑکیاں کتنی خوش اور آزاد ہیں۔ کسی کے بابا جان نہیں ہیں، اگر ہیں بھی تو ہمارے بابا جان کی طرح ان کو اس طرح خوار نہیں کرتے۔

میں نے بیزاری سے آسمان کی طرف دیکھا۔ سفید دمکتے اڑتے بادل طرح طرح کی شکلیں بدل رہے تھے۔ سورج کی روشنی سے ان کے اندر کوئی مشعل سی جلنے لگتی۔ مخمور سے لڑکھڑاتے آسمان کی وسعت میں جہاں چاہتے بھاگتے پھرتے۔ ٹھوکر لگنے کا... گرنے پڑنے کا ڈر نہیں۔ یہ سماوی دنیا پتہ نہیں دل میں ایک عجیب کیفیت کیوں پیدا کر دیتی۔ کچھ عجیب اداسی، بے خودی یا شاید بے بسی کہ ہم ان بادلوں کو چھو کر کیوں نہیں دیکھ سکتے، ان کے اندر مشعل جیسی جو دودھیا روشنی بھری ہے اس کے نیچے بیٹھ کر کتاب کیوں نہیں پڑھی جا سکتی۔ کچھ نہ کچھ ضرور تھا جو شدید اداس کن اور بیزار کن تھا۔ ڈھلتی شام کی سنہری دھوپ کے دراز ہوتے بے رنگ سائے اور کرسی اٹھا کر دھوپ کے تعاقب میں جگہیں بدلتے بابا جان کیسے پرسکون اور خوش باش تھے، انھیں احساس ہی نہیں تھا کہ کسی کو قید کر کے بٹھایا ہوا ہے۔

''بابا جان!'' میں نے کاپی بند کر دی۔ ''یہ بادلوں کو دیکھیں، کتنی شکلیں بدل رہے ہیں۔ کبھی یہ بڑا سا ہاتھی، کبھی چھوٹی سی چڑیا جس کے پیچھے بہت سے درخت اڑتے چلے جا رہے ہوں جیسے تاج و تخت کسی کے قدموں کی دھول ہو، کبھی بہتا دریا، کبھی کسی بادشاہ کی پالکی، کبھی سر جھکائے کوئی بوڑھا کبڑا جادوگر۔'' میں نے بابا جان کی طرف دیکھا۔ وہ انہماک سے کتاب پر کاغذ رکھے کچھ تحریر کر رہے تھے۔

''ان سب پر نظمیں لکھو'' بابا جان نے چہرے کے آگے سے کتاب ہٹائے بغیر کہا۔

کسی کے بابا جان اتنے ظالم نہیں، کسی کی ماں ایسی بے مہر نہیں جو سکول سے آتے ہی بابا جان کے پاس روانہ کر دے۔ ایسے لگتا تھا وہ اوپر سیمنٹ کے چوبارے سے نیچے ہمارے گھر کے صحن میں جھانکتے رہتے۔ پھر ان کی آواز آتی...

''چناں... بچیاں نوں پڑھن بھیج دیو۔''

اور امی حکم کی تعمیل میں شور مچا دیتیں، ''چلو جلدی کرو، جلدی کھانا کھاؤ اور جاؤ۔ بابا جان بلا رہے ہیں۔''

کبھی میں احتجاج کرتی، ''کیوں جانا ہوتا ہے؟ بابا جان چھٹی دینے کا نام نہیں لیتے۔''

''بے قدریو، یاد کرو گے کبھی، کنواں خود پیاسوں کو آواز دیتا ہے۔ سارا شہر ان کے پاس خود چل کر آتا ہے تم لوگ بے شرم بے قدرے۔''

بیرونی دروازے تک جاتے جاتے امی کی آواز پیچھے چھوڑنے آتی۔

••

خیریت گزری کہ بابا جان جدید میڈیا کے دور سے پہلے ہی چل دیے تھے ورنہ ان کو تلفظ کی یہ اغلاط ذہنی مریض بنا دیتیں اور میڈیا میں جملہ در جملہ انگریزی کا راج الجھن میں مبتلا کر دیتا اور وہ دن رات ان لسانی جھٹکوں کی تاب نہ لاتے ہوئے راہیِ ملکِ عدم ہو جاتے۔ اردو میں انگریزی کے ٹانکے لگانے کے وہ سخت خلاف تھے۔ ''بھئی یہ کیا ہوا، یا تو پوری انگریزی بولو یا مکمل اردو میں بات کرو۔ یہ کیا ذہنیت بن چکی ہے اور آپ لوگوں کو کوفت بھی نہیں ہوتی؟ انکل جی، آنٹی جی، پلیز جی، تھینک یو جی۔ اگر اندازہ ہے کہ صرف آنٹی کہنے سے تکریم کا حق ادا نہیں ہو رہا تھا تو اپنا رشتہ بلاؤ۔ دے بندہ ایک الٹے ہاتھ کی۔''

پتہ نہیں بابا جان کس کا غصہ اتار رہے تھے۔ ہم بے چارے تو تب بھی اور آج بھی اپنا ہی کلچر گود لیے پھر رہے ہیں۔ ممی ڈیڈی کلچر آج بھی ہمارے گھر سے کوسوں دور ہے۔

••

آٹھویں جماعت کے بعد بابا جان نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ ہم نے کیا گنوا دیا ہے۔ انسان کی کم نصیبی یہی ہے کہ جب اس کے پاس نعمت ہوتی ہے تو اسے اندازہ نہیں ہوتا کہ اسے کس چیز سے نوازا گیا ہے۔ اور جب وہ چھن جاتی ہے تب سمجھ آتی ہے کہ اسے کس چیز سے محروم کر دیا گیا ہے۔

سکول سے آ کر وقت کاٹے نہ کٹتا۔ بلاوجہ ہر ایک سے جھگڑا کرنے کو جی چاہتا۔ ایک دن تائی جان نے بلایا کہ بابا جان کا کمرہ صاف کرنا ہے۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ میں ہرگز نہیں جاؤں گی اوپر۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اپنی ہر وقت کی تدریس اور ہماری ادبی مشقت پر کوشاں چھتنار شخصیت کے ساتھ ان کا کیا مقام تھا۔ علم و حکمت اور حکایات کے ذریعے انسان سازی ان کا منشور تھا۔ اپنے چھوٹے مودب بھائیوں پر بلا کے مہربان اور ان کی اولادوں کے لیے سایہ دار شجر کی صورت موجود رہے۔ بابا جان آج بھی میرے ساتھ ہیں۔

ابا جی کو میں نے کئی راتیں مضطرب دیکھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ چھت اڑ گئی ہے گھر کی۔ ابا جی کو بابا جان کے جانے کے بعد میں نے بہت پریشان دیکھا۔ جب شام کو سب گھر بیٹھے ہوتے تو ابا جی کئی دفعہ چونک جاتے...

''لگتا ہے لالہ جی نے آواز دی ہے۔ بچوں کو پڑھنے بھیجو فوراً۔''

مجھے بہت دیر بعد اس کیفیت کی سمجھ آئی جب مجھے محسوس ہوتا کہ ابا جی نے کہیں قریب سے ہی آواز دی ہے۔

میرا بیٹا جب یونیورسٹی منتقل ہوا تو میرے لیے بہت مشکل وقت تھا۔ مہینے میں ایک مرتبہ ہی ملاقات ممکن ہوتی۔ مجھے وہم آتے رہتے کہ میرے نازوں پلے بچے کو کھانا بھی خود پکانا پڑتا ہوگا جو گھر قدم رکھتے ہی سوال کرتا، ''آج کیا کیا پکا ہے؟'' جسے ہمیشہ رنگ برنگے پکوان کھانے کی عادت رہی۔ ایک دن شام کو میں کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ اچانک میرے بالکل قریب سے اس کی آواز آئی، ''امی!'' میں نے ہڑبڑا کر کتاب بند کر دی۔ صرف ایک لفظ امی میں پریشانی اور فریاد سی تھی۔

''عالیہ۔۔۔!'' میں نے کچن میں کھٹر پٹر کرتی بیٹی کو آواز دی، ''آپ کو اُسامہ کی آواز آئی؟''

''نہ کریں امی'' اس نے وہیں سے جواب دیا، ''وہ آپ کا بے بی نہیں، بڑا ہو گیا ہے۔''

میں نے فوراً اس کا نمبر ملایا۔ فون نمبر بند جا رہا تھا۔ ادھر میری تشویش اور بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ لگاتار کالز کے دو گھنٹے بعد پیغام آیا، ''سوری امی جی پڑھ رہا تھا۔''

میرے مسلسل سوالوں کے باوجود اس نے قبول نہ کیا کہ کوئی مسئلہ تھا۔

''صفدر اللہ مرزا! آپ کو یاد کرنے کے علاوہ بھی بہت سے کام ہیں''

وہ اکثر مذاق سے مجھے صفدر اللہ مرزا کہتا۔ میرا طریقہ ابتدا سے ہی بچوں کے ساتھ ایسا رہا کہ محبت کی بے کرانی اپنی جگہ، لاڈ پیار اور ناز اٹھانا مامتا کا تقاضہ سہی لیکن تربیت میں اصولوں کی پابندی خود بھی کرنی ہے اور بچوں سے بھی کروانی ہے۔

ایک مرتبہ میرے بھائی نے اسے کہا، ''یار دیکھو میری بہن نے آپ کو بڑی مشکلوں سے اکیلے پالا ہے۔ نانی نانا بھی چلے گئے ہیں۔ اسے تنگ نہ کیا کرو۔'' بڑے مزے سے بولا، ''یار ماموں یہ آپ کی بہن صدف مرزا میں تو شاید چار مردوں کی سی سختی بھری ہے اللہ نے۔ چار بندے ہیں میری اماں میں، اسی لیے میں ان کو صفدر اللہ مرزا کہتا ہوں۔''

عالیہ کی شادی کے بعد جب میری بیماری کی وجہ سے وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آیا تو ایک دن اس نے اعتراف کیا کہ ''واقعی ان دنوں میں بہت پریشان تھا اور مجھے آپ کی شدید یاد آتی تھی کہ کیسے آپ نے ہمارے لیے اپنے شوق اور کیریئر کی قربانی دی۔ منہ سے بات نکلتے ہی پوری کی، کسی کے آگے کبھی ہاتھ نہیں پھیلایا۔ بلکہ ہمیشہ ہر ایک کے پھیلے ہاتھوں پر کچھ نہ کچھ رکھا۔ میں نے

واقعی آپ کو ان دنوں بہت یاد کیا تھا۔'' اگلی بات جو اس نے کبھی مان کر نہ دی وہ اس کی بھیگی آواز میں آنسوؤں کی جلترنگ تھی۔

اس دن بغیر اس سے بات کیے مجھے اس کی حالت کا اندازہ تھا یقینی طور پر وہ اداس، اکیلا، کمرے میں رویا ہوگا ورنہ اتنی دور بیٹھ کر میرے کلیجے کو ہاتھ کیوں پڑتا اور اشکوں کی جھڑی کیوں لگتی؟ میری رات کی نیند اڑ گئی تھی اس سے۔ کمرے کی کھڑکی کے بڑے شفاف شیشے سے پورے چاند کی روشنی براہِ راست تاریک کمرے کو جزوی طور پر روشن کیے ہوئے تھی اور میں اس کے قدم گن رہی تھی کہ کب یہ چاندنی واپس لوٹے گی اور رات ڈھلے گی۔ یہ رات زندگی کی ان ہی چند راتوں میں سی تھی جسے میں نے جاگ کر شعور کی پوری قوت اور ارادے کی تمام تر طاقت سے دھکیل کر صبح میں بدلا تھا۔ روشنی ہو، دنیا جاگے تو میں بھی ازسرِ نو جینے کی کوشش کروں۔

میں نے کئی ڈینش دوستوں سے یہ بات کی کہ بچے دور ہوں تو کیا کبھی انھیں بھی اس کی آواز سنائی دیتی ہے؟ جواب میں کئی ملتی جلتی کہانیاں سنیں۔ مجھے شاید کبھی اس بات کی سمجھ نہ آ پائے گی کہ یہ کیسی کیفیت ہے یا محبت کی کون سی منزل ہے جسے مذہب اور اعتقاد سے اوپر کا درجہ حاصل ہے۔

''اگر کوئی ماہرِ نفسیات سن لے تو آپ کو ذہنی مریض قرار دے جسے آوازیں سنائی دیتی ہیں۔'' میری بیٹی ہنس کر کہتی۔

••

جہلم، سرائے عالمگیر اور کھاریاں کے گرد و نواح میں دیہاتوں میں ابھی تک سکولوں کی سہولت نہیں پہنچی تھی۔ بابا جان کے پاس قرب و جوار کے گاؤں سے اکثر لوگ پڑھنے آیا کرتے تھے۔ جب میں نے چھوٹے چھوٹے آرٹیکلز کی صورت میں یہ یادیں قلمبند کرنا شروع کیں تو کوپن ہیگن میں پنجاب ریسٹورنٹ کے مالک محترم فرید صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ بھی بابا جان کے شاگرد رہے ہیں۔ ہم اکثر ٹی وی لنک کے مہمانوں کو وہاں عشائیے پر لے کر جاتے ہیں۔

میرے لیے یہ بات بہت خوش کن بھی تھی اور عجیب بھی کہ دنیا کی اس قدر چھوٹی ہے۔ سب ایک عالمی دیہات کے شہریوں کی طرح ایک دوسرے سے واقف ہو رہے ہیں۔ میں ان سے گفتگو کے لیے بطورِ خاص گئی۔ ان کے بارے میں باتیں کرنا شاید بچپن کے دلکش بے فکری کے دنوں میں واپس لوٹ جانے جیسا تھا۔

فرید صاحب نے بتایا کہ وہ قریبی گاؤں کھمبی سے پہلے تو پیدل چل کے سرائے عالمگیر آیا کرتے تھے، اس کے بعد وہ سائیکل پر آنے لگے۔

اگر میں صرف بابا جان کے شاگردوں اور تایا جان اور ابا جی کے مریضوں اور چچا جان کے دوستوں کی کہانیاں جمع کرنے لگوں تو شاید یہ کتاب اسی تذکرے کی نذر ہو جائے۔

صرف بابا جان کے شاگرد اور ان کے دوست احباب دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا اندازہ مجھے اکثر ہوتا رہتا لیکن جو سب سے مشہور بات ہوئی وہ یہ تھی کہ برطانیہ میں ایک پروگرام کے دوران وہاں کی معروف شاعرہ محترمہ طلعت سلیم سے ملاقات ہوئی۔ بے حد شفقت اور محبت سے ملیں۔ مجھے جامنی رنگ کا روپہلی مکیش سے بھرا دوپٹہ دیا جو آج بھی ان کے خلوص کی مہک دیتا ہے۔ میں نے واپسی سے پہلے انھیں فون کرنے کی کوشش کی۔ ان کے شوہر نے فون اٹھایا۔ میرا انٹرویو شروع ہوا کہ ڈنمارک سے تو آئی ہیں لیکن پاکستان میں کہاں سے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ جہلم سے ہوں۔ پھر سوال آیا جہلم میں کس علاقے سے؟ ہوتے ہوتے بات سرائے عالمگیر تک پہنچی اور پھر وہاں کی مرزا فیملی تک۔ کہنے لگے میں اس ہی علاقے سے ہوں، بعد میں کراچی چلا گیا۔ ایک استاد مرزا غلام نبی تھے وہاں پر، سرائے عالمگیر میں تعلیم اور تدریس کی بنیاد رکھنے والے۔ لیکن آپ ان کو کہاں جانتی ہوں گی؟ ان کے ایک بھائی برطانیہ میں بہت فعال تھے۔

میں اپنی دنگ رہ جانے والی کیفیت آج بھی محسوس کر سکتی ہوں۔ لیکن جب میں نے انھیں بتایا کہ وہ میرے بابا جان ہیں تو اب ششدر رہ جانے کی باری ان کی تھی۔ ایک دم چونک کر بے ربط سوال کرنے لگے، ہائیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کمال ہے۔ ہمیں اب تک علم ہی نہیں ہوا۔ پھر شفقت سے اصرار کیا کہ ہمیں مل کر جانا۔

••

اب جب سب ہی چلے گئے، ایک ہی شہر میں زمیں اوڑھے خفتہ ہیں، لیکن برکتوں کا سایہ ایک شامیانے کی طرح صرف مجھ پر ہی نہیں، میرے بچوں پر بھی تنا ہے۔ جب ان کو کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے، میرا تصور زقندیں بھرتا بابا جان کے کتابوں سے ٹھنسے کمرے کے اس کونے پر کھڑا ہو جاتا ہے جہاں بیٹھ کر مجھے عربی فارسی کی بے رنگ، بے معنی اور بے فائدہ گردانیں یاد کرنا ہوتی تھیں، جو میرے نصاب کا حصہ بھی نہیں تھیں اور جن کو بغیر غلطی کے سنائے میری جان بھی نہیں چھوٹتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک خوبصورت عہد تھا جو بابا جان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

جواہر سے بنا زینہ
جہاں شمسی شعاعیں نور کا ریشم بچھاتی تھیں
جہاں ہر سیڑھی چڑھتے ہی
پکڑ کر انگلیاں کرنیں
نئے منظر دکھاتی تھیں

جواہر سے بنا زینہ
جہاں پر رفعتیں مہتاب کی بھی سر جھکاتی تھیں
جہاں شفقت برستی تھی
جہاں رحمت اترتی تھی
جہاں آ کر بلند بختی پیشانی چومے جاتی تھیں

جواہر سے بنا زینہ
جہاں پر منتشر حرفوں کو پیکر ملتے رہتے تھے
مری مفلوج سوچوں پر
جہاں پر زمزمہ خوانی کی اک دلدار عطا اتری
مودت اور مروت کے
طلسماتی خصائص سے اٹا زینہ
بلندی کی طرف مائل
مگر واپس پلٹنے کے سبھی امکان بند جس پر
جو کندن اوڑھے
اب بھی ایستادہ ہے
یہ زینہ روشنی کا استعارہ

اک منارہ جو
بصارت اور بصیرت کو نئی وسعت عطا
کر کے
مجھے یہ اوج پر جانے کا ہر رستہ دکھاتا ہے
مگر اس خاک سے پیوند ہے
پہلا قدم اس کا
سیادت، علم و حکمت کے

جواہر سے بنا زینہ
غنی از دو جہاں زینے کے در
مجھ پر ہمیشہ وا
مری ساری توجہ کا یہی کعبہ یہی قبلہ
مرے عزم و محبت کا یہی مکہ... مدینہ
ابد تک شالا قائم ہے
سبق اقراء کا دائم ہے

••

نطق و تکلم کی فصاحت کا معلم

بہت برس پہلے میں نے فیسبک پر ایک پوسٹ لکھی۔
ہجر تیرا جے پانی منگے تے میں کھو نیناں دے گیڑاں
جی کردا تینوں کول بٹھا کے درد پرانے چھیڑاں
تایا جان.. غلام محی الدین مرزا
ابا جی کے لالہ جی، ساری عمر دونوں بھائی بغل میں رہتے رہے، لیکن میرے بچپن کی یاد ایک بات بہت واضح جھلک دکھاتی ہے وہ یہ کہ جب بھی تایا جان آتے، ابا جی کھڑے ہو کر استقبال کرتے خواہ وہ دن میں دس مرتبہ آئیں۔ امی جی کو وہ ہمیشہ چناں کہہ کر لاڈ اور احترام سے مخاطب کرتے رہے۔

آج تایا جان نوے کی دہائی عبور کرنے کے بعد بھی چاق و چوبند اور ذہنی طور پر مستعد، کسی بھی شعر کا ایک مصرع بولیے اگلے لمحے دوسرا مصرع توپ کے گولے کی طرح داغا جائے گا۔ آپ غلط تلفظ سے اردو بولیں تو یوں لگے گا جیسے آپ سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو۔ انجمنِ حمایتِ اسلام کے مشاعروں کی داستانیں میں نے ان سے ہی سنیں۔ ابا جی کے عہد کی آخری زریں یادگار، جن کے وجود سے اس پورے عہد کی خوشبو آتی ہے۔ دعاؤں کی درخواست ہے۔

اس پوسٹ کے جواب میں جو خوبصورت تبصرے اور پیغامات ملے ان میں بھی یہی اصرار تھا کہ ایسے بزرگوں اور ان کی اقدار کے متعلق ضرور لکھنا چاہیے۔ کئی راستوں پر زِگ زیگ کرتی بھاگتی زندگی سے لمحات مستعار لینے کی خواہش ہی رہی، حقیقت کبھی نہ بن پائی۔

••

ابا جی اور ان کے بھائیوں کی ایک ہی سوچ تھی کہ اللہ نے ہمیں دنیا کو جوڑنے کے لیے

پیدا کیا ہے۔ گھر سے باہر آپ اصلاح کا بیڑا تب اٹھائیں جب خاندان کے ساتھ صلۂ رحمی اور سلوک و اتفاق کے رویے پروان چڑھا سکیں۔ ابا جی اکثر حضرت علیؓ کا ایک قول دوہرایا کرتے۔ حضرت علیؓ سے پوچھا گیا، دوست اچھا کہ بھائی؟ فرمایا، وہ بھائی، جو دوست جیسا ہو، ہزار آپ کے گرد دوستوں کا میلہ ہو، وفاداری کے دعوے ہوں، اخلاص کے چرچے ہوں، لیکن خدا نخواستہ دم نکلتے ہی فوراً خاندان کو اطلاع کی جاتی ہے، بھائیوں کو پکارا جاتا ہے، تو پہلے ہی کیوں نہ خون کے رشتوں میں دوستی کے گلوکوز کی آمیزش کر دی جائے۔

تایا جان کو بابا جان سے صرف محبت ہی نہیں عقیدت بھی تھی۔ بابا جان نے ان کو پٹیالہ طبیہ کالج سے باقاعدہ طب و جراحت کی تعلیم دلوانے میں اہم کردار ادا کیا۔ سرائے عالمگیر میں باقاعدہ اسلامی دواخانے کی بنیاد رکھی گئی۔ بھائی جان احسان کو باقاعدہ میڈیکل کی تعلیم کے لیے لاہور بھیجا گیا۔ تایا جان کی زندگی کا مقصد ہی حکمت، طب اور رفاہِ عامہ کے لیے ان کا استعمال تھا۔ کتابوں سے حد درجہ محبت تھی۔ اہلِ علم کی صحبت میں رہنے کا شوق تھا۔ ملٹری کالج جو کہ دواخانے کے پہلو میں واقع تھا، ان کے اساتذہ سے تایا جان کی ہمیشہ صاحب سلامت رہتی۔ کوئی نہ کوئی کتاب ان کے سرہانے رہتی، صبح اخبار اور ریڈیو سے ان کے دن کا آغاز ہوتا جو رات عشاء کی نماز کے بعد مطالعے پر ختم ہوتا۔

••

تایا جان کے لاڈ کی مجھے کبھی سمجھ نہیں آئی۔ کبھی بے حد مہربان اور شیریں ترین لہجے میں فرماتے ''میری لائق بیٹی ہم تجھ پر فخر کرتے ہیں۔'' یکا یک میرا ستارہ بلند ہونا شروع ہوجاتا اور میں مسرت کے کوہِ ہمالہ پر چہل قدمی کرنے لگتی۔ اچانک ہی تایا جان کے ہاتھ میری کوئی تحریر لگ جاتی۔ انھیں میری لکھائی سخت ناپسند تھی،

''نالائق! یہ کیا لکھا ہے؟ صرف باتیں کرو، اس گھر میں سب سے لائق صرف عزیز الرحمان ہے۔'' تایا جان کاغذ کا ٹکڑا میرے اعمال نامے کی طرح لہراتے اور بائیں ہاتھ میں تھما دیتے۔ لو جی پہاڑ قدموں تلے سے سرکا لیا گیا اور سیڑھیوں کے بغیر نیچے اتار دیا گیا۔

••

ہمارے بزرگوں کی اعلیٰ صفات کا ہی ایک مظہر تھا کہ ہمارا خاندان یکجہتی اور حسنِ سلوک کا گہوارہ رہا۔ ہم لوگوں کو کبھی اس بات کا علم ہی نہیں ہو پایا تھا کہ ہمارے گھروں کے باہر دنیا کی تعلق

داری کیسی ہے۔ میں ہوش سنبھالنے تک یہی سمجھتی رہی کہ ہم سب بہن بھائی ہیں اور بابا جان اور تایا جان بھی ابا جی کی طرح ہوتے ہیں اور یہ سب بھائی جن سے میں جا کر دھڑلے سے لڑائیاں کرتی ہوں اور دھاندلی سے بقول بابا جان ''رونڈ'' مار کے لوڈو سے لے کر پٹھو گرم اور بیڈمنٹن میں جیت آتی ہوں، ہمارے تایا زاد بہن بھائی ہیں۔ گھر میں پکا کھانا پسند نہیں آیا یا کسی سے جھگڑا ہو گیا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، دیوار پھلانگو اور تایا جی کے گھر جا کر جھانک لو کہ کیا پکا ہے۔

••

ہمارے گھر میں چونکہ ٹی وی تو تھا نہیں اس لیے شام اور رات مطالعے اور تدریس کی نذر ہوتی تھی۔ کالج کی تعلیم کے دوران جب بین الکلیاتی مقابلوں میں شرکت کے لیے کوئی موضوع آتا تو گھر میں باقاعدہ نئی مصروفیات شروع ہو جاتیں۔ ابا جی شام کو مباحثے کی موافقت اور مخالفت میں دلائل سنتے، تلفظ اور ادائیگی کی درستی کرتے۔ ایک ہی جملے کو نئے انداز میں بیان کرنے کا کہتے، پھر ان کے یارِ غار تایا جان کی آمد ہوتی اور معاون استاد کے ہاتھ میں چارج آ جاتا۔ تایا جان ابا جی کے لکھے الفاظ دیکھتے اور پھر صفحے کے آخر میں تمام نکات ایک کاغذ پر اپنے ہاتھ سے لکھتے۔ اور لکھائی ایسی خوبصورت جیسے بیر بہوٹیاں قطار باندھے ایک سمت کو رواں دواں ہوں۔ کسی لفظ کی غلط ادائی پر مصیبت آ جاتی۔ اس کا منبع ماخذ سمجھایا جاتا، ''عربی سے آیا ہے۔ اس کا تلفظ ویسے ہی ادا کرو''۔ اور میں دل ہی دل میں سوچتی کہ کیوں آیا ہے؟ وہیں رہتا۔ اچانک کسی عبارت کو بلند آواز میں پڑھنے کا حکم ہوتا۔ پھر مجھے روکا جاتا اور نشان دِہی کی جاتی، ''فارسی کی تراکیب ہیں سمجھ کر استعمال کرو۔''

اب باری نئے جملے بنانے کی ہوتی۔ ابا جی اہتمام سے اپنا قلم نکالتے اور لفظ کے نیچے خط کھینچ دیتے، یہ لفظ مونث نہیں مذکر ہے، مفتوح نہیں مضموم ہے، اسے زیرِ اضافی کے ساتھ پڑھو۔ پھر میری تحریر دیکھ کر بولے، مذموم، نہیں، مضموم، ضمہ سے۔ یعنی حرف پر پیش ہو۔ مکسور، مفتوح، مضموم، چلو دوہراؤ یہ الفاظ۔

گھر میں ہمیشہ ایک درس گاہ کا سماں بندھا رہتا۔ جب مقابلوں کا دور شروع ہوتا تو یوں لگتا جیسے اب گھر ہی میں مشاعرہ برپا ہونے کو ہے۔ تایا جان کو خبر ہوتی کہ مجھے بین الکلیاتی مباحثوں میں شرکت کے لیے جانا ہے تو وہ بھی شام کو آ جاتے۔ صحن میں پڑی چارپائی کے سامنے میز سجا دی جاتی۔ کرسیاں سامنے رکھ لی جاتیں اور محفل کا آغاز ہو جاتا۔ مجھے جو بات سب سے زیادہ بری لگتی وہ ''فاعلاتن فاعلاتن'' تھی۔ بھئی جب میں مصرع صحیح کہہ لیتی ہوں تو اس کو بلاوجہ کاٹنا پیٹنا ضروری ہے کیا؟

تایا جان خسرو کے اشعار دوہراتے۔

اے کہ می گوئی مرا خسرو نمی دانی عروض
من چہ محتاجِ عروضم تا کنم گفت و شنو
نظم سنجیدہ ہمی گویم، بموزونِ طبع
نکتہ سنجیدہ باشد وقت سنجیدن گرو!

پھر اس کا ترجمہ کر کے بتاتے کہ ''میں فنِ عروض سے واقف نہیں ہوں، نہ ہی میں اس فن کا محتاج رہا ہوں۔ میں تو اپنی موزونیٔ طبع کی صلاحیت سے اپنے کلام میں نکتے اور نزاکت پیدا کرتا ہوں۔'' کبھی اس بات کی مزید تائید میں رومی کے اشعار سناتے۔

شعر می گوئم بہ از قند و نبات
من نہ دانم فاعلاتن فاعلات

''ایسا کرو، اردو میں اس مفہوم کا شعر کہو'' تایا جان یوں فرمائش کرتے جیسے کہہ رہے ہوں ذرا انڈے پر کالی مرچ چھڑک دو۔ میں تک بندی شروع کر دیتی۔ ''مصرعے کہہ رہی ہو یا منجی پیڑھی ٹھونک رہی ہو؟'' وہ خفا ہوتے۔ مجھے یاد رہ گیا کہ غالب کے فارسی شعر پر بیٹھے بیٹھے اردو میں ایک شعر کہا

روح میں اٹھتے ہوئے حرفوں کی تکریم کروں
شعر خود کہتا ہے مجھ سے، اسے تجسیم کروں

تایا جان بے ساختہ بولے، ''محنت کرو لڑکی، محنت کے بغیر کچھ ہاتھ نہیں آتا۔'' ابا جی نے چاچا جان کو خط لکھا تو یہ شعر انھیں بھی پہنچایا گیا۔

ان کا جواب آیا،

''زندگانی ہے صدف، قطرہ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خودگر و خودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے''

''لالہ جی، اس کام چور سے کہیے کہ اقبال کے کلام سے صدف لفظ کے تمام تر اشعار چن کر لکھے۔ میں نے اسی لیے اس کا نام صدف رکھا ہے۔''

''میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گھر کی آبرو

میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہرِ شاہوار کر''

میں کتنے دن چاچا جان کا خط پڑھتی اور ہنستی رہی۔ ''ولایت بیٹھے ہیں پر آرام نہیں۔ بھئی مجھے کیوں کہتے ہیں، اپنی بیٹیوں کو پڑھائیں نا؟''

امی جی کے لاڈلے دیور کو کوئی کچھ کہے تو جائے اماں کہاں پائے؟ فوراً میری گوشمالی شروع ''یہ تم کہاں سے سیکھتی ہو اپنی پرائی؟ خدا ہی تمھیں ہدایت دے۔ پتہ نہیں کس پر گئی ہو تم؟''

امی جی سے مزید عزت افزائی سے بہتر ہوتا کہ میں کتابیں کھول کر صدف لفظ کے اشعار خوشخط لکھنا شروع کر دوں۔ بچپن میں مجھے معانی و مطالب سے کوئی غرض نہیں ہوا کرتی تھی اور نہ ہی اس عربی فارسی اور گردانوں کی بدمزہ تکرار سے کوئی دلچسپی تھی۔ مجھے یہ سب صرف اس لیے یاد کرنا پڑتا کہ تایا جان خوش ہوتے تھے۔ لڑکوں میں عرفان بھائی کی ذہانت کا چرچہ کرتے اور پھر میری یادداشت کو سراہتے لیکن میری لاپروائی سے نالاں رہتے۔

اس زمانے میں موبائل تو ہوتے نہیں تھے کہ مباحثوں کی ساری تفصیلات سب کو پہنچ جایا کرتیں، لیکن جب واپس آتی تو شوق سے ساری روداد سنتے، ''کتنے کالج آئے ہوئے تھے؟ باقی لوگوں میں سے کسی نے کوئی نیا نکتہ کہا؟ نئے اشعار نوٹ کیا کرو۔'' انعامات دیکھتے جو بعد میں کالج جمع کروانا ہوتے تھے اور سالانہ تقسیم انعامات کے جلسے میں دیے جاتے۔

••

تایا جان اکثر اوقات نمازِ عصر کے بعد ذرا کی ذرا ہمارے گھر آیا کرتے۔ میں دھوپ کے تعاقب میں کرسی لے کر دیوار کے کونے پر بیٹھی تھی۔

''اچھا وئی کڑیے۔۔ اج کیہہ پڑھیا لکھا ای،'' انھوں نے ہمیشہ کی طرح سوال کیا۔۔

میں نے اس دن کا پسندیدہ پنڈت ہری چند اختر کا ایک شعر سنایا۔

خدا تو خیر مسلماں تھا، اس سے کیا شکوہ

مرے لیے مرے پرماتما سے کچھ نہ ہوا

امی جی کا چھوٹی سی تپائی پر چائے کی ٹرے رکھتا ہوا ہاتھ رک گیا، ''اس لڑکی کو سمجھا لیں،'' امی جی نے غصے سے کہا ''کوئی نہ کوئی کفر پڑھتی اور بکتی رہتی ہے،'' لیکن تایا جان تو خود واہ واہ کر رہے تھے۔

••

کالج کے پروگرام میں جشنِ بہاراں کا اہتمام ہوا۔ اقبال کی نظم فصلِ بہار، ''خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار'' فارسی میں پڑھنے کے لیے جب میرا انتخاب ہوا تو دن رات کی محنت سے میں نے یہ نظم یاد کی۔ پھر اس کی ادائی کے لیے دونوں بھائیوں کے سامنے میری پیشی ہوتی۔ لفظ 'خ' کی ادائیگی میں مجھے مشکل پیش آ رہی تھی اور میں روانی میں جب پڑھتی تو اسے 'ہ' یعنی 'ہ' ہاتھ والا 'ہ' پڑھتی جس پر تایا جان برافروختہ ہو کر کہتے یہ تم نے کہاں سے ہ، ہ، کرنا سیکھا ہے؟ تین چار سال میں اور کچھ حاصل ہوا نہ ہوا، اقبال کا فارسی کلام ازبر ہو گیا۔ اگرچہ اس کے معنی اور شرح بہت بعد میں سمجھ میں آئے لیکن ابا جی کا یہی احسان کافی تھا کہ مقابلے اور مسابقت ہی کی فضا میں سہی لیکن کلام ازبر کرنے اور ادائی صحیح کرنے کی ایک لت لگا دی اور پھر تلفظ اور مخارج کی تکرار، بس بار بار یار اسے دوہرائیں۔

''اچھا جی'' میں مسکینی سے کہتی۔

''اتنی مرتبہ کہو کہ آپ کی ادائی خود کار ہو جائے اور خواب میں بھی اگر آپ کو یہ پڑھنا پڑے تو آپ کو اسی طرح روانی سے آئے۔''

جیسے میں خواب میں بھی یہی نظم پڑھوں گی۔

••

بابا جان اور تایا جان نے ہمیشہ امی جان کا غیر معمولی احترام کیا۔ ابا جی سے بے پناہ محبت کرنے والے تایا جان کا ایک سنجیدہ احتساب مجھے آج بھی یاد ہے۔ امی جی کو کھانسی لگی اور دو دن مسلسل ہوتی رہی۔ تایا جان نے ابا جی سے باقاعدہ باز پرس کی کہ تین دن سے اس کی کھانسنے کی آواز آ رہی ہے اور آپ نے کچھ نہیں کیا۔ پھر امی جی کو دوا دی کہ میرے سامنے بیٹھ کر کھاؤ۔ جاتے جاتے پھر ابا جی سے کہا ''رُبِ شہتوتِ سیاہ رات کو دو چمچ پلانا ہے سونے سے پہلے۔''

کتنے دن مَیں تایا جان سے ناراض ہوتی رہی کہ میرے ابا جی کو ڈانٹا ہے۔ تایا جان ہنس کر کہتے:

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

''تمھارا قصور نہیں۔ بس تمھیں لہو گرم رکھنے کو بہانے درکار ہیں۔'' ابا جی خاموشی سے ہماری گفتگو سنتے رہتے۔ بعد میں دھیرج سے کہتے ''لالہ جی نے بہت بگاڑ رکھا ہے۔ کیسے خوش ہوتے

ہیں تمھاری بے پَر کی باتوں پر۔‘‘

تایا جان ملٹھی کے بالشت بھر ٹکڑے امی جی کو دیتے، ’’چناں، اے دوٹے دے پلے نال بھن لیہہ‘‘ (چندا، یہ دوپٹے کے پلو سے باندھ لو) عورتیں دوا اس لیے بھی نہیں کھاتیں کہ دُور پڑی ہوتی ہے، اور اپنی ذات کو مؤخر کرنا ان کی فطرتِ ثانیہ بنا دیا گیا ہے... اس لیے خواتین کو اپنی دوا بس دوپٹے کے پلو سے باندھ لینی چاہیے جونہی گلا خشک ہو یا کھانسی آئے، منہ میں رکھو اور چباتی رہو کھانسی نہیں آنی چاہیے، گلے میں خراش پڑ جاتی ہے، اندرونی زخم رطوبت کی وجہ سے نہیں سُوکھتا۔

امی جی نے سعادت مندی سے پڑیا میں لپیٹے ملٹھی کے ٹکڑے پلو سے باندھ لیے۔ جس دن تایا جان چل دیئے مجھے یونہی لگا کہ میری ماں کے آنچل سے بندھی جادوئی پُڑیا نجانے کون کھول کر لے گیا یا شاید مرزا خاندان کا یہ آخری سائبان تھا، وہ گرا تھا یا خاندان کے سر پر تنی چادر اڑ گئی جس کے پلو سے ملٹھی کے ٹکڑے بندھے تھے۔

گلے میں خراش نہیں پڑنی چاہیے، خراش پڑ جائے تو اندرونی زخم نہیں جاتا۔

آج جب چلتے چلتے قدم تھکنے لگیں تو میں چادر کے چاروں پلو جھاڑتی رہتی ہوں۔

••

ہماری تائی جان جن کو میں ہمیشہ دنیا کی حسین ترین عورت سمجھتی تھی، میں ان کے خوبصورت گھنگھریالے بالوں کو سنوارتی رہتی۔ امی جی لاکھ ان کو کہتیں، ’’آپ اس کو ڈانٹتی کیوں نہیں۔ سر چڑھ گئی ہے؟‘‘ ہنس کر کہتیں، ’’نہ مَلّا نہ۔۔۔ میرا کیہہ لیندی اے‘‘۔ (خدا جانے ان کے تکیہ کلام لفظ مَلّا کا کیا مطلب تھا؟)

ایک دفعہ گھر میں باداموں کا ڈبہ آیا۔ خوبصورت دھات کا ڈبہ جس پر بادام خوبصورتی سے پینٹ کیے گئے تھے۔ لیکن جونہی اشتیاق سے اسے کھولا، اندر سے لہراتا ہوا ربڑ کا سانپ برآمد ہوا۔ اپنے حصے کی چیخیں مارنے کے بعد میں نے ڈبہ اٹھایا اور سیدھا تایا جان کے گھر کا رخ کیا۔ پہلے تو حسبِ معمول مجھے دیوار پھلانگ کر آنے پر حسبِ استطاعت جھاڑ پڑی۔ میں نے انتہائی سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈبہ تائی جان کے حضور پیش کیا۔ ڈبہ کھلتے ہی جو کہرام مچا اس کا جائزہ لینے کے بعد ڈبہ اٹھا کر اسی راستے گھر آ گئی۔ چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ ملا کر شام تک کئی لوگوں کو ڈرا چکی تھی۔ اس ساری کارروائی کا خمیازہ رات کو بھگتا جب ابا جی کے سامنے پیشی ہوئی۔ ساتھ امی جی بیٹھی وہی رٹے رٹائے جملے کہے جا رہی تھیں۔

''غصب خدا کا، چودھویں جماعت چڑھ گئی اے، اس کے ساتھ کی لڑکیوں کو دیکھیں تو یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔'' پھر انھوں نے ''موت کا منظر، مع مرنے کے بعد کیا ہوگا'' کے عالم کی طرح جہنم کے مناظر دکھانا شروع کیے...

''اس کی ٹرافیاں اکٹھی کر کے اس کے سر میں ماری جائیں۔ باندر ہتھ تیلی لگی اوتھیں آکھیا پنڈ ساڑو'' (بندر کے ہاتھ دیا سلائی لگی کہنے لگا گاؤں جلاتے ہیں۔)

ظاہر ہے میں نے مکمل ہدایت پانے والے نومسلم کی طرح، اطاعت گزاری کے جذبے سے ساری باتیں سنیں۔ اب کے امی جی نے ابا جی کو بھی کامیابی سے اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ وہ چپ کر کے اپنے بستر پر بیٹھے میری حرکات کا خلاصہ سن رہے تھے۔ پھر بڑے ٹھنڈے لہجے میں بولے کہ ''بیٹا شرارت اور جسارت میں فرق ہوتا ہے۔ برابر کے دوستوں اور بہن بھائیوں سے تو قابلِ برداشت ہے لیکن آپ کو پتہ ہے ناں تائی جان بیمار رہتی ہیں آپ کی۔ اگر ان کو کچھ ہوجاتا تو پھر کون ذمہ دار تھا؟''

میں چپ کر کے سب سنتی رہی، ''ابا جی غلطی ہوگئی ہے، آئندہ نہیں کروں گی'' میں نے واقعی ندامت محسوس کی۔ خواہ مخواہ امی جی وجہ سے ابا جی سے ڈانٹ پڑگئی۔

''اب اگلے تین دن آپ کا ادھر جانا بند'' امی جی نے دیکھا کہ سزا تو دی ہی نہیں گئی۔ یہ تو آرام سے غائب ہوجائے گی۔

''جی اچھا'' میں نے جلدی سے کہا ''دیوار سے آواز دے کر چاول مانگ لوں گی۔''

''پرلے درجے کی ڈھیٹ ہو بھئی'' امی جی کا غضب کم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔

''پہلے معافی مانگ کر آؤ'' مجھے آج دن تک جبری معافی مانگنے کی منطق کی سمجھ نہیں آئی۔ اس سے کیا فرق پڑجاتا ہے۔ لیکن میں نے کچھ کہے بغیر فوراً سر ہلایا۔

''اٹھ کلو دا سر ہلا، دو تولے دی زبان نہ ہلائیں'' امی جی فوراً بولیں۔

جب تک میں معافی مانگ کر نہیں آئی میری جان نہیں چھوٹی۔

••

میرا بیٹا مشکل سے پونے دو برس کا تھا اور مکمل جملے بولتا تھا لیکن وہ ''گ'' کی آواز بخوبی ادا نہیں کرسکتا تھا، گ کے سارے لفظ دال میں بدل جاتے اور جب سب ہنستے تو بے حد خفا ہوتا۔ پاکستان میں ایک روز سب لوگ بیٹھے تھے۔ اسے اپنی چاچی اور اپنے ہم عمر چچا زاد بہن بھائی یاد

آرہے تھے۔ ایک دم بولا، ''جب میں بڑا ہوں دا، تو اپنی چاچی کو ایک در بنا کر دوں دا'' (جب میں بڑا ہوں گا تو اپنی چاچی کو ایک گھر بنا کر دوں گا۔)

تایا جان کہنے لگے اسے میرے پاس لاؤ، میری گود میں بٹھاؤ۔ پھر اسے پیار کر کے میری امی سے کہنے لگے، ''لے وئی چناں، ساڈی دھی نے جو گھر سے تربیت اور ماحول پایا اس کا حق ادا کر دیا۔ اس نے کامیابی سے گھر سے سیکھا ہوا سبق آگے اپنی نسل تک منتقل کر دیا، دال اور گاف بخوبی ادا نہیں ہوتی اور گھر تعمیر کر دیا بچے نے چاچی کے لیے۔''

''اچھا، واہ بھئی یہ تو بہت اچھی بات ہے۔۔تو اپنے چاچا جان کو گاڑی نہیں لے کر دو گے؟؟؟'' انھوں نے بات سے بات نکالی۔

''نہیں جی۔ چاچو کے پاس تو پہلے سے گاڑی ہے۔ میں اپنی امی کو گاڑی لے کر دوں گا تا کہ ان کو ہسپتال ٹرین پر نہ جانا پڑے۔''

آج بھی مجھے ان کے الفاظ یاد آتے ہیں تو اپنے لیے حوصلوں کے نئے قلعے تعمیر ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ابا جی اور ان کے بھائیوں کی ایک ہی سوچ تھی کہ اللہ نے ہمیں دنیا کو جوڑنے کے لیے پیدا کیا ہے۔

تایا جان کو اللہ رب العزت صحت و ہمت سے نوازے، ابا جی کے جانے کے بعد میرے پاس روزانہ آتے۔ امی جی نے ان سے کہا کہ اسے تو یہاں ہی صبر نہیں آتا، واپس جا کر پتہ نہیں کیا کرے گی۔ میں بڑے کمرے میں تھی جو اس وقت مہمان خانے کے طور پر استعمال ہو رہا تھا اور تعزیت کے لیے آنے جانے والے بھی وہاں ہی بیٹھا کرتے تھے۔ تایا جان نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی اور اندر آ گئے۔ مجھے علم بھی نہ ہوا کہ کب میں بھی ابا جی کی طرح ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

تایا جان سمجھانے لگے ''دیکھو تم ہماری سب سے پیاری بیٹی ہو، بہت بلند ہمت والی، یہاں جو سب سے الگ ہو کر پڑی ہو یہ صحیح حل نہیں۔ یہ غم تو وہ ہے کہ جوں جوں کملی بھجّے توں توں بھاری ہو (جیسے جیسے کمبل بھیگے گا بھاری ہوتا جائے گا) اللہ نے تمھیں قلم دیا ہے، تم لکھو، جو دل میں آتا ہے وہ لکھو، منتشر خیالات کو اور اس درد کو الفاظ میں پرو دو، نہ صرف یہ کہ صبر آئے گا بلکہ بعد میں یہ تحریر اس غم کو زندہ رکھے گی۔ غم زندہ رہیں تو انسان کا حوصلہ بھی قائم رہتا ہے۔ دردمندی ہمراہ رہتی ہے اور کام نکھرتا ہے۔'' میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس ایک ہی خیال آیا کہ پچھلے ہفتے اس وقت ابا جی یہیں تھے اور جو بھی آتا اسے کہتے تھے کہ ''سورۃ حشر کی آخری آیات پڑھو۔ مجھے یہ ہمیشہ سے

عزیز ہیں۔قرار آتا ہے سن کر۔"

تایا جان میرے سر پر ہاتھ رکھا، "پتر۔۔تمھارا باپ ولی تھا۔ مجھے اکیلا کر گیا ہے، جب میرا احسان عین جوانی کے عالم میں اس دنیا سے گیا تو اس نے میری جھکی کمر کو سیدھا تیر کر دیا تھا اور اب جب سارے بہن بھائیوں کے جنازے پڑھ کر میں بے بس ہوگیا ہوں تو خود ہی میری کمر توڑ گیا ہے۔ (میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہمارے تایا زاد بھائی جو ایم بی بی ایس کر چکے تھے وفات پا گئے تھے۔ ابا جی کے بے حد لاڈلے تھے۔ساری عمر وہ ان کی ذہانت و وجاہت کی مثالیں دیا کرتے اور مجھے تو وہ کئی مرتبہ اپنے درمیان موجود محسوس ہوتے تھے۔)

تایا جان کو اس وقت تسلی دیتے ہوئے علم نہیں تھا کہ صرف چند ماہ بعد وہ دوبارہ ایک نئے حوصلے کا طلائی سکہ لے کر میرے پلو سے باندھنے آئیں گے۔ چند ماہ بعد جب امی جی بھی چلی گئیں، میں پاکستان گئی۔ مجھے ملنے آئے تو کہنے لگے "اس محرومی کو اپنے لیے اذیت نہ بنانا، اپنی ماں کے لیے بھی لکھو، نئی آنے والی نسلوں کو علم ہونا چاہیے کہ ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو خاندانوں کو جوڑ کر رکھتے تھے۔ تمھاری ماں نے تمھاری دادی دادا کی بہت خدمت کی، ہم سب کو بند مٹھی کی طرح جوڑ کر رکھا۔ اس بھنور سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے جو سوچتی ہو اسے کاغذ پر منتقل کر دو۔"

••

تایا جان کا مہربان چہرہ دیکھ کر مجھے وہ شادمانی کے دن یاد آجاتے۔ بیرونی دروازے سے ذرا آگے تایا جان کا کمرہ تھا، پرسکون، صاف ستھرا، کتابوں سے بھری الماری، اور سرہانے رکھی کتابوں میں نشانی کے لیے کاغذ کے دبے تراشے۔ وہ کتاب پر نشان لگانے کے سخت مخالف تھے۔ کاغذ پر نکات لکھتے اور ان کو متعلقہ صفحات میں دبا دیتے۔ شہر بھر میں کبھی کسی کے پاس نئی کتاب آتی تو سب سے پہلے تایا جان تک ضرور پہنچتی۔ مجھے یاد ہے کہ میں چند ہفتے کے لیے پاکستان آئی اور حسبِ معمول ابا جی کے پاس بیٹھی تھی کہ باہر سے تایا جان کے بولنے کی آواز سنائی دی "لو بھئی دیکھو۔۔۔ پنجابی میں بھی قران مجید کا ترجمہ آ گیا ہے، مجھے تحفتہً ایک نسخہ ملا ہے۔"

"ہیں، پنجابی کا ترجمہ؟ کیسا لگتا ہوگا، پنجابی میں قرآن پڑھ کر" میں نے قدرے حیرت سے سوچا۔

اپنی آواز کے پیچھے پیچھے تایا جی سفید براق کرتا پہنے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کا سرخ و سپید چہرہ ہمیشہ کی طرح مطمئن تھا۔ ابا جی تو اپنے لالہ جی کو دیکھتے ہی حسبِ معمول اٹھ کھڑے

ہوئے لیکن میں نے ان سے بھی پہلے اٹھ کر تایا جان کے ہاتھ سے قرآن مجید لے لیا۔ ’’تایا جان، یہ مجھے دے دیجیے، آپ کے پاس تو اور نسخہ آ جائے گا۔‘‘ ابا جی ارے ارے کہتے رہ گئے۔

تایا جان نے خفا ہو کر کہا، ’’وضو بھی ہے تمھارا؟ ایسے ہی قرآن مجید کو تھام لیا۔‘‘ ’’جی جی تایا جان، ابھی تو میں نے عصر کی نماز پڑھی ہے۔ ہے نا ابا جی؟‘‘

اس سے پیشتر کہ ابا جی کچھ سمجھ پاتے، میں ان سے گواہی بھی دلوا دی۔ قبضہ پکا کرنے کے لیے میں نے جلدی سے تایا جان کو قلم پیش کیا۔ ’’تایا جی، اس پر لکھیے: نورِ نظر، لختِ جگر مسماۃ صدف مرزا کے لیے‘‘ تایا جان بے ساختہ ہنس پڑے، ’’یار یہ لڑکی تو چور نہیں ڈاکو ہے۔‘‘

••

تایا جان کو انڈیا میں پٹیالہ طبیہ کالج والوں نے دعوت نامہ بھیجا تھا۔ سب پرانے طلبہ کو اکٹھا کر کے دستار بندی کی رسم ادا کرنا تھی۔ میں اس وقت سکول جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے میں ان سے پوچھ رہی تھی کہ آپ کے ساتھ کوئی اور نہیں جا سکتا۔ میرا بھی دل چاہتا ہے میں انڈیا دیکھوں۔ عرفان بھائی پاس ہی بیٹھے تھے۔ ہم چونکہ بزرگوں کی توجہ اور شاباشیاں لینے کے سلسلے میں ایک دوسرے کے رقیب تھے، فوراً بولے، ’’نہیں تم نہیں جا سکتیں، انھوں نے خاص طور پر کہا ہے کہ تم جیسے فسادی لوگوں کا داخلہ بند ہے۔‘‘ مجھے انڈیا کی باتیں بھول گئیں، اور میں نے حسب عادت جم کر جھگڑا اور دعویٰ دائر کرنا شروع کر دیا:

’’ارے دیکھنا ایک دن مجھے انڈیا سے ذاتی خطوط آیا کریں گے کہ آپ تشریف لائیے اور ادبی تقریب کی رونق میں اضافہ کیجیے۔‘‘ میں نے بڑے زعم سے کہا۔

’’سبحان تیری قدرت، رونق میں اضافہ نہیں، فسادات میں اضافہ، آیئے اور جلتی پر تیل گرایئے کیونکہ آپ اس فن میں طاق ہیں‘‘ ’’شکائیتن‘‘ ’’کہیں کی‘‘ وہ بھلا کیوں پیچھے رہتا۔

تایا جان بہت بدمزہ ہوئے۔ کہنے لگے ’’سمجھ نہیں آتی تم دونوں کا ہر بات میں دخل دینا اور لڑنا کیوں ضروری ہے؟ دونوں ممالک کے حالات ہمیشہ تو کشیدہ نہیں رہیں گے۔ کیوں نہیں جائے گی میری بیٹی۔‘‘ اس وقت ہم میں سے کسی کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن مذاق میں کہی گئی ساری باتیں سچ ثابت ہوں گی۔

تایا جان نے واپس آ کر تفصیل کے ساتھ ساری باتیں سنائیں۔ کئی دن تک کسی قصہ خواں کی طرح ہم سب تایا جان سے انڈیا کی کہانیاں سنتے رہے۔ کاش اس زمانے میں بھی ویڈیو فلم وغیرہ

اتنی ہی آسانی سے دستیاب ہوتی جیسے اب ہیں تو یہ نادر واقعات دستاویز کی صورت محفوظ ہو جاتے۔

••

''اسے انحراف اور انکار کرنے دو۔ اس کی ایک اپنی سوچ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سنی سنائی اور کہی اور حکم دی ہوئی بات کو نہیں سنتی۔۔۔ اور چڑتی ہے۔''

''کل کو آپ ہی اس کا مزاج بدلیے گا۔۔ بلا سوچے سمجھے بولتی جاتی ہے اور سوائے بات بات پر دانت نکالنے کے اسے آتا ہی کچھ نہیں۔''

••

تایا جان کو صرف لسانیات سے ہی دلچسپی نہیں تھی بلکہ ان کو الفاظ کے مصادر، منبع اور بدلتی ہوئی اشکال سے بھی دلچسپی تھی۔ ڈینش سکول کی تدریس کے دوران میں ایک ایسی جماعت میں بھی کام کرتی تھی جس میں یورپ کے دوسرے ممالک سے آئے بچے رکھے جاتے اور ان کی ڈینش زبان کی خصوصی تعلیم ہوتی تھی۔ ایک دفعہ برطانیہ سے آئی ایک بچی سے بات چیت کے دوران میں نے پوچھا کہ آپ کو کون سا کھانا زیادہ پسند ہے۔ بہت سادگی سے کہنے لگی، ''چھٹ''۔ میرے لیے یہ لفظ بالکل نیا تھا۔ میں نے اس سے سوالات کر کے قیاس آرائی کی کوشش کی کہ یہ چھٹ کیا چیز ہوسکتی ہے لیکن میرے لیے یہ ایک اجنبی لفظ ہی رہا۔

جب میں پاکستان گئی تو میں نے تایا جان سے اس لفظ کے بارے میں پوچھا۔ رنگا رنگ مریضوں سے دن رات واسطہ رہنے کی وجہ سے ان کو بے شمار علاقائی الفاظ کا علم تھا۔ میرا سوال سن کر بولے کہ ''کیا وہ بچی میرپور کے علاقے کی تھی۔'' میں نے بتایا کہ ''یہ تو اب مجھے یاد نہیں لیکن وہ برطانیہ سے ڈنمارک منتقل ہوئے تھے۔''

تایا جان نے بتایا کہ میرپور اور اس کے نواحی گاؤں میں کڑھی کا سالن پکوڑے ڈال کر نہیں بنایا جاتا بلکہ وہ ٹوٹا چاولوں اور بیسن کی آمیزش سے سالن تیار کرتے ہیں جسے ان کی زبان میں چھٹ کہا جاتا ہے۔

آپ کی امی کی زبان میں پوٹا پوٹا لمبے چاولوں کو جب الگ کیا جاتا ہے تو بچے ہوئے چاولوں کو، ٹوٹا چاول، یا چھٹ بھی کہتے ہیں جو کہ عام چاولوں کے مقابلے میں نصف قیمت پر ملتے ہیں۔

••

امِ حبیبہ سے ایک ملاقات کا دن میرے لیے ایک بے حد یادگار اور خوش کن خیالوں اور

یادوں کا دن تھا۔ ایک آواز جو مجھے کشاں کشاں بچپن کے طلسم کدے میں لے جاتی ہے اور جس کے ساتھ بے شمار یادیں وابستہ ہیں۔ تایا جان کا کمرہ اور ان کے سرہانے رکھا ہوا بڑے بڑے بٹنوں والا نجانے کون سے زمانے کا ریڈیو جو علی الصبح بیدار ہوتا تو اس کی آواز تایا جان کے کمرے کی چار دیواری سے نکل کر گھر بھر میں پھیل جاتی۔ ٹیلی ویژن بھی پہلے تایا جان کے گھر ایسا ہی آیا تھا کہ جب کوئی پروگرام ختم ہوتا تو اس پر سیاہ سفید ترمرے سے نقاط ناچنے لگتے اور اس کو بند کیا جاتا پھر بڑے سے ڈبے کا دروازہ بند ہو جاتا اور طلسمِ ہوشربا ختم۔

تایا جان کا ریڈیو بھی نشریات سے جاگتا اور پھر دونوں گھروں میں نعت کی آواز گونجتی۔ تایا جان کے دواخانے پر جانے تک یہ آوازِ دوست لکڑی کے اس ڈبے سے مسلسل کچھ نہ کچھ کہتی رہتی۔ تایا جان ریڈیو کا بٹن گھماتے اور فرماتے،

خشک تار و خشک چوب، خشک پوست
از کجا می آید ایں آوازِ دوست

پھر شعر کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے یہ شعر ایک دوسرے لفظ کے ساتھ بھی پایا جاتا ہے

خشک مغز و خشک تار و خشک پوست
از کجا می آید ایں آوازِ دوست

ہمیشہ اصل نسخے کو دیکھتے ہیں۔ اردو میں آتے آتے فارسی کلام کی شکل ہی اور ہو جاتی ہے۔"

بات ہو رہی تھی ایک صبح تایا جان کے کمرے کی۔ میرے بچپن کی ایک ایسی آواز جسے میں آج بھی اسی طرح سن سکتی ہوں۔

"گل از رخت آموختہ نازک بدنی را رابدنی را۔" تایا جان کو وہ نعت بے انتہا پسند تھی اور وہ کہتے ایک تو نعت کا انتخاب دل نواز ہے اور دوسرے اس نعت خواں کا تلفظ اور ادائیگی، لحن اور آواز میں ایک مخفی گداز ہے جیسے نعت خواں ایک ایک حرف کو زبان سے نہیں دل سے ادا کر رہا ہے۔ گرمیوں کے دن تھے اور شام کو جیسے گھر میں دستور تھا سکنجبین، ستو اور بھنے ہوئے دانوں کا دور چل رہا تھا۔ تایا جان عصر کی نماز پڑھ کر لوٹتے تو ایک چکر لگا لیتے۔ دونوں بھائیوں میں مکالمہ ہو رہا تھا۔ تایا جان جو مولانا جامی کی نعتوں کے والہ و شیدا تھے، کسی طرح بھی مطمئن نہیں ہو رہے تھے کہ یہ شعر جامی کا ہے۔

در عشق تو دندان شکست است بہ الفت

تو جامہ رسانید اویس قرنی را قرنی را قرنی را

''یار بشیر، یہ جو نعت ہے، گل از رخت آموختہ، یہ کہیں آپ کے پاس ہے؟ کیونکہ مجھے جہاں تک یاد ہے یہ نعت خواں بچی ایک اضافی شعر پڑھتی ہے جو ہے تو ہو بہو اسی بحر اور انداز میں وہی مدحت کا رنگ لیے، لیکن مجھے کیوں یاد نہیں۔ وہ جیسے اپنا حافظہ ٹٹولتے، پھر پورے تیقن سے کہتے، نہیں، یہ شعر جامی کا نہیں۔

گرچہ آج بھی ہمارے خاندان میں بھتیجے اور بھتیجیوں کی ذہانت اور یادداشت کا چرچہ ہے اور الحمدللہ بچے بہت ذہین ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تایا جان کی ذہانت اور یادداشت کی گرد کو بھی کوئی نہیں پہنچا۔ عربی اور فارسی کے دیوان ان کے ذہن کے کمپیوٹر میں جوں کے توں محفوظ تھے۔ بس وہ صرف ایک لفظ کی کلید دباتے اور الفاظ پھولوں کی صورت لبوں سے جھڑنے لگتے۔ تایا جان کو یقین تھا کہ یہ شعر ہرگز جامی کا نہیں اور تحقیق لازم ہے۔

''جی لالہ جی۔ مجھے تو یاد نہیں کہ یہ شعر اس میں تھا یا نہیں لیکن چلیں اس کے اصل نسخے کو دیکھتے ہیں۔'' ابا جی حسبِ عادت مودبانہ سا اتفاق کرتے۔ ساری شام دونوں بھائیوں کی مولانا جامی کی نعت اور اس میں ایک ''مشکوک'' اضافی شعر پر بات چیت اور تحقیق کرتے گزر گئی اور بالآخر انھوں نے ملٹری کالج سے کتاب حاصل کی اور اصل نعت کے اشعار کا پتہ لگا کر چھوڑا۔ ''ہاں بھئی، لالہ جی بالکل درست فرماتے تھے، یہ شعر مولانا جامی کا نہیں ہے۔'' ابا جی فخر سے اپنے لالہ جی کی تحقیق کو سراہتے۔

ہر کس کہ لب لعل ترا دیدہ بہ دل گفت
حقا کہ چہ خوش کندہ عقیقِ یمنی را یمنی را یمنی را

مجھے حیرت بھی ہوتی اور کوفت بھی۔ چلو فرض کرو کہ یہ شعر مولانا جامی کا نہیں ہے۔ اس سے کون سی آفت آنے والی ہے۔ چلو کسی اور نے ہی لکھا ہو۔ اگر ابا جی کو اور ان کے لالہ جی کو یہ خبر نہ ہو کہ اس کا اصل شاعر کون ہے تو کیا زمین کی گردش رک جائے گی۔ لیکن میں امی کی جھڑکیاں کھا کھا کر اتنی ''سیانی'' ہو چکی تھی کہ میں نے یہ خود کلامی بآوازِ بلند نہیں کی۔

ان نعتوں کے ساتھ میری دوسری یاد جو وابستہ ہے وہ میری اپنی نعت خوانی ہے۔ سکول اور کالج کے نعت خوانی کے مقابلے اور میلاد کے انعقاد میں جب بھی انتخاب کرنا ہوتا، مجھے ہمیشہ امِ حبیبہ کی نعت سکھائی جاتی۔ تایا جان تو ''میری جانب بھی ہو اک نگاہِ کرم، کے بھی شیدائی تھے اور ہر

مرتبہ تان اسی بات پر آ کر ٹوٹتی۔ بھئی نعت خواں کا تلفظ بلا کا ہے۔ ایک ایک لفظ ایسے سجا سجایا اور جما جمایا ادا کرتی ہیں کہ لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ تایا جان یوں خوش ہو کر کہتے جیسے وہی ام حبیبہ کے استاد ہوں۔ باصلاحیت لوگ جہاں بھی ہوں وہ دل کو ایک روحانی خوشی دیتے ہیں، ہمارے بزرگوں کا یہی کہنا تھا۔ پھر جب خواتین اور بچیوں میں اہلیت ہو تو وہ شش پہلو مسرت بخشتی ہے کیونکہ عورت ایک پوری نسل کی تربیت کی امین ہے۔

میں کالج کے پہلے سال میں تھی جب میں نے گل از رخت آموختہ نازک بدنی را بدنی را کی نعت یاد کرنا شروع کی کیونکہ یہ نعتیہ مقابلے میں پڑھی جانا تھی۔ ابا جی کو ایسے پروجیکٹ بہت پسند آتے۔ مجھے حکم ہوا کہ فارسی نعت کا ترجمہ کر کے دکھائیں۔ لیکن ابا جی میں ترجمہ کیوں کروں۔ میں نے ناگہانی افتاد پر فوراً پوچھا، کیونکہ میں نے عربی اور فارسی بطور مضمون کبھی نہیں پڑھی۔

''اس لیے کہ جب آپ کو یہ نعت پڑھنی ہے تو اس کا مفہوم بھی معلوم ہونا چاہیے۔'' ابا جی نے پہلے میرے سوال کا جواب دیا پھر ہدایات جاری کیں، ''اس کا پہلے حرف بحرف ترجمہ کرو پھر اس کو بامحاورہ ترجمہ بھی کرو تا کہ جب آپ نعت پڑھیں تو آپ کو علم ہو آپ کیا پڑھ رہی ہیں تا کہ پوری تفہیم کے احساس اور ادب و کیف کے ساتھ شعر کو ادا کیا جائے۔ باخدا دیوانہ باشد بامحمد ہوشیار۔ بیچارے دو رکعت کے اماموں کی طرح یعلمون اور تعلمون نہ کرتی رہنا۔''

''اچھا جی، جو حکم۔'' میں نے ابا جی کی رہنمائی میں ترجمہ کیا اور پھر اسے پڑھا بھی۔ میری جانب بھی ہوا اک نگاہ کرم، نعت پر انعام بھی حاصل کیا۔

تایا جان نے بھی مجھے نہ صرف یہ معروف نعت پڑھائی بلکہ مولانا جامی رحمہ اللہ کی دیگر نعتیں بھی پڑھا دیں۔ خود ہی فارسی اشعار پڑھتے اور جھومتے جاتے۔ پھر کہتے جذبہ دیکھو اور زبان و بیان پر قدرت دیکھو۔ عربی اور فارسی کی استعداد دیکھو۔

دو چشمِ نرگسینش را کہ مَازَاغَ الْبَصَر خوانند
دو زلفِ عنبرینش را کہ وَاللَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی

(نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دو نرگسی آنکھیں ہیں کہ ہم "مَازَاغَ الْبَصَر" پڑھیں اور دو مشکبار زلفیں کہتی ہیں کہ وَاللَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی پڑھیں۔)

ز سرِّ سینہ اش جامی اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ برخواں
زمعراجش چی می پرسی کہ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی

(نبی ﷺ کے سینہ مبارک کے راز سے اے جامی اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ پڑھ لے۔ ان کی معراج کا کیا کہنا کہ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی)

میں چپ چاپ ان کو دیکھتی۔ پھر شاید انھیں یاد آتا کہ مجھے مجرموں کی طرح ایک کونے میں بٹھا رکھا ہے تو کہتے چلو بآوازِ بلند یہ اشعار پڑھو اور یہ عربی قرآن کی آیات ہیں، ان کا ترجمہ کر کے دکھاؤ۔ پھر جیسے خود کو بتاتے۔ ''لاکھ کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ ترجمہ کرے، اس کا لطف اصل زبان میں ہی مل سکتا ہے۔ انہی دنوں میں نے ''تَنَم فرسودہ جاں پارہ زِ ہجراں یا رسول اللہ ﷺ!'' اور ''منم ادنیٰ ثنا خوان محمد ﷺ'' جیسی نعتیں سیکھیں اور مقابلوں میں حصہ لیا۔

اگر آج میں پیشہ ور نعت خوانوں کی یلغار اور مروج نعتوں کے بارے میں کبھی تنقیدی کالم لکھتی ہوں اور جواباً مجھے کافر وغیرہ کے اعزازات سے نوازا جاتا ہے تو مجھے قطعاً افسوس نہیں ہوتا بلکہ ''لوکی تینوں کافر آکھدے توں آہو آہو آکھ'' کے مصداق ان کی تائید کرنے کو جی چاہتا ہے۔

میں نے کبھی یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ ایک دن ایسا بھی ہوگا کہ جب برِصغیر پاک و ہند کی اولین خاتون نعت خواں کی مجھ سے یوں ملاقات ہوگی، جس کے شیریں لحن اور اس بے مثال لب و لہجے کی مثال ہمارے بزرگ دیا کرتے تھے۔ ڈنمارک کی فضاؤں میں ان کے اور ان کے رفیقِ حیات کے ساتھ بیٹھ کر عشائیے اور بات چیت کا اعزاز حاصل ہوگا۔ اِم حبیبہ اپنے بے حد شیریں اور دھیمے لب و لہجے میں اس فارسی نعت کا پس منظر اور اس اضافی شعر کے اضافے کی وجہ بتاتی رہیں اور میں دم بخود ان کی آواز میں اپنے محبوب چہرے کھوجتی رہی اور منہاج وومین لیگ اور یوتھ کی بچیوں کی شکر گزار ہوتی رہی۔ محترمہ نفیس افتخار کی محبتیں مجھے مقروض کرتی رہیں۔

اُمِ حبیبہ بھی میری طرح اپنے والد کی شفقتوں کے سحر کی اسیر نکلیں۔ وہ ان کو نعتوں کا انتخاب کر کے دیتے۔ تلفظ اور مخارج سکھاتے۔ پھر ان کا ہاتھ تھام کر انھیں مقابلوں کے لیے لے کر جاتے۔ ٹی وی پر جب انھوں نے نعتیں پڑھنے کا آغاز کیا تو مولانا جامی کی اس نعت کی ریکارڈنگ کا وقت زیادہ تھا اور اشعار کم تھے۔ اِم حبیبہ کے والد نے اسی بحر اور انداز میں ایک شعر کہہ کر ریکارڈنگ کا تقاضہ پورا کیا۔ وہ دم بخود تھیں کہ کیسے آپ کے تایا جان نے یہ اضافی شعر شناخت کر لیا۔ انھوں نے امریکہ جا کر بھی مجھ سے رابطہ کیا اور جس عجز و محبت سے بات کرتی ہیں یہ بس کچھ ان ہی کی ذات کا خاصہ ہے۔

''صدف مرزا بس اسی لیے یورپ میں اتنا طویل عرصہ گزار کر بھی آپ کی زبان و اطوار

نہیں بدلے کہ آپ نے ایسے ماحول میں پرورش پائی۔'' ان کے لہجے میں میرے بچپن کے دن کھنکتے رہے۔ مجھے انھوں نے بطورِ خاص پاس بیٹھ کر وہ نعت سنائی اور میں حسبِ عادت دل ہی دل میں ابا جی سے مخاطب رہی۔ دیکھیے ابا جی، آپ کی دعائیں اور حوصلہ افزائی مجھے کہاں لے آئی۔

••

میں ڈنمارک واپس آ کر کوشش کرتی رہی کہ تایا جان کی نصیحت کے مطابق کچھ لکھنے کی کوشش کرسکوں لیکن یہ حرف و احساس کا رشتہ بھی عجیب ہے، ہزار چاہنے پر بھی ایک لفظ سپر نہیں ڈالتا، کاغذ پیاسا رہتا ہے اور قلم بے زبان، ذہن وہی سیاہ ماتمی پردہ جس پر کسی حرف کی روشنی عکس نہیں ڈالتی۔ ابھی چند مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ امی جی اپنی خواہش کے مطابق عدت ہی میں ملکِ عدم کی راہی ہوئیں۔ جولائی کے مہینے کا رش، ایئرپورٹ اور جہازوں کے دھکے، بچوں کے ساتھ ملک اور جہاز بدلتی نجانے کیسے میں پاکستان آ پہنچی۔

تایا جان ملنے کے لیے آئے تو اس مرتبہ میں نے واضح طور پر ان کی شخصیت کو شکستہ دیکھا۔ امی جی کے جانے کے بعد ان کے تسلی دیتے لہجے میں بھی دراڑیں تھیں جیسے وہ صرف ایک رسم ادا کر رہے ہوں۔

مصیبت اور لمبی زندگانی
بزرگوں کی دعا نے مار ڈالا

تایا جان نے بتایا کہ ہمارے دادا جان سے پہلے کوئی بچہ بھی ایک مہینے کی عمر کو نہ پہنچتا اور اس کا انتقال ہوجاتا۔ کسی بزرگ نے ہمارے پڑدادا سے کہا کہ اب کے تمھارے گھر جو بھی بچہ ہو اس کا نام بڈھے خان رکھنا۔ وہ نہ صرف طویل عمر پائے گا بلکہ اس کی نسل میں بھی کوئی شیرخوار فوت نہیں ہوگا۔ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ایسا ہی ہوا اور پھر ابا جی چھ بھائی تھے جو عمر کی کئی منازل گزار کر رخصت ہوئے۔ ان کی اولاد میں بھی اولادِ نرینہ کی کثرت رہی۔ تایا جان کہنے لگے، ''دیکھ لو، میں صرف جنازے پڑھنے کے لیے رہ گیا۔''

جب میں پاکستان سے واپس آ رہی تھی تو تایا جان مجھے خود ملنے آئے۔ میں طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے گھر سے نکلی ہی نہیں تھی۔ میری وجہ سے بچے بھی کہیں نہ جاسکے۔ اس دن بہت تیز بارش تھی۔ بڑے بھائی جان کے گھر کے گیٹ سے سیڑھیوں تک کا راستہ کافی تھا۔ ڈرائیور گاڑی سیڑھیوں تک لے آیا تھا۔ میں اور بچے واپسی پر انھیں چھوڑنے نیچے آئے۔ مجھے ان کے وجود سے ابا

جی کی مہک پھوٹتی ہوئی لگتی تھی۔

امی جی کے لیے ہمیشہ بے حد محترم ہستی اور ابا جی جب انھیں لالہ جی کہہ کر مخاطب کرتے تو ہم ہنسا کرتے تھے۔ انھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور میں نے پانی بھری آنکھوں سے دیکھا کہ ان کے سرخ وسفید وجیہہ چہرے پر بارش کے چھینٹوں کے درمیان آنسوؤں کی لکیریں بھی راستہ بنا رہی تھیں۔ دردِ مشترک تو تھا ہی، لیکن دل کے کسی نامعلوم گوشے سے ہوک اٹھتی۔ ہزار آپ کے گرد بہنوں بھائیوں اور خاندان کا ہجوم ہو لیکن ایک احساس کہ اب ان در و دیوار سے ان مقدس ہستیوں کی خوشبو میں لپٹی آواز کبھی نہیں ابھرے گی، کوئی سرزنش نہیں کرے گا کہ نماز کا وقت گزر گیا ہے، کوئی نہیں روکے گا کہ شام سے پہلے گھر واپسی ہو جانا چاہیے، کوئی فون کر کے نہیں پوچھے گا کہ کہاں تک پہنچے ہو، چناب کا پل کراس کرلیا؟ ہزار دفعہ کہا ہے کہ رات کا سفر نہ کیا کرو۔ حالانکہ زندگی اسی نہج پر رواں دواں ہے۔ ان بزرگوں کی جگہ آج یہی الفاظ کہنے والے اور خیال رکھنے والوں کو اللہ سلامت رکھے لیکن دل کے اندر کا خلا وقت کے ساتھ پھیلتا اور بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

••

بس اِک دُعا سے زمانے میں شاد کام ہوں میں
تمھارے نام کی نسبت سے نیک نام ہوں میں

ابا جی کا نظریہ بالکل سیدھا اور صریح تھا: وقولو للناسِ حسنا، اور پھر، لااکراہ فی الدین۔ لوگوں کو آخری وقت تک گنجائش دینا، جواب طلبی سے حتی الوسع گریز کرنا، عدالت لگا کر، بغیر حقیقت جانے دوستوں اور رشتے داروں کو کٹھرے میں لاکھڑا کرنے اور شہادتیں مانگتے رہنے سے اجتناب کرنا رشتوں کو بچانے کا واحد ذریعہ ہے۔

ابا جی کہا کرتے تھے کہ ایک دفعہ آپ نے کسی کے ساتھ آمنا سامنا کرلیا، تلخ نوائی ہوگئی تو دلوں کا شفاف ہونا ناممکن ہوجاتا ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ یا تو خاموشی اختیار کی جائے یا پھر احسن طریقے سے کنارہ کشی اختیار کی جائے۔ انھیں کبھی پنچایت میں جاکر لوگوں کے جھگڑوں اور بے فیض مباحثوں میں شریک ہونا اور مقدموں کی سماعت کرنا پسند نہیں رہا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر مسئلہ ختم کرنا ہے تو گزشتہ را صلوٰۃ اور آئندہ را احتیاط کے تحت کرنا ہی ہوگا۔ شاید یہی یادیں تھیں جو میری شاعری میں بھی آگئیں۔

جس نے رشتے بچا کے رکھنے ہوں
وہ رویوں کا تجزیہ نہ کرے

••

جیسا اکثر خاندانوں میں رواج ہوتا ہے کہ بیٹیوں کو گھر بٹھا لینا یا پھر بہوؤں کو میکے بھیج دینا اور پھر مسلسل مذاکرات کرتے رہنا۔ اس صورت میں راضی نامہ ہو بھی تو بعد میں اس تنازعے کی یاد طعنہ بن کر باقی عمر کی رفاقت کو عذاب میں بدل دیتی ہے۔ پہلے ایک بچی کو اٹھارہ بیس سال کی عمر

تک ایک محفوظ دائرے میں رکھو اور پھر اچانک اسے شریکے برادری میں جہاں کئی اختلافات ہوں بیاہ کر بھیج دو۔ خفیہ آتش فشاں کروٹیں لیتا رہے اور جب بیدار ہو تو سب کچھ بہا کر لے جائے۔ اولاد کو رشتوں کے معاملے میں ہتھیار یا اسلحے کی طرح استعمال کرنا ہی معاشرتی بگاڑ کا باعث بنتا ہے۔ جہاں خاندانی، معاشرتی اور سیاسی تحفظات ہوں، باہم شادیاں کر کے سفارتیں قائم کی جائیں اور پھر جب ان مفادات پر ضرب پڑے تو ان بچوں کو مہرے بنا کر جنگی چالیں چلتے رہیں، کیسے انسان ہیں؟ والدین کو اپنے فرائض کی ادائیگی دانشمندانہ طریقے سے کرنی چاہیے۔ بچوں کو جوتا اور کپڑا تو آپ اس کی مرضی کا لے کر دیں لیکن سر پر سہرا باندھ کر بتاتے ہیں کہ فلاں فرد آپ کی زندگی کا ریڈی میڈ ساتھی ہوگا۔ ابا جی ہمیشہ والدین کو مشورہ دیتے کہ اپنے بچوں کی شخصیت اور مزاج کے مطابق ان سے رائے لیں اور فیصلے ٹھونسنے کی بجائے دوستانہ معاملات رکھیں۔

••

ابا جی کو مزاح بہت پسند تھا لیکن تمسخر اڑانے والے انداز، تنقیدی رنگ اور بالخصوص بیویوں کے لطائف بہت ناپسند تھے۔ میں نے حسبِ عادت ابا جی کو مسجد سے جوتے چرانے کا لطیفہ سنایا جو میں نے خود نیا نیا سنا تھا۔ ''ایک آدمی چمچماتے جوتے پہنے رکھتا تھا۔ کسی نے پوچھا آپ ہر مہینے نیا جوتا لیتے ہیں۔ بڑے فخر سے کہنے لگا نہیں تو، بس ہر مہینے مسجد سے بدل لیتا ہوں۔'' سارے بہن بھائی ہنسنے لگے اور مزید لطیفے سننے کو ملے۔ ہمارا طوفانِ بدتمیزی تھا تو ابا جی اپنے نرم اور سادہ سے لہجے میں بولے، ''میرے بچے، آپ کو مسجد سے جوتے چرانے کے لطائف تو یاد ہیں لیکن کبھی یہ بھی سوچا کہ جو مسجد میں پنکھے لگواتے ہیں، بجلی کے بلب بدلواتے، صفیں خریدتے، تعمیر میں حصہ لیتے اور ماہانہ اخراجات اٹھاتے ہیں ان کا تذکرہ بھی کیا جائے؟ عیب جوئی کے لیے ایک دنیا تیار بیٹھی ہے۔ آپ کو بس یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آپ شہد کی مکھی ہیں۔''

••

ابا جی کا اٹل اصول تھا کہ کچھ ہو جائے کبھی کسی کا احسان نہیں لینا، خواہ وہ ایک نوالے کا ہو، ایک لمحے کا ہو یا کسی ایک کلمے کا۔ لوگ احسان جتانے میں رتی بھر دیر نہیں لگاتے اور آپ کی زندگی میں اپنا حصہ وصول کرنے لگتے ہیں۔ یہ صرف اللہ جل و شانہ کی صفت ہے کہ وہ کسی کو دیتا رہے اور پھر نہ ہی جتلائے، نہ حساب کتاب لے، نہ طعنے دے اور نہ ہی جوابی خدمات یا معاوضہ طلب کرے۔ خود داری افضل ترین چیز ہے۔ میرے بچوں نے ان سے یہ باتیں ورثے کے طور پر

لی ہیں۔ ان ممالک میں تعلیم کے ساتھ جز وقتی ملازمتوں کے مواقع موجود ہیں۔ بچوں نے ہمیشہ یونیورسٹی کی تعلیم کے ساتھ ملازمت کی۔ اب عمر کی اس منزل پر پہنچ کر میں سوچتی ہوں کہ واقعی احسان سے مبرا اور آزاد زندگی کتنی مسرت افزا اور کس قدر سکون بخش ہوتی ہے۔ ناپتی تولتی آنکھیں، جتاتے ہوئے لہجے، اپنے احسانات دوہراتی زبانیں زندگی میں شامل نہ ہوں تو کوئی مشکل راستہ نہیں روکتی۔ ابا جی کہا کرتے تھے کہ جو لوگ آپ کی زندگی دشوار کر دیں اور آپ کی شخصیت میں تلخی بھرنے لگے، مزاج بدلنے لگے، تو ان سے کنارہ کشی کرنے میں ایک لمحہ نہیں ضائع کرنا چاہیے۔ بہ حسن وخوبی اپنے راستے الگ کر لینے چاہییں۔ جو دوستی کو غرض کی بنیاد پر قائم رکھنا چاہیں اور آپ کی توجہ، محبت اور وضع داری کو اپنا حق سمجھ کر ناقدری کریں ان کو اپنے جذباتی استحصال کی اجازت دینا خود اپنی ذات کے ساتھ ظلم ہے۔ ایسے دوست کس کام کے جو پیٹھ پیچھے بیٹھے منصوبہ سازی کریں اور غموں کو مزید بھاری کر دیں؟ ایسے لوگوں کی صحبت سے بہتر گوشۂ تنہائی ہے۔ خلوت نشینی میں بہت برکات ہیں۔ ابن الوقت، شیخی خورے اور ریا کار لوگوں سے دور رہ کر صرف ایسے لوگوں سے ملو جن کے لیے آپ نافع ثابت ہو سکیں اور نیکی کرنے کے بعد بھول جائیں۔ احسان کریں اور خاموشی سے راستہ بدل لیں۔ شاید ان کی ان ہی باتوں کے زیرِ اثر میں نے عام زندگی میں گوشہ نشینی اختیار کی، سکون سے بچے پالے اور مطالعے اور لکھنے کے پروجیکٹ مکمل کیے۔

دوسروں کو معاف کر دینا بہت آسان ہوتا ہے لیکن اپنی ذات کے ساتھ جنگ مشکل ترین مرحلہ ہے۔ خود کو معاف کرنا اس سے بھی مشکل تر۔ ذہنی امراض، خودکشی، منفی اندازِ فکر، سب اسی جنگ کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ سو کوشش یہ ہی ہونی چاہیے کہ دانستہ کسی کی دل شکنی نہ کریں۔ کسی پر غلط تبصرے سے خود کو روکیں۔ کوئی زیادتی کر بھی دے تو جتلا کر درمیان میں شیشے کی دیوار مت کھڑی کریں تاکہ جب رات کو سونے کے لیے بستر پر جائیں تو یہ خوف نہ ہو کہ اگر صبح اٹھنا نصیب نہ ہوا تو حقوق العباد کیسے معاف کراؤں گا۔

••

شیر خوار بچوں کی پرورش میں جو سختی ابا جی کے مزاج میں تھی وہ ان کی فطری نرمی اور حلمِ طبع سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ بچے کی نگہداشت کو ہر کام سے اولیت دی جائے۔ بچے تھک جاتے ہیں۔ ان کو دبائیں۔ بچوں کو دو برس کی عمر تک روزانہ تیل لگائیں۔ موسمِ گرما میں ناریل کا تیل لگایا جائے وہ سورج کی تپش کو روکتا ہے۔ بچے کو گرمی میں کبھی ننگے بدن نہ رکھیں خواہ پیاز کی جھلی جیسا کرتا

پاجامہ ہو سفید رنگ یا ہلکے رنگوں میں ضرور پہنائیں۔ امی جی مجھے ہمیشہ بچوں کے لیے سفید سوتی کرتے بنوا کر بھیجتیں۔ ابا جی چند دن کے بچے سے یوں بات کرتے جیسے اپنے برابر کے کسی دوست سے بات کر رہے ہوں، ''آپ تھک گئے ہیں۔ بھوک لگ رہی ہے؟ آپ کو نیند تو نہیں آ رہی۔''

میرا پہلا اور لاڈلا بھتیجا وقاص تقریباً دو ماہ کا تھا جب ابا جی اسے گود میں لے کر بتاتے، ''آپ کا نام بہت خوب صورت ہے۔ آپ بھی صاحبِ علم ہوں گے۔ ماں باپ کے دل کا قرار ہوں گے۔''

''ابا جی!'' میں نے ان کی گود سے وقاص کو تقریباً چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''اس کو آپ کی باتوں کی سمجھ نہیں آ رہی۔''

انھوں نے احتیاط سے اسے میرے گود میں منتقل کیا، ''بیٹا یہ آپ کی خام خیالی ہے۔ اس کا دماغ ان باتوں کو ریکارڈ کر رہا ہے۔ بچے آواز، لہجہ اور لمس پہچانتے ہیں۔ یہ ان کی بڑی ضرورت ہوتی ہے ورنہ خالقِ کائنات ماں کے ساتھ دو سال رضاعت کی نعمت کیوں دیتا؟''

••

بچے اور خواتین کے مسائل اور ان کا حل ابا جی کے محبوب ترین موضوعات تھے۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ بچوں کے باپ کو ان کی ماں کا احسان مند ہونا چاہیے جو علیحدگی کے بعد بھی اس کی نسل کو پال رہی ہے۔ یہی بات مرد بھول جاتا ہے کہ اس کی اولاد اور اس کے درمیان بیوی ایک پل کی طرح موجود ہوتی ہے اور رابطے کے لیے اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ جو لوگ بیوی کی توہین اور بدسلوکی کر کے اس پل کو جلا دیتے ہیں وہ ساری زندگی دریا کو عبور نہیں کر سکتے۔ بچوں کی پرورش اور تربیت کے سلسلے میں ان کے مزاج میں کوئی لچک نہیں تھی۔ بالخصوص بچوں کے ساتھ حادثات کی روک تھام اور سدِ باب کے لیے وہ ہر وقت کوشاں رہتے بلکہ اس موضوع پر امی جی کی ان سے ٹھن جاتی، ''بچے آئے ہیں اور چھت پر چلے ہی گئے ہیں تو کیوں ان کے پیچھے پڑ گئے ہیں، دہشت پھیلا دی ہے گھر میں؟''

ابا جی کی اپنی پیش بندیاں تھیں، ''بھئی کوئی بچہ گر نہ جائے۔ اسے چوٹ نہ لگے۔ اکثر بچے سر پر ''پھٹ'' ڈال کر لے آتے ہیں، پھر ان کو ٹانکے لگواتی رہتی ہیں جاہل مائیں۔ کبھی بچے کا کندھا اتر گیا، کبھی بازو ٹوٹ گیا۔''

ابا جی کی بات سن کر میں نے جلدی سے اپنا دایاں بازو چادر کے اندر کر لیا جو بچپن میں تین مرتبہ ٹوٹنے کے بعد ٹیڑھا جڑا تھا۔

میری چھوٹی بھابی ابا جی کو یاد کر رہی تھیں۔ کہنے لگی کہ ابا جی کبھی کسی بات پر بہوؤں سے خفا نہیں ہوتے تھے۔ کوئی کام پڑ جاتا تو کہتے کہ بچہ میری گود میں دیں اور پھر باورچی خانے میں جائیں۔ لیکن ایک دفعہ میں انیقہ کو اوپر دھوپ میں لٹا کر نیچے کوئی چیز لینے آئی تو ابا جی نے طوفان اٹھا دیا کہ اوہنوں اِل چک کے لیہہ جائے گی (اسے چیل اٹھا کر لے جائے گی) بلی پنجہ مار جائے گی۔ بھابی بات سناتے ہوئے ساتھ ہنستی جائے کہ میں نے کہا ابا جی چیل کہاں بچے کو اٹھا سکتی ہے لیکن انھوں نے مجھے ڈپٹ کر چپ کروا دیا اور وارننگ بھی دی کہ بچے کی نگہداشت کو اولین اہمیت دینی ہے ورنہ بیبیوں سے اعلانِ جنگ ہوگا۔

انیقہ کو ابا جی اپنے سینے پر لٹا لیتے۔ بچہ لمس کی حدت سے خود کو محفوظ تصور کرتا ہے۔ دل کی دھڑکن اسے لوری دیتی ہے۔ میں اور بھابی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے۔ انیقہ ایسی شریر تھی کہ ابا جی کو سوتا پا کر ان کے بال کھینچتی یا جو چیز ہاتھ میں آتی کھڑاک سے انھیں دے مارتی۔ ابا جی آہستہ آہستہ کہتے رہتے، بری بات، بری بات۔

کئی مرتبہ ایسا ہوتا کہ انیقہ ان کے سینے پر ہی سو جاتی تو وہ گھنٹہ بھر اسی طرح لیٹے رہتے کہ اس کی نیند نہ خراب ہو۔ ایسی ہی ایک یادگار تصویر میرے پاس موجود ہے۔

ابا جی بہت اشتیاق سے بچوں کی دیکھ بھال کے بارے میں ڈینش ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کے لائحہ عمل کی تفصیل پوچھتے رہتے۔ میں نے ان کو بتایا کہ ابتدا کے ہر مہینے نرس گھر آتی ہے۔ بچے کی بصارت اور سماعت کی جانچ کے لیے رنگ دار بھالو اور کھنکھناتے کھلونے استعمال کیے جاتے ہیں۔ پہلی مرتبہ ماں بننے والی خواتین کی بہت رہنمائی کی جاتی ہے۔ ان کو شیر خوار کی پرورش کے بارے میں آگہی دی جاتی ہے۔ ماؤں کو رضاعت کی طرف راغب کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے ایسے گروپ بنائے جاتے ہیں جن میں ایک ہی عمر کے بچے شامل ہوتے ہیں۔ مائیں مہینے میں ایک مرتبہ ملتی ہیں اور بچوں کے مسائل اور ان کے حل پر تجربات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ جب عالیہ نے رضاعت کے گروپ میں شرکت کی اور باقاعدہ کنسلٹنٹ کے طور پر کام کیا تو میں بھی اس کے ساتھ نئی تحقیقات کا مطالعہ کرتی۔ اب سائنس ثابت کر رہی ہے کہ ماں کا دودھ بچے کی صحت اور حالات کے ساتھ کیمیائی طور پر بدلتا ہے۔ اس کی بیماری میں درد کش مادے ماں کے دودھ میں شامل ہوتے ہیں۔ ابا جی بتاتے کہ یہ سب فطری اصولوں کی طرف واپسی ہے۔

بچوں کو بہلانے کے لیے مائیں دروازے کی کنڈی کھٹکھٹاتیں، ڈبے میں دانے ڈال کر

ہلایا کرتیں۔ پھر جھنجھنے اور بھونپو کا زمانہ آیا۔ یہ تکنیک مغرب سے نہیں آئی۔ شیر خوار کی سماعت جانچنے کے لیے حکما گھنگھرو ہلانے اور چٹکی بجانے کا طریقہ استعمال کرتے آئے ہیں جس پر شیر خوار اپنی آنکھوں اور سر کی حرکت سے ردِ عمل ظاہر کرتا تھا۔ رضاعت کے ذریعے قدرت ماں کے جسمانی نظام کی بہتری اور مرمت کرتی ہے۔ چھاتی کے سرطان کا سدِ باب ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بچہ آنول کے کٹنے کے بعد بھی ماں کی آغوش اور بدن کے ساتھ جڑا رہتا ہے۔ پھر ماں کے دودھ کا تو نعم البدل ہی کوئی نہیں۔ یہ باتیں بہت عرصہ بعد مجھے یاد آتی رہیں۔ جب سائنس بچے اور ماں کے تعلق کو نئے زاویے سکھاتی اور اس کی زندگی کے ابتدائی سالوں کی اہمیت، ماں کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت اور ماں کے لمس کی طاقت اور بچے کے مزاج اور شخصیت سازی پر تحقیق سامنے آتی تو میں اپنی یادوں کی ہارڈ ڈرائیو سے وہ ساری محفوظ شدہ فائلز نکال کر دیکھتی ہوں۔ حیران ہوتی ہوں اور ممنون ہو کر دستِ دعا بلند کر دیتی ہوں۔

••

خواتین اور بچیوں کے بارے میں ابا جی کا نقطۂ نظر بالکل واضح تھا۔ کبھی خواتین امی جی کے پاس آتیں اور بچیوں کی بیماریوں کی بات کرتیں۔ انداز ایسا سنجیدہ اور پراسرار ہوتا گویا اس زمین کی مخلوق کے بجائے کسی اجنبی جزیرے پر مقید گناہگار مجرم کی ہو رہی ہو۔ پتہ نہیں کیوں ہمارے ہاں بچیوں کی بلوغت اور ان کی کسی بھی تکلیف کو انتہائی صیغۂ راز میں رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور معصوم بچیوں کو نوجوانی کے آغاز میں ہی معمولی درد اور تبدیلی سے انجان رکھ کر ہراساں کر دیا جاتا ہے۔

اس معاملے میں ابا جی اور تایا جان ہمنوا تھے۔ بچیوں کو بلوغت کی تبدیلیوں کے بارے میں آگاہ کرنا چاہیے۔ ان نام نہاد ملاؤں نے اپنی شریعت گھڑ رکھی ہے۔ اگر قرآن میں انسانی بدن اور نسوانی معاملات بیان کیے گئے ہیں جن کو بغیر سمجھے رٹنے اور پڑھنے پر نیکیاں کمانے کی تجارت عورتوں کو سکھائی گئی ہے تو ان کو اس بات سے بھی آگاہ کیا جائے کہ اس میں حیض و نفاس، وظیفۂ زوجیت، طہارت، بچے کی پیدائش، رضاعت، وراثت، خلع اور طلاق تک کے مسائل موجود ہیں نہ کہ عملی زندگی میں ان کو ڈرا کر خاموش کروایا جائے۔

ابا جی ہمیشہ دلیل سے بات کرتے کہ قرآن کو طوطے کی طرح رٹنے والوں کو بتاؤ کہ نسوانی مسائل اور موضوعات قرآن نے پیش کیے ہیں جن کو پڑھ کر آپ کو ثواب ملتا ہے۔ بچیوں کو قرآن کا ترجمہ پڑھایا جائے یا کم از کم وہ آیات تفسیر کے ساتھ پڑھائی جائیں جن میں ان مسائل کا

بیان ہے تاکہ بچیوں کو ازدواجی زندگی میں حقوق و فرائض کی سمجھ آ سکے اور وہ ایک پرمسرت زندگی گزارنے کے قابل ہوں۔

ابا جی اور تایا جان ہمیشہ یہی کہتے کہ اپنی بچیوں کو شروع سے اچھی غذا دو تاکہ انھیں مستقبل کی بیماریوں اور پیچیدگیوں سے بچایا جا سکے۔ بچیوں کی پرورش میں بہتر غذا اور مکمل دیکھ بھال ان کو مستقبل کی صحتمند خواتین بناتی ہے۔ لڑکوں سے کہیں زیادہ لڑکیوں کی خوراک پر توجہ دینی چاہیے۔ دودھ، پنیر اور متوازن غذا ابتدا سے ہی نشوونما کو بہتر کرتی ہے۔ پھر تعلیم اور تربیت سے اچھے افراد پیدا کرنے کا سامان کیا جائے۔

ان کا خواب تھا کہ ایسے سکول اور تربیت گاہیں بنائی جائیں جہاں ہر وقت تربیتی اور تعلیمی کام جاری و ساری ہو۔ دن رات کی الگ الگ شفٹوں میں پڑھایا جائے۔ ان ہی عمارات کو تعلیم بالغاں کے لیے رات کو استعمال کیا جائے اور گھروں میں بیٹھ کر بہوؤں کے سونے جاگنے کے اوقات کا کیلنڈر بنانے اور محلے والوں کو ''فونیں'' کرنے کی بجائے باہر نکلیں اور خواتین کو دستکاری سکھائیں تاکہ بچیوں کو ہنر بھی آئے، تعلیم بھی ہو اور وہ محتاجی سے بھی بچ سکیں۔

••

اکثر اپنے بچوں سے ناراض والدین ابا جی کے پاس اپنی اولاد کے بارے میں مشورہ کرنے بھی آتے اور ان کی شکایات بھی لگاتے۔ اس زمانے میں ابا جی نے کسی کے باپ کو سمجھایا کہ چلیں اب جب بچے نے اپنی ہم جماعت سے نکاح کر ہی لیا ہے تو اسے سینے سے لگا لیجیے اور شکر گزاریے کہ نکاح کر کے خود کو غیر شرعی کام سے بچا لیا ہے۔ ہم والدین کو بھی وسعتِ قلب کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اس شخص نے مزید دکھڑا بیان کیا کہ اس بدبخت کی تو خاندان میں منگنی بھی ہو چکی تھی، اب برادری میں بھی رسوائی ہوگی۔ ابا جی کا اگلا سوال تھا، ''یہ ذلت بہتر ہے یا وہ جو آپ کے دباؤ میں آ کر شادی کر لینے کے بعد یہ قدم اٹھاتا اور کئی زندگیاں خراب کرتا؟ دل کو بڑا کیجیے اور برادری کو ولیمے پر بلا لیں۔''

مریض، شاگرد اور وکلاء کی اس مثلث میں نجانے کتنی کہانیاں جن پر طویل ناول لکھے جا سکتے ہیں، کیسی بے شمار باتیں ذہن کے پردوں میں لپٹی ہیں۔ ایک معروف قصہ ان صاحب کا تھا جس نے بھائی کی وفات کے بعد سب کچھ ہتھیا لیا تھا اور روز پنچایت بیٹھتی۔ اس کا ایک بھتیجا ابا جی کے پاس شکایت لے کر آیا۔ اس نے چچا کو جان سے مارنے ڈالنے کے ارادے بھی ظاہر کیے۔

''بیٹا آپ نے اپنے والد کا جنازہ پڑھا تھا ناں؟'' ابا جی نے آرام سے پوچھا۔

''جی۔۔ پڑھا تھا۔۔'' وہ مودب لہجے میں بولا تھا۔

''تو آپ کے والد کے پاس کسی جائیداد کے کاغذات تو نہیں ہوں گے ہاتھ میں جب آپ نے ان کو دفنایا؟ سب مال و دولت، زمین جائیداد یہیں رہ گئی ناں۔ ایسے ہی آپ کے تایا بھی کچھ نہیں لے کر جاسکیں گے۔ یہاں خدائی انصاف نظر آتا ہے۔ آپ اپنی والدہ کی خدمت کریں۔ انھیں غم اور خدشات سے نکالیں اور کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا کہ تایا جان باہر عیاشی کریں اور آپ جیل کی سلاخوں کے پیچھے۔''

کبھی کسی والد کی شکایت پر اس کے بچے کو پاس بلاتے اور اسے حدیث سناتے کہ ''تو اور تیرا پیسہ تیرے باپ کا ہے۔'' مجھے اس جملے کی تب سمجھ آئی جب میں نے کالج پنجابی مباحثے میں حصہ لیا۔ ''پیوسراں دا تاج محمد تے مانواں ٹھنڈیاں چھانواں۔'' ابا جی نے مجھے تفصیل سے وہ حدیث پڑھائی جس میں ایک ضعیف والد کے بیٹے نے اپنے باپ کی شکایت دربارِ رسالت ﷺ میں لگائی کہ اس کا باپ اس کے مال و دولت پر بے جا تصرف کرتا ہے۔ جب سرکارِ دو عالم ﷺ نے انھیں طلب کیا تو وہ بہت دل شکستہ ہوئے اور دربارِ رسالت ﷺ کی جانب روانہ ہوتے وقت، بیٹے کے لیے بے اختیار چند اشعار کہے۔ حدیث کے مطابق ایک دلگیر باپ کے دل کی صدا اس کے قدموں سے پہلے رحمۃ للعالمین ﷺ کے دربار تک پہنچا دی گئی۔ آپ ﷺ نے ان کی آمد پر ان سے فرمایا کہ جو اشعار تم پر نازل ہوئے پہلے وہ سناؤ۔

کالج کے زمانے میں تو میں نے ابا جی کا ترجمہ کیے اشعار پڑھ دیے تھے لیکن آج جب میرے بیٹے نے اپنے شوق سے عربی سیکھی تو میں نے اس کی مدد سے چند اشعار کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

آج سے چودہ سو سال پہلے کے ایک باپ کی آنکھوں سے اشک رواں ہیں اور وہ دل ہی دل میں بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے گلے شکوے کرتا آ رہا ہے کہ جس دن تو پیدا ہوا اسی دن سے تیری خاطر میں نے اپنے آرام اور سکون کو بھلا دیا۔ راتوں کو تیری ننھی سی جان کی خاطر جاگا، تجھے ذرا سی بیماری چھو کر گزرتی تو میرا دل لرزنے لگتا۔ جانتا تھا کہ موت کا ایک دن مقرر ہے لیکن اندیشے کے ناگ میرے دل سے لپٹے رہتے۔ میری ایک ہی تمنا تھی کہ تو ایک بلند و بالا چھتنار درخت بن جائے اور میں تیرے سائے میں بیٹھ کر بڑھاپے کے دن تیری دید کی آسودگی کے ساتھ گزار لوں گا۔ پھر

جب وہ دن آیا کہ تو قامت کشیدہ ہوگیا اور میری ہڈیاں بھر بھرانے لگیں تو تو نے میرے ساتھ بدسلوکی شروع کردی۔ آخری تین مصرے عربی میں ہی پیش کیے ہیں تاکہ جو لوگ عربی جانتے ہیں وہ ان الفاظ میں دہکتے درد کے شرارے کی حدت کو محسوس کریں۔

كانك أَنْتَ الْمنعِم الْمتفَضِّل

فَلَيْتَك إِذْ لَمْ تَرْعَ حَقَّ أبوّتِي

فَعَلْتَ كمَا الجَار الْمجَاوِر يَفعَل

اور اب تو میرے ساتھ وہ سلوک کرتا ہے جو منعم گدا کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ تو مجھے گدا سمجھ کر ہی نوالہ دے دیا کر۔ میں تجھ سے اتنے ہی حسنِ سلوک کا متقاضی ہوں جتنا ایک پڑوسی دوسرے سے کرتا ہے۔

روایت میں ہے کہ امام الانبیاء ﷺ کی آنکھوں سے اشکوں کی ندی رواں ہوگئی اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''انت و مالک لابیک'' تو اور تیرا پیسہ تیرے باپ کا ہے۔ مجھے وہ دن یاد آگیا جب ابا جی نے باپ بیٹے کی صلح کروائی اور بیٹے کو معافی مانگنے کو کہا۔

گھر میں جب اس موضوع پر بات ہوتی کہ والدین اور اولاد کا رشتہ صرف جسمانی ہی نہیں روحانی بھی ہوتا ہے تو دلوں میں اتنی دراڑیں کیسے آجاتی ہیں جن سے تاعمر خون رِستا رہے۔ ابا جی کا مختصر جواب ہوتا:

''مال، پیسہ جس کی ہوس اپنے ساتھ خود غرضی لاتی ہے اور ایسے بدنصیب بیٹے بھول جاتے ہیں کہ جس اولاد کی خاطر وہ اپنے والدین سے دست و گریبان ہو رہے ہیں وہی اولاد ان کے پیش کردہ رویوں سے تربیت پا رہی ہے اور وہ دن دور نہیں جب ان کے بچے بھی ان سے ویسا ہی سلوک کریں گے۔''

اب ہمارے معاشرے میں تو وہ وقت آچکا ہے جب باوجود رزقِ حلال اور صالح تربیت کے ہزار دھڑکے لگے رہتے ہیں۔ وہ بوڑھا باپ جو اولاد کے لیے مال و جائیداد جمع کرتا ہے، ابھی اس کی آنکھیں بھی بند نہیں ہوتیں کہ سینوں میں آشیانے بنا کر چھپی ہوئی ہوس اپنے لیے بہتر زمین کا ٹکڑا، پختہ مکان اور چند لاکھ کاغذ کے ٹکڑوں کے لیے اپنے ہی بہن بھائیوں کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں۔ کوئی ان جھگڑوں کو داماد کی خود غرضی کہتا ہے تو کوئی اسے بہو کی حرص کا سبب قرار دیتا ہے لیکن بنیادی وجہ صرف اور صرف مال کی ہوس ہے۔ وہی مال جو سانس کی حدت کے سرد ہوتے ہی

اسی زمین پر دھرا رہ جائے گا اور ابلیسی دائرے کا سفر جاری رہے گا۔

''فیض رساں اور روزی رساں صرف اللہ کی ذات ہے۔ سخاوت اور عفو اللہ کی صفات ہیں۔ جب بندے میں آتی ہیں تو وہ غنی ہو جاتا ہے۔ اسے کسی سے کوئی غرض نہیں رہتی اور نہ ہی وہ صلے و انعام و اکرام لوٹنے کا متمنی رہتا ہے۔ اسے اللہ کے سوا کسی کی ذات سے فیض یاب ہونے کا قرینہ نہیں رہتا۔ وہ لوگوں کے احساسِ تشکر اور احسان مندی کے اظہار سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگ بادشاہوں سے بہتر زندگی اور اولیا جیسی موت سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ گِلے اور صِلے سے بے نیاز ہو جاؤ۔ اللہ نے آپ کے ذمے اولاد کی تربیت کا فریضہ رکھا ہے۔ اسے جسم و جان کی تمام تر قوت کے ساتھ انجام و نتائج کو اسی علیم بذات الصدور کی حکمت اور فیصلے پر رہنے دو۔''

••

ابا جی تعلیمِ نسواں کے بے حد حامی تھے تاکہ وہ خود اپنے ذہن اور اپنے ہنرمند ہاتھوں کا استعمال کرے اور اسے ملازمت اور تجارت کی آزادی ہو۔ وہ عورتوں کو معاشی بوجھ سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے تاکہ وہ پائی پائی کے لیے کسی دوسرے کے ہاتھوں کی طرف نہ دیکھے۔ ان کا یقین تھا کہ عورت کی حالت تب ہی بدلے گی جب وہ اقتصادی دباؤ سے نکلے گی۔ جب اسے کسی بالائی ہاتھ کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ جب لوگوں کے گھروں میں برتن دھونے کے بجائے وہ اپنے گھر کی دیواریں بلند کرنے کے قابل ہو جائے گی اور اپنے بچوں کو روٹی اور کتاب بیک وقت مہیا کر سکے گی۔ وہ بھی کوئی گھر ہے جہاں بچیوں کو پڑھنے کی تربیت نہ دی جاتی ہو؟ وہ تو قبرستان ہوا۔ کیا ملے گا انھیں تحفے میں جب وہ نئی زندگی شروع کریں گی؟

پرانی کہاوتیں اور ضرب الامثال ہر تعلیم یافتہ اور ناخواندہ مرد کو یاد رہتے ہیں۔ عورت کو فساد کی وجہ بتانے کے لیے معروف ترین محاورہ زن، زر اور زمین ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن عورت کو زر اور زمین کے ساتھ ایک ہی لکیر پر کھڑا کون کرتا ہے؟ سونے کی پوٹلی کا سودا کرو تو وہ ایک جیب سے دوسری جیب میں منتقل ہو جاتی ہے۔ عورت کو بھی اسی طرح انتقالِ ملکیت کے مراحل سے گزارو گے تو وہ اپنی بقا کی جنگ کے لیے طاقت ور فریق کے پاس کیوں نہ جائے گی؟ یہ جو خاندان آپس میں شادیاں کرتے ہیں، بچوں کو زمین کے ٹکڑوں کی طرح آپس میں تقسیم ہی تو کرتے ہیں۔ چاچے دی دھی، مامے دا پتر، پھوپھی اور تائے کے بچوں سے شادیاں اسی زمین اور زر کو اپنی ملکیت میں رکھنے کے لیے ہیں۔

••

میں نے ہمیشہ ابا جی کو یہی کہتے سنا کہ مرد کما کر تو لا سکتا ہے لیکن وہ ایک گرہستن عورت کی طرح دسترخوان نہیں سجا سکتا۔ یہ وصف اللہ رب العزت نے فطری طور پر عورت میں رکھا ہے کہ وہ آرائش، آہنگ اور تناسب کو پسند کرتی ہے۔ اس دولت کے بل بوتے پر وہ ایسی کارکردگی دکھا سکتی ہے جو مردوں کے بس میں بھی نہیں۔ مرد کے پاس لاکھوں بھی ہوں تو وہ صرف سامان خرید سکتا ہے لیکن عورت ککھ سے لکھ بنانے کا ہنر جانتی ہے۔ بس یہی وجہ ہے کہ جذباتی طور پر مرد ایک جذباتی عورت کا ہی سہارا چاہتا ہے جو صرف زبانی طور پر ہی اس کی حوصلہ افزائی کرے اور حرفِ تسلی کا خزانہ اس کے خالی دامن میں ڈال دے۔ دوسری طرف ان تمام اوصاف کو جب وہ منفی انداز میں استعمال کرتی ہے تو اس سے بڑا تخریب کا کوئی استعارہ نہیں ہوتا۔

اب بحث یہ ہے کہ عورت کو منفی ڈگر پر ڈالا ہی کیوں جائے؟ اگر اسے ابتدا ہی سے زیادہ محبت، زیادہ توجہ اور یقین سونپا جائے تو اس سے بڑا کوئی جال نہیں ہوتا بلکہ وہ خود اس زنجیر کی حفاظت کرتی ہے۔ اس کے برعکس تضحیک، تنقید اور حوصلہ شکنی سے بڑا ایٹم بم کوئی نہیں ہوتا جو ایک نہ ایک دن ضرور پھٹتا ہے۔ بطور باپ، بھائی، شوہر اور بیٹا اسے شفقت، تحفظ، محبت اور عزت سے نواز کر کوہِ نور بنایا جا سکتا ہے۔ ان چاروں مردوں میں سے پہلے دو مردوں کی محنت اور محبت کو ایک تیسرا مرد شوہر کے روپ میں یا تو مزید بلندی کی طرف لے جا سکتا ہے جہاں وہ اس کی نسلوں کی امین بن جاتی ہے یا پھر مکمل برباد کر سکتا ہے۔ ایک تیسری صورتِ حال یہ بھی ہے کہ اپنی خانگی زندگی کی بقا کے لیے سمجھوتے کی دلدل میں اتار دیا جائے جہاں اسے اپنے شعور اور شخصیت کی قربانی دینا پڑے۔ مگر اس صورت میں صرف ایک زندگی نہیں بلکہ ایک نسل کی خرابی کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔

••

ابا جی اپنے پاس خانگی مسائل لے کر آنے والوں کو تحمل اور معاملہ فہمی کی نصیحت کرتے،

''بیویوں یا بہوؤں پر بلاوجہ ناجائز پابندیاں لگانا محض نفرت کو جنم دیتا ہے۔ عورت ہو یا مرد، ان کی زندگی میں اقتصادی خود انحصاری ہونا بے حد اہم ہے۔ ساری زندگی تعلیم اور شعبہ ہی ساتھ دیتا ہے تو انسان وہی شعبہ اختیار کرے جس کے لیے واقعی خواہش ہو۔ پھر کئی سال کی تعلیم کے بعد کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خواتین سے ان کی مرضی اور اختیار چھین کر ان کو صرف اس لیے گھر بٹھا دے کہ اس کے خاندان کی رسومات و روایات یہی ہیں۔

معاملات پہلے طے ہونے چاہییں۔ شادی آسمان سے اتری یا آسمان پر بسر کرنے والی کوئی ایسی چیز نہیں بلکہ ایک سماجی معاہدہ ہے جس میں طرفین ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، مالک اور حاکم نہیں۔ اس معاہدے میں آقا و بندہ کی تفریق نہیں بلکہ حقوق و فرائض اور احترام اور محبت کا تبادلہ ہوتا ہے۔ یہ دقیانوسی سوچ کہ جہاں ڈولی جا رہی ہے وہاں سے جنازہ نکلے، صرف بیٹیوں کے ذہن میں ہی کیوں بٹھائی جاتی ہے؟ بیٹے کی تربیت میں بھی تو یہ چیز شامل ہونی چاہیے کہ باپ بننا کوئی سہل کام نہیں ہے۔ نسلِ نو کی تربیت اور مستقبل والدین سے قربانی مانگتا ہے۔ اس میں بالخصوص خواتین کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ بحیثیت ماں کے بچوں کی درست رہنمائی کا فرض اور ان کو صبر و تحمل کا درس دیتے ہوئے عورت سے منسوب روایتی حسد کی چنگاری کو بجھانا ہوگا۔

ہمارے زمانے میں عورتیں بے لگام حسد سے سیاست اور مکر و فن سے بچوں کے گھر اجاڑتی تھیں۔ ہر گھر کی بنیاد ہلنے میں عورت کا کردار موجود ہوتا ہے۔ لیکن اب وقت بتا رہا ہے کہ بچوں کے گھر بسانے کے لیے عورتوں کو اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لانا ہوں گی۔ ساس اور نند کے روایتی ہتھکنڈے چھوڑنا ہوں گے۔ اپنے باپ اور بھائی کی زندگی میں ایک اہم ترین اور نئے کردار کو برداشت کرنا ہوگا۔ بہوؤں کو مثبت سوچ رکھنا ہوگی اور اپنی نئی نسل کو رشتوں سے محروم کرنے کی سازشیں ختم کرنا ہوں گی تاکہ مرد کے ہاتھ کا ترازو سیدھا رہ سکے۔ وہ اپنے دماغ سے بھی سوچ سکے اور زنانہ سیاستوں اور کوتاہ اندیشی کا شکار نہ بنے۔ لشکر کشی اور رسہ کشی سے گریز کرنا ہوگا ورنہ گھر ریت کا گھروندا بن جائیں گے۔''

اباجی کے ان خیالات کو آج کے مغربی معاشرے میں پاکستانی کمیونٹی کی خواتین کے ساتھ کام کرتے ہوئے دہراتی ہوں تو وہ حیران ہوتی ہیں۔ یورپ میں آج بھی ایشیائی کمیونٹی میں ان مسائل کے سپولیے کلبلاتے ہیں۔

••

ساس اور بہو کے ازلی جھگڑوں میں بیٹی کے سسرال سے فسادات کے دوران میاں اور بیوی کے اختیارات، اطاعت گزاری کے دوران پھٹتے چولھے، کھانے میں کم نمک یا زیادہ مرچ پر حالات کی چکی میں پس جانے والی عورتیں، محبت کرنے والی ماں کے روپ میں داماد کو پھٹکارتے اور بیٹی کو کلیجے سے لگاتی عاقبت نااندیش طاقت کا ریلہ، گول گرم روٹی اور تازہ دم کی ہوئی چائے کے احکامات کی حکم عدولی پر گھر کی چاردیواری سے دھتکاری ہوئی عورت، والدین کے خوابوں کی تکمیل

کرتے شرق و غرب کے بعد باوجود ایک ازدواجی رشتے میں بندھے بچے، نوجوانوں کی غفلتوں اور نفرتوں کا شکار بے بس بڑھاپا، معصوم نونہال اور مرد و زن جن سے مل کر محوری ظلم کا شکار ایک ایسا معاشرہ بنتا ہے جہاں یہ سب اپنی اپنی دنیا میں جنگی حربوں اور ہتھیاروں کا ہدف ہیں۔

تو کیا یہ رویے سکھانے کی چیز ہیں؟ انسان کے اندر کہیں تو ایک محتسب موجود ہے جو اسے متنبہ کرتا ہے کہ وہ دوسروں سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ گھٹیا رویہ اور بدسلوکی کر رہا ہے۔ کیا اسے باہر سے کوئی آ کے سکھائے گا کہ یہ غیر انسانی اور غیر اخلاقی رویہ ہے؟ انسانی خصائل کا بہترین انداز تو حیوانات کی دنیا میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ جانور بھی اپنی مادہ کے ساتھ مل کر گھر بناتے ہیں۔ ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اپنی گروہی زندگی میں مادہ اور بچوں کے گرد حصار کھینچ کر رکھتے ہیں۔ تو حل کیا ہے؟ کیا جنگ ایک اور خونیں جنگ سے، اور ظلم مزید ظلم سے مٹے گا؟ بہترین حل یہی ہے کہ آپ اپنی ذات کی حد تک، کبر و اِستکبار کی کونپل کو اسی لمحے جڑ سے کچل ڈالیں کیونکہ جب یہ تناور شجر بن جائے تو پھر فقط پچھتاوے ہاتھ آتے ہیں۔

عزیز بھائی کی رحلت کے بعد، اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ابا جی کے لیکچر چلنے لگے جن کا مرکزی موضوع یہی تھا کہ عورتوں کو اپنی تعلیم اور دین کے علم کے ذریعے اپنے روایتی رویے بدلنا ہوں گے۔ اپنے گھر کے مردوں کو دوراہے پر کھڑا کر کے انتخاب کی آزمائش کے عذاب میں ڈالنے سے گریز کرنا ہوگا۔ اگرچہ ان کے پاس پہلے بھی مسائل کا شکار خاندان اور جوڑے آتے تھے لیکن وہ گھر میں اتنی شدت اور تواتر سے ان کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ یعنی سب کچھ عورتیں کرتی ہیں مرد معصوم بیچارے ننھے بچے جن کی لگام یا اماں اور بہنا کے ہاتھ میں ہوگی یا زن مریدی کا طوق ہوگا۔

''امی جی، ابا جی کو کیا ہوگیا ہے؟'' میں نے ایک دن باقاعدہ تشویش سے پوچھا۔

''مجھے کچھ نہیں ہوا جانِ پدر'' ابا جی بات کو اچکتے ہوئے بولے، ''جب سے میں نے اپنے ہاتھ سے جوان بیٹے کو لحد میں اتارا ہے، مجھ پر منکشف ہوگیا ہے کہ یہ مال و دولتِ دنیا اور رشتہ و پیوند صرف سانس بھر کا کھیل ہے۔ بس یہ تنفس کی روشنی کو بدن سے نکلنے دو پھر ایسی تاریکی پھیلتی ہے کہ تدفین کے لیے بھی دوسروں کے محتاج ہو جاؤ۔ کوئی مٹی دے یا نہ دے، کفن نصیب ہو یا نہ ہو۔ جتنے دم رگوں میں زندگی کی روانی ہے اسے غنیمت سمجھو اور اپنی ذات کو حرص، ہوس، انتقام، اور پچھتاوے سے حتی الوسع دور رکھو۔ جہاں تک ممکن ہو رحمۃ للعالمین ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے بوند بھر روشنی لے لو کہ جس نے کوڑا پھینکا، اس کی عیادت کو جانا ہے۔ دوسروں کو معاف کرنا اپنی ذات کے لیے راستے

سہل کرنا ہے۔ اور پھر یہ بھی تو احسان ہے کہ اللہ کسی کو معاف کرنے والا بنائے، دست بستہ معافیاں مانگنے سے پناہ دے۔ میں کبھی کبھار یہ سوچتی ہوں، کاش اس وقت علم ہوتا کہ یہ لیکچرز کتنے قیمتی ہیں اور ایک وقت وہ بھی آئے گا جب میری زندگی ایک ایک لمحے کا تصور کر کے ایک ایک لفظ دوہرائے گی۔

••

ابا جی کے پاس مریضوں کی رنگ برنگی داستانوں کے علاوہ جو مسائل بھری کہانیوں کے کردار آتے مجھے ان کی روداد سننے اور ابا جی کے مشوروں کے تجزیے کا بہت لطف آتا۔ ایک مشہور قریبی گاؤں سے جس کے بیشتر افراد یورپ میں تھے، ایک بزرگ اپنے بیٹے اور اس کے دو بہت پیارے بچوں کے ساتھ آئے۔ بچے انگریزی یا پنجابی میں ہی بات کر رہے تھے۔ میں نے ان دونوں کو مشروب کی بوتل کھول کر پلائی اور چھوٹے چھوٹے دو تین سوال کیے۔

وہ لندن سے اپنے دادی دادا کے پاس آئے تھے، جو مستقلاً واپس آ کر اب یہاں سیٹ ہو چکے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ان بچوں کے والدین کی علیحدگی ہو گئی تھی۔ والدہ بھی ان کے والد کی طرح یورپ میں ہی پیدا ہوئیں اور وہیں پرورش پائی لیکن دس برس بعد دونوں کے اختلافات ہو گئے اور اختتام جدائی پر ہوا۔ اب کی بار ان کے دادا نے اپنے بھائی کی بیٹی سے رشتہ طے کر دیا جسے ہم سہولت کی خاطر عاتکہ کہہ لیتے ہیں جو میٹرک پاس کرنے کے بعد کسی اچھے رشتے کے انتظار میں تھی۔ چونکہ ان کے ہاں برادری سے باہر شادی کا رواج نہیں تھا لہٰذا بچی کی عمر بھی کچھ ڈھلتی جا رہی تھی۔ دوسری جانب لندن والے وہاں کے پلے بڑھے بچوں کی لو میرج کو بھگت چکے تھے سو انھیں امید تھی کہ پاکستان کے ماحول اور تربیت کے پس منظر کی بچی زیادہ بہتر ساتھی ثابت ہو گی کیونکہ ان بچیوں کی تربیت میں اچھا تہذیبی ماحول اور صبر کا درس بھی شامل ہوتا ہے۔ پھر تیس برس کی پختہ عمر والی خاتون بچوں کے ساتھ بھی یقیناً اچھا سلوک کرے گی۔ لیکن قصہ یہ ہوا کہ محترمہ نے برطانیہ پہنچتے ہی میاں کے بچوں کو اپنا دشمن تصور کر لیا۔ اگرچہ رہتے وہ اپنی والدہ ہی کے پاس تھے لیکن وہاں کے قوانین کے مطابق ہر ہفتے ویک اینڈ پر باپ کے پاس رہنے آتے جو ان کو ہوم ورک کرواتا اور باہر گھمانے پھرانے یا خریداری کے لیے بھی لے کر جاتا۔

اعتراضات کی ابتدا خاتون کے اس اصرار کے ساتھ ہوئی کہ وہ ماں کے ساتھ شاپنگ پر کیوں نہیں جاتے، گھر کیوں آتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اب بچوں کے ابا کی زندگی پھر اسی نہج پر کھڑی تھی جہاں سے شروع ہوئی۔ مزید یہ کہ ان صاحبہ میں اولاد کے آثار بھی نہیں تھے جس پر وہ مزید چڑچڑی ہوگئیں۔ ادھر لڑکی کی والدہ کی شہہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور خاندانی جھگڑے بھی سر اٹھانے لگے۔

چودھری صاحب ابا جی کے پاس آئے کہ مرزا صاحب میرا چھوٹا بھائی اپنی بیگم اور ہماری بہو کے ساتھ شہر آئیں گے، آپ ذرا انھیں سمجھائیں۔ ابھی تو وہ اس بات پر شیر ہیں کہ لڑکے کی ایک دفعہ طلاق ہو چکی ہے سو دوسری دفعہ لڑکا خوف زدہ ہوگا اور پھر رشتے داری بھی ہے، سو اس کے لیے ایسا فیصلہ کرنا آسان نہیں ہوگا۔ ابا جی نے امی جی کو تفصیل بتائی اور یہ بھی کہا کہ آپ بھی بچی سے بات کیجیے۔ دو دن بعد موصوفہ نازل ہوئیں۔ نیلے رنگ کا جوڑا، نیلے ہی جوتے اور بڑے بڑے جھولتے آویزوں کے ساتھ خوب سج دھج تھی۔ بات بات پر تھینک یو تھینک یو اور انگریزی کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ چائے وغیرہ پیش کی گئی۔ جب میں برتن رکھ کر واپس کمرے میں آئی تو امی جی حسبِ عادت حسنِ سلوک سے دل جیتنے اور نیکیاں کمانے کے کلیے بتا رہی تھیں۔

جہلم کی ایک لیڈی ڈاکٹر کا پتہ بھی کروایا گیا۔ اب امی جی سے نہ رہا گیا، بڑی شائستگی سے بولیں، ''اس کے پہلے بچوں کو تو آپ گھر میں دیکھنا پسند نہیں کرتیں۔ ان سے شفقت برتیں، کیا پتہ اس نیکی کی وجہ سے ہی اللہ اس کی گود بھر دے؟''

چونکہ مجھے اس اوٹ پٹانگ قصے سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی سو آدابِ میزبانی نبھانے کے بعد میں اپنے حجرے میں گھس گئی۔ کہانی کا نقطۂ عروج تب آیا جب چند دن کے بعد معاملات بگڑ گئے اور اب کے وہ لڑکی اپنے والدین اور تایا کے ساتھ آئی۔ درمیان والا دروازہ بند کر دیا گیا۔ بچی کے ساتھ براہِ راست مذاکرات شروع ہوئے۔ امی جی نے چائے بھجوائی پھر رات کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ لڑکی کی والدہ کے تیز تیز بولنے کی آوازیں آتی رہیں جن میں یہ جملہ سنائی دیتا رہا کہ میری کنواری بچی دو دو بچوں کے باپ کے ساتھ بیاہی گئی۔

اب درمیانی دروازہ کھل گیا۔ کھانا رکھا گیا۔ لڑکی خاموشی سے اپنی اماں کی بغل میں دبکی بیٹھی تھی۔ مجھے ابا جی کے برہم تیور واضح دکھائی دے رہے تھے جو کہ ایک غیر معمولی بات تھی۔۔۔

''بہن جی بات یہ ہے کہ رشتہ آپ سے زبردستی نہیں لیا گیا تھا۔ آپ نے ساری صورتِ حال جانتے ہوئے اپنی مرضی و منشا سے دو بچوں کی موجودگی میں رشتہ دیا تھا۔''

''مولبی صاحب'' وہ دوپٹے کو کان کے پیچھے اٹکاتے ہوئے تیزی سے بولی، ''ساہنوں

رشتیاں دا گھاٹا نئیں سی۔'' (ہمیں رشتوں کی کمی نہیں تھی)

اب مولوی صاحب اپنی مثالی حکمت کے ساتھ نرمی سے بولے،''ظاہر ہے آپ کے پاس باقی تمام رشتوں میں یہی سب سے بہتر ہوگا۔'' لڑکی کی ماں خاموش رہی۔

''پھر آپ نے اپنی بیٹی کو یہ تو ضرور بتایا ہوگا کہ ان بچوں سے باپ کا رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا۔ نیک سلوک کرے گی تو پلے پلائے دو بچے بھی مل جائیں گے اور گھر بھی باعزت طریقے سے آباد ہوگا؟''

''رشتہ کب تڑوا رہے ہیں جی ہم۔ ہم تو کہتے ہیں کہ بس ان کی ماں ان کو سنبھالے۔ طلاق لے کر گئی ہے تو بچوں کو کیوں روز بھیج دیتی ہے؟''

اب ابا جی نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا،'' آپ عورتیں چاہیں تو ایسی صورتِ حال پیدا ہی نہ ہو۔ یہ کس قسم کا انصاف ہے کہ بچے ہفتے دو ہفتے بعد باپ کو ملنے آئیں تو گھر میں فساد شروع ہوجائے؟ اب تو پاکستان جیسے ملک میں بھی خاوند کی وفات کی صورت میں دو بچوں کی ماں کی شادی بھی ہوتی ہے اور اسے بچوں سمیت قبول بھی کیا جاتا ہے۔''

''جی، لیکن یہ لڑکے کی دوسری شادی ہے۔ میری بچی تو کنواری سکون سے اپنے گھر بیٹھی تھی۔ اس کے باپ کو بھائی کی محبت نے مصیبت میں ڈالا ہوا تھا۔ ویسے بھی یہ ولایت کی بے حیائی کا مسئلہ ہے کہ طلاق کے بعد بھی پہلی بیوی کا خیال رکھو۔''

ابا جی حیران ہوکر بولے،''اس میں مشرق ومغرب کے طرزِ بود و باش کا کیا ذکر؟ سنتِ نبوی ﷺ میں عورت کے پہلے بچے اور دورِ نبوت میں عورتیں اپنے بچوں سمیت نکاح میں آتیں۔ وہ بھی بچوں کے باپ سے ملتی تھیں اور ان کے سابق شوہر بھی ضرورت پڑنے پر ان سے بات چیت بھی کیا کرتے تھے۔ آج کا دستور نہیں کہ عورت سے کہا جائے کہ بچہ ننھیال میں چھوڑ آؤ۔

اسی طرح جو بھی عورت ایسے مرد سے عقد کرتی ہے جس کی پہلی اولاد ہو تو اس کے لیے پلی پلائی اولاد کو حسنِ اخلاق اور نگہداری سے اپنا بنانا کون سا بڑا کام ہے؟ اس میں یورپ کے آداب اور معاشرت کا تعلق نہیں۔ یہ حسنِ باطن، اعلیٰ ظرفی اور روشن ضمیری کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگر آپ کا سلوک اور اخلاق اپنے جیون ساتھی کے گھرانے کے ساتھ بہترین ہو۔ فی زمانہ جو بد خلقی اور بدسلوکی عام ہے وہ یہ ہے کہ بچوں والی خاتون کو اپنی فہرست سے نکال دیا جاتا ہے اور بچوں والے مرد سے معاشی اور مادی فوائد کے پیشِ نظر نکاح کرلیا جاتا ہے اور پھر بدفطرتی کے مظاہرے سے اس کی زندگی اجیرن بنا

دی جاتی ہے۔ میں اسی لیے بارہا کہتا ہوں کہ مرد اپنی ضد اور تکبر سے ایک گھر برباد کرتا ہے جب کہ عورت اجاڑنے پر آئے تو نسلیں اجاڑتی ہے۔ اس کا آسان حل یہ ہے کہ اپنے مزاج کی بدفطرتی کا اندازہ ہو تو کسی بھی مادی فائدے کی خاطر ایسی عورت یا مرد سے شادی سے گریز کیا جائے تاکہ بعد کے مسائل پیدا ہی نہ ہوں۔ نکاح ایک سماجی معاہدہ ہوتا ہے جسے طرفین اپنے اپنے مفادات اور بہتری کے مطابق کرتے ہیں۔ بچے معاشرے کا مجبور ترین طبقہ ہیں۔ ان کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیے۔''

••

یورپ اور مغربی دُنیا کے ثروت مند مردوں سے شادی کرتے ہوئے اپنی کنواری اور کم عمر بیٹی کا رشتہ دینا ایک عام بات ہے۔ یہ کہانی کرداروں کے نام کے فرق کے ساتھ ہمیشہ دہرائی جاتی ہے۔ اباجی اور تایا جان کے پاس ایسے مسائل اکثر آتے تھے۔ مجھے ایم اے کے امتحانات کی تیاری کے دنوں میں اباجی کے افکار کو ازسرِ نو ایک نئے زاویے سے سمجھنے کا موقع ملا۔ قریبی گاؤں میں راجہ برادری کے گھروں کی اکثریت تھی۔ ایک خاتون ہر دوسرے تیسرے دن آن موجود ہوتی تھیں۔ ان کے چہرے پر دائمی غصے کا ایک تاثر منجمد تھا۔ پیٹ کی مریضہ تھیں اور چائے پینے کے دوران مسلسل کہانی کی صورت میں اپنا مرض بیان کرتی رہتیں۔ 'تقریر' کے دوران گاہے بگاہے اپنے چار افسر بیٹوں کے کردار پیش کرتی رہتیں۔ پھر ایک ڈرامائی موڑ آتا اور ذکر شروع ہوتا ان کی اکلوتی بیٹی کا جو شادی کے بعد ولایت جا بسی تھی اور پوری بارہ جماعتیں پاس تھی۔ میں نے چپکے چپکے اس خاتون کا نام غصیلی بیگم رکھ دیا۔

ایک دن امی سے رازداری سے پوچھنے لگیں، ''یہ آپ کی بیٹی ہر وقت پڑھتی کیوں رہتی ہے؟ یہ اتنی سوکھی سڑی کمزور کیوں ہے؟ اس کی بچی بھی کمزور سی ہے؟ اس کا سسرال کہاں ہے؟ یہاں کیوں رہتی ہے؟ اس کا بندہ اسے خرچہ ورچہ دیتا ہے؟''

امی جی نے اس کو تسلی بخش جواب دیے کہ اسے پڑھنے کا شوق ہے تو امتحان دے رہی ہے۔ فارغ ہو کر واپس چلی جائے گی۔

''اچھا۔۔۔؟'' انھوں نے ایک غصیلی نظر میں تشکیک بھر کر مجھ پر ڈالی، ''بارھویں جماعت کے امتحان دے رہی ہو؟''

''نہیں''، میں نے مختصر جواب دیا۔

''پھر کون سی جماعت کا امتحان ہے؟''

''سولھویں جماعت کا۔''

''وہ تو ہوتی ہی نہیں'' انھوں نے ایک تضحیک آمیز نظر کی کٹاری پھینکی۔

مجھے بچپن کے زمانے میں ابا جی سے سنی ایک عالم و فاضل ''ڈڈو'' (مینڈک) کی کہانی یاد آ گئی۔ ایک دریائی مینڈک قسمت کی ستم ظریفی سے ایک کنوئیں میں جا گرا۔ وہاں مقیم ایک بوڑھے مینڈک نے اس کا انٹرویو لیا، ''ہاں میاں کہاں سے آئے ہو؟''

''جہاں سے میں آیا ہوں وہ دریا بہت بڑا ہے'' دریائی مینڈک بتانے لگا۔

کنوئیں کے دانا بوڑھے مینڈک نے ایک چوتھائی کنوئیں کا چکر کاٹا۔۔۔ پھر رک کر بولا، ''اتنا بڑا؟''

''نہیں'' دریائی مینڈک بولا۔

اب کے کنوئیں کے مینڈک نے نصف دائرے کا چکر لگایا، ''تو پھر اتنا بڑا؟''

''نہیں'' تین چوتھائی چکر کے بعد کے تقابل میں بھی دریائی مینڈک کا جواب نفی ہی میں تھا۔ تنگ آ کر کنوئیں کے مینڈک نے پورے کنوئیں کا چکر لگایا اور پھر پوچھا، تو پھر یقیناً اتنا بڑا ہوگا۔۔۔؟''

''نہیں۔۔۔ اس سے بھی کہیں بڑا'' دریائی مینڈک نے جواب دیا۔

''ابے چل۔۔۔ جھوٹے، گپوڑے۔۔۔ اتنا بڑا کنواں تو ہوتا ہی نہیں۔''

مجھے عصیلی بیگم کی نظریں بھی یہی پیغام دیتی محسوس ہوئیں، ''چل جھوٹی۔۔ گپوڑی۔۔۔ سولھویں جماعت تو ہوتی ہی نہیں۔''

میں نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور دوسرے کمرے میں چل دی۔

ان کے بیٹوں نے نجانے کون کون سی افسری پاس کی تھی۔ بیٹی بارہ جماعتیں پاس تھی اور ولایت رہتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ ان ہی دنوں ان کی لائق فائق بیٹی چار سال ولایت رہنے کے بعد پاکستان ملنے کے لیے آئی۔ اس کے سنجیدہ مسائل تھے اور اس کے سسر صاحب نے ابا جی سے رابطہ کیا کہ مرزا صاحب ان کی والدہ کو سمجھائیں کہ بچی کو سدھرنے کی تاکید کریں۔ مجھے آج ساری بات ٹھیک سے یاد تو نہیں لیکن مجھے وہ بے لاگ اور صریح مکالمہ کبھی نہیں بھولے گا۔

ابا جی نے امی جی کو اور مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا۔ یہ میری بیٹی ہے۔ انھوں نے میری طرف

اشارہ کیا۔ پڑھنے اور امتحان دینے کی غرض سے طویل عرصے کے لیے پاکستان آئی ہے۔ غصیلی بیگم نے جس طرح چونک کر دیکھا، مجھے اپنا آپ کسی کارٹون کی طرح محسوس ہوا۔

''کہاں سے آئی ہے؟'' غصیلی بیگم نے تھانیداروں کی طرح پوچھا۔ ان کی برمے کی طرح چھید کرتی نظریں میری سونی کلائیوں پر تھیں۔ اگرچہ میں نے گلے میں لاکٹ پہن رکھا تھا اور میرے ہاتھ میں یاقوت کی وہ نازک سی انگوٹھی تھی جو ابا جی نے بی اے میں ٹاپ کرنے پر خود اپنی پسند سے لا کر دی تھی۔

ابا جی نے ایک لحظہ توقف کیا پھر اسے سمجھانے کو بولے، ''ولایت سے۔''

اس کی نظر پھر چلائی، ''جھوٹی۔۔۔ گپوڑی'' لیکن وہ آہستہ سے بولی، ''اچھا۔۔۔۔؟ میں سمجھی یہ بھی کسی پنڈ سے آئی ہے۔''

ابا جی نے سنی ان سنی کر کے اپنی بات جاری رکھی اور غرور آمیز خاموشی طاری کیے بیٹھی لندن پلٹ بیٹی کو مخاطب کیا، ''میرے لیے آپ اسی بیٹی کی طرح ہیں اس لیے جو کہوں گا آپ کی بہتری کے لیے ہوگا۔ اسے غور سے سن لیں۔ آپ کی والدہ کو جسمانی عارضہ لاحق نہیں۔ وہ ذہنی طور پر اذیت کا شکار ہیں۔ مسلسل قے، پیٹ خراب اور بخار علامت ہیں۔ بوڑھے والدین کو اولاد کی خوشیاں زندہ رکھتی ہیں۔ ان کی کامیابیوں کی ڈھال کے پیچھے عمر کا پچھلا پہر گزارتے ہیں وہ۔''

بیٹی فرمانے لگی، ''میں اماں کو، جہلم سی ایم ایچ کے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتی تھی لیکن وہ ادھر ہی آنے کی ضد کرتی ہیں۔'' اس نے جس حقارت سے لفظ ''اِدھر'' ادا کیا وہ اس کے روایتی ولایتی ہونے کی نشانی تھا۔

''آپ کو مسئلہ کیا ہے؟'' ابا جی نے اختصار سے کہا۔

اب ہر ایک کو گھور کر دیکھنے والی خاتون شروع ہوگئیں، ''مسئلہ کیا ہوگا؟ آپ جس کی وکالت کرنا چاہتے ہیں اس کو صرف اپنے بچے ہی نظر آتے ہیں۔ بیٹے کو گاڑی لے کر دی۔ بیٹی کی شادی کا سارا خرچہ اٹھایا، اسے ولایتی سونے کے سیٹ ڈالے۔ جوڑے گھوڑے لے کر دیے۔ ہال بک کروائے۔ سلامیاں دیں۔ وہ تو میں نے واویلا مچا دیا تو آخری بچے کو گھر نہیں لا سکا۔ ان کی ماں اتنی ہی اچھی تھی تو اس کو چھوڑا کیوں۔ اب چھوڑ دیا ہے تو مڑ مڑ کر بچوں کے پیچھے جانے کے بہانے اسے ملتا کیوں ہے؟ وہ اتنی چالاک ہے کہ اولاد کی آڑ میں مال بٹور رہی ہے۔''

خاتون دو سو میل گھنٹہ کی رفتار سے چھوٹے اسٹیشنوں پر رکے بغیر بولتی رہیں ''پڑھی لکھی

ہوں، جاہل نہیں، سب سمجھتی ہوں۔''

''پتر۔۔۔ ہر جاہل کو یہی گمان ہوتا ہے کہ وہ سب سمجھتا ہے۔ دوسروں سے بہتر ہونے کا خبط اور برتر ہونے کا زعم زمین پر قدم نہیں رکھنے دیتا۔ اگر اتنے ہی بہتر ہو تو دوسروں کی بہتری کا بھی اہتمام کر دو۔'' ابا جی نے اپنی شفقت سے معمور آواز میں سمجھایا۔

میں نے امی جی کی طرف دیکھا۔ بھلا ہمیں اس تھیٹر کے ناظرین کیوں بننا ہے؟ مجھے کوفت ہونے لگی۔ یہ سارے ڈرامے کیا ادھر لگنا ضروری ہیں؟ آخر اپنی زنانیوں کو خود کیوں نہیں سمجھا اور سنبھال سکتے۔ اپنی اولاد کو سمجھانے کے لیے ابا جی کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ ان کے اپنے رابطوں کے پل کیوں جل جاتے ہیں۔

میرا جی چاہا اٹھ کر بھاگ جاؤں۔ کمبختو رہنا یا بسنا ہے تو ڈرامے نہ کرو۔ اگر نہیں رہنا تو بس فیصلہ سناؤ اور گھر گھر جاؤ۔ اتنا رسوا ہو کر اور اتنی ''پریا'' (پنچایت) بٹھا کر اگر واپس وہیں جانا ہے تو خاک ایسے بسنے پر۔ امی جی نے مجھ سے نظر ہی نہیں ملائی۔ انھیں علم تھا کہ میرا پارہ چڑھ رہا ہے۔ میری طرف دیکھے بغیر وہ چپ کر کے اس کے فرمودات سن رہی تھیں۔

میرے کہانی کار ذہن نے سارا افسانہ بن لیا۔ بے چاری دوسری بیوی بن کر گئی تھی۔ اب روایتی حاسد، تنگ نظر اور تنگ ذہن عورتوں کی طرح میاں کا ناطقہ بند کر رکھا ہوگا۔ اتنی اتراہٹ تھی تو دوسری بیوی بننا کیوں منظور کیا؟ ظرف نہیں ہے تو پھر رہو دو نمبری۔ میں نے اس کے مغرور چہرے کی طرف دیکھا جو شاید مسکراتا تو بہت دلکش لگتا لیکن کرختگی نے اس کے نقوش بگاڑ دیے تھے۔

''اچھا پتر۔ پہلی بات کا جواب دیں۔ آپ کو والدین نے گاؤں سے شہر بھیج کر پڑھایا۔ ناز و نعم سے پالا اور ظاہر ہے بیاہ کر اس کے ساتھ بھیجا جو ان کو سب سے بہتر نظر آیا ہوگا۔ کیا آپ کے شوہر نے چھپایا تھا کہ اس کے تین بچے ہیں؟''

''نہیں'' وہ ہنوز اسی ہٹیلے انداز میں بولی۔

''کیا اس نے بتایا نہیں تھا کہ ان بچوں کی ماں جو اس کے سگے ماموں کی بیٹی بھی ہے، وہ اسے چھوڑ چکا ہے؟''

''جی سب علم تھا'' اب کے اس کی والدہ بولی۔

''کیا اس نے آپ سے عمر چھپائی؟'' ابا جی وکیلوں کے ابا ہی ثابت ہو رہے تھے۔

''نہیں جی، یہ باتیں تو سچ سچ ہی بتائی تھیں۔'' اماں مری مری آواز میں بولیں، خاندان

والوں کے ذریعے اصلی عمر تو پتہ لگ ہی جاتی ہے ناں جی۔
''تو پھر جب آپ سب کو معلوم تھا کہ اس کے جوان بچے ہیں تو بھی رشتہ قبول کیا گیا، تو پھر کیا بچی کو ذہن نشین کروانا ضروری نہیں تھا کہ اس شوہر کو بچوں سمیت قبول کیا جانا چاہیے تھا؟ جیسے بیوہ بچیوں یا بچوں والی عورتوں کے نکاحِ ثانی پر ان کو بچوں سمیت قبول کرنے کے خطبے دیے جاتے ہیں؟'' ابا جی بہت رسان سے بولے۔

کسی پنچایت نامی اور صلح کی کوشش میں کی جانے والی مجلس میں بیٹھنے کا یہ میرا پہلا اور آخری تجربہ تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر تھی کہ ابا جی نے مجھے کیوں بٹھا رکھا ہے۔

غصیلی بیگم کے چہرے کا رنگ بدلا۔ اسے شاید اس بات کی توقع نہیں تھی۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ اب ابا جی اپنی روایتی حیرت آفریں صاف گوئی کا مظاہرہ کرنے کو ہیں۔ ''یہ گورے لوگ کا طریقہ ہے کہ طلاق دینے کے بعد بھی ان عورتوں سے ملتے ہیں۔ مسلمانوں کو زیب نہیں دیتا۔'' اس ولایت سے آنے والی دانشور نے ابا جی کو اطلاع دی۔

''نہیں میری بیٹی، آپ پڑھی لکھی ہیں۔ ذرا ازواجِ مطہرات کے بارے میں پڑھیے۔ بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا اور بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کی مثال صرف بڑی چھوٹی عمر کی عورت سے شادی کے لیے ہی دی جاتی ہے، یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس کے پیچھے ایک پورے معاشرے کی تربیت تھی۔ صحابہ کرام اپنی پہلی بیویوں سے بوقتِ ضرورت بات کیا کرتے تھے۔ بی بی صفیہؓ کی کہانی پڑھیں جب بیوی رشتے دار بھی ہو تو خوشی غمی کے موقع پر ٹکراؤ بھی ہوتا ہے۔ سانجھے خاندانوں میں یہ نشیب و فراز آتے ہیں۔ ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے صبر کی دولت کا حصول ضروری ہے۔

اسی لیے تو جائز کاموں میں طلاق کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ اب جب آپ کو معلوم تھا کہ آپ کے ہونے والے شوہر کے جوان بچے ہیں اور وہ ان کی ذمہ داری اٹھانے کا حوصلہ اور ظرف بھی رکھتا ہے تو آپ انکار کر دیتے۔ ابا جی نے نرمی سے کہا، ظاہر ہے کسی اور کی اولاد سے حسنِ سلوک کرنا آسان کام نہیں۔ حسد اور بغض بہت فطری جذبات ہیں۔ اب وہ ایک لمحے کے لیے رکے، پھر جیسے کوئی خیال آیا تو بولے، کہیں یہ خیال تو نہیں تھا کہ شادی کے بعد بچوں سے ملنا چھڑوا دیں گے؟''

غیر متوقع سوال کا بم ٹھاہ کر کے پھٹا اور دونوں ماں بیٹی کے ماتھے پر شکنیں کروٹیں بدلنے لگیں۔

''ہم کیوں چھڑواتے۔ ان کی ماں کا قصور تھا سارا'' دونوں خواتین بیک وقت اپنے اپنے الفاظ میں اس عورت اور اس کے بچوں کی شان میں مدح سرائی کرنے لگیں۔

''پڑھی لکھی اور باشعور بچیاں بَری میں ملنے والی پلی پلائی اولاد کو اپنی اولاد کی طرح نہ دیکھ پائیں یا ان سے دنیا داری کی غرض سے ہی محبت بھرا برتاؤ نہ کر پائیں تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ ایک فطری امر ہے اور ہر ایک کے بس کا روگ نہیں، لیکن ان بچوں سے بلاوجہ نفرت اور ان کے حقوق چھیننے کی کوشش قطعی غیر انسانی ہے۔

شادی سے پہلے تمام معلومات سچ بتائی گئیں اور اس کے باوجود رشتے کو رد نہیں کیا گیا اور اپنی ذہین وفطین بیٹی کا ہاتھ اسے تھما دیا گیا تو بچی کو تربیت اور زادِ راہ میں حسنِ سلوک اور نیک طینت ہونے کا درس دینا بھی والدین کا فرض تھا یا نہیں؟ ان کی عزت کرنے سے صرف خاوند کا دل ہی نہ جیت لیتیں بلکہ اپنی جگہ بھی بنا لیتیں۔

جب آپ کسی کی عزت کرتے ہیں تو فی الحقیقت آپ خود اپنی ہی تکریم کرتے ہیں۔ جس کی اپنی عزت نہ ہو وہ دوسروں کا احترام کیسے کرسکتا ہے؟ ماے کی دھی تو طلاق کے باوجود اس کے بچوں کی ماں رہے گی۔ ہاں البتہ باپ کو اولاد کمانی پڑتی ہے حسنِ سلوک سے، توجہ سے، ان کی ضروریات پوری کر کے، اپنے بچوں کو آسائشات مہیا کر کے، ان کی ذمہ داریاں ادا کر کے اور اپنے اور بچوں کے درمیان کھڑی ماں کی عزت کر کے۔ سو اگر کوئی شریف آدمی ایک اچھا باپ بننے کی کوشش کر رہا ہے تو شریکِ حیات کو تو ساتھ دینا چاہیے۔ گھر کا ماحول تب ہی خوشگوار بن سکتا ہے۔''

دونوں ماں بیٹی یک دم خاموش ہو گئیں۔ ''ہم نے تو سنا تھا کہ آپ عورتوں کا بہت ساتھ دیتے ہیں؟'' والدہ ناراضگی سے بولیں۔

''میں صرف حق کا ساتھ دیتا ہوں۔ اللہ کی دی ہوئی عقل سے مقدور بھر کوشش کرتا ہوں کہ اپنے دوستوں اور بچوں کو سمجھاؤں کہ حق تلفی مت کریں۔ اب آپ کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔'' ابا جی نے اب آخری آپشن سامنے رکھا...

''یا تو اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں اور اپنے شوہر کے حالات کے ساتھ خوش دلی سے سمجھوتہ کریں۔ اس کے بچے نہ صرف اس کی شفقت کے حقدار ہیں بلکہ اس کی جائیداد کے بھی وارث ہیں۔ آپ کے ولایت میں کوئی یہ حق نہیں چھین سکتا۔'' ابا جی نے یہ اطلاع بھی اسے لگے ہاتھوں دے دی، ''یا پھر واپس جا کر فیصلہ کرلیں، بلکہ واپس ہی نہ جائیں۔ کیا کریں گی بالکل اکیلی اس ملک میں۔ یہی آپ کے لیے آخری مخلصانہ مشورہ ہے۔''

دونوں خواتین کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ ''ہر روز کے جھگڑوں اور کھینچا تانی سے بہتر

ہے کہ آپ غور فرمائیں۔''

''بچوں کی ساری ذمہ داری ماں نے اٹھائی۔ پالا پوسا پڑھایا اور ان کے مستقبل کی خاطر شادی نہیں کی۔ اب صرف بچوں پر خرچ کرنا آپ سے برداشت نہیں ہو رہا؟ کیا آپ کو خرچہ نہیں دیتا؟ چھت مہیا نہیں کی آپ کو؟ آپ کی والدہ بتاتی ہیں کہ آپ کو انگریزی سیکھنے بھیجا۔ آپ کار چلاتی ہیں، ٹھاٹھ سے دو منزلہ مکان میں رہتی ہیں؟ جواب میں آپ نے صرف نیک سلوک کرنا ہے اور کوئی ذمہ داری نہیں۔ گھر میں سکون تب ہی ہو سکتا ہے جب آپ اپنے دل کو بڑا کریں۔ وہ بچے آپ کے شوہر کا خون ہیں۔ اس کی ذات کا حصہ ہیں۔ جیسے بچوں والی خواتین کی دوسری شادی کی صورت میں شوہر اپنی بیوی کی خاطر اس کے بچے کی کفالت بھی کرتے ہیں اسی طرح بیوی کی بھی اخلاقی ذمہ داری ہے۔ یہ تو نیکیاں کمانے کا آسان طریقہ ہے۔''

کہانی کا خلاصہ یہی تھا کہ تین ہفتے کی کھینچا تانی کے بعد عصیلی بیگم نے بچی کو سمجھا بجھا کر واپس روانہ کر دیا۔ ابا جی نے محسوس کیا کہ وہ ماں ہو کر بیٹی سے خائف نظر آتی تھیں۔ شاید بیٹیاں چار حرف پڑھ جائیں تو سب سے پہلے ماؤں کی بھی ماں بننا چاہتی ہیں۔ ڈگری ملنے سے انھیں کنٹرول اور اختیار حاصل ہو جاتا ہے جس سے وہ باقی افرادِ خانہ کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہیں اور خود کسی کی ماننے کو تیار نہیں ہوتیں۔

ابا جی اس موضوع پر بہت پریشان ہوتے، ''آنے والا وقت بہت بے مہر ہوگا'' وہ پیشگوئی کرتے، ''بچیاں پڑھ لکھ جائیں گی یا یوں کہیے کہ وہ ڈگری لینے کو پڑھا لکھا ہونا سمجھیں گی۔ پھر اسے ذمہ داری سمجھنے کی بجائے ہتھیار بنالیں گی جب کہ بچے تعلیم کی طرف کم راغب ہو رہے ہیں۔ یہ عدم توازن مسائل جنم دے گا۔ بیوہ یا مطلقہ کی شادی یا بچوں والے مرد کی دوسری شادی اعلیٰ ظرفی اور عدم برداشت کے بغیر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بلکہ عورت اپنے فطری صبر اور دانش سے پلی پلائی ریڈی میڈ اولاد کو اپنا سکتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس راستے پر ہی نہ چلیں۔ پہلے ہی شادی سے انکار کر دیں۔ والدین بچیوں کی رضا اور رائے معلوم کریں۔ دور اندیشی سے کام لیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک کم عمر بچی کو براہِ راست نکاح کے ساتھ ہی دو تین بچوں کی ماں بنا دیا جائے۔ اور اگر ایسا رشتہ ناگزیر ہو ہی جائے تو گھر والوں کو بالخصوص والدہ کو لگاتار رہنمائی کرتے رہنا چاہیے۔ بچوں کو آسانیاں دیں۔ مثبت اندازِ فکر دیں۔ دوسری طرف مرد حضرات کو بھی اپنے حالات اور عمر کے مطابق ساتھی کا انتخاب کرنا چاہیے۔''

گزشتہ دنوں بالکل ایسا ہی ایک مقدمہ میرے پاس آیا۔ بچی کسی گاؤں سے شوہر کی دوسری بیوی بن کر آئی۔ دونوں کی عمروں میں تقریباً پندرہ برس کا فرق تھا۔ پہلی بیوی طلاق کے بعد بچوں کے ساتھ دوسرے شہر میں رہتی ہے۔ بچے والد کو ملتے اور باپ بھی ان کو تحائف کی صورت میں کبھی لیپ ٹاپ، کبھی سائیکل اور موبائل وغیرہ لے کر دیتا رہتا۔ تین سال کے بعد نئی بیوی کے مسائل اس حد تک بڑھے کہ اس نے شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا۔

میں نے اسے بے حد سنجیدگی سے پوچھا بیٹا، مسئلہ ہے کیا؟

آپا، وہ آہستگی سے بولی، ہم میں عمر کا بہت فرق ہے۔

بیٹا یہ فرق کیا دو سالوں میں پڑا ہے؟ یا شادی سے پہلے ہی علم تھا کہ ہونے والا شوہر پندرہ سال بڑا ہے۔ اس وقت کیوں انکار نہیں کیا آپ نے۔ اب کیوں علیحدگی چاہتی ہیں؟

وہ بمشکل چھبیس برس کی پیاری بچی تھی، جواباً خاموش رہی۔

میں نے اسے سمجھایا کہ آپ کی آمد سے پہلے بچے اس کی زندگی میں موجود تھے اور اگر وہ بچوں کو تحائف لے کر دیتے ہیں تو احسان نہیں کرتے۔ یہ ان بچوں کا حق بنتا ہے۔ بچوں سے وہ باہر ملتے ہیں، آپ کے گھر نہیں آتے وہ، حالانکہ یہ ان کے باپ کا گھر بھی ہے۔ اعلیٰ ظرفی اور اعلیٰ حوصلے کا تقاضہ تو یہ ہے کہ آپ ان کے لیے گھر کے دروازے کھولتیں۔ لیکن چلیے یہ آپ کی مرضی پر ہے۔ اب سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ زبان ابھی آپ کو نہیں آتی، ویزے کے مسائل ابھی آپ کو ہیں جو شوہر کی رضامندی سے حل ہوں گے۔ ملازمت آپ نہیں کرتیں، آپ کے جھگڑوں کا منطقی حل یہی ہے کہ والدین سے بات کریں اور ان کے پاس واپس چلی جائیں۔ ڈینش قوانین کے مطابق طلاق لے کر آپ یہاں رہ نہیں سکتیں۔ آپ کی قانونی معیاد پوری نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ میرا لہجہ بھی ابا جی کی طرح دوٹوک ہوگا۔ بہر حال چند مرتبہ کی گفت و شنید کے بعد وہ حالات کی اونچ نیچ کو سمجھ گئی یا شاید مجبوری کی صورت سمجھوتہ کر لیا۔ مجھے ابا جی کی بہت یاد آئی کہ رشتہ طے کرتے ہوئے بچیوں کو اعتماد میں لیا جائے، ان کی تربیت کی جائے کہ وہ رضامندی سے خاوند کے پہلے بچوں اور ان کی ماں کے وجود کو برداشت کر سکیں۔

ابا جی اپنے گرد و نواح سے کہانیاں اٹھا کر گھر لایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ قریبی قبرستان میں کوئی ایک نوزائیدہ بچہ پھینک گیا۔ چھوٹے سے قصبے میں جنگل کی آگ کی طرح خبر پھیل گئی۔ ایک خدا ترس آدمی اسے اپنے گھر لے گیا۔ قصے کہانیوں کی طرح اس مقدمے میں ایک ظالم جادوگرنی

جیسی عورت کی سازش شامل تھی جو خود تو بے اولاد تھی۔ شوہر نے دوسری شادی کی اور نئی حاملہ بیوی کو چھوڑ کر پردیس سدھار گیا۔ جب بچے کی ولادت کا وقت آیا تو پہلی بیوی نے دایہ کی مٹھی گرم کر کے نوزائیدہ بچے کو باہر پھینکوا دیا۔ طے تو یہ پایا تھا کہ بچے کا گلہ گھونٹ دیا جائے لیکن دایہ کے ہاتھ لرزنے لگے اور وہ اسے قبرستان میں پھینک کر بھاگ آئی۔

عورت مظالم ڈھانے پر آئے تو مرد سے کہیں زیادہ سفاک ہوتی ہے۔ مجھے احمد ندیم قاسمی کا افسانہ کپاس کا پھول یاد آ گیا۔

ابا جی کا چونکہ ہر روز نئے مقدمات اور قصے کہانیوں سے واسطہ رہتا تھا، وہ کہا کرتے تھے کہ خواتین کی تربیت بہت ضروری ہے کہ وہ مظلومیت کے کنوئیں سے نکل کر ظلم کے پہاڑ توڑنے پر نہ تل جائے۔ یہ بھی آج شاید صرف برِصغیر کی نفسیات ہے کہ دوسری بیوی بن کر جانے والی خواتین کی نفسیات شاید عدم تحفظ، شک، حسد اور احساسِ کمتری جیسے احساسات کے ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے۔ یقیناً اس ضمن میں استثنائی صورتِ حال دیکھی گئی ہے۔ ایسی ایثار پسند اور دانشمند خواتین بھی ملتی ہیں جو پلی پلائی پرائی اولاد کے ساتھ اپنی ماں کا سا فرض نبھاتی ہیں اور ان کا ساتھ بھی نعمت کی صورت میں وصول کرتی ہیں۔ لیکن اکثریت ایسی ہی عجلت پسند اور کم ظرف سوچ کا مظاہرہ کرتی ہے جس کے بارے میں گفتگو ہونا ضروری ہے۔

••

ابا جی کو مسلسل سر جھکا کے ظلم سہنا اور اف نہ کرنا سخت برا لگتا تھا۔ ایک دفعہ گھر آئے اور امی کو کسی کے بارے بتانے لگے کہ، ''چھ سال سے بچی کو گھر میں بٹھا رکھا تھا۔ نہ اس کا آر کرتے تھے نہ پار کرتے تھے مگر میں نے آج پنچایت میں واضح فیصلہ کر دیا ہے کہ بچی کو آزاد کر دیں۔''

میں نے فوراً تائید کی، ''بہت اچھا کیا ابا جی۔ کمبخت خود تو دوسری شادی کے لیے تیار بیٹھے ہوتے ہیں کیونکہ استحقاق ہے اور عورت بے چاری ماں کے گھٹنے سے جا لگتی ہے۔''

امی کا فوری ردِعمل آیا، ''تسیں پیو دھی وس لگیاں وسن نہ دویو کسے نوں'' (آپ باپ بیٹی کے بس میں ہو تو بسنے نہ دیں کسی کو)

••

جن دنوں ہاٹ پاٹ نئے نئے آئے اور گھر گھر کی ضرورت بن گئے، ابا جی بہت خوش ہوئے کہ اب خواتین کی زندگی آسان ہوگی کہ آرام سے کھانا نکالا اور خود ہی کھا لیا۔ اکثر ابا جی رات

کو دیر سے گھر لوٹتے۔ کبھی کوئی اجلاس، کبھی زکوٰۃ کمیٹی، کبھی کسی کی پنچایت یا کوئی مریض لیکن مجھے نہیں یاد کہ انھوں نے کبھی کسی کو جگایا ہو یا کھانا گرم ٹھنڈا کرنے پر کسی سے کوئی مطالبہ کیا ہو۔ ابا جی کی خوراک ویسے بھی بے حد سادہ تھی۔ صبح ہلکا پھلکا ناشتہ، البتہ ابا جی کو دودھ پتی بے حد پسند تھی جس پر بالائی کی ایک موٹی تہہ ہوتی۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہم آج کل ڈبل کریم کے ساتھ کافی پیتے ہیں۔ چائے وہ خوب مزے لے کر نوش فرماتے۔ اگر اچانک کوئی مہمان آجاتا تو وہی کپ اسے پیش کر دیتے۔ دوپہر کا کھانا سب کے ساتھ دستر خوان پر گرم گرم روٹی کے ساتھ جو بھی پکا ہوتا خوش دلی سے کھاتے اور رات کا کھانا برائے نام مثلاً دلیہ یا باقر خانی یا اسی طرح کوئی پھل وغیرہ، لیکن اپنی ٹانک نما چائے پینا نہ بھولتے۔ ہمیشہ خوراک بھی سادہ کھائی اور دیگر عادات بھی بے حد سادہ۔ کسی سے اپنا کام کروانا پسند نہیں تھا۔ پانی بھی لینا ہوتا تو خود اٹھ کر لیتے۔ سردیوں میں نیم گرم پانی پیتے اور گرمیوں میں گھڑے کا پانی ضرور پاس رکھا ہوتا۔ فریج کی زیادہ ٹھنڈی چیز نہیں کھاتے تھے۔ دادی جان کے زمانے کی واحد پسندیدہ چیز بھنے ہوئے مکئی کے دانے تھے جو مجھے بھی ہمیشہ مرغوب رہے۔ میٹھا وغیرہ بہت زیادہ پسند نہیں تھا۔ ہاں پکا ہوتا تو کھا لیتے لیکن کبھی بلاوجہ فرمائش کر کے کبھی کچھ نہ بنواتے۔

••

ابا جی کو کسی بھی قسم کا کوئی منفی شوق نہیں تھا۔ اپنا غلام بنا لینے والی کسی عادت کی کوئی لت نہیں تھی۔ سگریٹ، حقہ نہیں پینا، ٹی وی نہیں دیکھنا۔ ان کا واحد شوق مطالعہ اور اخبار بینی تھا۔ صبح صبح یہ شوق شروع ہوتا اور سارا دن وقفوں وقفوں سے موقع ملتے ہی جاری رہتا۔ ہاں مغرب کے بعد وہ جم کر مطالعہ کرتے۔ میرے بچے ان کے سرہانے پڑی کتابیں دیکھتے اور انٹرویو شروع ہو جاتا۔ وہ بہت فخر سے بتایا کرتے کہ جب کتابیں عام نہیں تھیں تو لوگ ہاتھ سے لکھ کر صفحات اپنے پاس رکھتے تھے۔ اس وقت بالِ جبریل سب سے پہلے میں نے خریدی تھی۔ ہمارے گاؤں میں سب سے پہلے کتابیں ہمارے گھر میں آئی تھیں۔

ابا جی ہر طرح کی دھڑے بازی کے خلاف تھے۔ اکثر جب خانگی جھگڑوں میں بہن بھائی ہی کئی فریقوں والی سیاسی جماعت میں بدل جاتے اور ہر ایک کا جلی اور خفی ایجنڈہ مختلف ہوتا، فلاں سے ملو، فلاں سے نہ ملو کیونکہ ہم بھی نہیں ملتے، تو ابا جی کہتے کہ اس جہالت کو ختم کروانے کی ضرورت ہے۔ بقول ان کے، جب بہن بھائی یا دوست یار آمنے سامنے ہو جاتے ہیں یا کوئی چل کر کسی کے گھر آجاتا ہے تو ہر گلہ شکوہ از خود دم توڑ دیتا ہے۔

یہی بنیادی تعلیم تھی جس نے بعد میں ادبی دنیا میں قدم رکھنے پر مجھے کسی بھی سیاسی ہتھکنڈے کا نشانہ نہ بننے دیا کیونکہ ابا جی کے افکار اور ان کی زندگی کے عملی مظاہروں کے بعد میری سوچ واضح اور لائحہ عمل بالکل طے شدہ تھا۔ ہمارے گھر میں لوگوں کی ملاقاتیں ہوتیں، سسرال والدین سے ملنے نہیں دیتا تو کوئی بات نہیں، چلو یہاں آ کر مل لو۔

••

ابا جی کا محنت کش خواتین کے ساتھ کوئی اپنا ہی ربط و تعلق تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے کہ میں دوسروں کے گھروں میں برتن مانجھتی ان پڑھ عورت اور کرسی پر بیٹھی ملازمت پیشہ عورت میں مقصدیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ ان کے پیشِ نظر اپنی اولاد کی بہتری ہوتی ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ برتن دھوتی ماں ان کے پیٹ کی آگ بجھانے کے جتن کر رہی ہو اور کرسی پر بیٹھی عورت ان بچوں کی تعلیم و تربیت اور ذہنی گرسنگی اور عسرت دور کرنے کے لیے معاشی سہارے ڈھونڈ رہی ہو۔

میں نے عورت کے استحصال پر اور مرد کے استبدادی حربوں پر لکھا، لیکن اگر مجھے فیمینسٹ اور آزادیِ نسواں کی سرکش مجاہدہ سمجھا جائے تو میں تصحیح کرنے کی جسارت کروں گی۔ مجھے عورت کے وجود کے خیمے کے ساتھ بندھے چاروں رشتے بہت آسودگی دیتے ہیں۔ مرد سے محبت عورت کی سرشت ہے اور ان رشتوں سے صرف مان، محبت اور عزت اس کی خواہش ہے۔ جس دن مرد یہ نکتہ سمجھ لے گا اس دن یہ خیمے بے نظیر عمارت میں بدل جائیں گے جو اس کے خون اور ورثے کے ہر رنگ کی حفاظت کرے گی۔ عورت کا اولین عشق اس کا باپ ہے اور یہ کتاب مرد سے محبت کے نام ہے۔ اس پہلے عشق کے نام ہے جو رگوں میں دوڑتا ہے اور اگر اس کی توقیر کرتی شفقت اس خون کی حرمت کی پاسداری کرے تو عورت کی آغوش ہیرے تراشنے لگے۔ اس کی تربیت کی چادر میں تکریم کے موتی ٹانکے جائیں تو وہ گھر کی ناقابلِ تسخیر چار دیواری بن جاتی ہے۔ علم و آگہی کے دروازے کھولنے کے لیے کھل جا سم سم کا منتر اسے بھی بیٹوں کے برابر سکھا دیا جائے تو گھر کا سائبان ہو جاتی ہے۔

••

ابا جی کو یقین تھا کہ صرف ڈگریاں حاصل کر لینے سے اور انسانیت کا پرچار کرتے ترقی یافتہ ممالک میں قیام پذیر ہونے سے اذہان میں روشن خیالی اور دل میں انسانیت کا اجالا نہیں پھیلتا۔ مطالعہ صرف کتابوں کا نہیں ہوتا، فطرت کا بھی ہوتا ہے۔ زندگی کا مطالعہ، انسانوں کا، ان کے رویوں

کا، بدلتے چہروں اور لہجوں کا مطالعہ بھی ہوتا ہے جس کے لیے کوئی تعلیم ضروری نہیں۔ ایک شیر خوار بچہ بھی چہرے پڑھ سکتا ہے اور آواز کی لوری کو چیخ و پکار سے ممیز کر سکتا ہے۔

آپ نے کبھی اپنے گھروں میں کام کرنے والی بالکل ناخواندہ خواتین کی باتیں غور سے سنی ہیں؟ وہ کتنے بڑے بڑے فلسفے برتن دھوتے ہوئے بیان کر جاتی ہیں۔ ان کے بچے جو بھوکے بھی گھر سے نکلتے ہیں، آپ کچھ دینا چاہیں تو متانت سے جواب ملتا ہے، نہیں، میں کھا کر آیا ہوں۔ کبھی آپ نے نیکی کے جواب میں ہمیشہ برائی ملتے دیکھی ہے؟ نیکی کے بدلے میں منافقت، خیر کے جواب میں شر ملنے کے باوجود نیکی کو سفر کرنے دیں۔ اچھے عمل کا راستہ مت روکیں۔ صلے کی طلب مت رکھیں۔ بس مستقل مزاجی سے اپنے راستے کے خار کنکر ہٹاتے جائیے تاکہ آپ کے آنے والوں کے راستے سہل ہو سکیں۔

••

ابا جی کی کمر میں درد تھا۔ چک پڑی ہوئی تھی۔ گھر میں دودھ لانے والی ماسی اپنا پوتا لے کر آ گئیں، ''مرزا ساب اس کو نمونیہ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کی دوائی سے رام نئیں آیا۔ جی تساں ای کج کرو۔''

ابا جی چپکے سے اٹھ کر باہر کی طرف چل دیے۔ راستے میں چھوٹی تپائی پڑی تھی۔ اچانک اس سے پیر جا ٹکرایا اور ٹھوکر لگنے سے انگوٹھا نیلا ہو گیا۔

میں نے رونا پیٹنا مچا دیا، ''ابا جی یہ کس صحیفے میں لکھا ہے کہ اپنی جان کی پروا نہ کی جائے اور اٹھ کر دوسروں کے ساتھ چل دیں۔''

''چپ کرو نالائق، ابھی ماں آجائے گی آپ کی''۔ ابا جی نے پیر پر گرم پٹی لپیٹی۔ لیکن زندگی میں بہت سال کے بعد مجھے ان کی مجبوری کی سمجھ آئی جب میں مائیگرین سے بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ پڑوس میں رہنے والی بچی کا فون آیا...

''باجی، بچے کے پیٹ میں سخت درد ہے۔ ست اجوائن دیا تھا آپ نے۔ ختم ہو گیا ہے۔ تھوڑا اور مل سکتا ہے؟''

میں بمشکل دروازہ کھولنے کے لیے اٹھی تو ٹھک سے دروازہ میری پیشانی سے آ ٹکرایا۔ آنکھوں کے آگے ترمرے ناچ گئے...

''ہائے اللہ جی'' مجھے ابا جی کا انگوٹھا یاد آیا تو میں کتنے دن ہنستی رہی۔

''امی جی مسئلہ کیا ہے آپ کو؟ کیوں سارے کوپن ہیگن کی حکیم بنی ہوئی ہیں؟'' میری

صاحبزادی نے میرے ماتھے پر کریم کا مساج کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔

''بیٹا دس سال گزر لینے دو۔ آپ کو بھی کوئی نہ کوئی ''سٹ'' لگے گی تو ہر بات کا جواب مل جائے گا۔''

••

ابا جی نے مجھے سکھایا کہ آپ کے سجدے صرف آپ کی اپنی ذات کے لیے ہیں، صوم وصلوٰۃ صرف اپنی بخشش کی خاطر ہیں، لیکن لوگوں کے ساتھ آپ کا معاملہ اور لوگوں کے لیے نافع ہونا دوسروں کے لیے ہے۔ آدھی رات کو کوئی دروازے پر آجاتا تو اٹھ کر ساتھ چل دیتے۔ پنچایت کا فیصلہ کرنا ہوتا تو ساری رات بیٹھ کر طرفین کی باتیں سنتے۔ بیٹی والوں کا حتی الوسع ساتھ دیتے۔ چلچلاتی گرم دوپہروں میں کوئی مریض آجاتا تو فوراً اٹھ کر اسے دوا دیتے۔ کئی دفعہ بھائی خفا ہوتے کہ ابا جی نے کوئی اصول قائم نہیں رہنے دیا۔ کلینک کے باہر تختی پر لکھا ہے کہ 'دوپہر کو چند گھنٹے آرام کی وجہ سے ہر سلسلہ بند ہے' لیکن ابا جی ضرور اٹھ کر ساتھ چل دیتے ہیں۔ لوگ بگڑ جاتے، باہر بیٹھ کر انتظار نہ کرتے، اصول نہیں سیکھتے مگر ابا جی کہتے، ''مجھے خوف آتا ہے کہ میں اپنا علم سینے میں اور شفا بند مٹھیوں میں لیے پنکھے کی ٹھنڈی ہوا تلے سویا رہوں اور کوئی مریض درد کی شدت سہتا ہوا باہر بیٹھا صرف میرے جاگنے کا انتظار کرے۔''

تنگ آکر سب نے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

••

ابا جی کا دواخانہ شاید مہمان خانہ بھی تھا۔ کسی مریضہ سے کہا کہ گولی گرم پانی یا چائے کے ساتھ لینی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ حکیم صاحب چائے کہاں سے پیوں، میرے پاس تو گھر جانے کا کرایہ بھی نہیں ہے۔ جواب دیا:

''اچھا، باہر نکلیں تو ساتھ ہی بائیں ہاتھ گھر کا دروازہ ہے۔ وہاں چلی جائیے اور بی بی سے کہیں چائے بنا دیں۔''

گھر میں دو بڑے کولر ہر وقت برف سے بھرے رہتے۔ ایک کوری مٹی کا بڑا سا مٹکا جسے ٹونٹی لگوا کر رکھا گیا تھا، اس میں ٹھنڈا پانی ہوتا۔ جو لوگ برف سے پرہیز کرتے انھیں مٹکے کا پانی دیا جاتا۔

امی جی کہتیں، ''جو آتا ہے وہ اپنا رزق ساتھ لے کر آتا ہے۔''

مجھے چونکہ کام کرنے کی عادت نہیں تھی (بقول امی جی کے ازلی کام چور) اور زیادہ وقت بھائیوں کے ساتھ گزرتا تھا سو مجھے بہت کوفت ہوتی۔

جسے دیکھو منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔ کوئی پانی پینے، کوئی چائے پینے، کوئی دوپہر کی دھوپ ڈھلنے کے انتظار میں اور کوئی فون سننے۔ یہ فون سے استفادہ ''حاصل'' کرنے والوں سے مجھے سب سے زیادہ خار تھی۔ کسی کا بے وقت فون آجاتا کہ فلاں کو بلا دیں۔ ہم آدھے گھنٹے بعد فون کرتے ہیں۔ گویا فون نہ ہو گیا کوئی مصیبت پلے سے باندھ لی۔

ابا جی کو نجانے کتنی 'بیٹیوں' نے ابا جی، ماما جی، چاچا جی اور لالہ جی بنا رکھا تھا۔ ایک بیٹی صاحبہ پتہ نہیں اچانک کہاں سے نمودار ہوئیں۔ ان کے ہر عمر کے بچے تھے، بے حد پیارے چھوٹے چھوٹے گورے گورے بچے، خرگوش کے بچوں کی طرح معصوم اور چمکیلی آنکھوں والے کہ دیکھتے ہی پیار پھوٹ پڑے۔ قطار باندھے اماں کے پیچھے آتے۔ خدا جانے ان کے میاں کون سے ملک میں تھے اور انھوں نے مرزا صاحب سے استدعا کی تھی کہ میری بیگم صرف آپ کے گھر آتی ہیں اور فون کی سہولت بھی آپ ہی کے گھر ہے تو ان کی بات کروا دیا کیجیے۔ اب ابا جی کی بیٹی آتیں۔ حکم ہوتا بچوں کو برف ڈال کر شربت بنا کر دو۔ باجی کو چائے بھی پلا دینا۔ باقی سب تو ٹھیک تھا اور خرگوشوں جیسے ننھے منے بچے مجھے بہت اچھے بھی لگتے لیکن شاید رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کو بہت اونچا بولنا پڑتا...

''واز آرئی اے؟ ... جی میں کہیا واز آرئی اے؟ جی میں پچھیا کیہہ حال اے؟''

اتنے شور میں کون پڑھے۔ پھر بچے منی منی آوازوں میں چیں چوں چیں چوں کرتے، ''ابو میری گڑیا، ابو میری گاڑی'' میں ان کو آتا دیکھ کر دور ہی سے ''کٹ کٹ کرتی آئی مرغی'' کہہ کر دیوار پھلانگتی اور تایا جان کے گھر غائب ہو جاتی۔ ایک دن امی جی نے مجھے بٹھا کر خوب اچھی طرح جھاڑ پونچھ کی، وہی سکہ بند جملے...

''تمھیں شرم نہیں آتی؟ کوئی کسی کے گھر خود نہیں آتا۔ ان کو بھیجنے والی ذات کسی اور کی ہوتی ہے۔'' اور پھر آخر میں زچ ہو کر ہمیشہ کی طرح کہنے لگیں، ''پتہ نہیں تم کس پر گئی ہو؟ ہماری تو نسلوں میں کوئی ایسا بدتمیز نہیں گزرا۔''

''امی، بھیجنے والی ذات کے ساتھ میرے سفارتی تعلقات بہت اچھے ہیں۔'' میں اطمینان سے جواب دیتی، مجھے حکم ہوا ہے خودی کو کر بلند اتنا۔''

••

فیمنزم اور فیمینسٹ کا پودا ابھی اردو دنیا کے لوگوں کی غلط فہمیوں اور منفی مطالب کی ریتلی زمین میں سر جھکائے کھڑا ہے۔ ابھی ہمارے اذہان میں اس کی تفہیم، تفسیر اور شرح کا تعین ہونا باقی ہے۔ تانیثیت کی تعریف کے مطابق اس میں ہر وہ ذی روح شامل ہے جو معاشرے میں ہونے والے ظلم و ستم کے خلاف اپنے شعور اور اختیار کی تمام تر قوتوں کو مجتمع کر کے صدائے احتجاج صرف بلند ہی نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی زندگی کی چار دیواری اور اپنے اختیار کے دائرے میں شامل تمام مظلوموں کی مقدور بھر مدد بھی کرتا ہے۔

بنیادی انسانی حقوق سے جبری طور پر محروم کیے گئے انسان، جن کا تعلق کسی بھی صنف سے ہو۔ عدم مساوات کے ریلوں میں تنکے کی طرح بہتی عورتیں ہوں یا بچے، ان کی دستگیری کو پہنچتا ہر ہاتھ فیمینسٹ ہے۔ فیمینسٹ باپ وہ ہوتا ہے جو اپنی اولاد کی رگوں میں دوڑتے خون کی تکریم برابری کے اصول پر کرتا ہے۔ وہ بیٹی کو اپنے لیے طعنہ نہیں گردانتا اور مروجہ معاشرتی قوانین کے مطابق ان پر سماجی، تعلیمی، تربیتی اور جد و جہد بھری عملی زندگی کے ممکنہ مواقع چھیننے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس اصول کو انسانوں پر منطبق کیجیے تو ہمیں زندگی میں وہ تمام لوگ بھی دکھائی دیں گے جنھوں نے عورت کے بنیادی حقوق کے لیے مسلسل تحریک کی صورت میں کام کیا۔ مساوی سماجی حقوق، اخلاقی معاہدے، تعلیمی ترقی، ملازمت کے یکساں مواقع، روزگار کی سہولیات اور اجرت کی مساوات کا خیال ان معاشروں میں اٹھتا ہے جو 'کافر' سہی لیکن جہاں صنفِ نازک کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو ایک مسلمان عورت پیدائشی طور پر اپنے پیکج میں لاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ سارے حقوق تا حیات کاغذی رہتے ہیں۔

ایک اصلی فیمینسٹ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے جہاں انسانی اقدار اور معیار ہوں۔ جہاں عورت ایسے ماحول میں سانس لیتی ہو جہاں اسے بلی اور کتے کی طرح اینٹیں مار کر سنگسار نہیں کیا جاتا۔ جہاں کھری بان کی چارپائی پر پڑی عورت کا گلہ ایسے نہیں گھونٹا جاتا کہ بعد از مرگ بھی وہ دنیا کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہے۔ جہاں غیظ و غضب سے مغلوب مجازی خدا چہرے پر تیزاب پھینک کر نافرمانی کی سزا ایسے نہیں دیتا کہ دیدۂ عبرت نگاہ بنا دے۔ جہاں درختوں پر پھل لگتے ہیں اور باغوں میں جھولے پڑتے ہیں، ان کی شاخوں پر مظلوم شباب بھری جوانیاں بطور عبرت معلق نہیں ہوتیں۔ جہاں آنگن میں بچیوں کی ہنسی سے پودوں پر شگوفے کھلتے ہیں۔ جہاں ایک باپ

اپنی مٹھی میں چھیلی ہوئی مونگ پھلی خاموشی سے بیٹی کے ہاتھ میں منتقل کر دیتا ہے۔ اپنی رکابی سے بوٹی اٹھا کر اس کو کھلا دیتا ہے۔ جہاں بھائی اپنی پہلی تنخواہ سے ماں کے لیے شال اور بہن کے لیے اس کی پسند کے رنگ کا گرم جوڑا ڈھونڈنے جاتا ہے۔ جہاں اپنے محدود وسائل میں مقید شوہر کئی ملازمتیں کر کے گھر میں خوشحالی لانے کی تگ و دو میں جان کی کشتی بھی جلا دیتا ہے۔ جو اپنی بیوی کا ممنون ہوتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے چراغ میں اس کی عمر کی بتی بھی ڈال دی ہے اور جس نے اپنے بدن کے معبد میں اس کی نئی نسل کی نیک نامی کے لیے درود پڑھے ہیں۔ اس چھوٹے سے آنگن سے نسلوں کو سنوارتی نسائی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔

یورپ میں حقوقِ نسواں کی علمبرداری پہلے مردوں کے حصے میں آئی۔ فرانس میں مارک ڈی کونڈوسٹ (Marquis de Condorcet-1743 1794) نے عورت کی تعلیم کے حوالے سے جد و جہد کی۔ جرمی بینتھم (Jeremy Bentham, 1748 – 1832) نے برطانیہ میں عورتوں کے لیے مساوی حقوق کا مطالبہ کیا۔ اس کے شاگردوں میں جیمز مل بھی شامل تھا۔ اسی جیمز مل کے بیٹے جان سٹیورٹ مل نے برطانوی خواتین کے ہاتھ میں آزادیِ نسواں کا مطالبہ تھمایا اور وہ پہلا فرد تھا جس نے پارلیمان میں خواتین کے ووٹ کے حق میں آواز بلند کی۔ جرمنی خواتین کے لیے بنیادی حقوق کی اس روشنی پر حتی الوسع اپنے روزن اور دروازے بند کرتا رہا۔ ایک زمانے میں پیدائش کے وقت بچے اور بچی کے درمیان قانونی طور پر تفریق کی جاتی تھی۔ ''بچے، باورچی خانہ اور کلیسا'' کی تکون میں عورت کو محبوس رکھا گیا۔ جرمنی کا تقابل برِصغیر کی تہذیب و ثقافت سے زیادہ قریب ہے۔ ڈنمارک جیسے آزاد خیال ملک میں خواتین پر طب، مذہب اور سائنسی علوم کے دوازے بند رہے۔ شاعرات موت کو گلے لگاتی رہیں، ذہنی امراض کا شکار ہوتی رہیں۔ یہاں بھی ابتدا میں مردوں نے ہی عورت کا ساتھ دیا۔ لیکن آج برِصغیر میں اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے والی عورت کو بغیر اس تحریک کا مقصد جانے فیمینسٹ کہنا گالی بنا دیا گیا ہے۔

••

مجھے اس تذکرے سے یاد آیا کہ 23 اپریل 2018 کو میرا ایک کالم کسی جگہ شائع ہوا۔ عنوان تھا ''میرا جسم، میری مرضی۔ مگر کیوں؟'' میں اسے من و عن یہاں نقل کر رہی ہوں کہ شاید نقطۂ نظر کی وضاحت ہو سکے:

میرا جسم، میری مرضی۔ مگر کیوں؟

میں ایمنسٹی انٹرنیشنل ڈنمارک کی ممبر ہوں۔ وہی ایمنسٹی انٹرنیشنل جس کا نعرہ ہے کہ ہر نعرے کے پیچھے ایک نظریہ ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں فیمنزم کی تحریکیں بہ صورتِ امواج اٹھیں، مظاہرے ہوئے، ہاؤ ہو کے نتیجے میں کچھ مقاصد حاصل ہوئے، کچھ نہ ہوئے۔ پھر بتدریج یہ تحریک ماند پڑتی چلی گئی۔ اب پاکستان میں اندھا دھند تقلید کے مجنونانہ مظاہرے میں کچھ عورتوں نے چادر اور چار دیواری کو منہدم کرنے کی خواہش میں بدن کا سرمایہ بیچ چوراہے میں رکھ تو دیا ہے مگر سیاق و سباق جانے بغیر کیا انھیں وہ حقوق حاصل ہو سکیں گے جن کی وہ متمنی ہیں؟ وہ اپنی ملکیت اپنے بدن (جس کی مدتِ حیات چند برس ہے) کے سرمائے کے چکا چوند مظاہرے سے کون سی سرمایہ کاری کی جنگ جیتنا چاہ رہی ہیں؟

کیا ''میرا جسم، میری مرضی'' نعرے کا پس منظر بینر اٹھا کر پھرنے والی بیگمات اور ان کی تقلید میں چلنے والی عام خواتین کے علم میں ہے؟ بیگمات تو بے باک، طیش دلاتے پوسٹرز کی ڈانگ گھماتے گھماتے کسی پنج ستارہ ہوٹل میں قوم کے غم میں ڈنر کھا کر نرم گرم بچھونوں میں گھس جائیں گی جب کہ انھیں پروا تک نہ ہوگی کہ دیگر تقلیدی خواتین گھر پہنچنے تک سواری کے لیے کیسے کیسے خوار ہوتی رہیں گی۔ نیم برہنہ لباس میں ڈھلکتے بدن کی پائیداری اور دلکشی کا دورانیہ بڑھانے کے لیے اپنے ہی مردوں کی کمائیاں پوش علاقوں کے ڈرماٹولوجسٹس سے بوٹیکس لگوانے میں اڑانے والی ''بیبیوں'' نے مٹی کے چولھے جھونکتی، لوگوں کے گھروں میں برتن مانجھتی، دفاتر میں مرد حضرات کی جنسی پیشرفت کو مسترد کرتی اور ان کے انتقام کا شکار خواتین کو کیا فائدہ دیا؟ کیا ان بیبیوں نے کبھی حصولِ علم کی خاطر گھر کے سرپرستوں سے معرکے لڑتی اور تعلیمی اخراجات اٹھاتی محنت کش بچیوں کی عملی مدد بھی کی؟

جن ممالک کے سماجوں سے آپ نے چھومنتر سمجھ کے یہ نعرہ اڑا لیا اور مشرقی عورت کی تعلیمی آزادی سے قبل جنسی آزادی اور جنسی مساوات طلب کی، کیا ان ممالک کی حقوقِ نسواں کی جد و جہد کی خوں چکاں داستان کبھی پڑھی بھی ہے؟ ان میں سے کتنوں کو معلوم ہے کہ بدن کی ریاست کی حاکمیت کا دعویٰ کرنے سے بہت پہلے یورپ کی عورت نے تعلیم کا حق مانگا۔ پھر اس علم کی روشنی میں جائیداد کا حق، پھر روزگار کا، پھر مساوی تنخواہ کا حق طلب کیا۔ تب کہیں جا کے ایک تعلیم یافتہ، آزاد، خود مختار عورت نے اپنے بدن کے ساتھ جبر و زیادتی، نادانی یا ناپسندیدہ حمل سے نجات کے لیے اسقاط کا

حق مانگا تو کہا کہ میرا بدن میری ملکیت ہے، میں اس میں زبردستی کسی کے نطفے کی بوند کو گہر نہیں بناؤں گی کہ کل کو معاشرے میں ایک ایسا بچہ آئے جس کے والدین اس کی پرورش سے گریزاں ہوں جو ''لو چائلڈ'' نہیں۔ کس کس کے علم میں ہے کہ ابارشن کروانے پر ڈنمارک میں قانونی طور پر سزا دی جاتی تھی۔ آج بھی یورپ میں عورتوں کے مظاہروں سے پہلے ہفتوں طویل منصوبہ بندی ہوتی ہے، اہداف اور ان کے حصول کا تعین کیا جاتا ہے، محتاط اور مثبت انداز میں پیش قدمی کی جاتی ہے۔

تقلید کے لیے بھی عقلِ سلیم کی ضرورت ہے۔ کیا فرانسیسی فیمینسٹ سیمون بوژوا کی کتاب کا ترجمہ کرنے والوں نے اس کی ذاتی زندگی کی تصویر کشی کی؟ برطانیہ کی میری وول سٹون کرافٹ کی زندگی کی بے ثمر محبتوں اور خودکشی کی کہانیاں سنیں؟ آخر میں مرد کی آغوش کو پناہ بنا لینے والی عورتوں کے افسانے پڑھے؟ نہیں ناں، بس چند ادھ کچے لبرلز نے تانیثیت کا پھریرا لہرایا، مالی منفعت کا بیج بویا، علمی، ادبی اور ثقافتی نشستیں سنبھالیں اور فیمینسٹ کا بیج لگا کے اختیار کی دوڑ لگا دی۔ اپنے ہی مقتدر طبقے کے حصار میں قلعہ بند یہ بزعمِ خود تانیثیت کی محقق اور علمبردار عورتیں کروڑوں محنت کش عورتوں کی نمائندہ کیسے ہوسکتی ہیں؟ انھوں نے مردوں سے مسابقت کی تگ و دو میں عام عورت کی زندگی مزید اجیرن کی اور خود ہاتھ جھاڑ کر کونے پر ہوگئیں۔ پاکستانی فیمنسٹوں نے ''پہاڑ کی چوٹی تک چڑھائی'' جیسا نعرہ اچک تو لیا مگر زمین پر کھڑے کھڑے سڑکوں کو پہاڑ کی چوٹی سمجھ کر ''میرا جسم، میری مرضی'' جیسا نعرہ لے کر باہر نکل کھڑی ہوئیں اور باقی گھریلو عورتیں سزا بھگتنے میں لگی رہیں۔ اسی فیصد آبادی کے حالات سے واقف ہوئے بغیر، جلتی پر تیل گراتے نعرے لکھے، بینر کا لال کپڑا تہہ کر کے گاڑی کی ڈکی میں رکھا اور ملازمہ سے کھانا لگانے کا کہہ کر ہاٹ شاور لینے دنیا کی کلی ضروریات سے مزین باتھ میں روم جا گھسیں اور یوں ایکٹوٹی کے نام پر ایک دن اور اچھا گزر گیا۔

میں معافی چاہتی ہوں کہ میں ایک عام سی عورت ہوں اور عام عورت ہی میرا موضوع ہے۔ اس کی تعلیم کا حق میرا پہلا مطالبہ ہے۔ یورپ کی ملکائیں مسلمان ملکوں کے دورے پر جاتی ہیں تو ان کی تہذیب و ثقافت کے مطابق دلکش ملبوسات سلواتی ہیں تاکہ وہاں کی عورت ان سے خائف نہ ہو۔ میں نے اتفاق سے اس طلسم کو بہت قریب سے دیکھ رکھا ہے۔ مجھے بحیثیت ایک عورت شدید مجروح احساس کے ساتھ اپنی ان تمام بہنوں اور بیٹیوں اور دیگر خواتینِ خانہ سے معذرت کرنا ہے جن کے گھر کے مردوں نے پوری تیاری اور سیاق و سباق کے بغیر چلائی جانے والی تحریک اور نعروں سے خائف ہوکر چار دیواری کے روزن اور تنگ کر دیے۔ اگلی بار ضرور نکلیے مگر مہم جوئی کے سفر پر

نہیں، مرحلہ در مرحلہ حقوق کے حصول کے لیے۔ نہ تو یہ سفر مختصر ہے نہ ہی آسان۔ اسے مذاق اور تفریح سمجھنا استحصال کو مزید زندگی دینے کے برابر ہے۔

••

عورتوں اور بچوں پر مظالم، مذہب، معاشرے، قوم اور رسم و رواج کے نام پر کیے جا رہے ہیں۔ بچوں کو چونکہ عورت کے وجود کا حصہ سمجھا جاتا ہے لہٰذا اسے اذیت دینے کے لیے معصوم جانوں کو جنگی حربے اور شطرنج کی چال کی طرح چلا جاتا ہے۔ ان پر سوالیہ نشان لگانے والا ہر قلم فیمینسٹ ہے۔ میں نے آنکھ کھولتے ہی اپنے گھر میں بابا جان، تایا جان، ابا جی اور چاچا جان کی صورت میں فیمینسٹ اذہان کا راج دیکھا۔ ان ہی چراغوں سے کرن بھر روشنی لے کر میں نے کوشش کی کہ میری آغوش سے جو مرد نکلے وہ عورت کو صرف روٹیاں تھوپنے والا نوکر نہ سمجھے یا اسے بچے پیدا کرنے اور ان کی پرورش کرنے والا ممالیہ جانور نہ تصور کرے بلکہ اس کے وجود کو اپنی نسل کی آبیاری کرنے والے اس خالقِ مجازی کا رتبہ دے جس کی تخلیق، تربیت اور قربانی سے وہ اپنی اولاد کی تقدیر تحریر کرسکتا ہو۔ اپنے ساتھی کو وہ نکاح کے مقدس بولوں کے ذریعے زندگی میں شامل کرے تو پھر اس رشتے کے تقدس اور حرمت کا احساس کرے۔ اس عورت کا ممنون ہو جو اپنے خواب اور خواہشات لے کر اس کے نصیب جگانے آئی۔ جس کے بدن کے معبد میں مقدس بندھن کو مستحکم کرنے والی روحیں کروٹ لیں اور جس کا ہر ارمان ایک روشن ستارے کی صورت اپنے گھر اور بچے کے محور کے گرد گھومتا ہے۔

میں نے اپنے شعور اور ارادے کی تمام تر قوت سے اس بات کی جستجو کی ہے کہ میری گود سے نکلی بچی جس مرد کی زندگی میں شامل ہو اور جس گھر کے مستقبل کی معمار ہو اس کی تمام تر نیک تمنائیں اس نئے خاندان کے ہمراہ رہیں۔ وہ اپنے ہمسفر کی نہ صرف قدر کرسکے بلکہ اسے تکریم دے اور اپنی نانی جان کے سینہ بہ سینہ سکھائے درس کے تحت میکے اور سسرال کی حد بندیاں نہ کرے۔ وہ ایسے رشتوں کے استحکام کی امین ہو جہاں ماں صرف ماں ہوتی ہے خواہ اس کے آگے پیچھے کوئی بھی سابقہ لاحقہ لگا دیا جائے۔

••

سخاوت دلوں کے اندر ہوتی ہے یا شاید الست بربکم والے دن اللہ کچھ روحوں کو سخی بنا دیتا ہے۔ اپنے جود و سخا کے نور سے ایک رمق ان کی روحوں میں اتار دیتا ہے اور پھر دنیا بھر کی ابتلا و آزمائش، عسرت، تنگدستی، انھیں خودغرضی اور خست پر آمادہ نہیں کرسکتی۔ کبھی وہ دیا بجھا کر سائل کا

پیٹ بھرتا ہے تو کبھی آخری سانس پر پانی کا پیالہ آگے بڑھا دیتا ہے اور کبھی خود پیٹ پر پتھر باندھ لیتا ہے۔ وہ عورت جو کھجور کے دو ٹکڑے کر کے اپنی بیٹیوں کو بانٹ دیتی ہے اس بادشاہ سے کہیں بہتر ہے جو اپنی اولاد کو زر و جواہرات میں تول دیتا ہے۔

••

ابا جی کے مہربان اور متبرک ساتھ نے ایک ایسے حلقے سے جان چھڑا دی جس کا ہر فرد رات کو سوتے میں بھی یہی خواب دیکھتا ہوگا کہ صبح اٹھ کر کس کو اپنی شان و شوکت سے مرعوب کرنا ہے۔ سونا چاندی، جائیداد، گھروں اور گاڑیوں کے سائز و تنخواہوں سے کس کس پر دھاک بٹھانی ہے۔ ایک لمحہ کے لیے ایسی فرعونیت کا سوچ کر انسان لرز جاتا ہے اور دہل کر معوذتین پڑھنے لگتا ہے کہ الحمدللہ، قادرِ مطلق نے ہمیں ایسے عذاب ناک ذہن کے ساتھ پیدا نہیں کیا۔

ابا جی کہنے لگے ”تو پھر بتاؤ کہ ایسی عورتوں کی گود سے نکلے مرد کیسے ہوں گے؟“

”لیکن ابا جی، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ عورتیں ایسی کیسے بنیں؟ دکھاوا، تصنع، ریا، بے لگام زبان، کسی کا دل دکھانے کے لیے کوئی بھی بات کہہ دی، اور مسابقت کی فضا کو قائم رکھنے کے لیے خواہ گھر پھونک تماشہ بھی کرنا پڑے کریں؟“

”سوال تو اچھا ہے“ ابا جی بولے ”مسئلہ یہ بھی ہے کہ محدود تعلیم اور پھر دین کا علم نہ ہونے کی وجہ سے بھی خواتین اس طرف راغب ہوجاتی ہیں۔ جب زندگی میں کوئی اعلیٰ مقصد نہ ہو تو پھر دکھاوا ہی رہ جاتا ہے جس کے ذریعے زندگی میں کچھ نہ کچھ ہلچل ہوجاتی ہے اور خاندانی سیاست میں الجھ کر اپنی نسل کی بربادی کا اہتمام بھی کرتی ہیں۔ جو عورتیں خود اپنے پیروں پر کھڑی ہوتی ہیں اور اپنے پروں کے بل پر پرواز کرتی ہیں ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ ایسے فضول کاموں میں لگ سکیں اور وقت ہو بھی تو وہ ان سے ماورا ہو جاتی ہیں۔“

میں نے بات کاٹی، ”گستاخی معاف ابا جی، تو کیا غریب خواتین کی خود داری نہیں ہوتی؟“

”فلاں مرینہ کو دیکھو، فلاں کو دیکھو“ انھوں نے مثالیں گنانا شروع کر دیں۔

”میں نہیں ماننے کو تیار کہ غربت کی وجہ سے یہ فطرت ہے جو کہ مرد و زن میں یکساں ہوتی ہے، خود کو مظلوم سمجھ لینا یا زیادہ بااختیار سمجھ لینا۔ گردن کا جھک جانا یا رعونت سے اکڑ جانا دونوں امراض ہیں۔ فطرت میں توازن اللہ کی عنایت سے ہی آتا ہے۔“

••

''دھیاں جئی تے نعمت ای کوئی نئیں'' وہ بولے۔
''اچھا تو پھر پتر کیوں کہتے ہیں؟'' میں نے چھیڑا۔
''وہ تو میں معاشرتی جہالت کی نفی کرنے کو کہتا ہوں جو دھی اور پتر میں فرق کرتے ہیں۔''
''تو پھر بیٹوں کو بھی میری دھی رانی کہا کریں۔''

ابا جی مسکرائے، ''بیٹے کو تو پیدا ہوتے ہی یہ معاشرہ گڑ بتاشے بانٹ کر خوش آمدید کہتا ہے۔ اس کو دھی رانی کہنے کا فائدہ اس لیے نہیں کہ بیٹی کو تو یقین دلانا ہوتا ہے کہ وہ اسی طرح اہم ہے جیسے بیٹا۔ پتر کو دھی کہا جائے تو وہ اور ہی سیاپا بن جائے۔ مونث کا صیغہ عورت کے لیے ہے اور اسے مرد کے لیے استعمال کرنا اہانت ہے۔ لسانیات بھی عورت کے معاملے میں متعصب ہے۔''

''ہاں کیونکہ یہ بھی مردوں ہی کی وجہ سے ترتیب پاتی رہی۔ جیسے اردو میں ''مردانہ وار، اور پنجابی میں جنے دی بچی، یعنی مرد کی بچی وغیرہ کہنا۔''

''ہاں اس لیے کہ اس زمانے میں مرد گھڑ سواری کرتے، جنگیں لڑتے اور دادِ شجاعت دیتے تھے۔''

''جی ظاہر ہے۔ عورتیں رجز پڑھتیں اور بیوہ ہوتیں، دشمن کی انتقامی کارروائیوں کے کام آتی تھیں۔''

ابا جی کو آئس لینڈک ساگاز کے بارے میں جان کر بہت مسرت ہوئی اور ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح یہ داستانیں پڑھیں۔ ''ان کو تو عرب معاشرے پر منطبق کیا جاسکتا ہے'' وہ کہتے۔

••

ہمارے شہر کے گردونواح میں ایسے گاؤں بھی ہیں جن کی آبادی کی اکثریت یورپ کے مختلف ممالک بالخصوص برطانیہ میں ہے۔ گھر میں ایسے لوگوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا جو پاکستان کا چکر لگاتے تو وہاں برپا کرنے والی محافل کا تذکرہ فخر سے کرتے۔ جشنِ میلاد النبی اور نعت خوانی کی محفلیں، بزرگوں کی برسیوں پر مسابقت کی داستانیں سناتے۔ ایسی ہی ایک مہمان خاتون ہمارے ہاں تشریف لائیں جو یہاں اپنے پورے خاندان کی کرتا دھرتا تھیں۔ یوکے میں بھی ایسی ہی محافل کی شیدائی تھیں۔ ابا جی برطانیہ میں اسلام کا بول بالا اور دینی مراکز اور ان کی خدمات کی طویل داستان خاموشی سے سنتے رہے۔ پھر وہاں تبلیغی مراکز کا ذکر ہوا، نعتیہ پروگراموں اور نعت خوانوں کے دوروں

کا ذکر آیا۔ میں مہمانوں کو چائے اور لوازمات پیش کر رہی تھی اور مجھے ان کا مزاج دان ہونے کا دعویٰ تو نہیں لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اب ایک ہی دفعہ اس طویل یک طرفہ بیانیے کا جواب آئے گا جو ضروری نہیں کہ رسمی 'سب کہو سبحان اللہ' جیسا جملہ ہو۔ وہی ہوا۔

چائے کا دور ختم ہوتے ہی ابا جی نے بے حد ملائمت سے پوچھا...

''لاکھوں روپے لے کر نعتِ رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کاروبار بنانے والے نعت خوانوں اور قوالوں کو پونڈ دینے سے اسلام کی کیا خدمت ہوئی؟ غربت اور مشقت کی چکی میں پسنے والے انسانوں کے ایمان میں کیا ترقی ہوئی؟ امیروں نے امیروں کو بلایا، امیروں کو کھلایا۔ ان کا تن و توش دیکھا آپ نے؟ شکم سیری کے بعد ان کی جیب بھری اور صدقے یا رسول اللہ تماشہ دکھا کر مداری گیا۔ آپ پڑھے لکھے لوگ ہیں، آپ بتائیں جتنا پیسہ آپ نے ان پیشہ وروں کو دیا وہی ایک سکول کھولنے یا خواتین کو دستکاری سکھانے اور گھر بیٹھے آمدنی حاصل کرنے کے اقدامات کیے جاتے تو زیادہ بہتر نہ ہوتا؟ یہ عاشقینِ رسول ﷺ اگر اسلام سے اتنے ہی مخلص ہیں تو ان غریب علاقوں اور سکولوں میں جا کر اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے مفت اپنے فن کا مظاہرہ کر دیا کریں۔ آپ یقین کریں انسانوں کا سب سے پہلا اعتقاد روٹی ہے۔ جب شکم میں بھوک سے آگ لگتی ہے تو انسان اور بلیاں کتے ایک ہی کچرا گھر سے لقمہ تلاش کرتے ہیں۔ بھوک شریعت کو بھلا دیتی ہے کہ مرغی پر تکبیر پڑھی گئی تھی یا نہیں اور گوشت کسی حرام جانور کا ہے یا مردہ جانور کا۔ عشقِ رسول ﷺ کو کاروبار نہیں اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہیے۔ کتنے ہیں ہم میں سے جو آپ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ، عفو و درگزر، محنت و مشقت پر عمل پیرا ہیں؟''

اس دن طویل بحث ہوئی۔ عید میلاد النبی ﷺ پر پانی کی طرح بہایا جانے والا پیسہ، جلوسوں کی وجہ سے بند راستے، اندھا دھند نابینا عقیدت اور درپیش مسائل سے دانستہ چشم پوشی، سب زیرِ بحث آئے۔ کھانے کے بعد وہ رخصت ہونے لگیں تو امی ان کے لیے تحائف نکال لائیں۔ وہ خاتون کچھ پریشان بھی تھیں کیونکہ ابا جی نے چالیسویں اور برسیوں پر برپا کی جانے والی ضیافتوں اور شکم سیروں کی دعوتوں پر بھی تنقید کر ڈالی تھی اور ان کے خاندان میں بھی پاکستان اور برطانیہ دونوں جگہ بڑے بڑے جلسے ہوتے، پانی کی طرح پیسہ بہایا جاتا، لاؤڈ سپیکر لگتے اور قوالوں اور دعا مانگنے والوں کے وارے نیارے ہوتے۔ دیگوں کی تصاویر بنائی جاتیں اور خاندان میں بزرگوں کی برسیوں پر لگنے والے میلوں کا مقابلہ ہوتا۔

امی نے کہا، ''بہن جی! مرزا صاحب کی باتوں کا برا نہ مانیں۔ ان کے پاس سارا دن لوگ اپنے امراض اور مسائل لے کر آتے ہیں اور وہ ان کو حل کرنے کے لیے اپنے منصوبے پیش کرتے رہتے ہیں۔''

ابا جی فوراً بولے، ''میں وہ کہتا ہوں جسے حق سمجھتا ہوں۔ بیٹا آپ پڑھی لکھی روشن خیال بچی ہیں۔ آپ لوگ تبدیلی لانے کی ابتدا کریں۔ یہ جو عورتیں ہمارے گھروں میں کام کرتی ہیں ان کو اپنی والدہ کے نام کی کپڑے سینے کی مشینیں لے دیں۔ صدقہ جاریہ بنائیں۔ ان کے بچوں کی تعلیم کے اخراجات اٹھالیں۔ اپنے والد صاحب کی برسی پر کسی کے گھر نلکہ لگوا دیں، کہیں بجلی لگوا دیں، روشنی میں معصوم بچے پڑھیں گے تو آپ کے بزرگوں کو دعا دیں گے۔ بیٹا عورت کو اللہ نے اتنی عظیم طاقت اور استقامت سے نوازا ہے کہ وہ چاہے تو ان رسومات کو تعمیری رنگ دے اور اپنے حرفِ انکار سے معاشرہ بدل کر رکھ دے۔ اللہ نے اسے مجازی خالق بنایا ہے اور مٹی سے پیدا نہیں کیا۔ اس کے دیے گئے ایک نوالے کی فضیلت مردوں کی اگائی فصلوں کے برابر ہے۔ اسی طرح اگر وہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے تو ایک زندگی اور ایک گھر نہیں، ایک نسل تباہ کرسکتی ہے۔ آپ اپنے خاندان کی حد تک تبدیلی لاکر دیکھیں۔ یہاں غریب عورتوں اور بچوں کی کفالت کریں، آپ چند سال میں تبدیلی دیکھیں گی۔''

اس خاتون نے امی جی کے ہاتھ سے کپڑے لیے، اپنے بیگ سے پیسے نکالے اور ابا جی سے کہا اس دفعہ کی برسی کے پیسوں سے آپ ان خواتین کے گھر راشن بھجوا دیں۔ اس دن ان مالدار خاتون کے ساتھ مجھے ان کی بات چیت آج بھی حرف بحرف یاد ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ابا جی کتنے پرجوش انداز میں اپنے ہاتھ سے پرچی پر نام پتہ لکھ کر دے رہے تھے۔ تاکید کر رہے تھے کہ اس عورت کا اور بچی کی کفالت کا ذمہ اٹھالو، بچی کو پڑھا کر بی ایڈ کروا دو۔ عورت کو اعلیٰ پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت دلانا اشد ضروری ہے۔ میں نے ابا جی کے چہرے کو اتنا روشن اتنا مسرور کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ فوراً گئے اور اپنا زکوٰۃ والا رجسٹر اٹھا لائے اور براہِ راست ان خاندانوں کے نام پتے لکھوانے لگے۔

آج لندن میں مقیم وہ خاتون میری آپا ہیں اور جس خفیہ انداز میں وہ لوگوں کی مدد کرتی ہیں مجھے رشک آتا ہے۔ میں جب لندن جاتی ہوں حاضری کو ضرور جاتی ہوں۔ جب ابا جی نے کوچ کیا تو مجھے ملنے ڈنمارک آئیں اور ایک ہی جملہ کہتی رہیں...

''پتر ابا جی کی بات نے میری روح ہلا دی تھی۔ میں عید میلاد النبی ﷺ پر درود و سلام کے تحائف بھیجتی ہوں اور ان گھروں میں راشن جن کی ذمہ داری مجھے ملی تھی۔''

پھر وہ اتنی مدھم آواز میں بولیں جو بمشکل سنائی دی، ''تم خوش نصیب ہو۔ ہمارے باپ نے تو سوائے ہماری ماں کی حق تلفی کے اور کچھ نہیں کیا۔ وہ سہاگ کے ہوتے ہوئے بھی بے سہارا تھیں۔ ابا جی نے مجھے سہارا دینا سکھایا۔''

انھوں نے مجھے ابا جی کے ہاتھ سے لکھے نام اور پتے کی پرچی دکھائی۔ جانے کب میرے آنسوؤں سے بھیگ گئی۔ ایک بے قرار مگر شفیق سی خوشبو میرا حصار کرنے لگی۔ مئی کے مہینے کے آخری دنوں کی اترتی ہوئی شام کے دھند لکے میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کے اشک پونچھے۔ مجھے آج تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ میری آنکھیں ابا جی کی جدائی کے غم میں نم ہوتی ہیں یا احساسِ تشکر سے بھیگتی ہیں کہ اللہ نے مجھے ایک ایسے چھتنار درخت کے سائے تلے رکھا جس کا سایہ سب کے لیے یکساں تھا۔ جس کی دعا کل عالم کے لیے تھی۔ جو اللہ کو رب العالمین اور سرکارِ دوعالم ﷺ کو رحمت للعالمین سمجھتے تھے۔ حرفِ حق کہتے ہوئے نہ کسی سے خائف ہوتے نہ اپنے پرائے کا امتیاز کرتے۔ کبھی کسی کی ناجائز سفارش کر کے حق داروں کے حقوق پر نقب نہیں لگائی اور جہاں کوئی بے بس مستحق ملا اس کی خاطر ذاتی طور پر چل کر حق مانگنے گئے۔ عورتوں اور بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے ان کا ایک اپنا نظریہ تھا۔ وہ خواتین کو مردوں سے بہتر منتظم مانتے تھے۔ ان کی تعلیم کے لیے دن رات کوشاں رہتے تھے۔ کتنی بچیوں کو انھوں نے پیشہ ورانہ تعلیم کی طرف راغب کیا۔ گھر بیٹھ کر روزگار کمانے کے بندوبست کیے۔

ابا جی تمام مخیر دوستوں کو براہِ راست مستحقین کے ساتھ ملا دیتے اور پھر معاملہ ان کے درمیان رہنے دیتے۔ ان کے جانے کے بعد خواتین اور بچیوں کا ایک ریلا تھا جو کتنے دن تعزیت کے لیے آتا رہا، ''مرزا صاحب نے میری بچی کی شادی کروائی، مرزا صاحب نے ہمیں سلائی مشین لے کر دی، میرے بچوں کی فیس معاف کروائی، میرے گھر دوا مفت آتی تھی، میں بچے کو بھیجتی خاموشی سے دوا بھیج دیتے، چند دن میں شفا ہو جاتی، میری بچیوں کو گھر بیٹھے ٹیوشن پڑھانے کے لیے بچے بھجوا دیتے۔''

ایک دفعہ ابا جی کے پاس ایک عمر رسیدہ خاتون اپنے پوتے کے ساتھ آئیں۔ کہنے لگیں مرزا صاحب کوئی ایسا بندہ نہیں جو مجھے حج کروا دے۔ آپ تو اتنی مدد امداد کرتے ہیں۔ ابا جی ہنس کر بولے، ''بی بی پہلے یہ بیان فرمائیں آپ کے حج سے ان یتیم بچوں کو کیا فائدہ ہوگا؟ آپ کون سا انقلاب لائیں گی اتنی بھیڑ میں جا کر سجدے ادا کرنے سے۔ الٹا طویل سفر اور جسمانی بھاگ دوڑ سے کسی حادثے کا شکار ہو گئیں تو بچوں سے یہ سہارا بھی چھن جائے گا۔ اپنی بیوہ بہو کا خیال رکھیں۔ ان

یتیموں پر اپنا سایہ تان دیں۔ یہاں بیٹھے آپ کے دم سے وہاں لوگوں کا حج مقبول ہوگا۔'' اکثر کہا کرتے کہ میرا بس چلے تو ایک سال کے لیے ان حجاج کے حج پر پابندی لگا دوں، سارا پیسہ ان عورتوں بچوں کے لیے پناہ اور روزگار پر لگا دوں۔ ملّا نے نیکیاں گننے کے کاروبار پر لگا رکھا ہے عقل کے اندھوں اور گانٹھ کے پورے مسلمانوں کو۔''

••

ایک روز لسانیات زیرِ بحث آئی۔ ہم سب زبانوں پر عبور کے بارے بات کر رہے تھے۔ ابا جی نے خواہش کا اظہار کیا کہ میں اردو اور ڈینش کے علاوہ اور زبانیں بھی سیکھوں۔ عزیز بھائی بڑے آرام سے بولے، ''عورت کو اللہ نے ایک زبان کی تلوار دے کر ہی باقی سب کا تیا پانچا کر دیا ہے۔ اب مزید زبانیں سیکھ کر کتنی دھاروں کا اضافہ ہوگا؟''

••

ابا جی اپنے متمول دوستوں کو براہِ راست حاجت مند گھرانوں کا سرپرست بنا دیتے تاکہ وہ براہِ راست ایک دوسرے سے متعارف ہو سکیں۔ مجھے خیال آتا رہا کہ محدود وسائل ہونے کے باوجود وہ ضرورت مندوں کی مدد کے ممکنہ طریقے ڈھونڈتے رہتے تھے۔ اکثر کہتے کہ ''میرا بس چلے تو ان رزق ضائع کرنے والوں کو سلاخوں کے پیچھے بٹھا دوں۔''

مجھے زندگی میں اگر کسی بات پر وہ خفا ہوئے تو وہ مسلسل نئے لباس بناتے چلے جانا تھا۔ ہزار میں سستی تاویلات پیش کرتی، ''ابا جی دیکھیے میں اپنے کپڑے دوبارہ استعمال کرتی ہوں۔ پھر میں نے انگریزی کا ٹانکہ لگایا، Reuse کرتی ہوں۔''

''ہاں بیٹا اپنے شوق پورے کرنے کے لیے اس کو جو بھی نام دو۔''

''دیکھیں، ساڑھیوں کو لمبے ڈریسز میں ڈھال لیا ہے اور لانگ سکرٹس پر نئے بازو اور گلا لگا کر اسی لباس کو جدت دی ہے۔''

یہاں میری جدت، ندرت اور تخلیقی وفور منہ بسورتا رہ گیا لیکن ابا جی اپنا موقف بدلنے کو تیار نہیں تھے۔ درزیوں کے چکر، سامان اٹھانے کی مصیبت، پھر سنبھالنے کا عذاب، پھر چند مرتبہ کے استعمال کے بعد اس سے جان چھڑانے کی سوچ، غرضیکہ تمام دلیلیں دے ڈالیں لیکن ابا جی کی ایک ہی بات، ''بس کرو پتر جی، نہ دیا کرو بودی دلیلیں۔''

اگر کبھی معاشرہ سدھارنے کی بات ہوتی تو بلا جھجک ایک ہی بات کرتے، ''بات سامنے کی

اور سیدھی سی ہے بیٹا، کہ خواتین کو تعلیم اور ذریعۂ معاش کی فراہمی کے ذریعے معاشرے کو ایک تبدیلی اور بہتری کی طرف گامزن کیا جاسکتا ہے۔'' ابا جی اپنے ان خیالات میں لچکدار رویہ نہیں رکھتے تھے۔

''ٹھیک ہے ابا جی! آپا کی ایک بیٹی کی تعلیم کی ذمہ داری میں لے لیتی ہوں۔''

''اچھی بات، وہاں آپ کی اتنی سہیلیاں ہیں بیٹا۔ ان سے کہو کہ دنیاوی زندگی اور فضول رسموں کے بجائے ہر موقع پر ایک بچی کی کفالت کر دیا کریں۔ قطرہ قطرہ دریا بن جاتا ہے۔ ارادہ کرنے سے راستے بنتے جاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے ابا جی۔'' ان کی یہ فرمائش پوری کرنے کے لیے میں نے نجانے کتنے لوگوں تک ضرورت مندوں کے نام پتے پہنچائے۔ میرے بچے نانا کے پاس بیٹھتے تھے۔ ان کے ذہنوں میں بھی ایک ہی بات بیٹھ گئی، ''یہ سالگرہیں فضولیات ہیں بالکل۔ وہی پیسے جمع کر کے ان غریبوں کے بچوں کو بھیج دیا کریں جنھیں اللہ کی نعمتوں کا ذائقہ بھی معلوم نہیں۔''

گھر کے کام کاج میں مدد کرنے والی آپا کا اپنا ہی کردار تھا۔ ابا جی کو اس کی بچیوں کی فکر رہتی۔ اگر زیادہ تعلیم نہیں دلوائی جاسکتی تو کوئی ہنر ضرور سکھایا جائے تاکہ وہ خود کفیل ہوجائیں۔

••

ابا جی کے پاس ایک مریضہ آیا کرتی تھیں جو آزاد کشمیر کے کسی علاقے سے آکر یہاں بس گئی تھیں۔ اسی کی دہائی کو عبور کرنے والی اس محنتی عورت کے چہرے پر اس قدر حسن تھا کہ نگاہ ششدر ہوجائے۔ پھر وہ اپنی مخصوص بولی میں پنجابی ملا کر اتنی مٹھاس بھرے لہجے میں بولتیں کہ جی چاہتا گھر ہی نہ جائیں اور اپنی بکریوں اور ان کے بچوں کی داستانیں سناتی رہیں۔ ابا جی نے ان سے کہا کہ ہمارے گھر بھی دودھ بھیجا کریں اور پھر کبھی کوئی حساب کتاب نہیں ہوا کہ کتنا دودھ آیا، کتنے پیسے بنے، بس ایک مخصوص رقم ان کو مہینے کے آغاز میں دی جاتی۔ کثیر العیال تھیں اور سارا خاندان ایک ہی بڑے گھر میں ہنسی خوشی رہتا تھا۔ شام کو وہ دودھ دینے کے بہانے خود آجاتیں اور مرزا صاحب کے پاس بیٹھی نجانے کون سی کتھا سنایا کرتیں۔ امی اور ابا جی اکثر کہتے کہ کس قدر دانشمند خاتون ہے۔ ایسی عورتیں صرف اپنا خاندان ہی نہیں سنبھال سکتیں بلکہ امورِ سلطنت بھی سنبھال سکتی ہیں۔ مجھے ہمیشہ رشک آتا کہ حسن ہو تو ایسا کہ تاعمر قائم رہے۔ دانش ہو تو ایسی کہ ابا جی جیسے انسان جو سارا دن لوگوں سے ملنے اور ان کے مسائل سنتے رہتے ہیں، ان کو سراہیں۔ سنا ہے آج بھی وہ نوے کی دہائی عبور کرنے کے باوجود اسی طرح میٹھا بولی بولتی ہیں اور ان کے عارض آج بھی ضو دیتے

ہیں۔ وہ مرزا صاحب کے جانے کے دس برس بعد بھی ان کے لیے دعائیں کرتی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ان سے دوبارہ مل نہیں پائی۔

••

صائب تبریزی کے اشعار ابا جی کو بے حد پسند تھے۔ امیر خسرو کی غزل 'کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست' کے ساتھ ساتھ بلھے شاہ کا کلام 'تینوں کافر کافر آکھدے توں آہو آہو آکھ' بھی ان کا بے حد پسندیدہ تھا۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بچپن کی یہ یادیں میری اپنی شاعری میں اتر آئیں۔

اگر درد محبت کی دوا مانگوں تو میں کافر
وفا کے بدلے میں تجھ سے وفا مانگوں تو میں کافر

رحمتِ حق بہا، نہ می جوئید
رحمتِ حق، بہانہ می جوئید

(اللہ کی رحمت [اپنے بندوں کو نوازنے کے لیے] عوضانہ کی جستجو نہیں کرتی، بلکہ رحمتِ حق برسنے کے بہانے تلاش کرتی ہے)

مجھے ایک ایسے ماحول میں پروان چڑھایا گیا جہاں اپنے خالق کی مثال ستر ماؤں جتنی محبت نچھاور کرنے والی ہستی کی تھی۔ خدا کا تصور قہار و جبار کا نہیں کہ جو ایک ایک غلطی کا حساب لے کر مرحلہ وار آگے جانے دے گا۔ دوزخ کے بھڑکتے الاؤ سے گزر کر اور گرز کھا کر کہیں جنت میں داخلے کی قطار میں لگنے دے گا۔ نظیری کی معروف غزل میں نے شوق سے پڑھی:

تو از عذابِ خدا ما ز مغفرت گوئیم
نگاہ کن تو کجائی و ما کجا واعظ

(اے واعظ، تو عذابِ خدا کا ذکر کرتا ہے اور ہم اس کی مغفرت کی باتیں کرتے ہیں۔ ذرا نظر تو ڈال کہ تو کہاں ہے اور ہم کہاں)

کلامِ حق ہمہ غلط تا بکے کنی تفسیر
تو ہیچ شرم نداری ز مصطفیٰ واعظ

(کب تک تو خدا کے کلام کی غلط تفسیر کرتا رہے گا، تجھے تو مصطفیٰ ﷺ کی بھی کچھ شرم نہیں ہے اے واعظ)

یہی افکار پھر میرے اشعار میں بھی در آئے

گھڑا تھا تو نے جو قہر کا اک مجسمہ سا خدا بنا کر

فقیہِ عالم خبر یہ سن لے، ہم اس خدا سے گزر گئے ہیں

ابا جی کو بہت پسند آیا۔ کہنے لگے میری خواہش ہے کہ تم فارسی زبان میں بھی شعر کہہ سکو۔

''توبہ میری ابا جی! یہ ڈینش سیمناریم کی تعلیم جس طرح میں نے پوری کی ہے مجھے علم ہے۔ بچے، ملازمت اور تعلیم کی تکڑم نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے ہیں۔''

''تو پھر ڈینش میں لکھو۔ بھئی اگر آپ ایک بالکل نئی زبان سیکھ سکتی ہیں، نامساعد حالات میں تعلیم مکمل کر سکتی ہیں، تو فارسی کیا کہتی ہے؟ سچ پوچھیں اگر میرا بس چلتا تو فارسی، عربی، انگریزی اور پنجابی میں ایم اے ضرور کرواتا آپ کو۔ اتنی لمبی زندگی میں کچھ تو مشاغل ہونے چاہییں۔''

••

ابا جی کا پسندیدہ ترین قطعہ اقبال کے فارسی کلام سے تھا جسے وہ اکثر و بیشتر دوہرایا کرتے تھے۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر

روز محشر عذر ہائے من پذیر

گر تو می بینی حسابم ناگزیر

از نگاہ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پنہاں بگیر

میں نے ابا جی کے کہنے پر اس کا ترجمہ کیا جو انھیں پسند آیا۔ ان کا خیال تھا کہ منظوم تراجم میں زورِ کمال دکھانے کے لیے مفہوم کے ساتھ زیادتی ہو جاتی ہے۔

تو بے نیاز ہے دونوں جہاں سے، پر میں فقیر

تو روزِ حشر میری التجا بھی سن لینا

ہے ناگزیر اگر میرا احتساب تو پھر

مرے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر سے بچا کے لے لینا

مجھے ہمیشہ حیرت ہوتی کہ کیا امتی کو اللہ کے سامنے رسوائی کا خوف نہیں اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے شرمندگی ہے؟ ابا جی نے اپنی ٹانک نما بالائی کی موٹی تہہ جمی چائے کی پیالی سامنے رکھی تپائی پر رکھی اور اپنے دلکش ترنم میں ایک دفعہ پھر قطعہ پڑھا جسے میں ہمیشہ کی طرح مسحور سنتی رہی۔ ابا جی نے بستر پر میرے لیے جگہ بنائی اور میرے ہاتھ میں ارمغانِ حجاز تھمائی۔ نجانے کب کا مڑا تڑا اخبار کا کانا تراشہ نکالا اور مجھے اس کی عبارت پڑھنے کو کہا۔

اس قطعے کی کہانی کچھ یوں بیان کی گئی تھی کہ اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے ایک مداح رمضان عطائی کی درخواست پر انتہائی فیاضی سے مذکورۂ بالا رباعی اسے عطا کر دی۔ لیکن یہ مفہوم تخیل کو بے قرار اور خیالات کو تہہ و بالا کرتا رہا۔ اقبال نے اس خیال کو ایک نئی پوشاک دی۔ ایک نئی رباعی تخلیق کی۔

بہ پایاں چوں رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہ ما را
حساب من زچشم او نہاں گیر

''اچھا اب ذرا یہ قطعہ پڑھو۔'' پھر خود باآوازِ بلند پڑھ کر سنایا، ''اچھا، شاباش۔ اب ذرا اس کی تفہیم اور ترجمہ کر کے دکھاؤ۔'' میں نے بساط بھر کوشش سے کیا۔

یہ بوڑھی دنیا جب انجام کو پہنچ جائے
اٹھا کے پردہ تقدیر سب ہوجائے عیاں
مجھے تو رسوا نہ کرنا حضور ﷺ کے آگے
مرا حساب تو رکھ دینا اس نظر سے نہاں

مجھے آج بھی یوں لگتا ہے کہ میں ابا جی کے پاس بیٹھی ہوں اور وہ مجھے نئے سرے سے سب پڑھا رہے ہیں۔ ابا جی نے کہا کہ یہ محسوس کرنے کی شاعری ہے اور احتساب کی، ندامت کی اور اصلاح کی۔ محبوب کے سامنے رسوا ہونے کی اذیت اور محبوب کو دوسروں کی سامنے پشیمانی سے بچانے کی شدید تمنا کہ مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام، مجھ عاصی کی وجہ سے امت کے گناہوں پر دوسرے انبیا کے سامنے نادم نہ ہوں۔ یہی انسانی نفسیات ہے۔

میں حیرت سے ان کی باتیں سنا کرتی۔ وقت ثابت کرتا رہا کہ وہ جو کہتے تھے ان کی سوچ کی ہر لہر ان کے ہر عملی اقدام کی ہمراہی تھی۔ ابا جی کا ایمان کسی اور پیمانے پر مضبوط و مستحکم تھا۔ میں نے اسلام اور ایمان کا فرق اور مفہوم ان کی زندگی سے سیکھا اور بقول ابا جی کے، انھوں نے سورۃ الحجرات سے روشنی پائی۔ اسلام لے آنا اور مسلمان کہلانا ایک الگ چیز ہے اور دلوں میں ایمان کا داخل ہوجانا اور حق و باطل کی تمیز کر کے سچائی کے لیے ڈٹ جانا اللہ کی بے پایاں رحمت کے بغیر ممکن نہیں۔

مجھ سے ان کی محبت اور بے پایاں عنایات نے میرے راستے ہمیشہ ہموار رکھے۔ اپنے اصولوں کی خاطر دنیا بھر کی پروا نہ کرنا اور معاشرے کی تمام روایات سے ٹکر لے کر میرے سامنے دیوار بن جانا۔۔۔ میرے حرفِ انکار کو کسی آسمانی صحیفے کے مقدس حرف کی سی تعظیم دے کر مکمل آزادی دینا کہ جس افق کو چاہو چھولو، تمھارا باپ تمھارے ساتھ کھڑا ہے۔ یہ دنیا نپولین کے قول کو دوہراتے نہیں تھکتی کہ مجھے اچھی مائیں دو میں تمھیں اچھی اقوام دوں گا۔ اس مقولے کے مساوی ایک اور مقولہ ہونا چاہیے کہ مجھے اچھے باپ دو، میں تمھیں اچھی مائیں اور بیٹیاں دوں گا۔

یہ سطور لکھتے ہوئے ہی مجھے یکلخت احساس ہوا ہے کہ اپنی اولاد کی تربیت میں مکمل اعتماد اور باشعور آزادی دینا میں نے ان سے سیکھا۔ میرے بچوں کے قدم بھی ہر سرحد تک جانے کے لیے آزاد رہے لیکن ان میں میری محبت کی ایک نادیدہ نازک زنجیر بھی بندھی رہی جس کے احترام میں انھوں نے کبھی پند و نصیحت کی نوبت ہی نہ آنے دی۔ مجھے دنیا کے سامنے سر اٹھا کر کھڑے ہونے کا حوصلہ دیا۔ ابا جی نے محبت کا کیسا فلسفہ ورثے میں دے دیا تھا جس نے ساری عمر صبر و استقامت سے کم ظرفوں کی زیادتیاں برداشت کرنا سکھایا۔ ہزار جواب نوک زباں پر لرزتے رہتے لیکن ایک ہی احساس انھیں آواز نہ بننے دیتا، کہیں ابا جی کے سامنے ندامت نہ ہو۔ کہیں ان کو میری وجہ سے شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ اور دنیا یہ سمجھتی رہی کہ اسے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ بعض اوقات میری بیٹی کہتی کہ امی آپ کو اپنے ابا کے حضور پیش ہونے کا احساس شاید اللہ کے حضور سرخرو ہونے سے زیادہ ہے، اس کا جواب اتنا ہی سادہ ہے کہ اللہ رب العزت خود کسی کو سزا و جزا دینے زمین پر نہیں اترتا بلکہ ایسے اشخاص اور اسباب پیدا کر دیتا ہے جو آپ کو راستہ دکھاتے ہیں اور زندگی کے قرینے سکھاتے ہیں۔ پنجابی کے ایک محاورے ''رب نہ مارے ڈانگاں بس پٹھی کردے مت'' (خدا کسی پر لاٹھیاں نہیں برساتا بس اس کی کھوپڑی الٹی کر دیتا ہے) باقی اپنی راہ کے گڑھے انسان خود کھود لیتا ہے۔

••

ابا جی کے ایک ملنے والے اپنی ملازمت پیشہ بہو کو منا کر واپس لانے کے جتن کر رہے تھے۔ ساتھ ہی اس کوشش میں بھی تھے کہ اس کی ہر خوبی کو خامی میں بدل دیا جائے۔ ''مرزا صاحب، بچوں اور بیویوں کے سامنے ان کی تعریف کرو تو وہ سر پر چڑھ جاتی ہیں۔''

ابا جی خفا ہو گئے، ''یہ کس جاہل نے کہہ دیا ہے؟ جو سر پر چڑھنے والی ہوتی ہیں ان کو تعریف کے تکلف کی ضرورت نہیں اور جو ایسی نہ ہوں ان کی تعریف اور حوصلہ افزائی سونے پر سہاگا

ہوتا ہے۔"

اگر آپ پڑھی لکھی بہو کے کشادہ ذہن اور ملازمت کے حق کو نہیں قبول کر سکتے تو شروع سے ہی اپنے بیٹے کی مرضی سے نہیں، اپنی پسند کی بہو لائیں تاکہ آپ اسے بسنے کی سہولت دے سکیں۔ یہ فیصلے اور انتخاب کرتے وقت ہمیشہ اپنا قد کاٹھ نظر میں رکھنا چاہیے۔ دروازے اونچے نہ ہوں تو شتر و فیل والوں سے یارانے نہیں رکھنے چاہییں۔ اپنے قد سے اونچا انسان لا کر اس کی ٹانگیں یا سر قلم کر کے اپنے برابر کرنے سے بہتر ہے کہ پہلے ہی اپنے برابری والوں سے یا نشیبی علاقوں سے نسبتیں قائم کی جائیں اور توازن قائم رکھا جائے۔

یہ جاہلانہ سوچ کہ بس کسی طرح پکڑ دھکڑ کر شادی کر دیں باقی معاملات ازخود سلجھ جائیں گے، شادی اور گھر کی بنیاد بہتے پانی پر رکھتی ہے۔ ایسے گھر میں آپ بچوں کو مجبور تو کر سکتے ہیں، وہ مسرور نہیں رہ سکتے۔

••

میں اپنے خاندان کی طرف دیکھتی ہوں تو سب بہن بھائیوں اور ان کی اولادوں پر ابا جی کی دعاؤں کا سایہ نظر آتا ہے۔ کھلے آسمان تلے ستاروں بھری چادر کے نیچے ازلی مسافر چاند کے ہمراہ کہانیاں سناتے ابا جی، آج ہم سب میں جو جس مقام پر ہے اللہ کے کرم اور ابا جی کے مثالی باپ ہونے کی وجہ سے اور ان کی مناجات سے ہے۔ ایک سہولت اور امکانات بھری زندگی میں صرف دو بچے پالنے، پڑھانے کے بڑے فرض سے نبرد آزما ہونے کے بعد مجھے ابا جی کی یاد مزید احسان مند کرتی۔

وضع داری، سفید پوشی، کثیر العیال خاندان کی ذمہ داریوں کے ساتھ معاشرے کے سدھار کی طویل ان تھک جد و جہد کو خندہ پیشانی سے جاری رکھتے ابا جی، احسان کر کے بھول جانے والے لیکن دوسرے کے پانی کے ایک گلاس کا احسان یاد رکھنے والے ابا جی، اپنا پیٹ کاٹ کر دوسروں کو قرضہ دینے والے لیکن خود کسی سے ایک پائی کے روادار نہ رہنے والے۔۔۔ کسی سے کوئی توقع نہیں، گلہ نہیں، کوئی امید صلہ نہیں۔ "بھوکے سو جانا لیکن مقروض نہ جاگنا۔" ان کی ایک ہی نصیحت تھی۔ دوسروں کو جہاں تک ممکن ہو بغیر سوال کیے مدد کر دو۔

اُسامہ نے جب ادلبرگ یونیورسٹی میں تعلیم کا آغاز کیا تو اس کی وہاں رہائش، اخراجات، کرایہ، گھر آنے جانے کے ٹکٹ وغیرہ ایک مکمل منصوبہ بندی اور مسلسل محنت کے متقاضی تھے۔ میں اکثر سوچتی ابا جی نے کیسے سب کو پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھا لیا۔ اسلام آباد، راولپنڈی،

لاہور، رہائش، تعلیم، فیسیں اور پھر مکمل ذمہ داری سے شادیاں اور سہولتیں فراہم کرنے کی کوششیں، اور امی جی کا شانہ بشانہ چھ بھائیوں کو زنجیر کی کڑیوں کی طرح اکٹھا رکھ کر حلقہ بنائے رکھنا۔ کم از کم مجھے تو آج تک سمجھ نہیں آئی کہ خندہ پیشانی سے تاعمر ہر فرض کو عبادت سمجھ کر کیسے ادا کیا گیا۔

ایک دفعہ امی جی نے کسی شادی پر دینے کے لیے ان سے مردانہ کپڑے منگوائے۔ شام کو خالی ہاتھ گھر آئے۔ امی جی نے پوچھا کہ آپ کو یاد نہیں رہا کل شادی پر دینا ہیں۔ پہلے چپ رہے، پھر آہستہ سے بولے ''بس کسی کے بچے کے امتحانات کی فیس جمع کروانے کا آخری دن تھا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے فیس دے دی۔ شادی پر تو بعد میں بھی دیا جا سکتا ہے۔'' برسہا برس بعد وہ بچہ مجھے انگلینڈ ملا اور اس نے ابا جی کی تعزیت کرتے ہوئے کہا، ''باجی آج میں جہاں کھڑا ہوں اس میں آپ کے ابا جی کی اس دن کی دی ہوئی فیس شامل ہے۔''

ان دنوں جدائی کا داغ ابھی ہرا بھی تھا اور رِستا بھی تھا۔ میں بصد کوشش بھی اپنا پروگرام پورا نہ کر سکی۔ مجھے ایسے ہی محسوس ہوا کہ ایک نگران خوشبو میرے چہار جانب ہے۔ میں اس سے پھوٹتی روشنیاں اور نور کے غبار میں اپنا سفر طے کر سکتی ہوں۔ اس خوشبو سے جھڑتی دھنک میں اپنی ذات کے سب زرد موسموں کی چنریاں رنگ سکتی ہوں۔ کبھی مجھے وحشت ہونے لگتی، یا اللہ کیسے اس کیفیت سے باہر نکلوں گی؟ اس سے تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ پھر یاد آتا ہے کہ میرے قبلہ و کعبہ میرے والدین دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے مجھ پر راضی تھے۔ اپنی اولاد کے ساتھ دوسروں کے بچوں کو پڑھانے والے ابا جی شاید کسی کو دوجا سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ ہمارے گھر چچا زاد بھائی تعلیم اور امتحانات کی غرض سے رہتے۔ امی جی پہلے ان کو روٹی اور پراٹھا اتار کر دیتیں۔ یونیفارم دھو کر تیار کرتیں۔ ابا جی کا قائم کردہ چھوٹا سا سکول شام کو کھیل کا میدان بن جاتا۔ ٹیوشن سنٹر کی شکل اختیار کر لیتا اور رات کو ایک مہمان خانہ جس میں بھائی لوگ اور دیگر مہمان آرام سے سو جاتے اور صبح ناشتے کے لیے آتے۔

مجھے لندن میں سرائے عالمگیر کے نواحی گاؤں کے ایک بزرگ ملے۔ انھوں نے کہا، ''آپ کو علم ہے کہ سرائے عالمگیر تدریس کا مرکز کیوں بنا؟ کیونکہ اس میں مرزا صاحب کی نیت کا نور شامل تھا۔ چھوٹے سے گھر سے شروع ہوتا سکول جس میں غربا سے واجبی فیس لی جاتی، جس میں شرفا کی ستر پوشی کی جاتی۔ سخی اور ستار العیوب اللہ کی ذات ہے۔ جب انسان ان صفات کو اختیار کرتا ہے تو اس کی نسلوں میں نور پھیلتا ہے بی بی۔'' انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ جب لندن آؤ تو ہمیں ضرور ملا کرو۔

کتنے باپ اس معیار کے ہمالیہ کی چوٹی سر کر سکتے ہیں؟ کتنی مائیں اپنا آرام تج کر اپنے بھرے پرے کنبے پر آخری عمر تک اپنی محنت کی کھن کھن کرتی اشرفیاں نچھاور کرتی ہیں؟ کبھی میکے کی شان میں رطب اللسان عورتوں کو دیکھتی ہوں تو مجھے اپنی ماں کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ سسرال کی برائیاں کرتی اور میکے کے مردوں کے سر پر تاج رکھ کر اس میں زبردستی کے نئے نئے پر ٹھونسنے کی کوشش کرتی خواتین جن کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ امی کی یاد آتی۔ اپنی ہستی کو بھلا کر اوروں کو ادب، بے لوث اور غیر متعصب رویے سکھانے کی اعلیٰ مثالیں دیتیں۔

''امی جی۔۔۔ آپ کے کڑے معیار تک ہمارا پہنچنا بہت دشوار ہے'' میں اکثر دل ہی دل میں امی جی کو مخاطب کرتی۔ لوگ حیران ہوتے کہ ہمارا جھکاؤ اور لگاؤ اپنے ددھیال کے ساتھ ایسا تھا کہ اکثر دوست کہتے ہیں کہ آپ ننھیال کی بات بہت کم لکھتی ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ ایک تو ہمارے تایا جان، بابا جان وغیرہ پڑوس میں تھے اور دوسرے گھر کا ماحول ایسا تھا کہ شب و روز بھی آپس میں جڑے ہوئے تھے۔

••

دیارِ غیر میں دنیا کے ساتھ خود معاملات کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ کٹیا سے نکل کر آنے والے ہفت ہزاری بنے۔ پھر جب وہ پدرم سلطان بود کی داستانیں سناتے تو میں اندر ہی اندر چپکے چپکے ہنستی۔ اصل دولت تو شکر گزاری، توکل، یقین اور عجز ہے۔

''بیٹا کوئی بھی عورت صرف اس صورت میں سسرال جا کر تعلیم اور ملازمت کے ذریعے اپنے مشاغل جاری رکھ سکتی ہے جب اچھے خاندان میں جائے۔ اس کے راستے میں روکاوٹیں نہ کھڑی کی جائیں، اسے اس بنیادی چبوترہ تک رسائی دی جائے جس پر وہ اپنی کاوش کے محلات تعمیر کرے۔'' آج مجھے ایک ایک لفظ کی بازگشت اور ایک ایک کامیابی کے پیچھے ابا جی کے بنائے چبوترے دکھائی دیتے ہیں۔

••

نئے دور کی خود مختار عورت کو سمجھنا ہوگا کہ اس کی حیاتیات، نفسیات اور جذبات مرد سے مختلف ہیں۔ اس کے فضائل الگ۔ اس کے وسائل الگ اور اس کے مسائل الگ۔ جب تک وہ مساوات کی اس رکاوٹوں بھری دوڑ سے آگے نہیں بڑھے گی منہ کے بل گرتی رہے گی۔ ان کی فطرت میں یکسانیت نہیں مساوات ہے بلکہ عورت کو فضیلت حاصل ہے کہ وہ مرد کو حوصلوں کے نشیمن دیتی

ہے۔اسی کے دم پر وہ پرواز کرتا ہے۔اس مرد کی عقابی صفات شیرِ مادر سے شروع ہوکر اپنی بیٹی کے عشق پر ختم ہوتی ہیں۔عورت جسمانی لحاظ سے مرد سے زیادہ دیر جینے کی صلاحیت دے کر پیدا کی گئی ہے۔ وہ بنیادی طور پر جلد بچے پیدا کرنے کے قابل ہے۔ اسے ان کی تربیت کے لیے زیادہ قوتِ برداشت دی گئی ہے۔قوتِ فیصلہ جب متحرک ہوتی ہے تو کوئی اس کا راستہ نہیں روک سکتا۔ وہ بیک وقت کئی امور نمٹا سکتی ہے۔سب دیکھتی ہے اور سہہ جاتی ہے۔لوگ سمجھتے ہیں کہ مامتا کو پیروں کی زنجیر نہ سمجھنے کا دور اب آیا ہے یا مغرب کی عورتوں کو برا بھلا کہنے والے عرب کے پرانے معاشرے میں کئی کئی مرتبہ عقد کرنے والی اور کئی مردوں کے مخلوط بچے پالنے والی خواتین کو بھول گئے ہیں۔ بنیادی انسانی نفسیات اور جذبات وہی ہیں جو دنیا کی ابتدائی تہذیبوں میں تھے، جو انسانیت، شائستگی اور تحمل سکھاتی ہے۔عورت کا کمزور ترین محافظ اس کے اپنے بے قابو جذبات ہیں جہاں وہ خود اپنے ہاتھوں شکست کھاتی ہے۔ ایک ڈینش مصنفہ سوزن بروگر نے بھی لکھا کہ ”ہمیں چاہت کی زنجیروں سے اب آزاد کر ہی دو“ اور میں نے تراجم میں لکھا:

اتاری ہے چاہت کی پازیب
میرے ہاتھ تب اختیار آ گیا

اب اس اختیار کو استعمال کرنے کا مسئلہ سر اٹھاتا ہے۔آرائش زلف ولب و عارض؟ کیا عورت صرف اسی مقصد کے لیے ایک دائرے کا سفر کرے؟

ڈینش مصنفہ ویٹا اینڈرسن نے کتاب لکھی، ”بکواس بند کرو اور حسین بن کر رہو“ یعنی یہی تمھاری زندگی کا مقصد ہے کہ مرد کے پہلو میں سج سنور کر ایک مورتی بن کر بیٹھ جاؤ اور اپنی زبان پر کوئی رائے، کوئی تبصرہ یا حرفِ انکار مت لانا۔

زلف ولب و عارض کے فسانوں میں نہیں ہوں
میں اب تری مرضی کے جہانوں میں نہیں ہوں
تو حسن و نزاکت کی نمائش میں نہ الجھا
اب میں ترے طے کردہ ٹھکانوں میں نہیں ہوں
جینے کے لیے اپنی الگ سوچ ہے میری
میں حسن و جوانی کی دکانوں میں نہیں ہوں

••

ابا جی کو خواتین کے مسائل کا حل ان کی تعلیمی ترقی میں دکھائی دیتا کہ کسی نہ کسی صورت وہ علم کے زیور سے آراستہ ہو جائیں اور اسی علم کے بل پر اقتصادی دوڑ میں شریک ہو سکیں۔ اب اس آزاد، خود مختار اور مضبوط عورت کے تعمیری اور مثبت اہداف طے کرنا ضروری ہیں۔ ان مقاصد کے حصول اور خود انحصاری کی طرف جانے کے لیے معاشرے سے برسرِ پیکار ہوئے بغیر مہذب اور شائستہ انداز میں اپنے مطالبات پیش کرنا اور منوانا مکمل لائحہ عمل کا متقاضی ہے۔

خواتین کو اپنی صحت و عافیت کا سب سے پہلے خیال رکھنا چاہیے۔ اپنی زندگی میں صدیوں پرانے روایتی انداز ختم کرنا ہوں گے تاکہ وہ اپنی اولاد سے بھی توقعات وابستہ نہ کرے ورنہ اسے انھیں محاذوں پر شکست ہوگی۔ اپنی ذات سے دوسروں کے لیے نافع بن جانا۔ اور جب جہاں جس کے کام آسکیں بلا تامل خدمات پیش کریں۔ ان ہی مباحث اور اسباق کا فیض تھا کہ میں کبھی برانڈ اور فیشن کی دوڑ میں شامل صنفِ نازک کے ہمراہ زیادہ دیر نہ چل سکی۔ خود عورت ہوتے ہوئے بھی مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ خواتین اس نمائش سے کیا ثابت کرتی ہے۔ خود نمائی اور دکھاوے کی یہ دوڑ بھی ایک سنہری زنجیر ہے جسے عورت نے طلائی کمر بند کی طرح خود پر لاد رکھا ہے۔ اس زنجیر میں اس نے اپنی اہمیت جتانے کی چابی پرو رکھی ہے۔

خوش لباسی کا مطلب بے جا اسراف نہیں۔ مجھے یاد ہے میں نے نجانے کتنی مرتبہ اپنے ملبوسات دوبارہ ڈیزائن کیے، دوپٹوں کو رنگوا کر رنگ بدلے، ربن لگائے۔ کپڑے ڈیزائن کیے کہ وہی پیسے جو بلاوجہ نئے لباس بنانے پر لگانا ہیں، کسی ضرورت مند کے کام آجائیں گے۔ کامیابی یہ تھی کہ میری بیٹی اتنی ہی رفتار سے اس مادیت کی کششِ ثقل سے نکل گئی جس سے جہاز کرۂ ارض سے آزاد ہوتا ہے۔ یہ احساس مجھے راحت دینے لگا کہ وہ ایک جھونپڑی میں بھی خوش رہ سکتی ہے۔ اسے پبلک ٹرانسپورٹ سے یونیورسٹی جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

••

بابا جان، تایا جان اور ابا جی نے اپنے خاندان میں آنے والی بہوؤں پر تعلیم اور ملازمت کے دروازے کبھی بند نہیں کیے۔ انھوں نے ثابت کیا کہ بہو صرف آپ کے برتن مانجھنے اور غسل خانوں کے فرش رگڑنے اور خاندان بھر کے کپڑے استری کر کے دینے یا گھڑی کی سوئیاں دیکھ کر گرما گرم روٹی پکا کر دینے کے لیے خادم بن کر نہیں آتی بلکہ وہ آپ کی نسل کی تعلیم و تربیت کے لیے اپنی صلاحیتیں استعمال کرتی ہے۔ تایا جان کا دواخانہ اور پھر ہسپتال بنانے کی بھرپور کوشش اور ابا جی کا ایک

چھوٹے سے گھر سے شروع کیا ہوا سکول جس کی بنیادی اینٹ ابا جی کے مبارک ہاتھوں سے لگی اور ہم سب نے اس میں پڑھا۔ دسویں جماعت کے بعد ابا جی نے میری ڈیوٹی لگائی کہ بچوں کو خود نظمیں لکھ کر دو۔ ابا جی نے مجھ سے گنتی کی نظمیں اور حروفِ تہجی کی نظمیں لکھوائیں۔ ڈرامے لکھوائے۔

جب انھیں شکایت پہنچتی کہ آپ کی صاحبزادی پہلے بچوں کے ساتھ کھیلتی رہی اور پھر چودھری فیروز کی کوٹھی کے آم کے درخت پر چڑھ گئی اور شاگردوں سمیت کیریاں کھاتی پائی گئی تو انھیں غصہ آنے کے بجائے ہنسی آ گئی۔ کہنے لگے میری بیٹی پیدائشی معلمہ ہے۔ وہ جہاں چاہے پڑھا سکتی ہے۔ بس مسئلہ یہ ہے کہ میری بیٹی کی تعلیمی منزل فی الحال بہت آگے اور بہت دور ہے۔

ابا جی کو شاید یہ توقع تھی کہ میں ڈنمارک جاتے ہی زبان سیکھ کر فوراً یونیورسٹی کی تعلیم شروع کر دوں گی۔ لیکن انھیں یہ علم نہ تھا کہ ہر خاندان کی ترجیحات مختلف ہوتی ہیں۔ ابا جی کی طرح بنیادی اکائی رکھ کر چبوترے تیار کر کے دینے والی منزل ناپید ہو چکی ہے۔ اب ریڈی میڈ رجحانات ہیں جن میں صرف ذاتی مفاد دیکھا جاتا ہے۔ ابا جی کو وقت پر تعلیم حاصل کرنے اور مکمل کرنے کی دھن لگی رہتی کہ بچے اپنا تعلیمی وقت ضائع نہ کریں۔ چوبیس پچیس برس تک پروفیشنل تعلیم مکمل کریں اور شادی کر کے عملی زندگی کا آغاز کریں۔ جس قدر جلد ممکن ہو بچوں کی رہائش کا بندوبست ہو تا کہ وہ خود مختار زندگی گزارنا سیکھیں۔ عام روایتی والدین کے برعکس جب ان کے بیٹوں کے گھر بنتے اور وہ ان میں منتقل ہوتے تو ابا جی بہت خوش ہوتے۔

••

امی جی میری اور بچوں کی ایک ایک چیز سنبھال کر رکھتیں۔ بڑے تولیے، میرے ان سلے کپڑے، جوتے، پرانے ہیئر برش سب بیگ میں ڈال کر سنبھال دیتیں۔ ان کے جانے کے بعد لاکھ سب نے کہا کے اٹیچی کھول کر دیکھ لو، امی جی نے آپ کی چیزیں رکھی تھیں۔ میرا جی ہی نہیں چاہا کہ امی کے ہاتھوں سے تہہ کیے کپڑے کھولوں۔ میں نے کہا فی سبیل اللہ دے دو یا جو مرضی کرو۔ مجھے کچھ سروکار نہیں۔ مکانوں کے مکین چلے جائیں تو یہ مال و اسباب کس کام کا۔ پھر نجانے کس کس نے وہ صندوق کھولے اور بے جان چیزوں کا کیا ہوا، کچھ علم نہیں۔

••

عالیہ کو میڈیکل میں داخلہ ملا تو امی جی نے سب کے لیے تحائف خریدے اور نواسی کے لیے ایک لاکٹ سیٹ بھائی کو دیا جو فیملی سمیت یورپ کے دورے پر آ رہے تھے۔ فرانس اور جرمنی

تک پہنچے تو گرمی کے ہائی سیزن کی وجہ سے ڈنمارک کی سیٹیں نہ ملیں۔ وہ تحائف وہیں جرمنی میں دوست کے پاس چھوڑ گئے جو دو سال وہیں پڑے رہے اور جب ان کے جانے کے بعد میں ہائیڈل برگ گئی تو واپسی پر اسی طرح پیک کیے ہوئے تحفے وصول کیے۔ خوبصورت رنگوں والے سوٹ، منقش گلدان، لکڑی کا خشک میوے رکھنے والا بڑا ڈونگہ اور عالیہ کا لاکٹ سیٹ، اُسامہ کا کرتا۔

مجھے یوں لگا امی جی آج بھی وہیں کہیں موجود ہیں اور ابھی فرمائش کریں گی کہ ذرا یہ پہن کر بھی دکھا دو۔ ابا جی حسبِ عادت اخبار ہٹا کر دیکھیں گے اور تبصرہ کریں گے: تم عورتوں کو سوائے کپڑوں کے اور کچھ نہیں آتا۔

بڑے بھائی جان کی شادی پر جب کپڑوں پر گفتگو ہوتی تو ناراض ہو کر کہتے، ''کتنا وقت اور پیسہ ضائع کرتی ہیں عورتیں۔ بس ایک تھیلے میں دو جوڑے ڈالو اور نکاح کر کے بچی گھر لے آؤ۔ بچوں کی زندگیاں سہل کریں۔''

امی جی نے آرام سے کہا، ''ٹھیک ہے۔ آپ تھیلے میں دو جوڑے ڈال کر جائیے۔ پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔''

کہنے لگے، ''اگر عورتیں چاہیں تو وہ ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہیں۔ وہ نکاح کی آسانیاں پیدا کر سکتی ہیں۔ ریاکاری، اسراف، دکھاوا سب ختم ہو سکتا ہے اگر صرف عورتیں 'لوگ کیا کہیں گے' کے غم سے نکل آئیں۔''

کپڑے بنوانے کے خبط میں سب سے زیادہ عتاب میرے حصے آتا۔ میں کپڑے ڈیزائن کرتی رہتی۔ دوپٹوں پر کروشیے کی پٹی، ان میں موتی پرونے، ربن لگانے، رنگوں کے بارڈر ڈالنے اور فیتے لگوانے کی فکروں میں رہتی۔ پھر ہم رنگ جوتے، جیولری کی باری آتی۔ میں چوڑیوں کے ڈبے چھپا کر الماری میں رکھ دیتی۔ مشاعروں کی تیاریاں چپکے چپکے زیرِ زمین عسکری تیاریوں کی طرح ہوتی رہتیں اور تصاویر کے البم میری الماری میں مقفل ہو جاتے۔ یہ واحد شوق اور مشغلہ تھا جس پر میں نے کبھی سمجھوتہ نہ کیا اور ڈانٹ ڈپٹ سنتی رہتی۔ لیکن اللہ نے عالیہ کی صورت میں ابا جی کو اپنی مرضی کا انسان دے دیا۔

••

میں نے زندگی میں بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ ذرا سی بات پر فوراً وضاحت مانگنے چل نکلتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو پیشہ ورانہ زندگی میں بھی بے صبری اور بااصول ہونے کے نام پر ذرا سی بات کا

بتنگڑ بناتے دیر نہیں لگتی۔ مجھے بے شمار دوسری باتوں کی طرح احساس ہی نہ ہوا کہ کب میں نے اپنے بچوں کے ساتھ اسی خاموش برتاؤ کو اپنایا۔ ایسے ہی ایک مرتبہ میں کسی بات پر اپنے بیٹے کے ساتھ خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ وہ کہنے لگا امی جی، مسلمان کا دوسرے مسلمان سے ناراض رہنا منع ہے۔ میں نے جواباً اسے بتایا کہ شرعی طور پر تین دن ناراض رہا جاسکتا ہے۔ اس کے وکیل ماموں نے فرمایا:

''بیٹا تین دن کے بعد میعاد کی توسیع کی جاسکتی ہے، اچھا نہیں کہ اماں خاموش ہے؟''

''نہیں ماموں، یہ خاموشی زیادہ پریشان کرتی ہے۔'' پھر اس نے اپنے دلائل جاری رکھے اور میری گود میں گھستا ہوا آخری حربے کے طور پر کہنے لگا۔ ''چلیں نہ بولیں، لیکن معانقہ اور مصافحہ تو منع نہیں۔''

ایک اہم بات جو میں نے ابا جی اور امی جی سے سیکھی وہ بلاوجہ دوسروں سے سوال کرنا یا خواہ مخواہ کی معلومات لینے والی فضول باتوں سے احتراز تھا۔ بہت سے لوگ اب یہ سمجھتے ہیں کہ میری یہ عادت یورپ میں طویل عرصہ رہنے سے ہے، لیکن ایسا قطعی نہیں۔ یہ انداز میں اپنے زادِراہ میں ساتھ لے کر گئی تھی کہ جو جتنا مناسب سمجھے گا آپ سے تذکرہ کر دے گا۔ جس کا ذکر دوست احباب نہیں کرتے اس کا پوچھنا بھی نامناسب ہے۔ اور پھر بات سن کر آگے بڑھا دینے سے ان دونوں کو شدید نفرت تھی۔ شاید ابا جی کی پیشہ ورانہ تربیت بھی ایسی تھی کہ جس کے مسائل جہاں سے سنتے انھیں وہیں دفنا دیا۔ نہ فضول سوال کرنا، نہ کھوج لگانا، بلاوجہ ہر بات کا سبب پوچھنا، یہ ان کی سرشت میں شامل ہی نہیں تھا۔ اور وقت نے بتایا کہ ایسا بااصول انداز وقتی طور پر کیسا ہی پریشان کن ہو، انجام ہمیشہ بخیر اور پرسکون ہوتا ہے۔ کسی بھی رویے پر فوراً سوالیہ نشان لگانا یا چراغ پا ہونا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ خود کو بھی وقت دیں اور دوسروں کو بھی دوبارہ سوچنے اور ازخود اپنے رویے پر نظرِ ثانی کرنے دیں۔ ایک مرتبہ سوالات اور تفتیش کی تلوار نیام سے باہر نکل آئی تو وہ رشتے اور تعلق کی خونریزی کے بعد ہی واپس جائے گی۔ نظر انداز کرنا، لحاظ کرنا اور چشم پوشی سے کام لینا ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ لوگوں کو قرضہ دے کر حسبِ وعدہ واپس مانگنے سے انھیں پریشانی ہوتی، اور دوبارہ قرضہ دینے سے بھی باز نہ آتے۔

••

''بچی نے بی اے کر لیا ہے مولبی صاحب اور اب گھر بیٹھی ہے۔ کوئی مناسب رشتہ نہیں آرہا۔''

''اسے بی ایڈ کرائیں۔ رشتہ نہیں ہو رہا تو کیا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر بیٹھ جائے؟ شام کو بچوں کو ٹیوشن پڑھائے'' ابا جی نے حسبِ عادت بے لاگ بات کہی۔ کچھ عرصے بعد وہ خاتون پھر

نمودار ہوگئی، ''ہم راجوں سے باہر شادی نہیں کرتے۔ ایک رشتہ تو ہے جی لیکن وہ سعودی عرب رہے گا۔ بیوی کو ساتھ نہیں لے جاسکتا لیکن دو سال میں ایک مرتبہ آجایا کرے گا۔ اس کی بوڑھی والدہ ہیں۔ گھر اپنا ہے۔ یہ ان کے ساتھ رہے گی۔ آگے پیچھے کوئی ہے نہیں۔ سب بہت ''سوکھے'' (آسودہ حال) ہیں۔ تسیں کیہہ کہندے او؟'' (آپ کی کیا رائے ہے)

ابا جی خاموش ہوگئے۔ ہر بات اور مسئلے پر اپنی فوری رائے دینے والے ابا جی نے اسے کہا، ''میں سوچتا ہوں۔ بس یہی رشتہ ہے یا کوئی اور طلب گار بھی ہے؟''

''بس یہی سب سے اچھا اور سوکھے (آسودہ) گھر کا ہے جی۔''

اس دن میں نے ابا جی کو بہت مضطرب دیکھا۔ مجھے بعد میں امی جی نے بتایا کہ ابا جی اس سے براہِ راست کھل کر بات نہیں کر سکے لیکن انھوں نے امی جی سے کہا، ''اسے بٹھا کر سمجھائیں کہ کوئی دو وقت کی روٹی کماتا اور محنتی لڑکا دیکھ کر شادی کریں تا کہ وہ بچی ایک ساتھی اور ایک مرد سے عقد کے رشتے میں باندھی جائے۔ ایک بوڑھی ماں کے گھر سے اٹھ کر دوسری بوڑھی کی آیا گیری کرنے کو شادی نہیں کہتے۔ شرع میں شرم کی گنجائش نہیں اور مسئلے میں حیا کو مانع نہیں ہونا چاہیے۔ میں ایسی تمام شادیوں کے خلاف ہوں جہاں تمام ضروریات کا ضامن سمجھ کر ایک جوان بچی کو، نکاح کے نام پر دس دن کے دولھا کے ساتھ رخصت کر دیا جاتا ہے۔ دس دن بعد یا مہینے بعد دولھا واپس چلا جاتا ہے اور بچی زیورات الماری میں بند کر کے خادمہ، اور پھر اگر ماں بن جائے تو نئی صورت میں خادمہ بن جاتی ہے۔ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اور آنے والے وقتوں میں جو ہونے جا رہا ہے اس کی ابھی آپ کو سمجھ نہیں آئے گی۔ مرد کی ضروریات کے لیے قرآن سے چار شادیوں کی گواہی لانے والے، جوان بہن کو اور بیٹی کو جائیداد ہاتھ سے جانے کے خوف سے گھر بٹھا لیتے ہیں یا رشتے میں ذرا اونچ نیچ پر اسے ایک سیاسی ہتھیار کی طرح اپنے گھر لا کر قید کر دیتے ہیں۔ اور آخری صورت ''باہر'' کے رشتے ہیں۔ سال یا دو سال بعد شوہر آتا ہے۔ اپنی غیر موجودگی میں پیدا ہونے والے بچے کو کھیلتا اور بھاگتا دوڑتا دیکھتا ہے۔ ایک مہینے کا اضافی راشن پانی دیتا ہے اور چھٹی۔''

مجھے تب ابا جی کی باتوں کی سمجھ نہیں آئی۔ ابا جی کے مریض کم ہیں اور آپ بیتیاں سنانے والے زیادہ ہیں۔ میں نے تنگ آ کر سوچا۔ روزانہ کوئی نہ کوئی اپنی کہانی لے کر آجاتا ہے۔ ہر دوسرے دن کوئی مشورہ مانگنے چل پڑتا ہے۔

اس مسئلے کی سنگینی اور کہانیوں کے اندر سلگتے حقائق کا اندازہ مجھے تب ہوا جب میں نے

ڈنمارک میں عورت اور ازدواجی زندگی (میں نے لفظ ازدواجی یہاں ثقافتی وضاحت کے لیے استعمال کیا ہے) اصل موضوع ''عورت اور اس کی جسمانی وجنسی ضروریات اور مختلف معاشروں میں ان کا اظہار یا مکمل حل کیا ہے؟'' کے سلسلے میں ایک گروپ کے ہمراہ تحقیق شروع کی۔ اقدار، اعداد و شمار اور ثقافتی حالات کے جو منظر نامے پیش کیے گئے ان سے چند دن تو میری آنکھوں پر سے پٹی ہٹتے لگے، پھر اندھیرے سے یک لخت تیز روشنی میں آنے کا دھچکا بھی شامل تھا۔ عرب، ترک، پاکستان، اور ڈینش عورتوں پر مشتمل اس گروپ میں چشم کشا کھری کھری باتیں تھیں۔ ڈینش خواتین کا موقف تھا کہ عورت کو شعور حاصل ہوا، آزادی ملی، فیصلے کا حق ملا تو اسے اپنے ساتھی کے بغیر رہنے کی عادت بھی سیکھنا پڑی۔ کرسمس کی چھٹیاں اور گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے بوائے فرینڈ کی تلاش، اقتصادیات کے مسائل حل ہونے کے بعد ازدواجیات کے مسائل کا آغاز ہوا۔

مشرقی ممالک میں زبردستی کی شادیاں اور ایک چھت کے نیچے علیحدہ خواب گاہیں، یورپ میں خاوند بھیجنے کے بعد اپنے ملک میں ان کا انتظار کرنے والی سہاگنیں، مجھے فیض کی نظم یاد آ گئی۔

''ان حسیناؤں کے نام،
جن کی آنکھوں کے گل
چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بیکار کھل کھل کے
مرجھا گئے ہیں
ان بیاہتاؤں کے نام
جن کے بدن
بے محبت ریاکار سیجوں پہ سج سج کے اکتا گئے ہیں
بیواؤں کے نام''

اب اباجی کی رمزیہ گفتگو بھی سمجھ آنے لگی کہ اللہ نے آدم کا جوڑا حوا سے پیدا کیا ہے۔ آدم کو اس کے ماں باپ سے پیدا نہیں کیا۔ حوا نے اولاد پیدا کی لیکن وہ آدم کا پہلو بھلا نہ سکی۔ میں اس لمبے چوڑے میز کے کونے والی کرسی پر بیٹھے اباجی کو سوچتی رہی۔ وہ دن مجھ پر حیرتوں کے دروازے کھول رہا تھا۔ اباجی دین کے دخل دیے بغیر جو بات کہہ رہے تھے اس میں کتنی حکمت تھی۔ مجھے آج بھی یہ بات شدید متاثر کرتی ہے کہ اباجی بلاتفریق و امتیاز سیدھی سادی مذہبی بات کرتے تھے۔ وہ جو بات کہتے، مدلل اور مستحکم لہجے میں کہتے۔ انھیں اس بات سے شدید اختلاف تھا کہ بچوں

کی شادیاں بلاوجہ تاخیر سے کی جائیں یا ان کے رشتوں کے ذریعے سودے بازی کی جائے۔ خاندان یا معاشرے کی سیاست کی بازی بچھا کر بچوں کو مہروں کی طرح ان پر چلا جائے۔ اور پھر جب مفادات کی میز پر رشتوں کے معاملات طے ہوجائیں تو بیٹا نکاح کے بول کی مقدس زنجیر میں ایک کولھو کا بیل باندھ کر لے آئے۔ والدین کو ایک خادمہ مل جائے اور بیٹا واپس ولایت سدھار جائے۔ اب اس ملازمہ کو ذہنی طور پر تیار کر دیا جائے کہ بس آسائش کی زندگی گزارو۔ کپڑے، گہنے، گاڑی، سنگھار سب حاصل ہے لیکن ان کو دیکھنے اور سراہنے والا دو سال بعد ہی آسکے گا۔

مجھے کبھی ابا جی کی ان باتوں کی سمجھ نہیں آئی۔ لیکن جب لندن میں مہاجرین اور غیر قانونی پناہ گزینوں کا مسئلہ شدت پکڑ گیا اور ان کو ملک سے نکالنے اور چھاپے مارنے کی نوبت آ گئی تو میڈیا بھی اس مسئلے کے نئے سماجی پہلو کھودنے لگا۔ یہ لڑکے یا مرد جو ولایت میں گزشتہ آٹھ دس سال سے غیر قانونی طور پر مقیم ہیں، ان کی بیویاں اور بچے کیسے گزارا کرتے ہوں گے۔ یورپ کی آزاد فضائیں ان مردوں کی تمام ضروریات پوری کر دیتی ہیں لیکن ان کی بیویاں کیسے زندگی گزارتی ہوں گی؟

ہر مہینے منی آرڈر وصول کر کے سماجی زندگی کے تمام تر تقاضے اور سختیاں تنہا برداشت کرتے ہوئے ان کا سامنا کیسے کرتی ہوں گی۔ ہوسکتا ہے ان صفحات پر یہ مسئلہ ایک غیر ضروری اور غیر اہم دکھائی دیتا ہو لیکن فی الحقیقت اس کی جڑیں بہت گہری ہیں اور علماء کو حقوقِ نسواں کے بل کی مخالفت کرنے سے کہیں پہلے عورتوں کے اس بنیادی مسئلے کی طرف نگاہ کرنی چاہیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوجیوں کے لیے ہر چار مہینے کے بعد چھٹی لازم کیوں کی تھی۔

یورپ کے اس احتجاج کو بآوازِ بلند برا بھلا کہنے والوں کے لیے بے انتہا ضروری ہے کہ وہ غور فرمائیں کہ اسلام جلد شادی کر دینے کے حق میں کیوں ہے۔ مغرب اس بات کو کھلم کھلا تسلیم کرتا ہے کہ بچوں کی جسمانی زندگی میں آغازِ بلوغت کے ساتھ ہی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس نازک وقت میں والدین اور معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ ان کو آگہی دے۔

مجھے درس و تدریس کی زندگی میں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا کہ بچوں کو جو جنسی تعلیم دی جاتی ہے وہ دراصل کیا ہے اور بچوں کے لیے کس طرح سود مند ہے۔ اس تعلیم کا مطلب نوجوانوں کو شعور دینا ہے کہ کس طرح انھیں اپنے بدن کی حفاظت کرنا ہے۔ یہ صرف اس آگہی سے شروع ہوتی ہے کہ بچے اپنے جسم کو کوئی پراسرار، شرمناک اور بے ہودہ چیز نہ سمجھیں۔ اس کے افعال

کو جانیں۔ صنفِ مخالف کا بدن ان کے لیے چیستان نہیں بلکہ انھیں پیشہ ورانہ انداز میں شعور دیا جاتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

بچوں کی جنسی زندگی چونکہ آغازِ بلوغت سے شروع ہوتی ہے لہٰذا ان کو حفاظتی تدابیر سے آگاہ کیا جائے تاکہ وہ جنسی حملوں اور بیماریوں سے بچ سکیں۔ اکثر مسلمان والدین سکولوں میں احتجاج کرتے ہیں کہ یہ ہم مسلمانوں کے مسائل نہیں ہیں لہٰذا ہمارے بچے جنسی تعلیم کے پیریڈ میں نہیں جائیں گے جب کہ اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ صرف بچیاں ہی نہیں بلکہ لڑکے بھی اس ظلم کا شکار ہوتے ہیں اور آگاہی نہ ہونے کی وجہ سے خاموش رہتے ہیں اور اندر ہی اندر خفتہ آتش فشاں پہاڑ میں جنون کا لاوا بپھرتا رہتا ہے۔ یہ مظلوم نفسیاتی مریض بن کر اپنی اور معاشرے کی تباہی کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر ساجدہ سے بات ہوئی تو کہنے لگیں ترتیب دیجیے ذرا ایک ٹی وی پروگرام۔ اور وہ بھی ٹی وی نساء پر تاکہ ان کو بتایا جائے کہ مسلمان ممالک میں ایڈز کی شرح کیا ہے۔ اور جیسے ہولناک جنسی امراض وہاں ہیں، اہلِ مغرب اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ میت سے زیادتی کے بعد شوہر حضرات وہ تحفہ اپنی خوابگاہ میں لے گئے۔ ازدواجی وظائف ادا کر کے جنت کماتے ہوئے مجازی خدا نے گھریلو عورت کو بھی ایک ناکردہ جرم کی سزا میں شامل کرلیا۔ اس کو وہی امراض لاحق ہوئے۔ مرد کی جنسی بے راہروی کی قیمت گھریلو بیوی اور بچے بھی ادا کرتے رہے۔ جنسی آگاہی سے کم از کم گھر میں دائمی ساتھی تو نئی نسل تک وہ عذاب منتقل نہ کرے۔ ایسے مومنین جب نفسِ امارہ کے بے لگام گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے اندھا دھند ہوس کی شاہراہ پر گامزن ہوں تو ان کا خریدا ہوا فریقِ ثانی تو اس عذاب سے محفوظ رہے۔

میں ساجدہ کو اباجی کی کئی باتیں بتاتی تو وہ کہتیں صدف مرزا تمھاری سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ تمھارے والد اپنے وقت سے بہت آگے کی سوچ رکھتے تھے اور پھر اس سوچ کو آواز بنا دینے کی جرات بھی رکھتے تھے۔ کتنی عورتیں ہیں یہاں مغربی دنیا میں جن کے باپ اور بھائی ان کے کندھے پر بازو پھیلا کر کھڑے ہو جائیں؟

••

ایک اور باجی ہمارے گھر وارد ہوئیں۔ ان کے شوہر مڈل ایسٹ کے کسی ملک میں تھے اور وہ ان کی دوسری منکوحہ تھیں جس کو پہلی بیوی اور وارثین سے چھپایا گیا تھا۔ سرخ وسفید جھلمل

کرتے رنگ بقول امی جی کے ''لاٹاں ماردا حسن'' یعنی حسنِ ضوفشاں کی مالک وہ لڑکی اپنے کسی رشتے دار کے توسط سے 'ماماں جی' کے پاس آئی تھی۔ سکول واپسی پر علم ہوا کہ آپ کی ایک باجی آئی ہیں جو چند دن یہاں رہیں گی۔ ان کا خیال رکھنا ہے۔ مجھے اس کی کھنکھتی چوڑیوں کے ساتھ آنکھوں میں بھر بھر کر ڈالا گیا کھنکھتا سرمہ بہت اچھا لگتا۔ وہ واحد بھانجی تھی جو روتی بسورتی نہیں آئی تھی ورنہ تو پہلے ہدایات جاری ہوتیں کہ باجی بے چاری بہت پریشان ہیں، ٹرٹر نہ کرنا اور پہلے ان کو کھانے کی ٹرے دینی ہے۔ میں سکول سے واپس آکر اندر کمرے میں ان کے ساتھ بیٹھی رہتی۔

''موبلی صاب! (وہ گاؤں کے لوگوں کی دیکھا دیکھی ابا جی کو موبلی صاحب ہی کہتی) میں فیصلہ نئیں لینڑا، مینوں جتھے رکھسن، رہ لیساں'' (میں نے فیصلہ نہیں لینا مجھے جہاں رکھیں گے رہ لوں گی)۔

مجھے اس فیصلہ لینے کی سمجھ نہیں آئی۔ میں نے ابا جی کو اس کی جنگ لڑتے دیکھا۔ اور مجھے یاد ہے کہ انھوں نے کہا یہ مظلوم مخلوق فیصلہ کرنے کے قابل کہاں ہے۔ یہ تو دوسروں کے فیصلے سے ہراساں رہتی ہے۔ لیکن مجھے اس وقت یہ سمجھ نہیں آتی تھی کہ اتنی خوبصورت لڑکی نے ایک دوسری عورت کے شوہر سے شادی کیوں کی۔ دو عورتوں کا مشترکہ شوہر جس پر پہلی بیوی اور خاندان کا خوف بھی سوار تھا، جو بچوں سے بھی خائف تھا اور جس کی نئی بیوی کی چوڑیوں کے ساتھ اس کی آنکھوں کا کجرا بھی کھنکتا تھا، جو اپنے شوہر کی تمام تر شرائط اور مجبوریوں کے ساتھ سمجھوتہ کر کے بھی رہنے کو تیار تھی۔ مجھے کبھی ایسی عورتوں کی سمجھ نہیں آسکی۔ شرعی طور پر سب جائز تھا لیکن معاشرتی طور پر خودکشی تھی۔ ایسے کرداروں کی اپنی مختلف کہانیاں ہوتیں۔ کسی کو تحفظ اور پناہ درکار تھی، کسی کو خاندان کے گھٹے ہوئے ماحول سے فرار حاصل کرنا تھا، اسے یہ محدود آزادی بھی غنیمت لگتی۔ بہت عرصے بعد جب میں نے یونانی اساطیر کا مطالعہ کیا تو دیوتا زیوس کے کردار نے میری یہ ذہنی گرہ بھی کھول دی۔

آسمانی دیوتا اپنی پہلی بیوی ہیرہ کے ساتھ بھی ازدواجی زندگی گزارتا اور عیاشی کے لیے دوسری دیویوں اور انسانوں کی بستی سے جو اسے پسند آجاتیں، ان سے بھی تعلق رکھتا، ماں بنا کر ان کے قدموں میں زنجیر ڈالتا، اس کی بیوی اپنے دیوتاؤں کے دیوتا شوہر کو نکیل ڈالنے کی کوششوں میں ناکام ہو کر اس کی ہوس کا شکار ان مظلوم محبوباؤں کو سخت سزا دیتی۔ میں نے ڈینش شاعرات پر کتاب لکھتے ہوئے اس موضوع کا احاطہ کیا ہے۔

ایسے ہی واقعات نے میرے ذہن میں ایک نگار خانہ سجا رکھا ہے اور شاید یہیں سے میرے اندر کہانی کار نے جنم لیا۔ گاؤں کی معصوم بچیوں کے ساتھ دوسری شادی بلکہ خاموشی سے

نکاح کر کے، شرع کے نام پر عیاشی کرنے کے بعد اپنے نام اور نکاح کی قید چھوڑ جانے والے شہری بابو کسی شہر کی طرف جا بستے یا اس دھوکہ دہی کی فوج کے کسی اگلے مورچے کو چل دیتے، یا پہلی بیوی اور اس کے خاندان کے عتاب سے بچنے کے لیے روپوش ہو جاتے۔ ان کی چھوڑی ہوئی بے سہارا بیویوں کی مدد کے لیے ابا جی خود بھی ہلکان ہوتے بلکہ بھائیوں کی دوڑ بھی لگوائے رکھتے، ''فلاں کا کیس دیکھ لو، فلاں کو سکول میں کوئی نوکری دے دو، فلاں کو پرائیویٹ امتحان دلوا دو۔ اچھا وہ بچی نالائق سہی، اسے تفریح کے وقت سکول کی کینٹین پر کھڑا کر دینا۔'' شاید ابا جی نے اسی لیے بیٹوں کو وکالت پڑھانے کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

••

میں مصنوعی معصومیت طاری کر کے پوچھتی، ''امی جی، اس سارے ریوڑ میں کتنے آپ کے اپنے اصلی بچے ہیں اور کتنے بچے فلاں فلاں رشتے دار کے ہیں جو خوفِ خدا اور انفاق فی سبیل اللہ کے پروں تلے دبا کر رکھے ہیں۔''

امی جی تپ کر بولتیں، ''تیرے علاوہ سب میرے ذاتی بچے ہیں۔''

''ابا جی۔۔۔!'' میں نے ادب آمیز بے چارگی سے کہا، ''آپ کا بس چلے تو ہر گلی میں ایک سکول اور ایک پناہ گھر آمنے سامنے کھل جائے۔''

ابا جی نے اپنی کسی بھانجی کی کوئی عرضی لکھتے لکھتے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا، عینک اتاری، اپنی تیکھی ناک کو رومال سے صاف کیا، پھر کے شیشے صاف کیے، اور آہستہ سے بولے...

''میرا بچہ، میرا بس چلے تو ہر گھر ایک مدرسہ اور جائے پناہ ہو۔''

پچھلے سال جب یورپ میں مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ اٹھا تو آئس لینڈ کی ایک شاعرہ کی تحریک پر ہزاروں شہریوں نے ایک ایک مہاجر کے لیے اپنے گھر کے دروازے کھولے اور ان کی مکمل ذمہ داری اٹھائی۔ میں روزانہ وہ رپورٹیں دیکھتی رہی، میزبانوں کے خوشی سے تمتماتے چہرے، ڈرے سہمے، لٹے پٹے مہاجرین کی بے یقین آنکھیں اور فاقہ زدہ چہرے سکرین پر جھلملاتے رہے اور مجھے ابا جی کہیں دور کھڑے مسکراتے دکھائی دیے۔ مذہب، ملت، رنگ، نسل، زبان، زمان و مکان سے ماورا گھر کے دروازے دکھی انسانیت پر کھولتے سب لوگ ایک ہی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان پرجوش چہروں میں مجھے ابا جی کا چہرہ دکھائی دیتا رہا۔ کیسی بشاشت ہوتی ان کے چہرے پر جب گھر میں مقیم کسی بھی مہمان کو سب سے پہلے کھانے کی ٹرے دی جاتی، گلاس میں برف ڈال کر پانی ساتھ

رکھا جاتا، یا بھاپ اڑاتی چائے کی سادہ سی پیالی چھوٹی سی پلاسٹک کی ٹرے میں رکھ کر پیش کی جاتی۔

••

ابا جی نے اپنی ایک مریضہ کی شادی اپنے ایک دوسرے مریض سے کرا دی۔ مریضہ صاحبہ کے بچے نہیں ہو رہے تھے اور اس جرم میں ان کو گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ میکے آ کر بقا کی جنگ لڑنے لگیں اور بھائیوں، بھابیوں اور بھتیجوں کی خدمت میں جت گئیں۔ ادھر ایک دوست صاحب سعودیہ سے واپس آئے۔ شریکِ حیات چھوڑ کر عدم کو روانہ ہو چکی تھیں اور اولاد اپنی زندگی میں مگن ہو چکی تھی۔ وہ تنہائی کا شکار تھے۔ ظاہر ہے مرد کو تنہائی زہریلے ناگ کی سی لگتی ہے جب کہ اس کے گرد و پیش میں نجانے کتنی خواتین یہی زہر پی کر زندہ ہوتی ہیں۔

ابا جی نے فوراً مشورہ پیش کیا کہ آپ اس مریضہ سے نکاح کر لیجیے اور پھر اس پر تجویز پر عمل کروا کر دم لیا۔ مریضہ کے بھائی بہت نالاں تھے کہ جہاں چالیس برس کٹ گئے باقی عمر بھی کٹ جاتی۔ اب اس عمر میں یہ نئی حرکت کرا دی مرزا صاحب نے۔ ابا جی بڑے آرام سے بولے، ''وہ شوہر دیدہ خاتون ہے۔ اسے ولی کی اجازت کی ضرورت تو نہیں لیکن اگر بھائی سر پر ہاتھ رکھ کر رخصت کریں تو یہ عمل کارِ ثواب میں بدل جائے گا۔''

امی جی کبھی ان کاموں سے تنگ نہیں آتی تھیں۔ فلاں نے بیوی کو نکال دیا ہے۔ چلو چند دن یہاں رہ لو۔ فلاں کا شوہر اسے ماں سے ملنے نہیں دیتا۔ چلو ہمارے گھر آ کر مل لو۔ یہ بچھڑے ہوؤں کو ملتے دیکھنا عام سا ہی ڈرامہ تھا جو مجھے کبھی اچھا نہ لگتا کیونکہ مجھے اس جبر کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ پھر اسے تسلیم کر لینا اور جابر کو روکنے کے بجائے درمیانی راستے نکالتے رہنے میں کیا مصلحت ہے بھلا۔ سمجھوتے کے یہ راستے زندگی نے سکھائے جب میں نے یورپ میں رہتی دیسی عورت کو گھر کی چھت کے نیچے رہنے کے لیے اسی پرانے جبر کو برداشت کرتے دیکھا۔ یہی کردار میرے افسانوں کے موضوع ہیں۔

••

میری پہلی اور بے حد لاڈلی بھتیجی ماہ نور ایک دن گھر آئی اور حسبِ معمول ماں کو سکول کی روداد سنانے لگی۔ اس کی جماعت میں گھر کے ماحول پر بات چیت ہو رہی تھی۔ کچھ بچیوں نے بتایا کہ گھر میں پہلے ہمارے بھائی کھانا کھاتے ہیں، پھر بعد میں ہم امی کے ساتھ کھاتی ہیں۔ ظاہر ہے ماہ نور کو یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ بے چاری بہت سوچ سمجھ کر کہنے لگی، ''میرا خیال ہے وہ لوگ مسلمان نہیں ہوں گی۔''

ماہ نور میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے بتایا،''آپ کے دادا ابو، ابا جی کے چھ بھائی تھے۔ ہر ایک کثیر العیال تھا۔ برطانیہ والے چاچا جان کے علاوہ ہر ایک کے گھر بیٹیوں کی ہی کثرت رہی۔ سب کے ہی چھ چھ بیٹے بھی ہوئے۔ میں اگر اپنا بچپن یاد کروں تو میں نے بچپن زیادہ تر بھائی لوگوں کے ساتھ گزارا۔

چچا جان شفیع کے صرف بیٹے تھے، چچا جان نذیر کے بھی چھ بیٹے تھے۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی پڑھنے کی غرض سے ہماری طرف بھیج دیا جاتا۔ میں نے ان سب سے مل کر بہت دادا گیری کی، دھاندلی کی، من مانی کی، لڑائیاں کیں، لیکن ہمیشہ یہی سنا، چلو کوئی نہیں چھوٹی بہن ہے، پہلے اسے رسالہ دے دو، چھوٹی ہے۔ کھانے پینے میں بھی ابا جی کا موقف تھا کہ بچیوں کی خوراک ابتدا سے ہی بہت اچھی ہونی چاہیے کیونکہ اللہ نے ان کو جسمانی طور پر ایک خالق بنا کر پیدا کیا ہے۔

''ہمیں قدرت نے مسلسل بھتیجوں سے نوازا'' میں اسے کہانی کی طرح سنا رہی تھی جیسے چچا جان مجھے اپنے بچپن کی داستان سنایا کرتے تھے،''مجھے یاد ہے جب سات بھتیجوں کے بعد آپ پیدا ہوئی تھیں تو فون پر ابا جی کی کھنکھناتی آواز آج بھی میری سماعت میں محفوظ ہے...

''لو بھئی اس فقیر کو اللہ نے نواز دیا ہے، رحمتوں کا نزول ہوا ہے۔'' وہ نہایت انہماک سے سن رہی تھی۔ ایک دم خوشی سے بولی،''ہیں پھوپھو؟ واقعی دادا ابو نے ایسے کہا؟ پھر کیا ہوا؟''

میں نے اسے بتایا کہ پھر مبارک بادوں کا اور خوشی منانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ پھر جب فیاض بھائی کے گھر انیقہ پیدا ہوئی تو میں نے ابا جی سے کہا اس کا نام میں نے وہ رکھنا ہے جو اپنی بیٹی کا نہ رکھ سکی۔ انیقہ گوہر رحمان، نایاب موتی، لیکن جب انیقہ دو برس کی ہوئی تو اپنا نام''انیقہ گو بر مان'' بتاتی۔ ماہ نور ہنس ہنس کر بے حال ہوگئی۔

جب مجھے اللہ نے پہلے بیٹی سے نوازا تو کہنے لگے،''اللہ آپ پر بہت مہربان ہے۔ جس گھر میں پہلے بیٹی پیدا ہوتی ہے وہ رحمت، برکت اور نعمت ہوتی ہے۔ اس کی اچھی تربیت سے باقی نسل بھی سدھارنا مشکل نہیں ہوتا۔ عورت کی تربیت سے معاشرہ بدل دینے کا وقت ہے۔'' میں نے یہ بات پلو سے باندھ لی۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ کوئی بھی عورت اپنے باپ کا دستِ شفقت سر پر محسوس کیے بغیر مضبوط نہیں ہوسکتی۔ باپ کا دیا یقین اور اعتماد اس کی نسلوں میں چلتا ہے۔

عورت ہونا ایک بہت بڑی ذمہ داری اور بے پناہ اختیارات کا نام ہے۔ جس عورت کو قسمت تعلیم حاصل کرنے کے مواقع دیتی ہے اور اسے مہربان والدین کی مثبت تربیت بھی مل جائے تو

وہ فیصلوں کی بساط الٹنے کی قدرت رکھتی ہے۔ زندگی کے راستے خود منتخب کرتی ہے اور اس کی قیمت بھی ادا کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ بہترین مرد جنم دینے اور انھیں عورت کی عزت کرنا سکھا سکتی ہے۔ بیٹیوں کو وہ تمام مواقع دے سکتی ہے جس کی اسے اجازت نہ ملی۔ ساس کو اس عزت سے نواز سکتی ہے جو اس کی ماں کو نہ دی گئی، بھابی کو اپنے گھر میں پرسکون زندگی گزارنے کے اسباب کرسکتی ہے۔ ایک مضبوط عورت بہو کو ذہنی سکون دے کر مضبوط نسل کی بنیاد رکھ سکتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے معاشرہ آج بھی اسے بیٹی پیدا کرنے کے طعنے دیتا ہے۔ اسے اتنی استقامت نہیں دیتا کہ وہ اپنی ذات، خواب اور خواہش کی نفی کیے بغیر یہ جنگ لڑ سکے۔ مجھے عورت مرد کی اس پرانی کہاوتی جنگ پر کبھی یقین نہیں رہا کیونکہ ہمارے دانشور مرد کو صرف آدم اور عورت کو صرف حوا تصور کر چکے ہیں۔ دنیا میں قدم رکھنے والا ہر بچہ ایک باپ کا نام خون میں لے کر آتا ہے۔ ماں تو بدن کی ڈالی پر پھول کی طرح سجائے پھرتی ہے۔ بس یہ خون میں دوڑتا نام پہلا حوالہ ہے۔ جسے ہر عورت تاج کی طرح سر پر سجاتی ہے لیکن پھر معاشرہ اسے بتانے لگتا ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے پورے گلستان پر ایک شخص کو سرتاج بنائے، مجازی خدا سمجھے، اپنی شخصیت کا انہدام کر کے نہ صرف اس کا بلکہ اس کے خاندان کا دل جیتے اور جواب میں صرف ایک چھت کے نیچے رہنے کا معاشرتی رتبہ پائے۔ یہی سماجی جبر ہے جو پورے معاشرے کے ارتقا کو بننے نہیں دیتا کیونکہ اسے جواب میں کچھ نہیں دیا جاتا۔ اس کے تمام مواقع، ذہنی صلاحیتوں کا فروغ اور مزید علم و ہنر کی آموزش گھر اور بچوں کے نام پر رہن رکھ دی جاتی ہے جسے وہ اپنی ساری عمر کا سرمایہ اور بیگار کے بعد بھی پورا نہیں کرسکتی۔ ابا جی حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی مثال دیا کرتے۔ بچے، گھر، ذمہ داریاں کسی بھی عورت کا سفر روک نہیں سکتے۔

••

مجھے یقین ہے کہ میری شاعری کی حس کسی گنبد نما گھر میں گھٹ کر مرجاتی لیکن اطراف و جوانب کے پانیوں سے خنکی چرائے، بانہیں پھیلا کر آتی ہواؤں، کھلے آسمان کے سرگوشیاں کرتے چاند ستاروں اور تایا جان کے باغیچے سے کسی باغی کی طرح دیواریں پھلانگتی رات کی رانی کی خوشبو اور پھولوں سے لدے پودوں نے اسے زندہ رکھا۔ یقیناً پھولوں اور درختوں سے بھرے آنگن مہیا کرنے اور پھر تعلیم و تربیت کے لیے جان لڑا دینے کے لیے ابا جی جیسی روحیں کسی لمحۂ خاص میں تخلیق کی گئیں تھیں۔

••

کوئی اوڑھ کر اب زمیں سو گیا ہے

ان دنوں میری طبیعت کافی خراب رہتی تھی۔ کبھی خون تو کبھی پانی کی کمی ہو جاتی۔ ڈاکٹر نے تنگ آ کر ہسپتال منتقل کر دیا۔ ڈنمارک کے ہسپتال اور طبی سہولیات یورپ کی بہترین کارکردگی والی فہرست پر سرِ اول شمار ہوتی ہیں۔ میرے کمرے میں ٹی وی بھی لگا تھا اور کھڑکی باغیچے کی طرف کھلتی تھی جس سے صبح کے آثار نمودار ہوتے ہی چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں آنے لگتیں۔ ڈاکٹروں نے خون کی رپورٹس پڑھنے کے بعد فیصلہ کیا کہ مجھے مزید چند دن یہیں رکھا جائے اور مطلوبہ مقدار میں خون پانی دے کر ہی واپس کیا جائے۔ بقول میرے بھائی کے، تیل پانی چیک کر کے، سپیئر پارٹس ڈال کر واپس کیا جاتا ہے۔

جمعرات کی شب تھی۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ مجھے جیسے خواب میں محسوس ہوا کہ موبائل فون کی گھنٹی بے حد مدھم آواز میں بج رہی ہے۔ میں نے نیم غنودگی میں فون اٹھایا۔ دوسری طرف ابا جی تھے۔ بے حد نحیف آواز اور شاید انھوں نے کہا، ''وقت نہیں ہے میرے پاس۔ آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔''

ابھی چند ہی دن پہلے تو بات ہوئی تھی؟ تب تو بہت بہتر تھے؟ میرے سارے حواس یکلخت بیدار ہو گئے۔

''ابا جی! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ ابا جی!، ابا جی!'' لیکن لائن بے صدا ہو چکی تھی۔

میں نے واپس فون کرنے کی کوشش کی لیکن لائن نہیں ملی۔ پتہ نہیں کب دوبارہ نیند کی وادی میں چلی گئی۔ صبح مجھے خواب کی طرح یاد تھا کہ ابا جی سے بات ہوئی تھی میں نے احتیاطاً فون بھی چیک کیا کیونکہ اکثر درد کش ادویات کے زیرِ اثر سونے کی وجہ سے بات صحیح یاد نہیں رکھ پاتی تھی۔ صبح

کے ساڑھے تین بجے چند سکینڈز کی کال تھی۔ میں نے عالیہ کوفون کیا۔ بیٹا مجھے ملنے آؤ تو کالنگ کارڈ لیتی آنا۔ میں نے مختصراً اسے بتایا کہ ابا جی کا فون آیا تھا۔ اس نے فوراً سب کچھ ملتوی کیا اور گاڑی نکالی۔ پندرہ منٹ میں وہ میرے پاس موجود تھی۔ ڈاکٹر سے بات کی تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ آپ کسی صورت پاکستان نہیں جاسکتیں۔ میں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔

''مجھے کوئی نہیں روک سکتا، میں جاؤں گی اور اسی ہفتے کی فلائٹ لوں گی۔''

''میری بات سنو!'' ڈاکٹر نے آرام سے کرسی پر بیٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا، ''یہ دیکھو، تمھارے ہاتھ کی نس تو ملتی نہیں، ڈی ہائیڈریشن تمھیں رہتی ہے۔ پاکستان جا کر کیا بنے گا تمھارا؟ وہاں فوراً انفیکشن ہوجاتا ہے تم جیسے مریضوں کو۔ پہلے بھی تم وہاں سے غلط ڈرپ لگوا آئی تھیں تو ہمیں ہی سارا خون بدلنا پڑا تھا۔''

ڈاکٹر نے مجھے وہ خوفناک رات یاد دلا دی جب مجبوراً ایک ڈاکٹر سے ڈرپ لگوانا پڑ گئی اور اس کے بعد ہنگامی طور پر واپس ڈنمارک بھاگنا پڑا تھا۔ اب میں ضد کے بجائے لجاجت پر اتر آئی۔

''پلیز مجھے جانے دو۔ اب میں اپنی فیملی میں جا رہی ہوں۔ وہاں ہر طرح کے ڈاکٹر موجود ہیں۔ وہ ڈرپ لگنا تو بہت سال پہلے کی بات ہے تب میں اپنی فیملی میں نہیں تھی۔ ہمارے گھر میں حکیم، ڈینٹسٹ سے لے کر آکوپنکچرسٹ تک کے ڈاکٹر موجود ہیں۔ مجھے جانے دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں مسلسل پانی پیتی رہوں گی۔''

''توبہ!!! لگتا ہے تمھاری آنکھوں کے پیچھے واٹر ٹینک لگے ہیں۔ اوکے، میں بات کرتا ہوں باقی ڈاکٹرز سے۔'' ہزاروں ہدایات کے ساتھ مجھے دو ہفتے کی اجازت ملی۔

••

میرے دل کو ایک عجیب سا دھڑکا مسلے جا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے۔ لیکن نہیں۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ کیا ہونے کو ہے کیونکہ ایک نحیف و نزار آواز وقفے وقفے سے میرے کانوں میں گونجتی...

''زیادہ وقت نہیں ہے میرے پاس بیٹا، آسکتی ہو تو آجاؤ، آپ کے انتظار میں ہوں۔''

مجھے بھول گیا کہ میری آنکھوں کا نور میرے معصوم بچوں نے کیسے نئی فلائٹ کا بندوبست کیا اور مجھے بتاتے رہے کہ میں بہت بہادر ہوں اور یہ کہ میں ان کی کوئی فکر نہ کروں اور جب تک نانا

ابو کہیں ان کے پاس رہوں۔ طویل پرواز کا ایک ایک لمحہ میرے دل کی دھڑکن کی لَے کے ساتھ لَے ملائے لرز رہا تھا۔ میں نے ابا جی کے معمول کے مطابق سکونِ دل کے لیے سورہ حشر کی آخری آیات کا ورد شروع کیا۔ بچپن سے یہ آیات ابا جی سے سن کر یاد ہو چکی تھیں۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ.
هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ
الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ.

(سورۃ الحشر آیت 22-23)

وہی اللہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بادشاہ، پاک ذات، سلامتی والا، امن دینے والا، نگہبان، غالب، زبردست، بڑی عظمت والا ہے۔ اللہ، پاک ہے اس سے جو اس کے شریک ٹھہراتے ہیں۔

بس پھر ذہن مفلوج ہو جاتا۔ ابا جی کی خوش الحان آواز مفلوج ہوتی سماعتوں میں گونجتی۔ پھر وہی الفاظ کہ جتنا گہرا غم ہو یا خوف، بس یہ آیات جادو اثر ہیں۔ رنج و غم، پچھتاوے، پشیمانی، احساسِ زیاں، خسارہ کچھ بھی حاوی نہیں ہونے دیتیں۔ لیکن پتہ نہیں اس دن تو شاید اسمِ اعظم بھی میری بے کلی کا خاتمہ نہ کر پایا۔ شاید میں ابا جی کی طرح خوش عقیدہ نہیں تھی اور محکم یقین سے عاری بھی، کہ خود اپنی ہی ذات سے شکست و ریخت کا شکار ہو رہی تھی۔ ابا جی کے دیے صبر و سکون اور آزمائش کے وقت کم ظرفی نہ دکھانا، نعمتیں یاد کرنا اور ناشکری نہ کرنا؛ یہ سارے اسباق شاید کوئی سیلاب بہا کر لے گیا تھا اور مجھے اب شدید بے بسی، بے یقینی اور بے قراری کے الاؤ میں جلنا تھا۔

میں نے مختصر سے غسل خانے میں جا کر پانی کے چھینٹے آنکھوں پر مارے، سر درد کی گولی کھائی اور از سرِ نو هوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هو کا ورد شروع کیا لیکن میں ابا جی کی طرح خوش قسمت نہیں تھی۔ مجھے بار بار خوف اور اندیشے کا ہزار سروں والا ناگ آن گھیرتا۔ کبھی میرا جی چاہتا کہ درمیان سے یہ پردہ ہٹا کر پائلٹ سے کہوں کہ بھائی جہاز ذرا جلدی نہیں اڑا سکتے؟ مجھے صبح سے پہلے پاکستان پہنچا دو، تمام عمر دعائیں دوں گی۔

بے بسی انسان کو کیسے غیر منطقی خیالات و اقدامات کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ اندازہ مجھے اس رات ہوا۔ ہر انسان کی زندگی میں ایسا وقت ضرور آتا ہے جب وہ لمحوں میں صدیاں جیتا ہے۔ ایسا لمحہ جس میں ظاہری اور مادّی ساعتیں رک جاتی ہیں اور درد کے براق پر سوار بے تابی کسی اور ہی

عالم میں لے جاتی ہے۔ شاید یہ وہی رات تھی۔ نجانے میں نے کتنی منتیں مانیں۔ دل ہی دل میں کتنے واسطے دیے۔ یا اللہ! میں نے تجھ سے اپنے لیے کبھی کچھ نہیں مانگا، بس مجھے خیر سے ابا جی سے ملوا دے، پھر اور کچھ نہیں مانگوں گی۔ بس ایک دفعہ میں ان کے مقدس چہرے کی زیارت کرلوں، ان سے باتیں کرلوں۔ وہ سب باتیں جو وہ سننا چاہتے تھے اور میں نے کبھی نہ سنائیں۔ وہ اصرار کرتے...

''لکھو، جانِ پدر، اللہ کی نعمت کا کفران نہ کرو۔ لکھو۔ اللہ آپ کے لفظوں میں زندگی پھونکے گا۔ دل سے اٹھے لفظ ابراہیم علیہ السلام کے پرندے ہوتے ہیں۔ ٹکڑوں میں بٹ کر بھی ایک آواز پر زندہ ہوجاتے ہیں۔''

اور میں چپ چاپ ان کا چہرہ دیکھتی رہتی۔ دل کے ویرانے سے کوئی چلا کر کہتا کہ آپ کا دیا ہوا قلم، امی کی نصیحتوں نے بے نور کر دیا ہے۔ میں صرف ان کے معیار کی چوٹی تک پہنچنے میں مصروف ہوں۔

مجھے شاید بخار کے ساتھ سردی لگنے لگی۔ ایئر ہوسٹس نے مجھے کمبل لا کر دیا۔

''میڈم سونے کی کوشش کریں۔'' یہ مہربان لوگ، حرفِ شیریں کے تحائف بانٹنے والے۔ ان کی خدمت یقیناً اس کی نظر میں کئی راتوں کی عبادات سے افضل ہوتی ہوگی، جو ''ودود'' اور ''رؤف'' بھی ہے۔ زمین و آسمان کے درمیان معلق، لحہ بہ لحہ کوہساروں سمندروں پر سے گزرتے خدا خدا کر کے وہ ناگن جیسی زہریلی بل کھاتی رات کٹی تو سورج کی ابتدائی کرن کے ساتھ ہی مارگلہ کی پہاڑیوں کا سرسبز محبت بھرا چہرہ ایک نیم تاریک دیوہیکل ہیولے کی طرح ابھرا۔ اسلام آباد!

میں نے پہلی دفعہ طیارے میں بیٹھنے والے کسی بچے کی سی بے تابی سے کھڑکی سے جھانکا۔ پاکستان کی مٹی چھونے کا ایک لمحہ ہمیشہ دل میں جاوداں رہتا ہے لیکن اس دن مجھے یوں لگا کہ مجھے کبھی یہ دھرتی چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ میرے سارے رشتے ناتے، تہذیب و ثقافت اور شناخت تو یہاں سانسیں لیتی ہے پھر میں وہاں کیا کر رہی ہوں؟ اس لمحے میں کئی فیصلے ہوئے۔ بس میرے فرائض ختم ہوں پھر مجھے کون روک سکتا ہے؟ واپس یہیں آ کر باقی لوگوں کی طرح ہر تنگی ترشی کو اسی فخر سے کاٹنا جس سے ہم جدائی سہتے اور اس دیس کا نام لیتے ہیں۔ ایئر پورٹ پر بھائی کو دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ اب سانس کی آمد و رفت آسان ہوگئی ہے۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''ابا جی بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ ہم نے سوچا جہلم سی ایم ایچ لے جاتے ہیں۔''

''اچھا؟'' مجھے علم تھا کہ وہ ساری پیش بندیاں کر رہا تھا کہ میں کہیں ان کو دیکھ کر گھبرا نہ جاؤں۔

''لیکن ابا جی بہت خوش باش رہے ہیں اور ایک دن تو فرمائش کی کہ مجھے بس میں بکنے والے چنے لا کر دو۔ جب چنے ان کو پیش کیے گئے تو کہنے لگے کہ مجھے پنڈی کی طرف جانے والی بس کے چنے نہیں کھانے۔ جو ادھر سے بس آتی ہے اور منڈی بہاء الدین کو جاتی ہے میں نے اس بس کے چنے لینے ہیں۔''

بھائی بولے جا رہا تھا لیکن میرا اب کوئی بات سننے کا موڈ نہیں تھا۔ ہم ایئر پورٹ سے سیدھے جہلم سی ایم ایچ پہنچے۔ سفید بستر پر سفید ہی کپڑوں میں ملبوس ابا جی کا نحیف و نزار بدن دیکھ کر میرے دل کو دھچکا لگا۔

''ابا جی! گھر چلیں'' میں نے کہا، ''مجھے ہسپتال کے خوفزدہ کر دینے والے ماحول سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔'' انھوں نے جواب میں میرے سر پر ہاتھ رکھا اور مسکرانے لگے۔

ابا جی کی مہربان مسکراہٹ دیکھ کر مجھے اپنے ہوائی اڈوں کے دھکے تو کیا بھولے، مجھے تو یہ بھی بھول گیا کہ کوپن ہیگن میں جہاز کیسے میری نظر کے سامنے اڑ گیا حالانکہ یہ بات ناممکنات میں شامل تھی۔ مجھے یکسر بھول گیا کہ اگلی پرواز لینے کے لیے مجھے لندن کے ایئر پورٹ پر گھنٹوں بیٹھنا پڑا۔ پیروں کی سوجن کے باعث چلنا محال ہو گیا۔ مجھے بھول گیا کہ دو راتیں نہ مجھے نیند آئی نہ بھوک لگی۔ ایئر ہوسٹس بارہا آ کر طبیعت پوچھتی۔ بزنس کلاس کے کھانے کی پیشکش، ''چائے، کافی؟ کچھ تو لیجیے۔''

اور مجھے لگتا کہ ایک دن پہلے میں نے جو کچھ کھایا پیا تھا وہ بھی قے کے رستے نکلنے کو بے تاب ہے۔ ہسپتال کے سفید کپڑوں میں ابا جی کا نحیف و نزار جسم اور زرد چہرہ ان کی مسکراہٹ کو دھندلا نہیں سکا۔ آنکھوں سے ٹپکتی شفقت اور ہونٹوں کی زندگی عطا کرتی مسکراہٹ نے میرے اشکوں کے بند توڑ ڈالے۔ وہ شاید آخری دن تھا جب کسی کے سامنے میری آنکھ چھلکی۔

مجھے اپنے ضبط پہ ناز تھا سرِ بزم رات یہ کیا ہوا
میری آنکھ کیسے چھلک گئی مجھے رنج ہے یہ بُرا ہوا
ہمیں اپنے گھر سے چلے ہوئے سر راہ عمر گزر گئی
کوئی جستجو کا صلہ ملا نہ سفر کا حق ہی ادا ہوا

ابا جی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ دوسرے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

میرے ہاتھ پر ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ ان کی آنکھوں میں ویسی ہی جھلملاتی چمک تھی جو بچپن کے دنوں میں ہماری شرارتوں پر جھلکا کرتی تھی۔ یہی ٹمٹما تا تبسم میرے بچپن کی ہر کامیابی پر ایک طلسمی طلائی مہر لگا دیتا۔ ایک انجذاب کا عالم بغیر کسی وعظ کے شروع ہوجاتا، ''جس ڈالی کو پھل پھول زیادہ ہوتے ہیں اس کا سر ہمیشہ جھکا رہتا ہے اور خوشبو سرتا نے رکھتی ہے۔''

رات کو ابا جی کو گھر شفٹ کر دیا گیا۔ مریضوں کا خصوصی بستر ان کے کمرے میں لگا دیا گیا۔ بھائی نے بازو میں ڈرپ لگا دی۔ میں کرسی بستر کے ساتھ لگا کر بیٹھ گئی۔ ابا جی نے میرا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ہزاروں شاعروں نے ہاتھ کے لمس پر نجانے کیا کیا لکھ رکھا ہے لیکن شاید اس یقین دلاتے اور حوصلہ دیتے کمزور سے ہاتھ کی مضبوط گرفت اور اس سے توانائی اور سکون کی پھوٹتی برقی لہروں کے متعلق کوئی کبھی کچھ لکھنے کا حق ادا نہ کر سکے۔ اولاد کے سر پر والدین کا سایہ اور اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اپنی بیٹی کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اسے غیر مشروط محبت اور بے کراں شفقت کا احساس دلانا صرف ابا جی جیسی شاداب روحیں کر سکتی ہیں۔ میں نے جھک کر ابا جی کی پیشانی پر پیار کیا۔ وہ آہستہ سے بولے، ''سو جاؤ۔''

''آپ سو جائیں ابا جی'' میں نے ان کا تکیہ ٹھیک کیا۔

''بس اب انتظار ختم ہوا۔ دو مرتبہ گاڑی چھوڑی میں نے، نہیں گیا۔ عزیز الرحمان آیا تھا لینے کے لیے لیکن میں تمھارا انتظار کرتا رہا۔''

میں بھونچکا رہ گئی۔ بس چپ کر کے ان کے مطمئن چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ سکون اور اطمینان ان کی فراخ پیشانی سے ہمیشہ پھوٹتا تھا۔ حلیم سی مسکراہٹ ان کے چہرے کا حصہ تھی۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ میں نے ان کا ہاتھ ایسی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جیسے میلے میں پہلی مرتبہ جانے والا کوئی بچہ کھو جانے کے ڈر سے اپنے باپ کا ہاتھ نہ چھوڑے۔ ابا جی نے ہمیشہ کی طرح ایک ہی فرمائش کی، ''سورۃ حشر کی آخری آیات پڑھو۔''

مجھے اپنے سکول کے دن یاد آ گئے۔ سہیلیاں آپس میں ناراض ہوئیں۔ ہم نے ایک دوسرے کے نام ڈالے تو کہنے لگے کہ، ''سورۃ حجرات پڑھو۔ اس سورۃ میں آداب سکھائے گئے ہیں۔ ادب کے تقاضے، خاندانوں کو صرف شناخت کا ذریعہ سمجھنا، دوسروں کا تمسخر نہ اڑانا، طعنے نہ دینا، بدگمان نہ ہونا، کھوج نہ لگانا، دینداری نہ جتانا، اسلام قبول کرنے کا احسان نہ رکھنا، غیبت نہ کرنا

کہ یہ مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف ہے۔ قرآن کو ناظرہ دس مرتبہ بھی پڑھ لو تو صرف نیکیوں کا گوشوارہ ہی بنے گا اور جمع تفریق ہوتی رہے گی۔ لیکن اگر سمجھ کر قرآن کی ایک آیت بھی پڑھ لی اور اس کو جزوِ زندگی بنالیا تو دنیا میں ایک متقی انسان کا اضافہ ہوجائے گا۔"

ابا جی کے الفاظ میرے بچپن کے جھروکے سے نکل کر میرے چہار اطراف پھیل گئے۔

میں ابا جی کے خوابیدہ چہرے کو دیکھتی رہی۔ پرسکون اور نورانی چہرے پر بند آنکھیں، خوبصورت کھڑی ناک جو بند سیپیوں کی طرح طرحدار تھی۔ ہمیشہ مسکراتے رہنے والے ہونٹ نیم وا سے تھے۔

"اونہاں مکے جانڑ دی لوڑ ناہیں، جنہاں یار دے ویکھیاں حج ہووے" (انھیں مکہ جانے کی ضرورت نہیں جن کو یار کی دید سے حج ہوتا ہو)

امی جی تہجد کے لیے اٹھ کر آئیں، "تم سو کیوں نہیں جاتیں؟ پہلے بھی تو تمھارے بھائی ہی بیٹھتے تھے رات کو، اور کہیں بیمار نہ پڑ جانا؟"

"امی جی! میں بہت مشکلوں سے یہاں تک پہنچی ہوں۔ میں سوکر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ کبھی زندگی نے اتنا وقت دیا ہی نہ تھا کہ ابا جی کے پاس بیٹھ سکوں اور اپنے بچپن کے دنوں کی طرح بے دھڑک ہر وہ بات کہہ سکوں جو کبھی خود سے بھی نہیں کہی تھی۔" میں نے ابا جی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ ہر ایک کو خوشی بانٹنے کی تمنا سے روشن رہنے والی آنکھیں بند تھیں۔ میں بھی ان آنکھوں کو یونہی منور دیکھنے کی بے بس خواہش میں بس ان کے سامنے "خوشی خوشی رہنے لگے" کا کھیل رچائے بیٹھی رہی، ایک اچھی بچی جس کے ہاتھوں میں ٹرافیاں، گلے میں میڈل اور سر پر دی بیسٹ آل راؤنڈر کا پھندنا لگا تھا۔

امی جی خاموشی سے کھڑی مجھے دیکھتی رہیں۔ میں اپنی جگہ سے ہلی ہی نہیں۔ امی جی وضو کرنے چلی گئیں۔ مارچ کے مہینے کا دوسرا عشرہ شروع ہوچکا تھا۔ موسم بھی دلکش تھا اور آسمان بھی ستاروں بھرا تھا۔ پانی کو چھوکر آنے والی ہوا بھی بے خطر آتی تھی۔ لیکن اب ستاروں کے نام بتانے والی آنکھیں غنودگی سے بوجھل رہنے لگی تھیں۔ اب ہر وقت قصے سنانے اور ہر لمحہ نیکی کا درس دینے والی آواز بے حد نحیف ہوچکی تھی۔ میرا جی چاہتا کہ ابا جی کسی جادو کے منتر سے اٹھ جائیں اور کہیں کہ...

"چلو اوپر چھت پر چل کر بیٹھتے ہیں۔ آؤ میں تمھیں چاندنی کی گزرگاہوں کے راستے دکھاؤں، ستاروں کے جاگنے اور سونے کے اوقات بتاؤں۔" لیکن ابا جی کی بند آنکھیں اور چہرہ

پرسکون رہتا اور میرے ہاتھ پر ان کے ہاتھ کی گرفت مجھے بتاتی کہ وہ اس حالت میں بھی مجھے نہیں بھولے۔

اس سوموار سے ابا جی کی زندگی کی آخری اتوار کی دوپہر تک کے شب و روز کیسے گزرے مجھے کچھ خبر نہ ہوئی۔ عرقِ گلاب اور گلیسرین کا لوشن ابا جی کے پیروں پر لگاتی تو پاؤں پیچھے کھینچ لیتے۔ ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے کہ نہ کرو۔ میں پاس بیٹھ کر بالوں میں کنگھی کرتی تو ہلکے سے مسکرا دیتے۔ لمبی انگلیوں کے نرم پوٹے اور خوبصورت لمبے ناخنوں والا ہاتھ میرے سر پر آ کر رک جاتا۔ شام کو جب عیادت کو آنے والے مہمانوں کی آمد و رفت میں کمی ہوتی تو میں پھر ان کے پاس جا کر بیٹھ جاتی۔ مجھے قریب آنے کا اشارہ کرتے اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیتے۔ گویا مجھے یاد دہانی کرواتے کہ تم بے حد بہادر بیٹی ہو۔

''رونا نہیں''، وہ دوسرا ہاتھ اٹھا کر مجھے منع کرتے۔ انھوں نے عزیز بھائی کے جانے کے بعد بھی سختی سے عورتوں کو اندر کہلوا بھیجا تھا، ''کوئی میرے بیٹے کو نہ روئے، وہ کسی کا کچھ نہیں لے کر گیا۔ جاتے ہوئے گدا ہو یا بادشاہ، زندگی سب کچھ باہر ہی رکھوا لیتی ہے۔ بہت سادہ اور کھرا سودا ہے۔ جیسے تنہا آئے ہو بس ویسے ہی تنہا چل دو۔ مکر و فریب سے جمع کیا مال و منصب یہاں رہ جائے گا اور اعمال ساتھ چلیں گے۔''

انسان کی اصلیت آزمائش میں معلوم ہوتی ہے۔ خوشی، غم و غیظ، سب جب تک انسان کے قابو میں ہوتے ہیں اس کی شخصیت پر پردہ پڑا رہتا ہے اور جب انسان ان کے قابو میں آ جائے تو سب فاش ہو جاتا ہے۔ میں ابا جی کے چہرے کی زیارت کرتی رہتی۔ مجھے اپنے حسین بچپن کے دن یاد آ جاتے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر حروفِ تہجی کے دائرے اور قوسیں بنانے والا ہاتھ، کالج سے ٹرافیاں لے کر آتی تو فخر سے چمکتی آنکھیں میری بلائیں لیتیں اور یہ مہربان ہاتھ میرے سر پر آ رکتا، ہزاروں مریضوں کی کلائیوں اور پیشانیوں پر مسیحائی کا لمس ثبت کرتا ہاتھ، نجانے کتنے ضرورت مندوں کے ہاتھ یوں تھامتا کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہوتی، کتنے بے یقین متزلزل لوگوں کی یوں دست گیری کرتا کہ وہ دعائیں دینے کو ہاتھ اٹھا لیتے۔ نجانے کتنے لوگوں کا یقین تھا کہ یہ ہاتھ ان کی نبض تھامے گا تو وہ پلک جھپکتے صحت مند ہو جائیں گے۔

لیکن بیماری اور بڑھاپا کیسی بے بس کر دینے والی حقیقت ہے۔ پھر ان کو کس قدر جلدی تھی جانے کی۔ بس اب تمھیں دیکھ لیا ہے۔ بس اب جانے کی جلدی ہے۔ اس عمر میں بستر پر پڑے

ہوئے بھی ابا جی کی یادداشت اور حافظے میں بلا کی بیداری موجود تھی۔ جمعے کے دن ابا جی نے کسی کو سورۃ کہف پڑھنے کا کہا، مجھے یاد نہیں کہ کون پڑھ رہا تھا۔ نیم غنودگی کے عالم میں اس کی غلطی نکالی۔ اور کمزور آواز اور ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ غلط نہ پڑھو۔

رات کو عطا بھائی ابا جی کے قدموں میں بیٹھے پیروں کا مساج کرتے اور قرآن کی تلاوت کرتے رہتے۔ ابا جی نے شاید تھک کر ان کے ہاتھ ہٹانے کی کوشش ترک کر دی۔ ان کی محبت سے چھلکتی آنکھیں اپنے حافظ بیٹے کے وجیہہ چہرے کی بلائیں لیتیں اور وہ بولے بغیر آنکھیں بند کر کے تلاوت سنتے رہتے۔

ابا جی سو بھی رہے ہوتے تو میں ان کے پاس بیٹھی رہتی اور مجھے ان کے ہاتھ کی گرفت سے اندازہ ہو جاتا کہ ابا جی بیدار ہونے والے ہیں۔ نیند کے دوران انگلیاں ذرا سی کھل جاتیں لیکن آنکھ کھلتے ہی پھر مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیتے جیسے کوئی اپنے ہونے کا اور رفاقت کا احساس دلا رہا ہو۔ اتوار کو امی جی نے مجھے زبردستی اٹھا کر دوسرے کمرے میں بھیجا۔ خدا کے واسطے ذرا دیر سو جاؤ۔ میں دو بجے کے قریب ظہر کی نماز پڑھ کر آئی۔ ابا جی کو اپنی نمازیں قضا ہونے کا بے حد قلق تھا۔

میں نے کہا، ''ابا جی میں آپ کی طرف سے نماز پڑھتی ہوں۔ میری نمازیں کون سی کبھی پوری رہی ہیں۔ میرا تو لمبا حساب کتاب ہے۔ آپ کی طرف سے ادا ہو جائے گی۔''

ابا جی ہلکے سے مسکرا دیتے۔ ان کی مسکراہٹ مجھے بچپن کے مرغزار میں لے جاتی۔ ابا جی کی ناراضگی سے بچنے کے لیے میں مارے باندھے نمازیں پوری کرتی۔ کمرے میں دروازے کے پیچھے لگے کیلنڈر پر ہر نماز کا نشان لگاتی۔ یہ کیا وقت کی مناسبت سے پڑھو، رات کو ایک ہی دفعہ کیوں نہیں پڑھی جا سکتیں، یا جب وقت ملے تو پڑھ لو۔ ابا جی آرام سے مجھے بتاتے کہ اس کائنات میں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ سجدہ ریز ہونے کے اپنے اوقات ہیں۔ محبوب سے ملاقات اس کے طے کردہ وقت پر ہوتی ہے میرے بچے، اپنی سہولت اور ترجیحات پر نہیں۔ میں کبھی نماز پڑھتی کبھی دھیان نہ دیتی۔ یہ واحد حرکت تھی جو ان کو ناراض کرتی۔ وہ ہمیشہ کہتے اپنے دل، ذہن اور بدن کی تربیت نماز کی باقاعدگی سے کرنی چاہیے۔ طہارت، اہتمام اور قبولیت کا مسلسل احساس ساتھ رہتا ہے۔

ان کی داخلی گھڑی انھیں نمازوں کے اوقات میں مضطرب کرتی۔ اشارے سے نماز کی ادائیگی کا کہتے۔ ان کا چہرہ بتاتا کہ جبینِ نیاز میں ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں لیکن اس

خوگرِ حمد کو اب سجدے کی مہلت نہیں۔ مجھے یقین تھا کہ ابا جی کی روح ہمہ وقت کی مسجود ہے۔ میں نے حسبِ معمول پاس بیٹھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا...

''ابا جی! میں ظہر پڑھ آئی ہوں۔'' ابا جی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ شاید ہاتھ اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ میں جھک کر ان کے قریب ہوئی تو انھوں نے ہلکی سی آواز میں کچھ کہا جس کی مجھے سمجھ نہیں آئی۔ ان کا چہرہ بے حد کمزور ہو چکا تھا۔ ہاتھوں کی نسیں ابھری ہوئی تھیں۔ لیکن ایک سکون کی چاندنی چہرے پر رقصاں تھی۔ پھر شاید انھوں نے کہا کہ پڑھو۔ اس آخری ہفتے میں ان کو سورۃ الحشر اور سورۃ البقرہ کی آخری آیات سننے کا شوق ہو چلا تھا۔

میں نے ہلکی سی آواز میں قرات شروع کر دی۔ ابا جی نے ہمیشہ کی طرح سکون سے آنکھیں بند کیں لیکن ان کے ہاتھ کا لمس میرے ہاتھ پر اسی مضبوطی سے موجود تھا۔ شاید آدھ گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے ابا جی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا ہے۔ بظاہر ابھی تک وہ میرے ہاتھ میں ہی تھا لیکن مجھے احساس ہو گیا کہ میرے ہاتھ پر آہستہ سے زندگی کی ہمک سے خالی ہوتے ہاتھ کی گرفت چھوٹ گئی ہے۔ ان کا دوسرا ہاتھ سینے پر پڑا تھا۔ عتیق بھائی کی انگلیوں نے ابا جی کا ماتھا چھوا۔ پھر ان کا ہاتھ ابا جی کی نبض پر گیا۔ میں نے ان کے زرد ہوتے چہرے کو دیکھا۔ پھر انھوں نے آہستہ سے حماد سے کہا:

''اسے دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔''

''ابا جی!'' میں نے زبردستی اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا لیکن ان کی انگلیوں نے تھامنے سے انکار کر دیا۔

''ابا جی!'' میں نے بے یقینی سے ان کے چہرے پر دیکھا۔ پرسکون بند آنکھوں کے نیچے ایک واضح مسکراہٹ تھی لیکن ہونٹ بند تھے۔

''ابا جی! یہ میں ہوں، آپ کو میرا انتظار تھا نا، آپ کو بلا رہی ہوں'' لیکن ناقابلِ یقین بات یہ تھی کہ کہیں سے کوئی جواب نہیں آیا، نہ ہی ان کے ہونٹوں نے ''میرے بچے کیا بات ہے'' کہا۔ نہ ہاتھوں نے میرا ہاتھ تھام کر اپنی دائم شفقتوں کا یقین دلایا اور نہ ان کی غمگسار آنکھوں نے مجھے خاموشی سے بتایا کہ وہ میری بات بن کہے سمجھ گئی ہیں۔

نہیں، نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ابھی چند گھنٹے پہلے تو ابا جی نے کپڑے بدلے، بال کٹوائے اور ناخن ترشوائے تھے؟ رات کو خوش باش چھوٹے چھوٹے لفظ بولتے رہے۔ لیکن مجھے یہ

کسی نے نہیں بتایا کہ انھوں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ آج میری تیاری ہے۔ مجھے رات بھر انتظار مت کرانا۔ میرے پیچھے لمبے چوڑے افسوس و تعزیت کے بکھیڑے نہ ڈالنا، پیٹ بھروں کو ختم پڑھ پڑھ کر کھانے نہ کھلانا، تین دن کے بعد اسی کھانے کے بجائے فلاں اور فلاں کے گھر سودا سلف ڈال دینا، فلاں کے بچے کا خیال رکھنا۔ میری تیاری ہے۔ مجھے رات بھر انتظار میں نہ رکھنا۔ بڑے بھائی کو میرا قائم مقام سمجھنا۔ لیکن میری زندگی کے اس ظالم ترین لمحے میں میری ذات شاید ایک سپر نووا میں بدل چکی تھی۔ بڑے دھماکے کے بعد چاروں جانب ایک ہولناک خاموشی جیسے ساری دنیا زمین پر اچانک نمودار ہونے والے کسی کالے گڑھے میں سما گئی ہو۔ جب ان کو آخری دیدار کے لیے اندر لایا گیا تو سفید ململ کے صافے میں ان کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔

''دادا ابو ہنس رہے ہیں پھوپھو'' وجیہہ الرحمٰن پتہ نہیں کب میرے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

''ہاں میری جان، آپ کے ابو بھی ہنستے مسکراتے چلے گئے تھے۔ چلو اچھا ہے آج اپنے لختِ جگر کے پاس چلے گئے جسے شاید کہیں چھپ کر ہی آنسوؤں کا نذرانہ بھیجتے ہوں گے۔ ہمیں تو صبر و ضبط کا درس ہی دیا جاتا تھا۔ سوا تین بجے مرزا صاحب کے رخصت ہونے کا اعلان ہوا۔ اور چھ گھنٹے کے بعد پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ پتہ نہیں کب ان کو رخصت کیا گیا۔ پتہ نہیں کب انسانوں کی بہتری کے لیے تڑپتی لافانی روح نفسِ مطمئنہ کی صورت اپنے مرکز کو چل دی اور جسدِ خاکی کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ صبح آنکھ کھلنے سے پہلے ہی ایک ہراساں کرتا ہوا خیال کہ اب یہاں ابا جی نہیں ہیں، نیند کو مضطرب کر دیتا۔ ابا جی کبھی اس کمرے کو چھوڑ کر الگ کمرے میں سونے نہ جاتے۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھے بچوں کے درمیان رہنا اچھا لگتا ہے۔ یہ کیا کہ الگ کمرے میں کونے پر پڑے رہو اور آرام کی حرص میں خاموشی سہتے رہو۔ پتہ نہیں وہاں شہرِ خموشاں میں کیسے سب زمین اوڑھ لیتے ہیں۔ رسمِ دنیا چلتی رہی، لوگ آتے رہے۔

اساں لگّے ہو گئے سائیاں
اَساں رو رو عرضاں پائیاں
تساں کر لمیاں کلیاں تیاریاں
ساہنوں ویکھیا نہ اک واری
تساں واپس جاندی واریاں

میں نجانے کیا کیا لکھتی رہتی۔ امی جی نے میرے کمرے میں موجود تمام پرزے اور کاغذ

اٹھا کر سنبھال دیے۔

مرے سکوں کی سرزمیں دلوں میں اور دعاؤں میں
ہے آج بھی یہیں کہیں، دلوں میں اور دعاؤں میں
جو میرا سائباں رہا، کرم کس آسماں رہا
یقیں کا حرفِ آخری، دلوں میں اور دعاؤں میں

مجھے اپنے بھائیوں کے حوصلے پر فخر ہونے لگا۔ پتہ نہیں اللہ نے مردوں کو اتنا حوصلہ کیسے عطا کر رکھا ہے کہ وہ نہ صرف غم میں سے گزرتے ہیں بلکہ اسے سنبھالنے کی قوت بھی رکھتے ہیں۔

بھائی جان کئی مرتبہ مجھے اوپر کمرے میں دیکھنے کے لیے آتے۔ ''تم ٹھیک ہو نا؟ دوا کھالی؟''

پھر باری باری بھتیجے آتے، ''پھوپھو جی کچھ کھالیں، پانی پی لیں، پھوپھو جی چائے پی لیں۔'' میرا لاڈلا بھتیجا وقاص میرے پاس آ کر خاموشی سے بیٹھ جاتا، مجھے علم تھا کہ اسے اپنی پھوپھو ہنستے کھیلتے اچھی لگتی تھی۔ لیکن شاید یہ احساس مٹ چکا تھا کہ اب کسی کو خوش رکھنے کے لیے ہی سہی، خوش رہنا پڑے گا۔

نہ پوچھو کہ وہ دل کے کتنا قریں تھا
وہی شخص جو اک خبر ہو گیا ہے
کسی کی نظر اب نہ چومے گی ہم کو
کوئی اوڑھ کر اب زمیں سو گیا ہے

ہماری بھابی کو امی جی ایک زبردست منتظم کہا کرتی تھیں۔ انھوں نے ایک خودکار خاموشی سے تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ پورے گھر میں پھرکی کی طرح پھرتیں۔ کوئی مہمان بغیر چائے اور کھانے کے نہ جائے۔ انھوں نے سب بچوں کی ڈیوٹیاں لگا رکھی تھیں۔ پھر امی جی کے پاس جا کر بیٹھتیں، کبھی کمرے میں میرے پاس آ کر چپ کر کے بیٹھ جاتیں۔ میں ان کو دیکھتی رہتی۔ رشک کرتی کہ کیسی ہمت اور منظم انداز سے ہر ایک کی خبر گیری کرتی ہیں۔ ایک میں ہوں کہ لگتا ہے اب کبھی زندگی سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ہی نہیں ہوگا۔ بچے فون کرتے۔ ان کی کسی بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

ہزار میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی لیکن میرے تنفس کی رہگزر پھر تنگ ہونے لگی۔ سانس کی رفتار اور دل کی دھڑکن تعاون کرنے سے منکر ہو گئیں۔ امی جی کا پریشان چہرہ دیکھ کر میں کوشش کرتی کہ اٹھ کر ان کے پاس چلی جاؤں لیکن شدید بے معنویت کا احساس کچھ نہ کرنے دیتا۔

حالانکہ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ سورج بھی روز نکلتا تھا اور رات کو ستارے بھی اپنی ازلی نوکری پر آجاتے۔ آنکھیں جھپک جھپک کر صدیوں پرانی بوڑھی زمین کو دیکھتے رہتے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ بڑے کمرے کے دروازے کے پیچھے بچھے بڑے پلنگ پر سفید چادر اور آرام دہ سنبل بھرا تکیہ ویسا ہی چپ چاپ پڑا تھا۔ ساتھ الماری میں کتابوں کے ڈھیر خاموش تماشائی کی صورت موجود تھے۔ سرہانے پڑے اخبارات اسی ترتیب سے رکھے تھے جس سے آخری دفعہ ابا جی کے ہاتھوں نے سنبھالا تھا۔ کتابوں کے ڈھیر پر رکھی شفاف شیشوں والی عینک بھی میری ہی طرح ٹکٹکی باندھے خالی بستر کو دیکھ رہی تھی۔ پاس ہی دو خوبصورت ملول قلم بھی موجود تھے جنھیں ابا جی حفاظت سے سینے پر لگی جیب میں رکھتے۔ دودھیا موتیوں والی تسبیح دائرے کی صورت چپ چاپ پڑی تھی اور ہلکے آسمانی رنگ کا مخملیں جائے نماز جس کے نیچے ابا جی نے موٹا کپڑا لگوا رکھا تھا تاکہ سجدہ کرتے گھٹنوں کو تکلیف نہ ہو۔ کمرے میں لٹکی کالی شیروانی، چند سفید شلوار قمیص کے جوڑے اور کالے بند جوتے، ایک جوڑا پلاسٹک کے وضو کرنے والے چپل، تکیے کے نیچے جرابوں کا جوڑا، دستی رومال اور دو ٹوپیاں جنھیں وہ اپنے ہاتھ سے دھو کر سنک کے قریب ہی تار پر لٹکا دیتے۔

یہی کچھ ہے ساقی، متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں، ہوں میں امیر

کیسا سہل تھا مختصر اسباب کے ساتھ سب کچھ چھوڑ کر چل دینا۔ یہ پڑی ہے تیری دنیا، بہت رہ لیا۔ یہ رکھا ہے مال و دولت اور رشتہ و پیوند، سب ایک پھونک بھر سانس کی آمد و رفت کا تسلسل ہے۔ صنم کدہ ہے جہاں لا اِلہ الا اللہ۔ کہیں سے ابا جی کی آواز گونجتی اور میں گھنٹوں بے معنی خاموشی اوڑھے ان کے بستر کے پاس بیٹھی ان کی چیزیں دیکھتی۔ ہر چیز ویسے کی ویسی پڑی تھی، کبھی ان کی عینک اٹھا لیتی تو مجھے لگتا ابا جی کی آنکھیں بھی دھندلا گئی ہیں۔ عینک کے شیشے ملگجے ہو جاتے۔ مجھے ہر لمحہ یہی احساس ہوتا جیسے ابھی دروازہ کھلے گا اور زندگی سے بھرپور آواز آئے گی، ''چپ کیوں بیٹھی ہو؟ خاموش نہ رہا کرو۔''

اب کون خاموشی کو پڑھنے پر قدرت رکھے گا؟ اب کس کی سماعتیں ایسی چوکنا ہوں گی کہ فون پر آواز سنتے ہی فکر لاحق ہوگی، ''پتر زکام ہوا ہے؟ آواز بھاری کیوں ہے؟'' نہ کوئی وقت بے وقت بازار جانے پر لگاوٹ بھری فہمائش کرے گا۔ نہ کوئی نئی آنے والی کتابوں رسالوں کی فرمائش کرے گا۔ نہ وقت بے وقت میرے فون کی گھنٹی بجے گی...

''وقت کیا ہوا ہے تمھاری دنیا میں؟'' وہ یوں وقت پوچھتے جیسے میری دنیا کی گھڑی کے ساتھ ہی چلنا ہو۔

''بچے گھر آ گئے؟ دودھ پینے کی عادت ڈالی ہے یا نہیں؟ اتنی برفباری ہوتی ہے۔ ان کو تِل کے لڈو ضرور کھلایا کرو۔''

ایک آواز کے جادو نے میرے پردیس کو بابل کا آنگن بنا رکھا تھا۔ میں گھبرا کر صحن کے دوسرے کونے پر بنے بڑے کمرے میں چلی جاتی جو مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ خود کو یقین دلانا مشکل تھا کہ اب یہاں وہ مقدس وجود باقی نہیں ہے جس کی خوشبو سے گھر بھرا رہتا تھا۔

ابا جی ایسا سفرِ آخرت کسی کا نہیں دیکھا ہم نے۔ قبرستان کے راستے تک نجانے کس کس نے ہنگامی بتیاں جلا رکھی تھیں۔ گاڑیاں گزرنے کا راستہ نہیں تھا۔ لوگ پیدل چل کر جا رہے تھے۔ ایسا جنازہ کب کسی کو نصیب ہوتا ہے؟ ابھی تک لوگ قبرستان فاتحہ خوانی کے لیے جا رہے ہیں۔ گھر کی خواتین میں سے کسی کی مجال نہیں تھی کہ قبرستان جائے لیکن نجانے کون کون اپنا بنایا اور ابا جی کا نبھایا رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔ ''اب کون پوچھے گا ہمیں، اب کون رکھے گا ہمارے سروں پر ہاتھ؟ اب کون آرام سکون چھوڑ کر ہمارے مقدمے نمٹانے کے لیے راتیں بیٹھے گا؟'' سب اپنے اپنے قصے سناتیں، اپنے چاچا جی اور ماماں جی کو یاد کرتیں۔ اپنے اپنے حالات کی ماری خواتین ان کو اپنے اپنے الفاظ میں یاد کرتیں اور میں چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہتی۔ نجانے کہاں کہاں سے عورتیں بچیوں کو ساتھ لیے تعزیت کے لیے آتی رہیں؛ مرزا صاحب نے میری بچی کو فلاں امتحان دلوایا، مرزا صیب نے میری بیٹی کو گاؤں کے سکول میں ملازمت لے کر دی، صوفی صاحب نے میری سسرال سے میرے والدین کی صلح کرا دی اور زندگی کی رسہ کشی ختم ہوئی، مولوی صاحب نے میرے بچے کی فیس جمع کرائی تھی، اور میں گم سم ایک ہی کہانی مختلف کرداروں سے سنتی رہی۔

سُکھ وَسو تُم سیف ملوکا، ٹُریا باپ سفر نوں
ماتم سوگ نہ کرو سفر دا، چلّے اصلی گھر نوں
الوداع تُساں تھیں مینوں کیتا یاد سہیلی
اللہ بیلی جان اکیلی، چلّی چھوڑ حویلی

(میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ)

••

یہ بے سبب نہیں سُونے گھروں کے سنّاٹے
مکان یاد کیا کرتے ہیں مکینوں کو

(میر انیس)

ابا جی کے جانے کے بعد میں کبھی اس گھر اس لیے نہیں جاتی تھی کیونکہ وہاں ابا جی بیٹھتے تھے، سوتے تھے، جاگتے تھے۔ ہر کونے میں ان کی آواز گونجتی تھی۔ ہر جگہ ان کے نقشِ پا ثبت تھے۔ جہاں وہ نماز ادا کرتے تھے، جہاں بیٹھ کر تلاوت کرتے تھے، جہاں لوگوں کے مسائل سنتے تھے۔ ان کی مخصوص ہنسی کی کھلکھلاہٹ بھی وہیں کہیں جادو کے زور سے منجمد کھڑی تھی۔ گھر سویا ہوا محل بن چکا تھا۔

''میں نہیں جاؤں گی'' میں نے پھر بیکار ضد کی، ''میں اس سناٹے کو چیخیں مارتا نہیں سننا چاہتی۔ میرا دل ڈوبتا ہے، مجھے سانس نہیں آتا'' میں تاویلات پیش کرتی۔ لیکن جب میری لاڈلی بھتیجی انیقہ نے میرے پاس بیٹھ کر آرام سے کہا...

''پھوپھو، آپ ہمارے گھر تو آتی ہی نہیں؟'' تو میں نے خاموشی سے اٹھ کر ادھر کا رخ کرلیا۔ ہم نے امی جی کے باورچی خانے میں بیٹھ کر آلو کے پراٹھے بنائے، پوریاں تلیں، گھر بچوں کے قہقہوں سے گونجنے لگا۔ میرا پانچ سالہ بھتیجا فصیح الرحمان موبائل اٹھا لایا اور ویڈیو بنانے کی کوشش کرنے لگا، پھوپھو ایسے لگ رہا ہے جیسے ٹی وی پروگرام ہو رہا ہو۔

''چلو، پرے ہٹو'' میں نے اس کے ہاتھ سے موبائل لینے کی کوشش کی، وہ باہر بھاگ گیا۔

''پھوپھو، ہم یہ ویڈیو یوٹیوب پر لگائیں گے'' میری بھتیجی بولی، ''صدف مرزا آلو چھیلتے، پراٹھے بناتے، پوریاں تلتے ہوئے۔''

بچوں کے مسرور چہرے دیکھ کر میرے دل پر چھایا غبار جاتا رہا۔ ان کی شریر ماں وقفے سے باورچی خانے میں جھانکتی پھر کہتی...

''باجی میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب بھی آپ ادھر آئیں گی، میں نے آپ جیسی ظالم نند سے روٹیاں ہی پکوانی ہیں۔'' بچے ہنستے رہے اور مجھے محسوس ہوا کہ کہیں نہ کہیں ابا جی کی ہنسی کی آواز بھی اس میں شامل ہے۔

●●

میں قبرستان نہیں جاتی۔ یا کم از کم اس اہتمام سے نہیں جاتی۔ ابا جی کو رسمیں توڑنے اور سہولتیں پیدا کرنے کا جنون تھا۔ قبروں پر چادریں چڑھانے اور دیگر سوچے سمجھے بغیر بے جا اسراف جس کی قرآن و حدیث سے کوئی تصدیق و تائید نہ ہوں، بہت ناپسند کرتے تھے۔ یہ طے ہے کہ زندہ لوگوں کو مدفون لوگوں سے زیادہ ضروریات ہوتی ہیں۔ میری قبر پر چادریں چڑھانے کے بجائے اسی پیسے سے کسی غریب کو دو دن کا راشن ڈال دینا۔

عزیز بھائی کے لیے امی جی کو قبرستان جانے کا ہول اٹھتا تھا لیکن ابا جی کہتے:

''میرا پتر وہاں کہاں ہے۔ اس کی قبر تو میرے دل میں ہے اور اس قبر میں وہ زندہ ہے۔''

میں بھی آج تک روایتاً ان کے پاس قبرستان نہیں گئی۔ میرے دل میں بھی وہ آج تک زندہ ہیں۔ میں کئی دفعہ باہر جنگلے کے پاس کھڑی رہی لیکن اندر جا کر سرہانے بیٹھنے سے میرے دل میں عجب ہول اٹھتا ہے۔

شاید شہرِ خموشاں کے ویرانوں میں یہ نشانی ان کو تسلی دیتی ہو جو اپنے پیاروں کو ایک مٹی کی ڈھیری تک محدود سمجھتے ہوں۔ لیکن مجھے وہ ہمیشہ اپنے ہی دل میں مدفون ملے۔ میں آج بھی ان کی آواز سن سکتی ہوں۔ لوگ خواہ اسے واہمہ قرار دیں یا لاشعور کی بازیگری کہیں یا شاید اپنی بیماری اور بے بسی کو اپنی طاقت سمجھنا میرا جنون ہو، لیکن میں نے شدید آزمائش، تنہائی اور مایوسی کے عالم میں ان کی خوشبو محسوس کی ہے۔ کڑے لمحوں میں وہ شہد برساتا لہجہ، وہ نرم آواز اور وہی رنگوں بھری خوشبو مجھے اپنے آس پاس چلتی پھرتی لگتی ہے، سنائی دیتی ہے، جیسے کوئی نور بھرے لہجے میں تسلی دے رہا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اسی ایک رحمت بھری کیفیت نے مجھے زندگی میں کبھی تنہا نہیں ہونے دیا یا کسی اپنے پرائے کا محتاج نہیں ہونے دیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ مجھے امی جی کی یاد کبھی اس طرح نہیں آئی، بس دل کے ستون سے لپٹی پھولوں بھری بیل کی طرح مہکتی رہتی ہے لیکن ابا جی کی یاد نے مجھے قدم قدم پر حوصلہ دیا۔ ان کی رفاقت اور رہنمائی ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔

••

ترے اک سجدۂ شب سے کرم کی بارشیں تھیں ماں

امی جی کی زندگی کا مقصد ہمہ وقت کام میں مصروف رہنا تھا۔ ان کو دیکھ کر کبھی مجھے چیونٹی کا خیال آتا اور کبھی شہد کی مکھی کا، کبھی ایک گلہری، کبھی، کبھی چوں چوں کرتی دانہ چگتی چڑیا، لیکن اکثر مجھے چاند پر ہر وقت چرخہ گھماتی بڑھیا کا تصور آتا جو ازل سے بس چرخہ کاتے چلی جا رہی ہے اور نور پھیلائے جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دنیا میں اس قدر بربریت اور لرزہ خیز مظالم ہونے کے باوجود ابھی نور کی بارش ہوتی رہتی ہے کہ ہر گھر میں مائیں موجود ہیں۔

میں دل ہی دل میں ہنستی، اگر امی جی کو علم ہو جائے کہ میں ان کے سامنے بظاہر معصومیت سے بیٹھی اندر ہی اندر کیسی باتیں سوچ رہی ہوں تو کیا ہو۔

''شکر ہے کوئی سوچ نہیں پڑھ سکتا'' میں نے کہا۔

''دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں''، ابا جی بولے ''ہوسکتا ہے کہ آنے والے زمانوں میں ایسا بھی ممکن ہو کہ دماغ کی لہریں آپس میں باتیں کریں۔''

''جی، فرہاد علی تیمور کی طرح'' میں نے فوراً علمیت جھاڑی۔

''کون؟'' ابا جی چونکے، ان کو علی نام کی سمجھ آئی اور ان کی ڈکشن میں شاید حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور کوئی نام موجود ہی نہیں تھا۔

''ابا جی''، میں نے نہایت جوش و خروش سے کہا، ''آپ کو سسپنس ڈائجسٹ کے دیوتا۔۔''

''آہم۔۔۔ آہم''، ہمارے بھائیوں کے مشترکہ کھنکارنے کی آواز نے ہمیں درمیان میں ہی ٹھٹھک جانے پر مجبور کر دیا۔

••

امی جی کی باتیں اور ان کے معمولات کا بیان اور تصور ایسے ہی ہے کہ جیسے آپ کے ہاتھ میں کوئی کانچ کی گولیوں سے بھرا ڈبہ اچانک چھوٹ کر گر جائے اور آپ ان کے سمیٹتے سمیٹتے ہلکان ہو جائیں، اور پھر بھی یہ گمان رہے کہ کوئی نہ کوئی کینچا کسی نہ کسی کونے کھدرے میں دبکا رہ گیا ہے۔ امی جی کی متحرک یادیں اور چھوٹی چھوٹی باتیں اپنے اندر ایک مکمل تدریسی نظام لیے ہوئے ہیں۔ اپنا آرام قربان کر کے دوسروں کا خیال رکھنا، خاندان کو جوڑ کر رکھنا اور اولاد کے دل میں کسی کی بھی برائی نہ ڈالنا۔ میں نے جب اپنی عملی زندگی میں قدم رکھا اور رنگ برنگے لوگوں سے واسطہ پڑا تو ایک بالکل مختلف دنیا دیکھی جہاں مائیں پیدا ہوتے بچوں کو لوگوں سے نفرت سکھاتیں۔ معصوم اذہان اپنی پیدائش سے پہلے کے جھگڑوں کو دوہراتے۔ میں نے شدید حیرت کے عالم میں معصوم بچوں کو نفرت اور بغض کے منہ زور ریلے میں پروان چڑھتے دیکھا تو اپنی ماں سے عقیدت بڑھتی گئی۔

انھوں نے کوئی فلسفہ نہیں پڑھ رکھا تھا۔ ایک چھوٹے سے دیہات میں پرورش پا کر ساری زندگی ایک چھوٹے سے قصبے میں گزار دی لیکن ان کی باتیں اور عملی زندگی میں ان کے معمولات بڑے سے بڑے دانشور کو مات کر دیتے۔

امی جی کے برق رفتاری سے کام کرتے لمبی انگلیوں والے خوبصورت محنت کش ہاتھ جو یقیناً کسی زمانے میں بے حد خوبصورت رہے ہوں گے، مجھے بہت یاد آتے ہیں۔ نفاست سے کٹی سبزیاں، سلیقے سے تہہ شدہ کپڑے، ہمارے سکول کالج سے آنے پر گرما گرم روٹی، گھر میں ہر وقت چچا جان وغیرہ کا کوئی نہ کوئی بچہ پڑھنے کی غرض سے آیا رہتا۔ اس کا خیال اپنے بچوں سے بڑھ کر رکھنا۔

میری کم نصیبی کہ ایک دفعہ وطن چھوڑا تو کبھی ان کے کام نہ آسکی۔ ہمیشہ میری اور میرے بچوں کی خدمت ان جاںنثار ہاتھوں نے کی۔ آخری دم تک ان کو اپنے ہاتھ سے بنا کر کھلایا۔ خوبصورت پیشانی پر کبھی بل نہ آیا۔ ہمارے ددھیال کے ساتھ ان کا سلوک مثالی رہا۔

میں اکثر امی جی کے ہاتھوں کو دیکھتی رہتی۔ مجھے یہ ہاتھ مکمل انسانوں جیسے لگتے۔ متین، سنجیدہ، رشتوں کے ریشم کو سلجھانے کے فن سے آشنا ہاتھ، بہت صابر، ہر صبح ایک منتشر گھر کا شیرازہ سمیٹتے، دن بھر سگھڑاپے کے موتی پروتے اور لڑیاں بناتے ہاتھ، لیکن ان کے سو جانے کے بعد نجانے کون دھاگے کی گرہ کھول جاتا اور پھر ہر صبح صبر سے موتی چننے میں مصروف ہاتھ۔ ریزہ ریزہ، پتی پتی اور ذرہ ذرہ سمیٹتے ہاتھ جو بڑی سے بڑی پریشانی، زیادتی اور بدنمائی کی گرہیں تمکنت سے کھولتے رہتے۔ آنے والے زمانوں کی آبیاری کرتے ہاتھ جنھیں شاید اس بات سے کوئی غرض نہیں

ہوتی کہ ان فصلوں سے فیض یاب کون ہوگا۔

مجھے اگلی دو دہائیاں گزارنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ایسے ہاتھوں کو کبھی ہاتھ ملنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ زندگی کے ہر امتحان کو تحمل اور خاموشی سے گزار سکتے ہیں اور نتیجتاً ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔

ان کے جفاکش ہاتھ ہر وقت ان کے آنے پر مہمان نوازی پر مامور ہوتے۔ انھوں نے چندا ماموں کا محاورہ غلط ثابت کر دکھایا۔ مردوں کی بنائی امثال اور اقوال کا منہ چڑاتا ان کا صابر، مدلل اور منطقی رویہ پورے خاندان کو جوڑے رہا۔ عورت جلد باز، جھگڑالو، حاسد، گھری پیچھے مَت، جذبات مشتعل، پہلے گولی پھر بات، وغیرہ، کی تمام کہاوتیں ان کے سامنے غلط ثابت ہوگئیں۔ امی جی نے ثابت کیا کہ عورت دانش مند ہو اور اسے اچھے مرد میسر آئیں تو وہ جو چاہے کر سکتی ہے۔ امی جی نے ایک پیرا سول کی طرح پورے خاندان کو ایک لڑی میں پروئے رکھا۔ وہ ایک محبوب تائی جان تھیں، لاڈلی چاچی اور مہربان مامی جان رہیں۔

••

بھائی، ابا جی کو نئی شیروانیاں سلوا کر دینے کی مہم میں مصروف رہتے اور ابا جی چھوٹے بچوں کی طرح ان کی نظر بچا کر وہی پرانی کالی شیروانی پہننے کی کوشش میں پکڑے جاتے اور پھر ایک الجھن آمیز انداز میں کہتے، ''یار اندر تو میں وہی ہوں ناں، کیوں فضول پیسے ضائع کرتے ہو؟ یہ ایک ہے ناں، کون سا روز پہنتا ہوں۔''

امی جی کے مزاج میں حرص، دوسروں کی تقلید اور اپنے بے وجہ شوق اور دکھاوے کے لیے بچوں کو پریشان کرنے کا مادّہ سرے سے ہی نہیں تھا۔ ایک دفعہ بھابی نے امی جی کو سوٹ دیا، ''امی جی یہ بریزہ کا سوٹ ہے آپ کے لیے، میں بہت شوق سے لائی ہوں۔ بس جلدی سے سلوا کر پہن لیں۔'' ''بیٹا مجھے اس عمر میں ان لوازمات کی ضرورت نہیں۔ آپ لوگوں کے بچے پڑھنے والے ہیں۔ ہزاروں اخراجات ہوتے ہیں اور یہ بریزا کیا نیا چونچلا ہے۔ یہ تو سیدھی سادی چکن ہے، بریزا کیسے بن گئی؟''

وہ ساری عمر اپنے سفید دوپٹوں، پرنٹڈ قمیصوں اور سفید شلواروں میں ہی مطمئن اور سرشار رہیں۔ جہاں کوئی قیمتی چیز ان کی نذر کرنے کی کوشش کرتا ان کی پریشانی عروج پر پہنچ جاتی، ''میں کیہہ کرنی اے؟ فلانی کو دے دو، اس کی بچیاں ہیں، ان کے کام آئے گا۔''

میں ہمیشہ یہی سمجھتی رہی کہ امی جی سفید شلوار اور دوپٹوں کے ساتھ قمیصیں بدل بدل کر پہنتی رہتی ہیں، شاید یہ ان کی پسند تھی۔ لیکن مجھے ان کی عمر کے آخری ایام میں علم ہوا کہ یہ ان کی عادت بن چکی تھی کہ اعلیٰ اور نئی چیز اٹھا کر ضرورت مندوں کو دے دینا اور خود اپنے معمول کے مطابق وہی لباس زیبِ تن کرنا۔ جب انھیں نئے کپڑوں کا تحفہ ملتا ان کے دلائل شروع ہو جاتے۔ بیٹا یہ پہن کر میں کیا کروں گی؟ تم لوگوں کے اور اتنے اخراجات ہوتے ہیں۔ اتنے مہنگے کپڑے خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ فضول خرچی ہے یہ بھی۔

••

میں جہاں بھی گئی، زمین پر بچھا ایک سادہ دستر خوان میرے ساتھ رہا جس کے چاروں کونوں پر ابا جی، تایا جان، بھائی جان رضوان اور بڑے بھائی جان بیٹھتے، آمنے سامنے امی جی، تائی جان اور چاچی جان ہوتیں، ایک طرف بہو بیٹیاں جمع ہوتیں اور دوسری جانب بچے اپنی ٹولی جمائے رہتے۔ اب اگر کبھی تصور میں اوپر سے کھڑے ہو کر مواصلاتی سیارے سے تصویر بناؤں تو چار جہان آباد لگتے ہیں۔ امی جی کے ہاتھ کے سادہ سے پکوان کے بڑے بڑے دیگچے، جو ان ہاتھوں کی لذت اور برکت سے بھرے ہوتے، چاہِ زمزم کی طرح جن کی مقدار کبھی کم نہ ہوتی، بس کھاؤ اور بانٹو، اگلے دن پھر ایسے ہی معمور۔ امی جی گوشت آلو اور مرغی کا سالن بناتیں۔ چاولوں میں انھیں گوشت یا تازہ مٹر ڈالنا بہت پسند تھے۔ لاشعوری طور پر میری بھی یہی کوشش رہی کہ میرے بچوں کو بھی وہی ماحول مل سکے جو میرے بچپن کی یادوں کا حصہ ہے۔ ان کا اپنے خاندان کے ساتھ وہی چلن رہے تاکہ ان کو بھی وہی مضبوط بنیاد ملے جو ساری زندگی دلوں میں عداوت کا پودا نہیں لگنے دیتی۔ کم از کم جب دنیا سے جاؤں تو دو افراد ایسے چھوڑ جاؤں جو زندگی کو مخاصمت، منافقت اور عداوت کی نظر سے نہ دیکھیں۔

••

عید کی نماز پڑھ کر واپسی پر سب لوگ ہمارے گھر آتے۔ امی جی کی خوشی اور انتظام دیکھنے والا ہوتا۔ میز پر برتن پہلے سے سجے ہوتے۔ چائے کے ادوار چلتے۔ بالائی کی موٹی تہہ لگے سویوں کے ڈونگے، دودھ سویاں الگ اور سادہ سویاں الگ رکھی جاتیں۔ کھیر کا ڈونگہ الگ سے بناتیں اور میں جب امی جی کو سادہ سویوں پر کھیر ڈال کر کھاتے دیکھتی تو حیرت کا اظہار ضرور کرتی، بھلا کوئی دو سویٹ ڈشز بھی ملا کر کھاتا ہے؟

جواب آتا، "چہ داند بوزنہ لذات ادرک" بندر کیا جانے ادرک کا مزہ۔

کبھی مجھے ایسا لگتا کہ امی جی کی زندگی کا مقصد ہی چولھا چکی کرنا ہے۔ ہر ایک کی پسند کا خیال، فلاں یہ نہیں کھاتا، فلاں ایسی چائے پیتا ہے، فلاں کو چاولوں میں ثابت مسالہ نہیں پسند، فلاں کو شوگر ہے ذرا سا میٹھا الگ بنا لینا۔ ان کی فطرت بن چکی تھی کہ مہمان نوازی میں خوش رہتی تھیں اور ساتھ ہی ہمیں ہلکان رکھتیں۔ تایا جان ہنس کر کہتے،

اِٹ کھڑکے، دکڑ وجے، تتا ہووے چلھا

آن فقیر تے کھا کھا جاون، راضی ہووے بلھا

میں اندر ہی اندر بابا بلھے سے بھی ناراض ہوگئی۔ ان سب کا مطلب صرف چولھا چکی کے دائروں میں بٹھائے رکھنا ہے ہمیں۔

سہیلیوں کو اپنے گھر کی بھنڈی، دھنیا، پپیتا، لیموں اور جانے کیا کیا الابلا بھیجنا۔ کبھی خاموشی سے ایک خاتون کے گھر مہینے کا راشن بھیج دینا۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا، "امی! آپ ان عورتوں کو سودا خرید کر پہنچانے میں جو کھپتی ہیں تو سیدھے سبھاؤ پیسے بھیج دیا کریں۔"

تنک کر بولیں، "کمبخت نامراد اس کا بندہ نشئی ہے۔ مار پیٹ کر پیسے لے جائے گا اور چھ بچے منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔"

"چھ چھ بچے۔۔۔نشئی کے؟" یقیناً میں نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا ہوگا جس پر ان کا ملامت بھری خفگی میں جواب موصول ہوا...

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ بے وقوف۔ اللہ دی دین اے۔"

"اچھا!!!" میری حیرت بھی بدستور قائم رہی، "تے اس نشئی 'دین محمد' دی کوئی دین نئیں؟"

"یہ لڑکی نہیں سدھر سکتی آپ لکھوا لیں مجھ سے" امی جی ہمیشہ کی طرح پیشگوئیاں کرنے والے عامل کی طرح وثوق کا اظہار کرتیں۔

••

ابا جی نے امی کو کہیں قبل مسیح میں دو گرم سوٹ لا کر دیے تھے۔ وہ سوٹ تو ہم نے کبھی نہیں دیکھے لیکن ان کی چادریں جن میں سے ایک کا رنگ امی جی کی زبان میں گاجری اور دوسری کا زنگالی تھا، امی جی نماز پڑھتے ہوئے استعمال کرتیں۔ جس احتیاط سے وہ ان کو تہہ کر کے رکھتیں مجھے

ہنسی آجاتی۔ میں کئی دفعہ پوچھتی امی جی، ابا جی کس زمانے میں لائے ہوں گے یہ جوڑی۔ کوئی اندازہ؟ اور جواب میں وہ میری ڈھٹائی اور بے ہودگی کے بارے میں مفصل بیان جاری کرتیں۔

••

کپڑے کاٹنے سینے کی وہ بہت ماہر تھیں۔ اکثر ان کی سہیلیاں کچھ نہ کچھ کٹوانے یا سلانے لے آتیں۔ امی کھینچ کھانچ کر، کون نکال کر کپڑا کاٹ دیتیں۔

کوئی اچار کی فرمائش کرتے ہوئے کہتی کہ آپا، ذرا اچار تو ڈال دیں۔ آپ کے ہاتھ کا اچار خراب نہیں ہوتا۔

ہمارے گھر میں ہمیشہ اچار ڈالنے کا اور ساگ پکانے کا عمل پوری انتخابی مہم جیسا ہوتا تھا۔ امی جی کچے آموں کو دھوکر چارپائی پر سفید کپڑا بچھا کر دھوپ لگواتیں۔ ساتھ میرے پھیروں کی نگرانی کرتیں لیکن میں ہمیشہ کامیابی سے آم چرا کر کھاتی۔

ساگ اس طرح تھال بھر بھر کر کاٹا جاتا جیسے کسی نے گائے بھینس کو چارہ ڈالنا ہو۔ پھر بڑے دیگچوں میں ابالا جاتا۔ سارے گھر میں عجیب سی مہک پھیلی رہتی جو مجھے قطعی طور پر پسند نہیں تھی لیکن جب امی جی اس ساگ کو رائی، دارچینی، کڑھی پتہ اور نجانے کون کون سے مسالے ڈال کر بگھار لگاتیں تو میں چولھے کے پاس بیٹھ کر کھانے پہنچ جاتی۔ امی جی مکئی کی روٹی بناتیں اور پھر یہ سوغات اہتمام کے ساتھ شوقین مزاجوں کو بھیجی جاتی۔

••

بارہا مجھے یہی کہا جاتا ہے کہ تم ہمیشہ اپنے ابا جی، تایا جان، بابا جان اور چاچوں کا ذکر کرتی ہو، ماں کے بارے میں اتنا نہیں لکھتی۔

دنیا پتہ نہیں مدرز ڈے پر کیا کیا لکھتی ہے۔ بات تو یہ ہے کہ میں ہر سانس کے ساتھ اپنی ماں کے نام ایک دعا لکھتی ہوں جس کی تربیت اور حسنِ سلوک نے ہمیں اس قابل کیا کہ ہم بے ربط حروفِ تہجی کو لفظ بنانے کی کاوش کرسکیں۔ اب دستورِ دنیا بن چکا ہے کہ سال کے ایک دن میں ماں سے محبت کی یادیں تازہ کی جائیں۔ امی جی کے بارے میں لکھنے بیٹھی ہوں تو آج پھر میرا تخیل مجھے اپنے چاچا جان شریف مرزا کی یادنگری میں لے گیا۔ ماں کے بارے میں جو بھی تحریر ہوگی وہ اسی چمن سے گزر کر جائے گی۔

ہمارے سب چچا وغیرہ امی جی سے بے پناہ محبت کرتے تھے بالخصوص چھوٹے دونوں چچا۔

ایک دفعہ چاچا جان شریف سے میں نے پوچھا، بھائی تو آپ ابا جی کے ہیں لیکن آپ کا ہر رابطہ امی جی سے شروع ہوتا ہے۔ ہر کام امی جی سے پڑتا ہے۔ اس وقت انھوں نے حسبِ عادت مسکرا کر بچپن کی چند کہانیاں سنا کر ٹال دیا۔ لیکن اصل کہانی انھوں نے مجھے تب سنائی جب میں خود ماں بن چکی تھی۔

امی جی کی شادی کم عمری میں ہوئی جیسا اس وقت رواج تھا کہ چودہ پندرہ سال کی لڑکی کی شادی کر دی۔ جب وہ بیاہ کر آئیں تو گاؤں میں شور مچ گیا کہ ''مرزیاں دی نونہہ نوں پڑھنا لکھنا اوندا اے۔'' (مرزا کی بہو پڑھ لکھ سکتی ہیں) لوگ امی جی سے خط پڑھوانے لگے۔

ہمارے نانا جان اس زمانے میں بھی تعلیمِ نسواں کے زبردست حامی تھے۔ امی جی بہت لاڈلی تھیں اور نانا جان اردو عربی فارسی دان۔ میں نے پنجابی کلام امی جی سے سن سن کر یاد کیا۔ چھوٹے دونوں چچا اور امی جی کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ انھوں نے امی جی کے لاڈ بھی کیے اور ان سے ضدیں بھی کیں۔ امی جی بتاتی ہیں کہ تینوں دیور ماشاءاللہ 'شینہہ جوان' تھے۔ لوگوں کی نظریں ان کی طرف لگی رہا کرتی تھیں۔ چونکہ امی جی دادی اور دادا جان کی لاڈلی بہو تھیں لہٰذا یہ بھی طے تھا کہ امی کی مرضی بھی ہر فیصلے میں شامل ہوگی۔

وہ داستانیں الگ ہیں جو چاچا جان نذیر مزے سے سنایا کرتے اور پھر امی جی کی گھرکیاں دیکھ کر ہنسا کرتے۔ ایک دفعہ ہمارے سب سے چھوٹے چاچا کو کہیں میلہ دیکھنے جانا تھا۔ امی کے سر ہوگئے کہ آپا، کرتا سی دو، آپا کرتا سی دو۔ امی جی نے لاکھ کہا کہ اب تو بہت دیر ہوگئی، رات ہونے کو ہے، کل سی دوں گی، لیکن چھوٹے چچا ضد پر اتر آئے، آپا نہیں، کل میں نے میلہ دیکھنے جانا ہے۔ آج اور ابھی سی کر دو۔ پھر چاچا جان ساتھ بیٹھے اور لالٹین کی روشنی میں امی نے ہاتھ سے پرو کر ان کو کرتا سی کر دیا۔ کپڑے سینے کی مشین تو بہت دیر بعد آئی۔ چچا وہی کرتا پہن کر اگلے دن ساتھ کے گاؤں گئے۔

شام کو ہماری دادی جان بڑے اہتمام سے بھٹیارن کے پاس جاتیں اور دانے بھنوا کر لاتیں۔ پھر امی کو دیتیں اور کہتیں کہ اب سب کو بانٹ کر دو۔ کبھی ان دانوں میں گڑ ملایا جاتا، کبھی ایسے ہی کھائے جاتے۔ چھوٹے چاچا کا امی سے ہمیشہ جھگڑا ہوتا ''آپا مجھے دانے کم ملے ہیں۔ میں اور دانے لوں گا۔''

شریف چاچا بتاتے ہیں کہ ایک دفعہ آپا نے غصے سے اپنے دانے بھی پھینک دیے اور کہنے لگیں، ''ایہہ لیہہ، ایوی لیہہ جا'' (یہ لو.. یہ بھی لے جاؤ)۔ چاچا نے بڑے اطمینان سے دانے

اٹھائے اور سامنے بیٹھ کر کھانے لگے۔

ہمارے دادی اور دادا جان بہت جلد وفات پا گئے۔ ہم لوگوں نے ان کو نہیں دیکھا صرف قصے سنے ہیں۔ شاید ہی کوئی رات ایسی ہوتی ہو جب امی اور ابا جی ان کا ذکر نہ کرتے، ان کو دعا نہ دیتے۔ بلکہ کئی دفعہ تو مجھے اپنی دادی جان اپنے درمیان چلتی پھرتی محسوس ہوتیں۔ امی جی بتاتیں کہ وہ کس قدر حسین تھیں، کیسی معصوم اور سادہ تھیں۔ امی کے کتنے ناز اٹھاتی تھیں۔ دادی جان کشمیری اور دادا مغل تھے۔ دادی جان دیکھنے میں بھی کشمیری حسن سے مالا مال تھیں اور ہنستے ہوئے ان کے گالوں میں گڑھے پڑا کرتے تھے۔ وہ بے حد خوبصورت میٹھی آواز میں دھیمے لہجے میں بات کیا کرتی تھیں۔ جب امی جی نے پہلی دفعہ مجھے کالج کے مائک پر بولتے سنا تو کہنے لگیں تمھاری آواز بالکل بے جی جیسی لگتی ہے۔ بس صرف تمھیں بولنے کی تمیز نہیں۔ آرام سے بات کرو تو ان جیسی آواز لگے تمھاری۔ امی جی نے کبھی تعریف کر کے خوش ہونے کا موقع نہیں دیا تھا۔

••

چاچا جان شریف کا ذکر ہو رہا تھا۔ میری ان سے برطانیہ میں ملاقات بھی ہوئی لیکن کبھی مل بیٹھنے کا موقع نہ مل پایا۔ پھر جب وہ پاکستان سیٹل ہو گئے اور میں دونوں بچوں کے ساتھ گئی تو کہنے لگے کہ میرے پاس آ کر رہو۔ زندگی کے وہ چند دن میرا لازوال سرمایہ ہیں۔ ہم ساری ساری رات باتیں کرتے۔ شعر و ادب، غالب و اقبال، معاشرہ، مذہب ہر بات زیرِ بحث آئی۔

ان ہی خوبصورت دنوں میں انھوں نے امی جی کی ایک بات بتائی جس کا ذکر کرتے ہوئے وہ آبدیدہ ہو گئے۔ بتایا کہ جب ہماری دادی جان بیمار ہوئیں اور عمر کے آخری چند ایام تھے، ان کو قے بہت آنے لگی تھی۔ امی جی نے ایک بڑے تسلے میں جسے 'ڈانبہ' کہا جاتا تھا، برادہ ڈال کر رکھا تھا جس میں وہ ان کو فوراً قے کراتیں۔ آخر میں جب دادی جان صحیح طور پر بیٹھ بھی نہیں سکتی تھیں تو ایک دفعہ انھیں اچانک زور سے قے آئی۔ چاچا جان کہنے لگے کہ آپ کی ماں نے دونوں ہاتھوں کا اوک بنا کر اس میں قے اٹھالی ساتھ کہتی جائیں ''بسم اللہ بے جی۔۔۔ بسم اللہ تسیں لیٹے رہو۔'' ململ کے پرانے دوپٹے کے چھوٹے چھوٹے رومال بنا کر دادی جان کے سرہانے رکھے ہوتے۔ بستر پر ان کی تمام حاجات پوری کرائی جاتیں۔

میری بچی ششدر ان کو روتا دیکھتی رہی۔ پھر پریشان ہو گئی اور بولی، ''چھوٹے نانا ابو! لیکن اب تو آپ بڑے ہو گئے ہیں۔ پلیز اب نہ روئیں۔''

چاچا جان نے اسے پیار کیا اور کہانی کے انداز میں سنانے لگے۔ ہم چھ بھائی تھے۔ سب سے بڑے بھائی یعنی بابا جان کی والدہ ان کی پیدائش کے بعد وفات پا گئیں اور ہماری دادی جان نے ان کو پالا۔ ہمیشہ ان کو اپنے جنم دیے بچوں سے زیادہ اہمیت دی۔ اپنے بچوں کو ان کا ادب سکھایا اور پھر ہماری امی کو بھی کہا کرتیں کہ مجھے غلام نبی بڑا پیارا اے۔ کوئی اوہدا دل نہ دکھائے۔

اس دن مجھے پہلی مرتبہ علم ہوا کہ بابا جان کی والدہ وفات پا چکی تھیں۔ میں نے امی جی سے کہا کہ آپ نے بتایا کیوں نہیں تھا۔

کہنے لگیں ''توں فسوس کرن جانڑا سی؟ (تم نے تعزیت کرنے جانا تھا؟)

چاچا جان اکثر کہتے کہ ہماری ایک ہی بہن تھی جسے کم عمری میں بیاہ دیا گیا۔ ہمارے والدین کی خدمت کی ساری سعادتیں بھی تمھاری ماں نے سمیٹیں اور ساری دعائیں بھی وہ لے گئیں۔

امی جی نے از خود کبھی اپنی کوئی بات نہیں سنائی۔ ایک دفعہ چچا جان شریف نے مجھے بتایا کہ امی جی کو اپنے دیوروں سے اپنے بچوں کی طرح پیار تھا۔ گھر میں سو طرح کے حالات ہوتے ہیں۔ جب چچا جان کی شادی کا وقت آیا تو زیور اور کپڑے لتے کا سوال اٹھا۔ چچا کہنے لگے کہ آپا نے اپنے جھمکے اتار کر خاموشی سے پکڑا دیے اور دیور کی شادی ہو گئی۔

••

کتنی مائیں اپنا آرام تج کر اپنے بھرے پرے کنبے پر آخری عمر تک اپنی محنت کی کھن کھن کرتی اشرفیاں نچھاور کرتی ہیں؟ کبھی میکے کی شان میں رطب اللسان عورتوں کو دیکھتی ہوں تو مجھے اپنی ماں کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ سسرال کی برائیاں کرتی اور میکے کے مردوں کے سر پر کے تاج رکھ کر اس میں زبردستی کے نئے نئے پر ٹھونسنے کی کوشش کرتی خواتین جن کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ امی کی یاد آتی جو اپنی ہستی کو بھلا کر اوروں کو ادب، بے لوث اور غیر متعصب رویے سکھانے کی اعلیٰ مثالیں دیتیں۔

''امی جی! آپ کے کڑے معیار تک ہمارا پہنچنا بہت دشوار ہے'' میں اکثر دل ہی دل میں امی جی کو مخاطب کرتی۔ لوگ حیران ہوتے کہ ہمارا جھکاؤ اور لگاؤ اپنے ددھیال کے ساتھ ایسا تھا کہ اکثر دوست کہتے ہیں کہ آپ ننھیال کی بات بہت کم لکھتی ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ ایک تو ہمارے تایا جان، بابا جان وغیرہ پڑوس میں تھے۔ دوسرے گھر کا ماحول ایسا تھا کہ شب و روز بھی آپس میں جڑے ہوئے تھے۔

امی جی کا ایثار اور خاندان کو جوڑ کر رکھنے کی حکمتِ عملی ایسی فطری اور سہل تھی کہ لوگ حیران ہوتے کہ آپ سب کے ہونٹوں پر اپنے تایا اور چاچا کے نام ہی ہوتے ہیں۔ عام طور پر تو عورتیں چندا ماموں ہی سکھاتی رہتی ہیں عمر بھر، اور آپ لوگ اپنے ددھیال پر جان چھڑکتے ہو۔ ہمارے ذہنوں میں کبھی اس بات کا تصور ہی نہیں آیا تھا حالانکہ ہمارے ننھیال کا ایک اپنا مقام تھا خصوصاً ہمارے وکیل ماموں جن کی وسعتِ مطالعہ اور بے حد دھیمے اور شفیق مزاج کی میں دیوانی تھی اور جن کی شادی ہمارے تایا جان کے گھر ہوئی تھی، ان سے شاباشیاں لینے کے لالچ میں روسی ادب کا ترجمہ بھی پڑھ ڈالا تھا میں نے، اور رنگ برنگی ڈشز بھی بناتی تھی، لیکن وہ کراچی رہتے تھے۔ پھر ملک سے باہر چلے گئے تو دور ہونے کی وجہ سے وہ معمول نہیں ہو پایا جو روزانہ تایا جان اور بابا جان سے ملاقاتوں میں تھا۔

••

امی جی کو کنجوسوں سے شدید خار آتی تھی۔ سنجوڑے اور تھڑ دِلے لوگوں کے ساتھ چلنے سے بہتر ہے انسان اپنے ساتھ چل لے۔ جب کبھی انھیں کسی ایسی صورتِ حال سے واسطہ پڑتا کہ مہمان نوازی یا لین دین میں کوئی کم ظرفی کا مظاہرہ کرتا تو جل کر کہتیں کہ تھوک سے بڑیاں بنانے والوں کے ساتھ تو اللہ قبر بھی نہ بنائے۔

امی جی کے پاس ایک اردو بولنے والی خاتون بھی آیا کرتی تھیں۔ ان کا سیاق و سباق اب مجھے یاد نہیں لیکن یہ علم ہے کہ وہ ازار بند اور پراندے وغیرہ بنایا کرتی تھیں اور تیز تیز آواز میں اردو بولا کرتی تھیں جس کے جواب میں امی جی کو اپنی پنجابی زبان کو سہل فہم بنانا پڑتا۔ میں حسبِ عادت دونوں خواتین کی گفتگو غور سے سنتی پھر اس کی کامیاب نقل بھی اتارتی۔

ایک دن وہ دوپہر میں پیدل چلتی ہوئی آئیں۔ پستہ قد، گہرا سانولا رنگ اور ڈھلتی عمر کی دہلیز پر کھڑی ایک متفکر سی عورت جس کے ہاتھ کی گانٹھیں باقی ہاتھوں سے زیادہ سیاہ تھیں اور مزدور ہاتھ بتاتے تھے کہ یہ ساری عمر مصروفِ عمل رہے۔ وہ روہانسی آواز میں امی جی کو کسی کی شکایت کر رہی تھیں...

''اے ہے آپا، کیا جانیے کس خسیس کے پاس بھیج دیا آپ نے مجھے، اتنے باریک ریشم کے ازار بند بنوائے، اتنی محنت کرائی اور اجرت دیتے ہوئے سو سو بات کی۔ لو آپا اب بھلا موت میں سے مچھلیاں پکڑیں گی کیا؟''

ان کے سامنے چائے اور بسکٹ رکھتے ہوئے مجھے اپنی ہنسی پر قابو پانا دشوار ہوگیا۔ میں

ابا جی کے کمرے کی طرف بھاگی۔ ابا جی نہیں تھے۔ میں نے گھر کی دیوار سے تایا جی کے پورچ کی چھت پر قدم رکھا، وہاں سے بڑی چھت پھلانگی اور سیدھا بابا جان کے کمرے میں جا کر دم لیا۔ وہ حسبِ عادت پنکھا بند کیے کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔

''بابا جان، بابا جان، آپ نے پہلے کبھی یہ محاورہ سنا ہے؟'' میں نے فوراً نیا دریافت شدہ محاورہ ان کے گوش گزارا۔ بابا جان کو کتاب بند کر کے میری بات سننے کی کلفت ہوئی تھی۔ بہت سکون سے بولے...

''یہ محاورہ تو پنجابی میں بھی ہے۔ پتہ نہیں آج تک تمھاری ماں نے کیوں نہیں بولا۔ اسی کا مترادف محاورہ۔۔ پانی وچ مدھانی۔۔ بھی ہے۔ اس میں اتنا بے حال ہونے اور کودنے پھاندنے کی کیا ضرورت ہے جیسے تیسری عالمی جنگ کی خبر لائی ہو۔''

انھوں نے واپس کتاب کھول لی۔ میں مایوس ہو کر جانے لگی تو بولے،''اب آ ہی گئی ہو تو وہ کلیدِ مصادر پڑھ لو، میں نے تمھارے لیے ڈھونڈ نکالی ہے۔''

••

امی جی کے محاورے بھی اپنی ہی نوعیت کے ہوتے تھے۔ ان میں ہی وہ ساری کسر نکال لیتیں جو عام طور پر لوگ طعنے دے کر نکالتے ہیں: ہا کی جھناں منہ، گھڑے جتنا تھوبڑا لٹکا کے نہ پھرو۔

ہمارے گھر دو ماں بیٹیاں اکثر آیا کرتی تھیں۔ ان کے خاندان کے مرد بیرونِ ملک مقیم تھے۔ اکثر وہاں سے آئے تحائف کی کہانیاں سناتی رہتیں۔ میں تو چائے پانی دے کر غائب ہو جاتی۔ اچانک ان کے خاندان میں کسی کا انتقال ہو گیا۔ امی جی پہلی دفعہ ان کے گھر تعزیت کے لیے گئیں۔ گرمیوں کے دن تھے اور وہ بس کہتی رہیں،''خالہ جی بوتل منگاواں؟؟ خالہ جی چائے بناواں؟'' ان کا گھر بھی کہیں گلیوں میں اندر کر کے تھا جہاں تک پیدل ہی جانا پڑتا تھا۔ امی جی واپس آئیں تو سخت نالاں تھیں،

''توبہ ان کم بخت عورتوں کو کوئی پوچھے کہ گھر آئے مہمان سے پوچھ کر اسے چائے پانی دیا جاتا ہے؟ یہ مہمان نوازی پیسے سے نہیں جذبے سے ہوتی ہے۔ سارا خاندان باہر سے پونڈ کما کما کر بھیجتا ہے اور فریج ان کا ایسے جیسے اِلاں دا آلنڑاں (چیلوں کا گھونسلہ) اور میں غور و فکر کرتی رہی کہ چیلوں کا گھونسلہ امی نے شاید ہی کبھی زندگی میں دیکھا ہو۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے رنگدار تصوراتی و استعاراتی مثالیں دیا کرتیں۔

امی جی کہنے کہنے لگیں کہ وہ تعزیت کرنے کے لیے تقریباً ایک گھنٹہ بیٹھیں جس میں وہ مسلسل پوچھتی رہیں:

''خالہ جی بوتل منگاواں؟؟ خالہ جی چائے بناواں؟''

میں تو بہت خوش ہوئی لیکن بڑی ہمدردی سے کہا:

''اور دیا کریں لوگوں کو بھر بھر کر مگّے''، حسبِ عادت ناراض ہونے لگیں، ''اے بے شرمے، کسی سے واپس چائے کی پیالی پینے کے لیے مہمان نوازی کی جاتی ہے کیا؟''

••

امی جی کے ڈانٹنے کا اپنا ہی منفرد طریقہ تھا۔ مجھے تو باقاعدہ پہلے بغور سننا پڑتا کہ ان کے محاورات اور تاثرات کا اصلی ہدف کون ہے۔ ایک مرتبہ بھائی جان کی کالج میں کسی سے لڑائی ہوئی۔ بات بڑھ گئی اور گھر تک پہنچی۔ اب امی جی کسی کو مخاطب کیے بغیر خطبہ دے رہی تھیں۔

''دنیا کتنی سیانی ہے کہ اپنا راستہ بھی بنا لیتی ہے اور نقصان بھی نہیں ہوتا۔ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ تہاڈیاں ڈانگاں ٹٹ جاندیاں نیں تے سپ شوکدے رہندے نیں (تم لوگوں کی لاٹھیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور سانپ پھنکارتے رہتے ہیں) کوئی صبر نہیں کوئی حکمت نہیں۔

••

امی جی کے جہیز کے پیتل کے گلاس، پراتیں، پلنگ اور ان کے نوسٹلجیا کی وجہ سے مجھے بہت مسائل درپیش تھے۔ برتنوں کو یوں لشکایا جاتا جیسے چھوٹے بچے کو نہلا دھلا کر منہ چوما جا رہا ہو۔ پیتل کی پراتوں میں لسی یا سرکہ ڈال کر رکھا جاتا تاکہ صبح جھلملاتی ہوئی پرات برآمد ہو اور ہماری امی اپنے میکے کو یاد کریں۔

امی جی کے جہیز کے بڑے نواڑی پلنگ کی جب نواڑ کھلتی اور دھلتی تھی تو مجھے بہت خار آتی۔ پھر امی اسے چھٹی کے خوشگوار دن دھونے کا اہتمام کرتیں۔ میں امی کے کچن گارڈن کے کونے پر کرسی ڈالے کچھ پڑھ رہی تھی۔ امی جی نے قریبی گھر سے آئی بچی کو میرے پاس بھیجا اور کہا، ''اس کی مدد کر دو۔ چھت پر لے جا کر نواڑ ڈالو۔ ہاں پہلے ذرا ''بنیرے'' (منڈیر) اچھی طرح صاف کرا لینا۔''

''میں بہت مصروف ہوں، ابا جی نے کتاب دی ہے پڑھنے کے لیے، رات سے پہلے ختم کرنی ہے''، میں نے کہا۔

''آہو، آہو۔۔ ایس دکھیاری دیاں سنگھاں اتے دنیا دھری اے۔ (ہاں ہاں۔۔ اس دکھیا کے سینگوں پر دنیا دھری ہے) کہاں وقت ملے گا سدا کی کام چور کو؟ ابھی کسی کالج سے بلاوا آجائے پھر دیکھنا۔''

''کیوں لڑکی کے پیچھے پڑی رہتی ہیں بھئی؟ تخلیقی اور تعمیری کاموں میں کبھی سستی نہیں کی میری بیٹی نے'' ابا جی نے فوراً کہا۔ انھوں نے ہی مجھے پڑھنے کے لیے سیرتِ طیبہ ﷺ کی ایک کتاب دے رکھی تھی جو مجھے ایک اسلامی مذاکرے میں جانے سے پہلے پڑھنا تھی۔

''جی آ۔۔۔ دو وقت روٹی نہ ملے تو ساری پڑھائی لکھائی چولھے میں جھونک دی جائے۔''

''یا معبود، پھر وہی بات؟ لوگوں کو روٹی چاہیے اور یہ کہ سلیقہ اور تمیز کے بغیر کچھ نہیں ہونے کا۔'' میں غور فرماتی رہی کہ میری ماں اور سب مائیں کن لوگوں سے ڈرتی اور ڈراتی ہیں۔ ان کے ہاتھ پیر ٹوٹے ہوئے ہوں گے جو بہو کو گھر لاتے ہی صاحبِ فراش ہوجائیں گی یا پھر یہ اگلی زندگی کوئی امتحان گاہ ہے جہاں روٹی گول ہو، گرم ہو، بروقت ہو۔ چاول 'پوٹا پوٹا' لمبے ہوں۔ کھانا ہر وقت تیار ہو، گھر صاف ہو، پورے خاندان کے لیے ٹرے تیار ہو۔ ''نہ بابا'' میں نے دل ہی دل میں تہیہ کیا، ''میں کہیں نہیں جانے کی۔۔۔ نہ روٹیاں پکانے کی۔'' امی کو مسئلہ کیا ہے؟ ویسے یہ 'اگلے' اور 'لوگ' اپنی بیٹیوں کو بھی 'اگلوں' سے ڈراتے ہوں گے؟ اتنا خوف تو اگلے جہان جانے کا نہیں ہے جتنا ان نادیدہ لوگوں کی امتحان گاہ میں جا کر رعایتی نمبر لینے کا ہے۔ پھر میاں کی بات کو حرفِ آخر سمجھو، خواہ میاں صاحب کی اپنی حیثیت یہ ہو کہ گھر والے بھی ضروری بات کرنے سے پہلے انھیں باہر آلو لینے بھیج دیتے ہوں۔ ان کے احکامات کا انتظار کریں۔

بس میاں کی 'تار' پر چلو۔ کیوں بازیگر ہیں کیا؟ کیا ایسے میاؤں کو بھی کبھی کوئی سکھاتا ہوگا کہ سنتِ رسول سے سبق سیکھنا جہاں بیوی کے حقوق صلح کے سفید جھنڈے کی طرح پھڑ پھڑاتے ہیں۔ جہاں بیوی آقائے دو جہاں ﷺ کے ساتھ سوال و جواب کرسکتی ہے، جو اپنا پاپوش مبارک خود مرمت کرسکتے تھے، لباس مبارک کو پیوند لگا سکتے تھے۔ کہاں گئے یہ سب دروس، اور حسنِ سلوک کے سب اسباق کیوں نہیں پڑھائے جاتے بیٹوں کو۔

یہ تو بعد میں یورپ میں بسنے والے مسلمانوں کے خانگی حالات سے میں نے نتیجہ اخذ کیا کہ اسلام کو رسوا کرنے کی کوششوں میں سب سے زیادہ یہی مسلمان شامل تھے جن کے بیٹوں کی بغل میں گوری اور ہاتھ میں آبِ آتشیں کی بوتل دبی ہوتی۔ اولاد کی اسلامی تربیت کے تمام تر فرائض وہ

اپنی بیٹیوں کو پاکستان کے دور افتادہ اسلامی مدرسوں میں بھیج کر پورے کر لیتے۔ پھر ان بیٹیوں کے ساتھ چاچے یا مامے کے بیٹے کو بیاہ کر یورپ درآمد کرلیا جاتا، خاندان میں بھی واہ واہ ہوجاتی اور اسلامی احکامات بھی پورے ہوجاتے۔ بے جوڑ شادیوں کے یہ سلسلے اس وقت تک جاری رہے جب تک حکومت نے عمر کی پابندی اور اقتصادی شرائط لگا کر گھیرا تنگ نہ کیا۔

••

ایف اے کے نتائج کے بعد گولڈ میڈل اور جمع شدہ انعامات لینے کے لیے ابا جی کو خصوصی دعوت نامہ آیا لیکن وہ لاہور کسی جلسے میں شرکت کی وجہ سے کالج نہ جاسکے تو امی جی ساتھ گئیں۔ ظاہر ہے وہاں تو سب سراہنے والے تھے۔ جھاڑنے والا کوئی نہ تھا۔ ایف اے میں ٹاپ کرنے اور بین الکلیاتی مقابلے جیتنے کے انعامات جمع ہوئے تھے۔ امی جی مبارکبادیں وصول کرتی رہیں لیکن گھر آکر بولیں...

''باہر ماں دا جنٹلمین، گھر آوے تے جتیاں پین، باہر کی کتابی دنیا سے ہٹ کر گھر کی بھی دنیا ہوتی ہے جو سلیقے اور گھرداری سے ہی چلتی ہے۔ کسی مغالطے میں نہ رہنا۔ زندگی شیریں بیانی، ہنر اور اخلاق سے گزرتی ہے۔ انڈہ ابالنا تو آتا نہیں تمھیں، بس نری ٹرٹر۔''

ابا جی کو ہمیشہ میری یہی ایک شکایت لگائی جاتی۔

''یا اللہ!'' مجھے اختلاج ہونے لگتا ایک ہی طرح کے طعنے سن سن کر، ''یہ مرغی ابلا ہوا انڈہ کیوں نہیں دیتی میرے مولا؟''

''ہاں۔۔ اللہ اگر گنجے کو ناخن دے اور تمھاری حکومت رہی تو مرغیاں ابلے ہوئے انڈے ہی نہیں آملیٹ بھی دینا شروع کر دیں گی مہارانی صاحبہ سے احکامات لے کر'' امی جی کا دیسی ''آئرنی'' (Irony) سے چھلکتا جواب آتا۔

••

امی کی ایک سہیلی تھیں جو بے حد نمازیں پڑھا کرتیں۔ تہجد بھی اور اشراق وغیرہ بھی۔ سو نیند بھی پوری نہیں ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں وہ دن بھر سورتیں بھی پڑھتیں سو جب وہ ہماری طرف آجاتیں تو امی کو سناتی رہتیں کہ بچوں کا شور ہوتا ہے میں سو نہیں سکتی۔ کبھی ان کی بہو کسی بچے کی دوا لینے آجاتیں تو دبے لفظوں میں کہہ دیتیں کہ پھوپھی جان رات جاگنے میں اور سارا دن بچوں پر سختی کرنے میں گزارتی ہیں۔ شام کو باقی خاندان کو افطاری پر بلا لیتی ہیں۔ بچوں کو بھی دیکھتی ہوں اور

کام کرتے کرتے تھک بھی جاتی ہوں۔ ایسے میں کوئی کمی بیشی رہ جائے تو جھٹ بچوں کے پاپا کو دوبئی فون کر دیتی ہیں۔ آپ ہی ذرا اپنے طریقے سے بات کریں اور سمجھائیں، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ میں بہت تھک گئی ہوں اس نماز روزے اور عبادات کے ''ڈرامے سے۔''

میرے ہاتھ تو بات آ گئی۔ میں نے کہا کہ ''ان کی صحت تو اتنی اچھی ہے۔ خود کیوں نہیں کام کرتیں۔ اپنی آل اولاد کو دعوتوں پر بلاتی ہیں تو ان کے لیے پکایا بھی کریں۔ مجھے تو وہ ویسے ہی اچھی نہیں لگتیں۔''

امی جی کو مجھ پر بہت غصہ آیا۔ کہنے لگیں ''بزرگوں کو ایسے براہِ راست بات نہیں کہتے۔''

••

ابا جی تو خیر خدمتِ خلق کے لیے کوشاں رہتے ہی تھے، امی جی نے بھی ان کی معتمدِ اعلیٰ کا عہدہ سنبھال رکھا تھا۔ امی جی نے سبز رنگ کا ایک غلاف سی رکھا تھا جس میں زکوٰۃ کے پیسے ایک چھوٹی سی کالی ڈائری اور دو پنسلیں پڑی رہتی تھیں۔ اس کا باقاعدہ حساب کتاب ہوتا اور درمیان میں کاربن پیپر رکھ کر نقل بنائی جاتی۔ ایک ابا جی کے رجسٹر میں ہوتی اور دوسری ریکارڈ کے لیے بھیجی جاتی۔

امی جی پوری ذمہ داری کے ساتھ وہ حساب کتاب تحریر کرتیں اور پھر پہلی تاریخ کے آتے ہی ان گھرانوں کو پیسے اور سودا سلف بھیجنے کا اہتمام کرنے لگتیں۔

••

بابا جان کی عمر کے آخری ایام میں روز شام کو ان کے پاس جاتیں، پیروں کی مالش کرتیں۔ پاس بیٹھ کر اخبار پڑھ کر سناتیں اور گھر آ کر کونوں میں چھپ چھپ کر روتیں۔ بابا جان نے امی جی کو فارسی پڑھانے کی بہت کوشش کی تھی اور ہمیشہ کہا کرتے کہ کم عمر مائیں تو اپنے بچوں کی تعلیم کے ساتھ خود بھی تعلیم حاصل کر سکتی ہیں۔ امی جی ہماری درسی کتب پڑھتیں اور ان کہانیوں کا مزید پس منظر سنایا کرتیں۔

بابا جان امی جی کو فارسی حکایات اور اردو کہانیوں کی کتابیں دیا کرتے۔ پھر وہ ان سے ان کہانیوں کے بارے میں بات کیا کرتیں۔ وہ ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ بابا جان کے ہمارے خاندان پر دوہرے احسانات ہیں کہ وہ پوری نسل کے استاد بھی ہیں۔

امی جی کو بابا جان سے بہت محبت تھی اور وہ اس کا اظہار دودھ بالائی والی گرم چائے پلا کر کرتیں۔ بابا جان صحن میں رکھی چارپائی پر بیٹھتے تو امی جی جلدی سے ان کے لیے کرسی لے کر آتیں،

اہتمام سے سامنے میز رکھتیں اور پھر اوپر چائے کی پیالی سجائی جاتی جسے بابا جان بہت شوق سے نوش فرماتے اور امی جی کو کئی اقسام کی چائے بنانے کے نسخے بتاتے۔ کبھی مجھے لگتا کہ اس گھر میں جتنے درخت، پتے، بوٹے ہیں سب کی چائے بنا کر پی پلا دی جائے گی۔ امی جی کو رنگا رنگ قہوے اور چائے بنانا بھی شاید ان حکما کی مشترکہ تدریس سے آتی تھی۔

••

امی جی کے پیر بہت چھوٹے چھوٹے سے تھے بلکہ ان سے وراثت کے طور پر کسی کے بھی پیر بڑے نہیں تھے۔ ہمارے چچا جان ایک محاورہ بولتے تھے، سر وڈے سرداراں دے تے پیر وڈے گنواراں دے'' مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے اس کی لے الاپنا شروع کی۔ امی سنتے ہی حسبِ معمول ناراض ہوگئیں۔ ''اللہ کی بنائی چیز میں کیا دخل، تم سوچ سمجھ کر کیوں نہیں بولتیں؟''

میں ان کے لیے ایکو کا جوتا لے کر گئی۔ امریکہ میں ایک تو ویسے ہی ڈنمارک کی نسبت شاپنگ سستی تھی اوپر سے مجھے سیل پر مل گیا۔ میں بہت خوشی سے لے کر گئی۔

''امی جی یہ بہت نرم جوتا ہے۔ بس اب چلنے کے لیے یہی پہنا کیجیے۔''

اگلی دفعہ گئی تو وہ جوتا گھر میں مدد کے لیے آنے والی آپا نے پہن رکھا تھا۔ میں نے بڑی محنت سے اپنا غصہ برداشت کیا۔ رات کو میں نے امی جی سے پوچھا کہ کیوں دیا ہے اس کو جوتا، میں اتنے شوق سے لائی تھی۔ کہنے لگیں:

''پتر میں پیدل کب چلتی ہوں۔ اللہ سلامت رکھے آپ کے بھائیوں کو، دروازے کے آگے گاڑی آتی ہے۔ وہ بے چاری سارا دن چلتی ہے۔ ہمارے گھر تو ہیٹر لگے ہیں، ان بے چاریوں نے سردی میں لوگوں کے کام کرنا ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا بند جوتا ہے، جرابوں کے ساتھ پہن لے گی۔''

کبھی اسے ہیٹر کے پاس بٹھا کر کہتیں کہ ابلا ہوا انڈا اور گرم چائے کی پیالی پی کر گھر جانا۔ میں امی جی سے پوچھنا چاہتی تھی کہ آپ نے ٹھیکہ لے رکھا ہے، آپ کے آرام کے لیے ان کو بلایا جاتا ہے اور اگر آپ نے خود ہی سارے کام کرنا ہیں تو فائدہ کیا۔ لیکن مجھے علم تھا کہ میں نے ایسی کوئی بھی بات کہنے کی جسارت کی تو امی جی نے بچوں کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر میری جنج چڑھا دینی ہے۔ اب تماشہ دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔

••

بڑے بھائی جان کی شادی ہوئی۔ ہماری بھابی بقول ہماری امی صورت و سیرت دونوں میں یکتا لگتی تھیں۔ ہمیشہ کہا کرتیں کہ فیروزی رنگ اور میرون رنگ جتنا میری شاہدہ کو سجتا ہے میں نے کسی کو اتنا خوبصورت لگتے نہیں دیکھا۔

بھابی نے کچن میں کام شروع کیا تو بھائی جان ان کے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ پہلے انھوں نے لاکر پنکھا لگایا۔

''یہ چولھے کی آگ کو منتشر کر دیتا ہے۔'' وہ بولیں۔

''اچھا'' اب وہ پنکھی اٹھا لائے۔

میں ان دنوں بی اے میں تھی۔ میں نے کہا،''لائیے بھابی میں سلاد بنا دیتی ہوں۔'' ہم دونوں کام کم اور باتیں زیادہ کر رہی تھیں۔ بھابی قیمہ بھرے کریلے بنا رہی تھیں اور بھائی جان نے کیونکہ باورچی خانے میں کام ہوتا دیکھا ہی پہلی مرتبہ تھا سو عش عش کر اٹھے...

''ارے واہ۔ جب عورت باورچی خانے میں کام کرتی ہے تو وہ art create کر رہی ہوتی ہے۔'' مجھے بہت ہنسی آئی کیونکہ میں خود بھی اس وقت کھانا پکانے تک زیادہ دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ مجھے صرف ورائٹی ڈشز بنانے کا شوق تھا۔

میں نے امی جی کو کہا کہ بھائی جان کہتے ہیں کھانا پکانا آرٹ کریٹ کرنا ہے۔''وہ کیا ہوتا ہے؟'' انھوں نے اپنی فطری سادگی سے پوچھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بے حد نفیس اور نازک چیز تخلیق کرتی ہے۔ امی جی خوب ہنسیں۔ کہنے لگیں ''پتر ذرا اندر تو آ۔ آرٹ کریٹ کرواتی ہوں۔ آج باورچی خانے کا دروازہ دیکھا تو آج خالق و تخلیق کی سمجھ آ گئی۔''

••

ابا جی کے پاس جب بھی گھریلو تنازعات آتے اور ان میں اکثر وہی پرانے قضیے ہوتے کہ بہو گھر کے کام نہیں کرتی، ساس سسر کی خدمت نہیں کرتی، میکے کے چکر زیادہ لگاتی ہے، تو ابا جی اکثر ان کو بتاتے کہ والدین کی خدمت خود ان کی اولاد پر فرض ہے۔ بھائیوں کے عقد میں آنے والی عورتوں پر فرض عائد نہیں ہوتا کہ وہ آپ کی نسل کی افزائش بھی کریں، آپ کے بیٹے کا گھر بھی بسائیں اور اس کے والدین کی بالجبر خدمت بھی کریں، جب کہ آپ کی اپنی بیٹیوں کے لیے سارے اصول اور قوانین بدل جائیں۔

بیویوں اور بہوؤں کو سہولتیں دیں تاکہ وہ انسانی ہمدردی اور بہتر خاندانی تعلقات کے

تحت بخوشی سب سے محبت بھرا برتاؤ کریں۔ ملازمہ کی طرح ڈیوٹیاں لگاکر اور زبردستی کی جبری خدمت کرانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ امی جی کی بلند بختی تھی کہ وہ ایک بے لوث محبت کرنے والی بہو کے پاس اپنے آخری سانسیں گزار کر گئیں۔ آج مجھے چچا جان شریف کے آنسوؤں کی سمجھ آتی ہے کہ جو آپ کے والدین کی خدمت کرتا ہے اس کی محبت بے بس کر دیتی ہے۔

••

اُسامہ نے کہیں امی جی سے سن لیا کہ جگہ بڑے گھروں میں نہیں ہوتی بلکہ دلوں میں ہوتی ہے تو تب ہی سب مل کر رہتے ہیں۔ اس کی چچی اور چاروں بچوں کو ہمارے ساتھ ایک ہی گھر میں رہنا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کی چچی نے کہا کہ آپ لوگ مل کر چھ ہو جاؤ گے تو اودھم مچاؤ گے۔ پھر تمھارا کمرہ بھی تو چھوٹا ہے ناں؟

''جگہ گھروں میں نہیں دلوں میں ہوتی ہے'' اُسامہ نے کہا۔ اس کی چچی ہنس کر بولیں، ''تم کہاں سے یہ باتیں سیکھتے ہو؟'' شاید ہم بڑوں کو یہ علم نہیں ہوتا کہ بچے ہماری نصیحتوں سے نہیں ہمارے اعمال سے سیکھتے ہیں۔ ان کا بچپن ذہن میں راسخ ہو جاتا ہے۔ سارا گھر چھوڑ کر چاروں ایک ہی کمرے میں گھس کر سوتے۔ مجھے اپنے بچپن کے دن یاد آجاتے جب ہمارے گھر میں تایا زاد اور چچا زاد بھائی جمگھٹا بنا کر بیٹھا کرتے۔ عید کا موقع آتا تو امی شور مچاتی رہ جاتیں کہ ایک ہی راستے سے عید گاہ مت جانا۔

''ساڈا کیہہ اے امی جی'' حماد شرارت سے کہتا، ''کھلو جایئے تے جلسہ، جے ٹُر پیئے تے جلوس'' (کہیں رک جائیں تو جلسہ اور اگر چل پڑیں تو جلوس)۔ ''چل چپ کر، ماشاء اللہ پڑھا کرو'' پھر آیت الکرسی کا حصار کرتیں۔

میں ظاہر ہے لڑکوں میں پلی، اور ابا، بابا جان، تایا جان اور چچا جان کی محبوب شاگرد تھی۔ چچا جان سے تو کبھی سرزنش نہ ہوئی۔ لیکن جہاں ذرا سی بات منہ سے نکلی، امی محاورات کا دوہتھڑ رسید کرتیں، زبان شیریں.... ملک گیریں، یعنی میٹھی زبان سے ملک سنبھالے جاسکتے ہیں۔ ذرا حالات ابتر ہو جاتے تو کہتیں، ایہہ ای زبان تخت بھٹاندی اے، تے ایہہ ای کھوتے چاڑدی اے، یعنی اسی زبان کی مٹھاس تخت نشیں کرتی ہے اور یہی گدھے پر بٹھاتی ہے (منہ کالا کر کے)۔

امی جی سے ہزار جھاڑ جھپاڑ کھانے کے باوجود ان کی زندگی کے مشغولات، ان کی بات چیت کا انداز بھی میرے ساتھ ساتھ ہی آیا اور اب وہ میرے بچوں میں بھی ویسے ہی زندہ ہے۔ بچے

اسی طرح بولتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گھر کے دروازے سے اندر آتے ہی السلام علیکم کے جواب میں پہلے امی جی کی آواز آتی، ''بسم اللہ۔۔ وعلیکم سلام'' اور کبھی جو خدا حافظ کہیں تو ''خیر سے جاؤ۔ اللہ کی امان'' ابا جی کا لہجہ گونجتا۔ امی جی کی ''بسم اللہ'' کہنے کی عادت نجانے وراثت کے کس راستے سے میری اگلی نسل تک پہنچی۔

ایک دن میرا پاؤں پھسل جانے پر میری ڈیڑھ برس کی نواسی کے منہ سے نکلا ''بِس لا نانو'' (بسم اللہ) اور میں اس کے ننھے سے یاقوتی دہانے کو دیکھتے ہوئے ششدر کھڑی رہ گئی۔

میں ترسیل کے درمیانی چوراہے پر کھڑی وہ لہجے زندہ ہوتے دیکھتی ہوں۔ میرے ذہن کے روشن خانے میں والدین سے وراثت میں ملے لہجے، انداز، آواز والفاظ بے دھڑک گونجتے ہیں اور زبان ان کو لاشعوری طور پر ان ہی کے انداز میں دوہراتی ہے جو شاید تربیت کی صورت میں اگلی نسل تک پہنچ رہے ہیں۔

امی جی کی عادت تھی کہ جو عورتیں اور بچیاں ان کے پاس اپنے مسائل لے کر آتیں، وہ سب سے پہلے انھیں اپنی زبان بند رکھنے کا مشورہ دیتیں۔ کوئی کچھ بھی کہہ لے، بس کوشش کرو کہ اسی وقت حساب بے باق کرنے کے لیے ترکی بہ ترکی جواب نہ دو تاکہ بعد میں جب طیش اترے تو آپ کو ندامت نہ ہو۔

اسی طرح ایک منہ بولی بیٹی کو سمجھا بجھا کر واپس سسرال بھیجا اور سبق دیا کہ مردوں سے خواہ وہ باپ اور بھائی، بیٹے ہی کیوں نہ ہوں، بلاوجہ زبان درازی نہیں کرتے۔ اس سے آپ کی بات کی شنوائی تو کیا ہوگی، الٹا آپ کی عزت بھی جاتی رہے گی۔

عالیہ کی ہم جماعتوں کی شادیاں اس کے بعد ہوئیں۔ ان میں سے کسی نے اس سے پوچھا کہ تم نے پڑھائی بھی کی، گھر بھی چلایا اور بچی بھی سنبھالی، مجھے بھی کامیاب زندگی کا کوئی گر بتا دو۔ عالیہ نے جواب میں اسے ڈینش میں جو پیغام بھیجا اس کا ترجمہ تھا کہ میری نانو جان کہتی تھیں کہ مٹھی بند ہو تو لاکھ کی اور کھلے تو بس خاک کی۔ جو بات ہونٹوں پر روک لی جائے وہ تو کسی بھی وقت کہی جاسکتی ہے لیکن جو بات کہہ دی جائے وہ واپس نہیں ہوسکتی۔

اولاد کی تربیت کرنے میں بھی یہی اصول ہے کہ بچوں کو بالخصوص جوان ہوتے بچوں کو جو منہ میں آئے مت کہو، کسی وقت بات سنبھالنے کے لیے الفاظ ہونٹوں پر روکنے بھی پڑتے ہیں۔ بس زندگی میں یہ عادت بناؤ کہ تڑاخ کر کے بات منہ پر مارنا کوئی فخر کی بات نہیں۔

••

''بندہ، ڈوئی دی ڈنڈی جڈا وی مان نہیں ہوندا'' (بندہ ڈوئی کی ڈنڈی جتنا بھی ہو اسے برتری کا احساس رہتا ہے)، مرد مٹی دا وی مان نہیں'' امی جی نے موقع کی مناسبت سے محاورہ پھینکا۔ میں اُسامہ کے کپڑے بدل رہی تھی، ''اف خدایا امی جی بس کر دیں، خدا کے واسطے۔ پتہ نہیں کس آس پر آپ نے اس بے چاری کو راضی کر کے بھیجا تھا۔ حال دیکھیں اب اس کا، پانچ بچے ہو گئے ہیں۔

''یہ کون سی زنجیر پہناتی ہیں عورتیں خاوند کو؟ خود ہی سوچیں کہ جو ایک دو بچوں کی کفالت نہ کر سکا، ان کے اخراجات کے لیے بیوی سے لوگوں کے جھوٹے برتن دھلواتا رہا، اسے چار پانچ بچے کیا انسانیت پر مائل کریں گے؟''

''باجی چھوڑیں رہنے دیں، خالہ جی کا کیا قصور؟ ہماری تو بس زندگی ہی یہی ہے کہ 'وچ شریکاں وسیے، اندروں رویئے تے باہروں ہسیے' (شریکوں کے درمیان بستے ہیں، اندر سے روتے ہیں اور بظاہر ہنستے ہیں۔)

میں نے اس ان پڑھ دانشور کا چہرہ دیکھا جسے گھر والوں نے اور میری ماں سمیت معاشرے والوں نے مجبور کر کے دوبارہ مجازی خدا کے پاس اس کے بچے پیدا کر کر کے اس کے پاؤں باندھنے کے لیے بھیجا تھا، جس کے کان میں کسی دانشمند بوڑھی نے پھونک دیا تھا کہ بچے کامیاب زندگی کی ضمانت ہوتے ہیں، مرد کے پیر بندھ جاتے ہیں۔

''امی۔۔! آپ ہی تو محاورہ بولا کرتی تھیں کہ 'چار کُھر دی راکھی ہوندی اے تے دو کھراں والے دی راکھی کوئی نہیں' (چوپاؤں کا پہرہ تو دیا جا سکتا ہے لیکن دو پاؤں والے قابو میں نہیں ہوتے)۔

آپ لوگوں نے اس بے چاری کو تباہ کر دیا۔ پہلے وہ دو بچوں کا نان نفقہ پورا کرتی تھی، اب پانچ کا کرے گی! خود ہی انصاف کریں کہ پہلے والی صورتِ حال بہتر تھی یا اب والی؟''

امی خاموشی سے ابلتی ہوئی چائے میں چمچہ چلاتی رہیں۔

باہر صحن میں میری بیٹی اس کے نوزائیدہ بچے کے ننھے ننھے ہاتھ کھول کر اس کی مٹھی میں اپنی انگلی رکھ رہی تھی، ''بے بی۔۔ بے بی۔۔۔ میرا ہاتھ پکڑیں نا۔ بے بی۔۔ یس ماما۔۔۔ امی ہم اسے کیا تحفہ لے کر دیں گے؟''

اگلے چند دن دونوں بہن بھائی بازار سے بچے کے فیڈر، چوسنیاں اور رنگ برنگے

کپڑے اور کھلونے اکٹھے کرتے رہے اور انھیں رنگ برنگے چمکیلے نیلے کاغذوں میں لپیٹتے رہے۔

''یہ اتنے ڈھیر سارے نیلے کاغذ کیوں لے آئی ہو بیٹا؟'' امی جی نے عالیہ کے بے حد مصروف چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نانو'' اس نے اپنے ہلکے بھورے گھنگریالے بالوں کو جھٹکا دے کر پیچھے ہٹایا ''ضروری تھا کہ نیلا کاغذ ہی ہوتا۔''

''وہ کیوں میرا بچہ؟'' امی جی بھی اس سے جان کر ہی دم لینا چاہتی تھیں۔

''نانو!'' اس نے چھوٹی سی قینچی سے ربن کاٹا اور بڑے مصروف انداز سے کام روکے بغیر بولی، ''جو لڑکے ہوتے ہیں ناں، ان کے تحفے بھی نیلے ہی رنگ کے لیتے ہیں اور پھر نیلے کاغذ میں ہی لپیٹتے ہیں۔ اس طرح پتہ چل جاتا ہے کہ بے بی لڑکا ہے۔''

''اچھا۔ اچھا'' امی نے کسی سعادت مند شاگرد کی طرح گردن ہلائی جیسے بات سمجھ آ گئی ہو۔

''جی نانو۔۔ اس طرح کسی سے پوچھنا بھی نہیں پڑتا کہ یہ کیا ہے۔ سب کو خود ہی پتہ چل جاتا ہے کہ گلابی رنگ بے بی لڑکی کا ہے اور نیلا رنگ بے بی لڑکے کا ہے۔''

''اچھا اچھا۔۔۔ بے بی لڑکی کا گلابی رنگ ہوتا ہے؟'' امی جی کے علم میں اضافہ ہوا۔

ابا جی اور میں جو اب تک خاموش تماشائی کی طرح بیٹھے ساری کارروائی دیکھ رہے تھے، ہنس پڑے۔ ابا جی اس کے پاس بیٹھ کر بولے، ''اچھا یہ تو بتائیں آپ اتنی محنت سے ان کاغذوں میں تحائف کیوں لپیٹ رہی ہیں؟''

''تا کہ بے بی خوش ہو۔ جب وہ کھولے تو اس کے لیے سرپرائز ہو'' اس نے کاغذ کے اوپر سکواچ ٹیپ لگائی۔

''لیکن ایک مسئلہ ہے کہ بے بی تو ابھی یہ بات سمجھتا ہی نہیں۔ وہ تو بہت چھوٹا ہے؟'' ابا جی کی جرح جاری تھی۔

''اس لیے نانا ابو۔۔۔'' اب کہ بھائی فوراً مدد کو آیا۔ وہ اب تک بہن کو کاغذ اور ربن پکڑا رہا تھا ''کیونکہ بے بی کی امی تو سمجھتی ہیں ناں، پھر وہ خوش ہوں گی۔ اور جب وہ خوش ہوں گی تو بے بی بھی خوش ہوگا۔''

ابا جی چند لمحوں کے لیے دونوں کو دیکھتے رہے پھر کہنے لگے، ''کاش بچوں کی طرح ہم یہ بات سمجھ جائیں کہ دوسروں کو خوش کرنے میں کتنی راحت ہے۔''

میں شادی کے ہنگاموں کے دوران اس بے چاری کی بھاگ دوڑ اور مصروفیت کو دیکھ دیکھ کر جھنجھلاتی، ''امی جی آپ کو کیا پڑی تھی اس بے چاری کو راضی ناموں پر دستخط کیے بغیر بھجواتیں، بھگتیں اب۔''

''بس باجی۔۔اللہ کی دین ہے'' وہ جلدی جلدی جھاڑو لگاتی ہوئی بولی۔

''اللہ کی دین ہے تو تمھارے محمد دین کا کوئی واسطہ نہیں؟''

''ہی ہی ہی۔۔۔'' وہ جھاڑو چھوڑ کر دانت نکوسنے لگی۔

''بیٹا ایسے باتیں نہ کیا کرو، آپ کی امی کو صدمہ ہوتا ہے۔ اللہ نے اپنی ساری صفات اس عورت کو دے ڈالی ہیں'' ابا جی بولے۔

''ابا جی۔۔۔بس رہنے دیجیے۔ اسی افیم کے سہارے اور عورت کو جاہل رکھ کر ہر طرح کا ظلم اور تسلط برقرار رکھا جاتا ہے، پھر اسے جنت کی بشارت دے دی جاتی ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ زبان کھولتی ہے تو سب اسے جذباتی کہہ کر زبان بندی کا حکم دیتے ہیں۔ آپ کے پاس دن رات ایسی خواتین آتی ہیں، آپ ہی بتائیے کہ محنت مزدوری کے جواب میں وہ مانگتی کیا ہیں؟''

''مرد کی توجہ، محبت۔۔۔۔عزت؟'' ابا جی بولے، ''اپنے بچوں کی تختی اور قلم دوات کے لیے ہاتھ نہ پھیلائیں۔''

''ملازمت کرنے والی عورت جو دو دو محاذوں پر لڑتی ہے، وہ کس چیز کے پیچھے بھاگتی ہے؟''

''بچے اچھے سکولوں میں پڑھ جائیں، تعلیم حاصل کرلیں۔ اور کس چیز کے پیچھے بھاگنا ہے بے چاری نے؟''

''تم دونوں باپ بیٹی رنگ میں بھنگ ڈالا کرو بس۔ اور کچھ نہیں آتا آپ دونوں کو'' امی نے نالاں ہو کر اسے باہر بلالیا۔ اس نے ایک موٹی چادر کو چارپائی کے ساتھ باندھا اور جھولا سا بنا کر بچہ اس میں ڈالا اور امی کے ساتھ کام میں لگ گئی۔

ہم دونوں باپ بیٹی اس کے بڑے بچوں کو دیکھنے لگے جو ماں کے ساتھ چھوٹے بھائی کو سنبھالنے آئے تھے۔ اپنی خالق والی صفت کے ساتھ ساتھ رازق والی صفت بھی عطا کی ہے۔ یہ اس کی حکمت ہے کہ اللہ نے ماں کے دل میں جذبات کا سمندر رکھا ہے جو اپنی اولاد کو پالنے کے لیے اپنی ذات کو کہیں رکھ کر بھول جاتی ہے۔

••

امی جان کا خیال تھا کہ دنیا میں رنگ صرف لال، میرون، آتشی گلابی اور فیروزی ہی ہوتے ہیں۔ جب بھی میرے کپڑے بناتیں وہ ان ہی رنگوں کے ہوتے۔ ایک دفعہ میں پاکستان بھائی کی شادی پر آئی تو ان ہی رنگوں کے سوٹ بنائے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ ایک سوٹ آتشی گلابی تھا جس پر سلور سلمہ ستارے اور سلور بے حد چھوٹے موتیوں کا کام ہوا تھا۔ اصرار کرنے لگیں کہ تم یہ سوٹ پہن کر جاؤ۔ میں نے ہزار سمجھایا، امی لوگ جہاز میں سلامیاں دینے لگیں گے اور کوپن ہیگن اترتے ہی لوگ سمجھیں گے کہ ہیلووین کا شو ہو رہا ہے۔

ناراض ہوگئیں، کہنے لگیں، ''جب ماں نہ ہوئی تو پتہ چلے گا۔''

مجھے ہمیشہ سے موتیا، اور موتیا رنگ کے تمام شیڈ، سفید رنگ اور بادامی رنگ پسند تھے۔ ان کے ڈیزائن دیکھ کر ہمیشہ خفا ہوتیں، ''یہ تم پر کیا آفت آئی ہے، سفید اور موتیا رنگ پہننے کی عمر ہے تمھاری۔''

ابا جی کو ہمیشہ اعتراض ہوتا، ''بیٹا اتنی فضول خرچی اچھی نہیں ہوتی۔ دیکھو دنیا پر قیامت برپا ہو رہی ہے اور تمھاری دوڑ صرف بازاروں اور درزیوں تک ہے۔''

''ابا جی،'' میں نے بقراط بننے کی ناکام کوشش کی، ''یہ بھی تو ضروری ہوتا ہے ناں، لباس آپ کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے، صرف ضرورت کا فلسفہ تو نہیں ہوتا۔''

لیکن ان کا مجھ سے ہمیشہ ہی اختلاف رہا۔ ہزار میں صفائیاں دیتی، ''ابا جی، بھلا وہاں کون کپڑے سی کر دے، پھر جب میں واپس آتی ہوں تو یہ سارے کپڑے ضرورت مندوں کو دے دیتی ہوں۔''

ان کا ایک ہی جواب ہوتا، ''ان عورتوں کو اطلس و کمخواب کی ضرورت نہیں، ان کو تعلیم چاہیے بی بی۔ ان کے مسائل کا حل تعلیم اور دستکاری ہے۔ ان کو ایک پرانا جوڑا دینے کے بجائے ایک جماعت کا نصاب لے دو۔''

امی جی کے ہاتھ کے بنوائے کپڑے آج بھی میرے پاس موجود ہیں۔ ملتان، ڈی جی خان، پشاور، کوئٹہ، جہاں سے ان کا بس چلتا، کشیدہ کاری کروا کے میرے کپڑے بنواتی رہتیں۔ اکثر کہتیں، ''دنکمی نوں اکوای شوق اے۔''

••

ان کا واحد شوق کڑھائیوں والے، کروشیے کی بیلوں سے سجے، تارکشی سفید دوپٹے تھے۔

میری حریصانہ نظریں ہمیشہ ان دوپٹوں پر رہتیں۔ کالج کے زمانے میں امی جی ان کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھیں۔ ان کے چار موم کے اور 7330 کے دوپٹے بہت سینت کر رکھے رہتے۔

لیکن جب ہماری اکلوتی پھوپھو یا ان کی کوئی اپنی سہیلی آجاتی تو فوراً اسے کچھ نہ کچھ نکال کر دیتیں۔ میں فوراً اعتراض کرتی کہ مجھے تو بھی نہیں دیتیں آپ۔

''تو اب کیا خالی ہاتھ بھیجوں؟'' امی جی کی زنبیل کھلتی اور گرم شالیں، دوپٹے، بیڈ سیٹ وغیرہ نکال کر دیے جاتے۔ دوسروں کو تحائف دینے اور کھانا کھلانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ کھانے کی پلیٹوں پر سفید کروشیے کے سرپوش ڈال کر بھیجنے کا بھی شوق رہتا۔

مجھ سے ان کا جھگڑا چلتا رہتا کہ کپڑے سینا سیکھ لو۔ میں بھی ڈٹ کر جواب دیتی کہ یا خانہ داری چلے گی یا کشیدہ کاری اور سوئی سلائی کے قضیے۔ وہ خود تو ایسی سلیقہ مند تھیں کہ نجانے کتنی قسم کے ٹانکے، کڑھائیاں سیکھ رکھی تھیں۔ سلائی میں کئی بے قاعدہ قسم کی شاگرد بھی پیدا کر رکھی تھیں۔

گرمیوں کے دنوں میں جب کوئی عورت کپڑے کٹوانے آجاتی تو امی جی پنکھا بند کر کے فرش پر ہی کپڑا پھیلا لیتیں اور ہاتھ کی ''گٹھ چپے'' بالشت، چار انگلیاں (سے ماپ کر قینچی چلا دیتیں...

ایہہ کُرتے دیاں ''بچیاں'' یعنی بغل میں ڈالنے والا چوکور کپڑا، یہ رہے شلوار کے کندے، کپڑا کم ہے، بازو میں جوڑ آئے گا، یہ رہی کترن جو بازو میں ڈالنی ہے، اسے آستین کی نچلی طرف لگانا ہے تا کہ جوڑ نظر نہ آئے۔ بچی کھچی کترنوں سے گلے کے نیچے لگانے والی پٹیاں کاٹ کر قمیص کے اندر ہی لپیٹ دیتیں اور منٹوں میں جوڑا کاٹ کر ہاتھ پہ رکھ دیتیں۔

انھوں نے اپنے جہیز کی دوسوتی کی کڑھائی والی چادریں سنبھال کر رکھی تھیں۔ دوپٹوں کو امی جی کے ہاتھ سے کروشیے کی لگی بیل عجیب بہار دیتی تھی۔ لیکن میں بھی بہت استقامت سے اپنے بیان پر ڈٹی رہی کہ صرف کھانا پکانا سیکھوں گی، یہ کاٹ پیٹ، سوئی سلائی میرے بس کا روگ نہیں۔

البتہ ایک کام امی جی سے نہایت شوق اور انہماک سے سیکھا۔ اون کے نمونے اور سویٹر بننا مجھے بہت اچھا لگتا۔ صاف ستھرا کام، جہاں مرضی بیٹھے بیٹھے خاموشی سے بنتے رہو۔ اس شوق کی وجہ سے میں نے سویٹر، جرسیاں اور شال تک بن ڈالیں۔

ابا جی نے سلائی کڑھائی کے سلسلے میں بھی میری دستگیری کی۔ ''بھئی بات سنو، روٹی تو روز کھانی ہوتی ہے۔ اگر وہ شوق سے سیکھ رہی ہے تو کرنے دیں۔ آنے والے زمانے میں ہر چیز ریڈی

میڈ ہونے کو ہے۔ جن کو یہ فن آتا ہے ان کے کپڑے بھی درزی سیتے ہیں۔ اس جنجال کو رہنے دیں۔'' تب کہیں جا کر میری جان چھوٹی۔

لیکن کپڑے ڈیزائن کرنا، اور مشین سے اپنے کپڑوں کی فٹنگ وغیرہ کرنے کی حد تک میں کام کر ہی لیتی تھی۔

مجھے سلائی اپنی بیٹی کی وجہ سے ایک چیلنج کی طرح سیکھنا پڑی۔ اس کی چچی انگلینڈ سے واپس آئیں تو لال اور سنہری کپڑا لائیں کہ ان سے اب بچیوں کے کپڑے بنیں گے۔ میں دوپہر کو چولھے چکی سے فارغ ہوئی تو میرا جی چاہا کہ اب عالیہ کا فراک سیا جائے لیکن اس کی کٹنگ کرنا ایک مسئلہ تھا۔ میں نے کبھی زندگی میں یہ کام کیا ہوتا تو آتا۔

دوپہر میں سب کا سونا فرض تھا لیکن مجھے کہاں چین پڑتا کہ منتظر بیٹھی رہوں۔ میں نے عالیہ کا ایک فراک نکالا اور اسے اخبار پر رکھ کر خاکہ بنا لیا، دوسرے اخبار پر اسے قطع کر کے دیکھا، پھر اس میں سلائیوں کی گنجائش رکھ کر ایک اور کٹنگ کی۔

جب شام کو گھر والے سو کر اٹھے تو عالیہ وہ فراک پہنے پونیاں بنائے گھوم رہی تھی۔ یہ کام گو مشاقی کا نمونہ نہ سہی لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں جب بھی کرنا چاہوں گی کرلوں گی کیونکہ اسے سیکھنے میں کسی راکٹ سائنس کا عمل دخل نہیں ہوگا۔ پھر میں نے اپنے طور پر اتنی سی سلائی سیکھ لی کہ جب کبھی ضرورت پڑتی تو میں اپنا لباس تیار کر لیتی۔ آئمہ صوفیہ پیدا ہوئی تو میں نے باقی کے شوق بھی پورے کر لیے۔ ابا جی کی بات بالکل درست تھی کہ جب وقت پڑتا ہے تو ایسے کام آرام سے سیکھے جا سکتے ہیں۔

••

امی جی کی یاد مجھے اس وقت کیسی کیسی شدت سے آئی جب خود ماں بنی۔ امی جی نے ہمارے لیے اتنے بلند معیار بنا دیے تھے کہ ان تک پہنچنا محال تھا۔ درگزر اور حسنِ سلوک کی مثال کم از کم ہم سے تو ممکن نہیں تھی۔ اگرچہ تربیت کا لاشعوری حصہ ہونے کی وجہ سے یہ وصف زندگی میں شامل رہا لیکن امی جیسا جذب اور والہانہ پن شاید اب ممکن ہی نہیں۔ امی ابا جی کے سسٹم میں ایسے لگتا تھا کہ خود غرضی اور بدمزاجی کا پروگرام بٹن شامل ہی نہیں تھا۔ ''جانے دو، خیر ہے، کوئی بات نہیں، مٹی پاؤ، رات گئی بات گئی'' جیسے سخاوت سے لبریز الفاظ امی جی کا تکیہ کلام تھے۔ 'او جانے' پر تحقیق سے معلوم ہوا کہ مطلب انجان ہے۔۔۔ یعنی بے خبر ہے، کہہ کر آگے چلو۔ کوئی بات نہیں۔

••

امی کا حج اور عمرے کے بارے میں تصور ابا جی سے بہت مختلف تھا۔ وہ بہت شوق سے پڑھا کرتیں، ''میں پا کے کفنی مدینے جاواں۔ دل کرتا ہے کہ ہر سال وہاں جاؤں۔''

''کیوں؟ وہاں تمھاری نانی رہتی ہے؟'' ابا جی پوچھتے اور امی کے دلائل شروع ہو جاتے، عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، سفر کی فضیلت اور مغفرت اور بخشش اور نیکیوں کا کئی گنا ہو جانا۔ پھر ابا جی کا سوال ہوتا، ''اچھا یہ بتاؤ خود سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتنی دفعہ حج کیا؟ اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو کب نصیب ہوا؟ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قربت اُن کے آستانے کے سفر سے نہیں ہوتی۔ وہ انفرادی کام ہیں جو قریب کرتے ہیں۔ ہر دل میں کعبہ ہے اور گنبدِ خضرا کے بلند مینار بھی۔'' اس سے کہیں زیادہ ضروری کام ہیں اس ملک میں کرنے والے۔ آپ ان کی طرف دھیان دیں۔''

خوب بحث ہوتی۔ ابا جی کا موقف تھا کہ ''ہر سال اتنا خرچ کر کے جس میں کئی بچوں کی سالانہ تعلیم کے اخراجات اٹھائے جاسکتے ہیں، سوائے نام و نمود کے اور کیا حاصل ہوتا ہے؟ میرا بس چلے تو ان امیروں وزیروں کے لیے عمروں پر پابندی لگا دوں اور وہی رقم نادار بچوں کی کفالت اور ان کی تعلیم پر لگا دوں۔''

••

میں جب بھی پاکستان سے واپس آنے لگتی، امی جی چلتے چلتے بیگ میں جوس کا ڈبہ ڈال دیتیں، مونگ پھلی کا لفافہ، بھٹی کے بھنے ہوئے دانے، لہسن جلا کر تیار کیا ہوا تیل، چھلے ہوئے مٹر، سرکے میں بھگو کر خشک کی ہوئی اجوائن، خمیرہ یاقوتی جواہر دار، دھلی ہوئی اور پسی ہوئی دار چینی، سونف، تخم بالنگو اور نجانے کیا کیا سوغات جمع کر کے رکھی ہوتی۔ ایک مرتبہ ٹی وی لنک کی ٹیم میرے گھر آئی تو میں نے پاکستان سے آئے آملے اور ہرڑ کا مربہ پیش کیا۔ سرور صاحب کہنے لگے، ''آپ کے بزرگوں نے خوب کشتے کھلا رکھے ہیں تاکہ آپ کسی کو ہلنے نہ دیں اور خوب کشتوں کے پشتے لگائیں۔''

''بالکل'' میں نے تائید کی۔ ''ہماری امی کہا کرتی تھیں کہ کبھی زبان بند بھی رکھا کرو۔ تمھارا وہ حال ہے کہ، ہلیائیں کہ سلیائیں۔''

••

ابا جی اکثر کہا کرتے تے کہ ''یاد رکھیں زندگی کتنی بھی طویل کیوں نہ ہو ایک بات آفاقی

ہے۔ ہر مذہب میں موت کا ایک ہی عقیدہ ہے کہ وہ ضرور آئے گی، بھلے وہ اپنے مردوں کو جلائیں، دفنائیں یا پانی میں بہائیں، مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین رکھیں یا جھٹلائیں۔ بس یہی ایک بات طے ہے اور یہی بات مساوات قائم کرتی ہے کہ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔کل من علیہا فان۔'' انھوں نے اپنی محبوب آیت دوہرائی۔''اس فانی زندگی کے ستر اسی کی دہلیز تک بھی پہنچنا ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا، پھر یہ حرص و ہوس کی دوڑ کیسی؟''

نہ کر بندیا میری میری
نہ تیری نہ میری
چار دناں دا میلہ دنیا
فیر مٹی دی ڈھیری

پھر نجانے کب اس مٹی کی ڈھیری کی خاک میرے اندر اڑنے لگی۔

مٹی کا باوا، جس کے ہاتھ بھی مٹی
آنکھ بھی مٹی
مٹی کا باوا، جس کا دل بھی مٹی،
دل کے اندر بجنے والی جھانجھر کا ہر گھنگرو مٹی

ابا جی کے دنیا چھوڑ جانے کے بعد ہر چیز سے دل اچاٹ ہوگیا۔ میں گھنٹوں خاموش بیٹھی رہتی۔ کوئی تعزیت کے لیے بھی آتا تو کمرے سے باہر نہ نکلتی۔ کھانے کو جی نہ چاہتا۔ میں نے بعد میں ان کے گلے گزاریاں سنیں کہ تم کوئی بات کیوں نہیں کرتیں؟ میں نے کہا،

سنے جاتے نہ تھے تم سے میرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ، میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

''دوئے چیزاں بھیڑیاں، گل وی بھیڑی تے شکل وی بھیڑی۔'' (کوئی چیز تو اچھی رہنے دو، رُو بھی بُری اور خُو بھی بُری۔) امی جی نے اپنا مقولہ دوہرایا اور بیزار ہوکر اپنا چشمہ اور اخبار اٹھالیا۔

••

امی جی نے کبھی ڈنمارک سے کسی آنے جانے والے کو خالی ہاتھ نہ بھیجا۔ عالیہ کے لیے رنگ رنگ کے لہنگے، فراکیں، غرارے اور میکسیاں بھیجتیں، ساتھ ہی نصیحت کا پٹارہ کہ اس کو شروع سے ہی اپنا لباس پہننے کی عادت ڈال دو، رنگ برنگے کپڑے ہوں گے تو تب ہی شوق سے پہنے گی۔

بالواسطہ طور پر اس کی تربیت میں امی کا ہمیشہ ہاتھ رہا۔ اردو کے قاعدے، کتابیں، کیسٹ اور رنگ برنگ کارٹونوں والی رنگ بھرنے کی کتابیں، رنگین پنسلیں، رنگ برنگے پرکشش ربڑ اور طرح طرح کی بالوں میں لگانے کی سوئیاں اور پونیاں وغیرہ بھیجتیں جن سے اس کا ڈبہ بھرا رہتا۔

جب تک بچوں کی چچی اور میں ایک گھر میں رہیں، امی جی مجھے جوڑا بھیجتے ہوئے ساتھ چچی کا سوٹ بھی بھیجتیں۔ پھر تاکید ہوتی: پہلے اسے پسند کرا لینا۔ دیکھو اصل رشتے اور اصل بہنیں یہی ہوتی ہیں، نندیں بے چاری تو اپنی سسرال چلی جائیں تو عید شبرات پر ہی آ سکتی ہیں۔ انھیں اپنے رشتے سنبھالنے اور نبھانے کی محنت اور قربانی دینا ہوتی ہے۔ دیورانیوں جٹھانیوں سے حسنِ سلوک خاندانوں کو جوڑ کر رکھتا ہے اور خلقت میں بھی نیک نامی، اولاد کا بھی فائدہ، بہتری اور اچھی تربیت اس میں ہے کہ ان کو رشتوں کا تحفظ دیا جائے، ان کی شخصیت میں بگاڑ نہیں آتا۔ آپ سب سے بڑی ہیں ناں بیٹا، تو آپ پر ذمہ داری بھی زیادہ ہے۔"

میں خاموشی سے امی جی کے لیکچر سنتی رہتی۔ زندگی کے اس موڑ پر میں نے ان سے کوئی بھی گلہ نہ کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ ان کا مزاج کمپیوٹر کی طرح سیٹ تھا جس میں رنجش، بدگمانی، بدنیتی اور بدزبانی کی کہیں گنجائش نہیں تھی۔ مجھے علم تھا کہ انھیں ہر دکھ سے بچانے کے لیے مجھے ہر دکھ خود اپنی ذات تک محدود رکھنا تھا۔ کبھی ضبط کی چھلنی سے کوئی قطرہ رِس کر ان کی آنکھ تک نہ جائے۔ میں نے ان کو ہمیشہ خوش دیکھنے اور رکھنے کی کوشش کی۔ ان کے فرمودات اور ارشادات پر حرف بحرف عمل بھی کیا لیکن میں انھیں اس صدمے سے نہیں بچا سکی جو ان کے بیٹے کے حادثے کے فوراً بعد ان کو ملا۔ وہ اندر ہی اندر حیران ہوتیں۔ لیکچر میں سارا نصاب بھی درست تھا، سارے سوالات کے جوابات بھی بالکل ٹھیک تھے، پھر نتائج کیوں بدل گئے؟ خود اپنے ہاتھ سے سارا نصابِ تعلیم بدلنا پڑا، نظامِ تعلیم کو وہیں چھوڑ کر خود اپنے ہاتھ سے نئی کتاب تحریر کرنا پڑی۔ کبھی بہت پریشان ہوتیں تو کہہ دیتیں، شریف کہتا تھا اس لڑکی کا خیال رکھیں، آپا اسے پوچھیں، یہ اپنے اندر بیماری کیوں پال رہی ہے؟ پتہ نہیں کیوں کوتاہی ہوگئی ہم سے۔

کبھی مجھ پر الٹ پڑتیں، یہی تاکید کرتی تھی ناں کہ بک بک اور ٹر ٹر نہیں کرنی چاہیے۔ یہ تو نہیں کہا تھا کہ شوں شاں اور پھوں پھاں بھی قائم نہ رکھنا۔ مقابلے پر پیدا کیے ساس کے بچے پالتی رہنا۔ آج کل لڑکیاں اپنے بچے نہیں پال سکتیں۔ پھر شاید خود کلامی کرتیں...

"ہاں تم پر آزمائشیں بھی تو نویکلی ہی تھیں۔ ساس کے بچے بھی تو عالیہ سے چھوٹے

تھے۔'' پھر اپنی آنکھیں پونچھتیں...

''چلو اللہ انھیں سلامت رکھے۔ پر تم نے وقت بہت ضائع کر دیا۔''

اُسامہ پیدا ہوا تو میں نے خط لکھا ''امی، اُسامہ کے لیے کڑھائی والا سفید کرتا پاجامہ بھیجیں۔ مجھے بہت شوق ہے کہ اسے پاکستانی کپڑے پہناؤں۔''

انہی دنوں کسی کو پاکستان سے ڈنمارک آنا تھا۔ امی جی نے مختلف رنگوں کے چھ سات کرتے پاجامے، ٹوپی اور واسکٹ کے ساتھ بنوا کر بھیجے اور تین ماہ کی عمر سے میں نے اسے شلوار قمیص پہنانا شروع کیے۔ وہ اُسامہ کی تصاویر دیکھ کر ہمیشہ خوش ہوتیں۔ جب عالیہ کے کپڑے بھیجتیں تو گھر میں موجود اس کی ہم عمر باقی بچیوں کے کپڑے بھی ہوتے۔ انھیں اچھا نہیں لگتا تھا کہ صرف مجھے یا میرے بچوں کو الگ سے تحائف ملیں اور جوائنٹ فیملی میں رہتے ہوئے باقی بچوں کو تحفہ نہ دیا جائے۔ میں اکثر امی جی سے الجھتی کہ آپ کے اصول الگ کیوں ہیں، باقی دنیا تو ایسے نہیں کرتی، بڑی بے نیازی سے کہتیں، ''باقی دنیا میرا مسئلہ نہیں ہے۔''

••

امی جی کو میں نے کبھی گلہ گزاری کرتے نہیں سنا تھا۔ کبھی کسی کی برائی بچوں کے سامنے نہیں کی۔ ہوسکتا ہے قریبی سکھیوں کے ساتھ دکھ سکھ کرتی ہوں لیکن ہمارے سامنے۔۔'او جانے تے اوہدا خدا جانے'۔۔ کہہ کر ہاتھ جھاڑ لیتیں۔

عزیز بھائی کے دنیا سے اچانک منہ موڑنے کے بعد میں نے ان میں دو تبدیلیاں دیکھیں۔ اول، ان کا دبلا پتلا وجود، بچوں جیسی روشنی کے جھماکے مارتی شربتی آنکھیں، تیزی سے زوالِ عمر کی زد میں آ گیا۔ دوسرا، ان کے انداز میں زندگی سے عجیب بیزاری اور نامانوس رویہ پنپ رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں زندگی سے محبت کرتی ہوئی جگمگاہٹ نہیں رہی تھی۔ ہلکی شربتی آنکھوں میں ایک لاتعلقی سی آ گئی تھی جیسے کوئی زندگی گزار رہا ہو مگر اسے بسر کرنے کی خواہش نہ رکھتا ہو۔ اب وہ معمولی معمولی باتوں پر خفا ہونے لگی تھیں۔

بڑھاپے کی حدود میں داخل ہونے کے باوجود ان کے چہرے پر ایک معصومیت تھی۔ بے انتہا سادہ و بے ریا چہرہ، جس پر مہمانوں کی آمد کے ساتھ ہی نور بکھرنے لگتا۔

''رحمت اور رونق ہوتے ہیں مہمان'' وہ ہمیشہ کہا کرتیں، لیکن اب ان آنکھوں میں کچھ عجیب سرد مہری سی آ گئی تھی۔ رسمِ دنیا نبھانے کا انداز، چہرے پر سکون کی ملائمت تو بکھری رہتی لیکن

اس کے ساتھ ایک خاموشی اور راضی برضا قسم کا مجبور سا احساس بھی موجود ہوتا۔ میں نے ان کو کبھی شکوہ کرتے نہیں سنا لیکن جب وجیہہ الرحمن کا نام لیتیں تو سکون کی ملائمت میں درد کی بوندیں شامل ہو جاتیں۔ یتیم! کتنا بے رحم لفظ ہے؟ جیسے دل پر تیز دھار چاقو سے کوئی نام کھودر رہا ہو۔

''سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدائشی یتیم تھے'' ابا جی آہستگی سے کہتے۔ پتہ نہیں امی کو تسلی دے رہے تھے یا خود کو بتا رہے تھے، ''وہ مسبب الاسباب ہے۔ کسی کو بے سہارا نہیں چھوڑتا۔ سہارے بدلتا بدلتا جسے جتنا عروج دینا ہو وہاں تک پہنچا دیتا ہے۔''

امی جی خود کو بہت صابر اور بہادر ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھیں لیکن مجھے چھوٹے بھائی نے بتایا کہ ایک دفعہ سب ان کو ڈھونڈتے رہے کہ کہاں گئی ہیں۔ ایک کمرے سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے میں، اوپر چھت پر، گھر کے دوسرے حصے تک میں ڈھونڈھ ڈالا۔ خدا جانے کس وقت کیسی خودرفتگی کے عالم میں گھر سے نکلیں کہ وہ جن کی کبھی کسی نے پیشانی بھی نہیں دیکھی تھی، ایک دوپٹہ اوڑھے، پیروں میں چپل پہنے اپنے بیٹے کی قبر کے کنارے جا بیٹھی تھیں۔ کسی نے دیکھا اور اطلاع دی کہ جاؤ جا کے اپنی امی کو وہاں سے اٹھا کر لاؤ۔ ان کو بالکل یہ یاد نہیں تھا کہ وہ کب گھر سے نکلیں اور کب وہاں جا کے بیٹھ گئیں۔

اکثر میرا جی چاہتا کہ امی مجھے پہلے کی طرح کہیں کہ ٹرٹر نہ کر، تمھیں تو صرف باتیں کرنا آتی ہیں، لیکن امی بھی بدل گئی تھیں۔ انھوں نے بھی مجھے ہمیشہ کی طرح بے تکلفی سے ڈانٹنا ڈپٹنا چھوڑ دیا۔ کوئی خفیف سی کوئی لکیر آ گئی تھی رشتوں کے درمیان۔ اب وہ مجھے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ ایک عجیب سا رویہ جو مہمانوں سے روا رکھا جاتا ہے۔ یہ کھا لو، یہاں بیٹھ جاؤ، یہ پی لو، وہ کر لو۔ ایسے جیسے کوئی ٹوٹے ہوئے شیشے کو سنبھال رہا ہو۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ

پاکستان کے زلزلے (2005ء) کی امدادی مہم کے دوران چونکہ ہمارے گھر سامان جمع ہو رہا تھا سو میں نے فون کیا اور ابا جی کو بتایا کہ ہم بھی یہاں ایک بڑا پروگرام کر رہے ہیں جس کے لیے نظم اور ڈرامہ لکھا ہے اور جلد پیسے اور امدادی کنٹینر بھجوائیں گے، تو امی جی بولیں، میرا جی چاہتا ہے کہ میرے پاس بے شمار پیسے ہوں اور میں دن رات ان لوگوں کو بانٹوں اور کسی طرح ان کے گھر پھر آباد ہو جائیں۔ بڑے بھائی جان کے گھر اور اس سے ملحق سکول اور باقی قریبی عمارات میں لٹے پٹے لوگ جمع تھے۔ امی جی کا فون آیا، ''پیسے بھیجنے ہیں تو اب بھیجو ان کے لیے لنگر کا بندوبست کرنا

ہے۔'' یہ وہ موقع تھا جب میں نے عزیز بھائی کی وفات کے بعد ان کو پہلی مرتبہ ازخود رفتگی کے عالم میں جوش و جذبے کے ساتھ کام کرتے دیکھا۔

آج دس برس کے بعد میں جب یہ سب کچھ لکھنے بیٹھی ہوں تو مجھے یہ ساری باتیں یاد آ رہی ہیں اور پھر اسی عجیب سے احساسِ جرم نے دل کو آ گھیرا ہے جس سے ابا جی کو شدید نفرت تھی۔

''کسی کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ اس خود ترسی اور احساسِ جرم سے انسان کو باہر نکلنا چاہیے اور ایک نئی تعمیر کا عزم ہونا چاہیے۔ تعمیرِ نو پہلے سے زیادہ بہتر ہوتی ہے، زیادہ خوش ادا ہوتی ہے اور اپنی مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔ اپنی مرضی کے فیصلے کرنا سیکھو۔ تم دیکھ لو، وہ گھر جل گیا۔ حکومت دوبارہ تین ایک جیسے گھر پھر بنا دے گی۔ جب تک انسان کی سانس چل رہی ہوتی ہے دنیا میں کچھ بھی ایسا نہیں جو دوبارہ حاصل نہ ہو سکے ماسوائے ایک اس انسانی سانس کے۔''

لیکن واحد ابا جی ایک ایسی شخصیت تھے کہ جو شکستہ ریزوں کو جوڑ کر دوبارہ ویسے کا ویسے شیشہ بنانا چاہتے تھے، ''دیکھو دنیا میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ سیلاب آیا ہے، زلزلہ آیا ہے۔ گھروں کے گھر فنا ہو گئے ہیں، تباہ ہو گئے ہیں۔ لوگوں کے خاندان اور نسلوں کی نسلیں ہیں جو صفحہ ہستی سے مٹ گئی ہیں۔ تم کیا کرتی ہو؟ کیوں اس طرح سے بیٹھی ہو؟'' وہ امی کو سمجھاتے رہتے۔ میرے تصور میں ابا جی کا ایک بے حد مضبوط اور غیر متزلزل حوصلہ، مستحکم لہجہ اور ثابت قدم رویہ تھا۔ شاید اللہ نے ان کو غمگین اور محزون ہونے والا دل دیا ہی نہیں تھا۔

••

امی میری ہر چیز کو سینت سینت کر رکھتیں۔ بغیر پوچھے ایک دوپٹہ تک خیرات نہ کرتیں۔ ایک دن میں نے فون کیا تو کہنے لگیں ''میں تیرے ہی فون کا انتظار کر رہی تھی۔''

میں نے کہا ''زہے نصیب۔'' فون دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ بڑی راز داری سے بولیں:

''وہ فلاں ہے ناں، اس کی بیٹی کا رشتہ آپ کے ابا جی نے ہی کرا دیا ہے۔ پتر آپ کے اتنے کپڑے یہاں پڑے ہیں۔ ان میں سے تین چار سوٹ دے دوں؟ جہیز میں رکھ لے گی۔''

مجھے امی جی پر بہت پیار آیا، میں نے کہا ''بالکل جو آپ کا جی چاہے اسے دیجیے۔ میں جب آؤں گی تب اور بنا لوں گی۔'' امی جی تو ایسی خوش ہوئیں کہ بیان سے باہر۔ بھائی کو ساتھ لے جا کر ان کے گھر سارا سامان یوں دے کر آئیں کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔ ان دنوں کوئی

پاکستان آرہا تھا۔ میں نے امی جی کو کچھ پیسے بھی بھجوا دیے۔

ابا جی نے مجھے بتایا کہ آپ کی امی نے کہا کہ فوراً پیسے بدلوا کر لا دیں۔ امی جی نے پیسے مٹھی میں دبائے کہ یہ ان عورتوں کو دینا ہیں جو بے تحاشہ محنت کرتی ہیں۔ پتہ نہیں ان دوپٹوں کی تارکشی میں کتنی بے چاری عورتیں آنکھوں اور بینائی کی بیماریوں میں مبتلا ہوں گی۔ پھاٹک کے پار پشاور کے پٹھانوں کی دکان تھی۔ امی جی کام کرنے والی کو ساتھ لیتیں اور وہاں جا بیٹھتیں۔

''بیٹا ایک بچی کی شادی کرانی ہے۔ اس کے کپڑے لینے ہیں۔ اپنی قیمتِ خرید پر دو۔ اللہ برکت ڈالے گا۔ میرے پاس بس اتنے ہی پیسے ہیں اور کپڑے اچھے لینے ہیں۔ بچیوں کو شوق ہوتا ہے۔ دعا دیں گی۔''

امی جی کو تحفے میں بھی جو اعلیٰ کپڑا ملتا وہ آگے دینے کے لیے محفوظ ہو جاتا۔ کبھی میری ان سے لڑائی بھی ہوتی۔ لیکن پھر بعد میں میری زندگی میں ایک واقعہ ایسا ہوا کہ میں نے سوچا کاش امی جی ہوتیں تو میں جا کر ان کے پیر چومتی۔ میری بیٹی نے ابھی یونیورسٹی شروع ہی کی تھی کہ خاندان میں ایک شادی آ گئی۔ ایک دن چپکے سے اپنے دونوں سوٹ لا کر میرے بیڈ پر رکھ گئی ''امی جی یہ میری طرف سے بھیج دیجیے۔''

''تو آپ اس کی شادی پر کیا پہنیں گی؟''

''میں؟ امی جی وہ جو آپ کو شادی پر نانو نے ساڑھی دی تھی ناں، مجھے اس کے ساتھ بلاؤز بنوا دیں۔''

میں اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ کوئی فرمائش نہیں۔ کوئی مطالبہ نہیں۔ جو اچھی چیز ملے اسے آگے دوسرے کو دے دینے کی عادتیں۔ کاش انسان کے اختیار میں ہو تو وہ اپنے والدین کی ان نوازشوں کا ایک ایک کر کے شکرانہ ادا کر سکے۔ شادی میں وہ میری بیس سال پرانی ساڑھی پہنے ایسے مزے سے گھومتی رہی کہ کوئی یقین بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے ماں کی ساڑھی کے ساتھ بلاؤز بنوا رکھا ہے۔ اسی طرح کسی کی شادی میں سونے کا سیٹ بھجوا دیا۔

''امی جی، آپ کو پتہ ہے ناں کہ مجھے سونا پسند ہی نہیں۔ پھر ابھی تو مجھے پڑھنا ہے۔ دیکھا جائے گا۔'' شادی کی تیاریوں میں اکثر خاندانوں میں ملبوسات کی تیاری اور انتخاب پر ہی تنازعات کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ امی جی کی شخصیت کا ہی کمال تھا کہ عالیہ نے کسی چیز کو مسئلہ نہیں بنایا۔ اپنی ساس امی کی پسند کا لایا ہوا عروسی لباس پہن لیا۔ اس کے اسی مزاج کی وجہ سے مجھے بھی ہمیشہ

ذہنی سکون رہا۔

یقین کیجیے کہ والدین کی دعائیں کبھی ضائع نہیں ہوتیں۔ جلد یا بدیر شرف قبولیت ضرور پاتی ہیں۔

••

میرے بچوں نے کسی چیز کو ضائع نہ کرنے اور بے جا تصرف اور فضول خرچی سے بچنے کے تمام تر اوصاف اپنے نانا ابو سے سیکھے۔ آج بھی وہ ان کی مہمان نوازی کو یاد کرتے ہیں کہ نانی اماں ہر وقت باورچی خانے میں گھسی رہتیں۔ پراٹھے بنتے، کھانے پکتے اور پھر بچوں کا اور نانی کا جھگڑا شروع ہو جاتا۔ بچے بے چارے بے بسی سے کہتے ''نانو اور کتنا سا کھائیں؟'' تنگ آ کر کہتیں ''جاؤ فیر کھاؤ مامی جان کے ہاتھوں کی بے کار سویاں، (سپاگیٹی) نہ کوئی طاقت نہ لذت۔''

دونوں واپس آتے ہوئے اپنے گرم کپڑے اور دیگر استعمال کی چیزیں وہیں چھوڑ آتے ہیں۔ پیسے جمع کر کے غریبوں کو بھیجنے کی عادت اور غریب مریضوں کی کہانیاں سننا، سب وہیں سے ورثے میں ملا۔ آج لوگ حیران ہوتے ہیں کہ بچوں کو مغرب میں رہ کر مغربی رسومات ادا کرنے کی عادت نہیں، کوئی سالگرہ کا بکھیڑا نہیں، کوئی رنگ برنگے دن منانے کا جھنجھٹ نہیں۔ عالیہ اکثر کہتی ہے ''امی جب آپ کو دیکھ لیتی ہوں میرا مدر ڈے ہوتا ہے۔'' ابا جی کی بات کو وہ مقدس آیات کی طرح دوہراتے ہیں کہ ''یہی پیسے کسی غریب کو دے دینا بیٹا۔'' میں تو ایسی کئی زندگیاں ملنے پر بھی اپنے سادہ، بااصول اور وضع دار باپ کا احسان نہیں اتار سکتی۔ عالیہ جب بھی پنجابی کا صوفیانہ کلام دوہراتی ہے تو ابا جی کی یاد شدت سے آنے لگتی ہے۔

••

امی جی کو میرے سب سے بڑے بھتیجے وقاص سے بے انتہا پیار تھا اور جب کبھی بھابی بچوں پر پڑھنے کے سلسلے میں کوئی سختی کرتیں، امی جی بڑبڑایا کرتیں ''بے چارے کو سانس نہیں لینے دیتی یہ عورت'' پھر خود ہی اگلے دن کہتیں ''لیکن پانچ لڑکوں کو پالنا اور تربیت کرنا ماں کی قربانیوں کے بغیر نہیں ہوتا۔''

خیر میں تو ہمیشہ ملک سے باہر رہی، بشری تقاضوں کے تحت اتار چڑھاؤ ہر خاندان میں آتے ہیں لیکن جب بھی امی جی نے بھابی کا تذکرہ کیا، ہمیشہ سراہتے ہوئے کہتیں کہ اولاد کی کامیابی اور تعلیم کے پیچھے ماں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ اپنا آرام سکھ فراموش کر کے دن رات اولاد کے سر پر رہے تو ہی

بچے کامیاب ہوتے ہیں۔ مجھے بھابی نے امی جی کا ایک واقعہ سنایا۔ کہنے لگیں کہ وقاص کو زکام اور بخار تھا۔ میں نے اسے امی جی کے پاس بٹھایا اور کہا کہ اس کو قابو میں رکھیں تاکہ مالٹے یا کوئی ٹھنڈی چیز نہ کھائے اور ان کی نگرانی میں رہے۔ جب انھوں نے واپس آ کر دیکھا تو سر سے پیر تک رضائی اوڑھائے اس کے اندر ہی چپکے چپکے اسے مالٹے چھیل چھیل کر کھلا رہی تھیں۔ ظاہر ہے پھر میدانِ کارزار تو گرم ہوا ہی ہوگا، لیکن ''اصل نالوں سود پیارا'' کے مصداق امی جی اپنے بچوں کے بچوں کی عاشق تھیں۔

••

بھائی کی شادی پر گئی تو امی جی کی تمام سہیلیوں سے ملاقات ہوئی۔ کچھ خواتین میرے لیے اجنبی تھیں۔ ان میں سے ایک نے امی جی سے کہا، ''آپا! آپ اپنی اس بیٹی کو یاد کرتی تھیں، جس نے پیلی ساڑھی پہنی ہے؟ یہ باہر سے آئی ہے؟''

''ہائے آپا۔ کیسی خوش باش اور زندہ دل ہے۔ اسے کیا بیماری ہو سکتی ہے؟ آپ تو خواہ مخواہ ہمیں پریشان کرتی رہی ہیں۔''

امی جی کچھ نہیں بولیں۔ اس دن مجھے علم ہوا کہ مجھے ہمیشہ ہمت اور حوصلے کی تلقین کرنے والی ماں اپنی سہیلیوں سے کیسے بات کرتی رہی ہوگی۔

••

نئی سوچ اور نئے امکانات کو امی نے کبھی رد نہیں کیا۔ جب تک ہم بہن بھائی چھوٹے تھے تو ہمارے گھر ٹی وی نہیں تھا۔ شام اور رات کا سارا وقت آپس میں بات چیت، کتابوں اور قصوں کہانیوں میں صرف ہوتا۔ بہت ہوا تو تایا جان کے گھر جا کر کوئی ضروری پروگرام دیکھ لیا۔ محمد علی کی باکسنگ دیکھنے بھی ابا جی ادھر ہی گئے تھے۔ لیکن جب امی جی نے ابا جی کے کمرے میں چھوٹا سا ٹی وی رکھا اور اس کے سامنے صبح قرآن کا درس، اور قرات و ترجمہ وغیرہ پڑھتی رہتیں تو میں نے ان کا ایک مکالمہ ایک سہیلی کے ساتھ سنا۔ وہ محترمہ امی جی کو بتا رہی تھی کہ یہ شیطانی کارخانہ ہے۔ اس میں مخربِ اخلاق پروگرام لگتے ہیں۔ اور امی جی سادگی سے فون پر بات کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں ''لیکن ٹی وی پر اسلامی پروگرام بھی تو آتے ہیں جن سے گھر بیٹھے علم کا نور پھیلتا ہے۔ اس سے ناخواندگی دور ہو سکتی ہے۔''

سہیلی نے شاید توجیہہ دی کہ ''اسی ٹی وی پر گانے اور بیہودہ رقص بھی تو ہوتے ہیں ناں، اور یہ سب کچھ ٹی وی پر ہی لگتا ہے ناں جی؟''

''تے ٹی وی ساڈے پیو دا اے جہدے وچ اسیں فیصلہ کرنا اے کہ کیہہ چیز لگے۔ بازار

سے آپ اپنی پسند کی چیز لاتی ہیں، ناپسندیدہ چیزوں کی دکان تو بند نہیں کرا سکتی ناں؟'' امی نے بات ختم کی۔ انھیں حج اور ایسی معلومات دینے والے پروگرام بہت پسند تھے۔ جب عمرہ سے لوٹ کر آئیں تو کہنے لگیں کہ لوگ بے چارے بوڑھے والدین کو بھیج تو دیتے ہیں لیکن ان کے لیے ہر چیز اتنی اجنبی اور اتنی غیر مانوس ہوتی ہے کہ وہ سوائے وہاں بیٹھ کر رونے کے اور کچھ نہیں کرتے اور یہی آنسو قبول ہوتے ہوں گے اور انہی بے بس آنسوؤں کی وجہ سے ہمارے ٹوٹے پھوٹے اعمال قبول ہوتے ہوں گے۔

••

امی جی دادی اماں کا اور ہماری اکلوتی پھوپھو جان کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتیں کہ مجھے نہ تو سسرال کے روایتی پن کی خبر تھی نہ ہی مجھے پتہ تھا کہ ساس سسر بہوؤں کے ساتھ مخاصمانہ رویہ بھی رکھتے ہیں یا نندیں بھابیوں کے خلاف مورچے کھودتی رہتی ہیں۔ وہ خود ہمیشہ لاڈلی بہو اور محترم بھابی رہیں اور انھوں نے اپنے دیوروں کی شادیوں کے لیے کبھی اپنے زیور کپڑے کی بھی پروا نہیں کی تھی نہ ہی کبھی انھیں غیر سمجھا تھا۔ اس زمانے میں لوگ زیور کو اپنی سب سے بڑی سیکورٹی سمجھتے تھے لیکن امی جی کے پاس جو کچھ تھا انھوں نے بلا جھجک حاضر کر دیا، اور ان کی بلند بختی یہ تھی کہ انھوں نے ہمیشہ ہر ایک سے بے پناہ محبت اور عزت پائی۔

••

ابا جی کے جانے کے بعد ہمارے سب سے چھوٹے چچا جان کے بیٹے کی شادی پہلے سے طے تھی۔ وہ امی جی کے پاس آئے۔ ''تائی جان ہم شادی ملتوی کر دیتے ہیں۔'' امی جی نے فوراً منع کیا کہ جس طرح جو جو پروگرام ہے وہ ویسے ہی ہوگا۔ جانے والوں کے سوگ میں جینے والوں کی زندگیاں اجیرن کرنا کون سی دانشمندی ہے۔ اور پھر وہ صبح بارات جانے سے پہلے امی جی سے دعا لینے آئے۔ امی جی نے اٹھ کر انھیں خصوصی طور پر رکھے تحائف دیے اور پیار کیا۔ پھر کتنی دیر مرحوم چچا کو یاد کرتی رہیں، ''جیون جوگا، مجھ سے دانے اور گڑ چھین کر لے جاتا۔''

••

آج سخاوت کس چیز کا نام ہے۔ اپنی خوشی، اپنی ضرورت، اپنی غرض اور اپنے مفاد کے آگے کسی دوسرے کی ہستی بے نشان ذرہ ہے۔ لیکن میں نے ابا جی اور امی کو مسلسل سخاوت نہیں بلکہ قربانی دیتے دیکھا۔ امی جی کو مائکرو ویو اوون کے بنے پاپ کارن پسند تھے لیکن انھوں نے کبھی مجھ سے فرمائش نہیں کی۔ یاد کر کے میری آنکھوں میں دھواں بھرنے لگا۔ میرا خیال مجھے نجانے کہاں کہاں

بھٹکا تا ہوا لے گیا۔ مبین بیٹے کو علم ہوا کہ مجھے مونگ پھلی پسند ہے تو وہ خود جا کر خرید لاتے کہ ساسو ماں کو مونگ پھلی چھیل کر کھانا پسند ہے۔ مالٹے اور ادرک کا تازہ جوس بنا کر پیش کرتے کہ ساسو ماں کو جوس میں ادرک اور کالی مرچ اچھی لگتی ہے۔ میں بیٹی ہو کر نہ سمجھ سکی کہ میری ماں کو کیا پسند ہے۔ وہ تو میری بھتیجی انیقہ نے انکشاف کیا کہ

''پھوپھو جی! میں اور دادی اماں پاپ کارن بناتے تھے، ان کو پسند تھے ناں۔''

''ہاں شاید'' میں کفارہ ادا کرتی رہتی ہوں۔ کتنا عرصہ میں پوپ کارن بنا بنا کر محلے کے بچوں کو دیتی رہی اور جھیل کے کنارے بطخوں کو ڈالتی رہی۔ لیکن خلش کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔

••

میں نے صرف وہ کام شوق سے سیکھے جن کی طرف قدرتی طور پر میرا رجحان ہوا۔ کالج میں لڑکیوں کو میکرامے بناتے دیکھا تو مجھے رنگ برنگے دھاگوں اور موتیوں کا کھیل بہت پسند آیا۔ میں نے رنگ برنگے میکرامے اور ٹوکریاں بنائیں، جس پر داد دینے کے بجائے امی جی کہنے لگیں:

''تم تو ڈوریوں کو یوں بل دیتی ہو جیسے پھانسی کا پھاہ بنا رہی ہو۔''

وہ اس بات سے بھی قطعاً متاثر نہ ہوئیں کہ ان کی نالے پراندے بنانے والی پرانی سہیلی نے بھی میرے میکراموں کی تعریف کی اور مسلسل تین دن سیکھنے کے لیے آتی رہیں۔ میرے جتانے پر بولیں، ''پڑھیا ناں پا، تے بن بیٹھی علما'' (پاؤ بھر پڑھ نہ پائی اور خود کو علما کی صف میں شمار کر لیا۔)

امی جی کو ہمیشہ خدشات لاحق رہتے تھے۔ کہا کرتی تھیں کہ ''ایس ماہی منڈے دا دماغ خراب نہ کرو۔ مشاعرے لوٹنے اور تمغے ٹرافیاں پانے سے دماغ آسمان پر نہ چڑھ جائیں۔ لڑکی کو ایک بہترین ماں بننے کی تربیت دینا ضروری ہے اور ماں اسی اولاد کی خاطر ایک بہترین بیوی بہو کے کردار نبھاتی ہے۔ وہ اولاد کماتی ہے۔ باپ صرف اس لیے باپ نہیں ہوتا کہ ایک عورت نے اپنی جان داؤ پر لگا کر ایک نئی جان پیدا کر دی ہے اور اپنے خواب بھول کر ان کے لیے وقف ہو گئی ہے، بلکہ اسے بھی اولاد کمانا ہوتی ہے، اس کی تربیت میں حصہ لینا ہوتا ہے۔ بیوی بچے کا ہاتھ پھیلنے سے پہلے ضروریات پوری کرنا ہوتی ہیں۔'' مجھے یقین ہے کہ میری شاعری میں میرے بچپن میں سنی یہ سب باتیں ملفوف ہیں۔ میری غزل کا ایک شعر جس پر سبھی نے داد دی، وہ امی جی کے ان ہی افکار کا پرتو ہے۔

میں ماں ہوں، مجھ پہ لازم ہے، سبھی سہنا نہ اف کہنا
ذرا سی میں نظر بدلوں تو بستے گھر بکھر جائیں

••

ابا جی کے جانے کے بعد رات کو امی جی حسبِ معمول اپنے طویل وظائف پڑھنے بیٹھ گئیں۔ میں کئی راتوں سے جاگی ساتھ والے بستر پر سوگئی۔ امی کہتی رہیں اُدھر اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ، یہاں روشنی اور میرے پڑھنے سے تمھاری نیند خراب ہوگی۔ لیکن میں پتہ نہیں کب امی جی کی میٹھی آواز میں سورۃ الملک کی تلاوت سنتے سنتے بے خبر سوگئی۔ اچانک مجھے نیند میں ہی ہلکی سی بے چینی کا احساس ہوا۔ نیم خوابیدگی اور نیم بیداری کے عالم میں مجھے امی جی کی آواز آئی۔

''امی جی؟'' میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی، ''کیا ہوا ہے، کیوں پریشان ہیں؟''

''ایک تو تمھاری نیند کو پتہ نہیں کیا سیاپا ہے؟ پتہ ہلے تو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہو'' امی جی نے پلو سے آنکھیں صاف کیں۔

اس رات امی جی نے مجھے بتایا کہ آپ کے ابا جی نے مجھے زندگی میں کبھی ناراض نہیں ہونے دیا۔ اتنے بڑے خاندان میں اونچ نیچ ہونا ایک عام بات تھی لیکن ابا جی نے کبھی خفا ہو کر سونے نہیں دیا۔ عشا کی نماز کے بعد بڑے آرام سے کہتے، ''بھئی بات یہ ہے کہ کل پتہ نہیں اٹھنا نصیب ہو کہ نہ ہو۔ زندگی کا کوئی پتہ نہیں، معاف کر کے سونا۔''

آپ کے ابا جی نے ہمیشہ اپنے خاندان کے ساتھ میرے حسنِ سلوک کو سراہا۔ ہمیشہ احسان مند رہے۔

''آپ کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو شاید ہم سب بھائی اس سکون اور اطمینان سے کبھی نہ مل بیٹھتے'' وہ اکثر امی کے سامنے یہ بات دوہراتے۔

''تمھارے ابا جی نے جو کمایا، لا کر ہاتھ پر رکھا اور پھر پلٹ کر کبھی نہیں پوچھا بلکہ مجھ سے مانگ کر لیتے۔ گھر میں مہمانوں کی مدارات سے نہال ہوتے۔ نہ سگریٹ نہ پان، نہ کوئی علت، نہ کوئی بے معنی شوق، نہ کھانے پینے کا کوئی نخرہ۔ جو پکا ہوا ملا خاموشی سے کھا لیا؛ سارے دن میں ایک وقت کھانا کھانے کی عادت تا عمر قائم رہی۔ کبھی بچوں کی وجہ سے اختلافات ہوتے بھی تو کبھی تلخ نہیں ہوئے۔ کبھی کسی بات کو طعنہ نہیں بنایا۔''

میں خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔ نحیف و نزار چہرے پر عینک کا فریم کشادہ ہو گیا اور بار بار نیچے لڑھک جاتا۔ بے رنگ آنسوؤں کے قطرے چہرے پر جال بنا کر پھیلی لکیروں میں گم ہوتے، پھر ذرا سے وقفے سے سفید دوپٹے پر گرتے اور نم سا ایک دھبہ بن جاتے۔ میں مبہوت

صرف ان کا چہرہ دیکھتی رہی جیسے کسی نے قوتِ گویائی چھین لی ہو۔

''بشری کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں لیکن میں لاکھ یاد کروں تو مجھے کوئی ایسا لمحہ یاد نہیں آتا جب انھوں نے میرا دل دکھایا ہو۔ کبھی زیادتی کا احساس ہوتا بھی تو فوراً تلافی کرنے کا سوچتے۔ میں نے ساری عمر اپنی صوابدید سے گھر چلایا اور خاندان سے معاملات کیے۔ آپ کے ابا جی صرف دستخط سے منظوری دیتے رہے۔''

میں جیسے سانس روکے ان کی باتیں سنتی رہی۔ اچھا ہے آج امی بول ہی پڑیں۔ اچھا ہے کہ رو کر دل کا بوجھ بہا ڈالا۔ بہت ضروری ہے کہ دل پر پڑی غم کی بھاری سلیں کبھی سرکا بھی دی جائیں ورنہ درد کا لاوا ساری پرتیں چیرتا باہر آنے کی سعی کرے اور ساری ہستی تہس نہس کر دے۔ میں نے امی جی کو بادام کا شربت بنا کر دیا۔

''تم سوتی کیوں نہیں ہو؟'' انھوں نے آنکھیں پونچھتے ہوئے پہلی سی ناراضگی سے کہا۔ گویا وہ جو ایک اِقرار اور اظہار کا لمحہ آیا وہ تمام ہوا۔

''امی جی ابھی ڈنمارک کے وقت کے مطابق رات کے گیارہ بجے ہیں۔''

''اچھا چلو میں تہجد پڑھ لوں۔'' پھر قدرے توقف سے بولیں:

''دیکھیں ناں! گل سنڑھ'' انھوں نے بڑی راز داری سے کہا، ''میں نے سنا ہے کہ عورتوں کی عدت چار مہینے دس دن رکھی گئی ہے اور اس دوران اس کا نکاح اپنے شوہر سے قائم رہتا ہے۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ اب میرا بھی چلتے پھرتے بلاوا آجائے۔ نہ کسی کی محتاجی ہو اور نہ ہی کسی پر بوجھ بنوں۔ عدت میں ہی چلی جاؤں۔''

ان کی آواز اتنی ہلکی تھی جیسے مجھ سے بات کرنے کے بجائے خود کلامی کر رہی ہوں۔

''اچھا؟ اور ہمارا کیا قصور ہے امی جی؟'' مجھے خوف آنے لگا؛ لیکن میں بولی کچھ نہیں۔

''بس تیرے بچیاں نوں دیکھنا ہن شاید نصیب نہ ہووے۔ (بس تمھارے بچوں کو دیکھنا اب شاید نصیب نہ ہو)۔''

''کیسی باتیں کرتی ہیں امی جی؟ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم تینوں آئیں گے۔ پھر آپ ان کو مرغی والا پلاؤ بنا کر کھلائیں گی۔'' میں نے انھیں بہلایا لیکن ان کا لہجہ نہیں بدلا...

''اب کسے خبر پھر ملاقات ہے یا نہیں؟''

میرے دل میں خوف کے ہزار آنکھوں والے عفریت نے بیک وقت ساری آنکھیں

کھولیں۔ مجھے امی جی کے خوابوں اور باتوں سے ہمیشہ ڈر لگتا۔

''امی جی جانے دیں۔ نہ خود پریشان ہوں نہ مجھے کریں۔ مزے سے شربت پییں۔''

بات کرتے کرتے انھوں نے نظر اٹھائی، ''اب تم پر کیا آفت آئی ہے؟ ہزار مرتبہ کہا ہے کہ میرے سامنے نہ رویا کرو۔ چلو اٹھو، وضو کرو نفل پڑھو۔ میرے ساتھ قضا نمازیں ادا کرو۔ پوری نمازیں پڑھنے کی تمھیں توفیق نہیں ہوتی۔ ابا کے لیے نفل پڑھ پڑھ کر پتہ نہیں کیا کماتی رہتی ہو۔''

انھوں نے اپنے ساتھ ہی میرے لیے جائے نماز بچھالی۔

چلو جی امی جی کی پٹڑی بدل گئی۔ اب وہ نارمل ہوگئی تھیں، سو میری شامت آنا یقینی ہوگیا تھا۔ میں نے عافیت اسی میں جانی کہ وضو کر کے حکم کے مطابق ان کے ساتھ کھڑی ہو جاؤں۔

''گل سنڑھ۔۔۔ میں تیرے تے بہت خوش آں'' امی جی نے پارے میں احتیاط سے نشانی رکھی۔ ''تم نے ہمیشہ ہم سے دعائیں لی ہیں۔ کبھی گلہ گزاری نہیں کی۔ کبھی ناشکری نہیں کی بلکہ اپنے باپ کی طرح دوسروں کے فرائض بھی اپنے کاندھوں پر اٹھالیے۔''

میں حیرت سے امی جی کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ناریل کے سخت خول میں کہیں شگاف ہوا تھا اور ٹھنڈا میٹھا دودھ قطرہ قطرہ بہنے لگا۔

''باپ کا کیا ہے۔ وہ تو کفن بھی میلا نہیں ہونے دیتا۔ قبر کی مٹی بھی نہیں سوکھتی اور وہ سہرا سجا کر نئی عورت لے آتا ہے۔ وہ زندگی میں خلا اور کمی برداشت نہیں کرتا۔ اسے سہرا سجانے کی جلدی ہوتی ہے۔ یہ ماں کا کلیجہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہستی بھول کر دھوپ میں سائبان بن جاتی ہے۔''

امی نے حسبِ معمول وظیفہ کر کے مجھ پر پھونکا پھر اپنی آنکھیں صاف کیں۔

مجھے اندازہ ہوگیا کہ اب امی جی کی ذہنی رو میری طرف بہک جائے گی اور پھر دونوں کی رات غارت ہونا یقینی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا،

''امی جی ایک لطیفہ سناؤں؟''

امی جی نے گھور کر مجھے دیکھا۔ میں نے جواب کا انتظار کیے بغیر لطیفہ سنانا شروع کر دیا، ''ایک آدمی ایک قبر کے قریب بیٹھا روتے ہوئے قبر کو پنکھی جھل رہا تھا۔ پاس ہی دوسری قبر پر کوئی فاتحہ خوانی کے لیے آیا تو اس نے پوچھا کہ کس کی قبر ہے؟ روتے ہوئے کہنے لگا، ''میری بیوی کی۔''

''ارے آپ کو تو ان سے بہت محبت ہوگی؟''

''محبت؟ اس نے کہا تھا جب تک میری قبر کی مٹی خشک نہ ہو دوسری شادی نہ کرنا۔ پتہ

نہیں کیہڑا کنجر ہر روز پانی پا جاندا اے۔''

امی جی روتے روتے ہنس دیں، ''مصلن جئی۔۔۔مراثاں والے کم نہ چھڈ یں۔''

••

میں نے ابا جی کو کبھی امی جی سے اونچی آواز میں بات کرتے نہیں سنا۔ گھر میں کیا پکے گا، مہمانداری کیا ہوگی، شادیوں پر کیا دینا دلانا ہے، کس کو خوشی غمی پر کیا پہنچانا ہے، خاندان بھر میں کیسے خوش اسلوبی سے چلنا ہے، یہ سب امی جی کے شعبے تھے اور ابا جی نے کبھی ان میں دخل نہیں دیا تھا۔ اب مجھے حیرت ہوتی ہے کہ بہن بھائی سب ابا جی کے اور ہر بات کا مشورہ اور رائے امی جی سے لی جاتی۔ ابا جی جب کبھی کوئی بات پوچھتے، امی جی آرام سے کہتیں۔ ''تہانوں کیہہ، تسیں تے پروہنے او'' (آپ کو کیا، آپ تو مہمان ہیں) اور ابا جی بھی یوں اطمینان سے خاموش ہوجاتے جیسے اس بیان کے بعد خود کو مہمان سمجھ لینے پر رضامند ہو گئے ہوں۔

ابا جی کے جانے کے بعد ان کی تعزیت کے لیے میری ایک پیاری خالہ جان آمنہ ڈنمارک سے آئیں۔ آج ان کو میری والدہ کا درجہ حاصل ہے۔ وہ پہلی مرتبہ امی جی سے ملیں۔ یہیں انھیں ہماری بھانجی اسما پسند آئی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں...

''نی کڑیے تیرے خاندان دی کوئی بچی رواں ماسہ وی تیرے تے جائے تے خاندان سنور جانڑ۔''

ان کی محبت ہمیشہ میری آنکھیں نم کر دیتی ہے۔ خالہ جان آمنہ اور ستار انکل نے مجھے کبھی امی ابا جی کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ وہی امی جی کی طرح بے تکلفی اور بے تصنع انداز میں جھڑکیوں میں چھپی محبت، وہی چند دن فون پر بات نہ ہو تو بے قرار ہو کر فون کالز اور پھر سلام کے جواب میں ڈانٹ بھری پرسشِ احوال۔ امی جی سے ان کی ایک ہی ملاقات ہوئی لیکن انھوں نے کمال محبت سے ہمیشہ ادب سے ان کا تذکرہ کیا۔

تقدیر کے فیصلے ایسے ہی اچانک ہوتے ہیں۔ اگر آپ کے مقدر میں کوئی نعمت ہے تو دنیا بھر کی طاقتیں متفقہ حد بندیاں کرلیں وہ آپ کو مل کر رہے گی۔ اگر ستارے کوئی چال چل جائیں تو ہفت اقالیم کی دولت کے عوض بھی آپ کو وہ خوشی عطا نہیں کرسکتی۔ ابا جی عربی کا ایک شعر پڑھا کرتے تھے جس کا مفہوم کچھ یوں تھا:

اگر تیرے بخت میں نہیں ہے تو دو ہونٹوں کے درمیان کی چیز بھی نہیں ملے گی، اور اگر

تیری قسمت میں ہے تو دو پہاڑوں کے درمیان کی شے بھی تجھے مل کر رہے گی۔

تو ایسے ہی ان چند دنوں میں اسما کا اور عمران کا رشتہ طے ہوا۔ خالہ جان کا اصرار تھا کہ خاموشی سے نکاح کی سنت پوری کرتے ہیں، پھر ویزہ لگنے کے بعد آکر سہولت سے رخصتی کرا لیں گے۔ ابا جی اور امی نے جاتے جاتے بھی مجھے نئی نسبتوں کا غرور عطا کیا۔ امی جی نے مجھے بلایا اور کہنے لگیں، ''بہن جی بہت سادہ اور سمجھ دار خاتون ہیں۔ فی الحال بس خاموشی سے نکاح کر دیں۔ آرام سے رخصتی پر اپنے شوق پورے کرلیں۔ آپ کے ابا جی ہوتے تو وہ بھی یہی فیصلہ کرتے۔ یاد نہیں عزیز کے جانے کے بعد انھوں نے افشاں اور اس کے خاندان کی سہولت کو مدِنظر رکھتے ہوئے نہ کوئی رکاوٹ ڈالی نہ اس بچی کی کسی خوشی میں رسمی ماتم داری اور دنیا داری کو حائل ہونے دیا۔ غم تو عمر بھر کا ہے۔ جہالت یہ ہے کہ مٹی اوڑھنے والوں کے لیے جینے والوں کی خوشیاں حرام کی جائیں۔''

''جی امی جی، جو حکم'' میں بڑے بھائی جان اور بھابی کے پاس گئی۔ ہماری بھابی کی فہم و فراست اور خاندانی اقدار کی پاسداری ایک مثال ہے۔ کہنے لگیں ''تم ان لوگوں سے مطمئن ہو تو دیر کس بات کی؟'' قصہ کوتاہ، نکاح کی تاریخ مقرر ہوئی۔ بھائی جان اور باجی نے ہمیشہ خاندان کی بچیوں کو اپنی اولاد سمجھا اگرچہ خود اللہ نے انھیں یکے بعد دیگرے پانچ بیٹوں سے نوازا، لیکن ہر بچی کے معاملات میں وہ ایسے ذمہ داری اور ذوق شوق سے حصہ لیتے ہیں جیسے ان کی اپنی اولاد ہو۔ شہر بھر میں لوگ ان کی مثال دیتے ہیں کہ بڑے مرزا صاحب کی جگہ خالی نہیں رہنے دی۔

امی جی آہستہ سے بولیں، ''میرا بھی جی چاہتا ہے کہ اسما کو دولھن بنا دیکھوں لیکن سب کہتے ہیں کہ عدت میں ہو؟''

میں حسبِ معمول اپنا فتویٰ جاری کرنے لگی، ''امی جی، عدت کے مسائل اس زمانے میں معاشرتی وجوہات کے ساتھ منسلک تھے اور سختی تھی۔ عالمِ پیری کی وجہ سے آپ پر تو عدت ویسے بھی واجب نہیں ہے۔''

''چپ کرو'' بھابی نے آہستہ سے میرا ہاتھ دبایا، ''جو کام ہو رہا ہے سکون سے ہونے دو۔ نیا فتنہ نہ کھڑا کرنا۔''

''کوئی گل نہیں'' امی اپنی فطری مصالحت پسندی سے بولیں ''میں فوٹو دیکھ لوں گی۔''

دل میں آرزو کی کونپل کو دبانا شاید ماؤں کے خون میں دوڑتی قربانی کے خلیوں میں کہیں پنہاں ہے۔ مجھے ایک دم احساس ہوا کہ وہ اپنا شوق کیوں پورا نہ کریں۔ بچوں کی خوشی دیکھنا عمر بھر کا

خواب ہوتا ہے۔ اپنے اندر بھڑکتی آگ کو خود پر ہی سہہ کر باہر پھول بانٹنا اور لوگوں کی سراہتی باتیں کہ آپ کیسی شیریں سخن ہیں؟ یہ مٹھاس کہاں سے آئی؟ انگور کی بیل کی طرح دھوپ کی سختی جھیلتی مائیں۔ اگر کوئی ذرا سا جھانک کر دیکھے تو اندر بھڑکتے الاؤ کے سرد شعلے بھی دیکھ لے۔ میں امی جی کا چہرہ دیکھتی رہی۔ مجھے لگا کہ یہ سراسر زیادتی ہے کہ شرعی مسائل نکال کر ایک انسان کو بنیادی خوشی دیکھنے کا حق چھین لیا جائے۔

میں نے پھر لقمہ دیا، ''امی اس زمانے میں عدت انتہائی سختی سے ہوتی تھی تاکہ عورت کو بہتان طرازی سے بچایا جاسکے اور چار ماہ دس دن میں ہر صورت میں حمل ظاہر ہوجائے اور نسب کا معاملہ مشکوک نہ ہو۔''

''گل سن۔۔۔'' امی جی نے سرہانے پڑا پنج سورہ اٹھایا، عینک کو منہ سے بھاپ دے کر اپنے دوپٹے سے صاف کیا اور بولیں، ''مینوں فقہ نہ پڑھا۔ نمازاں کدے پوریاں پڑھیاں نئیں تے چلی اے فتویٰ لانڑ۔'' میرے فقہ و اجتہاد کے غبارے کی تو جیسے ہوا نکل گئی اور میں نے پٹے ہوئے پپی کی طرح کان لٹکانے میں ہی عافیت سمجھی۔

••

کوئی آتا ہے جب وطن سے ماں
اک بلاوے کی آس رہتی ہے
زندگی میں مگن بہت خوش ہوں
زندگی پر اداس رہتی ہے
جا کے دیکھا ہے گھر میں تیرے بعد
میری دنیا اداس رہتی ہے
ایک مٹی کے ڈھیر کے نیچے
ایک ممتا کی باس رہتی ہے

شاعری جہاں سکونِ قلب کا نتیجہ ہے وہاں درد کے احساس کو دوچند بھی کرتی ہے۔ کتنا عرصہ میں رنگ برنگے کاغذوں اور پرزوں پر اشعار لکھتی رہی۔ کچھ تو بعد میں جمع کر لیے، کچھ ڈپریشن کی نذر ہوگئے۔

ماں کے دامن سے بندھے ہوتے ہیں سارے رشتے
گرہ کھل جائے تو پھر پل میں بکھر جاتے ہیں
میں کہ تربت پہ کھڑی سوچ رہی ہوں ششدر
ٹوٹ جاتے ہیں جو تارے وہ کدھر جاتے ہیں

••

2018۔ایک ظالم سال
لو، پوری ایک صدی کا فسانہ ختم ہوا۔
آمنہ بی بی زوجہ ستار علی، چلی گئیں۔

2018ء کا سال ایک مرتبہ پھر میرے لیے عام الحزن ثابت ہوا۔ میں پاکستان ڈاکٹر ساجدہ کے فارم پر برپا کی گئی محفلِ موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ اچانک عمران کا فون آیا، ''باجی امی جی کی طبعت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹرز نے جواب دے دیا ہے۔ آپ کو یاد کر رہی ہیں۔''

شام کو میں نے ان سے فون پر بات کی۔ انھیں بیماری کی نوعیت سے لاعلم رکھا گیا تھا۔ کہنے لگیں تم پاکستان جا کر بیٹھ گئی ہو۔ یہاں ماں بیمار ہے، کوئی شرم ہی نہیں تمھیں، جلدی آجاؤ اور میرے لیے خطائیاں لے کر آنا، میں نے پاکستان کی خطائیاں کھانی ہیں۔''

میں نے واپسی کی سیٹ بک کرائی۔ مجھے یاد ہے اس دن میں نے اپنی پیاری دوست زرقا اظہر کو ملنا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے ہر صورت میں خطائیاں دلوا دیجیے۔ آدھی رات کو ہم لاہور کی معروف بیکری سے ان کی فرمائش کردہ خطائیاں خریدنے کے لیے بھاگے۔ جب میں ڈنمارک واپس پہنچی تو بچوں کی طرح خوش ہو کر کہنے لگیں کہ میں نے صرف خطائیاں مانگی تھیں، یہ جوڑا اور شال کیوں اٹھا لائی ہو۔ پاگلوں والے کام نہ کیا کرو۔ یہ یخنی کیوں بنا لائی ہو، مجھے بو آتی ہے اس میں سے۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہسپتال کے ایک کمرے میں آباد ہو گئیں۔

میں روز شام کو تھوڑی دیر کے لیے ان کے پاس جاتی۔ کمزور جسم سے منسلک بے شمار نالیاں دیکھتی۔ آہستہ سے ان کا ہاتھ تھام لیتی تو ان کے ساکت چہرے پر مسکراہٹ بکھر جاتی۔ ایک دن میں حسبِ معمول ان یخ بستہ سردی کو شکست دیتی ان کے کمرے میں پہنچی، کمرہ خالی تھا۔ میں بھاگتی ہوئی استقبالیہ پر بیٹھی نرس کے پاس پہنچی۔ اس نے کمپیوٹر کی سکرین دیکھی، پھر نرمی سے بولی:
''ابھی گھنٹہ پہلے انھیں دوسرے ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اب اس سے زیادہ کچھ

نہیں ہوسکتا۔‘‘ میں پلٹ کر اس ہسپتال کی جانب بھاگی۔ خاموش کوریڈر، سوگوار نشست گاہ سے گزرتے ہوئے ان کے کمرے تک پہنچی۔ ہسپتال کے سفید لبادے میں ملبوس سانس لیتا بے خبر وجود ایک جنگ لڑ رہا تھا۔ شاید زندگی سے آنچل چھڑانے کی کوشش یا موت کے پنجوں سے دامن بچانے کی خاموش جد و جہد۔ ان کی بند آنکھیں، سانس لینے کی مشین کے زور سے پھولتا پچکتا کمزور پنجر، دل کی دھڑکن دکھاتی مشین پر ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگتی دوڑتی لال لکیریں، انگلی کی نوک سے چپکا نبضیں گننے کا آلہ، ان کی ساری اولاد کی موجودگی کے باوجود بے پناہ سناٹا۔ میں نے ان کا ہاتھ تھاما۔ وہ بے حس و حرکت رہا۔ سرد ہوتے ہوئے پیر چھوئے۔ وہ کسی ابدی سفر کی تیاری میں تھے۔ متوجہ ہی نہ ہوئے۔ میں نجانے کون سی آیات کا ورد کر رہی تھی۔ عمران نے مجھے گھر بھیج دیا۔ عالیہ اور مبین انھیں دیکھنے گئے اور پھر میرے پاس آ گئے۔ یہ رات بھی زندگی کی ایک طویل ترین راتوں میں سے تھی۔ ستار انکل کو اس حالت میں بھی میری فکر تھی۔ ’’پتر ماں کے لیے دعا کرو، غم نہ کرو دعا کرو۔‘‘

••

دما دم صدائے کن فیکون کی تھاپ پر رقص کناں یہ کائنات کبھی ایک نکتے پر ساکت و صامت کھڑی دیکھی ہے؟؟؟ یا شاید ہم ساکت رہ جاتے ہیں اور چہار جانب بہتی زندگی بگولہ بن جاتی ہے۔ یا شاید کوئی ہولناک گنبد جہاں سانس لینے سے گرد باد چلتے ہوں، دل کے دھڑکنے کی صدا تابکاری بم کا مہیب دھماکہ لگتی ہو؟ شاید کچھ بھی نہیں۔ دل و دماغ بدلتے چند لمحات، اور پھر زندگی کا تسلسل، مشینوں کے سہارے سانس کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رکھنا کیا زندگی ہے؟

میری زندگی میں یہ لمحہ دوسری مرتبہ آیا۔ ریزہ ریزہ ہونے، لیکن ہر ریزے میں اتنی ہی اذیت جتنی سالم وجود میں۔ آج ان کے نیم سرد ہاتھ نے میرا ہاتھ نہیں تھاما۔

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر چوما، لیکن انھوں نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ انگارے برسے۔ کسی نے نہیں کہا، بندے دی پتر بن، کج میرا ای خیال کر، مہربان آنکھیں بند ہی رہیں۔ ہونٹ موتی اگلنے کے بعد کے سیپ جیسے۔ پرسکون چہرہ، جیسے کسی اور کائنات کے سفر پر روانگی کے لیے تیار۔ ہسپتال کی خاموش افسردہ فضا کا سناٹا میرے اندر چیخیں مارنے لگا۔

امی آپ سوتی کیوں نہیں؟ اس رات میرے بیٹے نے نجانے کتنی مرتبہ سوال دوہرایا۔

باہر سائبریا سے آئی حملہ آور ہواؤں نے برف کی چادر بچھا دی ہے۔ مسرور پرندے بہار

کی آمد کا اعلان کر رہے تھے۔

موبائل پر عمران کا پیغام چمکا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہتھوڑے کی طرح بجتی دل کی دھڑکن کو قرار آ گیا۔ میرے تصور کی ہتھیلی سے لپٹا نیم سرد ہاتھ ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

اے نفس مطمئنہ۔۔۔ چل اپنے رب کی طرف،

تو آمنہ زوجہ ستار علی، رخصت ہوئیں۔

ان کے ساتھ ہی پوری ایک صدی کی وضع داری، اخلاص ومحبت کے فسانے رخصت ہوئے۔

آج سے پورے دس برس پہلے وہ ابا جی کی تعزیت کرنے پاکستان پہنچیں۔

لیہہ پتر ایہہ کیہہ حال بنایا ای۔۔۔ اپنی ماں دا خیال کر۔

پھر تین مہینے بعد امی چلی گئیں، خالہ جان پھر پہنچ گئیں،

لیہہ پتر۔۔۔ کج اپنڑے بچیاں دا خیال کر

••

آمنہ بی بی زوجہ ستار علی، ایک ناخواندہ فلسفی۔۔۔

زندگی کا فلسفہ زندگی سے وابستہ لوگوں سے سیکھنے کا ہے۔ خالہ جان جب بھی میرے پاس آتیں، ان کی باتیں مجھے زندگی کی کتنی حقیقتوں، کتنے مسائل اور ان کے حل تک پہنچاتیں۔ ایسے لگتا جیسے امی کہیں گئی نہیں بلکہ ان کی روح کسی اور بدن میں سما گئی ہے۔

پتر۔۔ ہن بیماری تو لگ گئی۔۔۔ پر اسے اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے سیاپا نہیں بنایا میں نے۔۔

سمندر کی طرف جانے والی طویل روش پر انھوں نے اپنی ٹرالی کا رخ موڑا۔ اس ٹرالی میں وہ میرے لیے نجانے کتنی سوغاتیں بھر کر لاتیں۔ سبز دھنیا نفاست سے کاٹ کر، سبز پیاز، پودینہ اور سبز مرچوں کو کاغذ میں لپیٹ کر، بھنڈی دھو کے کاٹ کر لاتیں...

''پتر توں پڑھنے لکھنے دا کم کرن والی ایں، تیرے کول کدوں وقت۔۔ ایہہ لیہہ فریز کر دے۔''

''پتر ہر ویلے چوں چوں کرنے والا مریض سب کے لیے سیاپا بن جاتا ہے۔''

میرے ہمراہ چلتی سیالکوٹ کے ایک چھوٹے سے گھر میں پلی بڑھی آمنہ بی بی نے کہا۔

مجھے امی یاد آ گئیں۔

''نکی جئی بیماری دی لمی جئی کہانی سنانے والے لوگ، گل مکن ای نئیں دیندے۔''

(چھوٹی سی بیماری کی لمبی سی داستان سنانے والے لوگ بات ختم ہی نہیں ہونے دیتے۔)

طویل بیماریوں سے جنگ لڑتے لڑتے وہ مایوس ہوکر روایتی عورتوں کی طرح گھر بیٹھ کر بیٹوں اور بہوؤں کے لیے وبالِ جان نہیں بنیں۔ انھوں نے کوپن ہیگن میں کثیر الثقافتی عورتوں کے گروپ کی رکنیت لے لی۔ یہ گروپ حکومت کی زیرِ سرپرستی ایسی خواتین نے بنا رکھے تھے جو بچوں اور گھر کی ذمہ داریوں سے فراغت پا کر خود کو مصروف اولاد اور بچوں سے گلے شکوے سے محفوظ رکھتی ہیں۔ ہفتے میں ایک دن شوگر کے مریضوں اور وزن کی زیادتی کے مسائل کا شکار خواتین کو سادہ سوپ اور کھانا بنا کر پیش کیا جاتا۔ تر تراتے گھی اور بھنے ہوئے کھانوں کی رسیا خواتین نے گپ شپ کرتے ہوئے اپنے کھانے کی عادات بدل لیں۔ اب دوپہر کو وہ ابلا انڈہ، سوپ کا پیالہ اور جو کی روٹی کھانے لگیں۔ مہینوں میں کئی کلو وزن کم کر لیا۔

میں ان کے لیے اوون میں کھانا بناتی یا بغیر تیل کے کباب گرل کرتی تو بچوں کی سی سادگی سے مجھے اپنی عمر اور تجربے کی دھونس دے کر مرعوب کیے بغیر کہتیں،

''توں مینوں مچھی دے کباب بنانے سکھا دے۔''

کبھی فرمائش کرتیں کہ مجھے قیمے والے نان بیک کر کے دو۔ میں دو تین آٹے ملا کر دہی اور انڈہ ڈال کر آٹا گوندھتی۔ پھر پوچھتیں کہ اس میں انڈہ کیوں ڈالا، میں نے سادہ الفاظ میں کمپلیکیٹڈ کاربوہائیڈریٹس کی تعریف کرنے کی کوشش کی۔ سفید آٹا انتڑیوں کی حرکت کو کم کرتا ہے، قبض ہو جاتی ہے، اس لیے دہی اور انڈہ ڈالنے سے یہ پیٹ میں گرانی نہیں کرتا۔ اور انھوں نے بات پلّے باندھ لی۔ بڑے اعتماد سے اپنے گروپ کو بتایا کہ سادہ میدہ پیٹ اور انتڑیوں کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔

اسی گروپ کے زیرِ اہتمام وہ ایک بڑی بس میں بیٹھ کر ڈنمارک کے مشہور مقامات کی سیر کرنے جاتیں۔ ان کی سہیلیاں اور ان سب سے مخلصانہ محبت بھرا خصوصی رویہ ان کی ایک بہت بڑی خوبی تھی۔ خوش باش اور مصروف زندگی گزارنے والی متحرک ناخواندہ فلسفی جو بڑی سے بڑی ڈگری یافتہ خاتون سے بڑی فیمینسٹ تھیں، جو محبت اور حکمت سے مسائل حل کرنے پر یقین رکھتی تھیں۔

''آپ لوگ آپس میں کیا باتیں کرتے ہیں۔'' ستار انکل اور خالہ جان آمنہ کا بیٹا عمران جو مجھے اُسامہ کی طرح عزیز ہے، اور میرا ٹیکنکل داماد بھی ہے۔ اکثر پوچھتا ہے ''امی جی اور آپ کی عمر

میں اتنا فرق اور پھر آپ کا انٹلیکچولزم؟''

''انٹلیکچولزم؟ بیٹا! اگر آپ میری والدہ کے فرمودات سن لیتے تو ہوش ٹھکانے آجاتے۔ تعلیم حاصل کرنے کا مطلب اپنی ماؤں سے بہتر مواقع پانے کا نام ہے۔ ان کی دانش، زندگی کے تجربات، آزمائش کی بھٹیوں سے گزری زندگی کے سنہری اسباق، کوئی ڈگری نہیں دے سکتی۔ جو تعلیم بڑوں کا ادب نہیں سکھاتی وہ صرف خرِعیسیٰ کی نمائندہ ہے۔''

دو لفظ پڑھ کر ماؤں کی قیادت کرنے والی بچیاں امی کو کبھی ہضم نہیں ہوتی تھیں۔ اور اپنی زمین پر بیٹھ کر اپنی جڑوں پر نظر رکھنا ان کی سرشت میں شامل تھا۔ شاخیں خواہ فلک بوس ہوں، مگر علم کا نور اپنی جگہ ایک مسلم حقیقت ہے۔ لیکن بزرگوں کے تجربات کی حکمت کا اجالا مختصر ترین راستے سے طویل فاصلوں کو پاٹتا ہے۔''

یہ سال جسے میں عام الحزن سمجھتی رہی، میری زندگی میں ایک نیا باب کھول گیا۔ آمنہ بی بی ہمارے خاندان کا ایک حصہ بن گئیں۔ اسماء کی ساس بن گئیں۔ اب ٹیکنکلی میں ان کی سمدھن تھی۔ لیکن وہ اپنی بیٹیوں سے زیادہ مجھ پر نچھاور ہوتیں۔ یہ الگ بات کہ ان کی محبت میں جھڑکیوں بھرا تحکم شامل ہوتا گیا۔ پتر کے درجے سے تنزلی ہوکر، کڑیے کے زینے پر لاکھڑا کرتیں۔ مزید ناراض ہوتیں تو کہتیں، اے صدف۔۔۔ صدفڑی۔۔۔۔ رج کے نکمی اے توں، مل ہی جاؤ آکر، کوئی شرم ہے تمھیں، پوری دنیا پھر آئی ایں، کج ماں داوی خیال کر۔

میں ان کو باہر لے گئی۔ میں نے کہا کوپن ہیگن سٹیشن پر ملتے ہیں۔ اچھا سا کھانا کھلاؤں گی آپ کو، ٹرکش کھانا۔

نہ بہن۔۔۔ مجھے شوارما کھلانا۔ وہ اپنی سہولت کے مطابق مجھ سے رشتوں کا ادل بدل کرتی رہتیں۔ ہم ریسٹورنٹ میں ملے۔ کھانا کھا کر اٹھیں، اور کاؤنٹر پر جا کر اپنی ہی ایجاد کردہ ڈینش میں ان سے پے منٹ کی بات کی۔ عرب بچے نے بڑے ادب سے عربی ڈینش ملا کر سمجھایا کہ تمھاری بیٹی نے پے منٹ کر دی ہے۔ میں مزے سے دور سے انھیں دیکھ رہی تھی جیسے سائلنٹ فلم چل رہی ہو۔ دو دفعہ انھوں نے ہاتھ میں تھاما عصا زمین پر پٹخا۔ اس سے پہلے کہ کوئی معجزہ رونما ہوتا، میں اٹھ کر بھاگی،

''اماں نہ بنیں زیادہ، چلیں، آئس کریم کھاتے ہیں۔ چوری چوری، کسی کو نہیں بتائیں گے،'' میں نے ان کو کامیابی سے ورغلایا۔

غیر پارلیمانی زبان میں میری شان میں گستاخیاں کرتی، اپنی ٹرالی سنبھالے باہر کو چل پڑیں۔ ٹانگ کے آپریشن اور دھات کے پرزے فکس ہونے کے باوجود ٹنٹناتی ہر کام خود کرتیں، بس پکڑ کر جہاں جی چاہتا پہنچ جاتیں۔ ہاتھ کا آپریشن ہو چکا تھا۔ اکثر درد کی ٹیسیں اٹھتیں لیکن مجال ہے جو اف کر جائیں، درد کے فسانے سنائیں یا بقول ان کے، ہر وقت دی ریں ریں۔ میرے پاس آئیں۔ زنبیل کھلی...

''ایہہ میں کریلے تے بھنڈی کٹ کے لیاندی اے۔ ایہہ ہرا دھنیہ۔ دھو کے کٹیا ای میں۔ لیہہ پھڑ پتر۔ ایہہ میں تیرے واسطے خاص سٹرابیری لیاندی اے۔''

''یا اللہ۔۔۔ کیوں کرتی ہیں یہ سب۔ اپنی طبیعت کو دیکھیں،'' میں احتجاج کرتی۔ جواب میں امی جی کی طرح گھرکیاں دیتیں۔

عالیہ کی شادی پر پورے بزرگی اور ثقافتی تام جھام کے ساتھ آئیں، ''ایہہ سوہا جوڑا تیرے واسطے، ایہہ غرارہ میں آپوں سیتا ای، پا کے دَس، مینوں پتہ اے نا تینوں شلواراں قمیصاں نئیں پسند، (یہ دیکھو سرخ غرارہ میں نے خود سیا ہے، مجھے علم ہے تمھیں عام شلوار قمیصیں نہیں پسند)

میری ہنسی سے چڑ کر بولیں، ''رنڈیاں تتیاں والے رنگ نہ پائیں۔ کڑی پریشان ہووے گی۔''

عالیہ فوراً کہتی، ''جی امی، سرخ سوٹ پہنیں، میری شادی پر گانا گائیں، نچاں گی ساری رات سوہنیا، وئی، نچاں گی ساری رات۔''

عالیہ کی شادی پر اس کے سادگی مچانے کے شور کے جواب میں اس کے لیے سرپرائز ڈھولکی رکھی، تو ڈھولک پر پہلی تھاپ خود دیتیں،

''اے صدف۔۔۔ ذرا گانڑا گائیں ناں، تو چھٹی لے کے آجا بالما۔۔۔۔۔''

''توبہ۔۔۔ میں تنگ آگئی،'' میں نئیں گانڑا، میرا تو دل چاہتا ہے آپ کے بالم کو چھٹی دلا کر کالے پانی بھیج دوں۔''

''جا۔۔۔۔ نی،'' وہ بگڑ کر کہتیں، ''چل کالا ڈوریا کنڈے نال اڑیا ای اوئے، گا۔''

میں پنجرے میں بند میاں مٹھو کی طرح چوری کھانے لگتی۔ عالیہ کی شادی پر انھوں نے اپنی ساری اولاد سمیت میرا جس طرح خیال رکھا اس کا جواب دینے کے لیے میرے پاس کیا، دنیا کی کسی بھی زبان میں الفاظ موجود نہیں ہیں۔ مجھ پر ایک عجیب بے گھری اور بے دری کا عالم تھا۔ اپنی

سادہ دلی سے سمجھاتی رہتیں...

''پتر، تم نے تو ہمیشہ سب کے ساتھ نیکی کی، سب کے حق ادا کیے، دنیا کی بے قدری کا غم نہ کرو، دیکھو عالیہ کتنی خوش ہے، کتنی صابر اور سعادت مند بچی ہے، دیکھو لوگوں کے گھروں میں بچیاں رشتوں کے انتظار میں ہیں، ماں باپ کی راتوں کی نیندیں حرام ہیں، تمھیں اللہ نے اس کی کم عمری میں اولاد کا سکون دکھایا ہے، ''بھولے بھا'' ہی اپنے گھر والی ہوگئی، دیکھ کتنی معصومیت کا نور ہے اس کے منہ پر، کیسی معصوم اور فرمانبردار بچی ہے۔''

ہم مالموسویڈن میں عمران کے گھر ایک ہی کمرے میں گھس کر سوتیں۔ میرا دل لگانے کو میرے ساتھ ساتھ رہنے کی کوشش کرتیں۔

''میں نے نہیں آپ کے کمرے میں سونا، آپ خراٹے لیتی ہیں'' میں ناراض ہو کر تکیہ اٹھاتی

''جا، نی، میں تے نیندر وچ وی رونق لائی رکھنی آں،'' (جاؤ، میں تو نیند میں بھی رونق لگا کر رکھتی ہوں)

جس دن عالیہ ڈاکٹری کا آخری امتحان دے کر آئی میں نے سرپرائز ڈنر دیا۔ دوپہر کو ہی آ گئیں، ''لا مینوں دس۔۔۔ کیہہ کرنا ای،''

پھر اس کے لیے تحائف پیک کرنے لگیں، ''مینوں سرپرائز دا بڑا مزہ آوندا اے''

سادگی سے بولیں، ''دوجا بندہ خوش ہو جاندا اے''

آمنہ بی بی زوجہ ستار علی، ساری عمر دوسروں کو خوش کرنے کی تگ و دو میں رہیں۔ سسرال کی ساری ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں اور سب مطمئن ہو گئے۔ چھوٹے دیوروں، نندوں کی شادیاں پوری ذمہ داری اور لگن سے کرائیں۔ کسی کو کاروبار کرا دیا، کسی کو باہر سیٹ کرا دیا۔ اب نند کے بچوں کی شادی ہے۔ ان کی کمیٹیاں نکل رہی ہیں۔ تیاریاں مکمل کر کے جہاز پر جا بیٹھتیں۔

''بیماری لگ گئی ہے، زندگی کا پتہ کوئی نہیں، کب دم مسافر ہو جائے،'' سارا زیور تقسیم کیا، بینک میں رکھا پیسہ فی سبیل اللہ دیا، اسماء کے باپ سے کہا کہ عورتوں کا مدرسہ بنا دینا، ساری عمر کی جمع پونجی حق داروں میں تقسیم کی، اور اپنے مال کے پیچھے ہی مال دینے والے کی طرف چل پڑیں۔ آج پورے دس برس بعد، ایک مرتبہ پھر مجھے علم ہوا ماں کی رخصتی کیسی ہوتی ہے۔

سنسناتی تنہائی۔۔۔۔ جس کا کوئی انت نہیں۔

آج پورے ایک ماہ اور بائیس دن بعد

آمنہ بی بی زوجہ ستار علی نے.....

اپنے شوہر کو کچے دھاگے سے باندھ کر اپنے پاس بلالیا۔ مسجد کے وسیع ہال میں بیٹھے بیٹھے دس برس نگاہوں کے سامنے رنگ بدل بدل کر آتے رہے۔ محبوب ہستیوں سے بچھڑنے کا خوف.... ایسا پیرا سائٹ ہے جو خون کی آخری بوند پی کر بھی سیراب نہیں ہوتا۔

لیکن، سب کچھ لٹا دینے کے بعد، کبھی جب ڈر نہیں لگتا۔۔۔تو بے حد ڈر سا لگتا ہے۔

دکھ کی کٹاری دوہری تھی۔ پیار اگر دوہرا ملا تو جدائی بھی دونی ہی جھیلنا ہوتی ہے۔ خون کے رشتے ورثے میں ملتے ہیں، سہنا ہوتے ہیں، محبت کے رشتے کا پیوند انسان عمر کی قبا میں خود لگاتا ہے، نبھاہنا ہوتا ہے، یہ پیوند زمین سے پیوند ہونے تک ساتھ چلتا ہے، سنبھالنا پڑتا ہے۔

دو دھاری تلوار پر چل کر میں نے آج سارے رشتوں کو خیر باد کہہ دیا۔ اب والدین کی اور بزرگی کی نشست خالی تھی، وقت نے دھکیل کر مجھے اس مقام تک پہنچا دیا۔ جب زندگی میں کسی بھی آزمائش کے کوہِ سینا پر جوتے اتار کر چڑھتے ہوئے ہاتفِ غیبی بتاتا ہے کہ موسیٰ، آج سنبھل کر، آج دعا کے لیے ہلنے والے لب خاموش ہوئے۔ اب خود ہی سنبھلنا ہوگا کہ اب دعاؤں کا فریضہ ہمارے لبوں پر آرکا ہے۔

اب حقیقی اور معنوی ماؤں کا نوحہ ہی لکھنا ہے۔

••

انگلیوں کی پوروں سے ذائقے ٹپکتے ہیں

کھانا پکانا اور گھر داری کو اگر امی جی کی زندگی کا نصب العین کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ صبح نمازِ فجر کے بعد باوضو باورچی خانے میں جانا ان کا معمول تھا۔ سب کو سکول کالج جانے کی جلدی ہوتی تو وہ آرام سے بیٹھ کر تلاوت نہیں کرسکتی تھیں۔ سورۂ یٰسین شریف کا وِرد جاری ہوتا، خاموشی سے پراٹھے بناتے اور ابلتی چائے کو پیالوں میں منتقل کرتے وہ زیرِ لب جانے کیا پڑھتیں۔ ان کے ہاتھوں کے پکوان اور سادہ سا کھانا بھی صحت و غذائیت سے بھرپور سمجھا جاتا تھا۔ بے حد اہتمام سے دھلے ہوئے اور دھوپ میں سکھائے ہوئے مصالحوں کو بند ڈبوں میں رکھتیں اور اگر ان کو موقع ملتا تو وہ پکوان اور ٹوٹکوں کی شان دار کتاب ترتیب دے سکتی تھیں۔ میں لاکھ ان کی بتائی تراکیب سے ان جیسا کھانا بنانے کی کوشش کرتی لیکن وہ ذائقہ اور لذت نہ آپاتی۔ امی جی کے تو ہاتھوں اور انگلیوں کی پوروں سے ذائقہ برستا تھا۔ بالکل سادہ سی دال اور بگھار لگے ساگ کی خوشبو گھر میں چکراتی پھرتی۔

••

ایک شام ابا جی ٹماٹروں سے لدے پھندے گھر میں داخل ہوئے۔ اس سے قبل کہ حیرت زدہ امی کوئی سوال کرتیں ابا جی نے خود ہی وضاحت کر دی...

''بے چارہ عشا کی نماز تک کھڑا تھا اور کسی نے کچھ نہ خریدا۔ مجھ پر نظر پڑی تو کہنے لگا مرزا صاب! وِکری ای کرادیئو (مرزا صاحب کچھ خرید ہی لیں)۔''

امی جی نے ایک نظر ٹماٹروں کے بھرے دو تھیلے دیکھے پھر بڑبڑانے کا پروگرام ملتوی کر کے باورچی خانے کا رخ کیا۔ اگلے روز بڑا ڈونگہ ٹماٹروں کی چٹنی سے لبالب بھرا تھا۔ میں نے اس میں مزید لال رنگ ملا کر کاغذ کی قیف بنائی اور پھر اسے ابلے چاولوں پر پھول کی صورت میں

ڈالا اور اس کے اردگرد پودینے کی سبز چٹنی سے پتے بنائے۔ امی جی چپ چاپ میری کارروائی دیکھتی رہیں۔ میری سجاوٹ ختم ہوئی تو بولیں، ''یہ کیا چونچلے ہیں؟ ویسے چمچہ بھر کر ڈال کر بھی تو کھانے ہیں۔ ایویں اتنا وختا کرنے سے ہار پھول ٹانکے گئے۔''

ابا جی نے دلچسپی سے میری پلیٹ دیکھی اور بولے، ''لیکن پیٹ کے کھانے سے پہلے آنکھیں سیر ہوتی ہیں۔''

''جی آ۔ گھیو سنوارے سالناں تے بڑی بہودا ناں'' (اچھے گھی سے سالن سنور جاتا ہے اور نام بڑی بہو کا)۔

امی جی کا وار ابا جی کی مسکراہٹ نے کامیابی سے روکا، ''مزیدار ہے۔''

مجھے ایک دم امی جی کا محاورہ یاد آ گیا ''تھک نال وَڑیاں'' (پنجابی محاورہ ہے تھوک سے بڑیاں بنانا یا تلنا) اور ظاہر ہے ہنسی بھی آ گئی۔ ظاہر ہے سالن تو اب گھی سے ہی بنے گا۔ ''چلو ہٹو سارا دن لگا کر ایک ہنڈیا بنالے تو ابا سے داد لینے کھڑی ہوجاتی ہے۔'' امی جی نے خوش ہونے کی اجازت بھی نہ دی۔

شام کو اچانک شمس آباد سے چھوٹے چچا جان آ گئے۔ امی جی نے مجھے باورچی خانے میں بلایا۔ سامنے چاولوں کی ٹرے رکھی تھی، ''بات سنو، اس پر ذرا دوپہر والا پھول تو بنا دو۔''

میں نے بغیر کچھ کہے ٹماٹر کی چٹنی کا ڈونگہ نکالا اور مڑ کر امی جی کی طرف دیکھا اور ہم دونوں بیک وقت کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ پھر بولیں، ''چل جا، آتا کچھ ہے نہیں، نری ٹرٹر۔''

••

امی جی کو کھانا پکانے کے بعد اسے سجانے کی بھی عادت تھی۔ دوپہر کو کالج سے واپسی پر دوپہر کا دسترخوان سجا ہوتا اور امی جی اہتمام سے سادہ سے کھانے کے ساتھ سلاد، چٹنی اور سبزیاں کاٹ کر رکھتیں۔ شیشے کا ایک ڈونگہ امی جی کو بے حد پسند تھا۔ اس میں وہ رنگ برنگا سلاد رکھا کرتی تھیں۔ میں کالج سے آئی تو ہاتھ دھو کر دسترخوان پر آ بیٹھی۔ ہم سب دوپہر کا کھانا بڑے کمرے میں نیچے بیٹھ کر کھاتے تھے۔ کھانا کیا تھا، دعوتِ ماحضر تھی، جو آئے وہ بیٹھ جائے۔ میری نظر امی جی کے محبوب ڈونگے پر پڑی جس میں ست رنگی سبزیوں کی بہار سجی نظر آئی۔ امی جی نے رنگوں کی آمیزش کو فنِ امورِ خانہ داری کے ساتھ مدغم کر دیا تھا۔ مور کے پنکھ کی صورت کٹی نفیس گوبھی جس کے سفید رنگ پر ہلکی سی پیلاہٹ غالب تھی۔ چھنگلی کے برابر کاٹی گئی لال لال گاجر کے ٹکڑے، جا بجا بکھرے زمرد

کی جھلک دیتے مٹر کے دانے، گول گول کٹے آلو اور پیلی شملہ مرچ، سبز مرچ، سبز دھنیا اور پودینہ اوپر چھینٹوں کی صورت بکھیرا گیا تھا۔ گھر کے تازہ پودینے کی چٹنی جس میں امی جی لہسن زیرہ اور نجانے کیا کیا ڈالا کرتیں۔ ''اب دیکھ کیا رہی ہو؟ کھالو'' امی میری محویت میں خلل انداز ہوئیں۔

''میں غور فرمانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ پکوان کی کشیدہ کاری کیسے کی گئی ہے'' میں نے شرارت آمیز جواب دیا...

''واہ، واہ!!! سفید گول کٹی مولیوں پر سرخ گاجروں کے دائرے، اوپر نفاست سے کٹی مولیوں کے نوخیز سبز پتے بکھرے! ایسے لگتا ہے کہ کسی نے زمرد کاٹ کے بکھیر رکھا ہو۔''

امی جی نے گھور کر مجھے دیکھا، ''کبھی زمرد خود بھی کاٹنے کی زحمت نہ کرنا، بس بیٹھی باتیں میٹھارا کرو۔''

مجھے بھی اب امی جی کی باتوں کی عادت ہو چکی تھی، ''امی جی! پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔''

بس امی جی کو میری باتوں کی عادت ساری عمر نہ پڑی۔

••

امی جی ہر سبزی، دال اور کھانے کو الگ پروٹوکول دیتیں۔ جیسے زندگی کا مقصد صرف سبزیوں کا دل جیتنا رہ گیا ہو۔ گوبھی بنانے لگتیں تو بڑی احتیاط اور نفاست سے پھول کاٹتیں۔ پھر احکامات جاری ہوتے، ''گوبھی میں بساند نہیں ہونی چاہیے۔ اس کا ذائقہ، رنگ اور شکل برقرار رہنی چاہیے (کھلی تلی رہے۔۔۔ امی جی کے الفاظ تھے)۔ اس کا بھرتہ نہ بنے کہ سمجھ ہی نہ آئے کہ کیا کھایا ہے۔ سبز مرچیں سالن میں کھلی تلی نظر آئیں۔ بھون بھون کر بھوری اور مریل سی 'ویسی نہ بنا دینا جیسے پھچیاں رناں' (بدسلیقہ خواتین) جان چھڑاتی ہیں۔ سبزی میں سبزی کا اپنا ذائقہ آنا چاہیے۔

سبز دھنیا باریک کٹا ہوا ہو، پتہ پورا نہ دکھائی دے۔ سالن پر آخر میں ڈالنا کہ دھنیے کی رنگت برقرار رہے۔ گوبھی میں ایک چمچ سرکہ یا لیموں ڈال لینا، بساند بھی مر جاتی ہے اور ہانڈی کا رنگ بھی بھورا نہیں ہوتا۔''

''پیاری امی!'' بالآخر میں نے لجاجت سے کہا، ''میں یہ شعبدہ ہرگز نہیں دکھا سکتی کہ ایک ہی ہنڈیا کے اندر گوشت گل جائے، گوبھی زیادہ نہ گلے، اس کے پھول کی صورت قائم دائم رہے اور اس کا ذائقہ بھی گوبھی ہی کا ہو۔ کچی بھی نہ ہو کہ ہنڈیا سے بساند آئے۔''

''گوبھی میں اجوائن اسی وقت پیس کر ڈالو تا کہ خوشبو زیادہ آئے اور ذائقہ بھی ہو'' امی جی نے سنی ان سنی کرتے ہوئے مزید فرمایا۔

''اب اجوائن کیوں ڈالنی ہے؟'' میں نے تفتیش ضروری سمجھی۔

''اس لیے کہ گوبھی بادی نہیں رہتی۔ کھانے کے بعد پیٹ میں گرانی نہیں ہوتی۔''

''یا اللہ جی، آپ نے مجھے کن حکما کے گھر پیدا فرما دیا ہے؟''

قیمہ بھرے کریلوں کی ہدایات اور تقاضے سن کر تو میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ بس مجھے تو نعمت خانے میں قدم رکھتے ہی یوں لگتا تھا کہ یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے۔

یا میں نہیں یا لذتِ خوراک نہیں ہے۔

یقیناً اقبال کی روح تڑپ اٹھی ہوگی۔ ''کریلوں کو قصائیوں کی طرح چھیلنا نہیں۔ تیل میں بھگو کر برباد بھی نہیں کرنا۔ کڑواہٹ دور کرنے کے نام پر غذائیت کا ناس نہ مار دینا۔ ٹماٹروں اور دہی کے سر پر اس کا ذائقہ بہتر ہوتا ہے۔ جتنا باریک کاٹو گی اتنا ہی جلدی نرم اور حلیم ہوگا۔ نمک کا چھڑکاؤ نہ کرنا پھر وہ نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پہلے ہی کریلے کی خاصیت گرم ہے، زیادہ نمک چوس لیں تو ہانڈی میں بلڈ پریشر کا نسخہ پک جائے گا۔ خواہ مخواہ پیاس لگے گی اور پانی یوں پینا پڑے گا جیسے پیٹ میں ''مُنجی'' بیج رکھی ہو۔ اور ہاں، ٹماٹر ہانڈی میں ثابت رکھ کر چھلکا اتار لینا، نہیں تو ان کے چھلکوں کے ''پگھانے'' (غبارے) اوپر تیرتے پھرتے ہیں۔''

''قیمہ بھونتے ہوئے زیرہ پیس کر ڈال لینا۔ سبز مرچ کے پیٹ میں چیرہ لگا کر ڈالنا تا کہ ذائقہ شامل ہو۔''

''زندگی کا مقصد ایک چھوٹی سی ہنڈیا میں کسی چھومنتر کے زور پر قیمے، گوشت، مرغی اور مچھلی کے کچے گوشت میں ایک انقلابی قدم کے ذریعے جدت، ندرت اور لذت پیدا کرنا ہے۔ رنگ سازی کی صنعت، حکمت، جراحت، کیمسٹری اور بیالوجی کے تمام اسباق نعمت خانے میں پورے ہوں گے۔ حسنِ صورت و حسنِ سیرت سے مزین ہانڈی ہر روز یوں پکانی ہے کہ یہ زندگی کی آخری ہانڈی ہے۔''

●●

امی جی سے ایک دن میں نے پوچھا کہ آپ کو اتنے رنگ برنگے کھانوں کی تراکیب کیسے یاد رہتی ہیں۔ یہ تو ناممکن کام ہے میرے لیے۔ امی جی نے چاولوں کے بڑے پتیلے کو دم دیتے ہوئے اوپر پتھر کی مسالہ پیسنے کی سِل رکھی، نیچے رکھے توے کی آگ کو مدھم کیا، میں پاس رکھی پیڑھی

بیٹھی مشاہدہ فرما رہی تھی۔ پلٹ کر ایک تنقیدی نظر مجھ پر ڈالی اور اطمینان سے گویا ہوئیں...

''جس طراں تینوں جی ٹی روڈ جڈیاں لمّیاں نظماں یاد رہندیاں نیں'' (جیسے تمھیں جی ٹی روڈ جتنی لمبی نظمیں یاد رہتی ہیں۔)

''چاولوں میں پانی کم نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ''پُھر'' نہ سکیں اور گھنگھنیوں کی صورت میں کھنکھناتے رہیں، نہ ہی اتنا پانی ڈالو کہ وہ ''پِپّا'' بن جائیں۔'' میں پریشانی سے امی جی کی اصطلاحات سنتی رہتی۔ پھر میں نے ڈرتے ڈرتے پُھر جانے کا مطلب پوچھا تو علم ہوا کہ جب چاول، دال، گندم، چنے وغیرہ پانی چوس کر پھول جاتے ہیں تو اسے دیہی زبان میں پُھر جانا کہتے ہیں۔ میں نے ایک نظر امی جی کے بقول، پِپّا بنے اپنے کارنامے کو دیکھا اور دوسری نظر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ کاش میں چڑیا ہوتی، اس پُھر، پِھر سے ماورا ہو کر پُھر پُھر اڑتی پھرتی۔ بعد میں تایا جان نے بتایا کے اسی پُھر جانا سے، آپُھر جانا نکلا ہے، یعنی اپھارہ ہو جانا۔

بہت سالوں بعد جب ہم نیوٹریشن کے دو سالہ کورس میں ڈنمارک کی معروف ترین بریڈ بنانا سیکھ رہے تھے، اس کے غذائی حقائق کیا ہیں، نشاستے اور لحمیات کا تناسب کیا ہے، میدہ، انڈے، مکھن، کی درست مقدار کیسے ڈالی جائے۔ ہماری بزرگ استانی صاحبہ نے اوون سے نکلی ڈبل روٹی کو الٹا کر کے اور اپنی انگشتِ شہادت کو دوہرا کر کے اس کے درمیانی ابھار سے بریڈ پر کھٹاک کھٹاک کیا...

''اب آواز غور سے سنو، یہ آواز کھوکھلی اور کھنکھناتی ہونی چاہیے، ڈبل روٹی بھاری نہیں ہونی چاہیے، پھول کی طرح ہلکے سلائس ہونے چاہییں اور روٹی کا ٹیکسچر خوب پھولا ہوا ہونا چاہیے۔''

میں نے استانی جی کی طرف دیکھا، ''ہائے او میریے مائے، چاول کی چار چوفیری سے باہر آئے تو روٹی کی گھمن گھیری نے گھیر لیا۔''

مجھے بے اختیار امی جی کی یاد آئی اور میں نے سب کو چاول پکانا سیکھنے کی داستان سنائی۔

چاول جو نجانے کیسے میرے ہاتھ لگاتے ہی کھیر یا دلیے کی صورت اختیار کر لیتے، ان کا دانہ دانہ الگ دیکھنے کی خواہش شاید امی جی کے بچپن کی تمنا تھی۔ بس کسی جادوئی ترکیب کے ذریعے یہ کمبخت باریک تنکے کی صورت دکھائی دینے والے چاول ''پوٹا پوٹا لتے'' ہو جانے چاہییں۔ اس میدان میں تو خدا جھوٹ نہ بلوائے، امی جی نے جنابِ انور مسعود کی 'اج کیہہ پکائیے' کو بھی مات دے دی تھی...

''چاول وکھرے وکھرے (الگ الگ) نظر آئیں اور تیل میں بھیگے نہ دکھائی دیں۔ پوٹا پوٹا لمے ہون۔'' امی جی نے ہدایات دیں۔

''امی جی بالکل درست لمبائی بتا دیں'' میں نے پریشان ہو کر کہا۔

امی جی نے گھور کر دیکھا، ''چاول کو پہلے بھگو کر رکھتے ہیں، جاہلوں کی طرح مل مل کر نہیں دھوتے۔ دھوبی گھاٹ کھول رکھا ہے تم نے کیا؟ پھر جب دم کھولنا ہو تو ڈوئی کی الٹی طرف سے ڈنڈی کے ساتھ کاٹا (کراس) ڈال دیا کرو۔ چاول زخمی نہیں ہوتا۔''

''امی جی!'' میں نے ہراساں ہو کر کہا، ''میں آپ کو سویاں نہ پکا دوں، پوٹا پوٹا کیا، چپہ چپہ لمبی ہوں گی بلکہ فرمائش اور آرڈر پر کہنیوں تک لمبی بھی بنائی جا سکتی ہیں؟''

''ایہہ تسیں میری گل سن لؤ'' امی جی نے ابا جی سے مخاطب ہو کر کہا، ''اس لڑکی کو کھانا پکانا نہیں آنے کا، یہ صرف ٹرٹر کر سکتی ہے اور اس کے ذمے دار آپ سب ہیں جو اس کی زبان درازی پر خوش ہوتے ہیں۔''

ابا جی حسبِ معمول میری مدد کو آئے، ''کیا شور مچا رکھا ہے آپ نے؟ بھئی اسے کرنے دیں جیسے پکا رہی ہے۔ ایک دن میں سرسوں تو نہیں پھولے گی۔ ہم کھا لیں گے جیسا بنائے گی۔''

''ہائے ابا جی دیکھیے تو، اس دو روزہ زندگی پر ایک روزہ چاولوں کے کتنے گہرے اثرات ہیں۔'' میں نے ذرا سی حمایت پا کر کہا، ''حالانکہ پیٹ کے کنوئیں میں جا کر سب برابر ہو جائے گا۔''

جواب میں ابا جی نے غیر جانبدارانہ حکمتِ عملی اپنائی۔

امی جی ادھر سے مایوس ہو کر دوبارہ کچن شیف کی مسند پر براجمان ہو گئیں، ''اچھا، کبابوں پر انڈے نہ لپیٹنا۔ کباب پر اندر ڈالے دھنیے، سبز مرچ اور کٹی مرچ کی بہار نظر آنی چاہیے۔'' انڈہ اوپر تھوپ دیا جائے تو کباب خستہ نہیں رہتے۔ گارا مٹی دکھائی دیتے ہیں۔''

مجھے یاد ہے کہ چچا جان انگلینڈ سے آئے اور ان کی مہمان نوازی سے زیادہ دلداری کرتے ہوئے امی جی نے اپنے پکوان پھیلا رکھے تھے۔ میں نے چچا جان کو امی کی شکایات لگانے کی کوشش کی۔ دونوں ہاتھ کاندھوں تک اٹھا کر بولے...

''میرے ساتھ تو بات ہی نہ کرو، نہ ہی کسی حمایت کی امید رکھنا۔ آپا کی پکائی دال کا تڑکا تو پورے گاؤں میں جاتا تھا، بہتر یہی ہے کہ سیکھ لو۔ میاں محمد بخش رحمہ اللہ تک نے فرمایا تھا۔

نرم کباب بھجن تر تازے دھم گھتی خوشبوئی

چاول قلئیے رنگ برنگی نعمت چیز نروئی"

"قلیے کیا ہوتا ہے چچا جان،" باقی شعر تو کباب، چاول اور خوشبو کی کہانی سنا رہا تھا۔ یہ لفظ میرے لیے نیا تھا۔

"قلیہ، بھئی توے پر بھنا گوشت یا کباب یا مچھلی جسے بعد میں مسالے پر بھی ڈالا جاسکتا ہے۔"

بھلا میاں محمد بخش رحمہ اللہ کے جی میں کیا آئی کہ پکوان کی دنیا میں دخل دینے لگے۔ کمال ہے، رنگ برنگے کھانوں کے نام گنوانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے ہاتھ پر رکھے قیمے کو مقدور بھر گول کباب کی شکل دینے کی کوشش کی۔

بات میری خانہ داری سے شروع ہوئی، چچا جان نے بیچ میں اپنے محبوب میاں محمد بخش کو ڈالا، تایا جان تشریف لے آئے اور بات علاج بالغذا کی طرف نکل گئی۔ "توے پر کھانا بنانے سے غذائیت ضائع نہیں ہوتی جسے عام طور پر بیبیاں بھون بھون کر ناس مار دیتی ہیں۔"

میں دسترخوان لگانے میں مصروف ہوگئی۔ چچا جان بے چارے میری طرح دونوں بڑے بھائیوں کی حکمت کی باتیں سنتے رہے۔

••

"بھنڈی گوشت میں پھر وہی جادوگری دکھاؤ جی۔ بھنڈی کی لیس تو ختم ہو جائے لیکن اس کی رنگت برقرار رہے۔ اس پر خراش نہ آئے اور اس کا منہ نہ کھلے۔ ایک ہی ہانڈی میں ڈالا گیا گوشت تو خوب بھن جائے لیکن بھنڈی کی سبک سری ویسے ہی سر تان کر رہے۔ الگ تھلگ اور خوبصورت دکھائی دے۔"

میں نے امام ضامن باندھ کر امی جی کی ہدایات کے مطابق بھنڈی گوشت بنایا۔

حالانکہ باقی گھر تعریف کے ڈونگرے برسا چکا تھا، بڑے بھائی جان نے انعام میں پیسے بھی دیے کہ بہت اعلیٰ کھانا بنایا ہے، لیکن امی جی نے ڈونگے کا جائزہ لے کر منہ میں نوالہ ڈالے بغیر کہا کہ بھنڈی نے "منہ اڈیا ہویا اے" (بھنڈی نے منہ کھولا ہوا ہے)۔ نفاست نہیں ہے۔"

بھنڈی پکانا ہی نہیں، بھنڈی پکانے کی تیاری بھی ایک جاں گسل مرحلہ تھا۔ اسے دھونا، سکھانا، تراشنا اور پھر پکانا امی جی کی روایت میں ایسے شامل تھا جیسے بھنڈی نہ ہوئی کسی مقدس رسم کی ادائیگی ہوگئی۔

"یہ پکڑو،" امی جی نے ململ کا سفید دھلا ہوا کپڑا مجھے تھمایا، "اور ان دھلی ہوئی بھنڈیوں کو

ایک ایک کر کے خشک کرو۔''

میں نے چھانی میں پڑے دھلی ہوئی بھنڈیوں کے ڈھیر کو دیکھا،''امی جی دھل تو گئی ہیں۔ ڈرائی کلیننگ ضروری ہے کیا؟'' میں نے اپنی دانست میں دلیل دے کر بات کی۔

''ہاں، ان کی لیس کم ہوتی ہے اور شکل خراب نہیں ہوتی۔ تیل نہیں پیتیں، خستہ بنتی ہیں۔''

''اچھا۔۔ اچھا۔۔'' میں نے با دلِ نخواستہ ڈھیر کے کونے سے ایک بھنڈی اٹھائی۔ پھر کنکھیوں سے امی جی کی طرف دیکھا۔ وہ ایسے انہماک سے باریک باریک پیاز کاٹ رہی تھیں جیسے کنول کی پتیاں پرو رہی ہوں۔ میری آدھی سے زیادہ بھنڈیاں جھاڑ پونچھ کی منتظر تھیں۔ امی جی نے پیازوں سے فارغ ہو کر اب سبز مرچیں اٹھا لیں اور یاقوت تراشنے کا عمل شروع ہو گیا۔ میں نے جی کڑا کر کے سفید ململ کے کپڑے سے باقی کی بھنڈیاں رگڑنی شروع کیں۔

''یا اللہ اگر یہ بھنڈی نہ بھی پیدا ہوتی تو کیا قیامت آتی۔'' حسبِ عادت میرا خالقِ کائنات سے مکالمہ شروع ہوا۔ ''حضرت موسیٰ کی قوم نے تو پیاز، لہسن اور مسور کی دال مانگی تھی، بھنڈی کریلے کہاں سے آ گئے؟ یہ کوئی بات ہوئی بھلا، اس ناشکری قوم سے بندہ پوچھے ہمیں کیا مشقت میں ڈال گئے۔ کسی کے اعمال کی سزا کسی اور کو رہتی دنیا تک دینا، یہ کیا انصاف ہوا۔'' امی جی اپنے دھنیے کی پچی کاری سے فراغت پاتے ہی میری طرف متوجہ ہوئیں۔

''کتنی کوڑھی کڑی ایں توں۔'' (کتنی سست لڑکی ہو تم) ابھی تک بھنڈیاں خشک نہیں ہوئیں؟''

''امی ہیں بھی تو بہت زیادہ'' میں نے مظلومیت سے کہا۔

''نہیں، تم سے کام نمٹتا ہی نہیں کیوں کہ بدنیتی ساتھ شامل ہے۔ آپ نچی، ویہڑہ ڈینگا'' (ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا)۔ امی جی کی میرے بارے میں اپنی آزمودہ رائے تھی۔

''جی امی'' میں نے سعادت مندی سے اتفاق کیا ورنہ اگر میرے افکارِ عالیہ کی بھنک پڑ جاتی تو بھنڈی بھاشن بنتا۔ ویسے بھی اس منحوس بھنڈی سے مجھے بھی اللہ واسطے کا بیر تھا۔ نری لیس ہونے کے علاوہ خونخوار سبزی ہے۔

میری زندگی میں بھنڈی نامے کو بطورِ سزا ایک خاص مقام حاصل رہا۔ مجھے جتنی ان سے نفرت رہی اتنا ہی وہ سر تانے میرے راستے میں کھڑی رہتی جیسے لہرا لہرا کر دعوتِ مبارزت دے رہی ہوں۔

البتہ ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ ان بھنڈیوں کی وجہ سے مجھے انور مسعود کی نظم اج کیہ

پکایئے یاد ہوگئی کیونکہ یہ امی جی کی پسندیدہ کتاب تھی۔ وہ بڑے شوق سے یہ نظم نکال کر پڑھتیں اور فرماتیں کہ ''رِنھناں پکانا وی تے کوئی کوئی جاندا۔''

لونواں والی بھِنڈی ہووے، پوٹا پوٹا لَمّی ہووے
ہرّی تے کچور ہووے سوہنی ہووے کولی ہووے
وِچ ہون بکرے دی پٹھ دیاں بوٹیاں
نال ہون چھَنڈیاں تندور دیاں روٹیاں
مکھنے دا پیڑا ہووے، لسی دا پیالہ ہووے
بھنڈیاں دے نخرے تے گرم مصالحہ ہووے
بھنڈیاں بنانا وی تے کوئی کوئی جاندا
رنھناں پکانا وی تے کوئی کوئی جاندا

امی جی کو گھر کی سبزیوں کے شوق نے باقاعدہ باغبان بنا رکھا تھا۔ کریلے، ٹماٹر، بھنڈی، گوبھی، توری، دھنیہ، پودینہ اور خدا جانے کیا کیا۔ ایک دفعہ ان کی کوئی سہیلی آئیں اور مجھے حکم ہوا کہ جاؤ اور ساری بھنڈیاں اتار کر لاؤ۔ ان کو ساتھ دینی ہیں۔ میں نے مقدور بھر کوشش کی کہ بتائے گئے طریقے کے مطابق بھنڈی توڑ لاؤں۔ لیکن ہوا یہ کہ بھنڈی کے پودے سے میرے ہاتھوں بازوؤں پر سوزش ہوگئی اور سرخی کے ساتھ ساتھ شدید خارش ہوگئی۔ ابا جی نے مجھے مرہم کافوری لگائی اور ساتھ ہی خفا ہوئے کہ اسے یہ کام کیوں کہا یا پھر احتیاط کرنے کو کہنا تھا کہ ہاتھوں پر کپڑا لپیٹ لے۔ آپ کو پتہ بھی ہے کہ اس کی جلد کتنی حساس ہے۔ اپنے ہاتھ اور بازو کھجاتے کھجاتے اور اس پر مرہم کافوری لگاتے لگاتے میں نے سوچ رکھا تھا کہ ہاتھ ٹھیک ہوتے ہی پہلا کام اس بھنڈی کے کھیت کا خاتمہ ہے۔

شام کو میں نے بڑے اہتمام سے ہاتھوں پر کپڑا لپیٹا اور اپنے سر سے بلند ٹہنیوں کو نیچے کر کے ان کی گردن مروڑ دی۔ تین قطاروں میں لگے تمام منحوس پودے سرنگوں ہوگئے۔ اس آپریشن میں مجھے کوئی دس منٹ لگے۔ پھر ہاتھ دھو کر دوبارہ مرہم کافوری لگائی۔ اگلے دن امی جی نے اپنی محبوب کھیتی پر پالے کی مار دیکھ کر جو جوابی کارروائی کی اس کے بارے میں راوی خاموش ہے۔

••

ایک مرتبہ میں نے گوبھی کے پردہ نشیں پھولوں کے پردے ویسے ہی رہنے دیے لیکن درمیان میں سے ننھے پھول نکال کر کھا لیے۔ سرخ گول گول مولیاں، مونگرے کھانا تو خیر ویسے ہی

میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ امی جی ہر گناہ معاف کر سکتی تھیں لیکن ان کے محبوب پودوں اور پھولوں کی بے آبروئی کی شدید ترین سزا تھی جس میں مجرم کے ساتھ بات چیت بند کرنا اور سماجی مقاطعہ بھی شامل تھا۔ اس ضمن میں ابا جی کا بھی یہی عالم تھا۔ ناپسندیدہ بات ہوجاتی تو خاموشی اختیار کرتے۔ لاکھ پیٹو ابا جی مسئلہ کیا ہے۔ لیکن ان کا سائیلنٹ ٹریٹمنٹ جاری رہتا۔

••

''دریائے جہلم کی تازہ مچھلی یوں پکنی چاہیے کہ اس کی باس بھی مر جائے وہ خوب اچھی طرح سے گل بھی جائے لیکن مچھلی نہ ٹوٹے۔ اس پر لہسن ادرک کا آمیزہ اجوائن کے ساتھ پیس کر ڈالا جائے جو یوں یکجان ہو کہ نظر ہی نہ آئے اور آخر میں دھنیے، پودینے اور میتھی کے سفوف سے اسے ڈھک دیا جائے۔''

امی جی کی تراکیب بس ایسے ہی ہوتی تھیں کہ کوہِ قاف سے پھیرا ڈال کر آنا سہل تھا لیکن ان کے انداز میں کھانا پکانا محال تھا۔

''اے نامراد مچھلی!'' میں نے سامنے رکھی مچھلی سے مخاطب ہو کر کہا، ''تجھے کون سی آفت جہلم کے دریا سے اٹھا کر سرائے عالم گیر کے جدی پشتی حکما کے گھر لے آئی؟''

''توں صرف گلاں کریا کر (تم صرف باتیں کیا کرو)'' امی جی تپ کر بولیں، ''کتابیں ٹرافیاں کسی کام نہیں آئیں گی۔ پیٹ میں آگ لگی ہو تو یہی ٹرافیاں اٹھا کر لوگ سر میں مارتے ہیں۔''

''پھر وہی لوگ، یا اللہ! یہ کون سے اللہ مارے لوگ ہیں جو گھات لگائے اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ کب کوئی کتابوں کی دنیا سے نکل کر ان کی نسلیں بڑھانے کے لیے وارد ہو اور وہ مرغی، مچھلی، دال اور روٹی کے بہانے اس کی سر پھٹول کریں؟''

''روٹی، روٹی، امی جی آپ کو بھی بابا جان کی تعلیم و تدریس اور نظیر اکبر آبادی کی روٹی نامے نے یہ دن دکھائے ہیں۔''

لیکن زندگی دکھاتی ہے کہ ہماری مائیں کتنی بڑی فلسفی ہوتی ہیں۔ حرف بحرف ان کے اندیشے اور خدشات درست ثابت ہونے لگتے ہیں۔ بے چاری ٹھیک ہی تو اولاد کو ہر فن مولا کر دینا چاہتی ہیں۔ صدیوں پرانے لوک دانش کے محاورات انسانی نفسیات کی عقدہ کشائی کرتے ہیں۔ امی جی کہا کرتی تھیں، ''ڈھڈ نہ پیاں روٹیاں، تے سبّھے گلاں کھوٹیاں'' (پیٹ میں روٹی نہ ہو تو ہر بات بے معنی ہے)

''مجھے روٹیاں نہیں پکانیں'' میں مصر رہی۔

''اچھا تو تم آلو یا مولی بھر کر پراٹھے بناؤ'' ماموں جان بولے۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے'' پھر میں نے انتہائی شوق سے نئی نئی ڈشز بنائیں اور ایک ایسا وقت بھی آیا کہ امی جی کو پراٹھے صرف میرے ہاتھ کے پسند آنے لگے۔

••

''میری بیٹی برتن دھونے کے لیے پیدا نہیں ہوئی'' ابا جی امی جی کے مسلسل گلوں شکووں سے تنگ آ کر بولے۔

''اچھا؟'' امی جی نے سر پیٹ لیا، ''تو وہ کیا کرنے کے لیے تشریف لائی ہے۔''

''پڑھانے کے لیے'' آرام سے جواب آیا، ''اللہ نے ہر ایک کے ذمے کچھ کام لگائے ہیں۔ وہ جن کو پڑھاتی ہے وہ بخوشی گھر کے برتن دھوتی ہیں یا نہیں؟ تو دوسروں کو پڑھانے کے لیے خود پڑھنا ضروری ہے۔ آپ اسے پڑھتے ہوئے تنگ نہ کیا کریں۔ جب فارغ ہوگی تو اس وقت چولھا چکی سکھا لیں۔''

''تعلیم یافتہ بچیوں کے لیے کھانا پکانا سیکھنا یا کوئی اور ہنر سیکھنا کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ انھیں جم کر کام سیکھنے کی عادت ہوتی ہے۔ لکھنے پڑھنے اور یاد رکھنے کی صلاحیت ان کی صلاحیتوں کو بڑھاتی ہے۔ وقت پڑنے پر توجہ دے کر بے حد آسانی سے سب سیکھ لیتی ہیں۔''

''برتن تو کوئی بھی دھو سکتا ہے لیکن قلم میری بیٹی کے ہاتھ میں کوئی اور نہیں دے سکتا۔ وہ ڈوئی پکڑتی ہے تو آپ اسے سوئی میں دھاگہ ڈالنا سکھانے لگتی ہیں۔ جو بچیاں علم حاصل کر لیتی ہیں ان کے لیے یہ کام کاج سیکھنا بہت آسان ہوتا ہے اور میری بیٹی تو ہر کام تخلیقی انداز میں کرتی ہے۔''

''شہد کی مکھی کی دنیا ہی دیکھ لو۔ ظاہر ہر مکھی ایک جیسی لیکن ہر ایک کے فرائض ان کی ذات کے مطابق مختلف ہیں۔'' ابا جی امی جی کو تسلی دینے کے لیے کہتے، ''کوئی کارکن مکھی، کوئی سپاہی، کوئی رس لانے والی، چھتہ بنانے والی، چھتے کی صفائی کرنے والی سب مکھیاں الگ الگ درجات میں منقسم ہیں اور پھر ایک ملکہ مکھی بھی پیدا کی اللہ نے'' ابا جی دلیل دیتے، ''انسانوں کی دنیا بھی ایسی ہے، ملکائیں اور رانیاں بھی اللہ نے ہی بنائی ہیں۔''

ابا جی کی طویل گفتگو کے جواب میں امی جی کا ایک ہی محاورہ آتش بازی کی شرلی کی طرح ٹھاہ کر کے لگتا، ''میں وی رانی، توں وی رانی، کون بھرے گا پانی'' آپ اس کو صرف باتیں

مٹھار نا سکھائیں۔''

ابا جی قیمہ بھری لال شملہ مرچوں کے ساتھ سجی سفید مولیوں اور ابلے گول انڈوں کے کٹے ہوئے ٹکڑوں کو سراہتے۔ میں نے کھانا پکانے کا جو تجربہ کیا، ابا جی نے اسے ہمیشہ داد دی۔ حوصلہ افزائی کے لیے کبھی سو یا پچاس کا نوٹ بھی مل جاتا۔ لیکن امی کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ جو قیمہ مرچ اور آلو انڈے منٹوں میں بنائے جا سکتے ہیں اور کئی لوگ مل کر کھا سکتے ہیں اس کو سارا دن لگا کر دو طشتریوں میں سجانے میں کیا حکمت ہے، لیکن شاید اس لیے چپ کر جاتیں کہ چلو سارا دن باورچی خانے میں نظر تو آتی ہے۔

••

مین نے اپنے سامنے رکھے ایک کلو قیمے کے ڈھیلے کو دیکھا۔ ''یا اللہ اس گولے کو میں کس طرح ایک خوش ذائقہ اور پرلذت ہانڈی میں بدلوں۔ یہ تو طے ہے کہ میں بیزار کن آلو قیمہ یا قیمہ مٹر نہیں بناؤں گی۔'' میں نے بآوازِ بلند اعلان کیا۔

''تو کیا طلسم پھونکیں گی آپ؟'' امی جی اس وقت نئے رسالے بتول کی ورق گردانی کر رہی تھیں۔

''میں اس کے نرگسی کوفتے یا شاہی کوفتے بناؤں گی'' میں نے گویا اپنی انقلابی سوچ کا اظہار کیا۔

''اللہ رحم'' عزیز بھائی جو اسلام آباد یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے اور اس مرتبہ نسبۃً طویل چھٹی پر آئے تھے۔ وہ خود بھی زبردست کھانا بناتے تھے۔ خصوصاً حلیم تو ایسی لذیذ ہوتی کہ ماہر خانساماں بھی مرعوب ہو جائے۔ ''یا اللہ تو ہی رزاق ہے اور تو ہی آفات سے بچانے والا ہے۔'' انھوں نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا۔ میری طرف انھوں نے دانستہ رخ نہیں کیا۔ ان کے چھیڑنے اور زچ کرنے کا انداز بھی بے حد مہذب اور پہلو دار تھا۔

''اللہ ہمیشہ رحم کرتا ہے۔ ابا جی کہتے ہیں وہ رحیم و رحمان ہے۔'' میں نے ان کے علم میں اضافہ فرمایا اور قیمے کے گولے کو بڑے برتن میں ڈالا۔

''بلا شبہ، لیکن اس کی صفات میں قہار و جبار ہونا بھی ہے۔ جس کے لیے وہ ایسے افراد مساط کر دیتا ہے جن کے ہاتھوں میں ملک و ملت کی لگام اور ایک گھر کی ڈوئی ہوتی ہے۔ جدے ہتھ ڈوئی، اوہدا ہر کوئی'' انھوں نے مجھے تفصیل سے جواب دیا۔

''امی جی!'' وہ میری بڑبڑاہٹ کی طرف متوجہ ہوئے بغیر بولے، ''میں تو کل شام کا

مرغی کا شوربہ اور بھنڈی ہی کھالوں گا۔''

''اچھا!'' اب تو بات غیرتِ ملی اور زعمِ صنعت گری پر آ رکی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ قائم رہیے گا اپنے دعوے پر'' میں نے تنبیہ کر دی۔ جواباً حسبِ معمول انھوں نے اپنی ایک پیاری مسکراہٹ کا پھول میری طرف اچھالا۔ پھر میرے پاس آ کر راز داری سے بولے ''کوئی مدد چاہیے تو بتا دینا۔''

''جی نہیں... خودانحصاری اور خودداری پر کامل ایمان ہے ہمارا'' میں نے بے نیازی سے کہا۔

ہمارے اس بھائی پر اللہ نے تمام تر خوبیاں ختم کر رکھی تھیں۔ شاید عالمِ شباب ہی میں اپنے پاس بلانا تھا تو اپنی ذات کے پرتو سے اپنی صفات عطا کر رکھی تھیں۔ دو گھنٹے کی محنت کے بعد میں نے دستر خوان سجایا۔ بادام بھرے کوفتے اور ان کے ساتھ ابلے ہوئے آلو جن کو بڑی احتیاط سے تل کر سنہری رنگ دیا گیا تھا۔ میں نے عزیز بھائی کو جلانے کی خاطر ذوقِ جمالیات کا بھرپور استعمال کیا۔ پھول کی صورت میں کٹے لال ٹماٹر، چھلوں کی صورت کے پیاز، اور ستارے کی صورت کٹا لیموں سجایا۔ زمرد کے موتیوں جیسے ابلے ہوئے مٹر ان پر دمک رہے تھے۔ دہی میں چورا کیے پاپڑ اور کدوکش کھیرا ڈال کر اس پر گھر سے کٹے تازہ پودینے کے پتوں کا پھول بنا رکھا تھا۔

''امی جی!'' میں نے بھی عزیز بھائی سے مخاطب ہوئے بغیر کہا،''بھائی کے لیے کل رات کا مرغی کا شوربہ اور بھنڈی بھی گرم کرلوں؟''

''نالائق'' بھائی نے زیرِلب مسکرا کر کہا،''میں ہاتھ دھوکر آتا ہوں۔''

''کیا تیر مار لیا تم نے؟'' امی جی بولیں،''سارے مسالے تیار ملے، پیاز تک میں نے کاٹ کر دیا، روٹیاں تنور پر آٹا بھجوا کر لگوا لیں۔ سارا دن لگا کر ایک ہانڈی کیا پکالی، اب پوری دنیا قصیدے سنے گی۔ انڈے تھوڑے تے کڑکڑ بوہتی۔''

امی جی کے انڈے، مرغی، ٹرٹر، اور کڑکڑ سے مجھے بہت چڑ تھی۔ پتہ نہیں امی جی کا ہر محاورہ مرغی خانے سے ہوکر کیوں نکلتا تھا۔

''ہائے ہائے امی، کیا ہے جو ذرا سا خوش ہو لینے دیا کریں'' میرا منہ بن گیا۔ اتنے میں ساتھ والے گھر سے ہمارے دشمنوں کی آمد ہوئی۔

''واہ واہ چاچی جی یہ دعوتِ شیراز کس خوشی میں؟ میں ذرا ہاتھ دھولوں۔''

میں نے دور سے ہی مطلع کیا،''میں نے بنایا ہے اپنے دستِ مبارک سے۔''

''اچھا آ آ آ آ آ آ؟'' اس کیا تصنع سے بھرپور، اچھا، میں پرانی مخاصمت جھلک رہی تھی۔
''چاچی جی! خود بنایا اس نے یا دھوکہ دے گئی؟ روندل تو یہ ہے ہی ناں'' اس نے پوری توجہ اپنی چاچی سے مکالمے پر لگائی۔

''پاجی'' میں نے کہا اور پھر وضاحت کی...

''یہ اردو والا پاجی ہے۔'' امی جی نے گھور کے دیکھا، ''ہے جو ذرا سی شرم کرے کہ بڑا بھائی ہے۔ جب تک جواب نہ دے لو روٹی ہضم نہیں ہوتی تمھاری۔ آجاؤ بیٹا۔ ادھر آجاؤ۔'' انھوں نے ذرا سا کھسک کر اپنے ساتھ جگہ بنائی۔

''آپ جا کر ہاتھ دھو ہی آیئے'' میں نے امی جی کے محاوروں کے اگلے دوہتھڑ سے بچنے کے لیے کہا، ''زیادہ چالاکیاں کیں تو کہیں کھانے سے ہی ہاتھ نہ دھونا پڑ جائیں۔''

••

عزیز بھائی چونکہ خود کھانے بنانے کے ماہر تھے۔ جب وہ اسلام آباد سے آتے اور میں امورِ خانہ داری میں اپنی مشاقی دکھانے کی کوشش پر آمادہ ہوتی تو میری کم بختی آجاتی۔

''یہ کس ملک کا نقشہ ہے'' عزیز بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔

میں نے فوراً منہ پھلا لیا، ''مجھ سے ایسی ہی روٹیاں بنتی ہیں۔''

''امی جی کو دیکھا کیسی روٹیاں بناتی ہیں؟'' انھوں نے کہا۔

''امی بنوں گی تو میں بھی ویسی ہی بناؤں گی۔'' چپ رہنا میں نے تو سیکھا ہی نہیں تھا۔

''امی کوئی نہیں بن سکتا جب تک عقل نہ آئے'' امی جی نے درمیان سے ہی بات اچک لی۔

''ایسے ہی، تو جن کے گھروں میں نوکر ہوتے ہیں وہ کیسے امی بن جاتی ہیں؟ مجھے تو روٹیاں پکانا اور کپڑے استری کرنا نہایت برا لگتا ہے۔ میں تو یہ دونوں کام نہیں کرنے کی۔ اور برتن دھونا کتنا غیر شاعرانہ کام ہے۔ بس جمع کرتے جاؤ اور دھوتے جاؤ۔ توبہ ہے۔''

امی جی کو تشویش ہونے لگی۔ پھر ان کو اپنی خاندانی ناک کی فکر ہوئی جو میں نے کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی کھانے پینے کی متوالی، روٹیاں پکواتی اور برتن دھلواتی خونخوار ہستی کی بات نہ مان کر کٹوا دینی ہے۔

ادھر میری سمجھ میں یہ بات قطعی طور پر نہ آتی کہ کیا ایک پورا خاندان اس بات کا منتظر بیٹھا ہوگا کہ بیوی یا بہو بیاہ کر آئے تو وہ خود انڈوں پر بیٹھ کر کٹ کٹاک کرتے اس نووارد کو گرم

روٹیاں، استری شدہ کپڑے اور برتن مانجھنے کی بیگار پر رکھ لیں گے جس کی واحد حماقت ان کے بیٹے سے عقد کرنا ہے۔ ایسے لوگ بھلا بیٹوں کی شادیاں کیوں کرتے ہیں۔ دوپٹے کے پلّو سے باندھ لیا کریں اس پلّو کو۔

ایک خوش باش زندگی گزارتی، سکول کالج سے نکلی بے چاری بہو آتے ہی ان کے پورے خاندان کا بوجھ اٹھالے، خاندان کی بڑی بوڑھیاں جمع ہو کر کان کے ریڈار باہر نکالے، چشمے پہنے، سر جوڑے، رویتِ ہلال کمیٹی کے ارکان کی طرح، بہو کے چاولوں کے دانہ دانہ ہونے کی تصدیق کریں، روٹیوں کا قطر ماپیں، گوبھی کی بساندسوں سوں کر کے چیک کریں، دہی بڑوں میں انگلیاں ٹھونس ٹھونس کر دیکھیں کہ کہیں گِلٹی تو باقی نہیں رہ گئی، دال کے دانے گنیں جو دیکھنے میں بظاہر موتیوں جیسے ہوں لیکن ہاتھ لگانے سے برف کے گالے جیسے گھلتے چلے جائیں۔

میں نے امی کے پاس آتی ساری زنانہ فوج کی کہانیاں سن رکھی تھیں جن کی بیٹیاں سسرال جاتے ہی میدانِ حرب میں اتر جاتیں اور اس عسکری مشق میں زنانہ جوہر دکھا کر میاں سے دادِ شجاعت کی توقع لے کر امید اور خوف کے درمیان لٹکتی رہتیں۔

میں نے جاسوسی ڈائجسٹ اٹھایا اور مزے سے پڑھنے لگی۔ اپنی دھن میں مجھے دنیا بادلوں، چاند ستاروں، نہر کی لہروں اور جہلم کی روانی سے آگے کچھ نہیں لگتی تھی۔

''بس روٹی نہیں پکانی تو نہیں پکانی بھئی، کوئی زبردستی ہے۔ اتنی اچھی ڈشز بناتی ہوں۔ روٹیاں لگانے کے لیے تندور بڑے، نہیں تو بندہ نوکر رکھ لے اور اسے کہہ دے کہ بھائی داتا دربار جا، اپنی کھا اور میری لے آ۔''

''استغفر اللہ''، امی جی کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ پھر وہی معمول کا جملہ آیا، ''یہ لڑکی کس پر چلی گئی ہے یا رب؟ واہ جی پتر راوی، نہ کوئی آوی نہ کوئی جاوی۔''

''روٹی نہ ملے تو دین دنیا سب بھول جائے انسان۔ نماز روزے کی فرضیت بھی روٹی ہی کے گرد گھومتی ہے۔ آپ کی دادی اماں کہا کرتی تھیں، اول طعام بعد کلام، اللہ نوں سجدہ تے نبی نوں سلام۔ جب دیکھتیں کہ میرے چہرے پر متاثر ہونے کے کوئی اثرات ظاہر نہیں ہوئے تو پھر طریقہ واردات بدل کر ہمارے نانا جان سے سیکھے اشعار کے میزائل پھینکتیں،

پنج رکن اسلام دے، تے چھیواں فریدا ''ٹک''
جے نہ بھے چھیواں، تے پنجے ای جاندے مک

اسلام کے پانچ رکن ہیں، اے فرید ایک چھٹا رکن بھی ہے جو روٹی ہے، اگر یہ چھٹا رکن شامل نہ ہو تو وہ پہلے پانچ رکن بھی ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔''

اب جب میرے بچے میرے بنائے نان، کلچوں، پراٹھوں اور پوریوں کچوریوں کی تعریف کرتے ہیں تو لگتا ہے ایک ہی سانچے سے بن کر نکلے ہوں۔ میں کبھی ہنستی ہوں، کبھی میری آنکھوں میں نم آ ٹھہرتا ہے۔

••

اگرچہ میں اپنی سی کوشش کرتی کہ امی جی کی طرح عزیز بھائی کو واپسی کی تیاری میں سہولت دوں۔ ایک دفعہ میں نے بصد اہتمام ان کے سفید کپڑے دھوئے۔ نیل لگایا، پھر استری کر کے سوٹ کیس میں ڈالے۔ ان کو کسی کانفرنس میں جانا تھا۔ جاتے ہوئے چپکے سے مجھے سو روپے بھی دے گئے۔ میری اتراہٹ کا ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ لو بھلا یہ گھرداری کیا مشکل ہے۔ میں نے جرسی کی جیب میں سو روپے کا نوٹ تھپتھپایا، اپنے شانے پر خود ہی تھپکی دی۔

تین دن بعد عزیز بھائی کا فون آیا، ''امی جی اس لڑکی نے شلواریں میری اور قمیصیں ابا جی کی رکھ دی تھیں۔''

''ماں صدقے جائے، فیر توں کیہہ کیتا؟''

''کرنا کیا تھا۔ دوست کے کپڑے پہن کر گیا۔ وقت گزر گیا۔'' انھوں نے اطمینان سے کہا۔

••

''یہ جو کھانا پکانا ہوتا ہے ناں، اس کے لیے کوئی اضافی ڈگریاں درکار نہیں ہوتیں'' امی جی نے مچھلی کو بڑی احتیاط سے پلٹا، ''اس کے لیے بس دماغ موٹا نہیں ہونا چاہیے اور تھوڑی سی عقل کی ضرورت ہوتی ہے، جو کہ تم میں نہیں ہے۔''

''جی امی'' میں نے بہت سعادت مندی سے کہا ''اور میرا دل بھی نہیں چاہتا۔ جب عقل ہی نہیں تو فضول محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

امی جی نے گھور کر دیکھا۔ بولیں کچھ نہیں۔ کوفتے بناتے ہوئے مجھے ان میں نمک ڈالنا یاد نہ رہا۔ پہلے تو حسبِ روایت میری شان میں خوب قصیدے پڑھے گئے۔ پھر امی جی نے اس کا حل نکالا۔ ایک برتن میں پانی ابال کر اس میں نمک ڈالا اور پھر کوفتے ڈال دیے۔ وہاں سے اٹھا کر انھیں ہنڈیا میں رکھ دیا گیا۔

کھانا بچانے کے کئی ہنگامی طریقے میں نے سیکھ ہی لیے تھے۔ مثلاً مرغی جلا کر اس کا کوئلہ بنا حصہ کھرچ دیا جائے اور مسالے میں دودھ ڈال کر بھونا جائے پھر بچی ہوئی مرغی کو نئی گریوی میں ڈال دیا جائے۔

مونگ پھلی یا خشخاش پیس کر بھی ڈالی جا سکتی ہے۔ نمک زیادہ پڑ جانے پر آٹے کے پیڑے سے زیادہ آلو کے ٹکڑے کام آتے ہیں۔ نانی اماں جو ساری کارروائی دیکھ رہی تھیں، بڑی معصومیت سے بولیں، ''توں ایہنوں کھانا پکانا نہیں، کھانا بچانا سکھا دے۔''

کوفتے انڈے امی جی کو بہت پسند تھے۔ میں نے انڈے گولائی میں کاٹ کر ڈال دیے تو بولیں ''انڈے ہمیشہ لمبائی میں کاٹا کرو۔ گولائی میں کاٹنے سے زردی جلد ٹوٹ جاتی ہے۔'' کبھی کہتیں کہ ''سالن میں رکھنے والے انڈوں کو کاٹ کر توے پر ذرا تل لیا کرو۔ اس طرح زردی شوربے میں نہیں گرتی اور سالن کی شکل خراب نہیں ہوتی۔''

میں بظاہر خاموش رہتی لیکن دل ہی دل میں منحوس مرغیوں اور ان کے واہیات انڈوں کو خوب کوستی۔ اضافی مسئلہ یہ بھی تھا کہ ان کی ہانڈی کی شکل بھی بہت اچھی ہونی چاہیے، لال سرخ، پوست کے پھولوں جیسی ہنڈیا پر ہرے کچور تازہ کٹے دھنیے کے پتے تیرتے ہوں، گرم مسالے کی تیز خوشبو لذت کا اعلان کرے۔

جس لاون دی شکل ہو سوہنڑی نہ چنگی خوشبوئی
بھانویں لذت بھریا ہووے کرے پسند نہ کوئی

جس کھانے کی شکل یا خوشبو اچھی نہ ہو وہ بھلے کیسا ہی لذت بھرا ہو، کسی کو پسند نہیں آتا۔

امی جی کو زردہ اور پلاؤ ملا کر کھانا بہت پسند تھا۔ کھلکھلاتے تیز رنگ کا زردہ جس میں جابجا سبز پستے کے موتی ٹکے ہوتے۔ سفید بادام اور سندرخانی کشمش بہار دکھلا رہی ہوتی۔ ناریل کے تراشے لمبے لمبے ٹکڑے واقعی امی جی کے بنائے زردے کو اشتہا انگیز ثابت کرتے۔ ایک بار امی جی نے اپنی رکابی میں زردے پر پلاؤ کی تہہ لگائی۔ میری حسِ جمالیات کو شدید ٹھیس پہنچی۔

''امی جی کیا سارے زردے کو خراب کر دیا؟'' میں نے اعتراض کیا۔

بڑے اطمینان سے نوالہ بنایا اور بولیں، ''توں اپنی ڈش خراب نہ کریں۔ یہ میری مرضی ہے کہ میں اپنا کھانا کس طرح کھاؤں۔'' ان کے جانے کے بعد میں نے اچانک خود کو اسی طرح

پلیٹ بنا کر کھانا کھاتے پایا۔

••

میں کئی دفعہ سوچتی ہوں کہ امی جدید دور میں ہوتیں یا ان کو مواقع ملتے تو یقیناً ایک بڑی آرٹسٹ ہوتیں۔ میں بچپن سے ہی انھیں مولیوں، گاجروں کھیروں، اور شملہ مرچوں کے ساتھ ڈونگے سجاتے اور رنگوں سے کھیلتے دیکھا۔ وہ تو مجھے بعد میں چچا جان نے بتایا۔ وہ جب بھی وہ برطانیہ سے پاکستان آتے تو امی جی کے ساتھ اپنا گزارا وقت داستانوں کی طرح سناتے۔ امی جی کو شروع سے ہی رنگ بے حد پسند تھے اور وہ ان رنگوں کی آمیزش کے اصول بھی جانتی تھیں۔

ہماری دادی جان کے پاس صرف دو ہی سفید دوپٹے تھے۔ امی جی اکثر ان کو رنگ کر دیتیں۔ بدل بدل کر گہرے رنگوں کے دوپٹے دادی جان شوق سے اوڑھتیں اور جب ان کی ہمجولیاں انھیں چھیڑتیں کہ تو بہو کے آتے ہی باہڑی بن گئی ہو تو خفا ہو جاتیں۔ ایک دن شام کو باہر سے گھوم پھر کر گھر آئیں تو موڈ بہت خراب تھا۔ امی جی کو پاس بٹھا کر کہنے لگیں،

''ایک تو تم نے میرے دوپٹوں کو رنگ کر کر کے خراب کر دیا ہے ''پُڑ'' گئے ہیں۔ دوپٹے، کپڑے دھو دھو کر خراب کر دیے ہیں تم نے۔''

''اچھا بے جی آئندہ نہیں دھوؤں گی'' امی جی نے کہا۔

اگلے چند دن خاموشی سے گزر گئے۔ پھر ایک دن بولیں، ''لو میں نے ایک ہی دفعہ کہا ہے میرے دوپٹے نہ رنگو تو تم نے ہاتھ ہی اٹھا لیا ہے۔ مجھے اب سمجھ آئی ہے کہ جن کی بہوئیں ان کو کپڑے دھو کر نہیں دیتیں وہ مجھے پٹی پڑھاتی تھیں۔'' دادی اماں معصومیت سے شکایتی انداز میں بولیں۔

انھیں سب بچوں میں سے بابا جان اور ابا جی سے بہت پیار تھا۔ تایا جان اور چچا جان کا رنگ روپ دادی جان پر تھا، سرخ و سفید چمکتا ہوا۔ اور ابا جی کا رنگ ہمارے دادا جان پر تھا۔ دادی جان لاڈ سے ابا جی سے کہا کرتیں، ''پتر میرا مشکی، نہ کھنگ تے نہ خشکی۔'' چچا جان امی جی کی باتیں سنانا شروع کرتے تو رکنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ کہنے لگے آپا نے ہمارے گاؤں آ کر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ وہ کتنے آسودہ حال گھر سے آئیں۔ کبھی اف نہیں کی اور اپنی ثروت مند بہنوں کی تقلید میں کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔ اسی حال اور سادگی میں پوری خودداری اور وقار سے زندگی گزار دی۔

••

مجھے کھانا پکانے کی اہمیت کا اندازہ اس دن ہوا جب امی جی خاندان میں کسی شادی پر گئی

تھیں۔ میرے ایف اے کے امتحانات ہو رہے تھے۔ ابا جی میرے امتحانوں کی وجہ سے گھر تھے۔ دوپہر کا کھانا تو خیر تایا جان کے گھر سے کھا لیا۔ شام کو ابا جی نے کہا کہ ''تھوڑے سے چاول ابال لیں، میں دودھ سے کھا لوں گا۔'' اب میں نے کبھی انڈہ تک تو ابالا نہیں تھا چاول کیسے ابالتی۔ میں نے دیگچی میں پانی بھر کر ابالا اور اس میں تھوڑے سے چاول ڈال دیے اور جانفشانی سے چمچ ہلا ہلا کر پکانے کی تدبیر کرنے لگی۔ اب مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس ملغوبے کو کیا نام دیا جائے۔ ابا جی مغرب کی نماز کے بعد گھر آئے۔ میں نے شرمندگی سے کہا ''ابا جی پتہ نہیں چاولوں کو کیا ہو گیا ہے۔'' ابا جی نے ایک نظر پلیٹ میں پڑے کلف لگانے والے آمیزے کو دیکھا پھر اس پر چینی چھڑکی اور کہنے لگے ''میری بیٹی نے تو بغیر دودھ کے کھیر بنا لی ہے۔''

اگلے دن امی جی تشریف لے آئیں۔ مجھ سے کوتاہی یہ ہوئی کہ میں چاولوں کی اس نادر شاہی ڈش کو بروقت چھت پر چڑیوں کے لیے نہیں ڈال پائی اور وہ چھوٹی دیگچی سمیت باورچی خانے میں پڑی رہ گئی۔ امی جی کو تو موقع مل گیا۔ فوراً بولیں، ''آپ کے والد صاحب فرماتے ہیں کہ بہت تخلیقی ذہن ہے میری بیٹی کا، پہلی تخلیق تو نظر آ گئی۔ ماشاءاللہ۔''

امی جی کے واپس آتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ چاول پکانے سیکھ لیے۔ جو کام امی جی کے طعنے نہ کرا سکے اسے ابا جی کے سامنے شرمندگی کے احساس نے کرا لیا۔ امی جی کے مارے محاورے کے دو ہتھڑ کی سمجھ بھی آ گئی،

چاول گلن دم وچ، بندا گلے غم وچ

خواہ بندہ غم میں گل کر مر جاوے لیکن دم دا کیہہ بھروسہ دم آوے نہ آوے

دم دم نال دھمال پاوے، خواہ دم نکل جاوے لیکن چاول پوٹا پوٹا لمبا ہووے، دم دیتے دیتے دم نک آوے، درختاں تے چڑھ جاوے، پر دم صحیح آوے۔

''چاچا جی، آپ میں اتنا دَم بھی نہیں کہ کوئی دَم درود، دم دھاگہ اپنی آپا پر کیجیے یا مجھے دم دلاسہ ہی دے دیجیے،'' میں نے مدد طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

چچا جان نے بمشکل اپنی ہنسی چھپائی اور امی جی کے سامنے بے حد ادب سے ''چاولیات'' پر امی جی کے تحفظات سننے لگے، جسے میں آف دا ریکارڈ چولیات کہا کرتی تھی۔ جب تک دَم کھول کر چاولوں پر دَم کی بہار نہ دکھاؤ، دم میں دم ہی نہ آئے۔

چچا جان آہستہ سے بولے، ''ہزار مرتبہ کہا ہے کہ بڑبڑانے کے بجائے یہ غم کے افسانے

لکھ دیا کرو، بس جیسے باتوں سے باتیں جوڑتی ہو بس یہ بونگیاں لکھ دیا کرو۔''

امی جی کو چاولوں کے متعلق محاورات جانے کون سکھا گیا تھا کہ ان کی ڈانٹ کی تلوار دو دھاری ہو جاتی، اپنی ڈیڑھ چاول کی کھچڑی الگ پکانا، اپنے ڈھائی چاول الگ گلانا، وغیرہ۔

ایک دن ہمارے نیک دل چچا نے امی جی کی فی البدیہہ تقریر سنتے ہوئے کہا، ''آپا، چاولوں کو فارسی میں برنج کہتے ہیں۔'' میں نے جھٹ کہا ''چاچا جی، یہ سوائے رنج کے کچھ نہیں دیتے۔''

وہ ایک دن تھا کہ میرے آگے فرشتے کی تھی نہ دال گلتی

بھرے ہیں گالوں میں اب تو چاول کریں وہ باتیں چبا چبا کر

میرے بے چارے شریف چچا، شریف مرزا، اپنی آپا سے وفاداری کے تقاضے کی وجہ سے کھل کر ہنس بھی نہ سکے، سیاسی بیان کے انداز میں کہنے لگے، ''یورپی محاورہ ہے کہ مرد کے دل کا راستہ پیٹ سے ہو کر گزرتا ہے۔'' چچا جان کی شرافت کو لینے کے دینے پڑ گئے۔

''ایسے دل کو کیا کرنا جسے کوئی خانساماں، کوئی ماسی، کوئی شیف اپنے قبضے میں کر لے۔ ایسے راستے پر تو قدم بھی نہیں رکھنا چاہیے۔ وہ ڈگر تو رہے سنسان۔ جناب محترم پروفیسر محمد شریف مرزا، انتہائی افسوس سے اعلان کیا جاتا ہے کہ یورپ میں گزارے چالیس برس بھی آپ کے روایتی ذہن کو نہیں بدل سکے، اب کچھ نہیں ہو سکتا، چالیس برس۔ وقت گزر چکا، اب آپ اس پانی میں دوبارہ قدم نہیں رکھ سکتے۔''

''استغفر اللہ العزیز،'' چچا جان نے اپنے کان چھوئے، پھر کچھ سوچ کر بولے، ''لیکن ابھی چالیس سال پورے تو نہیں ہوئے، امید قائم ہے، میں نے محاورہ سنایا ہے، عقیدہ نہیں بتایا۔ میں نے کب کہا کہ یہ سچ ہے؟ میں تو کہنا چاہتا تھا کہ برطانیہ میں بھی ایک صدی پہلے وکٹوریہ عہد کی خواتین سے سگھڑ ہونے کی توقع رکھی جاتی تھی۔ ان کے رشتے آتے تو سوئی سلائی اور چولھا چکی کے اوصاف بھی گنے جاتے۔''

••

امی جی کو کھانا بنا کر بانٹنے کا بھی بہت شوق تھا۔ جب ان کے ڈبے واپس نہ آتے تو بے حد نالاں ہوتیں۔ ''میرے ڈبے وی نال ای کھا لتے نیں۔'' پھر ان کو واپس منگانے کے لیے ضد کرتیں۔

دواخانے کے بنے خالص شربت کی بوتلیں، گھر کے لیموں سے شکنجبین، برف کو اپنے خاص اسی مقصد کے لیے سنبھالے اور سفید دھلے ہوئے کپڑے میں رکھ کر چورا بناتیں اور پھر اسے

شربت میں ملاتیں۔ ایک دفعہ کہنے لگیں ''بیٹا شربت میں برف ڈالیں تو چینی کم ہو جاتی ہے۔''

میں نے کہا کہ ''شربت ہی کی برف بنا لیجیے، پھر اسی کو کوٹ کر استعمال کیجیے، خوبصورت بھی لگے گی اور میٹھا بھی کم نہیں ہوگا۔''

امی جی کو ترکیب پسند آئی لیکن مجال ہے جو شاباش دے جائیں۔ کتنے دن اپنی شربتِ مفرح والی سرخ برف دیکھ کر خوش ہوتی رہیں۔۔۔ ''لگتا ہے کسی نے یاقوت کے ٹکڑے کر کے سجا دیے ہوں۔'' شیشے کے جگ میں شربت پیش کرتیں تا کہ اندر سے شربت جھاتی مارتا نظر آئے۔ انھیں شیشے کے برتن بے حد پسند تھے اور سویٹ ڈش کا ایک سیٹ جو شاید کہیں ہمارے پیدا ہونے سے بھی پہلے کہیں لیا ہوگا، عذاب کی صورت مسلط تھا۔ پہلے اسے اہتمام سے دھویا جاتا، پھر اس کو اخبار سے خشک کرایا جاتا اور آخر میں بادام کے چھڑکاؤ والی کھیر ڈالی جاتی۔

چونکہ شہر میں جب مویشیوں کی منڈی لگتی تو دودھ کوڑیوں کے بھاؤ بکتا تھا۔ بڑے دیگچے میں اہتمام سے ابالتیں اور بقول ان کے ''بالائی کی روٹی اترے گی۔''

بس بچپن کی یہی بالائی مجھے ساری زندگی ایک عیاشی کی طرح پسند رہی۔ دودھ بالائی اور پھر یہاں بالائی کی متبادل ڈبل کریم کافی آج بھی میرے پسندیدہ مشروب ہیں۔ امی جی کا محبوب مشغلہ اس دودھ سے کھیر بنا بنا کر کواٹروں میں رہنے والے لوگوں کو بھیجنا تھا۔ کبھی عورتوں اور بچوں کو گھر بلا کر کھلا دیتیں۔ بالائی سے مکھن بنانا بھی انھیں بہت پسند تھا۔ ایک دفعہ بچوں کے سامنے ملک شیک والے جگ میں ڈال کر انھوں نے مکھن کا پیڑا بنایا جو بچوں نے دیکھا تو بہت دلچسپی سے لیکن کھایا نہیں تو مایوس ہوگئیں۔ ''گھر کا مکھن ہے، کھا لیتے تو صحت بنتی۔'' دودھ میں پھل ڈال کر دہی جمانے کا تجربہ کرنا اور ہمیشہ گھر میں صحنک میں دہی جمانا، اور پھر صبح ناشتے میں نہار منہ کھلانا امی جی کے فرائض میں شامل تھا۔

••

امی جی کی دنیا میں صرف کھانا پکانا ہی بنیادی اہمیت نہیں رکھتا تھا بلکہ کھانے کا سودا منگانا بھی پوری ایک سائنس تھی۔ ان کی لغت میں سودے کی ایک آدھ چیز کے لیے مَردوں کو دوڑانے والی عورتیں نہایت ''پھُکی'' ہوتی ہیں۔ مسالے تو خیر دھلے اور دھوپ میں سکھائے ہوئے تھے، ان کو پکاتے وقت پیسنا ضروری تھا تا کہ خوشبو ضائع نہ ہو۔ لیکن باقی سامان ایک ہی مرتبہ منگایا جاتا۔ آلو پیاز کی بڑی بوریاں آتیں۔ سٹور میں رکھی پیاز کے بڑے بڑے ڈھیر میں تو ایک مرتبہ میں نے لال بیگ

دیکھ کر چیخیں ماریں اور پھر اعلان کیا کہ مجھے پیاز کٹی ہوئی ملے گی تو کام کروں گی۔ امی جی کی تاکید تھی کہ یہ جو اوٹ پٹانگ بدشکلی ہانڈیاں بناتی ہو ان کا تمام سامان ایک ہی مرتبہ لکھ کر منگوایا کرو۔ باورچی خانے میں چھوٹی کاپی اور قلم بھی پڑا رہتا تاکہ جو چیز یاد آئے وہ فوراً لکھ دی جائے۔ ''سٹور میں رکھے سامان کو وقتاً فوقتاً دیکھتے رہنا چاہیے۔ عورت کو اندازہ ہونا چاہیے کتنا سامان موجود ہے تاکہ اس کے ختم ہونے سے پہلے ہی مزید منگایا جاسکے۔''

••

رات کے آلو گوشت کو صبح آلو کے پراٹھوں میں بدلنا ان کا کمال ہنر تھا۔ اگر سبزی یا پالک بنا ہوتا تو صبح اس سالن کے پراٹھے بنا لیے جاتے۔ دال کو بہت اچھا بگھار لگایا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ میں نے امی جی کو رات والی دال میں سبز مرچیں، دھنیہ، پیاز ڈال کر آٹا گوندھتے دیکھا، ''امی جی یہ کیا ملاوٹ کر رہی ہیں، ذخیرہ اندوزی تو پہلے سے ہی گھر میں ہوتی ہے۔'' امی جی نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی لیکن جب گھی میں تر تراتی دال والی بیسنی روٹی توے سے اتری تو امی جی کی ملاوٹوں کی داد دینا ہی پڑی۔

برفی اور کھوئے کا ڈبہ کھیر میں ضم ہو چکا تھا۔ پھلوں کی چاٹ میں بادام تیر رہے ہوتے۔ رات کی روٹیوں پر پانی کا چھینٹا دے کر مکھن لگا کر ہمیں کھلا دینا اور مہمانوں کو تازہ پھلکے پراٹھے پیش کرنا امی جی کا ہی خاصہ اور ہاتھ کا ہنر تھا، اور پھر مہمانوں کو کھلا کر خوش ہونا اور راز داری سے اپنی تراکیب بھی بتانا کہ رزق ضائع نہ ہو، کسی کے کام آجائے۔ ان کا کہنا تھا ''اسی پیٹ کے دوزخ کے لیے ہی تو دنیا دن رات باؤلی ہوئی ہے مشقت کر کر کے، رزق ضائع کرتے ہوئے بھوک سے مرتی خلقت کا سوچو تو کبھی فضول نخرے نہ کرو۔'' مہمان آجائیں اور میز بھری ہوئی ہو تو امی جی کی خوشی دیدنی ہوتی کہ چلو کچھ تو پسند آئے گا۔ امی جی نے کبھی چادر کے چھوٹے ہونے کا شکوہ نہ کیا اور گھر سے کوئی بغیر کھانا کھائے اور بغیر تحفہ لیے نہ جاتا تھا۔

میں عزیز بھائی کی شادی پر گئی تو راز داری سے کہنے لگیں۔ ''مرغی کے شامی کباب بنا دو، آج کل بہت سے لوگ بڑے گوشت کا قیمہ نہیں کھاتے۔ میں کباب فریزر میں رکھ دوں گی۔ پچھلی دفعہ تمھارے ہاتھ کے کباب بہت پسند آئے تھے مہمانوں کو۔ عظمت کو ساتھ لگا لو۔ بس اسے سمجھا دینا۔ میرا بچہ ذرا مچھلی کا کانٹا تو نکال دینا جیسے پچھلی مرتبہ نکال کر دیا تھا، کسی کو سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ مچھلی کے ایسے کباب بھی بن سکتے ہیں۔''

کبھی امی جی کام کرنے والی عظمت بی بی کو بتاتیں کہ کالج جانے تک اس نے کبھی کوئی کام نہیں کیا تھا، صرف اپنی مرضی کے اوٹ پٹانگ کھانے پکاتی تھی۔ کوئی تجربہ ناکام ہوگیا تو اسے چائنیز کا نام دے دیا۔ اب ہم ''ماہتڑوں'' نے کبھی چائنز کھایا ہوتا تو پتہ ہوتا ناں۔ عظمت کو بالکل یقین نہ آتا۔ باقاعدہ آنکھیں پھاڑ کر کہتی، ''ہیں خالہ جی، سچی؟ اب تو لگتا ہے باجی دیگیں پکاتی رہی ہوں گی۔'' مجھے بہت غصہ آیا۔ جب پھوہڑ تھے تب بھی بے عزتی، جب سیکھ لیا تب بھی اوقات یاد دلانا ضروری ہے؟

••

امی جی نے بچوں کے لیے مرغی پلاؤ بنایا۔ بچوں نے چاول کھا لیے اور بوٹیاں چھوڑ دیں۔ ''نانو ہم نہیں کھاتے ہڈی والی بوٹی'' ہماری صاحبزادی بولیں۔

''اچھا۔۔؟'' امی جی کو بہت افسوس ہوا۔ ''بچے کھاتے کچھ نہیں؟''

شام کو ہم گھوم گھام کر گھر آئے تو بچوں کو گرم گرم آلو کے چپس اور مرغی کے مزیدار پکوڑے ملے۔ انھوں نے بھی خوب مزے سے کھائے۔ بعد میں بڑے فاتحانہ انداز میں بولیں، ''میں نے بھی دوپہر کی مرغی کی ہڈی نکال کر پکوڑے بنا دیے تھے۔ ہن سناؤ۔''

••

لازم ہے قومِ موسیٰ کو تم بھی دعائیں دو
اے اہلِ ساگ تم پہ اتاری ہیں سبزیاں

امی جی کا ست رنگا ساگ تو بے حد مشہور تھا۔ باتھو، سرسوں، تارا میرا، قلفہ یا خرفہ، مکوہ، میتھی، مسور کا ساگ، چولائی، کینچ مینچ، سوئے، مولی شلغم کے پتے، ہلدی کے پتے، سہانجنے کے پتے اور خدا جانے ساگ کے نام پر کیا کیا منگوایا جاتا۔ حکما کی ہدایات کے تحت ساگ کی مختلف اقسام کو پکایا جاتا۔ سہانجنے کے پتوں کے پکوڑے تک تل دیے گئے۔ اکثر ساگ کو اکٹھا ہی ابال لیا جاتا اور پھر اس میں طرح طرح کے بگھار ڈال کر اس کی رنگا رنگی میں اضافہ کیا جاتا۔ ساگ تو ایک طرف رہا، رنگا رنگ ساگ کے بیج بھی استعمال کیے جاتے۔ ابا جی ایک بیٹی باجی خورشید، قریب کے ڈیرے سے آتیں۔ کبھی ان کی امی اور بھانجی ساتھ ہوتیں، بڑے کھیس میں رنگا رنگ ساگ بھرا ہوتا۔ ایک مکمل دیہاتی زندگی کا استعارہ تھیں۔ مجھے ان کی سادگی اور بول چال بہت اچھی لگتی۔ ان کے گھر کچھ مہمان لاہور سے آئے۔ والدہ سادگی سے بولیں...

''رنگ دیکھو ان کا، پیلا پھٹک، نہ روح نہ رحمت، اب کہا ہے کہ کھیتوں سے سبزی توڑو، ٹیوب ویل پر دھو کر کھالو، دودھ پیو، گڑ کھاؤ، دیکھنا تین ہفتوں میں رونق آ جائے گی۔'' واقعی وہ بچی جب واپس جانے لگی تو اس کی رنگت میں نمایاں فرق تھا۔

ہمارے گھر میں دال ساگ، یا بقول امی جی کے دال پات، ہمیشہ دیسی اور تازہ آتا، کبھی کوئی مریض مولیوں، گوبھی اور پالک کا ریڑھا لاد لاتا، کبھی کوئی سٹیل کے بڑے سے ڈبے میں دودھ، گھر کا مکھن، ماکھیوں شہد اٹھا لاتا۔ ایک بزرگ خاتون گجرات سے زندہ مرغا لے کر آئیں، ساتھ ان کی دھان پان سی بہو تھیں جو ایف ایس سی کر کے رواج کے مطابق پھوپی کے گھر بیاہی گئیں۔ روایتی سختی کے مطابق اسے برقع پہنایا گیا۔ اس کی پھوپی جان امی جی کے ساتھ کسی کے گھر تعزیت کو گئیں۔ اب وہ رو رو کر ابا جی کو داستان سنا رہی تھیں کہ سارا رستہ مرغا بس میں بانگیں دیتا آیا، پھر میرے برقعے کے نقاب والی ایک تنی ٹوٹ گئی، پھوپھی جان نے مرغا مجھے تھما رکھا تھا۔ ایک ہاتھ سے میں نقاب سنبھالتی رہی، دوسرے سے مرغے کی ٹانگیں قابو کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

ابا جی نے بہت تسلی دی، ''بیٹا دیکھو، بزرگوں کو بعض اوقات سمجھ نہیں آتی۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ آپ کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ وہ آپ کو ملازمت کی اجازت دیں۔ قریبی سکول میں ہی چلی جایا کرو، بس گھر سے ذرا نکلو۔''

خدا جانے اس کہانی کا کیا ہوا لیکن مجھے وہ منحوس، مردود مرغا ایک آنکھ نہ بھایا، لال کلغی لہراتا، گردن ٹیڑھی کر کے آہٹیں لیتا نابکار مرغا جو ایک عفیفہ کے نقاب میں جھانکتا اسے تماشہ بناتا رہا۔ جب اسے پکایا گیا تو میں نے احتجاجاً کھانا نہیں کھایا۔ میری دلی دعا تھی کسی طرح کوئی بلی اس کی تکہ بوٹی کر دیتی۔ لیکن ان خالہ جی نے شور مچایا، آپا پکائیں ناں مرغا، دیسی گھی ڈالیں۔

ساگ پکنے کا پروجیکٹ شروع ہوتا تو مجھے مصیبت پڑ جاتی۔ پورے گھر میں ایک عجیب سی ساوی ساوتری مہک دندناتی رہتی۔ امی جی کہتیں ''اس ساگ کو برابر کی گڈی بنا کر کاٹے بغیر کھلے پانی میں دھوتے ہیں۔'' شاید محبوب کی زلفوں کی طرح سنوار سنوار کر بڑے ٹب میں ڈال کر رکھ دیا جاتا۔ سنا ہے صاف پانی میں ڈبو کر رکھنے سے اس کی غذائیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ پھر برابر کی گتھی اہتمام سے کاٹی جاتی۔ گھر کے پیچھے محلے میں ایک بچی اور اس کی ماں بھی مدد کے لیے آتیں۔ صحن میں چارپائی بچھا کر اس پر چادر ڈالی جاتی تو نہایا دھویا، سرمنڈایا ساگ اس پر بچھا دیا جاتا۔ امی جی خاص طور پر بنوایا مٹی کا چولھا باہر منگاتیں۔ یہ چولھا ایک تانبے کے بڑے سے تختے پر تعمیر کیا گیا تھا

لہٰذا اس سے محتاط رہنے کے لیے وہ اس پر نظر رکھتیں بلکہ وقفے وقفے سے دربانوں والی نظر ڈال کر ہٹو بچو کی صدا بھی لگا دیتیں۔ امی جی کے جہیز کا ایک بڑا سا گولائی لیے ہوئے دیگچہ تھا۔ اس میں بے حد احتیاط سے ساگ ڈالا جاتا کہ ایک پتہ تک نیچے نہ گرے۔ ابال آنے پر اور حجم کم ہونے پر ساتھ ساتھ مزید ساگ ڈالا جاتا۔ امی جی کی خصوصی بڑی بڑی ڈوئیاں اور مدھانیاں اسلحے کی طرح قریبی پرات میں رکھی ہوتی تھیں۔ امی جی اسے کمال محبت سے ابالتیں، رنگلی ڈوئی سے ہلاتیں، مدھانی کو گول گول گھماتیں، مکئی کا بھنا ہوا آٹا دھار بنا کر گراتیں اور پھر تڑکہ یوں لگاتیں جیسے 'شریکاں نوں اُگ' لگائی جا رہی ہو۔ کالا زیرہ، کوٹی ہوئی سبز مرچیں، رائی کے دانے، کڑھی پتہ اور خدا جانے کیا کیا لوازمات تھالیوں میں ہوتے۔ کسی بڑے ٹیک وے کی طرح امی جی پسند کے مطابق بگھار ڈالتیں۔ آخر میں بھائی لوگوں کو دوڑایا جاتا کہ امی کی سہیلیوں کو پہنچاؤ۔ مجھے بہت زیادہ مکھن والا اور لہسن سبز مرچ کا بگھار پسند تھا۔ امی جی میری سٹیل کی تھالی پر ساگ رکھ کر تر تراتا مکھن ڈالتیں اور میں مکئی کی روٹی کے بجائے تندوری روٹی سے کھانا پسند کرتی۔

اپنی سہیلیوں کے درمیان امی جی باقاعدہ حکیم بنی ساگ کی افادیت سکھا رہی تھیں۔ کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے کہ شاید ان حکما نے امی کو اپنا ایجنٹ رکھا ہوا ہے۔ ایک دن اپنی ایک سہیلی کو بتا رہی تھی کہ مکوہ کے ساگ پر دار چینی، اجوائن، زیرہ اور موٹی کالی الائچی کا پاؤڈر چھڑک کر کھاؤ تو یہ رِحم کی کئی بیماریوں کا علاج ہے۔ حمل کے دوران بھی صحت کی حفاظت کرتا ہے۔

''یا اللہ! رَحم کر دیں امی، کیا ساری عمر حاملہ رہنا ہے ان عورتوں کو؟'' مجھے حیرانی بھی ہوتی اور غصہ بھی آتا کہ کیوں پوری کلاس لگا لیتی ہیں امی۔

''رِحم رہتا تو پوری عمر بدن ہی میں ہے ناں؟ آج کل کی لڑکیاں ڈھنگ کا کھانا تو کھاتی نہیں، منہ پر رنگ مل مل کر ہی حسین بنتی ہیں، جسم کے اندر کچھ طاقت ہو تو بوتھی پر نور آتا ہے۔ ساگ کھانے سے بچیوں کے کئی مسائل حل ہوتے ہیں۔'' کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے ہمارے گھر میں یہ ساگ ہمارے جنازے کے ساتھ ہی نکلے گا ورنہ کبھی نہیں نکلے گا۔ ایک دن میں نے رات کا بچا ہوا ساگ امی جی کو آٹے میں گوندھتے دیکھ لیا، ''امی جی اتنی ملاوٹ؟ ایسا لگتا ہے کہ اس گھر میں اوڑھنا بچھونا ساگ ہے۔'' لیکن جب اس آٹے کی روٹی پکا کر اوپر گھر کے مکھن کا ڈھیلہ رکھا گیا تو میں نے بھی مزے سے اڑایا۔

مجھے ساگ کی اہمیت اور افادیت اس وقت معلوم ہوئی جب اُسامہ پیدا ہوا تو اس کے پیٹ

میں شدید درد رہنے لگا۔ ڈاکٹر کو کچھ سمجھ نہ آتی۔ جب وہ روتا تو میں بھی ساتھ ہی آنسو بہاتی۔ ابا جی نے کہا کہ اس کو اجوائن کے چند دانے اور سوئے کے پتے ڈال کر قہوہ پلاؤ۔ سوئے کا انگریزی نام Dill بتایا گیا جسے ڈینش میں (Dild) کہتے ہیں جو سیلری کے خاندان سے ہی وابستہ ہے۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ کبھی زندگی مجھے موقع دے گی اور میں یورپی ساگ پر تحقیق کروں گی لیکن اہلِ یورپ کے پاس اہلِ پنجاب کا سا وہ ذوق شوق اور جذب و مستی کہاں جس سے سرشار ہوکر وہ کئی مہینے صرف ''ساگیالوجی'' کی دلداری کرتے گزارتے ہیں۔ ہاں مغرب نے مختلف اقسام پر ایسی شاندار تحقیق کر کے اسے منڈی میں عام کیا ہے کہ ہمارے حکما سن کر حیران ہوتے اور داد بھی دیتے۔

چولائی کا ساگ تو یورپ میں اعلیٰ ریستورانوں میں سلاد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ہم اپنے بچپن میں بگڑی ہوئی بکریوں کی طرح اس رنگیلے ساگ کو کچھ سمجھتے ہی نہ تھے۔ ہماری بیٹی ایک دن بولی کہ یہاں ساؤتھ امریکہ کا خاص صحت سے بھرپور پودا ہے جسے سلاد میں ڈالا جاتا ہے۔ میں اسے اہتمام سے سرخ اور سبز پتے دھوتے دیکھتی رہی۔

''ہمارے زمانے میں اسے چولائی کا ساگ کہا جاتا تھا اور یہ انڈیا پاکستان میں عام ملتا ہے اور اتنی بہتات ہے کہ بکریاں بھی کھانے سے انکار کر دیتی ہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے امی جی، یہ تو ساؤتھ امریکہ سے آیا ہے،'' اس نے پلاسٹک کے لفافے پر سلاد کی تفصیل دیکھی۔ یہ دیکھیے یہ اس پر طبی تحقیق ہے۔ یہ انہضام کے عمل کو تیز کرتا ہے، یعنی ہائی بلڈ کولیسٹرول میٹابولک ڈس آرڈر، اینٹی آکسیڈنٹ، کیلشیم، پوٹاشیم میگنشیم۔۔۔ وغیرہ کے لیے اس کی افادیت دیکھیے۔'' میں نے کان بند کر لیے۔ اس نے بیان جاری رکھا۔

''ان پتوں کو انگریزی میں ''جوزف کا کوٹ'' Joseph's coat بھی کہا جاتا ہے کیونکہ بائبل کا یہ کردار تین رنگ کا کوٹ پہنتا تھا۔ اس سلاد میں بھی یہی تین رنگ ہوتے ہیں۔ یہ سرخی مائل، سبز اور سفیدی مائل پتے مشہور ترین ماڈرن سلاد سمجھے جاتے ہیں۔''

''نہیں یہ پنجاب کا ساگ ہے'' میں نے قطعیت سے کہا ''اور انھیں رنگ برنگے ساگ کھانے کی وجہ سے پنجاب والوں کی صحت مشہور ہے اور آپ کے نانا ابو کہا کرتے تھے کہ ساگ اور دودھ غذائی اعتبار سے ایک ہی جیسی خصوصیات رکھتے ہیں۔''

''امی جی،'' اس نے سلاد دھوتے دھوتے ہاتھ روک کر اور مڑ کر مجھے دیکھا ''آپ بھی نانو کی طرح حکیموں کا ایجنٹ نہیں بن گئیں؟''

میرے تجسس کو اس بی بی کی لمبی چوڑی طبی اصطلاحات نے جگا دیا تھا اور میں نے اپنی تحقیق کا آغاز کیا۔ یہ ساگ واقعی چولائی ہی تھا۔ لیکن غلط عالیہ بھی نہیں تھی۔ انگریزی میں اسے Amaranthus کہا جاتا ہے، اور انسائیکلوپیڈیا برطانیہ کے مطابق اس کی رنگ برنگی اقسام کو amaranth کہا گیا ہے۔ ہندوستان میں اسے امرناتھ یعنی چولائی کا ساگ ہی کہا گیا اور مکئی کی روٹی کے ساتھ ہی کھایا جاتا ہے۔

''امی جی آپ یہ دلچسپ معلومات مضمون کی صورت لکھیں ناں،'' ہماری صاحبزادی نے فرمائش کی۔

میں نے ایک شام دل کڑا کر کے تحقیق کی ابتدا کر ہی دی۔ انڈیا اور بنگلہ دیش میں اسے امرناتھ ساگ کہا جاتا ہے۔ اب میری دلچسپی مزید جاگی، یعنی لاطینی، رومن اور یورپ کے ممالک میں اسی نام سے معروف ساگ، انڈیا میں مذہبی تہواروں میں دیوی کے درشن میں دان کیا جاتا، پرساد کے طور پر دیا جاتا۔ وہاں بھی ساگ کے ساتھ مکئی کی روٹی ہی کھائی جاتی۔ رہی سہی کسر ہمارے عین مقابل آ کر بسنے والی ہماری بنگلہ دیشی بیٹی نے نکال دی۔ وہ امرناتھ ساگ کو مچھلی اور کیلے کے پھولوں کے ساتھ پکاتی ہے۔ واقعی ساگ پر تو کتاب ہی لکھنے سے یہ سارے موضوعات بیان کیے جاسکتے ہیں۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ کے ایک مشہورِ زمانہ شعر میں کسی منچلے نے تحریف کر دی۔ اصل شعر یوں ہے

ہر گیاہے کہ از زمیں روید
وحدہ لاشریک لہ گوید

(گھاس کا ہر تنکا جو روئے زمین سے نمودار ہوتا ہے وہ وحدہ لاشریک کی وحدانیت کا اعتراف کرتا ہے)

برِصغیر کی ساگ سے جذباتی وابستگی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس شعر کی تضمین کی گئی:

ہر گیاہے کہ از زمین روید
اہل بنگالہ ساگ می گوید

یعنی زمین سے نمودار ہونے والی ہر گھاس پھونس کو اہلِ بنگال ساگ کہتے ہیں۔

شنید ہے کہ اس کلام میں ہر پتے سے مراد ساگ لیا جائے تا کہ دنیا و عقبیٰ سنور سکیں۔

مزید اشعار پڑھنے کو ملے جن میں اہلِ ایمان ہر پتے سے مراد ساگ کا پتہ ہی لیتے ہیں۔ یوں ان کا

تن اور من دونوں راضی رہتے ہیں۔

بے صدا و بے نوا و بے کلام
دے رہا ہے ذرہ ذرہ یہ پیام
پتے پتے کی یہی ہے گفتگو
اشہد ان لا الہ الا ہو
سبزۂ روئے زمیں ہے ذکر میں
محوِ حیرت غنچہ و گل فکر میں

(ابوسعید الہ بادی)

ساگ کی بین الاقوامی اہمیت کا اندازہ مجھے تب ہوا جب کوپن ہیگن ایئرپورٹ پر پاکستان سے آنے والی ایک بزرگ مسافر خاتون کی مدد کرنا پڑی۔ ان کے سامان سے سبز رنگ کا ایک بہت بڑا منجمد حالت میں ڈھیلا ملا۔ ایکسرے جیسی مشینوں سے گزرتے ہوئے یہ ڈھیلا پکڑا گیا۔ ان بزرگ خاتون کو ایک کونے پر کھڑا کر کے بات چیت جاری تھی۔ وہ بے چاری زبان نہیں بول سکتی تھی۔ وہ سمجھا نہیں پا رہی تھی کہ ان کے سامان میں یہ کیا چیز ہے۔ میں نے دخل در معقولات کرتے ہوئے افسر سے کہا کہ میں ان کی زبان جانتی ہوں اور مدد کرنا چاہتی ہوں۔ خاتون سے پوچھا گیا کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے آئی ہیں، کس کے پاس جا رہی ہیں اور آپ کے سامان میں یہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے آپ کو روک لیا گیا ہے۔

''کج وی نئیں ماڑا بچہ، سریوں ناں ساگ اے، نامرداں کی پتہ ای نئیں، خبرے کے لنگڑاں پیا، ایویں می کی پریشان کری چھوڑیا نیں۔'' (کچھ بھی نہیں، میرا بچہ، سرسوں کا ساگ ہے۔ ان نامرادوں کو علم ہی نہیں، بلاوجہ مجھے پریشان کر دیا ہے۔)

دو لفافوں میں بند کیا ہوا سبز رنگ کا یہ ڈھیلا سرسوں کا ابلا، گھوٹا اور فریز کیا گیا ساگ ثابت ہوا۔ مجھے ہنسی آ گئی اور وہاں پر کھڑے کھڑے میرے ذہن میں اپنے گھر کے آنگن میں اس سرسوں کو کاٹنے دھونے پکانے ابالنے اور بگھار لگانے اور عقیقے کے گوشت کی طرح بانٹنے کے وہ تمام مناظر یاد آ گئے جن کے اہتمام سے میری جان جلا کرتی تھی۔ میں نے افسر سے کہا کہ پریشان مت ہوں۔ یہ ہماری کلچرل سبزی ہے بلکہ اب تو قومی نشان کی طرح آپ اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

''لیکن یہ ہے کیا اور یہ سمگل کیوں کر رہی تھی؟'' کسٹم افسر کا سوال اپنی جگہ پر تھا۔

مجھے پھر کلچر ہی کا نگینہ ٹانکتے ہوئے ہوئے آسان فہم طریقے سے سمجھانا پڑا کہ یہ ''سینپ (sennep) کی ایک قسم ہے اور یہ بے چاری روایتی خاتون سوغات کے طور پر یہ اپنے خاندان کے لیے لا رہی تھی اور ان کو نہیں معلوم تھا کہ کسٹمز میں اس طرح کی چیزیں لانا غیر قانونی ہے۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے'' اس نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی نما چیز سے ڈھیلے کو یوں ہلایا جیسے وہ مریخ سے براہِ راست زمین پر گرا کوئی مشکوک ایلین ہو اور اچانک ہی زندہ ہوکر اچھل کر اسے دبوچ نہ لے۔

''میں نے کہا ناں، یہ مسٹرڈ کی شکل ہے اور یہ انڈس ویلی میں کاشت کیا جاتا تھا۔ اگر آپ اسے، مسٹرڈ یا سینپ سمجھنے سے گریزاں ہیں تو آپ اسے ڈینش (Grønkål Kale) سمجھ سکتے ہیں۔''

''نہیں یہ سینپ نہیں ہے۔ وہ تو زرد ہوتا ہے۔ اور فرانس کا مشہور ترین سینپ یہاں ملتا ہے تو پھر یہ وہاں سے کیوں لائی ہیں؟'' اس نے پیشہ ورانہ تفتیش جاری رکھی۔

''میں یہاں پر ترجمانی کر رہی ہوں یا نیوٹریشن پڑھانے کا فرض انجام دینا ہے؟'' میں نے شگفتگی سے کہا، ''اچھا ایسا کرو، تم اس کو لیبارٹری میں بھیج دو۔ خاتون کی پاسپورٹ کی کاپی لے لو اور اگر یہ خطرناک ثابت ہوا تو پھر اس کے نتائج مسافر کو بھگتنا پڑیں گے اور قانون کی خلاف ورزی کرنے پر البتہ آپ ان کو جرمانہ کرسکتے ہیں، بلکہ جرمانے کے طور پر آپ یہ ساگ ہی لے لیجیے کیونکہ ان کے خاندان کے لیے یہ رقم دینے سے زیادہ دلخراش ہوگا۔''

اس کے ماتھے کی شکن کم ہوگئی اور ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے کہا کہ ان خاتون کو بتا دو کہ آئندہ اس طرح کی کوئی چیز اپنے سامان میں نہیں لائیں گی۔ ''مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ اسلام آباد سے اس کی نشان دہی کیوں نہیں کی گئی؟''

''تو کیا تم اس کو پھینک دو گے؟'' میں نے ان خاتون کا بے یقین چہرہ دیکھ کر کہا۔ وہ شاید دل ہی دل میں ہماری گفتگو سے اور تاثرات سے کچھ اندازہ لگا رہی تھی۔ افسر نے چند لمحے کے لیے سوچا اور پھر چھڑی سے ڈھیلے کو خاتون کی جانب دھکیل دیا۔

''مبارک ہو'' میں نے کہا۔ ''اب اسے اٹھائیے اور واپس اپنے تھیلے میں ڈال لیجیے لیکن آئندہ خیر سگالی کی یہ سوغات مت لائیں۔''

''آئندہ میں آؤں گی ہی نہیں'' انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنی چادر سر پہ جمائی، کانوں کو باہر نکالا اور ناراضگی سے افسر کی طرف دیکھنے لگیں، ''گولی جوگا''

مجھے اس سیدھی سادی دیہاتن کو دیکھ کر پنجابی کا مشہور گیت یاد آگیا جس میں ساگ،

مکھن اور مکئی کی روٹی کو دیہی رومانویت کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔

گندلاں دا ساگ، تے مکھن مکئی
رِھن کے لہائی آں میں سجناں دے لئی
ککڑاں دی بانگ ویلے، تائیاں نیں تندوریاں
تیرے لئی میں، لک لک کٹیاں نے چوریاں
برکی کھوانی آں، تے انج چک وڈھناں ایں
دکھدیاں انگلیاں، تے کرنی آں ہئی

شاعری، بولیاں، لوک گیت اپنے ماحول اور موضوعات کو زندہ رکھتی ہے۔ ایک وقت تھا کہ دنیا کا آغاز، نیزہ اور بھالا لیے شکار کی تلاش میں جنگل نوردی تھا تا کہ شکم کی آگ بجھ سکے۔ اب وہ وقت آن لگا ہے کہ شکم سیری کے بعد کی فربہی سے نمٹنے کے لیے ورک آؤٹ اور جمنازیم کا فیشن چل نکلا ہے۔ ماحولیات سے آگاہ سائنسدان چلا چلا کر آنے والی قیامت کی خبر دیتے اور جہان والوں کو ساگ پات کی طرف ہنکا ہنکا کر لے جانے کی کوشش میں ہیں۔ نصیر احمد ناصر کی ایک شاندار نظم پیشِ خدمت ہے:

آزوقہ

ایک زمیں کے ٹکڑے سے بھی
کیا کچھ حاصل ہو سکتا ہے!
گندم، چاول، دال، کماد
سبزی، پتے، ساگ، سلاد
چوکھر، بھوسہ، چارا، کھاد
جس کو روگ اناج کا لاگے
چین سے وہ پھر سوئے نہ جاگے
خواب، حقیقت سب کچھ تیاگے
چند نوالے حلق میں ڈالے
تک تک ناچے، پگ پگ بھاگے
پیٹ کی خاطر خوب اگاؤ

اپنے دیس کی شان بڑھاؤ
دھکے کھا کر، آنسو پی کر
درد کماؤ، دکھ بسراؤ
دور دساور سے آتے ہیں
شہد، پنیر، کریکر، کافی
جیلی، جام، مربے، کیچپ
توتِ فرنگی، تونا مچھلی
سب کچھ کھاؤ، سب کچھ کھاؤ
ایک گلوب کے شہری سارے
بھوکے ننگے پیاس کے مارے
سرخ سیاست، زرد معیشت
ڈھلتی عمریں، چڑھتے بھاؤ
آنسو، آہیں، غم اور گھاؤ
ایک زمیں کے ٹکڑے سے بھی
کیا کچھ حاصل ہو سکتا ہے!!

(نصیر احمد ناصر)

••

امی جی کے جانے کے بعد امی جی کی سہیلیوں سے مل کر ایک عجیب سی بے نام کیفیت ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان کے پاس بیٹھے رہو اور ان کی یادداشتوں پر مبنی باتیں سنتے رہو۔ پچھلے ہفتے امی جی کی ایک پرانی سہیلی جو اب مانچسٹر منتقل ہو چکی ہیں، ڈنمارک تشریف لائیں۔ میں سب کچھ بھول بھال کر محاورۃً نہیں بلکہ حقیقتاً اڑتی ہوئی ان کو ملنے گئی۔ پہلے سے کمزور ہو چکی تھیں لیکن رعب و دبدبہ بڑھ گیا تھا۔ سفید کروشیے کی کناری لگا دوپٹہ سر پر جمائے اس کے کناروں سے دائیں بائیں کان پر نکالے صوفے پر جلوہ افروز تھیں۔ ان کا پوتا جو ماشاء اللہ تیس برس کا تھا، ساتھ آیا تھا۔

میں نے کہا، ''اب دو دن میرے ساتھ چلیں۔ میری خواہش ہے کہ آپ میرے گھر رہیں۔''

انھوں نے کانوں کے ریڈار ایک مرتبہ پھر درست سمت میں تنصیب کرتے ہوئے کہا،

''میرے میزبانوں سے پوچھ لو۔ میں تو تیار ہوں۔''

میں نے بیٹے کو فوراً فون کیا کہ رات کا کھانا اچھا سا بنانا ہے۔ میں خالہ جان کو ساتھ لے کر آ رہی ہوں۔ رات کے کھانے میں ہم دونوں ماں بیٹے نے بڑے ارمانوں سے بٹر چکن بنایا۔ اُسامہ نے نان بیک کیے۔ میرے آنے سے قبل اس نے مچھلی اوون میں رکھ دی تھی۔ لہسن، اجوائن اور ٹماٹر جوس کے ساتھ بنائی جانے والی یہ مچھلی سب بہت پسند کرتے تھے۔ خیر دسترخوان سجایا گیا۔

خالہ بی بٹر چکن کی شکل دیکھ کر فرمانے لگیں ''ایہ کیہہ اے؟''

عرض کیا... ''ڈینش مکھن ڈال کر مرغی بنائی ہے۔''

بولیں، ''جا... نی'' (اسے جانم یا جانی وغیرہ پر قیاس نہ کیا جائے)

''چٹا ککڑ کون پکاندا اے۔ مکھن وی ضائع کیتا تے ککڑ وی۔''

میزبانوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میرے بچوں نے ''چٹا ککڑ بنیرے تے'' کا گیت تو سن رکھا تھا، اس ککڑ کو ہنڈیا میں پکتے نہیں سنا تھا۔ اُسامہ کے چہرے پر مسکراہٹ جھلکی۔ اسے پنجابی زبان پوری سمجھ آتی ہے لیکن بول نہیں سکتا۔

مجھے انور مسعود کی ''چاء تے لسی'' کا مناظرہ یاد آ گیا۔ لسی چائے کو طعنہ دیتے ہوئے کہتی ہے، ''کھنڈ وی کوڑی کیتی آ تے ددھ وی کیتو ای کالا'' (چینی بھی کڑوی کر دی اور دودھ بھی کالا کر دیا)۔

''خالہ جان آپ نان کھائیں'' میں نے تل اور کلونجی سے سجے نان آگے بڑھائے۔

''آ۔ ایہہ ٹھیک نیں'' انھوں نے بٹر چکن کی پلیٹ پرے دھکیلی۔ اور مچھلی کی طرف نظرِ کرم ڈالی۔ ''ایہہ کیہہ مچھلی بنائی آ؟'' انھوں نے انگشتِ شہادت سے مچھلی پر دباؤ ڈالا، ''مچھلی تو تمھاری امی بناتی تھیں۔ جہلماں (جہلم) دی مچھی۔ تے اجوائن، ادرک، تھوم کے مسالے کے ساتھ، ہرے دھنیے تے ٹماٹراں نال سجا کے تندوری روٹی نال۔''

مچھلی کی ڈش کو پرے کھسکایا، ''ہن میں کیہہ کھاں؟''

ان کا پوتا شرمندہ ہو کر کہنے لگا، ''اماں! باجی 'نیوٹریشنسٹ' ہیں۔ وہ کھانا اس لیے اوون میں بناتی ہیں کہ صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے۔''

انھیں خدا جانے کیا سمجھ آئی۔ ڈونگے میز پر کھسکا دیے، پھر میری طرف دیکھا اور سادگی سے بولیں، ''لیہہ آئی وڈی 'نوں شٹرن'۔ مجھے تو ڈھنگ کی روٹی چاہیے۔ جیسے ہم سیدھے سادے لوگ ہیں بس ویسی سادہ ہانڈی تے روٹی۔''

میں نے شرمندگی سے کہا، ''کل رات کا قیمہ آلو اور مونگ کی دال مل سکتی ہے۔''

''آ۔ اوہ لیہہ کے آ'' میں نے جھٹ سالن گرم کیا۔ انھوں نے تازہ بیک کیے نان کو مزے لے کر کھایا۔ پھر بولیں ''تیرے ہتھ چ ذائقہ تے بہت اے پر آپاں والی گل نہیں۔''

''جی اچھا'' میں نے فوراً اتفاق کیا اور شکر کیا کہ انھوں نے کم از کم کھانا تو کھایا۔

عشاء کی نماز پڑھنے کمرے میں گئیں تو میں نے بیٹے کو دوڑایا۔ کوپن ہیگن میں عربوں اور افغانیوں کی دکانیں رات گئے تک کھلی رہتی ہیں۔ میں نے تاکید کی کہ جتنی قسم کا ساگ ملے اٹھا لانا اور مچھلی بھی ''چھوسک'' (کاڈ فش) لے کر آنا۔ تازہ سبز دھنیا پودینہ، ادرک، لہسن، سبز مرچیں، اس نے موبائل پر فہرست لکھی اور الہ دین کے جن کی طرح سارا سودا لا کر دیا۔ جب وہ سونے کے لیے گئیں تو میں نے ساگ چڑھا دیا۔

سرسوں کا ساگ چونکہ بہت کم ملا۔ میرے ذہن میں پھڑ پھڑاتے سیانے کوے نے فوراً اس کا حل ڈھونڈا۔ میں نے فرنچ سینپ کے دو بڑے چمچے ڈالے اور رائی اور میتھی کے بیجوں کو پانی میں بھگو دیا۔ مچھلی کو مسالہ لگا کر رکھ دیا کہ کل امی جی کی ترکیب سے مچھلی بناؤں گی۔ چاولوں کے لیے تازہ مٹر چھیلے۔ بون لیس چکن، مٹر اور لال شملہ مرچ ڈال کر پلاؤ بنایا۔

اگلے دن ناشتے کے بعد میں ان کو سمندر پر لے کر گئی۔ پھر جب کھانے کی میز سجی، انھوں نے دوپٹہ کانوں کے پیچھے از سرِ نو جمایا، ''ساگ کتھوں آیا؟''

عرض کیا ''رات کو تیار کیا تھا۔''

''راتیں کتھوں لبھا سی؟'' پھر ساری وضاحت دی۔ مچھلی کے سالن کے ساتھ خوب سبز مرچیں اور سبز دھنیا بھر کر مچھلی کے کباب بھی پیش کیے۔

''کل والا نان ہے؟'' انھوں نے چاولوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔

میں نے فوراً نان بیک کر کے پیش کیا۔ اب وہ متجسس ہوئیں اور اٹھ کر کچن میں آ گئیں۔

''ایہہ نان کس طراں بنایا ای؟'' پہلی دفعہ ان کے لہجے میں دلچسپی اور ستائش کا رنگ آیا۔

ان کے مزاج کی سادگی، برجستگی اور فطری پن سے مجھے امی جی یاد آ گئیں۔ مجھے بے فکری کے رنگ برنگے غباروں جیسے وہ سارے دن یاد آ گئے جب آل پاکستان ٹرافی لے کر آئی تو تایا جی اور ابا جی نہال ہو کر اسے یوں اٹھا کر دیکھتے جیسے بزرگ نواسوں پوتوں کو دیکھتے ہیں۔ اگلے دن وہ کالج جمع کروا دی جاتی۔ امی جی کی آواز مسلسل کانوں میں رس گھولتی رہتی ''ارے آتا کیا ہے اسے۔

کسی زعم میں نہ رہنا۔ انڈہ تو ابالنا نہیں آتا۔ نری ٹرٹر۔''

کبھی زیادہ طیش آتا تو فرماتیں ''انڈے تھوڑے کڑکڑ بوہتی۔'' انڈے کدھرے تے کڑکڑ کدھرے'' اور ایک ظالمانہ قسم کا محاورہ سست اور کاہل لوگوں کے لیے، ''انڈیاں تے بیٹھے رہو'' اب ڈانٹ پڑے تو سمجھ تو آنی چاہیے ناں کہ شان میں کیا گستاخی کی گئی ہے۔ بہت تحقیق کے بعد علم ہوا کہ انڈوں کو سینے کے عمل میں مرغی ہلتی نہیں اور کوئی ہلائے جلائے تو کٹ کٹاک کر کے ڈانٹتی ہے کہ اس کے ہلنے سے نئی نسل کی بقا خطرے میں پڑ جائے گی۔

اب میں سوچتی ہوں کہ اگر امی جی کے محاورات پر ہی لکھنا شروع کروں تو پوری ایک کتاب بن جائے کیونکہ وہ بڑی مہارت سے اردو اور پنجابی کے محاورات کی درآمد برآمد کیا کرتی تھیں۔ مثلاً ایک محاورہ وہ اکثر بولتیں، ''گھی انڈہ سیوے، تے کاں کھانڑ میوے۔''

''ارے، امی جی یہ تو سیدھا دکھ سہیں بی فاختہ کوے انڈے کھائیں'' کا ترجمہ ہے۔

مجھے بچپن سے ہی مرغی، انڈے، کھوتے، کتے، اونٹ اور کوّے والے محاورات سے شدید نفرت تھی۔ مجھے لگتا کہ میری زندگی کی ہر کامیابی پر کہیں نہ کہیں سے کتا نمودار ہوگا جو بقول امی جی کے، ''توں اڈیاں چک چک پھاہ لگنی ایں'' (ایڑیاں اٹھا اٹھا کر پھانسی کے پھندے تک پہنچنا) ''توں وٹا مار کے ستا کتا نہ جگایا کر، تینوں دکھیا نوں اونٹ تے بیٹھیاں کتا وڈھدا اے'' کے بقول مجھے باوجود اونٹ پر بیٹھنے کے سویا ہوا ایک کتا اچانک اٹھے گا، جھٹ سے کسی نہ کسی طرح مجھے کاٹ لے گا۔ کہیں سے کٹ کٹ کٹاک کرتی نا ہنجار مرغی نمودار ہوگی جس کا ایک نومولود بیضہ میری ساری کارکردگی برباد کر دے گا۔ مجھے میرا تصور بچپن کے زریں دنوں میں لے گیا۔ گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت ایک عام بات تھی۔ امی جی کے ہاتھ کی بڑی سی دیگ نما ہانڈی پکتی اور ''آون فقیر تے کھا کھا جاونڑ، راضی ہوئے بلھا'' کے مصداق سب فیضیاب ہوتے۔

ابا جی اور تایا جی محنت سے تلفظ اور ادائیگی سکھاتے، سیڑھیاں چڑھاتے سوتک لے جانے کی کوشش کرتے۔ ننانوے پر پہنچتے ہی امی جی ''نری ٹرٹر'' کا اژدھا اپنی پٹاری سے نکال لیتیں۔ مرد حضرات کی کاوشیں رسیاں بن کر زیرو پوائنٹ پر جا گرتیں۔ امی جی کا کتا فاتح قرار پاتا۔ ان کی مرغی، انڈے اور پالتو جانوروں کے محاورے جیت جاتے اور میری ٹرافیاں، کتابیں، انعامات اوندھے منہ جا گرتے۔ میں بھی کسی بات کی پروا کیے بغیر دیوار پھلانگ کر تایا جان کے گھر غائب ہو جاتی۔

●●

زمستانی ہواؤں میں چراغِ اُردو جلتا ہے

یورپ کے ادبی حلقوں میں میری اردو زبان سے عشق اور اس کے فروغ کی محنت تو اکثر گھر کے ماحول اور بابا جان، تایا جان اور ابا جی کی عربی فارسی جاننے اور پڑھانے کی وجہ سے تھی لیکن اکثر یورپی ادب کے حوالے سے ایک سوال کیا جاتا کہ مغربی ادب اور تاریخ میں دلچسپی اور جنون کیسے ہوگیا۔ اس کا جواب بھی میرے بزرگوں کے شوق و جستجو کے گلستان سے ہوکر گزرتا ہے۔

ہمارے چچا جان محمد شریف مرزا، 1962ء میں گولڈ میڈل ہاتھ میں تھامے اور دل میں حصولِ علم کی قندیلیں جلائے برطانیہ کی سرزمین پر وارد ہوئے۔ حصولِ رزق اور تلاشِ معاش کے ساتھ انھوں نے یہاں حصولِ علم کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور آتے ہی تعلیمی اداروں سے وابستہ ہوگئے۔ درس و تدریس ان کا بنیادی شوق تھا اور اس کے لیے مزید تعلیم کی ضرورت تھی۔ چچا جان اس خواب سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ اپنے بھائیوں کے مشورے پر انھوں نے چچی جان اور دونوں بیٹیوں کو دو برس کے لیے پاکستان بھیجا اور خود جم کر تعلیم حاصل کی۔

مجھے یاد ہے کہ بہت برس پہلے برطانیہ میں اقبال سیمنار لندن میں میری یعقوب مرزا سے ملاقات ہوئی اور انھیں علم ہوا کہ میں شریف مرزا کی بھتیجی ہوں تو انھوں نے باقاعدہ حملہ آور ہونے کے انداز میں ڈپٹ کر کہا، ''اے کڑیے، توں اینیاں گلاں کرنی ایں تے دسیا کیوں نہیں کہ محمد شریف مرزا تمھارے چچا تھے۔''

میں اس ناگہانی کو تیار نہیں تھی۔ بصد ادب عرض کیا مجھے علم نہیں کہ لندن قدم رکھتے ہی میں نے ہر راہگیر کو بتانا ہے کہ میں تشریف لے آئی ہوں اور محمد شریف مرزا میرے چچا تھے۔''

ہنسنے لگے، پھر بولے ''اب سمجھ آئی ہے کہ تمھاری اردو کا لب و لہجہ اتنا شستہ کیوں ہے،

ہونا ہی تھا بھئی، اب تمھیں اقبال کا کلام نہیں آئے گا تو کسے آئے گا۔''

میں نے عرض کیا کہ ''مجھے علم ہے، میں اپنے بزرگوں کے کاندھے پر کھڑی ہوئی ہوں۔''

••

چچا جان مجھے ہمیشہ انگریزی لغت کا تحفہ دیتے۔ انھوں نے ہی مجھے کالج شروع کرتے ہوئے سلجھے اور شائستہ انداز کی انگریزی (یوفیزم) کے بارے میں پڑھایا اور ''یوزیج این ابیوزیج'' اے گائیڈ ٹو گڈ انگلش دی۔

Honeywood Patridge, Eric; 1942;

"Usage and Abusage - A guide to good English";

انھوں نے ہی مجھے لغت، صرف ونحو، رومن تلفظ کی صحت کے لیے رومن اردو کا استعمال بھی سکھایا۔ ساتویں جماعت میں باقاعدہ مجھ سے رومن اردو میں لکھوا کر دیکھا جاتا کہ میں کیسے ہر اردو لفظ کو انگریزی میں لکھ لیتی ہوں۔ دورانِ تعلیم ہی انھوں نے مجھے انگریزی تلفظ میں (IPA) انٹر نیشنل فونیٹک الفابیٹ سکھانے کی ابتدا کی۔ چونکہ چچا جان کا کام ہی برطانیہ میں درس وتدریس کا تھا لہٰذا وہ وہاں کے تمام تر نئے قواعد وکلیے آکر ہم پر آزماتے۔ کسی بھی انسان کا تلفظ اس کے علاقے، تعلیم، سماجی طبقے اور قومیت کی چغلی کھاتا ہے۔ چچا جان اپنے عرب دوستوں کی انگریزی کے لطائف سناتے۔ وہ چونکہ حرف ''پ'' کی آواز ادا نہیں کرپاتے تھے لہٰذا عام سی بات میں بھی مزاح کا پہلو نکل آتا۔ مثلاً ان کے ایک دوست نے ایک دکان کے سامنے گاڑی پارک کرتے ہوئے پوچھا، ''برادر مرزا، کین آئی بارک ہیئر؟'' جس پر چچا جان نے اپنی مخصوص معصومیت سے کہا ''مائی برادر یوکین بارک اینی وئیر۔ فریڈم آف سپیچ۔'' چچا جان لسانی لطائف ایسے انداز میں سناتے کہ امی جی کو سمجھ نہ آنے پر بھی سب کو ہنستا دیکھ کر ہی ہنسی آجاتی۔

••

چچا جان کا بھی مجھ پر ہمیشہ یہ احسان رہا کہ بچپن سے ہی جب کبھی وہ پاکستان آتے تو ساتھ ہی وہ انگریز شعرا کا، ان کی نثر کا تعارف کرواتے اور ہمیشہ کلاسیک شعرا کے ناموں کو علیحدہ کرکے ان کو ایک طرف انگریزی میں لکھ کر دیتے اور میری سہولت کے لیے انھی ناموں کو وہ رومن اردو میں بھی لکھا کرتے۔ میرا خیال ہے کہ میں ساتویں جماعت میں تھی کہ جب چچا جان انگلینڈ سے آئے تو ان کی ایک کالے رنگ کی ڈائری تھی جس میں انھوں نے میرے لیے شیکسپیئر کے اقوال نوٹ

کرر کھے تھے۔ مجھے اپنے پاس بٹھایا لیکن ان کی انگریزی میرے سر سے گزر گئی اور صاف جواب دے دیا کہ چاچا جی مجھے تو یہ نہیں آتی میں اس کو کیسے کر سکتی ہوں؟ ہم لوگ تو ''دِس از اے گرل'' پڑھنے والے درجے پر ہیں۔ لیکن چچا جان نے مجھے بڑے ہی تحمل سے وہ لکھ کے دکھائے اور کہا کہ ان کو زبانی یاد کرو۔ صرف ایک بولنے والی زبان کی طرح اور اس کا مطلب یاد کرو جیسے ہماری ناخواندہ خواتین اعلیٰ ادبی محاورات کا بے دریغ استعمال کرتی ہیں۔ پھر مجھے چند جملے لکھ کر دیتے اور فرماتے لکھو۔ جب میں نے وہ لکھا تو بڑے خفا ہوئے اور خلافِ عادت براہِ راست کہا، ''کتنا گندا خط ہے تمھارا! ادھر لاؤ یہ نوٹ بک''۔ اس کے اوپر انھوں نے چھوٹا چھوٹا اور دور دور کر کے شیکسپیئر کے کئی اقوال لکھے اور مجھے ان کا گھوٹا لگانے کو کہا۔

••

چچا جان یوفیمزم کی انگریزی مثالیں سکھا رہے تھے۔ میرے لیے بالکل نئی شائع ہونے والی کتاب بھی لائے۔ یوفیمزم۔ ''فیئر آف سپیچ: (یوزز آف یوفیمزم) لے کر آئے۔ خوب صورت نئی کتاب۔ میں حسبِ عادت اسے چھو کر دیکھ رہی تھی۔

''اسے تعویذ بنا کر گلے میں نہیں ڈالنا، مطالعہ کرنا ہے'' چچا جان بولے۔ میں کتابوں سے ان کے عشق پر اکثر حیران ہوتی۔ کتاب کو ایسے کاغذوں میں لپیٹ کر اور اوپر کپڑا چڑھا کر لاتے جیسے ٹوپی سے انڈے برآمد کر رہے ہوں یا شیشے کے ظروف سنبھالے جا رہے ہوں۔

اب یوفیمزم کی اصطلاح پر بحث شروع ہوگئی۔ اس کا ترجمہ ''خوش سُخنی'' ہونا چاہیے۔ تایا جان نے فرمایا، خوش بیانی، خوش کلامی، حسنِ تعبیر اور نجانے کیا کیا تجویز کیا گیا۔ اب حکما سر جوڑ کر بیٹھے۔ چلو مانا کہ یہ لفظ یونان سے مستعار لیا گیا ہے اور چبھنے والے، خلش بننے والے اور لو دینے والے الفاظ کو نرم ملائم غلاف چڑھا کر پیش کیا جاتا تھا۔ چچا جان اپنے تدریسی تجربات کے حوالے سے بتانے لگے کہ برطانوی نظامِ تعلیم میں ہی نہیں سیاست میں بھی اندازِ بیان کی شائستگی کا خیال رکھا جاتا ہے۔

ابا جی نے کہا کہ ''آپ مغربی اور ترقی یافتہ معاشرے کی بات کر رہے ہیں جہاں ابھی تک شہنشاہیت ایک علامتی طور پر موجود ہے۔ لیکن آپ ان گاؤں سے آنے والے مریضوں اور خواتین کا اندازِ بیان ملاحظہ کیجیے جو کبھی بیماریوں کو اس کے نام سے نہیں بیان کرتیں۔ دیہات میں لوگ ''خنزیر'' کا نام نہیں لیتے کہ چالیس دن تک زبان ناپاک رہتی ہے اور یہ گالی کا استعارہ ہے جیسے پاکستانی والدین بچوں کو ''ڈوگی'' سکھاتے ہیں۔ خواتین اپنے مجازی خدا کا ذکر اس کی اولاد کے

حوالے سے کرتی ہیں ''کاکے دے ابا'' یا پھر ''اجی میں نے کہا سنیئے تو''۔ اسی طرح مرد حضرات ''نکی دی اماں'' یا پھر ''او نیک بختے'' وغیرہ۔ جب کوئی مرتا ہے تو اس کا ذکر ''بہشتی'' کے نام سے ہوتا ہے یا پھر ''اللہ کو پیارے'' ہو جانا کہہ کر موت کی المناک شدت میں کمی کی جاتی۔ اگر مجبوراً حکیم یا ڈاکٹر تک کسی بچی کو لے بھی آئیں تو استعارات اور علامات کی زبان میں بات بیان ہوتی ہے تو کیا یہ بھی یوفیمزم ہی کی مثال نہیں۔''

ابا جی نے ایک لطیفہ سنایا۔ ایک چودھری کا بیٹا نابینا تھا۔ بصد دقت اس کی حالت کو چھپا کر دھوکے سے اس کا رشتہ طے ہوا۔ دوسری طرف لڑکی والے بھی اتنے ہی بد دیانت تھے۔ خاتون ایک آنکھ سے محروم تھیں۔ جب بارات آئی تو کسی نے آوازہ کسا کہ عروس بے چاری تو ''یک چشم گُل'' ہے۔ ادھر سے لڑکے کے منچلے دوستوں نے نعرہ لگایا کہ ''لڑکا بالکل'' یعنی دولھا بالکل نابینا ہے۔

دشمن مرے تے خوشی نہ کریے۔ سجنا وی ٹر جانا۔ یعنی محبوب لوگوں کے مرنے کے لیے ''چلے جانا'' کے الفاظ استعمال ہوتے۔

اردو زبان میں یوفیمزم کے لیے فارسی اور عربی کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس طرح انگریز لاطینی اور فرانسیسی الفاظ مستعار لے لیتے۔ ڈاکٹروں اور وکیلوں کے پیشے میں سب سے زیادہ یوفیمزم استعمال ہوتا ہے۔

چچا جان انگریزوں کو انگریزی پڑھانے والے استاد تھے سو انگریزی قواعد و انشا پردازی کا بہت خیال رکھتے۔ انگریزی زبان کے پیچ وخم اور اسرار و رموز انھوں نے شارٹ کٹ طریقے سے سکھائے۔

چچا جان کو شیکسپیئر پڑھانا بھی بہت پسند تھا۔ انھوں نے ہی ڈاکٹر تھامس بوڈلر کی تالیفات کے بارے میں سکھایا کہ بوڈلر نے شیکسپیئر کی تخلیقات کی تالیف میں یوفیمزم استعمال کیا اور ایسے الفاظ حذف کر دیے جو بلند آواز میں خاندان کے سامنے پڑھے نہیں جا سکتے۔

عالیہ کو بھی چچا جان کی طرح شیکسپیئر پسند ہے اور جب چچا جان کو بتایا گیا کہ ہیملٹ ڈرامہ بنیادی طور پر ڈینش کہانی ہے جو مورخ ''ساکسو'' کے ذریعے شیکسپیئر تک پہنچی تو بہت حیران ہوئے۔ کہنے لگے کہ آخری دم تک انسان سیکھنے کے عمل میں ہی رہتا ہے۔ اگر یہی بات اردو مصنفین کے لیے منظرِ عام پر آتی ہے تو اس پر فوراً سرقہ کا الزام لگا کر تخلیق کی بھی تضحیک کر دی جاتی۔

••

انگریزی زبان اور اردو زبان پر انگریزوں کے التفات کا مطالعہ پھر لندن کی رائل

لائبریری ہمیشہ مجھے مسحور کرتی ہے۔ ہزار بار یہاں کی خاک چھاننے کے بعد بھی اس خاک کا سحر نہیں ٹوٹتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سب سے بڑا حسن یہاں کے بزرگوں میں (جواب اٹھ گئے) ایک پرانی مانوس شناخت ہے، ''مرزا محمد شریف کی بھتیجی آئی ہے، بھئی آپ کے چچا سے ہم عربی فارسی اور اقبالیات کی اسناد لیا کرتے تھے۔ برطانیہ کے پہلے ''وطن اخبار'' میں وہ اپنے ہاتھ سے مضامین لکھ کر فوٹو کاپیاں کر کے تقسیم کیا کرتے تھے۔''

چچا جان کی تدریس کا ہی احسان تھا کہ میٹرک، ایف اے، بی اے اور بی ایڈ تک انگریزی میں میرے نمبر سرِ فہرست رہے۔ جب کوئی بی اے میں ٹاپ کرنے کی مبارک باد دینے آتا تو امی جی بڑے فخر سے کہتیں، ''لیہہ دس۔۔ ایہدا کیہہ کمال اے۔۔ اس کا چاچا ولایت سے کتابیں ڈھو کر لاتا تھا۔''

کسی نے ابا جی کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا، ''مرزا صاب! سرائے عالمگیر کی بچی نے تو ان لڑکوں کی ناک کاٹ دی۔''

ابا جی کو بہت ناگوار گزرا، کہنے لگے ''ایک کامیابی کی ستائش کرتے ہوئے دوسروں کی ناکامی کی تشہیر بڑی کم ظرفی کی بات ہے۔ بچی پر محنت کی گئی اور اللہ کی رحمت شامل ہوئی تو قسمت بن گئی۔ لڑکی ہو یا لڑکا، جس پر شفقت، محبت، محنت اور وسائل صرف کیے جائیں گے وہ نتائج تو دے گا ہی۔''

میں نے ابتدا سے ہی ایسے واقعات اور امثال سے یہ سبق بخوبی سیکھ لیا کہ بچوں کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ اس کوری گندھی ہوئی گیلی مٹی سے جو کوزہ گری کریں گے، جو نقش و نگار بنا دیں گے، وہ ڈھل کر ویسا ہی نکلے گا۔ یہ رنگ ایسے پکے ہوتے ہیں کہ انھیں بعد کی بارشیں بھی نہیں دھو سکتیں۔ لاکھ ان پر مزید رنگ چڑھائے جائیں، رنگین مٹی بولتی ہے کہ اسے کن پانیوں سے گوندھا گیا ہے۔ اس مٹی کا حسنِ بیان بتاتا ہے کہ یہ جس گنبد کی صدا ہے، اس کی آبیاری کرنے والا لحن کس کا تھا۔ میرا تعارف ہمیشہ میرے بزرگ رہے۔ کیا یہ کم انعام ہے کہ آج کل یورپ کی علمی و ادبی فضاؤں میں جہاں ان گنت تنظیمیں بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں، کوئی آپ کو پچپن ساٹھ برس پہلے ان زمستانی ہواؤں میں اردو زبان کی اولین شمع جلانے والے کے نام کے حوالے سے شناخت دے؟

••

میں بی اے میں تھی جب چچا جان چھٹیوں پر آئے۔ یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے تین الہامی مذاہب پر بات ہونے لگی۔ چچا جان مجھے ذوق وشوق سے تاریخ پڑھا رہے تھے، جوشِ

خطابت میں انھوں نے کہہ دیا ''یروشلم ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔''

''ہمارے ہاتھ؟؟؟ ہمارے ہاتھوں میں کب سے تھا یروشلم؟ چاچا جی، کیہڑا ساڈا علاقہ، یہ تو وہی بات ہوئی کہ لوکل عیسائی نالی صاف کر رہا تھا پاس سے جلوس گزرا، ''لے کے رہیں گے پاکستان۔۔۔ بن کے رہے گا پاکستان''۔ اس کے بچے نے پوچھا، 'ابا ایہہ کون نیں تے کیہہ پئے کہندے نیں۔' 'پتر ایہہ مسلے نیں تے، ساڈے کولوں آزادی منگدے نیں۔''

چچا جان میرا منہ دیکھنے لگے۔ میں نے اپنا بیان جاری رکھا، ''جب تک شوکتِ اسلاف کے نشے سے نہیں نکلیں گے اور عصرِ حاضر کا چیلنج قبول نہیں کریں گے کچھ بدلنے کا نہیں۔''

''لالہ جی۔۔۔'' چچا جان چھوٹے بچوں کی طرح اٹھ کر ابا جی کے پاس پہنچے، ''ایہہ کڑی داناں بالکل صحیح صدف ای ہونڑا چاہی دا سی۔''

جتنے دن رہے کہتے رہے، ''میں تو تمھیں شرارتی اور نکمی لڑکی سمجھتا رہا بھئی۔''

''چاچا جی میں اسے تعریف سمجھوں یا۔۔''

''کڑیے توں جو چاہے سمجھ۔۔۔ تینوں کونڑ سمجھا سکدا اے۔''

چچا جان کی معصومیت بھری ذہانت نے مجھے بچپن سے اسیر کر رکھا تھا۔ میری شرارتوں جسارتوں پر یا تو ہنستے رہتے یا پھر اپنی آپا کو آواز دیتے، ''آپا اسے دیکھیں ذرا، تنگ کرتی ہے'' امی جی کبھی تو دور سے ہی مجھے پھٹکارتیں، کبھی تنگ کر کہتیں ''آپ سب نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ کتابوں اور تقریروں کے سوٹے لگوا لگوا کر، میرے ہاتھ لگے تو سیدھا تیر کر دوں۔''

''رہن دیو تسیں۔۔'' ابا جی ہنستے ''آپ تو خود ٹیڑھی پسلی کی پیداوار ہیں۔ اس کا حسن ہی یہی ہے کہ ٹیڑھی رہے۔''

••

چچا جان کو یورپی لوک داستانوں اور اساطیر میں بے حد دلچسپی تھی۔ میرے کالج کے مباحثوں کے دوران پاکستان آئے تو میں نے بتایا کہ ہمارا گروپ اٹک کالج سے نکلا اور وقار النساء کالج سے ہوتا ہوا لاہور کالج پہنچا۔ ہم ٹرافیاں جیت کر لائے، مشاعرے میں انعامات کمائے، یہ دیکھیے، چچا جان دھیمے سے مسکراتے اور کچھ بدبدائے جس کی مجھے سمجھ نہیں آئی۔

''چچا جان، یہ سراسر بے ایمانی ہے، بتایئے کیا قصیدہ پڑھا آپ نے؟'' میں ان کے سر ہوگئی۔

امی جی نے شاید صرف لفظ، ''بے ایمانی'' سنا اور میری گوشمالی کا آغاز کردیا۔ چچا جان نے لاکھ کہا آپا یہ برا لفظ نہیں ہے لیکن امی جی کی ڈانٹ ڈپٹ میں بات ختم ہوگئی۔

رات کو جب سونے کے لیے ابا جی کے کمرے میں گئے، امی جی کی طویل نمازِ عشاء شروع ہوئی تو میں ان کے سرہانے پہنچ گئی۔

''چاچا جان، بتا دیجیے کہ دن کو آپ نے مجھے کیا ''وِلو وِلائی''، کہا تھا؟ کچھ نہیں کہوں گی، بس سچ بتا دیں۔''

چچا جان بے اختیار ہنسنے لگے۔ پھر ذرا رعب سے بولے، ''ڈرتا ورتا نہیں کسی سے میں۔''

''اچھا تو پھر بتایئے''، میں نے اصرار جاری رکھا کیونکہ مجھے چچا جان کی مسکراہٹ نے اشتیاق میں ڈال رکھا تھا۔

''اچھا، میں نے آپ کو، چھلاوا، کہا تھا ''وِلو دا وِسپ''، ("will-o'-the-wisp")، یہ لوک داستانوں میں اس روشنی کو کہتے ہیں جو کبھی دور اور کبھی نزدیک سے آتی ہے۔ اسے ہندی یا سنسکرت میں ''اگیا بیتال''، بھی کہتے ہیں۔ آپ جانتی ہیں ناں سنسکرت اور لاطینی یونانی زبان میں کئی الفاظ کی مماثلت ہے جیسے اَگیا، یا اَگنی، اور لاطینی لفظ ignis وغیرہ۔ چھلاوے کو لاطینی زبان میں اگنس فاٹوس، ignis fatuus یعنی احمق کی آگ بھی کہا جاتا ہے۔''

چچا جان کو تدریس سے عشق تھا۔ اگلے تین دن میں نے چچا جان سے ان لوک کہانیوں کا پس منظر اور ہیلووین اور پمپ کن میں موم بتیاں جلانے کی روایات سنتے گزارا۔ تین دہائیوں بعد جب میں نے ''زبانِ یارِ من دانش'' لکھتے ہوئے جرمینک زبان، سنسکرت اور سر ولیم جونز کا دعویٰ کہ سنسکرت کی ان زبانوں سے مماثلت ہے، پڑھا تو مجھے اپنے تجسّس اور ضد کے درمیان پنپتے علم کے حصول کا شوق بھی سانس لیتا محسوس ہوا۔

••

چچا جان جب تدریس کے موڈ میں آتے تو بلاغت کا دریا بہتا محسوس ہوتا۔ میں کم عمری کے باوجود گھس کر ان بھائیوں کی محفل میں بیٹھتی۔ یہیں سے میں نے پہلی دفعہ لطیفہ سنا کہ فقہ اور مسائل کو کریدنے والے ''کھوچل'' لوگوں نے دین مشکل کر دیا ہے۔ حضرت امام شعبی سے کسی نے پوچھا کیا کہ وہ اپنی ڈاڑھی کا مسح کیسے کیا کرے؟ آپ نے جواب دیا کہ ''اپنی انگلیوں کو گیلا کر کے۔'' سائل نے پھر کہا کہ ''مجھے ڈر ہے کہ اس طرح مسح صحیح نہیں ہوسکے گا۔'' آپ نے فرمایا

''اچھا، تو پھر رات سے ہی اپنی ڈاڑھی کو پانی میں بھگو کر رکھ دیا کرو۔''

میں نے کہا ''چاچا جان یہ کیا ماجرا ہے۔ خود باریش ہیں اور اس کے مذاق بھی کرتے ہیں۔'' کہنے لگے کہ ''نظام میں رہ کر نظام کی بے قاعدگی کے خلاف جنگ کامیاب رہتی ہے۔ نئے نئے ملحدین جب دین پر تابڑتوڑ حملے کرتے ہیں تو میں ہنستا ہوں۔''

''مذہب کوئی بھی ہو، اس کے پیروکار اختلافات کے پلِ صراط سے گزرتے ہیں۔ مذہب کو برا کہنا اصل ملحدین کا کام نہیں، یہ تو اندر سے بنیاد پرست ہونے کی نشانی ہے۔ یورپ میں الحاد کی طرف مائل ہونے والے اس زمین کو مذہبی اختلافات سے پاک کر کے ایک بہتر جگہ بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے اپنے شائستہ اطوار ہوتے ہیں۔ الہامی کتب سے حوالے نکال کر ان کو باطل کرنے کی کوششیں اور تنقید کی زبان ان کی ذہنیت کا اعلامیہ ہوتی ہے۔ اور جب تک کسی فرقے کو اچھی طرح جان نہ لیں ان کے بارے میں بیان نہیں دینا چاہیے۔ اس سے نفرت اور تعصب کو ہوا ملتی ہے۔ آپ کسی بھی علمی و ادبی یا مذہبی بحث کے دوران ناقدین کی دلیل سے زیادہ ان کی زبان و بیان کی شائستگی پر غور کریں اور بیہودہ زبان استعمال کرنے والوں کو بیک جنبشِ قلم مسترد کر دیں۔ جو انسان لسانی محاذ پر ہی پسپا ہو جائے وہ دنیا میں تبدیلی لانے کی جنگ کیا لڑے گا۔''

میں نے چچا جان کی گفتگو کے بہتے پانی سے اس نکتے کا گوہر سنبھال کر اپنے یادداشت کے پلو پر ٹانک لیا۔ جیسے میں نے ان بھائیوں سے ادب، سادگی، مہمان نوازی، بے لوث خدمت، سائل کے سوال کرنے سے پہلے ہی استعانت اور خاموش تعاون کے خصائل اپنانے کی کوشش کی۔

میں چچا جان کے ہاتھ سے لکھے ہوئے آرٹیکلز سنبھال کر رکھتی۔ اپنی انگریزی کی محبوب استاد مس عابدہ نسرین کو بھی ایک کاپی دی۔ بہت خوش ہوئیں۔ کہنے لگیں مجھے اب سمجھ آئی ہے کہ انگریزی ادب تمھارے لیے اتنا آسان کیوں ہے۔

اقبال کی شاعری سب بھائیوں کا مشترکہ شوق رہی اور سب ہی کو حفظ بھی تھی۔ بالخصوص ابا جی اور چچا جان جب ترنم سے پڑھتے تو سماں بندھ جاتا۔ چچا جان کی پسندیدہ ترین غزل ''گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر'' بہت بچپن میں مجھے یاد کروائی گئی

''میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو''

''صدف صرف تمھارا نام ہو سکتا ہے۔'' انھوں نے میری کاپی پر خوشخط لکھا پھر کہنے لگے ''اس کے نیچے اقبال کے وہ اشعار لکھو جس میں صدف استعمال ہوا ہے۔'' اور میں نے کئی دن لگا کر

بغیر مطلب اور مفہوم سمجھے رنگ برنگی پنسلوں سے وہ اشعار ڈھونڈ ڈھونڈ کر لکھے اور پھر خود ہی کہتے کہ ''اقبال خود کو صرف شاعر کہنے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ انھیں اس بات کا گلہ ہی رہا کہ

من از میرِ اُمم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

چچا جان خود ہی شعر پڑھتے اور خود ہی اس سے لطف اندوز ہوتے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور شکوہ کیا کہ اے میرِ امم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ سے انصاف کا متقاضی ہوں۔ مجھے لوگوں نے غزل خواں جانا۔ ''دیکھو لڑکی، اس شعر میں لفظ ''داد'' کے تیور دیکھو۔ پھر مزید مصرعے ڈھونڈ کر سناتے، یا پھر شعر و سخن کو ایک تہمت گردانا کرتے۔ کہ بر من تہمتِ شعر و سخن است۔''

چچا جان نے مجھے نقوشِ اقبال از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی دی۔ بلکہ لفظ دی شاید دیانت داری کے خلاف ہے۔ میری حریص نظر اور فنکارانہ بے چارگی سے کتاب مانگنے پر یقیناً انھوں نے دل پر پتھر رکھ لیا ہوگا۔ بین السطور میں نے یہ بھی فرما دیا کہ اگر برضا و رغبت کتاب نہیں دیں گے تو کل یہ کتاب آپ کی الماری میں موجود نہیں ہوگی۔

••

ترجمے کی دنیا میں تو میں نے شاید بہت پہلے قدم رکھا۔ اکثر لوگوں کا خیال یہی ہے کہ تراجم نگاری شاید ڈنمارک قیام کی دین ہے۔ لیکن جب میں پرسکون فضا میں اپنی یادوں کی زنبیل کھنگالنے بیٹھی تو مجھ پر آشکار ہوا کہ کھیل ہی کھیل میں یہ تراجم تو مجھ سے سکول کالج کے زمانے میں کرائے جاتے تھے۔ شیخ عثمان مروَندی معروف بہ لال شہباز قلندر کی دلکش ترین غزل مجھے مسحور کیے رکھتی۔ اس کے معانی و مفاہیم ابا جی سے پڑھے اور ایک شعر کا ترجمہ کیا

تو آں قاتل کہ از بہرِ تماشا خونِ من ریزی
من آں بسمل کہ زیرِ خنجرِ خوں خوار می رقصم تو
تو وہ قاتل تماشے کو بہائے جو لہو میرا
میں وہ بسمل کہ زیرِ نوکِ خنجر رقص کرتا ہوں

''واہ واہ۔۔۔'' تایا جان نے خوش ہو کر کہا۔ ''اگرچہ تم سب میں اصل ذہانت تو عزیز الرحمان کے حصے آئی ہے لیکن تمھیں تک بندی کا تحفہ بھی ملا ہے۔''

تایا جان نے دس روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔ مجال ہے جو تایا جان کبھی مکمل طور پر خوش

ہونے کی اجازت دیں۔"

••

چچا جان اکثر ہمیں امی جی کی شادی کے ابتدائی دنوں کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ دادی اماں کو امی جی سے خصوصی لگاؤ تھا اور وہ ان کے سلیقے، اخلاق اور علم کی معترف تھیں۔ امی جی ظہر یا عصر کی نماز کے بعد کچھ نہ کچھ پڑھنے کی عادی تھیں۔ ایک دن دادی جان ان کے نزدیک ہو کر بیٹھیں۔ رشک سے دیکھتی رہیں، پھر پوچھنے لگیں،

"کیا لکھا ہے اس کتاب میں" امی جی کے سامنے جو صفحہ تھا انھوں نے پڑھ کر سنایا کہ جو شخص اللہ کے گھر یعنی مسجد کو صاف کرے گا اس کے لیے جنت میں نعمتیں ہوں گی۔

شام کو چھوٹے چچا غصے سے بھرے گھر آئے۔ "آپا کیا سناتی رہتی ہیں بے جی کو؟" امی جی نے حیران ہو کر پوچھا کیا ہوا ہے۔ چچا جان نے بتایا کہ بے جی عشاء کی نماز کے وقت مسجد پہنچ گئیں اور نمازیوں سے کہنے لگیں کہ چلو جلدی کرو صف لپیٹو، میں ذرا یہاں جھاڑو لگا دوں۔ میری بہو نے پڑھ کر سنایا ہے کہ مسجد کی صفائی کرنے سے بہشتوں میں گھر ملے گا۔ امی جی نے سر پیٹ لیا۔ بے جی سے اتنی مستعدی کی توقع نہیں تھی کہ وہ اسی دن مسجد صاف کر کے جنت میں محل بنانے چل دیں گی۔

ایک مرتبہ ہمارے دادا جان سردیوں میں لکڑیاں لے کر گھر آئے تاکہ چولھے یا انگیٹھی میں جلائی جائیں۔ دادی جان نے پوچھا یہ لکڑیاں کہاں سے آئیں تو دادا جان نے کہا "ٹابے" [] [](چھوٹے تالاب) کے قریب ٹال لگا ہوا تھا وہاں سے لایا ہوں۔ دادی اماں ناراض ہو گئیں کہ مجھے "لگی" (لاوارث) لکڑیوں کی آگ پر اپنے بچوں کو کھانا پکا کر نہیں کھلانا۔

چچا جان اکثر دادی اماں اور امی جی کی باتیں سنایا کرتے تھے کہ کیسے امی جی سے پیار بھی بہت کرتی تھیں اور ناراض بھی بچوں کی طرح ہو جاتیں۔ امی جی سے ضد کرتیں کہ مجھے کتاب پڑھ کر سناؤ، جب کہ چچا جان نے کہہ رکھا تھا کہ اب بے جی کو ایسی کوئی حدیث نہیں سنانی کہ وہ فوری طور پر اس پر عمل کرنے چل پڑیں۔

••

ابا جی سے جب میں نے کہا کہ مجھے اقبال کے "جاوید نامہ" کا ڈینش ترجمہ کرنے کا کہا جا رہا ہے۔ ایک لمحے کو وہ میری طرف دیکھتے رہے جیسے اندازہ کر رہے ہوں کہ مجھے اپنی اوقات یاد ہے یا نہیں۔

''اچھا! پتر جاوید نامہ کوئی دودھ کی کھیر نہیں ہے جس سے چمچ بھر کر کھا لیا اور اوپر میوہ، پستہ بادام ڈال دیا۔ دوسرے جاوید نامہ کی فارسی تو مانا آپ ساری سمجھتی ہیں۔ پڑھ رکھا ہے۔ ابا جی نے صاف شفاف عینک کو اتار کر بلاوجہ اس کے شیشے صاف کیے۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ ابا جی مجھے اوقات یاد دلانے کے لیے مناسب الفاظ سوچ رہے ہیں۔

میرے بچے، ''جاوید نامہ'' کی تاریخ کے لیے پہلے ابوالعلا المعری (1058۔ 979) کو پڑھنا ازحد ضروری ہے۔ اس کا 'رسالہ غفران' کوشش کریں کہ کسی عرب دوست کی مدد سے عربی میں سمجھیں۔ بنیادی عربی تو آپ کو آتی ہی ہے۔ اس کے بعد اپنے یورپی مصنف دانتے کی ڈیوائن کامیڈی ''طربیۂ خداوندی'' کو گہرائی میں جاکر پڑھو۔ پھر نئے سرے سے جاوید نامہ پڑھو اور اس کا انگریزی ترجمہ لکھو۔ جب یہ سب کر چکو تو کسی ڈینش شاعر کے تعاون سے اس کا ترجمہ ضرور کرو''۔ ابا جی نے ڈیوائن کامیڈی کا ترجمہ پڑھ رکھا تھا۔

اقبال نے معری کے حوالے سے اپنی مشہور نظم بھی تحریر کی تھی۔ ابا جی کتاب اٹھا لائے۔

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معری
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات
اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوانِ تر و تازہ معری نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحبِ غفران و لزومات

''ابنِ عربی کی معروفِ زمانہ کتاب ''فتوحاتِ مکیہ'' میں بھی ان ہی افکار کی جھلک ہے۔ اس کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔'' اس سے پہلے کہ ابا جی اس فہرست کو طویل کرتے، میں نے فوراً کہا، ''ابا جی ایہہ تے نہ کرن والیاں گلاں ہوئیاں۔ میں کہاں سے نومن تیل جمع کروں۔'' میں مایوس ہوگئی۔

''نہ کرنے والی بات آپ کر رہی ہیں۔'' ابا جی نے بھی میرے ہی انداز میں جواب دیا۔ ''آپ یہ کام سہولت سے کر سکتی ہیں بلکہ آپ ہی کر سکتی ہیں۔ یورپی ادب ہمارے لیے ایک بند گلی ہے۔ ہم اس تک صرف تراجم کے ذریعے رسائی رکھتے ہیں، وہ بھی ترجمہ در ترجمہ۔ پہلے انگریزی زبان کا جامہ پہنایا جاتا ہے اور پھر وہ انگریزی سے اردو میں آتا ہے۔ ایک بند کمرے میں بیٹھ کر ترجمہ و تلخیص کی جاتی ہے۔ لیکن آپ عربی، فارسی، اردو، پنجابی، سرائیکی، انگریزی اور ڈینش

کے آلاتِ حرب لیے ہوئے ہیں۔ ڈنمارک میں مقیم ہیں۔ اٹلی اور جرمنی آپ کا ہمسایہ ہے۔ زبانیں کوئی بہت زیادہ مختلف نہیں۔ ان افلاک تک آپ کی رسائی ہے۔ محنت کریں۔ لائحہ عمل بنائیں، کام کریں''۔ ابا جی کو ہمیشہ شوق رہا کہ میں ساری یورپی زبانیں سیکھوں۔

چلو جی۔ ہمیشہ کی طرح تان میرے دامن میں پڑے تمام تر امکانات پر ٹوٹی۔ یہ کسی کو نظر نہیں آتا کہ میرے بچے، گھر، ملازمت، کتنی ذمہ داریاں ہیں۔ شوقیہ، رضا کارانہ کام الگ ہیں۔ ابا جی نے میری سوچ پڑھ لی۔ ''بیٹا دن میں چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں۔ نیند ویسے ہی کم ہے آپ کی، باقی گھنٹے بانٹ لیں۔''

جب میں نے ڈنمارک میں انگریزی ادب کا مطالعہ شروع کیا تو مجھ پر کھلا کہ رسالہ الغفر ان کا اثر نہ صرف دانتے نے لے کر ''ڈیوائن کامیڈی'' کے تخیل کی رنگ آمیزی کی ہے بلکہ ملٹن کی کتاب ''پیراڈئز ری گینڈ'' اور گوئٹے کی ''فاؤسٹ'' کی بنیاد اور ابتدائی افکار اسی سے ماخوذ ہیں۔

••

چچا جان نے انگریزی پڑھانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ چونکہ وہ ماہرِ تعلیم تھے اور درس و تدریس ان کا پیشہ تھا لہٰذا ان کا انداز دلچسپ اور سحر انگیز تھا۔ ہمیں بھی تحصیلِ علم کا جنون تھا، سو چند دنوں میں رات کو بیٹھ کر مجھے کلیدی نوٹس لکھواتے، پھر میری لکھائی، اور ساتھ کہتے جاتے...

''پاکستان میں انگریزی کا معیار بہت گر گیا ہے بھئی، نصاب اور تدریسی نظام بدلنے کی ضرورت ہے۔'' یونانی دیومالائی داستانوں میں مجھے شدید دلچسپی ان کی وجہ سے ہی ہوئی۔ شیکسپیئر کے کون سے ڈرامے کا مرکزی خیال کہاں سے آیا، فلاں ڈرامے کا ماخذ کیا ہے، انگریزی محاورات میں یونانی اساطیر کا تڑکا کہاں لگایا گیا، انگریزی کیسے پڑھی جائے۔ امی جی خفا ہوتیں، ''دو دن کے لیے بے چارہ آ جائے تو سکول کھول کے بیٹھ جایا کرو''، ایک دن میں نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا، ''امی جی، بابا جان کے پاس پڑھنے کے لیے آپ ڈنڈے سے بھیجتی تھیں کہ چاچا جان سے پڑھنے کی جسارت کرنے پر آپ ''جان چھڑ'' قسم کا لاٹھی چارج کرتی ہیں۔ بڑے لاڈ سے بولیں ''بیچارہ پردیس کی برف سے بھاگ کر چار ہفتوں کے لیے آتا ہے اور تم جان کو چمٹ جاتی ہو۔''

••

چچا جان اپنے بڑے لالوں کے سامنے شدید مودب رہتے۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھے ایک شعر کی تفہیم پر تایا جان سے تڑاخ پڑاخ باتیں کرتے دیکھا تو ان کی باقاعدہ گھگی بندھ گئی۔

''یا اللہ، ہماری مجال نہیں کہ لالہ جی کے سامنے دم ماریں۔ یہ لڑکی وکیلوں والی جرح کرتی ہے، یا بدیع العجائب!'' چچا جان نے آسمان کی طرف دیکھا۔

میں نے حسبِ عادت دانت نکالے، ''چچا جان، آسمان سے بجلی گرے گی مجھ پر کیا؟''

''نہیں بی بی۔۔۔ برق گرتی ہے تو بیچارے ناتوانوں پر'' انھوں نے اپنے معصومیت بھرے انداز میں کہا جس پر ان کی آپا قربان جاتیں اور ان کی حمایت میں ہر ایک کے چھکے چھڑانے کے لیے تیار رہتیں۔

••

ڈنمارک آنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد میری طبیعت خراب رہنے لگی اور چند سال بعد ہی داخلی زخموں کی وجہ سے آپریشن پر نوبت آ پہنچی۔ میں پاکستان گئی تو چچا جان میرے پاس آ بیٹھے۔

''تمھاری طبیعت ٹھیک کیوں نہیں ہوتی، وجہ بتاؤ؟''

''لیجیے بھلا، چچا جان بیماری کی کیا وجہ ہوتی ہے، بس انٹسٹائن میں زخم ہو جاتے ہیں، ڈاکٹرز کو وجوہات کا علم نہیں۔''

میں نے تفصیل سے ان کو بتایا۔ اُسامہ ابھی دو برس کا بھی نہیں تھا۔ چچا جان بولے ''کوئی ڈرامہ نہ کرنا، اچھا، اپنی اولاد کو خود پالنا ہے تم نے، زخم کیوں ہو جاتے ہیں، کوئی انگور کیکر پر چڑھا ہوا ہے کیا'' پھر میرے لیے پودینے، سونف اور اجوائن کا قہوہ بنا کر لائے۔

''یہ لو، فیصلہ تیرا ترے ہاتھ ہے دل یا شکم۔''

ابا جی کے سب بھائیوں میں چچا جان شریف کا حوصلہ فوراً جواب دے جاتا۔ نازک دلی کا یہ عالم تھا کہ میری طبیعت کی خرابی دل کو لگا لی۔ دن میں کئی پھیرے ڈالتے۔

''ڈنمارک کا طبی نظام کیسا ہے، ڈاکٹرز کیسے ہیں۔'' ایک دن کہنے لگے ''لالہ جی تو بار بار آپریشن کا کہتے ہیں، اگر تم کہو تو میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔'' میں نے کہا ''توبہ کیجیے چچا جان، آپ کی آپا ہمیں آپ کی زندگی کی باتیں سنا چکی ہیں۔ گگی (فاختہ) زخمی ہو کر مر گئی تو کتنے دن بقول امی جی، شریف پھونکاں ماردا رہیا (یعنی شریف آہیں بھرتا رہا)۔''

چچا جان ناراض ہو گئے۔ ''آپا کو کیا پڑی ہے میری شہرت خراب کریں۔''

چچا جان شریف مجھے چھیڑا کرتے تھے، ''اے کڑی بلی اے نری، نو زندگیاں نیں ایدیاں۔ آپا کوئی فکر نہ کریں اسے کچھ نہیں ہونے کا۔''

چچا جان سے بلی کی زندگی اور محاورات پر بحث چھڑ جاتی۔ میں پوچھتی ''نو کا ہندسہ ہی کیوں؟ آپ انگریزوں کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ ہمیں بھی بتائیے۔''

''بھئی مقدس ہندسہ تھا۔ غور کرو اس پر۔ یعنی تثلیث کی تثلیث ہے۔''

''بلی طبعی موت نہیں مرتی۔ یہ ہر چوٹ سہار جاتی ہے لیکن مرتی غم سے ہے۔'' بھائی جان رضوان نے کہا۔

''میں بچپن میں بلی کو بی بی کہتی تھی اور بضد تھی کہ مجھے بلی لا کر دیں۔ ابا جی نے پوچھا کہ مجھے بلی ہی کیوں چاہیے تو میں جواب دیتی، ''بی بی میری بہن ہے''

••

چچا جان نے مجھے لغت دیکھنے کی عادت ڈالی۔ کہنے لگے کہ ''ایک لفظ کے کئی مطالب ہوتے ہیں۔ لغت دیکھنے کی عادت ہو تو اس کی مکمل تفہیم تب ہی ہوتی ہے اور ایک دفعہ ڈھونڈ کر سیکھا ہوا لفظ ہمیشہ حافظے کا حصہ بن جاتا ہے۔ خواہ کوئی لفظ کا مطلب بتانے والا ہو یا نہ ہو، لیکن جب آپ خود لغت کو کھولیں گی اور کسی بھی لفظ کے مختلف مفاہیم دیکھیں گی تو وہ عمر بھر آپ کے ساتھ رہیں گے۔''

''یہ دیکھو'' انھوں نے میری کاپی کے درمیان لکیریں لگا کر انھیں مزید خانوں میں بانٹا، ''اردو کی طرح انگریزی زبان میں سابقے اور لاحقے ہوتے ہیں۔ ان کے مطالب اور امثال سیکھ لو۔ یہاں سارا کھیل ان الفاظ کو ذہن نشین کرنے اور انھیں استعمال کرنے کا ہے۔''

''جی اچھا'' میں نے دلچسپی سے ان کو لکیریں لگاتے دیکھا۔

''یہ دیکھو۔۔۔ سابقے۔۔۔ مطالب۔۔۔ امثال۔ اب اسی طرح لاحقے۔۔ مطالب اور امثال کے تحت سب کچھ تحریر کرتی چلی جاؤ۔''

انگریزی زبان کے قواعد و انشا پردازی سے لے کر صوتیات کے نظام میں حروفِ تہجی کی مختلف آوازیں اور ان کے کلیے سمجھانے میں وقت لگاتے۔ حرف ''جی'' (G) کی آواز ''گ'' میں کب بدلتی ہے۔ پھر اس کی امثال لکھواتے اور استثنائی کلیے لکھواتے۔

••

میرے بچپن میں جب چچا جان پاکستان آئے اور امی سے فرمائش کی کہ مجھے بان کی کھری چارپائی پر سونا ہے تو ان کے لیے بڑے اہتمام سے چھت پر چارپائی بچھوا دی گئی۔

''میں بھی چھت پر سوؤں گی'' میری ضد شروع ہوئی۔

''اچھا آ جاؤ بی بی'' چچا جان بولے۔

میں نے ان سے بھی پوچھا کہ چاندنی آتی کہاں سے ہے اور دل کو اتنی اچھی کیوں لگتی ہے۔ شاید یہ سوال اس علم کا نقطۂ آغاز تھا جس نے مجھے آج تک اپنے سحر سے آزاد نہیں ہونے دیا۔ ان کی توجہ بھری شفقت سے میری دلچسپی آفاقی دنیا میں بڑھی۔ نہر اور دریا کا پانی تو مجھے مبہوت کرتا ہی تھا اب چاند تاروں نے بھی مسحور کرنے کا آغاز کر دیا۔ ان ہی شفاف راتوں میں ابا جی نے ہمیں چلتے ہوئے ستارے دکھائے۔ یہ کیوں چلتے ہیں، کیسے چل رہے ہیں۔ کہاں جائیں گے؟ خوش قسمتی سے بڑے آنگن میں پھولوں پودوں اور سبزیوں کی ملی جلی مہک کے پس منظر میں آسمان صاف دکھائی دیتا تھا۔

••

اقبال کا مکمل فارسی کلام اور بطورِ خاص جاوید نامہ، دو دن کے اندر اندر چچا جان نے جاوید نامہ کی اہمیت اور دانتے سے ہوتے ہوئے ابنِ عربی تک کا تعارف کرا دیا۔ پھر میرے لیے چند انگریزی اخبارات نکالے جو مجھے پڑھنا تھے ان چار ہفتوں میں۔ اسی دوران میرے تلفظ کی سختی بھی آتی اور میرے ہجے کرنے پر بھی تنقید ہوتا تھی۔ لیکن اس دفعہ انھوں نے ایک اخبار کا پہلا صفحہ خاص طور پر میرے سامنے رکھا۔ ''ایملی ڈیوسن'' خواتین کے حقِ رائے دِہی کی ناقابلِ یقین برطانوی مثال۔ پہلے مجھے ایک کہانی کی صورت اس کا سارا سیاق و سباق سنایا۔ پھر ایک صفحے پر چند سوال تحریر کیے جن کا مجھے جواب بھی دینا تھا۔ اس زمانے میں انٹرنیٹ اور 'گوگل' تخیل کی حدود سے ماورا تھے۔ چچا جان کی لکھائی ایسی تھی جیسے کسی نے سیکڑوں چمکیلے ناسفتہ موتی جادو کے زور سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست کر دیے ہوں۔ میں نے نیچے لکھے اپنے جملوں کو دیکھا اور شرمندہ ہو کر اوپر کاپی رکھ دی۔

چچا جان مسکرائے، ''می نویس وی نویس وی نویس۔۔۔

''بتاؤ کیا ایسے جان دینا درست تھا؟ جذباتی اور دیوانہ وار، بلا سوچے سمجھے، یوں بگٹٹ بھاگتے ایک گھوڑے کے سامنے آ کر؟''

''گھوڑا دوڑانے والے جاکی نے بھی بالآخر خودکشی کر لی۔ ایملی کا چہرہ، گھوڑے کے ٹکرانے سے چند ثانیے پیشتر کے تاثرات اور اچھل کر زمین پر گرتا وجود، جاکی کے لیے ایک آسیبی خیال بن گیا۔ لیکن ایملی کا یہ عمل کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس کے بیگ میں رکھا لندن کا دوطرفہ ٹکٹ، شام کی رقص پارٹی کے لیے خریدا ٹکٹ، فرانس میں بہن کے پاس جانے کے سارے

خواب، ایملی کی ایک مجنونانہ سوچ کی تکمیل میں گھوڑے کے سامنے کھڑے ہونے کے لمحاتی فیصلے کی بھینٹ چڑھ گئے۔ نو دفعہ جیل جانے کے ریکارڈ کے ساتھ۔ انسانی جان دیوانہ وار لٹا دینے کے لیے نہیں؟ یہ لو۔۔ یہ پڑی ہے میری جان۔ اب میرے مطالبات مان لو، اپنی زندگی کی توقیر کرنی ضروری ہے۔ چلو اب یہ صفحہ پڑھو اور مضمون لکھو۔''

چچا جان اپنے درس و تدریس کے تجربے کی وجہ سے بے حد اختصار کے ساتھ کلیدی الفاظ میں پوری کہانی سنا دینے کی مہارت رکھتے تھے۔ پھر استادانہ بے نیازی سے انتظار کرتے۔ میں ان لکیروں پر تصویریں بناتی رہتی۔ کبھی تو بالکل مبہم سے اشارے دیتے اور ان رنگ برنگے پروں پر مجھے پورا پرندہ تخلیق کرنا پڑتا لیکن مجھے اس ذہنی مشق اور بازیگری میں بہت لطف آتا۔ انگریزی ادب کی جھلکیاں مجھے چچا جان کی ان ہی آنکھ مچولی نما تدریس کے ذریعے نظر آئیں۔

••

کہانیاں لکھنے کی ترغیب دینے والوں میں بابا جان سے لے کر چچا جان تک سب بھائی شامل تھے۔ بچپن کی تاروں بھری راتوں میں مجھے چچا جان ٹاور آف لندن کی کہانی سنایا کرتے تھے۔ اپنی آواز کو گونج دار اور خوفناک سا بنا کر کہتے کہ ''سرد تاریک چاندنی راتوں میں یہاں قتل کیے گئے لوگوں کے بھوت پھرتے ہیں۔'' ''بھوت''، چچا جان نے اپنے سرخ و سفید معصوم چہرے کے گرد دونوں ہاتھ پھیلا کر اپنی دانست میں خوفناک سی صورت بنائی اور پھر صوتی تاثرات دیے۔ ''ہا ہا ہا، سب کو کھا جاؤں گا۔'' وہ اپنے چہرے کے دائیں بائیں دونوں ہاتھ پروں کی صورت لہراتے۔

''یہ بچوں والی بات ہے چچا جان''، میں نے ان کے ہاتھ نیچے کیے، ''اس میں ڈرنے والی کیا بات ہے۔''

وہ شاید مایوس ہو کر اپنی اداکاری کے مزید جوہر دکھانے سے باز آ گئے لیکن کہیں نہ کہیں ان کے ذہن میں لندن کے آسیب زدہ ٹاور، خونی مقتل گاہ اور عقوبت خانے کے بارے میں اردو داستانیں لکھنے کا خیال اور تصور بہت واضح تھا۔ چچا جان نے بتایا کہ اس دور میں بھی شاہی خاندان گوناگوں توہمات کا شکار ہے۔ مثلاً ان کو یقین ہے کہ ٹاور پر چھ سات کالے کوے ہر وقت موجود رہنا چاہییں تاکہ شاہی اقتدار کا دوام رہے۔ اگر یہ کوے محل کے چوباروں سے کوچ کر گئے تو شاہی سلطنت کو زوال آ جائے گا۔

جب میں اپنے بچوں کے ساتھ ان کے گھر چند راتیں رہی تو انھوں نے پھر وہی بات دوہرائی، لندن ٹاور میں پھرتے تاریخی بھوتوں کی داستانیں لکھنے کا کہا، ''تم ڈرتی جو نہیں ہو اور پھر تمھیں لندن جانے کے اتنے مواقع بھی میسر ہیں۔ سیر و سیاحت بھی پسند ہے اور چلتے چلتے لکھ بھی لیتی ہو۔ اردو میں بچوں کا ادب نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے مغربی دنیا کے ماحول پر لکھی گئی کہانیوں سے بڑوں کو بھی فائدہ ہوگا۔ بس ایسا کرو کہ بچوں کے لیے ملکہ این بولین Anne Boleyn کی کہانی لکھو۔''

ملکہ الزبتھ اول کی ماں جو بادشاہ ہنری ہشتم کی داشتہ بن کر رہنے سے منکر تھی، بادشاہ نے مذہب، سماج اور روایات کے برعکس ملکہ این سے شادی کی۔ ملکہ الزبتھ اول کی پیدائش پر وہ خوش نہیں تھا۔ اسے ایک وارث چاہیے تھا جو ملکہ نہ دے سکی۔ بادشاہ کو نئی شادی کے لیے بہانہ درکار تھا۔ اس نے ملکہ این پر بددیانتی کے الزامات لگا کر تحقیقات کا آغاز کرا دیا۔ بعض حوالوں میں بدچلنی اور جادوگری کے الزامات بھی ثابت کیے گئے اور ملکہ کو ٹاور آف لندن میں محبوس کر دیا گیا۔ ملکہ این پر باقاعدہ مقدمہ چلا کر اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ بے قصور ملکہ اکثر اپنا کٹا ہوا سر بغل میں دابے نمودار ہوتی ہے۔ شاہی خاندان اب تک پوری سنجیدگی سے اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ ہر سال اپنے قتل کے دن یعنی انیس مئی کی رات ملکہ محل میں بھٹکتی پھرتی ہے اور چار سر کٹے گھوڑوں کی بگھی میں ایک سر کٹا کوچوان اپنی گود میں ملکہ کا سر لیے گشت کرتا ہے۔ ملکہ الزبتھ اول نے اپنے دورِ حکومت میں ملکہ این کو شہادت کے رتبے پر فائز کر دیا۔

چچا جان نے اس مینار میں گھومنے والے بھوتوں کی ایک فہرست بنا کر دی۔ ہلکے پیلے رنگ کے کاغذ پر سیاہ موتیوں کی صورت میں جگمگاتی تحریر مکان کی آتشزدگی کی نذر ہوگئی لیکن یہ کہانیاں تحریر کرنا آج بھی میرا خواب ہے۔

••

امی جی کو ہر وقت یہی فکر دامن گیر رہتی کہ ان بابوں نے اس لڑکی کو بگاڑ دیا ہے، ''بس ہر وقت بانس پر چڑھائے رکھتے ہیں تاکہ کوئی اور کام نہ کرے بس صرف بازیگری کرتی رہے۔ اگر کل کو مزاج ہی نہ میں ملے تو کیا کرے گی؟''

خودی کی شوخی میں تندی و کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذتِ نیاز نہیں

چچا جان نے شعر پڑھا، امی جی اور بھڑک گئیں۔ گھور کر لاڈلے دیور کو دیکھا۔ میں نے چچا جان کے کاندھے کے پیچھے سے جھانک کر آہستہ سے کہا،''چا چا جی امی جی کو شعر کی تو سمجھ ہی نہیں آئی ہوگی۔'' امی جی نے سن لیا اور ناراض ہوکر بولیں،''مجھے ان لوگوں کے ارادوں کی خوب خبر ہے۔ اس جاہل سے اتنے شعر یاد کرا کر پتہ نہیں کون سا تیر مروائیں گے؟ کبھی اسے یہ بھی بتایا کرو کہ چپ بھی رہنا ہوتا ہے۔ جب تک پلٹ کر جواب نہ دے لے اسے سکون نہیں ملتا۔''

''اچھا، جی آپا'' وہ فوراً اچھے بچوں کی طرح بولے،''میں تو ہفتے دو ہفتے کے لیے آتا ہوں، چلا جاؤں گا۔ یہ اشعار تو اسے لالہ جی نے سکھائے ہیں۔''

آج جب میں چند ہفتے کے لیے پاکستان جاتی ہوں اور ماہ نور اور مہر کو گھول کر اشعار پلانے کی کوشش کرتی ہوں تو مجھے چچا جان کی یاد آتی ہے۔

چچا جان کے اندر ایک عجیب تحیر بھری معصومیت تھی۔ جب وہ ہماری شرارتوں پر حیران ہوکر سوال کرتے یا امی جی کو مدد کے لیے اور ہمیں ڈانٹنے کے لیے آواز دیتے تو مجھے مزید لطف آتا۔ امی جی فوراً آموجود ہوتیں اور ہم بدتمیزوں کو یاد کراتیں کہ ہمارے چچا جان اس قدر ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود کس قدر سادہ لوح ہیں۔

آج کل کے بچے تو پیدا ہوتے ہی آنکھیں کھول کر ہر ایک کو یوں دیکھتے ہیں جیسے پوچھ رہے،''ہوں توں دس وئی توں کیہڑا ایں''؟ (تم تعارف کرواؤ بھئی تم کون ہو؟)

بار ہا مجھے یہی کہا جاتا ہے کہ تم ہمیشہ اپنے ابا جی، تایا جان، بابا جان اور چاچوں کا ذکر کرتی ہو، ماں (اپنی ننھیال) کے بارے میں اتنا نہیں لکھتی۔ دنیا پتہ نہیں مدرز ڈے پر کیا کیا لکھتی ہے۔ بات تو یہ ہے کہ میں ہر سانس کے ساتھ اپنی ماں کے نام ایک دعا لکھتی ہوں جس کی تربیت میں محبت آمیز سختی نے مجھے سگھڑ اور سلیقہ شعار بنانے کی بھرپور کوشش کی اور خاندان کے ساتھ حسنِ سلوک نے مجھے دوسروں کے ساتھ نیکی کرنے کا عملی درس دیا۔

••

شریف چچا جان جب برطانیہ آباد ہوگئے تو اکثر لوگ ان کو گورا سمجھتے تھے۔ ان کے مزاج میں بھی دادی جان والی معصومیت اور سادگی تھی۔ ہم بچے بھی ان سے شرارتیں کرتے اور وہ ہماری شکایتیں امی جی سے لگایا کرتے۔ گھر میں بڑے کمرے میں شیشے کی الماری کے نیچے ایک تخت پوش پڑا ہوتا تھا جو خصوصی طور پر نماز کے لیے تھا۔ قبلہ رو اس تخت پوش پر جائے نماز بچھا ہوتا۔ یہ تخت پوش

لکڑی کے بجائے دھات سے بنوایا گیا تھا۔ میں دسویں جماعت میں تھی۔ چچا جان پاکستان آئے تو امی جی نے کہا کہ اپنے چچا کو نیا جائے نماز ڈال کر دو، پھر وہ ساتھ ہی لے جائیں گے۔ وہ جائے نماز ہماری خالہ جان سعودی عرب سے لائی تھیں اور چچا جان کو دینے کی غرض سے امی جی نے سنبھال دیا تھا۔ چچا جان تخت پوش پر کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا کہ ذرا آگے ہو کر کھڑے ہوں۔ پیچھے ٹیلی فون کی میز پڑی ہے۔ انھوں نے ماہرانہ نظروں سے تخت پوش کو دیکھا۔ چند قدم آگے بڑھائے۔ پھر پیچھے ہٹے۔ مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا۔۔۔''اچھا تمھارا دل ہے کہ میں اور آگے ہو کر کھڑا ہوں، میرا equilibrium نہ رہے اور میں گر جاؤں؟'' پہلے تو میں نے اس انگریزی لفظ کا مطلب پوچھا، جس پر چچا جان نے سب کچھ چھوڑ کر انگریزی پڑھائی اور لفظ کے اصل ماخذ سے توازن تک لے کر آئے۔ پھر بولے میں آپ کی باتوں میں نہیں آؤں گا اور پیچھے کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔

''توبہ چاچا جان، ہمسایہ ملک کی طرح کتنی باتیں فرض کر لیتے ہیں'' میں نے ان کو مزید چڑایا۔ چچا جان نے باقاعدہ امی جی سے شکایت لگائی، ''آپا، یہ لڑکی میرا تختہ الٹنا چاہتی ہے۔''

••

میں نے جب ڈنمارک میں تعلیم کے دوران تاریخ کا مضمون منتخب کیا تو وہ ایک نئی آزمائش تھی۔ پاکستان تعلیم کے دوران میں نے کبھی تاریخ کا مضمون نہیں پڑھا۔ جب ڈینش زبان میں یورپ کی تاریخ پڑھنے کا آغاز کیا تو میں اکثر خود سے سوال کرتی کہ اپنی ذات پر اتنے عذاب لادنے کی کیا ضرورت تھی۔ ڈینش طلبہ و طالبات تو نشاۃِ ثانیہ، اصلاح پسندی، قرونِ وسطیٰ کے نام کے ساتھ فرفر اس صدی کی خصوصیات گنوا دیتے، دیوار گیر بڑے نقشے پلٹنیاں کھاتے ہوئے نیچے کو کھلتے، اور میرے ہم جماعت ان پر چھڑی رکھتے، بِراعظموں کے رنگین نقاط کو پھلانگتے، دریاؤں اور سمندروں کی نشان دِہی کرتے، برطانیہ کی حد بندی سے برسلز اور پھر وہاں سے فرانس اور سپین تک کی لکیریں کھینچ کر کلیدی الفاظ میں اپنے پروجیکٹ کی وضاحت دے کر کرسی پر جا بیٹھتے اور سامنے رکھے چاکلیٹ ٹھونسنے لگتے۔

استاد کی تدریس کا طریقہ بھی اسی درجہ بندی کے ساتھ تھا، یعنی کہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ اس جماعت میں سب کے پاس بنیادی تاریخ و جغرافیے کا علم موجود ہے۔ میں لائبریری سے بچوں کی تاریخ کی کتابیں لے آتی۔ پھر ان ہی دنوں پاکستان جانا ہوا۔ چچا جان چونکہ پاکستان ڈیرے ڈال چکے تھے، میں نے فریاد کے انداز میں ان کو بتایا کہ مجھے نقشہ دیکھنا بالکل نہیں آتا، میں تو بالکل

نالائق ہوں۔

''لو بھلا یہ بھی کوئی مسئلہ ہے، چلو میرے ساتھ۔'' چچا جان بولے، ''رات ادھر ہی رہنا اور میں نقشہ دیکھنا سکھا دوں۔''

چچا جان کا بس نہ چلتا تھا کہ مجھے راتوں رات پوری دنیا کا نقشہ گھول کر پلا دیں۔ میرے سرہانے ان کا چمکتا ہوا گلوب پڑا تھا۔ چچا جان نے اسے شہادت کی انگلی سے گول گھمایا، ''یہ دیکھو، یہ خطِ استوا، عربی کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے برابر، دنیا کے نقشے پر اس کے عین وسط کھینچا گیا ایک فرضی خط یا لکیر ہے۔ یہ لکیر ہماری دنیا کو شمال اور جنوب کی طرف بالکل دو حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ یہ دیکھو، ان لکیروں اور خطوط میں پورا حساب موجود ہے۔ چچا جان نے ان خطوط کا انگریزی نام بتایا، طول البلد کو انگریزی میں Longitude کہتے ہیں۔ قطبین کو poles کہتے ہیں اور خطِ استوا کو equator کہتے ہیں۔

عالیہ نے انگریزی نام سے فوراً پکڑ لیا اور چچا جان کو بتانے لگی کہ ''یہ تو ہم نے سکول میں پڑھا ہے، لیکن آپ بہت مشکل کر کے کیوں بتا رہے ہیں؟''

''اچھا، پھر دیکھیں کہ طول البلد کو نصف النہار بھی کہتے ہیں۔ نصف النہار اولیٰ (prime meridian) انگلستان کے مقام گرینچ (Greenwich) سے گزرتا ہے اور اسے صفر درجہ طول البلد مانا جاتا ہے۔ 180 درجہ مشرق اور 180 درجہ مغرب کے طول البلد ایک دوسرے پر واقع ہوتے ہیں اور بین الاقوامی خطِ تاریخ (date) بناتے ہیں۔

''گرینچ (Greenwich) جنوب مشرقی لندن، انگلستان کا ایک ضلع ہے۔ یہ دیکھو جی ایم ٹی، GMT یہاں سے وقت بھلا کیوں؟'' انھوں نے پوچھا پھر خود ہی جواب دینے لگے ''کہ برطانیہ کے عروج کا دور تھا اس لیے جب وقت کی ترتیب کا مسئلہ ہوا تو اسے لندن کے قریب گرینچ سے ہی صفر مقام مانا گیا۔''

بچے متجسس آنکھیں لیے ہمارے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ میں چچا جان کا تمتماتا چہرہ دیکھتی رہی،

''زمین پر کھینچی ہوئی تصوراتی لکیر قطبِ شمالی کو قطبِ جنوبی سے ملاتی ہے اور لندن کے مضافات میں واقع گرینچ کے مقام سے گزرتی ہے۔ زیرو ڈگری کے فاصلے پر پائے جانے وقت کو دنیا کا معیاری وقت یا گرینچ مین ٹائم کہا جاتا ہے۔''

''مختلف ممالک اور شہروں کے اوقات کا تعین ان مقامات کے گرینچ سے گزرنے والی لکیر (گرینچ میریڈین) سے فاصلے کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ اس کا عمومی اصول یہ ہے کہ اگر آپ گرینچ میریڈین سے مشرق میں ہیں تو آپ کا وقت جی ایم ٹی سے آگے ہوگا۔ (مثلاً پاکستان کا معیاری وقت جی ایم ٹی جمع پانچ گھنٹے ہے)۔ اسی طرح گرینچ میریڈین سے مغرب میں پائے جانے والے ممالک کے مقامی اوقات گرینچ کے معیاری وقت سے پیچھے ہوتے ہیں۔ (مثلاً واشنگٹن کا معیاری وقت جی ایم ٹی منفی پانچ گھنٹے ہوتا ہے۔)

اب سمجھ آئی کہ دنیا میں مختلف ممالک میں وقت کا فرق کیوں ہوتا ہے؟''

''جی چاچا جی،'' میرے پاس سر ہلانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

چچا جان نے مجھے دو کتابیں نکال کر دیں اور بتایا کہ بحرِ اوقیانوس Oceanus کی وجۂ تسمیہ بھی یونانی دیو مالائی داستان سے ہی ہے اور پھر یہ لفظ عربی میں بھی مستعمل ہوا۔ یہ چچا جان کی برق رفتار تدریس ہی کا معجزہ تھا کہ میں نے باعزت طریقے سے امتحان پاس کرلیا۔

••

چچا جان کے علم وفضل کا اصل فیض نئی نسل کے بچوں نے اٹھایا۔ انگریزی زبان وادب، تاریخ، نقشہ، جغرافیہ، اساطیر، عربی اور فارسی غرض ہر میدان میں چچا جان فصاحت و بلاغت کا موجیں مارتا دریا تھے۔ تدریس کا جنون تھا اور پڑھاتے ہوئے یہ دریا کناروں سے امڈنے لگتا تھا۔

آج میں دمِ تحریر سوچ رہی ہوں کہ تدریس کا یہ جنون اور ترسیلِ علم کا یہ جذبہ کہ استاد خود شاگرد کی تلاش میں نکلے اور جہاں ممکنہ شاگرد ملے اسے شکاری کی طرح دبوچ کر اس کی کھوپڑی میں علم انڈیلنے کی کوشش کرے۔ کنواں اپنا حیات بخش میٹھا پانی لیے تشنہ کاموں کی تلاش میں پھرے۔ میں بعض اوقات اس بالجبر تدریس سے تنگ آجاتی۔

''یہ سب بھائی لاعلاج ہیں'' ایک دن میں نے حسبِ معمول سوچے سمجھے بغیر کہا۔

امی جی کے طیش کی انتہا ہی نہ رہی، ''تمھاری زبان کے آگے خندق ہے، کبھی جو سوچ سمجھ لیا کرو کہ کیا کہہ رہی ہو۔ حد ہوتی ہے جہالت کی، تمھاری کوئی حد نہیں۔''

اب جب ہماری تدریس سے تنگ آکر ہماری صاحبزادی کہتی ہے کہ امی جی آپ کا قصور نہیں، یہ آپ کی جینز میں مسئلہ ہے۔

••

کالج کے مباحثوں میں جب اردو زبان اور فورٹ ولیم کالج، اردو کی ترویج و ارتقا، انگریزوں کی پالیسیاں، چالاکیاں، مکاری، عیاری وغیرہ کے نکات زیرِ بحث آتے تو ہمیشہ کی طرح مثبت اندازِ فکر کے مبلغ ابا جی نے کہا کہ ''بدترین صورت سے بھی اپنی مرضی کا نتیجہ برآمد کرنے کے لیے ایک خاص تعمیری ذہنی مثبت ردِ عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ چلیے مان لیا کہ انگریزوں نے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل اور سیاسی مفادات کے حصول کے لیے اپنے ملازمین کو ہندوستانی زبانیں سیکھنے پر آمادہ کرنے کے لیے اضافی تنخواہ، مراعات اور عہدوں کی پرکشش پیشکش کیں، لیکن اس کے طفیل اردو زبان نے فائدہ اٹھایا اور اسے ترویج دی گئی۔''

چچا جان کا انتہائی شوق یہی تھا کہ برطانیہ میں اردو کے حوالے سے جو خزانہ جمع ہے اس پر تحقیق کی جائے۔ اس خزانے میں نجانے کتنی داستانیں مدفون ہیں۔ انگریزی اور ہندوستانی ثقافت کے ملاپ سے جنم لینے والی کہانیاں جن پر فراموشی کی دھول پڑی ہے۔ چچا جان نے مجھے اپنی جمع کی ہوئی فائل دکھائی۔ ان کو جب وقت ملتا لندن کے کتب خانے کھنگالتے۔ ان کو یقین تھا کہ اگر لوگوں نے شخصیات پر پی ایچ ڈی کے مقالے لکھنے کے بجائے تاریخی گلی کوچوں میں جا کر جستجو کی تو زبان و ادب کے ساتھ حیران کن داستانیں بھی ملیں گی۔ مجھے ہمیشہ کہا کرتے کہ تمھیں جب موقع ملے ہندوستان میں انگریزوں کے دورِ حکومت اور تہذیب و ثقافت پر تحقیق کرنا۔ فیلن کی لغت اور جان گلکرسٹ کی جد و جہد کی کہانی کو اردو زبان میں عام ہونا چاہیے۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ تحقیق کا کام گلکرسٹ اور فیلن کی لغات پر کیا جائے۔ پتہ نہیں لوگ کیوں گھسے پٹے انداز میں وہی چند شخصیات پر پی ایچ ڈی کیے جاتے ہیں۔ میرا بس چلے تو سب رد کر دوں اور محققین کو دلچسپ اور نادر موضوعات کی اجازت دوں۔

برٹش انڈیا کے دوران ایسے موضوعات اور کتب ہیں جو دلچسپ اور حیرت انگیز ہوں گی۔ لندن لائبریری بھری پڑی ہے مگر کوئی سائل بھی تو ہو۔ ان کے التفات اور توجہ کا فیض تھا کہ میں نے اپنی بساط بھر کوشش سے اس موضوع کا مطالعہ کیا۔ لیکن یہ کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا کہ ایک دن اس کتب خانے کو اسی عقیدت سے دیکھوں گی جسے میری پیدائش سے کہیں پہلے چچا جان نے دیکھا تھا۔ پھر زندگی نے مجھے بہت مواقع دیے۔ میں نے لاہور کی سڑکوں پر اورنگ زیب عالمگیر کی شاعرہ بیٹی خیرالنساء مخفی کے مقبرے کی سیاحت سے دہلی تک اور پھر وہاں سے نیشنل لائبریری آف پیرس اور پھر برٹش میوزیم کی لائبریری تک اس کو ڈھونڈا۔

••

چچا جان نے چونکہ برطانیہ کے شاہی کتب خانے سے اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی زیب النساء مخفی کے بارے میں بہت تفصیل جمع کر رکھی تھی اور بہت اشتیاق سے مجھے سنانا چاہتے تھے۔ باقی گھر شادی کے ہنگاموں میں مصروف تھا۔ میرے بچے اپنے ماموں کے ساتھ شہر کی سیر کو گئے تھے اور میں چچا جان کے شان دار کتب خانے میں بیٹھی تھی۔ وہ اپنے مخصوص شوق بھرے انداز میں اپنی دریافت کی گئی شہزادی اور اس کا فارسی کلام سنا رہے تھے۔ اس کی داستانِ حیات بھی کیسی عبرت انگیز ہے، چچا جان نے چند صفحات الٹے۔

محلاتی داستانیں، سازشیں، افواہیں اور افسانے تو تاریخ کی کتب میں درج ہوئے جن کی صحت کا یقین اور سند کا اعتبار بھی مشکل ہی ہے لیکن زیب النساء مخفی نے تجرد کی زندگی گزاری۔ اس کی نسبت دادا نے دارا شکوہ کے بیٹے سے طے تو کی لیکن اورنگ زیب عالمگیر کی ناپسندیدگی اس میں شامل تھی۔ چچا جان کے پاس ایک تقریباً شہید ہوئے صفحات والی کتاب تھی۔ ''اس زمانے میں مورخین نے اس کے محبوب گنوائے اور پھر اس کے اپنے سخت گیر باپ نے اسے سزا کے طور پر قید کر دیا۔''

''ایک منٹ چچا جان، محبوب نہیں، عشاق کی فہرست کہیے، ہمارے تہذیبی پس منظر میں عاشقوں کا چلن ہے جنھیں عاشق ہونے کا دعویدار ہونے کی سہولت بھی ہے۔ عشق کا اشتہار دینے کی اجازت بھی ہے، پہل کرنے کی بھی اور اپنی پیشکش کو قبولیت نہ ملنے پر شکایت اور دھمکی کی سہولت بھی، رد کیے جانے پر فخر آمیز انتقام کی داستان بھی اور ہر ممکن طریقے سے انکار کرنے والی پر مسلط کرنے والی ذلت بھی، عورت خواہ وہ شہزادی ہو، کیسی ہی بااختیار ہو، جب وہ کسی پر فریفتہ ہوتی ہے تو اس کا محبوب اس کے لیے پیچھے سے پھٹا کرتا ثابت ہوتا ہے۔ اس کے عشق اور رسوائی کی گواہیاں محکم ہوتی ہیں۔''

چچا جان سناٹے میں آ گئے۔ انھوں نے کتاب احتیاط سے واپس الماری میں سجا دی۔

''اس لیے آپ اس کے عشاق کی فہرست کے بجائے زندان میں مرنے کا احوال سنائیں مجھے۔''

اپنے عزیز دوست چچا سے یہ بحثیں کرتے ہوئے مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ زندگی صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہمہ تن گوش ہے اور بہت جلد یہ سارے سوالات اور فہرستیں لیے میرے

ہاتھ کے قلم اور اپنی رائے دیتے مائک پر حملہ آور ہوگی۔ لیکن اس بے باک زندگی کو یہ خبر نہیں تھی کہ نہ میں شہزادی ہوں اور نہ میرا باپ اورنگ زیب عالمگیر ہے۔ مجھے ایک چھتنار اور سایہ دار شجر حاصل ہے۔ مجھے اس پست معاشرے کی طرف سے آنے والے گھٹیا تیروں سے خائف نہیں کیا جاسکتا۔

کوپن ہیگن میں تدریس کے دوران جب مجھے چار سالہ یونیورسٹی کالج کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا تو میں نے یہاں چار مضامین میں سے ایک تاریخ کا مضمون بھی چنا۔ یہیں میں نے تنقیدی شعور کے ساتھ بہترین اساتذہ اور بین الاقوامی ماحول میں تاریخ کا مطالعہ کیا۔ اگرچہ میری ذمہ داریوں اور فرائض نے مجھے اپنے شوق کی تکمیل نہ کرنے دی لیکن میں نے برِصغیر کی تاریخ کے ساتھ ڈینش تاریخ کے تقابل اور موازنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ کبھی ماہانہ پروجیکٹ کے لیے اختصار کے ساتھ، کبھی زبانی لیکچر کے لیے ابتدائی معلومات کے بیانیے کے ساتھ یہ شوق جاری رہا۔ اور اس کی آخری کڑی میری ڈینش زبان و ادب کی تاریخ کی تحقیق کے دوران مجھے ملی۔ شہزادی خیرالنساء مخفی اور ڈینش شہزادی لیونورا کرسچن کی زندگی کی داستان میں مماثلت ڈھونڈ نکالنا ممکن ہوا۔

کرسچن چہارم کی ذہین وفطین بیٹی لیونورا کرسچن جسے محلاتی سازشوں کی وجہ سے زندگی کے بائیس برس بلو ٹاور میں قید و بند کی اذیتیں سہنا پڑیں۔ اگرچہ دونوں کی زندگی اس لحاظ سے مکمل طور پر جدا تھی کہ لیونورا کو اس کے والد نے انتہائی اہتمام کے ساتھ پڑھا لکھا کر اپنے ایک منظورِ نظر کے ساتھ بیاہ دیا۔ اس نے اپنے محبوب شوہر کی صورت میں ازدواجی زندگی کی تمام تر مسرتیں کشید کیں، دنیا کی سیر کی اور اسے ایک نئے رنگ میں دیکھا۔ پھر والد کی وفات کے بعد سوتیلے بھائی اور بھابی کے ساتھ کشمکش میں اپنے شوہر سمیت راندۂ درگاہ ہوئی۔ اسے قید کر دیا گیا اور اس کا شوہر مفقود الخبر ہوگیا۔ قید خانے میں ہی اس نے شدید پابندیوں کے باوجود چوری چھپے ڈینش ادب کا شاہکار کتاب (Jammers Minde) ''غم کی یاد'' لکھی جسے سترھویں صدی کے ادب کا شاہکار تسلیم کیا جاتا رہا۔ ''دیوانِ زیب النساء مخفی'' کو اہلِ فارس سبکِ ہندی کا بہترین ادب مانتے ہیں۔ دونوں عورتیں اپنے زمانے کی نسائی طاقت اور دانش کی علامت تھیں۔ دونوں نے محلات کی زندگی دیکھی اور بہترین اساتذہ سے تعلیم و تربیت پائی۔ دونوں کو کئی زبانوں پر عبور تھا۔ دونوں ہی کے ہاتھ میں قدرت نے قلم دیا اور دونوں ہی معاشرے کے انتقام کا شکار بنیں۔

••

اورنگ زیب عالمگیر کی دین داری کا تذکرہ سب بھائیوں کو بڑا محبوب تھا۔ میں نے ابنِ

انشاء کی کتاب کے اوراق الٹے، ''نہ کوئی نماز چھوڑی، نہ کوئی بھائی چھوڑا'' ''دین و دنیا دونوں پر نظر رکھتا تھا۔ نہ اس نے کوئی نماز چھوڑی اور نہ کسی بھائی کو چھوڑا''

''تو یہ ہے ابا جی آپ کا اورنگ زیب عالمگیر! ہماری سرائے عالمگیر بھی اسی کی نشانی ہے۔''

ابا جی کو ہنسی آ گئی۔ ''ہمیں تاریخ کی کتابوں میں یہ سب کیوں نہیں پڑھایا جاتا'' میں نے پوچھا۔ ''مجھے تو کبھی ایسے لگتا ہے کہ نصاب میں صرف وہ چیزیں رٹ لینا ہوتی ہیں جو ابواب میں بیان کر دی گئی ہیں۔''

''چلو بھئی ٹھیک ہے، آپ کو دلچسپی ہے تو آپ اپنے طور پر پڑھ لیں اورنگ زیب عالمگیر کو'' ابا جی نے ہمیشہ کی طرح درمیانی راستہ دکھایا۔

کالج کی ابتدا میں میرا تعارف اپنے طور پر تاریخ سے ہوا۔ پھر اپنے قصبے سرائے عالمگیر کے حوالے سے پڑھنے کا شوق جاگا، اور آخر میں چچا جان کی شفقت اور رہنمائی نے میرے لیے حیرتوں اور جسارتوں کے در وا کیے۔ چچا جان نے ہی خیرالنساء مخفی کا تعارف کروایا تھا۔ انھوں نے ہی مجھے اس کی زندگی اور شاعری اور پھر اورنگ زیب کے حکم نامے پر لاکھوں کی پنشن ضبط کر کے پابندِ سلاسل کرنے کی کہانی سنائی۔ برٹش میوزیم لندن میں اس کی نشانیاں محفوظ ہیں۔

چچا جان نے مجھے بتایا اور مجھے ابھی تک یاد ہے کہ میں نے ان سے کہا اگر کبھی میں نے تاریخ پڑھنے کا انتخاب کیا تو میں اورنگ زیب عالمگیر کی اس بیٹی پر ضرور تحقیق کروں گی۔ اور تحقیق تو چچا جان نے کر رکھی تھی۔ ان کا تو شوق اور زندگی کا مقصد ہی تحقیق اور مطالعہ تھا۔ اس دن ساری شام اور رات کا ابتدائی حصہ تاریخ کی ستم ظریفی اور سولھویں سترھویں صدی میں خواتین کی شخصیات اور شاعری کی باتیں کرتے گزر گیا۔ زیب النساء صائب تبریزی کی ہم عصر تھی۔ اسی باپ نے ابتدا میں کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے حافظِ قرآن بنایا۔ اس نے انتہائی کم عرصے میں سات برس کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا۔ پھر اسے خطاطی کی تربیت دی گئی۔ عربی اور فارسی پڑھانے کے لیے اساتذہ فراہم کیے گئے۔ ناز ونعم اور تعلیم و تربیت دے کر نابغہ روزگار بنا دیا گیا۔ اور پھر کہا گیا کہ بس اب صرف ہماری عطا کردہ روشنی سے وہی مناظر دیکھو جو تمھیں دکھائے جا رہے ہیں۔ اس محل اور اس باغ کے باہر کی دنیا تمھارے لیے شجرِ ممنوعہ ہے۔ اور شاعری۔۔۔؟؟؟ ہاں گستاخ لڑکی، اس شاعری کے گھنگرو تمھیں اپنے پیروں سے اتارنا ہوں گے۔

آنکھ دے کر وہ دکھاتا ہے بس اپنے منظر
ہم کو منظور نہیں سودا یہ بینائی کا

(صدف)

''ساری عمر غیر شادی شدہ زندگی بسر کرنے والی زیب النساء، محلاتی سازشوں، رسوائی کے بے نام افسانوں، ناکام معاشقوں کی داستانوں کا موضوع بنی اور پھر اپنے ہی باپ کے ہاتھوں سلیم گڑھ قلعے میں بے چارگی اور اسیری کے دن کاٹتی دنیا سے چلی گئی۔ تو ابا جی، یہ تھا ہمارا اورنگ زیب عالمگیر، قرآن لکھنے اور ٹوپیاں بیچ کر گزارا کرنے والا، اپنے والد، بھائی اور بیٹی تک کو زندان کی دیواروں پر اشکوں سے داستانیں لکھنے پر مجبور کرنے والا۔''

میں نے ابا جی کو طعنے مارے۔ لیکن ان کا جواب ہمیشہ کی طرح صلح کن اور علم افروز تھا۔

''میرے بچے ہر انسان خیر و شر کا مجموعہ ہے۔''

''تو پھر نصاب کی کتب میں اس کی شر انگیزی کیوں بیان نہیں کی جاتی؟'' میں اپنے سوالوں سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔

''نئے لوگ کریں گے ناں۔ آپ تحقیق کریں اور لکھیں۔ اس پس منظر کو لے کر افسانہ لکھیں۔ تاریخی ناول لکھیں۔'' وہ آرام سے بولے۔

••

چچا جان شریف کے سرخ و سپید رنگ اور دراز قامتی پر پہلی نظر میں لوگ ان کو گورا ہی سمجھتے۔ ان دنوں میں برطانیہ میں دیسی لوگوں کے محدود تعداد میں تھے سو اپنی زبان بولنے کا موقع نہ ملنے کے باعث غالباً انگریزی کا لہجہ بھی دیسی نہ رہا۔ ایک مرتبہ پاکستان آئے تو امی جی کے پاس بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ امی جی باورچی خانے گئیں تو پیچھے چلے گئے۔

''آپا میں ادھر ہی بیٹھ جاتا ہوں'' انھوں نے آگے پیچھے متلاشی نظر سے دیکھا۔ ''آپا وہ جو لکڑی کی چوکی سی ہوتی تھی، یاد ہے بے جی اسے کیا کہتی تھیں؟ مجھے وہ لفظ یاد نہیں آ رہا۔ بہت بیزاری ہو رہی تھی۔''

''پیڑھی'' چاہیے چچا جان!'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔ اسے پیڑھی نہیں کہتے تھے۔''

''موڑھا۔۔۔'' میں نے کسوٹی کھیلنے کی کوشش کی۔

''نہیں، آپا تسیں دسّو، یاد ہے ناں وہ لکڑی کی چوکی سی؟'' امی جی نے بہت اطمینان سے دیگچی سے چائے کپ میں انڈیلی۔۔۔ ''بنڈا۔''

''ہاں وہی بنڈا'' چچا جان کو جیسے کسی پھانس کے نکل جانے کے احساس نے سکون دیا۔ پھر شدید متفکر ہو کر بولے، ''آپا مجھے کہیں زبان ہی نہ بھول جائے، مجھے لفظ یاد نہیں رہتے، نامراد انگریزی کے الفاظ منہ پر آجاتے ہیں۔'' مجھے چچا جان کی تشویش پر ہنسی آگئی۔

••

چچا جان راولپنڈی گورڈن کالج کے مایہ ناز شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ بڑے بھائیوں کی خواہش اور چچا جان کی اپنی دلچسپی ادب اور تاریخ کے ساتھ تھی سو ان کو اسی راستے پر چلنے دیا گیا۔ درس و تدریس ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ وہ کسی ستارے کی طرح اپنے پیچھے روشن لکیر چھوڑ گئے۔ مزاج کی سادگی اور انکساری نے ان کی شخصیت میں ایک عجیب جاذبیت بھر دی تھی۔ ایک دن ہنس ہنس کر مجھے اپنا گولڈ میڈل وصول کرنے کی داستان سنانے لگے۔

''کڑیے، توں تے کپڑے جوتے میچ کر دی ایں۔۔۔ مجھے جب گولڈ میڈل لینے جانا تھا تو میرے پاس ڈھنگ کے کپڑے ہی نہیں تھے۔''

''واقعی؟ ہائے چچا جان پھر آپ نے کیا کیا۔'' میں ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''کرنا کیا تھا'' وہ اطمینان سے بولے۔ ''ہمارے ساتھ ایک ساہیوال کا لڑکا تھا۔ میں اس کی قمیص پہن گیا، اللہ اللہ خیر صلا۔''

''ماں صدقے''، امی جی بولیں ''میرے وِیر نے کبھی کسی کا احسان نہیں لیا، کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔''

••

میں چچا جان کے گھر بچوں کے ساتھ چند دن رہنے تو چلی گئی، وہ خوشی اور شوق کے مارے نہال ہو گئے۔ رات کو دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ دنیا جہان کے قصے، کتابوں کی باتیں، برطانیہ کی تاریخ اور سادہ لوح لوگ جو وہاں آ تو جاتے لیکن زبان نہ جاننے کی وجہ سے کیسی مشکلات اٹھاتے۔ اس زمانے میں زندگی آسان نہیں تھی۔ سردی سے بچنے اور گھر گرم رکھنے کا انتظام ایسا نہیں تھا جیسا آج کل ہے۔

اگلی صبح چچا جان مسجد میں جانے کی غرض سے نکلے۔ اونچی چھت والے بڑے سے

کمرے میں ہم سو رہے تھے۔ اچانک ان کی پالتو بلی نے بستر پر چھلانگ لگائی۔ میں اور عالیہ اس ناگہانی آفت پر چیخیں مارتے جاگے۔ اسے کمرے سے نکالا اور دروازہ بند کیا۔ خدا خدا کر کے دوبارہ آنکھ لگی تو چچا جان پرندوں کا چار منزلہ پنجرہ سرہانے لے آئے۔ اس پنجرے کے نیچے پہیے لگے تھے اور ہر منزل میں رنگا رنگ چڑیاں، طوطے، لالیاں اور خدا جانے کیا کیا پرند بھرے تھے۔ ان کی چوں چڑ چوں سے میری آنکھ کھلی۔ میں اٹھ کر باہر آئی۔

''کمال ہے چچا جان، یہ کیا چڑیا گھر اٹھا لائے ہیں۔ مجھے تو دیر تک سونا تھا۔''

بہت معصومیت سے بولے ''میں تو فطری ماحول پیدا کر رہا تھا کہ آپ کو محسوس ہو آپ جنگل میں سو رہی ہیں۔ اب اٹھ ہی گئی ہو تو یہ میرے پودے دیکھو، کیسے کیسے نایاب ہیں اور گلاب کتنے رنگوں کا ہے۔''

''میں گھر جا رہی ہوں چچا جان'' میں بگڑ گئی۔

''یہ بھی گھر ہی ہے، ابھی ناشتہ کرو اور پھر بچوں کے ساتھ تیار ہو جاؤ۔ شاپنگ کرنی ہے۔''

••

چچا جان نے عمرِ عزیز کے کئی عشرے برطانیہ میں گزار لیے۔ اپنے مزاج اور شوق کے مطابق وہاں بھی زبان سے محبت کا علم لہراتے رہے۔ اقبالیات کے مختلف موضوعات پر تحقیق و تحریر ان کا مشغلہ رہا۔ اپنے کالمز اور مضامین کو وہ ہمیشہ کوئی منفرد مصرع عنوان کے طور پر دیتے۔ آرٹیکلز کو مصرعوں کا موضوع دینا میں نے ان سے ہی سیکھا۔ مجھے آج بھی چچا جان کا ایک زبردست آرٹیکل یاد ہے جس کا عنوان ''حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے'' تھا۔ مجھے اس مصرع کا پس منظر سمجھانے کے لیے چچا جان نے اقبال کی پوری نظم ''غلام قادر روہیلہ'' پڑھائی۔

''اب دیکھو'' اس میں تاریخی حوالہ بھی شامل ہو گیا۔ ایک لطیف سا طنز بھی جھانک رہا ہے اور اس دور کے مظالم کی داستان بھی رقم ہے کہ جنگ کوئی بھی ہو، عورت اس کی قیمت ادا کرنے والا وہ مظلوم طبقہ ہے جس کو رسوا کر کے مردوں سے انتقام لیا جاتا رہا ہے۔''

یہ چچا جان ہی کی کرم فرمائی تھی کہ میں نے اقبال کو ایک تازہ ذوق اور ایک نئے زاویے سے پڑھنا شروع کیا۔

چچا جان جب پاکستان سیٹ ہو گئے تو مجھے ان سے ملنے کے بہت مواقع ملے۔ ''چچا جان اب یہ جو ایک نیا زاویۂ نظر سامنے آ رہا ہے جس میں نئے دانشور اور مشاہیر اقبال کی شاعری اور

شخصیت کو مسخ کرنے کی کوششوں میں عجیب غیر ادبی زبان میں نئے نئے نکات پیش کرتے ہیں۔''
اس سے پہلے کہ چچا جان کوئی جواب دیتے ابا جی بولے،

''بیٹا بات جتنی بھی کڑوی کیوں نہ ہو، اس کو کہنے کا انداز، الفاظ کا چناؤ، جملے کی کاٹ، اور ابلاغ کے اظہار کی کاوش لکھنے والے کی اپنی ذہنی سطح کی خبر دیتی ہے۔ ہر وہ تحریر اور تقریر جو اخلاق سے گرے ہوئے الفاظ استعمال کرے، اس کو پڑھنا اور سننا محض وقت کا زیاں ہے۔ دلیل لے کر آنے والا اپنے ساتھ قوتِ اظہار اور شائستگی کا اسلوب نہ لائے تو اس کی اپنی رائے نامعتبر ہو جاتی ہے۔''

''جی ابا جی۔۔۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر اس مضمون کو سامنے رکھا۔

''اس کی سادہ اور آسان مثال یوں ہے بچے کہ ایک جاہل اپنی والدہ کو بلاتے ہوئے ''اے بے بے بات سن'' کہتا ہے۔ دوسرا ''اماں بات سن'' کہہ کر ابتدا کرتا ہے۔ ایک ایسا بھی ہے جو ''او میرے ابے دی رَن، گل سن'' کہتا ہے۔ ان میں سے اگر ایک فرد ''امی جان ایک بات عرض کر سکتا ہوں'' کہتا ہے تو فیصلہ سننے والے کا ہے، وہ باقی بات سننے میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے یا نہیں۔ ذوقِ سلیم اور طبائعِ سلیم فطرت کی دین ہیں اور نفیس طبع کرختگی، کثافت اور کریہہ الفاظ یا مناظر کی ہر صورت سے کبیدہ ہوتی ہے۔''

''جی لالا جی بالکل۔۔۔'' چچا جان جو اپنے لالہ جی کے ادب میں خاموش بیٹھے تھے، کہنے لگے کہ ''یورپی ادب اور اس کی تھیوریز جس کو ہم اردو میں مشرف بہ اسلام کر کے لانے کی کوشش کرتے ہیں، مصنف اور قاری کے ان رشتوں، مصنف کی ذاتی زندگی کے پس منظر اور اس کے حالات و واقعات کو اتنی ہی اہمیت دیتی ہیں جتنی ایک ادب پارے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ جو چیز ہم نے مغربی ادب سے نہیں سیکھی وہ ادب اور ادیب کی تکریم ہے۔ اس کے قلم سے اس کی معیشت کے سہارے کو باندھنا، اور اس کے تخیل اور قلمی کاوشوں کو سماجی رویوں کے منفی اثر سے دور رکھنا ہے۔ پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ اقبال پر یا کسی بھی اور سیاسی، سماجی، ادبی یا مذہبی شخصیت پر تنقید کرنے والا خود کو ان سے بہتر ثابت کرے، ان سے بہتر لائحہ عمل لے کر آئے، جو مسائل وہ اپنی تحریر میں اٹھاتا ہے ان کے حل کی نشان دہی کرے۔ شاعری یا ادب طعنہ و دشنام کے لیے نہیں جیسے گلی محلے میں کوئی تو تڑاخ کر رہا ہو۔ شعریت یا مضامین کا اسلوب اور معنویت عام بات چیت اور شکوے شکایات یا تنقید کو بھی ادب سے بھرپور رنگ عطا کرتی ہے تاکہ جب نئی نسلیں ان سے استفادہ کریں تو زبان و ادب کے ساتھ تہذیب و شائستگی بھی سیکھیں۔''

''شعر گوئی کی صلاحیت اپنی جگہ، شعر فہمی کی اہلیت بھی قدرت ہی ودیعت کرتی ہے۔ اس لیے جو کچھ بھی لکھو باوقار انداز میں ذاتی اور سطحی انداز سے اوپر اٹھ کر لکھو۔ اپنی شخصی زندگی کی دلالت کرتی نظمیں اور طعنوں سے بھری غزلیات پھلجھڑی جتنی عمر لے کر آتی ہیں۔ ستارے جیسے اوصاف کے لیے ریاضت کرنا ہوتی ہے۔''

''لکھو اور پھر اس کو بارہا پڑھو، تنقیدی نظر سے دیکھو، راتوں رات ناگن ایسی بل کھاتی نظمیں غزلیں جو چند دن رینگنے کے بعد بلوں میں جا گھسیں، قاری کے ساتھ ہی نہیں خود اپنی ذات کے ساتھ بددیانتی ہے۔''

برسوں بعد جب میں نے ہائڈل برگ میں اقبال کے نام کی سڑک دیکھی، دریا کے کنارے ایستادہ پتھر کی سِل پر اقبال کی نظم اور اس کا جرمن ترجمہ دیکھا، میونخ یونیورسٹی کی سیر کی تو مجھے رہ رہ کر اباجی اور چچا جان کی وہ تمام باتیں یاد آتی رہیں۔ اپنی زبان و ادب کی مزید بہتری کے بجائے جو بہتر ہمارے پاس ہے ہم اس کو بھی منہدم کرنے کا سوچتے ہیں۔ آج کا یورپ نجانے کتنے دانشوروں سے بھرا پڑا ہے لیکن آج تک ان کے نام کی گونج یورپی ادب اور معاشرے میں سنائی نہیں دی۔ عصرِ حاضر کے جو حالات ہیں اور انتہا پسندی کا منہ زور ریلا جس پر مسلمانوں اور پاکستانیوں کا نام لکھ دیا گیا ہے، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے خود اپنے تشخص، زبان، ادب اور ادبی سرمائے کی تضحیک کے بجائے ان میں سے منتخب کر کے وہ دانش بھرے ادب پاروں کے تراجم اور تقابل کی ضرورت ہے جو آج کی نوجوان نسل کو رک کر ایک مرتبہ پھر سوچنے پر مجبور کرے کہ اردو زبان میں آدمیت اور انسانیت کے درس عرصہ دراز قبل بیان کر دیے گئے تھے لیکن سیاست اور عداوت کی اندھی لاٹھی کو مجنونانہ انداز میں گردش نہ دی جائے تو ادب کا یہ مدفون خزانہ نئی نسل تک منتقل ہو جاتا۔

اس زمانے میں 1962 تک برطانیہ میں اردو لکھنے اور چھاپنے کی کوئی سہولت نہیں تھی۔ ایک بے حد ابتدائی اخبار ''وطن'' کے نام سے نکالتے۔ ہاتھ سے لکھ کر پورا اخبار ترتیب دیا جاتا اور پھر اسے فوٹو کاپی بنا کر چند شائقین تک پہنچایا جاتا۔ مجھے تاعمر اس بات کا قلق رہے گا کہ اس اخبار کی ایک کاپی میرے پاس موجود تھی جو گھر کی آتشزدگی کی نذر ہوگئی۔ اس میں چچا جان کے ہاتھ سے لکھا مضمون ''حمیت جس کو کہتے ہیں گئی تیمور کے گھر سے'' شامل تھا۔ میں ابھی سکول جاتی تھی کہ چچا جان کا ایک مضمون پاکستان کے کسی اخبار میں شائع ہوا ''بیرون ممالک میں مقیم پاکستانی وطن میں رہنے

والوں سے زیادہ پاکستانی ہیں''۔

مضمون کیا تھا، ساٹھ کی دہائی سے برطانیہ نقل مکانی کرنے والوں کی حالتِ زار کا تذکرہ دردمندانہ انداز میں کرتے ہوئے لکھا کہ ولایت میں رہنے والے اپنی قومیت کے تشخص سے زیادہ بہتر طور پر آگاہ ہیں اور ان کی زندگی کمانے اور پیسہ پیچھے بھیجنے کے بکھیڑے میں گزر جاتی ہے۔ اجنبی زمین، موسم اور زبان میں رہتے اور پیسہ کمانے کی دھن میں دیس کے درختوں کی چھاؤں اور سرسوں کے ساگ مکئی کی روٹی اور لسی کے پیالے کو یاد کرتے ولایتی نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ ابا جی اپنے بھائی کے مضمون والا اخبار سینے سے لگائے پھرتے رہے۔ ہم سب کو وہ مضمون پڑھایا گیا۔ امی جی گلوگیر ہوگئیں۔ ان کا معصوم دیور بھائی موئے فرنگیوں کے یخ بستہ ملک میں اپنی زبان اور وطن کی ہواؤں کو ترس گیا ہے۔

چچا جان نے گارڈن کالج اور پنجاب یونیورسٹی سے اپنے بہترین تعلیمی ریکارڈ اور طلائی تمغے کے ساتھ تعلیم و تدریس کے دشت کی سیاحی کی اور جب ملازمت چھوڑنے کا وقت آیا تو وہی بچپن کے عشق کے بند ٹوٹے۔ سیلِ بے کنار نے مجبور کیا کہ اب شام ہوئی آوارہ غزالو، آؤ اب اپنے بن کو چلیں۔ چچا جان بھی خوابوں کی کٹی پتنگ کے پیچھے بھاگتے بچے کی طرح واپس پاکستان رہنے کا خواب پورا کرنے چل دیے۔ میری پاکستان میں ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے استفسار کیا کہ

''پیر و مرشد، یہ کیا ہوا کہ ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا...'' کہنے لگے ''بس بہت کاٹ لیا کالا پانی۔ میں یہاں بہت خوش ہوں۔ بند بکسے میں واپس آنے کے خیال سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ اب صبح سویرے لالہ جی کی زیارت کرتا ہوں۔ فجر کی نماز میں ہم تینوں بھائی کندھے جوڑ کر پہلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ عصر کی چائے آپا کے ہاتھ کی پیتے ہیں۔ آپا آج بھی چالیس سال پہلے کی طرح پیار بھری جھڑکیاں دے سکتی ہیں۔ مجھ سے پہلے اخبار پڑھنے کی ضد کرسکتی ہیں اور میرے بچوں سے اردو پنجابی میں بات کرسکتی ہیں۔ اور کیا لگژری چاہیے۔'' میں حیران ہوکر ان کے سادہ اور معصوم خوابوں کو گنتی رہی۔ پھر مزے سے پنجابی شعر سناتے،

اپنڑا گراں ہووے
پپلاں دی چھاں ہووے

ویسے اس کا ایک اور ورژن بھی ہے، چچا جان نے میری دلچسپی دیکھتے ہوئے کہا۔

آپنڑاں گراں ہووے، توتاں دی چھاں ہووے،

وانڑ دی اک منجھی ہووے، سر تھلے بانہہ ہووے۔
(اپنا گاؤں ہو، شہتوت کی چھاؤں ہو، بان کی بنی چارپائی ہو، سر کے نیچے بازو ہو۔)
مجھے ہنسی آ گئی، ''کیا تمثیل نگاری ہے چچا جان، لیجیے اب ایک ورژن میرا بھی سماعت فرمائیے:

اپنڑا گراں ہووے — اپنا گاؤں ہو
پپلاں دی چھاں ہووے — پیپل کی چھاؤں ہو
منجھی تھلے کتا ہووے — چارپائی کے نیچے کتا ہو
پئی ہوئی پاں ہووے، — جسے خارش پڑی ہوئی ہو
کوٹھے اُوتے کاں ہووے — چھت پر کوا ہو
پینڈواں دا ناں ہووے — دیہاتیوں کا نام مشہور ہو
سجے اک سراں ہووے — دائیں جانب ایک سرائے ہو
کھبے اک چناں ہووے — بائیں جانب چناب ہو
وچو وچ جہلماں دے — اس کے عین درمیان جہلم کے
پانڑیاں دا ناں ہووے — پانیوں کی شہرت ہو''

میں نے کچھ سنی سنائی اور کچھ اپنی تک بندی شروع کر دی۔ چچا جان نے حسبِ عادت اپنی آپا کو آواز دی، ''آپاااا۔۔ یہ لڑکی مجھے پینڈو کہتی ہے۔''

''ہاں۔۔۔ اور سر چڑھاؤ میم صاب کو'' امی جی نے بھی وہیں سے جواب دیا۔

چچا جان نے عالی شان لائبریری بنائی۔ لوگوں کو رضا کارانہ طور پر انگریزی اور برطانیہ کی تعلیم و ثقافت اور جغرافیہ پڑھانے پر جت گئے۔ مجھے تب ہی احساس ہو گیا کہ تعمیری اور بنیادی طور پر ہم سب کہیں نہ کہیں شدید پینڈو ہیں۔ ایسے ہی چند خوابوں کی ریت گھڑی میری مٹھی میں بھی مضبوطی سے بند ہے: واپس وطن جا کر ایک بہترین یونیورسٹی کی بنیاد رکھنا۔ ڈاکٹر ساجدہ جو ڈنمارک کا ایک روشن ستارہ ہیں، جب پاکستان ایک شاندار ہسپتال بنانے کا خواب بنتیں تو میری یونیورسٹی کی دیواریں بھی بلند ہونے لگتیں۔ ہم وطن واپس لوٹنے والے اس میں رضا کارانہ پڑھایا کریں گے۔ ہمارے بچے اور نوجوان دنیا میں مثالی سٹوڈنٹس ہوں گے اور تحقیق کے لیے یورپ جایا کریں گے۔ ساجدہ تو ہسپتال بنانے لاہور نقل مکانی کر گئیں اور میں خواہشوں کے دھاگوں میں خوابوں کے موتی

پرونے میں مصروف ہوں۔

••

چچا جان اقبال کے فارسی اور اردو کلام، دونوں کے عاشق تھے۔ ہمیشہ کہا کرتے کہ اردو زبان کا وقار اور جاہ وحشمت اقبال کی نظموں میں ہے۔ شکوہ، طمطراق اور آبِ رواں کی طرح بہتی گنگناتی شستہ زباں ہے۔ پردیس میں اور کچھ نہ ملے تو بس صرف اقبال کی کتب لے جایئے، یہی رابطہ کافی ہے۔ فارسی شاعری پر انھیں بے پناہ عبور تھا اور ایسے شستہ انداز میں اشعار پڑھتے کہ بس پھول چنتے اور گجرے پروتے جاؤ۔ گھنٹوں ان کے پاس بیٹھو لیکن وقت پر لگا کر اڑ جائے۔

جب 'زبانِ یارمن دانش' کا انتساب لکھا تو دل ایک عجیب نمکین پانی کے سیلاب سے زیرِ آب آ گیا۔ اپنے سب محسنین کے لیے نظم لکھی۔ ''جواہر سے بھرا زینہ'' بابا جان، تایا جان، ابا جی، میرے تینوں چچا اور ایک بے مثال تکریم سے چھلکتا ماحول بے غرض اور بے لوث محبت سے معمور فضا جہاں ہم جیسے سنگ ریزوں کو گوہرِ شہوار کرنے کی سعی مسلسل ہوتی رہتی۔

جواہر سے بھرا زینہ تو موجود تھا لیکن ان ہستیوں میں سے کوئی بھی کتاب کو ہاتھ میں لینے اور زلفِ محبوب کی طرح سنوارنے کے لیے یہاں موجود نہیں تھا۔ مجھے نکمی کہتے اور سمجھتے ہوئے جنوری کی ایک یخ بستہ صبح کو حسبِ معمول نماز کے بعد واپس آئے اور پھر دل کو منانے کے جتن کرتے اسی کے پیچھے ایسے راستوں پر چل پڑے جو صرف آگے جاتے ہیں واپس نہیں آتے۔

میں نے پہلی دفعہ امی جی کو زار و قطار آنسو بہاتے دیکھا، ''جاؤ شریف! ہر کام میں رائے لیتے اور ہر بات پر مشورہ کرتے تھے تم۔ کبھی اپنے لالہ جی سے اجازت لیے بغیر اسلام آباد تک نہیں جاتے تھے۔ یہ کیا کر دیا؟ اب کون آ کر کہے گا آپا اندر آ کے پہلاں میری گل سنو۔''

چاچا جی نے اپنی پنشن کا بڑا حصہ نادار عورتوں اور بچوں کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ یہ جنون سب بھائیوں میں یکساں تھا۔ معاشرے کے کمزور افراد کو تعلیم دی جائے اور جہالت، غربت اور بے بسی کی تنگ و تاریک گلیوں سے نکال کر اقتصادی خود انحصاری کی روشن شاہراہ کی طرف لے کر جایا جائے۔ ہمیں ان عورتوں اور بچوں کو مالی امداد بہم پہنچا کر گداگر پیدا کرنے کے بجائے ایسے افراد کو ہنر اور علم سکھانا چاہیے تاکہ وہ اپنی اولاد کے لیے نافع ثابت ہو سکیں۔ چچا جان کی اچانک وفات کے بعد یہ خواتین امی جی کے پاس آتیں، ہائے مرزا صاحب نے تے کدے ساڈے چندے وچ دیر نہ ہون دتی، وقت پر چندہ ہمیں بھجوا دیتے۔ ہاتھ پھیلانے کی ضرورت ہی نہ پیش آتی۔

••

چچا جان سے یورپ میں میری ملاقات دسمبر انیس سو اٹھاسی میں ہوئی۔ پہلی پہلی سردیاں اور گھر سے نکل کر اتنی دور دراز کا پہلا پہلا سفر، چچا جان کو دیکھنے کی مسرت نے سارا آزار دھو دیا۔

''تم نے یونیورسٹی شروع کی؟'' ان کا پہلا سوال تھا

''نہیں چچا جان، ابھی تو نہیں''

''زبان سیکھنا شروع کی ہے یا نہیں؟'' دوسرا سوال آیا، ''تمھارے لیے زبان سیکھنا بڑا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔''

''نہیں چچا جان، ابھی تو کچھ بھی نہیں کر سکی'' اس وقت عالیہ کے آنے میں ابھی چار مہینے کی دیر تھی، میں نے آہستہ سے کہا

''چچا جان، آتے ہی طبیعت خراب ہو گئی۔'' میں نے مختصراً کہا

''اچھا'' خاموش ہو گئے ''لیکن یہ طبیعت کی خرابی زبان سیکھنے کے راستے میں تو روکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ یہ فطری دائرہ ہے بیماری نہیں''

''کسی بھی لائبریری سے آڈیو کیسٹ کورس لے آؤ۔ ہفتے میں ایک دن سکول ضرور نکلنا تاکہ دماغ بالکل ہی گھریلو ڈرامے دیکھنے والا نہ ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے چچا جان'' میں نے بظاہر بہت سعادت مندی سے کہا لیکن میرا دل چاہا کہ انھیں بتاؤں یہ میرے باپ کا گھر نہیں جہاں ہر روز کوئی کتاب پڑھنا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔

شام کو وہی رسمی سی گپ شپ ہوتی رہی۔ چچی جان کے پرسشِ احوال اور سوالوں کے محتاط جوابات دینے کی مہارت آزمانے میں رات ڈھل گئی۔

اگلے دن کہنے لگے ''آؤ میں تمھیں کچھ شاپنگ کرا کے لاتا ہوں۔'' ان کو کوئی بل بھی جمع کرانا تھا۔ میں چچا جان کے ساتھ باہر نکلی۔ کرسمس کے دن تھے۔ دکانیں جگمگا رہی تھیں۔ برقی قمقمے آتے جاتے لوگوں کو جیسے آنکھیں مارتے دکان میں آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ موسیقی فضا میں چکرا رہی تھی اور اس کی دھن جیسے بے فکرے لوگوں کی آوازوں میں مل کر لڈی ڈال رہی تھی۔ لوگوں کا خوب ہلہ گلہ اور بھیڑ تہوار کا سماں پیدا کر رہی تھی۔ پارکنگ سے دکان تک پہنچنے میں کچھ راستہ پیدل تھا۔ انھیں ایک سردار دوست مل گئے۔

''او وئی اپنڑے پروفیسر صاحب کدھر دیاں تیاریاں؟''

چچا جان نے بتایا کہ یہ میری بھتیجی ہے اور ابھی چند مہینے پہلے بیاہ کر ڈنمارک آئی ہے اور میرے پاس پہلی دفعہ آئی ہے۔

بڑی محبت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے، ''فیر تاں ساڈی وی بھتیجی ای آ،'' (پھر تو ہماری بھی بھتیجی ہی ہوئی)

وہ ساتھ ہی چل پڑے۔ چچا جان ایک دمکتی دکان کے سامنے رکے اور کہنے لگے کہ یہاں پہ کوئی چیز پسند کروا پنے لیے۔

اب مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی، ''چچا جان مجھے کچھ نہیں چاہیے'' حقیقت بھی یہی تھی کہ گھر میں رہنے والی زندگی میں کیا شوق ہو سکتے تھے۔

''نہیں کچھ تو پسند کرو'' اب کے سردار جی شروع ہو گئے۔

''لیہہ دھی دھیانی آئی آن پہلی وارو، کج تاں لیہہ کے جاؤ وو گی ناں،'' (پہلی مرتبہ بیٹی آئی ہے کچھ تو لے کر جانا ہے ناں۔)

ایک دکان میں گئے۔ وہاں پر ایک چھوٹا سا گول گھومنے والا کھلونا تھا جس کا بٹن دبایا جاتا تو وہ گول گول گھومنے لگتا، ساتھ ہی موسیقی بھی نشر کرتا۔ میں نے کہا ''چچا جان یہی لے دیجیے۔''

''یہ کیا کرنا ہے؟ کوئی اچھی سی چیز لو'' سردار صاحب بولے۔

میں نے کہا ''نہیں مجھے یہی پسند ہے،'' اس کی پے منٹ کرتے ہوئے چچا جان اور سردار جی کا جھگڑا دیکھنے والا تھا

''پروفیسر سے پیسے مت لینا'' سردار صاحب نے کاؤنٹر پر کھڑی ایک خوبصورت سی لڑکی سے کہا،

''نہیں یہ سردار پیسے نہیں دے سکتا''، چچا جان نے نوٹ آگے بڑھایا۔

جواب میں وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ میرے لیے یہ ساری چیزیں بے حد دلچسپ تھی۔

سردار جی نے پورا بازو کھول کر کے چچا کے سینے پر سے گزار کر دوسرے کندھے پر رکھا اور دھکا دے کے کہنے لگے:

''ساڈی بھی تاں دھی آ'' (ہماری بھی تو بیٹی ہے) سردار جی نے دھکے سے وہ کھلونا میرے لیے پیک کروایا۔

میں کونے پر کھڑی ان دونوں کی محبت اور خوبصورت تکرار کو دیکھ کر ہنستی رہی اور کتنے

عرصے کی منجمد کرتی فضا میں مجھے محسوس ہوا کہ اپنائیت کی گرمی کیا ہوتی ہے۔ کسی بھی سردار کو ملنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ دراز قد، بارعب مونچھوں اور کالی پگڑی کے ساتھ وہ چچا جان ہی کے ہم عمر ہوں گے۔ ان کے قریبی دوست تو نہیں بس شناسا تھے، لیکن اپنی تہذیب و ثقافت کا آنچل مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ پردیس میں ایک ہی خطے کے لوگ ویسے بھی ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔

واپسی کے راستے میں چچا جان نے شاید تہیہ کرلیا تھا کہ وہ مجھ سے کھل کر بات کریں گے۔

''میں تمھاری اتنی جلدی شادی اور باہر شادی کے خلاف تھا۔ مان لیا کہ لڑکی کی شادی کر دی جائے جب منہ سے بُوئے شِیر آتی ہو، لیکن لڑکے کا اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ضروری ہے۔ دو ایک جیسی عمر کے اور زیرِ تعلیم بچوں کی عمر صرف ایک دیرینہ دوست کے اس وعدے پر کر دی جائے کہ بچی کو جاتے ہی پڑھالیں گے، بہت بڑی غلطی ہے۔''

چچا جان شاید خود کلامی کر رہے تھے، ''رائیگانی، ایک مرتبہ پھر خاندان کے جانفشانی سے پڑھنے والے فرد کی رائیگانی، اک دفعہ پھر رائیگانی، جس گھرانے کی بچیوں کو پڑھنے کی اجازت نہ ہو وہ پڑھی لکھی بہو برداشت نہیں کرسکتا بالخصوص یہاں یورپ میں۔ زندگی خانوں میں منجمد ہے۔ کوئی انیس سوا کہتر سے باہر نکلنے کو تیار نہیں۔ برطانیہ میں تو خیر زبان انگریزی ہے، مزید تعلیم آسان ہوگی۔ تمھارا تو سارا کلچر زبان سب نیا ہے۔ تم کیا پڑھوگی؟ تم دونوں میں سے کوئی ایک ہی پڑھ سکتا ہے۔ دوسرے کو رک کر اپنی تمام تر توانائی اور صلاحیت اسی ایک کو دینا ہوگی۔ ککر تے انگور۔ لالہ جی نے تو واقعی ککر تے انگور چڑھا دیا۔''

میں کچھ پریشان اور کچھ خائف ہوکر ان کی خود کلامی یا شاید پیشگوئی سن رہی تھی۔ اور تقدیر کا نادیدہ ہاتھ اس پر مہرِ تصدیق ثبت کیے جا رہا تھا۔ ہم دونوں کی سماعتیں بہری نہ ہوتیں تو ہم جابر بوڑھے کو ہنستے ہوئے اور پیشین گوئی کرتے ہوئے بھی سن لیتے۔

''اب اگلے کئی سال تمھیں کتابوں کے کاغذ سے ہوائی جہاز بنانا ہوں گے، شاعری کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر، ہاتھ پشت پر باندھ کر ایثار کے کنوئیں میں پھینکنا ہوگا، اور تمھارے بدن کے چیستان میں ضبط کی کٹاری صرف زخم اگائے گی، بس جراحت، مزید جراحت، مزید جراحت۔''

میں نے خاموشی سے گود میں رکھا کھلونا مضبوطی سے پکڑلیا، ڈنگ ڈونگ، ڈنگ ڈونگ۔

برطانیہ کی ایک خاموش چھوٹی سی سڑک کے کنارے کھڑی ایک چھوٹی سی کار ماں کی آغوش بن گئی اور چچا جان میری راز دار سہیلی۔ اس دن مجھے پہلی مرتبہ علم ہوا کہ ہماری چچی ہمارے

تایا جان کو ابا جی کہتی ہیں تو چچا جان کی بھتیجی ہوئیں، لیکن بھتیجی سے شادی؟ پہلے کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا، کبھی گھر میں بات ہوئی نہ کوئی تذکرہ، یہ کیا ماجرا ہے؟

''لالا جی نے ایک بیوہ سے شادی کی تھی، آپ کی چچی ان کے ساتھ آئی تھیں۔'' چچا جان نے بڑی سہولت سے انکشاف کیا۔ شائیں شائیں، میرے دائیں بائیں گزرنے والی ہوا سیٹیاں بجانے لگی۔

''اچھا'' میں نے بمشکل کہا۔ چچا جان کی شادی میری پیدائش سے پہلے ہو چکی تھی۔ میں گود میں رکھے کھلونے کو گھمانے لگی۔

''آپ کی تائی جان بابا جان کی بیگم کی بھانجی تھیں، بیوہ تھیں، دو بچے تھے، انھوں نے یہ رشتہ کروا دیا۔''

چھم سے میرے ذہن میں تایا جان کا وجیہہ و شکیل سراپا ابھرا، کشمیری رنگ و روپ، دراز قد اور پٹیالہ طبیہ کالج سے فارغ التحصیل، فاضلِ علومِ شرقیہ، شاعرانہ ذہن و تخیل کے مالک حسنِ یوسف کے مالک میرے تایا جان۔

''تو'' میں نے بحرِ حیرت کے غوطے کھاتے کھاتے خود کو سنبھالا، لیکن میری سانس کے رستے میں حیرانی بھر چکی تھی۔ ''تایا جان رضا مند ہو گئے؟''

''اس زمانے میں بڑے ہی فیصلہ کرتے تھے لڑکی'' چچا جان بولے، میرے ذہن میں تایا جان کے الفاظ گونجنے لگے،

''لالہ جی نے مجھے اس مقام تک پہنچایا، پڑھایا لکھایا، زندگی گزارنے کا قرینہ سکھایا۔''

تو گویا اب احسانات کی قیمت چکانے کا وقت تھا؟ میرا کہانی کار ذہن ایک ساعت کا ہاتھ تھامے ایک فیصلے کی گواہی دینے لگا۔ الاحسان یقطع اللسان۔ واقعی احسان زبان کو کاٹ کر ہی رکھ دیتا ہوگا۔

میرے تخیل میں تائی جان کا حسین چہرہ مسکرانے لگا۔ ترچھی مانگ والے گھنگھریالے بال اور شدید حسن۔ جب وہ ہنستیں تو ان کی آنکھوں کے گرد جھریاں پڑتیں جو حسن کی شدت میں اضافہ کرتیں۔ خوبصورت پاندان پہلو میں لیے پھرتیں جس میں سے چھالیہ چرا کر کھانا میرا مشغلہ تھا۔

ان کے بے حد گورے ہاتھ کیسی نفاست سے بڑے بڑے آلو بیضوی رخ پر کاٹتے، پھر گوشت آلو کی دیگ نما ہنڈیا پکتی جس میں ان ہاتھوں کی خوشبو شامل ہوتی۔ جو گھر میں آتا اسے اپنے مدھر دھیمے سے لہجے میں کہتیں، ''روٹی کھا کے جائیو۔'' سرائے عالمگیر کا نذیر بیگم میموریل ہسپتال

ہماری تائی جان ہی کے نام پر ہے۔ ان کا کردار ہمیشہ کے لیے زندہ ہوگیا۔

تائی جان کے متعلق سوچتے سوچتے میرا دھیان اپنے عظیم تایا جان کی طرف چلا گیا۔ ایک گاؤں کے چھوٹے سے گھر میں بیٹھے اپنی زندگی کا فیصلہ سنتے تایا جان، ایجاب وقبول کرتے اور پھر اس رشتے کو نبھاتے، اس معاشرے سے ٹکر لے کر ایک بچی کو پڑھاتے، زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتے تایا جان، ہماری تائی جان سے حسنِ سلوک کرتے، ان کی بہنوں کی مہمان نوازی کرتے، ان کے بھائیوں کی مدارات کرتے تایا جان، عرفان بھائی کی دیکھا دیکھی میں بھی ان کو ماموں کہتی اور خالہ پکارتی، ان کی آمد پر امی جی کی دعوت بھی شامل ہوتی۔

یہ ہمارے بزرگ کس قدر فراڈ ہیں، کیسے اندھیرے میں رکھا نئی نسل کو، اور میری ماں کو دیکھو، سسرالیوں کی وفادار اور لائلٹی نبھاتی عورت، اولاد کو سب کے احترام کے عملی سبق دیتیں اور ہماری تائی جان کو مامی جان پکارتی، ہر معاملے میں ان کے پاس جا کر ہدایات لینے والی ہماری امی، ''سب مافیا ہے چچا جان، اور آپ کی شادی؟ کیا یہ بھی قربانی کا حصہ تھی؟'' میں نے دیرینہ راز دار سہیلی کی طرح پوچھا۔

''مجھے لالہ جی نے بلایا اور فیصلہ سنایا کہ ان کی بیٹی سے میرا عقد پڑھایا جانا ہے۔''

وہ سہولت سے بولے جیسے کسی دوسرے کی کہانی سنا رہے ہوں۔

''اچھا،'' میں ان کے سرخ و سپید چہرے پر ایک قصہ گو کو تلاشنے لگی جو کسی الاؤ کے گرد بیٹھا لب و لہجے کے اتار چڑھاؤ سے سامعین کی نبضوں کی رفتار اور سانسوں کا اتار چڑھاؤ اپنی گرفت میں رکھے ہوئے تھا۔ اس الاؤ کی آنچ مجھ تک پہنچنے لگی۔ میرے تخیل میں چنگاریاں اڑنے لگیں۔ لالہ جی کے حکم پر الف لیلوی داستانوں کا راہ بھولا شہزادہ ایک محل کے تہہ خانے میں کھڑا اپنے پیروں کے گرد خود رسیاں لپیٹ رہا تھا۔ اب ساری عمر اسے ان رسیوں میں مزید گرہیں لگانا تھیں کیونکہ اس کی کمر پر احسانات کا بوڑھا سوار تھا۔

''تو آپ مان گئے؟'' اسی تہہ خانے پر چپکی جادوئی مکھی کی طرح میں گواہ بن گئی۔

قریب ہی کسی گرجا نے گھنٹیاں بجائیں اور ٹن ٹن کی صدائیں یہاں وہاں پھیل گئیں، شاید اس خاموش نکڑ پر کھڑی گاڑی میں بھی آ دبکیں۔

''دبے لفظوں کہا تھا کہ میری منزل دور ہے۔ میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ میں ابھی کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ میرے ارادے اور ولولے ابھی یہ بارِ گراں اٹھانے کو تیار نہیں۔ مرد کو ذہنی، جذباتی اور

اقتصادی طور پر اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ وہ اپنے خوابوں کی تکمیل کے بعد کسی اور کے خواب بھی پورے کر سکے۔ لالہ جی نہ مانے۔ کہنے لگے اسی پھیرے میں نکاح ہوگا۔''

''اور آپ کی آپا؟ وہ کچھ نہیں بولیں؟''

''نہیں۔ آپا نے کہا ٹھیک ہے، درست کہتے ہیں، خاندان جڑا رہے گا۔'' مجھے یاد آیا کہ میرے بچپن میں چچا جان ایک دفعہ سب کو پاکستان چھوڑ گئے تھے کیونکہ انھیں کچھ اعلیٰ امتحانات دینا تھے۔ وہ لکھنا چاہتے تھے، اخبارات و رسائل نکالنا چاہتے تھے، اقبال کے تراجم کرنا چاہتے تھے، دنیا گھومنے کی تمنا بھی سینے میں گھر بنائے بیٹھی تھی۔

شہزادہ تمام عمر اپنی رسیوں کی ترتیب بدلتا رہا، کبھی مکرامے کی صورت جھولا، کبھی جہاز، کبھی پرندہ، کبھی سیڑھی پرواز کے استعاروں سے اڑنے کی کاوشیں اور آزادیِ پرواز کے خواب ہی اس کی دسترس میں تھے۔

چچا جان نے چابی اگنیشن میں گھمائی، ''کم از کم لالہ جی کو وعدوں کے جادو پر یقین نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مانا یہاں تعلیم مفت ہے لیکن تم ایک مشترکہ خاندانی نظام میں ہو، اور چند مہینے بعد ایک بڑی ذمہ داری، ماں بننا کوئی آسان قدم نہیں۔ آپ کی چچی بتا رہی تھیں کہ بچے کی آمد کے مہینے بعد ہی اس پھوپھی بھی پیدا ہوگی۔ باپ ابھی یونیورسٹی کے ابتدائی سالوں میں ہے۔'' چچا جان جیسے خود سے بولے۔ ''لالہ جی یہ کیا کر دیا۔ وہ بُوئے بشیر، کیکر تے انگور چڑھایا۔''

مجھے چچا جان کے ردِعمل اور خود کلامی سے پریشانی ہونے لگی...

''ابا جی کو کچھ نہ کہیں۔ ان کو یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ میں پڑھنے پڑھانے والی زندگی سے نکل کر پھر پڑھائی شروع کرلوں گی۔ یہاں پر تو اس کے اخراجات ہیں ہی نہیں۔ ابا جی نے کچھ نہیں کیا چچا جان۔''

''اچھا، لیکن تمھیں لائبریری سے کورس لا کر پڑھنے کی اجازت تو ہوگی ہی؟ بس وہ لا کر خود محنت شروع کر دو۔ لیکن مجھے لگتا نہیں تم یہ کر پاؤ گی۔ تمھاری تو پرسنیلٹی بدل گئی ہے۔''

چچا جان نے ایسے تاسف سے کہا جیسے میری وفات ہوگئی ہو۔

''گھر چلیے چچا جان،'' میں نے گاڑی کی سکرین پر وقت دیکھا۔ ''آپ نے آج مجھے بہت شاک دیے ہیں'' میں نے انھیں ہنسانے کی کوشش کی۔

''نہیں لڑکی، تمھارا دیا ہوا شاک زیادہ بڑا ہے، رائیگانی سے بڑا نقصان کوئی نہیں ہوسکتا۔''

چچا جان نے گاڑی سٹارٹ کی۔ ہم دونوں کے ذہن میں شاید اپنی اپنی داستان گونج رہی تھی۔

••

وہ دسمبر میں کرسمس کی ایک یخ بستہ شام تھی۔ میں بچوں میں گھری نانی اماں بنی انھیں کہانیاں سنا رہی تھی۔ بجلی بجھا کر ہم نے موم بتیاں جلا رکھی تھیں۔ بچوں کے چچا زاد بہن بھائی اور پھوپھو کا بیٹا میرے دائیں بائیں بیٹھے آنکھیں پھاڑے کہانی سن رہے تھے کہ شہزادہ جنگل میں راستہ بھول گیا اور اس کو جنگل میں رہنے والی چڑیل نے قید کر دیا۔ اب میں نے چڑیل کے لب و لہجے میں کچھ مکالمے بولے:

''میں تمھیں کھا جاؤں گی، ہاہاہا، اور تمھاری ہڈیوں کا ہار ادھر سامنے دیوار پر لٹکاؤں گی۔''

بچوں کی گردنیں دیوار کی جانب گھومیں، پھر تجسس سے بھری میرے چہرے پر آرکیں۔ اتنے میں اینٹی کلائمکس کی طرح ان کی مائیں اندر داخل ہوئیں۔ بچوں کے دادا کی طبیعت سخت خراب ہوگئی۔ گھر میں ہم بچوں کے ساتھ اکیلے تھے۔ میں قصہ خوانی کی مسند سے نیچے اتری، ہسپتال فون کیا۔ انھوں نے کہا فوراً ہسپتال پہنچا دیں۔ ایمبولنس کے گھر پہنچنے کا وقت بچا لیں۔

اب سوال اٹھا کون ڈرائیو کرے۔ بچوں کی چچی کو بچوں کے پاس رہنا تھا۔ وہ چاروں بہن بھائی اور پھر دو میرے بچے ان کو سنبھالنا تھے۔ پھوپھو والد کو اس حالت میں دیکھ کر گاڑی کیسے چلائیں؟ میں نے فوری طور پر اٹھ کر برفباری والے جوتے اور کوٹ پہنا۔ اس طوفانی رات میں گاڑی کیسے چلائی، وہ ایک الگ داستان ہے۔ سڑکوں پر ہو کا عالم تھا۔ دائیں بائیں اطراف میں سڑکوں سے ہٹائی گئی برف کے تودے گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے۔ گاڑی کی ونڈو سکرین پر مسلسل گرتی برف یوں پڑتی جیسے کوئی اُون کے گالوں کا ٹوکرا اُلٹ دے۔ وائپر تیزی سے ان کو ہٹاتے۔ میں چالیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار کم کر کے رینگنے والی رفتار پر لے آئی۔ برف کے لشکر سے جنگ کشی جاری تھی۔ نہ وہ پسپائی پر تیار نہ میرے پاس رکنے کی گنجائش۔ شاید اس رات کے خوف، احساسِ ذمہ داری اور اندیشوں کو میرا قلم بیان کرنے سے قاصر ہے۔

جنگل میں بھٹکتے شہزادے اور برف کے طوفان سے نبرد آزما، برف کی بلاؤں کے چنگھاڑنے پر خوف زدہ ڈرائیور میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ شہزادہ ہیرو تھا۔ اس کے بچ نکلنے کا یقین تھا لیکن عام انسان کی داستان میں کامیابی کی نوید موجود نہیں ہوتی۔ ان دنوں موبائل نامی طلسماتی ایجاد موجود نہیں تھی۔ کوئی گوگل میپ نہیں، ہسپتال سے رابطہ نہیں۔ بس برف کی بوچھاڑ سے

نبرد آزما بالآخر ہم ہسپتال پہنچے۔ اندر ہی اندر لرزتی کانپتی، آیات کا ورد کرتی، تسلیاں دیتی میں گلوسٹرپ ہسپتال کے بیرونی دروازے پر پہنچی۔ سامنے سٹریچر لیے وارڈ کا عملہ موجود تھا۔ انھوں نے فوراً سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''تم اندر چلو اور کافی پیو'' ان میں ایک بولا۔

سکون کا بے پناہ احساس تو ہوا لیکن حوصلے کی وہ زرہ بکتر جو میں نے اوپر چڑھا رکھی تھی تارتار ہو چکی تھی۔ دروازے کے عین سامنے نجانے کیا ہوا، دروازہ تو مجھے دکھائی دیا لیکن پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ میری آنکھیں ہلکی سی بھنبھناہٹ سے کھلیں۔ میرے دائیں بائیں سفید لباس میں ملبوس شاید فرشتے تھے۔ یقیناً میں عالمِ بالا میں ہوں۔ ایک دم مجھے سب یاد آ گیا۔

میں جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھی۔ میری ناک میں نجانے کیا تھا کہ سانس آنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں نے چہرے پر ہاتھ لگایا۔ میری ناک اور گال پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ہراساں ہو کر میں نے اپنا جائزہ لیا۔ کپڑوں پر شاید خون لگا تھا۔ میں نے ہسپتال کا سفید جامہ سا پہن رکھا تھا جو نجانے کب مجھے پہنایا گیا۔ ایک نرس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''شکر ہے۔ تمھارا سکیورٹی نمبر کیا ہے؟'' اس نے میرے ماتھے کو چھوا۔

میں نے فرفر ہندسے دوہرائے۔

''تمھارا نام کیا ہے؟'' میں نے فوراً بتایا۔

پھر مجھے گرم گرم کافی دی گئی۔ میرے سامنے کرسمس کا چاکلیٹ اور بسکٹ رکھے گئے۔ بالآخر ڈاکٹر آیا۔ کرسمس کی وجہ سے عملہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

''اچھی خبر یہ ہے کہ ناک کی ہڈی نہیں ٹوٹی'' وہ مسکرایا۔ پھر میری ناک کے اوپر رکھی ناک نما پٹی کو چھو کر بولا۔

''تمھارے والد بالکل ٹھیک ہیں۔ ہارٹ اٹیک نہیں تھا، بس درد تھا۔ باقی چیک اپ کل ہوگا۔''

''میرے سسر ہیں'' بعد میں میں نے مشکل سے کہا۔

ناک، کان اور گلے میں درد کے بول آئے ہوئے تھے۔ اگرچہ ہاتھ پر لگی ڈرپ سے درد کش دوا دی جا رہی تھی۔ لیکن نجانے کیوں مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''اچھا...... لیکن جس قدر تم گھبرائی ہوئی تھی، ہم نے کاغذات میں تمھارے والد ہی لکھا، بدل دیتے ہیں۔''

میں نے شاید اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بڑے سکون سے سر تھوڑا سا آگے کر کے بولا ۔
''ایک مہربانی کرنا، آئندہ کسی مریض کو ہسپتال تک پہنچانے کی زحمت نہ کرنا۔ مریض تو شاید بچ جائے گا، تم ڈاکٹروں کے لیے مسئلہ بن جاؤ گی۔''
مجھے شدید درد کے باوجود ہنسی آ گئی ۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا، پھر خود بھی مسکرایا۔
''آپ گھومتے ہوئے دروازے سے ٹکرا کر گر گئی تھیں اور خون بند نہیں ہو رہا تھا۔ ناک کی ہڈی تو نجانے کیسے بچ گئی لیکن ہلکی سی ٹیڑھی ہو گئی ہے اور خون کی نالیاں شدید متاثر ہیں۔''
کہنی اور بازو ٹوٹنے کے بعد ٹوٹ پھوٹ کا یہ دوسرا درد تھا جو کہنی اور بازو سے شدید تر اور ناقابلِ برداشت تھا۔ مجھے گھر پہنچایا گیا تو بچے میرا سوجا ہوا چہرہ دیکھ شدید خوفزدہ ہوئے۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ناک پر مسلسل برف رکھنا تھی۔ ہائے یہ منحوس برف پہلے وائپر مار مار کر اسے ہٹایا گیا اور خود اسی مسیحا برف کو ناک کی چوٹی پر لگانے کے جتن کرنا تھے۔ اُسامہ میرا ہاتھ تھامے بہادر بنا رہا۔ اس کا ہمزاد چچا زاد بھائی شعیب سامنے بیٹھا ''بلیاں'' بناتا رہا۔ اس کا ننھا سا دہانہ پہلے لرزتا رہا۔ پھر ناک دائیں بائیں گھومتی رہی۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔
''تائی جان آپ کو برف نے مارا ہے؟''
''رونا بند کرو۔'' اُسامہ نے اسے جھڑکا...... ''میری امی بہت بہادر ہیں۔'' اس نے زبردستی میرے منہ میں مونگ پھلی کے دانے ڈالے۔
چند دن مکمل آرام کرتے گزرے۔ ایک دن اٹھ کر میں نے ای میل کھولی۔ میرے بھائی کی ای میل ایک اور ناگہانی خبر لیے ہوئے تھی۔ چچا جان شریف اچانک دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئے۔ میری ناک کا درد دل تک جا پہنچا۔ کرسی سے اٹھ کر بستر تک پہنچنا محال ہو گیا۔ ہفتے بعد میں پاکستان آئی۔ ایک دن دوپہر کو چھت پر دھوپ میں بیٹھے ابا جی نے پوچھا۔
''لیکن یہ ناک کی چوٹ کھڑکی سے ٹکرانے کی نہیں ہے۔ وہ تو معمولی ہوتی ہے، کچن میں تم سپیڈ سے بھاگ رہی تھیں جو اچانک کھڑکی سامنے آ گئی۔''
انھوں نے میری سوجی ہوئی نیلی ناک کو دیکھا۔ ''چوٹ تازہ بھی نہیں ہے۔ نیل اطراف سے کم ہو رہے ہیں۔ جب یہ چوٹ لگی ہو گی تو شدت اور اثرات اور زیادہ ہوں گے۔''
امی جی پاس بیٹھی مالٹے چھیل چھیل کر رکھ رہی تھیں۔
''دو پوٹے جیڈی نک اے تیری، وچ کیویں گئی الماری نوں'' (تمھاری ناک تو دو پوٹا

لمبی ہے۔ الماری سے کیسے جا ٹکرائی؟)۔

اگلے دن ابا جی نے کوئی لیپ نما چیز میری ناک کی پھننگ پر رکھی۔ پھر کپڑے کی پٹی لگا کر اسے جمایا۔ ''یا اللہ اگر میرے منہ پر یہ ناک لگا ہی دی تھی تو اس کی جان پر کیوں بن آئی۔''

••

میری زندگی کا ارمان ہی رہا کہ چچا جان میرے پاس ڈنمارک آتے اور ہم پہروں لمبی لامتناہی باتیں کرتے۔ میں ان کو اپنا سمندر دکھاتی اور ان سے ابا جی کی امی جی کی باتیں سنتی۔ وہ میرے لیے اردو فارسی اور عربی کے چمن زاروں سے چن چن کر گلدستے سجاتے اور مشامِ جاں معطر ہوتی۔ لیکن پردیس رہنے کی جوسب سے بڑی قیمت میں نے چکائی وہ چچا جان کے علمی و ادبی سلسبیل کے باوجود تشنگی تھی۔ اردو زبان سے دوری اور ڈینش زبان و ادب کے چیلنج کو قبول کرنے کے تقاضے تھے۔ بچوں کی ذمہ داری اور نیند میں بھی فرائض کی ادائیگی کی فکرمندی تھی۔ زندگی کے بہترین سال انہی کاموں سے نمٹنے میں گزر گئے۔

••

چچا جان ایک عزیز دوست کی طرح دو طرفہ مکالمے اور آموزش کے قائل تھے۔ مجھے ہمیشہ کہتے کہ ''ڈینش زبان و ادب پر توجہ دو۔ اس میدان میں کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا۔ کوئی براہِ راست تراجم نہیں۔ کیوں نہیں سوچتی ہو اس جہت میں؟'' میں ہمیشہ کی طرح بچوں کی مصروفیات کو جواز بناتی اور ہمیشہ جواب ملتا، ''دلنگڑے بہانے، سستی تاویلات۔ ضائع کر دیا تم نے خود کو لڑکی۔ نکمی ہی نکلیں تم۔ بس بیماری اور بچے پالو۔ چلو جی چھٹی ہوئی'' وہ مایوسی سے کہتے۔

میں نے کہا، ''میرا خواب ہے کہ بچے بڑے ہو گئے تو یہاں آ کر ایک بڑی یونیورسٹی قائم کریں گے۔ دریائے جہلم کے کنارے، ملٹری کالج کی طرح میری یونیورسٹی بھی یہاں کی شناخت ہو جہاں لائق ترین طلبہ و طالبات مفت پڑھیں۔''

کہنے لگے، ''چھوڑو جی، کون جیتا ہے۔ ہم جہاں بوریا ڈال کر بیٹھ گئے وہیں یونیورسٹی ہے۔ تم پہلے اپنے بچے پڑھاؤ۔ وہی پہلا فریضہ ہے۔''

میں کبھی جہلم کے کنارے ٹیولپ دیکھتی ہوں تو میرے ذہن میں ایک عالیشان مادرِ علمی کے دروازے کھلنے اور بند ہونے لگتے ہیں۔

••

میری نبضوں میں تیرے پاؤں کی آہٹ گونجی

میری زندگی میں عالیہ کی آمد صحرا میں بادِ نسیم کے جھونکے کی سی ہی تھی۔ ایک درس و تدریس سے وابستہ، متحرک زندگی سے اٹھ کر ڈنمارک کی سرد اور منجمد فضا میں نئی زندگی، نئی معاشرت، نئی زبان میں پہنچ کر مجھے اکثریوں ہی محسوس ہوتا کہ پورے ننانوے کے خانے میں پہنچ کر مجھے کہیں سانپ نے ڈس لیا اور نیچے صفر کے خانے میں لا پہنچایا ہے۔ ہاتھ سے پانسے کی ڈبیہ اور چھکے مارتا ہوا دانہ کہیں بحرِ ظلمات میں جا گرا ہے۔ نہ رات کو ابا جی آ کر نشان زدہ کتاب سرہانے رکھتے کہ صبح تک پڑھ لینا، اس پر بات کریں گے۔ نہ ہی فجر کی اذان کے ساتھ ان کی کلمہ طیبہ کا ورد کرتی آواز سنائی دیتی۔ نہ امی جی کی صلواتیں، نہ کھانے پر مہمان، نہ عصر کے بعد تایا جی کی آمد، صرف ایک رشتے کی چھومنتر سے طلسمات کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔

ایسے میں عالیہ کی آمد نے مجھ پر ایک نئی دنیا کا دروازہ کھولا۔ میں اس کی چمکیلی آنکھوں میں زندگی کا نیا مقصد دیکھ سکتی تھی۔ اس کا ہمکنا، تتلانا، بولنا، لڑکھڑانا اور پھر زندگی کی تمام ناہمواریوں میں میرا ہاتھ تھامے رکھنا، ایک ناقابلِ یقین طاقت کا احساس تھا۔ اپنی ماں کی طرح میں نے بھی بچوں کو ناجائز لاڈ پیار کبھی نہیں دیا، بلاوجہ کی اہمیت، ان کی شخصیت کو مسخ کرتی بے جواز اختیارات کی آزادی دینا بچوں کے ساتھ ظلم سمجھا۔ لیکن آج مجھے اعتراف کرنا ہے کہ ابا جی کی کسی دعا کی بدولت مجھے ایک ایسی بیٹی ملی جسے ان کی طرح روپے پیسے، زیور، کپڑے، دکھاوے اور طمع سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ بچپن سے ہی اپنے حالات اور میری بیماری کی وجہ سے صابر اور دھیمے مزاج کی تھی۔ جس گھر میں وہ پیدا ہوئی وہاں بچوں کی بہتات رہی۔ وہ اپنی پیدائش سے عین مہینہ بعد پیدا ہونے والی پھوپی اور ڈیڑھ برس بعد پیدا ہونے والے ایک نئے چچا اور ساتھ رہنے والے چچا کی نومولود بیٹی

کے ساتھ زندگی کو شیئر کرنے کی عادی تھی۔

اپنے چچا کے چاروں بچوں کی وہ بے انتہا محبت کرنے والی آپا رہی۔ اپنے پھوپھوزاد بھائی کی پیار کرنے والی بہن تھی، اپنی عمر سے چھوٹے پھوپھی اور چچا کے ساتھ بقائے باہمی کے تحت بہت صلح جو انداز میں وقت گزارا اور اپنی ماں کی طرح اپنے چچا کی دیوانی تھی۔

امی جی اس کے لیے ہمیشہ دعا کرتی تھیں کہ بچیاں جس گھر میں جائیں ان کو جوڑ کر رکھیں، خاوندوں کو بھڑکانے والی نہ ہوں۔ شوہر کا ہاتھ تھام کر اس کی ذمہ داریاں اس وقت ادا کریں جب اس کو ضرورت ہو۔ جھڑے چھانٹ کے ساتھ تو سب چل پڑتے ہیں۔

امی جی عالیہ کو پاس بٹھا کر عجیب و غریب حکایات سنایا کرتیں جو انھوں نے مجھے کبھی نہ سنائیں، شاید اس لیے کہ میرے سامنے ان کا عملی نمونہ تھا۔ وہ نندوں کا میکے میں راج پاٹ بالکل برداشت نہیں کرتی تھیں۔ نندیں اپنے گھر اور اپنی سسرال کے محاذ پر جا کر سپہ سالاری کے جوہر دکھائیں۔ نئے خاندان کے دلوں کو رام کریں، مائیکے کو میدانِ جنگ نہ بنائیں۔ بھائیوں، بالخصوص شادی شدہ بھائیوں کے گھر میں دخل در معقولات سے پرہیز کریں۔ یہ اصول اور کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، میں نے اسے ہمیشہ پلّو سے باندھ کر رکھا۔

عالیہ نے بھی شاید امی جی سے سینہ بہ سینہ صلحِ کل اور انسانیت دوستی کے خلیات حاصل کر لیے۔ اس نے اپنی شادی شدہ زندگی کے پانچ برسوں میں کوئی شکوہ شکایت یا فرمائش نہیں کی۔ شادی کی تقریب کی تیاری میں اسے بڑی شادی اور مہنگے ملبوسات شدید ناپسند تھے۔ عروسی جوڑا بھی اس نے وہ پہنا جو اس کی ساس امی نے پسند کر کے پاکستان سے خریدا۔ میری بھابی اکثر مذاق کرتی ہیں کہ ''ساؤ'' بچی کیسے پیدا ہوگئی ایک جنگجو عورت کے بطن سے۔ تمھارے کپڑے اور دوپٹوں، لیسوں کا اب تک مسئلہ رہتا ہے اور عالیہ نے بڑے بڑے فنکشنز تمھاری پرانی ساڑھیوں اور لہنگوں میں بھگتا دیے۔

یہ باب اللہ کے حضور شکرانے، والدین کی دعاؤں اور اپنی بیٹی کی بے کنار اور بے لوث محبتوں کے نام ہے۔ اس کے وسیلے سے مجھے اللہ نے ایسے داماد بیٹے سے نوازا جس نے ہمیشہ میرا احترام کیا اور ایک دن بھی ایسا نہیں آیا کہ مجھے کسی بات پر خفیف سی بھی ناگواری کا موقع ملا ہو۔ میری دعاؤں میں مبین عارف سے پہلے اپنی بہن بشریٰ عارف کا نام آتا ہے جن کی محبت نے خیر سگالی کے وہ تمام سگنلز قبول کیے جو ان کی طرف بھیجے گئے۔ ایک روایت شکن شاعرہ کی غیر روایتی زندگی کو اور

خلوص کو سمجھا اور جوابی محبت عطا کی۔

انھیں مل کر مجھے ہمیشہ ابا جی کی یاد آتی ''بیٹا نیکی کی قدر نیک دل ہی کر سکتا ہے ورنہ یک طرفہ خدمت اور نیکی ویسے ہی واپس پلٹ آتی ہے۔ جن دلوں پر قفل لگے ہوں وہ نیکی کی قدر نہیں کر سکتے، وقعت سمجھ ہی نہیں سکتے۔'' مجھے اعزاز ہوا کہ ڈنمارک میں پہلے میرے بچوں کی چچی اور میری مثال دی جاتی تھی۔ اب لوگ ہم دونوں سمدھنوں سے پوچھتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے آپ لوگ ایک دوسرے سے اتنی چاہت اور احترام سے ملتے ہیں ورنہ تو سگی بہنیں سمدھنیں بن کر شریک بن جاتی ہیں۔

جواب یہی ہے کہ ''یہ سب تمھارا کرم ہے آقا کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے۔''

عالیہ عارف حسین تمھارا شکریہ کہ مجھے پلا پلایا جوان بیٹا، اور نئی نسل میں روشنی کی طرح پھیلتی آئمہ صوفیہ عارف کا تحفہ ملا۔ میری بیٹی میرے لیے سراسر رحمت ہے۔

••

میری بیٹی ابا جی کے بستر پر ایسے ہی چڑھ کر بیٹھتی جیسے کبھی بچپن میں مجھے عادت تھی۔ مجھے ابا جی فوراً سے پیشتر ٹوکا کرتے کہ خیمے کے اونٹ کی طرح ساری جگہ پر پسر گئی ہو، چلو کرسی پر بیٹھو، لیکن نواسی کو کبھی اف تک نہ کہتے۔ وہ ان کے سرہانے رکھی کتابوں کی ورق گردانی کرتی، پرانے پرزے تراشے کھنگالتی اور ان سے پرانی کہانیاں سنتی۔ جب گاؤں میں سب سے پہلے ابا جی کو سائیکل ملی تو اس وقت سائیکل آج کی گاڑی کی طرح تھا۔ ابا جی اسے چمکا کر رکھا کرتے تھے۔ جب ابا جی کے گاؤں دولت نگر میں سب سے پہلے بجلی آئی تو لوگ بجلی کے بٹن اور بلب کو کسی عجوبے کی طرح دیکھتے۔

''نانا ابو! آپ جس سکول میں پڑھتے تھے میں نے وہ بھی دیکھنا ہے'' نواسی صاحبہ نے فرمائش کی۔ پھر وہ اس بوڑھے برگد کو بھی دیکھ کر آئی جس کے نیچے ابا جی کھیلا کرتے تھے۔

''نانا ابو، جب مریض ایک ہی بات بار بار کرتے ہیں تو آپ تنگ نہیں پڑتے؟ کیسے ہینڈل کرتے ہیں ان کو؟'' وہ پوچھتی۔

ابا جی کی ایک مریضہ کو اپنی بیماریاں گنوانے اور اپنی کیفیت بیان کرنے کی عادت تھی۔ ایک شام کو گھر آئیں اور ابا جی کو کہنے لگیں۔ ''کج نہ پچھو۔ میری تے جان انج ہوگئی اے جیویں کسے نے نمبو نچوڑ دتا اے۔'' (کچھ نہ پوچھیں، میری تو جان ایسے ہوگئی ہے جیسے کسی نے لیموں نچوڑ کر رکھ دیا

ہو۔) مجھے اس کی تشبیہہ پر ہنسی آ گئی۔ واہ میرے مولا! کتنی بڑی مصنفہ ہوتی اگر اسے اپنی بیماریوں کا بیان لکھنا آتا۔ نجانے کتنی نئی نئی تشبیہات اور استعارات تخلیق کرتی۔ ہر مرتبہ ایک نئے انداز میں اپنی کم ہمتی بیان کرتی۔ ''لگدا اے جیویں کسے نے پتہ ملو کے رکھ دِتا ہووے'' (لگتا ہے جیسے کسی نے پتہ مسل کر رکھ دیا ہو۔) میں یہ باتیں سن سن کر تنگ آ گئی کہ یہ ''کسے'' کون ہے جس نے ان کی جانِ ناتواں پر اتنے ظلم کیے۔ ابا جی کو مشورہ دیا کہ ان سے کہیے کہ ''باہر و باہر'' دوا لے جایا کریں۔

••

''آذر کا پیشہ خارا تراشی کارِ خلیلاں خارا گدازی'' ابا جی اپنے بستر پر بیٹھے اپنا پسندیدہ شعر پڑھ رہے تھے۔ ہماری صاحبزادی ان کے پاس دبکی ہوئی تھی۔ ''جی نانا ابو، مجھے یہ شعر آتا ہے اور یہ زیرِ اضافی ہے'' اس نے لقمہ دیا۔ انھوں نے چونک کر اپنی بارہ سالہ نواسی کو دیکھا۔ غیر معمولی دراز بالوں کی لمبی سی چٹیا بنائے، گرمی سے بے حال اور نانا ابو کے احترام میں نانی کا سفید دوپٹہ سر پر اوڑھے بڑے مزے سے انھیں سنانے لگی۔

''نانا ابو، مجھے پنجابی کا وہ شعر بھی آتا ہے،

''مسجد ڈھا دے مندر ڈھا دے، تے ڈھا دے جو کج ڈھیندا''

اور وہ شعر بھی،

دل بدست آور کہ حجِ اکبر است

از ہزاراں کعبہ یک د بہتر است

اسے بھی ماں کی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ نانا ابو کے دل میں اترنے کا ذریعہ علم سے محبت ہی ہے۔ میں امی جان کے ساتھ ان رنگ برنگے سوٹوں پر جھگڑا کرنے اور ڈانٹ کھانے میں مصروف تھی جو انھوں نے نہ جانے کہاں کہاں سے منگوا رکھے تھے اور میں ان کو سمجھا نہیں پا رہی تھی کہ امی میرے لیے یہ پہننا بہت مشکل ہیں، وہاں ایسے کپڑے نہیں چلتے۔

اچانک ابا جی اپنے بستر سے اترے اور جوتا پہنے بغیر میرے پاس آ کر میرے سر اور ماتھے کو چوما۔ میں اس عنایتِ بے جا پر متحیر اور مسرور تو ہوئی لیکن پوچھے بغیر نہ رہ سکی کہ ہوا کیا ہے۔ ابا جی کہنے لگے، ''یہ میری نور العینی کی باتیں سنو بیٹا۔ کب اسے پڑھاتی رہی ہو؟ اتنے کاموں میں اتنے فرائض اور اتنی مشکل زندگی کے ساتھ تم کس وقت یہ کام کرتی رہی ہو؟''

اگر دنیا بھر کے شفیق ترین باپوں کی شفقت اور محبت جمع کر کے ایک چھوٹے سے

ستارے میں سمو دی جائے تو وہ ستارہ اس وقت ان کی پیشانی پر روشن تھا۔ اگر تمام فخر و انبساط کو ایک سمندر میں بند کر دیا جائے تو وہ سمندر ان کی آنکھوں میں سمٹا ہوا تھا۔ عالیہ کے شانوں پر ہاتھ پھیلا کر بیٹھ گئے۔

''جانِ پدر آج اس لمحے میں میں نے کئی صدیاں جی لی ہیں۔ ارے اب تو پاکستان میں رہنے والے اپنی مٹی سے، انسانوں سے اور اپنی زبان سے محبت نہیں سکھا پاتے مگر میری بچی وہاں رہ کر کسی نابغہ کی طرح باتیں کرتی ہے۔''

خدا گواہ ہے کہ آج تک ان کا فخر و انکسار، ان کی بے ٹھکانہ خوشی اور مسلسل کھلکھلاہٹ میرے تصور میں ویسے ہی زندہ ہے۔ میرے ماتھے پر وہ محبت آج بھی ستارے کی طرح روشن ہے جس نے مجھے کبھی کسی بھی قیمت پر سمجھوتہ نہیں کرنے دیا۔ کسی کی داد و تحسین کی مجھ پروا نہیں ہونے دی، کسی شہرت کو مطمحِ نظر نہیں بننے دیا اور نہ ہی کسی کا احسان قبول کرنے دیا۔ اس ایک لمحے نے مجھے مزید اور مسلسل چلتے رہنے پر مجبور کیا۔ مجھے زندگی میں کسی اور کی حوصلہ افزائی، کسی احساسِ تحفظ اور کسی بھی طرح کی ضمانت کی گنجائش اور ضرورت نہیں رہی کیوں کہ مجھے سکھا دیا گیا تھا کہ آپ دستگیروں میں ہیں، دستِ طلب دراز کرنے والوں میں سے نہیں۔ آپ خود پناہ دینے والوں میں سے ہیں، پناہ گزینوں میں سے نہیں اور آپ کی ذات کو دارالامان ہونا چاہیے امان طلب نہیں۔

آج بھی بچے جب انھیں یاد کرتے ہیں تو حیران ہوتے ہیں۔ ان کی فکر میں ایک توازن تھا اور وہ کسی بھی بات کو عمومی کر کے دوسروں پر تھوپ نہیں دیتے تھے۔ بہت سے ایسے باپ بھی ہوتے ہیں جو معاش کی چکی میں پستے ہیں اور بیک وقت کئی ملازمتیں کر کے بچوں کو سہولیاتِ زندگی بہم پہنچاتے ہیں لیکن چونکہ خواتین کی اکثریت کو کم علم رکھا جاتا ہے، تعلیم اور ملازمت سے دور کر کے ان کو صرف گھر نام کے اس سنہری پنجرے کی قید دی جاتی ہے تو جب کبھی وہ جگمگاتا قفس اچانک غائب ہو جائے تو آپ ہی سوچیں کہ پھر چوری کا تقاضہ کرنے والا میاں مٹھو کیا کرے؟

ایک دن میری بیٹی کہنے لگی ''امی، نانا ابو مجھے بتا رہے تھے کہ صحرا میں وضو کیسے کرنا چاہیے اور اسے تیمم کہتے ہیں۔ میں نے کہا نانا ابو میں کون سا صحرا میں جا رہی ہوں۔ کہنے لگے چاند کے بارے میں آپ کیا جانتی ہیں؟ میں نے بتایا کہ مجھے تو بہت پسند ہے اور میں پڑھتی رہتی ہوں۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ اسٹرانومی (علم الکواکب) پڑھوں۔ کہنے لگے تو کیا آپ چاند پر جانے کا ارادہ رکھتی ہیں؟ بس اسی طرح صحرا میں وضو کی مثال دے رہا ہوں۔''

ابا جی کو بچوں سے مکالمہ کرنا بہت پسند تھا۔ ان سے مل کر کھیلنا، نئے کھیل کے اصول سیکھنا۔ ڈنمارک میں بچوں کی نظمیں اور گیت گانے کا بہت رواج ہے۔ ابا جی بچوں کو کہتے اچھا مجھے کوئی ڈینش گیت سناؤ۔ عالیہ نے ان کو تالی بجا کر اور ہاتھوں کے اشارے سے ایک گانا سنایا۔ جب وہ چند سال بعد دوبارہ پاکستان آئی تو ابا جی کو نہ صرف وہ گانا یاد تھا بلکہ ان کو ہاتھوں کی حرکات کے ساتھ آہنگ بھی یاد تھا، لیکن چونکہ ان کا تلفظ بہت مختلف تھا سو دونوں بچے ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔ پھر عالیہ اپنی آنکھیں گھماتی ہوئی کہتی۔

''نانا ابو! ذرا وہ گانا گائیں ناں۔ ایناں تیا اینا ایناں ایناں۔۔۔موسی فینا بوم بوم بوم'' ابا جی جواب میں دوہراتے اور پھر سب پر ہنسی کا دورہ پڑ جاتا۔

••

بچوں کی تربیت اور پرورش میں وہ کسی بھی لچک کے قائل نہیں تھے۔ ان کا نقطۂ نظر بہت واضح تھا۔ بچے پر پوری توجہ ہونا چاہیے۔ بچے کو گرنا نہیں چاہیے۔ اسے بلاوجہ مت جھڑکیں اور نہ ہی اونچا بولیں، بچہ خائف ہو جاتا ہے۔ نالائق ماؤں کی بےتوجہی کی وجہ سے بچے گرتے ہیں اور ان کے سروں پر زخموں کے نشان اور ٹانکے مستقل رہ جاتے ہیں۔ چھتوں سے گرنا اور سیڑھیوں سے گرنا معمول کی بات ہے سو دھیان رکھیں کہ بچے کو چوٹ نہ لگے اور نہ ہی اس کا ہاتھ جلے۔ اس کی بات غور سے سنیں۔ جب وہ سو جائے تو پھر اپنی دلچسپی کا کوئی کام کریں۔ ماں باپ بچے کو خود پڑھائیں تاکہ بچے کے ساتھ ان کا رابطہ رہے اور وہ اپنے مزاج کے مطابق بچے کی تعلیم و تربیت کر سکیں۔ بچوں کا دوسروں کے پاس جا کر ٹیوشن پڑھنا اور سکول سے گھر آتے ہی پھر بستے اٹھائے باہر نکل جانا ان کو قطعی ناپسند تھا۔

••

''میں آپ کے ایم اے کا داخلہ بھیجنے لگا ہوں...'' ابا جی نے مجھے تفصیلی خط لکھا۔ ''خود پر اتنا جمود طاری کرنا ٹھیک نہیں۔ کتابیں آپ کو بھجوا رہا ہوں۔ ان کا مطالعہ شروع کریں۔ پھر باقی تیاری امتحانات کے دوران ہو جائے گی۔ اس تعلیم کو ایک پروجیکٹ کی طرح لیں اور مکمل کریں۔'' میں عالیہ کو لے کر پاکستان گئی۔ امی جی نے اسے سنبھال لیا۔ انھوں نے شوق سے اس کے جانے سے پہلے ہی لہنگا اور فراک بنوا کر رکھے تھے۔ وہ ان کو بدل بدل کر پہنتی۔ ڈیڑھ برس کی عمر میں امی جی نے اسے ٹوائلٹ ٹریننگ دی اور پیمپی اتروا دی۔ دو ہفتے کے اندر اس نے چٹاخ پٹاخ باتیں شروع

کر دیں۔ ابا جی کے پیچھے پورا جملہ دوہراتی۔ وہ ان کی کتابوں کو چھیڑنے کی کوشش کرتی تو ابا جی کہتے ''اوں ہوں، بری بات، کتاب آرام سے پڑھتے ہیں۔'' اس نے کتابوں کو ہاتھ لگانا چھوڑ دیا۔ ابا جی کو دیکھ کر کہتی ''اوں ہوں۔۔'' باقی جملہ ناقابلِ فہم سا ادا کرتی۔

مجھے ابا جی کا حکم تھا کہ ادھر میرے کمرے میں چلی جاؤ اور پڑھائی شروع کرو۔ عالیہ کو انھوں نے بتایا کہ آپ کی امی پڑھ رہی ہیں، آپ نے ان کو تنگ نہیں کرنا۔ وہ کمرے کی طرف آ کر دونوں پردوں کے درمیان سے اپنا ننھا سا سر ڈال کر مجھے دیکھتی، پھر انگلی ہونٹوں پر رکھتی، شش، شش، اور تاکید کرتی ''پلیں'' (پڑھیں)۔

وہ ایسی عمر میں تھی کہ اس کے لیے ہر چیز نئی، ماحول نیا تھا۔ نئی چیز دیکھتے فوراً اٹھ کر بھاگ پڑتی۔ اوپر سے نانو نے رنگ برنگے فراک اور لہنگے کیا بنا دیے کہ اس کا سارا دن ایک کے بعد دوسرا لباس پہنتے گزرتا۔

ابا جی کہتے کہ اسے خود فیصلہ کرنے دو کہ وہ کیا پہننا چاہتی ہے۔ پھر ہنس کر کہتے کہ بھئی اسے انتخاب کا حق دو۔ میں لاکھ کہتی کہ ابا جی سردی ہوگئی ہے اور وہ فراک پہن کر بیٹھ گئی ہے۔ لیکن ابا جی میرا احتجاج نظر انداز کرتے ہوئے اسے فراک سمیت کمبل میں چھپا لیتے۔

عالیہ نانی نانا کی شہہ پر اپنے سارے کپڑے پھیلا کر بیٹھ جاتی۔ پھر ایک ایک کر کے ان کو گھسیٹتی۔ کبھی کوئی چمکیلا کپڑا اٹھا کر نانو کو بلاتی، ''نانو۔۔ واہ واہ؟'' امی جی کہتیں ''ہاں جی واہ واہ کپڑے ہیں، پہن لو۔'' خوبصورت کپڑوں کے لیے یہ عالیہ کی اپنی ہی اصطلاح تھی۔

ابا جی کہتے ''واہ بھئی میرے بچے نے کتنے اچھے کپڑے پہنے ہیں۔ کتنی اچھی پسند ہے۔'' میں ہاتھ میں کتاب لیے ان کو دیکھتی رہتی۔ وہ فاتحانہ نظروں سے فراک اٹھا کر ان کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتی۔

''جی میرا بچہ، یہ سب سے پیاری ہے۔ شاباش اب باقی کپڑے اٹھائیں۔ آپ کی امی جان نے پڑھنا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟ ان کو تنگ نہیں کرنا'' ابا جی اسے کہتے۔ وہ سنہری مائل بھورے گھنگریالے بالوں والا سر ہلاتی۔ فوراً ننھے منے ہاتھوں سے کپڑے سمیٹتی۔ پھر نانو کو فراک دکھانے کے لیے بلاتی۔ ابھی وہ نانو اور نانا ابو کو ''نینو اور نان بُو'' کہتی تھی۔

امی جی اسے ٹوپی اور جرابیں پہناتیں اور تاکید کرتیں کہ اب انھیں اتارنا نہیں۔

''اچھا'' وہ اثبات میں سر ہلاتی۔ ''اب میرے پاس کمبل میں بیٹھ جائیں اور جلدی سے

بسم اللہ پڑھ کر سنائیں'' ابا جی کہتے۔ وہ چھوٹی چھوٹی ہتھیلیوں کو جوڑ کر گود میں رکھ لیتی اور ابا جی اپنے انتہائی خوبصورت لحن کے ساتھ اسے سورۃ رحمٰن سنانے لگتے۔ وہ پیچھے پیچھے ناقابلِ فہم انداز میں اسی طرز پر'' آ آن۔۔ قاآن'' کہتی۔ پھر ننھا سا منہ اوپر اٹھا کر انھیں دیکھنے کی کوشش کرتی۔'' ماشاء اللہ۔ آپ تو بہت لائق ہیں۔'' وہ جلدی سے ہاتھ منہ پر پھیرتی اور بھاگ جاتی۔

کیڑوں کی یہ کہانی ہر روز دوہرائی جاتی۔ چند ماہ کے اندر ہی اس نے خوب باتیں کرنا سیکھ لیں۔ میں جب پنجاب یونیورسٹی میں امتحان دینے گئی تو وہ باہر ماموں کے ساتھ بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ چند طالبات جو امتحانات ہی میں دوست بنی تھیں، اسے دیکھ کر بہت حیران ہوتیں،

'' کمال ہے! آپ تو خود ابھی دسویں کی طالبہ لگتی ہیں۔ آپ کی اتنی پیاری بچی بھی ہے، ماشاء اللہ؟ لوگ تو یہاں سے یورپ پڑھنے جاتے ہیں، آپ پر کیا افتاد آن پڑی کہ آپ وہاں سے یہاں آ کر سر کھپا رہی ہیں؟'' اب میں انھیں کیا بتاتی کہ یہ بھی ابا جی کا شوق تھا کہ کم از کم ایم اے کی ڈگری تو لے لو، بعد میں جو جی چاہے پڑھنا۔

ابا جی عالیہ کو بچپن سے بلب کے گرد جمع ہوتے پروانے دکھایا کرتے تھے۔ جب وہ چھوٹی تھی تو ابا جی اس کے لیے کہیں سے جگنو پکڑ کر لائے۔ دو جگنو ان کی ٹوپی میں تھے۔ انھوں نے فوراً بڑے کمرے سے متصل چھوٹا کمرہ بند کیا اور مکمل تاریکی میں شعبدہ دکھانے والوں کی طرح جگنو آزاد کیے اور اسے دکھانے لگے۔ مجھے یاد ہے کہ میرا بیٹا جو اس وقت چار سال کا تھا، وہ سب کو فخر سے بتاتا،'' میرے نانا ابو کے پاس جادو کے 'کیڑے' ہیں، جو کاٹتے بھی نہیں ہیں اور جلاتے بھی نہیں بس اندھیرے میں چمکتے ہیں۔''

'' بیٹا جی چمکتے وہ روشنی میں بھی ہیں لیکن ان کو دیکھنے کے لیے اندھیرے کی ضرورت ہوتی ہے'' ابا جی نے اس کا گال تھپتھپایا۔

واہ پروین کیا یادگار شعر کہہ گئیں

جگنو کو دن کی روشنی میں پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے ہیں

جس گھر میں بچیوں کی ہنسی گونجتی ہے وہ بہت بابرکت ہوتا ہے۔ عالیہ جب پاکستان آتی تو اپنی دونوں کزنز کے ساتھ گلے میں بازو ڈالے کبھی ایک کمرے میں کبھی دوسرے میں۔ پھر خدا جانے کیا باتیں کرتیں کہ آدھی بات پر ہی ہنسی کا دورہ پڑ جاتا۔ انھیں ہنستا دیکھ کر وجہ جانے بغیر ابا جی

بھی کھلکھلا کر ہنستے۔

''ان بچیوں کو دیکھ دیکھ کر جیتا ہوں میں۔ ہنستی ہیں تو چاندنی پھیلتی ہے، گھنٹیاں بجتی ہیں۔ جیسے کوئی چاندی کے برتن میں کھنکھناتے سکے چھنکائے۔''

عالیہ جب کھلکھلا کر ہنستی تو کہتے ''بالکل اپنی ماں کی طرح ہنستی ہے۔ اس کے دم سے گھر میں رونق تھی۔'' پھر جب عالیہ پنجابی بولنے کی کوشش کرتی تو دونوں کزنز ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتیں۔ وہ لفظ 'مینوں' (مجھے) درست ادا نہیں کر سکتی تھی اور اسے 'منڑو' کہتی، جس پر وہ خوب مذاق کرتیں۔ لیکن ہنستے ہنستے اس نے پنجابی سیکھ ہی لی۔

ایک شام بجلی بند ہوئی تو ابا جی نے اوپر چھت کا رخ کیا۔ عالیہ بھی پیچھے بھاگی، ''منڑو وی کھاڑو۔''

''کیا؟'' پہلے تو وہ سمجھے ہی نہیں۔

عالیہ نے پھر دوہرایا، ''منڑو وی کھاڑو''، پھر ترجمہ کر کے بتانے لگی، ''نانا ابو اس کا مطلب ہے کہ مجھے بھی لے کر جائیں۔'' ابا جی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ہنسنے لگے۔

اب تک عالیہ کو سمجھ آ چکی تھی کہ کوئی لفظ غلط بولا ہے۔ اس نے بھی نانا ابو کی ہنسی میں اپنی کھلکھلاہٹ شامل کی اور پھر جھینپ کر بولی، ''غلط کہہ دیا کچھ؟''

''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، اللہ ہمیشہ ہنستا رکھے'' امی جی جو سیڑھیوں کے پاس لگے سنک پر وضو کر رہی تھیں فوراً بولیں۔

''امی جی! جب ہم ہنسا کرتے تھے تو آپ فرمایا کرتی تھیں، ''کھی کھی نہ کر۔ اور اب ماشاء اللہ ماشاء اللہ ہو رہی ہے؟''

''مول نالوں بیاج پیارا کڑیے'' (اصل رقم سے سود زیادہ عزیز ہوتا ہے) امی جی نے ہمیشہ کی طرح اپنا محاوراتی محاذ آباد رکھا۔ ''کڑیاں، چڑیاں بکریاں، تے تینے ذاتاں اتھریاں'' (لڑکیاں، چڑیاں اور بکریاں، تینوں بے امن مٹی سے بنی ہیں)۔

اب جب عالیہ اور اسما اکٹھے بیٹھ کر ہنستی ہیں اور ان کی بچیاں ہاتھ تھامے گھومتی ہیں تو مجھے ایک عجب سا سکون آمیز یقین آگھیرتا ہے کہ کہیں ابا جی کی دنیا میں چاندنی بکھر رہی ہوگی۔

••

''امی! آج میں دیر سے گھر آؤں گی'' صبح گھر سے نکلتے ہی ہماری دخترِ نیک اختر نے

ہمیں مطلع کیا۔

''خیریت؟''

''جی وہ آج واپسی پر میں فٹنس سنٹر جاؤں گی۔ ویک اینڈ پر بھی نہیں جا سکی تو سوچ رہی ہوں کہ ناغہ نہ ہوجائے۔'' اس نے اپنے بیگ میں جلدی جلدی تمام چیزیں یوں ڈالیں جیسے ڈرم میں کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہے۔ ہم نے جواباً سر کو استفہامی جنبش دینا ہی کافی سمجھا۔ محترمہ خود تو چلی گئیں لیکن مجھے چائے کی پیالی کے ساتھ ناشتے کی میز پر سوچیں کھنگالنے کے لیے چھوڑ گئیں۔ فٹنس سنٹر جانے کا جملہ سن کر اور اس کا صحت و ورزش کے بارے میں بہت محتاط رویہ مجھے غیر ارادی طور پر اس کے بچپن کے اس دور میں لے گیا جب اس نے ابھی پاؤں پاؤں چلنا سیکھا تھا اور حیرت زدہ لوگ اس کی عمر پوچھا کرتے تھے، ''ارے!!! سال سے بھی کم ہے اور چلتی پھرتی ہے؟''

''بھئی اس کو کھانے پینے کے لیے کچھ دیا کرو، لگتا ہے ایتھوپیا سے آئی ہے۔''

''ارے یہ اتنی دبلی کیوں ہے؟ میرا بیٹا ابھی صرف آٹھ ماہ کا ہے اور اس سے کہیں بڑا لگتا ہے۔ کیا ہوا جو ابھی اس نے بمشکل بیٹھنا ہی شروع کیا ہے؟ بھئی ہم نے کون سا اسے میراتھن دوڑانی ہے؟ برا نہ مانو تو کہیں کہ تم اس کی خوراک کا خیال کیا کرو۔ یہ تو چابی کی گڑیا معلوم ہوتی ہے۔''

بس ہر طرف سے ایسے ہی تبصرے سن سن کر ہم بے حد دلگیر ہو چکے تھے۔ جب ڈیڑھ برس کی عمر میں اسے پاکستان لے کر آئی تو ہمارے ایک چچا زاد بھائی صاحب اسے دیکھتے ہی بولے، ''یہ تو بالکل 'واَوَلونی' لگتی ہے۔''

''ہائیں، وہ کیا ہوتا ہے؟'' میں نے مزید پریشان ہو کر پوچھا۔

'واَوَلونی'۔ بھئی وہ جسے ہوا کا جھونکا بھی اڑا کر لے جائے'' بڑے مزے سے تشریح کی لیکن پھر شاید ہمارے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ کر ڈر کر بولے، ''ماشاء اللہ، بہت ایکٹو لگتی ہے۔ بہت بیدار ہے۔''

پتہ نہیں لوگوں کو کب عقل آئے گی کہ کسی بھی بچے کی ماں سے بالخصوص پہلی دفعہ ماں بننے والی عورتوں کے سامنے ایسے تبصروں سے گریز کرنا چاہیے۔

پاکستان تو پاکستان، چونکہ ڈنمارک میں بھی زیادہ تر یہی گھسی پٹی ہوئی نصیحت سننے کو ملی کہ اسے صحیح کھانا دو، فلاں چیز کھلاؤ، فلاں چیز پلاؤ، وغیرہ۔ بالآخر تنگ آ کر ہم نے اسے کاندھے پر اٹھایا اور سیدھا تایا جان کے کمرے کا رخ کیا، ''تایا جان! یہ لڑکی اتنی دبلی کیوں ہے؟'' وہ اخبار

پڑھنے میں مصروف تھے۔ اطمینان سے اسے تہہ کر کے رکھا۔ پھر فرمانے لگے،

''کھانا ٹھیک کھاتی ہے؟''

''جی الحمدللہ، کھاتی مرضی سے ہے لیکن ٹھیک کھا لیتی ہے۔''

''سوتی ٹھیک ہے؟''

''جی ہاں، کوئی مسئلہ نہیں۔ ساری رات سوتی ہے۔''

''اچھا، تو پھر تم پر کیا آفت آئی ہے؟ بھاگ دوڑ اس کی اپنی عمر کے بچوں سے زیادہ ہے۔ باتیں وہ بلبلِ ہزار دستان کی طرح کرتی ہے۔ جو کہو اسے دوہرا لیتی ہے۔ اب تم اور کون سا ٹیسٹ چاہتی ہو؟ جاہل ماؤں کی طرح موٹاپے کی طلبگار کیوں ہو؟'' تایا جان کا انداز آج بھی ویسا تھا جیسے کسی جاہل سے واسطہ پڑ جائے۔

ہم نے خجل ہو کر کہا، ''میں تو کوئی ٹیسٹ نہیں چاہتی تایا جان، مگر سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ اسے چیک کراؤں۔''

''کسی چیک اپ کی ضرورت نہیں'' وہ خشمگیں ہو کر بولے، ''جو یہ مشورہ دیتا ہے اسے ذہنی امراض کے معائنے کے لیے بھیج دو۔''

خیر اس جھاڑ جھپاڑ کے بعد چند دن امن و امان رہا۔

اب چونکہ ہمارے طویل قیام کا مقصد ایم اے کا امتحان دینا تھا اور ہمارا زیادہ وقت پڑھنے، نوٹس بنانے اور یونیورسٹی کے پھیرے ڈالنے میں گزر جاتا سو 'وا وَلونی' ہماری امی کے پاس بڑے سکون سے رہتی۔ روزانہ نئے نئے الفاظ بولتی، اور ہم سے لاتعلق سی ہونے لگی۔ لیکن اب ہماری بے سکونی کا آغاز کسی اور انداز میں ہوا۔ دراصل امی کے پاس جو بھی 'دیدہ بینا، جہاں دیدہ، سرد و گرم چشیدہ' خواتین آتیں، وہ نسخے بتانا شروع کر دیتیں۔ اور ایسے ایسے نادر نسخہ جات بتاتیں کہ ہمارے خاندانی حکما نے بھی عاجز آ کر لاحول پڑھنا شروع کر دیا۔ آخر ایک تیر بہدف نسخہ سن کر ہم جی کڑا کر کے اب کی بار ابا جی کے حضور حاضر ہوئے،

''ابا جی! وہ فلاں خالہ جان نے بتایا ہے کہ بنگلہ پان منہ میں چبا کر اس کی پیک دبلے پتلے بچے کی کمر پر ڈالی جائے تو لگا تار سات دن ایسا کرنے سے کمر پر بور آنے لگے گا۔ اسے ہٹا دیں تو دیکھتے ہی دیکھتے ہی بچہ گل گوتھنا، گول مٹول اور بانگلوسا ہو جائے گا۔''

ابا جی نے حقیقتہً وحشت زدہ ہو کر میری شکل یوں دیکھی جیسے کسی اور دنیا کی مخلوق کو دیکھ

رہے ہوں۔

''پڑھ لکھ کر ضائع کر ڈالا تم نے، سب سے پہلی بات تو یہ بتاؤ کہ اسے موٹا کر کے تم نے کون سے مقاصد حاصل کرنا ہیں؟ کوئی مقابلہ جیتنا ہے یا حلوے کھاتی اور لسی پیتی، جوڑوں کے درد کی ماری خواتین سے داد حاصل کرنا ہے؟ جہالت چھوڑو اور اللہ کا شکر ادا کرو کہ بچی ایسے پل رہی ہے کہ خبر ہی نہیں ہوتی گھر میں کوئی بچہ بھی ہے۔ وقت پر سونا، وقت پر کھانا، سارا دن بھاگنا دوڑنا۔ اتنی عمر میں اتنی منظم عادات، اب اور کیا چاہیئے؟ مسئلہ کیا ہے؟'' انھوں نے میری گوشمالی کے بعد 'نانا بو۔۔۔ نانا بوٗ کرتی، بازو پھیلاتی بچی کو گود میں بٹھا لیا اور اس سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔

''آپ کے ہاتھ کہاں ہیں؟'' اس نے جلدی سے دونوں ہاتھ پھیلا کر انھیں دکھائے۔

''آپ کے دانت کہاں ہیں؟'' اس نے فوراً باچھیں پھیلا کر ننھے ننھے دانتوں کی نمائش کر ڈالی۔

آپ کی ناک کہاں ہے؟'' اس نے جھٹ سوں سوں کر کے ناک دکھائی۔

ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد ہم نے اپنے دل کو تسلی دی کہ عالیہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود ہی 'گول مٹول' ہو جائے گی۔ جب ہم اس کو واپس لے کر آئے تو ماشاء اللہ پٹاخ پٹاخ باتیں کرتی، رنگ برنگے سوال اور خود ہی جواب دیتی ''واولونی'' ہمارے ساتھ تھی۔

ابا جی کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے ان ہی کی طرح کتابوں کو جوڑ جوڑ کر رکھتی۔ جہاں قلم نظر آتا، اٹھا کر جیب میں ڈالنے کی کوشش کرتی اور ساتھ ہی دعویٰ دائر کر دیتی، ''میرا ہے۔۔ یہ میرا ہے'' اب یہاں جو بھی دیکھتا پہلی بات یہی کہتا، ''ہائے پاکستان سے اور کمزور ہو کر آئی ہے۔ ذرا سی گردن نکل آئی ہے۔''

انہی دنوں کسی ملنے والوں کے ہاں پوتا ہوا اور اس کے عقیقے کی دعوت آ گئی۔ ہم نے دو سالہ گڑیا کو رنگ برنگا فراک پہنایا، چوڑیاں پہنائیں، بڑے حیلوں سے سر پر پونی بنانے کی کوشش کی جو اس نے کمال بے نیازی سے ناکام بنا دی اور دو منٹ بعد کلپ اتار کر ہمارے ہاتھ میں رکھ دیا۔ کان ابا جی نے چھدوانے نہیں دیے تھے کہ بلاوجہ بچے کو اذیت دینے کی ضرورت نہیں۔ چٹاخ پٹاخ باتیں کرتی واؤلونی تقریب گاہ میں ہر ایک کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ مسئلہ تب ہوا جب ایک خوب صحت مند خاتون گود میں ایک بے حد پیارا گوپلو سا بچہ لیے ہماری طرف متوجہ ہوئیں۔ عالیہ کی عمر پوچھی اور حیران ہوئیں کہ کیسی اچھی اردو بولتی ہے۔ پھر ذرا سا رک کر کہنے لگیں ''لیکن اس کی خوراک کا خیال رکھا کیجیے۔ خود ان کا بیٹا ڈیڑھ برس کا تھا لیکن ابھی چلتا نہیں تھا اور ڈاکٹرز اس کا

وزن کم کروانے کی تاکید کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ وہ بچے کو کیا کھلاتی ہیں۔ اتنے میں ایک بزرگ خاتون بولیں، ''جتنی توپ بڑی ہوگی اتنا ہی گولہ پھینکے گی ناں، آپ اسے دیکھیں اور اپنی جان بھی ملاحظہ کریں۔''

••

ہمارے گھر کے سادہ سے دسترخوان پر کوئی نہ کوئی بن بلایا اور غیر متوقع مہمان ضرور ہوتا۔ ٹرے میں سفید کپڑا بچھا کر اس کو اہتمام سے کھانا پیش کیا جاتا خواہ دال روٹی اور سلاد چٹنی ہو لیکن تمیز سے پیش کی جائے۔ اب میں عالیہ کو بڑے سلیقے اور شوق سے ٹرے اور ٹیبل سجاتے دیکھتی ہوں تو حیران ہوتی ہوں، کیا ناک نقشے کی طرح عادات بھی جینز میں آتی ہیں؟ عالیہ میں بیک وقت ابا جی کا مستحکم ارادہ اور غیر مشروط خدمت کا جذبہ اور امی جی کی ہمدرد غمگساری ہے۔ یہی میرا انعام ہے۔ اس نے پیشہ بھی ابا جی والا اختیار کیا۔ وہ اسی حلم اور متانت سے لوگوں کی بات سنتی ہے جو اپنے لڑکپن میں مجھ میں قطعی طور پر مفقود تھا۔

اب وہ وقت آن لگا ہے کہ کئی دفعہ وہ جن لوگوں کی خاموشی سے مدد کرتی ہے وہ ڈھونڈتے ہوئے مجھ تک پہنچتے، ''آپ عالیہ کی امی ہیں؟ آپ نے تو فرشتہ دے دیا اس دنیا کو۔ اس نے تو میرے جوتے بند کیے اور سامان اٹھا کر باہر گاڑی تک چھوڑ کر آئی۔''

میں کچھ شرمندہ سی ہو کر آگے پیچھے دیکھنے لگی کہ کوئی سن تو نہیں رہا۔ پھر میں نے کہا کہ یہ اس کی ذمہ داری ہے، ملازمت کا تقاضہ ہے۔ اس نے ایک دفعہ میرے ڈاکٹر کو بیٹھ کر میرے جوتے بند کرتے دیکھا تو کہنے لگی، ''امی جی میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں ایسی ڈاکٹر بنوں جو اپنے مریضوں کے سکون کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھے۔ آپ میرے بچوں کے لیے دعا کر دیا کریں کہ اللہ ان کے ہاتھ اور زبان سے کوئی کوتاہی یا غلطی نہ ہونے دے۔''

کئی مرتبہ بے اختیار میری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اپنی اوقات یاد آ جاتی ہے کہ میں تو ہرگز اس قابل نہیں تھی جتنا اللہ نے مجھے نواز دیا۔ اسی کی خاص عطا ہے کہ اس نے قدر دان اور نیک دل اچھے لوگوں کو ہماری زندگی میں شامل کر دیا۔

''امی! نانا ابو کتنے لبرل ہیں'' میری بیٹی آہستہ سے کہتی۔ پھر وہ ان کے پاس بیٹھی نجانے کیا ان کے کان میں پھونکتی رہتی۔ ابا جی اس کو کہتے، ''آپ کا دل ڈاکٹر بننے کو چاہتا ہے تو آپ ضرور بنیں۔ کسی کی کیا مجال کہ آپ کو روکے یا راستے میں رخنے ڈالے؟ اپنے دل سے فیصلہ کرو بیٹا کہ کیا

آپ اپنا آرام وسکون اور مادی خواہشات لوگوں کے بیمار بدن کو شفا دینے کی خاطر تیاگ سکتی ہیں؟ کیا اتنا حوصلہ ہے کہ مریضوں کی بات توجہ اور ہمدردی سے سنیں خواہ وہ دس مرتبہ ایک ہی بات کہیں؟ ذہن نشین کرلو میری جان کہ یہ زندگی بھر کا انتخاب ہے۔ ایک معلم اور دوسرا معالج کبھی بھی چھٹی پہ نہیں ہوتے۔ علم الابدان اور علم الادیان کے میدان کے طالب علموں اور معلمین کی اپنی کوئی ذاتی ترجیحات اور مفادات نہیں ہوتے۔ ان کو لوگوں کے لیے ایک چشمے کی مانند ہونا چاہیے جو بیک وقت رواں بھی ہوتا ہے اور اپنی جگہ پر بھی موجود رہتا ہے۔ جس کا جب جی چاہے فیض یاب ہو۔''

''ہاں میرا بچہ، بس یہ یاد رکھنا ہے کہ مریض زندگی اور موت کو خدا کے ہاتھ میں اور شفا آپ کے ہاتھ میں سمجھ کر آپ کے پاس آتا ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ رزاق بھی اللہ کی ذات ہے اور شافع بھی۔ آپ ان پرندوں کو دیکھتی ہیں ناں جو ہر صبح اپنا رزق کمانے کے لیے پرواز کرتے ہیں؟ وہ بھوکا جگاتا ہے لیکن بھوکا سلاتا نہیں۔ بس یہی توکل اور ایمان ایک مسیحا کا ہونا چاہیے کیونکہ ایک مسیحا مریضوں کے لیے روشنی، زندگی، صحت اور امید کی علامت ہوتا ہے اور وہ اس پر یقین کرتے ہیں، اسے اپنے راز بتاتے ہیں۔ اس طرح وہ امین بھی ہوتا ہے جیسے پروانے روشنی کی طرف لپکتے ہیں'' انھوں نے عالیہ کو نصیحت کی۔

••

ابا جی کے اپنے مزاج میں ظرافت اور ذہانت بیک وقت موجود تھی۔ لسانی الٹ پلٹ کے کھیل سے بھی مزاح پیدا کرتے اور رنگ برنگی مثالوں اور چٹکلوں سے خوب ہنساتے۔ ان کا کہنا تھا کہ حسِ ظرافت کے بغیر دوست داری اور تعلق داری نبھانا بہت مشکل ہے کجا کہ دنیا داری۔ ابا جی کی اس بات کو ہماری نورِ نظر نے پلو سے باندھ لیا۔

جب اس کے ہوش سنبھالتے ہی پیغامات کا سلسلہ شروع ہوا تو ہم نے کہا بی بی آپ خود بھی غور فرمائیں، اب پہلی نسل کا زمانہ تو ہے نہیں کہ والدین نے اپنی صوابدید اور مردم شناسی پر یقین کرتے ہوئے ہامی بھر لی اور پھر قاضی کو سر پر کھڑا کر کے اجازت مانگی۔ کسی بزرگ عورت نے سر پر ہلکی سی چپت رسید کر کے اقرار کی جنبش کروا دی۔ پھر لوگ ابا کے شملے کو کلف لگا لگا کر ایک دوسرے کو بھنے لگے۔ بہت ہوا تو کبھی کبھار اماں نے لٹھ مارنے کے جارحانہ انداز میں پوچھ لیا کہ بچو خوش ہو ناں؟ اور جواب میں صرف اثبات کی توقع رکھی۔ بچے جی جی کرتے ایک جبری تعلق میں زندگی بسر کرنے لگے۔ نئی نسل بلاشبہ زیادہ خود اعتماد اور خردمند ہے۔

جب بھی دوسرے ملک سے کچھ رشتے آئے تو صاحبزادی نے فرمایا، ''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پہلے آپ نے ساری زندگی اپنی امی کو دیکھنے کو ترستے گزاری اور اب بیٹی کو دیکھنے کے لیے پاپڑ بیلیں گی۔''

''اچھا، ٹھیک ہے'' میرے پاس نہ چاہتے ہوئے بھی اتفاق رائے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ پھر ایک بہت ہی اچھے رشتے کے بارے میں جو ذاتی طور پر مجھے ایک بہت بہتر پیج محسوس ہوا، محترمہ کی رائے مانگی تو بے نیازی سے بولی،

''امی ان لوگوں کو تو پنجابی ہی نہیں آتی۔ ہماری حسِ ظرافت ہی ایک دوسرے سے فرق ہوگی۔ لسانی رکاوٹیں درمیان میں رہیں گی، بلکہ کلچر کا اختلاف ہوگا تو خواہ مخواہ کی سر دردی پالنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''اچھا!'' اب کے میں نے متفکر ہو کر کہا، ''اگر اسی طرح ہاتھ میں چھلنی اٹھائے ریت ہی چھانتے رہے تو پتہ نہیں کیا ہوگا۔''

''امی جی فلاں کو نہیں دیکھا؟ ان کے گھر میں ہر وقت اردو پنجابی کا رولا پڑا رہتا ہے۔ وہ فلاں کو نہیں دیکھا، ان کے ذہنوں میں ابھی تک شہر گاؤں کی تہذیب اور کھانے پکانے کے تفرقات ہی ختم نہیں ہوئے؟ یکساں طرزِ معاشرت بہت ضروری ہے اور ذہنی اعلیٰ ظرفی اور برداشت کے رویے موجود ہونا چاہییں۔ ڈگری سب کچھ نہیں ہوتی۔''

''اچھا میری بقراطن بی بی'' اب کے میں نے تقریباً دانت پیستے ہوئے ہتھیار ڈالے۔

لیکن جب بھی میری اس موضوع پر بات ہوئی وہ ہمیشہ یہی کہتی، ''امی آپ ہی تو کہتی تھیں کم عمری کی شادی میں یہی سب سے بڑا ثمر ہے کہ انسان نرم و نازک شاخ کی طرح لچک کھا لیتا ہے۔ بچوں کے ساتھ دوستی قائم رہتی ہے۔''

''ہاں، بات تو درست ہے۔ لیکن آپ کی تعلیم میرا خواب ہے، وہ خواب جو میرے حالات نے مجھے مکمل نہ کرنے دیا۔''

''امی یہ آپ کا زمانہ نہیں کہ ابا تعلیم جاری رکھنے کا وعدہ کریں گے اور مکر جائیں گے یا ایک فریق اپنا کیریئر بنائے گا اور دوسرا اس کی اور پورے خاندان کی غلامی میں خود کو بھلا دے گا کہ وہ کون ہے اور کس بلندی سے اتر کر نیچے آیا ہے۔ اب افہام و تفہیم اور ایک دوسرے کی رائے کے احترام کا زمانہ ہے'' اس کے انداز میں بے فکری مجھے بے حد تقویت دیتی۔ ''محبت اور عزت دو طرفہ

ہوگی یا پھر نہیں ہوگی۔"

"ہاں درست سہی لیکن جب بیٹی اچانک اپنی ہنسی سمیٹ کر اور رفاقت کے انداز بدل کر ماں کا گھر چھوڑ جاتی ہے تو ماں جن احساسات سے گزرتی ہے وہ مجھے ابھی سے نیزے کی انی کی طرح چبھنے لگے ہیں۔"

••

میں سمجھتی ہوں کہ والدین کو اپنے بچوں کے ساتھ انتہائی دوستانہ رویہ رکھنا چاہیے۔ بلکہ شادی کے معاملات میں نہ صرف ان کی رائے اور رضا مندی اہم ہونی چاہیے بلکہ انھیں سوچ بچار کے لیے وقت بھی دینا چاہیے تاکہ جواباً وہ بھی آپ کی رائے کا احترام کرنا سیکھیں۔ اولاد کی تربیت یک طرفہ سڑک نہیں ہے کہ صرف اولاد سے ہی آدابِ فرزندی کی توقع کی جائے۔ اب ہم اپنے والدین جیسے بھی تو نہیں پھر ہم اپنی اولاد سے اپنے زمانے کی سعادت مندی کا کیسے مطالبہ کر سکتے ہیں؟ لیکن تربیت میں احترام شامل کرنے کی صورت صرف جاہلانہ محبت نہیں بلکہ مساوی احترام ہے۔

دورانِ تدریس مجھے بہت سے ایسے کردار ملے جہاں والدین گاڑی تو بچے کی مرضی کے مطابق اور شریکوں کے کلیجے کو آگ لگانے کے لیے لے کر دیتے ہیں لیکن جب شادی جیسا اہم معاملہ زیرِ بحث آتا ہے تو اس وقت ان کے سامنے پھوپھی یا خالہ کی بیٹی واحد انتخاب کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ بعد میں وہ بھلے کسی ڈینش دوشیزہ سے وارثین پیدا کرتے رہیں۔

••

میں نے روم کی تپتی ہوئی دوپہر میں ہوٹل سے ویٹکن سٹی تک پیدل چلتے ہوئے دعا کی کہ "یا اللہ ہمیں درست فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرما۔ ایسا فیصلہ جو میری بیٹی کو کسی خارزار کی طرف نہ لے جائے۔ کسی ناقدری کا شکار نہ ہونے دے۔" میں لائٹوں سے دائیں مڑی۔ دور سے پرشکوہ عمارت دکھائی دی۔ زائرین اور سیاحوں کا ہجوم قطار باندھے انتہائی صبر و ضبط سے باری کا منتظر تھا۔ رنگ برنگے چوغوں اور سر پر بندھے لمبے ہمرنگ رومالوں میں ملبوس راہبات، گلے میں بڑی صلیب پہنے راہب سب ادھر چلے جا رہے تھے۔

میں نے اپنا یکطرفہ مکالمہ جاری رکھا، "یا اللہ تو جانتا ہے میرے بچوں کے علاوہ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ اب یہ دامن سراسر خالی ہے۔ اس میں اب صرف پھول بھرنا کہ کانٹے جمع کرنے

کی سکت نہیں رہی مجھ میں۔ میری بچی کو درست فیصلے کی توفیق دے اور پھر اپنا کرم شامل کر دے۔''
''امی!'' عالیہ بھی میرے پیچھے مقررہ جگہ پر آ پہنچی، ''کیا کر رہی ہیں؟'' اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر میرے پاس ہی بیٹھ گئی، ''آپ ویٹکن سٹی کے سامنے بیٹھ کر دعائیں اور وظیفے کر رہی ہیں۔ کسی ''اصلی'' مسلمان نے سن لیا تو آپ پر فتویٰ لگا دیا جائے گا۔''
اس کا معصوم و مطمئن چہرہ میری کیفیات سے بے خبر میرے وہاں خاموش بیٹھنے اور تمام ممکنہ دعاؤں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ سنہری دھوپ کی ترچھی کرنوں میں اس کے کانوں کے ستارہ نما ٹاپس کا عکس اس کے رخساروں پر دمک رہا تھا۔
''میرا اللہ ہر جگہ موجود ہے اور سمیع و علیم ہے۔ اگر وہ یہاں موجود نہ ہوتا تو دل کی یہ حالت نہ ہوتی کہ آپ از خود رفتگی کے عالم میں اس سے مخاطب ہو جائیں۔''
مجھ سے ذرا آگے ایک ضعیف العمر راہبہ زار و قطار روتے ہوئے تسبیح کے دانے گرا رہی تھی۔ سامنے شاید کوئی مذہبی رسم ادا کی جا رہی تھی۔ لوگوں کا ایک چھوٹا سا منظم جمگھٹ لکڑی کی لمبی صلیب اٹھائے پادری کے گرد جمع تھا۔ خالق اور مخلوق کے درمیان مذہبی رسومات ادا کرنے والوں کی پیچیدہ بھول بھلیاں موجود تھیں۔ ایک عجب گفتنی ناگفتنی کا یا بود نبود کا سا عالم تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی بات مکمل کی۔ پھر ایک عجب سکینت اور اطمینان کی حالت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں نے حسبِ معمول ایک طویل چکر لگایا۔
ویٹکن سٹی کے عین سامنے رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس ایک بھکارن بیٹھتی تھی۔ آج شاید اس کی جگہ ایک منحنی سے فقیر نے لے لی۔ وہ ہاتھ نچا نچا کر اطالوی زبان میں اس سے نجانے کیا کہہ رہی تھی۔ جس کا جواب وہ حسبِ توفیق منمناتی آواز میں دے رہا تھا۔ میں نے نسبتاً دور کھڑے ہو کر اس کی تصویر کھینچنے کو کیمرہ سیدھا کیا کہ عالیہ نے میرا بازو پکڑ کر کھینچا...
''امی، امی، آپ بالکل پاپا رازی بن گئی ہیں، ان فقیروں سے ہی پٹیں گی کسی دن۔''
لیکن میں نے بھی تصویر بنا کر ہی چھوڑی۔ جب ہم تقریباً گھنٹے بھر کی سیر کے بعد واپس لوٹیں تو وہ جانباز بھکارن بڑے طمطراق سے اپنی مخصوص جگہ براجمان تھی اور بھکاری غریب کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ ''واہ، وومین پاور! اپنے ذریعۂ معاش کا حصول یقینی طور پر بزورِ بازو ہی لیا ہوگا۔''
''امی!'' اس نے کرسی پر بیٹھ کر جوگرز کے تسمے ڈھیلے کیے۔ کنول کے پھولوں جیسے ننھے پیر، مجھے ساڑھے آٹھ مہینے کی عمر میں پہلا قدم اٹھاتی، لڑکھڑاتی اور ڈگمگاتی اپنی طرف بانہیں پھیلاتی

بچی یاد آ گئی جو آج مجھے یہ بتا رہی تھی یہ آپ کا زمانہ نہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ بات پوری کرتی میں نے تپ کر کہا، ''کیوں؟ میں کیا موہنجوداڑو کے کھنڈرات سے دریافت ہوئی ہوں یا اریدو کے قدیم ترین ویرانے سے نمودار ہوئی ہوں؟''

''امی ی ی ی'' اس نے بے ساختہ ہنسی کے درمیان کہا، ''آپ ہر بات میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں اور مبالغے کو استعمال نہ کیا کریں۔''

''پاکستان کی بات نہ کرو۔ وہاں بیٹی کی شادی ہوتی ہے تو پورا خاندان، محلہ حتیٰ کہ درزی تک خیال کرتے ہیں۔ ماں کو پوری تھراپی ملتی ہے۔''

''امی جانی'' اس نے لاڈ سے میرے گلے میں بازو ڈالے، ''میں کہاں جا رہی ہوں وہ جو آپ کہتی ہیں لنڈی کوتل۔''

''چلو ہٹو'' میں نے اسے ماتھے پر پیار کیا۔

''آپ کے ساتھ تو پوری دنیا ہے۔ آپ کے سارے ادبی دوست، سارا خاندان، آپ کے ڈیزائنر تک، خواہ مخواہ جذباتی ڈرامے نہ کریں۔ امی چلیے نیچے چلتے ہیں آئسکریم کھاتے ہیں۔''

''یہ بڑھتا ہوا وزن تمھارے ان ہی کرتوتوں کی وجہ سے ہے'' میں نے صاف انکار کر دیا۔

''چلیں، چلیں۔۔ چھوڑیں وزن کو، ایٹ، ڈرنک، بی میری (Eat, drink, be merry) اس نے چپل پہنی اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

''امی پیزا کھائیں؟'' ہم نے ایک بنگالی ریسٹورنٹ ڈھونڈا جہاں دس یورو میں حلال کھانا ملتا تھا۔ ہم چہل قدمی کرتے وہاں پہنچیں۔ دو نوعمر لڑکے کاؤنٹر پر کھڑے تھے۔

''آ وَپ دونوں سٹوڈنٹس ہو؟'' نوجوان لڑکوں میں سے ایک نے بنگالی لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، یہ میری بیٹی ہے'' میں نے بہت بزرگانہ انداز میں کہا، پھر دیسی انداز میں ہماری گپ شپ شروع ہوگئی۔

ہم تین چار دن لگاتار رات کو وہاں سے کھانا کھانے گئے۔ آخری دن ہم نے انھیں خدا حافظ کہا۔ میں چونکہ کریڈٹ کارڈ پر بل ادا کرتی تھی سو میرا نام جان کر ان میں سے ایک نے کہا، ''میں نے آپ کا نام فیسبک پر ڈھونڈ نکالا ہے، آپ کویتا لکھتی ہیں؟''

''دنیا بہت چھوٹی ہے،'' میں نے کہا، ''میں لکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔'' مجھے وہ محنتی بچے بہت پیارے لگے۔ ہم نے انھیں پانچ دن کی ٹپ یکمشت ادا کی۔

''نہیں نہیں میڈم، پلیز رہنے دیں۔ آپ ٹورسٹ ہیں۔'' ان میں سے ایک نے فوراً کہا۔
''اب تو ہو گیا،'' میں نے بیگ اٹھایا۔
''اچھا میڈم، آؤ آپ ہماری طورف سے آج آئسکریم کھائیے'' بنگالی آمیز لہجے میں اردو بہت بھلی محسوس ہوتی۔ چاکلیٹ کیک، سٹرابیری کا جوس، ڈبل کریم کافی۔ یا اللہ!!!! ایسے لگتا ہے کہ ہم لوگ صرف کھانے کے لیے جیتے ہیں۔
''امی جی آپ تھک گئی ہوں گی۔ لائیے آپ کے پیروں کا مساج کر دوں۔'' کمرے میں پہنچتے ہی اس نے میرے سوجے ہوئے پیر اپنی گود میں رکھے۔ اس نے کمرے میں رکھے بالٹی نما کوڑے دان میں گرم پانی بھرا، پھر بچوں کی طرح مجھے کونے والی کرسی پر بٹھا دیا اور رعب سے بولی، ''بس آپ بیس منٹ کے لیے چپ چاپ پانی میں پیر ڈالے رکھیں، سوجن اتر جائے گی۔ کل ہم یہاں سے پیدل کلوزیم تک چلیں گے۔'' ہوٹل سے ویٹیکن سٹی چند منٹ کے فاصلے پر تھا۔ ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلتی ہوئی جاتیں اور لمبا چکر لگا کر واپس آتیں۔ نئی زندگی کا فیصلہ شاید اس نے اسی سڑک پر چلتے ہوئے کیا ہوگا۔
''بظاہر تو سب ٹھیک ہے۔ ہر بات تسلی بخش ہے'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی، ''میرے پڑھنے پر انھیں کوئی اعتراض بھی نہیں۔ ظاہر ہے جس گھر کی اپنی لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہوں وہ دوسروں کو منع نہیں کرتے۔ احساسِ کمتری کی بنیاد شاید احساسِ محرومی ہوتا ہے۔''
''بیٹا مختصر بات یہ ہے'' میں نے اس کی بات بھانپتے ہوئے کہا، ''خود سے پوچھو کیا چاہتی ہو۔ شادی ایسا فیصلہ ہے جس میں دل کی طرف سے واضح اقرار شامل ہونا ضروری ہے۔ بلکہ پہلے دل ہی دُہائی دے تو ایسے سفر کے جوتے پیروں میں پہننا چاہییں۔''
اس موقع پر مجھے کیا کیا نہ ابا جی کی یاد آئی۔ ایسی بے کنارگی دل میں خیمہ زن ہوگئی۔ ابا جی ہوتے تو بے دھڑک ہر فیصلہ ہو جاتا۔ لیکن شاید نہیں، بیٹیوں کی قسمت کسی دوسرے کے ہاتھ میں دینا اس دنیا میں میں کٹھن ترین مرحلہ ہے۔
''کوئی قدر کر پائے یا اسے احساس ہی نہ ہو کہ اسے کیا ملا ہے۔ چراغ ان ہاتھوں میں بے نور ہی رہتا ہے جنھیں چراغ جلانے کا ہنر ہی نہ آتا ہو'' کہیں سے ابا جی کی آواز آئی۔
مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ میں اوہام و وساوس کا شکار ہوں۔ میری بے نیاز اور بے لاگ قوتِ فیصلہ یہاں آ کر متزلزل ہو چکی تھی اور لمحوں میں آر پار کر دینے کی تمام تر صلاحیت

اس موڑ پر متذبذب کھڑی تھی، لیکن میں یہ بھول گئی تھی کہ اب اس مقام پر میں نہیں بلکہ میری بیٹی ہاتھ میں ہاں اور نہیں کا میزان لیے کھڑی ہے۔ وہ تعلیم یافتہ ہے، پراعتماد ہے اور اپنی کم عمری کے باوجود اپنی زندگی کے اہم ترین فیصلے خود کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں جو دیکھا اس سے مثبت نتائج برآمد کر کے انھیں اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیا تھا۔

روم واپسی پر عالیہ کی ہاں سے لے کر شادی تک کے سارے مراحل جس خوش اسلوبی سے طے ہوئے، اس سے مجھے آج بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب ابا جی اور امی کی دعاؤں کے صدقے میں اور اس بالواسطہ تربیت کی بنا پر ہوا جو وہ مسلسل ان سے گفتگو کے ذریعے کرتے رہتے۔ بچوں پر کبھی خطبات اور پند و نصائح کا اثر نہیں ہوتا، انھیں مثال چاہیے ہوتی ہے۔

واجبی تعلیم اور سادہ پرانے خیالات کی مالک والدہ، جوان ہی پرانے اصولوں پر کاربند تھیں کہ جس خاندان کے ساتھ رشتہ جڑ جائے بس آپ اس کو مکمل طور پر اپنائیں۔ ان کی اور آپ کی عزت و وقار اور ساکھ ایک ہوتی ہے اور اس میں اضافہ کرنا بہو اور داماد کا فرض ہے۔ مجھے یاد ہے کہ امی جی نے کبھی اپنے بچوں میں سے کسی کی ساس کو فلاں کی ساس کہہ کر تذکرہ نہیں کیا بلکہ نہایت فطری اور سادہ سے انداز میں تمھاری امی یا پھر کبھی مذاق سے تمھاری ساس امی کہا کرتی تھیں۔ ہمارے بھائی صاحب عطا الرحمان مرزا، جو ہمارے تایا زاد بھائی رضوان اللہ مرزا کے داماد بھی بنے، ایک دن بڑے فخر سے بولے...

''امی میری ساس صاحبہ سب سے زیادہ پڑھی لکھی ہیں۔''

امی ہنس کر بولیں، ''ہاں بھئی تمھاری ساس امی صرف پڑھی لکھی ہی نہیں بلکہ تعلیم کا استعمال بھی جانتی ہے۔ اس کی والدہ بھی ایک عظیم عورت تھی۔ جو عورت خاندان کو جوڑ کر نہ رکھ سکے اس کی تعلیم کا کوئی فائدہ نہیں۔ دانشمند عورت جانتی ہے کہ احترام کی لڑی میں پروئے رشتوں کے موتیوں سے صرف اس کی اولاد کی نہ صرف تربیت بہترین ہوتی ہے بلکہ وہ اس کے اثمار سے بھی فیض یاب ہوتی ہے۔ رشتوں کو اخلاق اور خلوص کی ڈوری سے باندھنا عورت کا پہلا قرینہ ہے۔ اس سے صرف اس کو کامیابی حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کی اولاد بھی ساری زندگی پھل کھاتی ہے۔'' امی جی کے اپنے ہی اقوالِ زریں تھے، ''انسان خلوص، خدمت اور خاموشی سے عزت اور وقار کماتا ہے۔''

''اچھا؟ ہوسکتا ہے'' میں نے بیچ میں اپنا فلسفہ جھاڑنا ضروری سمجھا۔

''ہوسکتا ہے کیا مطلب؟ کوئی جانور ہی ہوگا جو اس بات کو نہ سمجھے۔ پتر زبان شیریں تے

ملک گیری'، امی جی نے اپنے محاورات کے مطابق ہی زندگی گزاری تھی۔

''نہیں امی، جانور انسان سے زیادہ سمجھتا ہے۔ وہ روٹی ڈالنے والے ہاتھ کو کاٹتا نہیں۔ انسان کو صرف خاموشی سے خدمت گزاری ملتی رہے تو اس کا دماغ عرشِ معلیٰ تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ اسے خبر صرف تب ہوتی ہے جب سر پر رکھے انڈوں کی ٹوکری ہلتی ہے۔''

''تو اپنی مثالیں اپنے پاس ہی رکھ۔ تم سے تو کسی بات میں اتفاق ہوگا ہی نہیں۔ جب تک اپنے پٹھے سیدھے نظریات نہ پیش کرلو، چین نہیں آتا۔ کوئی اچھی بات نہ سیکھ لینا 'متے' کوئی ہدایت ہی ناں آجاوے کدھرے'' نالاں ہو کر کہتیں۔

یہ بعد میں ابا جی نے بتایا کہ امی جی کا کہا لفظ 'متے' فارسی لفظ 'مبادا' کی پنجابی صورت ہے۔ امی جی کو اس بات پر بھی شدید اختلاف تھا کہ مرزا صاحب کسی بات پر غور کرنے کے بجائے لفظ کی کھال اتارنے بیٹھ جاتے ہیں۔ مجھے اب احساس ہوتا ہے کہ لاشعوری طور پر میں نے امی جی کی تمام تر عادات اپنانے کی کوشش کی۔

مجھے خبر ہی نہ ہوئی کب میں نے عالیہ کو 'آپ کی امی جان کا فون آیا، آپ کی امی جان کی طرف جا رہی ہوں، ادھر ہی آجانا' کہنا شروع کیا، اور کب عالیہ کے لیے بھی یہ بات بالکل فطری ہوگئی کہ جس رشتے کا انتخاب اس نے اپنی مرضی سے کیا، ان سے تعلق داری نبھانا بھی اب اس کا ہی فرض ہے۔ بہت سوں کو میں نے کہتے سنا کہ ماں باپ بس وہی ہوتے ہیں جو اپنے ہوتے ہیں، دوسرے وہ جگہ لے سکتے ہیں نہ ہی ان میں اتنا ظرف ہوتا ہے۔

ابا جی کا ہمیشہ جواب یہ ہوتا تھا کہ دنیا ان مثالوں سے بھری پڑی ہے جہاں والدین کی غیر موجودگی یا موجودگی کے باوجود انسانیت کے متوالوں نے غیروں کی اولاد پالی ہو۔ اصل نکتہ صرف دلوں سے کینہ اور 'میرا تیرا' کا کلبلاتا احساس نکالنے کا ہے۔ ہماری امی جی نے ساری زندگی رشتوں کو احترام کے ناموں سے بلایا اور بغیر لیکچر دیے یہ تربیت نسلوں میں چلنے لگتی ہے۔ جب تک آپ دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا نہیں کریں گے، انھیں عزت سے نہیں نوازیں گے، تب تک آپ اپنے بچوں کی زندگیاں آسان نہیں کرسکتے۔

بچوں کے ہاتھ میں ترازو مت دیں کہ وہ والدین اور اپنے شریکِ حیات کے درمیان تعلق اور تابعداری کے باٹ ہی الٹ پلٹ کر رکھتا رہے اور زندگی میں رائیگانی کا احساس بڑھتا رہے۔

آج میں ممنونیت اور تشکر کے بے پایاں احساس کے ساتھ یہ تحریر کر رہی ہوں کہ عالیہ

نے اپنی شادی پر کوئی روایتی تکلف، فرمائش یا کپڑے لتے کا بکھیڑا نہیں ڈالا۔ میرے لیے یا اپنے شوہر کے لیے کوئی مشکل صورت پیدا نہیں کی۔ امی جی اور ابا جی کے تمام افکار اس کی زندگی میں عملی طور پر زندہ ہوگئے۔ دوسروں کو آسانیاں دینے کی فطرت اور اس کے سادہ انداز نے مجھے روایتی فکر مندی سے بچا لیا۔

ان کے نکاح کے بعد ایک دن میں عالیہ کی مسلسل ضد سے تنگ آ گئی کہ ''امی شادی کی تقریب بہت چھوٹی ہونی چاہیے، لوگ زیادہ نہ ہوں، کپڑے بہت مہنگے نہ ہوں، انگوٹھی بھی مناسب قیمت پر ہو۔ بس دکھاوا نہیں ہونا چاہیے۔''

''ایسا کرو،'' میں نے چل کر کہا، ''کھجوروں کا ایک ڈبہ لو اور کوپن ہیگن کے بڑے چوراہے پر جا کر چار بول پڑھوا لو۔ کھجوریں راہگیروں میں بانٹ دینا۔''

''ہائے امی جی، کاش یہ اتنا ہی آسان اور قابلِ عمل ہوتا۔ میں تو پتہ نہیں کس لمبے چوڑے حساب کتاب میں پھنس گئی ہوں۔ شادی میری ہے اور اس میں شور شرابا آپ کا۔ کیا وقت آن لگا ہے'' اس نے شرارت سے میری نقل کی، ''نکاح تو ہو چکا۔ تو اب ایسا کیوں ممکن نہیں کہ مختصر سی ایک تقریب ہو اور کام ختم؟''

میں نے روز روز کی اس تکرار سے تنگ آ کر مبین سے کہا، ''مبین بیٹا! اب میرا آپ کی بیوی کے ساتھ گزارا نہیں۔ یہ آپ کو بھی بہت تنگ کرے گی۔''

''کیا کریں؟ اب کیا ہو سکتا ہے؟ قسمت کا لکھا بس ایسا ہی ہے۔ گزارا کریں آپ بھی'' مبین نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''امی ۔۔! آپ میرے میاں کو کیا پٹیاں پڑھا رہی ہیں؟ حد ہوگئی ہے'' منکوحہ صاحبہ کھانے کی میز سجاتے ہوئے بڑبڑائیں۔

تاہم وقت نے ثابت کیا کہ اس کی رائے صائب تھی۔ اب جب بھی میرے تینوں بچے اکٹھے ہو جائیں یا دونوں خاندان باہم مل کر بیٹھ جائیں تو قہقہوں کی پھلجھڑیاں چھوٹتی رہتی ہیں۔ بڑے سے بڑے کام منٹوں میں حل ہو جاتے ہیں۔ ایک دن دونوں بہن بھائی سارا دن اکٹھے گپ شپ لگاتے رہے۔ رات کو ہمارے قانونی بیٹے مبین (داماد) بھی شامل ہوگئے۔ میں حسبِ معمول باورچی خانے میں کچھ لذتِ کام و دہن کا اہتمام کر رہی تھی کہ داماد صاحب اٹھ کر آئے...

''ساسو ماں جی! یہ دونوں مجھے تنگ کر رہے ہیں۔''

میں منصف کے فرائض انجام دینے باہر نکلی، ''بے شرمو کیوں بھائی کو پریشان کر رہے ہو؟'' میں نے خبر لینے کی کوشش کی۔

''نہیں نہیں میرے بھائی نہیں ہیں'' بی بقراطن نے جلدی سے میری تصحیح کی، ''احتیاط سے بولا کریں اور کہیں ساٹھ بندوں کا کھانا نہ فراہم کرنا پڑ جائے۔''

دونوں بہن بھائی کسی فلم کا تذکرہ کر رہے تھے جو مبین نے نہیں دیکھی تھی۔ انھوں نے کہا کہ میں بھی کل دیکھ لیتا ہوں، دونوں باآواز بلند اسے سٹوری سنانے لگے۔ منع کرنے پر ڈائیلاگ اور فلم کا اختتام دوہرا کر اسے زچ کرنے لگے۔

اُسامہ کو جب کسی کام میں مشورہ درکار ہوتا ہے تو فوراً مبین بھائی سے رابطہ ہوتا ہے۔ گھر خریدنے سے گاڑی کے انتخاب تک، چھٹیوں پر جانے کے پروگراموں سے ملازمت کی نوعیت تک، ہر بات میں اسے مبین بھائی سے مشورے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مجھے سمجھ ہی نہیں آتی کہ میں کیسے اس رحمت کا شکر ادا کروں جو اس پلے پلائے خوبرو بیٹے کی صورت میں رب العزت نے ہمیں عطا کی۔ میں نے مقدور بھر کوشش کی کہ زندگی کی تسبیح میں چن کر آبدار موتی ہی پروتی رہوں۔ میں نے پروردگار کی سب سے بڑی نعمت اپنے بچوں کی صورت میں پائی۔ یہ حقیر کاوش نعمتوں کے شکرانے کا ایک اظہار یہ ہے۔

ابا جی کی مسکراہٹ بھری آنکھیں یاد آتی ہیں، فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ''جانِ پدر، میں نہیں ہوں گا دیکھنے کے لیے، لیکن آپ پر رحمتوں کی بارش ہوگی، آپ کی زندگی کی بے مہری کا فولاد آپ کے ہاتھوں میں موم کی طرح ہوگا۔''

میں موبائل پر بلند آواز میں سورۃ رحمان لگاتی ہوں۔ ابا جی کی خوشبو کہیں رقصاں ہو جاتی ہے اور مجھے یقین ہونے لگتا ہے کہ وہ یہ سب عنایات اور زندگی کا تمام تر التفات میرے ساتھ ہی مل کر دیکھ رہے ہیں۔

••

دورانِ تعلیم عالیہ کی شادی کرنے کا فیصلہ بھی عام لوگوں کے نزدیک عجلت پسندی اور عاقبت نااندیشی سہی لیکن وقت نے ایک مرتبہ پھر ہمارا فیصلہ درست ثابت کیا۔

''جلدی کیا ہے؟'' یہ وہ سوال تھا جو اس وقت سے میرے تعاقب میں رہا جب اس کی عمر صرف تین برس تھی۔

قرآن پڑھانا شروع کیا تو اسی سوال نے کچوکا لگایا، ''آخر تمھیں جلدی کیا ہے؟''
اردو کا قاعدہ اس کے ننھے ہاتھوں میں دیا تو یہی سوال ابرو چڑھائے آن موجود ہوا، ''آخر تمھیں کس بات کی جلدی ہے کہ بچے سے کھیلنے کودنے کا وقت چھین لیا؟''
پورا ڈنمارک چھ برس کا بچہ سکول میں بھیجتا ہے۔ ''تمھیں کیا جلدی ہے؟ پانچ برس کی بچی کو سکول بھیجنا چاہتی ہو۔''
مجھے اگست کا وہ دن یاد ہے جب میں ہسپتال سے چند گھنٹوں کی رخصت لے کر آئی تھی تا کہ اس کے سکول کے پہلے دن اس کا ہاتھ پکڑ کر جا سکوں۔ نرس نے میری کنگھی کرنا چاہی تو دراز بالوں کے گچھوں کے گچھے اس کے ہاتھ میں آ گئے۔ شدید وحشت زدہ ہو کر میں نے پوچھا:
''میرے بال کیوں گر گئے سارے؟'' اس نے بے حد احتیاط سے بال سلجھائے اور نرمی سے بولی، ''ظاہر ہے اتنے دنوں بعد کنگھی کرو گی تو بال تو گریں گے۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ پیٹ کے ٹانکے کھل گئے اور تم نے اچھی غذا کھانا شروع کی تو چند مہینوں کے اندر آئرن اور خون کی کمی پوری ہو گی اور بال پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو جائیں گے۔ آپ تو نوجوان ہیں اور بہت باہمت ہیں۔''
کوئی جواب نہ پا کر کنگھا ہاتھ سے رکھ دیا پھر یوں بولی جیسے پانچ سال کی بچی کو بہلا رہی ہو...
''اتنے پتلے بال ہیں، ان کو کندھوں تک کٹوا دو تا کہ تم روز خود کنگھی کر سکو۔ تمھاری بیٹی تمھیں اچھے سے بال بنائے اور رنگ دار کپڑوں میں دیکھ کر کتنی خوش ہو گی۔ تم پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔'' طوعاً و کرہاً میں نے اس کی بات مان لی۔
لیکن جب میں عالیہ کے سکول پہنچی تو واقعی وہ مجھے دیکھ کر چہکنے لگی...
''امی آپ کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔ امی جی آپ کو پیلے کپڑے کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔''

اس کی استاد نے بھی مجھے خصوصی توجہ دی، اگرچہ وہ اس بات پر فکر مند تھی کہ عالیہ اپنے ہم جماعتوں سے ایک برس چھوٹی ہے اور آپ بھی مسلسل بیمار ہیں۔ اس سے بچہ مسائل کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ چند دنوں کی بات ہے، میں گھر آ جاؤں گی اور بچی کو مکمل توجہ ملنے لگے گی۔ سکول سٹاف کے لیے یہ بات ہضم کرنا مشکل تھی لیکن قانون کے مطابق یہ فیصلہ والدین کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرے انھیں علم تھا کہ میرا تعلق ہمیشہ درس و تدریس سے رہا ہے لہٰذا تعلیمی میدان میں

شاید مشکل نہ ہو لیکن جماعت میں واحد پاکستانی بچی، عمر میں چھوٹی، دیکھنے میں چھوٹی اور بہت کم آمیز بچی سماجی مسائل کا شکار ہوگی۔ میں نے مصلحت کی صورت نکالی کہ اگر ایسا ہوا تو ہم حل سوچ لیں گے۔ اسے پہلا قدم اٹھانے دیں۔

دیکھتے دیکھتے پہلا سال گزر گیا لیکن مجھے جس قدر محنت اور مسلسل مذاکرات کرنا پڑے وہ کچھ دل ہی جانتا ہے۔ سال کے آخر میں ایک طویل میٹنگ ہوئی۔ میز کی ایک جانب تین اساتذہ اور دوسری طرف میں اکیلی بیٹھی تھی۔ ڈینش کی استاد نے بات شروع کی۔ اگرچہ یہ بچی ذہنی طور پر اپنے ہم جماعتوں کے برابر ہے لیکن زیادہ گھلتی ملتی نہیں۔ اگلی جماعت میں مشکل ہوگی۔ ہمارا مشورہ ہے کہ اسے دوسرا سال بھی اسی جماعت میں رہنے دیں۔ میں خاموشی سے سارا لیکچر سنتی رہی۔

پھر میں نے صرف چند سوال اٹھائے، ''کیا اس کی جماعت میں بڑے بچوں میں سے کسی کو یہ سوشل رویے کا مسئلہ نہیں؟ کیا اس کی ماں کی بیماری کے علاوہ باقی اکیس بچوں میں سے کسی کے گھر میں کوئی مسئلہ نہیں؟ کیا ابتدائی مرحلے پر اس عمر کے بچے کی ذہنی صلاحیت پر بھروسہ کرتے ہوئے اسے جماعت کا اقلیتی بچہ ہوتے ہوئے ایک نئے کلچر میں ضم ہونے کا موقع دینے کے بجائے اسے یہ احساس دلانا مناسب ہے کہ اب وہ نئے ہم جماعتوں کے ساتھ نئی ہم آہنگی پیدا کرے؟ کیا اس سے سوشل مسائل نفسیاتی مسائل میں نہیں بدل جائیں گے؟''

ایک گھنٹے کی ملاقات کے بعد جب میں باہر نکلی تو ایک مرتبہ پھر میرا فیصلہ منظور ہو چکا تھا کہ میری بچی اگلی جماعت میں بیٹھے گی۔ ابا جی نے مجھے جہلم کانونٹ میں پڑھانے اور بی ایڈ کرنے کے مواقع شاید اسی دن کی یہ جنگ جیتنے کے لیے دیے تھے۔ میں خود اپنے سکول میں جماعت میں چھوٹی تھی لیکن ابا جی کو ایک سال میں دو دو جماعتیں پاس کروانے کا جنون بھی تھا۔ اگر مجھے ایک چھوٹے سے شہر میں رہ کر مسئلہ نہیں ہوا تو میری بچی تو یورپ کے ترقی یافتہ ترین ملک میں موجود تھی اور میں ابا جی کی طرح گیلی مٹی کو چاک پر گھمانے کا عزم لیے ہوئے تھی۔

پھر جب وہ منزلوں پر منزلیں مارتی نویں جماعت میں پہنچی اور دسویں جماعت کی دہلیز ایک زقند میں پھلانگ کر براہِ راست نویں جماعت سے کالج جا پہنچی تو سوالیہ لہجے مزید تند ہو گئے، ''جلدی کیا ہے؟ اتنی سی بچی کو اٹھا کر کالج جا ڈالا، اسے دسویں جماعت میں بیٹھنے دو تا کہ کالج کے لیے تیار ہو سکے۔''

میں حوصلہ شکنی کی اس دو دھاری تلوار پر کسی بازیگر کی سی مہارت سے چلتی رہی۔ زندگی

نامہربان سہی لیکن اس کا ہر پڑاؤ ثابت کرتا رہا کہ سارے فیصلے بروقت ہوئے اور درست ہوئے۔

کم عمری میں درس و تدریس کی ابتدا کی یہی پیچیدہ صورت میرے بیٹے کے ساتھ بھی رہی۔ لیکن اس مرتبہ میں سارے پیچ وخم سے آگاہ تھی۔ اس کے سکول کے پہلے دن جو ماں اس کا ہاتھ تھامے گئی وہ ڈینش زبان اور ڈینش ادب کی تعلیم حاصل کرنے کی ابتدا کر چکی تھی اور اس کا دوسرا قدم ایک ڈینش سکول میں درس و تدریس کے میدان میں معاون معلمہ کا تھا، سو یہ معرکہ بخوبی سر ہوگیا۔ دونوں اپنی عمر سے دو برس آگے رہے۔

اب دورانِ تعلیم شادی کا فیصلہ اہم ترین تھا۔ ایک مرتبہ پھر، ''جلدی کیا ہے'' کا سوال میرے سامنے رکھا گیا۔ تعلیم سے توجہ ہٹ جائے گی۔ شادی شدہ زندگی آسان نہیں ہوتی۔ ہمارا زمانہ اور تھا۔ دو چار سال میں کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن میں نے ایک مرتبہ پھر یہ فیصلہ سب کی آراء کے خلاف کیا اور وقت نے ثابت کیا کہ یہی فیصلہ درست تھا۔ بچوں کی شادیاں کر کے ذمہ داریوں سے آزاد ہونے کا خواب دیکھنے والی ماؤں کو علم ہونا چاہیے کہ یہ نئی ذمہ داریاں ہیں جو آپ کے صبر و تحمل کا امتحان ہوتی ہیں۔ ماں کی توجہ، محبت اور دور اندیشانہ رہنمائی بچی کے ساتھ ہو تو وہ متزلزل نہیں ہوتی۔ مجھے علم تھا کہ عالیہ کی تعلیم مکمل کرانے کے لیے مجھے مکمل ذمہ داری سے اضافی فرائض ادا کرنا ہوں گے۔ میں ان دلکش فرائض کی ادائیگی اور بچوں کی مدد اور رہنمائی کے لیے تیار تھی۔ عالیہ کے جانے کے احساس سے مجھے اچانک ایک دل گرفتگی کی دبیز دھند آ گھیرتی۔

عالیہ کے نکاح پر میری ایک مرتبہ پھر بڑی آزمائش تھی۔ بچوں کی خاطر زندگی وقف کر دینے والے جانتے ہیں کہ تنِ تنہا بچوں کو پالنے اور ایک مضبوط شخصیت بنانے کے بعد ان کے نقطۂ نظر سے بغیر کسی دلیل کے ٹکر لینا سہل نہیں۔ میں نے رات کے کھانے پر غیر رسمی اعلان کیا کہ بچوں کے والد اور چچا جان نکاح پر مدعو ہیں۔ میری خواہش ہے کہ اسلامی شعار اور انسانی معیار کے مطابق وہ اپنی بیٹی کے نکاح نامے پر خود دستخط کریں۔''

''امی ی ی ی، جب ہماری زندگی، تعلیم، معاملات اور اخراجات میں کبھی 'کسی' کا حصہ نہیں رہا تو ہماری زندگی کے اس اہم موقع پر بھی نہیں ہوگا'' ہمارے نئے نئے جوان ہوتے فرزندِ ارجمند بولے۔

''امی جی! پلیز اب ایک نیا پنڈورا باکس نہ کھول دیجیے گا'' ہماری صاحبزادی نے مودب سی سرزنش کی۔

''آپ دنیا کی وہ واحد غیر دانش مند خاتون ہیں جو اپنی فتوحات کا پرچم دوسرے کے ہاتھ میں دے دیتی ہیں'' ہمارے قانون دان برادر خورد بولے۔

''بات سنو'' میں نے بچوں کو بٹھا لیا۔ چونکہ ہمارے گھر میں حاکمانے نہیں چلتے دوطرفہ مکالمہ ہوتا ہے سو مجھے بہت مصلحت اور حکمت کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کرنا تھا۔ عام والدین کی طرح منطقی طور پر ہارتے ہوئے شرعی احکامات کا بیان اس لیے فائدہ مند نہیں تھا کہ دونوں مجھ سے بہتر دین اور فقہ سمجھتے تھے۔ اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ کے مطابق بحث بھی بہتر انداز میں کرسکتے تھے جوان بچوں کے ساتھ مکالمے کی تیاری والدین کو بھی کرنا پڑتی ہے۔ 2012 کی بڑی سرجری کے بعد میری طبیعت بھی زیادہ بہتر نہیں رہتی تھی۔ بچوں سے بحث کرنے کے بجائے ان کے احساس کو جگانے کے لیے مجھے اپنی خرابی صحت کے پتے کو کھیلنا تھا۔ ہم گھر کے ماحول سے نکل کر ٹرکش ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے چلے گئے۔ گپ شپ اور ہنسی مذاق کے بعد وہیں بات شروع کی کہ اس آپریشن کے بعد زیادہ پریشان کن باتوں اور بلاوجہ کی کشمکش سے نمٹنے کے لیے اب اعصاب نہیں رہے اس لیے میری بات آپ دونوں ٹھنڈے دل سے سنیے۔

''دو باتیں ہیں۔ اول یہ کہ آپ کے والد اور آپ کسی بھی مقام پر پہنچ جائیں، یہ حقیقت کبھی تبدیل نہیں کرسکتے کہ آپ کی رگوں میں ان کا خون ہے۔ اللہ نے ہر کام کا وسیلہ بنایا ہے اور مجھے اس نے اسی وسیلے سے اولاد سے نوازا۔ دوم یہ کہ میرے والد نے مجھے یہ سبق دیا کہ اپنے بچوں کو اچھا انسان بنانا، صرف اچھی اولاد نہیں بنانا جو محاذ پر آپ کے ساتھ کھڑی ہو۔ یہ عاقبت نااندیش ماؤں کا وطیرہ ہے۔ آپ کے لیے میں نے جو کچھ کیا، وہ میرا فرض تھا۔ اس میں کوئی احسان والی بات نہیں۔ آپ لوگ نہ ہوتے تو میری زندگی کیسے گزرتی؟

''رہی یہ بات کہ ماضی میں کیا ہوا، کس نے کسے تکلیف دی؟ تو آپ کو علم ہونا چاہیے کہ ہماری زندگی میں جو بھی آزمائش آئی وہ ہمارے نصیب کی تحریر ہے اور وہ ہر گز پوری ہونا تھی۔ ویسے بھی زندگی کا کیا اعتبار، مجھے اللہ نے نئی حیات بخشی، اس لیے نہیں کہ پرانے اور جاہلانہ طریقوں کو لے کر آگے بڑھوں، بلکہ اس لیے کہ اس نظام میں ایک تبدیلی لائی جائے خواہ وہ تبدیلی ہمارے اپنے قدموں کے گرد ہو، محدود ہو'' میں نے ابا جی کے الفاظ دوہرائے۔

''آپ کو ناگوار گزرے یا اختلاف ہو تو ہو، لیکن ایک بات طے ہے میرے بچو کہ نکاح نامے میں ولدیت کے خانے میں آپ کے والد صاحب ہی کے دستخط ہوں گے۔''

اب کے میں نے بات کہہ کر قلم توڑ دیا۔ یہ ان کی زندگی میں پہلا واقعہ تھا کہ میں نے کوئی بھی بات اس روایتی انداز میں کی۔ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

''امی!'' ہمارے صاحبزادے بولے،''آپ سوچ لیں، آپ کو علم ہے کہ ہمارے رابطوں کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکلا۔ آپ کی خیر سگالی کی تمام تر کاوشوں کو منفی رنگ دیا جاتا رہا۔ لوگوں کو راہ چلتے فائدے اور مقام حاصل ہوتے ہیں تو وہ اس کی قدر نہیں کر سکتے۔ مان جائیں میری بات۔ اپنی ذات کی تکریم خود کرانا ہوتی ہے۔ وہ حقوق طشتری میں ڈال کر نہیں دیے جاتے جو لازم بھی نہ ہوں۔''

''جی امی، ابھی آپ کی طبیعت پوری طرح سنبھلی نہیں۔ کئی سال لگ جاتے ہیں اس آپریشن کے بعد جسمانی اور ذہنی طور پر سیٹ ہونے میں۔ ہم کسی نئی آزمائش سے نہیں گزر سکتے۔ آپ دوبارہ سوچ لیں'' نیم حکیم عالیہ بھائی کی حمایت کرتے ہوئے بولی۔

''یعنی آپ مجھے کہہ رہی ہیں کہ میرا دماغ درست نہیں اور مجھے علم نہیں میں کیا سوچ اور کہہ رہی ہوں، اور مجھے دوبارہ سوچ سمجھ کر بات کرنا چاہیے؟''

''حد ہوگئی امی، میں تو آپ کے لیے فکر مند ہوں۔ آپ کو علم ہے کہ جو آپ سوچ رہی ہیں وہ ایک آئیڈیل صورت ہے اور میں آپ کی سوچ پر فخر کرتی ہوں، لیکن ہمارے حالات میں یہ ایک یوٹوپیا ہے۔ خواہ مخواہ سچویشن خراب ہوئی تو آپ کو ہی زیادہ تکلیف ہوگی۔''

میں نے کوئی جواب دیے بغیر اٹھ کر جوتا پہنا، گاڑی کی چابی اٹھائی اور سمندر کی طرف روانہ ہوگئی۔ مجھے علم تھا کہ میں نے اب دونوں کے پاس اختیار کوئی نہیں چھوڑا۔ اللہ کے کرم اور میرے والدین کی دعاؤں کے صدقے میں مجھے اولاد کی صورت میں مکمل راحت دی گئی۔ سکون اور تسکین کا یہ احساس دل اور روح کو کوئی کچوکا نہیں لگنے دیتا، کسی منفی سوچ کے سنپولیے نہیں پالتا اور ذہنی سکون اللہ کی بہترین نعمتوں میں سے ایک ہے۔

سمندر کے کنارے رہنے کا اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو مگر ایک بات طے ہے کہ یہ نظر میں تنگی اور طبیعت میں کثافت نہیں بھرنے دیتا۔ میں نے سمندر کے کنارے بیٹھ کر نجانے کتنی صدیاں بسر کیں۔ کتنے فیصلے کیے۔ کتنی مرتبہ لوگوں کو اور نجانے کتنی مرتبہ خود کو معاف کیا۔

رشتے سب حباب ہیں۔ ان کے رنگ اور ان رنگوں کا رقص بس تب تک ہی ہے جب تک زندگی کی بوتل میں صابن ملا پانی ہے۔ لبوں سے صبر کی نلکی لگائے رشتوں کے بلبلے اڑاتے رہو۔ یہ سارا کھیل بس اس سانس کی پھونک اور صابن کے پانی کا ہے۔ یہ ختم ہوگیا تو سب ختم۔ یہ سمندر

لمحوں میں حباب اڑاتا اور اچھالتا پھوڑتا رہتا ہے۔ اس کے سینے پر کوئی زخم نہیں ہوتا۔ اس کے ہاتھوں پر کہیں خون نہیں ہوتا اور اس کے چہرے پر کوئی داغ نہیں ہوتا۔ بس سمندر اور اس کی روانی رشتوں کے حباب تا حدِ نظر، حباب بن رہے ہیں، بگڑ رہے ہیں۔ ان کے تسلسل میں ہی زندگی کی کہانی ہے۔ کوئی ایک ٹوٹ گیا تو سمندر دوسرا دلا دے گا۔ جب تک جیو بس حباب ہی گنو۔ میں اس شام دیر گئے تک سمندر کے کنارے بیٹھی رہی۔

ابا جی کی تربیت اور امی جی کی مثالی زندگی کے عملی نمونے نے عورت کے روایتی جذباتی پن کو کبھی مجھ پر سوار نہیں ہونے دیا۔ ان کا کام مسلسل میری رہنمائی تھا۔ وہ مختلف انداز میں مجھے ایک ہی بات کی یاددہانی کراتے رہتے...

''دیکھو میرا بچہ! جہاں اتنے سال پکا کر دیا، کما کر دیا، پڑھا دیا، اپنی ماں کی تربیت کے مطابق ایک خاندان کو جوڑ کر رکھا، مل کر رہنے کی رِیت ڈالی، اب میں رہوں یا نہ رہوں آپ نے یاد رکھنا ہے کہ ہم دنیا میں جوڑنے کے لیے آئے ہیں۔ توڑنے کے لیے جاہل ماؤں کی کمی نہیں۔ آپ نے ثابت کرنا ہے کہ ہمیں اللہ نے نسل در نسل کینہ اور بغض پھیلانے کے لیے یہاں نہیں بھیجا۔ اپنے بچوں کو نافع انسان بنائیں۔ جو آپ کا فرض ہے اسے پورا کریں۔ دوسرے کیا کرتے ہیں اور ان رشتوں پر کتنی سرمایہ کاری کر سکتے ہیں، کیسے ان کو کما سکتے ہیں، وہ آپ کی سردردی نہیں۔ آپ کو اللہ نے اپنے خاص کرم سے قلم اور بیان دونوں کی دولت سے نوازا ہے۔ ان سے ایسی لغزش نہیں ہونی چاہیے کہ جب آخرت میں اس کی جواب طلبی ہو تو ندامت اٹھانی پڑے۔ آپ کسی کی حق تلفی مت کریں۔ ایسے فیصلوں کے لیے آگ کے الاؤ سے گزرنا ہوتا ہے۔ یہی امتحان ہے لیکن یہی کسوٹی بھی ہے۔ یا تو انسان کنکر ثابت ہو جاتا ہے یا پھر کندن بن کر نکلتا ہے۔'' یہ درس ہمیشہ میری زندگی کی لگام اپنے ہاتھ میں تھامے رہے۔

یہی وجہ تھی کہ عالیہ کے نکاح پر بچوں کے ساتھ میرا مباحثہ کئی دن جاری رہا اور ہر بات احترام سے ماننے والے بچے میرے ساتھ بحث و تمحیص کرتے رہے لیکن میں اپنی اسی تربیت کے تحت اپنے فیصلے پر مصر رہی جو ابا جی نے اپنی عملی زندگی سے دی کہ اولاد، والدین کی سانجھی ہوتی ہے۔ حالات کچھ بھی ہوں، دونوں میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کو مامتا اور شفقت سے محروم نہیں کر سکتا اور نہ کرنا چاہیے۔

میرا موقف ابا جی کی طرح صریح تھا۔ ''ہمیں کسی سے کوئی اقتصادی امداد نہیں لینی۔ وہ

کرنا ہے جو انسانیت کا تقاضہ ہے۔'' میں نے دونوں کی ایک نہ چلنے دی اور عالیہ کے نکاح نامے پر اس کے والد ہی کے دستخط کرائے۔ بعد میں حالات نے جو رخ اختیار کیا وہ میری ذمہ داری نہیں تھی۔ بطور انسان میرا فرض یہی تھا کہ حتی الوسع حقوق العباد پورے کیے جائیں۔

ابا جی کی تربیت اور دوستانہ پند ونصائح کہاں کہاں میرے کام آئی۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ''بیٹا جذباتی اور ذہنی مسائل وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں گھر کے ماحول میں بچپن مسائل کا شکار رہا ہو۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کے سر پر صرف میرا ہاتھ نہیں بلکہ لالہ جی کا سایہ بھی رہا۔ آپ ہم چھ بھائیوں کی لاڈلی اور اکلوتی اولاد کی طرح پلیں۔ باقی لڑکیاں اور بہنیں اور خاندان کے ماشاء اللہ دو درجن لڑکے آپ کے پیش منظر کے سامنے پس منظر میں چلے جاتے تھے۔ اپنے بچوں کو جذباتی اور ذہنی طور پر اپاہج نہ بنائیں۔ وہ جس کا خون ہیں اسی کے رہیں گے۔ ہاں، ان کا والد اپنی اولاد کو کیسے کماتا ہے، یہ اس کی آزمائش ہے۔ آپ کی آزمائش صرف یہ ہے کہ بچے اچھے، متوازن اور نافع انسان بنیں جن کے دلوں میں ادب اور احترام کا جذبہ موجود ہو۔ ان کے دلوں میں عداوت، بغض، کینہ اور جانبداری کی تخم ریزی نہ ہو۔''

''جی ابا جی'' میں نے حسبِ معمول مختصر جواب دیا۔ میں بھی ان کی ہر تمہید کا مطلب سمجھ سکتی تھی۔ پھر جب کبھی میرا بیٹا سکول سے آتے ہی بستہ رکھتا اور پیسے مانگتا۔

''امی جی بس کا ٹکٹ خرید دیجیے مجھے ابو سے ملنے جانا ہے'' میں چون و چرا کیے بغیر، موسم کی سردی سے آنکھیں بند کیے اس کے ہاتھ پر سو کراؤن رکھ دیتی۔ کبھی فرمائش کرتا۔

''امی جی، چاچی اور بچے آ رہے ہیں ڈنمارک، میں چاہتا ہوں وہ سب ہمارے گھر رہیں۔'' میں نے خاموشی سے اپنا بیڈروم خالی کر دیا اور تکیہ اٹھا کر عالیہ کے کمرے میں چلی گئی۔

''امی جی سب کی پسند کی ڈشز بنائیں مل کر؟'' وہ کہتا، ہم تینوں باورچی خانے میں جت جاتے۔ میرے اپنے ذہنی سکون کے لیے یہی بات بے حد اہم ہے کہ میں نے حتی الوسع کوشش کی کہ کسی کی حق تلفی اور دل شکنی نہ ہو۔ بساط بھر جد و جہد کہ زندگی میں دراڑیں اور خلیج نہ بنائی جائے بلکہ آبجو کی صورت راستے ملا دیے جائیں۔ میرے بچوں نے اپنے ابتدائی بچپن سے اپنے گھر میں اپنے ددھیالی رشتوں کی اسی طرح پذیرائی دیکھی جیسے کبھی ہم نے اپنے بچپن میں بالکل فطری انداز میں یہ رہن سہن دیکھا۔ اُسامہ کو شعور سنبھالنے پر علم ہوا کہ عائشہ اور شعیب اس کے سگے بہن بھائی نہیں بلکہ چچا زاد بہن بھائی ہیں۔

میں زندگی کی طویل جد و جہد میں متوازن اور مثبت تربیت کے لیے اپنے والدین کی ابد الآباد تک احسان مند اور دعا گو رہوں گی۔ ابا جی، جب میں آپ سے ملوں گی اور میری روح آپ کی مقدس روح کے گلے لگے گی تو آپ کو کوئی ندامت نہیں ہوگی۔ میں نے بساط بھر کوشش کی کہ ذاتی انا اور عناد کو کبھی راستے کی دیوار نہ بننے دوں۔ میری مکمل توجہ اسی بات پر رہی کہ کسی سے گلہ اور تقاضہ کیے بغیر اپنے فرائض نبھاتی چلی جاؤں۔

عالیہ نے نکاح کے لیے سفید جوڑے کی فرمائش کی۔ اس کی بڑی ممانی جان نے جس طرح عالیہ کی شاپنگ اور کپڑوں کی سلائی میں مدد کی، شاید اس کا شکریہ کبھی ادا ہی نہیں ہوسکتا۔ میڈم میڈم کھیل کر جاب سے گھر آتیں، چلو بھئی، تیار ہوجاؤ، بازار کی یاترا شروع ہوجاتی۔ انھوں نے ڈریس پسند کیا اور عالیہ کو تصویر بھیج دی گئی۔ اپنی طبیعت کے قلندرانہ پن کی وجہ سے اسے فوراً پسند آ گیا۔ اس کی فرمائش تھی کہ اس کی سلائی بہت اچھی ہونی چاہیے اور مغربی انداز کا لانگ ڈریس ہو۔ بھابی نے جس طرح وہ لباس تیار کر کے ایک دن کے اندر منگوایا وہ بھی ایک کارنامہ تھا۔ بھائی جان کو فون کھڑکایا گیا کہ آپ جب کھاریاں کورٹ سے واپس آئیں تو رابطے میں رہیں، آدھے راستے سے بچہ آپ کو پارسل پکڑا جائے گا۔ مجھے بہت ہنسی آئی، میں نے کہا یہ تو منشیات سمگل کرنے سے زیادہ لمبی پلاننگ ہے۔

''یہ پکڑو کپڑے، یہ اس کا نکاح کا ڈریس ہے، یہ لباس میری طرف سے ہے،'' انھوں نے بے حد دلکش میکسی جیسا لباس نکالا۔ ''یہ جب وہ اپنی سسرال جائے گی تو پہنے گی۔''

انھوں نے امی جی کی کمی محسوس ہی نہیں ہونے دی۔ میری ساڑھیاں ڈرائی کلین کروا کے تیار کر چکی تھیں۔ سٹور میں رکھے بڑے سوٹ کیس میں نفاست سے ہر چیز پیک تھی۔ عالیہ نے نکاح پر وہ سادہ سا چاندی کا سیٹ پہنا جو اس کی پیدائش پر بڑی بھابی نے مجھے دیا تھا۔

اس کی پارٹی کا لباس ڈاکٹر ساجدہ نے اور میں نے ڈیزائن کر کے بنوایا۔ عالیہ نے ٹی پنک رنگ کی فرمائش کی۔ اسے تمام تصاویر بھیجی گئیں۔ حسبِ معمول اس نے سادہ سا میکسی ڈریس پسند کیا۔ اس کے میچنگ سیٹ کے لیے میں اور ساجدہ دو ہی پھیروں میں کام مکمل کر چکے تھے۔ چاٹ اور گول گپے کھاتے کھاتے کام مکمل کیا۔ بوتیک والے کو ادائیگی کی گئی کہ شام سے پہلے لباس تیار کر کے بھیج دینا کیونکہ اگلے دن واپسی ہے۔ رات کو ملازم آ کر لباس پہنچا گیا اور آسانی سے ساری تیاری مکمل ہوگئی۔ کوئی بدنظمی، افراتفری یا شور شرابا نہیں۔ بقول ساجدہ کے، ''ایسی آسان دولھن کے ایسے فنکشن تو بائیں ہاتھ کا کام ہیں۔''

••

عالیہ کے نکاح کے دن میرے لیے بے شمار امتحانات سمندری بلاؤں کی طرح منہ کھولے کھڑے تھے۔

''بہن صدف مرزا! ذرا میری بات سنیئے'' امام صاحب نے مجھے عورتوں اور مردوں کے درمیان لگائی گئی دیوار کے پاس آ کر آواز دی۔

میں کئی راتوں کی جاگی ہوئی مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف اور بیٹی کے پرایا ہو جانے اور قسمت کے بند گنبد کے باہر غیر یقینی کے عالم میں بے بس کھڑے ہونے کے احساس کے ساتھ مسلسل برسرِ پیکار تھی۔ جلدی سے اٹھ کر گئی۔

''باجی، آپ ٹھیک ہیں؟'' انھوں نے بے حد پرسکون لہجے میں پوچھا اور میرے اثبات میں جواب دینے پر اپنی بات جاری رکھی۔

''باجی آپ نے سوچا ہے کہ بیٹی کا حق مہر کیا مقرر کرنا ہے؟ ابھی لینا ہے یا لکھوانا ہے؟ اور حق مہر ہوگا کتنا؟ آپ کی لڑکے والوں سے کوئی بات ہوئی یا نہیں؟''

''ہائیں، یہ باتیں بھی کرنا ہوتی ہیں؟'' بھک سے میرا دماغ اڑ گیا۔

''پتہ نہیں بھائی، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں اور نہ ہی اس بارے میں کسی سے کوئی بات ہوئی''، میں واقعی حواس باختہ ہو گئی۔

انھوں نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور پھر بولے، ''آپ لڑکے والوں سے بات کر لیجیے، میں انتظار کر لیتا ہوں۔''

نکاح سے عین چند لمحے پہلے اس اہم بات کا تذکرہ؟؟؟ مجھے لگا جیسے میری روح زمین و آسماں کے درمیان کہیں معلق ہے۔ خیر میں نے بچوں سے بات شروع کی۔ میرے قد سے بالشت بھر اونچے سپوت نے میرے شانوں پر بازو پھیلائے اور مسکرانے لگا...

''امی! فکر کی کیا بات ہے؟ یہ فرسودہ باتیں ہیں۔ بلاوجہ کے جھگڑے۔''

''حق مہر؟'' دولھن صاحبہ کو ہنسی آ گئی، ''امی حق مہر کی کیا بات ہوئی بھلا؟ کوئی چودہ صدیاں پہلے کا زمانہ ہے کیا جب مرد جنگوں میں شہید ہوتے تھے اور عورت کو اقتصادی طور پر مضبوطی درکار تھی؟''

اس وعظ پر میرا جی چاہا کہ سفید کپڑوں میں ملبوس اس لڑکی کو ایک زبردست سی چپت

لگاؤں۔ مسجد میں موجود سب مہمان ہمیں دیکھنے لگے۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ مجھے واقعی اپنی کم عقلی اور ان دونوں کی غیر سنجیدگی پر تاؤ آنے لگا۔ مجھے خود ہی اس موضوع پر بات کر لینا چاہیے تھی لیکن میرے ذہن میں حق مہر کوئی مسئلہ تھا ہی نہیں اور نہ ہی میری بیٹی کی نئی فیملی نے اسے کوئی جواز بنایا۔ حتیٰ کہ جرمنی سے مبین کے ماموں محترم بھائی مظہر چودھری شادی سے پہلے تشریف لا چکے تھے۔ ہشاش بشاش اور خوش مزاج مظہر بھائی نے سوائے اپنی بہو کے آگے پیچھے پھرنے کے اور کوئی کام نہیں کیا۔ نہ ہی کسی بھی قسم کا کوئی ایسا مسئلہ، کوئی شرط نامہ، کوئی سیکورٹی ہمارے درمیان آئی۔

بہرکیف دولھے والوں سے بات شروع ہوگئی۔ مظہر بھائی اور بشریٰ جی بلا جھجک بولے کہ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، جو آپ حکم کریں۔ اگرچہ دونوں خاندانوں کی اس بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی لیکن ان کی جانب سے اتنا خلوص اور ایسی اصرار بھری رضامندی تھی کہ ہمیں کسی بھی لمحے کسی بھی بے یقینی اور عدم تحفظ کا احساس نہیں ہوا۔ مزید یہ کہ میرا نقطۂ نظر واضح تھا کہ ان بچوں نے زندگی گزارنی ہے، ان کے لیے سہولتیں اور آسانیاں پیدا کی جائیں۔

دولھن سے کہا گیا کہ آپ جو چاہیں حق مہر مقرر کر لیں۔ جواب میں دولھن نے پہلے حیرانگی کا مظاہرہ کیا اور پھر محظوظ ہو کر دانت نکالے۔

''یہ مہر وہر سب ایسے ہی باتیں بنی ہوئی ہیں'' دولھن صاحبہ نے ارشاد فرمایا، ''میں ان چیزوں پر یقین نہیں رکھتی۔ جب قرآن وسنت میں ان باتوں کا حکم آیا تھا تو وہ عورت کی اقتصادی مضبوطی اور گارنٹی کے لیے تھا چونکہ تعلیم نہیں تھی اور مرد چار شادیاں کرنے کو ہمہ وقت تیار تھے۔'' عالیہ نے جیسے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

میں اس لیکچر کے لیے قطعی کے لیے تیار نہیں تھی۔ میں نے اسے ناراضگی سے دیکھا۔

''یہ کیا موقع اور وقت ہے ان نادر خیالات کے اظہار کا؟''

''امی! آپ کا حق مہر کتنا مقرر کیا تھا نانا ابو نے؟'' اس نے میرے کندھے پر جھک کر سرگوشی کی۔

''یہ کون سا موقع ہے گڑے مردے اکھیڑنے کا؟'' عجیب پاگل لڑکی ہے۔ موقع کی نزاکت دیکھے بغیر باچھیں پھیلائے جا رہی ہے۔'' میں نے سخت نالاں ہو کر اسے گھورا۔

''بتائیں ناں، آپ تو ملک سے باہر جا رہی تھیں؟ کوئی گارنٹی؟ کوئی لمبا چوڑا حق مہر لکھوایا

نانا ابو نے؟؟'' اس نے سوال مزید واضح کیا۔

''ایک ہزار روپے'' یقیناً میں نے جل کر جواب دیا ہوگا۔

''اچھا؟'' وہ پھر ہنس دی۔

اگرچہ عالیہ کی خواہش تھی کہ ان کا نکاح ڈینش مسلم امام عبدالواحد پڑھائیں لیکن مبین کی اور اہلِ خانہ کی ترجیح محترم امام سراج کی خدمات لینے کی تھی۔ امام سراج صاحب جو کوپن ہیگن کے سب سے بڑے اسلامک ادارہ منہاج القرآن کے انتہائی باشعور اور نوجوانوں کے پسندیدہ امام ہیں اور اپنے مزاج اور محبت کے لیے ان لوگوں میں بہت مقبول ہیں۔ اس دن ان کی طبیعت ناساز تھی لیکن وہ پھر بھی تشریف لے آئے۔ وہ نہ صرف یورپی ماحول کو سمجھتے ہیں بلکہ یہاں کی طرزِ معاشرت اور نوجوانوں کے ذہن کے مطابق ان سے بات کرتے ہیں۔ میں نے اپنی طویل بیماری کے بعد اس ادارے میں کچھ عرصے کے لیے رضا کارانہ کام کیا اور بچوں کو اردو پڑھائی۔ اس دوران ویمن ونگ کی روح و رواں نفیس فاطمہ افتخار نے میرے تدریس کے شوق اور صحت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مکمل اختیار دیا کہ جب چاہوں آؤں اور اردو کمپیوٹر یا اردو پڑھا دیا کروں۔

مجھے وہ مہربان دن ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ہماری پہلی اردو کانفرنس میں بھی ادارے کا تعاون اور مہمانوں کی پذیرائی میں وہ سب برابر شریک تھے۔ اس ادارے نے یہاں عورتوں کو آگہی دینے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ لکھنا مجھ پہ قرض ہے۔

بہرحال امام صاحب نے بہت نرمی سے کہا، ''بیٹا ایسے نہیں کہتے۔ حق مہر سنتِ نبوی ﷺ ہے۔''

''جی سنت تو ہے لیکن مسلمانوں نے اسے جھگڑا بنا لیا ہے'' وہ مصر رہی۔ ہزار میں نے اسے امام صاحب کی نظر بچا کر آنکھیں دکھانے کی کوشش کی، گھور کر دیکھا اور چپ رہنے کا اشارہ کیا لیکن مجال ہے جو اس نے میری طرف سرسری نظر بھی ڈالی ہو۔

''جیون جوگیے، ذرا یہ وقت گزر جانے دے، پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے'' میں نے دل ہی دل میں اس سے مکالمہ کیا۔

''لیکن بیٹا، آپ تو حق مہر طلب نہیں کر رہیں! یہ مسنون ہے اور شریعت کے مطابق کم سے کم حق مہر کی جو رقم ہے وہ تو آپ کو لینا ہی پڑے گا۔'' امام صاحب نے نرمی سے کہا۔

''جی امام صاحب، یہ بھی مذکور ہے کہ جو اپنی مرضی سے چھوڑنا چاہے اس پر کوئی اعتراض

نہیں'' دولھن صاحبہ بھی اسی دھیمے لہجے میں بولی۔
''پتر توں اِک واری گھر چل تے سہی، پھر میں تمھاری ساری علامہ گیری نکالوں گی'' میں نے دل ہی دل میں جل کر سوچا۔ ہم چاروں پردے کے قریب کھڑے آہستہ آواز میں بات کر رہے تھے۔ مٹھی بھر مہمانوں کی نگاہیں ہم پر مرکوز تھیں۔
''آپ ایسا کیجیے کہ ہم نے جو کم سے کم حق مہر مقرر کر رکھا ہے وہ تو فی الحال لیں۔ پھر بعد میں جو چاہیں کریں'' امام صاحب نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔
''جی بہتر'' سفید لباس میں اس کے معصوم چہرے پر ایک مکمل اطمینان کی کیفیت تھی۔
میں نے سکون کا سانس لیا۔ نکاح کی کارروائی شروع ہوئی۔ مائک پر امام صاحب کی نرم اور پرسکون آواز ابھری، ''ہماری بے حد محترم بہن صدف مرزا کی بیٹی عالیہ حسین کے نکاح کا بابرکت موقع ہے۔ ہم دلی دعاؤں کے ساتھ اور اللہ کے بابرکت نام کے ساتھ اس کا آغاز کرتے ہیں۔
''پیاری بیٹی آپ پر اس نکاح کے لیے کوئی جبر کوئی دباؤ تو نہیں؟''
''جی نہیں'' ایک واضح جواب کی صورت میں اس نے کہا۔
''آپ کی کوئی شرط، کوئی مطالبہ کرنا چاہیں؟'' مائک پر دوبارہ وہی بات دوہرائی گئی۔
''جی نہیں'' پہلے سے بھی زیادہ مضبوط آواز آئی۔
''پیاری بیٹی میں پھر دوہراتا ہوں کہ اس نکاح میں آپ کی رضا، آپ کی رغبت شامل ہے؟ آپ پر کسی قسم کا دباؤ نہیں، کوئی مجبوری نہیں؟ کسی بھی قسم کسی بھی طرح کا آپ کا کوئی مطالبہ ہو تو آپ کو پورا حق حاصل ہے۔''
''جی نہیں'' میری ہستی اس وقت صرف سماعت تھی۔ مجھے اپنے چاروں جانب کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پتہ نہیں دور کہیں دل کے پاتال میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں یا کٹی ہوئی آنول کی ٹیسیں پھر سے بیدار ہوگئی تھیں۔ شاید ابا جی کے بغیر دنیا میں تنہا رہنے کا ایک نوکیلا احساس یا شاید مکمل بے اختیار ہونے کی کیفیت کا غلبہ اشک بن کر آنکھوں میں بھنور ڈال رہا تھا اور میری بصارت کو زائل کر چکا تھا۔
''پیاری بیٹی آپ کوئی مطالبہ کوئی شرط رکھنا چاہیں گی؟'' عورتوں اور مردوں کے درمیان لگائی لکڑی کی دیوار کے پار سے مائک پر امام صاحب کی آواز ابھری۔
''جی نہیں۔'' میرے پہلو میں بیٹھی دولھن بولی اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

''نکاح کے کاغذات پر دستخط ہمارے والد کے ہوں گے۔''

میرے بیٹے نے امام صاحب کے سامنے قلم اور کاغذات رکھے۔ ایک لمحے کو تو امام صاحب بھی سکتے میں آ گئے۔ کاغذات پر پہلے بچوں کے ماموں حماد الرحمان مرزا اور ستار انکل کے نام دیے گئے تھے۔ لیکن میرے بچوں کی سعادت مندی کے سبب آخری وقت میں میری خواہش کا بھرم رکھ لیا گیا۔ یہ خواہش ان تمام سماجی اور معاشرتی گھٹیا اور منتقم حربوں کو ختم کرنے کے لیے تھی۔ ہم صرف اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں، کوئی دوسرا اپنے ضمیر کی عدالت میں کیسے اپنا مقدمہ لڑتا ہے وہ ہمارا مسئلہ نہیں۔

مبارک سلامت نکاح ہو گیا۔ گلے میں اٹکے کسی بڑے سے گولے اور آنکھوں میں چبھتی گرم ریت کے باوجود میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرے پہلو میں بیٹھی بچوں کی چچی نے بھی اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور اپنے مخصوص انداز میں آہستہ سے بولی ''بدتمیز جگی''۔

میرے بیٹے نے میری دائیں طرف آ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا، ''ہی ہی، امی آپ ساس بن گئی ہیں'' اس نے دانت نکوسے۔ حماد نے مجھے گلے لگایا اور ماتھے پر بوسہ دیا۔

''اے جلاد عورت! اب آپ ایک فلمی قسم کی ظالم ساس بن گئیں ہیں، بس اب کسی کو سانس نہ آنے دیا جائے۔''

''پرے ہٹو،'' مجھے ہنسی آ گئی۔

داماد صاحب مسکراتے ہوئے میرے پاس آئے اور میری بائیں جانب کھڑے ہو گئے۔

''مجھے تو لگتا تھا آج امام صاحب کچھ نہ کچھ کروا کے چھوڑیں گے۔ اللہ معافی! اتنی تفتیش؟ بار بار شرائط اور بار بار مطالبے۔'' مبین نے میرے کاندھوں پر اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔

''فکر نہ کرو، تم نے بہت اچھا ہوم ورک کیا تھا'' مہمانوں میں سے کسی نے دوستانہ فقرہ کسا۔

مبارک سلامت اور مسرتوں کی برسات میں مہمانوں نے کھانا کھایا اور نکاح کی رسم کی سادگی کو سراہا۔ بلاوجہ کی رسومات اور دنیا داری کے دکھاوے کی خاطر اسراف اور دھوم دھام سے اجتناب کی داد دی۔ یہی ہمارا مقصد تھا کہ تبدیلی کا عمل اپنے گھر سے شروع کیا جائے۔

البتہ ایک جدت میں نے یہ کی کہ مٹھائی کے بجائے سرپرائز کے طور پر کیک بنوا لیا تھا جس پر بچوں کے نام تحریر تھے۔ یقیناً مسجد میں بھی یہ پہلا موقع تھا کہ نوجوان بچوں نے اسے سماجی رسومات کے لیے اتنی خوشی سے استعمال کیا۔ رات گئے تک رونق رہی۔ بچے ہنستے مسکراتے کیک اور

چائے سے لطف اندوز ہوئے۔ معدودے چند مہمانوں میں عالیہ کے ڈینش دوست بھی شامل تھے۔ ڈینش بچیوں نے نہایت اہتمام سے سر پر سکارف لے رکھے تھے۔ وہ کیک دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

''ساسو ماں جی! ذرا اپنے داماد کو کیک تو کھلائیں'' حماد کو شاید اسی موقع کا انتظار تھا۔

''اچھا'' میں نے جلدی سے چمچ تھاما، پھر کیک سے سٹرا بری سمیت چھوٹا سا ٹکڑا کاٹا۔ مبین نے بڑے اشتیاق سے منہ کھولا۔ میں نے بے حد آرام سے ہاتھ واپس موڑا اور کیک اپنے منہ میں ڈال لیا۔ بچوں نے شرارت اور خوشی سے لبریز نعرہ لگایا۔

''امی جی! یہ کیا بات ہوئی؟'' دولھن صاحبہ نے فوراً احتجاج کیا۔

''یہ آپ سے بے موقع بحث کا بدلہ لیا ہے میں نے۔ زیادہ دانشمند نسل اٹھ کھڑی ہوئی ہے اب۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

عالیہ کے نکاح کے بعد جب میں پاکستان جانے لگی تو اس نے ایک لفافے میں مجھے کچھ پیسے ڈال کر دیے، ''امی ان میں سے فلاں کو آپ نے ایک سلائی مشین لے کر دینی ہے اور فلاں کو، فلاں کو۔''

میں نے اس کی فلاں، فلاں والی ہدایات کی طرف توجہ دیے بغیر پوچھا، ''یہ کیا ہے؟''

''پیسے ہیں'' وہ آرام سے بولی۔

''کون سے پیسے؟'' میں نے لفافے کو ہاتھ لگائے بغیر پوچھا۔

''یہ حق مہر کے پیسے ہیں امی۔ میں نے سوچا ان کو ایسی جگہ خرچ کیا جائے جس کا اثر دیر تک رہے۔'' میں نہایت غور سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔

''امی آپ کو یاد ہے، نانا ابو کہتے تھے کہ عورت جب مضبوط ہوگی تو تبدیلی آئے گی اور عورت کو کپڑے زیور اور آرائش کی تکون میں بند کرنا اس کی صلاحیتوں کو برباد کرنا ہے۔ مجھے ایسی شادی نہیں کرنی جس کا مقصد صرف کپڑے زیور اور ایک بڑی دعوت کے نام پر فضول خرچی اور ریا کاری ہو۔ اللہ نے ہمیں اس لیے پیدا نہیں کیا کہ گنتی کے چند سال ہم لوگوں کی مرضی اور دنیا کی ستائش کے لیے جییں۔''

میں کتنی دیر حیران اس کی شکل دیکھتی رہی اور سوچنے لگی کہ لڑکی! تم چند ہفتے ننھیال میں قیام میں کب کیا کیا سیکھتی رہی ہو؟ جی چاہا کہیں سے کسی طرح امی ابا جی مل جائیں اور میں ان کے

پاؤں دھو کر احسانات کا شکریہ ادا کرسکوں۔ عالیہ کو عادت تھی شام کو ان کے بستر پر بیٹھ جاتی اور رات گئے پتہ نہیں کیا کیا کہانیاں سنتی رہتی۔

''نانا ابو، آپ کے زمانے میں شادیاں کیسے ہوتی تھیں؟ نانی اماں آپ نے اپنی شادی پر کیا پہنا تھا؟ آپ کو کس نے تیار کیا تھا؟ آپ کی رخصتی ڈولی میں ہوئی تھی کیا؟''

میں گھر آئی تو مجھے ہنس ہنس کر بتانے لگی آج میں نے نانو سے پوچھا کہ آپ نے نانا ابو کو شادی سے پہلے دیکھا تھا، تو نانو شرما رہی تھیں میرے سوالوں پر، پھر مجھے ڈانٹ کر بھگا دیا۔

میرے تایا زاد بھائی آئے، ''قسمے ایہہ تیری کڑی تے لگدی ای نئیں۔ اتنی نفیس اتنی مہذب بچی ہے، تم تو نری ٹارزن تھیں۔''

میری آنکھوں کے سامنے وہ دن پھر گئے جب وہ سال بھر کی تھی اور 'نان بونان بؤ' کر کے ان کے گلے سے لپٹ جاتی تھی۔ میں جب بھی پاکستان جاتی تو وہ ان کے بستر میں گھس کے بیٹھ جاتی۔ ہزار کہتی ہمارے ساتھ بازار چلو، باہر چلو مگر وہ وہاں کمرے میں چھپی نہ جانے ان سے کیا باتیں کیے جاتی۔ واپسی کا سارا سفر اداس رہتی اور جہاز میں کھڑکی کی طرف منہ کیے بیٹھی رہتی۔ آج میرا جی چاہا کہ میں اڑ کر جاؤں اور اس سادہ سے کمرے کی اس گوشۂ جنت کی زمین پر سجدے کروں جہاں ابا جی کا سادہ سا وجود رحمت کے سائے کی مانند میرے پورے خاندان پر ابر بن کر چھایا رہتا تھا۔

••

عالیہ کے نکاح کے بعد شادی کی تیاریوں میں وقت کے اڑتے کی خبر ہی نہ ہوئی۔ انگریزی محاورے کے مطابق وقت کی ریت مٹھی سے پھسل گئی۔ عالیہ کی شادی پر حالات نے عجب کروٹ لی۔ بچوں کی محبوب چچی اور عالیہ کے ساتھ سوتے جاگتے بچپن گزارنے والی عائشہ شادی میں شامل نہ ہوئیں۔ میری یہ نیک نیتی بھی خوش انجام نہ ہوئی۔ میں ایک مرتبہ پھر بچوں کو جواب دہ تھی۔ اب کے میرے قد سے اونچا میرا بیٹا میرے سامنے کھڑا تھا۔

''آپ لاعلاج ہیں امی، آپ صرف اپنی من مانی کرتی ہیں، ہر بار لوگوں پر اعتبار کر لیتی ہیں، پھر مدعو کر لیتی ہیں، اور پھر نقصان اٹھا کر یہاں ہسپتال آ کر لیٹ جاتی ہیں''

وہ بڑے اعتماد سے مجھے میرے ہی بارے میں اطلاعات فراہم کر رہا تھا۔ ''شاعرہ، مصنفہ، جرنلسٹ، واہ واہ، دیوی دیوی کھیلتی ہیں'' وہ میرے سرہانے بیٹھ گیا۔

نرس نے آ کر بلڈ پریشر چیک کیا۔ نبض دیکھنے کے لیے انگلی پر چٹکی نما آلہ لگایا اور دل کی

دھڑکن گننے لگی، ''بلڈ پریشر ابھی تک بہت کم ہے، نبض بہتر ہے اور دل کی دھڑکن نارمل سے ذرا کم ہے'' اس نے برقی بورڈ پر تفصیلات درج کیں پھر مسکرا کر بولی:

''کیوں اتنے خوبصورت بچے کو تنگ کرتی ہیں؟''

''امی جی، دل کی دھڑکن کا ڈوبنا صرف شاعری نہیں ہوتا، بیماری بھی ہوتا ہے۔''

اُسامہ کو تقریر کرنے کا موقع مل گیا، ''آپ کو خود بھی شوق ہے کہ چند دن خیریت کے گزر جائیں تو آپ کو ہسپتال یاد آنے لگتا ہے۔ آپ نیک بنو نیکی پھیلاؤ، جگنو بنو رستہ دکھاؤ وغیرہ وغیرہ پر عمل کرنے لگتی ہیں۔'' وہ بچپن میں پڑھائی گئی اردو کی مثالیں بھی طعنوں کی صورت میں دیتا تھا۔

میں نے بمشکل ڈرپ لگا بازو ہلایا اور اس کے ہاتھ کو پیار سے چھوا، ''بس۔ یا کچھ اور؟''

''آپ کو نتائج کا علم بھی ہوتا ہے پھر بھی آپ غلط فیصلے کرتی ہیں۔ لوگوں کے لیے دروازہ کھول دیتی ہیں اور ہمیں ڈرائیور بنا دیتی ہیں۔ کیا ملا آپ کو؟''

اس کی آواز شکستہ ہوگئی۔ مجھے علم تھا وہ غصے میں اپنا غم چھپا رہا تھا۔ میرے بدن کے معبد میں کروٹیں بدلنے والا، میرے خون کے قطروں سے نمو پانے والا اور میری گود میں چھپ کر سونے والا اپنا احساس اپنے غصے میں لپیٹ کر مجھے بتا رہا تھا کہ مجھے کیسے فیصلہ کرنا چاہیے۔ میں روایتی ماں نہیں ہوں۔ میں نے اس کے انداز کو بدتمیزی یا نافرمانی نہیں سمجھا۔ ہر ماں کو یہ سوچنا چاہیے کہ اس کا بیٹا کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے، جب وہ اس کے پاس آ کر کوئی تنقید بھی کرتا ہے تو وہ اپنی تکلیف کو ناراضگی اور غصے میں ملفوف کر کے جتاتا ہے کہ اسے ماں کی کتنی فکر ہے۔ اس غصے کا جواب ناراضی نہیں ماممتا میں بھیگا ایک بوسہ ہوتا ہے۔

''امی جی آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں نے آگ لگا دینی تھی سب کو۔ آپ کے سب لیکچر بھول کر، زندگی ان شاعرانہ خیالات کے ساتھ نہیں گزرتی۔''

''ادھر آؤ'' میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا، وہ ذرا سا جھکا اور میں نے اس کی خوبصورت فراخ پیشانی چوم لی۔ ہم دونوں ہنس پڑے۔

''امی آپ نہیں باز آ سکتیں'' وہ باہر برآمدے میں پڑی چائے کی ٹرالی سے میرے لیے چائے بنا کر لے آیا اور لیور دبا کر بستر کی ٹیک اونچی کر دی۔

''یہ لیں۔ موجاں کریں'' اس نے جیب سے چاکلیٹ بار نکال کر میز پر رکھی، ''یہ لیں کھائیں۔ جتنی چاہیں کھائیں اور جتنی مرضی موٹی ہوں۔''

عالیہ اور مبین ملائشیا جا چکے تھے۔ مجھے بے طرح ابا جی یاد آ گئے۔ میرے دل میں ہوک سی اٹھی۔ میں چپ کر کے اس کی بات سنتی رہی۔ ''امی اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں نے سب کو تہس نہس کر دینا تھا۔ خدا کے واسطے امی اب بھی آپ سیکھ لیں۔ آپ لوگوں سے محاذ آرا ہوئے بغیر، مسلسل سب کا بھلا کرنے کی کوشش کرتی جائیں گی تو وہ اسے آپ کی پسپائی گردانیں گے اور یہ ان کو راس نہیں آئے گا۔ امی! لوگوں کو احساس دلانا ہوتا ہے کہ انھوں نے کیا غلط کیا اور ان کے نتائج کیا ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ اب میں کسی سے نہیں ملوں گی۔ ٹھیک ہے میں نے سیکھ لیا ہے کہ کوئی دوست نہیں ہوتا۔''

میرے نظریات غلط ثابت ہو چکے تھے اور بچوں کے ساتھ پہلے سے طے شدہ اصول کے مطابق میں نے ہتھیار ڈال دیے اور پاکستان جانے کی تیاری شروع کر دی۔ پہلے سے طے شدہ معاہدے کے اصول کے مطابق بچوں کی طرف سے دیا گیا میرے شاعرانہ خیالات کی پیروی کا یہ آخری موقع تھا جو خدا جانے میں نے گنوایا تھا یا میرے گھر کی چار دیواری سے باہر بستی دنیا نے۔

''میری پیاری امی، جب آپ واپس آئیں گی تو ہم اچھا سا گھر خریدیں گے۔ سارے کام مکمل ہو جائیں گے امی۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں ٹیکسی کا لائسنس لے لوں گا۔''

میرے بیٹے نے اپنی دانست میں مجھے تسلی دینے اور سبز باغ دکھانے کی کوشش کی۔

''ٹیکسی کا لائسنس؟'' میری آنکھوں سے خواب شراروں کی صورت گرنے لگے، ''آپ صرف اپنی تعلیم مکمل کریں گے۔ بہت ڈرامے کر لیے۔ بس اب ناک کی سیدھ چلیں۔ ہم نہیں لے رہے ٹیکسی کا لائسنس۔ آپ صرف پڑھیں گے۔ مجھے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ میری بیماری کی وجہ سے آپ کو یونیورسٹی چھوڑ کر یہاں آنا پڑا ہے۔ بس اب میں نے بیمار نہیں ہونا۔''

میں نے جلدی جلدی چائے پی جیسے چائے پیتے ہی اٹھ کر کھڑی ہو جاؤں گی۔

••

عالیہ کی شادی کے بعد ایک بہت دلچسپ بات ہوئی۔ جن دوستوں کی بیٹیوں کی شادی ہونے لگتی وہ مجھے پوچھتے بھئی آپ تو سینئر ہیں اور ماشاءاللہ آپ دونوں سمدھنوں نے مثال قائم کر دی ہے۔ اتنی خوبصورتی سے رشتہ نبھایا ہے اور جس انداز میں آپ ایک دوسرے کا تذکرہ کرتی ہیں رشک آتا ہے۔ میں محتاط انداز میں شکریہ ادا کرتی کیونکہ زیادہ تعریف و توصیف کرتی زبانوں پر مجھے یقین نہ کرنا سکھایا گیا تھا۔ ایسی ہی ایک شناسا سے ایک روز ملاقات ہوئی تو انھوں نے کسی طویل تمہید کے

بغیر میرا انٹرویو شروع کر دیا،

''اچھا میں نے آپ سے پوچھنا تھا کہ آپ نے بیٹی کے نکاح پر کیا لکھت پڑھت کی؟''

''جی؟'' فوری طور پر تو مجھے اس اصطلاح کی سمجھ ہی نہ آئی۔

''بھئی میرا مطلب ہے کہ آپ نے حق مہر کتنا لکھوایا؟''

''ہمارے خاندان میں حق مہر لکھوانے کا رواج نہیں ہے۔''

''اچھا؟'' وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگئیں، ''تو پھر ماہانہ خرچ وغیرہ تو باندھا ہی ہوگا؟''

''جی نہیں، ہمارے گھروں میں یہ شرائط وغیرہ بھی نہیں ہوتیں۔''

''واقعی؟'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگیں۔

''تو زیور کتنا لکھایا آپ نے؟''

''زیور؟ میں آپ کو ایک بات بتاؤں؟''

''جی جی، میں وہی تو پوچھنے کو حاضر ہوئی ہوں۔ میری بچی کا معاملہ ہے۔ آپ دعا بھی کیجیے اور بتایئے بھی کہ بچی کی سیکورٹی کے لیے کیا حق مہر وغیرہ باندھنا چاہیے۔''

''بات یہ ہے کہ جب میری شادی ہوئی تو سسرال والوں نے میری چوڑی کا ناپ مانگا۔ آپ سوچ سکتی ہیں میرے والد صاحب نے کیا جواب دیا ہوگا؟''

''نہیں۔'' بے چاری بے یقینی سے مجھے دیکھتی رہیں جیسے میں الف لیلیٰ کہانی سنانے کو ہوں۔

''ابا جی نے کہا کہ چوڑیوں کی کیا ضرورت ہے۔ اس کی والدہ نے کنگن بنوا لیے ہیں۔ وہی بہت ہیں۔ باقی سب خرافات ہے۔ آپ جایئے۔ چوڑیوں کی ضرورت نہیں۔''

''اچھا؟'' اب وہ واقعی مرجھا سی گئیں، ''تو آپ نے بھی عالیہ کا زیور نہیں لیا۔''

''بھئی جن کی بہو ہے وہ جانیں اور ان کی بہو جانے۔ میرا کیا دخل بیچ میں۔'' میرا خیال تھا کہ انھیں میرے جواب سے سمجھ آجائے گی کہ میرا مشورہ کیا ہے۔

''یعنی جو غلطی آپ کے والد صاحب نے کی وہی آپ نے دوہرا دی؟''

جب اس خاتون نے ابا جی کی ذات کو ہدفِ تنقید بنانے کی کوشش کی تو مجھے بھی ادب آداب بالائے طاق رکھنا پڑا، ''بی بی! آپ مجھ سے مشورہ لینے آئی ہیں یا مجھے میری اور میرے اجداد کی کوتاہیوں کی نشان دِہی کرنے آئی ہیں؟ میرے والد صاحب نے کیا مناسب سمجھا، یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ میں نے اپنی بیٹی کے لیے کیا بہتر سمجھا آپ وہ جاننا چاہتی تھیں سو سن لیا، اب آپ

تشریف لے جاسکتی ہیں۔''

جب آپ کسی کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ دینے کا فیصلہ کرتے ہیں تو اپنی روح کا سب سے شاداب حصہ عطا کرتے ہیں۔ ابا جی کہا کرتے تھے کہ جو کسی کو بیٹی دیتا ہے وہ صرف اس کے بیٹے پر نہیں بلکہ اس کی نسلوں پر احسان کرتا ہے۔ ایک عورت جو اس کی اولاد پالتی ہے۔ تب میں نے واقعی رک کر سوچا تو معلوم ہوا کہ واقعی ہمارے پورے خاندان میں جو بہوئیں آئیں، ابا جی نے اور تایا جان نے کبھی کسی کی تعلیم کا راستہ نہیں روکا، کبھی کسی کے ملازمت کرنے پر پابندی نہیں لگائی بلکہ بہت فخر سے بتاتے کہ ہماری بہوئیں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ابا جی نے میرے ایک بھتیجے کو حافظِ قرآن بنانے کی خواہش ظاہر کی۔ چند سال میں میرے دو بھتیجے حافظ بن چکے تھے۔ ابا جی کو مبارک کا فون کیا تو بتانے لگے کہ میرے دوست بھنڈاری صاحب کو اللہ اعلیٰ مقامات پر فائز کرے اور درجات بلند کرے، میری نسلوں کو سنوارنے کے لیے اپنی بیٹی دے گئے ہیں۔ شادی پر تاجرانہ انداز میں لین دین جہیز اور حق مہر کے لمبے چوڑے مسائل نجانے کس نے پیدا کر دیے۔ جس کام کو اللہ نے سہل کیا اسے مشکل ترین کر دیا گیا۔ ان عورتوں کو اللہ ہدایت دے، ان کی رسموں اور روایتوں نے بھی کام بگاڑا ہے۔ جس نے اپنی حیثیت کے مطابق جو حق مہر دینا ہو یا تحائف دینا ہوں اسے دکھاوے کی کیا ضرورت ہے؟

شرائط نامے میں ماہانہ چند ہزار روپے میں آپ بیٹی کی کون سی سیکورٹی خرید رہے ہیں یا لاکھوں لکھوا کر آپ کس کے قدم میں زنجیر ڈال کر کھونٹے سے باندھنے کی کوشش کر رہے ہیں؟ جسے کچھ نہیں دینا وہ مکڑی کے جالے جیسے شرائط نامے میں الٹا نہیں لٹکے گا۔ انسانی رشتوں کے اصول وہی رہیں گے جو دنیا پر پہلے انسان کا دل دھڑکنے کے ساتھ بنے۔ ان ہی اصولوں کے مطابق رشتے قائم کریں۔ اب یہ مرد پر منحصر ہے کہ وہ اس بندھن کو کیسے مضبوط کرتا ہے۔ اقتصادی طور پر اس کی ذمہ داری ہے۔ جب مردوں کو عورت کا قوام کہا گیا تو ساتھ ہی شرح کی گئی کہ وہ اپنے مال میں سے عورت پر خرچ کرتا ہے۔ ابا جی کو ہمیشہ اس معاملے میں طیش آجاتا۔ جذباتی ہوجاتے۔ اور ان کا بس نہ چلتا کہ لڑکے والوں کو انسانیت کے انجکشن لگا دیں۔

عالیہ کی رخصتی کے بعد میں اور اُسامہ بیٹھے عورت کے حقوق کے موضوع پر ہی بات کر رہے تھے۔ میں نے اسے سمجھایا، ''جو آپ کو پال پوس کر، پڑھا لکھا کر اپنی بیٹی دیتا ہے، اس کے جتنے بھی ناز اٹھائے جائیں کم ہیں۔ اپنی استطاعت کے مطابق اس کو رہائش اور دیگر سہولتیں بہم

پہنچائی جائیں۔ مرد کی کیا ذمہ داری ہے؟ کیا اسے نہیں پتہ کہ ایک نئی زندگی میں وہ اللہ اور رسول کو گواہ بنا کر کسی کو شامل کر رہا ہے۔ اگر اسے اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں تو پھر کوئی کنٹریکٹ اسے مجبور نہیں کرسکتا۔ خوئے بدرا بہانہ بسیار۔''

''امی جی! فی زمانہ تو عورت خود مرد کے برابر کماتی ہے۔ اب اس کی ضرورت وہ نہیں جو چودہ سو سال پہلے مردوں کے جنگ میں جانے اور بیوہ ہونے کے بعد اس کے بھائیوں اور خاندان کے ہاتھوں جائیداد کا استحصال ہونے پر درپیش ہوسکتی تھی۔ سو اسے آنے والے وقتوں کی پریشانی سے بچانے کے لیے قوانین بنا دیے گئے۔ ایک مکمل ضابطہ دیا گیا۔''

میں حیران ہو کر اس کا منہ دیکھتی رہی۔ پھر جواب دیا، ''میں نے بھی اپنی بیٹی کے پلو سے وہی ربع صدی پہلے کا سبق باندھا جو میری ماں نے میرے آنچل سے گرہ لگائی تھی۔ ایک محبت کے پیغامبر کی صورت میں خدمت، خلوص اور خاموشی سے ایک نئے خاندان میں ایک نئی زندگی کا آغاز۔ کوئی زیور، ہیرا موتی انسانی رشتوں میں محبت کی دولت سے بڑھ کر نہیں۔ اگر کسی کا دل بالکل سیاہ نہیں تو وہ اس پیغام کو آنکھوں اور لبوں سے لگا کر قبول کرے گا۔''

''اچھا، اچھا، یعنی وہی نانو والی غلطی؟'' اسے یکا یک شرارت سوجھی۔

''ادھر آؤ، ذرا میرے قریب آ کر بات کرو'' میں نے بستر پر لیٹے لیٹے ہاتھ آگے بڑھایا، ''بتاتی ہوں میں۔ ایک بات یاد رکھنا کہ انسانی رشتوں کے تقاضے اور کیفیات کبھی نہیں بدلتیں۔ جسے جذبات کی نفیس ریشم کی ڈوری نہ باندھ سکی، آپ آبِ زریں سے لکھ لیجیے کہ ایسے شخص کو دنیا کی کسی چھلنی سے گزار دیجیے، اسے کوئی معاہدہ، کوئی شرائط نامہ، کوئی رجسٹری نہیں سدھار سکتی۔ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر۔''

••

شام کو ہماری باتیں شروع ہو جاتیں کہ مائیں ہی بچیوں کی زندگی میں غیر ضروری دخل دے کر انھیں اجاڑتی ہیں۔ ایک تو اس موبائل فون نے زندگی آسان تو کی سو کی لیکن ہر وقت کی سہولت بے وقت کی راگنی بھی بنا ڈالی۔ اب ہر اماں کے پاس سمارٹ فون ہوتا ہے۔ وہ بچی کو صرف سنتی ہی نہیں دیکھتی بھی ہے۔ چونکہ زندگی میں غیر ضروری مداخلت ان کے ذہنوں کو بھی منتشر کرتی ہے اور اپنے فیصلے خود کرنے کے قابل بھی نہیں رہنے دیتی سو ایک وقت آتا ہے کہ ہر کام کے لیے اماں جان کو فون کھڑکانا اور ان کی ہدایات لینا ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ عادتِ ثانی بن چکا ہوتا ہے۔ بیٹا، اماں کا بوا اور بیٹی،

اماں کی لاڈو بن جاتی ہے۔ یا تو اماں جان اتنی دانشمند اور مصلحت اندیش ہوں کہ بروقت صائب رائے دیں یا پھر انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ بیٹیوں کی شادی اس لیے ہی کی جاتی ہے کہ وہ رخصت ہوکر اپنے گھر میں پاؤں ٹکائیں۔ دوڑے دوڑے میکے میں پھیرے ڈالنے والی بچیاں اپنے گھر کے در و دیوار کے سکون اور اپنے ہمسفر سے ہم آہنگی حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔

اردو والے میکے یا مائیکے کہتے ہیں، یعنی ماں کا، یا ماں سے وابستہ، جب کہ پنجابی میں لفظ پیکے، یعنی پیو کا، باپ سے وابستہ، کہا جاتا ہے۔ دونوں زبانوں میں بیٹی اور میکے پیکے سے وابستگی کی دلپذیر شاعری موجود ہے۔

ہماری امی جان کے خیالات اس معاملے میں بے حد واضح تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ آج کل لوگوں نے رشتہ ڈھونڈنا، اچھا رشتہ ملنا، پھر شادی بیاہ کے جوڑے گھوڑے، تقریبات، بے پناہ خرچ کے بعد جب شادی ہوتی ہے تو بچی کو سکھائیں کہ اب اپنے گھر ٹِک کر بیٹھے۔ بہت رہ لیا ماں کے پاس۔ اس فرض کے ادا ہونے کے لیے وِرد وظیفے کیے جاتے تھے، اب اس کو نبھانے کے لیے اصول بنائیں۔ مائیں دوطرفہ عدم مداخلت سکھائیں۔ نہ تو وہ خود بچی کی زندگی میں دخل دیں نہ ہی بیاہ کر گھر سے جانے والی بچی میکے کے معاملات میں غیر ضروری طور پر دخل دے۔ اپنا وقت، توانائی اور کوششیں اس بات میں صرف کرے کہ جس خاندان میں اس نے قدم رکھا ہے، ان کو یا تو اپنا بنا لے، یا پھر ان کی ہو جائے۔ یہ ارادہ وقت اور تحمل کا متقاضی ہے۔

ماؤں کو چاہیے کہ بچیوں کو دوستانہ انداز میں یہ اسباق یاد دلاتی رہیں۔ ان کی دوست بن جائیں تاکہ وہ باہر ہمدردی یا رہنمائی نہ تلاشیں۔ امی جی کی باتیں میرے ذہن کے دالان میں گونجتیں اور میں نے ان سے روشنی بھی پائی۔ عالیہ کے مزاج میں بھی صلحِ کل کا عنصر شامل ہے۔ گھر میں بڑی بہن ہونے کے باوجود اس کو بلاوجہ اور بلاموقع بڑا بننے کی عادت نہیں۔ امی جی کے سکھائے اسباق، انکساری اور ابا جی کی دعاؤں نے اسے ایک معتدل مزاج انسان بننے میں مدد دی ہے۔

••

صبح صبح طلوعِ آفتاب سے بھی پہلے فون کی گھنٹی مکمل خاموشی کو مرتعش کرنے لگی۔ چونکہ گھنٹی کی دھن ہماری صاحبزادی کی تھی سو جلدی سے فون اٹھایا۔ ''امی! دو گھنٹے بعد میرا امتحان ہے۔''

''جی بیٹا، کل بات ہوئی تو تھی۔ اللہ آپ کو کامیاب کرے گا۔'' حسبِ توفیق تسلی دی۔

''جی امی، تیاری تو مکمل ہی کی ہے لیکن صبح صبح آپ کی سکون پہنچانے والی آواز

(Soothing Voice) سننے کو جی چاہ رہا تھا۔''

''زیادہ ڈائیلاگ بولنے کی ضرورت نہیں۔ آپ خیر سے امتحان سے فارغ ہوجائیں پھر بات ہوگی۔''

''جی، بس آپ کی آواز ہی سننا چاہتی تھی۔ آپ کو پتہ ہے ناں، ماں کی آواز ہر طرح کا سٹریس اور پریشانی ختم کرتی ہے؟'' اس نے بات جاری رکھی۔

''اچھا، ٹھیک ہے، اب کیا حکم ہے، کیا گا کر سناؤں؟''

میرے مختصر جواب میں بولی، ''امی، مذاق نہ سمجھیں۔ اس پر پوری تحقیق ہوچکی ہے کہ ماں کے وجود میں اس کی محبت اور اس کے لمس اور حتیٰ کہ اس کی آواز میں خواہ وہ فون پر ہی کیوں نہ ہو، ایک خاص تاثیر ہوتی ہے جو بچوں کو پرسکون کر دیتی ہے اور (oxytocin) ہارمون کی افزائش ہوتی ہے۔''

''مجھے لیکچر دینے سے بہتر ہے کہ آپ جا کر امتحان سے نمٹیں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آپ کی سائنس اور میڈیکل کے اس انکشاف سے پہلے دنیا کی پہلی ماں کے وجود سے بھی خوشبو کے دھارے پھوٹتے تھے لیکن کوئی پیمانہ ان کو نہ تو ماپتا اور نہ تحقیق کرتا تھا۔ یہ ساری قوتیں جنھیں آپ ہارمونز کہتی ہیں، اس وقت بھی موجود تھیں جب کوئی اس نام سے آگاہ بھی نہیں تھا اور سائنسی ترقی یا تخریب اس کو ہرگز نہیں چھین سکتی۔ بربادی کے نقطۂ عروج سے ایک ماں نئی زندگی کی بنیاد رکھ سکتی ہے۔''

''اوہ، امی! اچھا اچھا، پلیز جذباتی نہ ہوں سویرے سویرے، منہ اندھیرے۔ یہ نہ ہو اقبال کی نظم سننا پڑے۔'' اس کی مسکراہٹ بقول ابنِ انشا فون پر دکھائی دے رہی تھی۔ ''بس اب میں امتحان کے لیے تیار ہوں۔ دعا کیجیے گا۔ خدا حافظ۔''

اس کا فون بند ہونے کے بعد مجھے اقبال تو یاد نہیں آئے البتہ کرشن چندر کا ایک افسانہ ''مامتا'' ذہن میں گونجنے لگا۔ زندگی میں جب پہلی دفعہ پڑھا تو ماں کی قدر آئی۔ جب دوسری مرتبہ پڑھا تو خود اپنے جنون کی سمجھ آئی۔

••

ایک روز میں اپنے بھائی کے گھر بیٹھی تھی کہ عالیہ کا فون آیا، ''امی آج میں ہسپتال سے واپس آئی تو امی جان (ساس) میز پر گرم گرم روٹی اور کھانا رکھ گئی تھیں۔ میں نے مزے سے بیٹھ کر

کھانا کھایا اور خوب دعائیں دیں۔''

''موجاں کرو پتر جی، اور محبتوں کا یہ قرضہ کئی گنا زیادہ کر کے لوٹانا نہ بھولنا'' میں نے جواب دیا ''ابا جی کہا کرتے تھے جو کسی کو پانی کا ایک گلاس بھی دیتا ہے اس کا شکریہ اس دنیا میں ادا نہیں ہوسکتا۔ اس کا واحد طریقہ یہی ہے کہ آپ بھی کسی کو پانی کا گلاس بھر کر دیتے رہیں تاکہ نیکی کا سفر جاری وساری رہے۔''

''امی جی!'' کبھی وہ الجھ کر کہتی، ''ایک تو آپ نے ہمارے سامنے اتنے مشکل معیار رکھ دیے ہیں کہ مجھے نہیں لگتا ہم کبھی اس درجے تک پہنچ سکیں گے۔''

''نانو یاد ہیں ناں بیٹا؟ ان کے وضع دار دستر خوان سے کوئی کھانا کھائے بغیر اٹھ نہیں سکتا تھا۔ معیار بنانے کے لیے پیسے کی نہیں، جذبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے محدود وسائل کے باوجود گھر میں ایک لنگر کا سماں رہتا تھا۔ میں بھی ان سے یہی کہا کرتی تھی کہ امی جی آپ نے ہمارے سامنے جو اصولوں کے اور اپنے حسنِ سلوک کے بلند زینے تعمیر کر دیے ہیں ان پر چڑھتے رہنے کی ہم میں ہمت نہیں۔''

مجھے ابا جی کی یاد آتی ہے کاش وہ یہاں ہوتے اور یہ سب دیکھتے۔ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ہم ان رشتوں کو بدصورت رویوں اور روایتوں کی عینک کے موٹے دھندلے شیشے کے عقب سے نہ دیکھیں تو ان میں کیسا حسن ہے۔ ایک نئی زندگی کی بنیاد ہے اور یہ بنیاد تب ہی مضبوط ہوگی جب صدیوں پرانے ان روایتی جھگڑوں کو ختم کیا جائے گا اور خواتین بلکہ ماؤں پر ہی اس کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ وہ ہی اپنی بیٹی یا بیٹے کو گھر آباد کرنے میں رہنمائی کرسکتی ہیں اور وہی اسے اجاڑنے یا جلانے کے لیے دیا سلائی کا کام کرسکتی ہیں۔ مرد جب غلطی کرنے پر آتا ہے تو وہ صرف اپنی ذات اور اپنا گھر تباہ کرتا ہے، لیکن عورت ہٹ دھرمی پر اتر آئے تو وہ نسلیں اجاڑ دیتی ہے کیونکہ جس ہستی کو نسلیں سنوارنے کی طاقت بخشی گئی ہو وہ تخریب کاری بھی اسی شدت اور قوت سے کرسکتی ہے۔

مرد اور عورت کی تعمیری اور مخفی توانائی پانی اور آگ کی طرح ہوتی ہیں۔ پانی جب تک گھڑے کے کورے بدن سے مٹھاس سمیٹے، حیات بخش رہتا ہے۔ برستا ہے تو دنیا کو سیراب کر دیتا ہے، گل وگلزار کھلاتا ہے۔ اپنے سینے پر دیوہیکل جہازوں کو حکومت کرنے دیتا ہے اور اگر بپھر جائے تو سب بہا کر لے جاتا ہے، آبادیاں تاراج کر دیتا ہے۔ اسی طرح آتش جب تک دیے کی لو میں جھلملاتی ہے تب تک اجالے بانٹتی ہے، چولھے میں سمٹ جائے تو رزق، لیکن بھڑک جائے تو سب

خاکستر کر دے۔

یہ مثالیں میں نے اتنی مرتبہ سنیں کہ لاشعوری طور پر میری شاعری میں عورت کا روپ سمندر اور پانی کے استعارے میں ڈھل گیا۔ پانیوں کے کنارے پرورش پانے اور پھر باقی زندگی ایک ایسے ملک میں گزارنے جس کے ہر باون کلومیٹر کے فاصلے پر سمندر ہو اور پھر سمندر کے پڑوس میں بس جانے کے باعث بھی میری اس سے ملاقات رہتی ہے اور اس مکالمے میں کہیں ابا جی بھی ضرور شامل ہوتے ہیں۔

••

اگرچہ دونوں بچوں نے اٹھارہ برس کی عمر میں ڈرائیونگ لائسنس حاصل کر لیے تھے تاہم اس سے پہلے تک، برف باری میں بچوں کو اکثر خود لانا ہوتا تھا۔ کئی دفعہ تو گاڑی میں ہی بیٹھ کر انتظار کرنا پڑتا اور ان دنوں میں مجھے پاکستان کی دھوپ بھری شامیں شدت سے یاد آتیں۔ عالیہ کو جب پہلی مرتبہ ہسپتال میں رات کی ڈیوٹی دینا تھی تو مجھے ایک عجیب سی بے کلی لگی رہی۔ خوش قسمتی سے ہسپتال گھر سے دس منٹ کے فاصلے پر تھا سو وہ خود گاڑی میں گئی۔ میں نے اسے ساتھ سنیکس بنا کر دیے لیکن ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ صبح سات بجے جب اس کی واپسی ہوئی تو میں نے اس کا پسندیدہ آلو کا پراٹھا بنا کر رکھا تھا۔

''امی'' وہ آتے ہی صوفے پر میری گود میں دراز ہوگئی، ''آپ میں کوئی جادو کی بیٹری ہے کیا؟ آپ تھکتی کیوں نہیں؟''

اب اسے کون بتاتا کہ اپنی اولاد کے کام کرتے ہوئے کون تھکتا ہے۔ میں نے طمانیت اور شکر گزاری کے جذبے سے مغلوب ہو کر اس کے بال سنوارے۔ اس جدید دور میں بھی ایسے جہلا کی کمی نہیں جو بیٹیوں کی تعلیم کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر ڈاکٹری کی تعلیم تو ان کے نزدیک لڑکیوں کے لیے شجرِ ممنوعہ ہونی چاہیے کیونکہ اس میں نظریاتی اختلافات ہونے کا احتمال ہوتا ہے اور پھر وہ بچوں کو کیسے پالیں گی؟

مغرب میں جو لوگ اپنے لڑکوں کو رنگ رلیوں کی کھلی چھٹی دے کر بیٹیوں کی کڑی چوکیداری کے قائل ہیں۔ ان بے خبروں کو شاید علم ہی نہیں ہوتا کہ کھڑکی بھر آسمان دیکھنے والی آنکھیں جب بغاوت پر اتر آئیں تو وہ افلاک کی حدود سے پار جھانکنے کی دھن میں تمام حدود و قیود پار کر جاتی ہیں۔ مجھے اپنے بچوں میں ابا جی کا پرتو نظر آتا، ان کی تربیت، ان کے افکار کہ بچے پر

یقین و اعتبار سے بڑھ کے کوئی مضبوط زنجیر نہیں سو اس کے اور اپنے درمیان دیواروں کے بجائے پل تعمیر کرو۔

••

ٹررن، ٹررن، موبائل کی گھنٹی ضدی بچے کی طرح بجے جا رہی تھی۔ میں باورچی خانے میں بہت انہماک سے پیزا بنانے میں مصروف تھی۔ فون سننے کا موڈ نہیں تھا۔ ذرا سا سر گھما کر دیکھا تو سکرین پر ہر گھنٹی کے ساتھ ہماری لختِ جگر کی تصویر متحرک ہو رہی تھی سو فون سننا لازم تھا۔

''امی'' اس نے تین سالہ بچوں کی طرح ٹھنک کر کہا، ''دیکھیں، میرا نمبر 406 نکلا ہے۔''

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے حسبِ عادت غیر سنجیدہ جواب دیا، ''میری جان 420 بھی تو نکل سکتا تھا؟''

''امی مذاق نہ سمجھیں، میں بہت پریشان ہوں'' اس نے روہانسی آواز میں کہا۔ چونکہ یہ پریشانی کا اظہار اس کا مزاج نہیں اور اپنی تعلیم اور پیشے کے متعلق وہ ہر بات عموماً بہت تحمل سے کرتی ہے سو اب مجھے واقعی فکر لاحق ہوئی۔ میں نے اوون بند کیا، چولھا چکی پرے کھسکائی، ''جی اب بتائیے، آرام سے، کیا ہوا ہے؟''

ڈنمارک میں طبی تعلیم کا عرصہ چھ برس کا ہے۔ بعد میں ایک سال کی ہاؤس جاب ہوتی ہے جس میں طلبہ و طالبات کو ملک کے مختلف ہسپتالوں میں بھیجا جاتا ہے۔ کس ڈاکٹر کو کہاں جانا ہے، اس کا منصفانہ فیصلہ قرعہ اندازی کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس سال کل 425 طلبہ و طالبات تھے جس میں اس کا نمبر 406 نکلا۔ ظاہر ہے اس کا مطلب یہی تھا کہ اس سے قبل تمام نزدیکی ہسپتال پہلے امیدواروں کو ملیں گے اور اس کے حصے میں کوپن ہیگن سے باہر کوئی دوسرا صوبہ اور کوئی دور افتادہ شہر آئے گا اور رہائش بھی وہیں ملے گی۔ میں نے مقدور بھر تسلی دی ''آپ تو بہت بہادر بیٹی ہیں میری، آپ سب کچھ سنبھال سکتی ہیں۔''

''مجھے نہیں پتہ، مجھے نہیں کہیں اور جانا'' اس نے اپنا ٹھنکنا جاری رکھا۔

''علم حاصل کرو خواہ تمھیں چین جانا پڑے'' میں نے بھی اماں بننے کی سعی جاری رکھی۔

''چین چلی جاؤں گی لیکن یولینڈ نہیں جانا میں نے۔''

''دیکھیں بیٹا! میں یہ کر سکتی ہوں کہ آپ کے ساتھ چلی جاؤں۔ آپ مسیحائی کیجیے گا اور

میں آپ کی بے بی سٹنگ۔'' میں نے اس کی دلجوئی کا درمیانی راستہ نکالا۔

''نہیں، آپ کے اپنے پروجیکٹ ہیں۔ آپ کی پی ایچ ڈی اور کتابیں؟ کب مکمل کریں گی ان کو؟''

''کتابیں کیا کہتی ہیں؟ وہاں آرام سے لکھتی رہوں گی۔ رہ گئی پی ایچ ڈی، تو اس کو اگلے سال پر ملتوی کر دیں گے۔ کون سا میرے پروجیکٹ کے رکنے سے دنیا کی گردش رک جائے گی؟ مجھے واقعی کوئی جلدی نہیں تھی۔ جہاں اتنے سال انتظار کیا وہاں مزید ایک سال اور سہی، اتنے میں تراجم کرلوں گی۔''

اب اس کو تسلی تو ہوئی لیکن ساتھ ہی شاید کوئی احساس بھی ہوا، ''امی ہماری وجہ سے آپ ہمیشہ اپنے پروگرام روک دیتی ہیں، یہ مناسب نہیں ہے۔''

''ہاں، کاموں میں بھی اہمیت کے لحاظ سے ترجیحات کو پیشِ نظر رکھنا لازم ہوتا ہے۔ کم اہم کاموں کو ملتوی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس بہانے مجھے آپ کو روزانہ دیکھنے کا موقع بھی مل جایا کرے گا۔'' میں نے اسے خوش کرنے کو کہا۔ اب اس کی روکسی اور جانب مڑ گئی۔

''اور میرا 'بندہ' بے چارہ؟ میری امی جان اور میری فیملی؟''

اب مجھے واقعی ہنسی آگئی، ''وہ معاملات آپ خود نمٹائیں'' میں نے ہمیشہ کی طرح معاملہ اسی کے ہاتھ میں دیا۔

''کیوں جی؟ آپ ہی نے مجھے ورغلایا تھا دورانِ تعلیم شادی پر، میرا بچہ ابھی کرلو شادی، سب کام ساتھ ہی ہو جائیں گے۔'' اس نے میرا جملہ دوہراتے ہوئے ایک نیا نکتہ اٹھایا۔

''میں نے نہیں آپ کے بندے نے ورغلایا تھا'' میں نے بھی یاددہانی لازم سمجھی۔

''میں نے تو صرف یہ بتایا تھا کہ زندگی کا اہم ترین کام وقت پر اپنا گھر اور خاندان بنانا ہے، تعلیم تو ساری عمر جاری رہتی ہے۔ مجھے دیکھ لیں، جب میں ایم اے کے امتحان دینے گئی تو آپ یونیورسٹی کے باہر بیٹھی آئس کریم کھا رہی تھیں۔''

''امی یہ کہانی میں جب سے پیدا ہوئی ہوں تب سے سن رہی ہوں۔ اب میرا بندہ تو باہر بیٹھ کر آئس کریم نہیں کھا سکتا ناں؟'' اس نے مجھے نئی پریشانی بتائی۔

یہ بندے کی اصطلاح اس نے ہماری پیاری منہ بولی خالہ سے سیکھی تھی۔ جب پہلی دفعہ سنا تو ہنس ہنس کر بے حال ہوگئی۔ کوئی مجازی خدا کہتا ہے، کوئی بندہ، کوئی گھر والا، کوئی سر دا سائیں

اور کوئی میاں، لیکن اس نے سب سے زیادہ لطف بندہ کی اصطلاح سے اٹھایا بلکہ اس کا ترجمہ کر کے عرب ترک سہیلیوں کو سنایا۔ انھوں نے اس سے بھی دلچسپ اصطلاحات کا تبادلہ کیا اور تب سے ہی اس نے لفظ 'بندہ' چن لیا تھا۔

''امی، ادھر اتنی خاموشی اور بیزاری ہوگی، سب لوگ دور ہوں گے؟''

''کوئی بات نہیں، آپ کی دونوں 'امیاؤں' اور آپ کا بندہ 'میاؤں' ادھر آ کر ہلہ گلہ کریں گے'' میں نے اس کے تصور میں رنگ بھرنے کی کوشش کی۔

''بیٹا ایسا ممکن ہے کہ آپ لوگ آج رات کا کھانا ادھر کھالیں؟'' میں نے 406 نمبر کا صدمہ کم کرنے کے لیے کہا۔

''جی امی، میں ذرا اپنے بندے سے پوچھ لوں'' اب اس کی آواز کھلکھلانے لگی۔ پھر ذرا رک کر بولی، ''لیکن آپ کی پی ایچ ڈی؟'' اس کی سوئی وہیں اٹکی تھی، ''اس طرح تو بہت دیر ہوجائے گی۔ ازمہد تا لحد علم حاصل کرو؟''

''دیر کیسی؟ میرا تو ابھی وفات پانے کا کوئی پروگرام بھی نہیں'' میں نے مزید تسلی دیتے ہوئے بات بدلی، ''اچھا یہ بتائیں کہ کھانا کیا ہے؟''

''اچھا، آپ میرے لیے کوفتہ بریانی بنالیں یا نان اور بٹر چکن بنا سکتی ہیں؟ میرا بندہ پیزا نہیں کھائے گا۔''

''نان بنالیں، ہونہہ'' مجھے لگا کہ 406 نمبر کا غم واقعی کم ہوگیا تھا۔

••

ایک میٹنگ کے درمیان بیٹھے بیٹھے میرے انٹرنیشنل نمبر پر بے آواز گھنٹی بجی۔ کیونکہ یہ صرف ارجنٹ کال بچوں کی ہوسکتی تھی لہٰذا مجھے فون اٹھانا پڑا...

''السلام علیکم امی''، دوسری طرف ہماری صاحبزادی تھیں، ''ایک منٹ بات ہوسکتی ہے؟''

میں معذرت کر کے فوراً باہر نکلی۔ ''امی آپ نے رابی (سہولت کے لیے فرضی نام) کا نمبر کسی کو دیا تھا کرائے پر گھر کی تلاش کے بارے میں؟''

''جی بیٹا دیا تھا۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ ارجنٹ دیجیے۔ میں نے فیس بک پر لگا دیا اور لندن ہی کے ایک صاحب کا فون نمبر دیا تھا۔''

رابی ایک ڈینش مسلم طالبہ ہے جو میری بیٹی کی دوست ہے اور اس لیے مجھے بھی بیٹی جیسی

ہے۔ ایک مسلمان ہی سے اس نے شادی کی جس نے اسے چار سالہ بچی کا تحفہ دیا اور کسی اگلی خاتون کو مسلمان کرنے چل دیا۔ اس کے اسی پس منظر کی وجہ سے وہ میرے دل کے نہایت قریب ہے اور وہ ہمارے گھر کو اپنا گھر ہی سمجھتی ہے۔ وہ لندن میں اپنی تعلیم کے دوران وہ مقیم تھی کہ اس کے مالک مکان کی اچانک وفات ہوئی جس کے بعد وراثت کے مسائل ہوئے اور اسے گھر چھوڑنے کا نوٹس مل گیا۔ اس نے فوراً ہمیں مدد کرنے کے لیے کہا۔ میں نے فیسبک پر ایک نوٹ لگایا اور بے حد خوشی ہوئی جب چند لوگوں نے فوراً رابطہ کیا۔ نیلما درانی صاحبہ نے فون کیا اور کہنے لگیں کہ اگر فوری ضرورت ہے تو میرے پاس آجائے، جب تک اس کے کمرے کا بندوبست نہیں ہوتا وہ میرے ساتھ شیئر کر لے۔

ہماری صاحبزادی کی آواز میں ناراضگی بھی تھی اور غصہ بھی۔

میں نے ڈینش میں پوچھا، ''آخر ہوا کیا ہے بیٹا؟''

''امی اس کو ایک چچا ٹائپ آدمی نے فون کیا ہے اور اپنے گھر کے ساتھ اپنا رشتہ بھی پیش کیا اور ملنے کو کہا۔''

''ہیں؟'' مجھے شدید حیرت ہوئی کیونکہ جن صاحب کو میں نے بچی کا نمبر دیا تھا وہ پختہ عمر کے سنجیدہ آدمی معلوم ہوتے تھے۔

''امی! کیا ہو گیا سارے مسلمانوں کو اور پاکستانیوں کو؟'' وہ مزید پریشان ہو کر بولی۔

یاد رہے کہ یہ نومسلم مذہبی اعتبار سے مسلمان ضرور ہوتے ہیں لیکن ثقافتی اعتبار سے وہ اپنے ہی ملک اور علاقے کی معاشرت سے وابستہ رہتے ہیں۔ ایسے ہی رابی مذہبی اعتبار سے مسلمان ضرور ہے اور وراثت میں ملے ہوئے اسلام اور ورثے میں مسلمان ہوئے لوگوں سے ہزار درجہ بہتر ہے لیکن ثقافتی اعتبار سے اور تہذیبی اعتبار سے وہ ڈینش ہی ہے۔ یہاں کوئی راہ چلتے آپ کو رشتہ پیش نہیں کرتا اور نہ ہی بے ہودگی سے، ملے بغیر دیکھے بغیر اور آپ کی رضا کو جانے بغیر، فوری طور پر خود کو پیش کر دیتا ہے۔

''امی اب اس کا نمبر کسی کو مت دیجیے گا۔ جس سے بھی رابطہ کرنا ہو پہلے آپ خود بات کریں، پھر جب کوئی مناسب لگے تو آگے بات کیجیے گا۔''

ندامت اور غصے کے مخلوط احساسات نے مجھے گھیر لیا کہ کیا واقعی یورپ میں رہنے کے باوجود ہمارے مرد حضرات اتنے مایوس ہو چکے ہیں کہ وہ عورت کو اپنی ذات کے تلذذ کے علاوہ اور کسی قسم کا احساس تحفظ تک نہیں دے سکتے؟ کیا کسی بھی عورت کو اپنے حرم میں داخل کیے بغیر اس کا

کوئی مسئلہ حل نہیں کیا جاسکتا؟ ایک چھت کی تلاش کی قیمت ایک عورت سے وہی لی جائے جو ایک اختیار رکھنے والا مرد چاہتا ہے؟ شاید میرے اس شدید ردِعمل کا باعث اس بچی کے سامنے شرمندگی تھی جو اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام کو دینِ کامل سمجھتے ہوئے اس میں داخل ہوئی تھی اور جس کا اسلام کے بارے میں علم اور عمل ہم پیدائشی مسلمانوں سے زیادہ مستحکم تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اس ادھیڑ عمر کے لینڈ لارڈ کو سمجھا سکتی کہ مرد بِنا کسی عورت کی مجبوری سے فائدہ اٹھائے اور بیمار ہوس کے اظہار کے بجائے انسان بن کر ایک دوسرے انسان کی مدد کرنا بھی سیکھ سکتا ہے۔ کم از کم اس معاشرے میں جہاں سماجی گھٹن نہیں ہے وہاں اس موروثی مرض کے بھدے اظہار پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ لیکن مجھے علم تھا کہ سوائے جلنے کڑھنے کے مجھے کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔ کیا واقعی تعلیم مغربی ماحول اور یہاں کے ساتھیوں کے آزادانہ ملنے کی جنسی آزادی کے باوجود چند حیوان عورت کو صرف ممالیہ جانور کی مادہ سمجھتے ہیں؟

میں نے رابی فون کر کے معافی مانگی۔ وہ ایک غیرت مند افغانی مسلمان کو بھگت چکی ہے۔ اے اللہ تُو ہمیں عورت کو انسان سمجھنے کی توفیق دے دے۔ اب کے میں نے براہِ راست اللہ ہی سے رابطہ کیا کیونکہ اپنی تخلیق کردہ مخلوق کو صرف وہ ہی سنوار سکتا ہے، نہ تعلیم نہ ماحول نہ ترقی یافتہ معاشرہ۔ میں نے رابی کو تسلی دی کہ ہمارے ہاں تو ایسے ہی ہے کہ بزعمِ خود سماجیات کے ماہر رشتے سے انکار ہونے پر سبق سکھانے چل پڑتے ہیں۔ صبح شام ایک ہی کاوش کہ کس طرح سے ایک عورت کے کردار کو مسخ کیا جائے، اسے سبق سکھایا جائے کہ ہماری رفاقت کو ٹھکرانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

میں نے اسے بھی امید کی ایک کرن دکھائی کہ دیکھو ہم سب مل کر تبدیلی لانے کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہ تبدیلی عورت میں بھی آئے گی اور مرد میں بھی۔

آج کل میں سندھی کلاسیکی ادب کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ ماروی کا کردار سترھویں صدی میں مثال تھا۔ کچھ چیزیں ناقابلِ فروخت ہوتی ہیں۔ انھیں سر پر ایک چھت کے بہانے اور چند آسائشات دینے کے عوض خریدا نہیں جاسکتا۔ اب جب اس موضوع پر گفتگو چل ہی نکلی ہے تو ایک اور بات جس کی طرف میں توجہ دلانا چاہوں گی وہ پاکستان میں حقوقِ نسواں کا قانون منظور ہونے کے بعد علمائے کرام کے مسلسل اعتراضات ہیں جو اپنی تقاریر میں کہہ رہے ہیں کہ اگر مغرب نے عورت کو آزادی دی ہے تو یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ مغرب میں عورت کا حال کیا ہے؟ سماجی طور پر اس کی اولاد کے بارے کسی کو یہ علم نہیں کہ کس بچے کا باپ کون ہے؟ مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ کیا ان

علمائے کرام نے کبھی مغربی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے؟ (میرے لالہ جی حافظ صفوان نے فساد ساز علمائے کرام کے لیے علمائے کرائم کی چچھاتی اصطلاح ایجاد کی ہے) ان کا کیا خیال ہے کہ اس عورت نے اپنی جنگ لڑ کے اپنے زمانے کے علما سے، جو بائبل ہاتھ میں لیے ان کے حقوق کا فیصلہ کیا کرتے تھے، اگر آزادی لی ہے، اس آزادی کی قیمت دی ہے، اور اس آزادی کو اپنا کر وہ کسی بھی مقام پر پہنچی ہے، تو کیا وہ اپنی اس آزادی کی قدر کرنے کی اہل نہیں ہے؟

براہِ کرم آپ اس کے ماحول کے مطابق اس کی شخصیت کا مشاہدہ کریں۔ وہ خود کو کسی کا غلام نہیں سمجھتی اور جس کی تازہ مثال حال ہی میں چلنے والی عالمگیر ME TOO تحریک ہے جس کے پرچم تلے اسی مغربی عورت نے اپنے اوپر ہونے والے جنسی جبر اور ہراساں کرنے کی بیس بیس سال پرانی داستانیں منظرِ عام پر لا کر نام نہاد معتبر شخصیات کی پارسائی کے چیتھڑے اڑا کر رکھ دیے ہیں۔ اس تحریک کے منفی و مثبت پہلوؤں پر تو بعد میں بات ہوگی پہلے مظلوم عورتوں سے زیادتی کرنے والوں کو اپنے احتساب کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

رہ گئی رنگ برنگے بچوں کی بات، تو جس معاشرے میں وہ رہتی ہے وہاں DNA کے ٹیسٹ کا دور ہے اور مغرب آپ کے ان سارے خدشات سے بہت آگے جا چکا ہے۔ اور جہاں تک اولاد ہی کے نام ونسب کی بات ہے تو حضور، اس بات کو سنبھل کر اور بہت سوچ سمجھ کر اٹھائیے۔ اس میں ہزاروں نام ایسے بھی آئیں گے کہ ہوسکتا ہے خود وہاں پہ ان کے اپنے نسب مشکوک نکل آئیں۔ ایک روایت یا حدیث جس کا بیشتر علما حضرات تواتر سے ذکر کرتے ہیں کہ قیامت کے دن اولاد کو ان کی ماؤں کے نام سے اٹھایا جائے گا۔ اس نکتے کو ذہن میں رکھیے اور خلوصِ دل سے سوچیے کہ ماں کے نام سے کیوں اٹھایا جائے گا؟ (تاہم یہ حدیث موضوع ہے اور اس پر تفصیلی بحثیں انٹرنیٹ سے دیکھی جاسکتی ہیں۔)

مغرب کی ہر بات کو حقارت سے دیکھنے کے باوجود وہاں رسائی اور اندھی تقلید کا مقصد کبھی سمجھ نہیں آیا۔ مغرب کی جو واحد برائی ہے وہ صرف یہی ہے کہ مشرق کے مردوں کو جو ''آزادی'' حاصل ہے، وہی مغربی عورت کے پاس ہے تو اس پہ تلملانا کیسا؟ دنیا جس تیزی سے ایک عالمی دیہات میں تبدیل ہوئی ہے، اس کا تقاضہ یہی ہے کہ نئی نسل کی تربیت واضح حقائق کے ساتھ کی جائے تاکہ وہ شرق وغرب کے سماجی فرق کو سمجھ سکیں اور مشترکہ افہام وتفہیم کے ساتھ مشترکہ احترام کا جذبہ پیدا ہوسکے۔

••

عالیہ کی شادی کے بعد جب بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ ہمیں بتایئے بچوں کی کامیاب شادی کا کیا راز ہے کیونکہ یہاں تو رشتہ ہونے سے شادی کی تقریبات تک پلاننگ کے دوران ہی جھگڑے شروع ہوجاتے ہیں۔ مجھے یہ سوال سن کر واقعی ہنسی آتی ہے کہ میرے فیصلے کو چیلنج کرنے والے، سرِ راہ مجھے سرپھری عورت سمجھ کر سمجھانے والے، اور عزت و آبرو کو مرد کی وراثت سمجھنے والے، اب مجھ سے ہی کیسا سوال کر رہے ہیں۔ میرے بچوں پر میرے والدین کی دعاؤں کا سایہ ہے کہ وہ اس ملک میں رہتے ہوئے بھی جسے ہمارے کرم فرما دارالکفر کہتے ہیں، صرف ایک ماں کی نگہداشت میں پروان چڑھنے کے باوجود اللہ نے انھیں اور مجھے ہر طرح کی آزمائش سے بچائے رکھا۔

عالیہ کی کامیاب ترین زندگی کا ایک اہم عنصر اس کی قانونی والدہ اور میری محترم بہن بشریٰ عارف ہیں جن کی تربیت کا ثمر ہے کہ مجھے ایک پلا پلایا بیٹا مل گیا جسے میرے تمام مسائل کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ بشریٰ عارف بہن نے کبھی مجھے یہ احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ ہم دو مختلف خاندان ہیں جو دو مختلف اطراف سے آ کر ایک مرکز پر ملے ہیں۔ جواباً میری بھی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ مجھ سے کوئی ایسی کوتاہی، جسارت یا خطا نہ ہو جس سے ان کے دل میں درز یا دراڑ آئے۔

فی زمانہ میں جب شادیوں پر فریقین کو بحث مباحثہ کرتے دیکھتی ہوں تو مجھے حیرت کے ساتھ تاسف بھی ہوتا ہے۔ میں نے عالیہ کی شادی پر امی جی کی عادات کے مطابق کسی بحث کی گنجائش نہیں آنے دی۔ چونکہ وہ بڑی بہو تھی اور ساس امی کے ارمان تھے لہٰذا سب کچھ ان کی پسند پر چھوڑا گیا۔ مہندی کا لباس چونکہ سیٹ نہیں آیا، وہ اس نے کوپن ہیگن سے خرید لیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ شادی بخیر انجام پائی۔ مجھے شوق تھا کہ وہ خوب اچھی سی مہندی لگوائے۔ اسے میں ایک پارلر میں لے کر گئی۔ عالیہ نے سادہ ترین مراکش انداز کی مہندی پسند کی جس میں رنگ بھر کر نگینے لگائے جاتے تھے۔ میرا اصرار تھا کہ عروسی ڈیزائن پسند کرو۔ عالیہ کو سادگی پسند تھی۔ مہندی لگانے والی بچی بولی، ''یہ پہلی دولھن ہے جس کی اپنی ماں سے لڑائی نہیں ہوئی ورنہ دولھنیں اتنی فرمائشیں کرتی ہیں کہ ان کے ڈیزائن کا فیصلہ ہوتے کئی دن لگتے ہیں۔''

شادی کی تقریبات میں سادگی اور فریقین کا باہمی احترام تمام معاملات اور انتظامات کو سہل ترین انداز میں مکمل کرتا ہے۔ بس یہی سادہ سا راز ہے جو ابا جی عورتوں کو واشگاف الفاظ میں سمجھاتے تھے کہ جو عورتیں اپنی انا کا پرچم لپیٹ کر رکھ دیتی ہیں تو وہ پرچم دراصل ان تمام فسادات

اور مسائل کا کفن بن جاتا ہے جس کا نئی نسل کو سامنا ہے۔ خواتین کو یہ بات سمجھنا ہوگی کہ ہمارے کلچر میں ہمارے بچوں کے گھر تب تک آباد نہیں ہو سکتے جب تک بطور ایک ماں کے ہم اپنی ذمہ داریاں قبول نہیں کرتیں اور وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اولاد کی زندگی میں دخل دینا نہیں چھوڑتیں۔ خصوصی طور پر رپورٹر مائیں جو بی بی سی کے نمائندے کی طرح گھر کا دروازہ کھلتے ہی ایک متعصب مورخ کی طرح اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ساری رپورٹ بیٹے، بھائی یا خاوند کے کانوں میں انڈیلتی ہیں۔ آج کی سائنس اور سمارٹ فون نے اس قابلیت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

مجھے ایک بچے کی بات ہمیشہ یاد رہے گی، ''میری بیوی تو بہت اچھی تھی بس اس کی اماں اگر ہر رپورٹ کا خلاصہ اسے نہ بھیجتی۔ اور ادھر کی ہر رپورٹ نہ مانگتی اور وڈیو کالز نہ کرتی۔''

یہ ساری باتیں ان ہی افکار کی گونج ہیں جو اباجی وقتاً فوقتاً کہا کرتے، ''بے لاگ رائے، بے خوف مشورہ، اگر لینا ہے تو لو، عمل کرو گی تو گھر بستے رہیں گے۔'' عورتیں اتنی بڑی طاقت ہیں کہ وہ چاہیں تو مردوں کو جوڑ کر ملا بھی سکتی ہیں اور توڑ کر مخالف کیمپوں میں بھی بٹھا سکتی ہیں۔ اگر اولاد کی زندگی میں بحران آئے تو ماؤں کو رک کر سوچنا چاہیے کہ اس میں میرا کیا کردار ہے، یہ پیدا کیسے ہوا اور میں اسے روک کیسے سکتی ہوں؟ جمع تفریق کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ اپنی انا کا علم لپیٹ کر اسے ان فسادات اور بحرانوں کو کفنانے کے کام میں لایا جائے۔ کسی بھی انسان کی کامیابی ایک اچھی نسل کی تربیت میں مضمر ہے اور بس، باقی سابقے اور لاحقے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ حضرت نوحؑ کی مثال دینے والے بھول جاتے ہیں کہ نافرمان بیٹے کے ساتھ اس کی والدہ بھی شامل تھی۔

●●

شکر ہے مجھ پر کسی کی احسان بھری رفاقت کا بوجھ نہیں اور آج کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری زندگی کے مشکل ترین دنوں میں کسی نے ان بوجھل ساعتوں کی طوالت کو کم کیا۔ رب العزت کا بے حد احسان ہے کہ اباجی اس سفر میں میرے ساتھ رہے۔ نہ دنیا کے سامنے خود جھکے اور نہ ہی مجھے جھکنے دیا۔ انھوں نے کبھی کسی کو اتنی جرات ہی نہ دی کہ کوئی میرے فیصلوں پر بات کرنے کی بھی کوشش کرتا۔ وہ آخر دم تک میرے سر پر سائبان کی طرح تنے رہے۔ بچے ان کی مضبوطی پر حیران ہوتے تھے کیونکہ ان کی عادات بچوں کے لیے بہت نئی تھیں۔ اپنا ہر کام خود کرنا، اپنی طبیعت کی خرابی کے باوجود اٹھ کر مریضوں کے ہمراہ چل دینا، نہ کھانے پینے کا کوئی چونچلا اور نہ ہی کسی سے کوئی مطالبہ، کسی پر اپنے کسی بھی کام کا کوئی بوجھ نہیں، کھانے میں کیڑے نکالنے اور نقص ڈھونڈنے کا کوئی

تصور ہی نہیں، نہ تو کسی سے کہہ کر اپنا کوئی کام کرانے کا رواج اور نہ ہی کسی کو آواز دے کر کوئی چیز مانگنے کا دستور، کسی کی زندگی میں کوئی عذاب آمیز دخل نہیں اور نہ ہی کوئی حکم نامہ۔ اُسامہ حیرت سے دیکھتا، ''امی، نانا ابو کتنے Self Sufficient ہیں''، اور واقعی ابا جی کو مخدوم ہونے سے زیادہ خادم ہونے کا جنون تھا۔

میں کہاں کہاں اور کیسے کیسے اللہ کا شکر ادا کروں۔ ہر اظہار میں ابا جی کا علم، میری ماں کا حلم اور پورے خاندان کی تائید شامل ہے۔ ابا جی نے عورت کو کبھی کمتر، حقیر اور پست نہیں سمجھا۔ ان کا دعویٰ رہا کہ اگر بچیوں کو مساوی تعلیم و تربیت دی جائے تو لڑکوں سے سبقت لے جاسکتی ہیں کیونکہ ان کے دماغ میں بیک وقت کئی افعال انجام دینے کا پروگرام ڈالا گیا ہے۔ انھوں نے بیٹی اور بیٹے میں امتیاز نہیں برتا۔ کہا کرتے تھے کہ پاکستان اور اس جیسے دوسرے ممالک کی سماجی پسماندہ رکاوٹوں میں تو سمجھ آتی ہے کہ عورت مخلوط تعلیمی اداروں میں نہ جائے، لیکن جب یورپ کے رہنے والے بچیوں پر تعلیم کے دروازے بند کرتے ہیں تو حیرت کے ساتھ اشتعال بھی شامل ہوجاتا ہے۔ ''جان پدر، آپ پر ذمہ داری ہے کہ اپنی بچی کو اعلیٰ تعلیم دلاکر اور ایک کامیاب انسان بنا کر مثال قائم کریں۔''

••

جس دن عالیہ کو میڈیکل کی ڈگری ملی اور وہ اپنے بھائی اور شوہر کے درمیان فخر سے کھڑی تھی تو میری آنکھوں سے ایک جھڑی برسنے کا اذن مانگ رہی تھی۔

''عورت کسی لحاظ سے کمتر نہیں ہے۔'' ابا جی کی آواز اس تاریخی ہال میں میرے ساتھ ایستادہ رہی۔ ان کی شفیق سرگوشیاں میرے آنسو خشک کرتی رہیں۔ اس رات جب میں سوئی تو میری نیند کے پیروں میں کہیں کوئی کانٹا نہیں چبھا۔ میرے جذبۂ شکر میں کسی فخر کی آمیزش کبھی نہ ہو پائی، بس ایک تشکر کا بے پایاں احساس جو ہر احساسِ زیاں کو بہا کر لے جاتا ہے۔

بالآخر اللہ نے میری بیٹی کو کامیابی کی منزل سے ہم کنار کیا۔ ابتلا اور آزمائش کے وہ تمام دن جو اس کی اعلیٰ تعلیم کے راستے میں اندھی کھائی کی طرح حائل تھے، مخالفت کے وہ سارے تیر جو روح کو گھائل کرنے کے بعد بدن کو زخم کی آماجگاہ بنا دیتے ہیں اور تحکمانہ پابندیوں کی وہ زندگی جہاں اٹھنے والے اگلے قدم پر زنجیر کھنک جاتی تھی، محض ایک خوف ناک خواب کی یاد بن گیا۔

میرے چہرے کو بھگوتے آنسو اس بات سے بے نیاز تھے کہ میرے گرد و پیش میں موجود ڈینش والدین مجھے کیسے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے اس کامیاب دن ابا جی کی یاد آتی رہی۔

''میں دیکھنے کے لیے نہیں ہوں گا لیکن دنیا دیکھے گی۔'' جس مقصد کے لیے ماں قربانی دیتی ہے وہ حاصل ہو جائے تو کیسا لگتا ہے۔ رستے کے سارے غم، ہر امتحان سے تنہا گزر کر سرخرو ہونا شاید ایسے خوب صورت انعام کی صورت میں ملتا ہے۔ مبین بیٹے نے میرے کندھے پر ہاتھ پھیلایا۔ اس کا دوسرا بازو عالیہ کے شانے پر تھا۔

''بس کریں امی،'' اُسامہ نے کیمرے کا بٹن دبایا،''ڈرامہ کوئین۔''

میں نے عالیہ کے آخری امتحان کے دن ڈنر کا اہتمام کیا۔ اپنے ہاتھ سے ہر ایک کی پسند کے کھانے بنائے۔ خالہ جان اور ستار انکل سہ پہر کو ہی آ گئے۔ عمران اور اسماء دونوں شہزادیوں کے ساتھ شام کو پہنچے۔ پھر عالیہ کو گھیر گھار کر لایا گیا۔ اسے علم نہیں تھا کہ ساری فیملی جمع ہوگی۔ میری بیٹی کا نیا اور اصل خاندان دنیا بھر کے تحائف سجائے پھولوں اور چاکلیٹس کی ٹوکریاں اٹھائے اپنی بھابو کے گرد پروانہ وار رقصاں تھا۔ مجھ سے کہیں زیادہ اس کی امی جان اس پر دعاؤں کے حصار پھونک رہی تھیں۔ ستار انکل اور خالہ جان عمران اور اسماء اس کی خوشیوں کو دوبالا کر رہے تھے اور چھوٹی لائبہ جو عالیہ کو عالمہ خالہ پکارتی تھی، اس کی گود میں چڑھی بیٹھی تھی۔ اس سے چھوٹی عیشا اپنی ہیرے کی کنیوں جیسی آنکھیں چمکا کر سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہو کیا رہا ہے، اور میرا بیٹا کچن میں کھڑا خانساماں کا رول ادا کر رہا تھا۔

''عورت چاہے تو ایک حقیر لکھ سے لکھ کر دے اور مرد لکھ کما کر بھی لائے تو عورت کی موجودگی کے بغیر لکھ ہے'' ابا جی کی آواز بھی ان گنگناہٹوں کے درمیان کہیں ابھرتی۔ غباروں اور شمعوں سے آراستہ گھر کے ایک کونے پر گھر کے بنے کھانوں کی بہار تھی۔ عالیہ کے لیے خصوصی کیک بنوایا گیا تھا۔ دوسرے کونے پر عالیہ کے لیے تحائف کے ڈھیر تھے۔ سب بچوں کی آوازوں کی گونج میں کسی ایک کی بات کی بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

خالہ جان خفا ہو رہی تھیں،''صبح لڑکی نے سفر کرنا ہے۔ چلو بوریا بستر لپیٹو۔''

صبح آٹھ بجے مجھے بھٹائی یونیورسٹی کی کانفرنس میں شرکت کے لیے نکلنا تھا۔ ڈاکٹر یوسف خشک جو کمال محبت سے مجھے بہنا کہہ کر پکارتے ہیں، وائس چانسلر ڈاکٹر پروین شاہ صاحبہ کا حکم سنا چکے تھے کہ صدف سے کہیے میں انتظار کر رہی ہوں۔ ساری بھاگ دوڑ میں کہیں تھکاوٹ کا نام و نشان نہیں تھا۔ رات گئے جب عالیہ اپنے کمرے سے تکیہ اٹھا کر میرے پاس آئی تو آہستہ سے بولی،

''امی آج اگر نانا ابو ہوتے۔''

''کیا مطلب ہوتے؟'' میں نے اس کی پیشانی چومی ''وہ آج بھی ہیں، میری صورت میں، آپ کی صورت میں اور ہر اس انسان کی صورت میں جو اپنی ہستی مٹا کر دوسروں کی روئیدگی اور بالیدگی کا متمنی ہو۔''

''امی جی آپ کیسے اتنے لمبے چوڑے کام کر لیتی ہیں؟ صبح سے تو آپ میری یونیورسٹی آئی ہوئی تھیں۔ لائیں میں آپ کے پاؤں دباؤں۔ کل سارا دن سفر کرنا ہوگا۔''

میں نے کہا، ''جب اللہ آپ کو ماں کے رتبے پر فائز کرے گا تو آپ کو اس عبقری طاقت کا احساس ہوگا جو اللہ والدین کو عطا کرتا ہے۔''

••

ابا جی اکثر عالیہ کو کہتے ''بیٹا ایک مریض دکھے ہوئے دل والا ہوتا ہے۔ اس کی بات توجہ سے سننا بھی عبادت ہے۔ اور پھر آپ ایسے لوگوں کے درمیان رہتی ہیں جن کا کوئی عقیدہ نہ بھی ہو تو وہ اپنی فطری نیکی کے باعث دوسروں کے لیے خیر کا باعث بنتے ہیں۔ نہ جنت کے محلات و باغات اور انعامات کی حرص، نہ ابدی نعمتوں کا تعاقب، بھلے ان کو قبر کے عذاب اور دوزخ کی آگ کا ڈر نہ ہو اور نہ ہی کسی کی خوشنودی کی طلب ہو، مگر پھر بھی وہ نیکی کرتے ہیں۔''

ابھی عالیہ کا میڈیکل کا رزلٹ بھی نہیں آیا تھا کہ اس نے پی ایچ ڈی کے لیے اپلائی کر دیا تھا اور اسے ڈرماٹالوجی میں داخلہ بھی مل گیا۔ ساتھ ہی ہماری نواسی کی آمد کی خوشخبری بھی مل گئی۔ اس نے ارادہ بدل دیا اور طے یہ پایا کہ بچے کے بعد ازسرِ نو پی ایچ ڈی کا پروجیکٹ لے لیا جائے۔ ابھی آئمہ چند ماہ کی تھی کہ عالیہ نے نیورو میں پی ایچ ڈی کے لیے درخواست دے دی۔ دورانِ تعلیم وہ برطانیہ میں نیورو ڈیپارٹمنٹ میں چند ہفتے کام بھی کر چکی تھی۔ ڈنمارک میں اگر پی ایچ ڈی کا پروجیکٹ منظور ہو جائے تو وہ ملازمت کرنے کے برابر ہوتا ہے جس میں تنخواہ اور دیگر سہولیات بھی دی جاتی ہیں۔

آئمہ کی پیدائش کے بعد ابھی مجھے پاکستان آئے چند ہفتے ہی گزرے تھے کہ ہماری صاحبزادی کا فون آیا، ''امی جانی، اس نے ہمیں کھنکھناتی آواز میں سنسنی پھیلانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے فون کیا، ''ایک اچھی خبر ہے۔''

''مجھے علم ہے۔۔ آپ کا پی ایچ ڈی ایڈمشن کنفرم ہو گیا ہے۔'' میں نے اپنے پتے شو کر دیے۔

''جی امی، لیکن خوش خبری کا دوسرا حصہ بھی ہے۔'' وہ ہنوز اسی انداز میں بولی، ''آئمہ

صوفیہ اور میں آپ کے پاس پاکستان آرہے ہیں۔ سوچا کام شروع کرنے سے پہلے عیش کرلی جائے۔'' یہ واقعی لاجواب سرپرائز تھا۔

عالیہ جب سات مہینے کی آئمہ صوفیہ کو لے کر پی آئی اے کے ذریعے پاکستان آرہی تھی تو وہ ایک الگ داستان تھی۔ یورپ میں نوجوان ماؤں کی سہولت کے لیے کاندھے پر پہننے والے تھیلے بنائے جاتے ہیں جس میں بچہ ماں کے سینے سے لگا رہتا ہے اور ماں کے ہاتھ کام کرنے، فیڈر بنانے اور اسے تھپکنے کے لیے آزاد ہوتے ہیں۔ یہ شاید نانیوں اور دادیوں کی مدد کا متبادل ہے یا شاید تنہا ماؤں کے لیے بچہ سنبھالنے کی سہولت کے طور پر بنایا گیا ہے۔ اسے کھیتوں میں کام کرنے والی مزدور ماؤں کی کمر پر چادر سے بندھے بچے سے تقابل کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ تھیلے تجارتی پیمانے پر اس تحقیق کے ساتھ بنائے گئے ہیں کہ نومولود بچہ ماں کے دل کی دھڑکن سن سکتا ہے۔ شیر خوار بچے کو ماں اس تھیلے کے اندر ہی دودھ پلاسکتی ہے۔

اگرچہ پی آئی اے کی پرواز براہِ راست تھی لیکن جہاز پہلے ناروے سے مسافر لیتا تھا۔ اسی جہاز میں ڈاکٹر ندیم ناروے سے بیٹھے۔ جب اسلام آباد ایئر پورٹ پر ہماری ملاقات ہوئی تو حیران ہوگئے۔

''یہ عالیہ ہے؟ میں اس بچی کو دیکھتا رہا۔ رات بھر کے سفر میں بچی کو کاندھے سے لگائے سنبھالے رکھا۔ میرا جی چاہا کہ میں مدد کروں لیکن پھر سوچا کہ یہ نہ ہو بچی کو میری پیشکش بری لگ جائے۔ لیکن کمال کی بہادر بیٹی ہے بھئی ہماری۔ بہت ہمت سے سفر کیا۔''

چند ماہ بعد ہم دونوں ایک شاپنگ سنٹر میں کھڑے تھے۔ ایک پاکستانی بزرگ پاس سے گزرے۔ عالیہ کو دیکھ کر ٹھٹکے۔ پھر پاس آ کر بولے، ''آپ تو بہت کمال کی ماں ہیں بیٹی۔ ہم آج بھی یاد کرتے ہیں کہ رات بھر کے سفر میں بچی کو رونے تک نہیں دیا تھا آپ نے، اور کیسے سنبھال کر رکھا۔''

پھر مجھے مخاطب ہو کر کہا، ''آپ کی بہن نے کنگرو والے تھیلے میں بچی کو ساتھ لگا کر سنبھالا ہوا تھا اور جہاز کی پچھلی سیٹوں پر ٹہل ٹہل کر سلایا۔''

مجھے ہنسی بھی آئی اور بات کی سمجھ بھی آ گئی کہ تھیلے میں ڈال کر بچوں کو سلانا ایک نئی بات تھی شاید۔ ''یہ میری بیٹی ہے۔'' میں نے بتایا ''اور پاکستان میرے ہی پاس آرہی تھی۔'' جواباً انھوں نے دعاؤں میں لپٹی حیرت کا اظہار کیا۔

••

''امی 2016 میں جتنا ٹریول ہو سکے کرلیں۔'' ہماری صاحبزادی نے فراخ دلی سے کہا، ''پھر 2017 میں آپ اپنی نواسی کو سنبھالیں گی اور اپنی کتابیں مکمل کریں گی۔''

''جو حکم'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''اللہ رے سعادت مندی'' اس نے میری کتاب الٹ دی۔

''آپ نے وعدہ کیا تھا کہ پڑھتے ہوئے شادی کرلو، میں بعد میں پڑھا دوں گی۔ دیکھ لیجیے میری سہیلیوں میں سے کسی کی شادی نہیں ہوئی۔''

''اچھا تو نقصان کیا ہوا جلد شادی سے؟'' میں نے بھی روایتی ماؤں کی طرح الٹ کر پوچھا۔

''اور میں نے آپ کو نواسی بھی لا دی ہے'' اب شکایات کا سلسلہ احسان سے جڑ گیا۔

''اچھا۔۔۔؟ اللہ کا احسان اور آپ کی فرمانبرداری کے قربان جایئے۔''

ڈنمارک میں زچگی کے لیے رخصت ایک سال کی ہوتی ہے۔ والد کو بھی بچے کی دیکھ بھال کے لیے چھٹی مل سکتی ہے۔ ڈنمارک جسے دنیا کا مسرور ترین ملک کہا جاتا ہے، ذہنی امراض کی زیادتی کے گراف پر بھی بہت بلندی پر ہے۔

عالیہ کی دلی خواہش تھی کہ وہ نیورولوجی میں پی ایچ ڈی کرے۔ یہ تمنا پوری ہوئی اور اس نے ڈنمارک کے معروف ہسپتال میں بحیثیت ڈاکٹر کے پی ایچ ڈی شروع کرلی۔ اس پروجیکٹ کا ایک حصہ ذہنی مریضوں سے بات چیت، ان کی کیفیات کا تجزیہ اور ان کو دوا لکھ کر دینا ہے۔ پی ایچ ڈی کے نگران ڈاکٹر سے طے کرنے کے بعد کچھ لیکچر بھی دیتی ہے جس میں سٹوڈنٹس کے ساتھ رابطہ ہوتا ہے۔ حسبِ معمول میرا ذوقِ تجسس بھی اس کی تعلیم کے ساتھ جاگا۔ میں روزانہ اس سے دن بھر کی روداد سنتی ہوں۔ ڈنمارک میں مریضوں کو پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی سے ہسپتال کا اور ڈاکٹر کا انتخاب کریں۔

ڈیپریشن اور معمولی ذہنی امراض کے شکار مریضوں کا بالجبر علاج معالجہ نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ جو مریض خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے خطرے کا باعث ہوں، ڈاکٹر ان کے لیے خصوصی حکم نامہ لکھتے ہیں اور مریضوں کو پولیس کی نگرانی میں ہسپتال میں لایا جاتا ہے۔ کل ڈاکٹر عالیہ نے اپنی زندگی کا پہلا حکمنامہ لکھا جو ایک نوجوان مریضہ کی جبری بھرتی کے بارے میں تھا۔ گھر آئی تو ہماری گفتگو شروع ہوگئی۔

دو معروف مصنفات ایمیلیا اور ہیلگا ڈنمارک کے مشہور ذہنی امراض کے ہسپتال سینٹ ہانز میں زیرِ علاج رہ چکی تھیں۔ ٹووڈِٹ لیوسن کی خودکشی کی مسلسل کوششیں اور آخر برفانی رات میں عام شاہراہ سے دور ایک ویران سڑک پر ہمیشہ کی نیند سونے والی یہ شاعرہ اور مصنفہ ڈینش ادب میں بلند مقام رکھتی ہے۔ اس کا تقابل سارہ شگفتہ سے کیا جاسکتا ہے گو دونوں کے حالاتِ زندگی سماجی اعتبار سے بہت مختلف تھے۔ اگلے دن ہی عالیہ کی باغی مریضہ، نرسوں کو جل دے کر ہسپتال سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی۔

ڈاکٹر صاحبہ کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں اور گھگھی بندھی ہوئی، ''امی جی اب کیا ہوگا؟ وہ تو اتنی کم عمر ہے۔'' شام تک مریضہ کو تو خیر بازیاب کرلیا گیا لیکن ڈاکٹر صاحبہ کو بھی غیر ضروری حساسیت کے لیے تھراپی دی گئی۔ ہسپتال کی پریشانیاں ذاتیات تک نہیں آنا چاہییں۔ یورپ میں باضابطہ طور پر مسیحاؤں کے لیے سرکاری طور پر جذباتی اور نفسیاتی تربیت کے لیے ماہرِ نفسیات موجود ہوتے ہیں۔

معروف انگریزی اخبار گارڈین میں، 2014 میں ڈنمارک کے متعلق ڈینئل فری مین اور جیسن فری مین کا ایک مضمون شائع ہوا:

> Mental illness affects us all – even in the happiest country on Earth

''سولہ فیصد خواتین اور تیرہ فیصد مردوں کو زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں اس مرض سے پالا پڑتا ہے۔ پتہ نہیں اس کی وجوہات کیا ہیں۔ ایک فلاحی ریاست اور آسودہ حال معاشرے میں ذہنی امراض کی کثرت کیوں ہے؟'' میں نے آرٹیکل پڑھتے ہوئے کہا۔

''بہت سیدھا جواب ہے امی، یہاں پر ذہنی مرض کو جسمانی عارضے کی طرح عام اور قابلِ علاج سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس مسئلے پر توجہ دلانے کے لیے سروے کیے جاتے ہیں تاکہ مریضوں کی ضروریات کو سمجھ کر اقدامات کیے جائیں۔ پاکستان یا جنوبی ایشیا میں ایسے سروے ہوتے ہی نہیں۔ اگر کسی طرح ممکن ہوں تو خدا جانے کیا دلخراش نتائج آئیں۔''

ڈنمارک میں ڈاکٹروں وکیلوں حتیٰ کہ ترجمانوں پر بھی اخفائے راز کی شدید پابندی عائد ہوتی ہے۔ بداحتیاطی کی صورت میں چھ ماہ قید ہوسکتی ہے۔ مجھے یاد ہے چند برس پہلے میں نے ایک افسانہ 'تین گھنٹے کی عورت' لکھنا شروع کیا۔ مجھے ایک نفسیات دان کا کردار لکھنے کے لیے کچھ تحقیق

کرنا تھی۔ ہسپتال سے مجھے مرض کے متعلق تمام معلومات دی گئیں لیکن کسی مریض کی خصوصی کہانی اور علاج کے بارے میں کچھ بتانے سے معذرت کر لی گئی۔

••

ابا جی اکثر شیخ سعدی کا قول دوہرایا کرتے تھے کہ تونگری بہ ہنر است نہ بمال، بزرگی بعقل است نہ بسال۔ اس وقت ان باتوں کا یقین کم ہی آتا، نہ ہی دلچسپی ہوتی۔ مارے باندھے فارسی پڑھنے پر مجبور تھے لیکن بلاشبہ بعض اوقات بچے ایسی بات سکھا دیتے ہیں کہ اپنی بزرگی پر نظرِ ثانی کرنا پڑتی ہے۔ کل ہی مجھے اپنی بیٹی سے تفصیلی بات کرنے کا موقع ملا۔ سارا دن کی مصروفیت سنانے کے بعد بولی، ''امی ایک مزے کی بات سنیں۔ آج مجھے ایک مریضہ ملی۔'' پھر جس انداز میں اس نے مجھے وہ روداد سنائی میں کتنی دیر محظوظ ہوتی رہی۔ ہسپتال کے سامنے عام طور پر بڑا بس سٹاپ ہوتا ہے جہاں گھنٹے میں متعدد بسیں چلتی ہیں تا کہ مریضوں اور ہسپتال کے عملے کو سہولت رہے۔ مزید یہ کہ ڈنمارک میں ماحولیاتی صحت مندی کے رجحانات کو عام کرنے کے لیے بسیں اور ریل گاڑیاں، سائیکل وغیرہ زیادہ استعمال کی جاتی ہیں اور سہولیات بھی عوامی ذرائع میں زیادہ ہیں تا کہ ان کا استعمال ہو۔ ذاتی گاڑیوں اور دکھاوے کے لیے بڑی گاڑیوں کی نمائش کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ ہماری صاحبزادی بھی وہاں کھڑی تھی۔ اچانک اس نے غور کیا کہ ساتھ ہی ایک معمر خاتون اپنی معذوروں والی کرسی پر بیٹھی ادھر ادھر گردن گھما رہی تھی۔ اس نے پیشہ ورانہ توجہ سے دیکھا تو شدید سردی میں برہنہ پا تھیں۔ دونوں کا مکالمہ شروع ہوا۔

''ہیلو، آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' عالیہ نے جھک کر پوچھا۔

''کیوں؟۔۔۔ تمھیں کیا تکلیف ہے؟'' جرمن آمیز ڈینش میں جواب آیا۔

''آپ کو سردی لگ رہی ہوگی۔ دیکھیے آپ کے پاؤں میں تو جوتا بھی نہیں'' عالیہ نے جھک کر اس کی جرابیں ٹھیک کیں۔

''اوہ! ہاں'' اس نے چونک کر پیروں کی طرف دیکھا، ''جوتا؟ ہاں'' پھر ڈپٹ کر جرمن زبان میں ہسپتال کو اور ڈاکٹروں کو برا بھلا کہنے لگی۔ بیٹی صاحبہ نے فوراً اس کی کرسی کے پیچھے ہاتھ رکھا، ''آیئے، پہلے آپ کے جوتے لے آتے ہیں، پھر جہاں آپ کہیں گی ادھر چلیں گے، کہیں سردی نہ لگ جائے۔''

''اچھا؟'' اس نے بے یقینی سے کہا، لیکن عالیہ کا ہاتھ نہیں جھٹکا۔ خیر دونوں سامنے ہی

ہسپتال میں پہنچیں۔ خاتون نے جو ستر برس کی تھیں، اچانک اپنی ماں کو یاد کر کے رونا شروع کر دیا۔ عالیہ نے وہیل چیئر کی پشت چھوڑی اور اس کے سامنے زمین پر بیٹھ کر اس کے ہاتھ پکڑے اور پیار سے پوچھا، ''آپ کتنے برس کی ہیں؟''

''ستر۔'' اس نے ہچکیاں لیتے، آنکھیں ملتے جواب دیا۔

''اچھا!!! ستر سال؟ پھر ہوسکتا ہے کہ آپ کی امی اب یہاں نہ ہوں۔ وہ ہوتیں تو نوے برس کی ہوتیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی بہت بہتر جگہ پر ہوں گی اور بہت خوش بھی ہوں گی؟''

تیسری منزل تک پہنچتے پہنچتے دونوں کے تعلقات دوستانہ ہو چکے تھے۔ وہاں پہنچیں تو خاتون کی ڈھنڈیا مچی تھی۔ خیر اس کو نرسوں نے بہت آرام سے واپس بستر پر پہنچایا، اس کے کپڑے بدلوائے۔

مریضہ کا خیال تھا کہ عالیہ شاید وہاں پر ملازمہ ہے اور چائے وائے بنانے کی ذمہ داری ہے۔ نرس نے اسے بتایا کہ وہ بچی ڈاکٹر ہے۔

''اچھا، چھوٹی سی ڈاکٹر!'' وہ پہلی مرتبہ مسکرائی۔ پھر چپکے سے وہ خاتون عالیہ کی مٹھی میں ایک بروچ دے کر کہنے لگی، ''مہربان پری! یہ تحفہ تم رکھ لو۔''

''نہیں نہیں۔ کل جب آپ سو کر اٹھیں گی تو کپڑے بدل کر خود یہ بروچ اپنے بلاؤز پر لگائیے گا، آپ مزید خوبصورت لگیں گی۔'' عالیہ نے اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرا جو اشکوں سے نم تھا۔

جس انداز میں اس نے مکالموں کی نقلیں اتاریں مجھے بہت ہنسی آئی۔ لیکن ایک بات اس نے کہی کہ بڑی عمر کے لوگوں سے بحث نہیں کرنا ہوتی، بالواسطہ بات کرنا ہوتی ہے۔ میں نے واقعی اپنے شاگردوں سے اور اپنے بچوں سے بہت کچھ سیکھا۔

••

میں نے بھی فیصلے کرنا ابا جی سے ہی سیکھے تھے۔ جب اللہ کے فضل و کرم سے میں نے کسی کا چھوٹا سا احسان لیے بغیر عالیہ کی شادی کی تو اُسامہ کی یونیورسٹی کی رہائش اور تعلیمی اخراجات کا مسئلہ بنا۔ میں نے اسی لمحے سارے مسائل کا حل سوچ لیا تھا۔ لمحوں میں یہ فیصلہ کیا کہ اب مجھے اس بڑے گھر میں نہیں رہنا۔ نئے سرے سے زندگی سے نبرد آزما ہونا ہے اور بیٹے کی ضروریات پوری کرنا ہیں اور اسے تعلیم مکمل کرانا ہے۔ مجھے اقتصادی مسائل سے نمٹنے کے لیے ایک مرتبہ پھر اس گھر کو چھوڑنا پڑا جو عالیہ کی شادی اور اُسامہ کے یونیورسٹی جانے کے بعد سامنے آئے، لیکن ایک مرتبہ پھر میرے فیصلے کے سارے اختیارات خود میرے ہاتھ میں تھے۔

مجھے خود ترسی کبھی نہیں ہوئی۔ ہاں، مانوسیت اور پناہ گاہ کے تصور نے دل گرفتہ ضرور کیا۔ ان دیواروں میں میرے بچوں کے قہقہے چھپے ہوئے تھے۔ ہم تینوں نے یہاں زندگی کے ساتھ پنجہ آزمائی کی۔ اسے بارہا پچھاڑا۔ کتنی ہنستی ہوئی کامیابیاں، کتنے روتے ہوئے حادثے، بیماریاں، تنہائی غرضیکہ کیا کچھ نہ تھا لیکن ایک مثبت حقیقت نے حوصلے جوان رکھے کہ ہم تینوں ایک ہی چھت کے نیچے تھے۔ اب آشیانہ خالی کرنے کا وقت تھا۔

''اپنے فیصلے خود کرو، وقت پر کرو اور پھر انہیں درست ثابت کرنے کی کوشش کرو'' مجھے ابا جی کا درس بخوبی یاد تھا۔

''بہت مشکل ہے ابا جی'' میں نے گویا خود کلامی کی۔

''مشکل اور ناممکن کچھ بھی نہیں، منزل کے قریب آ کر ہمت ہارنا کم عقلی ہے۔ بھلا یہ دنیا کا کارخانہ بھی کبھی رکا ہے؟ پہلے سے بہتر، ارفع اور زریں مستقبل کہیں منتظر ہوگا'' ہمیشہ کی طرح یہ ابا جی کا یقین تھا جو رہنما بن کر میرے ساتھ رہا۔ ایک لہجے کی خوشبو مجسم ہو کر میرے چہار جانب رقص کرنے لگی۔ ڈوبتے دل کو قرار آنے لگا۔ کیسی عجیب سمندر کے رنگوں کی گہری ٹھنڈی پرسکون کرتی خوشبو تھی جیسے سمندر کے اندر کہیں سارا نیلا آسمان ڈوب گیا ہو اور ارض و سما کا سکون اور وسعت میرے دل میں غوطے کھانے لگی ہو۔ جیسے دنیا بھر کی بے وفائی اور کج ادائی کو قدموں تلے روند دینے کا مشورہ دے رہی ہو۔ جیسے اس دن کے بعد گویا ذہن میں ایک نئی توانائی بھر گئی ہو۔ مجھے ایک مرتبہ پھر اٹھ کھڑا ہونے پر مجبور کرنے والی جھماکے مارتی کوندے کی طرح لپکتی خوشبو، جو دکھائی بھی دے رہی تھی اور سماعت میں بھی جلترنگ کی طرح بجتی تھی، اب لمس کی مانند ریشم سی بن کر جیسے میرے کاندھے پر سے جھانک رہی تھی۔

پھر میں نے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ بس لمحوں میں یہ فیصلہ کیا کہ اب مجھے اس گھر میں نہیں رہنا۔ میں نے نام نہاد دوستوں کی دریا دلی بھی دیکھ لی، سو میں نے ایک بار پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ گھر چھوڑتے وقت خیر اندیش سمجھانے نکلے۔

''صدف چھوڑ دو، پاکستان نہ جاؤ۔ اپنی صحت اور حالت دیکھو، ابھی ہسپتال سے آئی ہو۔ دوستوں سے مدد لینے میں کوئی حرج نہیں۔ گھر کو سہولت سے چھوڑنا اور پھر آرام سے پاکستان چلی جانا۔''

''نہیں'' میرا انکار پہلے سے زیادہ مضبوط تھا۔ میں نے شوق و ارمان سے ریزہ ریزہ اور

تنکا تنکا چن کر بنایا گھر چشم زدن میں چھوڑ دیا۔

نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

اب ایک دفعہ پھر میں تپتی زمین پر کھڑی تھی لیکن میری ذات کے ساتھ یہ غرور شامل تھا کہ میرے بچوں کی تعلیم و تربیت اور شادی تک کے اہم مراحل میں کسی کا ذرہ بھر احسان شامل نہیں۔ البتہ میں نے بہت سے چہروں سے نقاب سرکتے دیکھے مگر خاموشی سے نظر انداز کر دیا۔ ایک ہی اصول پیشِ نظر تھا کہ منت کش نہیں ہونا۔ جس پروردگار نے بچوں کی تعلیم و تربیت اور شادی جیسے بڑے فرض سے سبکدوش کر دیا وہ یہ مشکل بھی آسان کر دے گا۔ تنکا تنکا کر کے بنایا آشیانہ، ایسے چھوڑ جانا، یک لخت الجھے دامن کو جھٹکا دے کر چھڑانے کے مترادف تھا۔ عالیہ ملائشیا جا چکی تھی اور اُسامہ واپس یونیورسٹی چلا گیا۔ دونوں کو میری صحت بارے شدید تشویش لاحق تھی۔

خالی گھر میں یادوں اور قہقہوں کی بازگشت گونج رہی تھی۔ ایک عجیب احساس کے عفریت نے سر اٹھایا۔ ''سب مایا ہے۔ اس دنیا میں ہر چیز کا اختتام بے معنویت پر ہے۔ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند'' ابا جی کے بارہا دوہرائے ہوئے الفاظ کہیں آس پاس ہی گونجے۔ میں نے ہر کمرے کا چکر لگایا۔ دس برس کا طویل عرصہ ان دیواروں میں اور چھت میں کہیں جذب ہو گیا۔ میں نے شعوری طور پر کوشش کی کہ کوئی منفی خیال دل کو شکنجے میں نہ لے۔ اس گھر میں راحت اور برکت کا راج رہا۔ فون کے سپیکر پر ابا جی اور امی کی آواز گونجتی۔ کھانا بناتے ہوئے، کپڑے استری کرتے ان سے باتیں جاری رہتیں۔ یہاں بچوں نے تعلیمی میدان میں کامیابیاں حاصل کیں اور اب سفر یقیناً کسی بہتر رہگزر کی طرف ہو گا۔ میں نے خود اپنے شانے پر تھپکی دی۔

''ویلڈن صدف مرزا، یو آر اے ونر'' مکان پھر مل جائے گا اور تم اسے گھر بھی بنا لو گی۔''

مکان چونکہ کمپنی کا تھا اور گھر کی آتش زدگی کے بعد فوری طور پر دیا گیا تھا چنانچہ کمپنی نے اپنا نمائندہ بھیجا کہ مکان کا مکمل جائزہ لیا جائے اور اگر کوئی توڑ پھوڑ یا کمی بیشی ہو تو ایڈوانس کی رقم واپس نہ کی جائے۔ نمائندے نے شرلاک ہومز کی طرح لکڑی کے فرش کو بیٹھ کر یوں دیکھنا شروع کیا گویا یا تو میں نے اس میں ہیرے دبا رکھے ہوں یا پھر کہیں کوئی خونِ ناحق کا دھبہ چھپا دیا ہو۔

''فرش پر ہلکی سی لکیریں ہیں'' گسٹاپو کے کارندے جیسی شکل کا نمائندہ بولا۔

''اچھا''

’’کچن کی میز پر بھی ایک دھبہ سا ہے‘‘ اس نے محدب عدسے جیسی آنکھیں میز پر گاڑ کر کہا۔

’’اچھا‘‘

’’کھڑکی کے شیشے پر پینٹ کے داغ ٹھیک سے نہیں اترے‘‘ اب اس نے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کو دیوار گیر شیشے پر پھیرا۔

’’اچھا‘‘ اب اس نے ذرا رک کر مجھے دیکھا، پھر اسی انداز میں بولا ’’اس ساری مرمت پر دس ہزار کراؤن تک لگ سکتے ہیں۔ فرش کی رگڑائی ہوگی اور کچن کی میز بدلی جائے گی‘‘

’’اچھا‘‘ میں نے بھی اپنا جواب نہ بدلا۔

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔

’’اطمینان سے وقت لگا کر مزید داغ دھبے ڈھونڈو‘‘ میں نے اسے ملائمت سے کہا۔ ’’جب فارغ ہو گئے تو بتا دینا۔ میں اسی لیے یہ گھر واپس کر رہی ہوں کہ اقتصادیات کی لٹکتی تلوار اتار کر تمھارے ہاتھ پر رکھ دوں۔ کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ؟ پیسے واپس نہیں ملیں گے؟ نہ دینا۔‘‘

اور اس کے ردِعمل کا انتظار کیے بغیر جا کر خالی بالکنی کے فرش پر بیٹھ گئی جہاں دونوں اطراف میں کتابوں کی الماریاں ہوا کرتی تھیں۔ ایک شاندار لائبریری ہمیشہ سے میرا خواب رہی۔ اپنے کمرے میں چھت تک الماری رکھوائی اور باہر بالکنی میں دو الماریاں لگوائیں۔ درمیان کی میز پر میں شمع دان بدل دیتی۔ موم بتیوں کا رنگ اور خوشبو بدل جاتی۔ شیشے کے دروازے سے مدھم سا نور جھانکتا۔ ہم تینوں یہاں بیٹھ کر چائے پیتے اور ڈرائی فروٹ کھاتے۔ پورا چاند عین ہمارے سر پر آ کر معلق ہو جاتا جیسے کسی نے مخبری پر مامور کر رکھا ہو۔

میں کبھی نہیں بھول سکتی کہ ایک دفعہ اُسامہ نے شرارت سے مجھے بالکنی میں بند کر دیا، ’’اب پڑھیں بیٹھ کر کتابیں، اور سونگھیں اپنی موم بتیاں میری شاعرہ، بے بے جان!‘‘ اور پھر ہنستا ہوا باہر بھاگ گیا۔ لیکن بہن کو تاکید کرنا نہ بھولا کہ وہ تھوڑی دیر بعد دوازہ کھول دے ورنہ امی نانا ابو کو شکایت کریں گی، ’’ابا جی میں باہر بند ہوگئی ہوں۔‘‘

عالیہ اپنی میڈیکل کی کتابیں یہاں رکھ جاتی، ’’امی یہاں بیٹھ کر پڑھنے کا اپنا ہی لطف ہے۔‘‘ امتحانات کے بعد وہ رومی اور شیکسپیئر کی کتابیں کمرے میں لے جاتی اور سکون سے مطالعہ کرتی۔ یہ اس کا چھٹیوں کی عیاشی کا تصور تھا۔ اکثر اس کی سہیلیاں درمیانی دروازہ کھول کر یہاں بیٹھ کر کافی پیتیں۔

''گھر کی تین چابیاں ہیں، وہ واپس کر دو۔'' سراغ رساں کے اطوار والا نمائندہ معائنے سے فارغ ہو کر میری یادوں کی جھیل میں پتھر مارنے آ دھمکا۔

میں نے تینوں چابیاں اس کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ دونوں بچے جیسے میرے دائیں بائیں آ کھڑے ہوئے۔ دل میں ایک روایتی سے احساسِ زیاں کی کٹاری نے کچوکا لگانے کی کوشش کی، ''نہیں۔۔۔'' میں نے خود کو بتایا۔ ہم اس سے اچھا اور بہتر گھر بنائیں گے۔

میں نے خود کو یاد دلایا کہ جب زلزلہ زدگان لٹے پٹے آئے تو ان کی آبادکاری میں پیش پیش ابا جی کہا کرتے کہ ''ہر چیز پہلے سے بہتر مل سکتی ہے لیکن جو بچھڑ گئے وہ نہیں آ سکتے''۔

میری زندگی کی سب سے بڑی عطا میرے بچے سنہرے مستقبل کی شاہراہ پر گامزن ہیں۔ مجھے عالیہ کے توسط اور وسیلے سے ایک ہنستا مسکراتا، قدر دان اور خلوص لٹاتا پورا خاندان مل گیا اور آج تک لوگ حیران ہوتے ہیں کہ کیا واقعی ہمارا سمدھیوں والا روایتی رشتہ ہے؟

گھر تو ویسے ہی خالی ہو چکا تھا۔ عالیہ اپنے گھر کی ہوئی۔ اُسامہ یونیورسٹی جا چکا تھا۔ مجھے اس بڑے گھر کا کرنا بھی کیا ہے۔ میں جہاں بھی جاؤں گی اسے گھر بنا لینے پر قادر ہوں۔ میں نے اپنے شانے پر خود ہی تھپکی دی۔ آگ تو خیر لگ ہی گئی تو لگے ہاتھوں اس کو سینک ہی لیا جائے۔ چلیے پاکستان چلتے ہیں۔

میں نے ابا جی کے سکھائے سبق کے مطابق خود ترسی کے خون چوستی جونک جیسے احساس کو جھٹک کر دور گرایا اور اس سراغ رساں نمائندے سے پہلے سیڑھیاں اتر گئی۔ گاڑی میں بیٹھ کر اگنیشن میں چابی گھمائی۔ ایک آخری نظر اس مکان پر ڈالی جس پر لہراتے سفید پردوں کے پیچھے جدوجہد کے مسرت بھرے دن گزرے تھے۔

••

میں نے عالیہ کی شادی پر ایک نظم لکھی جسے ڈنمارک کے معروف کلاسیکی گلوکار اور بہت شفیق دوست محترم پرویز اختر نے اس کی رخصتی پر دھنوں میں اور اپنی طلسم انگیز آواز میں پیش کر کے اسے شادی کا بے مثال تحفہ پیش کیا۔ میں اکثر سوچتی ہوں ایسے پیارے لوگوں کا احسان کیسے اتارا جا سکتا ہے جو میری زندگی کے تاریک دنوں میں بھی ایک خاموش ہمراہی کی صورت ساتھ تھے اور روشن لمحات میں بھی ایک مسلسل نادیدہ دعا کی طرح اپنے ہونے کا احساس دلاتے رہے۔

••

مری ہمدم، مری بیٹی

تجھ سے پہلے تو خبر ہی نہ تھی میں ہوں کہ نہیں

تجھ کو پا کر ہی ہوا تھا مجھے 'ہونے' کا یقیں

تجھ کو چھو کر ہوا تخلیق کی قوت کا غرور

تجھ کو چوما تو مرے ہونٹ ہوئے تھے رنگیں

میری نبضوں میں تیرے پاؤں کی آہٹ گونجی

میری دھڑکن میں ترے پیار کے نغمے جاگے

تو مرے جسم کے معبد میں چڑھی جب پروان

میری رگ رگ میں نئے جذبوں کے چشمے جاگے

تیرے الفاظ میں پھر میرا تخیل چمکا

تیری باتوں میں مری اپنی صدا بھی چہکی

میری جاں! وقت کی ترتیب میں وہ پل آیا

جب کہ خود مجھ میں تری ذات کی خوشبو مہکی

میں جو اک نقطے کی صورت ہی تھی، تصویر ہوئی

تیری پیشانی پہ قسمت مری تحریر ہوئی

تیری آنکھوں میں مرے خواب ہوئے پھر زندہ

تیری ہستی میں مری ذات کی تعمیر ہوئی

پہلی 'غوں غاں' ہی تری دے گئی عظمت مجھ کو'

تیرے ہی دم سے ملی مادری رفعت مجھ کو'

میں نے جب تھک کے کبھی رستے میں رکنا چاہا

تیری جرات سے ملی چلنے کی ہمت مجھ کو

تو میری ذات کی تجدید، تسلسل میرا
تیری نسبت سے ہے ہر خواب مکمل میرا
تجھ سے تخلیق کی تشبیہہ بنی ذات مری
تیرے اک لمس سے ہر رستہ ہے مخمل میرا

تجھ پہ قربان مری زیست کی ساری چاہت
تجھ پہ نازاں مرے جذبات کی ساری شدت
تیرے ہاتھوں میں شفا ہو، ترے ہونٹوں پہ ہنسی
میری ہمدم، مری بیٹی ہے خدا کی رحمت

(صدف مرزا)

••

ابا جی کو میں اکثر وہ اشعار سنایا کرتی جو عید کارڈز پر لکھے ہوئے آتے۔ ایک مرتبہ ایک شادی کارڈ بھیجا گیا جس پر معروف گیت کا مکھڑا درج تھا...

زندگی اپنی گزر جائے گی آرام کے ساتھ
اب ترا نام بھی آئے گا میرے نام کے ساتھ

ابا جی نے اس شعر پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ ''بہت برمحل شعر ہے۔'' میں نے کہا۔

یہ سستی جذباتیت عورت کی شاعری کا مرکز نہیں۔ امہات المومنین رضی اللہ عنہن نے آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام ساتھ نہیں لگایا، ولدیت اسی باپ کی رہی جس کا خون رگوں میں دوڑتا ہے۔ نام تو بدلنے اور مٹنے کے لیے ہوتے ہیں۔ عورت کا اپنا نام اس کا اپنا حوالہ ہونا چاہیے۔

سکول کالج کے زمانے میں، درختوں پر نام لکھنے کی رومانویت اور ہاتھوں پر مہندی سے نام سجانے کی روایت کے حسن میں گرفتار ذہن کو یہ تبصرہ زیادہ پسند نہیں آیا۔ میں نے حسبِ عادت جوابی تبصرہ کیا ابا جی، شعر تو انسانی نفسیات اور معاشرے کی رسومات کا آئینہ دار ہوتا ہے نا، شناخت بھی ہے اور زندگی بدلتی ہے تو شناخت بھی بدلتی ہے... اعتراض کیوں؟؟

تو کیا عورت کی اپنی شناخت کوئی نہیں؟ جوابی سوال آیا۔

میں نے ڈینش دستاویزات میں جب اپنا نام بدلا اور مجھے "مرزا" کے نام سے پکارا

جانے لگا تو میں نے اس دن یہ بات سمجھی کہ میرا اپنا نام میرا اپنا حوالہ ہے اور میری شناخت میرے لہو میں دوڑتا میرے باپ کا نام ہے۔ قبر کے کتبے تو مسمار ہونے کے لیے ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔

''میرا نام ہے اب اُسامہ کی امی۔ اب یہی میرا آخری حوالہ ہے۔''

ایک دن عالیہ کالج سے واپس آئی تو بتانے لگی:

''امی جی میں ادارہ منہاج القرآن گئی واپسی پر۔ نفیس باجی نے تعارف کروایا یہ صدف مرزا کی بیٹی ہے۔ ساری خواتین مجھے دیکھنے اور ملنے آئیں۔ مجھے بہت ہنسی آئی۔''

''آپ کو دیکھنے... پھر آپ پر ٹکٹ تو لگائی جا سکتی تھی نا صدف مرزا کی بیٹی۔''

''میرا نام ہے صدف مرزا کی بیٹی۔'' وہ نظم پڑھنے کے انداز میں بولی۔

''نہیں بیٹا'' میں نے فورا کہا۔ ''آپ کا ایک اپنا نام ہے۔ آپ مجھ سے الگ ایک عورت ہیں جو لب و رخسار، زلف و لب و عارض کے فسانوں میں نہیں ملے گی۔ آپ مجھ سے زیادہ امکانات بھری زندگی کی شاہراہ پر چلنے والی وہ انسان ہیں جسے یہ جاننا ہوگا کہ یہ مواقع مادیت پرستی کی چکاچوند والی شاہراہوں پر رکنے کی نہیں بلکہ نئے راستے بنانے کی دھن میں گرد اڑاتی پگڈنڈیوں پر چلنا ہوگا۔''

میں نے ابا جی کو ڈینش شاعرات کے مضامین اور افکار کے بارے میں بتایا۔ 1970 کی دہائی میں ڈینش شاعرات نے خود کو محض چہرہ، بدن اور حسن کا استعارہ ماننے سے انکار کر دیا: ''بکواس بند کرو اور حسن کی آرائش کرو''۔

ابا جی نے بے حد اشتیاق سے ارتقاء کی یہ داستان سنی۔ ''اس پر اردو میں لکھو'' انھوں نے کہا، ''عورت کو محض چند برس کے شباب کا تعاقب کرنے کے لیے نہیں پیدا کیا گیا۔ اس کی دانش اور حکمت کو جلا دینے کی ضرورت ہے اور اسے اقتصادی طور پر خود انحصاری اور خود مختاری سکھانے کی۔''

میری غزل ''زلف و لب و عارض کے فسانوں میں نہیں ہوں'' انھیں بے حد پسند تھی اور ان کے ان افکار کی عکاس تھی۔

یہ الگ بات ہے کہ یورپ میں رہ کر بھی میرے بزرگوں کے نام کا حوالہ میرے ہمراہ رہا۔ اقبال کے حوالے سے سیمیناروں میں شرکت شروع کی تو برطانیہ میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ میں سٹیج پر محترم یعقوب مرزا کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ایک دم میری طرف رخ کر کے ناراضگی سے بولے

''اے کڑیے، توں اپنیاں گلاں کرنی ایں تے دسیا کیوں نہیں محمد شریف مرزا تمھارے چچا تھے۔''
میں اس ناگہانی کو تیار نہیں تھی۔ بصد ادب عرض کیا ''مجھے علم نہیں کہ لندن قدم رکھتے ہی میں نے ہر راہگیر کو بتانا ہے کہ میں تشریف لے آئی ہوں اور محمد شریف مرزا میرے چچا تھے۔'' مجھے چچا جان کے دوست بتاتے کہ وہ فارسی، عربی اور اردو کے بڑے عالم تھے اور اقبالیات پر ایک مستند حوالہ بھی۔ یہاں کے تدریسی نظام سے منسلک ہونے کی وجہ سے تحقیق اور تحریر ان کا محبوب مشغلہ تھی۔ مجھے اکثر نام کے ساتھ اپنے حوالوں کا موضوع بہت کچھ تحریر کرنے پر مجبور کرتا رہا۔

••

تیرے ہونٹوں کے تبسم میں جوانی میری

اولاد کی نعمت شاید دنیا کا سب سے بڑا انعام ہے۔ کبھی بچپن میں کہانیوں میں ذکر ہوتا کہ بادشاہ کے پاس دنیا جہان کی ہر دولت موجود تھی لیکن وہ اولاد سے محروم تھا۔ اسی غم سے وہ ہر وقت نڈھال رہتا۔

پھر ان ہی کہانیوں میں کئی بادشاہ اولادِ نرینہ کے لیے ننگے پاؤں درگاہوں کا سفر کیا کرتے۔ دن میں ایک پرچھائیں سے ڈرنے والی عورتیں راتوں کی مہیب تاریکی اور سناٹے میں قبروں پراشان کرتیں۔ مندروں میں خوفناک اور شرمناک رسومات ادا کرنے میں اپنی نسائیت اور حیا کو داؤ پر لگا دیتیں۔

برطانیہ جیسے ملک میں جب ایک جعلی پیر کو گرفتار کیا گیا تو اس کے آستانے سے اولاد کی طالب اور جعلی پیر کی ''خدمت'' میں ہمہ تن مصروف عورتیں بھی برآمد ہوئیں۔ ان ہی دنوں ایک حقیقی واقعہ لطیفے کی صورت سنایا جاتا۔ میرپور کے آگے کسی دور افتادہ گاؤں کی ایک خاتون جو تین دہائیوں سے برطانیہ میں مقیم تھیں، اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے شوہر کی بھتیجی سے بیاہ کر لے آئیں۔ چند سال گزر گئے لیکن کسی خوشخبری کی آہٹ سنائی نہ دی۔ شاید ان دنوں عورتوں کا محبوب مشغلہ اپنی بہوؤں اور بھابیوں کے طہر کے ایام گنتے رہنا تھا۔ گلی محلے اور خاندان والوں نے سوالات اور تفتیش کا آغاز کر دیا۔ سترہ برس کی معصوم بچی کو تعویذ پلائے جاتے، جڑی بوٹیاں کھلائی جاتیں، الٹے سیدھے غسل دیے جاتے۔ ان دنوں مومنین کی تالیفِ قلب کے لیے ایک پیرِ کامل پاکستان سے تشریف لے آئے۔ ابھی یورپی حکومت اور سیاست عہدِ حاضر کی طرح سخت گیر نہیں ہوئی تھی۔ پیر صاحب کو باقاعدہ ایک درگاہ کھولنے کی سہولت تھی۔ بے شمار مساجد، اسلامک سنٹرز اور طرح طرح کے مدرسے

مسلمانوں کی مذہبی آزادی کی علامت ہیں۔

بزرگ خاتون بھی بہو کے ایام گنتے گنتے پانچ سال گزار چکی تھیں۔ برطانوی قوانین مانع نہ ہوتے تو وہ اس بانجھ عورت کو اپنے بیٹے کی مسند اور زوجیت کے منصب سے ہٹا کر نئی بہو لا چکی ہوتیں۔ پیر صاحب کی شہرت کے ڈنکے بج رہے تھے۔ وہ اسے ہر جمعرات کو حاضری کے لیے چھوڑ آتیں۔ جمعرات کی رات خصوصی دعائیں ہوتیں۔ جمعے کو دم درود اور جھاڑ پھونک کے بعد بہو گھر آجاتیں۔ پیر صاحب بہت پہنچے ہوئے تھے۔ ابھی چار جمعراتیں بھی نہ گزریں کہ بہو بارآور ہوگئیں۔ ان کو پھر بھی حاضری کے لیے بلایا جاتا تاکہ حفظِ حمل کے وظائف پھونکے جاسکیں۔

پیر صاحب پر نذرانوں کی برسات میں اضافہ ہوگیا۔ ان کو فرشی سلام کرتی مستقبل کی نانیاں دادیاں ہاتھوں کے گہنے تک اتار دیتیں۔ خاندان کے وارث پیدا ہونے کی نوید ملتی اور جنت میں طلائی محلات کی بنیاد رکھ دی جاتی۔

بہو ایک بچی کی ماں بن گئی۔ دادی کی امیدوں پر اوس پڑگئی۔ کئی دن تو بہو سے بات ہی نہ کی۔ حلوے مانڈے کھلانے بند کر دیے۔ مسلسل طعنے دیتی رہی کہ سَت سال بعد جمی، وہ کڑی (سات سال بعد بچہ پیدا کیا وہ بھی لڑکی)

ایک دن ماں بننے اور بچی سنبھالنے کے امتحان سے گزرتی اور طعنے سہتی بچی نے جوابی حملہ کر ہی دیا۔ ''شکر کرو چاچی، پیر جی نے یہ بچی بھی دے دی، تمھارے بیٹے پر ہوتا تو چڑی کا بچہ بھی نہ پیدا ہوتا۔''

••

اللہ تعالی کا مجھ پر خصوصی احسان تھا کہ اس نے مجھے فوراً صحت مند اولاد سے نوازا۔ آسانی سے بچے پالنے کی توفیق دی۔ مجھے ابتدائی چند سال بہترین صحت اور ہمت بخشی کہ میں جوائنٹ فیملی خاندان میں دادی، پھوپھی اور چچی کے تلے اوپر بچوں کے ایک گروہ کے درمیان رہ کر، اضافی گھریلو مصروفیات کے باوجود بھی ان کی نگہداشت کرسکوں۔

اکثر لوگ جب عالیہ کی پرسکون اور سلجھی ہوئی عادات دیکھتے تو کہتے کہ لڑکی ہے ناں، اس لیے آپ نے سِدھالی ہے۔ لڑکے بہت اتھرے ہوتے ہیں۔ لڑکا ہوا تو دیکھیں گے کیسی عقل ٹھکانے آتی ہے آپ کی۔

پھر پروردگار نے مجھے اولادِ نرینہ سے نوازا۔ اگرچہ میرا ایمان ہے کہ المال والبنون زینۃ

الحیوۃ الدنیا، مال اور بیٹے دنیاوی زینت کا باعث ہیں۔ مجھ پر اللہ نے تین برس پہلے ہی رحمت نچھاور کی تھی۔ میری دعا صرف صحت مند نیک اولاد کی خاطر تھی۔ بچے بے حد سہولت اور آسانی سے پلے، بقول امی جی کے تمھیں تو اللہ نے پلاسٹک کے گڈے گڈیاں عطا کیے ہیں۔ آنکھ کے اشارے پر چلتے، ہنستے کھیلتے اور صابر بچے۔ ابا جی ان کو میری شرارتی بیٹی کے نفیس بچے کہا کرتے تھے۔

••

اُسامہ کی عادات فطری طور پر ابتدائی بچپن سے بہت منفرد تھیں۔ ایک مرتبہ میں نے دہی بڑے سموسے اور روسٹ چکن بنایا۔ مہمانوں میں سے کسی نے کہہ دیا، ''باجی آپ کوپن ہیگن میں دہی بڑے اور سموسوں کی دکان کھول لیں۔''

اس چار سال کے بچے کے کان سرخ ہو گئے، ''میری امی کو کیوں کہا کہ بازار میں سموسوں کی دکان کھولیں؟''

اس کی چچی نے لاڈ سے ساتھ لپٹایا، ''بیٹا ان کا کوئی غلط مطلب نہیں۔ وہ تو تعریف کر رہے تھے۔''

''آپ کی امی کو کوئی کہے کہ جا کر سموسوں کی دکان کھولیں۔ آپ کو کیسا لگے گا؟''

جب تک میں باورچی خانے سے نئے سموسے تل کر لاتی وہ اپنا جھگڑا پورا کر چکا تھا۔ بعد میں جب اس کا غصہ اترا تو وہ رات کو سونے سے پہلے حسبِ معمول میرے پاس آ کر لیٹا تو میں نے پیار سے سمجھایا، ''گھر آئے مہمانوں سے ایسے بات نہیں کرنی چاہیے۔ وہ کیا سوچیں گے کہ ماں نے کیسی غلط باتیں سکھائی ہیں۔''

''امی تو کیا میں نہیں سوچ سکتا کہ ان کی ماں نے بھی انھیں کوئی اچھی بات نہیں سکھائی؟ آئندہ آپ کسی کے لیے سموسے نہیں بنائیں گی۔''

میں ہمیشہ کی طرح متفکر ہو جاتی کہ اس لڑکے کا کیا علاج کروں کہ یہ فوری طور پر ایسا شدید ردِعمل نہ ظاہر کرے، لیکن وہ بات ہمیشہ پوری دلیل سے کرتا۔ اُسامہ کی عمر محض سات برس تھی جب ہم امریکہ میں قیام کے دوران سفر کر رہے تھے۔ صبح ہوٹل میں ناشتے کے لیے میں اور اُسامہ پہلے چلے گئے جب کہ عالیہ بعد میں آئی۔ کہنے لگا، ''اس کے ساتھ ہی بیٹھی رہیں، وہ دوسری ٹیبل پر ٹرک ڈرائیور ہیں۔ یہ لوگ اچھے نہیں ہوتے۔''

میں نے حیرت سے پوچھا، ''آپ کو کیسے معلوم ہے وہ ٹرک ڈرائیور ہیں اور یہ کہ وہ اچھے

نہیں ہوتے؟''

''کل رات ان لوگوں نے ہماری گاڑی کے ساتھ اپنا ٹرک روکا تھا۔ اور میں نے فلم میں دیکھا ہے کہ یہ لوگ بہت لڑتے ہیں۔''

اس کے مزاج میں احساسِ ذمہ داری ابتدائی بچپن سے ہی بہت زیادہ تھا اور چھوٹا ہونے کے باوجود اسے بہن کے تحفظ کی شدید فکر رہتی۔ اس کے بچپن میں جب نیویارک میں سٹیچو آف لبرٹی دیکھنے جانے کے لیے چھوٹے سے بحری بیڑے پر سوار ہونے لگے تو فوراً بہن کا ہاتھ پکڑ کر اس بات کا اطمینان کرتا کہ وہ اس بھیڑ میں بھی ساتھ ہی موجود ہے۔ مجھے اکثر اس کی یہ عادات حیران بھی کیا کرتی تھیں۔ ابا جی جب یہ باتیں سنتے تو کہتے کہ اللہ نے اسے کسی خاص لمحے میں تخلیق کیا ہے۔ ایسی شاداب روحیں دنیا میں مرد و زن کی ازَلی جنگ کو ختم کرتی ہیں۔ خواتین کو انسان سمجھ کر، اپنے برابر نہیں بلکہ خود سے بہتر سمجھ کر کیونکہ اللہ رب العزت نے عورت کو ماں بننے کے لیے چن کر مجازی خدا بنایا اور اسے اپنی صفات عطا کیں۔ عورت کی عزت، محبت اور تحفظ پہلی ترجیح ہونی چاہیے۔ مرد سے مساوات ہی نہیں بلکہ ایک درجہ اوپر اٹھ کر اس کی بہتری کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

بہت سال کے بعد جب میں نے یورپ میں یہودی حاملہ عورتوں کی دیکھ بھال ہوتے دیکھی تو میرے ذہن میں ابا جی کی باتیں گونجنے لگیں۔

دو دہائیوں کے بعد جب اُسامہ نے عالیہ کی شادی کے تمام انتظامات اور معاملات اپنے ہاتھ میں لیے تو مجھے ابا جی اپنے بالکل آس پاس چلتے پھرتے محسوس ہوئے۔ آج بھی جب وہ سارے کام چھوڑ کر اپنی بھانجی آئمہ صوفیہ کے ناز اٹھاتا ہے، اسے کنڈر گارٹن سے لینے جانا، اس کے لیے کھانے بنانا بلکہ محاورۃً ہی نہیں حقیقۃً اس کے اشاروں پر ناچنا مجھے مضحکہ خیز بھی لگتا ہے اور ایک طمانیت کا احساس بھی دیتا ہے۔ بھانجی صاحبہ بھی عجیب وغریب طریقے سے محبت کا اظہار کرتی ہیں۔ ابھی مشکل سے دو برس کی تھی اور بڑے کمرے میں بیٹھی کھیل رہی تھی کہ اُسامہ نے کہیں فون کرنا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا جس پر آئمہ صوفیہ صاحبہ نے شدید ناگواری کا اظہار کیا، ''نانو، ماموں دازا باند۔'' (نانو، ماموں دروازہ بند) جب تک اس نے دروازہ نہیں کھولا، بھانجی کا احتجاج بآوازِ بلند جاری رہا۔

کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کاش ابا جی یہ سب نعمتیں اور برکتیں دیکھنے کے لیے ہمارے ساتھ ہوتے کہ ان کی دعائیں حرف بحرف سنی گئی ہیں اور ان کے الفاظ سب کے سب معتبر ٹھہرے ہیں۔

••

اپنی چچا زاد بہن عائشہ سے اسے شروع بچپن سے بے حد پیار تھا۔ وہ دو سال کا تھا جب کسی بچے نے کھیل کے دوران عائشہ سے کہا کہ تم بے وقوف ہو۔ وہ بھاگتی ہوئی اندر آئی اور حسبِ عادت بڑی بڑی آنکھیں مزید پھیلا کر سنسنی خیز انداز میں شکایت کی۔ اُسامہ ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ فوراً اٹھ کر فرش پر جھاڑو دینے والا لمبا برش اٹھایا اور باہر چل پڑا ''میں اسے بتاتا ہوں آتا تون ہے'' (میں بتاتا ہوں عائشہ کون ہے) میرا ان دنوں آپریشن ہوا تھا۔ میں نے شور مچا دیا کہ اس سلطان راہی کو پکڑو۔ اس کی چچی نے فوراً جا کر پیچھے سے جکڑ لیا اور بہلا پھسلا کر جھاڑو ہاتھ سے واپس لیا۔

اٹھارہ برس کی عمر میں موسمِ گرما کی چھٹیوں میں ایک ڈینش ٹیلی فون کمپنی میں جز وقتی ملازمت کی تو پہلی تنخواہ ملتے ہی کہنے لگا، ''امی مجھے دو سونے کی انگوٹھیاں لا کر دیں۔''

میں نے کہا، ''دو؟ کیا کرنی ہیں دو؟ دو لڑکیوں کو بیک وقت دو گے؟''

''ہاں، میری دونوں بہنوں، عالیہ اور عائشہ کے لیے دو انگوٹھیاں پسند کر کے لے آئیں۔''

میں نے پاکستان آ کر اباجی کو بتایا تو بہت خوش ہوئے۔ بار بار کہیں ''الحمد اللہ، دلوں میں دیواریں اٹھانے یا نفرت کے بیج بونا بہت آسان ہیں لیکن ان کے دلوں کو شفاف رکھنے کے لیے ماں قربانی دیتی ہے۔ بچوں کو بغیر ضرورت کے کہانیاں سناتے رہنے سے ان کے ذہن اور دل میں نفرت اور غصہ بڑھتا ہے جو شاید ان کو اچھی اولاد تو بنا دے جو ماں یا باپ کے کندھے سے کندھا جوڑ کر دوسروں کو برا بھلا کہیں، لیکن یہ رویہ ان کو ایک ایسا اچھا انسان نہیں بنا سکتا جو دل میں کینہ یا بغض نہ رکھے اور احترامِ آدمیت کا قائل ہو۔''

••

ڈنمارک میں بچوں کے سکول جانے کی عمر چھ برس ہے لیکن والدین کو بہت سے قوانین میں ترامیم کی اجازت بھی ہے۔ مثلاً میں نے اپنے بچوں کو پانچ برس کی عمر میں سکول بھیجنے کی اجازت حاصل کر ہی لی۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ بچے کا جماعت میں سب سے چھوٹا ہونے کے سبب ان پر نظر زیادہ ہوتی اور والدین کو میٹنگز پر مسلسل بلایا جاتا اور ہر پہلو پر توجہ دی جاتی کہ بچے کی سماجی صلاحیتیں کیسی ہیں اور وہ سکول آنے جانے کے اوقات کی پابندی کر سکتا ہے یا نہیں۔ دوسرے بچوں کے ساتھ رابطہ اور سکول سے واپسی کی ذمہ داری کیسے پوری کر سکتا ہے۔ سکول کی عمارت ایک محافظ فصیل کی طرح کھڑی ہوتی تھی۔ صبح کے وقت جیسے پورا شہر سکول کی جانب رواں دواں ہوتا ہے۔

یہاں پر سائیکل چلانے کا رواج ہے۔ جگہ جگہ بورڈ لگے ہوتے ہیں'' ڈیوڈ نے ابھی سکول شروع کیا ہے۔ وہ ٹریفک میں نیا ہے۔ اس کا خیال کیجیے۔''

بچے پیدل، سائیکلوں پر اور ماں یا باپ کے ساتھ سکول کو رواں دواں ہوتے ہیں۔ گاڑیاں سکول کے چوراہے پر احتیاط سے موڑ کاٹتی ہیں اور بہت کم رفتار کر کے گزرتی ہیں۔ بچے کو سکول کی عمارت میں داخل ہوتا دیکھ کر اطمینان کا ایک احساس دل و دماغ میں جاگ اٹھتا ہے کہ بس اب وہ ایک حصار میں داخل ہو گئے، اب آرام سے گھر جا کر کام کریں یا آگے ملازمتوں پر چل دیں، اب بچے ادارے کی ذمہ داری ہیں، ہم واپسی پر بچے کو لیتے ہوئے گھر آ جائیں گے۔

میں اپنے سکول جاتے بچے کی ایک یاد کے ساتھ دن گزارتی رہی۔ اگست کا مہینہ تھا اور اس کی عمر مشکل سے سوا پانچ برس تھی۔ اس دن میں اسے سکول کی عمارت تک لینے نہیں جا سکی۔ میرے لیے بوجوہ وہاں تک پیدل جانا ممکن نہ تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ وہ سکول سے نکلا کرے گا اور میں گھر کی عقبی گلی سے اسے دیکھ لوں گی۔ ایک دو ہفتے کی بات ہے، پھر مسئلہ حل ہو جائے گا۔ دو دن تو ہمارے صاحبزادے دور سے قطبی تارے کی طرح نظر آتے اور کمر پر بستہ پہنے، ننھے ننھے ہاتھ ہلاتے، کودتے، پھاندتے، خاموش بنگلوں کے درمیان بنی کشادہ سڑک پر دوڑتے چلے آتے۔

تیسرے دن میں حسبِ معمول گھر سے نکل کر عقبی گلی میں کھڑی ہوئی۔ 11:40 پر چھٹی ہوتی تھی۔ ٹھیک 11:50 پر اس کا ننھا وجود گلی کے کونے پر نمودار ہو جاتا لیکن اس دن 11:50 ہوئے، چند بچے ننھی سائیکلوں پر دور سے آتے دکھائی دیے۔ پھر دو تین بچے اپنی ماؤں کے ساتھ نظر آئے۔ 11:55 ہو گئے... 12 بج گئے... میری نظر کلائی کی گھڑی پر تھی... 12:05۔ اس محلے میں رہنے والے سب بچے گزر چکے تھے۔ بے چینی اور گھبراہٹ سے میرا برا حال تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اندر جاؤں اور سکول کو فون کروں یا یہیں کھڑے مزید انتظار کروں۔ دنیا جہاں کے ممکنہ خدشات، اوہام و وساوس میرے ذہن میں جھماکے کرنے لگے۔ مجھے جتنی سورتیں اور اوراد و وظائف یاد تھے، میں نے پڑھ دیے۔ 12:10 منٹ پر دور سے ایک نقطہ نمودار ہوا۔ ذرا قریب آنے پر میں نے اسے دیکھا۔ دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے کیے سست قدموں سے میری جانب آ رہا تھا۔ میری جان میں جان آئی اور وہیں کھڑے اسے دیکھتی رہی۔ نیکر سے جھانکتی ننھی ننھی پتلی ٹانگیں، سفید جرابیں اور کالے جوتے، چھوٹے چھوٹے قدموں سے وہ میرے قریب آیا۔

''امی، یہ دیکھیں میں آپ کے لیے کیا لایا ہوں۔'' اس کی چمکیلی آنکھوں میں جیسے ستارے بھرے تھے۔ اس نے پشت پر چھپائے دونوں ہاتھ آگے کیے۔ اس کے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے سفید اور پیلے پھولوں کا گلدستہ تھا۔

''امی راستے میں بہت سے پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ میں آپ کے لیے پھول چن رہا تھا۔ آپ اپنے بالوں میں لگائیں گی ناں۔''

''امی امی، آپ رو کیوں رہی ہیں؟'' اس نے میری مجنونانہ گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ وہیں کھڑے کھڑے میں نے اس ہاتھوں پر، چہرے پر پیار کیا۔

''آپ کس سے پوچھ کر راستے میں رکے تھے۔ آپ کو نہیں پتہ تھا کہ امی وہاں چل کر نہیں آسکتیں اور بہت پریشان ہوں گی۔''

''سوری امی'' وہ واقعی پریشان ہوگیا۔ ''آئندہ نہیں کروں گا۔ آپ کو پھول اچھے لگتے ہیں ناں؟ تو میں وہاں بیٹھ کر توڑنے لگا۔ آپ کے سر میں لگانے کے لیے، سوری پیاری امی.. آئندہ نہیں کروں گا۔''

آج بھی مجھے اپنی زندگی کے وہ بیس منٹ اور ان کا تصور ہراساں کر دیتا ہے اور یہ واقعہ ہمیشہ ہماری زندگی میں شامل رہا۔ بچوں نے بھی سیکھا کہ تاخیر کرنا اور رابطہ نہ رکھنا ماں کے لیے کیسی ناقابلِ برداشت اذیت ہے۔ لیکن آج پاکستان میں بے قرار مامتا کو گلیوں سڑکوں میں پاگلوں کی طرح بھاگتے دیکھا، باپوں کے کاندھے پر لہولہان مستقبل کے خواب، معصوم بچوں کے جنازے، میرے خدایا! اور تو خاموشی سے سب دیکھتا رہتا ہے؟ بیس منٹ کی ناقابلِ بیان اذیت مجھے پوچھتی ہے کہ عمر بھر غم کے تازیانے کھانے کے لیے ان ماؤں کے پاس حوصلہ کہاں سے آئے گا۔ اگرچہ میں ٹیلی ویژن پر یہ بھیانک مناظر نہیں دیکھتی لیکن انٹرنیٹ پر چیختی دھاڑتی خبریں تعاقب کرتی آ ہی جاتی ہیں۔ سی این این کی رپورٹ کے مطابق آرمی پبلک سکول اور جونیئر کالج پشاور میں اچانک ''مجاہدوں'' کے نعرے گونجے ''اللہ اکبر... اللہ اکبر'' اور وہ اس مالک اور خالق کے نام پر معصوم زندگیوں کے چراغ بجھانے لگے۔ اللہ اکبر... اللہ سب سے بڑا ہے... اللہ سب سے بڑا ہے... پھر کسی پاکستانی طالبان کی آواز رہنمائی کرتی ہے۔ میزوں کے نیچے بہت سے بچے چھپے ہیں۔ انھیں بھی مار ڈالو....'' ''اللہ اکبر، اللہ اکبر''۔ وحشی صدائیں اعلائے کلمۂ حق کرتی ہیں اور پھر خوفناک دھماکے قیامتِ صغریٰ برپا کر دیتے ہیں۔ قوم کا مستقبل خاک وخون میں غلطاں تڑپنے لگتا ہے۔

سوچیے، ہدف آرمی پبلک سکول پشاور ہے۔ بنی اسرائیل کی قوم کے بیٹوں کو قتل کرنے کی دہائی مقدس صحیفوں اور معطر جزدانوں کے سینے چیر کر نکلتی ہے۔ یہ ہدف بہت سوچ سمجھ کر منتخب کیا گیا ہے۔ اس کشتِ ہفت رنگ میں قوم نے اپنے خواب بور کھے تھے۔ 149 تابناک ابواب، ان میں سے نجانے کتنے مسیحا و مصلح پیدا ہوتے، کتنے ملک وقوم کی بجھتی نگاہوں میں نئی بصارت کا نور بن کر نئے مناظر ترتیب دیتے، لوریاں دینے والی اور دعائیں نچھاور کرنے والی مائیں، اب عمر بھر نیند اور سکون کو ترسیں گی۔ قوم صفِ ماتم لپیٹ دے گی۔ دیواروں پر گولیوں کے سوراخ بھر دیے جائیں گے۔ سکول کے فرش پر سے خون کے دھبے ڈھل جائیں گے۔ فضاؤں سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور دھماکوں کا شور لہروں کی صورت معدوم ہوجائے گا۔ قبرستان میں شہیدوں کی چھوٹی چھوٹی قبروں کی مٹی خشک ہوجائے گی کیونکہ ان کو تر رکھنے والی ماؤں کی آنکھیں بے نور ہوچکی ہوں گی۔ جنونیوں کی نئی فصل تیار ہوجائے گی اور حکمران اور سیاسی طاقتیں دھرنے دیں گی۔ یہ سیاسی منظرنامہ سالہا سال سے ایسے ہی چلا آرہا ہے۔ اس پر سمجھوتے اور صبر وشکر وستم کی اس سیاہ رات کی طوالت میں اضافہ کرے گا۔

نظری اختلافات رکھنے والوں کا یہ فرض ہے کہ وہ سارا داخلی انتشار بھلا کر ملک وقوم کے تحفظ کو اوّلیت دیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کو رونے والو، ڈھاکہ کا امن وامان خاموش پیغام دیتا ہے کہ وہاں ماؤں کے آنچلوں میں کوئی انگارے نہیں باندھتا، وہاں مکتب مقتل نہیں بنتے۔ نوحے اور مرثیے لکھنے کے بجائے اور اپنی ذمہ داریاں دوسروں پر الزامات بنا کر تھوپنے کے بجائے فصیلیں مضبوط کرنے کا وقت ہے۔ قلعے کے دروازے اندر سے کھولنے والے غداروں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے ورنہ موت کے کنوئیں پر خونی دائرے کی صورت میں اسلحہ اپنی نمائش کرتا رہے گا۔ ماؤں کی گود قبرستان بنتی رہے گی۔

••

ابا جی کو اُسامہ کی حاضر جوابی اور حسِ ظرافت بے حد پسند تھی۔ وہ ہمیشہ کہتے کہ ''اس سے دلیل کے ساتھ بات کیا کرو۔ عام طور پر مائیں دور رس نظریا سوچ کے بغیر اولاد کی تربیت کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ بچہ عام بچوں سے زیادہ ذہین اور اپنی رائے کا مالک ہے۔ اسے اپنے دماغ سے سوچنے کی آزادی دو۔ مالی بنو، مالک نہ بنو۔''

پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب اُسامہ نے ڈینٹسٹ کی تعلیم شروع کی لیکن چار مہینے کے بعد ہی میرے پاس آیا۔ اس کی ابھی تک یہی عادت ہے کہ بچے کی طرح بستر پر دراز ہوجاتا ہے۔

لاکھ ہٹاؤ کہ کرسی پر بیٹھ کر آرام سے بات کرو، جوابی دلیل دیتا ہے کہ ''میں کلاس روم میں بیٹھا ہوں کیا، آپ نانا ابو کے بستر پر ایسے ہی نہیں چڑھ کر بیٹھتی تھیں؟'' خیمے کے اونٹ کی طرح دونوں بہن بھائی مجھے بے دخل کر دیتے ہیں۔ لیکن اس دن وہ میرے پاس صوفے پر آ کر بیٹھا، پھر بڑے آرام سے ایک ہاتھ میرے شانے پر رکھا، دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میرا ماتھا ٹھنک گیا لیکن میں خاموش رہی۔

''امی جی۔ ایک بات کہنا ہے۔ ناراض تو نہیں ہوں گی؟''

''اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں'' میں نے وعدے سے گریز کیا۔

''امی، مجھے ڈینٹسٹ بننا پسند نہیں۔''

''کیا؟''؟ مجھے دھچکا لگنا ایک فطری بات تھی، ''آپ کو اتنی کم عمری میں داخلہ مل گیا۔ اور گھر کے قریب یونیورسٹی میں۔ اور کیا چاہیے؟''

''امی مجھے نہیں پسند۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں ایک ڈینٹسٹ بننا چاہتا ہوں۔ لوگوں کے منہ میں ہاتھ ڈالتے رہو۔''

میرا دل چاہا کہ ایک چپت لگاؤں کھینچ کر۔ لبوں پر آتے آتے رہ گیا، ''کہاں ہاتھ ڈالنا چاہتے ہو صاحبزادے؟ جیبوں پر؟'' لیکن میں نے صرف، ''اچھا'' ہی کہنے پر اکتفا کیا۔ ظاہر ہے خاموشی اختیار کرنے کے علاوہ چارہ ہی نہ تھا۔ لیکن اولاد کو ایک بنے بنائے راستے سے بغیر کسی وجہ کے ہٹتے دیکھنا اور پھر خوش دلی سے قبول کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

''میرا ہاتھ چھوڑ دو'' میں نے سنجیدگی سے کہا، ''ہاتھ کیوں پکڑ رکھا ہے؟''

''امی جی!'' وہ مزید لپٹتے ہوئے بولا، ''یہ پری کاشن ہے، حفظِ ماتقدم کے طور پر۔ قسمے امی، بہت زور ہے آپ کے ہاتھ میں، چوٹ لگتی ہے اچھی بھلی۔''

مجھے لگا جیسے ابا جی یہیں کہیں کھڑے یاد دلا رہے ہوں کہ آپ اولاد کے مالی بنیں، مالک نہ بن بیٹھیں۔ اب اس کا نہیں جی چاہتا کہ وہ اس میدان میں جائے تو کیا ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر، ڈینٹسٹ اور اس طرح کے روایتی شعبوں سے انحراف کر کے اس نے آئی ٹی انجینئرنگ کا انتخاب کر لیا۔

••

اُسامہ کے مزاج میں ابا جی کی طرح ہی مختلف زبانیں سیکھنے کا شوق شاید ورثے میں ملا تھا۔ اس نے آٹھویں جماعت میں جرمن زبان میں شاندار نمبر لیے، نویں جماعت کے بعد دسویں کو

ایک زقند میں عبور کر کے کالج پہنچا تو گھر کے بالکل قریب کالج چھوڑ کر کوپن ہیگن کے دوسرے سرے پر کالج کا انتخاب کیا کیونکہ اس میں چینی زبان پڑھانے کا آغاز ہوا تھا۔ لاکھ میں نے سمجھایا کہ فرانسیسی یا اطالوی زبان پڑھ لو، کالج گھر سے پانچ منٹ پیدل کے راستے پر ہے، لیکن اس کے سر میں یہی دھن سمائی تھی کہ چینی زبان ہی پڑھنی ہے۔ تین برس یہ زبان پڑھنے کے بعد شاندار نمبر لیے اور کالج کے ساتھ چین کے ٹرپ پر گیا۔ اس وقت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آنے والے دنوں میں چین ایک عالمی طاقت بن کر ابھرے گا۔

چینی زبان سیکھنے کے بعد اپنے عرب دوستوں کی صحبت کی وجہ سے اسے عربی زبان سے عشق ہو گیا۔ میں نے ایک روایتی ماں کے خدشات کے تحت بہت سمجھایا کہ پہلے یونیورسٹی مکمل کر لو پھر عربی بھی پڑھ لینا لیکن صاحبزادے نے فرمایا کہ میری تعلیم میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سال کے اندر اس نے عربی بولنی اور لکھنی شروع کر دی۔ قرآنِ مجید تو خیر وہ ساڑھے چھ برس کی عمر میں پڑھ چکا تھا۔ اس کے عرب دوست اس کی رواں قرات پر حیرت زدہ ہوتے تھے کہ اس طرح تو ہم بھی نہیں پڑھ سکتے۔ یونیورسٹی کے دوران ہی اس نے عربی زبان کا امتحان پاس کر لیا۔ پرانے عرب قصائد، تاریخ، فقہ، تفسیر اور عربی گرامر وہ اپنے شوق سے شام کو بیٹھ کر پڑھا کرتا۔ پھر اس نے عربی اوزان اور افعال سیکھ کر میرے عروض کا امتحان لینا شروع کر دیا۔ پھر مصر کے کتابوں کے میلے میں جاتا رہا اور وہاں سے نادر عربی کتب لے کر آیا۔ میں نے بھی ابا جی کی بات سے دل کو حوصلہ دیے رکھا کہ اولاد کے مالی بنو، مالک بن کر اپنی مرضی سے اسے مت ہنکاؤ۔

••

میری عادت تھی کہ بچوں کو مشرقی اقدار سکھانے کے لیے بول چال اور اندازِ نشست و برخاست پر لیکچر دیتی رہتی۔ پھر ایک دن لاہور میں کسی تقریب میں شریک ہوئے تو ہمارے صاحبزادے جو بارہ برس کے تھے، چپ کر کے مغربی طرز کی پارٹی کو دیکھتے رہے۔ مجھے اس شریر کی دبی دبی مسکراہٹ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے پیٹ میں ہنسی کے گولے چھوٹ رہے ہیں لیکن ضبط کی کوشش میں ہے۔ باہر آ کر گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے اپنی کھلکھلاہٹ کو آزاد کیا۔ بچپن سے اس کے بے ساختہ ہنسنے کا انداز یہی تھا کہ انسان اسے دیکھ کر عمر بھر کے غم بھول جائے۔ حسِ ظرافت ایسی کہ آدھا جملہ سن کر باقی کا اندازہ لگانا اس کے لیے چنداں دشوار نہیں تھا۔ اس کی نور بکھیرتی ہنسی کے لیے میں نے ایک غزل کہی تھی۔

تمھیں ہنستا خدا رکھے، کہ جینے کی امنگ ہو تم
تمھارے ساتھ اس گھر کے در و دیوار ہنستے ہیں

لیکن اس وقت مجھے اس کے ہنسنے سے کوفت ہو رہی تھی۔ ''ہوا کیا ہے؟ کچھ پھوٹو گے بھی؟'' میں نے عمداً پیشانی شکن آلود کرلی۔

''مجھے آپ پر رحم آرہا تھا امی۔ جب سے پیدا ہوئے ہیں آپ نے اردو بولنا، اردو پڑھنا اور اردو لکھنا ہماری سزا میں شامل رکھا۔ تہذیب!!! پاکستان میں یوں ہوتا ہے، وہاں بچے یوں نہیں کرتے، وہاں بزرگوں کا احترام، وہاں ہر چیز سے مشرقی اقدار ٹپکتی ہیں۔ جب یہ سب سالگرہ پر انگریزی انداز میں گانے گا رہے تھے اور انگریزی بول رہے تھے اور آپ سے گفتگو بھی انگریزی میں ہو رہی تھی تو آپ آنٹی ہوگئیں تھیں ایک دم، کھی کھی کھی۔۔۔آنٹی'' اس نے پھر کچھ تصور کر کے ہنسنا شروع کر دیا۔

''مجھے تو وہ ساری شامیں یاد آرہی تھیں جو ہمارا ٹی وی بند کر کے آپ اردو کتاب سامنے رکھ دیتی تھیں، پاکستانی ترانے سنواتی تھیں، ہاہاہاہا، دل دل پاکستان۔۔اے وطن پیارے وطن۔''

''ہم کسی کے حاکم تو نہیں جو لوگوں پر اختیار رکھیں کہ یہ کہو، وہ نہ کہو، یوں کرو، یوں نہ کرو'' میں نے کچھ نالاں ہو کر کہا۔

''یار امی!'' اس نے شریر آنکھوں کے گوشوں سے مجھے دیکھا، ''آپ مان کیوں نہیں لیتیں کہ آپ جو نقشہ کھینچ کر ہمیں طعنے دیتی تھیں وہ غلط تھا۔ پاکستان تو کلچر کا ملغوبہ ہے۔''

''اچھا'' اب میں نے برہم ہونے کا ہتھکنڈہ آزمایا، ''تو اچھی اردو سیکھنے سے آپ کو نقصان کیا پہنچا؟ ٹوپی میں لگے پروں میں ایک اضافہ ہی ہوا ناں؟ ناشکر گزاری ہمارا قومی المیہ ہے اور گلہ گزاری ملی نشان۔''

اسے پھر ہنسی آگئی، ''امی آپ کوئی کانفرنس نہیں کر رہیں۔ جذباتیت کا شکار نہ ہوں۔ مان لیں کہ آپ نے ہم پر بہت ظلم کیے ہیں۔ سب لوگ شام کو کارٹون دیکھتے تھے۔ آپ ایک گھنٹے کے بعد ٹی وی کی تار نکال کر کمرے میں لے جاتی تھیں۔'' اس نے گڑے مردے اکھیڑے۔

''بات یہ ہے پتر جی! وہ مظالم تو یاد ہیں آپ کو، لیکن یہ یاد نہیں کہ آپ ''ط... ظ... اور پھر ''ف'' کو اسی بحر میں ''فوئیں'' کہا کرتے تھے۔ اسی طرح ''ج کے بعد آنے والے حروفِ تہجی، چ، ح اور خ کو ''چیم، حیم اور خیم'' کہنے پر تکرار کرتے تھے۔ سچ ہے دنیا ہے ہی ناشکری، احسان

فراموش۔ وغیرہ وغیرہ۔‘‘

••

ایک دن اچانک ہی میرے موبائل کی سکرین تاریک ہوگئی۔ میں اُسامہ کے کمرے میں گئی۔ ’’اسے دیکھو ذرا، کمبخت کالے منہ والا موبائل۔‘‘ میں نے موبائل اس کے سامنے رکھا۔

’’امی جی، اب پھر آپ اس مظلوم کے ساتھ زیادتی کر لائی ہیں۔ امی جی آپ کے ہاتھوں کو لگا کیا ہے آخر؟ آپ لوگوں کو سیدھا سادا سا موبائل چاہیے۔ یہ کیا ہوا، کبھی ساری سیٹنگ بدل دیتی ہیں، ہاتھ لگ گیا تھا، کیسے ہاتھ لگ گیا تھا؟‘‘

میں نے اس کے کان مروڑنے کی کوشش کی۔ وہ اٹھ کر بھاگا۔ میری عقل، عمر اور علم کا تقاضہ یہی تھا کہ اس شریر نوجوان کے پیچھے بھاگنے سے گریز کیا جائے۔ ایک محفوظ فاصلے پر کھڑے ہو کر اس نے بیان جاری رکھا،

’’ویسے آپ کو علم ہے آپ نے کتنے کمپیوٹرز کو ٹھیکرے میں بدلا، کتنے موبائل گم کیے، کتنوں کی سکرین توڑی، کتنے چارجرز آپ نے اپنے سفر وسیلۂ ظفر میں گنوائے، کتنی گمشدہ عینکیں آج تک نہیں بازیافت ہوئیں، کتنی مرتبہ یو ایس بی کا تحفہ دیا آپ کو ہم نے، کہاں کر دیے سب؟ اور کتنے پاور بینک دلوائے۔ جب بھی بات کرو، سوائے ڈانٹنے کے کیا کرتی ہیں آپ؟‘‘

ہم نے اس کو گھور کر دیکھنے پر ہی اکتفا کیا۔ برہم نظروں کے تیر اس عمر کی اولاد پر کارگر نہیں ہوتے۔ ویسے بھی تجربہ بتاتا ہے کہ جب آپ کی انگلی پکڑ کر چلنے والا آپ کے قد سے اونچا ہو جائے تو اسے صرف مٹھاس میں پیس کر نصیحت کی گولی کھلائی جاسکتی ہے۔ ہدایت کاری اور پیشکش کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ہمارے صاحبزادے کو کیمرے والا موبائل نیا نیا ملا تو انھوں نے سب سے زیادہ تجربات ہم پر کیے۔ ایک مرتبہ میں کچھ لکھنے میں مصروف تھی، اُسامہ نے تصاویر بنانا شروع کیں۔ ان دنوں ہمیں نئی نئی عینک لگی تھی۔ میں نے جھٹ عینک اتار کر رکھ دی۔

’’امی آپ عینک لگا کر رکھیں۔ اس طرح آپ کچھ پڑھی لکھی لگتی ہیں۔‘‘ وہ سنجیدگی سے بولا۔

••

پتہ نہیں کمپیوٹرز اور الیکٹرانک مصنوعات کو ہم سے کیا خار ہے، کسی بھی چیز کو ہاتھ لگا کر اپنی عقلِ سلیم کے مطابق کام کرنے کی کوشش کریں تو نہ عقل کام آتی ہے نہ سلیم راضی رہتا ہے۔

ایسے ہی ایک دن جب میرا لیپ ٹاپ چلتے چلتے اچانک گل محمد بن گیا، ہزار گل پرزے دبائے، کان مروڑے، لیکن چل کر نہ دیا۔ مجھے اردو میں کچھ لکھنے کی فوری ضرورت پیش آ پڑی تھی۔ میں نے اپنے صاحبزادے کا لیپ ٹاپ استعمال کر لیا۔ پہلے اس پر یونیکوڈ ڈاؤن لوڈ کیا، پھر اردو میں مضمون لکھ کر بند کر دیا اور خود کو شاباش بھی دی کہ ہم نے کتنے باصلاحیت ہیں، اپنے سارے کام خود ہی کر لیتے ہیں، کسی کی محتاجی نہیں ہے۔

لیکن ہماری ساری خوش فہمی اس وقت خجالت میں بدل گئی جب رات کو اس نے اپنا لیپ ٹاپ کھول کر اسے پاس ورڈ دینے کی کوشش کی، لیکن کمبخت مشین ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''امی، آپ نے میرے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ بدلا ہے؟ اس نے تنگ آ کر مجھے پوچھا۔

''نہیں، ہم نے دیانت دارانہ سچ بولا، ''ہمیں بدلنا ہی نہیں آتا ورنہ بدل دیتے۔''

''تو یہ لیپ ٹاپ پاس ورڈ قبول کیوں نہیں کر رہا؟'' وہ بے چارہ پروجیکٹ بنانے کے لیے اسے الٹا پلٹا کر دیکھ رہا تھا۔ یہ بعد کی تحقیق و تفتیش سے علم ہوا کہ کلیدی تختے کی زبان کا آپشن اردو میں کر دیا گیا تھا اس لیے لیپ ٹاپ پاس ورڈ کے لیے اردو حروف کو قبول نہیں کر رہا تھا۔

''آپ کیوں میرے کمپیوٹر پر اپنی اردو ڈال دیتی ہیں امی؟ پلیز ایسے نہ کیا کریں۔'' اب کے اس کا لہجہ ناراض نہیں بلکہ ملتجی ہو گیا۔ ''خدا کے واسطے اپنی انجینئرنگ نہ کیا کریں، کیا ہمارے گھر سے ہی اردو بن کر نکلے گی؟ کیا کیا الابلا ڈاؤن لوڈ کر دیا ہے آپ نے؟ اس پر لکھنا محال ہو گیا ہے۔ آتا تو کچھ ہے نہیں آپ کو۔''

''میری سب سے پیاری امی، سب سے اچھی امی، ساری دنیا سے زیادہ لائق امی، سب سے اچھا کھانا پکانے والی امی، سب سے اچھے کپڑے پہننے والی امی،'' ان سارے مکالمات کی ترتیب اب بدل گئی تھی۔ بیانات نیا رنگ لے چکے تھے۔

''آتا تو کچھ ہے نہیں آپ کو، آپ کو کیا پتہ امی، یہ کون سا رنگ پہن لیا ہے، امی یہ کس قسم کا ڈریس ہے جیسے پادریوں کے چغے ہوتے ہیں۔ آپ نے آج پھر وہی کپڑے پہن لیے؟ روز نئے کپڑے پہنا کریں۔ یہ رنگ کیوں پہن لیا امی؟ ہمارا کوئی مر گیا ہے؟ امی کھانوں پر تجربہ نہ کیا کریں۔ بھلا پیزے پر مچھلی کی ٹاپنگ کون کرتا ہے اس طرح؟''

''ابا جی، یہ آپ کے نواسے کو کیا ہو گیا ہے؟ کچھ زیادہ ہی آزاد تفکر اور آزاد تعقل کا استعمال نہیں کر دیا صاحب زادے نے؟'' میں واقعی متفکر ہو گئی۔

''بیٹا اب اس کی نظر بڑی ہوگئی ہے اور آزادیِ افکار اسے ہی کہتے ہیں۔'' ابا جی نے جواب دے کر اخبار منہ کے آگے پھیلا لیا۔

••

عالیہ کی شادی کے بعد میں نے وہ مکان چھوڑ دیا جس میں ہم تینوں پرندوں کی طرح چہکتے تھے۔ گھر کی چابی دینے کے بعد میں نے اُسامہ کے پاس جانے کا قصد کیا۔ ایک فرض ادا ہوگیا تو سوچا کہ اب اس کی یونیورسٹی جا کر اس کی گھر گرہستی کو بھی دیکھا جائے۔ وہ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں نہیں بلکہ اس سے ملحق اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔

سخت سردی تھی اور ٹرین پر چار گھنٹے کا رستہ تھا۔ میں نے بچوں کی طرح ضد پکڑ لی کہ مجھے ہر صورت میں اپنے بیٹے کے پاس جانا ہے۔ عالیہ نے میرا بیگ پیک کیا اور کوپن ہیگن کے مرکزی ریلوے سٹیشن پر چھوڑنے گئی جہاں سے یورپ بھر میں ٹرینیں چلتی ہیں۔ اس نے جھک کر میرے لمبے جوتوں کے تسمے باندھے۔ میرے کوٹ کے بٹن دوبارہ چیک کیے، نیا اونی سکارف میرے دستی بیگ میں رکھا، ''امی جی آپ شام کو پہنچیں گی۔ اس وقت سردی ہوتی ہے۔ وہاں پہنچتے ہی اوڑھ لیں'' اس نے بچوں کی طرح میرے کوٹ کا کالر ٹھیک کیا۔

''اچھا'' میں نے کوشش کی کہ میرے انداز سے سعادت مندی ظاہر ہو۔

''اور سمندر کے کنارے جاتے ہوئے ونڈ بریکر پہن لیجیے گا، وہاں سردی کوپن ہیگن سے زیادہ ہوتی ہے۔'' اس نے بیگ سے ٹکٹ نکال کر ہاتھ میں پکڑا دیا۔

''جی اچھا۔''

اب اس نے مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا، پھر بغیر کچھ بولے میرا سامان اٹھا کر ٹرین میں داخل ہوگئی۔ میری سیٹ ڈھونڈ کر اس نے سامان اوپر برتھ پر رکھا۔ پھر سیٹ کے سامنے والی میز کھول کر لیپ ٹاپ نکال کر اس پر سجایا۔ سوئچ ڈھونڈ کر پلگ لگایا۔

''امی جی، وائی فائی کی ہدایات اور پاس ورڈ آپ کے ٹکٹ پر درج ہے'' اس نے میرے ہینڈ بیگ کے باہر والے خانے میں ٹکٹ رکھا، ''اسے گم نہیں کرنا۔ زپ بند رکھیے گا۔''

''اچھا میری ماں'' اب کے مجھ سے رہا نہ گیا۔

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ خوشگوار، مطمئن اور کھنکھتی ہوئی ہنسی، جس کی جھنکار کو میں چھو کر دیکھ سکتی تھی۔ اس کے تار تنے ہوئے تھے اور کھنک میں سچائی تھی۔ ایسی ہنسی صرف دل کے اندر سے اٹھنے

والی سچی خوشی سے کھنک پاتی ہے۔ میں نے اس کے دمکتے چہرے سے نظریں ہٹالیں مبادا میری ہی نظر لگ جائے اور دل ہی دل میں معوذتین دوہرا کر اس پر پھونکنے لگی۔ میرا کوٹ اتار کر اس نے اوپر والی برتھ پر لٹال دیا۔ دستی بیگ کو بند کر کے سیٹ کے ساتھ احتیاط سے رکھا۔ پھر آخری جائزہ لیتی نظروں سے سب انتظامات کا جائزہ لیا۔ موبائل نکال کر وقت دیکھا۔

''امی جی ابھی سات منٹ باقی ہیں۔'' اپنا بیگ کھول کر اس نے مونگ پھلی کا لفافہ، میٹھے باداموں کا پیکٹ اور پانی کی ایک بوتل نکال کر میز پر رکھی۔ پھر سنیکرز چاکلیٹ کا ڈبہ نکال کر مجھے یوں دکھایا جیسے پہلی دفعہ سکول جانے والے بچے کو ماں رشوت پیش کرتی ہو۔

''اب آپ نے سفر انجوائے کرنا ہے۔ راستے میں لکھتی ہوئی، کھاتی ہوئی، گانے سنتی ہوئی جائیں۔ نہ بلڈ پریشر لو ہوگا، نہ ڈی ہائیڈریشن ہوگی اور نہ ہی چینی کی کمی'' اس نے میرے سارے بہانوں کو ایک ہی جملے میں رد کر ڈالا۔

''میرے خدایا! نیم حکیم'' اب میں نے واقعی چڑ کر کہا اور ساتھ ہی میرے تصور میں سکول جاتی پانچ سالہ بچی ابھر آئی جسے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کی ماں ہسپتال کیوں داخل ہے اور وہاں بیٹھے بیٹھے اسے سکول کیوں بھیجنا چاہتی ہے جب کہ اس کی عمر کے دوسرے بچے ابھی سکول نہیں جائیں گے۔ میں ہسپتال سے ایک دن کی چھٹی پر آئی تھی اور مجھے فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس کے بیگ اور لنچ باکس میں تمام چیزیں پوری ہوں۔ پھر جب یہی بچی اپنے کالج کے ساتھ پہلی دفعہ ملک سے باہر دس دن کے ٹرپ پر گئی تو ہنستے کھلکھلاتے بچوں اور ان کے والدین کے درمیان میں واحد ماں تھی جو ہوائی اڈے پر پریشان کھڑی تھی اور ہزار قابو پانے کے باوجود آنکھیں بھر آئیں تو اس کے دوست مزید ہنسنے لگے۔

''اچھا میری پیاری امی'' اس نے مجھے بھینچ کر گلے لگایا، ''آپ اپنے بیٹے کے پاس جا رہی ہیں۔ خوش ہو کر جائیں۔ اس بے چارے کو بھی تسلی ہو جائے گی۔ اتنی دور اکیلا پڑا ہوا ہے۔'' میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک لمحے میں پانچ سال کی بچی سے ایک ذمہ دار آپا بن گئی۔

''جا کر اس کا اپارٹمنٹ دیکھیں، مزے مزے کے کھانے بنائیں، شہر دیکھیں، فلمیں دیکھیں۔'' اس نے پھر بچوں کی طرح میرے بال سنوارے اور میرے گال پر بوسہ دیا۔ پھر باہر جا کر پلیٹ فارم پر کھڑی ہو کر ہاتھ ہلانے لگی۔ میں نے دھواں بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔ پتہ نہیں وہ پیچھے کو دوڑ رہی تھی یا میں کہیں آگے نکلتی جا رہی تھی۔ بچے نجانے کب بڑے ہوتے ہیں یا

ماں باپ کب ان کو بڑا سمجھنا شروع کرتے ہیں؟ زندگی سب کو اپنے اپنے مقامات پر ہانک کر لے جاتی ہے۔ سدا تو کوئی بھی ایک چھت کے نیچے نہیں رہتا۔ میں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے خود کو سمجھایا۔

ٹرین چل پڑی تو میں نے آرام سے سیٹ پر بیٹھ کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ دو سیٹیں چھوڑ کر صرف ایک مسافر بیٹھا تھا۔ آرام دہ کوپے کی تمام نشستیں خالی تھیں جو یقیناً اگلے شہروں میں پر ہونا تھیں۔ میں نے لیپ ٹاپ پرے ہٹایا اور میز پر کتاب نکال کر رکھی۔

''ہیلو'' سامنے بیٹھے مسافر نے ایک دوستانہ مسکراہٹ پھینکتے ہوئے کہا۔

''ہیلو'' میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

''آپ کی بہن بالکل آپ جیسی لگ رہی تھی۔ بہت خیال رکھنے والی لگتی ہے'' اس نے خوش دلی سے کہا۔

''میری بیٹی ہے'' میں نے جواب دیا۔

''واؤ!'' اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکوڑے اور شانے اچکائے، ''میں ایلن ہوں۔ تاریخ کا پروفیسر ہوں۔ پیرس سے آیا ہوں اور اوہوس یونیورسٹی وزٹنگ سکالر کے طور پر جا رہا ہوں۔''

''اچھا'' میں نے اپنا تعارف کرایا۔ ''میرا بیٹا اولبرگ یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ میں اس کے پاس رہنے کے لیے جا رہی ہوں۔''

''واؤ!!'' اس نے ایک مرتبہ پھر سارے چہرے اور تاثرات کی زبان میں جواب دیا، ''آپ کو پتہ ہے آپ بہت خوش قسمت انسان ہیں۔ آپ کی بچی تو لگتا ہے آپ سے پیار نہیں بلکہ پرستش کرتی ہے۔ یقیناً آپ نے یہ سب کمایا ہوگا۔'' اس نے میری مختصر سی میز پر سجے لوازمات دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ مجھے واقعی بہت نوازا گیا ہے۔''

تھوڑی دیر ہم نے ہلکی پھلکی مسافرانہ باتیں کیں۔ وہ کئی دفعہ کوپن ہیگن آ چکا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے جو طلاق کے بعد اس کی انگریز بیوی کے ساتھ لندن چلے گئے اور اب اسے ملے ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ اگلے چند سٹاپ پر مزید مسافر بیٹھے اور پھر گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔ میں نے کتاب کھول لی لیکن اس میں دل نہیں لگا۔ پہلی مرتبہ تھی کہ عالیہ کی شادی کے بعد مجھے اس سے الگ رہنا پڑا، اور اب میں اتنی دور جا رہی تھی۔ دل اداس ہونے لگا۔ میں نے ڈائری نکال کر

لکھنا شروع کیا۔ اب ذہن زمان و مکان سے آزاد ہو گیا۔

''میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' نجانے کس سٹیشن پر گاڑی رکی تو کسی نے اردو زبان میں کہا۔ میں نے چونک کر دیکھا تو میرا بیٹا سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ایک مرتبہ پھر مجھے پاکستانی جذباتی اماں ہونے کا طعنہ سننا پڑا۔

''میں نے آپ کو پورے سینتالیس دن بعد دیکھا ہے'' میں نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ اس نے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر میرے پاؤں اپنی گود میں رکھ لیے۔

''عالیہ کہہ رہی تھی کہ آپ پریشان ہیں اس لیے میں آدھے راستے میں آپ کو لینے آ گیا۔'' یہ میری زندگی کا ایک خوبصورت ترین دن تھا۔ میری نگاہیں اسے چوم رہی تھیں۔

اس نے بھی بہن کی طرح جیب چاکلیٹ اور مونگ پھلی سے بھر رکھی تھی۔ میرا ہاتھ کھول کر اس نے چاکلیٹ کی ٹکیہ رکھی۔ باقی سفر کا ہم دونوں کو پتہ ہی نہ چلا۔ ''امی جی مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے کہ آپ یہاں آ گئی ہیں۔ آپ کو بہت مزہ آئے گا۔ میں نے فریج میں آپ کے لیے چاکلیٹ بھر رکھے ہیں اور خشک میوہ بھی لایا ہوں۔ میں نے چاول بھی پکائے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے اب میں آپ سے اچھا پیزا بنانے لگا ہوں۔''

میرا دل ایک مرتبہ پھر بیٹھنے لگا۔ حالانکہ یہ میری زندگی کے اہم ترین مقاصد میں سے ایک تھا کہ میں اسے ایک ایسا مرد بناؤں جو خود کفیل ہو اور جو بیوی کو صرف روٹیاں پکانے والی خادمہ کا درجہ نہ دے۔

''اب کیا ہوا ہے امی؟ ڈرامہ کوئین نہ بنیں، پتہ نہیں آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ عالیہ کی شادی کیا ہوئی، آپ تو تھیٹر کرنے لگی ہیں۔ فکر مت کیجیے۔ عالیہ اور مبین بھائی کو بھی یہاں بلا لیں گے۔'' اس نے میرے خیالات کا تانا بانا توڑا، ''آپ انجوائے کریں، بے فکری سے مزے سے رہیں۔'' اس کے اپارٹمنٹ تک پہنچتے پہنچتے ہمیں رات آن پڑی۔

دو کمرے، نئے کچن اور خوبصورت غسل خانے کے ساتھ اس کا اپارٹمنٹ یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ زیادہ جائزہ لینے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں۔

''امی جی کس کمرے میں سوئیں گی؟ امی کوئی فلم ڈاؤن لوڈ کروں؟ پاپ کارن بناتے ہیں، مزے کریں گے۔'' اس نے میزبانی کے فرائض سنبھالے۔

''صرف سونا چاہتی ہوں۔ میں بہت دنوں سے نہیں سوئی۔'' اگلے دن دوپہر کو میں اٹھی۔

اُسامہ یونیورسٹی سے واپس آیا تو کہنے لگا، ''امی آپ سارا دن سوتی رہی ہیں؟'' پھر تفتیشی انداز میں پوچھنے لگا، ''نیند کی گولی تو نہیں کھائی تھی؟''

میں روایتی ماؤں کی طرح ناراض ہو کر بولی، ''زیادہ ابا نہ بنو میرے، نہیں کھائی تھی، تھکن کیا کم ہے اتنے دنوں کی۔''

''ناشتہ کریں گی یا کھانا گرم کروں؟'' وہ پروا کیے بغیر اپنی فطری بشاشت سے بولا۔

''بیٹا پانی ہے آس پاس؟'' کھانا کھا کر میں نے سیر پر جانے کی تیاری کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی ٹونٹی میں ہے'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''نہ بتاؤ، میں باہر نکلوں گی تو سمندر کی ہوائیں خود ہی کشاں کشاں میری رہنمائی کریں گی اپنی سمت۔''

''امی وہ سمندر نہیں جھیل ہے'' اس نے فوراً تصحیح کی۔

''اچھا، وہی، وہی۔''

''کیا مطلب، وہی؟ یعنی سمندر اور جھیل میں فرق ہی کوئی نہیں؟''

اف یہ جوان ہوتے ہوئے بچے، ''اچھا ٹھیک ہے جھیل'' میں نے اپنا قبلہ درست کیا۔

''امی پل پر نہ جایئے گا'' اس نے اگلی وارننگ جاری کی۔

''کیوں؟''

''بس کیا ضرورت ہے؟ ویسے بھی اس کا دوسرا سرا کافی دور ہے۔ پھر واپس آتے آتے شام ہو جائے گی۔''

میرا جواب نہ پا کر وہ فوراً بولا، ''اچھا جایئے لیکن پل پر مت جائیں، ادھر ہی لمبا چکر لگا لیں'' ہدایت نامہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

''کیوں؟ کیا پل آپ کے والد کا ہے؟'' اب میں واقعی چڑ گئی تھی۔

''نہیں امی، آپ کے والد کا ہے۔ آپ کی سہولت کے لیے بنوا گئے تھے'' اس نے برا مانے بغیر کہا، ''کوٹ پورا بند کریں۔ اس کی جیب میں میں نے اپنے دستانے رکھ دیے ہیں۔ دوسری جیب میں بینک کارڈ، موبائل فون اور گھر کی چابی ہے۔''

''اچھا''

''زیادہ دور نہ جایئے گا'' کواڑ بھیڑتے ہوئے میرے تعاقب میں اس کی آواز آئی۔

یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے۔ کسی بھی شہر کو ملنا ہو تو اس سے اس کی تنہائی اور اداسی کے لمحوں میں ملیے۔ اس وقت وہ آپ سے اپنے دل کی بات کرے گا۔ شور مچاتی سڑکیں، لال پیلی آنکھیں دکھاتی ٹریفک کی بتیاں، بھاگتی دوڑتی ہر سمت کو رواں بے سمت مخلوق، ہر ایک جلدی میں، ہر ایک مُصروف۔ ایسے حال میں تو کوئی بھی شہر جان چھڑا کر جھلائے انداز میں آپ سے مخاطب ہوتا ہے۔ کئی سوالوں کے جواب وہ نہیں دیتا اور کئی وضاحتیں شور میں دب جاتی ہیں۔ بہت سی باتیں ادھوری رہ جاتی ہیں۔

شہر کو سورج جاگنے سے پہلے اونگھتے، ہلکی سی نیند میں کروٹیں لیتے، دن بھر کے شور سے نمٹنے کے لیے برافروختہ لمحات میں جا پکڑیے یا پھر شام کے سایوں کو ماپنے کا پیمانہ لے کر اس کی سڑکوں اور گلیوں میں نکلیے۔ نہ آپ کو کہیں جانے کی جلدی ہو، نہ شہر کی سڑکوں کو مسافروں کو کہیں پہنچانے کی عجلت اور نہ ہی شہر کو دن بھر لوگوں کی چیخ پکار سن سن کر تھکاتی ہوئی اکتاہٹ۔ آرام دہ جوتا پہن کر خراماں خراماں چلیے، جہاں جی چاہے رک جایئے، جہاں اور جتنی دیر چاہے رکے رہیے۔ ایسے ہی دل کی باتیں لبوں تک آتی ہیں۔ ایک ایک کر کے شہر اپنی کہانیاں سنانے لگتا ہے۔ تاریخ کے اوراق الٹتا ہے۔ پرانے آئینوں کی گرد اڑنے لگتی ہے۔ لمبی لمبی قطاروں میں لگ کر صرف عجائب گھر دیکھنے کا شوق اور تصاویر لے کر ریکارڈ رکھنے کا جنون سیاحت نہیں سیاست کہلاتا ہے۔ اس شام میں اپنے ہی دھیان میں غلطاں و پیچاں شاید بہت دور نکل گئی اور پھر حسبِ معمول راستہ بھول گئی۔ ہلکی پھلکی بوندا باندی بھی شروع ہو گئی۔

شہر سے گفتگو ختم ہوئی اور بالآخر گھر پہنچی تو تفتیش شروع کر دی۔ صاحبزادے نے، ''اتنی دیر؟ کہاں رہ گئی تھیں امی جی آپ؟'' آواز میں پریشانی اور غصہ دونوں کا عنصر شامل تھا۔

''میں جھیل کے کنارے کنارے چلتی گئی تھی۔ دوسری سمت دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کہاں جاتی ہے۔'' میں نے دستانے اتارتے ہوئے جواب دیا۔

وہ کوئی جواب دیے بغیر میرے جوتے اتارنے لگا۔ پھر چھوٹے تولیے سے بال صاف کیے۔

''پرے ہٹو، میں کوئی بچی ہوں؟'' جب پوری دنیا گھومنے جاتی ہوں تب کیسے رستہ ملتا ہے مجھے؟''

''او میری بے بے جان، آپ بیمار بھی ہیں اور عجیب بھی۔ پتہ نہیں کہاں نکل جاتی ہیں۔ آپ گوگل کر لیتیں۔ موبائل آپ کے پاس موجود تھا۔''

میں نے خاموش رہنے میں ہی خیریت جانی۔

••

بن میں ویراں تھی نظر شہر میں دل روتا ہے
زندگی سے یہ مرا دوسرا سمجھوتہ ہے
زندگی سے یہ مرا آخری سمجھوتہ ہے، میں نے قاصر کے شعر میں تحریف کی۔

میں نے شاید خبطی ادبی مداریوں اور مدارنوں کی ڈگڈگی سے شدید خبیث زدہ (Frustrated) ہو کر ٹھاہ کر کے سوچ کے دروازے بند کیے، ویسٹ آف ٹائم، بس اب زندگی پر مزید اعتبار نہیں ہوگا۔ اب صرف تیرے بندوں سے حسنِ سلوک ہوگا یا خلوت نشینی ہوگی۔ میں جوتا اتار کر ساحل کی گیلی ریت پر چلنے لگی۔ میرے ساتھ چلتی سمندر کی ہوائیں شاید میری خود کلامی سننے کو ساتھ ساتھ ہولیں۔

''احکام تیرے سچ ہیں لیکن تیری دنیا ریت کا بنا گھروندا،'' میں نے ساحل پر بنے ریت کے قلعے اور اس میں دبائے گئے پلاسٹک کے سرخ پھولوں کو دیکھا۔ کسی نے بڑی محنت سے اتنا بڑا قلعہ بنایا اور نیچے لکھا ''Dont Enter'' (اندر آنا منع ہے)۔ واہ، ہم سے تو یہ بچے سمجھدار ہیں۔ جب علم ہو کہ دل ریت کا گھروندا ہے تو کم از کم داخلہ بند ہے کی تختی لگا دی جائے۔ لیکن کہیں دور سے ابا جی کی مترنم آواز آتی ''از محنت خار ہا گل می شود۔''

میں نے چلتے چلتے یوٹرن لیا۔ پتہ نہیں میں کتنی دور نکل آئی تھی۔ مڑ کر واپس چلنا شروع کیا۔ مقامِ آغاز پر پہنچ کر دیکھا تو سمندر کے مد و جذر سے کنارے ڈوب چکے تھے اور جانے کس دیس سے پلٹی شریر لہریں میرا جوتا لے گئی تھیں۔ مجھے شدید کوفت کے باوجود ہنسی آ گئی۔ ''اب کیا کروں؟'' میں نے بے کراں پھیلے سمندر کو دیکھا جیسے ہر سوال کا جواب اس کے پاس ہے۔

اللہ کی بہترین تخلیقات میں سے ایک یہ اسرار بھری بے کنار پانی کی دنیا بھی ہے۔ اس لیے ربِ کریم کی صفات کی جھلک سمندر میں ملتی ہے۔ جسے چاہے نواز دے، جس سے جب چاہے سب چھین لے۔ کسی کو دیوانہ کر دے تو کسی کے ذہن کو تاریک سکون دے۔ اپنی وحشی طاقت کو اپنے کناروں میں سمیٹے میرا ہمسایہ سمندر بظاہر بہت مطمئن دکھائی دے رہا تھا، ہم انسانوں جیسا۔ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔

شفق کی سرخی کی آخری تحریر بھی پانی میں ڈوب رہی تھی۔ قرمزی پانی میں قندیلیں

ڈولنے لگیں۔ آبی پرندوں کی ڈاریں گھر لوٹتے ہوئے شاید اپنا ہی استقبال کر رہی تھیں۔ شام کی خاموشی چھپھانے لگی۔ میں نے کوٹ کی جیب سے موبائل نکالا اور اپنے صاحبزادے کو فون کیا،

''مجھے گھر لے آؤ گے؟''

حسبِ توقع اس نے سوال کرنا اپنا اولین حق سمجھتے ہوئے فرمایا، ''گھر میں کیوں لاؤں؟ آپ نے کہا تھا کہ آپ پیدل واپس آئیں گی۔''

''میں ہی مکرر ارشاد فرما رہی ہوں کہ مجھے گھر چھوڑ دیں، سمندر میرا جوتا کھا گیا ہے۔'' میں نے شاید وضاحت دی۔

''جی امی؟'' اس کی بے یقین آواز گونجی، ''سمندر جوتا کیسے کھا گیا؟''

اب اسے ساری تفصیل سنانا پڑی۔ وہ آدھ گھنٹے کی ڈرائیو پر کسی دوست کے پاس بیٹھا تھا۔ گہرا ٹھنڈا سانس بھرنے کی آواز آئی، ''اس سے پہلے کہ سمندر آپ کو بھی ساتھ لے جائے، وہاں سے نکل کر سڑک کی طرف آئیں۔''

اب اس کا پند و نصیحت کا پٹارہ کھل گیا، ''ادھر سنگریزوں کی طرف سے مت آیئے گا، سیدھا ریت پر چلتی جایئے اور عقب سے سڑک کے کنارے پر آجائیں، ورنہ پھر پیر دکھیں گے۔ امی جی میں پہلے ہی کہتا رہتا ہوں کہ شام کو سمندر کی طرف نہ جایا کریں۔''

''تو کب جاؤں؟ دن کو گئی تو مسلمانوں کا ایمان خراب ہوگا'' میں نے اسے چھیڑا۔ وہ بہت ذوق شوق سے عربی پڑھ رہا تھا اور اس کی تعلیم اور تفہیم کے ساتھ خوب بحثیں بھی ہوا کرتیں تھیں۔

''آ رہا ہوں امی جی۔ شکر ہے آپ کو بھی پروا ہے کسی کے ایمان کی خرابی کی'' اس نے بھی جواب دینا ضروری سمجھا۔

''پتہ نہیں آپ کب بڑی ہوں گی امی، کمال ہے، سمندر میرا جوتا کھا گیا ہے۔''

اس نے کامیابی سے میری نقل اتاری، میں نے فون بند کر دیا۔

••

اُسامہ کے ساتھ یونیورسٹی قیام کے دوران میں نے محسوس کیا کہ اس کی عمر شاید ان دو سالوں میں دو دہائیوں کی زقند لگا گئی ہو۔ اس نے زندگی کو اور اپنے حالات کو ایک نئے اور ذاتی تنقیدی شعور کی عینک لگا کر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ شاید وقت سے پہلے سر پر پڑنے والی ذمہ داری، میری طویل بیماری یا شاید تعلیم کے ساتھ اپنے چھوٹے سے گھر کی گھریلو مصروفیات، خود کھانا پکانا،

خریداری کرنا اور صفائی کرنے کے تمام فرائض اسے بہت منظم کر گئے تھے۔ جب میرے بیٹے نے ایک دفعہ کسی بات پر اختلاف کیا تو کہنے لگا، ''امی آپ کو نہ بات یاد رہتی ہے نہ کسی کی زیادتی۔ پھر دروازہ کھول دیتی ہیں، پھر آپ کی خانہ داری شروع ہو جاتی ہے۔ دراصل آپ کو سکھایا ہی نہیں گیا کہ اپنے تنازعے کو یاد رکھنا چاہیے اور عزتِ نفس کے تحت جوابی تھپڑ مارنا چاہیے۔''

میں ساکت کھڑی اس کی باتیں سنتی رہی، ''تو گویا اباجی کی تربیت غلط تھی؟ ہمیں تو انھوں نے بتایا تھا کہ صبر کے مدارج میں کئی چیزیں شامل ہیں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دے لینا کوئی کارنامہ نہیں۔ قدرت رکھتے ہوئے خاموش رہنا ایک درجہ ہے اور احسن یہ کہ برائی کا جواب حسنِ سلوک سے دو۔''

''امی وہ نانا ابو کا زمانہ تھا۔ آج کے لوگوں کا یہی علاج ہے کہ ان کی زیادتیوں کے بعد ان سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ اپنے دروازے بند کر دیے جائیں تاکہ آپ کو احمق اور آسان کھیل سمجھنے والوں کو اندازہ ہو کہ انھوں نے کیا گنوایا ہے۔''

اگست کی اس زرد ہوتی ہوئی شام کو میں اس کی یونیورسٹی سے ملحقہ اس روشن اپارٹمنٹ کی آرام کرسی پر بیٹھی ششدر اس کا خوبصورت چہرہ دیکھتی رہی۔ اس کی روشن پیشانی اور ذہین آنکھوں اور مضبوط لہجے نے مجھے سوچ میں ڈال دیا۔ ''تو کیا میں واقعی غلط ہوں؟ کیا واقعی اب میرے فیصلے یہ بچہ کرے گا جس کو میں نے بولنا سکھایا؟''

''آپ ان لوگوں سے نہیں ملیں گی جن کی دوستی اور احترام آپ نے ہمیں سکھایا اور جب امتحان کا وقت آیا تو سب اس معاشرے کے ساتھ ہو گئے جس نے اپنی اقدار بنا رکھی ہیں۔ سب نے اپنا ذہن کھول کر بتایا کہ ہم تینوں کی عزت تب ہے جب ایک چوتھا انسان آ کر ہمارے تعمیر کیے مینار پر کھڑا ہو جائے! نہیں امی، ہرگز نہیں، اب ایسا نہیں ہوگا۔ آپ پاکستان چلی جائیں، آپ کی طبیعت بہتر ہو جائے گی۔ اور آپ وہاں بھی کسی ایسے فرد سے نہیں ملیں گی جو ہمیں یہ احساس دلانے میں شامل تھا کہ ہم اپنی ذات میں کچھ نہیں اور ہمیں ایک لاتعلق اور غیر ذمہ دار انسان کی شمولیت معتبر کرے گی۔ میں عالیہ سے بات کرتا ہوں۔ آپ پاکستان جائیں گی اور جتنا جی چاہے رہیں گی۔ ہم آپ کے بغیر رہ لیں گے۔''

اس نے میری طرف دیکھا، پھر زمین پر بیٹھ کر میرے ہاتھ پکڑ لیے، ''امی، آپ اب تب واپس آئیں گی جب ہم نیا گھر بنائیں گے۔ پھر میں آپ کو گاڑی لے کر دوں گا۔'' اس نے

مجھے چمکارا، ''پھر میری شادی ہوگی، مرغیوں کی طرح بچے ہوں گے۔'' اس نے میرے خواب دوہرائے ''پھر میری امی خوش ہوں گی کیونکہ میری امی کے خواب بس یہاں تک ہیں'' اس نے مجھے ہنسانے کی کوشش کی۔

''مرغیوں کے بچے نہیں ہوتے'' میں نے ہاتھ کی پشت سے چہرہ صاف کرتے ہوئے بات جاری رکھی، ''انڈے دیتی ہیں۔''

''اف میری استاد اماں، بندہ مرتا مرجائے، درستی اور تلفظ نہیں چھوڑنا'' اس نے دانستہ اتنی بلند خود کلامی کی کہ مجھے سنائی دے۔

میں بھول گئی تھی کہ یہ 'نہیں' میرے ہی باپ نے ہمیں سکھائی تھی۔ کہتے تھے کہ جو کسی کو اپنا استحصال کرنے کی اجازت دیتا ہے اور اپنی زندگی کا دروازہ بند کر کے حرفِ انکار نہیں کہتا وہ خود سب سے بڑا مجرم ہے۔ اس رات کئی مہینوں کے بعد میں بے خبر سوئی بلکہ اگلے کئی دن صبح شام کی تفریق کیے بغیر مسلسل سوتی رہی۔

••

''امی! بات یہ ہے'' اس نے کیلوریز ناپنے والے برتن میں دو کباب ڈالتے ہوئے کہا، ''آپ کے گھر میں یکسر مختلف ماحول تھا۔ آپ کو لوگوں پر صرف اور صرف یقین کرنا سکھایا گیا۔ ان کو خوش کرنے کی تعلیم دی گئی۔ ان کی مدد کرو، خود قربانی دو، وغیرہ وغیرہ۔ آپ نے ایک مختلف نظامِ تعلیم سے نمو پائی ہے۔ آپ خود بتاتی ہیں کہ پاکستان کے سکولوں میں اساتذہ کی تکریم اور ان کی تعلیم و تدریس پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا جب کہ ہماری صورتِ حال آپ سے الگ ہے۔ ہمارے سکولوں میں استاد ہمارے ساتھ بیٹھ کر تنقیدی شعور کو پروان چڑھاتا ہے۔ ہماری جماعت میں ایسے کئی بچے موجود ہیں جن کو صرف ماں نے پالا ہے اور یہ کوئی ایسا انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ آپ نے دس برس ایک بہترین استاد کا خطاب پایا ہے۔ مجھے یونیورسٹی میں آپ کے کئی شاگرد ملے ہیں۔ بات یہ ہے کہ نانا ابو نے آپ کو یقین کرنا سکھایا تھا لیکن ہم نے یقین نہ کرنا سیکھا ہے۔ میں نے خود ہی یہ بھی سیکھا ہے امی کہ صرف لوگوں کی خوشی کو ہی مقدم نہ رکھو بلکہ اپنی ذات کو بھی دیکھو۔''

میں بغور نوٹ کر رہی تھی کہ اب وہ لفظ 'ہم' کی بجائے 'میں' پر اتر آیا تھا۔ وہ بالکل عام انداز میں بات کر رہا تھا جب کہ ہاتھ مسلسل سلاد کاٹنے اور ناپ تول کر پلیٹ میں کھانا ڈالنے میں مصروف تھے۔

جب اس نے نوٹ کیا کہ خلافِ معمول کوئی جواب نہیں آ رہا تو اس نے ہاتھ روک کر میری طرف دیکھا، ''ظاہر ہے ہم آپ جیسے تو نہیں ہو سکتے کہ کسی نے جو مانگا دے دیا۔ کسی نے ناجائز اختیار استعمال کیا تو بے اعتنائی سے ہاتھ جھاڑ دیے کہ کوئی بات نہیں۔ کوئی گھر میں آ گیا تو اپنا کمرہ بستر پیش کر دیا۔ خود کھانے پکا پکا کر ہلکان ہو گئیں اور ہمیں ڈرائیور بنا دیا۔''

''بیٹا مہمانوں کے بہت حقوق ہوتے ہیں۔'' اس نے نہایت سنجیدگی سے میری نقل اتاری۔ ''کوئی پیسے لے کر کھا گیا تو کوئی بات نہیں، خیر ہے، اللہ اور دے گا۔ شاعرانہ جذباتیت سے زندگی نہیں گزرتی میری ماں! ایسے نہیں ہوتا۔ راستے روکنا پڑتے ہیں، کواڑ بھیڑنے پڑتے ہیں۔''

ایک نہایت مختصر سی 'اچھا' کے ساتھ میں نے میز پر سے اپنے کاغذ سمیٹے اور کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ دیوی کے سنگھاسن پر بیٹھنا کبھی بھی میرا نصب العین نہیں رہا۔ مجھے یہی سکھایا گیا کہ اچھی تربیت اپنی زندگی کی مثال سے دی جاتی ہے۔ صرف خطبات اور پند و نصائح کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمارے صاحبزادے ماشاءاللہ عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے جب ساری دنیا قدموں کے نیچے اکھڑے سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ مردانہ اٹھتی جوانی، ذہانت، فطانت، فیصلے، دانش اور صواب دید، غرضیکہ سب کچھ صرف اپنے پر ختم سمجھتی ہے۔ شاید دورِ شباب میں ہر انسان کبھی نہ کبھی خود کو ضرور عقلِ کل سمجھتا ہے۔

••

ایک دن شام ڈھلے گھر آیا اور فریج کھولا، ''امی! لزانیہ کہاں ہے؟'' اس نے رات کا بچا ہوا کھانا دیکھتے ہوئے کہا۔

''سامنے والے کے بچے آئے تھے۔ میں نے انھیں دے دیا ہے'' میں نے صوفے پر سے ہی اسے جواب دیا۔

''امی!'' اس نے تلخی سے تقریباً الجھتے ہوئے کہا، ''کچھ اور نہیں دیا جا سکتا تھا؟ آپ کو پتہ بھی ہے کہ میں لزانیہ ہی کھاتا ہوں؟''

''وہ پاکستانی کھانے نہیں کھاتے بیٹا۔ آپ بٹر چکن یا بریانی تناول فرمایئے۔ کل کی دعوت کے کھانے پڑے ہیں۔''

''امی!'' اب اس نے قدرے ناراضگی سے کہا، ''آپ کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ ہر وقت کسی اور کی پسند کی چیز اٹھا کر ایسے ہی نہیں بانٹ دی جاتی۔ آپ کا بس چلے تو پوری

بلڈنگ کو کھانا سپلائی کیا کریں۔"

میں نے یوں ہی ظاہر کیا جیسے سنی ان سنی کر دی ہو لیکن اس نے اپنا وعظ جاری رکھا، "آپ کو اپنے ابا حضور سے یہ عادات ملی ہیں لیکن ان کے آگے پیچھے غریب غرباء اور مستحقین تھے۔ آپ کے حالات وہ نہیں۔" صاحبزادے نے نئی نئی عربی پڑھ کر فقہ سیکھنا شروع کیا تھا۔ میں نے ہونٹوں پر مچلتی تلخ نوائی کو بصد کوشش روک لیا۔

امی کی بات یاد آ گئی کہ ماں بننے سے پہلے صبر کا سمندر سینے میں سمیٹنا پڑتا ہے۔ ایسا وقت بھی آتا ہے کہ اولاد آپ کو نادان سمجھتی ہے اور شاید آپ کی تربیت بھی کرنا چاہتی ہے۔ امی کا محاورہ یاد آ گیا کہ "ڈھڈ دے جمے شریک بن جاندے نیں" پتہ نہیں اس معمولی بات نے کس تار کو جا چھوا کہ جھنجھناہٹ آنکھوں میں آ رکی۔

اسے کوئی جواب نہ ملا تو کھانا بھول کر میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ لہجے میں پشیمانی تھی، "امی جی! میں اعتراض نہیں کر رہا، صرف آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ خود اپنی ذات کو بھی اہم سمجھنا سیکھ لیں۔ ابھی تک آپ کی طبیعت نہیں سنبھل پائی۔ سارا سامان پیک کر کے گھر واپس کرنا ہے۔ مجھے یونیورسٹی کا اپارٹمنٹ چھوڑنا ہے۔ ہمارے اوپر بہت ذمہ داریاں ہیں۔ آپ کھانے پکانے اور اسے بانٹنے میں خود کو تھکا لیتی ہیں۔ کچھ اپنی حالت پر بھی رحم کریں۔"

••

ابا جی متنازع باتیں، جھگڑے، لڑائیاں سب بھول جایا کرتے تھے کہ کس نے کیا کہا تھا اور کس موقع پر کیا ہوا تھا۔ بچوں کی سی سادگی سے کہتے، "مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ ربِ کریم نے میرے ذہنی نظام سے اسے منہا کر دیا ہے۔"

شاید بہت سوں کو اس کا یقین نہ آئے لیکن یقین مانیے کہ مجھے اس کا تجربہ ہوا۔ مجھے بھی منفی لوگوں کی منفی باتیں زیادہ دیر تک یاد نہیں رہتیں۔ ایسے ہی کسی موقع پر میں نے بچوں کو جب بھولنے کی تلقین کی تو میرا بیٹا میرا ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہوا صوفے پر لے آیا، "ادھر بیٹھ جائیں چپ کر کے۔ آپ کو تو کچھ پتہ نہیں کہ لوگوں سے کیسے نمٹنا ہے۔"

"یا اللہ! بیٹا آپ کس پر چلے گئے ہیں؟ ہماری تو نسلوں میں کوئی دروازے پر آئے مہمان کو نہیں روکتا۔" میں نے شدید ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ آپ یہ مائیگرین کی گولی کھائیں اور دوسری بات یہ کہ آپ مہمان

دیوی بننا چھوڑ دیں‘‘ اس نے نصیحت جاری رکھی، ’’لوگ بے وقوف سمجھتے ہیں ایسے لوگوں کو جو ماضی میں اپنے ساتھ روا رکھی گئی زیادتیوں کو یاد نہیں رکھتے اور بدطینت مخالفوں کے لیے اپنے دروازے بند نہیں کرتے۔‘‘

’’امی جی آپ کو پتہ ہی نہیں چلتا ایسے لوگوں سے نیکی کرنا نیکوں سے ظلم کے برابر ہے۔‘‘

’’تم اپنا فلسفہ اپنے پاس رکھو‘‘ میں نے اپنے کندھے سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

’’آپ کے نانا ابو کہا کرتے تھے کہ اللہ کی ذات سب کو نوازتی ہے۔ کلمہ پڑھنے والوں کو بھی اور تکفیر کرنے والوں کو بھی۔ اب آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں بیٹھ کر پچھتاؤں؟ واویلا کروں؟ خود کو کوسوں؟‘‘

’’امی امی!!!‘‘ وہ مجھے پچکارنے لگا، ’’جذباتی نہیں ہونا۔ دلیل سے بات کریں، دلیل سے ذلیل کریں،‘‘ وہ میری نقل اتارنے لگا۔

••

میں نے ایک دفعہ اُسامہ سے کہا کہ بیچلرز کرنے کے بعد آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔ تعلیم تو تمام عمر جاری رہتی ہے۔ کچھ سوچا ہو تو بتا دو۔ اس کے جواب نے مجھے پل بھر کے لیے حیران کر دیا۔ کہنے لگا ’’امی جی جب تک میں تعلیم مکمل کر کے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوتا، شادی کا خیال ذہن سے نکال دیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی کو شادی کے بعد معاشی دوڑ میں حصہ لینا پڑے۔ وہ اپنے شوق کی خاطر مشغلے کے طور پر جو جی چاہے کرے لیکن اسے دل پر جبر کر کے میری تعلیم ختم ہونے کا انتظار کرنا پڑے۔ آپ کی زندگی کا مقصد صرف ہمارے بچے پالنا اور روٹیاں پکا کر دینا نہیں۔ یہ آپ کی زندگی کا آزاد وقت ہے۔ اس میں اپنے تمام شوق پورے کریں۔ مجھے ڈگری، گھر اور گاڑی ملے گی تو آپ کو بہو بھی لا دوں گا اور خرگوشوں جیسے بچے بھی۔ میں اس کا جواب سن کر چپ کر کے بیٹھ گئی۔

سرکارِ دو عالم ﷺ اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی مثالیں دینے والوں کو یہ یاد نہیں رہتا کہ جہیز اور بارات کا تصور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عربی وضع قطع بنانے کے باوجود ثقافتی طور پر ہم اپنے علاقے سے جڑے ہیں۔

زندگی کے بے شمار اسباق ہم اپنی اولاد سے سیکھتے ہیں۔ ہر روایتی ماں کی طرح میرا بھی دل چاہنے لگا ہے کہ اس کے سر پر سہرا دیکھوں۔ گرد و پیش کے واقعات سکھاتے ہیں کہ جب ایک مرتبہ بچے صدی کا چوتھائی حصہ پار کر گئے اور اپنے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے تو پھر وہ زندگی

کے عملی کام بھی کتابی علم کی بنیاد پر کریں گے۔

میری دن، رات کی رٹ سے تنگ آ کر ایک دن وہ بولا، ''امی جی، یہ بات تو اپنے ذہن سے نکال ہی دیں کہ میں پاکستانی پس منظر کے کسی خاندان میں شادی کروں گا۔ ہمارے لوگ صرف شادی کی پارٹی کی تیاری کرتے ہیں۔ صرف لوگوں کو دکھانے کے لیے بڑے ہال، مہنگے ملبوسات، بڑی گاڑیاں اور ہنی مون کی تفصیلات طے کرتے ہیں۔ اس ڈسکو زندگی سے باہر نکل کر ایک عام آدمی کی زندگی گزارنے کے کیا تقاضے ہیں، وہ زیرِ غور نہیں آتے۔''

''اچھا تو آپ کیا چاند چڑھائیں گے؟'' میں نے آرام سے پوچھا۔

''میں کسی عرب پس منظر کی لڑکی سے شادی کرنے کو ترجیح دوں گا جو اپنی مرضی اور اپنے انتخاب سے اسلام کو اپنی زندگی میں اہمیت دیتی ہو۔''

''اچھا''

''امی!'' اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا، ''آپ کو پتہ ہے آج کل شادیوں کی ناکامی کا اصل مسئلہ کیا ہے؟'' اس کے کئی عرب دوستوں کی شادیاں بیس اکیس برس کی عمر میں ہو چکی ہیں۔ میں خاموشی سے سنتی رہی۔

''مسئلہ یہ ہے کہ ہم لڑکے سوچتے ہیں کہ ہماری پسندیدہ خصوصیات یہ ہیں اور اس کی حامل لڑکی سے شادی کر کے خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی نہ بدلے۔ وہی خوبیاں ہوں جن پر پختگی سے مزید استحکام آئے۔ لیکن لڑکیاں سوچتی ہیں چلو کوئی بات نہیں، میری پسند کی باتیں ساری تو پوری نہیں، خیر میں اسے شادی کے بعد بدل لوں گی۔''

''ہائیں!'' اب میں واقعی کچھ حیران ہوئی، ''کیا دفترِ شادیات کھول رکھا ہے آپ نے؟''

''نہیں امی جی، میں جن کی شادیاں ہو چکی ہیں ان کو دیکھتا رہتا ہوں۔''

''اچھا چلیں ٹھیک ہے۔ جب آپ کو 'منزلِ مراد، شاد باد' مل جائے تو مجھے بتا دیں۔''

••

تقریباً یورپ بھر میں ہی گھروں کے ساتھ ایک بیرونی سٹور بنایا جاتا ہے جہاں سائیکل، سودا سلف، اضافی سامان رکھا جاتا ہے۔ میرے سفر کے دوران ہمارے صاحبزادے نے کہیں چابیاں گم کر دیں۔ پہلے مصر رہا کہ آپ نے اپنی سیروں میں گم کی ہیں۔ بالآخر نیا تالا لا کر عمارات کی دیکھ بھال کرنے والے کاریگر کو بلا لایا،

''تالا توڑ دیں گے؟'' اُسامہ نے پوچھا۔

''نہیں، پورا دروازہ اکھیڑنا ہوگا'' وہ سنجیدگی سے بولا، ''تمھاری ماں کی اجازت چاہیے۔''
میں باہر گئی تو کہنے لگا، ''اس تالے کو توڑنے کے 5000 ہزار کرونا لوں گا۔''

''بھائی جان!'' میں نے آرام سے کہا، ''میرے پاس پانچ کرون ہیں۔ امید ہے تین صفر تمھاری جیب سے نکل آئیں گے۔''

اس نے جیبیں ٹٹولیں، ''چلو رہنے دو، میں گھر جا کر تین زیرو ڈھونڈ لوں گا۔''

تالا توڑ کر جانے لگا تو میں نے اسے چاکلیٹ کا ڈبہ دیا۔ اس کی شریر آنکھیں شرمندہ سی ہوگئیں، ''نہیں نہیں، میں مذاق کر رہا تھا۔ تم نے پچھلی دفعہ ہال کرائے پر لیا تھا تو مجھے بہت تنگ کیا تھا۔ اب میں ذرا بدلہ لے رہا تھا'' اس نے وضاحت کی، ''یہ کام تو میری ملازمت کا حصہ ہے۔''

''کوئی بات نہیں، رکھ لو۔ یہ ہمارا کلچر ہے ناں۔ ہم دوستوں کو عنایات کا شکریہ اس طرح ہی کہتے ہیں۔''

''ہاں ہاں'' میرے بیٹے نے لقمہ دیا، ''ہمارا کلچر، پہلے مینگنیاں ڈالتے ہیں پھر اوپر دودھ چھڑک دیتے ہیں۔''

صبح صبح محاورے کی بے عزتی کرنے پر میں نے ایک جھانپڑ لگایا لیکن مجھے ہنسی بہت آئی۔

''میں نے کیا مس کیا؟'' برائن بولا، ''تم دونوں کیوں ہنس رہے ہو؟ میری برائیاں کر رہے ہو ناں اپنی زبان میں؟''

جب اسے محاورے کی وضاحت کی گئی تو وہ لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

''میری ماں کے فارم پر بکریاں ہیں۔ میں آج ہی اسے سناتا ہوں۔''

''برائن!'' میں نے کہا، ''دودھ میں مینگنیاں، اصل محاورہ ہے۔''

''برائن!'' صاحبزادے بولے، ''مینگنیوں میں دودھ، زیادہ اصل ہے'' پھر میری رسائی اور جھانپڑ سے باہر ہو کر بولا، ''کبھی کبھی صرف میگنیاں اور، اور باقی ممیانا صرف زبانی جمع خرچ ہے، میں میں میں میں''

میرے ہاتھوں کی لکیروں میں ہے بچپن تیرا
تیرے ہونٹوں کے تبسم میں جوانی میری

●●

چیستانِ بدن میں کئی زخم رازوں کی صورت پڑے تھے

ڈنمارک میں میں منتقل ہونے کے چند برس بعد ہی میری بیماری کا آغاز ہوا معمولی سے انفیکشن سے آغاز ہو کر اندرونی زخموں تک بات جا پہنچی اور پھر عمر بھر ان امراض کا اور میرا چولی دامن کا ساتھ رہا۔ اُسامہ تقریباً دو برس کا تھا جب پاکستان جانے پر تایا جان نے مجھے بٹھا لیا۔

''ہیٹ کا یہ مرض نک چڑھے لوگوں کو ہوتا ہے، تمہیں کیسے زخم ہو گئے آنتوں میں؟ اب ادویات کے نام پر یہ زہر کھاتی ہو! سٹیر وائڈ ہوتا ہے ان میں، اور یہ مرض کو دباتا ہے، بیخ کنی نہیں کرتا انگریزی میں اسے کئی طرح کے نام دیئے گئے ہیں لیکن قدیم حکمت کے زمانے سے آنتوں میں زخم ہونے کو سنگرہنی کہا جاتا ہے۔ سَنگ، رَہنی، یعنی سنگ سنگ رہنے والی بیماری، کیونکہ آنتوں کی رطوبتوں کی وجہ سے زخم سُوکھتا نہیں، تَر رہنے کہ وجہ سے خشک ہو کر ٹھیک نہیں ہوتا۔''

تایا جان نے پریشان ہونے کے باوجود اردو پڑھانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا

''چھلکا اسپغول اور تخم بالنگو کی رطوبت اور جیلی آنتوں کے زخموں کو ڈھانک دیتی ہے لیکن مکمل افاقہ نہیں ہو سکتا۔ خوش رہا کرو۔''

اس کا علاج تایا جان نے صرف آپریشن ہیں تجویز کر دیا تاکہ زخم مزید نہ پھیلیں اور وقت نے ثابت کیا کہ یہ بہترین فیصلہ تھا کیونکہ کم عمری میں زخم جلد مندمل ہو جاتے ہیں میں سمجھتی ہوں کہ اس بیماری کے ساتھ نبرد آزما ہونے اور ابتداء ہی سے اس بات کو سمجھ لینے میں کہ یہ پیٹ کا مرض اور اس کے ساتھ لو بلڈ پریشر اور خون کی کمی یہ زندگی کا حصہ بن چکی ہے۔ میری قوتِ برداشت میں اضافہ ہی کیا بچوں کی نگہداشت اور تعلیم میں ہر لمحے کی اہمیت سمجھنا سکھایا، اسی بیماری کی وجہ سے مجھے بے حد کم عمری میں لوگوں کی منافقت بھرے کریہہ رویوں کی پہچان ہوئی ابا جی نے مجھے ہمت نہ

ہار نے دی مسلسل مجھے درس ملتے رہے نعمتوں کی قدر سکھائی جاتی رہی اس بیماری کے ساتھ میں نے بچے پالے، تعلیم مکمل کی، ملازمت کی اور بعد میں لکھنے کا مسلسل مشغلہ اختیار کیا۔

پاکستان سے واپسی پر کوئی ایسا نامراد انفیکشن ہمراہ ہولیا کہ اس کی بیخ کنی کے لیے مجھے ہسپتال رہنا پڑا۔ پھر پیٹ کے مرض نے مزید شدت اختیار کی اور مزید ایک سرجری کی نوبت آ گئی۔ مجھے دو ہفتے کے لیے ہسپتال ہی روک لیا گیا۔ روزانہ چیک اپ ہوتا اور خون ٹیسٹ کیا جاتا۔ ہماری نورِ نظر روزانہ آتیں۔ بڑے سے کوٹ پر بڑی سی ٹوپی اور دستانوں سمیت ہاتھ میری پیشانی پر رکھتیں، ''امی آج آپ ٹھیک ہوگئی ہیں؟ گھر چلیں؟''

ہسپتال میں ان دنوں کئی ملنے والوں کے گھر بچے پیدا ہوئے۔ وہ شوق سے ان کو بھی دیکھنے گئی۔ دو تین دن رہ کر سب اپنے اپنے بے بی لے کر گھروں کو چل دیتے۔ عالیہ کو جو سب سے بڑا دھچکہ لگا وہ یہ تھا کہ اس کی محبوب چچی جان بھی ایک دن اچانک ہسپتال آئیں۔ وہاں اللہ میاں سے بات کی اور ان کو بھی ایک بے بی بھائی مل گیا اور وہ بھی دو دن کے بعد چلی گئیں۔ اگلے دن وہ چچا کی انگلی تھامے ہوئے آئی۔ آنکھیں ایسے جگمگاہٹ سے بھری پٹ پٹ کر رہی تھیں جیسے اندھیری رات میں اچانک بلی کی آنکھوں پر گاڑی کی لائٹ پڑے۔ گھنگھریالے بالوں کی ننھی سی پونی ہلاتی ہاتھوں کے اشاروں سے مسرت کا اظہار کرتی۔

''امی امی! چچی جان کو بے بی ملا ہے۔ اس کے دو ہاتھ بھی ہیں اور انگلیاں بھی ہیں۔ اور امی اس کے بال کالے ہیں۔ اور وہ مسکراتا بھی ہے۔'' اس نے ننھے ہاتھوں سے میرے بال سنوارے۔ ''اور امی، پتہ کیا، اب وہ ہمارے گھر ہی رہے گا اور مجھے باجی کہے گا۔ میں اس کو فیڈر بھی پلاؤں گی۔'' میں نے اس کا جوش اور جذب سے بھرا چہرہ دیکھ کر بہت حظ اٹھایا۔ اگلے دن پھر اس کی سواری بادِ بہاری آئی۔ بے بی کی شان میں قصیدہ سنایا گیا۔ پھر مزید انکشاف کیا ''امی جی وہ شوشو بھی کرتا ہے۔'' پھر اطلاع دی کہ ''چاچو بہت سی نیپیاں لے کر آئے ہیں۔''

تیسرے دن جب وہ آئی تو موڈ بگڑا ہوا تھا۔ ظاہر ہے بے بی بھائی کی اصلی آپا نے دعویٰ دائر کیا کہ وہ ان کے کمرے میں رہے گا کیونکہ چچی ادھر رہتی ہیں۔ ''اب بے بی بھائی سو گیا ہے تو آپ بھی اپنے کمرے میں اُسامہ بھائی کے پاس جائیں۔''

اب اس نے میرے بالوں میں کنگھی کرنے کی کوشش بھی نہ کی اور نہ ہی ''کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں'' سنا کر داد لی۔ چھوٹی کرسی رکھ کر میرے بیڈ پر چڑھی دونوں ہاتھوں کی ننھی

ننھی مٹھیاں بھینچ کر آنکھوں میں دیں اور روہانسی آواز میں بولی ''سب کی امیاں یہاں آتی ہیں، اللہ میاں سے بے بی لے کر چلی بھی جاتی ہیں۔ آپ سو سال سے ادھر رہ رہی ہیں اور ایک بلی کا بچہ بھی نہیں لا کر دیا۔''

میں اس کے معصوم اور خفگی بھرے انداز پر ہنسنے لگی لیکن ساتھ ہی درد کی ایک شدید لہر اٹھی اور پیٹ پر لگے ٹانکوں سے جیسے آگ برسنے لگی۔ ڈاکٹر نے سب کو کمرے سے نکال دیا اور ساتھ ہی سختی سے منع کیا کہ مریضہ کو ہنسنے اور کھانسنے سے بچانے کی ضرورت ہے۔ ابا جی کو بھی یہ بات بتائی گئی کہ آپ کی نواسی نے اعتراضات شروع کیے ہیں۔ پہلے تو وہ محظوظ ہوئے لیکن جب انھیں بتایا گیا کہ ہنسنے سے زخم خراب ہونے کا اندیشہ ہے تو کبھی کسی بات میں مداخلت نہ کرنے والے اور نواسی پر نچھاور ہونے والے ابا جی نے کہا کہ اپنی بچی کو میری بچی سے دور رکھیے ورنہ زخم پرانے اور مزمن ہو جاتے ہیں۔ پھر پیٹ کے زخم تو تہہ در تہہ سلے ہوتے ہیں۔ ان کے مندمل ہونے میں تو سالہا لگتے ہیں۔ بچی کو نئے بے بی تک پوری رسائی دیجیے تا کہ اسے ماں کی کمی کا احساس بھولا رہے۔''

••

1994ء میں تایا جان اور ابا جی کے حکم کے مطابق ڈنمارک واپس جا کر میں نے ڈاکٹر سے سرجری کا مطالبہ کیا۔ ساڑھے چھ فٹ کے ڈاکٹر نے میری طرف سر جھکا کر دیکھا، ''ننھی لڑکی تم سمجھتی ہو کہ اتنا لمبا اور مرحلہ وار آپریشن مذاق ہے؟''

''نہیں''، میں نے سنجیدگی سے کہا، ''میرا آپ سے کوئی مذاق نہیں۔ میں درست کہہ رہی ہوں کہ مجھے آپریشن ہی کرانا ہے۔''

اس نے ایک مرتبہ پھر میرا بائیوڈیٹا دیکھا، پھر مجھے دیکھا اور فکر انگیز لہجے میں کہا، ''بچے بہت چھوٹے ہیں تمھارے۔ تم آسانی سے کئی سال بغیر آپریشن کے ادویات کے سہارے گزار سکتی ہو۔''

''نہیں مجھے یہ ادویات نہیں کھانی۔ سٹیرائیڈ ہے سب۔'' میں بھی اپنے موقف پر قائم رہی۔ وہ کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کاغذات اس نے پرے ہٹا دیے اور دوستانہ طریقے سے میرے فیصلے کا پس منظر جاننے کے لیے سوالات کرنے لگا۔ جب اسے معلوم ہو کہ صرف علامات سن کر مرض کی تشخیص کر دی گئی تھی اور ادویات دیکھ کر دونوں بھائیوں نے کھڑے کھڑے آپریشن کا فیصلہ یوں سنایا جیسے امی کہتی تھیں کہ مہمان آ گئے ہیں ذرا چاولوں کے ساتھ روٹیاں ڈال دو یا جیسے دھنیہ کاٹ کر سالن پر ڈال دو۔

مجھے یاد ہے کہ نمازِ عصر کے لیے جاتے جاتے ابا جی بولے، ''ہاں بھئی بچے! لالہ جی نے کہا ہے کہ آپریشن ناگزیر ہے۔ آپ واپس جاتے ہی کروا لیں۔ پیٹ اور انتڑیوں میں ان شدید زخموں کا علاج اینٹی بائیوٹکس نہیں۔''

ڈاکٹر آئیون برون کے ساتھ میری یہ پہلی تفصیلی گفتگو تھی۔ وہ کہنے لگا کہ میں مشرقی اَسرار سے ہمیشہ متاثر ہوتا ہوں۔ کچھ نہ کچھ سیکھنے کے لیے ملتا رہتا ہے۔ چلو اب ڈاکٹرز کا بورڈ بیٹھے گا تو بات ہوگی۔ اس نے گفتگو کو سمیٹا۔ ''تو یہ تمھارا آخری فیصلہ ہے؟'' اس نے خدا حافظ کہنے سے پہلے ایک مرتبہ تصدیق چاہی۔

''ہاں، کیونکہ مجھے بتایا گیا ہے جوانی میں سرجری سے جسم کو عادی ہونے میں سہولت ہوتی ہے۔ وزن کم ہونے کی وجہ سے ٹانکے جلدی جڑتے ہیں اور زخم جلد مندمل ہوجاتے ہیں۔''

''اچھا اچھا۔۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے'' وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ پھر ہنس کر کہنے لگا، ''نرس سے اگلی مرتبہ کا وقت لے لو۔ اب تین ہفتے بعد ملاقات ہوگی۔''

میں جولائی کی اس پگھلا دینے والی دھوپ میں جدید ترین ہسپتال کے لمبے کوریڈور پر راستوں کی نشان دِہی کرنے والے رنگوں کا تعاقب کرتی بیرونی دروازے کی طرف چل پڑی۔ جیسے انگریزی کہانی کے مطابق کسی نے راستہ یاد رکھنے کے لیے راہ میں دانے پھینک رکھے ہوں۔ ہر رنگ کسی خاص شعبے کی طرف لے کر جاتا اور مریضوں کو ہدایت کی جاتی کہ سرخ یا نیلی لکیر کے پیچھے چلتے جاؤ۔ جو لوگ بورڈز نہیں پڑھ پاتے انھیں بھی متعلقہ شعبہ ڈھونڈنے میں سہولت ہوتی ہے۔

ڈنمارک میں ذرائع آمد و رفت کا بے مثال انتظام ہے۔ میں نے ہسپتال کے بیرونی دروازے سے بس پکڑی اور سیٹ پر بیٹھ کر پسینہ پونچھا۔ چلو ایک مرحلہ تو طے ہوا۔ ان دنوں پاکستان ٹیلی فون ایک اعلیٰ درجے کی عیاشی تھا لہٰذا ٹیلی فون پر رابطہ عید شب برات پر ہی ہوتا۔ میں نے گھر آتے ہی ابا جی کو مفصل خط لکھا۔ جب تک ان کا جواب آتا میں دوبارہ ہسپتال گئی۔ ڈاکٹر کے بورڈ کے مشترکہ فیصلے سے مریضہ کی خواہش کو مدِنظر رکھتے ہوئے آپریشن کا مطالبہ مان لیا گیا تھا۔ اب مجھے مکمل آگاہی دینے کے لیے ایک نرس کے سپرد کر دیا گیا۔

''بڑی آنت کا آپریشن مذاق نہیں۔ اس ایک آپریشن پر لاکھوں ڈینش کرونز کی لاگت آتی ہے۔ اس میں جسم کے اندر پیچیدہ پیوند کاری کی جاتی ہے۔ انحصار اس بات پر بھی ہے کہ زخم کہاں تک پھیل چکے ہیں۔'' درمیانی عمر کی سنجیدہ چہرے والی نرس مجھے سمجھانے لگی۔

''زخم!'' کتنا عجیب لفظ اور کیسا اذیت ناک احساس ہے کہ ایک بظاہر ہنستے مسکراتے بھاگتے دوڑتے انسان کے اندر اتنے زخم کہاں سے اگ آتے ہیں۔ میں کمپیوٹر پر اپنے معائنے کے نتائج دیکھتی رہی۔ اگلے مراحل کا فیصلہ پہلے آپریشن کے بعد زخموں کے پھیلاؤ اور ان کی نوعیت پر تھا۔

''اگر پوری آنت نکالنا پڑی تو پیٹ پر ایک تھیلی لگا دی جائے گی جس کا براہِ راست تعلق معدے سے ہوگا۔ پھر تمام زخموں کے خشک ہونے کا انتظار کیا جائے گا۔'' نرس نے کمپیوٹر کی سکرین پر مجھے آپریشن کا عمل دکھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا'' میں نے کمپیوٹر کی سکرین دیکھی جس پر دھبوں کی صورت میں زخم دکھائے گئے تھے۔ اف، یہ کیا ہے میری درونِ ذات میں، اتنے داغ دھبے کہاں سے آگئے؟ شاعر کہتے ہیں زندگی میں اشک ستارے بنتے ہیں، رستہ دکھاتے ہیں۔ اب مجھے ایک نیا تصور دینا پڑے گا کہ یہی بے ضرر، بے روئے اشک جسم کو اندر سے داغ دار بھی کر دیتے ہیں۔ نرس شاید میرا چہرہ پڑھ رہی تھی۔ میری خاموشی کو اس نے شاید خوف سے تعبیر کیا۔

''اور اگر زخم جلد بھر گئے تو پھر ایک طویل آپریشن میں چھوٹی آنت کو کھینچ کر اس کی پیوند کاری کی جائے گی اور جسم کے اندر ایک تھیلی بنا دی جائے گی جو بڑی آنت کا کام کرے گی۔ بڑی آنت تو تم دیکھ لو، مکمل طور پر زخمی ہو چکی ہے۔ کیا کرتی رہی ہو تم اپنے ساتھ ینگ وومین؟'' اس نے ماؤس کا کرسر گھما کر بڑی آنت پر رکھا۔

اب سکرین پر مناظر بدل گئے، ''اچھا، اور اگر اس تھیلی کو جسم نے قبول کر لیا اور زخم جلد مندمل ہو گئے تو ایک اور آپریشن ہوگا۔''

اب مجھے اس کے سلسلہ وار انداز پر ہنسی آگئی، ''لگتا ہے کہ تم کوئی کہانی سنا رہی ہو جس میں چائنہ باکس کی طرح ڈبے ہی ڈبے ہیں اور کھلتے چلے جا رہے ہیں۔''

ڈبوں میں ڈبہ، ڈبے میں کیک

مریضہ ہماری لاکھوں میں ایک

''یہ کہانی نہیں'' وہ سنجیدگی سے بولی، ''یہ ایک پورا نظام ہے، مشکل اور پیچیدہ، اور اس میں جسمانی اور نفسیاتی طور پر بہت سی گرہیں پڑ جاتی ہیں۔'' اس نے کرسر گھما کر زخموں کے پھیلاؤ ماپنے کی کوشش کی۔ سکرین پر تیروں کے نشان ابھر آئے، ''یہ زخم اتنے سینٹی میٹر ہے، اور یہ اس سے بھی بڑا ہے۔'' وہ کلک کرتی گئی، اعداد و شمار ابھرتے گئے، کلک، کلک، تصویریں پرنٹ ہو کر باہر نکلتی

رہیں۔ فزکس کے اصول کے مطابق یہ زخم ناقابلِ پیمائش اور ناقابلِ شمار تھے۔ اگلے چیک اپ تک نئے دھبے نمودار ہوجاتے تھے۔ اس نے ہاتھ روک کر مہربان انداز میں میرا گال سہلایا، جیسے کوئی بچے کو بہلانا چاہے۔

''اچھا ہاں، تو آپریشن کے ذریعہ پیٹ سے تھیلی اتار دی جائے گی اور تمھیں مکمل نگرانی میں رکھا جائے گا کہ جسم کی کارکردگی دیکھی جائے۔''

''اچھا''

''غذا میں بہت پرہیز کرنا ہوگا۔ دودھ سے بنی مصنوعات اور بہت سی سبزیاں نہیں کھا سکوگی'' اب اس نے کمپیوٹر سے میرا اسکیورٹی نمبر ہٹا کر معائنے کو ختم کیا۔

''اچھا'' میں نے اطمینان سے کہا، ''ہم تو کھاتے ہی صرف جینے کے لیے ہیں۔''

''اور ذہنی طور پر تیار رہو''، اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا، ''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جسم اس کو برداشت نہ کرپائے اور سارا آپریشن ناکام ہوجائے اور باقی تمام عمر تمھیں پیٹ کے اوپر اس تھیلی کے ساتھ رہنا پڑے۔''

اب میرا رضامندی پر آمادہ ''اچھا اچھا'' کرتے رویے کا دم گھٹنے لگا۔

''اور اگر آپریشن مکمل کامیاب ہوا تو بھی بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ چالیس سے پچاس کے درمیان ٹانکے لگیں گے تمھیں۔ پورے بدن کا مرکزی حصہ ایک بچے کی طرح ہوگا، ذہنی اور جذباتی تبدیلیاں ہوگی، قوتِ برداشت کم ہوگی، چڑچڑا پن آجائے گا، ڈپریشن کا خدشہ ہوگا اور تمھارا ہنستا مسکراتا، بہادر اور باحوصلہ رویہ مغموم بھی ہوسکتا ہے۔ گھریلو زندگی پر اثر پڑسکتا ہے۔ بچے پریشان ہوسکتے ہیں۔''

میں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ میرے ذہن میں اس وقت اباجی، تایا جان، عالیہ اور اُسامہ کے چہرے باری باری ظاہر ہو رہے تھے۔

''میرے بچے؟'' میں نے آہستہ سے جیسے خود سے سوال کیا، ''ان کا کیا ہوگا؟''

''بچوں کو سنبھالنے والا کوئی نہ ہوا تو تمھیں گھریلو مددگار دیا جائے گا۔ صحت کی بحالی کے اس عمل میں کئی مہینے لگ سکتے ہیں۔'' شاید میں سکتے کے عالم میں خاموش بیٹھی رہی تھی۔

''تو اب تمھارا کیا فیصلہ ہے؟'' اس نے کمپیوٹر بند کیا۔

اب زندگی پھر اذیت بھرے ریفرنڈم کے دوراہے پر تھی۔ نرس خاموشی سے میرا چہرہ دیکھتی

رہی، ”تمھیں اپنا فیصلہ بدلنے کی پوری آزادی ہے۔ گھر جا کر سوچ لو۔ اپنے والد سے مشورہ کرلو، پھر فون کر دینا“ اس نے بے حد مہربان لہجے میں کہا۔ ہم دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔

وہ یقین، توکل اور ایمان کو آزماتا آخری لمحہ تھا۔ فیصلے کا پلِ صراط جس کی دھار تلووں سے لے کر تالو تک کاٹنے کی قدرت رکھتی ہے۔ لمحوں میں فیصلہ کرنے کا پُل جس کے نتیجے میں آزمائشوں کے پل سے گزرنا یقینی تھا۔ نجانے کون سی طاقت تھی جس نے ایک لمحے کے لیے بھی میرا ایمان متزلزل نہ ہونے دیا۔ شاید بے روئے اشک کہیں اور گرے ہوں اور زخم کے دھبوں میں اضافہ ہوا ہو۔ بچوں کی نگہداشت کا سوچ کر عجب حزن انگیز خیالات کی یورش ہوگئی۔ وہ تو میری مکمل توجہ اور لاڈ کے عادی ہیں۔

”جس قدر جلد ممکن ہو آپریشن کی تاریخ لے لو“ میں نے میز پر سے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا، ”ابھی دن لمبے ہیں اور روشنی ہے، سو میرے اور بچوں کے لیے آسانی ہوگی۔“

”اچھا“ اب اچھا کہنے کی باری اس کی تھی، ”لیکن تمھیں کسی سے مشورہ کرنے، بچوں کا انتظام کرنے کے لیے وقت چاہیے ہوگا؟“ اس کا تفکر آمیز لہجہ سوالیہ تھا۔

”میرے جرنل میں لکھ دینا کہ مجھے گھریلو کاموں کے لیے امداد نہیں چاہیے۔ وقت میرے بچوں کو بے حد سمجھ دار بنا چکا ہے۔ بچوں کی چچی ان کے ساتھ رہتی ہے اور بچے اس سے بہت مانوس ہیں۔“

”اچھا“ اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ پھر میرے کاغذات پر بچوں کی عمریں دیکھیں اور پروفیشنل انداز کے بجائے خالصتہً زنانہ انداز میں بولی، ”تمھارا بیٹا صرف دو سال کا ہے۔ تم اکیلی کیوں آتی ہو ہسپتال؟“ مریضوں کے شب و روز کی گواہی دیتی نیلی آنکھیں متجسس تھیں۔

”میرے جرنل میں لکھ دینا“ میں نے اس کا سوال سنا ان سنا کر دیا اور کسی تبصرے کا جواب نہ دیا۔ ”اگر ڈاکٹر آئیون برون خود میرا آپریشن کرے تو مجھے اطمینان رہے گا۔ اسے ساری بیماری کی تاریخ معلوم ہے۔“

”اچھا“ اس نے پھر ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ اب میں اس نظر کا جواب دیے بغیر باہر نکل آئی۔ رنگ برنگے راستوں کی نشان دہی کرتے تیروں کا تعاقب کرتے کرتے میں ہسپتال کی معجزاتی دنیا سے باہر نکل آئی اور بس سٹاپ پر کھڑی ہوگئی۔

میں گھر پہنچی۔ ابا جی کا دستی خط میرا منتظر تھا۔ میرے ہچکولے کھاتے دل کو یوں محسوس ہوا

جیسے ابا جی خود آ گئے ہوں۔ روحانی سکون کے ایسے لمحات انسانی شعور کبھی نہیں بھولتا جب ذہنی اذیت اور صد سالہ تنہائی جیسی ہولناک خاموشی میں اچانک کوئی خط اور پیغام الہام کی صورت آپ تک آ پہنچے۔ دل کے غارِ حرا میں تسکین کے فرشتۂ جبریل کی بے آواز چاپ نے پیٹ میں مخفی تمام زخموں پر مرہم رکھ دیا۔ میں نے خط کو یوں ہاتھ لگایا جیسے کوئی دیوارِ کعبہ کو چھونے کی سعی کرے۔

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا جانِ پدر، اللہ کسی انسان کو اس کی وسعت سے زیادہ نہیں آزماتا۔ وہی آپ کو شفا دے گا جس نے آپ کو یہ مرض لگایا ہے۔ آپ اور آپ کے بچے اللہ کی امانت ہیں، سو پریشانی کس بات کی؟ آپ پر شکر واجب ہے کہ آپ ایسے ملک میں بیٹھی ہیں جہاں ان امراض کا علاج موجود ہے۔ شکر گزاری کا فقدان کسی بھی آزمائش کو عذاب بنا دیتا ہے۔''

میں نے بارہا اس روشن جادوئی تحریر کو پڑھا۔ بقولِ غالب، خط کو چوما، آنکھوں سے لگایا اور تعویذ بنا کر تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ شکر گزاری اور دکھ میں سے سکھ کا پہلو نکال لینا ابا جی کی شخصیت کا سب سے نورانی پہلو تھا۔

شاید یہی نکتہ میرے ذہن میں تھا جب میں نے ہسپتال میں بمشکل سترہ سال کی ایک ڈینش بچی کو دیکھا جس کا آپریشن ناکام ہو چکا تھا۔ اس کے پیٹ پر تھیلی اور بازو پر ڈرپ لگی تھی۔ اب یہی اس کی زندگی تھی جو اسے محدود دائرہ میں گزارنی تھی۔ اس کے لیے تعلیمی سہولیات اور باقی ضروریات کا بندوبست کیا جا رہا تھا۔

ایک مریض کا وزن اور عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کے ٹانکے جڑ نہیں رہے تھے اور وہ کئی ہفتوں سے بستر پر پڑا تھا۔ مجھے واقعی نہ صرف عبرت حاصل ہوئی بلکہ ابا جی کی بات بھی یاد آئی کہ نیچے دیکھو گی تو احساسِ تشکر ہر موئے تن سے پھوٹے گا۔ مسلسل بیماری سے لڑنا اور لگاتار چار دیواروں کو دیکھتے رہنا مجھے راس نہیں آ رہا تھا۔ جواباً وہ دیواریں بھی مجھے دیکھ دیکھ کر بیزار ہو چکی ہوں گی۔

ابا جی نے مجھے اتنے بڑے بڑے آپریشنوں کے بعد بھی ہمت نہیں ہارنے دی، ''شکوہ کس بات کا بھئی؟ زندگی کی دو دہائیاں آپ نے بہترین صحت اور مستعد زندگی کے گزارے، اتنا شکرانہ ادا کیا جتنا لازم تھا۔ اب اگر بیماری آ ہی گئی ہے تو اس کے ساتھ اپنے اوپر نعمتیں گنو۔ اللہ نے اولاد سے نوازا ہے۔ بہترین ملک میں ہو جہاں صحت کی تمام تر سہولیات موجود ہیں۔''

''ہوسکتا ہے وہاں نہ ہوتی تو میری بیٹی کو پیٹ کی یہ نامراد بیماری لگتی ہی نہ'' امی جی

پریشانی سے کہتیں۔

''آپ کی بیٹی کو پیٹ کا کوئی مسئلہ نہیں، الحمدللہ۔ یہ بڑی آنت کا عارضہ ہے۔ اسے تو ہر صورت نکلوانا ہوگا۔ ویسے بھی آپ کی بیٹی شکر گزاری سیکھ لے، پریشانی کیا ہے اسے؟ مصیبت میں پریشان ہونا اس سے بڑی مصیبت ہے۔''

''مجھے اپنی تو کوئی فکر نہیں لیکن میرے بچے ابا جی؟ ظاہر ہے ان کی فکر لگی رہتی ہے۔'' میں نے منمناتی ہوئی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''بچے اللہ کی دَین ہیں اور وہی ان کا پالنہار ہے۔ یاد رکھیں جن کے بچے جتنے غیر معمولی حالات میں پلتے ہیں، ان کی صلاحیتیں عام لوگوں سے بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ لہٰذا فکر مند ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔''

ابا جی نے نہ تو خود عام لوگوں کی طرح میری صحت کا واویلا مچایا نہ کبھی امی جی کو منفی بات کہنے دی۔ مجھے بھی حکم ہوتا، ''چلو اٹھو، اردو کمپیوٹر پر کام کرو، ارے آپ لوگوں کو تو گود میں رکھ کر کام کرنے والے کمپیوٹر مہیا ہیں (لیپ ٹاپ)۔ اب بیمار ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہر کام چھوڑ دیا جائے۔ یاد رکھیں، پیٹ کا سسٹم خراب ہے، خدانخواستہ دماغ خراب نہیں۔ پیٹ بھی آپ کی حساسیت کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔ بستر پر لیٹ کر وفات پانے کا انتظار کرنے کے بجائے چلتے پھرتے ہنستے کھیلتے اس آخری رہگزر پر چلو جس پر سب کو جانا ہے۔''

••

''پیٹ کی بیماری تمھارے مزاج سے لگا نہیں کھاتی۔ یہ تو زیادہ تو جلنے کڑھنے والے لوگوں کو ہوتی ہے۔'' پھر شاید کوئی خیال آیا تو خاموش ہوگئے۔ چچا جان شریف کی بات یاد آگئی کہ یہ بیماری ان کو بھی ہوتی ہے جو محسوس کرتے ہیں اور ساری توانائی اس بات پر لگا دیتے ہیں کہ دنیا پر ظاہر نہ ہو پائے کہ وہ مغموم ہیں یا زندگی کا ایک بڑا جوا ہار رہے ہیں۔ سب کچھ داؤ پر لگا کر بھی مطمئن رہتے ہیں۔

''بیٹا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے، ''یہ گمان مت کرو کہ تم ایک چھوٹے سے جرثومے ہو۔ تمھارے اندر ایک عالمِ اکبر پوشیدہ ہے اور تم وجود کی آشکار کتاب ہو۔''

دَوَاؤكَ فِيكَ وَ مَا تبصِر

وَ دَاؤكَ مِنْكَ وَ مَا تَشْعر

أَتَزعمُ أَنَّكَ جرْمٌ صَغِيرٌ
وَ فِيكَ انْطوی الْعَالَمُ الْأَكْبَرُ
فَأَنْتَ الْكِتَاب الْمبِين الَّذِی
بِأَحْرفِهِ يَظْهَر الْمضْمَر

انسانی جسم کے اندر قدرت نے تحیر کا ایک جہان آباد کر رکھا ہے۔ بدن اپنی شکست و ریخت کی مرمت خود ہی کرتا ہے اور جب کوئی نا قابلِ تلافی نقصان ہوجائے تو اس کمی کے ساتھ جینا سیکھ لیتا ہے۔ سب اعضائے جسمانی ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ اپنے اوپر اللہ کے احسانات گنو۔ اللہ جب کسی کو آزمائشوں میں ڈالتا ہے تو وہ بلا مقصد نہیں ہوتیں۔ وہ یقینی طور پر کسی بڑے اور اہم کام کے لیے تیاری کا ایک مرحلہ ہیں۔

بے خبر اک راز کی دنیا ہے تو
شانِ حق کی تجھ سے ہوتی ہے نمو
تیری رگ رگ میں تجلی ہے نہاں
تو سراپا ہے نشانِ بے نشاں
تیری ہستی ہے ظہورِ حسنِ ذات
تو حقیقت میں ہے نورِ کائنات
تجھ میں شنوا اور بینا ہے وہی
شعر کے پردہ میں گویا ہے وہی

جب مجھے تھکن زیادہ ہونے لگی اور پیدل سیر کرنے میں موسمِ سرما کی برف باری مانع ہوئی تو میری ڈاکٹر نے کہا ”بی بی سوئمنگ شروع کر دو۔ اس ورزش کی وجہ سے انسانی جسم کو تمام تر فوائد حاصل ہوجاتے ہیں۔“ میں نے ابا جی کو ڈاکٹر کی تجویز کے بارے میں بتایا تو فوراً بولے، ”واہ، واہ! بھئی آپ کی معالج بہت قابل خاتون ہیں۔ پانی جیسی صحت بخش چیز تو شاید کوئی اور ہے ہی نہیں۔ فوراً شروع کر دو۔“

ڈنمارک میں ایک منظم گروپ کی صورت میں کوئی بھی تنظیم بنانا بہت آسان ہے۔ مسلمان خواتین نے اپنا ایک گروپ بنا رکھا تھا جن کے لیے ہفتے میں دو دن مختص کر دیے گئے جہاں صرف خواتین ہی تیراکی کے لیے داخل ہوسکتی تھیں۔ لائف گارڈ اور استاد و باقی عملہ بھی خواتین پر مشتمل ہوتا

تھا۔ مجھے تیراکی سکھانے والی ڈینش استاد دھان پان سی، اسی برس کی نسبتۂ پستہ قد خاتون تھیں۔

''ادھر آؤ حسین لڑکی'' اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے کاغذ پر میرا نام اور ڈاکٹر کی ہدایات دیکھیں، پھر دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑا ''یہ جو بیماری کا ہوّا ہے ناں، اسے پانی بہا کر لے جاتا ہے۔ چلو یہ دیکھو۔'' اس نے ذرا سے بلند تختے پر کھڑے ہوکر دونوں ہاتھ سر سے بلند کیے اور پھر مچھلی کی طرح جست لگائی اور دھڑام سے پانی میں کود گئی۔ میری روح فنا ہوگئی۔ یہ تختہ ہے یا دھڑن تختہ؟ میں نے دیوار کے ساتھ لگے اس جھولتے ہوئے تختے کو ہراساں نظروں سے دیکھا۔ اب مجھے 'چھٹے چک دے' کی سمجھ بھی آ گئی۔ اس بظاہر بے ضرر نظر آنے والے تختے پر میرا تختہ تو ہوسکتا ہے لیکن اس پر سے پانی میں کود کر ڈوبنا اور ڈوب کر ابھرنا میرے لیے ناممکن ہے۔

میں نے اس خوش باش خاتون سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ رضا کارانہ کئی کام کرتی تھی۔ کبھی وہ اپنی جوانی کے زمانے کے ڈنمارک کی کہانیاں سناتی کہ کیسے ''سکولوں میں لڑکیوں اور لڑکوں کو الگ الگ رکھا جاتا تھا۔ استانیاں پوری نظر رکھتیں کہ دونوں اصناف کو آپس میں قول وقرار تو دور کی بات، بات چیت کا موقع بھی نہ مل جائے۔ ایک زمیندار کی بیٹی کی شادی دوسرے جاگیردار سے ہی ہو تو اچھا ہے۔'' میں اس کی باتیں سن کر ہنستی۔

''اس زمانے میں جب لڑکیاں پہلی دفعہ ڈیٹ پر جاتیں تو مائیں ان کے پرس میں بیس کرونر رکھ دیتیں اور پھر سرگوشی کر دیتیں، ''لڑکا پسند نہ آئے، یا کوئی بھی ناپسندیدہ حرکت کرے تو فوراً اٹھ کر چلی آنا، کسی ناپسندیدہ بات پر کوئی سمجھوتہ نہ کرنا۔''

وہ ہنس ہنس کر بتاتی، ''میری ماں کہتی تھی کہ یہ مرد بنیادی طور پر شکاری ہوتا ہے، آسانی سے ہاتھ آنے والے شکار سے اس کی پلٹنا، جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا، قسم کی فطرت کی تسکین نہیں ہوتی۔ وہ گھات لگا کر بیٹھنا، دام بچھانا اور شکار کا تعاقب کرنا پسند کرتا ہے۔ کوشش کرو کہ زندگی میں ایک ہی بوائے فرینڈ ہو۔ شکاری کو مصروف رکھنا سیکھو گی تو وہ یہاں وہاں منہ نہیں مارے گا۔'' پھر میری تعجب سے پھٹی آنکھوں کو دیکھ کر ہنستی۔

''ہمارے یہاں تو ماں شادی شدہ بچی کو بھی ہدایات اور تربیت دینے کی اہل نہیں سوائے اس کے کہ ساس سسر سے توڑ کر میاں کو کس طرح مٹھی میں رکھنا ہے۔ انھیں تو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کسی بھی انسان کی فطرت میں زیادہ دیر تک مٹھی میں بند رہنا نہیں ہے۔''

''اچھا تم مجھے بتاؤ تمھارے ملک میں لوگ پانی سے ڈرتے تو نہیں، تیراکی ہوتی ہے یا

نہیں؟'' وہ مجھے تجسس سے پوچھتی۔ میں نے اسے بتایا کہ ''پانی کی ہمراہی میرے لیے کوئی اجنبی رفاقت نہیں لیکن تیراکی سیکھنا ہوگی۔'' وہ دلچسپی سے میری باتیں سنتی۔

''اچھا یہ بتاؤ وہاں لڑکیاں کیسے ملاقات کرتی ہیں شادی کے امیدوار سے؟''

پہلے تو مجھے بے قابو ہنسی کو روکنا پڑا۔ پھر میں نے اسے مذہب اور کلچر کا فرق بتایا۔ رومیو جولیٹ کی طرح سوہنی مہینوال کی کہانی سنائی۔

''اچھا، لیکن اگر پھر بھی کوئی لڑکی ملاقات کرنے جائے تو کیا ہوتا ہے؟'' اس نے سوال بدل دیا۔

''پھر اگلے دن اس کی لاش پانی سے ملتی ہے، جس میں تمھارے جیسی رضا کارانہ، ماہر چھڑاپی کا کوئی تعلق یا کمال نہیں ہوتا۔ گلے کے گرد رسی لپٹی ہوتی ہے یا زہر خورانی سے بدن نیلا پڑا ہوتا ہے۔''

ہم دونوں ہنستیں ''اگرچہ نہر والے پل تے بلانا، انتظار کرنا، ناراض ہونا، گن گن کر بدلے لینا، سب گیتوں میں موجود ہے، خلقت پاگل ہوکر یہ گانے سنتی ہے، لیکن ان پر بچی کا عمل برداشت نہیں کرتی۔'' ہم دونوں درمیانی وقفوں میں خوب گپ شپ لگاتیں۔ ایک مرتبہ میں نے اسے دیسی کھانا کھلانے کے لیے گھر مدعو کیا، تصاویر دکھائیں۔ ''نہر کے کنارے سورج ڈوبتے دیکھو اور جہلم کے دریا سے ابھرتے ہوئے اس کی طلائی شعاعوں کا رقص دیکھو تو زندگی کا حسن آشکار ہو جائے۔''

''تم تو پانی کے کنارے پلی بڑھی ہو اور سمندر کے کنارے رہتی ہو۔ پانی بہت بڑا دوست ہے۔ اس سے باتیں کریں تو یاد رکھتا ہے۔'' وہ مجھے بڑے یقین سے بتاتی۔

''اچھا'' پھر میں نے سمندر سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ ''شریک غم سمندر ہے'' نظم شاید اسی گفت وشنید کا نتیجہ تھی۔

ڈنمارک میں غیر ملکی خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے بے شمار سہولیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انھیں گھروں سے نکالنے اور جسمانی طور پر فعال کرنے میں تیراکی کی رغبت دلائی جاتی ہے۔ ان کی طرزِ زندگی کے احترام میں ان کو خاتون انسٹرکٹر اور خاتون لائف گارڈ دی جاتی ہے۔ بند گھروں میں ٹیلیوژن کے آگے بیٹھ کر زندگی بسر کرنا بہت منفی انداز ہے۔ شام سات بجے سے نو بجے تک کے تیراکی پروگرام میں بہت کم لوگ آتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں اکیلی ہی ہوتی۔ رنگ برنگی روشنیوں میں گرم پانی سے بھاپ اٹھتی۔ سکون بخش موسیقی کی لہریں پانی کی لہروں میں مدغم ہو

جاتیں۔ پانی پر بالکل ساکت لیٹنے کا طریقہ بالخصوص تجویز کیا جاتا جس سے صرف جسم ہی نہیں دل و دماغ بھی ہلکا پھلکا ہو جاتا۔

میں نے ابا جی کو بتایا کہ اب میں نے سوئمنگ سیکھ لی ہے۔ میرے گھر سے چار منٹ کے فاصلے پر سوئمنگ ہال تھا۔ میری ڈاکٹر نے اسے تجویز کیا تھا لہٰذا وہاں میرا مہینے کا کارڈ بالکل مفت تھا تاکہ میں زیادہ سے زیادہ استعمال کروں۔ گرم پانی کی تیراکی کی بھی مجھے خصوصی اجازت دی گئی ہے تاکہ جوڑوں کے درد کی پیش بندی ہو سکے۔

''چلو اچھا ہوا، تیراکی سیکھ لی'' ہمارے برادرِ خورد سنجیدگی سے بولے۔ ''اب جسے چاہیں، غرق کر دیں۔''

''بات یہ ہے منے،'' میں نے بڑے آرام سے اسے بتایا، ''غرق تو میں تیراکی سیکھے بغیر بھی کامیابی سے کرتی رہی ہوں۔ اب شاید غرق ہونے والوں کو بچانے کی سبیل ہو سکے، اگرچہ فائدہ کوئی نہیں کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں۔''

ابا جی ہنسنے لگے، ''ہاں، کچھ بدبخت تو اپنے ساتھ سارا سفینہ لے کر ڈوب جاتے ہیں۔ اسی لیے پرانے زمانے میں کشتی ڈوبنے لگتی تو گناہ گاروں کو کشتی سے اتارا جاتا۔ اچھا یہ بتاؤ اب درد کش ادویات کی ضرورت تو نہیں پڑتی ناں؟'' ابا جی نے پوچھا، ''آپ کو صد ہزار بار شکر گزار ہونا چاہیے کہ آپ کو ایسی سہولیات حاصل ہیں۔ ان کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔'' پھر تفصیلات پوچھتے، ''گرم پانی کا درجہ حرارت کتنا ہے؟ کتنے فیصد لوگوں کو تیراکی آتی ہے۔'' تب میں نے غور کیا کہ تیراکی اور سائیکلنگ تو ڈینش نظامِ تعلیم کا حصہ ہے۔ ابتدائی جماعتوں سے ہی ہفتے میں ایک دن پوری جماعت سوئمنگ ہال جاتی ہے۔

••

''میں آپ کے لیے خود کھانا بناؤں گا'' ابا جی بولے، ''آپریشن کے بعد بہت ضروری ہے کہ آپ کو سادہ غذا دی جائے۔ روز صبح ابا جی خود اپنی نگرانی میں کسی خاص قسم کا انڈہ بنواتے۔ مسلسل دو ہفتے تک مجھے ادرک اور اجوائن کے ساتھ کلونجی والا انڈہ کھانا پڑا۔

''ابا جی! میرا دل نہیں چاہ رہا۔۔۔ اس کا ذائقہ کچھ عجیب سا ہے۔''

میں اعتراض کرتی لیکن وہ ہاتھ میں پلیٹ لیے اصرار کرتے۔

''بیٹا دوا سمجھ کر کھالو۔۔۔ شاباش ایک پلیٹ ہی تو ہے۔''

بادلِ نخواستہ میں چمچ بھر کر کھاتی رہتی۔ آئرن کی کمی کے لیے الگ سے دواخانے میں بنائے گئے املتاس کی پھلیوں کے سیرپ دیے جاتے۔ اور تو اور، واپسی پر میرے سامان میں نجانے کون کون سے مربے اور خمیرے بھرے ہوئے ہوتے۔ آملے کا مربہ، ہرڑ کا مربہ اور نجانے کیا کیا سوغاتیں، جن پر ابا جی کے ہاتھ سے لکھی ہدایات بھی ہوا کرتی تھیں۔

جب میں واپس آنے لگی تو ابا جی نے پوچھا، ''بیٹا، اب تو آپ کو چکر نہیں آتے ناں؟'' میں نے بتایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اب سر درد اور چکر نہیں ہیں جیسے پہلے تھے۔ میری طرف دیکھ کر خفیف سا مسکرائے، حالانکہ ان کی عادت بہت کھل کر ہنسنے کی تھی۔ ان کی حسِ ظرافت بھی بے پناہ تھی اور خوش خلقی وخوش مزاجی کے ساتھ ہنستے مسکراتے رہنا بھی عادت میں شامل تھا۔ ''آپ کو پتہ ہے آپ کا ناشتہ کس چیز کا تھا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے دیکھا پھر کہا، ''انڈہ تھا آپ کے رنگ برنگے مسالوں میں؟''

''ہاں'' وہ بڑے آرام سے بولے، ''اور مغز تھا۔ یعنی بھیجا کھاتی رہی ہو۔''

''آغ غ غ ہائے، اف ابا جی! یہ کیا کھلا دیا؟'' میری طبیعت عجیب سی متلانے لگی۔ میں بکرے کا مغز کھاتی رہی ہوں؟ یہ سوچ کر ہی میرا منہ بن گیا۔

••

اگرچہ صحت کے ان مسائل کے ساتھ نبرد آزما رہنے کی عادت تو ہوگئی تھی لیکن اس کے اثرت میں ڈپریشن سب سے بڑا عذاب تھا جس کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھے یاد ہے کہ جب مجھے ہوش آیا تو ایک نرس میرے بستر کے ساتھ کرسی رکھ کر بیٹھی رہتی۔ مجھے بہت کوفت ہوئی میں نے چڑ کر پوچھا تم میرے کمرے سے نکلتی کیوں نہیں ہو۔

بہت آرام سے میرا ہاتھ پکڑ کر بولی ''اتنی طویل سرجری کے بعد اکثر ڈپریشن کا حملہ ہوتا ہے، میں تمھارے پاس رہوں گی اگر تمھیں کوئی مسئلہ ہوا تو تم پریشان نہ ہو۔''

اس وقت میں نرس کو بہت ناراض ہوئی اور اسے کمرے سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ میری نیند کے دوران بھی بیٹھی کسی ناگہانی حملے کا انتظار کرتی رہتی۔

''کم بخت کہیں کی،'' اگلے دن میں نے اسے اپنے بستر کے پاس براجمان پایا تو مزید غصہ آیا لیکن اس شام ڈاکٹرز کے تجربے کے مطابق مجھ پر شدید ڈپریشن کا حملہ ہوا، میں نے دوا لینے سے اور کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور بچوں کی طرح ایک ہی ضد پکڑ لی کہ مجھے گھر جانا ہے، پاکستان

بھیج دو میں اپنے والد کے پاس جانا چاہتی ہوں۔

خدا خدا کر کے وہ دن تو گزر ہی گئے لیکن اچھی بھلی زندگی میں ایک بے معنی سی کوفت شامل ہوگئی۔ بچوں کو تعلیمی اداروں میں بھیج کر اور گھریلو مصروفیات کا چرخہ کاتنے کے بعد طبیعت پژمردہ ہونے لگتی۔ میری ڈاکٹر مارگریٹ لونسٹن نے ایک دن مجھے بچپن اور تعلیم کے بارے میں پوچھا۔ جب اسے علم ہوا کہ میرے پاس تو ایم اے بی ایڈ کی ڈگری ہے اور ہمیشہ میں ٹاپ کرتی رہی تو بے حد حیران ہوئی۔ پھر اس کے سوالات شروع ہوئے کہ گھر سے کیوں نہیں نکلتی۔ کچھ پڑھو یا کام کرو تا کہ بیماری کا احساس طویل نہ ہو۔

پھر اس مسیحا نے میرے جرنل میں لکھا کہ مریضہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور اس کا دماغ ضرورت سے زیادہ بیدار رہتا ہے۔ صرف گھریلو کام اور بچوں کی دیکھ بھال، مریضہ کے ذہن کی ضروریات کو پورا نہیں کرتیں۔ اسے ملازمت کی ضرورت ہے۔

اگلے دن میں نے اپنی اسناد محکمہ تعلیم کوپن ہیگن (ڈنمارک) کو بھجوا دیں۔ دوسرے دن مجھے فون آ گیا اور میں نے چند ہفتوں کے بعد ڈینش استاد کے ساتھ معاون استاد کی حیثیت سے جز وقتی ملازمت کی ابتدا کر دی۔

میرے لیے یہ ملازمت شاید مچھلی کا کنوئیں سے نکل کر واپس دریا کی طرف جانا تھا یا شاید پرندے کا ہوا میں اڑنا یا تتلی کا پھول پر بیٹھنا۔ مسلسل بیماری اور ڈپریشن کو تو خیر باد کہنا ہی تھا، لیکن سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اُسامہ کا سکول بھی اسی دوران شروع ہوا۔ ہم دونوں ماں بیٹا اب ہم جماعت ہو گئے۔ بچوں کے تمام گیت، کہانیاں، سکول کا تعلیمی نظام، والدین اور اساتذہ کی میٹنگز، اساتذہ کی توقعات اور والدین کی ذمہ داریاں، دونوں کردار میں نے بیک وقت کامیابی سے ادا کرنا سیکھ لیے۔ سب سے اہم بات یہ خودشناسی تھی کہ میرا خمیر اللہ نے شاید درس و تدریس کی مٹی سے اٹھایا ہے اور ایک طویل خارزار سے گزار کر واپس اس نخلستان میں بھیج دیا ہے۔ میں نے تمام تر گھریلو ذمہ داریوں کے باوجود اس ملازمت کو اپنے لیے ایک سنگِ میل تصور کیا اور شوق سے سکول جانے والے بچے کی طرح پڑھائی کا آغاز کر دیا۔

••

کلام سے طعام تک، علم کی حکومت ہے

ہم نے غذائیت کا مضمون ایک بہت بڑی غلط فہمی میں منتخب کر لیا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ ڈینش نظام میں ایشیائی کھانے متعارف کرائیں گے اور ان پر مضامین لکھ کر آسانی سے چار میں سے ایک مضمون بغیر ہینگ پھٹکڑی لگے پاس کرلیں گے۔ ابتدا کے چند لیکچرز میں ہم بچوں کے امتحانات کی وجہ سے شامل نہیں ہوئے۔ ہفتے بعد جب ہم خراماں خراماں جماعت میں داخل ہوئے تو وہاں طالبات سے زیادہ طالبعلم جمع تھے۔ ڈنمارک اور بیشتر یورپین ممالک کے تعلیمی نظام میں ساری جماعت کو بنیادی امورِ خانہ داری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ برقی تختہ سیاہ پر مختلف پنیروں کی اقسام دکھائی جا رہی تھیں۔ چند دودھ کے ڈبے بے ترتیب پڑے تھے۔ خیر، اپنی نشست پر تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد پڑھائی کی ابتدا ہوئی۔ 20 صفحات کا ایک پمفلٹ دیا گیا جس پر بیکٹریا کی اقسام اور ان سے پیدا ہونے والی بیماریوں کے نام درج تھے۔ دودھ، دہی، پنیر، گوشت کتنی دیر فریج سے باہر رہ سکتا ہے؟ فریز کیسے کیا جاسکتا ہے؟ بیکٹیریا سے بچاؤ کے اقدامات، دودھ کو جراثیم سے محفوظ رکھنا کیسے ممکن ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکچر شروع ہوا تو ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔

پاسچرائزڈ ملک کیا ہے اور اس کی تاریخ کیا ہے، تکنیک کیا ہے؟

دودھ سے دہی اور پنیر بناتے وقت کیا کیمیائی عمل واقع ہوتا ہے؟ یعنی کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک۔ پنیر کی اقسام، غذائیں کس ترکیب کے ساتھ بنائی جائیں کہ کھانے کا ذائقہ بھی برقرار رہے اور اس میں کیلوریز بھی کم نہ ہوں؟ صحت مند ماحول میں کھانا کیسے بنایا جائے؟ آخر میں اپنی تراکیب متعارف کرائیں اور اس کی کیلوریز کو کمپیوٹر کے پروگرام سے گنیں۔ پھر عام ڈش کی کیلوریز اور تیاری کے عمل اور غذائیت کے فرق کو بیان کریں۔ دو سال کا نصاب دیا گیا جسے

پڑھ کر ہمارے ہاتھوں سے رہے سہے طوطے بھی پرواز کر گئے۔ گروپ ورک، فیلڈ ورک، گوشت پر خصوصی تعلیم، مسلمان اور یہودی مذبوح کھانا اور اس کا پس منظر، ہندو ازم، عیسائیت اور غذائی احکامات، مذاہبِ عالم اور غذائی اجناس، ثقافت اور غذائی عادات، وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد ہفتہ وار پروجیکٹ کی باری آئی۔ ایک ہفتے کا موضوع اور تدریس کی تکنیک پھر ہفتے کے آخر میں تمام طالبعلم انفرادی پیشکش اور لیکچر دیں گے۔ آخری دو گھنٹے کچن استعمال کریں اور جو ڈش بنائیں اس کی تفصیلات لکھتے جائیں۔ ہمارا پلاؤ، سموسوں، کھیر اور رس ملائی کے ذریعے استاد کو مرعوب کرنے کا خواب خاک میں مل چکا تھا۔ بادلِ نخواستہ ایک ڈینش طالبعلم کے ساتھ گروپ بنایا جس نے کالج کے زمانے میں بی ایس سی کی تھی اور بعد میں ہماری طرح درس و تدریس کا یونیورسٹی کالج منتخب کیا تھا۔

''پریشان کیوں ہو؟'' اس نے مزے سے بسکٹ نکال کر منہ میں ڈالا اور ڈبہ ہماری طرف بڑھایا۔

ہم نے مختصراً بتایا کہ ہم کس خوش فہمی کے تحت ادھر آئے تھے اور اب انتہائی پریشان ہیں کہ ہمارا کیا بنے گا۔ مضمون تبدیل کریں یا استاد سے بات کریں؟

''کچھ مشکل نہیں ہے'' اس نے بدستور منہ چلاتے ہوئے کہا، ''مجھے اچھا کھانا پکانا نہیں آتا اور تم تھیوری کے لیے پریشان ہو! سیدھی سی بات کہ تم پریکٹیکل کی ڈش بنانا اور میں تھیوری کا سارا کام کر دوں گا۔ نوٹس ای میل میں بھیج دوں گا، پڑھو گی تو فوراً سمجھ آجائے گی۔''

''گھر آکر حسبِ معمول ابا جی کو فون کھڑکایا، ''ابا جی! یہ تو بہت مشکل کام ہے۔ زندگی میں اتنی فزکس، کیمسٹری اور بائیولوجی میں تو نہیں پڑھنے کی۔''

''مشکل کیا ہے بیٹا؟ اسے چیلنج سمجھ کر قبول کرو۔ میں اردو میں بھی کچھ کتب بھیجنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

دورانِ تعلیم مختلف اور نئے موضوعات پر چار صفحات کا مضمون لکھنا ہوتا تھا یا زبانی بات چیت کی جاتی تھی۔ غذائی اجناس کے حوالے سے بہترین پروجیکٹ وہی سمجھا جاتا تھا جو تاریخ، ثقافت، اور موضوع کی افادیت کو مانندِ زنجیر باہم مربوط رکھ سکے۔ عموماً ڈینش طلبہ دو یا تین کا گروپ بنا کر کام کیا کرتے جس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ باہمی رابطے اور افہام و تفہیم کی تربیت بھی ہو جاتی تھی جو مستقبل میں ملازمتوں کے دوران ایک اضافی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ اس پروجیکٹ کے

دوران یہ گروپ آپس میں گھروں میں بھی اپنی میٹنگ رکھتے ہیں۔ پہلے سال کے اختتام پر میں نے ابا جی سے کہا،'' آپ کو ہی شوق تھا کہ میں اس طویل تعلیم کے بحرِ ذخار میں قدم رکھوں۔ اب بتایئے کوئی ایسا موضوع جس میں جدت، ندرت اور افادیت سب شامل ہوں اور اس کی معلومات بھی لوگوں کے لیے نئی ہوں۔''

''بالکل۔ سوچتے ہیں ایسا پروجیکٹ'' انھوں نے حسبِ معمول بشاشت سے کہا۔

ابا جی کی ایک بہت بڑی خوبی تھی کہ وہ ہر مسئلے کو بہت مثبت انداز میں سوچتے تھے۔ ''نہیں۔۔۔ مشکل ہے۔۔۔ ناممکن ہے'' جیسے الفاظ پر ان کا یقین کم ہی تھا۔ آج میں پیچھے مڑ کر دیکھوں تو مجھے اپنی زندگی کی ہر کامیابی کے لیے یہی روشن فکر اور مثبت رویہ نظر آتا ہے ورنہ یہ وہی طویل تعلیم تھی جو میرے ساتھ کئی لوگوں نے شروع کی اور راستے میں ادھوری چھوڑ دی۔ لیکن مجھے بچوں کی ذمہ داری اور صحت کے مسائل کے باوجود ابا جی نے ہتھیار نہیں ڈالنے دیے۔

''مشکل کیا ہے جانِ پدر؟ ہر کتاب آپ کو میسر، مواد تک رسائی، دنیا کی بہترین یونیورسٹی، کثیر الثقافتی ماحول، سب کچھ تو آپ کو میسر ہے۔ اب ایک ہی راگ تو نہ الاپو۔ گھڑی سامنے رکھنے کی عادت ڈالو اور شام کو زیادہ نہیں بس ایک گھنٹہ اس پر کام کرلو۔ شاباش۔ ہمارا زمانہ تو ہے نہیں کہ کتابوں کے لیے جوتے چٹخاتے پھرو۔ آپ کو تو کتب خانے والے بھی کتابیں گھر بھجوا دیتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر معلومات کے ذخیرے اور حوالہ جات صحت کے ساتھ ملنا تو اب بازیچۂ اطفال ہے۔ مسئلہ کیا ہے؟'' انھوں نے اپنا تکیہ کلام دوہرایا۔

''اب ناشکری تو نہ کرو'' امی جی نے فون پکڑ کر اپنی موجودگی کا احساس دلانا ضروری سمجھا۔

اس طویل خطبے اور 1940 کی امثال سے بچنے کے لیے خیریت اسی میں تھی کہ ان کی تائید کر دی جائے۔ امی جی ابتدا میں تو میرے اس تعلیم میں داخلہ لینے کی شدید مخالف تھیں۔ انھیں میرے فرائض اور ذمہ داریوں کی بھرمار کا بخوبی اندازہ تھا۔ وہ پریشان ہو کر کہتیں کہ میری بیٹی کی زندگی تو پہیہ بن جائے گی۔ لیکن ابا جی نے ہمیشہ یہی کہا،'' بیٹا شروع تو کریں، اگر نہ ہو سکا تو ملتوی کر دیں۔ آپ ایسے ملک میں بیٹھی ہیں جو امکانات کی سرزمین ہے۔ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آئے گا۔ بھئی جوتا تو پہنو۔ باہر نکلو گی تو راستے ملیں گے ناں؟ اب گھر میں تو شاہراہیں بننے سے رہیں۔''

داخلے کے لیے تین گھنٹے کا امتحان ضروری تھا۔ یہ تعلیم غیر ملکیوں کے لیے عموماً پانچ برس

کی تھی۔ ایک اضافی سال ڈینش زبان، ادب اور ثقافت سے متعارف کرانے کے لیے پڑھنا پڑتا۔ خیر، ابا جی بھی مصر رہے کہ بی بی امتحان تو دو۔ مارے باندھے تین گھنٹے کا کمپیوٹر پر تحریری امتحان دیا۔ دو ہفتے بعد خط آ گیا کہ آپ کو ڈینش طلبہ و طالبات کے مساوی نظامِ تعلیم کے لیے منتخب کرلیا گیا ہے۔ آپ کو پہلا سال پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ نئے تعلیمی سال میں آپ کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ مجھ پر تو شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔

ابا جی نے سنا تو آرام سے بولے، ''اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ کبھی محنت بھی رائیگاں ہوئی ہے؟''

خیر ہم بات کر رہے تھے ہوم اکنامکس پروجیکٹ کی۔ چند دن کے بعد ابا جی نے فون کیا اور جو بے مثال موضوع منتخب کر کے دیا اس نے خود مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ موضوع تھا: 'زیتون کا تیل، تاریخ، تحقیق واستعمال اور دستر خوان میں اس کا استعمال کیسے کیا جائے'۔ ابتدائی مختصر نکات بتائے: قرنوں پرانی تاریخ میں اس تیل کا ذکر، مذاہبِ عالم سے پیوستگی، یہودیت میں مذہبی رسوم میں استعمال، اسرائیلی گھرانوں میں اس کی اہمیت، بائبل سے حوالے، قرآن میں تذکرہ، غذائیت کے ساتھ افزائشِ حسن اور جلد و بالوں کے تحفظ میں اس کا کردار، تحقیق، موجودہ دور کی جدید تحقیق، پکانے کے لیے اس کا استعمال کیوں بہتر ہے، فزکس اور کیمیائی تبدیلیاں کیسے رونما ہوتی ہیں، عام تیل کے ساتھ موازنہ اور پھر کس درجۂ حرارت پر کیا تغیرات ہوتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ہماری معلمہ جو کافی معمر تھیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد اضافی کام کے طور پر تدریسی خدمات انجام دے رہی تھیں، بہت حیران ہوئیں۔ انھوں نے مزید رہنمائی کی۔ جدید تحقیقات اور عالمی کانفرنسوں کا مواد دیا۔ میرے ساتھ ایک اور طالبہ شامل ہوگئی جس کا تعلق ترکی سے تھا۔ ہم نے عام سورج مکھی کے تیل اور زیتون کے تیل سے ایک ہی جیسے پکوان بنائے اور پھر ان کی غذائی خصوصیات کا جائزہ پیش کیا۔ سب سے زیادہ داد تاریخی و مذہبی حوالوں کو ملی۔

اسرائیلی حوالے کی مشہور ترین آیت کے طور پر مشہور مسیحی شاگرد یعقوب نے لکھا، ''اگر تم میں کوئی بیمار ہو تو کلیسا کے بزرگوں کو بلائے اور وہ ''یہوواہ'' کے نام سے اس کو تیل (مراد زیتون کا تیل) مل کر اس کے لیے دعا کریں۔ جو دعا ایمان کے ساتھ ہوگی اس کے باعث بیمار بچ جائے گا اور ''یہوواہ'' اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔'' ظاہر ہے اسلامی نقطۂ نظر سے ''والتین والزیتون'' کا قرآنی حوالہ بھی شامل تھا۔ ادب میں اس کی مثال ملٹن کے حوالے سے موجود تھی۔

See there the olive grove of Academe,
Plato's retirement, where the Attic bird
Trills her thick-warbled notes the summer long.
Milton—Paradise Regained. Bk. IV. L. 244.

پروجیکٹ کے سرورق پر میں نے زیتون کی ڈالی لگائی جو امن و آشتی کی آفاقی علامت ہے۔ہم نے تیل کو موجودہ آلودگی کے دور میں کیمیائی مادوں سے بنے حسن و آرائش کے سامان سے وابستہ کرتے ہوئے کچھ ایشیائی فیس ماسک بھی پیش کیے جس پر خواتین واقعی عش عش کر اٹھیں۔ پھر فرانس میں کریموں کی وجہ سے موت کا نوالہ بننے والی خواتین کا ذکر ہوا۔سوال جواب کے دوران ہسپانوی طالب علم نے اپنے ملکی و ثقافتی کھانوں کا ذکر کیا۔آٹھ ہفتے کے اس پروجیکٹ پر ہمیں 90 فیصد نمبر ملے۔ظاہر ہے اس حوصلہ افزائی سے رفعتِ پرواز اور طاقتِ پرواز میں اضافہ تو ہونا ہی تھا۔

••

ابا جی کے اندر ایک بچے کا سا تجسس ہمیشہ زندہ رہا اور ایک بچے ہی کی معصومیت سے وہ ہر نئی بات کو سیکھنے کی کوشش کرتے۔ مجھے جب دو سال غذائیات کا مضمون پڑھنا پڑا تو ابا جی نے میرے ساتھ میری ہی طرح دلچسپی سے اس مضمون کا نصاب اور طریقۂ تدریس جاننے کی کوشش کی اور اکثر بے ساختگی سے کہتے، ''واہ بھئی واہ، کیا قوم ہے کہ ایک ہی مضمون میں علم، صحت، تاریخ، سائنس، کیمسٹری اور حیاتیات پڑھا دیتی ہے۔''

میں نے یورپین سبزیوں کے بارے میں پڑھنا شروع کیا اور اسی دوران جب پاکستان گئی تو انھوں نے میرے ساتھ بیٹھ کر ان سبزیوں کے بارے میں پڑھا۔ اسپارگس (Asparagus) جو یورپ میں شوق سے کھائی جاتی ہے اور یہاں سے ہی یہ سبزی ایشیا میں پہنچی۔ میں نے اس کے بارے میں بتایا تو فوراً اٹھ کر اپنی حکمت کی کتاب تلاش کرنے لگے۔ افتاد یہ آن پڑی کہ بجلی بند ہوگئی۔اب ابا جی کے ذوقِ تجسس کی تشنگی دیدنی تھی۔بستر پر بیٹھے بیٹھے نابکار بجلی والوں کی اگلی پچھلی کوتاہیاں بیان کرنے لگے جو ان کے مزاج کا خاصہ نہیں تھا۔خدا خدا کر کے گھنٹے بعد بجلی آئی۔ابا جی نے کتاب نکالی اور جب تک ان سبزیوں کے عربی اور فارسی میں نام، ایشیا میں ان کی آمد کی تاریخ، خصائص اور ادویات کے طور پر استعمال کو نہیں جان لیا ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ ہالیوں، موسلی، موسلی سیاہ، مارگدوں، اور مارچوب کے ناموں سے اس سبزی کا پورا شجرہ نسب کھنگال مارا۔ پھر

حسبِ عادت آرام سے کہنے لگے کہ اردو میں ان سبزیوں اور جڑی بوٹیوں کے بارے میں ضرور ایک کتاب لکھنا اور اس کا نام رکھنا ''دل یا شکم۔'' مجھے ہنسی آ گئی،

''ابا جی میں کیا کیا لکھوں؟''

اسی اطمینان سے بولے،''ہر اس بات کی بابت لکھو جو اردو میں موجود نہیں اور بالخصوص کھانے پینے کے ساتھ جن کا تعلق ہے، اور خواتین کو ضرور علم و آگہی ہو تا کہ وہ اپنی اور اپنے خاندان کی صحت سنوار سکیں۔''

''جی اچھا ابا جی'' میں نے بھی حسبِ عادت وعدہ کر لیا۔

سیلری (Celery) کے بارے میں بھی سارے حقائق نکالے اور ہنسنے لگے۔ پھر بولے، ''بیٹا یہ سب سبزیاں یورپ سے ہی ایشیا میں آئیں اور یہاں کے حکما نے ان کو ادویات کے طور پر استعمال کیا۔ لوگوں کو شاید علم بھی نہ ہو کہ یہ سب سبزیاں، اجوائن، سونف اور ریوند چینی (Rhubarb) کے خاندان کی ہیں۔ میں نے ان کی نشان دہی پر ان کے بارے میں تحقیق کی۔ (Annals of Chemistry and Practical Pharmacy, Volume 1)۔ میں نے سویڈش زبان کے محاورے اور ڈینش زبان کے بچوں کے معروف ترین ادیب ہیلف ڈین راسموس کے گیت (Mariehønen Evigglad gik tur på et rabarberblad) میں اس کا تذکرہ بتایا۔ بچوں کا یہ گیت موسمِ بہار کی آمد کا اعلان ہے اور اسے عوامی گیت کی حیثیت حاصل ہے۔

''اس گیت کا ترجمہ کرو'' ابا جی پھر بولے۔ (چلو جی، جو بولے، او ہو کنڈا کھولے) ''جی اچھا کر دوں گی۔'' میں نے سعادت مندی سے ٹالنے کی کوشش کی۔ ''ویسے اس کا لفظی مطلب ہی بتا دو'' وہ پھر بچوں کی طرح بضد ہوئے۔

''جی اچھا'' میں نے بھی بچوں کو بہلانے کے انداز میں کہا،''میری ہوٗن (Mariehønen) کا ڈینش تلفظ مغی ہیون ہے۔ اس کو انگریزی میں لیڈی برڈ کہتے ہیں۔ اردو یا پنجابی میں اسے شاید بیر بہوٹی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے ننھے ننھے پر بھی ہوتے ہیں۔ پروں پر کالے دانے بہت بھلے لگتے ہیں۔ شاید انگریزی کے پرانے گیت،''لیڈی برڈ لیڈی برڈ فلائی اوے ہوم'' کی طرز پر ہے۔ ڈینش گیت کا لفظی مطلب ہے کہ ایک لیڈی برڈ ریوند چینی کے پتے پر سوار سیر کو نکلی۔ ڈینش بچے بچے کو یہ گیت ایسے ہی از بر ہے جیسے اردو والوں کو ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری۔''

''اچھا، اب ٹھیک ہے۔'' ابا جی نے خدا جانے اپنی ڈائری میں کیا لکھا اور مطمئن ہو کر

لوحِ محفوظ کی طرح سنبھال کر تکیے کے نیچے رکھ دی۔ اگلے چند دن ابا جی نے کسی محنتی اور متحرک طالب علم کی طرح میرا ہوم ورک کرتے گزارے۔

ابا جی نے اپنے سامنے کئی مسالے پھیلا رکھے تھے۔ وہ ان کا انگریزی اور اردو، پنجابی، اور ہندی نام ایک کاغذ پر لکھ رہے تھے۔

''مائی گاڈ، امی یہ تو بیزل (Basil ـ Seed) ہے'' ہماری دخترِ بلند اختر آ کر نانا ابو کے پاس بیٹھ گئیں۔ اسے تازہ اور سبز بیزل ہمیشہ سے پسند تھا اور وہ اسے مغربی سبزی سمجھتی تھی۔ بیزل کا مطلب ہی یونانی زبان میں بادشاہ کا ہے۔ اسے نباتات کی ملکہ بھی کہا جاتا ہے اور سینٹ جوزف وورٹ بھی (Saint-Joseph's-Wort)۔

''اب تو مجھے اس مضمون سے خصوصی دلچسپی ہوگئی'' ابا جی مسکرائے، ''بیٹا آپ کو اور یگانو کی داستان یاد ہے ناں، تو بس یہ وہی کہانی ہے۔ شام کو بات کریں گے۔ اب انگریزوں نے شہد ملا دیا تو ہمارے شربت 'ڈرنک' بن گئے۔ من حیث القوم ہمیں معاشرت کی سند انگریزوں سے چاہیے۔ ہم کھپ کھپ کر تھک گئے کہ بیبیو، گھر کے بچوں اور افراد کو ان کم قیمت اور بالانشیں نسخوں سے صحت مند رکھو۔ اب آپ اس پر جلدی سے ایک مضمون لکھیں۔ مجھے اس مضمون کی ایک نقل دینا، میں دواخانے میں رکھوں گا۔ نیاز بو، ریحان، تلسی یعنی (Basil) ایک ہی چیز کے کئی نام ہیں جنھیں عام لوگ استعمال کرتے ہیں لیکن جب تک انگریز ہمیں نہ بتائیں کہ یہ ہماری صحت کے لیے کتنے ضروری ہیں اور کتنی ہی بیماریوں کا گھریلو علاج ہیں، ہمیں یقین نہیں آتا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھو تو عیسائی اور ہندو دونوں اس پودے کو متبرک سمجھتے ہیں۔'' اب انھوں نے مجھے حکمت میں اس کا استعمال اور آسان گھریلو نسخے لکھوانے شروع کر دیے۔

سینٹ جوزفز وورٹ (St Joseph's Wort) کو جڑی بوٹیوں کا بادشاہ بھی کہا جاتا ہے۔ تیز پات یعنی انڈین بے لیف'' (Indian Bay Leaf)۔

ابا جی نے کئی تہوں میں تہہ کیا کاغذ کھولا۔ اس پر موتیوں کی صورت میں باریک لکھائی میں مختلف زبانوں میں جڑی بوٹیوں اور مسالوں کی فہرست تھی۔ ''ابا جی! اس سے چھوٹا کاغذ نہیں ملا تھا؟'' میں نے فقرہ کسا۔

''یہ دیکھو السی (Linseed,flaxseed) جسے حکما زمانہ قدیم سے استعمال کراتے چلے آ رہے ہیں'' ابا جی نے سنی ان سنی کرتے ہوئے بات جاری رکھی ''آپ نے بچپن میں تل کے اور السی

کے لڈو کھائے ہیں، جیسے آج کل کے بچے کیک اور چاکلیٹ کھاتے ہیں۔ سردیوں میں جوڑوں کے درد جیسی بیماریوں سے بچنے کا سستا اور سہل علاج۔ انگریزی میں اسے پڑھ کر نوجوان نسل کو فوائد کا یقین ہونے لگتا ہے۔ نئی تحقیق کے پیچھے بگٹٹ دوڑنے والے پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ان کی نانیاں دادیاں ان ہی گھریلو ٹوٹکوں سے آسانی سے بچوں کو پالتی تھیں۔ ان نباتات پر ضرور ایک کتاب لکھنا''، انھوں نے بچوں کی طرح فرمائش کی۔ ''میرا دل چاہتا ہے کہ یورپی مصنفین کی طرح تم صرف کتابیں لکھو۔ بس اس کے علاوہ تم پر کوئی ذمہ داری نہ ہو۔'' ابا جی کو شاید علم نہیں تھا کہ وہ ان کی دعا کی قبولیت کا وقت تھا۔

میری استاد نے کہا کہ اپنے والد صاحب سے پوچھو کہ اگر مشرقی مسالہ جات پر کوئی مستند مقالہ لکھا جاسکتا ہے تو اگلے سال کا پروجیکٹ اسے بنا لینا۔ ہمیں بھی نئی معلومات ملیں گی۔ اس کی رہنمائی اور ابا جی کی جدتِ طبع سے میں نے ایک اور یادگار پروجیکٹ پیش کیا۔ انھوں نے مجھے بے شمار نباتاتی نسخے، جڑی بوٹیاں اور مسالے چھوٹی چھوٹی شفاف تھیلیوں میں بھر کر بھیجے۔ ہر ایک کا لاطینی، انگریزی، ہندی اور اردو نام لکھا ہوا تھا اور ان کے خواص بھی درج تھے۔ کھانے میں ان کی مقدار اور اثرات اور ان کی مدد سے ہلکی پھلکی بیماری کا علاج بھی درج تھا۔ میرا کام صرف ترجمہ کر کے ڈینش میں پیش کرنا تھا۔ جس دن مجھے ڈگری ملی، میرے دل میں زندگی کی سب سے بڑی خواہش نے جنم لیا کہ کاش اس ساری جدوجہد کا انعام، اصل حقدار یعنی ابا جی کو دے سکوں۔

''میری خواہش ہے کہ آپ ایک کتاب لکھیں جو مکمل طور پر غذائیت کے بارے میں ہو۔ بالخصوص بیبیوں کی رہنمائی ہو کیونکہ آدھی سے زیادہ بیماریوں کا علاج تو باورچی خانے سے ہی ممکن ہے۔ کتاب کا نام ہونا چاہیے'' وہ کچھ دیر سوچتے رہے اور میں ان کے مہربان چہرے کو تکتی رہی۔ پھر بولے ''ہاں، میرا خیال ہے کہ کتاب کا نام رکھنا چاہیے ''فیصلہ تیرا ترے ہاتھ میں ہے دل یا شکم'' یا پھر صرف ''دل یا شکم'' کیسا رہے گا؟'' انھوں نے داد لینے کے انداز میں معصومیت سے میری طرف دیکھا۔

''ابا جی! فہرست کچھ طویل نہیں ہوگئی؟ شاعری کی کتاب، گھر کے حادثے کی کتاب، ڈینش شعر و ادب کی کتاب، ڈینش شاعرات پر کتاب، وائی کنگز پر کتاب، یورپ کے تاریخی مقامات کی کتاب، یورپ کی مساجد کی کتاب؟'' میں نے ابا جی کو یاد دلایا۔

''تو کیا ہوا؟'' انھوں نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا، ''مسئلہ کیا ہے؟ ایک روٹین بنالو

کہ رات کو اتنے صفحات ہر حال میں لکھنا ہیں۔''

''جی ابا جی ٹھیک ہے'' ظاہر ہے اس کے علاوہ میرے پاس کیا جواب ہوسکتا تھا؟ ابا جی مکمل طور پر خواب دیکھنے والے تھے۔ ایک کے بعد ایک اور تعبیریں جمع ہوتی رہیں، وہ جس کو مرضی ملیں، اس سے انھیں غرض نہ تھی۔ بس خواب دیکھنے کا سلسلہ جاری رہے، یہی ان کی خواہش تھی۔ ابا جی کو غذائیت اور صحت جیسے موضوعات کی جدید تحقیقات میں بہت دلچسپی تھی۔ جب میں نے سیمنا ریم کی تعلیم مکمل کی اور بغیر تیل اور چکناہٹ کے مخلوط کاربوہائیڈریٹس کے کھانے بنانے کی تراکیب لکھنا اور استعمال کرنا شروع کیں تو بے حد خوش ہوئے۔

''اس موضوع پر آپ کو اردو میں مضامین لکھنا چاہییں۔ بیبیاں اس بات کو نہیں سمجھتیں کہ ایک تو غلط غذا کا استعمال انسانی صحت کا دشمن ہے اور دوسرے یہ بے جا اسراف کے زمرے میں آتا ہے۔ کڑکڑاتے تیل میں تیار شدہ مسالوں کے ڈبے انڈیل کر اور گوشت، مرغی اور نہاری کھلا کر مہمان نوازی کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ آئس کریم اور چائے پلا پلا کر آدابِ میز بانی نبھاتی ہیں۔ مرد بار بار اٹھ کر بازاروں کو بھاگتے رہتے ہیں اور ریڈی میڈ کھانے میزوں پر سجتے رہتے ہیں۔ اب یہ پیزا کیا بلا ہے؟ اتنی رقم میں تین گھرانے کھانا کھا سکتے ہیں جتنا بچوں کو یہ جدید خوراک کے نام پر الم غلم کھلاتی ہیں۔ کیا ہو گیا ہے نئی نسل کو؟ اور یہ ''ایٹ آوٹ'' (Eat Out) کا ایک نیا رولا ہے۔''

''ابا جی یہ صرف خواتین کا قصور تو نہیں ہے ناں؟'' میں نے دفاعی مورچہ سنبھالا۔

''کیوں بھئی؟ کیسے ان کا قصور نہیں؟'' وہ با قاعدہ مباحثے کے لیے تیار ہو گئے۔

''ہم یورپ کی بات نہیں کر رہے جس میں مرد بھی کھانا بناتے ہیں۔ میں آپ سے یہاں کے عام لوگوں اور عام گھرانوں کی بات کر رہا ہوں۔ جسمانی اور ذہنی بیماریوں کی جڑ ہی غلط خوراک اور اچھے غذائی اجناس کو پکانے کا غلط طریقہ ہے۔''

ابا جی کے پاس یورپ سے مریض آتے، کھاریاں اور جہلم کے نواح کے دیہات سے لوگ آتے۔ تایا جان کے پاس بھی دور دراز سے مریضوں کا تانتا بندھا رہتا۔ دونوں بھائیوں کا پختہ خیال تھا کہ ان کی بیماریوں کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ یہ مریض اپنی معاشرت کے مطابق کھانے پینے کے اطوار وہاں لے گئے ہیں۔ ان ٹھنڈے ممالک میں پاکستان کی گرم آب و ہوا اور کھلے دالانوں آنگنوں اور کھلی چھتوں والی طرزِ زندگی کے مطابق غذا کھانے کی عادات نہیں چل سکتیں۔ ظاہر ہے وہ بچپن سے سنتے آئے تھے کہ ''جو کرے دودھ گھیو، نہ کرنے ماں تے نہ کرے پیو'' (جو دودھ اور گھی

جسم کی نگہداشت کرتا ہے وہ ماں اور باپ نہیں کر سکتے)۔ موقع ملتے ہی انھوں نے دودھ اور گھی سے جان بنانے کے جتن شروع کر دیے لیکن جسمانی طور پر سستی اور کاہلی نے اسی دودھ گھی کو جان گنوانے کا باعث بنا دیا۔ ابا جی ان کے امراض سن کر پریشان ہوتے۔

''یہ سب محاورات یہاں کی زندگی کے ساتھ لگا کھاتے ہیں جہاں پراٹھے کھانے کے بعد طویل گرم دن کی مشقت سامنے ہوتی ہے اور بدن اس خوراک کو محنت کر کے اپنا جزو بنا لیتا ہے۔ ٹھنڈے ممالک میں جوتے کے ڈبے جتنے گھروں میں اصل گھی مکھن میں تلے ہوئے پراٹھے اور تر تراتے کھانے جسم پر صرف بوجھ ہی بنتے ہیں۔ پھر نئی نسل، جو ہے ہی کمپیوٹر کی پیداوار، اسے گھر آتے ہی تلے ہوئے چپس اور مچھلی کھلا کر مائیں سمجھتی ہیں کہ بہت عمدہ خوراک کھلا دی۔''

میں ابا جی کے تجزیے اور مطالعے پر حیران تھی۔ انھیں ان ممالک کی طرزِ زندگی اور رہنے والوں کے ذہنی مسائل کا بھی بخوبی اندازہ تھا، ''اچھے بھلے لوگ صرف معاشی آسودگی کے لیے وہاں جا کر ایک اجنبی زندگی گزارنے لگتے ہیں۔ خواتین اپنے ملک کی زندگی، والدین اور بہن بھائیوں کی خوشی غمی میں شمولیت کے لیے ترستی رہتی ہیں۔ والدین مٹی اوڑھے سو جاتے ہیں اور بچے وہاں سے پونڈ اور ڈالر بھیجتے رہتے ہیں۔ پکے اونچے، دومنزلہ مکان بنا کر ابا کو شریکوں میں ممتاز کر دیتے ہیں اور پھر ابا جی اور بے جی ان مکانوں میں اکیلے پڑے رہتے ہیں۔ ادھر سے پاؤنڈ اور ڈالر کمانے والوں کو بھی یہ علم نہیں ہوتا کہ اس خون پسینے کی کمائی سے یہاں لوگوں نے علم و ہنر کو فروغ نہیں دینا بلکہ صرف فریج اور فریزر بھرنا ہیں۔ چونکہ ان کے درست استعمال کا طریقہ بھی نہیں آتا سو پرانی غذا کے استعمال سے بیماریوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ پھر پیسے کی فراوانی سے ہوٹلوں اور ریستورانوں میں قطار باندھ کر جانے کا رواج صرف اور صرف انسانی صحت کو تباہی کی طرف لے کر جا رہا ہے۔ بس تم اچھے اچھے مضامین لکھو اور اگر بیبیوں کو یہ یقین دلا دیا جائے کہ یہ سب کھانا فیشن ہے تو وہ فوراً اسے اختیار کریں گی۔ گھر کے نعمت کدے میں پکی خوراک اپنے گھر والوں کو دی جائے تاکہ آپ کو علم ہو کہ آپ کھا کیا رہے ہیں؟''

آج یہ سطور لکھتے ہوئے میں سوچ رہی ہوں کہ اچھا ہی ہے جو ابا جی نے سوشل میڈیا کا یہ دور نہیں دیکھا جب مہنگے ریستورانوں میں چائے اور کیک، پیزے اور بریانی کھا کر لوگ اپنی تصاویر تفصیل کے ساتھ لگاتے ہیں یا ''سیلفیاں'' بنا کر وہیں بیٹھے بیٹھے دوستوں کو ٹیگ کیا جاتا ہے۔

ابا جی کو مچھلی بہت پسند تھی اور گھر میں اس بات کا اہتمام کیا جاتا تھا کہ مچھلی کے پکوان بنائے جائیں۔ سردیوں میں بالخصوص زیادہ کھائی جاتی۔ ہمارے حکما بزرگوں کا کہنا تھا کہ انگریزی

کے جس مہینے کے نام میں لفظ ''ر'' نہ ہو اس مہینے میں مچھلی کھانے سے اجتناب کیا جائے جیسے مئی، جون، جولائی اور اگست، لیکن ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر، جنوری، فروری، مارچ اور اپریل کے مہینوں میں مچھلی کھانا درست ہے۔

سائنسی طور پر یہی مہینے افزائشِ نسل کے بھی ہوتے ہیں۔

ہمارے گھر کے سب لڑکے مل کر مچھلی کے شکار کو جاتے۔ چھوٹے چچا جان شفیع کو تو ابا جی کہتے ہی شکاری تھے۔ ربڑ کے لمبے بوٹ اور کوٹ پہنے پورے خاندان کے لڑکوں کو ساتھ لیے شڑاپ شڑاپ کرتے چاچا جی گھر آتے تو مچھلی بازار سج جاتا۔ ان کو نجانے کتنی اقسام کی مچھلیوں کی پہچان تھی اور ان کے نام لے کر انھیں پکانے کی تراکیب بتاتے۔ امی جی ہنستی رہتیں اور ان کو ایسے ہی دلار کرتیں جیسے کبھی بچپن میں کرتی ہوں گی۔ ایک دفعہ دسمبر کی چھٹیوں میں سب دولت نگر میں چچا جان نذیر کے گھر جمع تھے۔ شام ڈھلے ڈھیروں تھیلوں میں بھر کر مچھلی لائی گئی جسے سب ''ڈولے'' کہہ کر پکار رہے تھے۔ مچھلیاں ابھی زندہ تھیں اور باقاعدہ تڑپ رہی تھیں۔ میں نے انھیں دیکھ کر خوب رونا پیٹنا مچایا اور سب کو ظالم وغیرہ کہا اور اپنا احتجاج درج کرانے کے لیے کھانا بھی نہیں کھایا بلکہ دن کے بچے ہوئے کالے چنے اور ابلے چاولوں کا بلیک اینڈ وائٹ ملغوبہ کھالیا۔ مرغابیوں کا شکار آتا تو اسے بھی اہتمام سے پکایا، کھایا اور کھلایا جاتا۔

••

''ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے'' ابا جی بولے، ''یہ مت سمجھو کہ وہ سال ضائع گئے جن میں نہیں لکھا۔ اگر لکھا نہیں تو مشاہدہ تو یقیناً کیا ہوگا۔ اس مشاہدے کو قلم پر منتقل کرو۔ اب یہی دیکھو کہ تم زیادہ چاول کھاتی ہو، چلو کھچڑی پر ہی تحقیق کر کے کچھ لکھ ڈالو۔''

''ابا جی! حکیموں کو ایک ہی غذا کا علم ہے۔ بس کھچڑی کھائے جاؤ'' میں نے مذاقاً کہا۔

''کڑیے! کھچڑی صرف مریضانِ معدہ کا علاج نہیں۔ غذائی اعتبار سے یہ مکمل صحت بخش کھانا ہے۔ یہ بادشاہوں کے دسترخوان کی زینت بنا۔ انگریز اسے ولایت لے گئے اور پھر اس میں ولایتی اجزاء شامل کر کے اسے اپنے دسترخوان میں شامل کر لیا۔''

اچانک ابا جی کو کوئی خیال آیا اور بات بدلتے ہوئے بولے، ''ایک پروجیکٹ اس موضوع پر بنا لو۔ چاول اور دال دونوں کے غذائی خواص اور پروٹین کی وجہ سے کم قیمت میں گوشت کا نعم البدل، گھی اور صحت بخش مسالے یعنی لونگ زیرہ اور تیز پات، پھر سبزی خور پروٹین کے حصول کے لیے مختلف

دالیں ڈال کر کھچڑی کھاتے ہیں۔ جنوبی ایشیا کے ثقافتی کھانے اور تاریخ بھی شامل ہوسکتی ہے۔''

آئیڈیا واقعی بہت اچھا تھا۔ پھر جب میں نے اس کا لیکچر مکمل تیار کیا تو میرے ایک ہم جماعت نے شرارت سے کھچڑی کا تلفظ ''کا چڑی'' (کھا، چڑی) ادا کرنے کی کوشش کی، پھر سوال کیا، ''اب کیا بالکل نئی چیز پڑھنے کا حکم ہے؟''

''نئی چیز تو خیر نہیں ہے،'' میں نے ایلن ایٹن ڈیوڈسن کی کتاب 'دا آکسفورڈ کمپینئن ٹو فوڈ' (The Oxford Companion to Food) سے کاپی کیے ہوئے صفحات ہر گروپ کی میز پر رکھے۔ شیشے کی بوتلوں میں چاول، مونگ کی دال اور گرم مسالے پڑے تھے۔ دیوار پر لگے پروجیکٹر پر ڈیوڈسن کے الفاظ ابھرے، اس نے برطانیہ کی معروف ترین ڈش کیڈی گری (Kedgeree) کو کھچڑی کی بدلی ہوئی صورت کہا۔ انگریز انڈین کالونی سے دیگر بہت سی چیزوں کے ساتھ ساتھ صدیوں پرانی کھچڑی کی ترکیب بھی لے گئے، اگرچہ مقامی اجزاء سے ہم آہنگ کر کے اس میں مچھلی اور انڈوں کا اضافہ کیا گیا۔ لیکچر کے بعد گرما گرم کھچڑی پیش کی گئی جسے چکھنے کے بعد تبصروں اور سوال جوب کا سیشن شروع ہوا۔ میں زندگی کے ہر مقام پر پدرانہ شفقت اور راہنمائی کے قرض میں جکڑی ہوں۔

••

امی نے ایک ڈبہ میری طرف بڑھایا، ''اس میں دوا خانے کے دھوپ میں سکھائے دھلے اور پسے ہوئے مسالے ہیں۔ میں نے بارہ مسالے اکٹھے کر دیے ہیں۔ جب بھی کھانا پکانا ہو، ایک چمچہ ڈال دینا۔ اجوائن اور کلونجی سِرکے میں سوکھی ہوئی ہے۔''

''ہائے اللہ۔۔'' میں نے سر پیٹ لیا، ''امی جی آپ نے اتنی محنت کی ہے لیکن کسٹم میں یہ مرچ مسالے عذاب میں ڈال دیں گے۔''

''کہہ دینا کہ میری ماں نے بنا کر دیے ہیں'' بے نیازی سے بولیں۔

''امی جی! اگر وہاں دو سو مسافروں کی ماؤں نے مرچ مسالے دیے ہوئے تو؟ وہ جہاز ہے کہ پنساری کی دکان؟''

''مجھے نہیں پتہ۔۔۔'' بے اعتنائی سے بولیں، ''پورا ہفتہ لگا کر بنائے ہیں میں نے، چک ایتھوں تے لیہہ جا۔ یہ مٹر ہیں تازہ چھلے ہوئے، میری بچی شوق سے کھاتی ہے۔ ساتھ نہیں آئی اس کے لیے لے جاؤ۔ یہ تل کے لڈو، یہ آملے کا مربہ، یہ ہرڑ کا مربہ۔ سارے بال تباہ ہوگئے ہیں

تمھارے۔ کیا بال تھے۔ لوگ رک رک پوچھتے کہ کیا لگاتی ہیں آپ کی بچیاں۔ نامراد مصیبتوں نے برباد کر دیے سارے بال میری لڑکی کے۔'' امی کی باتوں میں میرے لیے محبت کے ساتھ ساتھ میری نئی زندگی کی ممکنہ آزمائشوں کے لیے تفکرات کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میرے ساتھ چل پڑیں۔

ابا جی گھر میں بنی ہوئی غذاؤں کے استعمال کو پسند کرتے تھے۔ جو، شہد اور سرکہ کے استعمال کی تلقین کیا کرتے تھے۔ جب کبھی کدو کا موسم آتا تو طرح طرح کے طریقوں سے پکایا جاتا؛ گوشت میں کدو، دال میں کدو، کریلے میں کدو۔ ایک دن میں نے تنگ آ کر کہا، ''ابا جی! کیا خیال ہے، آج کدو میں کدو نہ ڈالے جائیں؟''

مسکرا کر بولے، ''نہیں آج کدو کا حلوہ بنے گا، شہد میں۔''

''کدو شریف کھانے کا میرا کوئی پروگرام نہیں۔ میں تو تایا جان کے گھر جا رہی ہوں'' میں فیصلہ سنا کر رفو چکر ہوگئی۔ ابا جی سبزیوں کے چھلکوں کو بھی حتمی آپشن کے طور پر کوڑے میں نہ پھنکواتے۔ کدو کے چھلکے باقاعدگی سے عقبی محلے میں رہنے والی ایک بچی کو دے دیے جاتے تاکہ وہ بکری کو ڈال دے۔

••

''ہر عورت کو غذا سے علاج کی بنیادی باتوں کا علم ہونا چاہیے کیونکہ وہی بچے پالتی ہے، اسی کے ہاتھ میں نعمت خانے کا نظام ہوتا ہے اور یہیں سے ایک صحت مند معاشرے اور قوم کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ جو اپنا خیال نہیں رکھ سکتا اس نے دوسروں کی کیا دستگیری کرنی ہے؟ نالائق قوم۔ میں بار بار کہتا ہوں کہ صحت اور خوراک لیے پیسے کی نہیں، عقل اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے۔ شہروں میں شیکسپیئر کے ڈرامے دیکھنے اور دکھانے والے بیمار جب کہ دیہاتوں میں ہل کی لکیریں سیدھی رکھنے والے دہقان جن کے پاس دودھ، لسی، ساگ، گڑ، چنے اور سبزیوں جیسی نعمتیں اور ٹیوب ویل کا پانی، درختوں کی قطاریں، ان کے چھتنار سائے اور نہر کا کنارہ موجود ہوں، وہ مثالی صحت کے مالک ہوتے ہیں۔''

میں نے لاشعوری طور پر یہ باتیں، جو کہ یورپ کا بڑے سے بڑا ڈاکٹر بھی نہیں بتا سکتا تھا، پلے سے باندھ لی تھیں۔ میرے بچوں کی پرورش بے حد سہل انداز میں انہی فطری اصولوں پر ہوئی۔ بلاناغہ تیل کی مالش اور غسل کرانا معمول تھا۔ سادہ اور تازہ خوراک۔ کبھی ڈاکٹروں کے پھیرے نہیں

لگائے۔ کھانسی ہوئی تو شہد میں ادرک یا کالی مرچ اور دارچینی ملا کر چٹا دی۔ زکام ہوا تو موٹی الائچی اور لونگ کا پانی پلا دیا۔ پیٹ کا مسئلہ ہوا تو سونف، اجوائن اور پودینے کا قہوہ پلا دیا۔ سب لوگ حیران ہوتے کہ کتنی آسانی سے بچے پال لیے۔ صاف ستھرے چھوٹی سی عمر میں باتیں کرتے ہنستے کھیلتے بچے۔ پھر رفتہ رفتہ مجھ سے نسخے پوچھے جانے لگے۔ اس کی وجہ صرف بچپن سے ذہن میں رچے یہی خیالات تھے کہ صحت کی بہتری خود اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں سادہ طریقوں کا استعمال۔ بچوں کو بھرپور توجہ دینا برانڈ کے کوٹ اور جوتے پہنانے سے کہیں افضل ہے۔

جب پاکستان میں مردہ اور حرام جانوروں کے گوشت کے استعمال کا سکینڈل منظرِ عام پر آیا اور ٹی وی کے پروگرام آئے دن نت نئے انکشافات کرنے لگے تو مجھے ابا جی کی ساری باتیں یاد آتی رہیں۔ بالخصوص جب ریستورانوں کی رکابیوں سے دھوبی کے گدھے دولتیاں مارتے برآمد ہوئے تو ابا جی کی باتیں یاد آ کر تفننِ طبع کا سبب بنتی رہیں۔

ایک دفعہ حلال اور حرام جانوروں کے موضوع پر بات ہونے لگی تو میں نے کہہ دیا کہ امریکہ میں اکثر عرب لوگ عام دکانوں سے مرغی اور ٹرکی لے کر کھا لیتے ہیں۔ کچھ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ بھوک کی شدت میں حلال کہاں سے لائیں؟

ابا جی نے بڑے آرام سے کہا، ''ہاں جی جتھے میاں نور جمال، کھوتا کھلوڑا سب حلال'' (جہاں میاں نور جمال کا فتویٰ ہوگا وہاں گدھے اور کھالیں سب کچھ حلال مانا جائے گا)۔ ان ہی اسباق کا فیضان ہے کہ میرے بچے ترجیحاً ہمیشہ گھر کا بنا ہوا کھانا کھاتے ہیں۔ باہر صرف کبھی کبھار دوستوں کے ساتھ چلے گئے تو اور بات ورنہ سب لڑکے ایک گھر میں جمع ہو کر اپنے اپنے ملک کے پکوان بناتے ہیں جس میں میرے بیٹے کے ہاتھ کا بنایا بٹر چکن اور چاول بہت مشہور ہیں۔

••

کم تیل ڈالنے اور کم میٹھا استعمال کرنے کے بارے میں ابا جی کی اور میری گفتگو سنتے سنتے امی جی تنگ آ جاتیں۔ تیل ڈالے بغیر کھانا کیسے پکے گا۔ میں نے کہہ دیا کہ ''میں تو بہت سے کھانے تیل کے بغیر بناتی ہوں۔''

''اچھا، پھر تم مجھے بغیر تیل کے پکوڑے بنا کر دکھاؤ'' امی جی جیسے امتحان لینے کے لیے بولیں۔

''جی میں وہاں بناتی ہوں اکثر۔ اصل مقصد تو مختلف سبزیوں کو پکوڑوں کی صورت میں

بدلنا ہے ناں؟ میں بہت سی سبزیاں باریک باریک کاٹ کر انھیں سرکے میں بھگو کر یا صرف مسالے چھڑک کر رکھ دیتی ہوں، پھر ان میں بیسن اور پھینٹا ہوا انڈا اور ذرا سا دہی لگا کر اوون میں گرل کر لیتی ہوں۔''

''اچھا۔۔۔ چلو ذرا بناؤ تو'' امی جی نے کافی تجسس دکھایا۔ میں نے کالے چنوں کا آٹا، جو کا آٹا، مکئی اور باجرے کا آٹا ڈالا اور خوب سبز مرچیں، ٹماٹر، سبز دھنیا، پودینہ اور زیرہ وغیرہ ڈال کر انڈے اور خمیر کی آمیزش سے کیک کی ترکیب کی طرح نان سٹک فرائنگ پین میں پتلی سی روٹی بنا کر دی، اور معمولی تیل کے ساتھ پکوڑے بنا کر دکھائے۔ بہت خوش ہوئیں اور کہنے لگیں، ''خستہ تو ویسے نہیں ہیں لیکن ذائقہ اور کرارے ٹھیک ہیں۔''

میں نے کہا، ''امی جی بس اصل بات غذائی عادات بدلنے کی ہے۔''

''اچھا تو جو چیز ساٹھ سال تک کھائی ہو وہ ایک دم کیسے بدلی جائے؟'' وہ اپنی دلیل پیش کرتیں۔

''جی وہی بات آگئی ناں۔۔۔ دل یا شکم'' ابا جی نے پکوڑوں پر پودینے اور زیرے کی چٹنی ڈالتے ہوئے کہا، ''مائیں بچوں کو شروع سے ہی ایسے کھانے متعارف کرائیں۔ مٹھائیوں اور کیک کے بجائے انھیں رنگ برنگے پھل کھانے کی عادت ڈالیں۔ پلیٹوں میں سجا کر دیں گی تو ضرور کھائیں گے۔ کھیر، کسٹرڈ میں بھی ان کے پسندیدہ پھل ڈالیں۔ آئس کریم اصل دودھ کی بنائیں اور گھر میں تجربہ کریں۔ اچھا، پالک گوشت بنانے کی کوئی ترکیب بتاؤ جو لذیذ بھی ہو اور جس پر تیل کی لہریں بھی نہ بہتی ہوں'' ابا جی ایسے بولے جیسے کوئی بچہ ڈرائنگ کی کسی اناڑی استانی سے ہاتھی بنانے کی فرمائش کرے اور تقاضہ کرے کہ اس کی سونڈ کی بجائے اسے پر لگا دو۔

••

نیا زمانہ اور نئی غذائی عادات اور فاسٹ فوڈ جیسے موضوعات پر ابا جی کی بیبیوں سے شدید محاذ آرائی تھی۔ اس پر وہ خطبہ دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، ''باہر کے ڈاکٹروں نے ایسا لکھا ہے، باہر کے کک ایسے کھانا پکاتے ہیں، باہر کے ملکوں میں کیک مشہور ہیں اور یوں میٹھی کریم سے تھپے کیک کھلانے کا رواج عام کر دو۔ پہلے فیشن کی دوڑ میں حصہ لینے کے لیے بھاری بھرکم انگریزی ناموں والی مضرِ صحت غذا کھاتی ہیں اور پھر رونے بیٹھ جاتی ہیں کہ موٹی ہوگئی ہیں، بچے بیمار ہوگئے ہیں۔ بیبیو! اللہ کا واسطہ ہے کہ گھریلو اور حکمت کے ٹوٹکوں سے اپنے گھر والوں کا

وقت پیسہ اور صحت بچاؤ۔'' ابا جی اپنی مریضاؤں کو بالخصوص سمجھاتے کہ بات پیسے کی بات نہیں بلکہ یہ ان وسائل کو سلیقے اور بیدار مغزی سے استعمال کرنے کا معاملہ ہے۔ رزق کے احترام اور اسے ضائع ہونے سے بچانے کی کوشش کی بات ہے۔ ہمارا دین تو صدیوں پہلے اس بارے نصیحت کر چکا ہے۔

••

مجھے ہمیشہ دواخانے کے دھلے، دھوپ میں سکھائے گئے صاف ستھرے مسالہ جات بھجوائے جاتے اور شروع سے ہی میرے بچوں کو گھر کے بنے کھانوں کی عادت پڑ گئی۔ پھر ساتھ ہی دونوں نے کھانا پکانا بھی سیکھ لیا۔ ابا جی کے تصورات اور نظریات کی گونج میری اگلی نسل تک بھی پہنچی۔ بلکہ جب سے میری نواسی پیدا ہوئی اور اس کی صحت اور میرے ٹوٹکوں کو دیکھ کر نئی نسل نے تو مجھے شاعرہ کے بجائے حکیم کہنا شروع کر دیا۔ کسی کو کوئی جڑی بوٹی چاہیے، کوئی نسخہ چاہیے، جھٹ سے مجھے فون کھڑکایا جاتا ہے۔

''امی! آپ تو شاعرہ کے بجائے حکیمہ ہوگئیں'' صاحبزادے ہمیں چھیڑنے کا کوئی موقع نہ جانے دیتے۔

''یہ بھی شاعری ہے بیٹا جی۔۔۔'' میں نے بھی ابا جی کی طرح ہار مانے بغیر کہا، ''جب میں آپ لوگوں کے لیے ہاتھ سے کھانے پکا کر میز سجاتی ہوں تو اسے آرٹ اور تخلیق ہی سمجھتی ہوں۔ رنگ برنگے قہوے اور چائے کی بھاپ اڑاتی پیالیوں پر کیا اشعار نہیں کہے جاسکتے؟''

''بالکل امی جی، آپ جو چاہے کرسکتی ہیں، حکیم صدف اللہ مرزا، اس نے غالباً جان چھڑائی۔

''ایک فنکار ہمیشہ فن کا مظاہرہ کرتا ہے خواہ وہ توے پر روٹی ڈالے، یا سفیدی کا برش تھامے، اینٹ اور گارے کی دیواریں ہموار کرے، لکڑی کی سطح رگڑے، گاڑی کے نیچے لیٹا کالے ہاتھوں سے گاڑی کے مرض کی تشخیص کرے، یا سڑک پر بجری کوٹے۔''

''جی جی امی جی،'' وہ اٹھ کر باہر بھاگ گیا۔

••

مجھے بچپن سے ہی اپنے گھر کے حکماء کی باتوں سے کوفت ہوتی۔ اب یہ کیا ہر چیز میں حکمت، ہر بات میں ٹوٹکہ ہی موجود ملے گا۔ فلاں پھل، فلاں سبزی، فلاں کھانا، فلاں نسخہ، فلاں ٹوٹکہ۔ لیکن عجیب بات کہ ابا جی اور تایا جان کے بتائے ہوئے ان ہی ٹوٹکوں اور نسخوں سے میں نے

انتہائی آسانی سے بچے پالے۔ کبھی ڈاکٹروں کے پھیرے نہ ڈالے۔ یہ آسانیاں ہماری نسلوں میں چلتی ہیں۔ میں نے اپنی نواسی کی پرورش میں یہی گھریلو نسخے آزمائے۔ ہر روز تیل کی مالش، کان، ناک اور ناف میں تیل ڈالنا، معمولی تکالیف کا علاج گھر میں ہی کرنا۔ میری بیٹی نے ابا جی کی باتیں دماغ کے بینک میں سنبھال رکھی تھیں۔ بہت اہتمام سے بچی کی پرورش میں قدرتی اور دیسی نسخہ جات کا استعمال کیا۔ بچی کو آغوشِ مادر اور شیرِ مادر حاصل رہا۔ جب اس کی نرس گھر میں بچی کو دیکھنے اور وزن کرنے آتی تو بے حد خوش ہوتی اور اس بات پر داد بھی دیتی کہ بغیر بازاری رنگ برنگے لوشنوں، کریموں اور صابنوں کے قدرتی اور نباتاتی اجزا سے ایسے صحت مندانہ انداز میں بچی کی پرورش ہو رہی ہے۔

جب ہماری نواسی صاحبہ تشریف لائیں تو عالیہ نے باوجود کوپن ہیگن میڈیکل سکول سے فارغ التحصیل ڈاکٹر ہونے کے، اپنی بچی کو ان ہی قدرتی اور فطری اصولوں پر پالنے کی کوشش کی۔ ''پیٹ میں مسئلہ ہوگیا ہے امی، اجوائن کا قہوہ پلا دوں؟ اب گرمی لگ رہی ہے اسے، سونف کا پانی دے دوں؟'' ہر روز مالش اور غسل کرانا تو اس کی عادت میں شامل تھا۔

ڈنمارک میں نرس ابتدا میں گھر آکر بچے کی نشوونما کا جائزہ لیتی ہے۔ اس کا وزن اور قد ماپا جاتا ہے۔ پھر ہر چیز کا اندراج کیا جاتا ہے۔ ننھی آئمہ جب چمکتی آنکھوں، پوپلے، بغیر دانتوں کے منہ کو کھولے، ہنسی مسکراتی گول گول بازو لیے میری طرف لپکتی ہے تو مجھے اس کی آنکھوں میں صاف طور پر ابا جی کی شبیہہ دکھائی دیتی ہے، جن کی عنایات ہماری نسلوں میں سفر کر رہی ہیں۔ آئمہ کی نرس خوش اور حیران ہوکر اسے دیکھتی ہے کہ قدرت نے ماں کو بچی کی غذا کا ذریعہ بنایا اور اس کا وزن اور جلد بھی ایسی صاف ستھری ہے جیسے برقی قمقمے روشن ہوں۔

عالیہ نے اسے بتایا کہ میری والدہ نے نجانے کس کس قسم کے حلوے اور دالیں بنا بنا کر بزورِ بازو مجھے کھلائی ہیں۔ کالے چنوں کا شوربہ اور اوون میں بیک کی ہوئی مچھلی، کھجور اور انڈے کا خصوصی حلوہ جس میں اخروٹ اور بادام ڈالے گئے تھے۔ کچھ ہمارے رعب اور کچھ بطور ماں بچے کی صحت کو اولیت دینے اور شیر خواری میں بھرپور غذا مہیا کرنے کے خیال سے بے چاری چپ کر کے کھاتی رہی۔ ہاں، کچھ باتوں پر ہماری تکرار ہوجاتی ہے مثلاً، ''امی جی یہاں کا شہد خالص نہیں ہوتا، میں نے اپنی بچی کو نہیں دینا۔''

''اچھا'' اور یہاں آکر میں بھی ہتھیار ڈال دیتی ہوں۔ اس کی ماں ان ہی اصولوں کو

ازبر کیے ہوئے ہے۔ بلاوجہ کا کھلونوں کا ڈھیر نہیں رکھنا، سونے جاگنے کا وقت مقرر ہونا چاہیے، وغیرہ۔ جب وہ پیدا ہوئی تو ہسپتال میں اذان کے بعد موبائل پر بچوں نے اقبال کا خودی کا سرِ نہاں لاالہ الااللہ لگایا۔ عالیہ کہنے لگی یہ نانا ابو کا پسندیدہ ترین کلام تھا جسے وہ خود بھی ترنم سے بچوں کو سنایا کرتے تھے۔

••

پاکستان گئی تو ہمیشہ کی طرح ابا جی نے میری ادویات چیک کیں، ''یہ کوڈین کیا بلا ہے؟ کیوں اضافہ ہے اس دوا کا؟''

''ابا جی، رات کو پیروں میں بہت بَل پڑتے ہیں اور درد ہوتا ہے۔'' مجھے نئی بیماری کا بتاتے ہی بن پڑی۔ ابا جی دوا لے گئے اور یقیناً لیبارٹری میں اس کی پوری تحقیق ہوئی ہوگی۔ رات کو گھر واپسی ہوئی تو چتکبرے کیلوں کا بڑا گچھا ساتھ تھا، ''ادھر آؤ جانِ پدر'' مجھے ان کے انداز سے علم ہوگیا کہ اب کوئی نہ کوئی نیا نسخہ مجھ پر آزمایا جائے گا۔

''آپ اپنی دوا چھوڑ دیں اور روزانہ دو کیلے صبح اور دو شام کو کھائیں۔ پھر بتدریج کم کریں اور دن میں صرف دو کیلے کھائیں۔ اس کو نسخہ نہ سمجھیں بلکہ غذائی عادت بنالیں' ابا جی نے بڑے اہتمام سے بڑی پلیٹ میں کیلے رکھے اور پھر ساتھ ہی ایک ڈبیہ مجھے تھمائی، ''اس میں پسی ہوئی دارچینی اور کالی مرچ ہے۔ کیلوں پر چھڑکنی ہے۔''

''جی اچھا۔۔۔'' میں نے سعادت مندی سے کہا اور حسبِ ہدایت دو کیلے کھالیے۔ اب کیا تھا، صبح اٹھتے ہی دو کیلے حاضر ہوتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد پھر دو نامراد کیلے اپنا کالا پیلا منہ لیے آن پیش ہوتے۔ آخر میری سعادت مندی نے بھی احتجاجاً ہاتھ اٹھالیے۔

''ابا جی، مجھے نہیں کھانا کیلا۔ مجھے نہیں پتہ کہ میں بندر سے انسان بنی یا نہیں لیکن یہ ضرور لگتا ہے کہ انسان سے بندر بننے کو ہوں'' میں نے ٹرے پرے دھکیل دی۔

''نہیں میرا بچہ! اپنا فلسفہ چھوڑو۔ جب تک جینا ہے صحت کا خیال رکھنا ہے۔'' انھوں نے کیلا چھیل کر اوپر کالی مرچ، دارچینی کا سفوف چھڑکا، ''جو اپنا خیال نہیں رکھتا وہ کسی کے لیے کیا کرسکتا ہے۔ اپنی صحت اور جسم کا خیال نہ رکھا جائے تو یہی بدن انسان کے لیے آزار بن جاتا ہے۔ بس اللہ محتاجی اور لاعلاج مرض سے بچائے۔''

''میرے بچے! اللہ نے اپنے کائناتی نظام میں ضرور اسباب پیدا کر رکھے ہیں۔ جب

وقت آتا ہے تو سارا حساب درست ہوجاتا ہے۔ قدر دان اذہان اور مثبت اندازِ فکر والے لوگ باہم مل جاتے ہیں۔ لکھ کر رکھ لو ابھی تو بچوں کی زندگیوں سے خوشیاں کشید کرنی ہیں۔ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوکر آپ کو اپنی تعلیم پر توجہ دینا ہے۔ رومی اور اقبال پر کام کرنا ہے۔'' ابا جی کی آنکھیں پھر نئے خوابوں سے جھلملا اٹھیں۔

''بس آرام کرنے کی تاکید نہ کرنا اسے'' امی نے لقمہ دیا، ''بہت پڑھ لیا، اب سکون سے اپنی صحت کا خیال رکھے۔''

••

ابا جی نے کبھی کھانا پلیٹ میں نہیں چھوڑا۔ ویسے بھی قلتِ طعام کے عادی تھے لیکن رزق ضائع کرنے والوں کے ساتھ ان کا خصوصی اعلانِ جنگ تھا۔ ''ایک دانہ جو ضائع ہوتا ہے اس کے پیچھے ایک کسان کی کتنی محنت اور عقیدت شامل ہے۔ جب دنیا سوتی ہے وہ اٹھ کر کھیتوں کو پانی دیتا ہے۔ تپتی دوپہروں میں خون پسینے کی بوندیں شامل کر کے اس کھیتی کی حفاظت کرتا ہے۔ پھر آسمان کی طرف نظریں لگائے دستِ دعا بلند کرتا ہے، کبھی ابرِ رحمت کے کرم کی، کبھی بادلوں کے بغیر برسے گزر جانے کی۔ کہرے سے اس کا دل سہا رہتا ہے۔ اور پھر جب فصلیں تیار ہوتی ہیں تو سارا گاؤں آپ کے دستر خوان تک رزق کے یہ دانے پہنچانے کی مشقت کرتا ہے جسے صرف چند لمحوں میں لٹکی ہوئی توندوں والے کوڑے کے ڈھیر میں ڈال دیتے ہیں۔''

سوان ہی افکار کا نتیجہ تھا کہ ہمارے گھر میں رزق کی حرمت انتہا درجے کی تھی۔ رات کی بچی روٹیوں کو پانی اور مکھن لگا کر توے پر تازہ کیا جاتا، پھر رات ہی کے بچے ہوئے سالن یا آملیٹ کے ساتھ کھایا جاتا۔ کوئی مہمان آتا تو اسے گرم تازے پراٹھے پیش کیے جاتے۔ اگر کوئی پلیٹ میں کھانا چھوڑتا تو ابا جی بلالحاظ کہتے کہ برتن صاف کرنا سنت ہے۔ امی کبھی ناراض ہوتیں کہ لوگ کیا سوچتے ہوں گے۔ شاید کھانا کھلانا گراں گزرتا ہے جو ساتھ ہی مرزا صاحب آداب سکھانے لگے۔

''جو مرضی سوچیں'' ابا جی اپنی فطری بے نیازی سے کہتے، ''ڈونگے ان کے سامنے پڑے ہیں، جتنا مرضی ڈالیں۔ لیکن میرے گھر کے دستر خوان سے رزق کوڑے دان تک نہیں جائے گا۔''

اکثر تو یہ بھی ہوتا کہ ہم رات کی روٹی کو دیسی گھی سے تازہ کیے پراٹھے کی صورت کھا لیتے تو امی کی محبوب عظمت باجی آجاتیں۔ وہ برتن دھولیتیں تو اسے آہستہ سے کہتیں، ''چل پراٹھا بنا کے کھالیہہ۔ میں نے گھر میں مکھن بنایا ہے۔''

ایف اے کے امتحانات کی تیاری میں قریب رہنے والی ایک سہیلی ہمارے گھر آیا کرتی تھی۔ امی جی نے اسے سیون اپ کی بوتل پیش کی۔ اس نے آدھی پی کر چھوڑ دی۔ جب چائے کا کپ آیا تو اس نے وہ بھی آدھا بچا دیا۔ امی جی نے پوچھا، ''بیٹا چائے پوری کیوں نہیں پی، ٹھیک نہیں بنی؟''

وہ بڑی سادگی سے بولی، ''خالہ جان یہ فیشن ہے۔ پورا کھانا نہیں کھاتے۔''

مجھے امی جی کا حیران چہرہ آج بھی یاد ہے، ''ہائیں! یہ کیا فیشن ہے؟ چلو ابا جی کے سامنے نہ کہنا ورنہ لیکچر کی ذمہ داری آپ پر ہوگی'' انھوں نے ساتھ ہی اسے متنبہ کر دیا۔ اس نے کافی تاویلات دیں کہ بچا ہوا کھانا چھت پر پرندوں کو ڈال آتے ہیں۔ کام کرنے والی ماسی لے جاتی ہے۔ تاہم ہمارے گھر میں اس بات کا اہتمام کیا جاتا کہ رزق ضائع نہ ہو۔

بچپن کی سیکھی یہ عادات انسان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہیں۔ جب میری بیٹی پیدا ہوئی اور اس نے کھانا شروع کیا تو اس کا بچایا ہوا انڈا اور چاول میں خود کھاتی۔ میرا ناشتہ یا کھانا اکثر بچوں کی پلیٹ سے شروع ہوتا۔ پھر جب وہ بڑے ہوئے تو انھوں نے سیکھ لیا کہ کھانے کی پلیٹ صاف کرنی ہے یا فریج میں رکھنی ہے اور بعد میں ختم کرنی ہے۔

مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ میں اکثر لوگوں کا نام تحریر نہیں کرتی اس کے باوجود بہت سوں کو اندازہ ہوجاتا ہے کہ پسِ پردہ شخصیت کون ہے۔ عالیہ بمشکل دو برس کی تھی کہ مجھے کسی کے بچے کے عقیقے میں جانا پڑا۔ جب میں اسے چاول اور بوٹی کھلا چکی تو حسبِ عادت میں نے اسی پلیٹ میں اپنا کھانا نکال لیا۔ ہماری میزبان نے دیکھا تو فوراً بولیں، ''ہائے ہائے۔ پھینکو یہ پلیٹ اور نیا کھانا نکالو۔''

میں نے ادب سے سمجھانے کی کوشش کی کہ بچی نے دو چمچے چاول بچا دیے۔ میں نے اسی پر گرم کھانا ڈال لیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ میرے اٹھ آنے کے بعد ان محترمہ نے میرے کھانے پینے سے اندازہ لگایا کہ غالباً بے چاری کسی غریب گھر کی ہے۔ چھوٹے شہروں میں لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں جواباً عرض کیا ''غالباً نہیں، میں یقیناً ایک چھوٹے شہر کے ایک چھوٹے سے غریب سے گھر سے ہوں اور ہمارے گھر کی بنیادی تربیت یہ ہے کہ رزق ضائع کرنے کو گناہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔''

اس واقعے کے بعد جہاں کہیں ان کو موقع ملتا، کوئی نہ کوئی تیکھا، چبھتا ہوا جملہ ضرور

پھینکتیں۔ ایسے کتنے واقعات سنا سکتی ہوں جس میں زیور نہ لادنے، بچوں کا بچایا کھانے، آدھے کھائے نان کو لپیٹ کر بیگ میں ڈالنے، پوری آستینیں پہننے اور ساڑھی کے پورے بلاؤز کے استعمال پر ایک خاص حلقے میں میرا مذاق اڑایا جاتا۔ مجھے ہنسی آتی۔ میں دل میں سوچتی کہ اگر یہ بڑبولے اور نودولتیے مادہ پرست اور خالی برتن خود کو کلچرڈ اور تہذیب یافتہ کہتے ہیں تو ہم چھوٹے شہر کے غربا اور پینڈو گنوار ہی اچھے۔

••

بچوں کے لیے کھانا بناتے ہوئے میں نے سودا منگوانے کی فہرست لکھی۔ اس میں ''اوریگانو'' کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ بچوں کو اس کی مہک اچھی لگتی ہے۔ ہمارے صاحبزادے ابتدائی بچپن سے کھانے پینے کے معاملے میں اپنی خصوصی پسند رکھتے ہیں۔ ''اوریگانو کیا ہوتا ہے۔'' ابا جی نے اپنے فطری تجسس اور سادگی سے پوچھا۔ ہماری بیٹی ان کو بتانے لگی ''نانا ابو، یہ ایک اٹالین مسالہ ہے جو سپاگیٹی، لزانیہ اور میکرونی میں ڈالتے ہیں۔''

''اچھا؟'' ابا جی بولے، ''آپ کے ماموں کو فون کر دیتے ہیں کہ لاہور سے واپسی پر اوریگانو بھی لیتے آئیں۔''

چند دن تک گھر میں اس مسالے کا چرچہ رہا۔ بالآخر ماموں صاحب آئے تو مسالہ بھی لائے۔ ابا جی نے بڑے اشتیاق سے چھوٹی سی شفاف تھیلی میں سے اوریگانو کی ننھی پتیاں نکالیں، پھر ہاتھ پر رکھ کر سونگھیں اور بے اختیار ہنس پڑے۔

''جاؤ لڑکو، اسے دواخانے سے اجوائن کے پتوں کی بوری بھر کر لا دو۔ دس دنوں سے اوریگانو کی گردان نے سوچ میں ڈال رکھا تھا کہ اطالوی مسالے کیسے ہوں گے۔''

اب تو گھر میں جو بھی آتا اسے ہمارے یورپی مسالے کی داستان مسالے لگا کر سنائی جاتی۔

امی جی ہنس کر بولیں، ''وہ جیسے فلاں کی بہو کہنے لگی کہ بچوں کی ''گرینی'' آرہی ہیں۔ میں سوچتی رہی پتہ نہیں کیا آرہا ہے۔ جب گرینی آئیں تو وہ بہن سکینہ نکلیں۔ میں نے کہا ''نانی کہتے ہوئے کیا سیاپا پڑتا ہے تم لڑکیوں کو۔ یہ اٹالین مسالہ بھی گرینی ہی نکلا ہے۔''

اب تو ابا جی کی تحقیق کے شوق کو نئی راہ ملی۔ انھوں نے مزید اطالوی مسالوں کی فہرست نکالی، اسی طرح، جائفل اور جاوتری جنھیں اٹالین مسالے ''نیٹ میگ'' کہہ کر مرعوب کرنے کی کوشش

کی جاتی ہے۔ پھر بچوں کو جائفل کا پھل دکھایا گیا۔ اس کے اوپر لپٹے سرخ غلاف کو جاوتری کہتے ہیں۔ جائفل کی مقدار کم سے کم استعمال کرنی چاہیے البتہ بیبیاں اسے جلد کی حفاظت کے لیے استعمال کریں۔ یہ ہزاروں کی کریموں سے بہتر ہوتی ہے۔

''لو جی،'' امی جی بولیں، ''اسے ایک نیا ٹوٹکہ بتا دیں تا کہ یہ میرے سارے مسالے منہ پر مل کر بیٹھ جائے۔''

میں ابا جی کے لیے شہد اور چیا سیڈ کی بوتل لے کر گئی۔ ابا جی نے بہت شوق سے بوتل میرے ہاتھ سے لی۔ ''چیا سیڈ'' انھوں نے اپنی عینک پہنی اور بستر پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں چند خواتین مجھے ملنے آ گئیں۔ میں دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ رات کو ابا جی کے کمرے میں آئی تو میرے چیا سیڈ کے شہد والے ڈرنک پر ان کی تحقیق تیار تھی۔ پہلے تو حسبِ معمول ان کی روشنی پھیلاتی ہنسی گونجتی رہی۔ مجھے اپنے بچپن پر اس ہنسی کا نور تنا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایک مرتبہ میری ایک سہیلی نے گھر جا کر حیرت سے بتایا کہ ابا جی تو خود بھی ہنستے ہیں اور اپنی بیٹی کو بھی ہنسنے سے منع نہیں کرتے۔ مجھے علم تھا کہ اب اوریگانو کی طرح ہی سے میرے چیا سیڈ کا تیا پانچہ ہونے والا ہے۔

ابا جی نے کہا کہ حکیم ساری زندگی تلسی اور اس کے بیج کے ذریعے علاج کرتے رہے۔ غریب مریض اس کے ذریعے اپنی صحت کو بہتر بنائے رکھتے ہیں۔ عام طور پر اسے ''تخم ملنگا'' کہا جاتا ہے جب کہ اس کا طبی نام تخم بالنگو ہے۔ پنجابی میں یہ ''نیاز بوٗ'' کے نام سے مشہور ہے اور ہندو اسے تلسی کہتے ہیں اور تخم ملنگا (فالودے میں تیرتے ہوئے کیڑے نما بیج) اسی کے بیج ہوتے ہیں۔ گھر میں تلسی لگانے سے مچھر نہیں آتے۔ عربی فارسی میں اسے ریحان کہتے ہیں۔ زیتون اور انجیر کی طرح اس کا ذکر بھی قرآن مجید میں سورہ الرحمن اور سورہ الواقعہ میں ہے۔ تلسی کو تقریباً ہر مذہب اور معاشرے میں مقدس اور خصوصی مقام حاصل رہا ہے۔ مندر اور چرچ کی قدیم رسومات کی ادائیگی میں اسے استعمال کیا جاتا تھا۔

''ابا جی ہر مذہب ہر اچھی چیز پر اپنا غاصبانہ قبضہ کر لیتا ہے۔ پھر اس کے استعمال کے قواعد وضوابط بنا دیتا ہے جو صرف عوام کے لیے ہوتے ہیں۔'' میں نے اپنا نکتۂ فکر بیان کرنا ضروری سمجھا۔

''خیر اب ایسا بھی نہیں ہے۔ کاغذ قلم اور علم مذہب ہی کے ساتھ متعارف کرایا گیا تو ان علوم کے بارے میں بھی درج کیا گیا۔ یہی تاریخ کو محفوظ رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔'' ابا جی کو کوئی

بات اچھی نہ بھی لگتی تو وہ اپنے بالواسطہ طریقے سے سمجھانے کی کوشش کرتے، ''دیکھو بیٹا، قدرت نے صحت، ذہانت، صورت اگر بادشاہوں کے لیے رکھی ہوتی تو عوام کے حصے کچھ بھی نہ آتا۔ حکماء صدیوں سے ان ہی جڑی بوٹیوں کے ذریعے علاج کرتے ہیں۔ یہ جو چیا سیڈ کے نام سے آپ کرشماتی ڈرنک میرے لیے لائی ہیں، ہم اس کی مختلف اقسام کے ذریعے تندرستی بانٹتے ہیں۔ چونکہ یہاں آپ اسے 'بھس کے بھاؤ' سمجھتے ہیں اور ان کی قدر نہیں ہے، نہ ہی خواتین اسے یقین کے ساتھ استعمال کرتی ہیں تو بے قدری بھی بہت ہے۔ لیکن غربا اسی کے ذریعے تندرست رہتے ہیں۔ چند چمچ پانی میں ملا کر پی لیا جائے یا اس میں گڑ بھی شامل کر کے 'چیا ڈرنک' بنا لیا جائے تو غریبانہ معجزے دکھائے جاسکتے ہیں'' ابا جی پھر ہنسنے لگے۔

''اگر ہماری پڑھی لکھی فیشن زدہ بیبیاں اس کو رواج دیں تو ان کے حسن وصحت کے نوے فیصد مسائل حل ہوجائیں۔ وہ سارے امراض بھی جنھیں فیشن ایبل لوگ ''ہارمونک پرابلمز'' کہتے ہیں۔ لیکن کہاں جی، یہ تو باہر سے امپورٹ ہوکر آئے تو ذوقِ یقین کے ساتھ تفاخر بھی شامل ہوجاتا ہے۔''

یہی حشر میرے ''مورنگا پاؤڈر'' (Moringa Oleifera) کا ہوا۔ میں اپنی طرف سے بہت شوق سے ابا جی کے لیے پاؤڈر لے کر گئی اور بقول امی جی، نئے نئے سپاہی کی طرح ''کھوتے دے سینگ پٹ لیاندے'' (نیا سپاہی گدھے کے سینگ بھی اکھیڑ لاتا ہے) ابا جی کو اس کے فوائد بتا رہی تھی جو وہ حسبِ عادت بہت اشتیاق سے سن رہے تھے۔ پھر جب ابا جی نے اس پر تحقیق کی تو وہ سہانجنا نکلا۔ مجھے علم تھا ابا جی نے تایا جان کو بھی بتایا ہوگا اور دونوں بابے مجھ پر ہنسے ہوں گے۔

تایا جان کو بابا کہا جاتا تو شگفتگی سے کہتے، ''اپنے باپ کو کہو بابا، میں کیوں بابا ہوا بھئی۔''

ابا جی نے دواخانے سے لائی بوتل میرے سامنے رکھی، ''بیٹا جب بے چارے حکیم ملتجی ہوتے ہیں کہ اللہ کے بندو، اللہ کی نعمتیں یہاں وہاں بکھری پڑی ہیں، اپنی غذائی عادات بدلو، تو انگریزی ناموں کی ماری خلقت بات سننے کو تیار نہیں ہوتی۔ اب ہارورڈ یونیورسٹی یا کوئی بھی مغربی ادارہ تحقیق کر کے اس کے فوائد ظاہر کرے گا تو پھر سمجھ آئے گی کہ گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے۔ میرے بچے یہ جو آپ نے جوشِ خطابت میں مورنگا ٹری، ڈرم سٹک ٹری، ہارس ریڈش اور میجک ٹری کے نام لیے ہیں، یہ آپ کے گرد و پیش میں اگا ہوا ایک مسکین سا درخت ہے جس کا نام بھی ہماری

زبان میں 'ماہتڑ' سا ہے: سہانجنے کا درخت۔ اس کے پتے، پھلیاں، جڑیں سب کی سب بھرپور غذا ہیں۔ یہ ادویات میں استعمال ہوتا ہے۔ حسن و آرائش کی مرہم میں ڈالا جاتا ہے۔ لیکن ہماری غلطی یہ ہے کہ ہمیں مصنوعات کو مشتہر کرنا نہیں آتا۔ کریں گے بھی تو مقامی نفسیات کے مطابق۔ کوئی کان نہیں دھرے گا جب تک کہ اس پر مغربی ڈاکٹر اپنی سند نہ دے دیں۔''

''آپ کی امی وہ جو ''اسپغول تے کج نہ پھرول'' کہتی ہیں ناں، وہی اسپغول ولایت جا کر بہت معتبر ہوگیا۔ وہ آپ کے چچا کیا کہتے تھے، مسٹر براؤن بن گیا۔'' اتنی لمبی تشریح سن کر میرا بھی منہ بن گیا۔

میرے سامان میں کیمومیلا ٹی کے ڈبے ہوتے۔ ابا جی نے لفافہ بھر کر منگوا دی۔ میں رنگ برنگے ڈبے دکھاتی۔ ''ابا جی ہم اسے کمیل ٹی کہتے ہیں۔''

ایک مرتبہ پھر مجھے گلِ بابونہ پر لیکچر سننے کو ملا۔ پھر ایک مرتبہ خواہش ظاہر کی کہ آپ اردو میں ایک کتاب لکھیں اور اس میں مرکزی خیال خواتین اور بچوں کی صحت رکھیں تاکہ بچیوں کو روشناس کرایا جاسکے کہ اپنی ذات کی دیکھ بھال کے لیے اور بچوں کی صحت اور پرورش کے لیے بہت زیادہ پیسے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ سب ہمارے نصاب کا بھی حصہ ہونا چاہیے۔''

''یہ لیونڈر ٹی ہے،'' میں نے ایک اور ڈبہ نکالا۔

''جی جی، ہم کہتے ہیں تو نئی نسل سننے کو تیار نہیں، اہلِ مغرب کہہ دیں گے تو آمنا وصدقنا۔ یہ سب صدیوں پرانے نسخے ہیں بیٹا۔ پورا ڈنمارک بچوں کو کمیل ٹی پلاتا ہے اور اسے نجانے کون سی کرشماتی دوا سمجھتا ہے۔ عام چائے تو انگریزوں کی عیارانہ چال سے مشہور ہوئی۔ غلاموں اور سپاہیوں کو کالی چائے بھوک مٹانے کی غرض سے دی جاتی۔ مغلوں نے اس میں دودھ اور شکر کا اضافہ کر کے صحت بخش بنا دیا۔''

''بچے ہوں یا بڑے، پیٹ کی تکلیف میں گرم قہوے سے بڑھ کر کوئی موثر اور سہل علاج نہیں ہے۔ حکما صدیوں پہلے سے ان ہی جڑی بوٹیوں کے قہوے پلاتے آئے ہیں لیکن ان کو قدامت پسندی کہہ کر رد کر دیا جاتا تھا۔ اب یہی چیزیں ماڈرن ہونے کی نشانی ہوگئیں اور سائنس اپنی مہر لگا دے تو پھر سونے پر سہاگہ ہوگیا۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ صرف ان نباتاتی قہوے اور چائے پر کتاب لکھی جاسکتی ہے۔''

ابا جی کہا کرتے تھے کہ ''ملاوٹ بھری اس چائے کو پینے سے بہتر ہے کہ پھولوں اور

پتوں کی تازہ چائے بنا کر پی جائے جس سے بشاشت بھی حاصل ہو اور صحت بھی۔'' ان ہی اسباق نے مجھے نہ صرف اپنی تعلیم کے دوران نمایاں کامیابی دی بلکہ میرے گھر میں زندگی کو بہت سادہ اور سہل رکھا۔ مجھے خود بھی خبر نہیں ہو پائی کہ کب ابا جی کے ان ہی خطبات نے مجھے بھی ''نیم حکیم'' بنا دیا۔

آپا صدیقہ بیگم جب ڈنمارک آئیں اور انھوں نے مجھے کچن میں کام کرتے دیکھا اور پھر میرے مسالوں اور نباتات والی الماری دیکھی تو بڑی سادگی سے بولیں، ''اے کڑیے، توں تے حکیم ایں پوری۔'' میرے پکائے ہوئے کھانوں کی صحت مند انداز کی فراخ دلی سے کی گئی تعریف نے مجھے جہاں شادمان کیا وہیں مجھے ابا جی بھی یاد آئے، جن کی تعلیم و تربیت کا یہ حصہ تھا کہ حسن و صحت کا اصل مرکز باورچی خانہ اور عورت ہے۔ وہ کتنی اہم طاقت ہے، اسے خبر ہی نہیں۔ وہ مساوی حقوق کی اندھا دھند جنگ میں سب کچھ جھونک دیتی ہے حالانکہ اللہ نے اسے برابری دے کر نہیں بلکہ مرد سے کئی قدم آگے رکھا ہے۔ وہ بذاتِ خود ایک بیج ہے جس سے نجانے کیسے کیسے رنگوں کے پھول، پودے اور درخت اگتے ہیں۔

ابا جی کو میری صحت کی ہمیشہ فکر ہوتی اور وہ کوئی نہ کوئی نسخہ مجھے تھماتے رہتے۔ مجھے مائیگرین کی شکایت ہوئی تو ابا جی نے سونف، خشخاش، بادام، اخروٹ، کالی مرچ اور دار چینی کا سفوف میرے ہاتھ پر رکھا، ''چلو شاباش، اس کو پھانک لو اور اگر دودھ نہیں پی سکتی تو نہ سہی، بس روز صبح شام دوا سمجھ کر اس کی ایک چمچی کھانی ہے۔ شاباش، جلدی سے پھانک لو۔''

میں ہمیشہ ناک بھوں چڑھاتی لیکن پھر اچانک میں نے اپنے بچوں کو یہی سارے نسخے بہانے بہانے سے کھلانے شروع کیے۔ کبھی کیک میں ڈال کر، کبھی پھینٹی ہوئی کریم میں اور کبھی ابا جی ہی کی طرح منت سماجت کر کے ''پلیز بیٹا کھا لو، سر میں درد نہیں ہوگا، تھکاوٹ نہیں ہوگی۔''

اسی تعلیم کے طفیل ہم نے غذائی عادات، مذہب اور معاشرت کو مربوط کر کے مطالعہ کرنا سیکھا۔ بچوں کی سوچ، عمل، اطوار، گھر کے ماحول اور تربیت کا پتہ دیتے ہیں۔ بچے کا ٹفن کیریر کھلتا ہے تو اس گھر کا پورا رہن سہن، تربیت، معاشرت سامنے آ جاتی ہے۔ اس موضوع کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم نے ایک پروجیکٹ بھی بنایا۔ مسلمان بچے ڈینش بچوں کے پورک کھانے پر انھیں تحقیر کا نشانہ بناتے۔ جواباً وہ ان کے تیز بو والے مسالہ جات کا مذاق اڑاتے جن کی بو ان کے کپڑوں سے بھی آتی تھی۔ پاکستانی بچوں کے کھانے کے ڈبے میں اکثر فرائی کیا ہوا کباب رکھا جاتا۔ روٹی میں

لپٹا ہوا سالن بھی دیکھنے کو ملتا۔ بچے کو فلاں چیز پسند نہیں، بچہ پھل اور سبزی نہیں کھاتا، اسے دودھ دہی پسند نہیں جیسے جواز عام سننے کو ملتے۔

••

ابا جی کا اور گھر میں مدد کے لیے آنے والی آپا کا ایک مکالمہ میں نے بھی سنا۔ وہ ابا جی کو بتا رہی تھیں، ''بچیاں کہندیاں نیں بیوٹی پارلر دا کورس کروا دیو۔''

ابا جی نے سادگی سے پوچھا، ''اس میں کیا کرنا ہوگا انھوں نے؟ کتنی دیر کا کورس ہے؟''

وہ بے چاری سمجھانے کی کوشش کرنے لگی، ''او جی کڑیاں ووہٹیاں بنن آندیاں نے، مہندی شہندی لاندیاں نیں (دولھنیں بننے آتی ہیں اور مہندی وغیرہ لگائی جاتی ہے)''

ابا جی کو واقعی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس میں فائدے والی کیا بات ہے۔ بوتیک اور کپڑوں کی ڈیزائنگ اور سلائی کی بات ہو تو سمجھ آتی ہے کہ ظاہر ہے جتنے کپڑے سی لو اتنا منافع ہو جاتا ہے۔ بچیوں کو گھر بیٹھے آمدنی ہو جاتی اور ہنر بھی ہاتھ آ جاتا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ آپا بے چاری کے ستارے الٹی چال چل گئے کہ ان دنوں لاہور میں ایک لڑکی بیوٹی پارلر میں آرائشِ گیسو کے دوران بجلی کا کرنٹ لگنے سے جاں بحق ہو گئی۔ خبروں میں اس واقعہ کا خوب چرچہ ہوا۔ اگلے دن ابا جی نے ماں بیٹی کو طلب کر لیا۔ پہلے تو جاں بحق ہونے والی دولھن کا غم کھایا جاتا رہا۔ پھر پوچھا،

''وہ اس کے بالوں کے ساتھ کر کیا رہی تھیں؟ سر میں بجلی کا تار کیسے چلا گیا؟ پوچھنے لگے، ''ذرا سمجھاؤ مجھے بھی یہ گھر گھر کیا کاروبار ہے؟ میٹرک کر کے بچیاں مشاطگی کے کون سے منتر پڑھتی ہیں کہ عورتیں دیوانہ وار سیکڑوں روپے لٹا آتی ہیں؟''

اس معصوم نے رنگت نکھارنے کی ایک کریم کا ذکر کیا کہ تقریباً ہر بیوٹی پارلر والی تین چار کریمیں ملا کر ایک نسخہ دیتی ہے۔

''کون کون سی کریمیں؟'' ان کی جرح جاری تھی۔

مجھے سارے نام تو اب یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ جونہی اس نے بیٹنو ویٹ کریم کا نام لیا تو ابا جی ناراض ہونے لگے ''کیا، کیا کہا؟ آپ لوگ بیٹنو ویٹ ملاتی ہو کریموں میں؟''

وہ بے چاری سہم گئی، ''سب ہی ایسے کرتے ہیں جی۔'' بس پھر کیا تھا۔ عورتوں کی سختی آ گئی۔ وہ جو ہر وقت حقوقِ نسواں کی باتیں اور نسائی ہمدردیاں تھیں، کسی پٹارے میں بند ہو گئیں۔

''ان جاہل عورتوں کو کوئی سمجھانے والا نہیں کہ اپنی صحت سے نہ کھیلیں؟ یہ کیمیائی مرکبات شدید خطرناک ہیں۔ ارے بی بی! مت بھولو کہ سرطان ہوتا ہے جلد کا۔ آنکھوں کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ صرف ایک جلد کا ڈاکٹر ہی نسخہ بنا کر دے سکتا ہے۔ کاش ان عاقبت نااندیشوں کو علم ہو سکے کہ اللہ نے قدرتی اجزا میں انسانی صحت و حسن کا خزانہ رکھا ہے۔ ہلدی، صندل، لیموں، دودھ اور سبزیوں کے عرق سے بڑھ کر کوئی ایسا کیمیائی مادہ نہیں جو جلد کو تر و تازہ رکھے۔ ان عورتوں کو باشعور بنانے کی ضرورت ہے۔ بچیاں تو بالکل بھی ان کے پاس نہ پھٹکیں۔ بالوں کو رنگ کروانے اور اوٹ پٹانگ جلد کے لوشن کریموں میں ایسے مادے ہوتے ہیں جو جسم میں جذب ہو جاتے ہیں اور آنے والی نسلوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔'' وہ ماں بیٹی بس جی جی کرتی رہیں۔

بعد میں آپا امی سے کہنے لگی کہ میری بچیاں گاؤں شادی پر گئیں، وہاں میک اپ اور تھریڈنگ سے تین چار ہزار روپیہ کما لائیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب اگلے چند دن آپا پر بھاری گزریں گے۔

اب ابا جی ایک نیا مشورہ لے آئے، ''اچھا ایسا کرو کہ جڑی بوٹیوں سے علاج کرو اور نباتاتی نسخے متعارف کراؤ۔ بیبیاں خود سیکھ لیں کہ گھریلو انداز میں وہ خود کیسے اپنا خیال رکھیں، فعال اور متحرک رہیں، پانی زیادہ پئیں۔'' افسوس اس بات کا ہے کہ اس موضوع پر ان کی سنی ہی نہیں گئی۔ چند ہی سال میں قرب و جوار میں دھڑا دھڑ بیوٹی پارلرز کے رنگ برنگے بڑے بڑے سائن بورڈ سجنے لگے۔ پریشان ہو کر کہتے، ''یہ عورتیں اپنے مسائل کیا خاک کم کریں گی؟ یہ تو پیسے دے کر مسائل خریدتی ہیں۔'' اگرچہ ابا جی حقوقِ نسواں اور خواتین کی تعلیم و تدریس کے سرگرم علمبردار تھے لیکن اکثر وہ ان کی عمومی نفسیات کے بارے میں نالاں بھی ہوتے۔

مجھے ایک مرتبہ پیٹ کی سرجری کے بعد ایک ٹانکے میں چھوٹا سا زخم ہو گیا۔ اس کے اوپر ڈاکٹر نے بیٹنو ویٹ کریم لگانے کا کہا۔ نرس مجھے خصوصی کمرے میں لے گئی ایک پوری پٹی اس نے زخم پر رکھی اور اس کے اوپر صرف اتنا سا سوراخ کیا جس پر کاٹن کی سلائی سے ایک نقطے کے برابر بیٹنو ویٹ کریم لگائی جا سکے۔

''یہ باقی کسی حصے کو نہ چھوئے'' نرس نے تاکید کی اور پھر کریم خریدنے کے لیے رسید بنا کر دی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ ابا جی نے بیٹنو ویٹ کریم لگانے پر اتنا شدید ردِعمل کیوں ظاہر کیا تھا۔

••

ابا جی کو میں سکول میں تمام بچوں کے کھانا پکانا اور گھر داری سیکھنے کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ایک گروپ کو تیل کے ساتھ کھانا بنانا تھا اور دوسرے کو تیل کے بغیر، امی جی اور باجی عظمت پاس بیٹھی سن رہی تھیں۔

''ہا ہائے باجی۔'' آپا عظمت نے آلو چھیلتے چھیلتے ہاتھ روک کر کہا۔ ''تسیں ولایت وی ہانڈیاں پکانڑا سکھاندے او؟''

بے چاری کی توقعات کو شدید ٹھیس پہنچی تھی۔ میں اپنی تمام تر تدریسی مہارت بروئے کار لا کر سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ نیوٹریشن کا آسان ترجمہ بتا سکوں اور یہ کہ درسگاہوں میں دسویں جماعت تک کر بچے کو کھانا پکانا سیکھنا پڑتا ہے اور کھانے کی صحت مند عادات، اور یہ کہ غذا میں کتنی طاقت ہے۔

''پتر۔ یہاں ہم جو جتن کرنے سکھاتے ہیں کہ غذائی قلت دور کیسے ہو، وہاں اتنے ہی کھکھیڑ کر کے سمجھایا جاتا ہے کہ غذائی ضروریات سے کم کیسے کھاؤ۔'' ابا جی ہمیشہ کی طرح میری مدد کو آئے۔

••

ابا جی کی چونکہ ان گنت بھانجیاں اور بیٹیاں تھیں، ان کی ایک عدد بیٹی صاحبہ کہیں بیرونِ ملک سے آئیں۔ ان کا وزن بے تحاشہ بڑھ چکا تھا اور گھٹنوں میں بھی تکلیف رہنے لگی تھی حالانکہ ابھی عمر چالیس سے بھی کم تھی۔ کہنے لگیں، ''ماما جی، بس کوئی ایسی دوائی ہو جو میرا وزن کم کر دے، نسخہ بے شک جتنا مرضی مہنگا ہو۔''

ابا جی نے انھیں دوا دی۔ بے حد اصرار کرنے لگیں کہ دوا کے پیسے ہر صورت میں دینے ہیں، ایسا نسخہ مہنگا بھی بہت ہوتا ہے۔ ابا جی کہنے لگے، ''ہاں مہنگا تو بہت ہے اور اگر آپ نے ساتھ بتائی ہدایات پر عمل نہ کیا تو سارا پیسہ بھی ضائع ہوگا اور دوا کا فائدہ بھی نہیں ہوگا۔'' وہ تقریباً آٹھ ہفتے رہیں۔ عموماً پاکستان جا کر ویسے بھی وزن میں ذرا کمی آجاتی ہے اور جب ساتھ پرہیز بھی ہو رہا ہو اور بازاروں کے والہانہ چکر بھی لگائے جائیں تو ویسے ہی نتائج اچھے ہوتے ہیں۔ ابا جی نے انھیں بلاناغہ اپنے گاؤں کا تازہ ساگ بغیر گھی کے تڑتڑاتے چھینٹوں کے پکوا کر کھانے کو کہا۔

''کون سا ساگ؟'' انھوں نے استفسار کیا۔ ''جتنی اقسام کا بھی مل سکے یا تو ملا کر بنا لینا یا پھر ہر روز بدل بدل کر کھانا ہے۔ اور روٹی بھی باجرہ، مکئی، جو، بیسن ملا کر پکوانی ہے اور بغیر مکھن کے

کھانی ہے۔ میٹھا کھانے کو جی چاہا تو صرف اپنے گاؤں کا گڑ کھا سکتی ہیں۔ چاول بالکل نہیں کھانے اور دوا کا نسخہ صبح خالی پیٹ کھانا ہے۔''

جب آٹھ ہفتے بعد وہ واپس جانے لگیں تو ملنے اور ساتھ ہی مزید تین ماہ کی دوا لینے آئیں۔ وزن بھی کافی کم ہو چکا تھا اور سانس بھی نہیں پھولتا تھا۔ ابا جی نے وہ فیس جو وہ پچھلی مرتبہ زبردستی میز پر رکھ کر جا چکی تھیں، ان کے بیٹے کے ہاتھ پر رکھی اور کہنے لگے، ''نسخہ میں آپ کو لکھ دیتا ہوں، جس کو بھی ضرورت ہو اسے دیجیے اور صدقہ جاریہ بنیں۔

وہ نسخہ کیا ہے؟ صرف دار چینی اور اصل درخت سے اتارے شہد کی گولیاں۔ سفوف کلونجی، اجوائن، زیرہ، دار چینی اور لاکھ دانہ کو ہم وزن لے کر پیس دیا گیا ہے۔ ہاں، جو بھی استعمال کرے، پہلے چیک کرا لے کہ بلڈ پریشر زیادہ تو نہیں۔'' وہ خاتون ہکا بکا رہ گئیں۔

ابا جی نے کہا کہ ''آپ خواتین کی عمومی نفسیات ہی یہی ہے مہنگے نسخے، مہنگی ادویات اور مہنگی کریمیں خرید کر آپ خواتین کا یقین کامل ہوتا ہے لیکن عمومی ذہانت اور عام منطق کے تحت تبدیلی آپ کو مشکل لگتی ہے۔ خواتین جب تک فعال زندگی نہیں گزاریں گی اور کھانے پینے کی عادات کو معتدل نہیں بنائیں گی ان کو یہ مسائل پیش آتے رہیں گے اور وہ امراض کا نشانہ بنتی رہیں گی۔''

''صبح نہار منہ گرم پانی پینے کی عادت ڈالو۔ کھانے سے پہلے پانی پیو جب کہ فوراً بعد میں پینے سے گریز کیا جائے۔ کھانا چبا کر کھایا جائے اور اپنا کام خود کیا جائے۔ ایسی طرزِ زندگی سے چھوٹی موٹی تکالیف تو خود ہی رفع ہو جاتی ہیں۔ گھر میں نوکروں چاکروں کی وجہ سے یا پھر ہمارے معاشرے میں بہو کے آ جانے سے ساس صاحبہ آرام کو فرض سمجھ لیتی ہیں۔ بس یہاں سے ہی ان کی صحت تباہ ہونے کا آغاز ہو جاتا ہے۔''

ان معاملات میں ابا جی کی ان بے چاری عورتوں سے ہمدردیاں ختم ہو جاتیں اور شاید تلقین کی میٹھی گولی سے مایوس ہو کر وہ نسخہ بدل کر تنقید کا کوڑتمہ (حنظل) دینے لگتے۔

''ان عورتوں کا مسئلہ یہ بھی تو ہے کہ وہ ایسی سادہ باتوں اور دیسی نسخوں کو بہت معمولی سمجھتی ہیں۔ جب تک بڑے ڈاکٹروں کی فیس نہ بھر لیں اور بیوٹی پارلرز (اب تک ابا جی کو بیوٹی پارلر کی سمجھ آ چکی تھی) جا کر صورت کی ناس نہ مار آئیں، انھیں یقین نہیں ہوتا کہ آرائشِ حسن ہو چکی ہے۔''

بیوٹی پارلر کی نئی آفت کے ساتھ ساتھ ابا جی کو عورتوں کی توہم پرستی اور ذہنی پسماندگی

سے بھی بہت خار تھی۔ کبھی جب سنتے کہ اچھی بھلی پڑھی لکھی خواتین تعویذ گنڈوں کے چکر میں پڑی ہیں تو بہت مایوس ہوتے۔ کبھی یہ مایوسی ناراضگی میں بدل جاتی۔ ''گھر میں خود سربسجود ہو کر اللہ سے ہمکلام نہیں ہونا جو خود کہتا ہے کہ میں ولی ہوں، دوست ہوں، غمخوار ہوں، میرے پاس آؤ۔ آدھی رات کو دنیا کا حاکم خود اپنے بندوں سے پوچھتا ہے کہ ہے کوئی مانگنے والا کہ اس کا دامن بھر دوں۔ بس یہ عورتیں پیروں فقیروں کے پاس چینی پانی لینے دوڑ پڑتی ہیں۔'' ابا جی روانی میں بول رہے تھے اور ہم کان دبائے بات سنتے رہے۔

خواتین بے چاری اپنی صحت سے غفلت کرنے پر اکثر ڈانٹ بھی کھاتیں۔ ایک دفعہ ایک محترمہ قریبی گاؤں سے اپنی بہو سمیت آئیں۔ خاندان سارا ولایت تھا۔ بڑے کروفر سے بات کرتیں۔ ابا جی نے گھر بھیجا۔ معصوم سی دبلی پتلی لڑکی نے آنکھوں میں بھر بھر کے سرمہ ڈال رکھا تھا۔ مہندی ہاتھوں پر لپٹی اور سینڈل کی درزوں سے جھانک رہی تھیں۔ چہرے پر ہلکی سی چھائیاں تھیں۔

امی نے مبارک دی، ایک قمیص دوپٹہ ان کو دیا اور ایک سوایک روپیہ بہو کے ہاتھ پر رکھا۔

ابا جی کھانے پر گھر آئے تو وہ شروع ہوگئیں، ''لالہ جی، آج کل کی لڑکیاں منہ پر جانے کیا الابلا لگاتی ہیں، دیکھیں ذرا کل کی دولھن ہے۔ رنگ خراب ہوگیا، منہ تے چھائیاں پے گیاں نیں۔''

''بہن جی بات یہ ہے کہ پہلے آپ اور آپ کے بیٹے ان بچیوں کو ماڈرن دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں یہی الابلا لگائی بیویاں بھاتی ہیں۔ آپ اپنے ہاتھوں ڈھونڈ کر چاند سی بہو لاتی ہیں۔ پھر جب چاند، زندگی کے حقائق کے بادلوں سے گزرتا ہے تو آپ بجائے ساتھ دینے کے انھیں پریشان کرتی ہیں'' ابا جی اپنی مثالی حق گوئی سے بولے، ''پھر آپ مسائل لاتی ہیں کہ اب بیٹا دوسری شادی پر تل گیا ہے۔ گھر میں سکون دیں۔ بچی کو دوا باقاعدگی سے دیں۔ دودھ اور پھل بہت ضروری ہیں۔ گلقند اور انجیر کھلائیں۔''

''پتر،'' ابا جی اس چھوئی موئی کے پودے سے بولے ''رات کو سیاہ تل، زیرہ، ہلدی اور بالائی والا نسخہ ضرور استعمال کرنا ہے۔''

ساس صاحبہ خاموش ہوگئیں۔ یقیناً کچھ مسائل کا شکار تھیں۔

••

ان دنوں میں نے کیا کیا نسخے نہ لکھ کر رکھے۔ دہی اور چاٹی کی لسی کے نسخے، گڑ دودھ اور

لیموں کے نسخے، لہسن اور پیاز کے پانی کا استعمال، شہد، دودھ، دہی، بادام، اخروٹ اور پستہ وغیرہ۔ انڈوں کے ساتھ ماسک بنانے کے لیے ہم معروف نہیں بدنام ہو چکے تھے۔ امی جی کی مرغی اور انڈے کے محاورات کو ایک نیا رنگ دے لیا۔ جہاں انڈے دکھائی دیتے، میرا ذوقِ جمال انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتا اور انڈے، دہی، تیل، شہد اور ایلو ویرا کو گھول گھال کر ماسک بنا دیے جاتے۔

''اک منہ تے لگ گیا اے'' امی بگڑ کر بولیں، ''اب سارا دن دنیا جہان کے نسخے ٹوٹکے اس پر استعمال کر کر کے دیکھو۔''

''اچھا، اک ڈِھڈ تے لگ گیا اے۔ ساری عمر لوگ کماتے پکاتے ہیں، اس دوزخ کو بھرنے کے لیے۔ میں نے ایک بالائی میں خالص شہد ملا کر رُوئے روشن پر کیا لگالیا، مچ گیا شور اے۔ امی یہ سراسر ناانصافی ہے۔ جو رنگ برنگی کریموں پر وقت پیسہ صحت سب تباہ کرتے ہیں انھیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔

حکمائے کرام کا فرمان ہے کہ لمبے دراز اور چمکیلے بالوں کا راز انڈے، تیل اور دہی میں ہے۔'' میں نے چھٹی کے دن صبح دو انڈوں کا آملیٹ بنایا۔ امی جی نے پراٹھے بنا کر رکھے تھے۔ اچار اور دہی سے سجا کر ناشتہ کیا۔ پھر خیال آیا کہ یہ جو دو انڈے پڑے ہیں کیوں نہ ان کو بالوں میں لگا لیا جائے؟ اہتمام سے دہی اور تیل ملا کر پھینٹا اور سر میں لگا کر کتاب پکڑی اور دھوپ کے تعاقب میں صحن میں جا بیٹھی۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ بھائی جان آگئے۔ ناشتہ کرنے کی غرض سے کچن میں گئے۔ امی جی دوپہر کے لیے سبزی بنانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ فرزندِ ارجمند کو اپنے ہاتھ سے ناشتہ بنا کر دینے بیٹھیں تو انڈے ندارد! ''کمال ہے، ابھی یہاں انڈے پڑے تھے'' امی حیران ہو رہی تھیں۔

میں نے وہیں سے آواز لگائی، ''ناموجود کو موجود کرنے کی کوشش مت کیجیے امی جی، دو کھا لیے ہیں اور دو سر میں لگا لیے ہیں۔''

امی جی کو جو تاؤ آیا سو آیا۔ میری شان میں قصیدہ پڑھا۔ پھر رک کر اپنے نورِ نظر سے بولیں ''چلو تم نہا لو، میں اور انڈے منگواتی ہوں۔'' تایا جان کا ننھا منا پولٹری فارم زندہ باد۔

''نہیں امی جی'' بھائی جان آرام سے بولے، ''میں نے تو وہی انڈہ کھانا ہے جو اس نے بالوں میں لگایا ہے۔''

''اسے تیل کی کڑھائی میں ڈبوئیں'' میرا چچا زاد بھائی بولا، وہ ہمیشہ مجھ سے نالاں رہتا

تھا،''اس کے سر سے مومیائی سمیت انڈہ برآمد ہو جائے گا۔''

مجھے آگ ہی تو لگ گئی۔ میں نے کتاب بند کی، آستینیں چڑھائیں،''اور تم خود سب کے اٹھنے سے پہلے جو چار میٹھے انڈے بنا کر کھاتے ہو پینڈو کہیں کے؟''

امی جی ناشتہ بنانا بھول کر جو میری زبان درازی، بدتمیزی اور جہالت کی رپورٹ پیش کرنے لگیں تو میں نے اٹھ کر غسل خانے کا راستہ لیا۔

''تائی جی رہنے دیں'' وہ آرام سے دوسرا چائے کا کپ اٹھا کر منہ سے لگاتے ہوئے بولا،''اس کے کہنے سے کیا میں اب کھانا پینا چھوڑ دوں؟''

••

تایا جان دوا خانے سے آملے ریٹھے اور سیکا کائی کا پاؤڈر بھیجتے۔ جب بھی کوئی پوچھتا آپ کی بیٹی شیمپو کون سا لگاتی ہے، امی سوچ میں پڑ جاتیں،''شیمپو تو کوئی خاص نہیں آتا، پتہ نہیں باقی الا بلا کیا لگاتی رہتی ہے۔''

وہ تشکیک سے میری دراز چٹیا کو دیکھتیں،''اچھا، پھر الا بلا کا ہی نسخہ بتا دیجیے۔''

مجھے نہیں یاد کہ کوئی ایسا نسخہ ہو جس کا ان حکما نے تذکرہ کیا ہو اور میں نے استعمال نہ کیا ہو۔ اکثر خواتین اپنے مسائل لے کر آتیں تو ابا جی ان کو گھر بھیج دیتے۔ وہ امی جی کو کہانیاں سناتی رہتیں۔ ان دنوں سعودی عرب کی طرف قافلے روانہ تھے۔ گھروں میں ریال کھنکنے لگے اور نیویا کریم بھی عام ہوتی گئی۔

ایک خاتون اپنا پرانا مسئلہ لے کر آئیں۔''حکیم صیب، چہرے پر چھائیاں پڑ گئی ہیں۔ کریماں لگا لگا کے پھاوی ہوگئی آں کوئی فرق نہیں، کیا کروں؟''

''کچھ بھی نہیں کرنا'' ابا جی اپنے سہل ترین انداز میں بولے،''گھر میں مسور کی دال تو ہے ناں؟ بس وہی لگانی ہے۔''

''کیہڑے مَسر حکیم صاب؟'' وہ سادگی سے بولی،''ثابت کہ دَلے؟'' (ثابت یا کوٹے ہوئے)

''دَلے ہوئے سرخ مسور'' وہ بولے۔

''دال پکا کے؟'' اس کا اگلا سوال تھا۔

''ہاں'' میں نے اس کے سامنے سے شکنجبین کا خالی گلاس اٹھایا،''لہسن کا تڑکا لگا کے، دو

پیچھے اُبلے چاول بھی ڈالنے ہیں۔''

''اچھا باجی، کھانے نہیں؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''نہیں ڈیرے پر جانے سے پہلے منہ پر لگانے ہیں۔۔۔'' میں نے بہت سنجیدگی سکون سے کہا۔

''ہیں باجی'' اس بے چاری کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ابا جی جو اب تک چپ کر کے بیٹھے تھے، آرام سے بولے، ''بیٹا اندر جاؤ اور اسے پیسٹ بنا کر دکھاؤ۔''

اب سکون سے دیکھنے کی باری اس کی تھی۔ میں ''ہور چوپو گنے'' کی حکایت یاد کرتی کچن روانہ ہوگئی۔

یورپ میں طویل قیام بھی میری قدرتی اور نباتاتی اجزاء کے استعمال کی عادات نہ بدل سکا بلکہ غذا، صحت، ماحولیات اور غذا اور افزائشِ حسن کی مصنوعات میں کیمیائی مرکبات کی تباہ کاریوں سے آگاہی نے مزید اضافہ کیا۔ گرمی کی چھٹیوں میں پاکستان گئے۔ ہم نے اپنے بھتیجے سے کہا، ''انڈہ چاہیے بیٹا۔''

''پھوپھو فریج بھرا پڑا ہے،'' اس نے کہا۔

''نہیں، مجھے دیسی مرغی کا تازہ انڈہ چاہیے۔''

میرا مطالبہ سن کر اس معصوم نے یہ بھی نہ پوچھا کہ آپ نے کرنا کیا ہے دیسی انڈے کا۔ سیڑھیاں پھلانگتا نیچے مرغیوں کے ڈربے کے پاس انتظار کرنے بیٹھ گیا۔ اس بے چارے نے مچان پر بیٹھے شکاری کی طرح کیسے انڈہ حاصل کیا، یہ ایک الگ داستان ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھولی سانسوں سے مٹھی میں انڈہ دبائے اوپر آیا، ''پھوپھو، پھوپھو! یہ لیں۔ انڈہ ابھی گرم ہے۔''

''ماں صدقے۔۔ میرا بچہ'' مجھے بے اختیار پیار آیا۔ فوراً اٹھ کر بھاگی۔ میرے پیچھے پانچوں بھتیجے قطار بنائے مجمع لگا کر کھڑے ہوگئے، ۔ جیسے ابھی انڈے سے کبوتر نکال کر دکھاؤں گی۔ میں نے فوراً انڈہ توڑا۔ زردی الگ کی۔ اس میں درخت سے اتارا شہد ڈالا۔ ذرا سی بالائی ملائی اور چہرے پر لگانی شروع کی۔

''ای ی، آئیں، ایز ززز، آ ئے، پھوپھو گندہ۔ افففف''

سب کی ملی جلی آوازیں آئیں۔ میں نے مکمل نظر انداز کر کے سفیدی پھینٹ کر اس میں بادام کا تیل ڈالا اور اسے بھی چہرے پر تماشہ دکھاتے مداری کی طرح لگایا۔ ''یہ لیں پھوپھو تولیہ،''

بھتیجے نے پھرتی سے میرا اگلا کرتب دکھانے سے پہلے تولیہ پیش کیا۔ انڈے کا کریا کرم تو جو ہوا سو ہوا، اب اس کی داستان آج تک خاندان میں آنے والے ہر نئے فرد کو سنائی جاتی ہے اور امید واثق ہے کہ سینہ بہ سینہ چلے گی۔ جب یہ کہانی میرے بچوں کو نمک مرچ لگا کر سنائی گئی تو ہماری صاحبزادی بولیں، ''کوئی نئی بات کریں وقاص بھائی۔ ارے امی کا کیا ہے، امی تو دودھ، دہی، شہد، آلو، ٹماٹر، پیاز، لہسن، کیچپ، مایونیز تک کو منہ پر لگا سکتی ہیں۔''

ہمارے صاحبزادے اپنے گرد ہجوم لگا کر سنانے لگے۔ ''لوگ یورپ سے کریمیں منگواتے ہیں۔ امی ان سے صرف باتھ روم کی سجاوٹ کا کام لیتی ہیں۔ سلاد بناتی ہیں اور باقی سب بچا کھچا منہ پر سجا لیتی ہیں۔''

میری ڈاکٹر اکثر جلد اور بالوں کی صحت کا پوچھتی۔ مسلسل صحت کے مسائل میں جلد خراب ہو جاتی ہے، خصوصاً چہرے اور ہاتھوں کی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں صرف دیسی طریقے سے جڑی بوٹیوں کا استعمال کرتی ہوں۔ میک اپ صرف انتہائی ضرورت کے تحت کرتی ہوں۔

''نو سیرم؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''نو'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''نائٹ کریم؟''

''۔۔۔نو''

''ٹریول میں کیا کرتی ہو؟''

''تیل کے نسخے ہیں اور بالکل آسان حل ہے میرے پاس۔ وٹامن سی اور ای کی گولیاں یا پھر ایلو ویرا کریم۔ بس۔''

''صدف'' وہ سنجیدگی سے بولی، ''تم اردو کے بجائے ڈینش میں کتاب لکھو۔ آج کے کیمیائی دور میں ضروری ہے کہ خواتین کو آگاہی ملے۔ اس کی ضرورت خصوصاً ہماری بچیوں کو ہے جنھوں نے حمل اور وضع حمل کے مراحل طے کرنے ہیں۔ آج کے کیمیائی دور میں ضروری ہے کہ خواتین کو آگاہی ملے اور خاص طور پر مشرقی ممالک سے آئی خواتین کو، جو بلا سوچے سمجھے دیسی بیوٹی کلینک پر جاتی ہیں اور غیر تعلیم یافتہ پیشہ ور لوگوں کے ہاتھوں میں اپنی صحت و سلامتی کا خزانہ رکھ دیتی ہیں اور پھر انھیں معاوضہ بھی دیتی ہیں۔''

''میں کیا کیا کروں؟ آپ کو علم ہے اتنے کام مجھ سے نہیں ہوتے'' میں نے لاڈلے

مریضوں والا جواب دیا۔

''کچھ بھی نہ کرو، جو کچھ تم اردو میں لکھ رہی ہو اس کا ڈینش ترجمہ کر دو'' اس نے مختصر حل پیش کیا۔

میں نے گھر آ کر بچوں کو بتایا کہ میرا خیال تھا ابا جی چلے گئے ہیں اور اب مجھے کوئی بھی مسلسل لکھنے پر نہیں اکسائے گا۔ آج ڈاکٹر نے یہ نئی تجویز دی ہے۔

''بالکل کریں امی جی'' عالیہ نے پرجوش ہو کر کہا، ''بلکہ یہ باتیں ڈینش میں لکھنا اپنا فرض سمجھیں۔ فرانس میں جب خواتین کی موت کی شرح زیادہ ہوئی تو علم ہوا کہ وہ جلد کی خوبصورتی کے لیے جو کریم استعمال کر رہی تھیں اس میں خطرناک کیمیائی اجزا شامل تھے'' اس نے فوراً اپنی ایک تحقیق کا حوالہ دیا۔

''بلکہ امی جی یوں کیجیے کہ یورپ میں جلدی امراض کی تاریخ اور پھر حقائق کی اور امراض کی نشان دہی سے شروع کیجیے اور اختتام نانا ابو کے ان تمام نسخوں پر کیجیے جو بے ضرر ہیں۔''

''لو جی، ایک نیا مشورہ۔ بیٹا پہلی کتابیں مکمل کرنے کے لیے جو وقت اور سکون چاہیے مجھے وہ میسر نہیں۔ مزید کیا کروں؟''

''پاکستان چلی جائیں۔ وہاں آپ خوش رہتی ہیں۔ مزے سے کام کیجیے۔ لیکن نانا ابو کے لیے ڈینش میں ضرور لکھیے ورنہ مجھے یہ کام کرنا پڑے گا'' صاحبزادی نے حل بھی پیش کیا۔

جب ہماری صاحبزادی نے والدہ بننے کی سنہری راہگذر پر پہلا قدم رکھا تو اس نے اپنی ڈریسنگ ٹیبل سے سارا میک اپ اٹھا دیا۔ ہر طرح کی خوشبو کا استعمال بند کیا اور صرف وہی بنیادی اور ضروری مصنوعات رکھیں جو خاص طور پر حاملہ اور رضاعت کے ہارمونز کے تحفظ کے پیشِ نظر بنائی جاتیں۔ پھر مجھے ایک لیکچر دیا گیا کہ ''امی ان کیمیائی کریموں کے ذریعے جو کیمیائی مادے جلد میں اور خون میں داخل ہوتے ہیں وہ جزوِ بدن ہو جاتے ہیں۔ نہ صرف بچے پر اس کا اثر پڑتا ہے بلکہ خواتین میں سرطان کی اور جلدی امراض کی بیماریاں خفتہ رہنے لگتی ہیں۔ یاد ہے ناں جب نانا ابو نے کام کرنے والی آپا کو ڈانٹا تھا کہ بازاری کریموں کا استعمال چھوڑ دو۔ میں تو جب بھی موقع ملا ضرور حکمت اور دیسی جڑی بوٹیوں کا کورس کروں گی'' اور اس نے اپنے اگلے ارادے سے مطلع کیا۔

●●

چچا جان کتب بینی کے ساتھ ساتھ اخبار بینی کے بھی عاشق تھے۔ ان کی ایک عجیب

عادت تھی۔ اخبار سے جہاں کوئی دلچسپ خبر، کوئی اہم تراشہ، یا کوئی تاریخی تصویر ہوتی اسے سنبھال لیتے اور پاکستان آتے ہوئے اسے سوغات کے طور پر لے آتے۔ میں 1996ء میں پاکستان گئی تو انھوں نے ابا جی کو بھوک سے مرتی ہوئی ایک بچی اور اس کی موت کے منتظر ایک گدھ کی تصویر دے رکھی تھی۔ یہ تصویر سوڈان میں قحط کے دوران لی گئی تھی۔ وہاں اقوامِ متحدہ کی جانب سے اشیائے خوردنی کی تقسیم کے مراکز کھولے گئے تھے۔ جب فاقہ کش مخلوق دیوانہ وار ان کیمپوں میں کھانا لینے کے لیے بھاگی تو گویا محشر کا سماں تھا جس میں ماں باپ کو اولاد تک کا خیال نہ رہا۔ خون کی آخری رمق تک ایک نوالہ رزق حاصل کرنے کے لیے لگا دی گئی۔ اسی تقسیمِ رزق کے دوران ایک فاقہ کش بچی بھی رینگتی ہوئی کیمپ تک پہنچنے کی جان لیوا کوشش میں مصروف تھی۔ پاس ہی ایک گدھ اپنی گرسنہ منتظر نگاہیں اس پر گاڑے ہوئے تھا۔ فوٹو گرافر کیون کارٹر نے اس روح فرسا منظر کو اپنے کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرلیا۔

23 مارچ 1993ء کو شائع ہونے والی اس تصویر نے دنیا بھر میں ہلچل مچا دی۔ افلاس، بھوک اور بے بسی کی عکاسی کرتی یہ تصویر فوٹو گرافر کیون کارٹر کو بین الاقوامی شہرت تو دے گئی لیکن ساتھ ہی صحافتی تنقید کا نشانہ بھی بنا گئی۔ ہزارہا قارئین نے سوال کیا کہ اس بچی کا انجام کیا ہوا۔ کیا کیمرہ مین نے صرف مرتے ہوئے بچے کی بے کسی دنیا کے سامنے پیش کی یا کیمرہ ہاتھ سے رکھ کر اس گدھ کو مار بھگایا اور بچی کی مدد بھی کی۔ تصویر پر ایوارڈ پانے کے چند مہینے بعد عین جوانی کے عالم میں صرف تینتیس برس کی عمر میں 27 جولائی 1994ء کو فوٹو گرافر نے خودکشی کرلی۔

اس کا آخری پیغام جو اس کی لاش کے ساتھ ملا اس کی اہم ترین سطور تھیں ''میرے خدا میں عہد کرتا ہوں کہ میں کبھی بھی اپنی خوراک ضائع نہیں کروں گا اگرچہ وہ کیسی ہی بدذائقہ کیوں نہ ہو اور میں کتنا ہی پیٹ بھرا کیوں نہ ہوں۔''

تصویر بنانے اور ایوارڈ لینے کے جنون میں اسے بھی ایک گدھ قرار دیا گیا۔ اس کی خودکشی کا سبب مفلسی، احساسِ جرم، اور ایک کربناک احساسِ شکست تھا۔

ابا جی نے مجھے کہا کہ ذرا اس خبر کے بارے میں اردو میں لکھو۔ فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے رویے عام لوگوں سے کہیں مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن اردو میں لکھنا اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے لوگوں کو رزق کے ایک ایک دانے کی قدر ہوسکے۔ بچوں کے کھانے کی نصف بھری رکابیاں کوڑے دان میں الٹنے والی ماؤں کو علم ہوسکے کہ یہ رزق کھیتوں سے گھر کے نعمت خانوں تک

کیسے پہنچتا ہے۔ بیبیاں چاہیں تو وہ دسترخوان سے رحمت اور برکت اٹھنے ہی نہ دیں۔ 1997 میں شائع ہونے والی کتاب ''سوشل سفرنگز'' (Social Sufferings) میں اس کی مکمل تفصیلات ہیں۔ اس ایک کتاب پر کیا موقوف، اس موضوع پر کئی کتب تحریر کی گئیں۔ جب تک میں نے ساری کہانی پڑھ کر ان کو پس منظر اور انجام نہیں سنایا انھیں سکون نہ ہوا۔

جب یورپ میں غذا کو ضائع کرنے کے خلاف جرمانہ لگانے کی مہم شروع ہوئی تو مجھے ایک عجیب احساس نے گھیر لیا۔ 2012 میں برلن میں ایک تحقیق کے نتیجے میں علم ہوا کہ ہر جرمن 80 کلو کھانا کچرے میں پھینکتا ہے۔ وزیرِ زراعت ایلس ایگنر نے بہت سنجیدگی سے اس کا نوٹس لیا۔ اس نے کہا کہ دنیا بھوک سے مر رہی ہے اور ہماری قوم رزق کی ناقدری کرنے والی بن چکی ہے۔ گیارہ ملین کلوگرام کھانا باہر پھینکا جا رہا ہے جس کا ساٹھ فی صد نجی شہری ذرائع کرتے ہیں۔ بیس فیصد گروسری کی منڈیوں میں تلف کیا جاتا ہے اور سترہ فیصد ہوٹلوں اور ریستورانوں میں باہر پھینکا جاتا ہے۔ ایک عام شہری 235 یورو کی خوراک کوڑے میں پھینکتا ہے اور اس لحاظ سے پوری قوم سالانہ بیس بلین یورو کی غذا ضائع کرتی ہے۔ میڈیا نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ دنیا میں بھوک اور افلاس کا عفریت پھیلا ہوا ہے اور یہاں اعداد و شمار کھانے کی ناقدری کے بارے میں چیخ چلا رہے ہیں۔

ابا جی اور امی جی دونوں کو بے انتہا تکلیف اس بات سے تھی کہ وسائل کم ہونے رونا رویا جائے۔ امی جی کا تو مخصوص لفظ ''رنڈی رونا'' تھا۔ ''یہ پورا نہیں ہو رہا، وہ پورا نہیں ہو رہا۔'' مہمان آ گئے تو سیاپا پڑ گیا۔ میں نے پہلے تو لفظ ''رنڈی رونا'' کی اصطلاح پر اعتراض کیا اور لسانی تعصب قرار دیا۔

جرمنی کی معروف یونیورسٹی سٹوٹ گارٹ (Stuttgart) نے مزید تحقیق کر کے لکھا کہ گھروں میں جو کھانا باہر پھینکا جاتا ہے وہ غذائی اعتبار سے بالکل صاف ستھرا اور کھانے کے قابل ہوتا ہے۔ وزیر صاحبہ کو تجویز پیش کی گئی کہ عوام کو باشعور بنانے کے لیے مہم چلائی جائے اور باقاعدہ قانون سازی کی جائے۔ یہ موضوع میری دلچسپی کا تھا۔ میں نے مکمل مہم کی خبروں پر اور حکومت کی سرپرستی میں ہونے والے اقدامات کو ایک ندامت بھری مسرت سے دیکھا۔ عوام کو آگہی دینے کے لیے جس تیزی سے کام کیا گیا وہ کسی بھی حساس ذہن کو اپنا محاسبہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کھانے کے بند ڈبوں پر غذا کی آخری تاریخ درج ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ اسے فوری طور پر باہر پھینک دیتے ہیں۔ اس بات کے بارے میں مکمل پروگرام کیے گئے تاکہ لوگوں کو سکھایا جائے کہ اس تاریخ کے بعد بھی چند دن تک غذا

کھانے کے قابل ہوتی ہے۔ یا تو اسے فوری طور پر کھا لیا جائے یا پھر کسی ضرورت مند کو دے دیا جائے۔ گویا اب یہاں سعدی کا بتایا اصول، ''خوردن برائے زیستن است نہ زیستن برائے خوردن'' (زندہ رہنے کے لیے کھانا نہ کہ کھانے کے لیے زندہ رہنا) نافذ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

دوسرے جرمنی جغرافیائی اعتبار سے ڈنمارک کا ہمسایہ ہے اور وہاں آنا جانا بھی لگا ہی رہتا ہے۔ بالخصوص ہیمبرگ صرف چار گھنٹے ڈرائیو کی مسافت پر ہے جہاں ایک روزہ سفر بہت آسان ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ہوٹلوں میں سختی سے اس قانون کی پابندی ہوتے دیکھی کہ ہر گاہک صرف اتنا ہی کھانا آرڈر کرے گا جتنا وہ کھا سکتا ہے۔ جو بچے گا وہ پیک کرکے یا تو ساتھ لے جائے یا پھر راستے میں کسی بے گھر کو پکڑا تا جائے۔ جو گاہک اس کی پابندی نہیں کرے گا اس پر جرمانہ عائد کیا جائے گا۔ انڈیا اور پاکستان سے آنے والے سیاحوں اور دیگر مندوبین کے لیے یہ تجربہ بہت حیرت انگیز ہوتا ہے۔ عام طور پر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ پیسہ ہمارا اپنا ہے، ہم جتنا مرضی آرڈر کریں۔ لیکن ان پر واضح کیا جاتا ہے کہ رقم بھلے آپ کی سہی، لیکن ذرائع اور وسائل حکومت کے ہیں۔ ڈنمارک میں رات آٹھ بجے کے بعد بیکری کی بنی ہوئی اشیا نصف قیمت پر فروخت کر دی جاتی ہیں۔ اکثر درس گاہوں میں آٹھ بجے کے بعد بچا ہوا کھانا مفت تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ بہرحال یہ ایک طویل موضوع ہے جس پر کتب تحریر کی جا سکتی ہیں۔

مجھے ابا جی کی یاد ستاتی رہی۔ کاش وہ یہ سب دیکھنے کے لیے موجود ہوتے کہ انسان دوبارہ دکھاوے، شیخی اور مصنوعی زندگی کی شان وشوکت سے کنارہ کرکے، پرندوں اور جانوروں کی طرح اتنا ہی استعمال کرنے کی عادت ڈال رہا ہے جتنا اس کے پیٹ میں سما سکتا ہے۔ جرمنی کی تقلید میں یورپ کے دیگر ممالک میں بھی سرکاری طور پر ایسی ہی مہمیں چلائی گئیں۔ سوئٹزرلینڈ اور فرانس نے بھی قوانین منظور کیے۔ مجھے اینجلینا جولی کے دورۂ پاکستان اور سیلاب زدگان کے علاقوں کے دورے کے بعد پاکستان کے سابق وزیرِ اعظم کی طرف سے ضیافت کے بارے میں رپورٹ یاد آ گئی۔ جن لوگوں نے وہ رپورٹ پڑھ رکھی ہے انھیں اس کے طنز، تضحیک اور حقارت کے نشتر ضرور زخمی کر گئے ہوں گے۔

●●

جل پری آج بھی علامت ہے

ڈنمارک کا سماجی نظام مکمل طور پر فلاحی ہے۔ اس میں شہریوں کے حقوق کو اہم مقام حاصل ہے اور بالخصوص بچوں کی فلاح و بہبود کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے۔ ڈنمارک کی معروف ترین علامت، جل پری، ڈینش ڈرامہ نگار اور مصنف ہانز اینڈرسن (ہینس کِعس چَن آنا سن) کی ایک الف لیلوی کہانی کا کردار ہے جسے محبت اور ایثار کی علامت بنا دیا گیا ہے۔ اس مصنف کے نام سے ڈنمارک کا بچہ بچہ واقف ہے اور اس کی کہانیاں سکولوں میں باقاعدہ نصاب کا حصہ ہیں۔

ڈنمارک میں بھی ابتدائی چند سال کو چھوڑ کر میں نے حصولِ علم کی بھرپور کوشش کی۔ ابا جی نے میرے اس سفر کو تمام نہیں ہونے دیا۔ ان کی مکمل حوصلہ افزائی نے میری ذات میں ایک بچی کو زندہ رکھا جسے جہلم کے دریا کی لہریں اپنے تعاقب پر اکسایا کرتی تھیں۔

کوپن ہیگن کے ایک مشہور سکول میں تدریس کی ابتدا میں نے معاون معلمہ کی حیثیت سے کی کیونکہ میرے پاس پاکستان سے ڈگری تو موجود تھی لیکن زبان کی رکاوٹ ہر میدان میں منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میری اس اولین ملازمت نے مجھے ذہنی طور پر بے حد مثبت راستے پر ڈالا۔ ہر وقت جو رائیگانی کا احساس کہیں نہ کہیں کچوکے لگاتا تھا وہ معدوم ہوا۔

ڈینش بچوں کے ادب، پرانی داستانوں اور بچوں کے گیتوں کا علم ان ہی زرخیز دنوں کی دین تھا۔ یہی علم مجھے اپنے بچوں کو ہوم ورک کرانے میں کام آیا۔ اسی سکول میں محترم عباس رضوی سے ملاقات ہوئی جو وائس پرنسپل (سکول انسپکٹر) کے عہدے پر تھے اور تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اسی سکول میں بچوں کے گیت کا ترجمہ کیا اور ثقافتی پروگرام کیے۔

ابا جی کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں پاکستان گئی تو کہنے لگے بس اب تحصیلِ علم کے موقع

کو ضائع نہ کرنا اور ازسرِ نو بچوں کے ساتھ خود بھی پڑھنا شروع کرو۔

چچا جان کی کم وقت میں دی گئی بنیادی انگریزی زبان کی تدریس نے مجھے ڈینش زبان سیکھنے میں بہت مدد دی۔ انگریزی محاورات اور ادب سے واقفیت کی وجہ سے میں نے محض تین ماہ کے کورس کے بعد ملازمت حاصل کی۔ اس ملازمت کے دوران مجھے عملی تعلیم کا موقع ملا۔ بچوں کے ساتھ عجائب گھروں کی سیر، کہانیوں کی کتابیں، بچوں کے گیتوں اور گانوں کی دھنیں، کرسمس کے گیت اور ان کا پس منظر وغیرہ۔ پھر ڈینش زبان کے بہترین اساتذہ نے میری رہنمائی کی۔

یہیں ملازمت کے ساتھ ساتھ مجھے نویں جماعت کا سال پڑھے بغیر براہِ راست دسویں جماعت میں داخلہ ملا اور ہفتے میں دو دن کی کلاسز کے بعد امتحان میں شاندار کامیابی ہوئی اور یونیورسٹی کالج کے پہلے سال میں داخلہ ہوگیا۔ مجھے وہ اضافی سال بھی نہیں پڑھنا پڑا جو غیر ملکیوں کو زبان اور ثقافت کی تفہیم کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

سکول کا انسپکٹر ٹورین عام ڈینش مردوں کے مقابلے میں ذرا پست قد تھا لیکن اس میں بہترین قائدانہ صلاحیتیں تھیں۔ جب اسے علم ہوا کہ مجھے میٹرک میں داخلہ مل گیا ہے تو اس نے منگل اور جمعرات مجھے کلاس ختم ہوتے ہی چھٹی کرنے کا کہا اور کسی بھی میٹنگ یا ترجمانی کے کام کے لیے نہ روکا۔ ٹورین نے ہی مجھے بہترین تعریفی اسناد دیں۔ یہیں پر آرن جیسا استاد موجود تھا جس نے کھانے کے وقفے کی قربانی دے کر مجھے ''طلائی سینگ'' جیسی مشکل ترین نظم پڑھائی۔ میں نظم میں موجود اساطیری حوالوں کو اردو میں لکھ لیتی۔ وہ میرے کاغذات پر اجنبی زبان میں لکھی وضاحت کو اپنی چندھی ہوئی آنکھوں سے چھوٹے شریر بچوں کی طرح دیکھتا۔

''سب کو بتانا کہ یہ نظم تمھیں میں نے پڑھائی تھی۔''

''اچھا'' میں جان چھڑانے کے انداز میں وعدہ کرتی۔

''سب کو بتانا، سکول میں بھی اور اپنے پاکستانیوں کو بھی'' وہ گولڈن براؤن داڑھی میں انگلیاں پھیرتا۔

''اچھا'' میں مصلحت بھرے صبر سے کہتی۔

ہماری میز پر بیٹھی ڈینش کی استاد اسے ڈانٹنا شروع کرتی، پھر مجھے آہستہ سے کہتی، ''فضول ہے بالکل، تم برا نہ ماننا۔''

''بھولنا نہیں، اپنے ابا کو بھی بتانا'' وہ فہمائش سے بے نیاز پھر دوہراتا۔ بظاہر سنجیدہ

چہرے کی باریک لکیروں سے شرارت جھانکتی۔

''اچھا میرے ابا'' میں چڑ کر کہتی۔

آرن نظمیں بھی کہتا اور موسیقی کا استاد بھی تھا۔ اسی نے مجھ سے سب سے پہلے ڈینش گیت کا اردو ترجمہ کرنے کو کہا۔

مسٹر یاکب، مسٹر یاکب، سوؤ کم

سکول کی گھنٹی بجتی ہے۔۔۔ سکول کی گھنٹی بجتی ہے۔

پیم پام پوم، پیم پام پوم

اسے زبان تو سمجھ نہیں آئی لیکن جب بچوں نے اسی دھن میں کامیابی سے گایا تو بہت حیران ہوا، ''تم شاعرہ ہو؟''

''نہیں'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''پھر تم نے یہ آہنگ کیسے سمو دیا ترجمے میں؟''

سکول کے پروگراموں میں بچے اسی دھن میں یہ گیت بھی گاتے اور ڈینش بچوں کی زبان پر اجنبی تلفظ کے ساتھ اردو کا گیت بہت خوبصورت لگتا۔

''مان جاؤ کہ تم شاعرہ ہو، کسی کو نہیں بتاؤں گا'' اس نے یوں کہا جیسے مجھے وعدہ معاف گواہ بنا رہا ہو۔

مجھے لائبریری میں دیکھ کر وہ اکثر رنگ برنگے محاورات اور فقرے چست کرتا رہتا۔ کبھی شہد کی مکھی، کاڈ مچھلی، کبھی ڈولفن مچھلی اور کبھی چھوٹی چیونٹی کہہ کر چڑاتا۔ میں کھانے کے وقفے میں بیٹھی کوئی نظم یا آرٹیکل پڑھا کرتی تھی۔ وہ بہت سنجیدگی سے سوال کرتا، ''اچھا یہ بتاؤ اتنا پڑھ کر اور بڑی ہو کر تم کیا بنو گی؟''

سکول انسپکٹر ٹورپن بھی ہنستے ہوئے کہتا، ''دراصل ہمارے لیے یہ بہت عجیب بات ہے کہ کوئی غیر ملکی اور وہ بھی خاتون، اتنی دلچسپی سے ڈینش کلاسیک پڑھے۔''

اس سکول میں میں نے دو بہترین سال گزارے۔ یہیں محترم عباس رضوی جیسے معلم، مدرس اور سیاست دان سے ملاقات ہوئی جن کی شفقت اور رہنمائی مجھے حاصل رہی۔ اس سکول کے پلیٹ فارم سے کام کرتے میں نے انڈوں کو مختلف ٹوکریوں میں رکھنا سیکھ لیا۔ بچوں کی ٹوکری، گھر داری، ملازمت، لیکن اس بانٹ تقسیم میں مجھے اپنے نام کی ٹوکری مختص کرنا یاد نہ رہا۔ بس یہی جنون تھا

کہ بچوں کی تعلیم اور تربیت میں کوتاہی نہ ہو۔ ذاتی تعلیم اور کیریئر کے لیےتو عمر پڑی ہے۔ دو برس اس سکول کی ملازمت اور تربیت کے بعد مجھے باقاعدہ ڈینش اساتذہ کے مساوی نوکری کا موقع ملا۔

اسد احمد جو اس وقت اردو تعلیم کے کنسلٹنٹ تھے، ان کی رہنمائی اور تجویز پر میں نے ڈینش بی ایڈ میں داخلہ لیا۔ مجھے ان سے اچھی کتب بھی مستعار ملتی رہیں اور حوصلہ افزائی بھی حاصل رہی۔ اسد احمد کے مزاج میں شائستگی اور سہولت دینے کا ایک خاص پہلو تھا جس سے اخلاقی طور پر تقویت حاصل ہوتی۔ لازمی مضامین کے ساتھ ساتھ چار اختیاری مضامین لینا ضروری تھے۔ میں نے ڈینش، تاریخ، غذائیت (امورِ خانہ داری) اور انگریزی زبان کا انتخاب کیا۔ یہاں ایک مرتبہ پھر مجھے انگریزی زبان کی تعلیم میں میرٹ کی بنیاد پر چھوٹ مل گئی اور صرف ایک مقالہ لکھنے کے بعد چار ہفتے ایک سکول میں انگریزی پڑھانے کی وجہ سے یہ امتحان مکمل ہوگیا۔

میں نے چچا جان کو بہت یاد کیا۔ مقالہ لکھنے اور اس کا زبانی امتحان دینے کے دوران جتنی آسانی پیش آئی وہ چچا جان کے ساتھ انگریزی بولنے اور برطانیہ کی تاریخ اور وہاں کے تعلیمی نظام سے مناسب آگہی کی وجہ سے ہی ممکن تھی۔ انگریزی زبان کی گرامر، صرف ونحو کی مشقیں، ڈینش زبان کی گرامر سیکھنے میں معاون ثابت ہوئی۔ چار سال کالج میں نفسیات پڑھنے کا فائدہ ہوا کہ کوپن ہیگن کے یونیورسٹی کالج میں تعلیم کے دوران مجھے تعلیمی نفسیات میں صرف مقالہ لکھ کر اور زبانی امتحان دینے کے بعد پاس کر دیا گیا۔ کہاں کہاں ان بزرگوں کی تعلیم و تدریس کے اثمار مجھ پر نچھاور ہوئے۔ ان کی رہنمائی میری دستگیری کرتی رہی، ان کی حوصلہ افزائی نے استعانت کا درس دیا، کتنے محاذ میرے سامنے کھلے پڑے رہے اور میں ہر ایک کو کامیابی سے بند کرتی اور انڈوں کی ٹوکریاں احتیاط سے سنبھالے اگلے پڑاؤ کو چلتی رہی۔

••

سکول میں معصوم بچوں کے ساتھ کام کرنے کا اپنا ہی ایک لطف ہے۔ پھر ایک ایسی زبان کا ادب پڑھنے کی کوشش کرنا جسے سیکھنا ایک چیلنج ہو۔ بچوں کے اداروں میں کام کرنے سے ہمہ وقت یہی محسوس ہوتا ہے کہ آپ زیرِ تعلیم ہیں۔ بچوں کا ادب انگریزی محاورے کے مطابق انگلی کی پوروں پر آٹھہرتا ہے۔ مل کر گانے گاتے رہنا، مل کر سیر کو جانا، ڈرامے کرنا، ڈینش بچوں کے گیتوں کے اردو تراجم کرنا، یہ سب اسی جزوقتی ملازمت کے فیوض و برکات کا حصہ تھا۔

ہمارے گروپ میں ایک پاکستانی بچہ تھا۔ ہم اس کو علی کہہ لیتے ہیں۔ وہ ایک بے حد روایتی

اور دور افتادہ گاؤں سے تعلق رکھنے والے ایک زمیندار خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ کئی بیٹیوں کے بعد پیدا ہوا اور فطری طور پر اپنے والد کا بے حد لاڈلا تھا۔ اس کی والدہ نے بتایا کہ باپ کے سینے پر سویا کرتا تھا۔ سکول شروع کرنے سے کچھ ہی عرصہ قبل اس کے والد کا اچانک انتقال ہوگیا۔ یہ صدمہ بچے کے لیے اتنا شدید تھا کہ اس کے معصوم ذہن نے اس سنگین حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

علی اور میں نے ایک ہی دن سکول کا آغاز کیا۔ اسے زبان نہیں آتی تھی اور وہ عارضی طور پر قوتِ گویائی سے بھی محروم ہو چکا تھا۔

میں اس کا بے حد خیال رکھتی اور اسے ڈینش اور اردو میں سبق دوہرا کر بتاتی۔ اگر وہ میری کسی بات پر مسکرا دیتا تو میرا سارا دن سرشار گزرتا۔ اس کی والدہ کو چونکہ زبان نہیں آتی تھی لہٰذا میں ان کے ساتھ علی کو لے کر نفسیات دان کے پاس بھی جاتی۔ بچے کے نفسیاتی علاج کے ساتھ سپیچ تھراپی کے لیے اس بھی مدد کی جا رہی تھی۔

سکول کے پاس ہی ایک پارک تھا جس میں ایک بڑا درخت تھا۔ بچے اس پر چڑھتے اور ایک دوسرے سے شرارتیں کرتے۔ سکول کا انسپکٹر اور دیگر اساتذہ بھی وہاں موجود تھے۔

علی اچانک میرے پاس آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا۔ وہ درخت پر چڑھنا چاہتا تھا۔ میرے بچپن کے دن لوٹ آئے۔ ''ادھر آؤ'' میں نے درخت پر چڑھ کر ہاتھ بڑھایا۔

جب ہم دونوں درخت کے تنے پر بیٹھے تھے تو اس کی مسکراہٹ ہنسی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ٹیم کے اساتذہ درخت کے قریب آ گئے۔ سب کے چہرے دمک رہے تھے۔

''ارے آج تو علی ہنسنے لگا۔''

''لیکن تم پاکستانی لڑکی، درخت پر کیسے چڑھیں، تمھارے کلچر میں تو منع ہے ناں۔'' انسپکٹر صاحب بولے ''نیچے اترو، ورنہ اخبار میں خبر لگوا دوں گا۔''

پھر ایک دن آیا جس نے مجھے اپنی ایک نااہلی سے روشناس کرایا۔ اچانک علی کے دانت میں درد ہونے لگا۔ ڈنمارک میں دندان ساز سکول کے نظام اور ٹیم کا حصہ ہے۔ بچوں کے دانت پابندی سے چیک کیے جاتے ہیں۔ جماعت میں دانت صاف کرنے کی ابتدائی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ علی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا تھا۔ اس نے حسبِ معمول اشارہ کیا کہ آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ میں علی کا ہاتھ تھامے دو برآمدے پار کر کے کلینک تک پہنچی۔ علی نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ میں نے اس کا سر تھپتھپایا، ''علی، میں آپ کے پاس ہوں، پریشان نہیں ہونا۔''

اسے کرسی پر لٹا کر معائنہ کیا گیا اور دانت میں سوراخ کی تشخیص ہوئی۔ مشین کی بے رحم آواز اور ننھے سے دہانے میں ڈاکٹر کے اوزار نے بچے کو خائف کر دیا۔ علاج تو بہر حال کرنا تھا۔

علی نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔ وہ معصوم بول کر اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ مجھے احساس ہوتا، ڈاکٹر نے مجھے قدرے خفا ہو کر کہا،

''اگر تم خود اس طرح رونے پیٹنے لگو گی تو بچہ تو سنبھل چکا۔ یہ پیشہ ورانہ مہارت نہیں ہوتی کہ ترجمان خود بھی بچے کے ساتھ روتا رہے۔''

مجھے بہت غصہ آیا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ میں پیشہ ور ترجمان نہیں ہوں۔ استاد ہوں اور بچے کی تشفی کے لیے ساتھ آئی ہوں۔ دوسری یہ کہ بچہ انتہائی تکلیف میں ہے، اور آخری بات یہ کہ مجھے کوئی خاص پروا بھی نہیں ہے کہ پیشہ ورانہ تربیت میں کیا منع ہے۔''

اگلے دن مجھے سکول انسپکٹر نے اپنے دفتر بلایا۔ وہ عموماً لنچ باقی سٹاف کے ساتھ ہی کیا کرتا اور اس کی حسِ مزاح اور بے تکلفی کے سبب سب اساتذہ اس کے گرویدہ تھے۔ میں اکثر کھانے کے وقفے میں ڈینش کلاس کا ہوم ورک کیا کرتی تھی اور ٹورپن مجھے پوچھتا رہتا کہ ابھی اور کتنا پڑھنا ہے تمھیں۔

''ہاں بھئی مہربان لڑکی'' اس نے میز پر رکھے کاغذات ہٹا کر مکمل توجہ سے بات شروع کی۔ ''کل تم دندان ساز کی طرف گئیں تھیں؟''

''ہاں'' میں نے مختصراً کہا۔

''بات یہ ہے کہ تم نے بے حد کم عرصے میں بچوں اور والدین میں بہت مقبولیت حاصل کی ہے۔ بچے آپ کے ساتھ خود بہت محفوظ تصور کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔ بالخصوص وہ بچہ علی اور اس کی والدہ نے درخواست کی ہے کہ تم مکمل طور پر ان کی ترجمانی کے فرائض انجام دو۔ اس بچے کو اپنے والد کی جدائی کے غم نے یکسر خاموش کر دیا ہے اور بہت طویل عرصہ ہو چکا کہ اس میں کوئی بہتری نہیں آئی۔ اس کی آئندہ صحت مند زندگی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور تم واحد استاد ہو جو یہ کام احسن طریقے سے انجام دے سکتی ہو۔ پہلی وجہ بچے کا آپ پر اعتماد اور آپ کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جانے پر رضامندی ہے۔ دوسرے آپ زبان اور ثقافت سے آگاہ ہیں۔ اور سب سے اہم وجہ آپ کی بچوں سے محبت اور ان کے سے رابطے کی فطری صلاحیت بہت سودمند ہے۔''

''نہیں ٹورپن،'' میں نے صاف انکار کر دیا۔ ''میں ہر کام کرنے کو تیار ہوں لیکن اس کے دانتوں کے علاج کے لیے ساتھ نہیں جا سکتی۔ اسے تکلیف میں دیکھنا میرے بس سے باہر ہے۔

اس کے لیے آپ کسی پیشہ ور ترجمان کا انتظام کیجیے۔''

علی کی والدہ چونکہ بالکل ناخواندہ تھیں اور میں ان کے ساتھ پنجابی ہی بولا کرتی تھی تاکہ وہ بلا جھجک مجھ سے ہر بات کر لیں۔

ایک دن بے حد سادگی سے بولیں :

''باجی پتا نئیں لگدا تُسیں میڈم او۔ تُسیں تے میرے نال بالکل پِنڈ والی گل بات کر دے او۔'' (باجی پتہ ہی نہیں چلتا کہ آپ میڈم ہیں۔ آپ تو میرے ساتھ گاؤں والوں کی طرح بات چیت کرتی ہیں)۔

میں ایسے تبصروں کو ہمیشہ اپنے لیے اعزاز خیال کرتی ہوں۔

اگلے دن ایک خوش خبری میری منتظر تھی۔ علی کی والدہ سکول آئیں اور اپنے مخصوص پنجابی لب و لہجے میں بولیں، ''باجی کل میرا علی بولن لگیا جے'' (کل میرا علی بول پڑا ہے)۔

اس نے سکول سے گھر آتے ہی بتایا ''آج میری ٹیچر بے چاری کلینک میں رو پڑی۔ درد مجھے ہو رہا تھا اور وہ بے چاری رونے لگی۔''

''لو باجی، ہم کئی مہینوں سے رو رہے ہیں اور یہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ آپ کے دو آنسو گرے تو اس کی زبان چل پڑی۔''

پھر ایک سال کے بعد مجھے ترقی دے کر کوپن ہیگن کے دوسرے حصے میں بھیج دیا گیا اور معصوم علی سے میرا رابطہ ٹوٹ گیا۔ ٹورین نے الوداعی تقریب میں مجھے ''پیدائشی استاد'' کہا۔

ایک استاد کے لیے ہر بچہ علی ہوتا ہے۔

••

امریکہ قیام کے دوران رضا کارانہ تدریس کے علاوہ مجھے کورٹ لینڈ کی معروف یونیورسٹی ''سُونی'' (SUNY Cortland) میں ایجوکیشن کے شعبے میں ہی ایک سمسٹر پڑھنے کا اتفاق ہوا اور ان کے نظام کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہر چند ان دنوں ڈینش زبان پر محنت کی وجہ سے میری انگریزی کو زنگ لگ چکا تھا لیکن چند ماہ ہی میں روانی اور تحصیلِ علم کی لگن نے میری استاد کو بھی حیران کر دیا۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے یورپ کے سٹوڈنٹس کو اپنی رہائش گاہ میں لنچ کے لیے بلایا تو میں واحد پاکستانی طالبہ تھی۔ اس نے بطورِ خاص مجھ سے گفتگو کی اور حوصلہ افزائی کی کہ ایشیائی پس منظر کے ساتھ یورپی زبان سیکھ کر تعلیم حاصل کرنے کا شوق قابلِ تحسین ہے۔

جنگلوں کے طویل سفر میں چمکتے جگنو حرارت نہ بھی دے سکیں مگر دل میں ایک حدت کی لہر ضرور دوڑا دیتے ہیں۔ مجھے بھی وقت نے اتنی گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ بیک وقت ملازمت اور حصولِ علم کی گیندیں فضا میں اچھال کر شعبدے دکھانا سکھا دیا۔ ابا جی نے اور ان کے بھائیوں نے مجھے زندگی کی بھول بھلیوں سے بچ نکلنے اور سرخرو ہونے کے لیے (Ariadanes) ''آریہ ڈین کا دھاگہ'' دے دیا تھا جسے میں نے ہمیشہ اپنی بقا کے لیے استعمال کیا، اور دائیں بائیں دیکھے بغیر اس صد چشم آرگس، اور ہزار سر رکھنے والے سانپ سے بچ کر فاتح بن کر نکلی۔

دعاؤں کا روشن حصار میرے ساتھ رہا، جبری تربیت اور رہنمائی کا ابر میرے سر پر تنا رہا جس نے قسمت کے سیاہ دائروں سے نکلتے ہوئے مجھے سیاہ بخت اور بدمزاج ہونے سے بچائے رکھا۔ خود غرضی، جہالت، حرص اور بغض کا عادی نہ ہونے دیا۔

منتقم مزاجی جیسی لعنت ہمارے گھر سے دور رہی۔ آج جب زندگی کے بیشتر فرائض ادا ہونے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو ہر موڑ پر ابا جی کے اقوال اور افعال کے چراغ جلتے ملتے ہیں۔ ان کا علم، نافع انسان بنانے کی دھن، تعلیم دینے کا جنون، درگزر اور نظرانداز کر دینے کی حکمتِ عملی، ظرافت کے ناخن سے پیچیدگی کی گرہیں کھولنے کا درس، دوسروں کا لحاظ اور نیک نیتی جیسے اسباق میرے پلو سے بندھے رہے۔ بچوں کی ماں کا ادب اور لحاظ کیے بغیر آپ ایک اچھی نسل نہیں پیدا کر سکتے۔ بچوں کو ان کے ددھیالی رشتوں سے محروم رکھ کر آپ خود اعتماد انسان نہیں بنا سکتے۔ ایک ماں کو ان سب سے ماورا ہو کر انسان سازی کی طرف توجہ دینی چاہیے کہ وہ اچھی اولاد کی صورت میں اپنے ساتھ صف آرا ہونے کے لیے مجاہد نہ پیدا کرے بلکہ اچھے انسان جو کسی بھی امتیاز کے بغیر ہر ایک سے نیک سلوک کرنے کے قائل ہوں۔

••

ابا جی کو جونئی بات معلوم ہوتی وہ اسے پورے انہماک، دلچسپی اور بچوں کے سے تجسس سے سنتے۔ سوال کرنے میں انھیں کوئی عار اور باک نہیں تھا۔ ابا جی فیض احمد فیض اور اس کے کلام سے قطعی طور پر واقف نہیں تھے۔ جن دنوں میں فیض کی نظمیں ترجمہ کر رہی تھی، میں نے ابا جی کو بتایا کہ فیض کی بڑی سالی کا نکاح علامہ اقبال نے پڑھایا تھا اور اس میں طلاق کا حق بیوی کو دیا گیا۔ جب فیض نے ایلس کے ساتھ شادی کی تو اسی نمونے پر نکاح نامہ کی شرائط لکھی گئیں اور طلاق کا حق ایلس کو تفویض کیا گیا۔

''واہ واہ بھئی، یہ بات کہنے والی اور پھیلانے والی ہے۔ لاؤ دکھاؤ ذرا کتاب، یعنی عورت کی قیمت نہ تو بتیس روپے آٹھ آنے ہے اور نہ ہی طلاق کے تین حروف۔ سکولوں میں فرسودہ نصاب میں محض چند غزلیات لگا دی جاتی ہیں لیکن ایسے انقلابی اقدامات اور سوچ بھی پڑھانی چاہیے۔'' انھوں نے کتاب کی ورق گردانی شروع کی۔ پھر ابا جی نے فیض کی نظم بھی منگائی جو انھوں نے اقبال کے لیے لکھی۔

آیا ہمارے شہر میں اک خوشنوا فقیر

پھر بڑی سادگی سے بولے، ''مجھے تو فیض کے بارے میں ایک لفظ نہیں آتا تھا۔''

••

میں ابا جی کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ میرے موبائل کی بیٹری ختم ہو گئی۔ چارجر دوسرے کمرے میں بچوں کے پاس پڑا تھا۔ ابا جی کہنے لگے کہ جا کر بچوں سے چارجر لے آؤ۔

میں نے اٹھ کر سوٹ کیس سے نیا چارجر نکال کر لگالیا۔ ابا جی کے زیرک مشاہدے میں ہر بات رہتی تھی۔ کہنے لگے ''اگر آپ کے پاس ایک ہی چارجر ہوتا تو آپ اٹھ کر دوسرے کمرے میں جاتیں، بچوں سے بات بھی کر آتیں اور دیکھ بھی آتیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ خود کفیل ہونا اور خود انحصاری بیک وقت مضبوط بنا دینے اور محدود کر دینے کا نام ہے۔ لوگ سہولت کے آئینہ خانوں میں رہنے لگتے ہیں جہاں اپنے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔''

دونوں بچوں کے پاس ایک ہی موبائل تھا۔ جب وہ اسلام آباد گئے تو میرا موبائل خراب ہو گیا۔ میں ان کو فون کرنا چاہتی تھی اور نمبر نہیں مل رہا تھا۔ امی جی خفا ہو کر بولیں۔ ''اج کل دیاں مانواں، موبائل گم گیا تے اولاد وی گم گئی۔ زبانی کیوں نہیں یاد رکھا تم نے؟''

ہزار وضاحت دی کہ امی جی یہ نمبر لوکل ہے، ڈنمارک کا مجھے آتا ہے، لیکن انھوں نے اپنی خفگی کا اظہار جاری رکھا، ''میرے چھے بیٹوں کے پاس موبائل ہیں۔ مجھے سب کے نمبر زبانی آتے ہیں۔ سب کے گھروں کے نمبر بھی زبانی آتے ہیں، آج کل کی مائیں۔۔۔''

''چلو بس بھی کر دیں اب،'' ابا جی نے مصالحت کی کوشش کی۔ ''ابھی نیا نمبر کھولا ہے۔ نہیں یاد رہا بچی کو۔''

''تے اینیں لکھ کے کیوں نہیں رکھیا؟ ویسے تو بڑی لکھاری بنی پھرتی ہے، ایک ڈائری پر نمبر نہیں لکھا گیا۔ غیر ذمہ دار مائیں۔۔۔''

ابا جی نے اتنی دیر میں اسلام آباد لینڈ لائن پر فون کر کے پتہ کرلیا اور گھر کا امن و امان بحال ہوگیا۔

••

میں نے ڈنمارک جیسے ٹیکنالوجی کے میدان میں صفِ اول میں کھڑے ملک میں دونوں بچے پالے۔ کبھی میں شرارت سے ابا جی سے کہتی کہ ''میرے بچے کبھی نہیں گرے، کہیں چوٹ کا نشان نہیں اور دیکھیے ان کا بازو بھی ماں کی طرح تین دفعہ نہیں ٹوٹا۔'' ابا جی ہنستے اور امی ناراض ہوکر کہتیں، ''توں اڈیاں چک چک پھاہ لگن نوں پھردی سیں، ترا کوئی علاج نئیں سی'' (تم ایڑیاں اٹھا اٹھا کر پھانسی لگنے کو تیار تھیں، تمھارا کوئی علاج نہیں تھا)۔ لیکن میرے لاشعور میں ابا جی کی باتیں کسی جزدان میں ملفوف پڑی تھیں۔ ورق ورق کھلنے لگیں۔ میں نے اپنے بچوں سے مکمل اردو میں بات چیت کی۔ تین برس کی عمر میں عالیہ نے ''اے وطن پاک وطن'' کا ترانہ گایا۔ میری طویل بیماری سے جنگ کے باوجود آٹھ برس کی عمر میں قرآن پڑھ لیا۔ اُسامہ نے ساڑھے چھ برس کی عمر میں قرآن مکمل کرلیا۔ اس کی استاد ہمیشہ حیران ہوتی کہ یہ ڈینش اتنی تیزی سے کیسے پڑھتا ہے۔ پھر اس نے نتیجہ نکالا کہ اسے عربی حروفِ تہجی آتے ہیں اور الفاظ جوڑنے کی عادت ہے۔

••

بچے سے برابری کی سطح پر بات چیت کرنا، بغیر ضرورت کے پابندیاں نہ لگانا، ان کے دوستوں کو گھر بلانا اور اپنے دوستوں کی طرح برابری کی سطح پر ان کی مدارات کرنا اور نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں ان کے ہمراہ رہنا، یہ سب ایسے کام ہیں جن کی وجہ سے بچے والدین سے وابستہ رہتے ہیں۔ اکثر والدین بچوں کے سوالات سے بچنے اور ان کے ساتھ وقت گزارنے کے بجائے ٹیلیویژن کے آگے بٹھا دیتے ہیں۔ لیکن مجھے اپنے گھر کے ماحول اور ابا جی کی رہنمائی نے اپنی اولاد سے جوڑے رکھا۔ بچے صرف ایک گھنٹہ ٹیلیویژن دیکھ سکتے تھے۔ مجھے نہیں یاد کہ گرمیوں کے طویل دن میں کبھی سوئی ہوں۔ سکول کا کام مکمل کرنے کے بعد جسمانی طور پر فعال رہنے والے کھیل کھیلے جاتے۔ ان کے دوستوں کو گھر بلاتی۔

موبائل، آئی پیڈ اور ایسی تمام جدید ناگزیر چیزوں کو اپنے اور اولاد کے درمیان قطعی حائل نہیں ہونے دیا۔ ایپل اور بلیک بیری صرف پھلوں کے نام ہونا چاہییں۔ جب وہ اونچی دیواروں اور بند دروازوں کی علامت بن جاتے ہیں تو ایک صوفے پر ساتھ بیٹھا بچہ ماں سے کئی

زمانوں کی دوری پر بیٹھا ہوتا ہے۔ نئی نسل کے والدین کی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہیں۔ آسائشوں اور سہولیات کو مثبت انداز میں استعمال کر کے بچے کی تعلیم و تربیت کا عمل بھی تیز تر کیا جاسکتا ہے، فاصلے مٹائے جاسکتے ہیں۔

ابا جی کی طرح میرا بھی ایمان ہے کہ دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ موبائل پر اردو لکھنے کی سہولت آئی تو میں نے بچوں کو اردو میں پیغام لکھنے شروع کر دیے۔ وائس میل کا تعارف ہوا تو میں نے اردو اشعار ریکارڈ کر کے بھیجے۔ ہم تینوں ہر نئی آنے والی فلم دیکھنے اکٹھے جاتے۔ باہر کا کھانا کم کھاتے لیکن جب مل کر وقت گزارنے کا موقع ملتا تو ہم مختلف ممالک کے کھانے کھاتے۔ میرے بچے ہمیشہ میرے دوست رہے۔ ابا جی ہی کی طرح میں نے ان کے اور اپنے درمیان ماہ و سال کی دوری کو غیر ضروری بزرگی نہیں بننے دیا۔ میرا بیٹا مجھے کالج یونیورسٹی میں اپنی کارروائیاں اور تفصیلات ایسے سناتا جیسے کسی دوست کو بتا رہا ہو۔ بچوں کو برابری کی اہمیت اور شعور دے کر آپ ان کو اتنا ذمہ دار بنا دیتے ہیں کہ وہ زندگی کا کوئی بھی فیصلہ سوچے سمجھے بغیر نہیں کرتے۔

اب والدین اور بچوں کے رابطے بھی اسی سرعت سے نئے انداز میں ہونے لگے ہیں۔ ایک دوسرے سے ملاقات ممکن نہیں ہوئی، فون کال کا جواب نہیں ملا تو بس ایک پیغام چھوڑ دو۔ تعلقات میں استحکام کے بجائے دلوں میں دراڑیں آنے لگی ہیں۔ موبائل پر تصاویر، وقت، جگہ سب کی فراہمی سے ایک عجیب چور سپاہی اور مدعی و منصف کی داستان شروع ہوگئی ہے۔ ''آپ نے اتنے بجے میرا پیغام دیکھا تھا لیکن جواب نہیں دیا۔ آپ کل فلاں جگہ کھانا کھانے اکیلے ہی چلے گئے۔'' مجھے ابا جی کی باتیں یاد آنے لگیں کہ اکیسویں صدی میں جدید ترین اوزاروں کے ساتھ قدیم اذہان بندر اور استرے کا کھیل کھیلتے ہیں۔ کتنے گھروں میں فسادات پھوٹ پڑے۔ حجابات اٹھنے لگے۔ خلوت کی داستانیں جلوت میں باتصویر پیش ہوئیں تو کچھ بھی پردے میں نہ رہا۔ تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو ہی فاش کر دیا۔ مغربی دنیا میں نوجوان جوڑوں کے درمیان مسائل بڑھ گئے۔ ذہنی امراض اور نفسیاتی الجھنوں میں اس نظام کا ایک بڑا ہاتھ ہے۔

••

ابا جی کو عمر کے پچھلے پہر میں بھی نئی زبانیں اور نئے حقائق سیکھنے کا شوق تھا۔ میں نے انھیں بورخس کا ایک مقولہ سنایا کہ 'اندھا پن ایک قید ہے'۔ پوچھنے لگے کہ مغربی ادب کے تراجم کہاں سے ملیں گے۔ ابا جی بے حد شوق سے مجھے پوچھتے کہ ڈینش زبان کا ماخذ کیا ہے اور کیا یورپین زبانیں

بھی آپس میں ایسے ہی مربوط ہیں جیسے مشرقی زبانیں؟

میں نے تفصیل سے بتانا چاہا تو کہنے لگے، ''ٹھہرو ٹھہرو مجھے لکھنے دو۔'' وہ بچوں کے سے اشتیاق سے یورپی زبانوں میں الفاظ کا تلفظ پوچھنے لگے۔ میں نے لفظ ''جیزس'' (Jesus) کے انگریزی سپیلنگ لکھے اور بتایا کہ ہسپانیہ والے ج کو ''خ'' (خیسس) پڑھتے ہیں، ہم اہلِ ڈنمارک اس کو ''ی'' سے پڑھتے ہیں جیسے ''یے سس۔''

''واہ'' ابا جی اپنی ڈائری پر نوٹ لکھنے کے بعد بولے ''یہ تو ایسے ہی ہے جیسے اہلِ فارس ''ق'' کو ''غ'' اور عربی زبان میں ''گ'' کو ''غ'' پڑھا جاتا ہے۔ برِصغیر میں بھی تو حیدر آباد میں قائدِاعظم کو خائدِاعظم کہا جاتا ہے۔ 'پ' کو 'ف' یا جیسے حرف ''ذ'' کو ''ج'' ادا کیا جاتا ہے۔

ڈنمارک میں اکثر بوڑھے افراد کو نئی زبانیں سیکھنے کی طرف مائل کیا جاتا ہے کیونکہ دماغ پر کی گئی جدید تحقیقات بتاتی ہیں کہ آموزش کا یہ عمل بوڑھوں کے دماغ کو متحرک کرتا ہے اور انھیں نسیان کا عارضہ لاحق نہیں ہوتا۔ میں اکثر حیران ہو کر سوچتی تھی کہ یہ سب باتیں جانے بغیر بھی وہ آخری عمر میں بھی شہد کی مکھی کی طرح اپنے انجذاب کی قوت سے مالا مال تھے۔ یہ ہی وہ نقطۂ آغاز تھا جب میں نے ڈینش زبان و ادب کے بارے میں لکھنے کا فیصلہ کیا۔ ابا جی ایک دائمی آسودگی کی صورت میں کہیں نہ کہیں سایہ فگن ہوتے ہیں۔ ان اوراق میں جو کوئی بھی ان کو دیکھ پائے تو میرے ابا جی کے لیے دستِ دعا ضرور بلند کرے۔ یہی میری اس کاوش کا مقصد ہے کہ میں رہوں یا نہ رہوں لیکن مجھے بلاتفریق انسانوں سے محبت کرنے کا اور اپنی ذات کو بہتری کا درس دینے والوں کا نام ضرور زندہ رہے۔

••

ڈینش شعر و ادب پر کام کرتے ہوئے بھی ابا جی کے ذوقِ تجسس نے کتنی نئی دنیاؤں کے دروازے کھولے۔ ان کا معصوم سا استفسار کہ سکینڈے نیویا میں کل کتنے ممالک شامل ہیں، اردو کے عام قاری کو تو یہ بھی علم نہیں ہوگا کہ سکینڈے نیویا کی تاریخ و جغرافیہ کیا ہے۔ ان کی تجویز کے مطابق ہی میں نے کتاب پر شروع کے ابواب شامل کیے۔

پھر جب ساگاز کے باب پر کام شروع کیا تو ان کی دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ داستان گوئی کا فن اور داستانوں میں بادشاہوں کے قصے، معاشرے میں عزت اور غیرت کے پیمانے، عورت کو باپ اور پھر شوہر کی جاگیر سمجھنے کا تصور اور پھر عورت ہی کو زیادتی کا نشانہ بنا کر اس کے باپ اور بھائیوں

کی غیرت کو تازیانے لگانا اور ان سے انتقام لینا، عرب معاشرے اور برِصغیر پاک و ہند کے جاگیردارنہ نظام ہی کی صورت میں ہے۔ میں نے ابا جی کو کئی مشہور ساگاز سنائیں۔ کئی ساگاز میں عورت (بیٹی یا بہن) کے انتقام کی ہولناک کہانیاں ہیں۔ وہ اپنے باپ اور بھائیوں کا انتقام لینے کے لیے اور بادشاہ کی جبری بیوی بننے کے بعد اس کی نسلوں کا نام ونشان مٹا دیتی ہے، حتیٰ کہ جو بچے اس نے خود جنم دیے، یا بادشاہ سے انتقام لینے کے لیے، ان ہی کو مروا دیتی ہے۔ یہ عورت دشمنوں کو نسیت و نابود کر دیتی ہے۔

''خدا کی پناہ!'' ابا جی نے کہا۔ ''ہمارے چھوٹے سے شہر اور ان کے قصبات میں ایسی کئی داستانیں ہیں۔ شاید فطرتِ انسانی ہزاروں سال پہلے ہر خطے میں ایسی ہی تھی۔''

عرب قبائل کی طرح آئس لینڈ کی ساگاز میں بھی عورت اپنے شوہر کے بجائے اپنے باپ کے نام سے شناخت پاتی ہے، اور اسے ''فلاں کی دختر''، ''فلاں کی بیٹی'' کہا جاتا تھا۔

''انگریزی میں داستانیں موجود ہیں؟'' ابا جی نے پوچھا۔ ''جی بالکل ہیں۔ امریکہ میں بھی ان پر بہت کام ہوا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''لیکن بیٹا، آپ ان پر اردو میں کام کریں جو براہِ راست تراجم ہوں۔ سکینڈے نیویا کی تاریخ کے حوالے سے ان کہانیوں پر تحقیق، تراجم اور تقابل ایک نایاب کام ہوگا۔''

وائی کنگز کے بارے میں کام کرتے ہوئے بھی ابا جی کو بھی یاد آیا کہ انھوں نے منصورہ سے شائع ہونے والی کسی عربی کتاب کے اردو ترجمے میں وائی کنگز کا ذکر کیا تھا۔

''اسے ڈھونڈو۔'' مجھے اردو کتاب کا ترجمہ تو نہ مل سکا لیکن میں نے عربی کتاب ڈھونڈ نکالی۔ اس کا جرمن ترجمہ 1823ء میں ہو چکا تھا۔ سویڈش زبان میں یہ اسّی کی دہائی میں آچکی تھی۔ انگریزی اور ڈینش ترجمہ تاخیر سے ہوا۔ ابا جی کے تجسس نے مجھے وائی کنگز پر مکمل پروجیکٹ بنانے پر مجبور کیا۔ سنہ دو ہزار میں جب جیمز منٹگمری کی کتاب، ابنِ فضلان اینڈ دا روسیا، (Ibn Fadlan and the Rūsiyyah) منصۂ شہود پر آئی تو ابنِ فضلان پر مزید تحقیق کے راستے کھلے۔ اس کی تحریر پر تنقید بھی ہوئی۔ میں نے سکینڈے نیویا میں موجود تقریباً تمام عجائب گھروں میں جا کر نوٹس مکمل کیے۔ وائی کنگز پر زبان و ادب کے حوالے سے کام کیا اور ان کی شاعری کا ترجمہ بھی کیا۔ میری کتاب ''زبانِ یارِ من دانش'' میں یہ مواد ایک باب کی صورت میں موجود ہے۔

وائی کنگز کی تدفین کی رسومات کے بارے میں سب سے زیادہ مستند حوالے دینے والا

اور عینی شاہد مصنف عرب دنیا سے سامنے آتا ہے۔ ابنِ فضلان دسویں صدی عیسوی کا عرب مصنف جس کو بغداد کے عباسی خلیفہ المقتدر نے 921ء میں ولگا بلغاریہ (یا وولگا کاما بلغاریہ جہاں ترک نسل کے لوگ آباد تھے) کے بادشاہ کے پاس سفارت خانے کے ایک رکن کے طور پر بھیجا تھا۔

بادشاہ نے ذاتی طور پر ایک خط لکھ کر درخواست کی تھی کہ اِس علاقے میں اسلامی عقائد سکھانے کے لیے کوئی وفد بھیجا جائے۔ مہذب بغداد کا باسی ابنِ فضلان دورانِ سفر محیر العقول مناظر اور واقعات کا چشم دید گواہ تھا۔

اس نے بعد میں اپنے سفر کی تفصیلات کے بارے میں ایک کتاب ''الٰی ملک الصقالبہ'' (The Kita-b ila- Mulk al-Saqa-liba) لکھی۔ یورپ میں اِس کتاب کی اِس لیے بھی بہت پذیرائی ہوئی کہ اِس میں سکینڈے نیویا کے وائی کنگز کے جنازے اور تدفین کی رسومات کا مفصل تذکرہ ہے۔

اس نے اپنے سفر کے دوران شدید سردی کا ذکر بھی کیا۔ علم و آگہی سے منور ذہن نے حیرت و استعجاب سے یورپ کی جنگجو قوم وائی کنگ کو قریب سے دیکھا اور پھر تفصیل کے ساتھ آخری رسومات کے چشم دید واقعات تحریر کیے۔ نورس تاریخ میں اِس کتاب اور واقعے کی بہت اہمیت ہے کیونکہ یہ زمان و مکان کی پوری صحت کے ساتھ تفصیلات کا بیان ہے۔

ابنِ فضلان کے بیان کے مطابق وہ کسی بے حد امیر سردار کا جنازہ تھا۔ اس کی رسومات کو کئی دن لگے۔ پہلے اس کی میت کو ایک عارضی قبر میں رکھا گیا تا کہ اس کے نئے کپڑے وغیرہ سیے جا سکیں۔ اِن رسومات کی ادائیگی کے لیے کئی خیمے لگائے گئے تھے۔ اِس دوران اس کی ایک کنیز نے رضا کارانہ طور پر اعلان کیا کہ وہ اپنے مالک کے ساتھ اِس آخری سفر پر جانا چاہتی ہے۔ اس کے اِس اعلان کے بعد اس کو ہر وقت نگرانی میں رکھا گیا۔ اسے پینے کے لیے بھاری نشے والے مشروبات دیے جاتے۔ آخری دن جب ساری تیاریاں مکمل ہوگئیں تو ایک بحری جہاز لایا گیا جس میں ایک خوبصورت بستر سجایا گیا۔ ایک بوڑھی عورت نے جس کو موت کے فرشتے کا نام دیا گیا تھا، اِس بستر کو سجایا اور اِس پر تکیے رکھے۔ پھل، شراب اور اس کے ہتھیار بھی سجائے گئے۔ پھر دو گھوڑے ذبح کر کے ان کا گوشت ڈالا گیا۔ آخر میں ایک مرغی اور مرغا بھی ذبح کر کے رکھا گیا۔

اِس دوران لڑکی ہر خیمے میں گئی۔ وہاں دوسرے سرداروں نے اس کے ساتھ ہمبستری کی اور اسے کہا کہ اپنے آقا سے کہنا کہ اس کی محبت میں ہم نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ گویا دوست کی وفاداری اور محبت کا ثبوت دے کر اِس نمائندے کو آقا کے پاس بھیجا جا رہا تھا۔

سہ پہر کے قریب اس کو ایک دروازے میں سے گزارا گیا۔ چند آدمیوں نے اسے اپنی ہتھیلیوں پر اٹھایا اور تین دفعہ اسے سر سے بلند کیا گیا۔ ہر دفعہ اسے بلندی پر آنے والی زندگی کے متعلق مناظر دکھائی دیے۔ پہلی مرتبہ اس نے اپنے ماں باپ کو دیکھا، دوسری مرتبہ اس نے اپنے تمام رشتے داروں کو دیکھا اور تیسری مرتبہ اس نے سرسبز باغات میں اپنے آقا کو دیکھا۔ اس کے ساتھ اور بھی بہت سے مرد اور لڑکے تھے۔

نشہ آور مشروبات دے کر اور علامتی دروازے سے گزار کر اس لڑکی کو ذہنی طور پر اگلی دنیا میں داخلے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اِس رسم سے فارغ ہو کر لڑکی نے اپنا کنگن اتارا اور اس بوڑھی عورت کو دے دیا، انگوٹھیاں اتار کر اس کی بیٹیوں کو دے دیں۔ سب لوگوں کو خدا حافظ کہا۔ اسے جہاز کے اندر کھینچ لیا گیا۔ باہر فوراً ہی مردوں نے ڈھول پیٹنا شروع کر دیا تاکہ رسومات کی ادائیگی کے دوران اس کی چیخوں کی آواز نہ سنائی دے۔ اِس کے بعد چھ مرد اندر گئے اور اس کے ساتھ ہمبستری کرنے کے بعد اس کو آقا کے بستر پر لٹا دیا گیا۔ دو آدمیوں نے اس کے بازو دبوچ لیے اور دو مردوں نے اس کی کلائیاں جکڑ لیں۔ موت کے فرشتے یعنی بوڑھی عورت نے اس کے گلے کے گرد رسی کس دی اور ایک چاقو سے اس کی پسلیوں پر وار کیا۔

مرنے والے کے رشتے دار ایک جلتی ہوئی لکڑی لے کر جہاز میں آ گئے اور اس کو نذرِ آتش کر دیا۔ بعد میں اس راکھ پر ایک گول مینار سا تعمیر کیا گیا، اس پر پودے لگائے گئے اور مرنے والے کا نام تحریر کیا گیا۔ پھر سب اپنے اپنے جہازوں میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔

ابا جی سے گفتگو کے دوران یوں ہی ایتھنیا دیوی کا تذکرہ ہو گیا۔ ''کون ایتھنیا؟'' میری تقریر کے جواب میں ابا جی کا سادہ سا سوال آیا۔

میں نے انھیں یونانی دیومالائی دیوتائے اعلیٰ کی بیٹی کے بارے میں بتایا جس کا نام ایتھنز شہر سے وابستہ کیا جاتا ہے اور جو اپنے باپ زیوس دیوتا کی پیشانی سے زرہ بکتر پہنے ہوئے پیدا ہوئی۔ ابا جی کے تجسس میں تفنن بھی شامل ہو گیا۔ ہنستے ہوئے کہنے لگے ''بس، اب ماں کی طرح

اساطیری حملے کرنا، نیا اسلحہ آ گیا آپ کے ہاتھ میں۔''

ابا جی نے مجھے یونانی اور قدیم عربی اساطیر کا موازنہ کرنے کو کہا۔ کہنے لگے، '' آپ جن لوگوں کو برا سمجھتی ہیں ان سے بھی اچھی بات سیکھ سکتے ہیں۔ جو کام اور حرکات اور باتیں ان لوگوں کی ہیں وہ ہم نہیں کریں گے۔ ہندہ کلیجہ خور بھی ایک کردار ہے جس سے سیکھا جاسکتا ہے۔ عورت کو علم نہیں لیکن لاشعوری طور پر وہ گود کے بچے کو مرد بناتی ہے۔''

''ابا جی،'' میں نے تقریباً تنگ آ کر کہا، ''لیکن عورت کو اگر معمار کہا جائے اور سمجھا جائے تو کیا وہ ایتھنیا کی طرح پیدا ہوگی۔ آخر ایک اصلی گوشت پوست کی عورت جسے جنوبی ایشیا میں اضافی بوجھ سمجھا جاتا ہے، پیدا ہوتے ہی تو بھٹے سے اینٹیں لے کر تعمیری کام میں نہیں جت جائے گی ناں؟ آخر اسے بھی تو تربیت، تعلیم اور پرورش کی ضرورت ہوگی؟''

''پرانے زمانے میں عورت کو قرآن، کتابت اور علمِ خطابت سکھایا جاتا تھا۔ گھوڑے کی لگام اور کتابت کا قلم اس کے ہاتھ میں تھا تو آپ کی ہیروعورتوں نے کارنامے دکھائے۔''

ابا جی کو بی بی زینب رضی اللہ عنہا اور بی بی خنسا رضی اللہ عنہا کے کردار بے حد پسند تھے۔ بالخصوص بی بی زینب رضی اللہ عنہا کے نطق و تکلم کی فصاحت اور جرأت ان کے لیے مینارۂ نور تھا۔

••

قدیم عربی ادب اور پرانی آئس لینڈ کی ساگاز میں یہ نقائص اور حقائق یکساں انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ یورپ کے شاہی خاندان اپنے اقتدار کی توسیع کے لیے کم عمر بچیوں کی شادیاں عمر رسیدہ بادشاہوں سے کرتے، ازدواجی نسبت قائم کرتے ہوئے سیاسی معاہدے طے ہوتے۔ ڈنمارک کی حد تک بات کیجیے تو یہاں کی ملکہ مارگریٹ اول (1412-1353) کو نو برس کی عمر میں شادی کی غرض سے ناروے بھیج دیا گیا۔ دس برس کی عمر میں اس کی شادی کر دی گئی۔ ملکہ مارگریٹ اول کی شادی سراسر سیاسی معاہدہ تھی جو سویڈش نارویجن بادشاہ میگنس چہارم اور ہفتم کے سب سے چھوٹے بیٹے شاہ ہوکن ششم آف ناروے سے کی گئی۔ دونوں بادشاہوں کے درمیان طے پایا کہ بادشاہ ویلڈمر کی بیٹی ملکہ مارگریٹ کا سسر شاہ میگنس چہارم نورڈک طاقت کے حصول کی جنگ میں شاہ ویلڈمر کا ساتھ دے گا۔ شاہ ویلڈمر کا سویڈن کے بادشاہ ایرک دوازدہم آف سویڈن کے ساتھ ساؤتھ سویڈن کے علاقے پر تنازع تھا۔ سکینیا (Scania) کا علاقہ 1332 سے سویڈن کے پاس

رہن رکھا تھا۔ بادشاہ ویلڈمر اس علاقے کی بازیابی چاہتا تھا۔ شادی کے اس معاہدے میں ہیلسنگ بورگ کا قلعہ بھی ڈنمارک کو واپس دیا جانا تھا۔ ملکہ مارگریٹ کی ماں ہیلوِگ کی شادی بھی سیاسی سمجھوتے اور اکھاڑ پچھاڑ کا نتیجہ تھی۔ اس کے بھائی نے اپنے ماموں کے خلاف شاہ ویلڈمر کے ساتھ اتحاد کرلیا اور اپنی بہن کی شادی بادشاہ سے کر دی۔ ہیلوِگ کے تاریخی جہیز سے شاہ ویلڈمر نے ڈنمارک کی بنیادیں مضبوط کیں۔

مارگریٹ کی شادی اور معاہدے کو سکینڈے نیویا میں خوش دلی سے نہیں دیکھا گیا بلکہ برجٹ آف سویڈن یا سینٹ برگیٹا نے پوپ کو لکھے خط میں اس معاہدے کو ''گڑیا کا کھیل'' قرار دیا۔ سینٹ برگیٹا کی بیٹی میریٹے کو ملکہ کی تعلیم و تربیت پر مامور کیا گیا تا کہ اسے دین و دنیا کا علم دیا جا سکے۔ میریٹے کی بیٹی بھی ملکہ کے ساتھ تربیت پا رہی تھی۔ میریٹے ایک بے حد سخت گیر استانی تھی۔ ملکہ مارگریٹ کے لیے قدرت نے عجیب راستے ہموار کیے۔ اس کی شادی کے چند ماہ بعد ہی اس کا اکلوتا بھائی کرسٹوفر وفات پا گیا، جس کا سیاسی نتیجہ یہ تھا کہ اب ڈنمارک کے ولی عہد کا عہدہ خالی تھا۔ اب سکینڈے نیویا کے سیاسی حالات نشیب و فراز کا شکار ہو گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ملکہ مارگریٹ کو سرکاری طور پر کبھی ملکہ نہیں کہا گیا۔ اس کا حریف البرٹ کنگ آف سویڈن اسے طنزیہ طور پر لیڈی کنگ بھی کہتا تھا۔ لیکن مارگریٹ اول کے نام کے ساتھ یہ القاب مشہور ہو گئے۔ اس زمانے میں بحیثیت ایک عورت حکمران کے مارگریٹ کو بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بیٹے کی موت کا سبب اسے قرار دیا گیا۔ بدچلنی کا الزام لگا کر اسے سویڈش سیاست دان ابراہام براڈرسن (1350–1410) کے ساتھ ناجائز تعلقات اور ان کے شاخسانے میں ایک بیٹی کی ماں قرار دیا گیا۔

آج کے قاری کے لیے اِس کے مضامین عجیب سہی، لیکن جب بھی اِن کو کسی بھی زبان و ادب کی تاریخ اور ابتدائی حالات و واقعات کے پس منظر میں دیکھا جائے گا تو بہت سے عناصر یکساں نظر آئیں گے۔ مثال کے طور پر صرف ایک صدی پہلے ڈنمارک میں ایک جاگیردار اپنی بیٹی کی شادی دوسرے جاگیردار کے گھر ہی کرنا چاہتا تھا۔ نوجوان نسل کو اپنی مرضی سے ساتھی کے انتخاب کا موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ لڑکی کے انتخاب میں یہ بات بالخصوص پیشِ نظر رکھی جاتی کہ وہ خوب صحت مند، تندرست و توانا ہوتا کہ وہ نہ صرف کھیتوں میں کام کرنے میں معاون ہو بلکہ زیادہ بچے بھی پیدا کر سکے اور ان کو پالنے پوسنے کا فرض بھی نبھائے۔

اس زمانے میں کسی بھی گھرانے میں دس بارہ بچے عام بات تھی۔ اِس تصور کو پنجاب کے

جئی کلچر کے متوازی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب محبت اور شادی کلی طور پر خاندان اور قبیلے کی مرضی اور شرائط پر ہوا کرتی تھی۔ شاعری میں عورت کو اپنے باپ اور بھائیوں کے شملہ و دستار کا وزن اٹھانا پڑتا تھا اور مرد کو اپنے جذبات خاندانی قوانین اور معاشرتی حد بندیوں کی نذر کرنا ہوتے تھے۔ انارکلی کو دیوار میں چنوا دینے جیسی کہانیاں صرف برِ صغیر پاک و ہند کا ورثہ نہیں بلکہ تقریباً ہر معاشرے میں ایسی مجبور محبت کے نشانات ملتے ہیں۔ ساگاز میں جنگ کے دوران یا باہمی جھگڑوں میں دشمن کی بیٹیوں کو اغوا کر لینا، ان کے ساتھ جبر و زیادتی کرنا یا دشمن کو شدید اذیت سے دوچار کرنے کے لیے لڑکی کو حاملہ کر کے چھوڑ دینا وغیرہ شامل تھا۔

بیٹوں والے اپنے بیٹے کے لیے رشتہ لے کر جاتے تو باقاعدہ جہیز و اِخراجات و تحائف وغیرہ کی بات چیت قانونی انداز میں ہوتی۔ لڑکی کے لیے رشتہ دیکھتے ہوئے والدین کی ترجیح یہ ہوتی کہ لڑکا مالی لحاظ سے مضبوط ہو، بلکہ ان سے بہتر ہوتا کہ لڑکی کو زیادہ تحفظات حاصل ہوں۔ والدین کی رضا سے نسبت طے ہو جانے کے بعد بھی اس دور کا معاشرہ دونوں کو آزادانہ ملنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ رسم و رواج، مذہبی قواعد و ضوابط اور اخلاقی پابندیاں بہت سخت تھیں، لیکن اس دور کے قصوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بغاوت کی ابتداً ہو چکی تھی اور ازدواجی دائرے سے باہر رہ کر بھی بچوں کی پیدائش و پرورش ہونے لگی تھی۔ ایسے گیت یا قصے اپنے عہد کی سماجی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ شہر میں تو جلد ہی اِس بات کو ہضم کر لیا گیا لیکن دیہی ماحول میں 1900ء کے وسط کے بعد جوانوں کی اِس آزادروی پر سماجی خاموشی نیم رضا ٹھہری۔

آئس لینڈ کی شاعری میں عشقیہ شاعری قابلِ قبول نہیں تھی۔ کسی عورت کے لیے شعر کہنا نہ صرف اس کے کردار پر ایک دھبہ لگانے کے مترادف تھا بلکہ اس کے پورے خاندان کی آبرو پر ایک حملہ سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قانونی طور پر عشقیہ نظموں اور گیتوں کی ممانعت تھی اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ قدیم آئس لینڈک معاشرے میں ایک عورت کو کسی کو اپنی مرضی سے دل دینے کا یا اس کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا حق حاصل نہیں تھا۔ اس کی شادی کا فیصلہ اس کا والد، بھائی یا پھر کوئی اور سرپرست کرتا۔ بیوہ کو نسبتاً آزادی حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آئس لینڈ کے ادب میں شاعری کی یہ صنف نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگرچہ اِس میں عورتوں کے حسن اور عارض و لب و گیسو کے افسانے ہیں لیکن اِس شاعری کو نسوانی نام نہیں دیا گیا بلکہ اِسے مردانہ نام سے ہی ظاہر کیا گیا ہے۔ ہوامول (Hávamál) میں اِس کا تذکرہ ہے۔

یہاں مجھے اس عورت کا قصہ یاد آگیا ہے جسے ایک جنگ میں بچے کھچے خاندان سمیت قید کرلیا جاتا ہے اور اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ باپ، بھائی، شوہر اور بیٹے میں سے جس کسی ایک کو چن لے، اسے معاف کر دیا جائے گا اور باقی سب تہہِ تیغ کر دیے جائیں گے۔ وہ ایک لمحہ لگائے بغیر بھائی کو بچانے کا فیصلہ کرلیتی ہے۔ اس کا موقف یہ تھا کہ میرا باپ تو بوڑھا ہے اور اسے تو دنیا سے جانا ہی ہے۔ شوہر کا حصول بھی کوئی مسئلہ نہیں کیونکہ میں حسین ہوں، جوان ہوں، مجھے ہاتھ تھامنے والے بہتیرے مل جائیں گے اور میں پھر صاحبِ اولاد ہوجاؤں گی، لیکن میرا ماں جایا، میرے خاندان اور قبیلے کا آخری چراغ ہے اور اسی سے میرے باپ کا نام زندہ رہے گا۔ سو اس کو جان کی امان دی جائے۔ پھر آئس لینڈ کی ساگاز کی وہ عورت بھی جو اپنے سامنے اپنے جوان بھائیوں کو قتل کرنے کا بدلہ لرزہ خیز انداز میں لیتی ہے۔ اس قاتل اور غاصب بادشاہ کے بچوں کی ماں بننے کے باوجود پوری نسل کو قتل کر کے لیتی ہے، جس میں وہ ذہنی اور روحانی طور پر ایک ماں نہیں بنتی بلکہ جبر کے نتیجے میں صرف اپنے بدن کو نفرت پالنے کے لیے کرائے پر دے دیتی ہے اور جب وہ ان کو ہلاک کرتی ہے تو اس کے ذہن میں اپنی کوکھ کے آبدار موتی نہیں بلکہ ایک ظالم اور جابر مرد کی اولاد ہوتی ہے جو اس کی بے بسی اور بے چارگی کے تعلق سے وجود میں آئی تھی۔

اپنے بھائیوں کے بہیمانہ قتل کا انتقام لینے کے لیے وہ بھی مرد شکاری کی طرح طویل منصوبہ بندی کرتی ہے۔ ایک دن بادشاہ کسی سفر یا کسی مہم سے فاتح بن کر اپنے لشکر کے ساتھ محل واپس آتا ہے۔ باوفا بیوی شوہر کی کامیابی کی خوشی میں ایک بڑے جشن کا انعقاد کرتی ہے۔ اپنے دونوں بیٹوں کو قتل کر کے ان کے سروں کے پیالے میں بادشاہ کو شراب پیش کرتی ہے اور ان کے بھنے ہوئے دل کھلاتی ہے۔ پھر مکمل اطمینان کے ساتھ اسے بتانے کے بعد کہ اس نے کیا کچھ کھایا ہے، وہ محل کو آگ لگا دیتی ہے۔

آئس لینڈک ساگاز کی اپنے خاندان کے مردوں سے محبت اور ان سے ظلم کے انتقام کے ساتھ ساتھ جو یورپی حکایات اور داستانیں معروف ہیں اور جن کو آج بھی پرانی مصوری کے ذریعے زندہ رکھا جاتا ہے ان میں سے ایک پینٹنگ بے حد معروف ہے۔ رومن داستانیں بھی عورت کی باپ سے محبت کی گہرائی بیان کرنے کے لیے ''رومن چیرٹی'' Caritas Romana کی حدود تک جا پہنچتی ہیں۔ جہاں نوجوان بیٹی ''پیرو'' اپنے بوڑھے قیدی باپ ''سیمون'' کو بچانے کی کوشش میں عقیدے اور اخلاقیات کی ہر حد پھلانگ جاتی ہے۔ اس داستان کے مطابق بادشاہ نے سیمون کو

سرتاپا زنجیروں میں جکڑ کر قید خانے پھینکوا دیا تھا اور دربانوں کو حکم دیا کہ اسے یہیں بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ پیرو محبت سے بیتاب ہو کر اجازت مانگتی ہے کہ اس کو بلا ناغہ باپ سے ملنے کی اجازت دی جائے۔ پیرو ایک شیر خوار بچی کی ماں تھی اس نے جذبات کی انتہا پر جا کر زنجیروں میں جکڑے باپ کو دودھ پلانا شروع کیا۔ جب اس کا راز کھلا تو جیسے قیامت آ گئی اور باپ کو زندان خانے کی تنہائی میں زندہ رہنے کے لیے اپنے شیر خوار بچے کی طرح غذا پہنچانے کے جرم میں دونوں باپ بیٹی پر فتوے لگائے گئے۔ اس کہانی کی اصلیت جو بھی ہو لیکن یورپی فنونِ لطیفہ میں اس واقعے کی تصاویر ملتی ہیں۔ بے شمار فنکاروں نے اسے اپنے فن کا موضوع بنایا ہے اور عجائب گھروں میں بھی آویزاں ہے۔ اس کہانی کے بارے میں رومن اسناد میں جو نظم پیش کی گئی ہے وہ بذاتِ خود ایک شہ پارہ ہے۔

ابا جی نہایت انہماک اور دلچسپی سے یہ حکایات سنا کرتے تھے، ''یہ تاریخی، تہذیبی اور سماجی تقابل نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔ اس موازنے کے ذریعے اقوام میں باہمی تفہیم اور تحمل کا عنصر جنم لیتا ہے۔ آپ ڈینش عورتوں اور شاعرات پر ضرور کتاب لکھیں۔ آپ نے تاریخ کو جدید انداز میں پڑھا ہے'' وہ یوں فرمائش کرتے جیسے میرے ہاتھ میں جادو کی چھڑی ہو۔

''مسئلہ یہ ہے بیٹا کہ عورت کا کردار ہمیشہ مرد نے تخلیق کیا، وہی اس بات کا تعین کرتا رہا کہ اسے کردار کیسے نبھانا ہے اور کہاں پر کیا مکالمات ادا کرنے ہیں۔ لیکن جب عورت خود افسانہ تحریر کرے گی، اس میں اپنا اور مرد کا کردار چنے گی اور مکالمات لکھ کر ادائیگی کروائے گی تو ہی تقابل ممکن ہو سکے گا۔ سو آپ کو صرف لکھنا ہے، بس۔''

میں نے ابا جی سے پوچھا، ''جب کبھی مباحثوں کے لیے عورت کے موضوع پر تقاریر لکھتی ہوں تو اسے جذباتی قرار دے کر منطق اور دلیل کے دروازے اس پر بند کر دینے والے مخالفین کو کیا جواب دیا جائے؟''

''عورت کی جذباتیت ہی اس کی طاقت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ اسے جذباتی کہا جائے تو اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟ ابا جی اپنے مخصوص انداز میں بولے، ''عورت عمومی طور پر زیادہ جذباتی ہوتی ہے اور اسی صفت کی وجہ سے وہ بچوں کی خاطر اپنی زندگی اور ارمان قربان کر دیتی ہے۔ پھر اگر وہ باقی معاملات میں بھی جذباتیت دکھائے اور فوری غصے اور انتقام کی خاطر فیصلے کرے اور ان کے دور رس نتائج پر غور نہ کرے تو کوئی نئی بات نہیں۔ فوری ابال اس کی عقل و دانش کو بہا کر لے جاتا

ہے لیکن جب جذبات کے ریلے کو منطق کا ٹھہراؤ ملتا ہے اور شعوری تربیت کا سہارا ساتھ شامل ہو جائے تو اس میں قائدانہ صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ مردوں کو بھی اس میدان میں پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ یعنی تربیت اور ماحول سے جذباتیت پر قابو پایا جا سکتا ہے۔''

عزیز بھائی نے اعتراض کی جسارت کی تو ابا جی بولے،''بالکل، یہ بات طے ہے کہ ماحول اور تربیت سے مزاج بدلے جا سکتے ہیں۔ تاریخ کی کتب اٹھا کر دیکھو، جہاں امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جاتا وہاں عورت نے حکومت بھی کی، گھڑسواری کے جوہر بھی دکھائے، جنگیں بھی لڑیں۔ یاد رکھو کہ بھیڑوں کی سی تربیت دے کر آپ عورت سے شیرنی کے اوصاف نہیں مانگ سکتے۔

جن گھرانوں میں بچیوں پر غیر ضروری روک ٹوک نہیں ہوتی اور انھیں اپنی ذہانت اور شوق کے مطابق تعلیم حاصل کرنے دی جاتی ہے، جہاں بیوی سے مشاورت ہوتی ہے اور ماں کا ادب کیا جاتا ہے وہاں عورتوں میں ایک خاص دانش مندی ہوتی ہے وہ رپورٹر نہیں رہتی بلکہ مدیرۂ اعلیٰ ہوتی ہے اور اپنی فراست سے وہ تمام جھگڑے اور فسادات بآسانی روک سکتی ہے جو گھریلو سطح پر شروع ہو کر اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ پنچایتیں بیٹھنے لگتی ہیں۔''

شکر ہے ابا جی کی رسائی کبھی سٹار پلس ڈراموں تک نہیں تھی ورنہ جس عورت کے حقوق کے لیے وہ جنگ لڑتے تھے اس کی 'چھترول' بھی اسی شدت سے ہوتی۔

••

ہمارے معاشرے میں جس گھرانے میں لڑکے زیادہ ہوں ان کی گردن میں بلاوجہ ہی ماش کا آٹا لگ جاتا ہے۔ یہ بھی ایک سماجی رویہ ہے کہ فلاں کے بیٹے ہیں۔ ہاں بھئی، لوگ رشتوں کے لیے آتے ہیں۔ ابا جی کو اس ذہنیت سے شدید نفرت تھی ''کمبختو! بیٹیاں نہ ہوں تو بیٹے لے کر کہاں مارے مارے پھرو گے؟ اس معاشرتی لعنت سے چھٹکارہ ضروری ہے۔ جس بلند بخت کے گھر اللہ بیٹی بھیجتا ہے، اپنی رحمت، نصرت اور برکت دے کر بھیجتا ہے۔

المال والبنون زینۃ الحیات الدنیا۔ دنیا کی آرائش سمجھ لی گئی۔ اللہ انھیں سلامت رکھے۔ لیکن جو تڑپ اور درد سہہ کر زندگی تخلیق کرنے کی قوت بیٹی اور عورت میں ہے وہ کہیں بھی نہیں۔ اپنے گھروں میں سکھ چین کی زندگی جیتی ہیں۔ لیکن 'مرزا صاحب میری اماں کا خیال رکھیے گا' کے خط بھیجتی رہتی ہیں۔ پیٹ کاٹ کر باپ کی دوا لینے آتی ہیں۔ عورت اپنے رشتے کی بقا اور ناموس کی لیے کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔''

••

پاکستان جاتے ہوئے ہوائی کمپنیوں کا اور ہمارا معاملہ جھگڑالو پڑوسنوں والا ہی رہا۔ اکثر فلائٹ تو پہنچ جاتی لیکن ساز و سامان کہیں فضا کے پیچ وخم میں ہی رہ جاتا۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ اسے سوءِ اتفاق کہوں یا شامتِ اعمال، تقدیر کی ستم ظریفی سمجھوں یا اپنے صبر کی آزمائش، لیکن ایک بات ضرور ہے کہ اس کی وجہ سے بہت دلچسپ واقعات اور تبصرے سننے کو ملے۔ مثلاً پی آئی اے کے ساتھ جب یہ تجربہ ہوا تو کہیں کوئی شنوائی نہ ہوئی بلکہ بے حد خواری ہوئی۔ فون ملا کر گھنٹوں متعلقہ افراد تک پہنچنے میں لگ جاتے اور ذہنی پریشانی الگ۔ خیر یہ ذکر اس دفعہ کا ہے جب ابا جی کی طبیعت ناساز تھی اور مجھے بالواسطہ پتہ چل گیا۔ میں نے فون کیا تو ابا جی کی ہشاش بشاش آواز سنائی دی، ''السلام علیکم۔ مجھے پتہ تھا میرے بچے کا فون ہے۔''

''ابا جی!'' میں نے برہم ہونے کی کوشش کی، ''آپ کے بچے کے علاوہ پوری دنیا کو پتہ ہے کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔ جانِ پدر میں بالکل ٹھیک ہوں'' انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یقیناً آپ کو خواب آیا ہوگا۔ ایک تو میں آپ کی ماں اور آپ کے خوابوں سے تنگ ہوں۔''

''آپ معتبر ذرائع کے ہاتھ میں فون دیجیے'' اس سے پہلے کہ خوابوں پر بحث شروع ہوتی، میں نے فوراً مطالبہ داغا۔

''نالائق'' ان کو پھر ہنسی آ گئی۔

امی جی گھر پر نہیں تھیں سو ہمارے بھتیجے صاحب نے فون فوراً ان کے ہاتھ سے لیا، ''پھوپھو! دادا ابو کو بہت درد ہو رہا تھا۔ ان کے گردے میں پتھر آ گئے تھے'' اس نے یوں اطلاع دی جیسے پورا کوہِ ہمالیہ ابا جی کے گردے میں سما گیا ہو، ''دادا ابو نماز بھی لیٹ کر پڑھتے تھے۔ بس آج کرسی پر بیٹھ کر پڑھی ہے۔''

''اچھا؟'' میں نے فون بند کر دیا۔ اس دن جمعرات تھی اور جمعے کو میری چھٹی تھی۔ ان دنوں میں دو مختلف تعلیمی اداروں سے وابستہ تھی۔ میں نے براہِ راست انسپکٹر کو فون کیا۔ ریٹا انتہائی فعال اور خوش مزاج خاتون تھی۔ میں نے اسے ساری بات بتائی اور کہا کہ مجھے دو ہفتے چاہییں۔

''میری ننھی دوست! تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ واپس آؤ گی تو بات کریں گے۔ میری نیک خواہشات بھی اپنے والد تک پہنچانا نہ بھولنا۔ اور ہاں، چھٹی کے لیے ایک ای میل ضرور بھیج دینا،

ریکارڈ کی غرض سے۔''

بچوں نے بھی فوراً سامان پیک کر دیا، ''امی فکر نہ کریں، آپ جائیں۔ ہم اب بڑے ہو گئے ہیں۔''

میں نے ہفتے کو پی آئی اے کی اسلام آباد کے لیے فلائٹ لے لی۔ دستی سامان میں نے کبھی بھی زیادہ نہیں رکھا۔ بس جلدی میں چند ادویات اور سات گھنٹوں کے سفر کے لیے دو کتابیں اور سر درد کی گولیاں۔ اسلام آباد اترنے کے بعد انتظار کے طویل گھنٹوں کے بعد پتہ چلا کہ سامان نہیں آیا۔ رپورٹ لکھوانے کے جاں گداز مراحل سے گزر کر گھر پہنچے اور سامان وہیں رہ گیا۔ اس کی بازیابی اگر اٹھارویں صدی کے شعرا کے تجربے میں ہوتی تو وہ محبوب کے انتظار کے بجائے پی آئی اے کا انتظار جیسے مضامین باندھا کرتے۔

بہرکیف بات واپسی کے سفر کی تھی۔ ایک خاتون میرے ساتھ والی نشست پر تھیں۔ پاکستان آمد کے سفر میں چلتی ہوا سے بات کرنا بھی اچھا لگتا ہے۔ واپسی کے سفر میں کوئی اور بھی بات کرنا چاہے تو ناگوار گزرتا ہے۔ لیکن وہ میرا انٹرویو لینے کے موڈ میں تھیں۔ پہلے دس منٹ یکطرفہ بولتی رہیں، ''میرا بیٹا شادی کے بعد سگی پھوپھی کے گھر گیا ہے لیکن اللہ کسی دشمن کو بھی یہ دن نہ دکھائے۔ اکو ای میرا پتر تے ماں دھی نے کتے دے بھانڈے وچ پانی پیا دتا۔''

''ہائیں!! یعنی کتے کے برتن میں پانی دیتے تھے؟'' اب میرا تجسس جاگا۔

''نہیں نہیں، میرا مطلب ہے کہ بہت ذلیل کیا۔''

''اوہ! دراصل غیر ملکیوں نے 'کھوئی چوں پانی' یعنی گھر میں جو چھوٹا سا کنواں ہوتا ہے اس کے پانی کی کہانی بھی بنا رکھی ہے جو پتہ نہیں کہاں تک درست ہے۔ لیکن شنید یہی ہے کہ کسی کی بہو گاؤں سے آئی۔ ماما جی نے پانی مانگا تو لا کر پیش کر دیا۔ انھیں کچھ عجیب سا لگا۔ سو پوچھنے پر پتہ چلا کہ کھوئی دا پانی اے۔ تحقیقات سے علم ہوا کہ بے چاری ٹائلٹ کو ولایتی کھوہ سمجھتی رہی۔ سو، ہو بھی سکتا تھا کہ بے چارے ولایتی کتے کے ساتھ خور و نوش جائز سمجھتے ہوں؟ کچھ بھی ممکن ہے۔''

''یا مظہر العجائب، بہر حال میرا سامان گم ہو گیا تھا۔'' میں نے مختصراً کہا۔

کہنے لگیں، ''بعض اوقات اللہ گناہوں کی سزا بھی تو دیتا ہے۔''

اب کے واقعی میری بولتی بند ہو گئی۔ یہ جملہ میں نے دوسری مرتبہ سنا تھا۔ پہلی دفعہ اپنی بیماری کے دنوں میں یہ 'ارشادات' سنے تھے۔

مجھے دنگ دیکھا تو بولیں ''میرا سامان کبھی گم نہیں ہوا۔ میں ایک دفعہ سعودی عرب شریف بھی جا چکی ہوں۔ میرے بھائی نے عمرہ شریف کرایا تھا۔''

''اچھا'' اب کے میں نے واقعی کھڑکی کی طرف رخ کر کے کتاب کھول لی۔

ہزار ان کے سوالات سماعت سے ٹکراتے رہے، ''تم شادی شدہ ہو؟ پڑھنے جا رہی ہو؟ سامان کو تالا لگایا تھا؟ ناروے اترو گی یا ڈنمارک جاؤ گی؟''

میں نے جنت کی بشارت پانے والے مومنوں کی طرح چپ سادھے رکھی۔ میری زندگی کی اور کوئی مصیبت سزائے اعمال ہو نہ ہو مگر وہ خاتون یقیناً میری کرنی کا پھل تھیں۔

دوسری مرتبہ پھر سامان گم ہوا لیکن اس مرتبہ سویڈش فضائی کمپنی کے ٹکٹ تھے۔ بچوں کے ساتھ گرمیوں میں پاکستان جانا ہوا۔ جب تک امی ابا جی سلامت رہے بچوں کے ساتھ چھٹیوں میں پروگرام بنتا رہا۔ اب کے ایک ہمدرد نے مشورہ دیا کہ سویڈن کی ایک کمپنی نے نئی سروس شروع کی ہے، اس کی ٹکٹیں لیں۔ بچے ساتھ ہیں، مزے سے جائیے۔ بہرحال مزہ اسلام آباد ایئر پورٹ پر سامان کی گمشدگی کی صورت ملا۔ تاہم اب کی بار کمپنی چونکہ یورپین تھی سو اس نقصان کی تلافی کے لیے ایک سوالنامہ آیا: سامان کتنے دن تاخیر سے ملا؟ ہوٹل لیا ہو تو اس کا بل؟ گزارے کے لیے کتنی خریداری کی؟ ادویات، کپڑے، جوتے۔ سب کی فہرست؟ خریداری کا بل؟ سامان کہاں پہنچایا جائے؟ وغیرہ وغیرہ۔

ابا جی کو بے حد حیرت ہوئی۔ لوگوں نے خوب بڑھا چڑھا کر جھوٹے بل پیش کیے۔ ہمارا کیس چونکہ سیدھا سادا تھا کہ اپنے والدین کے پاس گئے، خریداری بھی نہیں کی۔ رہے کپڑے، تو وہ ہم ویسے بھی گھر پہنچ کر امی کے ہی پہنتے ہیں۔ زیادہ تر بچوں کا دستی سامان تھا۔ اس کے باوجود ہمیں تلافی کے لیے چھ ہزار کراؤن ادا کیا گیا جو تقریباً ایک ٹکٹ کی قیمت بنتی تھی۔

''ارے واہ!'' امی بولیں، ''ایسا سامان تو بے شک گم ہو جائے۔''

''امی! ہر بندہ میکے نہیں جاتا۔ سامان میں ادویات اور دیگر ضروری چیزیں ہوں تو پریشانی ہوتی ہے۔''

اس بات کی سمجھ ہمیں تب آئی جب بہاول پور اور خیر پور کانفرنس میں پی آئی اے نے ہمارا سامان گم کیا اور اگلے دن کا وعدہ کرتے کرتے تین دن لگا دیے۔ ہم کانفرنس میں مقالہ پڑھنے کی غرض سے ایک جوڑے کی تلاش میں شہر کے بازار میں جوتے چٹخاتے رہے۔

یہی نہیں بلکہ ایک مرتبہ ڈاکٹر ساجدہ جو میرا سامان لا رہی تھیں، ان کا پورا سوٹ کیس ہی غائب ہو گیا اور تادمِ تحریر مفقود الخبر ہے۔ عالیہ کو سیلاب زدگان کی امداد کے لیے منعقد کیے گئے ایک پروگرام میں نظامت کے لیے خصوصی پاکستانی کپڑے درکار تھے جو بہت اہتمام سے بنوائے گئے تھے، سب فنا فی اللہ ہو گیا۔ پی آئی اے نے اس موقع پر بھی وہ خوار کیا کہ اللہ کی پناہ۔

••

ابا جی کا معمول بن گیا کہ ہر دوسرے تیسرے دن فون کر لیتے۔ نئے نئے فون کارڈ نکلے تھے جو ایک دفعہ ملا لیا جاتا تو پھر گھنٹہ بھر چلتا۔ بند کر دیا جاتا تو ختم ہو جاتا اور پھر نیا کارڈ لینا پڑتا۔ ڈینش وقت کے مطابق فون کرتے۔ یوں بچوں سے بھی ان کی گپ شپ لگتی۔ ان کی اردو گفتگو اور تلفظ کا جائزہ لیتے۔ ایک دن مجھے کہیں میٹنگ پر جانا تھا۔ میں نے کہا ابا جی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ بڑے اطمینان سے بولے، ''لیکن ابھی میرا کارڈ ختم نہیں ہوا۔'' میں نے چھیڑا ''شکر کروں گی کارڈ مکے گا۔'' ہنس کر بولے، ''جانِ پدر، تین کارڈ سرہانے کے نیچے رکھے ہیں۔ سو روپے کا کارڈ ہے، میں نے پانچ اکٹھے منگوا لیے ہیں۔''

کارڈز کا طویل نمبر ملاتے ہوئے جب ان کو دقت ہوتی تو کہتے ''کاش کوئی ایسا طریقہ بھی نکلے کہ بس نمبر پر ہاتھ لگاؤ تو کال مل جائے۔'' اب جب وائبر، وھاٹس ایپ اور ٹچ سکرین کا زمانہ آیا اور کال کرنے کے کئی ڈھنگ نکلے تو میں نے ابا جی کے تخیل کو حقیقت میں بدلتے دیکھا۔ لیکن یہ عہد سہولیات کا تو ہے، چشم زدن میں رابطے بھی ہونے لگے ہیں، لیکن وہ ذوق وشوق اور وہ تمنا نہیں رہی۔

••

میں نے جلدی سے کوٹ اور جوتے پہنے، بیگ اٹھایا اور دروازہ بند کر دیا۔ لیکن جب میں نیچے پہنچی اور بیگ سے گاڑی کی چابی نکالنے کی کوشش کی تو علم ہوا چابیاں تو گھر میں ہی رہ گئی ہیں۔ ''یا اللہ! اب کیا کروں؟ موبائل نکال کر میٹنگ والوں کو بتایا کہ میں شاید لیٹ ہو جاؤں گی۔ پھر ٹیکسی کو فون کیا۔ خود اپنی نااہلی پر غصہ بھی آ رہا تھا اور کوفت بھی ہو رہی تھی۔ اچانک موبائل کی گھنٹی بجی۔ سکرین پر عجیب سا نمبر تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ نظر انداز کر دوں، پھر خیال آیا کہ ٹیکسی آفس سے فون نہ ہو۔ میں نے موبائل آن کیا۔ دوسری طرف ابا جی تھے، ''خیر ہے، بہت جلدی میں لگ رہی ہیں؟''

''ابا جی!'' میں نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ''گھر اور گاڑی کی چابیاں اندر ہی رہ گئی ہیں اور میں باہر بند ہو گئی ہوں۔''

جواب میں چند سکینڈ تک ابا جی کی ہنسی سنائی دی۔ پھر بولے، ''بیٹا گھر کے اندر اور کمرے میں بند ہونے کا تو میں نے سن تھا لیکن میری زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی کو اللہ کے وسیع آسمان کے نیچے بند ہونے بارے خبر سنوں۔''

صورتِ حال کے تناظر میں اپنی بات کا جائزہ لیا تو مجھے بھی ہنسی آ گئی۔

••

ابا جی کے زندگی بارے اپنے ہی تجربات تھے اور ان ہی کے پیشِ نظر وہ کہا کرتے تھے کہ بچوں اور خواتین کو بھرپور اعتماد اور اپنی اہلیتوں کے استعمال کے مواقع دینا چاہییں۔ اسی سے بہترین نسل پروان چڑھتی ہے۔ مضبوط اور باصلاحیت مرد کبھی عورت کی ذہانت اور ترقی سے خوفزدہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے بساط بھر سہولیات اور مواقع فراہم کرتا ہے۔ میں نے ملازمت کے دوران دیکھا کہ کئی والدین بیٹیوں کو موبائل دینے کے خلاف تھے۔ مگر بچیاں سکول آ کر موبائل نکالتیں اور اسے استعمال کرتیں۔ مرضی کے کپڑے پہنتیں اور گھر جاتے ہوئے نجانے کہاں ٹھونس جاتیں۔ ماں باپ کے ڈر سے سکارف لینے والی بچیاں چند گھنٹے من مانی کر کے کھلی ہوا میں سانس لے لیتیں۔ میں شدید خوف کے احساس کے ساتھ ان کا مشاہدہ کرتی رہتی۔ جو بچیاں یہاں قابو نہ آتیں انھیں پاکستان بھیج دیا جاتا۔ سو وطن ان کے لیے سزا کا استعارہ بن گیا۔

ڈنمارک میں بھی ایک زمانے میں ایسی ''خودسر اور سرکش'' بچیوں کے لیے کالے پانی کی سزا تھی۔ ڈنمارک میں ایک وقت وہ بھی تھا جب اخلاقی انحطاط، جنسی بے راہروی اور سرکشی پر مائل عورتوں کو غیر معینہ مدت کے لیے ایک چھوٹے سے جزیرے ''سپروائیو'' (Sprogø) پر بھیج دیا جاتا جہاں سے فرار ممکن نہ تھا اور جہاں ان کی خودسری کو نکیل ڈال دینے والی زندگی ان کی منتظر ہوتی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً پانچ سو لڑکیوں کو وہاں رکھا گیا۔ اِس سزا کو رائج کرنے والوں کا موقف یہ تھا کہ ایسی لڑکیوں کی بدچلنی کی وجہ سے معاشرے میں بے نسب بچوں کی کثرت ہو جائے گی جو اخلاقی، سماجی اور اقتصادی بگاڑ کا باعث بنے گی۔ والدین اپنی بچیوں کو ڈرانے کے لیے اور ان کے اخلاق درست کرنے کے لیے اِس جزیرے پر بھیج دینے کی دھمکیاں دیا کرتے تھے۔ اِس جزیرے اور اِس کی اسیر لڑکیوں کے حالات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس دور میں جو سزا معاشرے میں قابلِ قبول تھی آج کے دور میں اسے ظلم کی انتہا کہا جاتا ہے۔

سرکش اور بدکردار لڑکیوں سے بھرے اِس جزیرے میں کسی بھی مرد کا داخلہ ممنوع تھا

لیکن اِس کے باوجود وہاں کبھی کبھار ایسے افسانے جنم لیتے رہے جس میں قید خانے میں رہنے والی لڑکیوں تک مردوں کی رسائی ہوجاتی تھی۔ ایسی ہی ایک کہانی میں ایک لڑکی میں جب حمل کے آثار نمودار ہوئے تو ملک بھر کے اخبارات نے قارئین کو رنگین سرخیاں مہیا کیں۔ سزا کے طور پر وضعِ حمل کے بعد لڑکی کو بانجھ کر دیا گیا۔

مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے مردوں کو بھی سزا کے طور پر ایک جزیرے لیوائیو پر بھیج دیا جاتا۔ ویبیک مارکس (Vibeke Marx) کی کتاب ''سپروائیو سے پرچھائیاں'' اِس موضوع کی معروف ترین کتاب ہے۔

بدقسمتی سے ڈنمارک میں مقیم پاکستانیوں نے ثابت کیا کہ ان ذہن میں آج بھی مرضی سے ہمسفر کا انتخاب کرنے والی بچیوں کے لیے صرف کالے پانی کی سزا ہی کافی نہیں بلکہ ان سے زندہ رہنے کا حق بھی چھین لیا جانا چاہیے۔ ایسی ہی ایک بچی پاکستان سے آئی۔ محض اٹھارہ برس کی عمر میں چھپ کر ایک عربی سے نکاح کیا اور اگلے دن اپنے بھائی کے ہاتھوں قتل ہوگئی۔ اس واقعے نے ڈینش میڈیا کو چلانے پر مجبور کر دیا اور مہینوں پولیس کی تفتیش، گرفتاریاں اور سزا کے موضوعات پر بحث ہوتی رہی۔

••

میرے بچے ابا جی کی آنکھوں کا نور تھے اور انھوں نے اس بات کو بھی سچ ثابت کر دیا کہ جسمانی و جغرافیائی دوریاں اور دریا سمندر کے فاصلے بھی دلوں کو دور نہیں کر سکتے۔ زمانی و مکانی بُعد کے باوجود ذہنی و جذباتی ہم آہنگی ناممکنات کو ممکن بناتی ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں آج کل کی طرح ٹیلی فون کی سہولتیں نہیں تھیں۔ کارڈ خرید کر اس کا طویل نمبر ملانا پڑتا تھا۔ بعض اوقات تو کتنی مرتبہ کوشش کرنا پڑتی، فون کے قریب بیٹھنا پڑتا کیونکہ لینڈ لائن پر گفتگو کرنے کے زیادہ منٹ ملتے اور موبائل پر کارڈ فوراً ختم ہوجاتا تھا۔

آج والدین اور اولاد کے درمیان رابطوں کی بے شمار سہولیات ہیں لیکن مسائل بھی بے پناہ ہیں حتیٰ کہ ایک ہاتھ بھر کی دوری پر ہونے کے باوجود قربت کی آگ سرد رہتی ہے اور بات کر کے بھی الفاظ ضائع ہوتے ہیں۔ البتہ فیسبک پر تقریبات کی تصاویر، ہوٹلوں کے کھانے اور سالگرہوں کی مبارکباد کے ڈنکے بجنے لگتے ہیں۔

••

امریکہ قیام کے دوران مجھے ابا جی کا ایک طویل اور تاریخی خط موصول ہوا۔ آج سے

اٹھارہ بیس برس پہلے کوئی فری فون کا تصور نہیں کرسکتا تھا۔ خط میں ایک پیار بھری سرزنش تھی اور ناشکرے پن پر شفقت بھری برہمی کا اظہار بھی۔ دل اداس ہونے اور دل نہ لگنے پر حیرت بھی تھی اور ایک نئے ملک میں ایک ایک لمحے سے علم کشید کرنے کی نصیحت بھی۔

''جانِ پدر! اس ماں کو اداس اور پریشان ہونے کے لیے وقت کیسے میسر ہوسکتا ہے جس کے پاس دنیا کے دو بہترین ہنستے کھیلتے کھلونے ہوں۔ آپ وہ تمام کہانیاں شاید بھول گئی ہیں جو بچپن میں سنائی جاتی تھیں۔ جوتا نہ ہونے کا غم تب ختم ہوتا ہے جب کوئی پیروں سے معذور انسان راستے میں دکھائی دے۔ بچوں کے بارے میں لکھا کرو کہ انھیں نیا ماحول کیسا لگا، ان کے سکول کیسے ہیں؟ جب تک یونیورسٹی شروع نہیں ہوتی بچوں کے سکول چلی جایا کرو۔ رضا کارانہ تدریس کی تو ہر جگہ ہر لمحہ پذیرائی ہوتی ہے۔''

اگلے دن ہی میں اپنے بیٹے کے سکول کی انتظامیہ سے بات کرکے روزانہ نو سے بارہ بجے کی جماعتوں میں کام کا آغاز کرچکی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد میں نے کورٹ لینڈ کی یونیورسٹی میں اپنی کلاسز کا آغاز کر دیا۔ ڈنمارک کے مقابلے میں امریکہ میں گاڑی خریدنا اور رکھنا بازیچۂ اطفال تھا۔ بڑا ملک اور بڑی دکانیں پھر ان میں سامان کی بھرمار، یہاں بھی ان کی رہنمائی اور نصائح، گوہر بھرے خطوط کی صورت ملتی رہی۔ آج اگر بچوں کو کسی بھی طرح کی کوئی معاشرتی علت نہیں تو اس کا احسان بھی اس تربیت کا ہے جو مجھے ان سے ملی۔ ان کو خوش خلقی اور عجز و انکساری کے تمام اسباق اپنے نانا نانی سے ملے۔ دونوں کو کبھی برانڈ کے جوتے، کپڑے کھلونے یا ذاتی استعمال کی چیزوں کی حرص اور شوق پیدا نہ ہوا۔

••

میری ہمیشہ اپنے بچوں کے لیے یہ دعا رہی کہ یااللہ ان کو دل دریا اپنے نانا جیسے دینا۔ میں ابا جی سے کہتی، ''ابا جی، میرے بچوں کے لیے دعا کریں کہ وہ آپ جیسی فیاض طبیعت کے مالک ہوں، بے لوث ہوں اور باکردار ہوں۔ میرے پاس ان کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟ کیا جاہلانہ بات ہے میرا بچہ۔ ہر انسان ایک مکمل جہان ہوتا ہے۔ اسے دوسروں سے طاقت اور تسکین تو مل سکتی ہے لیکن تکمیل نہیں، نہ ہی وہ کسی کے سہارے جیتا ہے۔ اللہ نے اس کا بنیادی ذہنی اور جسمانی سانچہ ایسا رکھا ہے کہ وہ دوبارہ اٹھنے کے لیے گرتا ہے۔''

••

میں نے زندگی کو ہمیشہ ابا جی کی عینک سے دیکھا۔ اگر کبھی مناظر بھیانک بھی ہوئے تو میں نے عینک نہیں بدلی بلکہ مناظر بدل دیے۔ زندگی بارہا اس مقام پر لائی جہاں خیر خواہوں نے مشورے دیے۔ دنیا میں، بالخصوص پاکستان میں ''شان وشوکت'' جھاڑنے کے آداب سکھانے کی کوشش کی گئی کہ آج کی دنیا بہت پیشقدمی کر چکی ہے، اس لیے یہاں پاکستان میں ذرا اپنی پوزیشن کے مطابق رہنا ہوتا ہے۔ لیکن میں کسی بھی دنیا میں گئی، میری دنیا وہی تھی جو اس چھوٹے سے، پانیوں کی بانھوں میں بستے، قصبے سرائے عالمگیر کے ایک سادہ اور چھوٹے سے آنگن میں آباد تھی۔ یہ آنگن وہ سفینہ تھا جہاں سمندر خود کھنچا چلا آتا تھا۔ میں اس جہانِ رنگ و بو کے جس حصے میں بھی گئی، میرے ہاتھوں میں وہی عینک رہی جس نے مجھے تصنع، بناوٹ، دھوکے، فریب اور کذب و ریا کی اس بستی میں وہی کھرے اصول، وہی سادہ اور فطری نظر، اور نظریہ رکھنا سکھایا۔

کراچی میں ایک طویل و عریض ڈنر پر بیٹھے جہاں یورپین مہمان بھی موجود تھے اور دنیا بھر کی ڈشز بھی حاضر تھیں، اچانک مجھے ساگ دکھائی دیا۔ میں نے ہر ڈش سے اغماض برتتے ہوئے ساگ اور روٹی اٹھالی۔

بہت سے لوگوں کو شاید یہ بات اعلیٰ کلاس کی نہ لگے لیکن جب کوئی بناوٹی لہجے میں بنا بنا کر باتیں کرتا ہے تو میرے جبڑوں میں درد سا ہونے لگتا ہے۔ الفاظ کی رفتار گھٹا کر اور تاثرات کے رنگ بڑھا کر، ایک بات کہنے کے ڈرامے میں جب وقت کا زیاں ہو تو مجھے لگتا ہے کہ جیسے میری ساعت کی رفتار بھی گھٹ گئی ہو۔ سادگی سے محبت مجھے اپنے بزرگوں سے تحفے کے طور پر ملی ہے۔ چچا جان شریف برطانیہ سے آتے تو آپا سے بان کی کھری چارپائی کی فرمائش کرتے جواب پیراشوٹ اور پائپ سے بنی ہلکی چارپائیوں سے شکست کھا چکی تھی۔ فرمائش ہوتی، ''آپا مکئی کی روٹی تو کھلائیں'' اور وہ وہیں چولھے کے پاس بیٹھ جاتے۔ امی گول گول روٹی تھاپتیں، اوپر مکھن کا ڈھیلا رکھتیں اور دونوں ان پرانے زمانوں کو یاد کرتے جو ہم نے صرف ان کی باتوں میں گزارے۔ جب ہماری دادی اماں بچوں کی طرح ضد کیا کرتیں اور امی انھیں رنگ برنگی روٹیاں بنا کر کھلایا کرتیں تھیں۔ جب ہمارے دادا جان امی کے ساتھ عقیدت بھرے لاڈ کیا کرتے تھے جس میں ان کے گھر اور بیٹوں کو سنبھالنے کا احساس احسان مندی کے طور پر جھلکتا تھا، جب دادی اماں، امی جی کو دعا دیتے ہوئے پہلے ہماری نانی اور نانا جان کو دعا دیا کرتی تھیں۔

مجھے کراچی میں ہما بخاری کی ایک ملازمہ کے الفاظ یاد آ رہے ہیں جو مجھے اپنا سرمایہ لگتے

ہیں، ''ہم تو سمجھے باہر سے کوئی میڈم آرہی ہیں، یہ تو ہمارے ملتان کے پنڈ سے آئی لگتی ہیں۔''

ایک دفعہ ڈاکٹر ساجدہ اور میں لاہور میں اکٹھے ہوئے تو ہم تصنع سے بھری اس ہائی کلاس کی اداؤں پر غور کرتے ہوئے قہقہوں کی برسات کر دی۔ ساجدہ کہنے لگیں، ''یہاں آ کر اور اس تصنع بھری زندگی، برانڈڈ طور طریقوں اور مغربی انداز سے دم گھٹنے لگتا ہے؛ ایک ایک لاکھ کا ہینڈ بیگ تھامے، اپنے اپنے کک کی مہارتوں کے افسانے، خادماؤں کی غیر حاضریاں، گاڑیوں کے ماڈلز، مہنگے ترین ہوٹلوں کے تذکرے، بیوٹی پارلرز اور جم خانوں کی کہانیاں، بوتیک اور وہاں کے نئے ملبوسات۔ دھاک بٹھانے کا کوئی انداز رہنے نہیں دیا جاتا۔ میں نے شکر کیا کہ وہاں ڈنمارک سے آئی ایک لڑکی مل گئی جس سے میرے اعصاب کی حالت بہتر ہوئی۔''

••

لوگوں کو معاف کرنا خود اپنی ذات کو معاف کرنے کے مترادف ہوتا ہے تاکہ آپ کا اپنی ذات کے ساتھ صلح نامہ رہے اور آپ جنگ کی کیفیت میں نہ رہیں۔ مجھے جب کبھی انگلینڈ جانا ہوتا تو چند ایک لوگ ایسے تھے جنھیں میں ملنے سے گریز کیا کرتی تھی لیکن اباجی ہمیشہ کہتے کہ نہیں تم ضرور جانا۔

''میری غلطی نہیں ہے اباجی'' میں ہمیشہ مصر رہتی۔

''غلطی کر کے معافی مانگنے والا تو فرض ادا کرتا ہے۔ غلطی نہ کر کے دوسروں کے ساتھ نیک سلوک کرنا عبادت ہے۔''

''میں بڑی ہوں۔ بالکل بات نہیں کروں گی۔'' میں دوسری دلیل دیتی۔

''ہاں۔ لیکن بڑے جب خود چھوٹوں سے محبت کرتے ہیں تو وہ بڑے ہونے کا حق ادا کرتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ بڑا ہونا کوئی بہت آسان بات ہے؟ جب بلندیاں جھک کے پستیوں سے ملتی ہیں تو ان کی بلندی میں اضافہ ہوتا ہے ورنہ خاک تو زمین سے اڑتی ہی رہتی ہے۔ بزرگ خواہ کہیں بھی ہوں، کسی بھی خطے کسی بھی مذہب کے ہوں، ان کی عزت کرنے سے نہ صرف دل کو سکون ملتا ہے بلکہ ان کے ساتھ رہنے سے زندگی اپنے اسرار و رموز خود سکھاتی ہے اور آپ لمحوں میں صدیوں کا سفر طے کرنے لگتے ہیں۔''

••

میں سمجھتی ہوں کہ والدین کو اپنے بچوں کے ساتھ انتہائی دوستانہ رویہ رکھنا چاہیے۔ شادی کے معاملات میں نہ صرف ان کی رائے اور رضامندی اہم ہونی چاہیے بلکہ انھیں سوچ بچار کے لیے

وقت بھی دینا چاہیے تاکہ جواباً وہ بھی آپ کی رائے کا احترام کرنا سیکھیں۔ اولاد کی تربیت کوئی یک طرفہ سڑک نہیں ہے کہ اولاد سے صرف آدابِ فرزندی کی توقع کی جائے۔ اب ہم اپنے والدین جیسے بھی تو نہیں پھر ہم اپنی اولاد سے اپنے زمانے کی سعادت مندی کا کیسے مطالبہ کر سکتے ہیں۔ لیکن تربیت میں احترام شامل کرنے کی صورت صرف جاہلانہ محبت نہیں بلکہ مساوی احترام ہے۔ دورانِ تدریس مجھے بہت سے ایسے کردار ملے جہاں والدین شادی جیسے اہم معاملے کی صورت میں پھوپھی یا ماموں کی لڑکی کو واحد آپشن کے طور پر پیش کرتے ہیں اور یہی حال بچیوں کا ہے جنھیں اعلیٰ تعلیم دلانے کے بعد بتا دیا جاتا ہے کہ اب شادی خالہ یا تایا کے بیٹے سے ہی ہوگی۔

میں نے ابا جی سے یہ بات کی تو کہنے لگے، ”آپ کیا سمجھتی ہیں یورپ میں قیام اور تعلیم ذہنی رجحان کو بدل سکتی ہے؟ اولاد کی پسند کا احترام کیے بغیر انھیں زندگی کا ساتھی منتخب کر کے دینا شادی جیسے جوئے کو مزید بے یقین کرتا ہے۔ میں اسے اولاد پر ظلم کے مترادف سمجھتا ہوں۔ اللہ کے واسطے اولاد کے مالی بنو، مالک نہ بنو۔ ہمارے پاس ولایت سے کتنے ہی والدین آتے ہیں جو فخر سے بتاتے ہیں کہ اولاد کو ہم نے رشتے جوڑنے اور مضبوط کرنے کے لیے استعمال کیا، بہن بھائیوں کے بچے سیٹ کرائے۔

پھر بعض لوگوں کے بقول ”رُسیاں نوں مناون واسطے“ (روٹھے ہوں کو منانے کے لیے) بچوں کے رشتے کرنا پڑے۔ اگرچہ والدین کو بیٹے کے چال چلن کا علم ہوتا لیکن غریب رشتے دار کی بیٹی لا کر ان پر احسان کر دیتے اور اپنے گھر کی بلا تنخواہ ملازمہ رکھ لیتے جسے تاحیات ”تمھارے والدین کی روٹی لگا دی ہے“ کے طعنے سننے پڑتے، خاوند کی ولایتی میم سوکن کو برداشت کرنا پڑتا اور آسائشوں کے نام پر ایک گھٹے ہوئے ماحول میں بھیڑ بکری کی زندگی گزارنا ہوتی۔

مجھے ابا جی کی ایک پرانی بات یاد آگئی۔ رشتے ناتوں پر آکر اکثر بہن بھائیوں میں اختلافات ہوتے ہیں۔ ہمارے سب سے چھوٹے چچا جان ابا جی کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں کرتے تھے لیکن امی جی سے اکثر شکایت کرتے رہتے۔

”لالہ جی نے کڑی باہر ویاہ دتی تے اسی رشتہ منگدے رہ گئے۔“ امی جی نے دبے لفظوں ابا جی سے بات کی اور جو جواب انھوں نے دیا وہ مجھے آج بھی یاد ہے۔

”جس بہن بھائی نے میری بیٹی لے کر راضی ہونا ہے وہ بے شک ناراض رہے۔“ جب

ہم ایسے حالات کی بات کرتے تو ابا جی کہتے۔

''آپ ان موضوعات پر لکھیں تا کہ لوگوں کو علم ہو کہ مغربی ماحول اور ڈگری کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔''

''جی لکھوں تا کہ پکڑی جاؤں کہ کس خاندان کا ذکر ہے؟''

''سیدھی بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ افسانے لکھو، کہانی سناؤ، کردار بدلو، مقامات تبدیل کر دو۔ کمال ہے، کہانی کار تو اپنے کرداروں کے لیے کاتبِ تقدیر ہوتا ہے۔'' شاید یہی وجہ ہے کہ جب میں نے افسانے لکھے تو ان کا پس منظر یورپی ماحول تھا۔

••

کبھی میں حیرت سے سوچتی ہوں کہ ابا جی کی سوچ اور فکر اپنے زمان و مکان سے بہت آگے تھی۔ ان کی نظر دور رس نتائج پر رہتی۔ خواتین کو وہ ایک بڑی اور متحرک طاقت کے طور پر لیتے جسے عزت اور محبت سے تخریب کار بننے سے روکا جا سکتا ہے۔ وہ بیک وقت معالج، مصلح، استاد اور دوست کا کردار نباہ رہے تھے۔ کبھی ایسا مسئلہ آجاتا جس میں کسی خاتون کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہو اور وہ خاموشی سے نباہ کیے جاتی ہو تو کہتے ''اس عورت سے ہمیشہ خائف رہنا جو سارے اختیارات رکھتے ہوئے بھی صبر اور مفاہمت کرتی رہے کیونکہ فطری اور قدرتی ردِعمل کو زیر کرنے والا انسان جب اپنے اختیار استعمال کرتا ہے اور بساط پلٹنے پر آجاتا ہے تو اسے روکنا یا اس کا مقابلہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لیے طلب کرنے سے پہلے فریقِ مخالف کے حقوق اس کے ہاتھ پر رکھ دیے جائیں تو گھر امن و امان کا گہوارہ بن جاتا ہے۔''

کبھی اخبار میں کوئی ایسی خبر آجاتی کہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کو ڈھونڈ کر اس کے ٹکڑے کر دیے گئے تو بہت رنجیدہ ہوتے۔ ''ایک انسان جس نے نسلوں کی بنیاد رکھنا ہو اس کی پرورش میں کیا جھول اور کجی رکھی گئی کہ اس نے انتہائی قدم اٹھایا۔ ہیر رانجھا کے قصے گانے والے ذاتی زندگی میں اتنے سفاک کیسے ہو سکتے ہیں؟ عورت اور بچیوں کو کمزور سمجھنے والے نہیں جانتے کہ ''ناری رکے تو آپ سے، نہ رکے تو سگے باپ سے۔'' شاید ناانصافی اور استحصال کے انتقام کے طور پر بچیاں ایسا قدم اٹھاتی ہیں۔''

ایک مرتبہ ایسے ہی کسی قصے میں گھر میں کام کرنے والی آپا نے کہہ دیا کہ بچی پتہ نہیں بھاگی کیوں حالانکہ پڑھی لکھی بھی نہیں تھی۔ بے چاری کی شامت آگئی، ابا جی نے اسے پوچھا، ''پڑھی

لکھی بچیاں کیا اتنی احمق ہوتی ہیں کہ بلا سوچے سمجھے گھر کی دہلیز پار کر جائیں۔ پتہ نہیں کب آپ کو سمجھ آئے گی کہ چار کھر دی راکھی اے دو کھر دی کوئی راکھی نئیں (چار کھر والوں یعنی چو پائیوں کی رکھوالی کی جاسکتی ہے لیکن دو پیروں والوں کی کوئی رکھوالی نہیں کر سکتا)۔ اعتبار اور محبت سے بڑھ کر کوئی زنجیر اور کھونٹا نہیں۔ اولاد کو بلا صنفی امتیاز اسی کھونٹے پر باندھو۔ آزادی سے بڑھ کر اسیر کرنے والی کوئی زنجیر نہیں۔''

••

موسمِ گرما میں ذرا سا سورج نکلنے پر سمندر کا کنارہ سرد ممالک میں رہنے والوں کے لیے گوشۂ فردوسِ بریں بن جاتا ہے۔ لوگ دیوانہ وار پیراکی کے لباس اور پانی میں کھیلنے والے لوازمات لیے ساحلِ سمندر کی راہ لیتے ہیں۔ بچوں کی چہکار، والدین کی خوش گپیاں اور نوجوان جوڑوں کے غسلِ آفتابی سے ساحل پر ایک شہر آباد ہو جاتا ہے۔ لائف گارڈز کی ڈیوٹی شروع ہو جاتی ہے۔ آئس کریم، کافی، لنچ فراہم کرنے کے لیے کیفے کھل جاتے ہیں۔ بچوں کے جھولے کی چرخ چوں اور گیت یک زبان گونجنے لگتے ہیں۔ پکنک کے ڈبے کھلتے ہیں۔ باربی کیو کا ساز و سامان سیٹ کر دیا جاتا ہے۔ شام کو جب عموی طور پر ساحل تنہا رہ جاتا ہے تو میں تقریباً ہر روز ہمسائے سمندر کی زیارت کو جاتی ہوں۔

ایسی ہی ایک شام کو میں ایک خاتون کو دیکھ رہی تھی جو مسلسل پانی میں ورزش کیے جا رہی تھی۔ ان کی فیملی پانی میں دور تک اندر جاتے عرشے پر تولیہ اور باقی لوازمات لیے موجود تھی۔ جب وہ بال نچوڑتی پانی سے باہر آئی تو میں نے نوٹ کیا کہ وہ حاملہ تھی۔ اس پر پورے خاندان کی اتنی توجہ اور اس کے کھیل اور ورزشی مشقیں دیکھ کر بہت خوشگوار حیرت ہوئی۔ بعد میں علم ہوا کہ وہ یہودن تھی۔ یہودیوں کے ہاں ایک نئے بچے کی آمد میں پورا خاندان شامل ہوتا ہے۔ یہ تفصیلات از خود ایسی ہیں کہ انسان عش عش کر اٹھے۔ کل کے مظلوم آج کی حاکم نسلیں پیدا کرنے کے لیے کیا کیا جتن کر رہے ہیں۔

پتہ نہیں کیوں میرے تصور میں ایک پٹی ہوئی، آنکھوں کے نیچے نیل، سوجے ہوئے ہونٹ، ایک بچہ پہلو سے لگائے ایک کی انگلی تھامے، اور آخری مہینے حمل کا بوجھ اٹھائے، گھریلو خادمہ کا فریضہ انجام دینے والی آپا آ کر کھڑی ہو گئی جسے ہماری اماں نے گھر میں اپنی مدد کے لیے رکھا ہوا تھا۔ انھوں نے ہی ضد کر کے پچھلے سال اس کا راضی نامہ کرایا تھا کہ بچے باپ کے زیرِ سایہ پلنے چاہییں۔ وہ پٹ پٹا کر ایک نئے نطفے کا بوجھ اٹھائے، پہلے مظلوموں کو پہلو سے لگائے، ایک سوالیہ نشان بنی آ کھڑی ہوئی۔

''واہ ری مائے۔۔ میں کنوں آکھاں''، ایسی عورتوں سے قوم کے معمار پیدا کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ ماں کو پیٹ بھر کر کھانے کو میسر نہیں بلکہ منہ کا نوالہ چھیننے کی گردش کرتی داستانوں میں اس سے سفید گھوڑے پر سوار محمد بن قاسم پیدا کرنے کی امید رکھی جاتی ہے۔ خاوند کی بے رغبتی، بدزبانی اور بدسلوکی سے خائف، سسرال کی نیزے کی انی جیسی چھیدتی باتوں سے بچتی، غریب میکے پر بچے کی ولادت کے اخراجات اور رسومات کے بوجھ کی فکر سے متردد، لڑکی پیدا ہوجانے کے اندیشے سے نڈھال، اس عورت سے خاندان، معاشرہ اور قوم کیا امیدیں وابستہ کرے؟

میں نجانے کن سوچوں میں غلطاں و پیچاں اس مسرور عورت کے قہقہے سنتی رہی۔ وہ یہودی حاملہ عورت، اس کی کھلکھلاہٹ، زندگی کی شادمان ساعتوں کا فخر اس کے چہرے پر لالی بکھیرے ہوئے تھا۔ اس کا شوہر اسے کانٹے میں پروکر پھل کھلا رہا تھا۔ زمین پر بچھی چٹائی پر بیٹھ کر اس نے وائلن کے سر بکھیرنا شروع کیے جیسے قصے کہانیوں کی ملکہ جس کے اردگرد خدام کی فوج ہو۔ میری محویت پر مسکرائی،

''آجاؤ'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ میں تو جیسے بلاوے کی منتظر تھی۔

اس کی ماں نے شیشے کی بوتل نکالی جس میں بادام اور کھجوریں بھری تھیں۔ تھرماس سے ابلتا پانی برآمد کر کے شیشے کی چھوٹی پیالی میں ڈالا اور اس میں سبز چائے کی پڑیا ڈال دی۔ نیاز بو کے پتے پاس رکھے۔ ایک کاغذی لفافے سے پھل نکالے اور آلتی پالتی مارے بیٹھ کر موسیقی سننے لگی۔ وہ شام میرے قلب و ذہن کو چھیڑ کر مرتعش کرگئی۔

میری مسلسل تحقیق، تجسس اور شوق نے مجھے یہودیوں میں حاملہ عورتوں کی دیکھ بھال، بچوں کی پیدائش، تربیت اور نشوونما کے بارے میں مختلف کتابیں پڑھنے پر آمادہ رکھا اور مجھے یہ جان کر بھی شدید حیرت ہوئی کہ یہودیوں میں ایک حاملہ عورت کو مبارک باد دینا یا ضرورت سے زیادہ جوش وخروش اور سرگرمی کا اظہار کرنے کا رواج نہیں۔ مبارک باد کہنے کے بجائے ان کے ہاں ایک دعائیہ لفظ ''باشا ٹووا'' (B'sha'ah tovah) کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے ''سعادتِ سعید'' یعنی آنے والا وقت خوبصورت ہو۔ مبارک باد دینے کے لیے دوسرے الفاظ ہوتے ہیں۔

آج کل جو رسم چل نکلی ہے کہ اچھے بھلے تعلیم یافتہ پاکستانی خاندانوں میں اگرچہ وہ بظاہر خود کو مذہبی اور روایات اور اقدار کا پابند قرار دیتے ہیں لیکن عورت میں ایک نئی زندگی کے آثار نمودار ہوتے ہیں مبارک باد اور اعلانات کا سلسلہ جاری ہوتا ہے، پوری دنیا کو خبر ہوجاتی ہے کہ اس خاتون کے حمل کی کیا صورتِ حال ہے، ولادت کب ہوگی؟ اس کے بعد بے بی شاور کی جو ایک نئی رسم چل

پڑی ہے، یہ ہونے والے بچے کی ماں کو کوئی بہت زیادہ ذہنی سکون نہیں دیتی۔ بچے کی صنف کے بارے میں جان کر اعلان کرنا عام سمجھ لیا گیا ہے۔ جو وقت ماں کو سکون اور ذہنی تیاری کا دینا چاہیے وہ اس ہاؤ ہو میں گزر جاتا ہے۔

اب جو نئی سائنسی تحقیق سامنے آ رہی ہے اس کے مطابق والدہ کا موڈ، اس کا مزاج، اس کی ذہنی اور جذباتی حالت، اس کے اپنے خاوند کے ساتھ تعلقات نیز اپنی سسرال کے ساتھ جو صورتِ حال ہوتی ہے، اس کا بھرپور اثر بچے پر پڑتا ہے۔

یہودی خواتین کے حمل کا زمانہ شاید ان کی زندگی کا خوبصورت ترین وقت ہوتا ہے جس میں ماں باپ بننے والا ایک جوڑا ہی نہیں، ایک خاندان ہی نہیں، ایک محلہ گاؤں یا شہر ہی نہیں بلکہ پوری سرکار اور حکومتی سطح پر سہولیات اور دیکھ بھال کا فریضہ ہوتا ہے۔ ماں کی غذا اور کھانے پینے کی تمام عادات، اس کے صبح شام کے علمی و ادبی مشاغل، اس کی تعلیمی اور تدریسی سرگرمیاں، سب کے سب ماں کو مرکز میں رکھ کر اس کو ذہنی اور جذباتی سکون اور اہمیت دینے کے لیے ترتیب دیے جاتے ہیں۔ بچے کا باپ بھی ان نو مہینوں کے دوران اپنی حاملہ بیوی کے ساتھ نہ صرف بے انتہا حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرتا ہے بلکہ ماں بننے والی عورت اکثر ریاضی کے معمے حل کرتی رہتی ہے۔ بچے کا باپ اس کی ذہنی آزمائش وحساب کے سوالات حل کرنے، گیت گانے، پیانو یا وائلن بجانے اور بادام کھجور مچھلی اور دودھ جیسی غذا کھلانے کی خدمت میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اکثر باپ رات کو سوتے ہوئے ہونے والے بچے کو کہانی پڑھ کر سناتے ہیں تاکہ بچہ پیدائش سے پہلے ہی اپنے والد کی آواز کو پہچانے اور اس کا ایک تعلق اپنے باپ کے ساتھ آواز کے ذریعے قائم ہو جائے۔

مقدس انجیل کے قصے سنائے جاتے ہیں۔ والدین ہر ہفتے کو سینیگاگ حاضری دیتے ہیں۔ آیات سنتے سناتے ہیں۔ مقدس دھنیں گاتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک شاندار کتاب ''متوقع معجزات'' نے مجھے عش عش کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہودی بچوں کو ابتدا سے کم از کم تین زبانیں سکھائی جاتی ہیں: عبرانی، عربی اور انگریزی۔ ریاضی اور سائنس توجہ اور جدید نفسیات کے مطابق پڑھائی جاتی ہے۔ غذائی عادات میں پھل کھانے کی عادت ڈالی جاتی ہے۔ دنیا بھر میں سستے داموں تمباکو کی لعنت پھیلانے والے اپنے گھروں میں سگریٹ کے ایک کش کی اجازت نہیں دیتے۔ میں نے یہودی سائنسدانوں کے حالاتِ زندگی شوق سے پڑھے اور اس قوم کی منصوبہ بندی اور باشعور قوم کے حصول کے لیے اقدامات کو سراہتی رہی۔

Expecting Miracles: Finding Meaning and Spirituality in Pregnancy Through Judaism

••

ابا جی کا ''انقلابی'' قول تھا کہ جو کسی کو بیٹی دیتا ہے وہ صرف اس خاندان پر نہیں اس کی نسلوں پر بھی احسان کرتا ہے۔ جگر کا گوشہ پال پوس کر، پڑھا لکھا کر، ایک نئے خاندان میں بھیج دینا اور پھر مروجہ معاشرتی اصولوں کے تحت اس کا گھر بسانے کی خاطر اسے دبنے، پسنے اور ان کی خادمہ بننے کے درس دینا تاکہ وہ کسی طرح خوش رہ سکیں۔ ایسے مواقع پر کوئی اسلامی تعلیمات کا نام نہیں لیتا جس کے مطابق عائلی زندگی کے اپنے قوانین ہیں لیکن ہمارا معاشرہ ایسا ہے کہ اس بچی کو پہلے والدین اپنی روایات کے مطابق پروان چڑھاتے ہیں پھر اس کا سسرال فیصلے کی ترازو ہاتھ میں اٹھا لیتا ہے۔ بیس بائیس سال کی بچی کی صلاحیتیں آزمانے کے لیے پورے خاندان کی بڑی بوڑھیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ وہ کھانا پکانے سے گھر گرہستی تک اور اپنی آنکھیں بند کر کے، بصارتیں کسی کنوئیں میں دفن کر کے، ان کے فرزندِ ارجمند کے شب و روز کے دائرے کو اس کی مرضی سے دیکھے۔

افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ جب ایسے رشتے تباہ ہوتے ہیں تو اندر خانے کہیں نہ کہیں خواتین ہی ملوث ہوتی ہیں۔ شادی کی جاہلانہ رسومات سے نئے جوڑے کی نئی زندگی میں دخل اندازی تک ان کا عمل دخل ہوتا ہے۔ لیکن ایک دانشمند عورت اپنی اولاد کا گھر بسانے اور بچانے کی مصلحت تک ہر جگہ مخفی انداز میں موجود ہوتی ہے۔ اپنی بیٹی کو حسنِ سلوک اور نئے گھر کو اپنا گھر سمجھنے کا درس دینے والی عورت وہ کارنامے انجام دے سکتی ہے کہ مرد جس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

••

ابا جی کو ایسے لوگ قطعی طور پر ناپسند تھے جو پہلے تو تعلیم یافتہ بہو تلاش کرتے ہیں اور پھر اس کی زندگی تلخ کر دیتے ہیں۔ اچھے اچھے بظاہر تعلیم یافتہ اور دینی تعلیمات پر عمل پیرا گھرانوں میں دیکھا گیا ہے کہ بہو کو گھر لاتے ہی اسے عملی طور پر روزمرہ کے کام ایک ملازمہ کی سی باقاعدگی سے ادا کرنے کو کہا گیا۔ ساس چونکہ اب روایتی ملکہ بن چکی ہیں تو آنے والی دیوروں کے کپڑے بھی استری کرے، نندوں کی سہیلیوں کی مدارات بھی کرے، جب ساس ملکہ کہے بن ٹھن کر، زیور لاد کر اس کی سہیلیوں کے سامنے فیشن پریڈ بھی کرے۔ تعلیم یافتہ عورت کے مسائل زیادہ ہوتے ہیں۔ اسے تعلیم کا طعنہ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

خاندان میں آنے والی عورت کے فیصلے ایک نیا خاندان کرنے لگتا ہے۔ بہو کو تعلیم جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ان کے حکم کے مطابق بہو ملازمت نہیں کرے گی تاکہ اس کا وقت ان کے احکامات کی تعمیل میں گزرے، یا پھر زبردستی اس سے کام کرایا جائے تاکہ اس کی کمائی پر وہ حق جتا سکیں۔

دونوں صورتوں میں ایک انسان پر جبر کر کے اچھے نتائج کیسے حاصل کیے جا سکتے ہیں؟ تعلیم یافتہ خاتون کو ایسے حالات میں مقید کرنا کہ وہ اپنی ڈگریاں دیکھ کر دل جلاتی رہے، ناانصافی نہیں ظلم ہے۔ بحیثیت ایک انسان کے علم حاصل کرنے کا مساوی حق اور خواب کب تک دوسرے کی مٹھی میں رہے گا؟ پہلے بیٹی کو باشعور کرو، علم کی روشنی سے منور کرو۔ جب ذہن درست اور غلط کا شعور دے، فکر تن کر پورے قد کے ساتھ کھڑی ہو جائے تو پھر اس کی تقدیر کسی جاہل سے باندھ کر اس کے پاؤں کاٹ دو۔

عورت جب تک چکی کے دو پاٹوں میں پستی رہے گی وہ اچھی نسل اور قوم کسی منتر سے تو نہیں دے گی۔ کسی بھی فرد کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے بعد صرف ایک ڈگری آتی ہے۔ جب تک وہ عملی زندگی میں اس شعبے سے منسلک ہو کر پیشہ ورانہ کام نہیں کرتا وہ صرف ڈگری یافتہ ہوتا ہے۔ انجینئر، وکیل، ڈاکٹر جب تک اپنے پیشہ ورانہ مقام پر کھڑے نہیں ہوتے ان کی فائل میں صرف ایک ڈگری ہوتی ہے جس کا کاغذ دیمک کا منتظر رہتا ہے۔ جب تک عورت کی فلاح و بہبود کے لیے منظم انداز میں کام نہیں کیا جائے گا، معاشرے میں تبدیلی نہیں آسکے گی۔

ابا جی کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ اگر کسی خاندان کے سربراہ کے اصولوں میں بیٹی کو تعلیم دلانا نہیں تو اسے چپ کر کے گھر کیوں بیٹھ جانا چاہیے۔ تعلیم دلانے کے لیے گھر میں بھی تو استاد رکھا جا سکتا ہے۔ پھر ایسے خاندانوں میں جب ان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکے خاندان کی مرغی کے ڈربے میں پلی تقریباً ناخواندہ بچی سے شادی سے انکار کرتے ہیں، یا مارے باندھے کر بھی لیں تو وہ اس توجہ اور التفات کو ترستی رہتی ہے جو ایک بیوی کا حق ہوتا ہے۔

اگر شوہر کو عورت کی تعلیم سے احساسِ کمتری جاگنے لگتا ہے، وہ منہ بند کر کے گول گول گرم روٹیاں پکا کر دینا اپنے وجود کی معراج سمجھ لے اور وہ سیڑھی بن جائے جس پر قدم رکھتا ایک ساتھی بلندیاں فتح کرے جب کہ دوسرا اپنی ذات کی نفی ہوتی دیکھتا رہے اور گھٹ گھٹ کر مر جائے۔ ابا جی ایسے نظام کے خلاف تھے۔ یہ معاملات شادی سے پہلے طے ہونا چاہییں۔

ابا جی ہمیشہ کہا کرتے کہ ''یہ فیصلے اور انتخاب کرتے وقت ہمیشہ اپنا قد کاٹھ نظر میں رکھنا چاہیے۔ دروازے اونچے نہ ہوں تو شتر و فیل والوں سے یارانے نہیں رکھنے چاہییں۔ اپنے قد سے اونچا انسان لا کر اس کی ٹانگیں یا سر قلم کر کے اپنے برابر کرنے سے بہتر ہے کہ پہلے ہی اپنے برابری والوں سے یا نشیبی علاقوں سے نسبتیں قائم کی جائیں اور توازن قائم رکھا جائے۔''

ابا جی کے نظریات بالکل سادہ تھے کہ شادی ایک سماجی معاہدہ ہے جو زندگی کو نظم و ضبط کی ڈگر پر چلاتا ہے۔ اس میں اصلاحات کی گنجائش ہے۔ اس معاہدے میں ایسی شق رکھنے کی سہولت ہونی چاہیے جو عورت کے راستے مسدود نہ کرے بلکہ اسے بھی حق حاصل ہو کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر سکے اور اپنی تعلیم کا استعمال کر سکے۔ اسے بھی مرد کی طرح تعلیم اور ڈگری کی بنا پر اہمیت دی جائے۔ ابا جی اس ضمن میں ہماری بھابی جان کو بہت سراہتے تھے جنھوں نے پانچ لڑکے پالے، ان کی تعلیم و تربیت پر مکمل دھیان دیا، گھر کو سکون اور آرام کی جگہ بنایا، کامیابی سے پیشہ ورانہ زندگی گزاری۔ تعلیم یافتہ عورت اپنی ذمہ داریاں زیادہ بہتر انداز میں انجام دیتی ہے۔

••

جب شادیاں طے پانے کا نیا نظام چلا کہ ہر رسم رات کو ہوگی تو ابا جی اور تایا جان باقاعدہ پریشان ہو کر اجلاس کر رہے تھے۔ ''لوگ تھکے ہارے رات کے ہنگاموں کے بعد صبح گھر پہنچیں گے اور سارا دن منحوسوں کی طرح سو کر گزاریں گے تو ہو چکی شادی خانہ آبادی جو باقی گھروں اور بچوں کے کئی دن ضائع کر کے انجام پائے۔'' ابا جی باقاعدہ دل گرفتہ ہوتے کہ یہ انداز نئی نسل کا مستقبل بہت بھیانک کر دیں گے۔ ان کے لیے یہ رسومات اور نئی زندگی کا تصنع بھرا انداز ایک عام سی بات بن جائے گی۔

''بیٹا میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ اب شادیوں میں صرف ایک تقریب کی تیاری کی جاتی ہے، ہال کون سا ہو، کھانے کتنے ہوں، شریکوں کو آگ لگائی جائے، شادیوں کے جوڑے، دولھن کے پہلے دن کا لباس، زیور، خصوصی گاڑی اور انٹ شنٹ اخراجات پر عمر بھر کی جمع پونجی لگا کر آپس میں بنتی ہی نہیں۔ بچوں کی تربیت میں دونوں خاندان یہ کوشش ہی نہیں کرتے کہ شادی کی تقریب کے رنگارنگ دن گزر جائیں گے تو پھر کیسے ایک سادہ روزمرہ سی عملی زندگی کا آغاز کرنا ہے۔ پھر تنازعات شروع ہوتے ہی تصفیے کی درخواست لے کر آ جاتے ہیں۔ مرزا صاحب، بچی کو فارغ کرا دیں اور ہمارا جہیز واپس لے دیں۔''

ابا جی بہت پریشان ہوتے، ''یار ابھی راہ نہیں میلی ہوئی کہ آپ لوگ تقریب کے انعقاد پر بحثیں کر رہے تھے۔ رسہ کشی جاری تھی۔ اور اب اس رشتے کو جھٹکے دے رہے ہو۔ ٹھیک ہے سامان واپس دلوا دیتے ہیں۔ عزت کہاں سے واپس سمیٹو گے۔ صبر کیوں نہیں رہا آج کل۔ یا اللہ یہ تیری دنیا کدھر جا رہی ہے؟''

میں نے ڈنمارک میں اور مغربی دنیا میں قدامت پسند خاندانوں کا یہی حال دیکھا تھا بلکہ یہاں اس سے بھی بدتر تھا کیونکہ بچوں کے شریکِ حیات پاکستان سے درآمد کرنے کے بعد ان سے بھی ناروا سلوک کیا جاتا اور خود اپنے بچوں کی زندگی بھی اجیرن کر دی جاتی۔ انھیں چکی کے پاٹ میں ڈال دیا جاتا۔ ایک طرف وہ والدین کے ساتھ وفاداری نبھاتے، دوسری طرف پاکستان سے آئے ساتھی کے ساتھ شرق و غرب کے فاصلے مٹانے کی کوشش میں ازدواجی زندگی کی گاڑی چلانے اور سب سے بڑا امتحان اپنی ڈینش یا یورپین سماجی زندگی میں ضم ہونے کی ذمہ داری اٹھانے میں وہ جینا بھول جاتے اور پھر صرف زندگی کا پہیہ ہی چلتا۔

مجھے ابا جی کے ان ہی رہنمائی کرتے اصولوں نے اپنے بچوں کو ان کی مرضی کے مطابق جینے کا حق دیا جس کے بابرکت ثمرات بھی میں نے دیکھے۔ والدین کو اپنے بچوں کا دوست ہونا چاہیے کیونکہ یہ والدین اور اولاد کا رشتہ وہ ہے جو والدین کی خواہش اور خواب کی بنیاد پر بنتا ہے۔ اور اولاد کے پاس انتخاب کا حق نہیں ہوتا۔

••

ہمارے بھائی حماد کی شادی بیرونِ ملک رہنے والے خاندان میں ہوئی۔ وہ فیملی شادی کی تیاریوں کے لیے پاکستان آئی اور یہاں خریداری شروع کی۔ ابا جی کو چونکہ بے جا اسراف اور دوسروں کو رسم و رواج کے نام پر عذاب میں ڈالنا بالکل پسند نہیں تھا، انھوں نے مجھے بلایا اور ایک لاکھ روپیہ میز پر رکھا،

''یہ آمنہ بیٹی کو دے دیں۔ وہ خود اپنی مرضی کا جوڑا بنوالے، بلکہ اسے ساتھ لے جائیں۔ بس اتنے ہی پیسے ہیں میرے پاس۔''

امی جی نے ہمیشہ عروسی کپڑے اپنی بہوؤں کی پسندیدگی سے بنائے۔ ''جس نے پہننا ہے اس کی مرضی کا رنگ اور لباس ہونا چاہیے۔'' امی جی جب ہماری سب سے بڑی بھابی کے ساتھ شاپنگ پر گئیں تو کہنے لگیں، ''میری شاہدہ کی پسند اور خرید و فروخت کا طریقہ ہی الگ ہے۔ سادگی

سے لباس پسند کرلیا بچی نے۔''

باقی بھائیوں کی شادی کے بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں کیونکہ میں تو پہنچ ہی نہیں پائی۔ حماد کی شادی کیونکہ میرے سامنے ہوئی اس لیے میں نے امی ابا جی کی ذات میں دوسروں کو سہولت دینے اور اپنی مرضی اور رائے نہ ٹھونسنے کا اصول دیکھا۔

پھر ہمیں دس ہزار نصیحتیں کرتے کہ ''وہ لوگ باہر سے آئے ہیں۔ ان پر بوجھ نہ پڑے۔ خود پردیسی ہیں۔ اب ایسے لوگوں کا دیس وہی ہے جہاں ان کا گھر بار ہوتا ہے۔ بارات صرف چند لوگوں کی جائے گی۔ ولیمے پر جسے مرضی بلالینا۔ جہیز جیسی لعنت تو ہونی ہی نہیں چاہیے۔ بچی والوں سے فرنیچر لینا اور بلاوجہ کے خرچے کرانا کہاں کی انسانیت ہے؟ میرے گھر میں ایک لکڑی تک نہیں آئے گی نہ ہی کوئی فضول رسم ہوگی۔''

ابا جی نے خود اپنے شوق سے کمرے کو سیٹ کرایا۔ حماد سے کہا کہ کسی چیز کی کمی نہ ہونے پائے۔ پردے بدلوائے۔ نیا اے سی لگوایا۔ بجلی کی کیتلی اور چائے کا سامان رکھوایا۔ مکمل کمرہ ایسے تیار کرایا کہ بچی کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ میرے بچے نانا ابو کا شوق اور انتظامات دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ نانا ابو کو صرف دوسروں کی سہولت اور آرام کا خیال ہے۔ ''امی جی، نانا ابو تو نئی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ نئے زمانے کی سادہ یورپی زندگی کے مطابق پرسکون آسان زندگی کے انتظامات ہیں ناں یہ'' عالیہ کہتی۔ پھر خاموشی سے اپنے نانا ابو کا جائزہ لینے لگتی۔

••

عالیہ نانو جان کے پیچھے پیچھے پھر رہی تھی۔ ''نانو آپ کو کیا پسند ہے، آپ کے لیے کیسا ڈریس بنواؤں۔'' امی جی بے تحاشہ ہنستیں، ''بیٹا میرے ڈریس کی فکر نہ کرو۔ اپنے اچھے اچھے کپڑے بنواؤ۔'' پھر اسے ماموں کی شادی کی خوشی میں یاقوت کا سیٹ دیا۔ ''خوشیاں تو اب ان بچوں کی پوری ہونی چاہییں۔''

امی جی نے شادی کی کسی رسم و رواج میں کسی قسم کا کوئی دخل نہ دیا۔ ''بچوں کو جیسے اچھا لگے ویسے ہی کرلیں۔ جو اس کا جی چاہتا ہے بنوائے اور پہنے، اس میں کسی کو دخل نہیں دینا چاہیے۔'' بھابیوں کی عروسی تیاریوں یا عملی زندگی میں نندوں کی مداخلت کے تو وہ شدید مخالف تھیں۔ ''جس کی شادی ہے اسے پوچھو وہ کیا پہننا چاہتی ہے۔ زبردستی کے جوڑے دے کر چابی کی گڑیا کی طرح پہنانا اس زمانے میں نہیں چلتا۔''

عالیہ امی جی کا دوپٹہ تھامے پیچھے پیچھے پھر رہی تھی، ''نانو آپ نے اپنی شادی پر لہنگا پہنا تھا؟'' امی جی ہنستی جاتیں۔ ''ہمارے زمانے میں بس لال جوڑا ہوتا تھا، میں نے میاں جی سے کہہ کر چاندی کی پازیبیں بنوائی تھیں۔'' امی جی اسے پرانی سہیلی کی طرح وہ باتیں بتا رہی تھیں جو ہم نے کبھی نہ سنی تھیں۔ میں نے امی جی کے خوبصورت چھوٹے چھوٹے پیروں کو دیکھا۔ بھلا کیسی لگتی ہوں گی پازیبیں ان کے پاؤں میں۔

عالیہ کی ضد شروع ہوگئی، ''مجھے بھی پازیب لینی ہیں'' اور امی جی اس کے ماموں فیاض کو آوازیں دینے لگیں، ''لڑکی کو پازیبیں لا کر دو بھئی۔''

آمنہ کو مہندی کی رسم کا شوق تھا۔ میں بڑے بھائی جان اور بھابی کے کان کھا رہی تھی کہ بھائی جان لاہور مہندی لے کر جانے کا بندوبست کریں۔ بچیوں کو ارمان ہوتا ہے۔ اور وہ آہستہ سے بولے،

''اچھا۔۔اچھا۔۔۔کرتے ہیں ناں بندوبست۔''

ابا جی چوکنا ہو گئے، ''اب یہ کیا فرما رہی ہے، کسی فضول رسم کا چھلاوہ نہ نکال لینا اب۔''

''کچھ نہیں ابا جی، شادی سے پہلے دعائے خیر کے لیے قرآن خوانی کا اہتمام کرنا ہے لاہور والوں نے، تو سوچ رہے ہیں کہ ہم بھی شامل ہو جائیں۔'' وہ کمال معصومیت سے بولے۔

''اچھا۔ اچھا'' ابا جی مطمئن ہو گئے۔

''بھائی جان آپ نے اداکاری کے وہ جوہر دکھائے کہ آسکر ایوارڈ حاصل کر سکتے ہیں۔'' مجھے ہنسی آ رہی تھی اور وہ سنجیدگی سے مہندی لے کر جانے کے سارے انتظامات مکمل کر رہے تھے۔ بھابی ہمیشہ کی طرح ہر کام میں امی جی کا دستِ راست تھیں۔ دولھن کی خواہش پوری کی گئی اور مہندی سرائے عالمگیر سے لاہور لے کر جانے کا اہتمام کیا گیا۔

شادی کے معاملات میں بھی لڑکی والوں کی مرضی اور سہولت کو پیشِ نظر رکھا۔ بارات والے دن کہا گیا کہ رخصتی سرائے عالمگیر کے لیے آج نہیں ہوگی، ایک دن بعد ہوگی۔

''اچھا''، ابا جی نے ایک لمحہ لگائے بغیر کہا، ''باقی لوگ چلے جائیں، میں رک جاتا ہوں۔ جب بچی کہے گی اس دن واپسی ہو جائے گی۔''

بعد میں اگرچہ بہت باتیں ہوئیں کہ یہ کیا بات ہوئی اب بارات دولھن کے بغیر جائے؟ ادھر امی جی انتظار کر رہی تھیں کیونکہ وہ ایک ہی دن میں طویل سفر نہیں کر سکتی تھیں اور گھر ہی میں منتظر تھیں۔ بہت سے مہمان بھی جنھیں بارات میں مدعو نہیں کیا گیا تھا، وہیں انتظار میں تھے۔ لیکن ابا جی

نے کسی بات کی پروانہیں کی کہ خاندان، محلہ یا لوگ کیا کہیں گے۔ ابا جی نے خود بھی لاہور ہی قیام کیا۔ پھر ابا جی اور ہم پہلی دفعہ اکٹھے رہے۔

''میرے بچے، شادیات میں یہ فیصلے آزمائش کی گھڑی ہوتے ہیں۔ اپنے گھر آنے والی بچی یا داماد کی عزت کو اپنی عزت سمجھا جائے تو انا کا سنپولیہ کہیں بھی سرنہیں اٹھاسکتا۔ کل کو آپ نے بھی اولاد کی زندگی میں ان مقامات سے گزرنا ہے۔ بس یہ بات پلے باندھ لینا کہ آپ کی ماں نے ہم چھ بھائیوں کو جوڑ کر رکھا، کبھی کسی بات کو مسئلہ نہیں بنایا، دوسروں کو اہمیت دی اور آپ نے نتیجہ دیکھا کہ اس نے کتنی عزت کمائی۔ بس ذرا سا صبر، اک ذرا سا حسنِ سلوک اور آپ انسانوں کے دل جیت لیتے ہیں۔ جب دل جیت لیا تو وہ جو دلوں میں رہتا ہے وہ بھی اس جیت میں ساتھ ہی حاصل ہوجاتا ہے، پھر وہ آپ سے کلام کرتا ہے اور وہ جو اقبال نے کہا ہے ناں کہ رضا پوچھتا ہے تو وہ سورۃ فتح میں وعدہ کرتا ہے کہ وہ اپنے بندے کا ہاتھ ہوجاتا ہے۔ میں جو سارے کام چھوڑ کر یہاں بیٹھا ہوں تو صرف اس لیے کہ یہ معصوم بچی جو میری نسل کی بنیاد رکھنے ہمارے گھر آرہی ہے، اس کا دل اس ابتدائی قدم پر ہی کسی بات پر مغموم نہ ہو۔ بس، باقی سودا تو میرا اس دل میں رہنے والے کے ساتھ ہے۔''

میں خاموشی سے ابا جی کے پرسکون چہرے کی طرف دیکھتی رہتی تھی۔ وہ دودھ دینے والی مائی چاند بی بڑی رازداری سے بتا رہی تھی کہ حکیم صیب بس ہاتھ لگا کر دیکھتے ہیں ناں تو دل سے بیماری کا ڈر تکلیف نکل جاتی ہے، بس سب ٹھیک ہوجاتا ہے۔ تو کیا دل میں رہنے والا دل سے سارے ملال ایسے ہی نکال پھینکتا ہے؟ دلوں کو جیتنے کے لیے اور ہمارے دلوں کا سہارا بننے کے لیے وہ ایسے ہی ہمارے گرد چلنے پھرنے والے لوگوں میں بھیس بدلے موجود ہوتا ہے۔

ابا جی ظہر کی نماز پڑھ کر آئے۔ حماد کے لگژری اپارٹمنٹ میں قالین پر کپڑا بچھا کر کھانا کھایا گیا۔ بچے ان کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ ''نانا ابو، قیمے والے نان کھلائیں ناں۔'' اور حسبِ توقع انھوں بچوں کو بازار کا کھانا کھلانے سے صاف منع کر دیا۔

''بچو، ذرا سی لذت کی خاطر بیمار مت ہونا، آپ کی ماں پریشان ہوجائے گی۔''

اگلے دن ابا جی اٹھے، ''مجھے انیقہ یاد آرہی ہے''۔ انھوں نے پوتی کو یاد کیا جو ان کے سینے پر چڑھ کر سوتی تھی۔

''کیوں، اس کی ڈوئی ڈنڈا کھائے چوبیس گھنٹے گزر گئے ہیں؟'' میں نے انھیں چھیڑا۔

ہماری بھتیجی ابا جی کی بے پناہ لاڈلی تھی۔ وہ بھی ہر وقت ان کے گرد رہتی۔ وہ سو رہے

ہوں اور انیقہ کے ہاتھ میں جو چیز آتی ٹھاہ کر کے پھینکتی اور پھر اپنی زبان میں نجانے کیا کیا مطالبے کرتی۔ یہ اس کے جگانے کا طریقہ تھا۔ یا پھر ان کے سینے پر چڑھ کر لیٹ جاتی اور باریک باریک انگلیوں سے بال پکڑ کر کھینچتی۔ ابا جی ہر ادا پر نثار ہوتے۔

ایک دن حسبِ معمول سینے پر چڑھی تو سوگئی۔ ابا جی فکر کے مارے ہلے تک نہیں کہ بچی کی نیند خراب نہ ہو جائے۔ میں آج بھی انیقہ کو دیکھتی ہوں تو مجھے اس پر بے پناہ پیار آتا ہے۔ ابا جی اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے، ''میرے پیے پتر نوں اللہ نے رحمت نال نواز دتا۔''

اور ماہ نور جو ابا جی کو سات پوتوں کے بعد ملی، اس کا اپنا ہی مزاج تھا۔ کوئی پروا نہیں آگے پیچھے کیا ہو رہا ہے، بس اپنی دنیا اور کھیل میں مگن، نہ ہم کسی کے نہ کوئی ہمارا۔ جوں جوں وہ بڑی ہو رہی تھی اور اپنی من مانی کرتی تو سب میرے بچپن کو یاد کرتے، ''پھوپھی پر گئی ہے۔''

ایک مرتبہ ملنے کے لیے آئی تو پتہ چلا کہ اپنی چیزوں کی کوئی پروا نہیں کرتی، کسی کو دے دیں، گم ہو گئیں، نہیں ملیں تو کوئی فکر نہیں، کسی اور کھیل میں مگن ہو جاتی۔ ابا جی نے اسے گود میں بٹھا لیا، ''اچھا ہے میری بچی کو کسی چیز کی پراو نہیں، کوئی فکر نہیں، کوئی لالچ نہیں، یہ تو واقعی آپ پر چلی گئی۔''

''نہ ابا جی، مجھ پر تو نہ جائے۔ بلند بخت ساتھ لے کر آئے۔'' میں نے پتہ نہیں کس رو میں کہہ دیا۔ ابا جی خاموش ہو گئے۔

رات کو چھت پر چارپائی بچھوا دی گئی، کرسیاں رکھوائیں۔ صندل کے شربت کا جگ منگوایا اور مجھے بلا بھیجا۔ میں بچوں کے ساتھ گپیں لگا رہی تھی۔

''باجی، چلیں ابا جی اوپر بلا رہے ہیں،'' ہماری چھوٹی بھابی صاحبہ سندیسہ لے کر آئیں۔ ہماری یہ بے پناہ شرارتی اور خوش مزاج بھابی کا کام ہر وقت ہنستے رہنا اور پٹاخے کی طرح ہر بات کا جواب دینا ہے۔ اگرچہ میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ مجھ سے رشتے کی مناسبت سے ذرا ڈر سہم کر رہے لیکن مجال ہے جو اس پر کوئی دھمکی کارگر ہو۔

''کدھر؟ اوپر؟ تمھاری تمنا پوری نہیں ہو سکتی، میرا کوئی پروگرام نہیں اوپر جانے کا۔''

''یہ تو آپ کو جا کر پتہ چلے گا۔ لگتا ہے آج آپ کی جھاڑ پونچھ کا پروگرام ہے۔'' وہ تو مجھے جھاڑ پڑنے کے تصور سے خوش ہو رہی تھی۔

میں نے چند لمحوں میں پچھلے دس دن کے واقعات دہرائے۔ میں معصوم تو کچھ کرتی ہی

نہیں۔ مجھے کیوں جھاڑنا پونچھنا ہے۔

''امی جی میں بھی اوپر چلوں نانا ابو کے پاس؟'' ہماری صاحبزادی تیار ہوئیں۔

''نہیں آپ نانو کے پاس بیٹھیں'' میں نے اٹھ کر جوتے پیر میں پھنسائے اور دوپٹہ ڈھونڈ کر تمیز سے اوڑھا اور اوپر چل دی۔ ابا جی کی عادت تھی کہ کمرے کی روشنی جلا دیتے اور باہر کی بند رکھتے تاکہ پروانے پتنگے نہ آئیں۔

''ادھر بیٹھو'' انھوں نے چارپائی پر جگہ بنائی اور صندل کے شربت کا گلاس مجھے پکڑایا۔ اس خصوصی التفات پر مجھے مزید تشویش ہوئی۔ لیکن میں خاموشی سے شربت پینے لگی۔

''اب بتائیں، آپ جیسی قسمت کیوں نہ لائیں لڑکیاں؟'' اچانک سوال کی صورت مجھ پر شب خون مارا گیا۔ مجھے فوری طور پر کوئی جواب ہی نہ سوجھا۔ میں نے تو اپنی دانست میں ایک معمولی بات کی تھی جس پر یہ گرفت ہونا ضروری نہیں تھی۔

''آپ کو اللہ نے ہمیشہ غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا۔ لوگ اپنے گھر کے لاڈلے ہوتے ہیں۔ آپ ساری عمر پورے خاندان کی لاڈلی رہیں۔ اکلوتے بچے سے زیادہ آپ کے ناز نخرے اٹھائے پورے خاندان نے۔ سارے بھائی ایک طرف اور آپ کی من مانیاں ایک طرف۔ بابا جان نے ہمیشہ آپ کو لڑکوں سے بڑھ کر توجہ دی، ذہانت کو سراہا اور صیقل کیا۔ آپ کی ہر کامیابی پر پورا شہر شامل رہا۔ لالہ جی آج تک آپ کو اسی طرح ملنے آتے ہیں جیسے بچپن میں آپ کی کتابیں کاپیاں دیکھنے آتے تھے۔ ہماری جرات نہیں ہوتی ان کے سامنے اونچی آواز میں بات کریں لیکن آپ کے تڑتڑ سوالوں کا جواب خندہ پیشانی سے ملتا ہے۔ آپ کو خبر بھی نہیں ہوگی کہ آپ جب کھاریاں سے غلط ڈرپ لگوا کر شدید بیماری کی حالت میں آئیں تو لالہ جی آپ کے پیروں کو مساج کر رہے تھے اور شدید پریشانی کے عالم میں کہہ رہے تھے اسے واپس بھیجو لیکن یہ بچوں کے ساتھ کیسے جائے گی اب۔

اپنے اوپر اللہ کے احسانات گنو۔ اللہ نے فرشتوں جیسی اولاد دی۔ آپ کی بات کہنے کی نوبت نہیں آتی وہ فرشتے آپ کا اشارہ سمجھتے ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی میں بیماریوں سے مسلسل جنگ لڑی اور فتح یاب ہوئیں۔ زندگی کا اہم ترین فیصلہ خود کیا۔ مرضی کا راستہ چنا اور سب کی تائید و تعاون آپ کے ساتھ ہے۔ زندگی کچی مٹی کی صورت دوبارہ آپ کے ہاتھ میں ہے، اس کی کوزہ گری جیسے چاہو کرو۔ پورا خاندان آپ کے ساتھ ہے۔''

میری بولتی بند ہوگئی۔ میری ایک عام سی بے توجہی میں کہی بات نے ان کا دل دکھا دیا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آئی کہ جواب کیا دوں۔

ابا جی نے میرا ماتھا چوما۔ ''بیٹا کتنی عورتیں ایسا کر پاتی ہیں، عموماً ان کے ورثا گردنیں جھکا کر ان کی خوشیاں مانگنے جاتے ہیں۔ آپ سے درخواست کرنے لوگ آپ کے دروازے پر آتے رہے، میرے قدموں میں بیٹھے، آپ کی زندگی کی ڈیڑھ دہائی تباہ نہیں ہوئی۔ آپ نے ثابت کیا کہ آپ بادشاہ نہیں لیکن بادشاہ گر ضرور ہیں۔

آپ نے ایک خاندان میں اپنی روایات کا شجر لگایا، تعلیم کا بیج بویا۔ حصولِ علم میں معاونت کی، اپنے مستقبل کی قربانی دے کر ان کی تعلیم کے راستے ہموار کیے، اپنی ماں کی طرح ایک خاندان کو جوڑ کر رکھنے کی کوشش کی۔ میں نہیں رہوں گا دیکھنے کے لیے لیکن آپ کی نسلوں میں روشنی کے چراغ جلیں گے۔ ان بچوں کی پیشانیاں بتاتی ہیں کہ ان کے پیچھے ایک ماں کی تابدار تربیت ہے۔ میری پوتیوں کی قسمت آپ پر کیوں نہ جائے۔ مجھے بہت تکلیف ہوئی ہے۔''

ابا جی نے میری خاموش معذرت کو سُنے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔

''ایک بند گلی سے اور ایک اندھے کنوئیں سے آپ مرضی سے باہر آئیں اور ثابت کر دیا کہ عورت اگر چاہے تو وہ اپنی نسلیں بچا سکتی ہے۔ آپ ان بلند بختوں میں سے ہیں، زندگی جن کے ہاتھ میں نامہ اعمال دیتی ہے اور وہ نہ صرف اپنی قسمت خود تحریر کرتے ہیں بلکہ اپنی اولاد کی بھی سمت مقرر کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے وجود سے روشنی پھوٹتی ہے۔ وہ چراغ نہیں اجالا بن جاتے ہیں۔''

ابا جی نے شربت کا دوسرا گلاس مجھے تھمایا... گویا پانی پلا پلا کر مارنے کا ستم جاری تھا۔

''کرنوں کو کوئی آندھی نہیں بجھا سکتی۔ میں نہیں ہوں گا دیکھنے کے لیے، لیکن دنیا دیکھے گی کہ آپ دنیا میں نافع انسانوں کا اضافہ کریں گی۔ مثالیں قائم کریں گی۔ اگرچہ میں دیکھنے کے لیے نہیں ہوں گا لیکن دنیا دیکھے گی۔'' ابا جی شاید خود سے باتیں کر رہے تھے۔

''میں دعا کرتا ہوں کہ میری پوتیاں آپ کا سا صبر، حلم اور قوتِ فیصلہ لے کر آئیں، اپنی قسمت اپنے ہاتھ سے لکھیں اور اپنے علم اور قلم کو اپنا عصا بنائیں۔''

''سوری ابا جی، غلطی ہوگئی ابا جی۔ آئندہ نہیں ہوگی۔''

میں جب سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہی تھی تو میں وہ نہیں رہی تھی جو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی تھی۔ "Yes, I can make things happen" میں نے اپنے سائکارٹرسٹ کی بات

دوہرائی۔ ''میں عام عورت نہیں ہوں۔

ابا جی کہتے ہیں کہ وہ عورت عام نہیں ہوتی جس کی محنت اور ایثار پر قدم رکھ کر دوسرے ڈگریاں کمالیں، زندگی بنالیں، اس کے ٹھکرائے راستے پر بادشاہِ وقت بھی چلے تو اس کی بخشش پر پلتا ہے۔ خود کو داد دینا سیکھو تب ہی دنیا کو سراہنے کے قابل ہوسکوگی۔ ملامت کرنے سے کچھ نہیں ملے گا۔''

اس رات میں نے اپنی نظم ''فیصلے کا پل'' کہی۔

••

سب سے مشکل کام جواب دینے کی اہلیت اور طاقت رکھتے ہوئے سارے انگارے ہونٹوں پر روک لیے جائیں یا کہیں دل کے دریا میں ڈبو کر سرد کر دیے جائیں۔ بدزبانی بدکلامی بدلحاظی اور بدنیتی کو جانتے بوجھتے بھی منافقت اور خودغرضی کے کھیل میں دوسروں کا ساتھ دینا اور خود کو بے وقوف کہلوا لینا۔ لیکن جب دن کے آخر میں گوشوارہ بنتا ہے تو ایسے منافق خردمندوں کے ہاتھ میں صرف مادّی فوائد آتے ہیں۔ لاکھ، دو لاکھ، زمین، جائیداد؟ زمین کا ٹکڑا جو آنکھیں بند ہوتے ہی وہیں زمین کے اوپر اور آپ کے سینے پر دھرا رہ جاتا ہے۔ زمین کے اندر تنہا ہی جانا ہے دفن کے لیے اگر زمین نصیب ہو۔ فرعونوں کا زمانہ لد چکا جو اپنے ساتھ غلام کتے بلے گھوڑے زیور ہیرے موتی ہتھیار لے جاتے تھے اور پھر بھی زمین ان کو قبول نہیں کرتی، کبھی نہ کبھی ڈھانچوں کی صورت اگل دیتی ہے۔ رہا سمندر تو وہ بھی کبھی نہ کبھی باہر تھوک دیتا ہے۔

سکینڈے نیویا میں کھدائی کے دوران انسانی حیرت کو مہمیز کرتے شواہد ملے ہیں جن سے ماہرین قدیم دور کے تجارتی و سماجی روابط کے بارے میں از سرِ نو غور کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ سویڈن میں کھدائی کے دوران آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے 1872–1895ء کے برکا کے قبرستان کی کھدائی کی تو ایک قبر میں عورت کی خستہ حال لاش کے ساتھ چاندی کی انگوٹھی دریافت ہوئی جس نے پورے سکینڈے نیویا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ بہت عرصہ تک یہ انگوٹھی سٹاک ہوم کے عجائب گھر میں محفوظ رہی۔ قیمتی پتھر یاقوت سے مزین نقش و نگار والی انگوٹھی جس پر کندہ حرف کو ''فار اللہ''، ''ٹو اللہ'' پڑھا جا رہا ہے۔ ماہرین کے خیال میں اِس کا مفہوم ''ان شاء اللہ'' بھی ہوسکتا ہے۔ سکیننگ الیکٹرانک خوردبین کے ذریعے انگوٹھی کا مزید مشاہدہ و معائنہ کیا گیا ہے۔ جدید تحقیقات کے مطابق یہ انگوٹھی 5.94 فیصد اعلیٰ چاندی کی دھات پر مشتمل ہے اور اِس پر جڑا پتھر، یاقوت نہیں بلکہ

سوڈا لائم شیشے کا رنگین پتھر ہے جو اس زمانے میں نایاب سمجھا جاتا تھا۔ وائی کنگز کو سونے اور چاندی سے جو لگاؤ تھا وہ بھی اِن نوادرات سے ظاہر ہوتا ہے۔

میں جب سویڈن میں اللہ کے نام کی انگوٹھی دیکھنے عجائب گھر گئی تو مجھے ابا جی بے حد یاد آئے۔ پھر میں نے زندگی میں وہ وقت بھی دیکھا جب آپ مقابلے اور غلبے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی مادّی دولت پر تین حرف بھیج کر کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اس خاک سے اٹھ کر پھر تعمیرِ نو کا اپنا نشہ ہے۔ اپنی نئی دنیا خود بسانا ایک ناقابلِ بیان تجربہ ہے۔

یہ سرشاری بھری لذت وہی جان سکتے ہیں جو اس سود و زیاں کی بساط کو الٹ چکے ہوں، جو لاکھوں کے لالچ اور زمین کے ٹکڑوں کی حرص کو ٹھکرا چکے ہوں۔ بے زری کا اپنا سرور ہے۔ خود غرض منعم کو اس کی بخشش اس کے منہ پر دے مارنے کا خمار ناقابلِ بیان ہے۔

••

''زندگی کی نعمتیں گنا کرو میرا بچہ'' ابا جی کہتے ''دال میں سے کنکر نہ چنتی رہا کرو، دال پر توجہ مرکوز رکھو۔ ساری بات انسانی ذہن کی ہوتی ہے کہ وہ زندگی کو کس طرح دیکھتا ہے۔'' ان کی رائے ہمیشہ کی طرح واضح تھی۔

''جی ابا جی، لیکن عملی زندگی میں دال کی اکثریت نہیں۔ ہماری دنیا کا یہ تھال کنکروں بھرا ہے۔ اس میں سے اچھائی اور نیکی کون تلاشتا پھرے۔ آپ کے زمانے میں نیکی، دوستی اور وفا کے مفہوم اور ہوا کرتے تھے، آج کے دور میں سب بدل گیا ہے۔'' میں نے اپنا فلسفہ جھاڑا۔

''اچھا؟'' ابا جی نے عینک اتار کر اس کے عدسے صاف کیے۔ کتاب کے درمیان نشانی رکھی۔ ہلکے موتیا رنگ کے امی جی کے ہاتھ کے بنے سویٹر میں ان کا بے حد قانع اور مطمئن چہرہ چمک رہا تھا۔

''آپ کو علم ہے کہ اللہ نے شاداب روحیں دنیا میں کیوں پیدا کی ہیں؟'' میں چپ رہی۔ ''تاکہ فرق ظاہر کیا جاسکے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن کا۔ دور کہیں چمکتا ایک جگنو اور زمینوں سے بھی کہیں اوپر ایک ٹمٹماتا ستارہ تاریکی کے لیے ایک دھمکی بھی ہوتا ہے اور امید کی ایک کرن بھی۔ دنیا کا یہ تھال جو تمھیں کنکروں سے بھرا نظر آ رہا ہے یہیں کہیں اس کے اندر ایک آدھ ریزہ اصلی ہیرے کی کنی کا بھی ہوگا اور وہی کنکروں کے ڈھیر سے زیادہ قدر و قیمت کا ہوگا۔ اسی لیے ان کنکروں کو بھی چھاننا پڑتا ہے۔ کون جانے کب یہی کنکر گھڑے میں گر کر پانی کی سطح بلند کر دیں۔''

میں ان کا مطمئن اور پرسکون چہرہ دیکھتی رہی۔ مجھے یقین تھا کہ میں کبھی ابا جی کی طرح اتنے وسیع ظرف کی مالک نہیں ہوسکتی۔

''جی ابا جی۔ پہلی بات تو یہ کہ اب گھڑوں اور کوّوں کا زمانہ نہیں رہا۔ اب گھروں میں نہ تو صحن ہوتے ہیں نہ منڈیریں۔ اب تو کنکر بھی صرف آنکھ ہی میں پڑتا ہے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔۔ بات کو سمجھ کر بھی نہ سمجھو تو اور بات ہے ورنہ آپ کو بھی علم ہے کہ ایک کنکر بھی رائیگاں نہیں بنایا گیا۔ یہی کنکر ملتے ہیں تو ہمالہ بنتا ہے۔''

انھوں نے واپس کتاب سنبھال لی، ''بات انسانی طلب کی ہے۔ جسے طلب اور تمنا ہی ہیرے موتی کی ہو تو وہ اسی میں مارا مارا پھرے گا۔ جس دن انسان اس تلاش سے ماورا ہو جائے تو وہ اس بات سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے کہ کون ہیرا ہے اور کون محض ایک سنگریزہ۔ پھر وہ چھان بین بھی چھوڑ دیتا ہے۔ نیکی کا معاوضہ نہیں طلب کرتا اور حساب کتاب، گوشوارے، کیا کھویا کیا پایا کے تجزیے میں نہیں الجھتا، اور 'ہم نے تم سے کیا کیا اور تم نے ہم سے کیا کیا' کا احتساب بھی بھول جاتا ہے۔''

''وہ اپنے پرائے کا ٹھپہ لگائے بغیر صرف بھلائی پر اتر آتا ہے۔ چاندنی اس بات کی تحقیق نہیں کرتی کہ وہ کس چیز پر خود کو لٹا رہی ہے۔ سورج کی کرنیں آنکھ کھلتے ہی مندر، مسجد اور گردوارے ہر ایک کے در و بام سے لپٹتی ہیں۔ بادل کسی سرزمین سے گزرتے ہوئے جغرافیے کا علم حاصل نہیں کرتا۔ سو انسان کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے اسے زیبا ہے کہ وہ وہی کرے۔''

''زمین پر انسانی بقا کے لیے ہر اپنے پرائے کے ساتھ نیکی اور اس کا دکھ درد جہاں تک بن پائے دور کرے۔ اس بات کی تشویش کے بغیر کہ جواباً وہ آپ کے ساتھ کیا کرتا ہے کیونکہ نیکی کسی بھی صلے اور معاوضے کی طالب اور محتاج نہیں ہوتی، اگر اسے مشروط کرو گے تو وہ کاروبار تو ضرور ہو جائے گا، اطمینانِ قلب کا باعث نہیں بنے گا۔ اور پھر جب اطمینان ہی نہیں ہوگا تو کشاکش شروع ہوگی۔ آپ کو زیبا ہی نہیں کہ اس مختصر حیات میں اس کشمکش کے دام میں رہیں کہ دنیا میں کنکر کتنے ہیں۔ آپ کو اس سوچ سے ماورا ہونا ہے۔ پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ رحمانی قوتیں آپ کے دل و دماغ سے منفی یادیں کھرچ ڈالتی ہیں اور صرف 'کل عالم دی خیر' کی روشنی باقی رہ جاتی ہے۔ میں انتظار کروں گا کہ آپ دل سے ہر سود و زیاں کا احساس مٹا کر مجھے وہاں ملیں۔''

''جی ابا جی۔'' میں نے ہر حرف دل پر اترتا محسوس کیا اور عافیت اسی میں جانی کہ اب منہ بند کر کے بیٹھ جاؤں ورنہ ابا جی کے تاریخی حوالے، اشعار اور علمی ادبی بحث شروع ہونے کا امکان تھا،

اور چونکہ عصر کا وقت تھا اور ان کے لالہ جی کی کمک بھی پہنچ جاتی۔ میری واپسی میں صرف تین دن باقی تھے۔ میں انھیں جھاڑ کھا کر اور کبھی نہ ختم ہونے والی بحث میں پڑ کر ضائع نہیں سکتی تھی۔

••

''کل من علیہا فان۔ دنیا میں صرف ایک حقیقت جس کو کسی علمی، عقلی اور سائنسی ثبوت کی ضرورت نہیں وہ یہی ہے کہ ہر چیز کو فنا ہونا ہے۔ پہلے سے بنی دنیا بھی کسی نہ کسی طریقے سے فنا ہوتی آئی ہے اور جو ذی روح پیدا ہوا ہے اسے یہ جہانِ فانی چھوڑ کر جانا ہے۔ جن لوگوں نے ان یتیموں کا حق مارا ہے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے زیادہ سے زیادہ جمع کر لیں، اگر وہ یہ نکتہ یاد رکھیں کہ فنا ہونے کے بعد دنیا سے جانا خالی ہاتھ ہی ہے۔ یہی حرص اور دولت اولاد کو آپس میں لڑائے گی اور خون پانی سے بھی پتلا ہو کر گلیوں میں بہہ نکلے گا۔ تو کیوں نہ دنیا پر کوئی ایسا نشان چھوڑ جاؤ کہ بعد میں آنے والوں کے لیے نافع ہو۔ دنیا میں آنا عبث نہ ٹھہرے۔ خواہ وہ ایک حرفِ تسلی ہو، ایک چھوٹی سی نیکی ہو یا پانی کا ایک گلاس۔''

''یا دوا کی ایک پڑیا، ایک کیپسول، ایک سیرپ کا چمچہ'' میں نے اپنا لقمہ دینا ضروری سمجھا۔

''ہاں دوا کی ایک پڑیا بھی۔۔۔ خواہ آپ نے اس میں صرف پسی ہوئی چینی ڈال رکھی ہو۔ اصل بات مریض کا ایمان اور یقین ہے کہ اسے دوا مل گئی ہے اور اس کا اثر ہوتے ہی وہ صحت یاب ہو جائے گا۔''

پھر ایک طویل بحث شروع ہو جاتی کہ انسانی ذہن کس طرح کام کرتا ہے اور وہ کتنا طاقتور ہے۔ چینی کی بنی گولی اور گلوکوز کی بوتل لگوانے والے اس یقین کے سہارے ہی کامیاب ہوتے ہیں کہ ان کا علاج معالجہ شروع ہو چکا ہے۔

ابا جی کے پاس ایک معمر بزرگ آیا کرتے تھے جو ہمیشہ ضد کرتے، ''لڑکو! اپنے ابا جی کو بلا کر لاؤ'' ان کا انتظار کرتے، اور پھر مصر رہتے کہ ابا جی انھیں ''ٹونٹی'' لگا کر دیکھیں۔ اس کے بعد ان کی تسلی ہو جاتی اور وہ خوش باش واپس چلے جاتے۔

''بات یہ ہے جانِ پدر، کہ سارا معاملہ دل کے یقین کا ہے۔ باقی علاج معالجہ اور دوا ثانوی چیزیں ہیں۔ اصل قوتِ ارادی اور انسان کا داخلی رویہ اسے خوش باش اور مطمئن رکھتا ہے۔''

••

ابا جی نے کبھی مجھے میرے سامنے ہی سراہنے اور داد دینے کا موقع نہ گنوایا۔ کئی دفعہ

کہتے، ''آپ کو اپنے اوپر ناز کرنا چاہیے کہ اتنی طویل نامراد پیٹ کی تکلیف کے ساتھ اتنے بڑے خاندان کی خدمتوں کا بوجھ آپ نے اٹھائے رکھا اور پھر اتنی ذہنی اذیت سے گزر کر اپنے بچے بھی پال لیے اور اپنا قلم بھی سنبھال لیا۔ ہاں مجھے غم صرف اس بات کا ہے کہ آپ نے زندگی کا بارِ گراں تنِ تنہا اٹھایا اور اس بات پر بھی مجھے فخر ہے کہ آپ نے اس بوجھ کی کبھی کوئی شکایت نہیں کی، اس کو عذاب نہیں سمجھا۔ کسی کے لیے اس سے بڑی کوئی سزا شاید ہی ہو کہ اس سے کوئی گلہ نہیں کرتا۔ کوئی مطالبہ یا شکایت کیے بغیر زندگی کی بنی بنائی پگڈنڈی چھوڑ کر اپنا الگ راستہ بنا لے۔

میری بیٹی نے خاموشی سے غیر ضروری اور غیر لازم وزن اٹھائے رکھا اس وقت تک جب تک مجھے خود دکھائی نہیں دے گیا۔ قصور وار تو میں بھی ہوں جس نے تمھاری خاموشی نہ سمجھی اور یہ نہ تجزیہ کیا کہ تمھارے کبھی نہ تھکنے والے قدم سست کیوں پڑ جاتے ہیں۔ میں تمھارے علاج معالجے میں ہی لگا رہا۔ میں نے یہ بات کیوں نہ سوچی کہ ہنسنے کھیلنے کے عادی انسان کا جسم جب بیمار ہوتا ہے تو وہ کس بات کی علامت ہے۔ تمھارا مزاج کیوں بدلا اور ایک تخلیقی ذہن کے ساتھ جسم کیوں منکر ہو گیا؟ ہر روز ڈاکٹر صرف یہی ایکسریز میں دیکھتے رہے کہ زخم ٹھیک نہیں ہوتے۔ جراحت اور مزید جراحت۔ لیکن یاد رکھو جب تک درد بانٹا نہ جائے وہ زخم بن کر رِستا ہے اور پھر لاعلاج ہو جاتا ہے۔ انسانی جسم سے بیماری کی تاریکی صرف اس صورت میں نکلتی ہے جب ذہن کو ہر منفی خیال، پچھتاوے، منتقم سوچ اور حسد و خود ترسی کے سنپولیوں سے پاک کر دیا جائے۔ پھر دل شادمان رہنے لگتا ہے اور اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے دل سے حزن اور ملال کا احساس نکال لے گا اور دلوں کو مطمئن اور اذہان کو پرسکون کر دے گا۔ آپ کو بہت آگے جانا ہے میرے بچے۔ آپ کو اپنی تخلیقی قوتوں اور تعمیری وفور کو ضائع نہیں ہونے دینا۔ میرے اختیار میں ایک چھوٹے سے سکول کا چراغ جلانا تھا، میں نے وہ کر دیا۔ لیکن آپ کے پاس امکانات کا ایک شمسی نظام ہے۔ آپ لکھیں تاکہ جس تک وہ الفاظ پہنچیں ان سے تعمیری سوچ کی کرنیں بکھریں۔''

شکر گزاری میری آنکھوں سے گرم سیال مادّہ بن کر بہہ نکلی۔ کہاں کہاں بابا جان کی شفقت نے میرے سر پر ہاتھ نہیں رکھا۔ کہاں کہاں تایا جان میرے شانہ بشانہ کھڑے نہیں ہوئے اور کہاں کہاں ابا جی کی خاموش نظر نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ دنیا کے ہر سیلِ بلا کے سامنے میں تمھارے آگے ڈھال کی صورت کھڑا ہوں۔ عورت خواہ افریقہ جیسے اسرار سے بھرے برِاعظم سے نکلے یا یورپ جیسے آزاد، مہذب اور تعلیم یافتہ معاشرے کی پیداوار ہو، کامیابی کے جس افق کو جی چاہے چھو لے، اگر اس

کی بنیاد کی مٹی میں باپ نے اپنی شفقت، یقین، احساسِ تحفظ اور حوصلہ افزائی کا پارس پتھر رکھ دیا ہو تو وہ مٹی کو سونا بناتی چلی جاتی ہے۔

••

جدید عورت فطری تقاضے سے ہزار انکار کرے لیکن یہ طے ہے کہ اسے بنیادی طاقت اور یقین کے ماخذ کے لیے بچپن، جوانی یا عمر کے سہ پہر میں باپ، شوہر، بھائی اور بیٹے کے فخر کی تمنا رہتی ہے۔ یہی فخر اس کی ذات کو روشن رکھتا ہے۔ میں جب بھی ڈنمارک کی ملکہ مارگریٹ اول، اور موجودہ ملکہ مارگریٹ دوم کی داستان پڑھتی ہوں تو میرا یقین قوی ہوتا چلا جاتا ہے۔

مارگریٹ دوم کے والد نے اسے ملکہ بنایا، اس کے دونوں بیٹوں نے اسے ایک مثالی ماں بنایا اور جب اس کے شوہر نے آخری عمر میں آ کر اپنی وفات سے پہلے بیماری کی حالت میں اس کے ساتھ ایک قبر میں دفن ہونے سے انکار کیا تو پورا ڈنمارک اس خبر سے چونک گیا۔ یورپ کا شاہی خاندان اپنی زندگی ہی میں اپنی قبر، تدفین اور تمام رسومات کی مکمل تیاری کر لیتا ہے۔ ملکہ مارگریٹ دوم نے انتہائی وقار کے ساتھ شوہر کی اس خواہش کا احترام کیا اور اپنی آخری آرام گاہ میں تنہا سونے کو قبول کر لیا۔ چونکہ اسے زندگی نے بہت مہربان ساتھیوں سے نوازا تھا، اس نے اپنے طویل دور میں ہر موقع پر ان سب کا احترام کر کے دکھایا کہ عورت ایک ملکہ بھی ہو تو وہ اپنی ذات سے منسلک مردوں کو بھرپور تکریم دے کر اپنی عزت میں اضافہ کر سکتی ہے۔ سو اسے اپنی تکمیل کے لیے تدفین کی کسی رواج، رسم یا شوہر کے قبر میں پہلو بہ پہلو ابدی نیند سونے کے انکار سے کوئی فرق نہیں پڑا۔

••

بچپن میں جب کبھی کسی ایسی بات پر ضد کی جو ابا جی کو پسند نہیں تھی تو دو ہی لفظ کہتے، ”بری بات“ اور جب ایک ہی بات مسلسل دوہراتی اور فرمائش جاری رکھتی تو کہتے، ”اچھی بات۔“ شدید قسم کا انکار اور بلاوجہ کے عہد و پیمان کرتا اقرار انھوں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ ساری عمر ابا جی کی اس ”اچھی بات“ ور ”بری بات“ نے ایک معیار بن کر راستہ دکھایا۔ میرے بچوں کی پرورش اور تربیت میں غیر شعوری طور پر وہی آزادروی اور قوتِ فیصلہ کی حوصلہ افزائی تھی جو مجھے سکھائی گئی۔ کئی دفعہ جب لوگ اپنے خانگی جھگڑے لے کر آتے تو ابا جی کی رائے رہنمائی اور مدد کے طالب ہوتے۔ ایسے میں ابا جی کی باتیں اور ذاتی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے مشورے اور تجاویز میرے ذہن کے کسی خانے میں انمٹ سیاہی سے تحریر ہیں۔ اس تحریر کو بڑے سے بڑا حادثہ نہیں مٹا سکا۔

''مرد اپنا وقت اور پیسہ دیتا ہے جب کہ عورت اپنی پوری زندگی اپنی خوشیاں اور اپنا مستقبل دیتی ہے۔ اللہ کی ذات نے اس کی ذات میں اپنا ہی ایک جلوہ رکھا ہے۔ آپ کے بچوں کی ماں ہے اس سے نیک سلوک کرو۔ اقتصادی طور پر اسے محتاج نہ رکھو کہ وہ آپ کے ہی بچوں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے آپ کے ہاتھوں کی طرف دیکھے۔ انسانوں کی بدترین قسم وہ ہوتی ہے جو دوسروں کو مجبور بنا کر اپنا محتاج کر دینا چاہتی ہے۔ مجبور اور محتاج انسان جز وقتی غلام تو بن سکتا ہے، ہمہ وقتی آپ کے کنٹرول میں نہیں رہے گا۔''

بہت بعد میں بابل کی دہلیز چھوڑنے اور دنیا کے سمندر میں کشتی ڈالنے کے بعد علم ہوا کہ اس محفوظ علاقے کے باہر کی دنیا کیسی ہوتی ہے۔ لوگوں نے رشتوں میں بھی کیسی ملاوٹیں کر رکھی ہیں، اغراض، طمع اور حسد کے ناگ فصل کی صورت میں لہرا رہے ہیں اور لوگ باگ صرف عصا ڈھونڈنے میں مصروف رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وطن چھوڑنے کے بعد عقل اور علم سرعت سے حاصل ہونے لگتے ہیں۔ والدین سے دوری اور اپنے ماحول سے بالکل الگ دنیا میں راتوں رات عمر میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ جب آپ اپنی تربیت کے مطابق زندگی کے شترِ بے مہار کو کرتب سکھانے کی کوشش کریں۔ صد شکر یہ کہ میرے بزرگوں کی تربیت اور رہنمائی دائم میرے ہمراہ رہی اور ان کی نظر میں سرخرو رہنے کے عزم نے بے سمت نہیں ہونے دیا۔

میں نے جب خود انسانوں کے ساتھ رابطے میں رہ کر زندگی کا تجربہ کیا، بالخصوص جب تعلیمی شعبے میں ہر طرح کے لوگوں سے ملنے اور ان کے مسائل سے آگاہی کا موقع ملا تو مجھے پاکستان کے ایک چھوٹے سے قصبے میں گاؤں کے سادہ لوگوں سے لے کر یورپ امریکہ سے واپس لوٹنے والے لوگوں کے مسائل سمجھنے اور حل پیش کرنے والے ابا جی کے فلسفیانہ تجزیے پر حیرت ہوتی۔ اولاد کو مار پیٹ کے ذریعے، پاکستان سے بلائے شوہر کی شخصیت کا استحصال کر کے، بیوی کو پابندیاں لگا کر، خرچہ نہ دے کر، اقتصادی طور پر دست نگر بنا کر اور اس کی اہانت کے ہتھکنڈے سے وقتی طور پر واقعی غلام بنایا جا سکتا ہے۔ آب و آتش، دنیا میں انسان کی خدمت کو ہمہ وقت تیار خادم ہیں۔ لیکن جب یہی غلام آقا بن جاتے ہیں تو اس دنیا کو کھنڈر بنانے میں دیر نہیں کرتے۔ انسانی فطرت بھی آگ اور پانی جیسی ہے جو بے قابو ہو کر بغاوت پر اتر آئے تو یا سب کچھ جلا کر راکھ کر دیتی ہے یا پھر سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتی ہے۔

••

اگرچہ 1999ء میں ڈینش حکومت کی طرف سے لندن سے ایک ایرانی استاد کو بلا کر ہمیں اِن پیج کا کورس کرایا گیا لیکن وہ صرف کام چلاؤ حد تک تھا۔ اس میں مہارت حاصل کرنے کے لیے مشق لازم تھی جو میں نے ذاتی دلچسپی اور ذوق وشوق سے کی۔ نئی چیزوں کو فوراً سیکھنے کا شوق بھی مجھے ابا جی سے ہی ورثے میں ملا۔ ابا جی سائنسی ترقی سے بہت متاثر ہوتے اور اسے انسانیت کی خدمت کہتے۔ میری بیٹی کی ایک دوست کو پی ایچ ڈی میں سروے کے لیے ایک خط کا اردو میں ترجمہ کر کے استعمال کرنا تھا۔ میں ان دنوں پاکستان میں تھی جب اس کا فون آیا کہ امی جلدی سے اس کی مدد کر دیں۔ اس نے کسی سے ترجمہ کرایا ہے لیکن اس پر نظرِ ثانی کرنا ہے۔ میں نے اسے فوراً خط کا اردو ترجمہ کیا اور پھر اسے تصویر بنا کر بھجوایا تا کہ وہ کسی بھی اردو پروگرام کے بغیر پرنٹ کیا جا سکے اور بآسانی استعمال ہو سکے۔ جب میں واپس آئی تو اس نے مجھے پھول اور چاکلیٹ بھیجے اور اس بات پر بھی حیرت ظاہر کی کہ اردو زبان میں بھی اس قدر سرعت سے کام ہو سکتا ہے کہ رات کو درخواست کی جائے اور صبح آٹھ بجے ای میل میں موصول ہو جائے۔ بلاشبہ ابا جی درست کہا کرتے تھے کہ یہ علمِ نافع نہ صرف انسانوں کے کام آتا ہے بلکہ انھیں باہم مربوط بھی کرتا ہے۔ کسی بھی چیز کو آپ کیسے استعمال کرتے ہیں یہ انسان کی ذاتی فطرت پر منحصر ہے ورنہ یہ ترقی تو انسان کو نفع پہنچانے کے لیے ہوتی ہے۔

میں چونکہ تعلیم سے متعلق ہر بات ابا جی کو بتاتی تھی، میری جو شامت آئی تو میں نے کہہ دیا کہ مجھے اردو کمپیوٹر تو آتا ہے لیکن مجھے گرافک اور ڈیزائنگ نہیں آتی کہ میں اردو تحریروں کو دلکش انداز میں پیش کر سکوں۔ جب میں پاکستان آئی تو ابا جی نے پہلے ہی اردو گرافک کی کلاسوں کے بارے میں معلومات لے رکھی تھیں۔ عتیق بھائی کو بھی کمپیوٹر سیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ ابا جی نے ان سے بھی کہہ رکھا تھا کہ اس لڑکی کو ذرا اردو گرافک سکھا دینا۔

بچوں کو چھٹیاں ہوئیں اور ان کو لے کر پاکستان پہنچی تو ابا جی نے مجھے اردو کمپیوٹر اور فوٹو شاپ سیکھنے کے لیے بھیجا۔ کہنے لگے ''گھر بھی بچے کو بلایا جا سکتا ہے لیکن سنٹر جا کر باقی سسٹم بھی دیکھ لینا۔'' پروفیشنل بڑے کمپیوٹر پر ایک ہفتے کا کورس کیا اور پھر باقی مسلسل مشق ذاتی محنت سے میں کمپیوٹر اور اردو کمپیوٹر میں کبھی کسی کی دست نگر نہیں ہوئی۔

یہ ابا جی کا ایک اور احسان تھا۔ گرمیوں کے طویل اور تمتماتے ہوئے دن تھے۔ میں امی جی کے ساتھ بیٹھی مزے سے شکنجبین پینے میں مصروف تھی۔ ابا جی اندر آئے۔ ''بیٹا آپ نے کہا تھا

ناں کہ آپ کو اردو کمپیوٹر اور فوٹو شاپ سیکھنا ہے۔ تو میں نے لڑکے کو کہہ دیا تھا۔ اب جاؤ اور جو کچھ بھی سمجھنا ہو سیکھ آؤ۔''

''ابا جی آج میرا جی نہیں چاہ رہا۔ ابھی تو ہم آئے ہیں'' میں اتنے سکون کے ماحول بلکہ عیش ونشاط کے عالم سے نکل کر باہر نہیں جانا چاہتی تھی۔

''چلو چلو، جلدی کرو، شاباش، آپ کے بھائی نے کہہ دیا تھا ادھر سنٹر میں کہ آپ آئیں گی، جلدی کرو، کون سا سارا دن لگے گا؟'' انھوں نے حسبِ عادت فوری عمل پر آمادہ کرنا چاہا۔ امی جی نے بھی زندگی میں پہلی دفعہ میری ہاں میں ہاں ملائی۔ ''رہنے دیں، اتنی گرمی میں کہاں جائے گی۔''

''گرمی سب کے لیے پڑتی ہے۔ اس کے لیے الگ درجہ حرارت ہے کیا؟ چلو آج جا کر دیکھ آؤ اور پھر کل تفصیل سے پڑھنے چلی جانا۔ آپ کے لیے تو ایک ہفتے کا کورس ہی بہت ہوگا۔''

ابا جی نے اپنا اصرار جاری رکھا۔ پھر بچوں کی طرح پچکارتے ہوئے بولے،''جاؤ شاباش میرا بچہ، پھر مجھے بھی اس پروگرام میں اردو لکھ کر دکھانا''۔ مجھے خاموشی سے اٹھ کر چادر لیتے ہی بنی۔

''نانا ابو! آپ کو پتہ بھی ہے کہ فوٹو شاپ کیا ہوتا ہے؟'' میرے بیٹے نے بڑے آرام سے پوچھا۔ ''ایسے ہی میری امی کو بھیج رہے ہیں زبردستی۔''

''نہیں میرے بچے،'' ابا جی نے اسے اپنے ساتھ بستر پر بٹھا لیا۔ ''مجھے نہیں پتہ یہ کیا پروگرام ہے۔ بس اتنا علم ہے کہ اردو کمپیوٹر کے ساتھ ملا کر آپ کی امی اس میں شاعری لکھا کریں گی، تو جو کچھ بھی یہ پروگرام ہے وہ سیکھ آئیں۔ وہاں جا کر ان کے کام آئے گا۔''

••

جن دنوں گھر میں نیا نیا کمپیوٹر آیا تھا تو بے حد دلچسپی سے اسے دیکھتے اور دستاویزات لکھنے کے لیے اسے کرشمہ قرار دیتے۔ اردو ورڈ پروسیسر پروگرام پر تو دل و جان سے فدا تھے۔ میری حوصلہ افزائی کرتے کہ فوراً سے پیشتر اسے سیکھو۔ مجھے اردو ٹائپ کرتا دیکھتے تو بہت خوش ہو کر کہتے کہ اب تو کوئی جھنجھٹ ہی نہیں رہا۔ نہ قلم نہ سیاہی نہ کاغذ اور نہ ہی کتابت کا جھگڑا۔ کمپیوٹر سے قبل تو کتابیں تحریر کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ اغلاط کی نشان دہی اور تصحیح کے لیے طویل اور پریشان کن مسائل رہے ہیں۔

جب انھیں پہلا موبائل تحفے میں ملا تو حیرت اور مسرت سے جیب میں لیے گھومتے

رہے۔ میں شرارت سے فون کرتی۔ اول تو جیب سے موبائل نکالنے میں ہی وقت لگتا، پھر جب کال اٹھا ہی لیتے تو بات شروع ہوتی، ''مرزا صاحب۔۔۔ مزاج بخیر؟'' میں آواز بدل کر بات کی کوشش کرتی۔

''نہ کرو بچہ، یہ نمبر ابھی صرف آپ کے پاس ہے۔'' وہ جھانسے میں نہ آتے۔

پھر ان کو سارے نمبر فیڈ کر دیے اور کال کے ساتھ جب سکرین پر کال کرنے والے کا نام اور نمبر چمکتا تو بچوں کی طرح خوش ہوتے۔ جب وہ اس کو استعمال کرنا سیکھ رہے تھے تو حیران ہوکر ایک ہی بات بار بار کہتے، ''محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی۔''

موبائل پر میرا بیٹا انھیں پیغام لکھنا سکھا رہا تھا۔ کی پیڈ کا سائز چھوٹا ہونے کی وجہ سے انگلی کسی اور بٹن پر جا رکتی، آخرِ کار کہنے لگے ''بس موبائل پر دو ہی بٹن ہونا چاہییں: سرخ اور سبز، ایک دبا کر بات سن لی جائے اور دوسرا دبا کر ختم کر دی جائے۔''

ان کو دو لفظوں کا پیغام لکھنے میں بہت وقت لگتا۔ ایک دن ابا جی نے پیغام لکھنے کی مشقت کرتے کرتے سر اٹھا کر کہا، ''موبائل میں ایسا فنکشن ہونا چاہیے کہ اسے حکم دو تو وہ پیغام لکھ لے اور حکم دو تو بھیج بھی دے۔''

''جی ابا جی، کن فیکون کی طرح؟'' میں نے پوچھا۔

کہنے لگے، ''اگر ابنِ آدم یہ معجزہ دکھا سکتا ہے کہ چشم زدن میں بات سمندروں پہاڑوں کو پھلانگتی دوسرے انسان کے کانوں تک جا پہنچتی ہے تو کن فیکون بھی شاید کسی ایک ہی جست کے فاصلے پر ہو۔ شاید وہ ہوا کی لہروں میں بھٹکتی آوازوں کو بھی کسی طریقے سے زندہ کر لے۔ اب تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ معراجِ مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم اور زمان و مکان کے تصورات کے بدلنے کا مطالعہ بھی تو کرو۔ ہم تو صرف اتنا پڑھ سکتے ہیں جو اخبارات یا ترجمہ کی ہوئی کتب سے ملتا ہے۔ آپ کو ضرور اس برقی ترقی کی رفتار کے ساتھ چلنا چاہیے۔ اب سائنسی علوم اور سائنس کا مطالعہ اور تحقیق ناگزیر ہوگئی ہے۔''

جب ان کے جانے کے بعد سمارٹ فون کا چلن عام ہوا اور ''سپیچ ٹو ٹیکسٹ'' کی سہولت عام مہیا ہوئی تو میں نے ابا جی کو بہت یاد کیا اور ہمیشہ کی طرح وہی خواہش کہ کاش آج ابا جی حیات ہوتے۔ میرا جدید ٹیکنالوجی اور کمپیوٹرز اور موبائلز پر اردو کے فروغ کی جد و جہد ان ہی افکار کا نتیجہ تھی۔ ابا جی کی طرح میں نے بھی تدریس ہی کے شعبے کو اپنی زندگی کا مرکز بنایا۔ اب جدید تدریس کا تقاضہ جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ زبان و ادب کو جوڑنا تھا۔ میں نے نجانے کتنے لوگوں کو یونیکوڈ انسٹال

کر کے دیا۔ موبائل فون پر اس کے کی بورڈز فعال کر کے دیے۔ ان پیج پڑھایا۔ ایک دن ٹی وی کے آفس میں بیٹھی ایک ڈینش اشتہار کا ترجمہ کر رہی تھی کہ چودھری سرور صاحب نے بچوں کی طرح جھگڑا شروع کر دیا، ''خود آپ منٹوں میں اردو کی خبر بنا کر پروگرام کے نیچے پٹی چلا دیتی ہیں، ہمیں نہیں سکھاتیں۔ ہزار دفعہ گزارش کر چکا ہوں کہ لیپ ٹاپ پر اردو ڈال دیں۔''

میں نے اپنا کام ختم کیا۔ پھر ان سے کہا، ''لائیے ادھر اپنا موبائل، اب لیپ ٹاپ کا زمانہ نہیں ہے۔''

''اس میں اردو نہیں ہے'' وہ پہلے ہی مدافعتی انداز میں بولے۔

''ہاں، لیکن آج میں نے سوچ رکھا ہے کہ یہ طعنہ و دشنام کا سلسلہ ختم کر کے گھر جاؤں گی۔'' میں نے ان کے موبائل میں یونیکوڈ ڈاؤن لوڈ کیا، پھر پہلی اردو عبارت لکھ کر دکھائی۔

''اب ادھر کونے میں بیٹھ جایئے، اور اردو لکھنے کی پریکٹس کریں۔''

وہ چند لمحے مجھے دیکھتے رہے۔ میں نے اپنا کام جاری رکھا۔ پھر سعادت مندی سے کونے والے صوفے پر جا کر بیٹھ گئے۔ میں دزدیدہ نظروں سے دیکھتی رہی اور مجھے ان کی مشقت اور مصمم ارادے سے مسرت ہوئی۔ دو دن کے بعد مجھے ان کا اردو میں پہلا ٹیکسٹ میسج موصول ہوا،

''استانی جی، یہ دیکھیں میں اردو پیغام لکھ رہا ہوں۔''

••

میں نے ابا جی کو فون کیا تو وہ حسبِ عادت فوراً لپک کر فون تک نہیں آئے۔ بھائی نے بتایا کہ الیکشن چل رہا ہے گھر میں، اور بھابی جان لیڈی کونسلر کا انتخاب لڑنے کو ہیں۔

''خواتین کو زندگی کے ہر شعبے میں اپنی صلاحیتیں منوانا چاہییں'' ابا جی نے ریسیور پکڑا اور تمہید باندھی۔ غالباً بہت مصروف تھے، پھر بولے، ''شاہدہ بیٹی کو بھی انتخابات میں حصہ لینا ہے۔ خواتین کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ بھی فیصلہ کرنے والوں میں شامل ہوں۔ اس کا انتخابی نشان ٹوکری ہے سو میں لکھ رہا ہوں، ''مانواں دا تے بھیڑاں دا نشان ٹوکری۔'' میں نے پوچھا پنجابی میں کیوں نعرے بازی ہو رہی ہے، تو کہنے لگے ''یہاں پر اکثریت یہی زبان سمجھتی اور پسند کرتی ہے۔''

بھابی نے الیکشن جیت لیا اور پورے وقار سے لیڈی کونسلر کے فرائض ادا کیے۔ عالیہ اپنے اساتذہ کو اور ہم جماعتوں کو بتاتی کہ میرے نانا ابو پہلی نسل کے فرد ہیں لیکن وہ بہت فخر سے اپنی بہو کے اس مقام اور رتبے کا ذکر کرتے ہیں۔

مغربی میڈیا کے منفی پروپیگنڈا کی وجہ سے ڈینش بچے یہی سمجھتے کہ برِصغیر کے لوگوں کا شاید ایک ہی مقصد ہے کہ یا تو بچیوں کو ماں کے پیٹ میں قتل کر دینا، اور اگر زندہ رہنے کا حق دیتے ہیں تو ان کی تعلیم اور شادی اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔ عالیہ کو بہت ہنسی آتی، ''ہاں، پاکستان میں ہر گھر کے بیرونی دروازے پر تلوار لٹکی ہوتی ہے تاکہ باپ گھر آتے ہی جاسوسہ ماں سے پوری رپورٹ لے اور پھر اس کے مطابق بچوں کی دھنائی دھلائی ہو۔''

مجھے کسی نے انگلینڈ میں ہی پوچھا، ''تم لوگوں کے خاندان میں یہ معیوب نہیں سمجھا جاتا کہ خواتین کے نام اور پوسٹر دیواروں پر لگائے جائیں اور وہ یوں مردوں میں بیٹھ کر میٹنگ کرتی پھریں۔ مرزا صاحب کو تو ہم مذہبی احکامات کا پابند سمجھتے تھے۔ ہمارے ہاں تو خطوں پر بھی عورتوں کے نام نہیں لکھے جاتے۔ عورت کے تو نام کی بھی عزت ہوتی ہے۔''

میں چند لمحے حیران ہو کر ان کا منہ دیکھتی رہی کیونکہ وہ گزشتہ تیس سال سے مانچسٹر میں مقیم تھیں۔ میں نے کہا، ''آپا! ابا جی نے یہ کام اس وقت بھی کیا تھا جب میری عمر بمشکل سولہ سترہ برس تھی۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے بیٹھ کر میرے بینرز پر بھی اشعار لکھے تھے۔ میرے بھائیوں نے سیڑھیاں رکھ کر جہلم کالج میں ان کو باندھا، شہر میں پوسٹر لہرائے۔ میں نے بھاری اکثریت سے الیکشن جیتا۔ اگر میں ملک چھوڑ نہ دیتی تو پتہ نہیں وہ مجھے کہاں تک کے انتخابات میں حصہ لینے کو کہتے۔''

ابا جی کے مذہبی ہونے نہ ہونے کی بات تو بعد میں ہوگی، پہلے ہم قرآن میں سورہ مریم کی بات پر غور کیوں نہ کریں؟ کچھ اعتراضات انہوں نے میرے ٹی وی پروگراموں کے بارے میں بھی کیے۔ پھر شاعری پر ''بے حیائی'' کی مہر لگا کر کہنے لگیں ''یہی وقت تم درس دینے اور میلاد وغیرہ میں شمولیت کے لیے لگاؤ تو دنیا میں بھی عزت اور آخرت میں بھی بخشش کا سامان ہو جائے۔'' ایسے لوگوں کی باتوں کا جواب مکمل خاموشی اور آئندہ ان کی شکل دکھائی دیتے ہی دور سے سلام کے بعد کلام کا موقع نہ دینا ہوتا ہے۔

ابا جی کو عربی وضع قطع اور عرب تہذیب وتمدن کے بالجبر رواج سے اختلاف تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر علاقے میں وہاں کے موسم کے مطابق لباس پہنا جاتا ہے۔ خود کو عام لوگوں سے دور ہٹا لینا اور پھر اس پر اترانا اور دوسرے لوگوں کو نظرِ حقارت سے دیکھنے کو وہ معاشرتی اور اخلاقی معائب میں شمار کرتے تھے۔ میری کئی سہیلیاں گھر آتیں جن کے بال تراشیدہ تھے یا وہ پردے کی پابندی نہیں کرتی تھیں لیکن ابا جی نے کبھی ان کو نہیں ٹوکا۔ تاہم وہ از خود ان کو دیکھتے ہی دوپٹہ شانوں پر سے

اٹھا کر سر پر کرلیتیں۔

••

ہمارا تاریخ کا استاد کھچڑی ڈاڑھی والا ہونق سا لیکن بے انتہا لائق شخص تھا۔ اس نے دسمبر کی شدید سردی میں ہمیں پورے کوپن ہیگن کی پیدل سیاحت کرائی۔ ایک ایک مقام پر رک کر اس کے بارے میں بتاتا، وقفے میں سارے گروپ نے وائن اور برانڈی وغیرہ پی، میں اور ایک مراکش کی بچی کافی پیتے اور سردی سے شوں شوں کرتے اسے بددعائیں دیتے۔

مجھے بچوں کی وجہ سے اور گھریلو مصروفیات کی وجہ سے کئی چھٹیاں کرنا پڑیں۔ جب میں دو ہفتے بعد کلاس میں گئی تو بہت تپاک سے کہنے لگا، ''ارے مجھے پہلے بتانا تھا ناں کہ تم آ رہی ہو تو میں تمھارے لیے پھول لے کر آتا۔ لیکن جب اسے گھر کی آتشزدگی اور میری بیماری کی خبر ہوئی تو اس نے مجھے خصوصی رعایت دیتے ہوئے نہ صرف امتحان میں شرکت کا موقع دیا بلکہ یقیناً اپنے خصوصی التفات سے کامیاب کر دیا۔ ان دنوں میری یادداشت کی حالت بے انتہا بگڑی ہوئی تھی۔

جون کا خوبصورت مہینہ شروع ہوتا ہے اور ہوائیں چہچہاہٹوں سے معمور ہوجاتی ہیں۔ سورج بمشکل چند گھنٹوں کے لیے ڈھلنے کی آمادگی ظاہر کرتا ہے جیسے ضدی بچے سونے کے لیے خواب گاہ میں جانے سے انکار کرتے ہیں۔ گلیوں سڑکوں اور شاہراہوں کے اطراف میں سبزہ اور پھول مخمور ہوکر جھولنے لگتے لیکن میرا دل کسی انہونی کے خیال سے بیٹھنے لگتا۔ یہی تو وہ دن تھے میرے خدایا، میری زندگی کے عذاب ناک دن۔

پھر جولائی کے طویل دن اور دل کو مغموم کرتی زرد شامیں کھڑکی میں معلق ہوجاتیں۔ میری مسلسل سنبھلنے کی کوششوں کے باوجود دل ٹوٹے بادبانوں کی کشتی بن جاتا۔ ایسے میں ابا جی کی فون کالز ایک مکمل تھراپی کا کام کرتیں۔ ''میرے بچے، دنیا میں آئے دن حوادث کی یلغار ہے تو کیا جینا چھوڑ دیں ہم؟ دیکھو جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ آپ کو نہیں لگتا کہ قدرت آپ کو کسی بڑے کام کے لیے مضبوط بنا رہی ہے۔ میرا پتر تو بہت بہادر ہے۔ بھئی بچے پال لیے آپ نے ایسی نفیس تربیت کے ساتھ۔ بہترین فیصلوں کی صلاحیت ہے آپ میں۔ ذرا خود کو شاباش دینا سیکھو۔''

میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہتی۔ کئی دفعہ کے دوہرائے علمی ادبی لطائف سنتی اور اخلاقی طور پر ہنستی رہتی۔

''مجھے پتہ ہے جب آپ دل سے نہیں ہنستیں تو آپ کی ہنسی بھی جھوٹی ہوتی ہے، گیلی دیا

سلائی جیسی۔'' ابا جی کہتے۔شکر ہے ان دنوں ویڈیو کالز کا امکان نہیں تھا ورنہ وہ میرے آنسو بھی گن لیتے۔ ان کو جو بات شدید مضطرب کرتی وہ میری پژمردگی تھی۔ شاید ان کو اسی کیفیت سے بچانے کے لیے میں نے خود کو ہر ممکن کوشش سے سنبھالا۔

''جب آپ واقعی خوش ہو کر ہنستی ہیں تو وہ پھلجھڑی کی طرح ہوتی ہے۔'' اب انھوں نے تقابل شروع کر دیا۔

''اچھا ابا جی،'' میں ان سے اتفاق کرتی، ''آپ بہت پہنچے ہوئے ہیں۔ مان لیا، بس طبیعت ٹھیک نہیں ہے ناں۔''

''چلو، پھر اٹھو اور کوئی تعمیری کام کرو۔ کچھ لکھو۔''

''اچھا ابا جی، لیکن کیا لکھوں؟'' میں اپنی بیزاری چھپانے کی کوشش کرتی۔

''کچھ بھی، وہ اچھی باتیں جو ان حادثات کے بعد ہوئیں۔ ان ڈاکٹروں کے بارے میں لکھو ناں جو بیٹھ کر آپ کے جوتے تک باندھ دیتے ہیں۔ جو آپ کو ریٹائرمنٹ جیسے امکانات کی طرف دھکیلتے ہیں کہ آپ صرف لکھیں اور پڑھیں۔ ملازمت کے بکھیڑوں سے نکلیں۔ اپنی سائکاٹرسٹ کے بارے میں لکھیں جو آپ کی ہر بات سکون سے سنتی ہے اور داد دیتی ہے۔'' ابا جی جیسے تیاری کر کے بیٹھے تھے۔

''اچھا ابا جی'' میں سعادت مندی سے کہتی۔ لیکن مجھے اندر ہی اندر عجیب خوف کا سامنا کرنا پڑتا۔ کیسے لکھوں وہ سارے عذابناک لمحے، جیتے جاگتے، ہنستے کھیلتے انسانوں کے قہقہے کربناک چیخوں میں بدلتے اور راتوں کے مقدر میں سلگتے ہوئے رت جگے۔ ابا جی کو کیا علم کہ کس مصیبت سے گزرنا پڑتا ہے۔

''ہاں، اور یہ بھی لکھو کہ کتنے لوگ ہیں جو آپ کی طرح بلند بخت لے کر آئے ہیں۔ جنھیں اللہ نے ابتدائی جوانی میں طویل بیماری لگائی تو عام انسانوں سے زیادہ ہمت دی۔ مواقع دیے۔''

''جی جی، بالکل بڑا احسان ہے'' میں جل کر کہتی۔

''تو کیا نہیں ہے؟'' وہ اطمینان سے بولے۔

''وہ بات میری ٹالتا ہے دیکھو کس کمال سے
سوال کا جواب بھی وہ دیتا ہے سوال سے

ابا جی یہ فی البدیہہ ہے آپ کے لیے۔''

''نیچے دیکھنے کی زحمت کرو جانِ پدر، دنیا میں افلاس اور بیماری بکھری پڑی ہے۔ لاعلاج لوگ یہ جنگ لڑتے ختم ہوجاتے ہیں۔ ذرا سر، گردن اور ناک نیچے جھکا کر دیکھ لیا جائے تو احسانات کی گنتی کرنے میں آسانی ہوتی ہے، اور میری بیٹی تو بہت بہادر ہے۔''

مجھے عالیہ کی معصوم بات یاد آجاتی۔ جب وہ اپنی ہم عمر کزنز اور بچوں سے کھیلتی تو شیخی بگھارتی، ''میری امی سخت بہادڑ ہیں۔''

''ہاں ... دروازے تک شیروں کی لاشیں پڑی ہیں۔'' اس کی چچی ہنس کر کہتیں۔

بس یہ ''سخت بہادڑ'' ہونے کا تمغہ گلے میں پہنے مجھے چلتے رہنے پر مجبور کرنے والی مہربان ذات ابا جی کی تھی۔ شدید خوف، بے قراری، ڈراؤنے خوابوں، پچھتاوے اور احساسِ جرم جیسی گہری کھائیوں کو ان کا ہاتھ تھام کر عبور کیا۔ پھر ابا جی کے نئے تقاضے شروع ہوجاتے۔ ''امتحان دو، اور ڈگری مکمل کرو۔''

''ابا جی مشکل ہے، چھ گھنٹے کا امتحان کیسے دوں؟ میں اتنے گھنٹے تو بیٹھ ہی نہیں سکتی اور اتنا مشکل امتحان ہے، اس کے لیے جو یکسوئی درکار ہے وہ مجھ میں نہیں ہے۔''

''مشکل کیا ہے؟ بزدلوں اور نالائقوں کام چوروں کا بہانہ۔ کچھ مشکل نہیں۔ چلو، شاباش، اٹھو۔'' ابا جی کا بس نہ چلتا کہ مجھے بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیں۔

ڈینش کا امتحان بھی آتش زدگی کی آزمائش کے بعد تھا۔ اس کا زبانی امتحان تو میں نے معجزاتی طور پر بہت اچھے نمبروں سے پاس کرلیا۔ اس امتحان میں سیمنا ریم سے باہر سے ایک استاد بلایا جاتا تھا اور دوسرا ہماری ہی درس گاہ کا تھا۔ تحریری امتحان چھ گھنٹے پر مشتمل تھا۔ پہلے چالیس منٹ تو میں نے جواب لکھنے کی کوشش کی، لیکن پھر ایک دم کمپیوٹر کی سکرین سیاہ ہوگئی اور شدید سر درد کی وجہ سے مجھے گھر بھیج دیا گیا۔ نتیجہ ظاہر ہے فیل ہونے کی صورت نکلا۔

''ابا جی میں فیل ہوگئی ہوں۔'' میں نے ابا جی کو اطلاع دی۔

''اچھا'' ان کی مطمئن آواز آئی، ''دوبارہ کب ہے امتحان کی تاریخ؟''

''مجھے نہیں پتہ، میں جاننا بھی نہیں چاہتی۔'' زندگی میں پہلی مرتبہ امتحان میں ناکام ہونا مجھے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

''گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔ ارے کوئی گھوڑے پر بیٹھے گا تو گرے گا ناں۔ پھر اٹھو، اب کے جم کے بیٹھنا۔'' فوراً جواب آیا۔

''خدایا، یہ عاشق کون سی دنیا کے یارب رہنے والے ہیں۔''

''کیا کروں گی ڈگری لے کر ابا جی، دوبارہ ملازمت تو ہو نہیں سکے گی مجھ سے،'' میری یاسیت نقطۂ عروج پر تھی۔

''تو کون کہتا ہے ملازمت کرو، میں نے کہا ہے کہ امتحان دے کر ڈگری لے لو، پھر جو جی چاہے کرنا۔'' ابا جی کے پاس ہر سوال کا جواب موجود تھا۔

''ابا جی، ڈگری کی حیثیت ہی کیا ہے، کاغذ کا ٹکڑا؟'' میں نے فلسفہ بیان کیا۔

''جی، اسی ٹکڑے سے مشتِ خاک کی خاصیت کا تجزیہ ہوتا ہے،'' وہ کون سا کم تھے۔

''چلو، جاؤ لائبریری۔ گھر بیٹھ کر پڑھنے کا ماحول ہی نہیں ہوتا، دماغ تیار نہیں ہوگا بستر میں گھس کر اور صوفے پر لیٹ کر پڑھنے سے۔ نکلو باہر، شاباش، میرا بہادر بچہ۔''

میرا جی چاہتا کہ ابا جی کو جواباً کہوں،

شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثلِ برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

لیکن مجھے علم تھا کہ ابا جی ہر بات کو رد کر دینے کا طریقہ جانتے ہیں۔ مجھے آرام سے بیٹھنے تو دینا نہیں تھا انھوں نے۔ ہزار بتایا کہ ابا جی رات کو نیند نہیں آتی، بات یاد نہیں رہتی، دماغ بہت تھک جاتا ہے، توجہ مرتکز نہیں ہوتی کسی بھی نکتے پر۔

''چلو، اٹھو شاباش، حجتیں نہ ڈھونڈو، ذہنی قوت کو جمع کر کے ایک سمت دھکیلنا ہوتا ہے۔''

ابا جی کسی بھی وجہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے۔

دوبارہ امتحان کا نتیجہ بھی وہی رہا۔ اب کے میرے ڈاکٹر نے لکھ کر دیا کہ مریضہ چھ گھنٹے میں امتحان نہیں دے سکتی۔ وزارتِ تعلیم اسے کم از کم دس گھنٹے دے اور امتحان کے دوران نگران کو تاکید کی جائے کہ طالبہ کو وقفہ دیا جائے تاکہ وہ اپنی سہولت کے مطابق ذہنی قوتوں کو یکجا کر کے امتحان دے سکے۔ وہ اس کا ایک حصہ شاندار کامیابی کی صورت میں پاس کر چکی ہے۔ اس مرتبہ دس گھنٹے میں اتنا جواب لکھ لیا کہ پاس ہو کر ڈگری لے لوں۔

میں یہ امتحان شاید کبھی کامیابی سے نہ دے پاتی اگر ابا جی کی حوصلہ افزائی شامل نہ ہوتی۔ وہ مسلسل کہتے، ''دیکھو، دو بچوں اور ملازمت کے ساتھ یہ امتحان بس پاس کرنا ہے۔ بس اتنے نمبر لے لو کہ ڈگری مل جائے۔ علم تو ساری عمر حاصل کرنا ہے۔ بس گھبرانا نہیں، فیل ہونا بھی ایک کامیابی ہے۔

چلو شاباش ایک مرتبہ پھر اپلائی کر دو۔'' چھت سے گرنے والی مکڑی کی طرح بار بار گر کر میں نے بالآخر یہ خندق پار کر ہی لی۔

••

شادی، گھر، بچے، خاندان اور والدین، ان رشتوں کا ایسا ایک دائرہ ہے کہ ان کے باہر بڑے سے بڑا عالم یا فلسفی بھی رہے گا تو ذہنی انتشار کا شکار رہے گا۔ تمت بالخیر ہونا ممکن نہیں، اسے خود ہی اپنے ذہن کی کھائیاں اور دلدل لے ڈوبے گی۔ ان رشتوں کی خاطر اور انھیں نباہنے کے لیے انسان مشقت کرتا ہے۔ دن رات تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ ان کی خاطر جینا ہی بڑھاپے اور آخری عمر کو پرسکون بناتا ہے ورنہ خودغرضی صرف منتشر ذہنی کی طرف دھکیلتی ہے۔ اپنے بعد ایک نئی نسل اور اپنے سے بہتر اولاد، بہتر مواقع اور اعلیٰ ترنصب العین کے ساتھ ہی آپ کو کامیاب کرتی ہے۔

اچھا ملک، اچھی زمین، اچھا گھر، تعلیم، ڈگری، ان سب کے لیے دنیا بھاگ رہی ہے۔ آپ کسی ملک کو یا سرزمین کو ایک اچھا انسان پیدا کر کے بھی تو دے سکتے ہیں بجائے اس کے کہ اچھے ملک کی تلاش میں پردیس کے دھکے کھائیں، برفوں میں گھنٹوں محنت کریں، جوانی کے چند سال عیاشی میں گزار لیں اور آخری عمر میں وہاں پیدا کی ہوئی اولاد کو وطن واپس لانے کی تدبیروں میں دیوانے ہو جائیں یا پھر ہر سال مدینے جا کر آخرت میں بھی وہی جنت کے محل اور باغات ڈھونڈتے پھریں۔ مجھے ابا جی کی حکایات سننے میں بہت مزہ آتا۔ ان کے پاس بہت سے مریض ایسے آیا کرتے تھے جو ساری عمر تارکینِ وطن رہ کر باقی عمر پاکستان گزارنے آجاتے۔ کوئی فقیروں اور شاہ جی کے دربار کے پھیرے ڈالتا کہ اللہ بیٹے کے دل کو بدل دے اور وہ گوری کو چھوڑ کر 'مامے دی دھی' کے ساتھ نکاح پڑھوا کے ماں باپ کے احساسِ جرم کو کم کرے یا بیٹی وہیں کسی ہم جماعت سے شادی کے بجائے اپنے 'چاچے دے پتر' کے ساتھ نکاح کرانے پر رضامند ہو جائے تاکہ اس کے ماں باپ طعنوں سے بچ جائیں۔

••

سیمون ڈی بورژوا کی کتاب سے میرا تعارف ڈینش زبان کی تدریس کے دوران ہوا۔ یہاں سکولوں میں دوسری زبانیں سیکھنا لازم ہے۔ تاریخی پس منظر بھی فرانسیسی اور جرمن زبانوں کی برتری کا ہے۔ تراجم براہِ راست اسی زبان سے کیے جانے پر زور دیا جاتا ہے۔ میں نے اس کتاب کا ڈینش اور انگریزی ترجمہ پڑھا۔ عالیہ نے فرانسیسی زبان پڑھی تو میں نے بھی شد بد حاصل کی اور

مجھے ہمیشہ یہ شوق رہا کہ جرمن اور فرانسیسی زبان پر بھی عبور حاصل کیا جائے لیکن زندگی کے اولین مقاصد میں ترجیحات کی فہرست پر اس کا نمبر بہت نیچے رہا۔ یہ کتاب یقیناً عورت کی زندگی کے حوالے سے ایک انقلابی تبدیلی کا آغاز تھا۔ یورپ میں بھی عورت کو ان تمام ارتقائی مدارج سے گزرنا پڑا جہاں آج کی مشرقی عورت کھڑی ہے۔ یہ عورت صرف بیٹی کے طور پر باپ کی جاگیر، بھائیوں کے وقار کی ذمہ دار، پھر خاوند کی ملکیت اور آخر میں بیٹوں کے اشارۂ ابرو پر چلتی کٹھ پتلی رہی۔ ارسطو کے نظریات سے لے کر عصرِ حاضر تک عورت کو کمتر اور پست خیال کیا جاتا رہا۔ اس میں اعلیٰ خصوصیات کا فقدان اور ذہنی طور پر کمزور، غیر منطقی اور جذباتی مخلوق گردانا جاتا۔ پھر مذہب نے اسے اپنے مقدس ہاتھوں کی انگشتِ شہادت کے اشارے سے بتایا کہ وہ ایک زائد ہڈی سے تخلیق پانے والی نامکمل ہستی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس چار سالہ تعلیم کے دورانیے نے مجھے مسلسل مطالعہ پر آمادہ رکھا۔

••

میں نے ابا جی سے کہا کہ یورپ میں سمندروں کا سفر کریں تو ہنگامی ہدایات میں عورتوں اور بچوں کو پہلے بحری جہاز سے نکالے جانے کی ہدایت فرض کے طور پر لکھی ہوتی ہے۔ ہوائی اڈوں پر رش کے دوران بچوں والی ماؤں کو ازخود برتری کے حقوق حاصل ہوجاتے ہیں جب کہ ہم بچوں کے ساتھ پاکستان کا سفر کریں اور پاکستانی ہوائی کمپنی کے ساتھ کریں تو پریشانی سے برا حال ہوتا ہے، اور جو منفی تجربات ہوتے ہیں ان پر تو میں بات ہی نہیں کرنا چاہتی۔ ڈائریکٹ فلائٹ ہونے کی وجہ سے اور بچوں کی ہمراہی کے باعث ہر صورت میں قومی پرواز لینا ہوتی ہے۔

ابا جی کے دائیں بائیں دونوں بچے بیٹھے تھے۔ انھوں نے بہت محتاط انداز میں بات کی۔ ''بیٹا جہاز میں مسافر تو وہی ہوتے ہیں ناں جو یورپ میں برسہا برس رہنے کے بعد وطن کا سفر کرتے ہیں۔ پاکستانی ایئر ہوسٹس دیکھ کر ان کی ذہنیت بھی شاید وہی ہو جاتی ہے جو وہ انیس سو ستر کی دہائی میں یہاں سے لے کر گئے تھے۔ ایک خاتون جوان مسافروں کو چائے پانی دینے اور سہولیات بہم پہنچانے پر مامور ہے، کہیں نہ کہیں اس کی تضحیک کرنا اور اسے ''نوکرانی'' سمجھنے کا رویہ اذہان میں کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ پھر مذہبی طور پر بھی ان کی نوکری کو ناجائز تصور کیا جاتا ہے۔ مجھے پاکستان کے ہوائی اڈے کے بارے میں علم تو نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ خواتین اور بچوں کے ساتھ ایسے ہی ناانصافی اور بدنظمی ہوتی ہوگی۔''

یہاں سے بات نے فیمنزم کی طرف رخ موڑا۔ عالیہ آہستہ سے بولی، ''امی، نانا ابو فیمنسٹ ہیں؟''

ابا جی کو ہنسی آ گئی، ''ہر وہ انسان جو انسانوں سے محبت کرتا ہے وہ فیمنسٹ ہے۔''

پھر ابا جی نے اسے بی بی زینب رضی اللہ عنہا کی داستان سنائی۔ تایا جان کو بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نظمیں زیادہ پسند تھیں لیکن ابا جی کی تان ہر جگہ آ کر بی بی زینب رضی اللہ عنہا پر ٹوٹتی تھی۔ ان کا خطبہ ابا جی کو عربی زبان میں ازبر تھا۔ جب کالج کے دوران وہ ان کا حوالہ دیتے تو مجھے مہمیز کرتے۔

''تصور کرو، ذرا سوچو، کہ جس صدی میں دنیا عورت کو گائے اور بھینس سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی اس زمانے میں ایک خاتون اس معاشرے کے منہ پر زبردست طمانچے رسید کرتی ہے۔ وہ بول سکتی ہے، اسے کسی دربار کی سطوت ہراساں نہیں کرتی۔ سوچو جانِ پدر، اسے اپنے بھائی کی لاش غمزدہ کر کے گھٹنوں کے بل نہیں گرا سکتی، جلے ہوئے خیمے، بھوکے پیاسے بچے نہ اسے لب بستہ کر سکے اور نہ ہی اسے مجبور کر پائے کہ وہ کسی سمجھوتے پر دستخط کرے۔ تصور کرو، اور محسوس کرو، ایک عورت کی آواز، ''انصتو'' کہتی ہے اور مجمعے کے سر پر پرندہ بیٹھ جاتا ہے۔''

مجھے بہت دیر بعد اندازہ ہوا کہ ابا جی کو اس خطبے سے عشق تھا۔ اسے پڑھتے ہوئے وہ آبدیدہ ہو جاتے۔ ابا جی نے ہی مجھے اس خطبے کا اردو ترجمہ پڑھایا اور میں نے کبھی کالج میں عربی کا مضمون نہیں رکھا تھا لیکن ابا جی کے پڑھائے تراجم نے ہمیشہ میری رہنمائی کی۔

ان کے دنیا چھوڑ جانے کے کئی برس بعد جب میرا بیٹا عربی بولتا اور لکھتا ہے، بی بی زینب رضی اللہ کے روزے پر حاضری دینے دو مرتبہ گیا، جب وہ کہتا ہے کہ اگر میری بیٹی ہوئی، اگر میری بیوی نے مجھے اس کا نام رکھنے کی اجازت دی تو میں اس کا نام فاطمہ رکھوں گا۔ زینب تو خاندان میں پہلے سے ہی ہیں ناں۔ امی جی آپ کو علم ہے کہ زینب نام کا کیا مطلب ہے؟ جونہی اس نے یہ کہا تو مجھ پر بھی ابا جی ہی کی طرح رقت طاری ہو گئی۔

میں نے ڈینش شاعرات پر لکھی گئی تحقیق و تراجم کی مکمل کتاب کا انتساب جب بی بی زینب رضی اللہ عنہا کے نام کیا اور اس کے بارے میں ڈینش احباب کو بتایا تو محفل پر ایک سکتہ چھا گیا۔ میری پنجابی نظم ''چنی'' (چادر) کی وجہ نزول بھی اپنے بچپن کی یہی فضا رہی ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا کہ میری شخصیت بنانے اور اسے ایک سنگتراش کی طرح مسلسل تراشنے میں ابا جی کی ذات

شامل تھی۔ شعر و ادب کی دنیا میں قدم رکھنے اور مگرمچھوں، کرگسوں اور بھیڑیوں سے نہ ڈرنے کا سبق اور ہمت ان ہی کی عطا کردہ تھی۔

••

ابا جی کی تربیت نے مجھے ادھورے علم کے ساتھ ایسی روایتی فیمینسٹ نہیں بننے دیا جو بہتر مرد پیدا کرنے کے بجائے ان سے دشمنی پر اتر آئے۔ ان کی تربیت نے پورے علم کے زعم کے ساتھ صرف خود کو درست سمجھتے ہوئے دوسرے مذاہب کی تعلیمات کی دھجیاں اڑانے نہیں دیں۔ مجھے تفکر، تدبر اور تحریر کی اہمیت سے روشناس کرایا۔

''آپ کے لفظ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ لوگوں کے اذہان کو منور بھی کر سکتے ہیں اور منفی بھی، سو جو لکھو دیانت داری اور احساسِ ذمہ داری سے، جس شعبے میں قدم رکھو جانفشانی سے اور محنت سے اس ذہانت کا بھرپور استعمال جو قدرت نے عنایت کی اور اس تربیت کا اظہار جو قسمت نے روشن خیال مردوں کو عطا کی اور یہ مواقع جو مقدر نے آپ کو ازسرِنو عطا کیے۔ سفر و سیاحت، علم کا حصول اور نئی زبانوں تک رسائی، ہر پل کو زندگی کا آخری پل سمجھ کر جینا چاہیے۔ تشکر اور محنت لازم ہے، صرف ذہانت کچھ نہیں بناتی۔''

مجھے یہ کہتے ہوئے بھی فخر ہوتا ہے کہ یہ مواقع مجھے ابا جی نے فراہم کیے۔

••

کھانا خود گرم کرلو۔

اس نعرے میں ذرا سی تبدیلی (کھانا خود گرم کرلو اور صرف اتنا کرنا جتنا کھالو۔ بار بار کھانا گرم کرنے سے مضرِ صحت ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ نعرہ نہ رہا۔ یہ تو بھاشن ہو گیا۔)

LUMS لمز میں فیمنزم پر لیکچر کے دوران بہت سوالات اٹھائے گئے۔ مجھے تدریس کا خوبصورت ترین لمحہ وہ لگتا ہے جب طلبہ و طالبات آپ سے بے جھجک ہر سوال کر سکیں۔

گجرات یونیورسٹی میں مجھے ان سے مکالمہ کرنے کے دو مواقع ملے اور ان کے اساتذہ محترم شیخ عبدالرشید اور ڈاکٹر غلام علی نے مجھے بہت خوشگوار حیرت سے بتایا کہ آپ کے ساتھ تو وہ طالبات بھی کھل کر بات کر رہی تھیں جو عام طور پر جماعت میں خاموش ہی رہتی ہیں۔

یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی اور مینجمنٹ کی استاد ڈاکٹر عنبرین صلاح الدین نے یونیورسٹی کے سکول آف سوشل سائنسز اینڈ ہیومنٹز کے شعبہ جینڈر سٹڈیز کے زیرِ اہتمام سکینڈے نیوین وومین

رائٹرز کے حوالے سے ''بریکنگ بیریرز آف جینڈر آئڈینٹٹی'' کے عنوان سے ایک لیکچر میں مدعو کیا۔

جناب سعود عثمانی کی شرکت بھی ایک اعزاز تھی اور ڈاکٹر عبداللہ جو واشنگٹن سے آئے تھے اور خوبیِ قسمت سے شامل ہو گئے، انھوں نے بھی سکون اور تحمل سے لیکچر سنا۔ یورپی ممالک میں مصنفات اور شاعرات کی طویل جد و جہد، مذہبی، معاشرتی اور قانونی محاذوں پر چومکھی لڑتی عورتوں کی کہانیاں طلبہ و طالبات کے لیے حیرت انگیز تھیں۔ خوب سوالات کیے گئے۔ کیا اسلامی ممالک میں فیمنزم کا فروغ ہو سکے گا؟

سعود عثمانی اور ڈاکٹر عبداللہ کی گفتگو بھی بے حد پسند کی گئی۔ امریکہ میں پچاس برس گزارنے کے بعد ان کے خیالات ان کے تجربات و مشاہدات کے عکاس تھے۔ دنیا نہ ہی کبھی ایک خواب جزیرہ رہی ہے نہ رہے گی۔ لیکن ایک مثبت اپروچ یہ ہے کہ جو اچھی چیزیں ہیں وہ چن لی جائیں اور کم اچھی نظر انداز کی جائیں۔ ناجائز اور ظالمانہ پر صدائے احتجاج بلند کی جائے، عملی قدم اٹھائے جائیں۔ اپنے گھر اور اثر کے دائرے میں لوگوں کو حکمت اور تحمل سے بدلا جائے اور آخر میں منظم اور متحد جد و جہد کی جائے۔

بلند آہنگ احتجاج اور نفرت کے سیل میں فرق میرے نزدیک انتہائی اہم ہے۔ اس سے جن اذہان نے ساتھ دینا ہے وہ بھی مشوش ہو جاتے ہیں۔ خیر یہ تو نقطۂ نظر اور طریقِ کار کی بات ہے لیکن جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے، مردوں نے تعلیمِ نسواں اور آزادیِ نسواں کے لیے اقدامات کا آغاز گھر کی عورتوں کو تعلیم کی دولت دلانے سے کیا۔ پھر کتب لکھیں۔ آئین سازی کی طرف قدم بڑھایا۔ پراعتماد اور تعلیم یافتہ خواتین اکثر انگلی پکڑے ہوئے باپ اور بھائیوں کے شانوں پر کھڑی ہوتی ہیں۔ اس کے بعد مقدر سے جنگ شروع ہوتی ہے۔

میں کتاب کا لنک دے رہی ہوں۔ مغربی اور یورپی معاشرے میں مردوں نے حرفِ حق بلند کرنے کی ابتدا کی۔ لیکن اگر اس کے متوازی تحقیق بھی ہو تو میں ضرور پڑھنا چاہوں گی۔ علم میں کچھ بھی حرفِ آخر نہیں ہوتا۔

Robertson, Stacey (2000)۔ Parker Pillsbury: radical abolitionist, male feminist Ithaca, NY: Cornell University Press ISBN 9780801436345

••

اباجی کا پختہ خیال تھا کہ خواتین کی حالت سدھارنے میں ابھی طویل وقت لگے گا۔

''سماجی طور پر بظاہر آزاد اور برسرِ روزگار خواتین کی زندگی بھی داخلی طور پر شدید خلفشار کا نمونہ ہوتی ہے۔ بجائے اس کے کہ شوہر اور سسرال اس بات کی تکریم کریں کہ ایک عورت نہ صرف اپنے بچے عام عورتوں سے زیادہ توجہ سے پال رہی ہے، خود ہی ان کو پڑھاتی ہے بلکہ معاشی طور پر خاوند کی ذمہ داریاں اٹھانے کو بھی رضامند ہے۔ ایسے میں یا تو مرد ان کی ذمہ داری مکمل طور پر اٹھائے، ضرورت پڑنے سے پہلے وہ فرض سمجھ کر پوری کر دی جائے، احسان جتا کر خرچ نہ دے۔ بصورتِ دیگر ملازمت پیشہ خاتون کی دوہری عزت کی جانی چاہیے، ایک تو اولاد پال کر دینے کی اور دوسرے اقتصادی بوجھ بٹانے کی۔ لیکن عملی زندگی میں ان کی زندگی کو زیادہ دشوار اور پیچیدہ بنایا جاتا ہے۔ آج کی عورت سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ گرم گرم روٹی پکا کر پیش کرنے کے بعد پاس کھڑی ہو کر مور چھل جھلنے لگے یا باورچی خانے سے بھاگ بھاگ کر کھانے کی میز تک گرم چپاتی اتار کر پیش کرتی رہے۔ کھیتوں میں چائے اور کپاس چننے والی عورتیں اور کرسی پر بیٹھ کر کام کرنے والی عورتوں کے ساتھ کم و بیش ایک سا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ دونوں کی خدمات کو سراہا نہیں جاتا۔''

''خدایا، حد ہے اباجی، آپ کو یہ سب داستانیں کون سنا جاتا ہے۔'' میں ان کے تجزیے پر حیران ہوتی۔

''بیٹا ہمارے پاس روزانہ صرف مریض نہیں آتے، کہانیاں خود چل کر آتی ہیں۔ اس مسئلے کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ایک اچھی تعلیم یافتہ اور برسرِ روزگار بچی کی تربیت میں مصلحت اندیشی، معاملہ فہمی اور مفاہمت ضرور شامل ہونی چاہیے تاکہ وہ زیادہ بہتر انداز میں افراط تفریط سے بچتے ہوئے معتدل اور درمیانہ راستہ اختیار کریں۔ اس سلسلے میں مائیں ایک کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ جتنا علم زیادہ ہو اتنا ہی عجز بھی بڑھنا چاہیے۔ جو ماں اپنی بچی کو ایک اچھی عورت، اچھی شریکِ حیات اور ایک اچھی ماں بنانے میں کامیاب ہو جائے وہی اس کی اصل کمائی ہے ورنہ دورِ حاضر میں بیویوں کو ایک عجیب خودسری سکھائی جانے لگی ہے جس میں انھیں علم کا غرور اور ملازمت کا ناز سکھا دیا جاتا ہے۔ جہاں تکبر اور خود پسندی اور احساسِ برتری کا مرض ہوتا ہے وہاں فطرت میں موجود باقی صلاحیتیں اور خوبیاں دب جاتی ہیں۔ جذباتی اور عملی زندگی میں درست خطوط پر تربیت کا فقدان ہے۔ زندگی کا اہم ترین مقصد سب سے پہلے اچھی نئی نسل کو پروان چڑھانا ہے۔ ایسے لوگوں کو معاف نہیں کیا جاسکتا لیکن خود کو تو معاف کیا جاسکتا ہے ناں۔ جو وقت ضائع ہو گیا سو ہو گیا، بس اب جو مٹھی میں

ہے اسے بہترین اور باثمر طریقے سے استعمال کرو۔''

شاید ان تمام باتوں کا اثر میرے بچوں میں آ گیا۔ میرا بیٹا ماشاءاللہ بہترین کھانا پکاتا ہے۔ اسے گھر کے کام کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔ میں نے شعوری طور پر اس کی تربیت میں یہ بات شامل کرنے کی کوشش کی ہے کہ شادی کا مطلب خوشی ہے۔

''آپ کے وجود سے آپ کے ساتھی کو خوشی اور سکون ملے نہ کہ اس کو وقت پر گرم روٹی مہیا کرنے کا عذاب آمیز خوف ہو۔ ایک عورت جو آپ کے مکان کو گھر بنانے آئے اور زندگی میں اولاد کی خوشیاں دینے آئے اسے صرف محبت ہی نہیں عزت سے نوازنا بھی آپ کا فرض ہے''

''امی جی'' وہ ہاتھ جوڑتا، ''مجھے معاف کر دیں۔ میں اگر ایک شاعرہ کے گھر پیدا ہو ہی گیا ہوں تو اس کے سارے خواب کیا میں نے ہی پورے کرنے ہیں؟''

''ظاہر ہے، کرنے پڑیں گے۔ میرے خوابوں سے آپ کے خواب بھی پیوستہ ہیں۔ وقت جس رفتار سے گزرتا ہے وہ دن دور نہیں جب میرا اللہ مجھے یہ خوشیاں دکھائے گا۔''

••

سکول میں ملازمت کے دوران مجھے اس نظام کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جسمانی طور پر بچے مغرب کے ترقی یافتہ ملک میں رہتے تھے لیکن گھر کی چار دیواری میں جاتے ہی ان کو احساس دلایا جاتا کہ ہم ہر لحاظ سے مختلف ہیں۔ پھر جب شادی کا وقت آتا تو نہ صرف یہ کہ وہ اپنی کسی غیر ملکی ہم جماعت سے یا گوری سے تو شادی کا تصور بھی نہ کریں بلکہ انھیں اپنی ذات سے باہر کسی پاکستانی سے شادی کی بھی اجازت نہیں۔ سید سید کے ساتھ اور چودھری اپنی ذات ہی میں کھپے گا۔ والدین ہنکا کر بچوں کو واپس پاکستان لے جاتے تاکہ ان کی کزنز سے ان کی شادیاں کرائی جائیں۔ ایسا ایک نسل تک تو کامیابی سے ہوتا رہا۔ بچے سمجھوتہ کر لیتے اور اماں ابا کو سکون ہو جاتا۔ راوی چین لکھنے لگتا۔

پھر وقت پندرہ بیس سال آگے بہہ نکلا۔ اب ایک ناقابلِ یقین بات یہ ہوئی کہ جب یہاں کے بچے پاکستان گئے تو وہاں بھی وقت بہت تیز چال چل کر ایک دوسرے دائرے میں شامل ہو چکا تھا۔ اب وہاں کے لڑکوں کو بھی اپنی ہم جماعتیں پسند آنے لگیں۔ انھیں اس معاشرے کو سمجھنے والی، اور اچھے عہدوں پر فائز طرحدار لڑکیاں اچھی لگنے لگیں۔ دور دیس سے آئی شہزادی جسے ایک خاص ماحول میں رکھا گیا اور انیس سو اکہتر کے پاکستان کے دیہی معاشرے کے مطابق تربیت دی

گئی لڑکی مسترد کر دی گئی، یا پھر یورپ آنے کے بہتر امکانات اور سمجھوتے بھری زندگی کا آغاز ہوا بھی تو شادی کے بعد زیادہ دیر تک نبھاہ نہ ہوسکا۔ شادیوں کا آغاز ہی پاسپورٹ لینے کی نیت کے بعد ''نمٹ لیں گے'' کے اصول کے تحت ہونے لگا۔ وطن سے آنے والے روشن خیال اور بے فکرے نوجوان کو برف میں سخت جسمانی محنت کر کے کاروبار چمکانے والے سسر ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اسی طرح پاکستان سے اعلیٰ تعلیم اور کھلے روشن ماحول سے آئی ہنستی کھیلتی لڑکی کو سسرال ایک دھمکی سمجھنے لگا۔ جن ممالک میں زبان انگریزی نہیں تھی وہاں زنانہ سیاست کے تحت اسے زبان سیکھنے کی اجازت نہ دی جاتی حتیٰ کہ ذاتی معاملات کے لیے ڈاکٹر کے پاس بھی ساتھ ساس یا نند جاتی۔ کچھ مقدمات ایسے بھی دیکھے گئے کہ بچی کو پہلے چچا کے گھر بیاہ دیا گیا۔ چند مہینے بعد اندازہ ہوا کہ اس سے نہیں نبھ سکے گی تو لڑکے کو واپس رخصت کر دیا گیا۔ اب والدہ کا 'سنہری دور' آیا۔ شوہر کے خاندان کو برا بھلا کہہ کر اور بھائیوں کو باہم صف آرا کروا کر اپنے بھانجے کا رشتہ پیش کر دیا۔ اب کی مرتبہ بچی پاکستان گئی تو اس کا نکاح خالہ کے بیٹے سے ہوگیا۔ یہ بندھن بھی سال سے کم چلا اور خاندانی رنجشوں کی وجہ سے نتیجہ پھر علیحدگی تک پہنچا۔ اب بچی بھاگ کر اسلام آباد سفارت خانے تک پہنچی جنھوں نے اسے بغیر پاسپورٹ کے راتوں رات واپس پہنچایا۔ والدین کی خواہشات کے لیے تجرباتی خرگوش بننے اور جذباتی طور پر ویران ہونے کے بعد اس نے علمِ بغاوت لہرا دیا۔ اب وہ ایک ڈینش کے ساتھ آزادانہ خود مختار زندگی گزار رہی ہے۔

''ہاہائے۔۔۔اینوں کلمہ ای پڑھالے۔ یہ تو نرا کفر ہے۔''

ایک صاحبہ کے مفت مشورے پر پٹاخ سے جواب آیا، ''دو کلمہ گوؤں کی دوزخ سے نکل کر آئی ہوں۔ اب یہی جنت ٹھیک ہے۔'' اس نے بھی جوابی حملہ کیا، ''یہی وجہ ہے کہ میں آپ لوگوں سے ملنا ہی نہیں چاہتی۔''

''قصور وار کون؟'' ابا جی جو اب تک تحمل سے میری بات سن رہے تھے، آرام سے بولے، ''یہ کثیر الثقافتی معاشروں کے عام موضوعات ہیں۔ اس کا مغرب سے تعلق نہیں۔ برِصغیر پاک و ہند ہو یا عرب ممالک، یہ انسانی فطرت کی داستانیں ہیں جو رنگ بدلتی ہیں۔ والدین کا فرض ہے کہ اولاد کو جانور سمجھ کر اپنی مرضی کی مادہ یا نر کے پنجرے میں بند کر کے تماشہ نہ دیکھیں۔ اپنی خاندانی سیاست کی بساط پر اولاد کا سرمایہ داؤ پر نہ لگائیں۔''

••

ان دنوں یو کے سے آئے ایک صاحب کی دوسری شادی کا انکشاف ہوا جو انھوں نے پاکستان میں پہلی بیوی بچوں سے چھپ کر کی تھی اور اب ان کو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ دوسری بیوی اگرچہ تعلیم یافتہ اور حسین تھی اور عمر میں ان ولایتی صاحب سے بہت کم تھی۔ وہ اتنے میں ہی خوش تھی کہ محترم سال کے بعد دو ہفتے کے لیے آجاتے تھے۔ اسے خرچہ بھیجتے، چھوٹا سا گھر بنا کر دیا اور دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔

اب جب سیاسی مجرموں کی طرح انکشافات کا وقت آیا تو پہلی بیوی بچوں نے وہ فساد مچایا کہ الاماں۔ گھر میں اس مقدمے پر بحث ہوتی۔ ابا جی کا خیال تھا کہ محترم نے ایک عورت کو سہارا دیا اور اسلامی نکاح کرلیا۔

''وہ اس معاشرے میں ایک محفوظ زندگی گزار رہی ہے اور خوش ہے۔ یہ گھر گھر میں بن بیاہی عورتوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، اس سے بہتر نہیں کہ اس عورت نے سمجھوتہ کر کے گھر آباد کرلیا۔''

اس دن نجانے کیوں میں نے اپنے اختلافی نظریات کو بآوازِ بلند پیش کیا اور ابا جی ہی کے بتائے اصولِ اقتصادیات کے ساتھ جوڑ دیا۔

''دوسری بیوی وہی عورت بنے گی اور چھپ چھپا کر نکاح کر کے، صرف خرچہ لے کر راضی ہوجائے گی، وہی عورت بچہ پیدا کرنے کی خواہش اور مسرت سے دست بردار ہوگی، جو یا تو معاشرتی طور پر ایک تنہا بھیڑ ہے یا اقتصادی طور پر خود کفیل نہیں اور اسے تنخواہ کی طرح ایک ماہوار خرچہ چاہیے۔

اتنی برداشت بھی فطرت کے خلاف ہے۔ میں بحیثیت عورت کے آپ کو بتا رہی ہوں کہ کوئی عورت بھی ماں بننے کے اعزاز سے محروم نہیں ہونا چاہتی نہ ہی سماجی تحفظ کی طمع میں وہ اپنی فطرت کے دلکش ترین اعزاز سے محروم ہونا چاہتی ہے۔ جو عورت ان سارے مسائل سے آزاد ہوتی ہے وہ محبت یا تحفظ کے نام پر ایسے سمجھوتے نہیں کرتی، اور اگر کرے بھی تو اس کی زندگی کے بہترین سال دوسری بیوی بننے کے کردار کو اپناتے اور نباہتے گزر جاتے ہیں۔ میں بھی یورپ کے ایسے بے شمار مقدمے دیکھ چکی تھی جس میں بالآخر دونوں بیویوں میں سے ایک کا استحصال ہوتا تھا۔

''دیکھیے ابا جی، وہ پہلے زمانے تھے جب خواتین دوسری، تیسری، اور چوتھی بیوی بننے پر رضا مند ہوجاتی تھیں۔ اب وقت اور اس کے تقاضے بدل چکے ہیں۔ بیویوں میں مساوات اور انصاف سے سلوک کرنا، ان کی ذمہ داری اٹھانا اور دونوں بیویوں سے حاصل کیے گئے بچوں کی پرورش کے مسائل آج کا خوشحال مرد نہیں حل کرسکتا۔''

ابا جی چند لمحے میری طرف دیکھتے رہے جیسے اس بات کا یقین کر رہے ہوں کہ یہ میں نے ہی ''فرمایا'' ہے۔ پھر آرام سے بولے، ''میرے بچے، انسانی فطرت نہیں بدلتی۔ آپ جدید انداز میں تحقیق کر کے دیکھ لیں۔ کتنی بیوائیں، مطلقہ، بن بیاہی بچیاں گھروں میں بیٹھی ہیں۔ وجوہات کچھ بھی ہیں۔ مسائل اور نتائج ایک سے ہیں۔ آپ دور مت جائیں۔ سامنے کی مثال اپنے خاندان کی لیں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں عزیز الرحمان کے جانے کے بعد اپنی بہو کو بھی صرف ایک نگران ماں بن کر نہ بیٹھنے دیتا۔ اگر کوئی میری رائے لیتا تو میں آپ کے چچا شریف کے دنیا کے رخصت ہونے کے بعد ان کی بیٹیوں کو اپنے بلند ترین معیار کے ساتھ سنگھاسن پر براجمان نہ ہونے دیتا۔ اور اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں آپ کو تنہا اقتصادی، ذہنی اور جذباتی محاذوں پر چومکھی لڑنے کی اجازت نہ دیتا۔''

اب خاموش رہ کر فرش کی طرف دیکھنے کی باری میری تھی، جیسے کہیں سے تیل نکلنے کی امید ہو۔

''ایسے مباحث میں ذاتیات کی بات کوئی دلیل نہیں۔ سماج کے سدھار میں یہ وہ اہم مسئلہ ہے جس سے اغماض برتا جا رہا ہے۔ اگر آج نہیں تو کل جب آپ یورپ اور مغربی دنیا میں خواتین کی تنہا سیاہ دیکھیں گی تو ضرور سوچیں گی۔ مسائل کے زیادہ اچھے اور کم اچھے حل ہر معاشرے میں موجود ہیں۔

میں پھر اپنی بات دوہراتا ہوں کہ آپ کے اختیار میں یہ ضرور ہے کہ آپ اپنی بچی کی تربیت کیسے کریں گی۔ کیا اس کو تعلیم اور ڈگریوں کے بلند زینے کی طرف مسلسل چڑھائی آپ کے کے اہداف میں شامل ہے یا کہیں رک کر بروقت، فطرت کے اصولوں کے مطابق اسے عملی زندگی کے آغاز کا سبق دینا بھی آپ کی ذمہ داری ہے؟

اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ بچیاں اپنی ڈگریوں اور اعلیٰ ملازمتوں کے زعم کے ساتھ گھروں میں بلیاں کتے پال کر زندگی گزار دیں یا سماجی سمجھوتہ کر کے ایک بامقصد زندگی گزاریں کہ آسان اور سہل زندگی کوئی بھی نہیں ہوتی۔ بزرگ یونہی نہیں کہہ گئے کہ ''دکھ سجا ایہہ جگ'' لیکن خوش قسمت لوگوں کو اپنے راستے خود منتخب کرنا چاہییں۔''

پھر بہت سال کے بعد ان بالواسطہ خطبات کے تحت میں نے بیٹی کی شادی تعلیم کے دوران ہی کر دی۔ لیکن میں اپنی دلیل اور موقف پر قائم رہی کہ ایسے خوش حال مرد اگر سنتِ رسول ﷺ

ہی پوری کرنا چاہتے ہیں اور اس میں ان کی ایک کم عمر، حسین عورت کے حصول کی غرض شامل نہیں تو وہ جوان بیواؤں، بے خطا مطلقاؤں اور دوسری بیوی کے مطالبے پر طلاق یافتہ اور تنہا رہ جانے والی پہلی بیویوں کو نکاحِ ثانی کے پیغام کیوں نہیں بھیجتے؟ ان کی فہرست پر کم عمر کنواری ہی کیوں ہوتی ہے۔

اگر درمیانی عمر کے تنہا مرد انتخاب کریں بھی تو دوسری بیوی کے طور پر وہ آزاد، خود مختار اور کسی بھی تسمہ پا بنے رشتوں کے بغیر عورت کی تلاش میں ہوتا ہے۔ اسے بہر صورت اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے۔ میں بہت بچ بچا کر اور محتاط اور محفوظ الفاظ میں اپنا زاویہ نظر بیان کرتی۔

••

''یہ معرکہ بھی ہو ہی جائے''، میں نے ابا جی کے بھیجے پیغامات سے تنگ آ کر جیسے خود سے کہا۔ مجھے خبر تھی کہ ان کو میری بیماری اور تنہائی کا شدت سے احساس تھا اور وہ براہِ راست مجھ سے اس موضوع پر بات کرنے سے گریز کر رہے تھے۔ لیکن کوئی نہ کوئی پیغام آ جاتا تو پھر ایک اجنبی سی لاتعلق فضا قائم ہو جاتی۔

ابا جی چھت پر چارپائی بچھائے بیٹھے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ اوپر چلے گئے۔ میں بھی ان کے پاس پہنچی۔

''کوئی تیسرا مجھے یہ پیغامات کیوں پہنچائے، ہم ہر موضوع پر پہلے کی طرح گفتگو کیوں نہیں کر سکتے؟''

ابا جی کا موقف تھا کہ اگر باپ بیوی کے مرتے یا زندگی سے نکلتے ہی تنہائی اور ذمہ داریوں کا کھکھیڑ ڈال کر فوراً شادی کر سکتا ہے تو عورت کیوں تنہا رہے اور کیوں اس کی اولاد پالتی رہے؟ یہ فطرت کے، دین کے اور انصاف کے منافی ہے۔

''ابا جی، یہ تجویز ہے، حکم ہے یا مشورہ؟'' میں بھی آخر ان ہی کی بیٹی تھی۔

''حکم تو خیر نہیں ہے،'' انھوں نے مونگ پھلی چھیل کر میرے ہاتھ پر رکھی۔

''میرے بچوں کے اور میرے درمیان کبھی کوئی نہیں رہا ابا جی۔ ان کی شخصیت کی تعمیر کے لیے اہم ترین عنصر یہی ہے کہ ان کو ایک غیر منقسم ماں ملے، سو فیصد ماں، جس کے ذہن پر کسی اور رشتے اور اس کے فرائض ادا کرنے کا بوجھ نہ ہو۔ اسی نصب العین کے لیے خانوں میں بٹی منتشر زندگی کو سمیٹا تھا کہ میرے بچوں کو میری ضرورت تھی ایک مکمل ماں کی، جوان کے لیے راستے بنا سکے اور خود کو مختلف بے سود اور بے ثمر محاذوں پر مسلح ہی نہ کرتی رہے۔ سو میں اسی مقصد کے لیے جینا

چاہتی ہوں۔ ساتھی، ہمسفر، شریکِ حیات، مجھے علم نہیں اس کی تعریف کیا ہے۔ ہمارے فرسودہ معاشرے کے مطابق مرد کو ایک قانونی خادمہ حاصل ہوجائے جو اس کی جملہ ذمہ داریاں اپنے کاندھوں پر اٹھالے، اس کی زندگی میں جگہ اور مقام بنانے کی بیمار، سستی اور غیر فطری خواہش کے لیے اپنی زندگی کا سانچہ بدل ڈالے اور پھر خود کو آنچ دیتی رہے؟ یا کوزہ گر کے چاک پر گیلی مٹی بنی گھومتی رہے کہ کبھی تو کوئی شکل مل جائے گی۔ ایسی بے یقین، بے شکل اور بے سمت زندگی سے بہتر ہے کہ اپنے فیصلوں کا ہفت رنگا ریشم اپنے ہاتھ ہی میں رکھا جائے۔

ابا جی خاموشی سے مونگ پھلی چھیلتے رہے۔

''آپ میری بیٹی کے لیے دعا کیجیے۔ میں ایک عورت دنیا میں ایسی پیدا کرنا چاہتی ہوں جسے کوئی رسم ریت یا قانون شکست نہ دے سکے۔ وہ اپنی شرائط پر اپنی زندگی کی جہات مقرر کرے۔ اسے ایک ایسا قدر دان انسان ملے جو اس کی ذات کا انہدام نہ کرے بلکہ تعمیر اور ترویج میں معاون ہو اور اس کی رفاقت کے سرمائے کی قدر کر سکے۔

نواسی کے ذکر پر ان کا چہرہ روشن ہو جاتا۔ فوراً بولے، ''اس کے ماتھے پر ستارہ روشن ہے۔ میں نہیں ہوں گا دیکھنے کے لیے لیکن وہ ایک نافع انسان بنے گی جو آپ کی ساری قربانیوں کے پھل جمع کرے گی۔''

اب جب کبھی لوگ میرے بچوں کو خوش بخت قرار دیتے ہیں تو ان کو علم نہیں کہ انھیں آج بھی مسلسل میرے بابل کی دعائیں پہنچ رہی ہیں۔ وہ جس یقین سے کہا کرتے تھے کہ یہ بچے نیکی کا تسلسل ہیں۔ ان کو اچھا انسان بنانا ہے، اچھی اولاد نہیں۔ ان کے سجدۂ نیم شب میں ہمارا نام ہوتا، وہ اس دنیا سے رخصت ہونے کے آخری لمحے تک میرا ہاتھ تھامے رہے۔ بھلا اس ہاتھ کے ہوتے ہوئے مجھے کسی اور کی دستگیری کی ضرورت تھی؟

••

میرا ہمسایہ کافر ہے ملحد ہے یا جو بھی ہے، اس کا فیصلہ اسے پیدا کرنے والا کرے گا۔ مجھے یہ علم ہے کہ جب کبھی مجھے یا میرے بچوں کو ضرورت پڑی وہ خود اور اس کے بچے حاضر رہے۔ میں زندگی میں کبھی نہیں بھلا سکوں گی کہ اس کا بیٹا میری گاڑی کی برف ہٹا رہا تھا۔

''بچے یہ کیا کر رہے ہو؟''

اس نے ہاتھ روکے بغیر کہا، ''صبح تم جاب پر جاؤ گی تو تمھیں برف نہیں ہٹانا پڑے گی۔''

میرے دل میں کچھ پگھلنے لگا۔ یہی کام ایک دفعہ میرے بیٹے نے بھی کیا تھا۔ مسلسل گرتے کپاس کے پھاہوں جیسی برف میں تیزی سے برف صاف کیے جا رہا تھا۔ میں نے اوپر کھڑکی سے اسے دیکھا اور بھاگتی ہوئی نیچے گئی، ''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''امی جی، اب ہمارے پاس گیرج تو رہا نہیں، صبح آپ کو جلدی اٹھنا ہوگا تو برف کیسے صاف کریں گی؟''

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ساری رات یہ منہ پھٹ بدلحاظ ضدی برف اس کی محنت کو اکارت کر دے گی۔ مجھے اپنے بیٹے کے احساس کی تو سمجھ آئی لیکن سٹین کے بیٹے کی وہی حرکت ایک سوچ جگا گئی۔ محبت فاتحِ عالم ہے جو رنگ، نسل، مذہب اور سرحد کی کسی پابندی کو نہیں مانتی۔

••

میری زندگی کے ہر خانے میں ابا جی ایک جگمگاتی مشعل بن گئے۔ مجھ پر یہی احسان کافی ہے کہ زندگی جینے کے لیے انھوں نے اپنے عمل سے چند اصول سکھا دیے اور ان کو پلے سے باندھے صرف اس بات کی تگ و دو کی کہ دوسروں کے لیے کیسے نافع انسان ثابت ہو سکیں۔ لوگوں سے توقعات نہ رکھیں تو کبھی مایوسی نہیں ہوگی۔ لوگوں کی خامیوں اور کوتاہیوں کے کھوج میں نہ رہیں اور ان کو پکڑ کر عدالت کے کٹہرے میں کھڑا نہ کریں تو آپ کا اپنی ذات کے ساتھ نہ تصادم ہوگا نہ ہی آپ کی ذہنی اور جذباتی دیواروں کا انہدام ممکن رہے گا۔

ابا جی ہمیشہ سے خوش امید اور خوش گمان رہے۔ مجھے اکثر کہا کرتے، ''بس دنیا کے ساتھ اتنا چلنا میری جان جتنی ضرورت ہے۔ آپ نے اپنے پورے خاندان کے ساتھ ہمیشہ بھلائی کی، خیر کا سوچا۔ میں دیکھنے کے لیے نہیں ہوں گا لیکن وہ جو ساری خیر کا مالک ہے وہ آپ کی نسل کو نوازے گا۔ لوگوں کے شر سے اور احسان فراموشی کی وجہ سے اپنی ذات میں موجود خیر کے احساس کو مرنے نہ دینا۔ دنیا کا یہی چلن ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ ''جس پہ احسان کر اس کے شر سے ڈر'' لوگ شاید اس کا مطلب سمجھتے ہیں کہ احسان کرنے سے باز آ جانا چاہیے۔ اللہ نے ایک نافع انسان کی فطرت میں خیر رکھی ہے۔ اگر ایک جانور اپنی فطرت سے باز نہیں آتا تو ایک انسان کیوں ترک کر دے؟ میں آپ کے لیے ہمیشہ دعا کرتا ہوں کہ آپ درست فیصلے کریں۔ اس دنیا کے ساتھ کتنا چلنا ہے کہاں چھوڑنا ہے اور کب راستہ بدلنا ہے، یہ فیصلے اپنے ہاتھ میں رکھیں۔''

ادھی لعنت دنیا تائیں ساری دنیا داراں ہو

راہ صاحب دے خرچ نہ کیتی لین غضب دیاں ماراں ہو

پیواں کولوں پتر کوھاوے پھِٹ دنیا مکاراں ہو

دنیا ترک کیتی جنھ باہو لیسَن باغ بہاراں ہو

میں نے حتی الوسع ان باتوں کو یاد رکھنے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ شاید اسی کوشش کی وجہ سے میرا ابا جی سے تعلق ہمیشہ قائم رہا۔ میں کبھی قبرستان نہیں گئی کیونکہ میرے دل اور میرے تخیل میں وہ ہمہ وقت موجود ہیں۔

••

رات کو سونے سے پہلے مطالعے کے نشے کی عادت ابا جی ہی کی وجہ سے پڑی۔ جب بھی پیسے جمع ہو جاتے، کالج سے واپسی پر فراز کی کتابیں خریدنے چل دیتے۔ ڈرائیور کو تنگ کیا جاتا کہ بک کارنر چلو۔ اس نے ابا جی سے کہا بی بی بہت دیر لگاتی ہیں، اور مجھے تاخیر ہو جاتی ہے۔ کہنے لگے کون سا روز جاتی ہے۔ جب وہ کتابوں کی دکان پر جانے کا کہے تو ضرور لے جایا کرو۔ پھر مجھے بھی سمجھایا کہ اس غریب کو ایک دن پہلے کہا کرو تا کہ وہ تیار ہو کہ آپ اس کا وقت ضائع کریں گی۔ سرائے عالمگیر کے تمام طلبہ و طالبات کے لیے بک کارنر ایک ناگزیر ضرورت تھا۔ مجھے تو خیر ادبی کتابوں اور رنگ برنگے کارڈز کا شوق وہاں لے جاتا۔ شیشے کے لمبے شوکیس کے اندر تازہ ترین کتب سجی دعوتِ مطالعہ دیتیں۔ کمرے میں چھت تک سجائے شیلف میں پہلو بہ پہلو سلیقے سے جمی کتابیں منتظر آنکھوں سے دیکھتیں۔ زندگی میں میرا ایک بڑا خواب یہ بھی رہا کہ میں اپنے کمرے میں پوری دیوار پر زمین سے چھت تک الماری لگوا کر اس میں اپنی کتابیں سجاؤں۔ سامنے شیشے کا دروازہ ہوتا کہ ان پر گرد بھی نہ پڑے اور دکھائی بھی دیتی رہیں۔ یہ بھی ابا جی کا احسان تھا کہ جب میں نے گھر کی آتش زدگی کے بعد اپنا نیا گھر بنایا تو انھوں نے مجھے بے شمار کتب بھجوائیں۔ میں نے اپنی خواب گاہ میں چھت تک اونچی الماری لگوا کر اس میں یوں ترتیب وار کتابیں سجائیں جیسے کوئی خوابوں کے موتیوں کی مالا پروتا ہے۔ پھر میں اپنی توقع سے کہیں زیادہ حریص اور خسیس ثابت ہوئی اور کتابوں پر نمبر لگا کر انھیں محفوظ کیا اور مستعار مانگنے والوں کی سنی ان سنی کر دی۔ یہ الگ بات کہ جب مجھے اچانک گھر چھوڑنا پڑا تو میری نازوں پلی کتب یہاں وہاں بکھر گئیں۔ اس کا حل میں نے ای بکس کے ذریعے کیا اور ایک خزانہ اپنے کمپیوٹر اور موبائل میں جمع کر لیا۔

عزیز بھائی نے شادی کے بعد بڑے کمرے میں دیوار کے ساتھ لمبی خوبصورت الماری بنوائی جس کے دروازے باہر کو کھلنے کے بجائے سلائیڈ کی طرح آگے پیچھے ہوتے۔ شفاف شیشے کے عقب سے کتابیں جھانک رہی ہوتیں۔ میں نے فوراً شیشے کے پٹ کھولنے کی کوشش کی لیکن ان کے درمیان کیمرے کی طرح چھپا ننھا سا تالہ میرا منہ چڑانے لگا۔ ''مجھے پہلے ہی پتہ تھا'' عزیز بھائی بولے، ''اور کوئی میری کتابیں چھیڑے نہ چھیڑے تم ضرور چوری کروگی۔ میں نے بندوبست کررکھا ہے۔''

مجھے کبھی محسوس ہی نہ ہوا کہ میں لاشعوری طور پر کتابوں کے سرورق کو ابا جی ہی کی طرح سنوارنے لگی تھی۔ ایک دن اچانک میں نے عالیہ کو رومی کی کتاب کے چمچماتے اور چکنے سرورق کو انہماک سے چھوتے دیکھا تو مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا، ''آپ نانا ابو کی طرح کتاب کے گال تھپتھپا رہی ہیں؟''

''جی نہیں امی، آپ جب اپنی الماری میں منہ دیے کھڑی ہوتی ہیں تو آپ بھی کتابوں کے ایسے ہی ناز اٹھاتی ہیں۔''

پھر ایک دن اُسامہ نے اچانک اعلان کیا کہ وہ عربی زبان سیکھے گا۔ دو برس کے عرصہ میں اس نے عربی زبان پر ایسا عبور حاصل کیا کہ ڈنمارک میں باقاعدہ امتحان پاس کرلیا۔ کتب جمع کرنے کا شوق بھی شاید کہیں وراثت میں ملتا ہوگا۔ اس نے دو مرتبہ مصر کے کتاب میلے میں شرکت کی اور گھر میں نادر عربی کتب کا خزانہ بھی جمع ہوگیا۔ امام شافعی کا شعری مجموعہ مجھے بھی مجبور کرنے لگا کہ میں عربی پڑھنا شروع کردوں۔ شدید حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب میں نے آئمہ صوفیہ کو باپ کے کندھے پر سوار دیکھا۔ جونہی مبین کتابوں کی الماری کے پاس سے گزرتے، وہ لٹک کر کتاب پر ہاتھ پھیرتی۔۔۔۔ ''آہا۔۔آ آ۔۔'' یہ ادا اس نے اپنے والد سے سیکھی۔

••

ہمارے بھانجے فیصل کی شادی پر جب اس کے سسرال کا پاکستان آنے کا پروگرام بن رہا تھا تو عزیز بھائی کے حادثے کی وجہ سے وہ ہچکچا رہے تھے۔ لیکن ابا جی نے فوراً فون کرکے کہا کہ جس طرح آپ لوگوں کو چھٹیوں کی سہولت ہو ویسے کریں۔ پھر شادی کے دوران بھی اس بات کا مکمل خیال رکھا کہ وہ خاندان دیس میں پردیسی ہے لہٰذا ان کو کسی فضول رسم اور جاہلانہ رواج اور مطالبے سے پریشان نہیں کرنا۔ افشاں کو بہت پیار سے افشاں رحمت کہتے اور اس کی سادہ معصومانہ باتوں پر خوب ہنستے۔

افشاں مجھے بتانے لگی کہ ''جب ہمارا نکاح ہوا تو میرے سہیلیاں کہنے لگیں، 'تم دانت نکال رہی ہو۔ لوگ کیا کہیں گے؟ تمھاری سسرال کیا کہے گی؟ ذرا رونے والا منہ بنالو۔' میں نے نانی اماں (میری امی جی) سے کہا کہ میں تو بہت خوش ہوں۔ جب مجھے رونا نہیں آ رہا تو میں رونے والا منہ کیوں بناؤں۔ آپ ناراض تو نہیں ہوئے ویڈیو اور تصاویر دیکھ کر۔'' نانی اماں کہنے لگیں ''ہنستے گھر بستے ہیں۔ اللہ آپ کو ایسے ہی ہنستا رکھے۔ فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

کنیڈا اور پاکستان میں وقت کے فرق کی وجہ سے جب وہ ملازمت سے واپس آتی تو فون کرتی۔ صبح کے تین چار بجے تھے۔ ابا جی نے فون اٹھایا۔ ''نانا ابو سوری، بہت دیر تو نہیں ہوگئی۔'' ابا جی نے کہا ''کوئی بات نہیں۔ اب جلد ہی نماز کا وقت ہونے والا ہے۔'' ابا جی اس کی معصوم باتوں پر خوب ہنستے۔ کہنے لگی ''نانا ابو، میرے میاں کو تو نماز نہیں پڑھنا ہوتی۔ آپ ذرا ان کو جگا دیں۔''

ابا جی اوپر اسے بلانے کے لیے گئے۔ افشاں کو اس کی والدہ نے ڈانٹا، ''کیوں غلط سلط وقت پر فون کر کے نیند خراب کرتی ہو۔''

بڑے آرام سے کہنے لگی، ''لیکن میں اپنے میاں سے بات کرنا چاہتی تھی ناں۔ اور جب نانا ابو کو مسئلہ نہیں تو آپ کو کیا پرابلم ہے؟''

افشاں کے ساتھ ابا جی کو ایک خاص انسیت تھی۔ کہا کرتے تھے کہ صاف شفاف طبیعت اور ایسی شیریں زبان بچی ہے کہ منہ سے پھول جھڑنے کے محاورے کی سمجھ آتی ہے۔ ایسی خصوصیات والے لوگ زندگی سے بہت خوشیاں کشید کرتے ہیں۔ ایسی بچیاں بہت اچھی مائیں بنتی ہیں۔ ان کی بات حرف بحرف درست نکلی۔

عالیہ کی شادی کے بعد ان کا پروگرام نیویارک جانے کا بن گیا۔ ان دنوں اُسامہ کو بھی چھٹیاں تھیں۔ فیصل نے فون کیا کہ آپ لوگ بھی چپ کر کے پروگرام بنالیں تاکہ جب عالیہ نیویارک سے کنیڈا آئے تو اس کا استقبال ہم سب مل کر کریں۔ ہمارے داماد صاحب کو بھی اس سازش میں شریک کرلیا گیا۔ بلکہ ان تاریخوں میں ٹکٹ بک کرانے کی ذمہ داری بھی ان کی تھی۔ عالیہ نے ہمیں ایئر پورٹ پر دیکھا تو اس کی حیرت اور مسرت دیدنی تھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ مبین تو حیران نہیں ہوئے۔ ناراض ہونے لگی کہ آپ لوگ کتنے منصوبے باز ہیں۔

افشاں نے انتہائی محبت سے دونوں کو ٹورنٹو گھمانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ اگرچہ بچے تو بچپن میں کنیڈا کی سیر کر چکے تھے لیکن اب فیملی کے ساتھ مل کر دیسی ریسٹورنٹ پر جانا اور نئے ایکوریم

میں جانا ایک دلچسپ تجربہ تھا۔

فیصل کا آٹھ سالہ بیٹا سرگوشی میں ماں سے پوچھنے لگا، ''یہ میری دادی ہیں؟''

افشاں نے کہا، ''ہاں اور یہ آپ کی پھوپھو ہیں اور اُسامہ آپ کے چچا ہیں۔''

اس نے کنفیوز ہوکر دوبارہ پوچھا، ''لیکن دادی اماں کو تو بوڑھا ہونا چاہیے تھا جیسے سکول میں سب کے گرینڈ پیرنٹس آتے ہیں؟''

''یہ ماڈرن دادی ہیں بیٹا۔ آج کل ایسی ہی دادیاں بنتی ہیں۔'' افشاں نے کہا، ''دانیال! ذرا دادی اماں کو معوذتین تو سناؤ۔''

اس نے خوبصورت قرات کے ساتھ سورتیں سنائیں۔ میں نے سو ڈالر نکال کر دیا۔ فوراً بولا، ''دادو! مجھے دو اور سورتیں بھی آتی ہیں۔''

افشاں جھٹ بولی، ''خالہ! یہ اپنے ابا پر گیا ہے۔ ساری اکانومی کی سمجھ آتی ہے اسے۔''

چند دن میں عالیہ اور مبین تو واپس ہوگئے۔ میں اور اُسامہ بذریعہ سڑک واشنگٹن سدھارے۔ ڈاکٹر عبداللہ اور منور احمد خالد نے بے مثل میزبانی کی۔ جب ہم واپس آئے تو طویل سفر سے بری حالت تھی۔

افشاں مزے سے بولی، ''خالہ آپ آرام کریں۔ پھر آپ نے مجھے شامی کباب اور دہی بڑے بنا کر دینا ہیں۔ ہم سے آپ جیسے نہیں بنتے۔'' مجھے ابا جی کی بات یاد آگئی کہ شیریں زبان بندہ آپ سے جو چاہے منوا سکتا ہے۔

عالیہ کی شادی پر فیصل سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مہینے کے لیے آگیا۔ سارے عملی کام اور ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں۔ عالیہ کہتی فیصل بھائی مجھے دونوں دن مہندی کا نیا ڈیزائن بنانا ہے۔ ''چلو۔۔۔'' فوراً گاڑی نکالی اور صبح نو بجے لے گیا۔

''فیصل بھائی، مجھے تیار ہونے بیوٹی پارلر جانا ہے'' وہ پھر فرمائش کرتی۔ ''چلو ایڈریس ڈالو موبائل میں۔'' ان دنوں سام سنگ نوٹ 2 نیا نیا آیا تھا۔ فیصل نے کہا کہ افشاں کا مشورہ تھا کہ ہماری ہائی ٹیکنالوجی کی عاشق خالہ کو سونا چاندی تو متاثر نہیں کرے گا، ان کے لیے یہ موبائل اور ایکسٹرنل ڈرائیو ہی بہترین تحفے ہیں۔ عالیہ کے لیے اس نے پرفیوم کے سیٹ، میک اپ اور نجانے کیا کیا پیک کرکے بھیجا۔ مادّی چیزیں محبتوں میں اگرچہ ضروری نہیں ہوتیں لیکن یہ جذبے کی یادگاریں ضرور بن جاتی ہیں۔ مجھے ابا جی کی پیشگوئیاں یاد آنے لگیں۔ ''فیصل آپ کو پلا پلایا بیٹا ملا

ہے۔ اللہ جب نواز نے پر آتا ہے تو وہ نیکیوں کا اجر یونہی دیتا ہے۔'' ابا جی کی بات حرف بحرف سچ ہوئی۔

عالیہ کی شادی پر مہینہ بھر فیصل نے مجھے احساس نہیں ہونے دیا کہ میں تنہائی محسوس کروں۔ ''خالہ لائیں میں آپ کے پاؤں دباؤں۔ دیکھیے کتنے سوج گئے ہیں۔''

کبھی کہتا ''خالہ چلیں، کوپن ہیگن آئسکریم کھا کر آتے ہیں۔ گاڑی میں چلاؤں گا۔'' پھر اس نے لذیذ کھانے بنا کر کھلائے۔ مالمو گئے تو وہاں ہم نے یادگار وقت گزارا۔

اللہ جب آزمائش ڈالتا ہے تو راستے بھی بناتا ہے۔ مکان کو چھوڑنے کے فیصلے کے حق میں اس نے میرا جذباتی ساتھ دیا۔ ''خالہ آپ کا کوئی فیصلہ کبھی غلط نہیں ہوا۔ آپ جو کر رہی ہیں بالکل ٹھیک کر رہی ہیں۔ آپ نے ساری زندگی لوگوں کے کام کیے ہیں۔ اب ان لوگوں کی آزمائش کا وقت ہے کہ آپ کے دیے محبتوں کے قرضے واپس لوٹائیں۔''

عالیہ اور مبین ملائشیا چلے گئے تو فیصل نے میرا یوں خیال رکھا جیسے بچوں کو بہلایا جاتا ہے۔

••

بچے کتے کو ڈوگی کہتے ہیں، اور جونہی کسی نے کتا کہا۔ عالیہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھی، ''اف۔۔۔ امی خفا ہوں گی۔۔۔ یہ گندہ لفظ ہے۔''

میری امی کے محاوروں میں کتے کا لفظ جس کثرت سے استعمال ہوتا، یہی محسوس ہوتا کہ کتے سے برا اور پلید جانور ہی کوئی نہیں۔ پھر ایک اور ثقافتی حد بندی کہ سور نام نہیں لینا بلکہ اسے 'باہرلا' وغیرہ کہنا۔ عام خیال یہ ہے کہ سور یا خنزیر کا نام لینے سے زبان چالیس دن ناپاک رہتی ہے۔ لیکن قرآن میں تو خنزیر کا لفظ آتا ہے اور سورہ الکہف میں ان کا کتا غار کے باہر موجود تھا۔ اور پھر جانوروں کی دنیا میں کتا وفا کا استعارہ ہے۔

بڑے بھائی جان نے بھی چوکیداری کی غرض سے ہمیشہ کتے رکھے۔ ایک دن عالیہ نے ان سے پوچھا ماموں یہ ڈوگی لڑکی ہے یا لڑکا؟ جس پر میرے بھتیجوں نے اسے خوب تنگ کیا۔

جب عالیہ ان کے ساتھ فارم دیکھنے گئی تو کتے کے ننھے ننھے پلے دیکھ کر دونوں بچے بہت خوش ہوئے اور ان کی تصاویر بناتے رہے۔

ابا جی ان کو بابا بلھے شاہ قصوری کے اشعار سناتے جس میں کتوں کی وفاداری کا تذکرہ

کر کے انھیں انسانوں سے بھی بلند تر قرار دیا گیا۔ انسان تب اشرف المخلوقات ہے جب تک وہ اپنی زندگی کے مقاصد کو سمجھتا ہے۔

راتیں جاگیں کریں عبادت
راتیں جاگن کتے، تیتھوں اُتے
بھونکنوں بند مول نہ ہندے
جا روڑی تے ستے، تیتھوں اُتے
خصم اپنے دا در نہ چھڈدے
بھاویں مارو سو سو جُتے، تیتھوں اُتے
بُلھے شاہ اٹھ یار منا لے
نئیں تے بازی لے گئے کتے تیتھوں اُتے

(کتے انسان سے بلند مرتبہ لے گئے جو وفاداری اور شب بیداری سے اپنا یار منا لے گئے۔ جو اپنے مالک کا در نہیں چھوڑتے خواہ انہیں سو سو جوتے رسید کیے جائیں۔)

ابا جی نے کتوں کے بارے میں بچوں کے سوالات کا تفصیلی جواب دیا، شام کو ان کے ساتھ بیٹھ جاتے اور اسلامی کہانیاں سناتے جن میں حسنِ سلوک اور اعلیٰ اخلاق کا تذکرہ ہوتا۔ سیرتِ نبوی ﷺ سے واقعات سناتے۔ اسلام دینِ فطرت ہے جہاں بھی کوئی بات فطرت سے ہٹی ہوئی لگے اس پر سوال اٹھائیں، تحقیق کریں۔ شاید ان ہی دنوں کی برکات کا اثر تھا کہ اُسامہ نے عربی زبان اور حدیث وفقہ کے مطالعے میں بھرپور دلچسپی لی اور عرب اساتذہ سے تاریخ وتفسیر پڑھی۔

میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ کتے کے اندر دس صفات ہیں کہ اگر ان میں سے ایک صفت بھی انسان کے اندر پیدا ہو جائے تو وہ ولی بن سکتا ہے۔

① کتے کے اندر قناعت ہوتی ہے جو مل جائے یہ اسی پر قناعت کر لیتا ہے راضی ہو جاتا ہے، یہ قانعین یا صابرین کی علامت ہے۔
② کتا اکثر بھوکا رہتا ہے۔ یہ صالحین کی علامت ہے۔
③ کوئی دوسرا کتا اس پر زور کی وجہ سے غالب آجائے تو یہ اپنی جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جاتا ہے، یہ راضیین کی علامت ہے۔

④ کتے کا مالک اگر اس کو مارے تو وہ اپنے مالک کو چھوڑ کر نہیں جاتا، یہ صادقین کی علامت ہے۔

⑤ اگر کتے کا مالک بیٹھا کھانا کھا رہا ہو تو یہ باوجود طاقت اور قوت کے اس سے کھانا نہیں چھینتا، یہ مساکین کی علامت ہے۔

⑥ جب مالک اپنے گھر میں ہو تو یہ دور جوتوں کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہے اور ادنیٰ جگہ پر راضی ہو جاتا ہے، یہ متواضعین کی علامت ہے۔

⑦ دنیا میں رہنے کے لیے اس کا اپنا کوئی گھر نہیں ہوتا، یہ متوکلین کی علامت ہے۔

⑧ رات کو یہ کم سوتا ہے، یہ محبین کی علامت ہے۔

⑨ اگر اس کا مالک اس کو مارے تو یہ تھوڑی دیر کے لیے دور چلا جاتا ہے۔ اور اگر اس کا مالک اس کو دوبارہ روٹی ڈالے تو یہ دوبارہ آ کر کھا لیتا ہے۔ اس سے ناراض نہیں ہوتا۔ یہ خاشعین کی علامت ہے۔

⑩ جب مرتا ہے تو اس کی کوئی میراث نہیں ہوتی، یہ زاہدین کی علامت ہے۔

غور کریں کہ ان میں سے کتنی صفات کے ہم مالک ہیں۔

آدم از بے بصری بندگیِ آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد

(علامہ محمد اقبال، پیامِ مشرق)

آدمی اپنی بے بصری (اپنی حقیقت سے بے خبری) کی بنا پر آدمی کی غلامی کرتا ہے، وہ (آزادی و حریت) کا گوہر تو رکھتا ہے لیکن اسے قباد و جمشید (بادشاہوں) کی نذر کر دیتا ہے۔

یعنی اس غلامی کی عادت میں وہ کتوں سے بھی زیادہ خوار ہو جاتا ہے، (کیونکہ) میں نے نہیں دیکھا کہ (کبھی) کسی کتے نے دوسرے کتے کے سامنے سر خم کیا ہو۔

عالیہ اباجی کے پاس بستر پر چڑھ کر بیٹھ گئی، ”لیکن نانا ابو، ڈنمارک میں تو لوگ کتوں کو اپنی اولاد کی طرح پالتے ہیں۔ پھر جب سکولوں میں غیر ملکی بچے ان سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں تو جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ مسلمان ان کو ناپاک کہتے ہیں۔ امی جان نے بھی ہمیں ڈوگی کہنا سکھایا۔“

''فقہی مسائل اپنی جگہ، اور ان کو سمجھنے کے لیے سنجیدہ مطالعے کی ضرورت ہے۔ پھر یہ علمائے کرام کا فرض ہے کہ وہ نئی نسل کی رہنمائی کریں۔ سماجی طور پر عربوں میں کتے پالنا عام بات تھی جیسے آج کا یورپ، پھر کتوں کی کثرت کی وجہ سے کتے مارنے کے احکامات احادیث وسنت میں آئے۔ وہاں سے زبان کے ارتقاء کے ساتھ محاورات بنے۔''

''لیکن نانا ابو، وہاں تو بے بی ڈوگی ہوتے ہیں بہت پیارے۔ پھر میری سہیلی کی امی ان کی ٹریننگ کرتی ہے۔ وہ بدتمیز نہیں ہوتے۔''

''اچھا۔۔۔ ضرور تمیز دار ہوں گے۔ آپ ان کو برا بھلا نہ کہیں کیوں کہ وہ ان کا طرزِ زندگی ہے، لیکن اپنے گھر بھی نہ پالیں۔''

ابا جی نے درمیانی راہ دکھائی۔

''توبہ نانا ابو،'' ہمارے صاحبزادے شکایت لگانے کا سنہری موقع کیوں گنواتے، ''آپ کی بیٹی تو بلی تک نہیں رکھنے دیتیں حالانکہ مجھے بہت شوق ہے۔'' ابا جی نے نواسے کی طرف دیکھا، ''بیٹا جانور پالنا ذمہ داری کا کام ہے۔ آپ کی امی کیا کیا کریں؟''

جواباً میں نے بھی ابا جی کو بتایا کہ صاحبزادی گھوڑا پالنا چاہتی تھیں۔ اسے دو دن ایک فارم میں گھوڑے سے کھیلنے اور اس کی نگہداشت کرنے کے حقوق لے کر دیے۔ بی بی کو لے کر جانا اور پھر اس اجاڑ فارم پر اس کی دیکھ بھال کو موجود رہنا دردِ سر تھا۔ ابا جی نہایت تحمل سے منصف بنے کبھی سر گھما کر ان کی بات سنتے کبھی میری طرف متوجہ ہوتے۔

میں نے جوابی بیان دیا اور ان کو بتایا کہ اُسامہ صاحب نے خرگوش پال لیے۔ پھر ان کے ناز اٹھانے کے لیے ماں کو لگا دیا۔

''امی ان کو نہلا دیں۔'' کبھی ایک چھڑی اٹھا لاتا اور اس پر سے خرگوشوں کو چھلانگ لگوانے کی فرمائش کرتا۔ ''امی جی خرگوش موٹے ہو گئے ہیں، ورزش کرائیں۔ امی ان کے ناخن کاٹ دیں۔''

خصوصی نیل کٹر لینے کے لیے بازار پہنچے۔ سو کراؤن کا ناخن تراش لائی۔ اب اسے قابو کر کے ناخن تراشنا ایک الگ کہانی ہے۔ پنجرے کی صفائی اور خوراک دینے کے فرائض بھی اماں ہی انجام دے۔ میں نے الٹی میٹم دیا، ''یا تو یہ مخلوق خود پالو، یا انھیں گھر سے نکالو۔'' پھر دل پر پتھر رکھ کر اخبار میں اشتہار دیا کہ جسے خرگوش چاہییں آ کر پنجرے سمیت لے جائیں۔ چند گھنٹوں بعد فون

کی گھنٹی بجی، ایک چھوٹی سی محتاط آواز آئی، ’’خرگوش کتنے کے ہیں؟‘‘

’’بالکل مفت، بلکہ ساتھ میں ان کا بچا ہوا کھانا بھی اور ناخن تراش بھی۔‘‘

میرا جواب سن کر اس کی مسرت بھری چیخ گونجی۔ شام کو اپنے والدین کے ساتھ دو ڈینش بچے خوشی سے کودتے پھاندتے آئے اور پنجرہ اٹھا کر چلتے بنے۔ کتنے دن اُسامہ کی ٹھنڈی آہوں سے درجہ حرارت سرد رہا۔

ابا جی نے نواسے کو لپٹا لیا، ماتھے پر بوسہ دیا، پھر ہنس کر بولے۔ ’’گزارا کریں بیٹا اس ظالم ماں کے ساتھ۔‘‘ اور نانا نواسے کی ہنسی سے کمرہ گونجنے لگا۔

کیا کیا یاد کروں؟ اس برگد کی چھاؤں سے وابستہ یادوں کی لڑیوں کے موتیوں جو بکھرے ہیں تو ان سب کو سمیٹنا ممکن نہیں۔

••

قصہ ایک ترجمے کا.....

1722ء میں ڈینش عورتوں کو لکھنے پڑھنے کی آزادی نہیں تھی۔ لڈوگ ہولبرگ نے تعلیمِ نسواں کے حق میں نظم تحریر کی تھی۔

سترہ سو بائیس کی ایک نظم کا انتخاب تو کر لیا، ترجمہ کرتے ہوئے دانتوں پسینہ آ گیا۔

ڈنمارک کتب خانے کی ایک سہولت کا تذکرہ کرنا چاہتی ہوں۔

مجھے کسی بھی نظم و نثر کا ترجمہ کرنے سے پہلے اس کے بارے میں تمام تر تبصرے اور تجزیے پڑھنے کی عادت ہے۔ مختلف کتب اور مضامین سے ہوتے ہوئے خیال آیا کہ اس دور کے اخبارات کے تجزیے پڑھے جائیں۔

میں نے شہر کے کتب خانے سے بات کی۔ انٹرنیٹ پر تلاش کیا۔ بالآخر اخبار کا کالم مل ہی گیا جس میں اس نظم کا تجزیہ کیا گیا تھا۔ کتب خانے کے ملازمین نے مضمون کی ایک نقل بنا کر بھیجی، فیسبک پر ہی ایک ڈینش مصنف نے پہلے تو حیرت کا اظہار کیا کہ ایک غیر ملکی خاتون کیسے اس نادر نظم کے حوالے تک جا پہنچی، پھر اپنی کتاب کے بارے میں اطلاعات دیں، انٹرنیٹ پر کتاب ملنے کے بعد بھی پیغامات بھیجتے رہے کہ اگر کہیں بھی تفہیم کی مشکل ہو تو پوچھ لینا۔

مسلسل تحقیق اور تلاش کے دوران مجھے ایک کتاب ملی جس میں تفصیل سے اس نظم کا پس منظر، معاصرین کا ردِعمل اور نظم کے محاسن پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ ابھی چند لمحے پہلے میں نے ڈینش

رائل لائبریری کو لکھا کہ مجھے اس نظم پر تحریر کردہ کتاب درکار ہے۔ جواب میں کتاب کی فراہمی، ای بک، یا پی ڈی ایف کے تین آپشن ملے۔

''پی ڈی ایف،'' میں نے کلک کیا اور چائے بنانے چلی گئی۔ صرف پانچ منٹ بعد ای میل میں کتاب پہنچ گئی۔ میرا مطلوبہ موضوع، صفحہ نمبر بھی ہائی لائٹ کر دیا گیا۔ اندازہ کیجیے، ایک نظم کے ترجمے لیے پورا شہر حرکت میں آ گیا۔ کتب خانے کی دنیا بھی جہانِ دگر ہے۔ مسرور اور متشکر ہونے کے لیے کتنی باتیں ہیں۔ ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں۔

(Zille Hans Dotters Gynailcologia eller Forsvars Skriftfor Qvinde- Kidnnet)

Zille Hans Dotter'sCynailcologia, A Defense of Women

••

تراجم کی دنیا، شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے۔ ادبی دیانت داری سے اور براہِ راست اسی زبان سے تراجم کرنا کچھ ایسا بھی آسان نہیں۔ مغربی دنیا میں اس کے لیے ذولسانی اور ذوثقافتی ہونا شرط ہو چکا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ گزشتہ سال مجھے لوح مجلہ کے لیے نوبیل انعام یافتہ ڈینش ادیب ہنرک پون وہی ڈین، (Henrik Pontoppidan. 1857-1943) کا ایک افسانہ ترجمہ کر کے دینا تھا۔ ایک تو افسانے کا انتخاب جاگیردارانہ ڈنمارک کے حوالے سے کر لیا، ستم بالائے ستم کچھ الفاظ دیہی تہذیب سے تعلق رکھتے تھے اور ڈنمارک کے دوسرے صوبے جاٹ لینڈ کی لسانی تہذیب کی عکاسی کرتے تھے چنانچہ کسی لغت میں موجود نہیں تھے۔

ان افسانوں میں دیہات کی زندگی کی منظر کشی اور دہقانوں اور ان کی اولادوں کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کی داستانیں ایک گہرے طنز کی چبھن کے ساتھ نہایت بے باکی سے بیان کی گئی ہیں۔ جاگیردارانہ اور آمرانہ معاشرے میں طاقت اور وسائل پر ایک طبقے کی خدائی اور حکمرانی کے خلاف اس نے صدائے احتجاج بلند کی۔

شدید زہر آمیز لہجہ اور غریبوں کا استحصال کرنے والے ہاتھوں کے لیے بھرپور جارحانہ تیکھے تیور اس مصنف کی پہچان ہیں۔ اگرچہ اس کی زبان عام سادہ اور سلیس ہے اور اس نے استعارات و تشبیہات کے ازدحام میں اپنے مضمون کے مطالب کو کھونے نہیں دیا، اس کے باوجود اس

کے اسلوب میں ایک گہرائی اور دردمندی ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

وہ ایک عام آدمی کی زندگی میں مذہب کے آمرانہ تسلط کے خلاف تھا اور زندگی کے ہر شعبے میں انسانوں کو اپنا محکوم بنانے کے لیے عیسائیت کی دخل اندازی پر بھی اس نے کڑی نکتہ چینی کی جس کے نتیجے میں اس پر عقیدے کی توہین کا فتویٰ بھی لگایا گیا۔ میں ہنرک اور احمد ندیم قاسمی کے درمیان کئی مشترک خصوصیات دیکھتی رہی۔

یہ افسانہ ''ایک خوابناک دیہاتی زندگی'' (Bonde-idyl) اس زمانے کے ادب میں کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ تحریر نہ صرف اپنے عنوان کے اعتبار سے طنزیہ ہے بلکہ اس کی تفصیلات اپنے دور کی مکمل عکاسی کرتی ہیں اور بدقسمتی سے دورِ حاضر میں برِصغیر کے دیہات ابھی تک اسی زندگی کے دھرے پر آنکھوں پر پٹی باندھے کولھو کے بیل کی طرح گھومے چلے جا رہے ہیں۔ ایک ایسا نظام جہاں جاگیر دار، وڈیرے، زمیندار اور جرگے انسانوں کی زندگیوں میں کن فیکون کے مالک ہیں۔ اس طرزِ حیات میں عورت کی وقعت اور حیثیت جانور سے زیادہ نہیں ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں گھوڑے، گائے اور بھینس کے دام اس سے زیادہ لگائے جاتے ہیں۔

افسانے میں مصنف ہاریوں اور کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور طبقے کی عورتوں کے لیے ''کتیا'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اس صورتِ حال کی تطبیق مشرقی معاشرے کے ساتھ کی جائے تو ''رنڈی'' اور ''کنجری'' کے الفاظ کماحقہ ترجمانی کریں گے۔ ہنرک کی کہانیوں میں ایک ایسا معاشرہ سانس لیتا ہے جہاں شوہروں کے سامنے ان کی بیویوں کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے اور وہ لب سیے اور آنکھیں بند کیے گزر جاتے ہیں۔

ڈنمارک میں باقاعدہ ایسا ادارہ موجود ہے جس کا فرض ہے کہ وہ ہر لفظ کے مطالب اس کی تاریخ اور تہذیب کے حوالے سے دے۔ لیکن اتنا وقت نہیں تھا۔ ممتاز شیخ افسانے کے منتظر تھے اور مجھے ایک ڈینش دوست کے فون کا انتظار تھا۔

افسانے میں ایک ایسی صورتِ حال ہے جب فصلیں کاٹنے اور کھلیان بھر لینے کے بعد زمینداروں کے ڈیرے پر ایک جشن برپا کیا جاتا ہے۔ اس میں وڈیروں کو شراب پیش کی جاتی لیکن مزدوروں اور مزارعوں کے لیے ایک مشروب رکھ دیا جاتا۔ اب میں ترجمے میں اس لفظ کو صرف مشروب کہہ کر سرسری سا آگے گزر جانے پر مطمئن نہیں تھی۔ بالآخر تحقیق و تفتیش کے بعد مجھے علم ہوا کہ اس مشروب اور چینی لیموں ملے میٹھے پانی کا پنجاب کے دودھ اور لسی کے کلچر سے تقابل کیا جا سکتا

ہے۔ انور مسعود کا چودھری اور رحما اسی کلچر کے کردار ہیں۔

مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ چودھری اور رحما کسی ہمسایہ گاؤں میں مبارک باد دینے کے لیے گئے۔ جس گھر میں وہ جا کر رکے، چودھری کو دودھ کا بڑا گلاس دیا گیا جس پر بالائی کی تہہ تیر رہی تھی اور رحمے کو لسی کا بڑا گلاس دیا گیا۔

دودھ پی کر چودھری صاحب نے مونچھیں صاف کر کے تاؤ دیا اور کہا، ''الحمدللہ''

رحمے نے اپنا گلاس پی کر زمین پر رکھا اور بآوازِ بلند کہا، ''الحمد للّی''

''اوئے، تمھیں شرم نہیں آتی، کافرا، کلمہ خراب کردا ایں،'' چودھری نے گھر کا۔

''چودری صیب، تساں پیتا اے، میں پیتی اے'' رحمے نے ادب سے جواب دیا۔

ڈنمارک میں لٹریچر کے کئی مترجمین ہیں مثلاً چینی اور روسی زبان کے مترجمین تو بہت محنتی، محقق اور باعلم ہوتے ہیں۔ اسی طرح ڈینش مستشرقین سولھویں صدی سے فارسی، عربی اور سنسکرت میں اپنے علم و فضل کا کمال منوا چکے ہیں۔

••

آسیہ مسیح اور علمائے کرام کی تحریف: عاصیہ مسیح

میں نے کالج کے زمانے میں ایک مرتبہ ایک استاد کا نام ڈالا۔ ہمارے ابا نے شام کو بلا لیا۔ سامنے ایک سورۃ کا ترجمہ پڑا تھا ''سورۃ الحجرات''۔

''بیٹھ جائیں۔'' ابا جی نے چہرے کے آگے سے کتاب ہٹائے بغیر کہا۔ ہنستے مسکراتے اور دوستانہ گپ شپ کرتے ابا جی کو شدید سنجیدہ دیکھ کر میری ہتھیلیاں پہلے ہی پسینے سے بھیگ چکی تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی سارے دن کی کاروائیاں دوہرائیں۔ شرارتوں اور بدتمیزیوں کی کرائم لسٹ پر غور کیا۔ کچھ سمجھ نہ آئی۔ سورہ اٹھائی۔ تفہیم القران سے لیا گیا ترجمہ و تشریح سنانا شروع کی۔ میں جب ''ولا تنابزوا بالالقاب'' پر پہنچی تو کہنے لگے:

''رک جائیں۔ اب اس کا ترجمہ اور تفسیر پڑھیں۔ شاباش۔''

میں نے آیت کا ترجمہ پڑھا۔ ''ایک دوسرے کے نام مت دھرو''۔ تفسیر میں ''نام بگاڑنا، تمسخر کرنا، تحقیر کرنا اور دلآزاری کے لیے نام کی تضمین کرنا، نام ڈالنا، منع کیا گیا۔''

''بس رکھ دیں۔ یہ پہلا رکوع لگا تار ترجمہ کے ساتھ ایک ہفتہ پڑھیں۔ افاقہ ہوگا۔''

ہم جھڑکیاں کھا کھا کر نمازیں پڑھنے والی نسل تھے، ابا جی کو خوش کرنے کو گھر میں لٹکے

کیلنڈر پر نماز کی حاضری ڈالنے والے بچے، جن کو دین کی تفہیم اور عبادات پر کوئی قابلِ ذکر بات یاد نہیں۔ عرفِ عام جن کو جہلاء میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

لیکن جب یہ اہلِ جبہ و دستار سرِعام نام بگاڑتے بد کلامی کرتے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے نام مسخ کرتے ہیں تو کیا انھیں سورۃ الحجرات کا پہلا رکوع یاد نہیں آتا؟ کیا یہ بلاسفیمی یا توہینِ رسالت نہیں؟

میرا یہ کالم چھپا تو مذہبیوں نے اس کا برا منایا اور انباکسوں میں گالیوں کا طوفان امڈ آیا۔ مجھے پوسٹ لکھنا پڑی کہ انباکس پیغامات لکھنے والے دوستوں سے عرض ہے کہ میری پوسٹ پر ذرا سا غور فرما لیا کیجیے۔ وعظ کی گنجائش ہو تو وال پر لکھیے، یہیں پر جواب ملے گا۔

••

دومن ڈے...

ایک باصلاحیت عورت کا وجود مردوں کے لیے خطرہ بن گیا تھا۔ بہت دنوں سے ہم مسلمانوں کو منہ کی پھپھوندی دور کرنے کے لیے ایک گرما گرم موضوع مل گیا۔ جس طرف رخ کیجیے، ایک گناہگار باغی عورت اور ایک معصوم، مظلوم، معروف، ساٹھ برس کے مرد کی زندگی سرِ بزم زیرِ بحث تھی۔ میں نے خود کو بالجبر لکھنے سے باز رکھا کہ یہ صنفی تعصب میں شامل کر دیا جائے گا۔

ایک عورت کی شادی اور اسی عورت کی دوسری طلاق، فسانے، قصے، مسالہ، چٹپٹی داستانیں، بس یہی ہے ہمارا ذہنی عروج؟ طلاق تو مرد کی بھی دوسری تیسری تھی۔ صاحبِ اولاد تو وہ بھی تھا۔ مغربی زندگی سے آشنا، تعلیم یافتہ، روشن خیال، ایک پوری قوم کو ایک نئے خواب کی تعبیر دینے کا مصمم ارادہ لیے ہوئے۔

تو عزیزانِ من، گھر اجڑنے یا اجاڑنے، خود چھوڑنے یا کسی کے راستہ بدلنے، کا نتیجہ صرف ایک ہوتا ہے۔ کچھ فسانوں کی بازگشت دور تک جاتی ہے۔ دیر تک رہتی ہے۔ لیکن وقتی غبار بیٹھ جاتا ہے۔

اس ایک طلاق پر جس طرح زبانِ خلق پرجوش اور مستعد بیانات جاری کر رہی ہے۔ ان کے لیے ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آ گیا جو بہت پہلے ابا جی سے سنا تھا۔

ایک صحابی نے بیوی کو چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ چٹخارے لینے والے لوگ ہر زمانے کی طرح اس دور میں موجود تھے۔ بیمار قسم کا تجسس اور چسکے لیتی ہوئی ٹوہ ہر دور میں لوگوں کے سروں میں سمائی

رہی۔ لوگ مصر ہوئے۔ کیا وجہ ہے؟ کیوں چھوڑ رہے ہیں؟

انھوں نے فرمایا، ابھی وہ میری بیوی ہے۔ میں اس کا لباس ہوں۔ پردے کی بات نہیں بتا سکتا۔ طلاق مکمل ہوگئی۔ لطف اندوز ہونے والی زبانوں نے پھر استفسار کیا۔ اب تو بتایئے جھگڑا کیا تھا؟ کیوں طلاق ہوئی؟

''اب وہ میرے لیے ایک غیر عورت ہے۔ میرے لیے جائز نہیں کہ کسی غیر عورت کے نقائص بیان کروں۔'' جواب ملا۔

دوستو، یہ دین کی وہ صورت تھی جو ہمیں سکھائی گئی تھی۔

سنا رہے ہیں جو صدیوں سے چڑھ کے منبر پر
حقوق۔ قبلہ! وہ سارے ہیں کاغذی اب تک

آج دنیا نے عورت کو یہ حق یا اجازت نہیں دی کہ وہ خود کو انسان سمجھے۔ لیکن میرا یہ دن ابا جی کے نام ہے۔ کالج کے دھواں دھار مباحثوں کے دوران کمال شفقت اور حکمت سے کہا۔

''عورت کو حقوق صدیوں پہلے تفویض ہوگئے تھے جب صحرا کی ریت میں دفن چیخوں کو مجتمع کر کے ان پر کالی کملی تان دی گئی۔ اچانک وہ قدموں تلے جنت لیے مردوں کی استاد ٹھہری۔ جانِ پدر! استحصال کی جنگ معاشرے سے ہے، ان کے ساتھ ہے جو خود بدلتے نہیں قرآن بدل دیتے ہیں، ان متعفن اذہان کے ساتھ ہے جو عورت کو بدچلن ثابت کرنے میں مردانگی کا ہتھیار اٹھاتے ہیں۔ بات صرف حقوق کے نفاذ کی ہے۔''

شکریہ ابا جی۔ آپ آج بھی میرے ہمقدم ہیں۔ وہ مشعل بردار جس نے انتہا پسندی کا شکار نہ ہونے دیا۔

••

یااللہ پھوپھو مر جائیں...

ہماری ننھی منی بھتیجی مہر لوڈو گیم اٹھا لائی۔ ''چلیے پھوپھو گیم کھیلیں۔''

میں نے کتاب کو تکیے کے نیچے رکھا۔ ''چلیے۔''

بساط جمی اور کھیل شروع ہوا۔ قسمت دیکھیے کہ میری ساری گوٹ باہر نکل آئیں۔ مہر گھٹنوں پر ہاتھ رکھے دعا کرنے لگی۔ ''یااللہ پھوپھو مر جائیں۔'' اس کی ماں بھاگی آئی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے۔''

''اماں'' وہ منا سا منہ اوپر اٹھا کر بولی۔ ''میں کہہ رہی تھی کہ پھوپھو کی گوٹی مر جائے۔''

اب اماں بھی کھیل میں شامل ہوگئیں۔ بورڈ الٹا گیا۔ مہر کے دعائیہ الفاظ بدل گئے۔

''یااللہ، پھوپھو کو چھکا نہ ملے، یااللہ پھوپھو کو تین چھکے ملیں، سارے نمبر جل جائیں، یااللہ پھوپھو کو سیڑھی نہ چڑھنے دینا۔''

اب کوئی دعا قبول نہ ہوئی۔ میری گوٹ آخری ہندسوں تک پہنچی تو گڑگڑا کر بولی:

''یااللہ، پھوپھو کو سانپ کاٹ جائے'' اور واقعی سانپ ڈس گیا۔

مورل۔ بچوں کی بد دعائیں نہ لیجیے۔

••

آپ کا برگد اُڑ گیا پھوپھو...

پچھلے سال موسمِ گرما میں جب پاکستان آمد ہوئی تو میں رضوان بھائی کے باقاعدہ انٹرویوز کرتی۔ مہر میرے ساتھ سائے کی طرح لگتی رہتی۔ پھر میں ان کو کاغذ پر نوٹس کے انداز میں لکھتی اور لیپ ٹاپ پر لکھنے لگتی۔

پھوپھو برگد کب آئے گا؟ وہ بے صبری سے پوچھتی۔

''برگد کتاب کب آئے گی بولیں... برگد تو درخت ہے نا، وہ نہیں آسکتا۔''

''اچھا پھوپھو! اچھا اچھا، وہ تیزی سے جان چھڑانے کے انداز میں بولی: ''بتائیں نا کب آئے گی برگد؟ بس لکھتی جاتی ہیں، لکھتی جاتی ہیں۔ پھر اس کو پن لگا کر جوڑ دیں گی؟''

میں اس کے تجسّس بھرے سوالوں کا جواب دیتی رہی اور جب جون کے دنوں میں برگد کی آخری فائل پرنٹ کر کے نکالی اور اس کو صفحات کی ترتیب سے اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہی تھی تو مہر اور اسد میرے دائیں بائیں بیٹھے صفحہ نمبر پڑھ کر ان کو اوپر نیچے رکھ رہے تھے۔ اچانک پنکھے کی تیز ہوا چند کاغذات اُڑا کر لے گئی۔

''آپ کا برگد اُڑ گیا پھوپھو۔'' مہر نے چیخ مار کو یوں اطلاع دی جیسے کہیں آگ لگ گئی ہو۔

میں نے پنکھے کا بٹن دبا کر پنکھا بند کر دیا۔ ''یہ برگد اڑنے والا نہیں میرے بچے، یہ اُڑان بھرنے کے قابل کرے گا آپ کو۔''

••

میں بھائی کے گھر اوپر والے پورشن میں بیٹھی حسبِ معمول کچھ لکھنے میں مشغول تھی۔ مہر اوپر

آئی، دروازے سے جھانکا، پھر خاموشی سے واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ آئی، پانی کی بوتل رکھی اور نکل گئی۔ مجھے علم تھا کہ اس کا دل چاہ رہا ہے کہ اب پھوپھو نیچے آئیں اور کوئی کھیل تماشہ شروع ہو۔

میں جب نیچے اتری تو اس نے فوراً میری کرسی ہیٹر کے قریب رکھی۔ بھاگ کر خشک میوہ جات کی ٹرے اٹھا لائی۔ میرے پاس بیٹھ کر آرام سے بولی...

''میرا جی چاہتا ہے میں بڑی ہو کر پھوپھو بن جاؤں۔''

''بس بس، ایک ہی پھوپھو بہت ہے،'' اس کی ماں نے باورچی خانے سے جھانک کر کہا۔

••

میں اکثر سوچتی کہ ابا جی کی زندگی کا شاید مقصد ہی یہی تھا کہ وہ مجھے ایک کے بعد ایک موضوعات سجھاتے جائیں اور فرمائش کرتے جائیں کہ اردو زبان میں یہ چیزیں براہِ راست ڈینش زبان سے ترجمہ یا تحقیقی کام کے ذریعے منتقل کر دو۔ جل پری کے دیس نے تو میرا کام بڑھا دیا تھا جیسے کسی نے جہلم کے دریا میں ڈنمارک اور سویڈن کے پانی، آبنائے اوریسنڈ Øresund کی لہریں گھول دی ہوں۔ ان پانیوں کے بہاؤ پر (Longline) کے کنارے پانی کی جانب پشت کیے جل پری کا مجسمہ گزشتہ ایک صدی سے شاید جہلم کی ان پیاسی لہروں کا منتظر تھا جو اسے ہانز کرسچن اینڈرسن کی کہانی سے نکال مشرقی دنیا کی لازوال عشق کی داستانوں کے متوازی کھڑا کر دیں۔

میں نے ابا جی کے لیے اس کہانی کا خلاصہ ایک نظم کی صورت میں کیا۔

جل پری

سر بسر صدیوں کی ریاضت ہے
جل پری آج بھی علامت ہے

کہنے کو یہ فقط کہاوت ہے
سوچو تو پیار کی سفارت ہے

استعارہ ہے یہ وفاؤں کا
اور محبت کی اک روایت ہے

وصل جس کے نصیب ہی میں نہ ہو
یہ اسی درد کی شہادت ہے

ہجر جس کا سدا بہار رہے
یہ اسی عشق کی صداقت ہے

ماورا جو مکاں زماں سے رہے
اس تعلق کی یہ حکایت ہے

لہروں کے بازوؤں میں ہے گم سم
اس کی خاموشی ہی خطابت ہے

جل پری ٹوٹی تھی صدف کی طرح
اب یہ گوہر بڑا غنیمت ہے

پانیوں کی یہ بیٹی کہتی ہے
عشق ایثار سے عبارت ہے

وہ جو قائم ہی بس غرض پہ ہوا
ایسا رشتہ فقط تجارت ہے

انتظار اب کوئی نہیں باقی
اس کو ڈنمارک سے عقیدت ہے

عشقِ صادق نے کر دیا پتھر
اس کا بت قابلِ زیارت ہے

Hans Christian Andersen:

Den lille havfrue (The Little Mermaid)

جاگ اٹھے خفتہ کئی زخم پرانے یک لخت

ابا جی کے جانے کے بعد میری طبیعت روز بروز خراب ہونے لگی۔ ہزار خود کو مصروف رکھنے کے حیلے کیے، چند ماہ میں حالت کچھ بہتر ہوئی تو امی جی نے رختِ سفر باندھ لیا۔ مجھے اکثر لگتا کہ میرا پاتال کا سفر شروع ہو چکا ہے۔ بے زمانی اور بے مکانی کا جان لیوا احساس راتوں کو خارزار بنا دیتا اور دنوں کو بے نور طویل دورانیے میں بدل دیتا۔ میری صحت ایک مرتبہ پھر سب کو تشویش میں ڈالنے لگی۔ ڈاکٹرز مسلسل آرام کرنے، ریلیکس رہنے اور دوائیاں بدلنے کے اقدامات کرتے تھک ہار گئے۔ ان کا بورڈ بیٹھا۔

''پرانے زخم کے ٹانکے تازہ ہو گئے ہیں۔ اندر پھر زخم بن رہے ہیں اور سوائے آپریشن کے کوئی چارہ نہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا کہ اس مرتبہ وزن کی کمی، صحت کی مسلسل خرابی کی وجہ سے یہ سرجری خطرات سے خالی نہیں اور اندازے سے زیادہ طویل بھی ہو سکتی ہے۔ ڈپریشن بھی ہو سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے'' میں نے کاغذات پر دستخط کیے۔

''یاد رکھنا یہ آپریشن ہے، پوسٹ مارٹم نہیں۔ مجھے بہت سے کام کرنا ہیں ابھی۔'' میں نے قلم میز پر رکھا۔

''تم بھی یاد رکھنا کہ یہ آپریشن ہی ہے۔ مرنے کی کوشش نہ کرنا۔'' ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ ''اور تم یقیناً بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔ تمھارا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔''

میں نے اعضا کے عطیہ دینے کے کاغذات پر بھی دستخط کیے۔ آنکھیں، دل، گردے، پھیپھڑے، سب دان کر دیے جائیں۔ یہ فعل حلال ہے یا حرام، اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ چند دن قبل بینک جا کر دونوں بہن بھائیوں کے لیے مساوی تحائف کا لفافہ بنا کر نام لکھا، وصیت نامہ

تحریر کیا، گھر آ کر بچوں کے لیے قیمے والے نان بنا کر فریزر میں رکھے۔ جگہ جگہ رلتے پرزے یکجا کیے۔ نظمیں، ادھورے افسانے، مختصر سفر نامے، سب کی فائل بنائی اور بینک میں رکھی۔

تمام تیاری مکمل کر کے ہسپتال کا رخ کیا۔

آپریشن سے پہلے میں نے دو باتیں بچوں پر واضح کر دیں۔ اول یہ کہ حالات جو رخ چاہے اختیار کریں، مجھے کسی صورت امدادی مشینوں کے سہارے زندہ نہیں رہنا۔ میں نے اپنے والد سے یہ بات سیکھی جو وہ اکثر دعائیہ صورت میں بلکہ یک طرفہ مکالمے کی صورت میں کرتے۔

''یارب مینوں اپنے محتاجاں دا محتاج ناں کریں۔'' (مجھے اپنے محتاجوں کا محتاج نہ کرنا۔)

دلوں کے درمیان صادق رشتے ہوں، خون کے خلیات میں دوڑتے نسب کے بندھن ہوں یا بدن اور روح کا ناتہ ہو، تو اسے امدادی مشینوں کے سہارے بالجبر اور بے سود زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ خود اپنی ذات سے بے خبر اور دنیا کے لیے دیدۂ عبرت نگاہ کا نمونہ بن کر زندہ رہنا مجھے منظور نہیں۔ میں نے ہسپتال کے کاغذ کی پشت پر لکھا،

محبت روح کی مانند ہے
مرتی نہیں
قالب بدلتی ہے
یہ امدادی مشینوں کے سہارے زندہ رہنے سے صریح انکار کرتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مجھے کچھ ہو جائے تو یہیں پر رکھنا ہے، مردہ خانے کی سرد درازوں میں تادیر نہ رکھنا۔ بے روح لاشے کو عذاب کی صورت جہاز میں لاد کر احمقانہ جذباتیت کا شکار ہو کر پاکستان نہ لے جانا۔ میرے وطن کی سرزمین کو تابوت میں بند بے حس و حرکت لاشوں کی ضرورت نہیں جو صرف مدفون ہونے کے لیے ارضِ پاک تک گھسیٹے جائیں کہ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ میرے بہن بھائی مجھے کیوں اس حالت میں دیکھیں اور بلاوجہ کی بھاگ دوڑ اور تدفین کی رسومات سے نمٹیں؟ رہی دعا، تو وہ اب بھی مجھے پہنچتی ہے اور ان ہی دعاؤں کے سہارے میری سانس کی ڈوری جڑی ہے۔

میں اپنی ذہنی رو میں مسلسل بات کرتی رہی، اور جب میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو میری نورِ نظر کا چہرہ زرد تھا۔

''امی آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ چند دن کی بات ہے، آپ یہیں بیٹھ کر اپنی نظمیں لکھتی پائی جائیں گی۔ بلاوجہ ڈرامہ کرتی ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ اٹھ گئی تو ضرور لکھوں گی لیکن کدی بندہ نئیں وی اٹھدا'' میں نے اسے ہنسانے کی ناکام کوشش کی۔

''نہ کریں امی، اور اُسامہ کے سامنے تو بالکل ایسی بات نہ کریں۔ وہ کچھ کہتا نہیں لیکن گھبرا جاتا ہے۔'' اس نے فوراً تاکید کی۔

''جو حکم میری آقا۔ لیکن میری بات یاد رکھیں۔ سب کچھ آپ کے ذہن میں واضح ہونا چاہیے۔'' پھر مجھے ایک دم ہنسی آ گئی۔

''امی!'' اس نے قدرے ناراض ہو کر کہا، ''کیوں ہنس رہی ہیں، یہ مذاق ہے کیا؟''

''نہیں۔ دراصل مجھے اُسامہ کی ایک بات یاد آ گئی ہے۔ جب وہ چھوٹا تھا تو میں اسے لاڈ سے ٹیپو سلطان کہا کرتی تھی۔ اس کے ناموں کے بارے میں میرا اپنا خیال تھا کہ مجھے اپنے بیٹے کو ابتدائی بچپن سے ہی بطور مرد بہادر، شجیع اور مستحکم قوتِ فیصلہ، صاحب الرائے انسان بنانا ہے۔ اُسامہ نام صرف اس لیے میرا خواب رہا کہ میں نے اسلامی تاریخ میں پڑھا تھا کہ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگی اور پورا شہر چہ میگوئیاں کر رہا تھا۔ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش تھے اور ام المومنین رضی اللہ عنہا ایک عام بے بس عورت کی مانند ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں، تو پہلی بلند آواز حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی ابھری کہ ''میری ماں کی گواہی میں دیتا ہوں۔'' قرآن کی گواہی تو مومنین کا ایمان آزما کر اتری۔

میں نے تب ہی سوچ لیا کہ اگر میرا بیٹا ہوا تو اس کا نام صرف اُسامہ ہوگا، جو ان تمام خصوصیات کا حامل ہوگا اور اپنی راہیں خود بنائے گا، میرے پلو کو تھام کر فیصلے پوچھنے نہیں آئے گا بلکہ میں اس سے مشورہ کرنے کے لیے اسے اپنے پاس بلاؤں گی۔ جو صرف رشتوں کا احترام ہی نہیں سیکھے گا بلکہ احترامِ آدمیت کا قائل ہوگا، جس کے لیے عورت کا ہر روپ محترم ہوگا، جو ذہنی طور پر اتنی مستحکم رائے رکھے گا کہ اسے پانی کے بہاؤ کے ساتھ نہیں بلکہ بہاؤ کے مخالف سمت تیرنے کا فن آئے گا۔ یہی سوچ کر میں نے اپنی پسند کا یہ نام منتخب کیا۔

اُسامہ کی حسِ ظرافت بچپن سے غیر معمولی تھی۔ ان دنوں شدید برف باری ہو رہی تھی اور ڈنمارک میں ''ونٹر ڈپریشن'' عام تھا۔ اوپر تلے چند لوگوں نے ٹرین کے نیچے آ کر خودکشی کر لی۔ پورا

کوپن ہیگن سکتے میں آ گیا۔ ٹرینیں معطل ہوگئیں۔ ذرائع ابلاغ چیخنے لگے۔ بچے صبح ریلوے اسٹیشن پر منتظر رہے اور واپس بھی تاخیر سے آئے۔

اُسامہ مجھے مسلسل تنگ کر رہا تھا کہ مجھے گاڑی پر کالج چھوڑ کر آئیں۔ میں نے روایتی ماؤں والے جملے پھینکنا شروع کیے کہ ''مجھے اس برف کی سفید چادر کو دیکھ دیکھ کر ڈپریشن ہو رہا ہے۔ حالات دیکھ کر برے خیال آ رہے ہیں۔ پتہ چلے گا جب ماں نہ ہوئی۔''

''امی جی!'' وہ میرے بستر میں گھس کر بولا، ''دو باتیں ہیں۔ ایک تو خودکشی کا خیال آئے تو سنجیدگی سے سوچنا ہے کہ عوام الناس کو تکلیف نہ ہو۔ سویرے منہ اندھیرے نہیں کرنی۔ ریل گاڑی ٹرائی نہیں کرنی۔ لوگ سردی میں مصیبت میں پڑ جاتے ہیں۔ مخلوقِ خدا کو تکلیف ہوگی۔ اس سے بہتر طریقے بھی ہیں جو تکلیف دہ اور اذیت ناک انجام سے بچا سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کی تدفین یہیں کرنی ہے یا پاکستان لے کر جانا ہے؟''

عالیہ بھی ہنس دی۔ جب میں نے ابا جی کو اس کی تجاویز سنائیں تو کھلکھلا کر ہنسے اور کہنے لگے، ''پتر جی، آپ کا ہی پتر ہے ناں؟ کچھ تو ماں کا اثر لے گا۔''

لیکن اس دن اپریل کی آخری تاریخیں تھیں اور دن قدرے طویل ہو رہے تھے۔ ایک سینئر نرس مجھے اس آپریشن کے بارے میں آگاہی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیتی یا پھر میرے گال پر اپنے ہاتھ پھیرتی جیسے بچے اپنی بلی سے لاڈ کرتے ہوں۔ ''پریشان نہ ہونا۔ تم ایک بہادر انسان ہو اور ویسے بھی خواتین بیماری کو بہتر انداز میں برداشت کرتی ہیں۔ ڈنمارک کے بہترین سرجن تمھارا آپریشن کریں گے اور تم بہت محفوظ ہاتھوں میں رہوگی۔''

میں نے اسے جوابی تسلی دی کہ میں بالکل پریشان نہیں۔ میرا ایمان ہے کہ جو رات قبر کی تاریکی میں ہے وہ باہر نہیں ہوسکتی۔ مجھے صرف اپنے بچوں کی فکر ہے۔ ابھی مجھے بہت کام کرنا ہیں لہٰذا مجھے ہر صورت میں اٹھنا ہے اور میں اٹھ جاؤں گی۔ وہ پہلے تھوڑی حیران ہوئی پھر ہنس پڑی۔

اس شام جب عالیہ مجھے خدا حافظ کہہ کر گئی تو میں نے ابا جی کی عادت کے مطابق کمرے کے فرش پر بڑا تولیہ پھیلا کر دو نفل ادا کیے اور شاید انھی کی طرح دیوانہ وار یکطرفہ مکالمہ بھی کیا کہ میرے مولا میرے ساتھ جو مرضی کر، میرے بچوں کو ان معاملات سے باہر رکھ۔ بس ان کو کوئی دکھ نہ دینا۔ یہ کوئی بات ہے کہ میری وجہ سے میرا باپ بھی دکھی ہو اور پھر میری وجہ سے میری اولاد کا سکھ چین جاتا رہے۔ بس مجھے اٹھنا ہے ان امدادی مشینوں کے سہاروں کے بغیر، اور تیرے محتاجوں کا

محتاج بنے بغیر۔ پھر میں نے کوئی روایتی دعا کے بغیر امی جی اور ابا جی کو دعاؤں کے پھول بھیجے۔ بتی بند کی اور آرام سے سوگئی۔

اگلی صبح سات بجے آپریشن کی تیاری شروع ہوگئی۔ خود غسل کرتے اور کپڑے بدلتے مجھے ایک لمحے کو خیال آیا کہ ''آج ہی ہم نے بدلے ہیں کپڑے، آج ہی ہم نہائے ہوئے ہیں'' کے مصداق اگر یہ آخری صبح اور زندگی کی آخری شام بھی ہو تو کم از کم خوش تو رہنا چاہیے۔ دونوں بچے میرے سٹریچر کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ آپریشن تھیٹر کے سامنے ان کو روک دیا گیا۔ عالیہ نے جھک کر میرے ماتھے پر پیار کیا اور اُسامہ اپنا شدید زرد چہرہ لیے بالکل خاموش کھڑا رہا۔

خلائی جہاز جیسے کمرے میں رنگ برنگی مشینوں اور خصوصی لباسوں میں موجود کئی ڈاکٹر ہنستے مسکراتے تیار کھڑے تھے۔ دو نرسیں منکر نکیر بنی میرے دائیں بائیں آگئیں۔ ہمیشہ کی طرح ہاتھ پر ڈرپ لگانے کے لیے نس تلاش کرنا ایک معرکہ تھا۔ دو ڈاکٹر جو صرف بے ہوشی کی دوا کی مقدار کے تعین کے لیے کھڑے تھے، قریب آگئے۔

ان میں سے ایک نے کہا کہ ''تمھارا دماغ بہت دیر سے سوتا ہے اس لیے دوا دینے میں بہت احتیاط چاہیے۔ میرا معاون دوست بھی میرے ساتھ ہے۔ ہم تمھارا بہت خیال رکھیں گے۔ گھبرانا مت۔ اور اپنے دماغ کو ہدایات دو کہ جلدی سو جانا اچھی بات ہے۔''

وہ مجھے مسکراتا دیکھ کر ہنسنے لگا۔ ''بس اب چند لمحوں بعد تمھیں دوا دی جائے گی۔ اس آپریشن کی سنجیدگی کے پیشِ نظر اپی ڈیورل ایڈمنسٹریشن (Epidural administration) کے ذریعے ریڑھ کی ہڈی سے اینلجیزک analgesic ادویات دی جائیں گی۔ ہماری پوری ٹیم بہت تازہ دم ہے اور تمھارے کامیاب آپریشن کے لیے مکمل طور پر تیار ہے۔''

چونکہ میں طویل بیماری اور کئی مرتبہ طویل سرجری کے تجربات بھگت چکی تھی لہٰذا مجھے زیادہ گھبراہٹ نہیں تھی۔

''میں کئی دن سے سوئی نہیں، میرا خیال ہے میں نیند پوری کروں گی'' میں نے بھی جواباً اسی گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا، خود کو بتایا کہ مجھے جلد ہی اٹھنا ہے۔ بھاری ہوتی آنکھوں کے ساتھ مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ میں بدلتی آوازیں کچھ دیر میرے شعور میں گونجتی رہیں اور پھر ایک ابدی قسم کی تاریکی کا راج ہوگیا۔

مجھے زندگی کے وہ دن دھند لکے کی طرح یاد ہیں۔ اذیت ناک درد کی لہروں پر بند

باندھنے کے لیے کمر میں انجکشن لگائے گئے۔ مارفین کی مقدار بڑھا دی گئی۔ بے کنار کرب کے مسلسل حملوں کے باعث بے یقین سی بصارت کی مدد سے کمرے میں بار بار آتے مسیحاؤں کے متوحش چہرے میں دیکھتی تو تھی لیکن کچھ سمجھنے سے قاصر تھی۔

''امی جی'' میری بیٹی کا خطرناک حد تک زرد چہرہ اور لرزتے ہاتھ مجھے آج بھی یاد ہیں، ''آپریشن ناکام ہو چکا ہے۔''

''مجھے علم ہے کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے'' میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی ''لیکن اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟''

''امی!'' اس نے جھک کر میرے چہرے پر بوسوں کی بارش کر دی۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی مہریں مجھے ہوش میں لانے کے لیے کافی تھیں، ''امی اب دوبارہ آپریشن ہوگا۔''

''کوئی نئی بات نہیں، بیٹا یہ تو پہلے سے ہی پتہ تھا ناں کہ اس دفعہ ایک آخری چانس ہے پیٹ کی اس بیماری سے نمٹنے کا؟''

''جی۔ لیکن پیٹ کو اس وقت تک کھلا رکھا جائے گا جب تک سارے زخم صاف نہیں ہوتے۔ اس میں ہفتہ بھی لگ سکتا ہے اور اس سے زیادہ بھی۔ اور پھر دوبارہ کب سیا جائے گا، ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔''

پتہ نہیں وہ اور کیا کیا کہہ رہی تھی لیکن اس کے آنسو مجھے وہ تکلیف دے رہے تھے جو جسمانی گھاؤ نہیں دے سکے۔ مجھے آپریشن کی کامیابی اور ناکامی سے زیادہ اپنی بیٹی کی فکر تھی۔ میرے رستے ہوئے زخموں سے کہیں زیادہ ان آنسوؤں میں حدت تھی جو تواتر سے اس کی آنکھوں سے برس رہے تھے۔

''میرا بیڈ سیدھا کرو'' میں نے اسے اشارے سے کہا۔ اس نے بستر کی سائیڈ پر لگا لیور دبا کر اسے تقریباً سیدھا کیا۔ ''خود بھی پانی پیو اور مجھے بھی لا کر دو۔'' وہ بھاگ کر باہر راہداری سے پانی کا جگ اور گلاس اٹھا لائی۔ ادویات کے زیرِ اثر منہ کا ذائقہ سخت خراب تھا اور بستر پر لیٹے لیٹے بھی چکر آتے تھے۔ لیکن مجھے اپریل کی آخری تاریخوں کا وہ دن اچھی طرح یاد ہے کیونکہ اس دن کے ساتھ ایک وحشت ناک خیال بندھا ہوا ہے۔

عالیہ کے بے بس الفاظ، ''امی جی اب کیا ہوگا؟ اب تو نانا ابو بھی نہیں ہیں۔ اب ہمارا تو کوئی ہے بھی نہیں'' مجھے ہوش میں رکھنے کے لیے کافی تھے۔ وہ عام طور پر ایسے بات نہیں کیا کرتی

تھی۔ اس کے انداز کا ٹھہراؤ اور صورتِ حال کا سامنا امید اور حوصلے سے کرنے کا انداز سر بسر ابا جی والا نظر آ رہا تھا۔

''میری جان، ایک بات طے ہے کہ ان شاءاللہ میں نے یہ جنگ جیت ہی لینی ہے ہر قیمت پر، اس لیے پریشانی کی کوئی گنجائش نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ یہ رونا دھونا بند کریں۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ ہسپتال میں بیٹھ کر امتحان کی تیاری کریں گی۔ آخری بات یہ ہے کہ اُسامہ کو کچھ نہ بتانا۔ وہ اتنی دور یونیورسٹی میں بیٹھا ہے۔ کہیں سب چھوڑ چھاڑ نہ دے۔'' یہ الگ بات ہے کہ اقتصادی حالات اسے اس موڑ پر لے ہی آئے کہ وہ یونیورسٹی چھوڑ کر کوپن ہیگن منتقل ہو جائے۔

''امی!'' اس نے ناراض ہونے کی کوشش کی، ''زندگی کا کوئی امتحان اور یونیورسٹی کی تعلیم آپ سے زیادہ اہم نہیں۔''

ایک مرتبہ پھر سٹریچر حیات و موت کے درمیانی کمرے کی طرف رواں دواں تھا۔ ایک مرتبہ پھر مہربان مسیحاؤں کی ٹیم نے میرے گرد حلقہ بنالیا، اور ایک مرتبہ پھر اس بھاگتی دوڑتی اور اپنے مدار میں گھومتی دنیا کی دوسری نامعلوم سمت جا کر مجھے خود اپنے ہی بدن کے خلاف جنگ میں حصہ لینا تھا۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ مجھے کوئی خوف نہیں تھا، شاید کسی داخلی سکون نے مجھے بے حد حوصلہ دے رکھا تھا۔ یقین کی ایک عجیب سی تسکین بھری کیفیت میرے ذہن پر طاری تھی جس نے عالیہ کی ہمت بھی بندھائے رکھی۔ نزاکت اور بے چینی کا اظہار شاید وہ لوگ کرتے ہیں جنھیں ہاتھ کا چھالا بننے کی عادت ہو یا پھر بچوں کو رام کہانی سنا کر بہتر محسوس کرتے ہوں۔ میرا بس نہ چلتا تھا کہ کسی طرح عالیہ کو بھی اس آزمائش سے دور رکھتی لیکن وہ چونکہ خود میڈیکل کے شعبے میں تھی، اس کی آگہی زیادہ اذیت ناک تھی۔

مجھے موت و حیات کی اس آخری سرحد کے وہ دس دن بالکل یاد نہیں۔ کبھی کبھی اندھیرے میں روشنی کی باریک درز کی طرح، سفید لباس میں نصف چہرے کو ڈھانپے کچھ سائے سے یہاں وہاں لہراتے۔ ڈاکٹروں کے علاوہ صرف عالیہ اس خصوصی لباس میں، میرے اس مکمل طور پر الگ تھلگ کمرے میں آ سکتی تھی۔

وہ دس دن اور راتیں کیا ہوئے، ان دنوں میں میرے گرد و پیش میں کیا ہوا، مجھے کچھ خبر نہیں۔ لیکن مجھے اچانک سب کچھ متحرک ہوتا محسوس ہونے کی وہ ساعت یاد ہے۔ احساس سے کہیں پہلے مجھے ایک دودھیا روشنی کی دھند پھیلتی محسوس ہوئی اور پھر بے کراں خوشبو کا غبار اپنے اوپر حصار کرتا محسوس ہوا۔ دل کی دھڑکن سرپٹ بھاگتے گھوڑے کے سموں کی آواز کے ایک دھماکے سے بتدریج

سبک خرامی کی طرف آنے لگی۔ میں آوازوں کے بے ہنگم ہجوم کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ڈاکٹر خود کو اور میری بیٹی کو مبارک دے رہا تھا۔ پھر مجھے وہ خوشبو بہا کر اپنے ساتھ لے گئی۔ اب اس بات میں کیا اسرار ہے۔ یہ ڈوبتے لاشعور کی تنکا تھامنے کی آخری کوشش ہے یا یہ محبت اور عقیدت کی مجنونانہ کیفیت ہے؟ لیکن مجھے وہ خوشبو روشنی کے چکا چوند حملے کی طرح یاد ہے۔ پھر جب مجھے مکمل طور پر ہوش آیا تو باہر پرندوں کے چہچہانے کا شور تھا۔ کسی درز سے روشنی کی ایک لکیر سی کمرے میں آ رہی تھی۔ عالیہ نے میرا ایک ہاتھ تھام رکھا تھا۔ میں نے شاید کچھ کہا تھا۔ بعد میں عالیہ نے ہنستے ہوئے بتایا کہ آپ بار بار یہی کہتی تھیں کہ میرے بیٹے کو بلا دیں۔

ایک مرتبہ کسی نے کہہ دیا تھا کہ اُسامہ کے زیادہ لاڈ اُٹھایا کریں ''نِکّا اے تے نالے مُنڈا اے۔'' (چھوٹا ہے اور لڑکا بھی ہے۔)

مجھے ایک وحشت ناک پیاس کی شدت بھی یاد ہے جیسے زبان پر دورویہ نوکیلے کانٹے اگ آئے ہوں۔ جب میں اشارے سے پانی مانگتی تو نرس مجھے ایک چھوٹی سے چمچی میں برف کا ایک ٹکڑا دیتی۔ پلک جھپکتے وہ برف تحلیل ہو جاتی اور تالو میں ببول اگنے لگتے لیکن پانی کا قطرہ تک نہ دیا جاتا۔

ڈاکٹر نے بے حد نرمی سے میرا ہاتھ تھاما، ''یہ پیٹ کی سرجری ہے بہادر لڑکی، اس میں پانی نہیں دیا جا سکتا، جسم میں پانی بہت ہے، یہ پیاس ادویات کی تلخی سے ہے۔''

شاید یہ نزع، سکرات اور موت کے درمیان کا دورانیہ تھا۔ میرے جسم سے نجانے کتنی تاریں، کتنے بیگ بے ترتیبی سے چسپاں تھے۔ بازو میں نجانے کس قسم کی بڑی سی ڈرپ لٹکی تھی جو محسوس تو کی جا سکتی تھی لیکن ہاتھ نہیں ہلایا جا سکتا تھا۔

''اچھا'' میں نے اشارے سے کہا،

''مجھے یقین تھا تم ہمیں سرخرو کرو گی، مرو گی نہیں۔'' وہ اب سکون سے مسکرا رہا تھا۔

پھر ایک دن مجھے انتہائی نگہداشت کے وارڈ سے عام کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ میرے بچے اور ان کے دوست آزادانہ آنے جانے لگے۔

کئی دن کی معذوری کے بعد اچانک ایک دن میں نے اٹھ کر اپنا بستر خود ٹھیک کیا۔ رخِ روشن دھویا یا بقول اقبال چراغِ رخِ زیبا لے کر زندگی کو ڈھونڈا۔ سر کے چار بالوں کو کنگھی کی۔ اپنی پسندیدہ خوشبو لگائی، سامنے پڑی خصوصی پہیوں اور کالے منہ والی تمسخر اڑاتی کرسی کو پرے دھکیلا۔ سہارے کے لیے چلنے والی ٹرالی پر اپنا مریضوں والا لمبا گاؤن لٹکایا اور کمرے سے نکلی۔ عین سامنے

سے ڈاکٹر ہاتھ میں بھاپ اڑاتی کافی کی پیالی لیے اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ پہلے تو اس کا منہ حیرت سے کھلا، پھر آنکھوں میں روشنی چمکی اور پھر ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے۔

''واؤ'' اس نے ہاتھ میں تھامی پیالی، کافی کے لوازمات والی ٹرے پر واپس رکھی، پھر تالی بجائی ''مس مرزا، یو میڈ مائی ڈے۔'' اس نے آ کر میرے کندھے پر تھپکی دی۔

''زیادہ تیز نہ چلنا اور دور نہ جانا۔'' یقیناً ماں اپنے بیمار بچے کو پہلا قدم اٹھاتے دیکھ کر شاید ایسے ہی خوش ہوتی ہوگی۔

''اچھا، فکر مت کرو۔ یہ واکر ہے ناں میرے پاس۔'' میں نے باہر کی طرف چند قدم اٹھائے۔ وہ میرے پیچھے چلنے لگا۔

''اپنی کافی پی لو'' میں نے مڑے بغیر کہا۔

''اچھا، اچھا'' اس کے لہجے میں خوشی کھنک رہی تھی۔ ''ہمارا خیال تھا تم ابھی دو چار ہفتے اور لو گی اٹھنے میں۔''

میں نے چلنا جاری رکھا۔ بڑے دروازے سے باہر نکلتے ہی ایک نرس بھاگ کر میرے ساتھ چلنے لگی۔

''افوہ، تم کیوں آئی ہو'' میں نے مریضوں کی طرح چڑ کر کہا۔ جواب میں وہ ہنسنے لگی، ''ڈاکٹر کہہ رہا تھا تمھارے پیچھے چلوں اور پانچ منٹ بعد تمھیں واپس لے آؤں۔''

عالیہ کی کلاسز بھی اسی ہسپتال میں ہو رہی تھیں۔ اس کی جماعت کے جتنے سٹوڈنٹس ڈاکٹرز تھے سب باری باری چکر لگاتے۔

''عالیہ کی امی کے کمرے میں جا رہے ہیں'' اس کی دو عرب ڈاکٹر سہیلیاں جو ہمارے گھر بے دھڑک آتیں اور عالیہ کے کمرے میں بوریا بستر لگاتیں، اس کے ساتھ سائے کی طرح رہیں۔ ان میں سے ایک بچی کے والدین دونوں مختلف شعبوں میں ڈاکٹر تھے۔ وہ میرے آپریشن کے دوران سارا دن باہر بیٹھی رہی۔ دونوں مجھے خالہ کہتی ہیں۔

''خالہ جس دن آپ اٹھ کر چلیں گی ہم رقص کریں گی'' دونوں نے مجھے لالچ دی۔

''مجھے ابھی رقص کر کے دکھائیں'' میں نے ضد کی۔ ان پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

''خالہ! آپ ٹھیک ہیں بالکل۔ ڈرامہ نہ کریں۔''

ایک دن شام کو ایک نوجوان ڈاکٹر آیا۔ یقیناً ترک یا عرب تھا۔ اس نے بسم اللہ پڑھ کر میرا ڈرپ والا ہاتھ پکڑا۔ میں نے اسے مسکرا کر دیکھا، ''جیتے رہو۔''

''آپ عالیہ کی امی ہیں ناں۔ پھر ہم سب کی بھی امی ہیں۔ میں اس سے جونیئر ہوں۔ وہ سارا گروپ میری بہنوں جیسا ہے۔''

شام کو ایک معصوم بنگالی سٹوڈنٹ ڈاکٹر جھانکا کرتا، ''آپ ٹھیک ہیں؟''

''ہاں، تمھاری شادی تک بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی'' میں اسے یقین دلاتی، ''عالیہ نے بتایا تھا کہ تمھاری شادی سٹاک ہوم میں ہوگی اور یہ بھی کہ ہماری بہو بے حد حسین ہے۔'' وہ کچھ شرما کر ہنستا اور دروازے میں کھڑا ہو کر وی کا نشان بناتا، ''گریٹ۔ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔''

ڈینش سٹوڈنٹس ڈاکٹر بھی آتے۔ پاکستانی کھانوں کا رسیا ایک نوجوان بولا، ''ٹھیک ہو جائیں پھر ہمیں 'ساموسا' بنا کر دیں۔ بس مرچیں کم رکھیں۔''

کلاس ختم ہونے کے بعد عالیہ آئی تو میں سو رہی تھی۔ وہ گھر چلی گئی۔ رات کو پھر آئی، ''امی آج آپ اٹھ کر خود چلی تھیں؟'' فرطِ مسرت سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

''امی آپ کو بتاؤں کیا ہوا، میرے اندر قدم رکھتے ہی شام کی ڈیوٹی والی نرسوں نے مبارک باد دی۔ کہہ رہی تھیں آپ کی ماں نے معجزہ دکھایا ہے، خود اٹھ کر چل پڑیں۔ پھر میں نے ان سب کو چاکلیٹ دی۔ آپ کے جرنل میں بھی لکھا ہے کہ آپ نے اپنے سارے کام خود کیے۔ میری بہادر امی۔''

مجھے ڈھائی سال کی پونیاں ہلاتی بچی یاد آ گئی، ''میری امی سخت ''بہادڑ ہیں۔'' پھر یوں ہوا کہ امی نے ساری زندگی سر پر لگے اس بہادری کے پھندنے کو سنبھالنے میں لگا دی۔

میری نرس ہمیشہ حیران ہو کر ان بچوں کو دیکھتی۔ ''تم لوگ تو ایک زنجیر کی طرح بندھے ہو۔ پھر اس عربی بچے سے پوچھا کہ تم کیا کہہ کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہو جو مریضہ اتنی خوش ہوتی ہے۔ اس نے سمجھایا کہ تمام مسلمان ہر کام شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ کہتے ہیں جس کا مطلب ہے ''اللہ کے نام کے ساتھ''۔ ان کا یقین ہے کہ اللہ ہر کام میں رحمت اور برکت ڈال دیتا ہے۔

اگلے دن وہ مجھے ڈرپ لگانے آئی تو میرا ہاتھ پکڑتے ہی بولی، ''بسم اللہ'' میں حیران ہو گئی۔ ظاہر ہے پھر مجھے بہت خوشی بھی ہوئی۔ کہنے لگی میں نے اسی لیے یہ سیکھا ہے کہ میرے مسلمان مریض خوش ہوا کریں گے۔ اس نے موبائل میں رومن حروف میں بسم اللہ لکھ کر محفوظ کر رکھا تھا اور اس کی ریکارڈنگ سن کر ازبر کر لیا۔ اپنے مریضوں کو خوش کرنے والی اس عیسائی عورت کو کوئی فرق

نہیں پڑتا تھا کہ بسم اللہ کہنے سے اس کا رشتہ خداوند یسوع مسیح سے کمزور پڑ جائے گا یا کلیسا کے دروازے اس پر بند ہو جائیں گے۔ اسے بس ایک ہی دھن تھی کہ حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا مریض کسی طرح مسکرانے لگیں۔

••

عالیہ دن میں کئی پھیرے ڈالتی۔ مجھے خوش کرنے کے لیے اپنے تھیلے سے رنگ برنگے تحائف نکالتی۔ اگر میں سو جاتی تو میری پیشانی پر ہاتھ رکھتی۔

''امی،'' اس نے ایک ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھا۔ ''امی'' ہاتھ کے لمس کا ریشم اور نرم آواز کی شبنم بیک وقت میرے وجود سے ٹکرائی جیسے رحمت سی برسنے لگی ہو۔ ''امی'' ہاتھ کا اور آواز کا محتاط دباؤ بڑھا۔

''آنکھیں کھولیں، میں آپ کے لیے قلم اور چھوٹی ڈائری لائی ہوں۔ آپ کے نئے موبائل پر وائس ریکارڈر بھی ہے۔ خود کو ضائع نہ کریں امی۔ لکھیں، قلم سے نہیں لکھ سکتیں تو وائس ریکارڈر میں آڈیو کلپ ریکارڈ کر لیں۔''

میرے کمرے میں آنے والے اس کے خصوصی کپڑوں اور دستانوں کو دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ اس کے چہرے کا تناؤ کم ہوا۔

''امی جی، جانتی ہیں ہوش میں آتے ہی آپ نے کیا کیا؟''

''بتائیں گی تو علم ہوگا۔'' میں نے رضائی ٹھیک کرنا چاہی۔ اس نے جھک کر میرے بدن سے منسلک تاروں کو احتیاط سے ریشم کے دھاگے کی طرح چھوا۔

''آپ نے کہا تھا میرے بیٹے کو بلا دیں، پھر آپ دوبارہ سو گئیں، اور جب آنکھ کھلتی آپ اسے بلاتی تھیں۔ آپ کو علم تھا ناں کہ میں تو آپ کے پاس ہوں۔ آپ بہت بہادر ہیں۔''

پھر مہینے بعد جب میں ہسپتال سے نکلی تو اُسامہ مجھے لینے کے لیے آیا۔ میرا مزاج بہت چڑچڑا ہو رہا تھا۔ ''میں نے میکڈونلڈ کی مچھلی کھانی ہے۔'' میں نے راستے میں میکڈونلڈ دیکھ کر کہا۔

''امی جی بہت رش ہے، آپ تھک جائیں گی۔'' اس نے سٹیرنگ چھوڑ کر میرے ہاتھ کو تھپتھپایا جیسے کوئی بچے کو بہلاتا ہو۔

''نہیں مجھے مچھلی کھانا ہے۔ میکڈونلڈ جانا ہے۔'' میں نے ضد جاری رکھی۔ بالآخر اس نے گاڑی موڑی اور ڈرائیو وے میں سروس پر کھڑی لڑکی کو میرا آرڈر لکھوایا۔ اس کے پاس بچوں کو

دینے کے غبارے رکھے تھے۔

''میری امی کو غبارہ مل سکتا ہے۔'' اُسامہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔ لڑکی نے مسکرا کر ایک غبارہ تھما دیا۔

''ایک اور دے دیں گی؟'' اُسامہ نے دوسرا غبارہ لے کر میرے دوسرے ہاتھ میں پکڑایا...

''چلیں شاباش، اب چپ کر کے بیٹھ جائیں۔'' اور میں واقعی گھر پہنچتے تک غبارے یوں سنبھالے بیٹھی رہی جیسے یہ طلسمی پرندے اڑ گئے تو ناقابلِ تلافی نقصان ہو جائے گا۔

دونوں بچوں نے مجھے محاورۃً نہیں حقیقتاً ہاتھ کا چھالہ بنائے رکھا۔ اُسامہ رات کو میرے پیروں کی مالش کر کے موزے پہناتا، ''چلیں اب سونے کی تیاری کریں۔ بہت ہو گیا۔ بجلی بند، آنکھیں بند، شاباش۔''

وہ بہت اچھے کھانے بنانے لگا تھا۔ مجھے بہت خوشی ہوتی کہ کم از کم میں اسے ایک ایسا مرد بنانے میں کامیاب ہو جاؤں جو بیوی کو خانساماں نہ سمجھے اور ہر دکھ سکھ میں اس کے ساتھ موجود ہو۔ عورت مرد کی بڑی سے بڑی بیماری اس کے ساتھ مل کر جھیل جاتی ہے بلکہ اس کی معاشی ذمہ داریاں بھی اٹھا لیتی ہے لیکن مرد بے چارے کو بیوی کی علالت میں کوئی روٹی پکانے والا درکار ہوتا ہے۔

''آپ کا کیا خیال ہے میں بیگم صاحبہ کے لیے کھانا پکانا سیکھ رہا ہوں؟ میں اپنی آزادی اور خود انحصاری کے لیے کھانا بناتا ہوں۔'' وہ ہنستا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آزمائش نے ہم تینوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مقناطیسی کشش سے باندھ دیا۔ خوف، امید اور دعا کی تکون نے ہماری زندگی دلکش بنا دی۔

••

میرا ابھی تک یہ حال ہے کہ دن اور تاریخیں یاد نہیں رہتے۔ کتنی فلائٹس چھوٹ گئیں۔ کتنی مرتبہ میں ایک دن پہلے ہسپتال پہنچ جاتی یا پھر ایک دن بعد نمودار ہوتی۔ سامان گم کرنا تو جیسے مشغلہ بن گیا۔ عالیہ نے سکِن سپیشلسٹ سے میرا پورا پروگرام بک کر رکھا تھا کیونکہ مسلسل ادویات کی وجہ سے جلد پر نیلے داغ دھبے نمودار ہو گئے تھے۔ اب ابا جی تو تھے نہیں جو رنگ برنگے لیپ بنا کر بھیجتے اور جلد کے سارے مسائل حل ہو جاتے۔ ابا جی نے مجھے سِرکے میں خشک کی گئی کلونجی، ناریل کے تیل اور زیرے سے ایک ماسک بنانا سکھایا تھا جس سے چند ہفتوں میں بازوؤں اور ہاتھوں سے

ڈرپ لگنے کے آثار جاتے رہے۔ لیکن اب کئی ماہ کے بعد بھی جلد کے دھبے بڑھتے جا رہے تھے۔ ایک دن عالیہ مجھے ساتھ لے کر گئی۔ اپنے دوست ڈاکٹروں سے ملوایا۔ آپریشن میں خون لگنے سے اور دیگر وجوہات کی بنا پر جلد کے مسائل بڑھ گئے تھے۔

تین دن لگاتار پھاہوں کی صورت میں کچھ ٹیسٹ دینا تھے۔ کمر پر کچھ خاص پلاسٹک کے پھاہے لگا دیئے جاتے جو جلد کو ٹیسٹ کرتے۔ خون کے ٹیسٹ بھی دینا ضروری تھے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ میں کوئی بچی نہیں، خود ٹرین سے چلی جاؤں گی۔ خیر، سویرے گھر سے نکلی۔ بارش، گھر کے سب سے چھوٹے ضدی بچے کی طرح منہ بسورے ریں ریں کرتی قطرہ قطرہ روتی ساتھ ہولی۔ پارکنگ سے ٹرین سٹیشن تک جاتے جاتے اس کی اشکباری نے مجھے بھی بھگو ڈالا۔ جولائی کے مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں بھی سرد ہواؤں نے بے مہری پھیلا رکھی تھی۔

حسبِ عادت میں آدھ گھنٹہ پہلے پہنچی تھی۔ کوپن ہیگن سٹیشن پر پہنچ کر میں ایک بنچ پر بیٹھی رواں دواں مسافروں کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر سٹیشن پر موجود چھوٹی سی دکان سے پانی کی بوتل اور دو ڈینش خریدے، دو اس لیے کہ سیل پر ایک تقریباً مفت مل رہا تھا۔ میں نے کارڈ سے ادائیگی کرتے ہوئے اچانک رکنے والی مشین کو دیکھا! یہ کیا؟ کارڈ کو رد کر دیا گیا تھا۔

''سوری، میرے پاس عینک نہیں ہے۔'' میں کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی سے مخاطب ہوئی۔

شیشے کے شوکیس کے پیچھے کھڑی لڑکی نے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر تفہیمی انداز میں سر ہلایا، ''کوئی بات نہیں، دوبارہ پاس ورڈ دو۔''

میں نے حسبِ ہدایت دوبارہ کارڈ گھمایا۔ مشین نے ادائیگی قبول فرمالی۔ جب میں مڑنے لگی تو شیشے میں مجھے اپنی شبیہہ دکھائی دی۔ عینک میرے سر پر ٹنگی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بے اختیار ہنس دیں۔

واپس آئی تو بنچ پر تھوڑی سی جگہ تھی۔ میں نے بیٹھ کر ابھی کھانے کا آغاز ہی کیا تھا کہ ساتھ والا جوڑا اٹھ کر چل دیا۔ دونوں میں شاید سرد جنگ چل رہی تھی کیونکہ نوعمر لڑکی کے ناراض تیور اور پیر پٹخنے سے یہی لگا۔ میں نے خوبصورت جھلملاتی دھوپ میں بیٹھ کر لفافے سے پیسٹری نکالی۔ اتنے میں ایک معمر ڈینش اسی بینچ پر آبیٹھا۔ میں سرک کر آخری کونے پر ہوگئی۔

ساتھ بیٹھے عمر رسیدہ ڈینش نے بڑی شائستگی سے پوچھا، ''کیوں! مجھ سے بُو آتی ہے؟''

''نہیں تو'' میں نے اپنی طرف سے بہت خوش اخلاقی سے کہا، ''میں تو سوچ رہی تھی کہ

آپ سہولت سے بیٹھ جائیں اور سامان بھی بینچ پر ہی رکھ لیں۔‘‘

’’اچھا، تو تم نسل پرست ہو۔‘‘ اس نے پھر اسی سنجیدگی سے پوچھا۔ اب مجھے اس کی ظرافت کا اندازہ ہوگیا۔ وہ بہت سنجیدہ انداز میں شرارت کر کے ہم تارکینِ وطن والے سوالات مجھے لوٹا رہا تھا۔ جو لوگ مشرقی ممالک سے آتے ہیں وہ اکثر ڈینشوں کو بدبودار، شرابی اور نسل پرست سمجھتے ہیں۔ میں نے ایک ڈینش اسے دی۔

’’کل پھر آؤ گی؟‘‘ اس نے شکریہ کہہ کر پیسٹری سنبھالی۔ اب میرے لیے ہنسی روکنا ممکن نہیں رہا تھا۔

’’ہاں، ہاں، کل بھی آؤں گی اور پرسوں بھی۔‘‘

’’میں ادھر ہی بیٹھا ہوتا ہوں۔ ابھی اولڈ پیپل ہوم جانے کو دل نہیں چاہتا۔ یہاں بیٹھا مسافروں کی ہلچل دیکھتا رہتا ہوں۔ میں کوپن ہیگن کی رائل لائبریری میں کام کرتا تھا۔ مجھے لوگوں سے ملنا اور ان کا مشاہدہ کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ میری مردم شناسی نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم مجھے ڈینش پیش کرو گی۔‘‘ نم نم، اس نے مزے سے ایک ٹکڑا کھایا۔ ہلکی سی گپ شپ کے بعد میں نے لائبریرین سے اجازت چاہی۔

جلد کے خصوصی کلینک پہنچ کر اوپر پانچویں منزل پر جا کر میں نے دوبارہ پرس نکالا اور اپنا رجسٹریشن کارڈ دیا۔ سفید کوٹ میں ملبوس عمر رسیدہ نرس نے میرا کارڈ مشین میں گھمایا۔

’’آپ کو تو کل آنا تھا اور الرجی چیک کرنے والے پلاسٹر لگوانا تھے؟‘‘ وہ کچھ پریشان سی نظر آئی۔

’’ہاں ہاں، میں کل آئی تھی، پلاسٹر لگے ہیں۔‘‘ میں نے وضاحت دی۔

’’اچھا؟ تو پھر اپنا میڈیکل کارڈ دیکھیں، آپ کو آنے والی کل کو آنا ہے یعنی صبح آیئے۔‘‘

پاس کھڑے تقریباً سات آٹھ برس کے ایک بچے نے ہنسنا شروع کر دیا۔

’’کوئی بات نہیں‘‘ نرس ایک مہربان مسکراہٹ کے ساتھ بولی، ’’اکثر لوگوں کو تو اپنا وقت یاد ہی نہیں رہتا۔ وہ آتے ہی نہیں، اسی لیے نئے قوانین کے مطابق تین سو کراؤن کا جرمانہ لگایا جاتا ہے۔‘‘

’’اچھا، لیکن میری مستعدی ملاحظہ فرمایئے، میں ایک دن پہلے آ گئی ہوں۔ کیا مجھے تین سو کراؤن کا اعزازیہ دیا جائے گا؟‘‘

••

تخلیق در تخلیق در تخلیق، خالق ہوں

بچہ گنبد کی صدا ہوتا ہے۔ لیکن اپنے ''ذاتی بچے'' پالنے کی جد و جہد میں بے شمار باتیں صرفِ نظر ہو جاتی ہیں، البتہ اصل پر سود وصول کرتے بچے کی ہر ادا، ہر تاثر، ہر حرکت یادداشت کی سِل پر ایک نقش بن جاتی ہے۔ آئمہ صوفیہ کا خارجی دنیا میں پہلا قدم، اس کی زندگی کے پہلے چند گھنٹے جیسے ایک رنگین سحر کا اسیر ہونا تھا۔

اس تحریر کو جانے کیا نام دینا چاہیے۔ سوشل میڈیا کی تاریک جہت کو دیکھنے والے اسے جو چاہے کہیں لیکن ہمیں تو اس میڈیا سے مسرت اور شناخت ملی۔ آئمہ صوفیہ کی آمد کے بعد شادمانی کے اظہاریے کے طور پر اس کے حوالے سے چند مضامین لگانا شروع کیے۔

''نانیات، نواسیات، نواسی نامہ، نانیالوجی، نانی گیری'' از رہِ تفنن مختلف اقساط لگانے سے حیرت انگیز اور خوش کن تبصرے ملے۔ اگرچہ کچھ روایتی قسم کی نانیات نے ناگواری کا اظہار بھی کیا، کہ یہ کیا حرکت ہے، نانی بن ہی گئیں تو اتنا غل مچانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب فیسبک پر لوگ ہمیں بھی بوڑھی نانی کہنے لگیں گے۔ شاعرہ کے تصور کے ساتھ نانی کا لفظ جچتا نہیں ہے۔

حیرت تو بہت ہوئی کہ کیا ابھی تک، بزعمِ خود روشن خیال عورت بھی عمر اور بیسی، گھیسی کے مقولے کی زد میں ہے اور مرد ساٹھا پاٹھا اور دادا، نانا بن کر بھی سماجی زندگی میں کسی اعتبار سے خائف اور کسی زاویے سے کمتر نہیں؟ مساواتِ مرد و زن کیا ہوئی؟ لیکن آئمہ کی کلکاری نے ہمیں اس بیکار کی بحث میں الجھنے نہیں دیا۔

ہماری نٹ کھٹ لاڈلی ڈاکٹر فاخرہ نورین نے ہمیں پہلے نانو اور پھر سود خور نانو کا خطاب دیا۔ وہ جب ہماری کوئی نئی تصویر یا پوسٹ دیکھتی، نانو سے پہلے مزید پھلجھڑی سے القابات لگاتی۔

اس کی دیکھا دیکھی ہم فیسکی نانی ہوگئے۔ اب محسوس ہونے لگا ہے کہ شاید ہمارا نام ہی نانو ہے۔

••

مجھے یاد ہے میری زندگی ایک مرتبہ پھر تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو ہوکر مجھے اس دن ملی جب اس ڈھائی کلو گوشت کے لوتھڑے نے پیدا ہوکر آنکھیں کھولیں تو مجھ پر جیسے زندگی نے براہِ راست روشنیوں کے در وا کر دیے۔ احسان مندی اور سرشاری سے لبریز دل کو یقین ہی نہ آتا کہ یہ بچی واقعی مجھے ملی ہے۔ اس کی تخلیق درتخلیق خالقِ مجازی میں ہوں۔ ذہن پر اشعار نازل ہونے لگے۔

میرا خیال تھا کچھ زخم بھر نہ پائیں گے
میرا خیال غلط اس کی اک نظر نے کیا

ایک مرتبہ پھر میرے ہاتھ میں گیلی مٹی رکھ دی گئی ہے اور اس بار آزادی و اختیارات کی ہفت رنگ ڈور بھی میرے ہاتھ میں دے دی گئی۔ اپنی اولاد کے لیے سائبان بن جانے کا سبق تو سالہا سال سے میرے پلو سے بندھا ہے۔ میرے اپنے سر پر ابا جی کا سایہ اتنا گھنیرا ہے کہ اس برگد کے سائے تلے نئی نسل بھی بآسانی بیٹھ کر سائے کی ٹھنڈک حاصل کرسکتی ہے۔

آئمہ صوفیہ جب تیزی سے ہاتھ پیر مارتی حیات بخش مسکراہٹ سے مجھے دیکھتی ہے تو میں اس کے ملکوتی چہرے پر امی جی کی روشن مسکراہٹ دیکھ سکتی ہوں۔ جب کبھی وہ اپنی ضوفشاں جھلملاتی ہنستی آنکھوں سے مجھے دیکھتی ہے تو میں ان میں ابا جی کی شبیہ دیکھ سکتی ہوں۔ بقول ابا جی، ایک بچے کی صورت میں زندگی اپنے تمام تر امکانات کے ساتھ آپ کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ مجھے ایک بار پھر اپنا بچپن عطا کیا گیا ہے، ایک حیاتِ نو کے پہلے زینے پر کھڑا کر دیا گیا ہے کہ اب دنیا میں ایک اور نافع انسان کا اضافہ کرنے کا وقت ہے۔

میں نے اسے بازوؤں میں لیا اور اس نظر کی روشنی میں دور تک اور دیر تک چلنے کا قصد کرلیا۔ فاصلے طے کرنے کے فیصلے چشم زدن میں ہوگئے۔ اس بچی کے لیے میں نے پورا ایک سال علمی و ادبی دنیا سے کنارہ کشی کی۔

کہا جاتا ہے کہ ہر بچہ جو دُنیا پر بھیجا جا رہا ہے وہ خالق کا اپنی مخلوق پر یقین کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ ابھی بھی تخلیق سے مایوس نہیں ہوا۔ چند گھنٹے کی آئمہ صوفیہ کو گود میں لیا تو پوری نظم والہانہ اناز میں دل کے چہار جوانب سے پھوٹی۔ یہ وارفتگی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ چمکیلی کالی آنکھوں، احمریں لبوں اور شہابی رنگت والی سانسیں لیتی گُڑیا نے میرے قلم کا رُخ بدل دیا۔ میں نے

نظمیں اور کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔

سال بھر کی ہوئی تو عالیہ کی چھٹی ختم ہوگئی۔ وہ علی الصبح ہسپتال کو روانہ ہوجاتی۔ آئمہ صوفیہ اپنی مرضی سے جاگتی، ادائیں دکھاتی، ناز اٹھواتی سارا دن میرے پاس رہتی۔ ویک اینڈ پر میں اپنے گھر واپس آتی تو دو ہی دن میں دل اداس ہو جاتا۔

••

کوزہ گری عبادت ہے...

پرانے زمانے کی بات ہے پہلے جب میں پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے کا امتحان دے رہی تھی تو میری سال بھر کی بیٹی باہر ماموں کی گود میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ پرانی ہم جماعت ملتیں تو ناک چڑھا کر کہتیں، ''تینوں رام نئیں۔ اگر سب سے پہلے اماں بن ہی گئیں تو تعلیم کی جان چھوڑ دو، لوگ یہاں سے بھاگ کر باہر پڑھنے جاتے ہیں، تم وہاں سے منہ اٹھائے یہاں آ گئی ہو۔''

ادھر ادھر سے اور یہاں وہاں سے سب کے رنگ برنگے تبصرے سن کر جب میں امی جی کی طرف دیکھتی تو حیران ہوتی۔ وہ ایسی توجہ اور احتیاط سے اس کے کام کرتیں، مرغی کے بچے سارا دن اسے لیے لیے پھرتیں۔ میں اکثر سوچتی پتہ نہیں نانیوں دادیوں میں ایسی کون سی پوشیدہ توانائی ہوتی ہے جو اپنے بچے پال سنبھال کر نئی پنیری سنبھالنے چل نکلتی ہیں۔ میرے تو بچے بڑے ہو جائیں گے تو میں صرف اپنے شوق پورے کروں گی۔

پھر ہوا یہ کہ جب ہماری صاحبزادی بھی پڑھتے پڑھتے پیا کو پیاری ہوگئیں، جس میں بہت سا دخل ہمارے وعدے وعید کا بھی تھا کہ تم بس شادی کرلو، ہم تمھارا پورا ساتھ دیں گے۔ دیکھو ہم دونوں کی کیسی انڈرسٹینڈنگ ہے، آپ کی جب تعلیم مکمل ہوگی تو آپ کو اور کوئی چنتا نہیں ہوگی۔ پھر دلائل دیتی کہ وقت پر شادی کرنے اپنے نئے خاندان میں اور اپنے ''بندے'' کے ساتھ نسبتۀ جلد یگانگت پیدا ہوتی ہے۔ خیر اللہ کے کرم سے سارے کام ترتیب سے ہوتے چلے گئے۔ صاحبزادی نے پچھلے سال میڈیکل کالج ختم کیا، پھر ہمیں ایک جیتا جاگتا تحفہ دیا۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے، ڈھائی کلو کے اس ہنستے روتے گوشت کے لوتھڑے نے ہمیں دنیا بھلا دی۔ اب اس کی ماں کو ڈنمارک کے ایک معروف ہسپتال میں نیورولوجی میں پی ایچ ڈی شروع کرنا تھی۔ حسبِ وعدہ ہم نے جو جہاں گردی کرنا تھی کرلی، بس اب صرف نواسی کے ناز اٹھائیں گے۔ ذہنی امراض اور مریضوں کے ساتھ رویہ اور نگہداشت ایک دلچسپ موضوع ہے۔ خود مجھے کتنا

کچھ سیکھنے کو ملا اس پر ہم بعد میں لکھیں گے۔

پہلے چند دن تو اس نے ہمارے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا جو غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے والوں کے ساتھ پولیس کرتی ہے۔ اٹھانے کی کوشش کروں تو ننھے ننھے بازوؤں سے پیچھے کو دھکا دیتی۔ بہلا پھسلا کر گود میں بٹھایا تو اس کی اوں ں ں ں کا ساز پورے کوپن ہیگن نے سنا۔لیکن پھر چند دن میں اس کے ننھے ذہن نے سمجھوتہ کرلیا، شاید یہی سوچ کر کہ یہ عورت جو کوئی بھی ہے جان تو چھوڑے گی نہیں، چلو ماں باپ کے آنے تک اسے لفٹ کرا ہی دو۔

وہ جو کہتے ہیں ''اصل نالوں سود پیارا'' اور بقول ہماری نٹ کھٹ ڈاکٹر فاخرہ نورین کے، توں سود خور نانو موجاں کر۔تو صاحبو، اب جب وہ مسکرا کر ننھی باہنیں گلے میں ڈالتی ہے اور پھولوں جیسے ہاتھوں سے ناک پکڑ کر اکھیڑنے کی کوشش کرتی ہے، کبھی بالوں کو گرفت میں لیتی ہے اور یقین کرنا چاہتی ہے کہ اصلی ہی ہیں، ہاتھ پر پہنی انگوٹھی کا نگینہ اتارنے کے جتن کرتی ہے اور تنگ آ کر کسی ملکوتی زبان میں جھگڑا کرتی ہے تو امی بہت یاد آتی ہیں۔ اللہ نے شاید اسی لیے آدم کو ماں باپ کے بغیر پیدا کیا تھا کہ زندگی کا پہلا اور آخری مقصد آنے والی نسلوں کی آبیاری کرنا ہی ہے۔ان کی خاطر کعبہ، بت خانہ سب چھوڑ چھاڑ کر زندگی صفا و مروہ کے درمیان زقندیں بھرنے لگتی ہے۔

میں اس کی ایک ایک ادا، ایک ایک آواز اور ہر مسکراہٹ پر ایک عجب شادمانی اور ناقابلِ بیان مسرت کے نرم جھونکے محسوس کرتی ہوں۔ اس نے پہلا لفظ دادا بولا تو دادی نہال ہو کر صدقہ اتارتی رہیں۔

پھر آ جا، بابا، ایناں ایناں۔۔۔اور خدا جانے روزانہ علم الاصوات میں کیا نادر اضافہ کرتی ہے۔ مجھے پکارنے کے لیے روزانہ ایک نیا نام ایجاد کرتی ہے۔ اناں، اور پھر ایناں، اور کبھی ننا کہہ کر گلابی رخساروں والے گال غبارے کی طرح پھلاتی ہے۔

ہم نے ابا جی کے سکھائے تمام تر دیسی نسخے اس پر آزمائے اور بالکل سادہ زیتون اور بادام کے تیل کے مساج سے اسے پالا، جس پر گھر آنے والی نرس بھی حیرت زدہ ہو کر پوچھتی ہے کیا آپ واقعی کوئی کریم لوشن استعمال نہیں کرتے؟

اسے شروع سے ہی کوئی الیکٹرونک کھلونا اور موبائل نہیں دیا گیا۔کونے پر رکھے چند ایک لکڑی اور پلاسٹک کے کھلونوں سے کھیلتی رہتی ہے یا پھر کپڑے کی بڑی سی رنگ برنگی کتاب جسے وہ کبھی پڑھنے کی کوشش کرتی ہے اور کبھی اس کو کھا کر علم گھول کر پی لینا چاہتی ہے۔ ایک گھنٹہ ٹی وی پر

بچوں کی اردو کی نظموں والے کارٹون دکھائے جاتے ہیں جو وہ بڑی خاموشی اور دلچسپی سے دیکھتی ہے۔

کھانے میں میٹھا اس کو ذرا پسند نہیں۔ ابلی ہوئی سبزیاں اور بھاپ میں بنی مرغی کھاتے ہوئے فوراً ''نیام نیام'' کہہ کر پکانے والے کو سراہتی ہے۔ کسی وقت میٹھا کھلانے کی کوشش کی جائے تو زبان کی نوک پر رکھ کر ''پھرررر'' کی آواز کے ساتھ باہر دھکیل دیتی ہے یا پھر تیزی سے سر کو نفی میں ہلاتی ہے، ''نینا نینا نی ا۔''

میری کتابوں کی دشمن ہے۔ جہاں نظر آجائیں ان کی ورق گردانی کرنا عین عبادت سمجھتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی انگلیوں میں قلم تھام کر اپنی دانست میں بے حد مہارت سے لکھتی ہے۔ لیکن مجال ہے جو کتاب یا کاغذ پھاڑے یا کہیں دیوار وغیرہ پر لکیر لگائے۔ البتہ جب چھوٹی تھی تو ایک رات کو کہیں کاغذ پر نظم لکھی، علی الصبح جب نانی نانی کھیلنا شروع کیا تو یاد ہی نہیں رہا کہ تکیے کے پاس کاغذ پڑے ہیں۔ وہ تو جب محترمہ نے آدھا صفحہ گیلا کر کے خراب کیا تو بمشکل باقی کاغذ اس کے چنگل سے چھڑایا۔ ''آپ کی بیٹی نے میری نظم کھالی ہے۔'' میں نے اس کی ماں کو شکایت کی۔ ''کوئی بات نہیں امی، بڑی ہو کر آپ کو کئی نظمیں لکھ دے گی'' جواب ملا۔ یقین کیجیے زندگی کا سب سے بڑا لطف اس گیلی مٹی کی کوزہ گری ہے اور سب سے بڑا مقصد اس سادہ کاغذ پر احترام انسانیت کا پہلا سبق جلی حروف میں تحریر کرنا ہے۔

اس سال ہم صرف فیملی کے ساتھ سفر کریں گے۔ صرف بچوں کی نظمیں لکھیں گے۔ اردو ادب کی خدمت بھی اپنے گھر سے شروع ہوتی ہے ناں۔ البتہ ڈنمارک کئی بین الاقوامی پروگراموں کا انعقاد اور میزبانی کرے گا۔

••

پلے گروپ کے بچوں کے ساتھ اسے ہنستے کھیلتے، بسورتے اور احتجاج کرتے دیکھ کر عجب معتبر کرتی مسرت ملتی ہے۔ ارسطو نے کہا تھا کہ بچوں کی سنگت میں رہو، روح جتنی بھی گھائل ہوگی، اس کے زخم بھر جائیں گے۔

حیرت سے زیادہ نشاط و انبساط کا احساس اس وقت حاصل ہوا جب ہمارے دوستوں نے ہمارا تعارف ہی اس ننھی بنجارن کو بنالیا۔ کراچی میں بچوں کے ادب کے حوالے سے ہمارے بے حد متحرک اور قابلِ احترام دوست سلیم مغل سے ملاقات ہوئی۔ بہت سرشاری حیرت نے آن گھیرا جب وہ فرمانے لگے کہ، ''آئمہ صوفیہ اور نانو، اب اردو ادب کے نئے کردار بن گئے ہیں۔ چند دن

پوسٹ نہیں لگتی تو کمی محسوس ہوتی ہے۔ اردو ادب میں نانی چندو کا کردار تو تھا ہی مگر نواسی آئمہ کا دلچسپ کردار پہلی بار سامنے آیا۔ یہ کمسن اور خوب صورت کردار اپنی نانو کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ میں نے آئمہ کا نام نائمہ رکھ دیا ہے۔نون نواسی کا ترجمان ہے۔"

کانفرنس کے اگلے دن میں محترم شمیم حنفی نے ایک خوشگوار تبصرہ کیا۔"بھئی اپنی نواسی کو ہماری بہت دعا دینا۔" پہلے دن ناشتے کی میز پر جناب شمیم حنفی، جناب انیس اشفاق، جناب قاضی افضال اور جرمنی سے جناب ڈاکٹر عارف نقوی تشریف فرما تھے۔ میں نے سلام کیا۔سب کا مشترکہ گرم جوش جواب ملا۔

ابھی میں ناشتے کی پلیٹ بنا کر لائی ہی تھی کہ جناب شمیم حنفی نے فرمایا،"بھئی کیا خوب لکھتی ہیں آپ۔ اپنے ابا کے بارے میں اور کیا منفرد تحریریں ہیں نواسی کے بارے میں۔ میں فالو کرتا ہوں فیسبک پر۔"

"ہائیں،" فرطِ حیرت و مسرت سے میرا نوالہ گر گیا۔ آپ میری تحریریں پڑھتے ہیں؟؟؟"

"ہاں" وہ سادگی سے بولے۔"آپ سادہ اور رواں لکھتی ہیں۔ بچی کے بارے میں بالکل نقشہ کھینچ دیتی ہیں۔ مجھے اپنے ابا والی کتاب ضرور بھیجنا، میں پڑھنا چاہتا ہوں اور نواسی کو میری دعائیں پہنچا دینا۔"

میرے لیے آنکھوں میں آئی نمی پی جانا ممکن نہیں رہا۔ہم انسان کتنے ہی جی دار کیوں نہ ہوں، کچھ لمحے بہا کر لے جاتے ہیں۔ اللہ ایسے وسیع القلب، اعلیٰ ظرف اور وضع دار بزرگوں کو سلامت رکھے۔

عجیب سی بات یہ ہونے لگی کہ اب دوست ہمیں نواسی پر لکھی نظم اور خاکوں سے یاد کرنے لگے۔ ناروے میں جمیل احسن صاحب سے ملاقات ہوئی تو پوچھنے لگے۔"اب نیا کچھ نہیں لکھا آپ نے بچی پر۔ یہ سب کالم چھپوا ڈالیں، محفوظ ہو جائیں گے۔ کیا اعلیٰ اور سادہ اسلوب سے آپ بچی پر مضمون لکھتی ہیں کہ باقاعدہ ان کا انتظار رہتا ہے۔"

ناروے کے معروف شاعر ادریس بھائی جب نانا بنے تو مجھے فون کر کے کہنے لگے،"آپی آپ سچ ہی کہتی تھیں کہ انسان کا پاؤں زمین پر نہیں رہتا، واقعی یہ ڈھائی تین کلو کا ہنستا روتا لوتھڑا انسان کو سب کچھ بھلا ڈالنے پر مجبور کر دیتا ہے۔"

یہ محض چند تبصرے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب بچی کے بارے میں لکھنا ایک شناخت بن چکا ہے۔ فیسبک کی پیاری سہیلیاں اکثر لکھتی ہیں کہ آپ کی تحریروں سے باقاعدہ یہ احساس ارمان پلنے لگا ہے کہ ہم بھی جلد از جلد نانیاں بن جائیں۔

سب سے زیادہ اعزاز کی بات یہ ہے کہ ننھی آئمہ صوفیہ کو پالنے سے ہی ادبی رشتے، محبتیں اور دعائیں ملیں۔ نسل در نسل محبت بانٹنے والو، شکریہ کم مایہ لفظ ہے۔

••

برلن میں فروغِ اردو اور لسانی و ثقافتی پل کی تعمیر میں تندہی سے مصروف محترم عارف نقوی کی میزبانی کا اعزاز حاصل ہوا۔

عارف نقوی میرے بچوں سے ملے۔ عالیہ سے تفصیلی گفتگو کرتے رہے۔ اُسامہ چونکہ جاب پر تھا، اس سے سرسری بات ہوئی۔ البتہ پھر آئمہ صوفیہ نے خوب گیت سنائے۔ مجھے اس وقت واقعی بہت لطف آیا جب عارف نقوی عالیہ کی ذہانت کو سراہتے ہوئے تشکیک بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے۔

''بہت ذہین بچی ہے بھئی، بہت شائستہ۔ میرا جی چاہتا پنجابی میں کہوں۔ میری اپنڑی اے۔ ذاتی۔''

عالیہ کو بھی ان کا شیریں لکھنوی لہجہ اور انداز بہت پسند آیا۔ میں کھانا بناتے ہوئے دونوں کی گفتگو سنتی رہی۔ بلند بختی کا تصور نعمتوں کا تشکر ہم سب کے نزدیک مختلف ہے۔

آج عارف نقوی کا لنچ میرے گھر تھا۔ ہماری صاحبزادی اور نواسی صاحبہ آئیں۔ چند لمحوں میں خوب گھل مل کر گانے سناتی رہی، پھر ایڑیوں پر گھوم کر دکھایا اور پھر اردو گیت سنایا۔ اچانک نقوی صاحب کو کھانسی آ گئی۔

آئمہ بھاگی آئی۔ ''نانو نانو۔ تھوڑا سا پانی۔ تھوڑا سا پانی۔''

''اچھا جی۔'' میں نے پانی کا جگ بھر کر میز پر رکھا۔ ان کو ایک گلاس پانی دیا۔ آئمہ صاحبہ مطمئن ہوگئی۔ عالیہ ان کے پاس بیٹھی گپ شپ کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ کھانسے۔ ان کو کچھ الرجی کی شکایت تھی۔

اب آئمہ صوفیہ سنجیدگی سے بولی۔ ''نانو، قاوہ (قہوہ) بناااا آئیں۔''

مجھے بہت ہنسی آئی۔ ''بوا حکیمن کہیں کی'' ایک بے پایاں طمانیت دل میں اترنے لگی۔

میرے نزدیک بلند بختی صرف یہی ہے کہ آپ کی نسلوں کو ایسے بزرگوں کی شفقت نصیب ہو جو ان کی شخصیت سازی میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

••

جرمنی سے ہماری بے حد باصلاحیت دوست، شاعرہ، مصنفہ اور مترجم عشرت معین سیما ٹی وی لنک کی دعوت پر ڈنمارک تشریف لائیں اور ہمارے غریب خانے پر قیام کیا۔ آئمہ صوفیہ کے والدین کو کہیں جانا تھا تو وہ ہمارے پاس ہی تھیں۔ رات کا کھانا ہم نے مل کر کھایا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بہت خاموشی اور غور سے مہمانی کا جائزہ لے رہی تھی۔ اگلے دن ہم رات گئے ٹی وی لنک کے دفتر سے واپس آئے۔ گھر داخل ہوئے، جوتے بدلے، تو عشرت کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز ائی۔ کیا ہوا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ کوئی جن بھوت تو عاشق نہیں ہو گیا۔

کہنے لگیں نہیں، کل غسل خانے میں آپ کا پلاسٹک کا وضو والا چپل پڑا تھا، وہ پہن لیا۔ وضو کر کے باہر آئی تو آئمہ صوفیہ بھی خاموشی سے میرے پیچھے چل دی۔ پھر دروازے پر کھڑے ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ جونہی میں نے جوتا اتار کر جائے نماز پر پیر رکھا یہ بی بی سمجھ گئی کہ اب مجھ پر پابندی لگنے کو ہے۔ آئمہ بی بی نے پہلے ایک جوتا اٹھایا، پھر مزید حوصلے سے آگے ہوئی، دوسرا جوتا اٹھایا اور دوڑ لگا دی۔ ''نانو جوتا۔ نانو جوتا۔''

میری نواسی یقیناً ازحد خوش قسمت ہے کہ اس کے ابتدائی بچپن سے ہی اس کی انگلی تھامنے والی شخصیات بلند پایہ ہیں۔

••

ڈاکٹر نبیلہ گھر آئیں تو ان کے ساتھ ایک دم گھل مل گئی بلکہ ان کو بھی نانو کہنے لگی۔ ان کی انگلی تھام کر باہر سیر کرنے چل دی۔ میں اوپر کھڑکی سے دونوں کو دیکھتی رہی۔ نبیلہ اسے جھولے پر بٹھائے جھلا رہی تھیں۔ میں نے ان کی تصاویر بنائیں۔

ایک دن آئمہ صوفیہ آئی۔ نبیلہ کمرے میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

''جایئے نانو سے پوچھیں چائے پئیں گی۔'' اس نے میری گود میں بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی۔

''نانو۔ چھائے ئے ئے؟'' ابھی وہ چائے کو ڈینش انداز میں چھائے کہتی تھی۔

اندر سے نبیلہ نانو نے اسی طرح جوابی صدا بھیجی، ''نہیں شکریہ''

آئمہ صاحبہ فوراً بولیں، ''نانو، سی آ، نائے۔'' یعنی نانو کہہ رہی ہیں نہیں۔

ہمارے بے ساختہ ہنسنے پر گول گول گال پھلا کر بیٹھ گئی۔

آج کل ایک نئی حرکت فرما رہی ہیں محترمہ۔ جب والدہ لینے آئیں تو جانے سے صاف انکار کر دیا۔ دونوں پیر صوفے پر رکھ لیے۔ ''نائے نائے۔'' پھر روتی ہوئی واپس گئی۔ ''نائے نائے'' امی جی اور لکھیں، نہیں نہیں والی شاعری، ساری میری بیٹی میں منتقل ہوگئی۔ اس کی ماں بڑبڑانے لگی۔

••

انطالیہ۔ترکی کی سیر

نانو کی ننھی بنجارن، ایک طمانیت بھرا غرور، ناز بھرا نیاز، آئمہ صوفیہ کی نانو۔ اب یہ نیا تعارف بن گیا۔ سمیرا اکبر سے فون پر بات ہوئی تو پہلا سوال ''آئمہ صوفیہ کا کیا حال ہے۔'' زرقا اظہر سے زارا مظہر تک۔ سب پہلے اس دو برس کی بنجارن کا حال پوچھتے ہیں جو آج کل اردو ڈینش اور انگریزی کے گیت گاتی ہے۔ اسے بھی نانو کی طرح سمندر سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ چڑیا سے مکالمہ کرتی ہے۔ آ جائیں۔ کھانا کھالیں۔

آٹھویں منزل سے اپنے کمرے میں کھڑی سمندر سے باتیں کرتی آئمہ صوفیہ کوہِ طوروس میں گھرے ترکی کے دلکش شہر انطالیہ کی سیر کرائے گی۔ ہمارے ایرانی دوست اس شہر کو انتالیہ لکھتے ہیں۔ قدیم تاریخ نے اس شہر کو عجب اسرار بھرا حسن عطا کر رکھا ہے۔ اس کے ماضی کے سارے ڈانڈے یونانیوں سے ملتے ہیں۔

کوہِ طوروس، (انگریزی: Taurus Mountains، ترکی: Toros Dağları) جنوب مشرقی اناطولیہ کا ایک پہاڑی سلسلہ ہے جس میں سے دنیا کا مشہور دریا فرات نکلتا ہے۔

آئمہ صوفیہ، دبئی کی فضاؤں پر غور وفکر۔ ابھی کسی کے ایک مزے دار جملے نے یہ پوسٹ لکھنے پر اکسایا۔ ''نانی، دوتری۔۔ پھر اکل'' یعنی نانی نواسی پھرتی رہتی ہیں۔

ہمارے گھر میں ایک رواج رہا کہ بچوں کی سالگرہوں پر یا کسی بھی بات پر انعام دینے کے موقع پر ان کو کہیں سیر کرا دی جائے۔ باہر، دریا کے کنارے سہی لیکن باہر ضرور لے کر جائیں۔ ماشاءاللہ آئمہ چند ماہ کی عمر میں پاکستان آئی اور اس کے بعد سے دنیا کے سفر پر ہے۔ برف کے گولے بناتی آئمہ دوبئی میں پانی کے بلبلے بنانے پر خوش ہے۔ لیکن بلبلے بنا کر تکی رکھنے اور تالی

بجانے کے مختصر وقفے میں بلبلے پھوٹ جاتے ہیں اور آئمہ دوبارہ نلکی ننھے سے دہانے سے لگا لیتی ہے۔ زندگی کا تسلسل جاری ہے۔

••

پاکستان آنے کے لیے سال کے آخری مہینے کا انتظار بچپن میں گزاری عیدوں جیسا ہے لیکن کبھی سنا تھا کہ

ایک نادیدہ سی زنجیر محبت جس میں
پابستہ رہتے ہیں سب اختیار مرضی سے

اس مرتبہ بوریا بستر باندھتے مسرت کو اس نادیدہ زنجیر نے پابستہ کیا ہے۔ اب پہلے کی طرح موسمِ سرما کے آخری مہینے پاکستان میں گزارتے ہوئے دھیان اس ننھی طوطی میں رہتا جس میں میری جان بند ہوگئی تھی۔

آئمہ کی پیدائش کے بعد میں جب دو ماہ پاکستان رہنے کے بعد واپس آئی تو فلائٹ کی تاخیر متوقع تھی۔ محترمہ سات سے آٹھ بجے کے دوران سو جاتی ہیں۔ میرے گھر پہنچنے پر وہ سو چکی تھی۔ اب اس کی نیند خراب ہوگی، مجھے تشویش ہوئی۔

''یہ آپ کی طرف رہیں گی دونوں۔'' داماد بیٹے نے کہا۔

''اچھا،'' میں نے کچھ تذبذب سے کہا۔ ہماری نواسی ہماری ہی طرح اپنے ابا کی دیوانی ہیں اور صبح آنکھ کھلتے ہی بابا نظر نہ آئیں تو نقضِ امن کا خطرہ بھی ہے۔ بہت عرصے بعد آئمہ صوفیہ رات کو میرے پاس رہی۔ داخلی گھڑی بدلنے کی وجہ سے مجھے نیند دیر سے آئی۔ صبح شاید سات بجے تھے۔ میری آنکھ ننھی سی چہچہاتی آواز سے کھلی۔

''ننا۔۔ ننا۔۔ ناااااانو، ہلکی سی گنگناتی آواز نے سماعت کو مرتعش کیا، پھر ننھی ننھی نرم انگلیاں میری رضائی ہٹانے کی کوشش کرنے لگیں۔ کمرے میں ابھی نیم تاریکی تھی لیکن یوں لگا جیسے ان انگلیوں سے کرنیں پھوٹ رہی ہوں اور طلوعِ آفتاب وقت سے پہلے گھر کے مغربی گوشے سے ہوگیا۔

آئمہ صوفیہ کھنکتی آواز میں ہر لفظ گنگناہٹ کے انداز میں بولتی ہے۔

مااااموں ں ں۔۔۔ اور ماموں نثار ہو جاتا ہے۔

جونہی گاڑی گھر سے نکل کر دادو ہاؤس کی طرف مڑتی ہے، اس کا راگ بدل جاتا ہے، دادوود، پوپو۔ لیکن چونکہ چھوٹے چاچو جانی سے بہت پیار ہے سو ان کے نام کے گیت میں بند طویل

بھی ہیں اور زیادہ بھی۔ چاچو، چاچو۔ چاااا۔ چوووو۔ جبین چاچو (زین چاچو)، اور مسکین چاچو کی مجال نہیں کہ ایک مرتبہ بھتیجی کے پاس آ کر باہر جاسکے، باقاعدہ رورو کر ضد کرتی ہے،'' چاچو لینا ہے، چاچو لینا ہے۔''

ڈنمارک کے تعلیمی نظام میں چونکہ گیتوں اور نظموں کا چلن زیادہ ہے اور اس کی استانی صاحبہ بھی کھیل کود کر نظمیں گاتی ہیں، گھر پر نانی گنگناتی ہے، لہٰذا نواسی صاحبہ ہر بات مترنم انداز میں پیش کرتی ہیں۔ ہماری بھتیجی کی طرح یہ حساب کے فارمولے گانے پر بھی قادر ہوں گی شاید۔ میں اسے خود میں مگن کتابیں لے کر گنگناتے دیکھتی رہی۔ یہ الوہی سرود اور معصوم ترنم ہر چیز بہا کر لے جانے پر قادر ہے۔ تھکن، غم، پچھتاوے، ہجر، اندیشہ ہائے دور دراز، سب کو بھاپ بنا کر اڑا دینے کی قوت رکھتا یہ ننھا سا وجود کتنی بڑی رحمت ہے۔

جب اس کی ماں بیدار ہو کر آئی تو ہم دونوں ابلے ہوئے انڈے اور مالٹے کے تازہ جوس سے ناشتہ کر رہے تھے۔ کیا اس سے زیادہ حسین زندگی کا تصور ممکن ہے؟

••

کہاں ہو تم، کہاں ہو تم

''وہ اے آ تووؤ''، hvor er du....Hvor er du

بچوں کو ہاتھ کی انگلیوں کے نام سکھانے کا ایک گیت جسے کلاسیکی حیثیت حاصل ہے، یہ نارویجن فنگر فیملی گیت ہے جو انگریزی میں ترجمہ ہونے کے بعد دنیا بھر میں پھیل گیا۔ میں نے تدریسی دور میں اس کا ترجمہ کیا تھا۔

میاں انگوٹھے۔۔ میاں انگوٹھے،\
کہاں ہو تم، کہاں ہو تم\
یہیں پہ ہوں میں، یہیں پہ ہوں میں\
السلام علیکم، السلام علیکم

آئمہ صوفیہ جمعہ کو سارا دن میرے پاس رہی۔ وہ گانے کو نئے نئے لفظ لگا کر بدل لیتی ہے۔

بابا، بابا، وہ اے آ توووو\
بابا، بابا، کہاں ہو تم

مجھے اس کی حرکت پر بہت حیرت ہوئی۔ ابھی بحرِ حیرت میں غوطے کھا کر باہر آئی تو اس

نے دونوں ہاتھوں کے منے منے انگوٹھے نکالے اور انھیں لہرا کر بولی،

ننا ننا۔۔۔۔ وہ اے آ تو وووووو

ننا ننا، کہاں ہوتم، السلام علیکم

شنگرفی ہونٹوں کا پھول سا دائرہ بنا کر، توتووووو، تووووو کرنے لگی۔ میں نے اس کی ننھی سی سری کا معائنہ کیا۔ پھر چھوٹا سا منہ دیکھا، ''الٰہی کہاں سے ایسی باتیں کرتی جوڑتی ہے یہ لڑکی۔''

آئمہ نے جھٹکے سے اپنا آپ چھڑایا۔ پھر میرا جوابی معائنہ کیا۔ اگر میں دماغ اور سوچ کی لہریں پڑھنے پر قادر ہوتی تو یقیناً جواب آتا، ''الٰہی۔۔ کہاں سے ایسی باتیں جوڑتی ہے میری نانی۔''

••

میرے گھر کے پاس سمندر کے کنارے کھیلنا آئمہ کو بے حد پسند ہے۔ چھٹی کے دن دھوپ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اچانک اس نے چند بچوں کو ہاتھ میں آئسکریم لے کر جاتے دیکھا۔ پہلے تو اس نے گردن موڑ کر نظروں سے ان کا تعاقب کیا۔

''نانو،'' آئمہ کی ننھی سی سرگوشی سنائی دی۔ ساتھ ہی ہاتھ کا اشارہ کیا،

''ای ی ی ی سس'' یعنی آئسکریم۔ ڈینش تلفظ اِیس ہے۔ اس لفظ کی درازی، مانگنے والی کی ٹپکتی رال کی مناسبت سے تھی۔

''بیٹا، آپ کی امی سے اجازت لے لوں'' میں نے اس کے گال تھپتھپائے۔

''اچھا''، وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ یقیناً اسے علم تھا نانو جم کر مقدمہ لڑیں گی اور اجازت لے کر ہی ٹلیں گی۔ ڈنمارک میں بچوں کی غذا و صحت کے مطابق بہت سے کیفے ہیں لیکن ہماری صاحبزادی ہفتے میں ایک مرتبہ فریز کیے دہی اور فروٹ کی مٹھاس سے جعلی قسم کی آئسکریم بناتی ہے جو معصوم نواسی غنیمت سمجھ کر کھا لیتی ہے۔

میں نے کہا آج آئمہ میرے سمندر پر آئی ہے سو آئسکریم کھانی چاہیے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اپنے سکہ بند جملے بولتی جس میں نانی کے بگاڑنے کا ذکر ہوتا، میں نے جلدی سے کہا، ''چائلڈ فرینڈلی آئسکریم بھی ہے۔ آنگلو۔ چھانگلو جتنی، آئسکریم کے نام پر تہمت، سٹرابیری سے بنی، بغیر میٹھے کے۔''

میں نے یوں تیزی سے تفصیلات بتائیں جیسے مجھے اشتہاری برانچ میں منافع ملنا ہو۔

''اچھا۔'' اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی میں نے مڑ کر منتظر آئمہ صوفیہ کو اشارہ کیا۔ ہم دونوں اٹھ کر کیفے کی طرف بھاگیں۔ میں سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ دو برس کی آئمہ بڑے اعتماد سے قطار میں کھڑی ہو کر باری کا انتظار کرنے لگی۔ اس کے پیچھے لمبا تڑنگا تقریباً ساڑھے چھ فٹ کا آدمی آ کھڑا ہوا۔

صاحبزادی ننھا سا چہرہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگی، پھر بہت بے تکلفی سے بولی،

''ہا آ آ ئے۔ ہیلو۔''

جواب میں وہ کھلکھلا کر ہنسا، ''سونے کی ڈلی۔''

••

باورچی خانے میں سب سے اوپر والے شیلف سے کچھ اتارنے کی کوشش میں کرسی رکھی، آئمہ صوفیہ قالین پر بیٹھی ڈرائنگ کر رہی تھی، مجھے دیکھا تو اٹھ کر بھاگی آئی۔

''نانو۔۔ Pass på Ikke fald'' یعنی احتیاط کریں، گر مت جائیں۔ پھر اردو میں بولی۔۔ ''نانو، نیچے، شاباش۔۔ نیچے۔۔ نیچے۔''

اس کے ننھے منے چہرے پر تفکر کے بادل تھے۔ وہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اتنی دیر کھڑی رہی جب تک میں نیچے نہیں اتری، جیسے اگر میں گر گئی تو اپنے ہاتھوں سے روک لینے پر قادر ہو۔ مجھے واقعی آج علم ہوا کہ فطری طور پر محبت میں دوسرے کا خیال، دھیان، اور بے تابی ہے۔ قریبی ترین رشتے سے یہ عنصر منہا کر دیجیے تو محبت یہ شعلہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ فطرت اور محبت کی اصل تعریف آج اس بچی نے سکھائی۔

کاش اللہ والدین اور بزرگوں کو یہ توفیق دے کہ وہ اپنے ہاتھوں میں انعام کی صورت دیے گئے ان ننھے منے انسانوں کو ہمیشہ اس فطرت سے محبت کرتے رہنے کا سبق دے سکیں۔ ایک آفاقی خواب کہ محبت آفاقی ہوتی ہے، معصوم اذہان کو مسموم کیے بغیر فطرت کو پنپنے دینے کا فریضہ بہت بھاری ہے لیکن اس کے ساتھ تسکین و شادمانی کے اعزازات پیوستہ ہیں۔

••

مرا نام ہے اب اُسامہ کی امی۔

''آپ عالیہ کی امی ہیں؟'' میں ریسٹورنٹ میں بیٹھی نواسی صاحبہ کو اوون سے نکلی گرما گرم روٹی اور مچھلی کھلانے میں مگن تھی۔ اس کی ماں کانفرنس کے شام کے اجلاس میں شرکت کے لیے جا چکی تھی۔ ''عالیہ کی امی۔'' ایک لمحے کے لیے تو سماعت کو اس نام کی بازگشت نے مسحور کیا۔ مجھے یاد

آیا کہ اُسامہ ابھی آٹھ نو برس کا تھا تو میں نے اس کے ایک دوست کے گھر فون کیا جو اکثر کھیلنے اور پڑھنے کے لیے ہمارے گھر آتا۔ اتفاق سے فون اسی نے فون اٹھایا۔ میں نے پہلے تعارف کرایا۔ ''بیٹا میں خالہ بول رہی ہوں۔''

''خالہ؟'' میں ان کی واحد خالہ تھی۔ باقی لوگوں کو وہ ''آنٹی'' کہتے تھے۔ لیکن چونکہ اُسامہ ان کی والدہ کو خالہ کہتا تھا، وہ بھی مجھے خالہ کہنے لگے۔ میں نے اسے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ ''میں اُسامہ کی امی بات کر رہی ہوں۔''

''اچھا۔ تو یوں کہیں ناں۔'' وہ یوں بولا جیسے کسی نالائق دوست سے بات کر رہا ہو۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ ہم آپ کو گھر میں اُسامہ کی امی کہتے ہیں۔

اس دن ایک ہی نشست میں نظم ''میرا نام ہے اب اُسامہ کی امی'' لکھی۔

خیر، میں بات سنا رہی تھی اس شام کے ڈنر کی جو ہم دونوں نانی نواسی پورے ریسٹورنٹ میں تنہا بیٹھی تناول فرما رہی تھیں۔ ہم دونوں نے اپنا شغل روک کر اسے دیکھا۔ دراز قد اور دبلے پتلے صاحب کے سینے پر نام کا بیج لگا تھا۔ اس کی ذہین نیلی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ بھی ڈاکٹر ہوگا۔

''مجھے علم ہے کہ ان تین دنوں میں پورے ہوٹل میں ایک ہی ننھا فرشتہ اور اس کی نانی جان ہوسکتی ہیں۔'' اجنبی ڈاکٹر نے ہنس کر کہا

''میں ماؤنس ہوں، پی ایچ ڈی میں ڈاکٹر عالیہ کا سپر وائزر ہوں۔'' اس نے مصافحے کو ہاتھ آگے بڑھایا۔

''اوہ، اچھا'' میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس بے مثل ڈاکٹر، استاد اور اس کی انکساری، انسان دوستی، قابلِ تقلید تدریس پر کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ عالیہ روزانہ ان کی نرم مزاجی کے قصے سناتی۔ میرے ذہن میں ایک سینئر اور درمیانی عمر کے استاد کا تصور تھا لیکن وہ کسی طور سے درمیانی عمر کے نہیں لگتے تھے۔ انھوں نے شفقت سے آئمہ صوفیہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''یہ ہماری آئمہ صوفیہ ہے۔'' آئمہ بھی حسبِ عادت غور سے انھیں دیکھ رہی تھی۔

''عالیہ ایک بہترین محقق اور بہت پراعتماد ڈاکٹر ہے۔ ہمارا ہسپتال اس کی آمد پر خوش اور ذہانت اور محنت کی قدر کرتا ہے۔'' ماؤنس نے مجھے بتایا۔ کچھ لوگ کہیں چند منٹ بھی قیام کریں تو خوش سخنی کی خوشبو بکھیر دیتے ہیں۔ باہر مسلسل گرتی رم جھم سے شام بھیگ رہی تھی۔ شکر گزاری کے

احساس سے میرے اندر بھی کہیں بارش ہونے لگی۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور شاید کہا کہ میری بیٹی بہت خوش بخت ہے جسے زندگی نے اتنا زبردست موقع دیا۔

''آپ لوگوں کے کھانے میں مخل ہوا۔ معافی چاہتا ہوں۔ مزے سے کھانا کھائیں۔'' انھوں نے آئمہ کو ہاتھ ہلایا۔ جواباً اس نے دونوں ہاتھ لہرائے۔

آئمہ صوفیہ کی پیدائش سے پہلے عالیہ کو ڈرماٹالوجی میں پی ایچ ڈی کا داخلہ ملا۔ تین ماہ بعد آئمہ کی آمد کا سندیسہ آیا۔ ڈنمارک میں میٹرنٹی کی چھٹی ایک سال ہوتی ہے۔ اس دوران اس نے فیصلہ کیا کہ میں مکمل طور پر اپنی بچی کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی ہوں اور اس پی ایچ ڈی پروجیکٹ کو خیر باد کہنا چاہتی ہوں۔ یہاں کے تعلیمی نظام میں بھی بچوں کے والدین کو سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ سال پورا ہونے سے پہلے اسے نیورو سائیکاٹری میں ڈنمارک کے معروف ہسپتال میں پی ایچ ڈی پروجیکٹ مل گیا۔ دو دن وہ ہسپتال میں مریضوں کو دیکھتی ہے اور تین دن تحقیق کرتی ہے۔ جتنی سہولیات اور آسانیاں اسے دی گئی ہیں ان کا عشرِ عشیر بھی پاکستانی ڈاکٹر ماؤں کو ملے تو وہ دنیا کی صفِ اول کی مسیحا ہوں۔

رات گئے عالیہ ڈنر کے بعد کمرے میں آئی، ''امی آپ ڈاکٹر ماؤنس کو ملی تھیں؟ اس نے اجلاس میں آتے ہی میز پر گھنٹی بجا کر سب کو متوجہ کیا اور بتایا کہ ہماری کانفرنس کے دو اہم شرکاء باہر ڈنر کر رہے ہیں۔ سب لوگ حیران ہوگئے کہ ایسی مائیں بھی ہوتی ہیں جو اپنی زندگی کی سب مصروفیات چھوڑ کر نواسی کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ساتھ چل پڑیں۔'' اس کی کئی کولیگز نے بتایا کہ انھیں بہت مشکل سے اپنے بچوں کا انتظام کرنا پڑا ہے اور اب تین دن بعد ہی ان کو ملیں گے لیکن آپ تو انتہائی خوش قسمت ہیں۔ ''کل میرا گروپ آپ کو ملنے آئے گا۔ حیران نہیں ہونا۔''

اب اسے کون بتائے کہ والدین کو حیرتوں کے یہی سلسلے جوان رکھتے ہیں۔ زوالِ عمر کی زد میں جاتے ہوئے یہ نعمت کم ہی والدین کو نصیب ہوتی ہے کہ ان کے لیے وقت کا پہیہ الٹی چال چل جائے، گردشِ ایام پیچھے کو دوڑے اور معصوم بچے سے ان کی گود بھر دی جائے، نافع انسان ہونے کا اعزاز دیا جائے۔ ابا جی کی طرح میں نے بھی زندگی کو اس کی نعمتوں سے شمار کرنا سیکھ لیا تھا۔

واپسی کے سفر پر ہم معروف ڈینش مصنف اور الف لیلوی کہانیوں کے شہنشاہ ہانز کرسچن اینڈرسن کے گاؤں سے گزرے۔ ڈینش میں اسے (ہینس کھَغِس چَن آنا سَن) کہا جاتا ہے اور بچہ بچہ اس کے نام سے واقف ہے۔ میں نے تدریس کے زمانے میں اس کی بہت سی کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا اور اس کی تنہائی بھری زندگی پر مضمون بھی لکھا۔ کیسی تحیر آمیز حقیقت ہے کہ جن لوگوں کے

اپنے دل کبھی آباد نہ ہوں وہ دوسروں کی زندگی میں خوشی بھرنے کے قابل کیسے ہوتے ہیں۔

ہم سوا برس کی آئمہ کو اس کی زیارت کرا کے لائے۔ ''آئمہ صوفیہ'' میں نے اسے مجسمے کے قریب بٹھایا، ''جب آپ بڑی ہوں گی تو کہانیاں بھی لکھا کریں گی۔''

••

کیا تمھارا خدا ہے ہمارا نہیں؟ لا حافیج۔ خاخافیج۔

آئمہ صوفیہ چند گھنٹوں کے لیے ابتدائی نگہداشت کے ادارے میں جاتی ہے۔ اس عمر میں فطری طور پر بچے تیزی سے بولنا سیکھتے ہیں۔ سو محترمہ وہاں ڈینش میں بات چیت کرتی ہے۔ ہائے۔ ہیلو۔ چھاااک۔ (شکریہ)، اور فاویل یعنی خدا حافظ۔ جب وہ گھر آتی ہے تو اردو کے لفظ بولنا شروع کر دیتی ہے جس میں ''نہیں'' ترجیحی طور پر بولتی ہے۔ پھر شکیہ۔ (شکریہ) اور آخری لفظ ''لافیج'' یا پھر ''خاخافیج'' ہے۔ یعنی اللہ حافظ یا خدا حافظ۔

اس سے پہلے کہ یہ طویل بحث شروع ہو کہ مسلمانوں کو اپنے ایمان کی سلامتی کے لیے کون سا لفظ بولنا چاہیے اور اہلِ ایمان اور اہلِ زبان کے نزدیک کیا فصیح ہے، اللہ کو خدا کہنے سے درجات میں کیا تنزل ہوتا ہے، ایک چھوٹا سا مکالمہ سن لیجیے۔

جن دنوں ٹی وی پر اللہ حافظ کی مہم اور ان دونوں الفاظ کی کشمکش کی ابتدا ہوئی، ابا جی اور ان کے لالہ جی اردو اور تہذیبی اثرات کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ زبان و بیان، علاقائی لہجہ نیز علم و ادب کے فقدان جیسی وجوہات کے پس منظر میں ابا جی کو سمجھ نہیں آتی تھی آخر اس سلام دعا کے بارے میں شریعت کہاں سے آ گئی؟ لوگ بے چارے جو قریبی گاؤں سے چل کر آتے ہیں وہ تو سلام بھی درست طور پر نہیں کہہ سکتے۔ ابا جی نے ایک مریض کا اندازِ تکلم اور صاحب سلامت کا انداز سنایا۔

''سلاماں لیکیم صیب۔ میرا پتر عبداللہ آیا سی ناں، میرے نال؟ اک واری، اوہو ای، جنھوں تپ چڑھیا سی۔ اوس عبدللے دا ویاہ جے۔ میں سَدّا دینڑ آیاں۔''

(السلام علیکم حکیم صاحب، میرا بیٹا عبداللہ، جو میرے ساتھ ایک مرتبہ آیا تھا ناں، وہی جسے بخار ہو گیا تھا، اس عبدلے کی شادی ہے ناں۔ میں دعوت دینے آیا ہوں۔)

''وہ جاتے ہوئے رب راکھا (رب رکھوالا، اللہ نگہبان) کہہ کر جاتے ہیں، یعنی اپنی مقامی زبان میں اللہ کے سپرد کرنا، بالکل ویسے ہی جیسے اہلِ عرب فی امانِ اللہ کہتے ہیں۔ اب ان پر فقہ کیا جرم عائد کرے؟''

تایا جان بولے۔ ''عبداللہ کا نام تو جو علاقائی انداز میں بگاڑا سو بگاڑا، میرا ایک مریض اپنے پوتے ابوبکر کی دوا لینے آیا۔ اس کا اپنا ہی فطری اور بے تکلف انداز ہے۔
حکیم صاب۔ ابوبکرے نوں آپوں چل کے ویکھو۔ (حکیم صاحب، ابوبکر کو خود چل کر دیکھیے۔)
تایا جان نے دوا دینے کے بعد نرمی سے کہا کہ آپ نے پیارے نبی ﷺ کے ایک دوست کے نام پر یہ نام رکھا ہے،
''صدقے یا رسول اللہ ﷺ'' اس نے فوراً انگلیوں کے پوروں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا۔ تایا جان نے کہا کہ آپ اس بچے کا نام بگاڑا نہ کریں۔
وہ بڑی سادگی سے بولا، ''جی میں تو اپنے بچے کو لاڈ سے بلاتا ہوں، کوئی نبی پاک کے بیلی کا نام تو نہیں بگاڑتا جی۔''
اب پیار و احترام سے اللہ میاں اور اللہ سائیں کہنے والوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ، یا، اللہ عزوجل کیا گناہ دے گا؟ اس موضوع پر بحث کر کر کے وقت ضائع کرنے والوں کو چاہیے گھر کے ملازموں کو پڑھانا شروع کر دیں۔
لو بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ تو میں بات کر رہی تھی اپنی زندگی کے سب سے بڑے بونس آئمہ صوفیہ کی۔ اس کے ساتھ ایک سوا سال کی بچی لیونورا بھی آتی ہے جس کے والد انگریزی کے لیکچرر ہیں۔ ہم دونوں کی اکثر ملاقات ہوجاتی ہے۔ آئمہ نے مجھے پلٹ کر ''خاخا پھیج'' کہا تو لیونورا کے والد نے پوچھا، یہ کیا کہہ رہی ہے۔ میں نے بتایا کہ اللہ حافظ یا پھر خدا حافظ کہتی ہے۔
اس نے مجھے مزید دلچسپ باتیں بتائیں۔ اس کے والد ڈرائیونگ سکھانے کا سکول چلاتے تھے۔ ڈنمارک میں یہ لائسنس انتہائی مہنگا اور مشکل ہے۔ پھر زبان نہ آتی ہو تو مرے پر سو دُرے کی مثل مزید مصیبت ہوتی ہے۔ ویسے بھی ڈنمارک میں ڈرائیونگ سیکھنا اصول وضوابط کے لحاظ سے یورپ کی مشکل ترین آموزش ہے۔ بہرحال اس کے والد نے بتایا کہ بیشتر ایرانی اور پاکستانی لوگ ''خدا حافظ'' کہتے ہیں جب کہ عرب زیادہ تر اللہ کا لفظ بولتے ہیں۔ اپنے شاگردوں کو ڈرائیونگ کے اسباق دینے کے ساتھ وہ ان کی زبان سیکھ لیتے ہیں جیسے اب لیونورا آئمہ صوفیہ کی زبان سیکھے گی۔ ''جی ہاں، آئمہ کی استاد اب سیکھ گئی ہیں اور ہمیں خاخا پھیج ہی کہتی ہیں۔''

••

نانو آکیں توت گی۔ (نانو کی آنکھیں ٹوٹ گئیں)

کل سارا دن نواسی صاحبہ ہمارے پاس رہیں۔ اس کی اماں کورس پر گئی تھیں۔ میرے کمرے میں کھٹر پٹر کر رہی تھیں۔ پھر ایک دم بھاگی بھاگی باورچی خانے میں آئی۔ ''نانو آ کیں ٹوت گی۔''

اسکے منے منے ہاتھوں میں میری لنگڑی لولی عینکیں دبی تھیں، ''نانو۔ آ کیں۔'' پھر رک کر میرا چہرہ پڑھنے لگی، عینک آگے بڑھا کر بولی، ''توت گی۔'' میری عینک کو وہ ''نانو۔ آ کیں'' کہتی ہے۔

••

مجھے لڑنا گوارا کب ہے فطرت کے اصولوں سے...

ایک خوشگوار ترین بات یہ ہوئی کہ دنیا میں جہاں بھی جائیں، لوگ ہمیں ''نواسی نامہ'' کے حوالے سے سوال کرنے لگے۔ سپین کی معروف سڑک پر ارشد نذیر ساحل ملے۔

''آئمہ کا کیا حال ہے؟'' لیجیے ہمارا حال پوچھے بغیر پہلا سوال آئمہ کے بارے میں ہونے لگا۔ لندن پیر رکھا۔ روبی ناصر ملنے آئیں، ''نواسی کو بھی لے آتیں۔ اس کی باتیں پڑھ پڑھ کر ملنے کا اشتیاق ہے۔''

ایک اور سوال جو آئمہ کی ماں کے بارے میں اکثر کیا جاتا تھا۔ ''آپ نے اسے پاکستانی کپڑے پہننے کی عادت کیسے ڈالی؟'' عالیہ بھی لانگ ڈریس پہنتی ہے۔ مجھے اس سوال کا جواب نہیں آتا تھا۔ اس کا جواب آئمہ صوفیہ نے دیا۔

میں انگلینڈ سے اس کے لیے عید کا ڈریس لائی۔ میرون اور کریم پشواز۔ یہ میری ماں کے پسندیدہ ترین رنگ تھے۔ آئمہ بی بی نے لباس پہنا۔ پھر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر گول گول گھومی۔

''واؤ، نانو، فیبین۔'' یعنی بہت فائن ڈریس ہے۔ پھر آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی۔

''واؤ۔ نانو۔ شووکیہ'' (شکریہ)۔ پھر گھومی، ''تھّو تووو، تھّو تووو'' اور بڑی ادا سے بولی۔

''تھانک یو''۔ یہ تھینک یو وہ ابھی دوبئی سے سیکھ کر آئی ہے۔

بہت سے سوالوں کے جواب بچہ دیتا ہے۔ کوئی زبردستی نہیں کہ کیا لباس پہننا ہے۔ اس نے آنکھ کھول کر یہی ڈریسز دیکھے گھر میں۔ باہر جو بھی نظر آئے، پہلا نقش یہی ہے۔ بچیوں کی فطرت ہے۔ انھیں رنگ، رعنائی اور نسائی غرور سے دور مت کیجیے۔ یہی انھیں کائنات میں رنگ بھرنے کے قابل کرتا ہے۔

••

فیمنزم

آئمہ صوفیہ نے فیروزی شفون کا لمبا فراک پہنا، پھر گول گول گھومی،

''تو تو... تو تو.. تو تو'' پھر بھاگی ہوئی شیشے کے آگے جا کھڑی ہوئی۔ ''نانو، دیکھیں،''

میں اس کی معصوم حرکات دیکھتی رہی۔ فطرت ابتدا سے خود کو منواتی ہے۔ مجھے پنجاب یونیورسٹی میں فیمنزم پر ایک چھوٹا سا سیمنار یاد آ گیا۔ بچیوں کے بولڈ سوالات اور ان کے حقیقت پسندانہ جوابات جو شاید یورپ میں تین دہائیاں گزارنے والی فیمنسٹ سے متوقع نہیں تھے۔

زندگی کو فطری اصولوں پر رہنے دیجیے، ''تو تو.. تو تو.. تو تو..''

••

الم غلم لکھنے کے بجائے نسخے لکھا کیجیے آنٹی...

کل شام قریبی شہر میں رہنے والی ایک بچی کا فون آیا۔ اس کی والدہ حیات نہیں۔ وہ یہیں پلی بڑھی۔ اس کے بیٹے کو شدید سردی، زکام اور کھانسی تھی۔ پوچھنے لگی آنٹی آپ آئمہ کے لیے جنجر ٹیبلٹ کیسے بناتی ہیں۔ میں نے وضاحت سے بتایا۔ پھر ویڈیو بنا کر بھیجی۔ بڑی سادگی سے بولی۔ آنٹی یہ جو بلاوجہ فضول، مفت کے کام، الم غلم لکھتی رہتی ہیں، نہ فیض نہ فائدہ، اس کے بجائے بچوں کی خوراک اور ٹوٹکے لکھ دیا کریں۔ بلکہ ڈینش میں لکھیے۔ کسی کے کام تو آئے۔ ورنہ باقی اوٹ پٹانگ کی کیا سمجھ آتی ہے؟

••

''اب قابو آئیں ناں آپ''

بہت دن سے تمھیں دیکھا نہیں ہے

تو دنیا میں اجالا ہی نہیں ہے

کئی دن سے عالیہ سے ملاقات نہیں ہو پائی تو نانی شاعری پر اتر آئی۔ عالیہ کو فون کیا کہ شام کو فرصت ہو تو چکر لگا لو۔

ہماری بیٹی صاحبہ ایک دن گلہ گزاری کرتے بولیں، ''امی مجھے تو آپ نے کبھی نہیں کہا تھا آ کر شکل دکھا جاؤ، خود ہی آنا پڑتا تھا۔ جب سے آئمہ صوفیہ آئی ہے، آپ بدل گئی ہیں۔ پہلے تو مجھے کبھی بلاتی ہی نہیں تھیں، خود سے ہی آ جانا جب سہولت ہو۔ اب آپ قابو آئی ہیں ناں۔''

میں نے بہت صبر سے بیانیہ سنا۔ ''آپ مت آئیں۔'' میں نے کہا۔ ''آئمہ صوفیہ کو لے جاتی

ہوں۔ آپ کو تو نہیں بلایا۔"

اس کے منہ بسورنے پر مجھے ہنسی آ گئی، "بھلا نانی بھی کبھی قابو آتی ہے؟"

••

کل اچانک اکتوبر کے مہینے میں کمیاب اور بہت چمکیلی دھوپ نے کھڑکی کے شیشے سے لشکارے مارنے شروع کیے۔ آئمہ صوفیہ اپنے کمرے میں بیٹھی کھیل رہی تھی۔ سرسراتے درختوں کے پتوں سے گزرتی زرد دھوپ دیوار پر متحرک سائے اور دائرے بنانے لگی۔

"ہوہ۔" آئمہ فوراً چونکی۔ "یہ کیا ہے؟" پھر رقص کرتے دائروں میں انگلی گھمانے اور پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے اسے شیشے کی دیوار کے باہر سیبوں کے جھومتے درخت دکھائے۔ اسے کچھ سمجھ نہ آئی لیکن وہ کافی دیر دائروں سے کھیلتی رہی۔

سائنس پڑھنے کا آغاز ہو گیا۔

••

نانیالوجی، نانی نانی۔۔۔ سنو کہانی...

آج ہی رات کے کھانے پر آئمہ صوفیہ کی حسِ مزاح کی بات ہو رہی تھی۔ ننھے ننھے ویڈیو کلپ دیکھ دیکھ کر ہم سب بھی ہنس رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ بمشکل چھ ماہ کی تھی تو کھلکھلا کر ہنستی تھی۔

کبھی میں اس کی نپی کا بنڈل کھولتی تو ایک نپی اٹھا کر سر پر ٹوپی کی طرح رکھ دیتی، جس پر قلقل کرتی ہنسی چاندی کی گولی کی طرح ٹھپے کھاتی شیشے کے برتنوں میں چکراتی پھرتی۔ میں مسمریز ہو کر اس کا جگمگ کرتا چہرہ دیکھتی۔

میں ننھی سی ناک پر انگشتِ شہادت سے دستک دینے کے انداز میں تھپتھپاتی۔ وہ ننھی ناک سے "نون غنہ، ناں ناں ناں ناں ناں" کی آوازیں نکالتی، اس کی ہنسی پھر بے قابو ہو جاتی۔ میں نے تحیر کو تسکین دینے کے لیے شیر خوار بچوں کی حسِ مزاح اور سمجھ بوجھ پر کتابیں منگوائیں۔ سائنس کہتی ہے جس گھر میں والدین ہنستا کھیلتا ماحول رکھتے ہیں، چند ماہ کا بچہ ہنستا ہوا رویہ اور ردِعمل دکھاتا ہے، مزاح کو سمجھتا ہے اور مختلف ماحول اور صورتِ حال کو ایک دوسرے سے ممیز کر سکتا ہے۔

••

آج کل ہماری نواسی اپنی گڑیا کے لیے کھانا بناتی ہیں۔ پھر چمچ بھر کر اس کے منہ میں ڈالتی ہیں۔ پھر صوتی تاثرات، ''اووم، نم نم نم۔ نم نم'' اسے سمجھ نہیں آتی کہ گڑیا کھانا انجوائے کیوں نہیں کرتی، اور تو اور ''گڑیا بسم اللہ بھی نہیں پڑھتی۔'' پھر بازو سے پکڑ کر اس کا منہ صاف کرتی ہے، اور آخر میں شب بخیر اور کہانی بھی سنانی ہوتی ہے۔ اسے بابا روز کہانی سناتے ہیں۔ اور وہ مجھے ''نانی نانی، سنو کہانی'' کے مصداق جوڑ توڑ کر کے کلیدی الفاظ میں اشاروں کے ساتھ کہانی سنا دیتی ہے۔

••

اس برف بھری فضا میں روشنیاں اور زندگی کی حدت کا احساس مبارک ہو۔

آئمہ صوفیہ کی زندگی کا یہ پہلا کرسمس ہے جس پر وہ اپنی حیرت اور مسرت کا اظہار کر سکتی ہے۔ میرے گھر کے عین سامنے کرسمس کا بڑا سا درخت لگا کر اسے بے شمار ننھی روشنیوں سے سجا دیا گیا ہے۔ آئمہ کا اصرار تھا کہ اس کے سامنے کھڑی رہیں۔ پھر وہ درخت کی روشنیاں گنتی ہے۔ دس کے بعد گنتی ختم ہو جاتی ہے تو وہ رنگ گننے لگتی ہے۔ ''نانو، دیکھیے، گلابی، لال، نیلا، پیلا، ییلو، کوول۔''

کوول، ڈینش میں پیلے رنگ کو کہتے ہیں۔ چونکہ پیلی روشنی زیادہ تھی تو اس نے تین زبانوں میں ایک ہی رنگ گن لیا۔ اسے کہتے ہیں ملٹی لنگول ہونے کے فائدے۔

••

ننھی ترجمان...

آئمہ صوفیہ سے بات کرتے ہوئے ہم اکثر جملہ اردو میں دوہراتے ہیں۔ دو برس کی عمر میں دو زبانیں بولنے والی ہماری نواسی اب ہمارے الفاظ ہمیں ہی لوٹانے لگیں۔ کل اپنی ماں سے کوئی چیز مانگ رہی تھی اور عادتاً رنگ بھی بتا رہی تھی۔ ''امی.. سفید.. سفید'' ماں کو ہنسی آئی۔ اس نے شاید دوبارہ سننے کے لیے کہا، ''کیا کہہ رہی ہیں؟''

''سفید، سفید'' پھر ہاتھ ہلا کر سمجھانے کے انداز میں بولیں، ''وِز وِز۔''

گویا اب گھر میں نئی ترجمان کا اضافہ ہو گیا۔

••

گل چینی کرتے ننھے ہاتھ...

''نانو، نانو، یہ دیکھیں، پھول''

میں نے گھر کے ساتھ ملحق گھاس کے قطعے پر چٹائی بچھائی۔ ساتھ ہی ننھی سی آواز آئی ''نانو۔کھانا؟؟'' جتنی دیر میں کھانا چنا جاتا، آئمہ صوفیہ پھول چننے لگیں۔قریب سے کوئی چڑیا چہکی۔ آئمہ اس کے پیچھے بھاگی۔ پھر منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر بھونپو بنایا۔''چڑیا۔ چڑیا۔ وہ اے آتو وو'' (کہاں ہوتم؟) اسے شاید اندازہ تھا کہ چڑیا ڈینش سمجھتی ہے۔ پھر مایوس ہوکر واپس آئی اور میرے بالوں میں پھول ''ٹھونکنے'' لگی ''نانو۔ دیکیں۔ دیکیں پھول۔''

پلیٹ میں چاول ڈالے اور اردو، ڈینش، انگریزی میں نظمیں گانے لگی۔لکڑی کی کاٹھی۔ کاٹھی پہ گھوڑا۔ اس سے دل بھر گیا تو، ''للے پیٹا ایڈا کھاپ۔ننھا پیٹر مکڑا اور آخر میں ''ممی فنگر۔ممی فنگر۔ وئر آر یو۔ ہئر آئی ایم۔ ہاؤ ڈو یو ڈو۔'' بلبل خود چہکتا رہا۔خبر ہی نہیں ہوئی کب دن گزر گیا۔

••

نانو!!! بابا کھانا دے دیں...

میں باورچی خانے میں اپنا من پسند مشغلہ لیے بیٹھی تھی۔ گھر میں مسالے بھون کر پیس لیے جائیں تو پکوان کی خوشبو اور ذائقہ مختلف ہوجاتا ہے۔ گرائنڈر کی آواز میں مجھے آئمہ صوفیہ کی چھوٹی سی آواز سنائی نہیں دی تو کچن میں آکر میرا ہاتھ ہلا کر بولی۔

''نانو! بابا کھانا دے دیں۔'' میں نے حیرت سے دیکھا۔ گڑیا جتنا ننھا سا سر ہلا کر پھر مطالبہ کیا ''بابا کھانا دے دیں۔''

پیچھے اس کی ماں ہنستی ہوئی آئی، ''امی میں فون پر اس کے بابا سے بات کر رہی تھی کہ امی نے ابھی تازہ تازہ نان بیک کیے ہیں اور ہم نان کباب کھا رہے ہیں۔انھوں نے کہا آپ کے تو مزے ہیں۔بس اتنی سی بات سن کر فوراً آپ کی طرف آئی ہے کہ میرے بابا کے لیے بھی کھانا دے دیں۔''

میں نے کھانا پیک کیا۔ پورے سکون سے کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ پھر احتیاط سے لفافہ سنبھالا اور بولی، ''امی گھر چلیں۔ بابا کھانا۔ گھر چلیں۔''

عالیہ ہنسنے لگی، ''امی جی یہ آپ پر گئی ہے۔اپنے ابا کی عاشق۔''

پروردگار سلامت رکھے ایسے والد کو جو اپنی بچی کی زندگی کا پہلا اور سچا عشق بننے کے قابل ہوتا ہے۔

••

آئمہ صوفیہ اپنی بلبلے بنانے والی نلکی لے آئی، ''نانو، بلبلہ بنائیں، نائے نانو، بڑا بلبلہ، بوت سارے بلبلے۔''

میں نلکی منہ سے لگا کر فرمائش کے مطابق چھوٹے بڑے بلبلے چھوڑنے لگتی۔

''نانو انھیں بلبلے پکڑ کر لائیں،'' پھر ایک دم اس کی ذہنی رو مڑ جاتی۔

''نانو، سیب کھانا ہے،'' میں سیب کاٹنے لگتی۔

''نائے نانو، وہ سیب کھانا ہے،'' وہ کھڑکی سے باہر سیبوں سے درخت کی طرف اشارہ کرتی۔

میں نے رضا علی عابدی سے تذکرہ کیا کہ آئمہ صوفیہ کی فرمائشیں عجب ہیں۔ ہنس کر بولے، ''شہزادیاں ایسی فرمائشیں کرتی رہتی ہیں، فلاں پہاڑ سے فلاں درخت سے فلاں پھل لا دو۔ شکر کیجیے کہ گھر کے پچھواڑے میں لگے درخت سے سیب توڑنے کو کہا ہے، کہیں کوہِ قاف نہیں بھیج دیا۔''

سیب کی پلیٹ دور کھسکا کر کاغذ پنسل اٹھا لاتی، ''نانو، اس پر مکڑی بنائیں۔''

میں آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگتی۔ ''نانو، ایک پریشان مکڑی بنائیں،''

''اچھا،'' میں اس مکڑی نما خاکے کے منہ پر عمودی ترچھی دھاگہ نما لکیریں لگاتی۔ وہ شاید میری کارکردگی سے مایوس ہو جاتی۔

''نائے نانو، گوش (خرگوش) بنائیں'' میں بڑے بڑے کان تراشنے لگتی۔

''امی جی، جب ہم چھوٹے تھے تو آپ ہمیں بھی ایسے ہی تحمل سے پالتی تھیں؟'' اس کے ماموں نے کئی مرتبہ مجھے پوچھا۔

میرے تخیل میں وہ سارے دن جھلکنے لگے جب لمبی دوپہر میں جب سارا گھر سونے کا وقفہ مناتا تو میں ان دونوں کو لے کر بیٹھ جاتی۔ کبھی ان کے لیے کاغذ کے پرندے کاٹے جاتے، اردو کے بلاک رکھ کر پڑھتے، رنگ برنگی پنسلوں سے گل بوٹے بناتے، باہر ناشپاتی کے درخت کے نیچے کپڑا بچھا کر پکنک مناتے اور ان کی مرضی کے مطابق بھاگتے دوڑتے دن گزر جاتا۔

اپنا کوئی ذاتی شوق نہیں تھا۔ نہ کتاب، نہ کاغذ، نہ ٹی وی۔ ایک عجیب ون وے سڑک پر دوڑتی زندگی، لیکن ان بچوں کے دم سے سرسبز و شاداب۔ گھر میں جائنٹ فیملی سسٹم کے تحت ماشاء اللہ بچے ہی بچے تھے۔ اور ان سب میں رہ کر ایک جداگانہ پرورش تو شاید صرف تحمل ہی تحمل تھا۔

''بہت مشکل نہیں ہوتا امی؟ اتنے بچوں میں آپ کو محسوس نہیں ہوتا تھا کہ کنڈر گارٹن کھلا ہوا ہے۔''

میں نے اس کے روشن چہرے کو دیکھا،''کوئی مشکل نہیں ہوتی، عبادت ہوتی ہے۔''
ماں بننے سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہوتی۔ ایک پوری زندگی صاف سلیٹ کی صورت، گیلی مٹی جیسی ماں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ مصورہ بھی ہے اور کوزہ گر بھی۔ اور واقعی تحمل ہی کی تو ضرورت ہے۔ بلکہ صرف تحمل ہی کی ضرورت ہے۔

••

چند دن میری طبیعت خراب رہی۔ میرے بیٹے نے مجھے بیڈ پر ناشتہ دیا۔ اس نے بغیر مجھ سے پوچھے فرائی انڈہ بھی پیش کیا اور آملیٹ بھی بنا دیا۔ اس کے باوجود وہ مرد ہی رہا۔ دیسی بدیسی کھانے وہ ایسے شاندار بناتا ہے کہ بزعمِ خود گرہستن عورتیں بھی حیران ہوں۔ ویک اینڈ پر گھر کے سارے تولیے، بستر کی چادریں اور باورچی خانے کے تولیے اٹھا کر لانڈری بھی کر دیتا ہے۔

شام کو میری بیٹی آئی۔ اس نے بہن اور بھانجی صاحبہ کے لیے کھانے کی میز سجائی۔ بہت دن بعد ملاقات ہوئی تھی۔ پھر دونوں کے قہقہے بلند ہونے لگے۔ آئمہ میرے پاس بستر میں گھسی ہوئی کہانیاں سن رہی تھی۔

چند گھنٹے بعد عالیہ واپس جانے لگی تو کہا ''امی جلدی جانا ہے۔ آئمہ کے سونے کا وقت ہے۔ مبین ادھر امی جان کی طرف شفٹنگ میں مصروف ہیں۔ میں کچن کی شاپنگ کرتی ہوئی جاؤں گی۔''

چھوٹی بچی کے ساتھ دودھ، دہی، انڈے کی شاپنگ کرتے ہوئے بھی وہ ایک عورت رہی۔ محبت کرنے والی ماں اور احساس کرنے والی شریکِ حیات۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے آج تک ان اصولوں اور تقسیمِ کار کی سمجھ ہی نہیں آئی۔ کھیتوں میں کام کرتی، ٹوکری ڈھوتی عورت۔ دن رات مدد معاش کی چکی میں پستے مرد، گھر کے خرچ اور بچوں کو اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھانے کی غرض سے کئی ملازمتیں کرتے مرد، آخر احساس کے نقطۂ اتصال پر ملنے میں کیا مسئلہ ہے؟

''فیمنسٹ کے معنی بھی آتے ہیں کیا؟'' ہر معاشرے میں پہلے فیمنسٹ مرد تھے۔ اپنا کھانا خود گرم کر لینے والے ابا جی دبے قدموں چلتے تاکہ کسی کی نیند نہ خراب ہو جائے۔ پتہ نہیں دنیا کس طرف جا رہی ہے۔ انسان کی فطرت میں جب تک اپنی ذات سے جڑے رشتوں کا حساسیت بھرا رویہ نہیں جاگے گا، خود غرضی اور خام غصہ ان کے گھروں کو اور رشتوں کو پھونکتا ہی رہے گا۔

••

میرے احساس کا اظہار ہے طاقت میری...

آج آئمہ صوفیہ کا کھانا بناتے ہوئے اس کی بات یاد آگئی۔ بچے اپنے جذبات کا اظہار کیسے بلاواسطہ اور سچے انداز میں کرتے ہیں۔ محبت، ناراضی، غصہ، خوف، بھوک اور تھکن کا اظہار سادگی اور سیدھے سبھاؤ کر لیتے ہیں۔ بچوں کے رویوں میں ہمارے سیکھنے کی کتنی باتیں موجود ہیں۔

میں نے مسالہ پیسنے کی مشین میں زیرہ ڈال کر اسے چلایا۔ آئمہ نے فوراً دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے ''نانو، آئمہ پانک'' یعنی آئمہ خوفزدہ ہے۔ میں نے فوراً مشین بند کی اور اسے اٹھا لیا۔

وہ اردو میں صرف کلیدی الفاظ میں بات کرتی ہے جب کہ ڈینش روانی سے بولتی ہے، جس کی مختلف وجوہات میں ایک یہ ہے کہ اس میں ایک ہی لفظ سے مافی الضمیر ادا ہو جاتا ہے۔

پچھلے ہفتے تشریف لائیں تو گود میں براجمان ہو کر بولیں۔ ''نانو آئمہ سُلٹَن۔'' یعنی آئمہ کو بھوک لگی ہے۔

کھانا کھانے کے بعد ''آئمہ مے اٹ'' آئمہ کا پیٹ بھر گیا ہے۔

اب کے حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ بابا کی عاشق نے بابا ہی کی شکایت لگائی۔

''نانو آئمہ کِھزاے تے۔'' یعنی آئمہ کو بہت دکھ ہو رہا ہے۔

''کیوں میرے بچے۔'' میں نے اس کے پھولے رخسار پر بوسہ دیا۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے فوراً منہ صاف کیا۔

''نانو، بابا آئمہ کھیلنا۔ بابا دروازہ بند۔ آئمہ کھزاے تے۔''

''اوہو، میری زندگی، بابا کو پتہ ہی نہیں چلا ہوگا کہ دروازہ بند ہو گیا۔'' میں نے بہلایا۔

کھانا کھا کر پھر بابا کی شکایت لگی۔ پھر اظہار ہوا کہ محترمہ بہت دکھی ہیں۔ میں سلانے کے لیے لے گئی۔ سوتے سوتے پھر ساری بات دوہرائی۔ سو کر اٹھی۔ باہر صوفے پر میرے پاس آئی۔ چونکہ گھر میں ٹی وی نہیں ہے اور اس کے سامنے موبائل بھی استعمال نہیں کرنا ہوتا۔ وہ لکڑی کی ٹرے اٹھا لائی۔ کپ نکالے اور چائے خانہ کھول لیا۔

''نانو چینی؟'' اس نے سفید لکڑی اٹھائی۔

''نہیں، شکریہ۔ بس دودھ ڈال دیجیے تھوڑا سا۔''

''اوکے۔'' اس نے سر ہلایا۔ پھر اہتمام سے چائے دی۔ لکڑی کا بنا کیک دیا۔

''نم نم، بہت بہت شکریہ۔ کیسا لذیذ ہے۔'' میں نے داد دی۔

''شکیپیہ نانو'' وہ بولی، پھر یکدم کچھ یاد آیا،

''نانو، بابا دروازہ بند کرنا۔ آئمہ صوفیہ کھڑا اے تے۔''

میں نے لکڑی کا منا سا کپ اس کے ہاتھ میں دیا۔ پھر سنجیدگی سے کہا۔

''اچھا اب تو بابا جانی سے بات کرنی ہی پڑے گی۔''

اس نے چونک کر میرا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔

''جی، بابا نے آئمہ صوفیہ کو اداس کیوں کیا۔ دروازہ کیوں بند کیا بھئی۔ سامنے کیوں نہیں رہے آئمہ صوفیہ کے؟'' میں نے اپنی سنجیدگی برقرار رکھی۔ اسے نجانے کیا احساس ہوا۔ فوراً سیاسی لیڈر کی طرح یوٹرن لے کر بیان بدل گئی۔

''نانو بابا فرنچ ٹوسٹ دینا۔ بابا سیوُ ڈ'' یعنی بابا بہت اچھے ہیں۔ ''بابا فرنچ ٹوسٹ۔ نم نم۔ بابا سیوڈ۔ بابا آچے ہیں۔'' پھر دوہراتی رہی ''بابا نے فرنچ ٹوسٹ بنا کر دیا تھا۔ میرے بابا بہت اچھے ہیں۔'' لوٹا سی لڑکی۔

••

از محبت خارہا گل می شود...

ہماری ایک بنگلہ دیشی بیٹی عین ہمارے سامنے والے گھر میں آبسی ہے۔ سویڈن سے آئی ہماری پیاری دوست شہناز اور ہم گھر کے بیرونی دروازے سے باہر نکلنے کو تھے کہ مقابل دروازے سے ہماری نئی پڑوسن ثریا نے دروازہ کھولا۔

''صدف۔ آپ کے برتن،'' اس نے خالی ڈونگے آگے بڑھائے۔ میں نے شہناز سے تعارف کرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتیں، ثریا نے شگفتگی سے بنگالی لہجے میں کہا۔ ''بنگلہ دیش آپ کا دشمن نہیں۔''

''ارے۔ یہ کیا بات۔ بیٹا۔ اس وقت تو آپ پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔ سیاست لڑاتی ہے۔ ہم عام لوگ تو بیلوں کی لڑائی میں سہمے اور بٹے رہ گئے۔''

ثریا میری بیٹی سے چند برس بڑی ہے اور دو سال کی بچی فاطمہ کی ماں ہے۔ اس کا شوہر آئی ٹی انجینئر ہے اور دونوں گرین کارڈ سکیم پر ڈنمارک آئے۔ ان کے ساتھ ہی اس علاقے میں بہت سے نوجوان انڈین جوڑے دکھائی دینے لگے۔

یاد رہے کہ پاکستان کے مقابلے میں انڈیا اور بنگلہ دیش کے لیے ویزے کی بہت

سہولیات ہیں۔ اس کی وجوہات بھی ہمارے اہلِ سیاست کی بدعنوانی اور ایک جانبدار خاتون سفیر کی بدوضع سفارت کاری رہی جو ملک کو جتنا پیچھے دھکیل سکتی تھیں، دھکیلا۔ کمیونٹی کے احتجاج پر جناب مسرور جونیجو آئے جنھوں نے گرتی ساکھ کو سنبھالا دیا اور اب سید ذوالفقار گردیزی اور ان کی انتہائی بااخلاق اہلیہ بیگم لیلیٰ گردیزی سے روشن توقعات ہیں۔ دیکھیے تو، بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔

ثریا سے روز گپ شپ ہوتی۔ کہنے لگی میں نے تین سال سے اپنی ممی کو نہیں دیکھا۔ جب عالیہ آپ کو امی کہتی ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ پھر میری ترقی ہوئی اور میں صدف سے ''آآمی'' ہوگئی۔ ثریا بہترین گلوکارہ ہے اور باقاعدہ فن سیکھنے کے بعد ثقافتی پروگراموں میں فن کا مظاہرہ کرتی ہے۔

جھگڑا تب شروع ہوا جب فاطمہ نے ہمیں نانو کہنا شروع کیا۔ خیر تخلیے میں کہتی رہی تو راوی چین لکھتا رہا۔ ثریا کو ضرورت پڑے تو میں بچی کو سنبھال لیتی۔ لیکن آج گھمسان کا رن پڑا۔

آج پانچ جون کو ڈینش آئین سازی کی یادگاری چھٹی ہے۔ عالیہ اور ثریا دونوں آئمہ اور فاطمہ کو چھوڑ گئیں۔ میں اکلوتی آئمہ کی اکلوتی نانو، لیکن اب فاطمہ نے بھی وہی رشتہ قائم کرلیا تھا، تو جب رشتہ ایک ہے تو خفیہ کیوں رہے؟ بچے فطرت کا حصہ ہیں، مشکوک محبتیں نہیں پالتے۔

جونہی فاطمہ نے نانو کہہ کر میری طرف بازو پھیلائے، آئمہ کا سرخ و سفید چہرہ پیلا پڑ گیا۔ بے یقین آنکھوں سے ٹپ ٹپ پہلی بارش کے قطرے گرے۔ رندھی ہوئی ننھی سی آواز میں بولی۔ ''نانو میری ہیں۔ صرف میری۔ فاطمہ کی نانو نہیں، مانو بلی کی نانو نہیں۔''

لیکن دبلی پتلی، چھریری اور سانولی سلونی فاطمہ نے تیزی سے آئمہ کو دھکا دیا۔ پھر سر کے عین وسط سے بالوں کی مٹھی بھر لی۔ آئمہ کی چیخیں بلند ہوئیں۔ ثریا واپس بھاگی۔

''اوئے آآمی۔ یہ تو بالکل پاک بنگلہ جنگ شروع ہوگیا۔''

مشکل سے امن و امان قائم ہوا اور آج شام ہی ہماری اور آئمہ کی دعوت ثریا کے گھر ہے۔ آئمہ سے کہا ہے کہ فاطمہ کے لیے تحفہ پیک کرو۔ وہ ایک ننھے سے خرگوش پر ربن باندھ رہی ہے۔ بھلا بال کھینچنا کوئی ایسا جرم تو نہیں کہ خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد۔

••

دوست دارم کہ دوست عیب مرا
ہم چو آئینہ پیش رو گوید
نہ کہ چون شانہ با ہزار زبان
پشت سر رفتہ مو بہ مو گوید

اس کا سہل ترین مفہوم یہ ہے کہ دوست آئینے کی طرح ہوتا ہے جو اپنے دوست کے عیب اس کے منہ پر کہتا ہے۔ ہزار زبانوں والے کنگھے کی طرح نہیں کہ سر کی پشت پر جا کر بال بال کو کہانیاں سناتا ہے۔

رفاقتوں کے یہ سلسلے یا صداقتوں کے یہ مرحلے
جب ڈاکٹر ساجدہ نواسی صاحبہ کو ملنے آئیں۔
جولائی کی ایک بے مزہ دوپہر کو ڈاکٹر صاحبہ کا فون آیا۔
کدھر ہو؟

کہاں جاؤں گی؟ یہیں ہوں، طبیعت ٹھیک نہیں، میں نے فوراً مریض بن کر دکھایا، جو حسبِ معمول سنی ان سنی رہی۔

گھر؟

ہاں
کیا کر رہی ہیں؟
''باغیچے میں درختوں پر خوب سیب لگے ہیں۔ وہ گن رہی ہوں'' میں نے جل کر کہا۔
''آپ کہاں ہیں؟ آپ کا کوئی پتہ نہیں کب اڑن کھٹولے سے اتریں۔''
''کوپن ہیگن ہوں، رات ہی پہنچی ہوں۔'' بڑے آرام سے جواب آیا۔
''ہائیں،'' میری ساری کوفت اور بیزاری دور ہوگئی، ''جہاں بھی ہیں فوراً حاضر ہو جائیں۔''
ساجدہ کی محبت ڈاکو یار کی سی ہے، بھلا بھی چاہیں گی تو نشتر کی نوک پر۔

وائے صدقے جاؤں میں اپنے ڈاکو یار کے
جس نے ڈولی میں بٹھایا مجھ کو ٹھڈے مار کے

بس ایک دفعہ ہی سر درد کی شکایت کی تو پیشہ ورانہ مستعدی سے بولیں، ''میں تو ٹانگ ہی کاٹ سکتی ہوں، نیا گھٹنہ ڈال دوں؟؟؟؟''

اس سے پہلے کہ ڈاکو یار کے ٹھڈے گھٹنے پر پڑتے، میں نے صوفے پر سے زقند لگائی۔ جلدی سے رات کے کپڑے بدل کر بقول میری صاحبزادی کے، بے ڈھنگے کپڑے پہن لیے۔ ''نہ فٹنگ نہ استری۔''

''کوئی مسئلہ نہیں، اگر کسی نے محفل سے نکال دیا تو دیکھ لیں گے، ابھی تو ایسے ہی چلے گا، بلکہ دوڑے گا۔''

ساجدہ آئیں۔ ساتھ ہماری لاڈلی ماہین تھیں۔ گویا ملاقات کا نشہ دوآتشہ۔ ماہین ماں کے حب الوطنی کے جنون میں شریک ہے اور ڈنمارک چھوڑ کر پاکستان جا بسی ہے۔ وہیں میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ ماں ہی کی طرح سادہ اور منکسر المزاج۔ ہم دونوں دن رات کی طرح ایک دوسرے کے تعاقب میں رہتے ہیں۔ دونوں، اپنے اپنے مقام پر، کبھی تم نہیں، کبھی ہم نہیں، ابنِ انشا نے ہمارے لیے ہی کہا تھا۔

ہم سانجھ سمے کی چھایا ہیں، تم چڑھتی رات کے چندر ماں
ہم جاتے ہیں تم آتے ہو، پھر میل کی صورت کیونکر ہو

آئمہ نے ہماری انگلی پکڑ کر دروازہ کھولا اور کمان سے چھوٹے تیر کی طرح ماہین کو لپٹ گئی۔ ہم دونوں نانیاں ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ ساجدہ ہاتھ بڑھاتیں۔ پھر بڑے شوق سے

''پچ پچ پچ، آ جائیں۔ شاباش۔ نانو پاس۔ پچ پچ پچ''

جواب میں وہ زور زور سے نفی میں سر ہلاتی، ''نہیں۔ نہیں''

''نانی کی طرح بس نئیں نئیں کر،'' ساجدہ جل کر بولیں۔ پھر وہ ماہین کی انگلی پکڑ کر اسے باغیچے میں لے گئی۔ میں حیران اس کی ادائیں دیکھتی رہی۔ کیا محبت بھی ورثے میں ملتی ہے۔ کہیں خلیات کی بنت میں شامل ہے۔ شاید خون میں دوڑتی ہے۔

اس کی ماں بالکل اسی عمر کی تھی جب میں ساجدہ کو پہلی دفعہ ملی۔ یہ اتنا وقت کہاں سے بچ بچا کر گزر گیا کہ آہٹ تک نہیں آئی۔ جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھمائی ہو، نظر بچا کر ماہ و سال گزر گئے۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے۔ عالیہ نے میڈیکل کالج شروع کیا۔ پہلی دفعہ ساجدہ کو لیکچر دیتے سنا۔ گھر آئی تو گھگھی بندھی ہوئی تھی، ''امی، ساجدہ خالہ تو شدید لائق ہیں۔ پورے ہال پر سکوت طاری تھا۔ یہ صوفے پر لیٹ کر ''چائے ئے ئے ئے'' کی صدا دینے والی خالہ تو نہیں تھیں۔ چاکلیٹ

کنگیز بیک کر لفافہ بھر کر دینے والی خالہ۔''

''امی، عزت اسی میں ہے کہ میں سنجیدگی سے پڑھائی شروع کر دوں۔'' اس نے جیسے ڈر کر کہا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ ''ظاہر ہے کچھ کر کے دکھائیں گی تو بات بنے گی۔'' حالانکہ اس کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا رہا۔ اپنی آرتھوڈوکس اماں کی طرح میں بھی اولاد کو رگِ جاں سے عزیز ضرور رکھتی ہوں لیکن بے جا ستائش اور مدح سرائی کبھی نہیں کی۔ وہ تو امی میرا گولڈ میڈل لینے گئیں تو واپس آ کر بولیں، ''کسی مان میں نہ رہنا، انڈہ تو ابالنا نہیں آتا تمھیں۔ نری ٹرٹر۔'' اماں کے ڈر کے مارے مدتوں ٹرانا چھوڑے رکھا۔

ساجدہ کو اللہ نے جوں جوں مرتبے سے نوازا، وہ ثمر دار شاخ کی طرح جھکتی گئیں۔ آرتھو پیڈک سرجن، جس کے ہاتھ کی شفا دستِ عیسیٰ کی سی ہے۔ کلب فیٹ کا مرض، ہاتھ سے بچوں کی ایڑی گھما کر علاج کر دیتی ہیں۔ نجانے کتنے مریضوں کے گھٹنے میں ٹنٹناتی سٹیل کی ڈبیاں ڈال کر ان کو بھاگنے کا حکم دیتی ہیں، قم باذن اللہ۔ پاکستان کے زلزلے اور سیلاب میں بے شمار ڈینش ڈاکٹرز کو مہمیز کرنے والی دھان پان سی ڈاکٹر ساجدہ، کوپن ہیگن میں آپریشن کرتے ہوئے اگر کوئی کیل قبضہ، پیچ، مرضی کا نہ ملے تو ہیلی کاپٹر سے ہمسایہ ملک سے طلب کرنے والی کاملیت پسند ڈاکٹر، جب زلزلہ زدگان کے امدادی کیمپ سوات میں مریضوں کی سرجری کر رہی تھیں، جب مطلوبہ پیچ مانگا تو ان کے سامنے کیلوں پیچوں کا بڑا سا گول ڈبہ کر دیا گیا، ''ڈھونڈ لو بی بی'' اور بی بی بلاچون و چرا کے، پیچ تلاش کر لیتی۔

بے غرض، بے طلب عورتوں کی مدد کرنے کو ہمہ وقت تیار، میرے کتنے ہی افسانوں کا موضوع ساجدہ سے سنی حقیقی کہانیاں ہیں۔ حقیقت جو فسانے سے زیادہ سنگین ہوتی ہے۔ اسی حقیقت کو اپنی چھوٹی انگلی تھمائے اپنی مرضی کے راستے پر چلنے والی آہنی خاتون، ڈنمارک کی پرسنیلٹی آف دا ایئر کا ایوارڈ حاصل کرنے والی ڈاکٹر ساجدہ کے بیٹے ڈاکٹر ماجد کو کوئین مارگریٹ نے طبی تحقیق پر تمغہ دیا۔ ان کی بیٹی شائستہ بہترین قانون دان ہے۔ میں نے ساجدہ سے کہا، ''ذرا نواسی کے سر پر ہاتھ پھیریں، کچھ آپ کا اثر لے۔''

''الٰہی رحم!'' میرے فرزندِ ارجمند نے تبصرہ کیا۔

ہم نے طے کیا کہ لنچ ترکی ریسٹورنٹ میں کرتے ہیں۔ میری گاڑی میں بے بی چیئر نہیں تھی، ''پولیس نے دیکھ لیا تو جرمانہ ہو جائے گا'' میں نے ڈرایا۔ پولیس اور حکومت کا موقف ہے کہ

قوم کا سرمایہ اور مستقبل بغیر سیٹ بیلٹ کے کیوں لیے جاتے ہیں۔ یہاں تو ماں باپ بچے کی درست دیکھ بھال نہ کریں تو حکومت بچے چھین لیتی ہے۔

ساجدہ بولیں ''اوپر شال دے کر چھپا لیں۔''

میں نے بردہ فروشوں کی طرح اسے چادر کے نیچے چھپایا۔ کونج کی طرح کی وہ پتلی سی ننھی سی گردن نکال کر، ننا ننا، کرتی رہی۔ اور میں، چاااآ آ کر کے بہلاتی رہی۔

عالیہ کو فون کیا۔ وہ ہسپتال سے بھاگی آئی۔ آئمہ نے ماں کے پاس جانے سے صاف انکار کر دیا۔ ''نائے۔۔۔ نائے'' اور ماہین کے گرد ننھے ننھے بازو لپیٹ دیے۔

''چلو جی،'' ساجدہ بولیں۔

ان کے ہاتھ ایک معصومانہ رعونت سے پہلے ہی جھٹکے جا چکے تھے۔ ہنستے کھیلتے واپس جاتے ہوئے یونہی خیال آیا۔ صادق دوست زندگی کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ زندگی کو ایک خوبصورت دن عطا کرنے کا شکریہ ساجدہ!!!

••

کون کہتا ہے زباں کل کو یہ مر جائے گی؟

اگلی نسل کو اردو زبان سکھانے کی کوشش میں بس اتنا کیا کہ اس سے ہر بات اردو میں کی۔ ڈے کیئر سنٹر سے واپس آ کر وہ ڈینش لفظ بولتی تو اس کا ترجمہ کیا جاتا۔ میں نے اس کے والدین سے صرف ایک درخواست کی کہ ''بچی کو اس کی موروثی زبان سے محروم مت کیجیے گا۔ اس سے اردو بولیے۔ ڈینش انگریزی تو آ ہی جائے گی۔''

سو کوشش جاری ہے۔ محترمہ ساری بات سمجھتی ہیں، کلیدی الفاظ بولتی بھی ہیں۔ کئی ستم ظریف کہتے، ''رہنے دیجیے۔ دماغ کنفیوز ہو جائے گا، ویسے بھی اردو کس کام کی۔''

میں سب کی سنتی لیکن بچی سے مسلسل اردو ہی میں بات چیت ہو رہی تھی۔ اس دن میں اس کی سالگرہ پر حکم کے مطابق اچھے کپڑے پہن رہی تھی۔ جیولری پہننے کا حکم بھی تھا اور چویاں.. یعنی چوڑیاں بھی پہننی تھیں۔ میں تیار ہو کر باہر نکلی... اچانک آواز آئی...

''واؤ... یہ کون آیا؟ نانو آئیں، شیشہ دیکھیں... جلدی جلدی۔''

اس نے ایک سانس میں مکمل اردو میں وہ تمام جملے دوہرانے شروع کیے جو پچھلے تین برس میں ہم سے سنتی رہی۔ میں نے اسے گود میں بھر لیا۔ بڑی ادا سے بولی...

نانو کی زندگی ہوں
ماموں کی لاڈلی ہوں
امی کی جان ہوں
بابا کی بے بی ہوں
چاچو کا بھالو ہوں
دادو کی رااااااانی

یہ وہ الفاظ ہیں جو وہ پچھلے ایک سال سے سن رہی تھی۔ ایک ہی سانس میں بالکل درست انداز میں وہ سارے الفاظ دوہراتی ہے جو اسے گزشتہ سال سے ہم پکارتے چلے آ رہے تھے۔ تین برس کی عمر میں تین زبانیں بولنے کا آغاز کر ہی دیا بچی نے۔

میرے لیے دعا فرمایئے، جانبر ہو جاؤں۔ آج اسے ملنے جا رہی ہوں۔

••

آئمہ صوفیہ کے کنڈر گارٹن کی ابتدا ... شمالی یورپ بچوں کا تہوار فیسٹے لاؤن قدیم ڈینش زبان کا یہ لفظ جرمینک زبان سے مشتق ہے۔ fastelaghen یا فاسٹ ایوننگ، کسی نہ کسی رنگ میں سکینڈے نیویا میں منایا جاتا ہے. پیرس سے کارنیوال کے ثقافتی تحفے میں اس میں رنگ بھر دیئے گئے لوتھرن تہوار کی صورت میں یہ ایش وینس ڈے.... کے بعد پہلی اتوار یا سوموار کو منایا جاتا ہے... بعد میں اسے بدعت قرار دے دیا گیا۔ پندرھویں صدی میں اس دن ایک خاص رسم ادا کی جاتی تھی، جو آج بھی موجود ہے۔ ڈنمارک میں یہ رسم کرسچن دوم کے زمانے میں جرمنی سے لائی گئی۔

بیچاری شروڈنگر کی بلی... کی طرح...

لکڑی کے ایک ڈرم می ایک زندہ بلی بند کر دی جاتی۔ پھر سارا محلہ مل کر اس ڈرم کو لکڑی کے ڈنڈے سے پیٹتا، ڈرم کے ٹوٹ جانے پر بلی نکل کر بھاگ جاتی۔ بستی سے شیطانی طاقت نکل جاتی۔ لوگ ناچتے گاتے ڈھول بجاتے اور گرما گرم روٹی بیک کر کے کھاتے۔

اب تعلیمی اداروں کے بچے ذوق وشوق سے رنگ برنگ بھیس بدل کر تیار ہوتے ہیں۔ پھر نرم و نازک لکڑی کا ڈرم کمرے کے وسط میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ اس میں چاکلیٹ، ٹافیاں بھری ہوتی ہیں۔ بچے قطار میں باری باری اس ڈرم کو ڈنڈے مارتے ہیں۔ جو بچہ ڈرم پھاڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ بلیوں کی رانی یا بلیوں کا راجہ قرار پاتا ہے۔

ٹافیاں بکھرتی ہیں، غبارے اڑتے ہیں اور بچے اپنے اپنے لباس پہنے سارا دن کھیلتے ہیں۔ شام کو سکول کے بچے ٹین کے ننھے ڈبے لیے گھر گھر سے ٹریٹ مانگنے آتے ہیں۔ ہیلووین کی ٹریٹ آرٹرِک کی طرح شرارتیں کرتے ہیں۔ ایک ڈینش گانا الاپا جاتا ہے۔ تدریس کے زمانے میں کیا ترجمہ دیکھیے...

فیسٹے لاؤن نام ہے میرا
روٹی مجھ کو لینی ہے
مجھ کو گر نہ روٹی ملی تو
میں نے جھگڑا کرنا ہے
اوپر روٹی، نیچے روٹی
روٹی میرے پیٹ میں
مجھ کو گر نہ روٹی ملی تو
میں نے جھگڑا کرنا ہے
آج کتنے برسوں بعد آئمہ صوفیہ نے وہ دن مجھے لوٹا دیا۔

••

مسجد مندر یہ میخانے
کوئی یہ مانے، کوئی وہ مانے
سب تیرے ہے جاناں کاشانے
کوئی یہ مانے، کوئی وہ مانے
دوستو

ڈنمارک میں انڈیا، بنگلہ دیش اور سری لنکا سے بہت سے آئی ٹی انجنیر، ڈاکٹرز وغیرہ گرین کارڈ پر آرہے ہیں... پاکستان سے یہ تبادلہ کیوں نہیں ہوتا... یہ دلخراش موضوع اگلی تحریر تک اٹھا رکھتے ہیں...

آئمہ صوفیہ کے کنڈر گارٹن میں ایک نیا لیو بیو بچہ آیا، جس کا تعلق سری لنکا سے ہے، اس کی والدہ چائلڈ سپشلسٹ ہیں... ایک ہمسائے میں فیملی آئی جن کا تعلق انڈیا سے ہے، آئی ٹی کی جاب پر، ان کی ایک بچی کیمایہ، آئمہ صوفیہ کی ہم عمر ہے... ان دونوں بچوں کو زبان نہیں آتی... آئمہ

بی بی کے ایک نئے کردار نے ہم سب کو چونکا دیا، اس نے باقاعدہ ان بچوں کو کنڈرگارٹن کے قواعد سکھائے، خود جوتے پہننا، کوٹ اتار کر اپنے خانے میں رکھنا، ہاتھ دھونا، دروازہ بند کرنا، کمرے کے اندر جوتے بدلنا، اور باہر جاتے ہوئے اسے مخصوص جگہ پر رکھنا..... اس کے بعد اپنی صوابدید کے مطابق ان کی ترجمانی بھی کرتی ہے اور بہت اعتماد سے ہائیڈی کو بتایا کہ ابھی ان کو ڈینش نہیں آتی اس لیے ''ہم زیادہ دوست بن گئے ہیں''...

عالیہ نے ان بچوں کو گھر شام کے کھانے پر بلایا... کیمایہ کی والدہ برہمن ہیں لیکن والد کسی اور ذات سے ہیں... بچے کھیل رہے تھے، نماز کا وقت ہو گیا... موبائل۔فون پر آواز گونجی...

آئمہ صوفیہ کی دادو جان جائے نماز پر کھڑی ہو گئیں... آئمہ نے جھٹ اپنا دوپٹہ اٹھایا اور ان کے پہلو میں جا کھڑی ہوئی... اس کے دیکھا دیکھی ،کیمایہ بھی بھاگی اور آئمہ کے ساتھ نماز نماز کھیلنے کی کوشش کرنے لگی....

عالیہ نے دونوں کو دیکھا تو گھبرا گئی لیکن اس نے کیمایہ کو بہت پیار سے اٹھا لیا... اور کہا کہ آپ ادھر بڑے کمرے میں ٹی وی دیکھیں... آئمہ صوفیہ اپنی دادو جانی کے ساتھ نماز پڑھ رہی ہے نا.... آپ اپنی امی کے ساتھ پڑھیں گی، کیمایہ ناراضگی کا اظہار کرنے لگی...

لیکن عالیہ نے اس کی والدہ سے تذکرہ کر دیا کہ بچے اس بات کو لے کر ناراض ہوئے آج، وہ ہنسنے لگیں اور کہا کہ کوئی مسئلہ نہیں، بچیاں تو اسے کھیل سمجھ رہی تھیں... آئمہ صوفیہ نے فوراً سوال اٹھایا کہ اب اللہ میاں سے بات کرنی ہے تو کیمایہ کیوں نہیں کر سکتی...

کثیر الثقافت معاشرے میں بچوں کی تربیت، سوالوں کے جوابات، اور ان کو مطمئن کرنا... والدین کے صبر و تحمل کی آزمائش ہے... تین سالہ بچی جو سوال اٹھانے لگی ہے...

••

آئمہ صوفیہ کے چچا اور پھوپھو جانی کی شادی پر بہت لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ چونکہ اس کی اماں تو شادی ہال میں میزبانی کے فرائض ادا کرنے کے لیے پہلے پہنچتی تھیں، ہم دونوں بعد میں آرام سے جاتے۔ جہاں بہت سے تعریفی کلمات سننے کو ملے وہیں یہ بھی سننے کو ملا کہ آپ نے تو روایتی نانی کا تصور ہی بدل دیا۔

کہاں سفید کھچڑی بالوں والی بزرگ خاتون ناک پر عینک رکھے، کتاب پکڑے کہانیاں سنایا کرتی تھیں اور کہاں اطلسی ساڑھیوں، رنگین میکسیوں اور نت نئے لہنگوں، غراروں، شراروں میں

ملبوس نانی نواسی کی انگلی تھامے شادی ہال میں انٹری دیتی ہے۔ یا پھر نانی کولمبس بنی بچی ''بطوطی'' کو ساتھ گھمائے پھرتی ہیں۔

آخری بے تکلف تبصرہ ایک پرانی سہیلڑی نے کیا۔''ارے کم بخت، تو نانی بن کر بھی نہیں بدلی۔''

آج یہ ایک دو سالہ بچی نہیں ہے۔ یہ ایک مکمل کائنات ہے۔ ہر بچہ ایک مکتب ہوتا ہے۔ اس کی بند مٹھی میں صدق کے موتی ہوتے ہیں اور اس کی ہر ادا میں فطرت انسان سے ہم کلام ہوتی ہے۔ میں زندگی سے ایک مرتبہ پھر تعارف حاصل کر رہی ہوں۔

ابا جی کی طرح میرے خواب بھی لافانی ہیں جنھیں تعبیر دینے کی ہر ممکن کوشش اس مختصر وقفۂ حیات میں کرنی ہے اور باقی ورثے میں آگے منتقل ہو جائیں گے۔ آج آئمہ صوفیہ کی صورت میں میرے خواب تتلیوں کی مانند میرے گرد رقصاں ہیں۔ میں ان رنگین غباروں کو شاداب امید کے دھاگے سے باندھتی ہوں اور پھر یہ دھاگہ انگلی کے گرد لپیٹ کر چل دیتی ہوں۔

میری دوسری انگلی آئمہ صوفیہ کی مٹھی میں ہے۔

••

نظم

آئمہ صوفیہ

وہ آنکھوں کے ستاروں سے
نیا ایسا نظامِ شمسی اک ترتیب دیتی ہے
کہ جس میں میری ہستی کو نیا محور ملا ہے یوں
کہ وارفتہ طوافِ چشم کرتی ہوں

وہ نازک انگلیوں میں جب پکڑتی ہے مری انگلی
وہ جب برکت بھرے ہاتھوں سے مجھ کو تھام لیتی ہے
کبھی وہ شنگرفی ہونٹوں کے ملکوتی تبسّم کے
حسیں اک دائرے میں ساری دنیا قید کرتی ہے!

کبھی شاید فرشتوں کی ذرا شوخی پہ
وہ خوابوں ہی خوابوں میں یوں ہنستی ہے

کبھی اپنی گلابی نرم سی نازک ہتھیلی کو اٹھاتی ہے
اور اس کو لاٹ دیتے چاند جیسے ضوفشاں ماتھے پہ رکھتی ہے
کبھی جنت کے پانی سے دھلے پھولوں سے عارض پر
وہ معصومانہ
لانبی انگلیوں کو ایسے رکھتی ہے
کہ خوابوں میں بنائے خاکوں میں کچھ رنگ ابھرتے ہیں!
میں ان خوابوں کو اک قرطاس کے دامن پہ رکھتی ہوں
شہابی پاؤں کے غنچے
کہ جیسے دودھ میں ہلکورے لیتی پتیاں گل کی
میں ہاتھوں میں انھیں لے کر
نئے رستوں کی ان دیکھی فضا میں
زمزمہ خواں ہوں
اور ان پیروں کی جنبش سے
تخیل پھر نئے افلاک بھی دریافت کرتا ہے

مرے مسحور!
میں اپنی اَن کہی نظموں کے ریشم کو اگر یکجا کہیں پر ڈھیر بھی کر دوں
تو شاید اس لطافت سے بھرے احساس کی خوشبو کا اک جھونکا بھی
مرے لفظوں کے گلشن تک رسائی پا نہیں سکتا
قدم میرے زمیں سے چند فٹ اوپر۔۔۔

ذرا سا اور بھی اوپر
غرور و سر خوشی کی بے کراں
مغرور سی اک کیفیت میں
بن رکے۔۔۔۔!
تخیل کے سجے
کہ قاف کی جانب اڑانیں لیں
جہاں احساس کی پریاں
نئے الفاظ کے اَن دیکھے رنگوں کی
حریری۔۔۔خوش نما۔۔دلکش قبا کی منقطع پیوند میں مصروف۔۔۔
جادو کی چھڑی ایسے گھماتی ہیں
کہ
کہ سرشاری بھرے اشکوں کے موتی چارسو بکھریں۔۔۔
میں بھیگی مسکراہٹ سے اسے باہنوں میں بھرتی ہوں
جبینِ صبحِ روشن دار!
لبوں سے کچھ دعاؤں کے
نئے پھولوں کی مہکی۔۔لازوال۔۔ابدی۔۔سجل مالا پروتی ہوں!
اسے تخلیق دینے والی ماں کے لمس کے جادو سے واقف ہوں۔۔۔
ابھی کل ہی اسے میں نے جنم دے کر اٹھایا تھا
ابھی میری سماعت کے دریچوں میں
اسی کلکاری کی کستوری میں لپٹی یہ شمعیں جگمگاتی ہیں
یہ وقت اک دلربا دوشیزہ کی اٹھلاتی۔۔بانکی چال چلتا
نجانے کب میری نظروں کے محور سے کہیں باہر
عجب اک برق رفتاری سے سمتِ نَو میں رقصاں تھا

مرے چاروں جوانب۔۔۔
رنگ و رامش سے بھری
کلکاریوں کے نور افشاں انجم و مہتاب گھومے جا رہے ہیں
سماعت اب بصارت کو نئے آفاق دیتی ہے
تشکر کے چھلکتے بادلوں پر پاؤں رکھے
لازوال اکرام گنتی ہوں
میں باہنوں میں بھری دنیا کی تابندہ جبیں پر
اِن لبوں سے اک نئی دنیا سجانے پر بھی قادر ہوں
میں ان کلکاریوں کی......
اس ہمکتی مشک کی
تخلیق در تخلیق در تخلیق۔۔۔
خالق ہوں

(صدف مرزا)

••

نیلے ویسپا پر شہزادہ

ہمارے وجیہہ وشکیل تایا زاد بھائی جان رضوان جنھیں میں بچپن میں کہانیوں کا شہزادہ سمجھتی تھی، میرے بچپن کی بہت ابتدائی یادوں میں سے ایک ہیں۔ سرخ وسفید چہرہ اور خوب صورت کپڑے پہنے نیلے رنگ کے ویسپا پر آتے جاتے رضوان بھائی۔ سکول میں جب مجھے بادشاہ کی کہانی لکھنے کو کہا گیا تو میں نے اس میں شہزادے کا کردار بھائی جان رضوان کا لکھا۔ میرے ذہن میں ان کا نقشہ ہمیشہ ایسے ہی آتا۔

ابا جی کہانی سے بہت محظوظ ہوئے جس میں ایک خوبرو شہزادہ ایک عام سے گھر میں پیدا ہوتا ہے لیکن وہ اپنے نیلے ویسپا پر بیٹھ کر بہت سے ناممکن کارنامے دکھا سکتا ہے۔ جب وہ گھر آ کر ویسپا سکوٹر کھڑا کرتے تو ہم اس پر سواری کی کوشش کرتے۔ چچا جان شریف کی طرح وہ بھی امی جی کے بہت لاڈلے تھے۔

رات کو کھانے کے بعد جب وہ اپنے چاچا جی کو ملنے آتے تو بیرونی دروازے کے ساتھ لگے بجلی کے مین سوئچ کو آف کرتے۔ ہم سمجھتے بجلی بند ہوگئی ہے۔ پھر فوراً بجلی آجاتی۔ ابا جی ہنس کر کہتے کہ یہ میرا پتر رضوان آ گیا ہے۔ بھائی جان مسکراتے ہوئے اندر آتے، امی جی جہاں بیٹھی ہوتیں پاس بیٹھ جاتے۔ صبح سویرے اپنے نیلے ویسپا پر بیٹھے اچانک سلام کرنے نمودار ہوجاتے۔

میرے بچپن کی یادوں میں ایک بہت واضح منظر یہ بھی ہے کہ جب میرا بازو ٹوٹا تو بھائی جان اپنے نیلے ویسپا پر، جسے میں اڑن کھٹولا سمجھتی تھی، بٹھا کر جہلم لے کر گئے اور میں سارا راستہ بھوں بھوں روتی پیٹتی گئی۔ بازو کی ہڈی چڑھانے والے منحنی سے آدمی نے جھلا کر کہا، ''اب ہڈی ٹوٹی ہے تو سیدھی جڑنے کی نہیں۔ کمال ہے ذرا سی بچی نہیں قابو آتی۔''

اس ماہر سرجن کی یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔ جب لگا تار تین دفعہ کھیلنے کودنے پھاندنے کی وجہ سے بازو کی ہڈی ٹیڑھی جڑ گئی تو ایک دن بھائی جان اپنے شیریں لہجے میں بولے...

''ہن تے بس کر دے میری بہن، باز آ جا۔ ایک بازو صرف تین مرتبہ ہی ٹوٹ سکتا ہے۔''

امی جی کو بھی ان سے ایک خاص انسیت تھی اور جب مجھے بہت دیر بعد پتہ چلا کہ یہ ہمارے سگے بھائی نہیں ہیں۔ سگے اور چچا زاد کی اصطلاح ہائی سکول میں جانے کے بعد سمجھ آئی جب بزمِ ادب کے لیے ایک مضمون لکھتے ہوئے میں نے پورے خاندان کے نام لکھتے ہوئے سب کے نام لکھے۔ سکول کی ایک معروف استاد آپا جی شمس ہنس کر بولیں ''اتنی مخلوق ایک گھر کی کیسے ہو سکتی ہے؟'' پھر انھوں نے چچا زاد، تایا زاد وغیرہ کی اصطلاحات سکھائیں۔ کتنے دیر وہ میرے بیس تیس بہن بھائیوں کے ناموں پر ہنستی رہیں۔

بھائی جان مجھے اکثر امی جی کی باتیں بتاتے رہتے۔ کہتے کہ خاندانوں میں جب کبھی کوئی متنازع بات ہوتی تو چچی جان کی رائے اہم ترین ہوتی۔ انھوں نے ابتدا سے ہی اپنے حسنِ سلوک اور خداداد حسنِ اخلاق سے پورے خاندان کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ چھ بھائیوں کی بیویاں، اپنے ساس اور سسر کی غیر موجودگی میں بھی اتفاق سے ہر خوشی و غم کے مواقع پر اکٹھی جایا کرتیں۔ چچی جان کا مقام ہر مہمان نوازی میں مرکزی تھا۔

کوئی گاؤں سے آیا، کسی کا بچہ پڑھنے کی غرض سے سالہا سال آ کر رہا، کوئی وقت بے وقت کام پڑ جائے، چچی جان کی پیشانی پر بل آتا نہ ان کے کام کرتے ہاتھ رکتے۔ کام سے کام رکھنا اور بات بنائے رکھنا ان کی ذات کا خاصہ تھے۔

••

بھائی جان رضوان کو بھی شاید اپنے بزرگوں سے محبت اور سعادت مندی کے باعث کوئی دعا ہی لگی کہ ان کے گھر میں ایک ایسی عورت اتری جس نے اپنے حلم، اخلاق اور محبت سے پورے خاندان کی باگ ڈور تھام لی۔ امی جی کہا کرتی تھیں کہ میں نے خالدہ کی والدہ سے عجز سیکھا۔

خالدہ باجی اپنے جہیز کی کتابوں بھری الماری سے مجھے ایک ایک کر کے کتابیں پڑھنے کے لیے دیا کرتی تھیں۔ خاندان کے سارے بزرگ بہت متاثر تھے کہ جہیز میں کتابوں کی اتنی بڑی الماری لے کر آئی ہیں۔ عورتوں کو کپڑے لتے، برتن اور زیور وغیرہ جمع کرنے سے فرصت نہیں ملتی۔ جب وہ لاہور جاتیں تو امی جی کے لیے اون کے گولے اور بھائی جان رضوان کے لیے رنگ رنگے

کرتے بنوا کر لاتیں۔ امی جی کہتیں کہ رضوان نے کپڑے کی شان میں اضافہ کر دیا ہے۔

••

برگد کے آخری صفحات مکمل کرنے سے پہلے مجھے بھائی جان رضوان سے بہت سے سوالات کرنا تھے۔ تایا جان کی حکمت اور طب کا کالج، پٹیالہ کالج، چچا جان شریف کا گورڈن کالج، ان کا برطانیہ جانا، ان کی تعلیم، شادی اور وہ تمام باتیں جن کا شعوری طور پر جاننا کبھی ضروری ہی نہیں تھا۔

وہ باتیں کرتے رہے اور میں ستاروں بھرے آسمان کی ردا کے نیچے بیٹھی، عمر کی سترویں دہائی کو چھوتے رضوان بھائی کی باتیں سنتی رہی۔ رب العزت شکرانے کے اظہار کی توفیق بھی کسی کسی کو عطا کرتا ہے ورنہ اتنی بڑی دنیا پھر کر علم کی بلندی پر پہنچ کر لوگ دیوار سے لگی سیڑھی پاؤں کی ٹھوکر سے گرا دیتے ہیں۔

مجھے اپنے بچپن کی باتیں بتاتے ہوئے کہنے لگے کہ سب بہن بھائیوں میں سے صرف ہماری چچی جی (میری امی جی) نے دادی دادا کی خدمت کی اور ہم انتہائی بچپن میں جب گرمی کی چھٹیوں میں دولت نگر جاتے تو ہمارے لیے مرغیاں اور بطخیں پال رکھی ہوتی تھیں کہ بچے آ کر ان سے کھیلیں گے۔ جب تک دادا جان اور دادی جان رہے، چچی جی ان کے پاس رہیں۔ دل و جان سے ان کی خدمت کی۔ انھیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ کوئی اور ان کی خدمت کے لیے کیوں حاضر نہیں ہوتا، صرف میں ہی کیوں کروں۔ ایسے لگتا تھا کی چچی جان اسی گھر میں پیدا ہوئی ہیں اور اپنے دیوروں کے ساتھ پل کر بڑی ہوئی ہیں۔ اوپر تلے کے بہن بھائیوں کی طرح وہ ان سے ضدیں کرتے اور وہ کبھی میکے جانے کا نام لیتیں تو چچا جان شریف ان کے سر ہو جاتے کہ ہمارا کیا ہوگا؟ اُدھر کیوں جا رہی ہیں؟ چچا جان شفیع شور مچا دیتے، ''اوتھے کیہہ پیا اے'' (وہاں کیا پڑا ہے)۔

بھائی جان رضوان بتانے لگے کہ ایک مرتبہ تائی جان کو کسی نے امی جی کے بارے میں غلط فہمی ڈالی۔ رضوان بھائی جان نے پوری بات سنے بغیر اسی وقت کہا کہ میری چچی جان ایسا کر ہی نہیں سکتیں، اور بعد میں وقت نے ان کی بات کی تصدیق کی۔ رضوان بھائی جان امی جی کے ساتھ ایسے کھڑے ہوتے جیسے کوئی فی زمانہ اپنی سگی ماں کا ساتھ بھی نہیں دے سکتا۔ میں نے اپنا موبائل سامنے رکھا اور ان کی باتیں ریکارڈ کر رہی تھی۔ بھائی جان نے مجھے ان خواتین کے بارے میں بتایا جو غلط فہمی اور فساد ڈالنے کی کوششوں میں تھیں۔

''پتہ نہیں یہ عورتیں ہی کیوں ایسے کاموں میں ملوث ہوتی ہیں؟'' وہ بولے،''خاندانوں کے مسائل میں نوے فی صد حصہ ان عورتوں کے حسد اور لگائی بجھائی کا ہوتا ہے۔''

''پتہ نہیں ذہین سے ذہین اور دانش مند ترین مردان بیبیوں کی باتوں میں کیسے آجاتا ہے؟''

میں نے گود میں بیٹھی سات ماہ کی آئمہ کو کاندھے سے لگایا اور ریکارڈر بند کیا۔

خالدہ باجی جلدی سے اُٹھ کر میرے پیچھے آئیں...

''بات سنو! کسی کا نام مت لکھنا کتاب میں، گڑے مردے اکھیڑنے والی بات ہے۔ ہر جگہ ہر خاندان میں ایسے لوگ ہوتے ہیں لیکن کوئی بھی بات سوچ سمجھ کر ہی تحریر کیا کرتے ہیں۔''

مجھے ان کی بات سن کر ہنسی آگئی۔ میں نے کہا،''فکر مت کیجیے۔ یہ نام صیغۂ راز میں رہیں گے۔''

••

میں کھلے آسمان تلے رضوان بھائی جان کے گھر میں ان کے سامنے بیٹھ کر گم گشتہ یادوں کی گودڑی سے وہ سارے لعل مٹھی میں سمیٹنے کی کوشش میں تھی جو وقت، بیماری اور حادثات نے میری یاد کے خانے سے محو کر دیے تھے۔ وہ اپنے بچپن کو یاد کرتے ہوئے بچوں کی طرح مسکرائے اور ان کے صبیح چہرے پر پھیلی روشنی میں مجھے ہمیشہ کی طرح بیک وقت بابا جان، ابا جی، اور تایا جان دکھائی دیے۔

''میں چاچا جی کو صرف دو لفظوں میں بیان کرسکتا ہوں۔'' بھائی جان نے مختصراً کہا ''توکل اور ایثار۔'' چچا جان کو''تیرا میرا، اپنا پرایا اور سود و زیاں'' کی فکر کبھی بھی لاحق نہیں رہی۔ بس مسلسل محنت اور بڑے بھائیوں کا احترام ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ دونوں بھائی جب دواخانے میں اکٹھے کام کرتے تو وہ کسبِ معاش اور رزق کمانے کی جد و جہد کا دور تھا۔ تایا جان ابا جی سے کہتے کہ تم جو جی چاہے لیا کرو، تم ملازم نہیں مالک ہو۔''

''نہیں لالہ جی، بس یہی بہت ہے'' وہ کمال قناعت سے کہتے۔ ایک دن تایا جان نے ناراض ہو کر کہا،'' کچھ دنیا داری بھی ضروری ہے'' اور پھر حکم دینے کے انداز میں کہا،''یہ سب کچھ تمھارا بھی ہے۔ جو جی چاہے لیا کرو۔''

تایا جان، ابا جی کے برادرِ محترم ہی نہیں استاد بھی تھے۔ ابا جی ہمیشہ کہتے کہ آج میں جو کچھ ہوں لالہ جی کی دعاؤں سے اور ان کی عنایات سے ہوں۔ انھوں نے جس حکمت سے میری تربیت کی، زندگی بسر کرنے کے لیے میری رہنمائی کی، وہ صرف ایک باپ کرسکتا ہے۔ تایا جان

جب بات کرتے تو فرماتے کہ آج میں جو کچھ ہوں اپنے لالہ جی (بابا جان غلام نبی مرزا) کے التفات سے ہوں۔ انھوں نے کمایا اور مجھے پٹیالہ بھیج کر تعلیم دلائی، ذہنی اور جذباتی نشوونما کی۔

تایا جان نے حصولِ علم کے بعد ایک دفعہ ایک نواحی دیہات ''بولانی'' کی مسجد میں عید کی نماز پڑھائی۔ دعا کے بعد گاؤں کے سرکردہ لوگ آئے اور ایک تھیلی جس میں ایک ایک روپے کے تین سو سکے تھے جو اس زمانے میں کئی لاکھ کے برابر تھے، تایا جان کے سامنے رکھے۔ رضوان بھائی بتاتے ہیں کہ جن صاحب نے یہ قصہ سنایا وہ آبدیدہ ہوگئے اور کہنے لگے کہ تایا جان کا سرخ و سفید چہرہ پیلا پڑ گیا، ''یہ کیا ہے؟'' انھوں نے استفسار کیا۔

''وہ جی گاؤں والے آپ کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔''

تایا جان چند لمحے ششدر اس تھیلی کو دیکھتے رہے۔ پھر یک لخت چکرا کر گر پڑے۔ اب خدمت گاروں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ کسی نے پانی پلایا تو کسی نے پیروں کی مالش کی اور کسی نے ہتھیلیاں دبائیں۔ تایا جان نے ہوش وحواس بحال ہوتے ہی کہا کہ یہ پیسے لے جائیں اور گاؤں کی بیواؤں میں تقسیم کر دیں۔ مسجد میں تدریس میرا فریضہ ہے پیشہ نہیں۔ شاید یہی وہ تاریخی لمحہ اور بے لاگ فیصلہ تھا جس نے سرائے عالمگیر میں صحت و تدریس کے میدان میں ایک سنگِ میل رکھا تھا۔

بابا جان نے بھی جب یہ واقعہ سنا تو فرمایا کہ مسجد میں امامت کرنا اور لوگوں کی تربیت کرنا ایک مقدس فریضہ سہی، لیکن آپ کا ذریعہ معاش کچھ اور ہونا چاہیے تاکہ مدرسہ اور ملا کے اس تصور کو بدلا جائے۔ اپنے قدم مضبوطی سے جماؤ اور پھر شوق کی تسکین کے لیے جس مسجد میں چاہو لوگوں کو پڑھانے بیٹھ جانا۔ یہی وہ ہدایات تھیں جن کی بنا پر ایک پورے خاندان کی بنیاد رکھی گئی۔ رضوان بھائی جان، ابا جی کی بات کرتے ہوئے محبت اور عقیدت مندی سے ہر مرتبہ نئے الفاظ چنتے۔ ''چاچا جی سراسر پیار اور سراسر بے غرض و بے لوث ہستی تھے۔ چاچا جی کا پیار شامل نہ ہوتا تو ہم کہاں ہوتے۔''

بھائی جان رضوان کے بیلوں سے ڈھکے لان میں ہم دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے اور دونوں کی آنکھوں میں اشک رواں تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ ہم کسی اور ہی دنیا کے کچھ اور ہی باشندوں کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ لوگ جن کا خون ہماری رگوں میں گردش کر رہا تھا اور اس خون میں شاید کسی انتھک محبت کا کوئی خلیہ بھی شامل تھا جو رشتوں کو ایک نکتے پر مرکوز رکھنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

••

ہماری ایک ہی پھوپھو جان تھیں آمنہ بی بی، جن کی کم عمری میں ہی شادی ہوگئی اور بیاہ کر گجرات شہر چلی گئیں۔ اس زمانے کے رواج کے خلاف یہ ایک معجزہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ پڑھ لکھ سکتی تھیں۔ پھوپھو جان نے گلی محلے کے بچوں کو قرآن پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ جب بھی ہمارے گھر آتیں امی جی دودھ سویاں بناتیں اور بالائی کی موٹی تہہ ساتھ موجود ہوتی۔ پھوپھو جان کو سفید چینی پسند نہیں تھی۔ امی جی ان کے لیے شکر اور کسی نہ کسی گاؤں سے آیا سوغات کا میوے والا گڑ رکھا کرتی تھیں۔ پھوپھو جان کھانا کھا کر اوپر بابا جان کے کمرے میں جایا کرتیں۔ ان کے پاس پوٹلی میں بابا جان کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات ہوتی۔ میں بکری کے میمنے کی طرح پھوپھو جان کے پیچھے جاتی۔ کبھی پوٹلی میں تِل کی پنیاں برآمد ہوتیں، کبھی السی کے لڈو، کبھی چنے کی دال کی پنجیری۔ میں بہت بدمزہ ہوتی۔ ایک مرتبہ وہ بابا جان کے لیے میٹھے بادام لائیں۔ میں نے شور مچا دیا کہ بابا جان کو بادام نہ کھلائیں ورنہ سختی ہماری آئے گی۔ وہ پہلے ہی کوئی بات نہیں بھولتے۔

جب وہ جانے لگتیں تو امی جی ان کے سامنے قمیص اور دوپٹے رکھا کرتیں۔ ان میں سے جو پسند ہے وہ لے لو۔ میں امی جی سے پوچھتی کہ صرف قمیص دوپٹہ کیوں دیتی ہیں۔ کتنا عجیب لگتا ہے۔ پورا سوٹ کیوں نہیں دیتیں اور امی جی کہتیں اسے ''بیور'' کہتے ہیں۔ بہنیں جب بھائیوں کے گھر آتیں ہیں تو سر پر دوپٹہ رکھ کر بھیجتے ہیں۔''

مجھے کبھی اس رِیت کی سمجھ نہیں آئی تو بہنوں کو پورا جوڑا دینے میں کیا قباحت ہے۔

میں دسویں جماعت میں تھی جب پھوپھو جان کا انتقال ہوا۔ وہ دن ہمارے گھر میں ایک عجیب قیامت کا تھا۔ امی جی کبھی کہیں رات نہیں رہتی تھیں لیکن وہ تین دن بعد گھر آئیں اور اگلے کئی دن تعزیت والوں کا تانتا بندھا رہا۔

برگد کی تکمیل سے پہلے میری عادت تھی کہ میں روز شام کو رضوان بھائی جان کے پاس جا کر بیٹھ جاتی اور ان سے دادا جان اور دادی جان کی باتیں سنتی۔ میں بھائی جان رضوان سے پھوپھو جان کے بارے میں بات کر رہی تھی کہ اچانک انھوں نے کہا کہ پھوپھو جان ابا جی کی نصف بہن تھیں۔

''ہائیں؟'' میں نے آئمہ صوفیہ کو کھانا کھلاتے کھلاتے ہاتھ روکا۔ ''لیکن امی جی نے تو ساری عمر کبھی اس بات کی بھنک نہیں پڑنے دی اور اب نانی بن کر مجھے علم ہوا کہ آمنہ پھوپھو کی والدہ اور ہمارے ابا جی کی والدہ ایک نہیں تھیں۔''

پھر ابا جی یاد آئے کہ وہ ان کے آنے پر کتنے خوش ہوتے۔ شام کو جلدی گھر آجاتے اور

خدا جانے کون کون سے رشتے داروں کی باتیں کرتے۔

••

انہی رضوان بھائی جان اور خالدہ باجی کی بیٹی صائمہ ہماری بھابی ہے جو بھابی کم اور بیٹی زیادہ ہے۔ عالیہ شادی کے بعد پہلی مرتبہ سات مہینے کی آئمہ کو لے کر پاکستان آئی تو پہلے سیدھا ہم بڑے بھائی جان اور بھابی کے پاس گئے۔ امی جی کے بعد انھوں نے جس طرح عالیہ کی شادی، اور نکاح کے جوڑے تک کی تیاریوں میں حصہ لیا وہ شاید اس کی نانی بھی زندہ ہوتیں تو نہ کرسکتیں۔ وہاں دو دن رہنے کے بعد ہم صائمہ کی طرف آگئے۔

عالیہ کو بہت ہنسی آتی، ''امی جی، ماموں تو گھر ہیں ہی نہیں اور مامی جان نے کیسے سارا چارج سنبھالا ہوا ہے۔'' بچوں کی تعلیم و تربیت سے لے کر خاندان کے ساتھ معاملات سنبھالنے کی خوش اسلوبی تک صائمہ میں اپنی ماں کی شخصیت جھلکتی ہے۔ خندہ پیشانی اور حسِ مزاح سے مہمان نوازی کرتی خاتون کا کردار ادا کرتی یہ بچی ابھی کل کی بات ہے، سیپارہ ہاتھ میں تھامے امی جی کے پاس آتی۔ ننھی ننھی آنکھیں بھیچ بھیچ کر زبردستی آنسو نکالتی اور امی جی رضوان بھائی کو گھر کنے لگتیں۔ ''کیا بچوں کے پیچھے پڑے رہتے ہو، پڑھ لے گی، ابھی عمر ہی کیا ہے؟''

بی اے میں پڑھتی اسی بچی کو اپنے پیارے چاچا جی کے دامن پھیلانے پر ایک لمحے کی پس و پیش کے بغیر رضوان بھائی نے رضامندی کے پھولوں سے بھر دیا۔ خاندان میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں، ایک ہی ماں باپ کی اولاد حتیٰ کہ جڑواں بچے تک مختلف مزاج لے کر آتے ہیں۔ خاندان ہی میں سے کسی نے امی کو مبارک دینے کے بجائے کہا، ''لو، رضوان کو اتنی جلدی کیا تھی بچی کو بیاہنے کی؟ بی اے بھی پورا نہ کرنے دیا اور شادی کر دی۔''

امی جی ہمیشہ اعتدال کے درمیانی راستے پر سفر اختیار کرتیں۔ مصلحت بھرا جواب دیا، ''اللہ نے زندگی اور موت کی طرح نکاح و شادی کا دن بھی مقرر کر رکھا ہے۔''

لیکن وہ خاتون اشارہ نہ سمجھیں۔ ''بچی کو امتحان تو دینے دیتا۔ آخر جلدی کیا تھی؟'' اگلا اعتراض ہوا۔

''بس اس کے چچا کا اصرار تھا تو حکم کی تعمیل کی'' امی جی کے چہرے پر مکمل سکون تھا۔ میں امی جی کو ٹرے سے بسکٹوں، مٹھائی اور سموسوں کی پلیٹیں اٹھا کر میز پر سجاتے دیکھتی رہی۔

''پھر بھی۔۔۔۔ آج کل کون اتنی جلدی مچاتا ہے۔ تعلیم بہت ضروری ہے۔ بچی کون سا

بوڑھی ہورہی تھی، جلدی کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ نجانے کیا کہلوانا چاہتی تھیں۔

امی جی نے خالی ٹرے اٹھا کر میز پر اور چائے کی پیالی ان کے سامنے رکھی۔ پھر بڑے دھیرج سے بولیں، ''جلدی اسے نہیں ہمیں تھی جن کے بیٹے کی عمر زیادہ ہورہی تھی، بڑھاتے نہیں کرنا سی ناں۔ وہ تو ابھی اگلے چار سال بھی پڑھ سکتی ہے، اٹھارہ برس کوئی عمر ہوتی ہے آج کل؟ لیکن ڈگریوں کی دُھن میں لڑکیاں پختہ عمر کی سطح پر ماؤں کی بھی مائیں بن جاتی ہیں پھر صرف وہ ڈگری ہی لے کر آتی ہیں۔''

اب کے امی جی نے چائے کی پیالی کے ساتھ جواب بھی دیا۔ یہ رہی سو سنار کی ایک لوہار کی۔ امی ابا جی کے لاڈلے رضوان بیٹے کی بات تھی، ہما شما کی تو تھی نہیں جو ادھوری چھوڑ دی جاتی۔

••

امی جی کی ایک عادت جو میں نے بچپن سے دیکھی وہ دوسروں کو خود سے بہتر سمجھنا، ان سے سیکھنے کی خواہش ظاہر کرنا تھا۔ خالدہ باجی کی والدہ ہمیں ملنے آتیں تو بڑے شوق سے ان کو اپنے گھر مدعو کرتیں۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو کہنے لگیں...

''بھئی اصل دانشمند عورت تو خالدہ کی والدہ ہیں۔ ڈپٹی کمشنر کی بیگم ہیں اور ان کے دیور سیشن جج، بیٹی یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ لیکن عجز وانکسار اور محبت وشفقت کا عالم دیکھو کہ چھوٹے سے شہر کے کثیر العیال خاندان میں بیٹی بیاہ دی اور اسے مسلسل سبق سکھا رہی ہیں کہ بیٹا یہ جو آپ کی نندیں ہیں یہ چڑیاں ہیں اور چڑیوں کا چنبہ اڑ جاتا ہے۔ بچے گھونسلہ خالی کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔''

ابا جی اور جملہ برادران باجی خالدہ کی والدہ سے شدید متاثر تھے۔ ان کا حلم، معاملہ فہمی اور بصیرت کو خراجِ تحسین پیش کرتے تھے۔ تایا جان نے ایک مرتبہ اور امی جی نے کئی مرتبہ ان کا یہ واقعہ مجھے سنایا۔ تایا جان نے ایک سادہ صفحے پر بھائی جان رضوان کے دستخط لیے اور لاہور خالدہ باجی کے والدین کے پاس پہنچے۔

تایا جان نے کہا کہ وہ اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ اس سادہ کاغذ پر جو شرائط یا مطالبات لکھنے ہیں لکھ لیجیے، ہمیں بلاچوں و چراں منظور ہوں گے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب کی بیگم نے فرمایا:

''سرائے عالمگیر والے تو بہت سادہ لوح ہیں، ارے میں بیٹی دے کر نیک گھرانے کا ایک پلا پلایا وجیہہ بیٹا لے رہی ہوں، شرائط تو آپ ہم سے لکھواتے، فی زمانہ ایسی عنایت ہر ایک پر

نہیں ہوتی۔''

تایا جان کہنے لگے:''میری ساری فراست اور حکمت اسی منکسرالمزاج عورت کی دُور اندیشی اور شیریں زبانی کے حضور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔''

پھر ہم نے اپنے کزنوں کی شادیوں پر ان کے پورے خاندان کو آ کر خدمت کرتے دیکھا۔

جب کتاب تکمیل کے مراحل پر پہنچی تو میں نے جا کر خالدہ باجی سے ان کی والدہ کے بارے میں پوچھا۔ جو جواب ملا وہ میری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھا۔ اگرچہ ان کی والدہ نے آنکھیں کھولتے ہی والدین کی شفقت سے محروم زندگی گزاری پھر شادی کم سنی میں ہوگئی اور پھر اپنے ڈپٹی کمشنر خاوند کے بھائی بہن پالے جو کہ ان کے سسر کی دوسری بیوی میں سے تھے۔ ایک سادہ اور دنیاوی تعلیم سے نا آشنا خاتون نے معاشرے کو بہترین تعلیم کے ساتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد دیے۔ خالدہ باجی امجد اسلام امجد کی ہم جماعت رہی ہیں۔ یونیورسٹی کی تعلیم پانے کے بعد شادی کر کے ایک چھوٹے سے قصبے کے ایک بڑے خاندان کی پہلی بہو بن کر آئیں۔ جہاں باقی بہن بھائیوں کی ذمہ داریاں ابھی باقی تھیں۔ اپنی والدہ کی تربیت اور حسنِ سلوک سے انھوں نے ایک انتہائی کامیاب زندگی گزاری۔ پھر جب ان کی بیٹی کی نسبت ابا جی نے اپنے بیٹے سے طے کی تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔

نقطۂ نظر وہی کہ جن بچیوں کی مائیں صابر، ذہین اور خوش گفتار ہوتی ہیں ان کی اولاد بھی اسی نقشِ قدم پر چلتی ہے۔ کبھی ان سے کوئی بڑا بول نہیں سنا اور نہ کبھی اپنے خاندان کی شان کے قصائد اور سسرال اور میکے کے تقابل اور موازنے میں، میکے میں سب کو بقراط اور افلاطون، محمد بن قاسم ثابت کرنا۔ شاید یہ ساری باتیں ہمارے اجتماعی لاشعور میں نقش ہیں۔

وقت جب مجھے ایسے ماحول میں لایا جہاں لوگوں نے انسانوں کو بڑے شہروں اور چھوٹے گاؤں، جائیداد، کاروبار، تنخواہ اور پیسے میں بانٹ رکھا تھا تو مجھے اپنا بچپن بہت یاد آیا۔ پھر ایسے لوگوں کی اوقات بھی سمجھ آ گئی اور ان کی دکھاوے کی نفسیات اور مریض ذہنیت سے سبق سیکھنے کا موقع بھی ملا۔

پھر خالدہ باجی کے چچا جان کی بیٹی عشرت احتشام بھی تایا جان کی بہو بنیں اور جہلم کالج میں کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں تدریس میں مصروف ہوگئیں۔ اس وقت میں بھی کالج ہی جاتی تھی اور جب کبھی مقابلے میں جیت کر آتی یا کوئی پوزیشن آتی تو وہ بڑے فخر سے سب کو بتاتیں کہ یہ میری نند

ہے۔ایک دن امی جی کے پاس بیٹھی کہنے لگیں کہ کالج کی پرنسپل مسز منیر نے مجھے کہا...
''اپنے بچوں کے سر پر ان کی پھوپھو کا ہاتھ رکھواؤ۔ چاچی جی! میرے بچے پھوپھی پر گئے تو قسمت سنور جائے میری۔''

امی جی فوراً بولیں،''اسے سر پر نہ چڑھاؤ۔ سب لوگوں نے مل کر اسے بگاڑ دیا ہے۔ آتا جاتا خاک نہیں، استری کیے ہوئے کپڑے ملتے ہیں۔ پہن کر صرف نخرے کرتی ہے اور شعر پڑھ دیتی ہے۔''

امی جی کے رویے اور خدشات ہر روایتی ماں جیسے تھے۔اس کائنات میں صرف مونث کو ہی ہر کام اور ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار کیا جاتا ہے شاید۔اور کسی ہنر کے نہ آنے کی وجہ سے سزا کی مستحق بھی۔ مجھے اس فلسفے کی سمجھ نہیں آتی تھی اور میں بآوازِ بلند اس کا اظہار کرتی جس پر مزید عتاب نازل ہوتا۔ خالدہ باجی بتاتی ہیں کہ جب بابا جان کو چائے دینے جاتیں تو وہ اپنے حقیقی باپ کی شفقت سے پوچھتے،''خوش ہوناں؟ کوئی کچھ کہتا تو نہیں آپ کو؟''

••

ہمارے خاندان کے پہلے نواسے فیصل کی شادی پر دولھن لے کر جب سرائے عالمگیر پہنچے تو رضوان بھائی نے اپنے ہاتھوں سے گھر کی آرائش کے لیے لائٹس لگائیں، کمرہ تیار کرایا اور کہنے لگے یہ میرے مرحوم چچا جان کے مرحوم بیٹے کا لختِ جگر ہے۔ خالدہ باجی نے نہایت محبت سے افشاں کو خوش آمدید کہا اور میرے بھائی، جو ان کے داماد ہیں، کی دولھن کے لیے محبت سے ہر چیز حاضر کی۔ اس سے کہیں بڑھ کر ہماری بھتیجی صائمہ نے خندہ پیشانی سے میزبانی کے تقاضے نبھائے۔

ابا جی کا مسرور چہرہ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔طبیعت کی خرابی اور نقاہت اپنی جگہ تھی۔اولاد کے عالمِ شباب میں داغِ مفارقت کا درد دل پر جس انمٹ سیاہی سے نوحہ لکھتا ہے اسے بے قراری کے آنسوؤں کی بارش دھو نہیں سکتی اور آتشِ فراق سے سلگتے اشک آگ نہیں لگا سکتے۔ گیلے کاغذ دل ہی میں کہیں سلگتے رہتے ہیں۔لیکن میں نے ابا جی کی ذات میں وہ بے نیازی اور راضی برضا رہنے کی کیفیت دیکھی جس نے مجھے زندگی بسر کرنے کے نئے اسباق دیے۔''ہمارے غموں سے دوسروں کی خوشیوں پر سائے نہیں پڑنے چاہییں۔ اور دیکھا جائے تو یہ زندگی کی بڑی سعادتوں اور نعمتوں میں سے ایک ہے کہ آپ اپنی اگلی نسل کی خوشیاں دیکھیں۔''

برسوں بعد میں فیصل کے ساتھ کینیڈا کے ڈھابوں اور سڑکوں پر اپنے بچوں کے ساتھ

پھرتے ہوئے ابا جی کو یاد کرتی رہی کہ خاندانوں کی بنیادوں میں ایثار اور بے لوث محبت بھر دی جائے تو آنے والی نسلیں فیض پاتی ہیں۔ آج تک افشاں نے فیصل کی کوئی شکایت کرنی ہو یا کوئی بات منوانی ہو تو چپکے سے فون کر دے گی، ''خالہ ذرا اپنے بیٹے کو دیکھ لیں۔'' مدھر اور میٹھے لہجے میں بات کرنے کا انداز اس نے اپنے بیٹے کو ورثے میں دیا ہے۔

دانیال کا لب و لہجہ بالکل ماں جیسا ہے۔ ٹھہرے لہجے میں مٹھاس بھر کر جب وہ مجھے دادی جان کہتا ہے تو یہ ساری شیرینی میری زندگی میں پھیلنے لگتی ہے۔ وہ آج بھی یاد کرتی ہے کہ سب گھر والے کس قدر مہمان نواز تھے اور کیسے انھوں نے میرے ناشتے تک میں میری پسند کی چیزیں منگا کر رکھی تھیں۔ پھر نانو (امی جان) میرے جاگنے کے انتظار میں بیٹھی رہتیں۔ میری جوان صائمہ مامی مجھے پوچھتی رہتیں کھانے میں اور کیا پسند ہے۔

••

ابا جی اکثر کہا کرتے کہ رضوان اور خالدہ نے ایک مثال قائم کر دی ہے۔ ایک بڑے خاندان کی ذمہ داریاں اٹھانا اور ان کو بطریقِ احسن نبھانا، بہن بھائیوں کے لیے ایک مثال بن کر رہنا اور ایثار کو اپنی فطرتِ ثانیہ بنا لینا۔ فی زمانہ ایسی عورتیں ایک خیالی پیکر معلوم ہوتی ہیں جو واقعی ایک نئے خاندان میں آ کر اس کا حصہ بن جائیں اور پھر اتنی نیک نامی اور عزت کمائیں۔

باجی خالدہ نے ایک مرتبہ بتایا کہ جب وہ شادی ہو کر سرائے عالمگیر آئیں تو رضوان بھائی جان نے ان سے کہا کہ ہمارے چچا جان اور چچی کو دوسرا گھر نہیں سمجھنا۔ یہ مجھے بہت پیارے ہیں اور واقعی انھوں نے ساری زندگی ہمیں بہن بھائیوں کی طرح رکھا۔ شادی و غم میں ساتھ دیا، ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر لے لیا اور خاندان کی بچیوں کے لیے مثال بن گئیں۔

میرے بچپن کی دلکش یاد اور بالواسطہ تربیت میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ لاشعوری طور پر یہ میرے لیے کامیاب ازدواجی زندگی میں سکون اور احترام کی زندہ مثال تھی۔ بھائی جان رضوان اور باجی خالدہ کا جوڑا بے لوث خلوص اور ایک دوسرے کی ذات اور خاندان کا ادب، ایک دوسرے کو اپنا لباس سمجھنا اور عزت کی حفاظت کرنا اور عزت کمانے کا عملی نمونہ تھا۔

مجھے ہمیشہ ایسے لگتا ہے کہ میرے بچپن میں اتفاقی لکھی کہانی کے شہزادے کو ایک شہزادی مل گئی اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔

••

چھپے تھے تیر کیا کیا مہربانوں کی کمانوں میں

اس سے قبل کہ میں اس قصے کا آغاز کروں، نارڈک اساطیر کے ایک کردار کی تفصیل پڑھ لیجیے۔ یورپ میں شعر و سخن، ارضیات و فلکیات، طب اور ٹیکنالوجی ہر میدان میں اکثر نام اساطیر ہی سے لیے جاتے ہیں۔ سو یہی طرز میں نے اپنے اسلوب میں بھی اپنائی۔

یہ بوڑھی دنیا اپنی شیر خوارگی کے زمانے سے ہی کمزور اور بے بس افراد پر زیادہ وزن لادنے کی عادی رہی ہے۔ جغرافیائی، لسانی، تہذیبی اور مجموعی دانش میں رچا بسا ہے کہ عورت کی ذات کے گرد اصول و قواعد کا ایک آتشیں حصار رہے۔ میری کتاب ''سخن کا سفر'' سے دو اقتباسات دیکھیے۔

> کائنات کی ابتدا سے ارض و سما کی تفہیم اور تشریح کا آغاز اساطیر سے ہوا۔ انسان نے اپنے تجسس کی تشنگی کے لیے داستانیں تخلیق کیں۔ ان کا مطالعہ درحقیقت انسانی نفسیات اور رجحانات کی تفہیم کی ایک کڑی ہے۔ اساطیر کی جمالیات زندگی کے ہر شعبے سے مترشح ہوتی ہے اور ان میں ہی عورت کا کردار کسی نہ کسی طرح کسی اعلیٰ دیوتا کی جنبشِ ابرو پر ہی تشکیل دیا جاتا۔ یونانی دیومالائی داستانوں میں عورت کا ذکر زیوس کی خدائی اور شہنشاہیت کے اختیارات کی ذیل ہی میں آتا ہے۔
>
> معاشرے میں عورت کو خواہ مرد کے جنسی جبر کا نشانہ بننا پڑے، اسے آبرو باختہ تصور کیا جاتا اور کنوار پن اور بچے پیدا کرنے کی صلاحیت جو اس کی وقعت کے دو اہم پتے تھے، اِن کے ختم ہوتے ہی اسے فاحشہ اور بدچلن قرار دے کر اس کا مستقبل تاریک کر دیا جاتا۔ دیوتاؤں کی ہوس کا نشانہ بننے کے بعد وہ خوں آشام درندہ بنا دی جاتیں۔ ان کرداروں پر مکمل کتاب

تحریر کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ عورت کی اہمیت کی استثنائی صورتیں اور امثال بھی موجود تھیں لیکن یورپی سماج اور شعر و ادب کی داستان اِنہی کرداروں کے حالات سے سمجھی جاسکتی ہیں۔

اس کتاب میں یورپی ادب اور معاشرت میں عورت کے تصور کے ابواب سے پہلے اساطیر کے حوالے سے جو میں نے تحریر کیا اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

''میرا ذاتی خیال ہے کہ اساطیر کی دیویوں کے گہرے مطالعے سے انسانی نفسیات اور موجودہ زمانے میں عورت کے کردار کی تفہیم آسان ہوتی ہے۔ سماج کے ارتقا اور ذہنی کشادگی کے دائروں کی حد بندی میں یہ داستانیں اہم کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ ان سے فنونِ لطیفہ میں رنگ آمیزی ہوئی۔ شعر و ادب میں شہہ پارے تخلیق کیے گئے۔ ضرب الامثال اور محاورات بنے اور معاشرے میں عمومی رجحانات کی ترویج ہوئی۔ یونانی اساطیر کی مشابہت رومن دیومالائی داستانوں کے ساتھ بالخصوص اور بین الاقوامی اسطورہ کے ساتھ بھی ہے۔ ان کے مطالعے اور موازنے سے علم ہوتا ہے کہ دنیا میں ابتدا سے ہی ان اساطیر میں بطور مرد اعلیٰ دیوتا یا دیوتاؤں کے دیوتا زیوس اور اس کے ہم پلہ دیوتاؤں کے لیے وہ تمام مراعات جائز اور قابلِ قبول تھیں جو آج کے مردانہ تسلط کے معاشرے میں رائج ہیں۔ مصری، سمیری، یونانی، رومن، عبرانی، عیسائی، ہندوستانی، جاپانی اور چینی اساطیر کے مطالعے سے کئی معاشرتی حقائق کی وضاحت ہوتی ہے۔

عورت کے لیے اس کا حسن، ذہانت، ہنر مندی اور صلاحیتیں اسے صرف مصائب میں مبتلا کرتی رہیں۔ دیویوں کے پاس یہ ساری صلاحیتیں ان کے باہمی جھگڑوں اور مسابقت کا باعث بنتیں۔ عام عورت کو صرف ایک کنواری دوشیزہ ہونا چاہیے جس کے بدن کی دولت پر ایک مرد کا حق ہو اور وہ اس سے اپنے وارثین پیدا کرے۔

ان داستانوں میں عورت کا تصور اور اس کا مطالعہ ایک اہم ترین پہلو ہے۔ دیوتاؤں کا عورت سے سلوک، اس کی تخلیق کو ایک ثانوی مقام دینا اور اس کے

حسن کے باعث اس پر آفتوں کا نزول، اس کے بدن کے حصول کے بعد اس کو حاملہ رکھ کر دیوتاؤں کے وارثین پیدا کرنا، انھیں سزا کے طور پر مطعون کرنا، جانور بنانا اور دربدر کی ذلت ان کا نصیب بنانا تقریباً تمام اساطیر میں ملتا ہے۔

یورپی ادب کی تفہیم اور اس میں بنیادی انسانی حقوق یا حقوقِ نسواں کی ابتدا اور مقاصد کو سمجھنے کے لیے ان اساطیر میں مرکزی دیویوں اور دیوتائے اعظم کا قالب بدل بدل کر اپنی معشوقاؤں کے بدن کو اپنی بے کنار ہوس کا نشانہ بنانے کے قصائد سے آگہی ضروری ہے تاکہ اس پس منظر میں سماج میں عورت کے وجود اور اس کی اہمیت کے ارتقا کو سمجھا جا سکے۔

دیومالائی دنیا میں عورت کا تصور اور مقام دیوتا ہی طے کرتے تھے۔ صرف یونانی دیومالائی سلسلے کے اعلیٰ دیوتا زیوس کی داستانوں کا مطالعہ کیا جائے تو عورت کا وجود صرف جنسی تلذذ کی علامت ہے۔ اساطیر میں مرد کا عورت پر فریفتہ ہونا اس کی بربادی کا باعث بن سکتا ہے۔ اس کا شباب اور حسن و جمال اسے زمین جائیداد، ملک، گھوڑے اور اونٹ کی طرح ایک ملکیت بنا دیتا ہے جس کا حصول اور تصرف مرد کی انا کا مسئلہ بن جاتا ہے۔

ان دیومالائی کہانیوں میں جنسی زیادتیوں کا شکار ہونے والی عورتیں مسلسل اذیت اور غم کی علامت بن جاتی تھیں۔ دیوتا جن دیویوں یا انسانی دنیا کی عورتوں پر فریفتہ ہو جاتے ان کو جسمانی طور پر حاصل کرنے کے لیے ہر حربہ اختیار کرتے۔ وہ انھیں لالچ دے کر، انعامات کی بارش کر کے، سہولتیں چھین کر یا دھمکا کر ہوس پوری کرنے میں ناکام ہو جاتے تو آخری ہتھیار کے طور پر نئے قالب اختیار کر کے اپنی مذموم خواہشات پوری کرتے۔ ان کے لیے یہ بات کسی اہمیت کی حامل نہیں تھی کہ ان عورتوں کو بھی دیوتاؤں کی اس عارضی اور جبری قربت کی طلب تھی یا نہیں۔ زیوس کے مقابل رومن دیوتا جوپیٹر کے قصے بھی یہی رنگ لیے ہوئے ہیں۔

دیویاں اساطیر کی دنیا میں چارسو پھیلی ہیں۔ بالجبر مائیں بنا دی گئی دیویاں، ناپسندیدہ دیوتاؤں کی بیاہتا بیویاں، جو اپنے محبوب کے ساتھ بھی تعلقات

استوار کیے ہوئے ہیں، بھیس بدل کر رقیبوں کو مارتے دیوتا، سوتیلی اولادوں کو قتل کراتی دیویاں، الغرض دیومالائی دنیا ان قصائد سے بھری پڑی ہے جہاں عورت کو منفی روپ میں پیش کیا جاتا ہے اور جنگوں کا موجب قرار دیا جاتا ہے۔ آج صدہا صدیاں گزرنے کے باوجود عورت کی زندگی اور اسے بسر کرنے کے اصول اِنہی کہانیوں کے مطابق ہیں۔ اس کا حسن اور صلاحیتیں معاشرے میں برداشت ہونا، پتینا اور مردانہ تعصب اور انا کے حملوں اور تضحیک سے بچ کر زندگی بسر کرنا بھی ایک آزمائش سے کم نہیں۔"

میں نے بھی اس محترم ہستی کو نورڈک اساطیر کے ایک بڑے دیوتا کا نام دے کر خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ جناب لوکی صاحب، اس سے پیشتر کہ میں ان کی مساعیِ جمیلہ کے بارے میں کچھ کہوں، میری پہلی کتاب "زبانِ یارِ من دانش" سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

شرپسند دیوتا "لوکی" Hveðrungr Loke یا Loki, Loptr,

لوکی اساطیر کا ایک مرکزی لیکن عجیب و غریب کردار ہے۔ اس کی شخصیت کی طرح اس کے کام اور مقاصد بھی مختلف النوع ہیں۔ اس کی اگرچہ اوڈِن سے قریبی ناتے داری ہے، بعض روایات کے مطابق وہ دیوتا کا ماموں ہے۔ اِن ہی روایات کے مطابق اوڈِن نے لوکی کے ساتھ مفاہمت کرتے اور اس سے اپنا خونی اور نسبی تعلق قائم کرنے کے لیے اپنی کلائی سے خون نکال کر اس کی کلائی کے خون سے ملا دیا۔ اگرچہ سب دیوتا اس کا بہت لحاظ کرتے ہیں لیکن وہ جب کبھی موقع ملتا انھیں گزند پہنچانے سے باز نہ آتا۔ لوکی نام کا مطلب ہی دھوکہ باز ہے۔ لوکی قالب بدلنے کی طلسماتی طاقت رکھتا ہے اور خود کو کسی بھی قالب میں تحویل کر سکتا ہے۔ "لوکی" نورس اساطیر میں مکاری و عیاری اور دغابازی کا استعارہ ہے۔

دیوی "سِف" Sif

دیوی تھور دیوتا کی بیوی اور زرخیزی کی دیوی تھی۔ اس کے خوبصورت سنہرے بالوں کے بارے میں روایت ہے کہ جب وہ محوِ خواب تھی تو لوکی نے کاٹ لیے اور پھر اس پر بدچلنی اور بے وفائی کا الزام بھی لگایا۔ بعد میں

ماہرین نے اس کے سنہرے بالوں کو سنہری گندم کے خوشوں سے وابستہ کر دیا، کیونکہ وہ زرخیزی، ازدواجیات اور اولاد وغیرہ کی دیوی بھی ہے۔ دیوی کے سنہری بالوں کو شاعری میں بطورِ استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔

دیویوں کو ان کے حسن و جمال اور دیوتاؤں کی طرف سے عطا کردہ صلاحیتوں اور اہلیتو ں ہی کی حفاظت کرنی ہے چاہے نورڈک اساطیر یا سکینڈے نیویا کی دیومالائی کہانیوں میں تو دیوی فرایا پر باقاعدہ بدچلنی کے الزامات لگائے جاتے رہے اور وہ ان کی تردید کرتی رہتی۔ یہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ شیطانی خصلت کے مالک لوکی نے سوتے میں ایک دفعہ فرایا کے حسین بال کاٹ دیے گویا چٹیا کاٹنا صرف عصرِ حاضر ہی کا اذیت ناک اور رسوا کن شعار نہیں بلکہ اس کی ابتدا سماجیات کے ارتقاء سے پہلے کی ہے۔ عورت کو بدکردار ثابت کرکے دفاعی مورچے میں دھکیل دینے کے مردانہ ہتھکنڈوں کا مقصد ہی یہی تھا کہ عورت خود کو بے قصور ثابت کرنے کی مجنونانہ کوشش میں یا تو سمجھوتہ کرکے مرد کے عشرت کدے کی زینت بن جائے یا پھر معاشرتی رسوائی کا نشانہ بننے کے بعد پارسائی ثابت کرنے کے لیے آزمائشوں سے گزرے۔

الزام کو غلط ثابت کرنے کے جتن

قدیم یورپی معاشرے میں بھی عورت کو اپنی پاکدامنی ثابت کرنے کے لیے جان پر کھیل کر وہ تمام جتن کرنا پڑتے جو مشرقی معاشرے میں رائج ہیں۔ دیویوں کی دنیا سے شاہی محلات اور تاج و تخت تک ملکاؤں سے لے کر عام عورت تک تذلیل کا سہل ترین طریقہ اور مہلک ترین ہتھیار اس کی کردار کشی تھا۔ عورت کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے مختلف آزمائشوں سے گزرنا پڑتا۔ آگ پر چلنا، انگاروں پر چلنا، قدیم معاشروں اور مذاہب میں معجزے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ سپین اور جاپان میں بھی اس کے نشانات ملتے ہیں۔ نیوزی لینڈ، چین اور موریشس میں بھی اس کا رواج رہا۔

••

جون 2003ء

ایک عمر گزری، نہیں شاید کئی زمانے گزرے، دو جون کی صبح کے دھندلکے کے اپنے ساتھ ایک آتش، دھماکوں اور دھوئیں کی بدبو کا ایک طوفان لے کر آئے۔ ڈنمارک کی تاریخ کا ایک لرزہ خیز واقعہ جس نے ملک بھر کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کہانی کا کردار ایک ڈینش بیوی (شادی کاغذ پر درج نہیں تھی۔ جوڑا پندرہ برسوں سے ساتھ تھا۔ اردو قارئین کی سہولت کے لیے بیوی کا لفظ استعمال کیا ہے۔) کو نیا ہمسفر ملنے پر پہلے دوست نے اپنے چار بچوں کے ساتھ خودکشی کر لی۔ اس نے نہ صرف اپنے مکان کو دھماکے سے اڑا دیا بلکہ اطراف کے مکانات بھی رہائش کے قابل نہیں رہے۔

یہ صبح میری زندگی کے ایک مکمل نئے دور کا آغاز تھی۔ سمجھوتوں کے درمیان ایک لگی بندھی زندگی جس میں کسی سوچ اور فکر کی چنگاری تک کو بھی سلگنے کی اجازت نہیں تھی، بالکل ایسی ہی زندگی جو کروڑوں عورتیں گزارتی ہیں اور مٹی کی ڈھیری ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان شعلوں کی آغوش سے ایک اور عورت نے جنم لیا، جس نے نہ صرف اپنے نوعمر بچوں کا ہاتھ تھام کر انھیں خطرے سے نکالا بلکہ خود پر اوڑھی سمجھوتے کی بارودی چادر بھی اٹھا کر انہی شعلوں میں ڈال دی۔ کربناک چیخوں، وحشت ناک شعلوں اور بے کنار اشکوں سے گزر کر میں نے وہ نظم کہی جسے لوگ اچانک کہیں سے نمودار ہونے والی عورت کی شاعری کہتے ہیں۔

''میری بیٹی اکثر مجھ کو قفنس کہتی ہے''

2005ء میں ڈنمارک کے اردو حلقے میں ایک شاعرہ، مصنفہ اور ٹی وی اینکر کا ظہور ہوا۔ یہی اس جنگ کا نقطۂ آغاز ہے جس نے لوکی جیسے رذیل انسان کو ایک عورت کے خلاف محاذ آرا ہونے پر مجبور کیے رکھا۔

یہ وار کبھی وہ چھپ کر عقب سے کرتا، کبھی بے حمیت انداز میں لبِ سڑک کھڑے لوگوں کو روک کر بتاتا، کبھی براہِ راست مجھے فون کر کے دھمکی دیتا کہ ''اگر میرے الفاظ چرائے تو عدالت میں گھسیٹوں گا۔''

پھر اس نے دیکھا کہ یہ عورت تو کسی بات کا جواب ہی نہیں دیتی، بین الاقوامی مشاعروں اور کانفرنس میں مدعو کیے جانے لگی ہے اور عالمی سطح کے علمی ادبی حلقے کے لوگ ڈنمارک آنے لگے ہیں۔ یہاں سے اس کی باطنی خباثت نے ایک پرانا صدیوں پرانا بھیس بدلا۔ وہی پہلا اور عمومی الزام جو کسی بھی عورت کو اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہونے دیتا۔ اسے بلندی سے منہ کے بل گراتا ہے۔ وہ

ہائی دیتی ہے، قسمیں کھاتی ہے، اگنی پاتھ پر چلتی ہے، ثبوت کے طور پر بی بی کی صحنک کو ہاتھ لگاتی ہے، ہونٹوں کو تیزاب کی طرح کاٹ دینے والا کتھا کھا کر دکھاتی ہے، اور جب کچھ بھی کام نہ آئے تو وہ زمین پر پڑی دریدہ چادر کو اٹھا کر اپنے سینے، سر اور چہرے پر ڈال لیتی ہے۔ لرزتی، کانپتی، چھپتی، لڑکھڑاتی، گمنامی کی دلدل میں اتر جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کا دعویٰ کرنے والے خود کو ہیرو سمجھتے ہوئے معاشرے کے سامنے گردن اٹھا کر چلتے ہیں۔

لیکن شعلوں کے راکھ کر دینے والے الاؤ کی آغوش سے اپنے فیصلوں کے کاغذ اپنے ہاتھ سے لکھتی جو عورت نمودار ہوئی ہے وہ جانتی ہے کہ اس کے لیے کسی صحیفے میں شہادت نہیں اترے گی، اس کے لیے کوئی محمد بن قاسم گھوڑے نہیں دوڑائے گا، اور حقیقت تو یہ ہے کہ اسے حباب نما ان سہاروں کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ جس باپ کی بیٹی ہے اس نے ہوش سنبھالتے ہی اس کا ہاتھ اپنے مبارک ہاتھ سے تھام کر نور بھری روشنائی سے لکھنا سکھایا تھا۔ ہاں، لہو میں دوڑتا تحمل آمیز انکسار اسے لب کشائی کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

یاد رہے کہ یہ تحریر کسی دوست یا دوست نما دشمن کے لیے نہیں، یہ جوابی جنگ ایسے غلیظ الباطن مردوں کے خلاف ہے جو ہاتھ میں قلم تھامتی عورت کو الزامات اور تہمتوں کی اندھیری گپھا سے ڈراتے ہیں۔ اس سے کنارہ کشی کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور معاشرتی وسماجی بارودی سرنگوں سے خائف کرتے ہیں۔ اسے دیباچے لکھنے یا کتابیں چھاپنے کے پھندوں میں الجھاتے ہیں۔ لیکن اگر صدف مرزا کے ہاتھ میں عصا نہ ہوتا تو وہ لہراتے جھومتے پھنکارتے سانپوں سے بھرے میدان میں نہ اترتی۔

جب میں نے ''زبانِ یارِ من دانش'' پر کام شروع کیا تو یہاں کے نام نہاد مترجم، ادیب، شاعر اور نجانے کیا کیا القاب کے سابقے لاحقے اپنے نام کے ساتھ لگائے ایک صاحب نے فون کر کے دھمکانے کی کوشش کی...

''آپ ڈینش ادب پر لکھ کر تو دکھائیں۔ آپ کی عمر سے زیادہ میرا تجربہ ہے۔ ان ادبی شخصیات کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب آپ پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔ میں آپ کے تمام تراجم پر نظر رکھوں گا۔ اگر میرا کوئی لفظ استعمال کیا تو عدالت میں گھسیٹوں گا۔''

میں حیران ہو کر فون کے ریسیور کو دیکھتی رہی۔ پھر مجھے حیرت کے ساتھ ہنسی آ گئی۔ اب مجھ سے پہلے پیدا ہونے میں آپ کا کیا کمال اور مجھ سے پہلے ڈینش ادب پر لکھنے سے کیا وہ آپ کی جاگیر ہو گیا۔ میں نے جب ابا جی کو بتایا تو وہ بہت محظوظ ہوئے۔ کہنے لگے،

''چلیے، مبارک ہو۔ آپ آج سے مشتعل کرنے والی دھمکی بن گئیں۔ جانِ پدر، وتعزمن تشاء وتذل من تشاء۔ ایسی ذہنی کثافت کا جواب مزید اور مسلسل تعمیری کام سے دینا ہوتا ہے۔ مزید محنت اور مزید زینے طے کرنے کا عزم ہونا چاہیے۔ یہ ابتدا ہے۔ ایسے لوگ آپ کو جابجا ملیں گے۔ جہالت اور حسد کی تاریک گپھا سے گزرتے ہوئے علم کا عصا لے کر بے دھڑک گزر جانا۔''

ابا جی کے جانے کے بعد وقت نے ثابت کیا کہ ایسے متعفن اذہان تو راستے کے ہر موڑ پر تھے، اور جن میں کوئی صنفی امتیاز بھی نہیں تھا!!

مشاعرے پڑھنے کے بجائے لڑنے کی دلدادہ خواتین، صدارتیں مانگتی، شہرتوں کی بھیک کے لیے ادبی راستوں پر کھڑی اعلیٰ و ارفع ہستیاں۔ میں نے ابا جی کی بات کو مشعلِ راہ بنایا، ''مشاعروں کی تعداد، تالیوں کی گونج، کتابوں کی گنتی اور ایوارڈز کا بوجھ اس بات کا فیصلہ نہیں کرتا کہ کون کتنا بڑا شاعر ہے۔ زندہ رکھنے کے لیے ایک شعر بھی کافی ہوتا ہے۔'' میں نے مشاعرے کی بیساکھی تھامنے سے انکار کر دیا اور حصولِ علم کی جد و جہد میں شامل رہی۔

پھر اس نام نہاد مصنف اور مترجم جن کو خود کو دانشور کہلانے کا بے انتہا شوق ہے، کی تمام تر صلاحیتیں ان چند عورتوں کی کردار کشی کی مہم میں صرف ہوگئیں۔ اس کارِ خیر میں ان کی اہلیہ بھی شانہ بشانہ ہمراہ تھیں۔ بلکہ وہ ان کو ترکش میں سے تیر اٹھا اٹھا کر ایسی عورتوں پر چلانے کو دیتیں جو ان کے شوہرِ نامدار کے فرمان کے مطابق بھٹکی ہوئی ہیں یا کسی بھی لحاظ سے اس میدان میں کام کرتی ہیں جو خلیفۃ الارض کی جاگیر ہے۔

کبھی مجھ سے کہیں سامنا ہوجاتا تو میں حیران ہوکر ان کی بے رونق اور ویران شکل دیکھتی۔ خود بے اولاد تھیں شاید اسی لیے دل کے کونے کھردرے رہے اور ان میں وہ نرمی نہیں آئی جو اذیت کی آگ سے گزرنے کے بعد سونے کو نرم کر دیتی ہے۔

ڈنمارک جیسے ملک میں رہ کر انھوں نے اپنے شوہرِ نامدار کے ساتھ مل کر جہاں تک ممکن ہوا کردار کشی کی مہم جاری رکھی۔ عورتوں کی یہ سیاست بازی اور منفی ذہنیت مردوں کی ریشہ دوانی سے ہزار ہا گنا زیادہ تباہ کن ہے۔

ڈنمارک میں ایک ادبی شخصیت اپنی اہلیہ اور بیٹے کے ساتھ تشریف لائی۔ ٹی وی لنک نے ان کی میزبانی کی۔ وہ لوکی اور ان کی بیگم سے بھی ملے۔ واپس جا کر ان کی بیگم نے مجھے فیسبک پر انفرینڈ کر دیا۔ پھر سینہ بہ سینہ چلتی روایات سے علم ہوا کہ مسز لوکی نے ان کی اہلیہ کو بتایا کہ اس

خاتون سے خود بھی بچ کر رہیں اور اپنے شوہر کو بھی سمجھا دیں کہ انھیں کسی پروگرام میں نہ بلائیں۔ ان کو آتا جاتا خاک نہیں، بس بدکرداری کی وجہ سے مشہور ہیں۔

مقامِ حیرت یہ ہے کہ جب ہم نے یہاں پہلی اردو کانفرنس کرائی تو لوکی صاحب کو ان کی اہلیہ سمیت مدعو کیا گیا تھا۔ ٹی وی لنک کے ریکارڈ میں اس کی ویڈیو موجود ہے۔ میں نے خود فون کر کے ان کو یاددہانی کرائی کہ اس بین الاقوامی پروگرام میں سب مقامی شعرا کو شامل کیا جارہا ہے۔ اس کے بعد کے متعدد پروگراموں میں ان کو نہ صرف دعوت دی گئی بلکہ جب مستنصر حسین تارڑ صاحب تشریف لائے تو بھی جنابِ لوکی کو مدعو کیا گیا اور ان کی خواہش پر ان کو مضمون پڑھنے کا خصوصی موقع دیا گیا۔ ان کی داخلی خلش محض اس بات کی ہی تھی کہ ان کے ہوتے ہوئے ایک معمولی عورت بین الاقوامی مہمانوں کی پذیرائی کرے، سٹیج سنبھالے، ریڈیو پروگرام پیش کرے، ٹی وی انٹرویو اور اخبار کے کالم لکھے۔ مجھے ان کے غیظ وغضب کی تمام وجوہات معلوم ہوگئیں اور یہ احساس بھی کہ شاید وہ اس ناگہانی افتاد کی طرح نازل ہونے والی عورت سے ناراض ہونے کے تمام حقوق رکھتے تھے لیکن اس یک طرفہ ناراضگی کو لاوے کی طرح بکھرنے پر قابو پالیتے۔ آخر محترم اقبال اختر بھی تو یہاں برسہا برس سے ادبی محافل برپا کرتے رہے اور اعلیٰ پائے کے شاعر بھی ہیں۔ جہاں بہت سے شعرا مشتعل ہوئے وہیں انھوں نے میرے شعری مجموعے پر دلپذیر مضمون لکھ کر مجھے ڈنمارک کے ادبی منظرنامے میں خوش آمدید کہا۔

میں ابتدا میں ہمیشہ لوکی صاحب کو احترام سے سلام میں پہل کرتی۔ جب کبھی ان کا فون آتا، اسی ادب سے ان کی بات سنی جاتی۔ 2009ء میں واشنگٹن مشاعرے کی سن گن لوکی تک پہنچی۔ چونکہ یہ عالمی مشاعرہ ایک تاریخی موقع تھا جس میں امجد اسلام امجد، انور مسعود، جاوید اختر، شبانہ اعظمی اور سلیم کوثر موجود تھے۔ مجھے اعزاز حاصل ہوا کہ میں واحد شاعرہ تھی جس نے نہ صرف اس مشاعرے میں شرکت کی بلکہ اگلے روز محترم اشفاق حسین کی دعوت پر کنیڈا مشاعرے میں بھی یورپ کی نمائندگی کی۔

••

ایک دن میرے ڈینش موبائل پر امریکہ کے وقت کے مطابق علی الصبح ایک فون آیا۔ ایریا کوڈ ڈنمارک کا تھا۔ میں نے اٹھایا۔ دوسری طرف سے لوکی کی انتہائی چاپلوسانہ آواز ابھری، ''ایک محترمہ ڈنمارک میں آئی ہیں، ہم ان کے لیے نشست کا اہتمام کر رہے ہیں، آپ کو مدعو کرنا تھا۔'' اگرچہ میں ان کی بات سے پہلے ہی اندازہ لگا چکی تھی کہ یہ ضرور کوئی شرانگیز حرکت ہے کیونکہ وہ

خود تو اس قابل تھے ہی نہیں کہ کسی کے لیے بھی نشست کا اہتمام کر سکیں، دوسروں کے کندھے پر بندوق رکھ کر ہی گولی چلانے کے عادی ہیں، لیکن میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں ضرور حاضر ہوتی اگر ڈنمارک میں ہوتی۔ واپسی پر علم ہوا کہ میرا خیال درست تھا۔ لوکی نے فون پر صرف یہ تصدیق کی تھی کہ میں ڈنمارک میں موجود نہیں ہوں۔ اگلے دن پروفیسر نے ڈینش سوشل اتھارٹیز کو تحریری شکایت بھیجی کہ مجھ سے جواب دِہی کی جائے کہ میں ملک سے غیر قانونی طور پر باہر کیوں رہتی ہوں۔

شر پسند لوکی دشمنی میں اندھا ہو کر اور انسان دشمن پروفیسر وینڈ یگو ام الخبائث کے نشے میں دھت ہو کر بھول گئے تھے کہ قوانین کا علم ہونا بے حد ضروری ہے۔

قانونی طور پر میں چھ مہینے تک ملک سے باہر رہ سکتی ہوں، پروجیکٹ پر کام کر کے جب بھی اضافی آمدن حاصل کرنا چاہوں کر سکتی ہوں۔ میں ڈنمارک کی معروف رائٹرز تنظیم کی پہلی پاکستانی مصنفہ اور شاعرہ کی رکنیت حاصل کر چکی ہوں۔ مجھے اس تنظیم کا خصوصی رکنیت کا کارڈ دیا جا چکا ہے جس کے تحت میں بہت سے عجائب گھروں اور علمی و ادبی محافل میں داخلہ فیس کے بغیر جا سکتی ہوں۔ کمپیوٹر میں میرے نام کی رجسٹریشن نمبر کے ڈالتے ہی میری بنیادی معلومات میں لفظ ''آتھر'' لکھا جاتا ہے۔ وہ جتنے خطوط لکھیں گے وہ ڈینش نظام میں میرے حق میں جائیں گے۔ جس دن میری ڈینش زبان میں کتاب شائع ہوگی یہ سب ثبوت اس کتاب کو مستند کریں گے۔ یہ کتاب تو مجھے ہر حال میں لکھنا ہے۔ جب بھی زندگی نے اتنی فرصت دی، ڈینش زبان میں لکھنا ہے تاکہ تاریخ صرف شکاری ہی مارے ہوئے شیر کے سینے پر پاؤں رکھ کر تحریر نہ کرے بلکہ اس کے پنجوں کو توڑ کر بچنے والا شیر بھی اس کی کھال پر پیر رکھ کر بتا سکے کہ وقت بدل چکا ہے۔

دراصل لوکی یہاں پر چوک گئے۔ عام طور پر خواتین ایسی دوغلی شخصیت کے فریب میں آ کر یا تو منافقت بھری چاپلوسی اور منافقت کے جھانسے میں الجھ جاتی ہیں یا پھر ان کی الزام تراشی سے خوفزدہ ہو کر خاندان کی عزت بچانے کے لیے بخوشی پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔ اس عورت کو ایسا کوئی خوف دامن گیر نہیں تھا۔ جونہی وہ کوئی نئی چال چلتے، میرے اندر سر نہوڑائے بیٹھی چھوٹی لڑکی جست لگا کر پنجوں کے بل کھڑی ہو جاتی۔ میں نے ان کی تصویر لگا کر فیسبک پر پوسٹ لگا دی:

جناب لوکی صاحب، آپ کے دس سالہ التفات کے جواب میں...

ہماری اگلی ملاقات اس میدانِ جنگ میں ہوگی جس کی بساط آپ گزشتہ دس برس میں بچھاتے

رہے ہیں۔ آپ کی بہتان طرازی نے بتا دیا تھا کہ آپ کیا ہیں۔ آپ کو اب علم ہوگا کہ میں کون ہوں۔

میں اپنے کہے اور لکھے، ایک ایک لفظ کی امین ہوں۔ آپ کی طرح منحرف نہیں ہوں گی۔ ابتدا آپ نے کی تھی، انتہا ہماری ہوگی۔ ڈنمارک کی تاریخ میں ایک اضافہ ہوگا۔ ڈینش دیسی عورت کو استحصال کی چکی میں پستا آٹا سمجھتے ہیں۔ معلومات میں اضافے کا وقت ہے کہ عورت چکی کا پاٹ بھی ہوسکتی ہے جو سب پیس دینے پر قادر ہوتا ہے۔

ایک باب آپ نے لکھا، ایک انجام میں تحریر کروں گی۔

سیکڑوں لوگوں نے اس پر تبصرے کیے۔ پھر بہت لوگوں نے کہا کہ پوسٹ ہٹا دیجیے، آپ کا مقصد تو پورا ہو چکا۔ لیکن میں نے اسے صرف اپنی ذات تک محدود کر دیا۔ اس عبرت کے نشانے کو اس لیے نہیں ہٹانا چاہتی کہ ابھی اس کہانی کو ڈینش زبان میں کتابی صورت میں آنا ہے۔ میں نے وہ تمام تہمتیں جو ایک پتھر کی صورت ماری گئی تھیں، ایک پھول کی طرح سنبھال کر رکھی ہیں۔ اعمال تو انسان کا تعاقب کرتے ہیں خواہ وہ زمین کے اندر پناہ لے، سانسوں کا گھٹتا بڑھتا دھاگہ ٹوٹ بھی جائے تو یہ داستان زندہ رہنی چاہیے تا کہ ان تمام عورتوں کے اندر سے خوف کا بچھو ایک ہی دفعہ مار دیا جائے جن کو ہر روز اس کا ڈنک سہہ کر مرنا اور جینا ہوتا ہے۔

ایک کامیابی یہ ہوئی کہ ایک پاکستانی شادی شدہ صاحب ملازمت کی جگہ پر ایک نوجوان خاتون کو ہراساں کرتے تھے۔ کبھی اسے چپکے سے نکاح کرنے کی پیشکش کرتے، کبھی اسے کہیں دوسرے ملک میں ویک اینڈ گزارنے کی دعوت دیتے۔ وہ گھر والوں سے ڈرتی تھیں کہ شکایت کی تو ملازمت پر پابندی لگ جائے گی۔ والدین گھر بٹھا لیں گے، پھر نئی ملازمت کیسے ملے گی۔ اس کے والد نے اسے بچپن میں پاکستان بھیج دیا تھا تا کہ والدین یہاں ملازمت کریں اور وہ اپنے چچا کے گھر مذہبی تعلیم و تربیت حاصل کرے۔ اس نے فیسبک پر یہ تصاویر دیکھیں، پوسٹ پڑھی اور تبصرے دیکھے تو مجھ سے رابطہ کیا۔ میں نے اس کے حالات کے مطابق اسے جوابی کارروائی کرنے کو کہا۔ اگر احترام سے مہذب انکار کو اور ''میری جان چھوڑ دیجیے'' کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا تو سائیلنسر لگا فائر کیجیے۔ ان صاحب کی بیگم بھی فیسبک پر موجود تھیں۔ صاحب جی کی تمام محبت بھری، شوقِ وصل سے رال ٹپکاتی دعوتیں سکرین شاٹ بنا کر پیش کر دیں۔ ان کو اپنے حالات بتا کر درخواست کریں کہ اپنے مجازی خدا کی رسی کھینچ لیں۔ ڈینش باس کو اعتماد میں لے کر ساری کہانی سنا دیں۔ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہر بات کی شکایت ابا کو نہیں لگائی جاسکتی لیکن دامن تک آگ پہنچانے والے کے

ہاتھ ضرور جلا دیے جائیں۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ مسئلہ بے حد خاموشی سے حل ہوگیا اور وہ صاحب ملازمت سے نکال دیے گئے۔ بیگم نے بھی جواب طلبی کر لی، تین بچوں کے ساتھ گھر چھوڑ دینے کی دھمکی دی۔ ہیرو صاحب تائب ہو گئے۔ بچیوں کو اپنی آبرو، اپنے مستقبل، اپنی زندگی کی حفاظت ہر ممکن طریقے سے کرنی چاہیے۔

ایک بے حد محترم ہستی نے لوکی صاحب کی وکالت کرتے ہوئے فرمایا کہ اب تو وہ خاموش ہو گئے، آپ بھی جانے دیجیے۔ میں نے فیسبک پر ہی جواب لگا دیا،

''آپ نے بالکل بجا کہا۔ مرد کے پاس ہتھیار بے شمار ہیں لیکن آخری ہتھیار وہی ہے جسے استعمال کرنے کے بعد وہ فریقِ مخالف کو اس زعم میں گھٹنوں کے بل گراتا ہے، کہ اب باقی عمر وہ انکار کی قیمت ادا کرے گی یا اگنی پاتھ پر چل کر دکھائے گی، بی بی کی صحنک کو ہاتھ لگائے گی، گوشہ نشیں ہو جائے گی، زبان پر چپ کے قفل ڈال کے چابی بزدلی کے بحرِ ظلمات میں ڈال دے گی... اس کے قدموں میں آ گرے گی، یا زہر پی لے گی... لیکن ان پر پیچ گلیوں سے گزرتا ایک راستہ اسی طاقت سے جوابی تھپڑ مارنے کا ہے، ایسا طمانچہ جس کی گونج اس مرد کی نسلوں میں سنائی دیتی رہے اور عبرت کا سامان ہو۔ ان بے بس عورتوں کے لیے زبان ہو جو رسوائی کے ڈر سے چپکے چپکے عالم پناہ کی جبری، ناجائز اور بے راہرو خواہش کی غلامی کیے جاتی ہیں، مرد کو فرعون بنائے دیتی ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ پلٹ کر یہ جوابی حملہ کرنے کا حکم کسی اور کا نہیں میرے والد کا تھا۔ ''لکھو، جانِ پدر اٹھاؤ قلم اور واپس تب رکھنا جب آخری سانس ٹوٹے۔''

ڈنمارک کی کمیونٹی چونکہ ایک چھوٹی بستی کی طرح ہے اس لیے شر پسند لوکی کا پھیلایا ہوا متعفن اور مسموم دھواں گھر گھر تک پہنچا۔ اردو سائٹ پر ڈالا گیا، نوجوان نسل تک ای میلز وغیرہ کے ذریعے پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر ساجدہ کے بچوں تک انگریزی میں لکھے گئے خطوط بھیجے گئے۔ اگر مجھے علمی اور ادبی حلقوں میں کامیابی ملی تو اس کے پسِ پردہ میرے پورے خاندان کا تحفظ، ان کا اعتماد اور ان کا یقین میرے ساتھ تھا۔ قتل ہونے سے ڈرنے والی عورتیں اور سماجی رسوائی کے گڑھے میں گرنے سے لرزاں عورتیں اپنی ڈگریاں اور اپنی کتابوں کا طومار اندھی الماریوں میں رکھ کر انھیں بھول جاتی ہیں۔

دراصل سماج میں شرمناک صنفی امتیاز اور عورت کا استحصال اس لیے بھی خاموشی سے ہوتا رہتا ہے کہ دنیا اسے ہونٹوں پہ انگلی رکھے خاموش رہنے کی تلقین کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہونے والی

زیادتی کا ازالہ کرنے کے بجائے اور آنے والی نسل کو اس سے محفوظ رکھنے کے بجائے اسے ایسی کہانیوں کو دبا دینے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ اپنے خاندان کو اپنے معاملات سے آگاہ کرتے ہوئے ڈرتی ہے۔ داخلی گھٹن اس کی تخلیقی قوتوں کو زنگ آلود بلکہ کھونڈا کر دیتی ہے۔ ایسی خواتین باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے اپنے بچوں کو اعتماد اور مضبوطی دینے سے قاصر رہ جاتی ہیں جس کی وجہ سے مغربی معاشروں میں رہنے والے بچے ایک دوہری زندگی کا اور ایک بے یقینی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ بچے معاشرے میں لو کی صفت لوگوں کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، جو گھر سے باہر دنیا کے ترقی یافتہ ترین معاشرے کے شہری ہوتے ہیں جہاں انھیں ایک ایسا چہرہ اپنے چہرے پر پہن کر کردار ادا کرنا ہوتا ہے جس میں وہ صنفی مساوات کے قائل ہوتے ہیں، اور واپس گھر کی دہلیز عبور کرتے ہی وہ نقاب اتارنا کرنا قابلِ حصول تعلیم یافتہ، خود آگاہ عورت کو بدچلن ثابت کر کے اسے مذہب اور معاشرے کی دودھاری چھری سے اقساط میں قتل کرنے کی مہم میں شریک بھی تو ہونا ہوتا ہے۔

ایک خاتون نے جو بظاہر سماجی طور پر فعال ہیں، مجھے فون کیا تو کہنے لگیں کہ آفرین ہے آپ کے خاندان کی سپورٹ پر، اگر میرے ساتھ اس طرح کے خطوط کا یا ایسے فحش مضامین لکھنے کا معمولی سا سلسلہ بھی ہوتا تو سب سے پہلے تو میرا اپنا خاندان ہی مجھے زندہ گاڑ دیتا۔ کتاب لکھنے کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ مغربی دنیا میں رہنے والے لوگ کم از کم اپنی بچیوں کو اتنی پختگی اور اتنا اعتماد عطا کریں کہ وہ گھر سے باہر نکل کر مغربی معاشرے میں ایک دوغلی زندگی گزارنے کے بجائے ایک خود مختار اور ایک مکمل یقین کے ساتھ زندگی گزار سکیں اور خود اپنی نظر میں سرخرو ہوں۔

••

372ابا جی سماجی طور پر بنی ناروا اقدار کے خلاف تھے۔ مبینہ طور پر روایات شکن تھے اور مخالفت کے باوجود مجھے مشاعروں، مباحثوں اور علمی و ادبی پروگراموں میں شرکت کی مکمل اجازت تھی جسے بہت سی ہم جماعت رشک اور حیرت سے دیکھا کرتی تھیں۔ میں نے بھی دورانِ تعلیم نصابی وغیر نصابی میدان میں کبھی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا اور ہمیشہ اچھے تعلیمی نتائج دیے۔

لیکن جب میں نے کوپن ہیگن میں ٹی وی لنک کے ادبی شعبے کے پروگرام کا آغاز کیا تو کسی مقامی حاسد نے میرے پروگرام کی ویڈیو بنا کر ابا جی کو کسی طریقے سے بھیجی اور ساتھ ہی ایک ''محبت نامہ'' کہ آپ کے گھر کی بیٹی ہے، مردوں کے انٹرویوز کرتی پھرتی ہے اور سر پر دوپٹہ بھی نہیں لیا۔ ابا جی نے اوپر چھت پر رکھے ٹی وی پر پروگرام دیکھا۔ پھر کہا، ''مردوں کے ساتھ تو اس کے

مباحثے کوئی نئی بات نہیں، ہاں رہی بات دوسرے اعتراض کی تو جب وہ میری چھت کے نیچے تھی تو پردہ کرتی تھی۔ آج بھی ہمارے سامنے کرتی ہے لیکن،'' ابا جی نے فکر آمیز انداز میں ڈاڑھی میں انگلیوں سے خلال کیا۔۔۔''ہاں، اس نالائق کا تلفظ خراب ہوگیا ہے۔ اس پر محنت کرنا ہوگی اسے۔ میڈیا میں آنے کے لیے مسلسل محنت اور مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔''

مجھے بھائی نے مسالے لگا کر یہ چٹ پٹی داستان کوپن ہیگن آ کر سنائی۔ اس شہر کے حاسدین کی گھٹیا بہتان طرازی اور ''رقعہ بازی'' کی عادت کبھی نہیں گئی لیکن وہ غریب بلاوجہ خطوط بازی کی اتنی محنت کرتے رہے اور یہ نہیں جان پائے کہ مجھے صرف تلفظ درست کرنے اور مسلسل محنت کرنے کا حکم ہوا تھا۔ کسی جاہل کی بنامِ محبت جبری پیشکش کو قبول کرنے یا رد کرنے کا مکمل اختیار مجھے ہی دیا گیا تھا۔

2006ء میں مجھے امریکہ میں مشاعرہ پڑھنے کا موقع ملا۔ ابا جی کی شانے پر تھپکی اور حوصلہ افزائی ساتھ تھی۔ وہ بہت خوش دلی سے کہتے، ''اللہ نے آپ کو قلم تھامنے اور سیاحت کرنے کے تمام تر مواقع دیے ہیں۔ کفرانِ نعمت مت کرنا۔ کتاب اور قلم ہاتھ سے تب گرنا چاہیے جب سانسوں کے دھاگے سے آخری موتی بھی بندھ جائے۔''

ڈاکٹر عبداللہ جب بھی ابا جی کے بارے میں میری کوئی تحریر پڑھتے، ہمیشہ فون کر کے کہتے کاش میں ان سے مل سکتا اور ان کو بتاتا کہ آپ کی محنت وصول ہوگئی ہے۔

••

جیوے میری ماں کا جایا
لڑنا ہے ڈرنا نہیں
گر لڑتے لڑتے مر گئے
تو مر کے بھی مرنا نہیں

پاکستان سے ایک مہربان نے پیام بھیجا، ''صدف مرزا آپ پر ایک فلم بنائی گئی ہے۔''
''اچھا...آ آ آ'' میں نے ایک ہاتھ میں موبائل پکڑا اور دوسرے سے گھر کا دروازہ کھولا۔
''فلم کا نام ہے دنگل، ضرور دیکھیے گا۔''
''اچھا آ آ آ'' مجھے فلم اور ڈرامے وغیرہ دیکھنے کی عادت بھی نہیں اور وقت بھی کبھی نہیں ملا۔ فلم دیکھنے پر مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔

ہمارے گھر کے سامنے ایک معروف ہستی سیٹھ اے ڈی ادیب کی رہائش گاہ تھی۔ ان کے گھر میں ہر عمر کے بچے تھے۔ ادھر ہماری چھت پر ہم اپنے بھائیوں اور چچا زاد، تایا زاد بھائیوں کے ساتھ غلیل کے ماہر اور پتنگ بازی میں حسبِ استطاعت شجاعت کے جوہر دکھاتے تھے۔ سیٹھ صاحب کے ایک بیٹے نے ادھر سے جھگڑے کا آغاز کیا۔ میں نے غلیل سے تاک کر پتھر مارا اور نتائج دیکھے بغیر بھاگ کر نیچے گئی اور چارپائی کے نیچے چھپ گئی۔ حسبِ توقع خالہ جان کرم بی بی بھوں بھوں روتے بچے کو ساتھ لیے، اس کی پیشانی کے گومڑ پر ہاتھ رکھے، بڑبڑاتی آ پہنچیں۔

''مرزا صاحب، حد ہوگئی۔ بچے کی آنکھ نکل جاتی تو کون ذمہ دار تھا؟ سر پھٹ جاتا؟''

ابا جی اپنے نرم لہجے میں بولے، ''بلاؤ نیچے ان الو کے پٹھوں کو، جمع ہو کر غنڈہ گردی کرتے ہیں، میں ابھی نمٹ لیتا ہوں۔''

امی جلدی سے شربت بنا لائیں۔ ''بیٹھیے بہن، پانی پییں۔ یہ سب لڑکے جمع ہوتے ہیں تو ہوش نہیں رہتا ان کو۔ آپ فکر مت کریں۔ ابھی ان کی شامت آتی ہے۔''

''لڑکوں نے نہیں، باجی نے غلیل سے مارا ہے۔'' بچے نے ایک ثانیے کے لیے رونا بند کر کے جواب دیا، پھر بھیں بھیں رونے لگا۔

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر ابا جی کی مدھم سی آواز آئی، ''کدھر گئی ہے یہ لڑکی؟'' میں نے چارپائی کے نیچے دم سادھ لیا۔

بعد کے معرکوں، جھگڑوں، مجادلوں میں بھائی کی آواز ساتھ دیتی، ''ڈرنا نہیں، لڑنا ہے۔'' میں تین مرتبہ ٹوٹے بازو کے ساتھ ہر وہ کام کرتی جو بھائی لوگ کرتے۔

پاکستان بھر کے ادبی دنگل، مشاعرے، مباحثے، پنجابی ٹاکرے، افسانے، مضامین کے مقابلے، میں شمولیت بھرپور ہوتی تھی۔ ہر جگہ مکمل تیاری کرا کے بھیجا جاتا۔

''مقابلے میں ہار سے مت ڈرنا'' ابا جی کہتے، ''اصل بات مقابلے میں شامل ہونا اور اپنی صلاحیتیں آزمانا ہے۔''

پھر بہت زمانے کے بعد، جب ڈنمارک کے نام نہاد دانش وروں نے ایک خاتون سمجھ کر زبانی اور تحریری دھمکیاں دینا شروع کیں تو میرے بچپن کی غلیل باہر نکلی اور بھائی جان کی بات ساتھ چلی، ''بچے، ڈرنا نہیں، لڑنا ہے۔ دیکھ لیں گے کون جی دار اٹھتا ہے دھاندلی کرنے کو۔''

جرمنی میں سیٹھ صاحب کے ایک بیٹے سے ملاقات ہوئی تو بولا، ''باجی، ہم تو آج بھی

آپ سے ڈرتے ہیں۔ اب تو آپ ادبی بم بھی پھینک سکتی ہیں۔''

تو صاحبو، ہر جرات مند آواز کے عقب میں شانہ تھپکتی ایک سرگوشی ضرور ہوتی ہے۔ ''ڈرنا نہیں، لڑنا ہے اور ہار کر نہیں آنا'' ایک شفیق باپ کا مضبوط ہاتھ سر پر، شانے تھپکتا بھائی، ابتدائی میدان سے زندگی سے نبرد آزما ہونے کے تمام آلاتِ حرب سے لیس کر کے میدان میں اتارتا ہے۔ بقول ابا جی کہ اگر میری بیٹی نے یورپ میں رہ کر شاعری اور ادب کے میدان میں قدم رکھا ہے تو اسے یہاں کے پاکستانی مردوں اور ان کی رفیقِ کار شاخت اور مشاعروں کی بیساکھیاں مانگتی عورتوں کی بنائی گئی ان گھپاؤں سے کوئی خوف نہیں، اس کے ہاتھ میں عصا ہے۔

••

لوکی صاحب نے جب مجھے کراچی کی آرٹس کونسل میں دیکھا تو حسد کی درانتی ہاتھ میں لے کر نکلے، بساط بچھائی، پرانے خطوط نکال کر انتظامیہ کو بھجوائے۔ یورپ کی چند شاعرات جن کا کام گھسی پٹی شاعری پڑھنا اور مرد شاعروں کو راکھی باندھنا ہے۔ ان کا مشغلہ تعلقاتِ عامہ کے زور پر ہر مشاعرے میں جا پہنچنا ہے، درپردہ ان کے ساتھ ہو گئیں۔

میں نے جب ڈینش شاعرات کی جدوجہد پر کتاب تحریر کی تو ایک اہم نکتہ یہ بھی سیکھا کہ جب تک اُردو شاعرات ادبی جوڑ توڑ چھوڑ کر اپنی تعلیمی اور ادبی نشوونما پر زور نہیں دیتیں تب تک سفر میں کاغذ کی کشتی ایک ہی مقام پر ڈولتی رہے گی۔ تعلیم اور مطالعہ بنیادی اینٹ ہے جس پر اعتماد کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اور اس کی چوٹی پر شعر و سخن کا علَم لہرایا جاتا ہے۔

2015ء ابتدا سے ہی میری زندگی کا خوبصورت ترین سال تھا۔ اس میں عالیہ نے اپنی تعلیم مکمل کی اور قدرت نے اسے ماں بننے کا مژدہ سنایا۔ لیکن یہ جاتے جاتے کا ناقابلِ تصور تماشہ دکھائے گا، یہ کبھی میں نے اپنے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ کراچی میں شاہ لطیف کانفرنس جاری تھی اور مجھے اس میں شمولیت کرنا تھی۔ نومبر کی آخری تاریخیں تھیں۔ ڈنمارک میں بلا کی سردی پڑ رہی تھی جب کہ ہم چند لوگ جو وزارتِ ثقافت و سیاحت کے مہمان تھے، ایک عشائیے پر مہران ہوٹل میں مدعو تھے۔ ڈنمارک سے عباس رضوی بھی کراچی ہی تھے اور عشائیے میں شامل تھے۔

''مرزا۔۔۔'' رضا علی عابدی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا، ''تمھارے شہر کے دشمنوں نے خطوط بازی شروع کر رکھی ہے۔ بہت دشمن بنا لیے تم نے۔''

''دشمن'' میں نے پوچھا۔ ''ارے میرے دشمن کہاں سے آئے۔ میں تو دوستوں کی طرح

دشمن بھی اعلیٰ پائے کے بنانے کی قائل ہوں اگر خود بناؤں تو۔ ہاں! ڈنمارک کے سگانِ کوئے لعنت بہت ہیں۔ یہاں کراچی تک پہنچے ہیں۔''

جواب میں وہ مسکرائے اور اپنا سکہ بند جواب دیا، ''اچھا''۔ ''لیکن ان لوگوں کو خطوط لکھنے کے لیے اتنا وقت کہاں سے مل جاتا ہے؟''

''دیکھیے جناب، اب ہم راستے کے ہر بھونکنے والی مخلوق پر پتھر پھینکنے لگے تو سارا دن پتھر ہی ڈھوتے رہیں گے اور گلیوں میں ٹیلے بن جائیں گے۔''

''آرٹس کونسل کی کانفرنس میں آؤ گی؟'' انھوں نے پوچھا۔

''پتہ نہیں، فی الحال تو بھٹ شاہ جانے کی تیاری کر رہی ہوں اور آج کل سندھی زبان وادب میری مہار تھامے ہوئے ہے، اور مجھے یہ کام بے حد دلچسپ اور صلاحیتوں کو آزمانے والا لگتا ہے۔''

''اچھا، لیکن اگر تم آیاؤ تو بہتر ہوگا'' انھوں نے اپنے دھیمے انداز میں کہا۔

رضا علی عابدی اپنی شیریں مزاجی، بذلہ سنجی، گفتگو میں اختصار بھری شائستگی کے ہمراہ مجھے اکثر اپنی پرانی سہیلی جیسے لگتے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ میں نے بے حد دلگیر ہو کر انھیں کسی صاحب کا دھمکی بھرا پیغام نقل کر کے بھیجا۔

''جوتی کی نوک پر رکھو'' جواب آیا اور میں کھلکھلا کر ہنس دی۔

پھر اچانک یوں ہوا کہ کانفرنس کی تاریخ آگے بڑھا دی گئی۔ احمد شاہ صاحب سے فون پر بات ہوئی تو انھوں نے کمال شفقت اور اصرار سے کہا کہ آپ ضرور شرکت کیجیے گا۔ اب ڈنمارک سے آئے محترم مندوب کی شرپسندی بڑھتی گئی۔

مجھے ابا جی کی بات یاد آگئی کہ سگانِ کوئے لعنت کے جواب میں سنگ زنی ضروری نہیں لیکن انھیں یاد ضرور دلانا چاہیے کہ وہ ہیں سگِ آوارہ اور یہ یاد دہانی صرف ان کا سامنا کرنے سے ہی ہوگی۔ انھیں جنگل کے بادشاہ اور تھڑوں پر بیٹھے، نالیوں میں رلتے، اور گلیوں میں چھچھیڑوں کی بو سونگھتے وجود کے فرق کا پتہ چلے۔

''ٹھیک ہے ابا جی'' میں نے حسبِ معمول خود کلامی کی۔ ''چلیے یہ معرکۂ خیر وشر بھی سہی۔ اچھا ہے دنیا بھر سے مندوبین جمع ہیں، ڈنمارک کی ادبی صورتِ حال کا بیان بھی ہو جائے۔ اب واقعی ایک ایسی ملاقات ضروری ہے جس سے اگلی ملاقات کا امکان معدوم ہو جائے۔ چلیے، کوپن ہیگن نہ سہی، جہاں چاپلوسوں کی محافل کے علاوہ انھیں کہیں ہلکی سی ''بخ'' کرنے کی جرات بھی نہیں ہوتی،

جہاں خود کو یورپین اور پروگریسو ظاہر کرنے کی کوشش میں وہ زیادہ تر تھڑے کے نیچے ہی پائے جاتے ہیں۔ چلیے کراچی کی آرٹس کونسل کے دربار کا سٹیج ہی سہی۔ سکینڈے نیویا کے مبصر، مترجم، صحافی، شاعر، مصنف، کیچڑ اچھالنے کے ماہر سے دو بدو ہوا ہی جائے۔''

''یاد رکھنا، عورت کے لیے بی بی فاطمہ اور بی بی زینب ایک بہترین نمونۂ حیات ہیں۔ بی بی زینب نے خواتین کو ہی نہیں، مصلحت اور مفاہمت کے خیموں میں چھپے مردوں کو بھی بولنا سکھایا اور یزید کے دربار کے مینارے ہلا دیے۔''

ابا جی کی آواز ہمیشہ میرے ساتھ تھی۔ کہاں بی بی زینب کہاں مجھ سی ناچیز ہستی، لیکن روشنی کی کرنیں تو وہاں سے مجھ تک آئی ہی ہیں سو میں نے ہامی بھر لی۔ اگرچہ میرا مقالہ بھی تیار نہیں تھا کیونکہ مجھے کانفرنس میں شمولیت کرنا ہی نہیں تھی۔ میں نے ڈینش ادب، آئس لینڈک ساگا اور عرب داستانوں کی مماثلت اور ماحول پر بات کی جو میری کتاب کا ایک باب بھی ہے۔ میرا موضوع تراجم کی اہمیت اور ضرورت بالخصوص اصل زبان سے براہِ راست تراجم کی منظم کوشش تھا۔ ان مقاصد کے لیے مصنف کا ذولسانی ہی نہیں ذوثقافتی ہونا بھی ضروری ہے۔

مجھ پر کئی تماش بین قسم کے لوگوں نے سوالات کیے،

''ارے صدف صاحبہ، وہ فلاں فلاں صاحب تو آج آئے ہی نہیں۔''

''کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ان فلاں فلاں صاحب سے براہِ راست استفسار کیا جائے؟'' میں نے بھی اسی انداز میں عرض کیا۔

''صدف صاحبہ! آپ کا نام تو بورڈ پر نہیں تھا؟ ایک نام نہاد بزرگی مائل صاحب بولے۔

''جی۔۔نہیں تھا'' میں نے تائید کی، ''اعتراض کیا ہے؟''

''جن کا نام تھا وہ تو آئے ہی نہیں۔'' چسکے لگانے کے خوگر مسلسل سوال کرتے رہے۔

''جی، مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے۔ آپ منتظمین سے رابطہ فرمائیے۔''

••

میرے ذہن کی شفاف سکرین پر دس دسمبر کی وہ روشن صبح ہمیشہ روشنی کا انعکاس کرتی رہے گی۔ صدارت رضا علی عابدی کر رہے تھے اور مہمانِ خصوصی افتخار عارف تھے، اور سکینڈے نیویا کی نمائندگی کرنے والی واحد ذات میں۔ میری حیرت، تجسس، جرات، حوصلہ اور فیصلہ سب بیکار گیا۔ سگانِ کوئے لعنت نے ہلکی سی بخ بھی نہ کی اور حسبِ روایت نجانے کہاں دبک گئے۔ اجلاس ختم ہوا۔

''بہت اچھا بولیں تم، کیا اعتماد ہے بھئی صدف۔ میں نے آپ کو پہلی دفعہ سٹیج پر ایسے بولتے دیکھا ہے۔'' لندن کی معروف شاعرہ اور افسانہ نگار آپا نجمہ عثمان نے کمال محبت سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ آپا نجمہ عثمان نہ صرف انتہائی تعلیم یافتہ ہیں بلکہ بہت اعلیٰ ظرفی سے حوصلہ افزائی کرنے پر بھی قادر ہیں۔ ورنہ اکثر خواتین کو نادیدہ حسد کا زہر پلا سانپ سونگھ جاتا ہے۔

''اچھی گفتگو کی آپ نے۔ آپ کی کتاب کہاں سے مل سکتی ہے؟'' آپا نے تجسّس سے پوچھا۔

مجھے ان رسمی جملوں اور باتوں کی گونج میں ابا جی کا فاتحانہ چہرہ دکھائی دیتا رہا۔ ان کی متبسم آنکھیں، مضبوط لہجہ اور شفقت کی خوشبو لٹاتا وجود دنیا کے ہر سٹیج پر میرے ہمراہ کھڑا رہتا ہے۔ میں سٹیج سے نیچے اتری۔ بلا مقابلہ منتخب ہونے میں کوئی غرور ہو نہ ہو، فتح کا لطف نہیں رہتا۔ اصل مزہ تو پلٹ کر جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا میں ہی ہے۔

وہ دم برسہا برس کی تپسیا کے بعد آیا تھا جب بغیر ایک لفظ کہے، بغیر اپنی ذہنی سطح سے نیچے اترے، میدانِ جنگ خالی ہو گیا تھا اور ڈنمارک کے بزعمِ خود کرتا دھرتا جن کی زندگی کا مقصد اچانک نمودار ہونے والی خاتون کی مخالفت تھی، گلیوں چوراہوں اور اپنی اپنی سائٹ پر ڈنمارک کی واحد نسائی آواز کے خلاف شور وغوغا کرتے رہے۔

مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ اس دن جناب انتظار حسین جیسی شخصیت نے میری گفتگو کو سراہا اور اس نکتے کی داد دی کہ ''عالمی دیہات میں تراجم اب صرف لغات کے علم سے نہیں بلکہ تہذیب وثقافت کو جاننے اور برتنے کی وجہ سے ہوں گے۔ بیرونِ ملک رہنے والے اردو زبان کے مصنفین کو تراجم کا بیڑہ اٹھانا چاہیے۔''

کانفرنس کے فوراً بعد جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو میں نے معروف جریدہ ''لوح'' کے لیے مضمون لکھا:

منتظر رہ گئے فسانے سب
اب سنا ہے کہانی کار گیا
رہ گئیں خالی آنکھ کی گلیاں
چھوڑ کر ان کو انتظار گیا

سنا ہے انتظار حسین چلے گئے۔ کہتے ہیں وہ ہم میں نہیں، سرخیاں شور مچاتی ہیں کہ

رخصت ہوا ایک عہد جو گزشتہ عہد کو جلو میں لیے تھا اور آئندہ کی خبر دیتا تھا۔ دوست پرسے دے رہے ہیں کہ کہانی گئی کہانی کار گیا، کردار رہ گئے.. کردار ساز گیا... لیکن مجھے وہ سارے دن یاد آرہے ہیں جب پاکستان کے مختلف شہروں میں ان سے ملاقاتیں رہیں۔ اور ابھی چند ہفتے پہلے کراچی میں آرٹس کونسل کی اردو کانفرنس میں وہ پیرانہ سالی کے باوجود شریک تھے۔ نقاہت ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ تھکن لہجے میں بول رہی تھی اور کہانیاں اوڑھے بدن نحیف و نزار تھا۔ لیکن ان کی کہانیوں کی متلاشی آنکھوں کو ایک عزم روشن کیے ہوئے تھا۔ مجھے ان سے پہلی ملاقات یاد آگئی۔

"بھئی سالہا سال یورپ میں رہ کر بھی تمھارا لب و لہجہ اچھا ہے۔ اچھا بولیں تم۔"

محترم انتظار حسین جیسی شخصیت کی زبان سے یہ چند الفاظ میرے لیے کافی تھے۔ میں تو جیسے ساتویں آسمان کی سیر پر تھی۔ مختصراً عرض کیا کہ "دیارِ غیر میں ہمارا معاش اردو سے وابستہ نہیں۔ یہ بقول شیکسپیئر محبت کی محنت ہے۔ کوشش کرتے ہیں اپنی زبان و ادب کے ساتھ جڑے رہیں۔"

ڈینش زبان و ادب کے بارے میں بات ہوئی۔ ان کا ذہن بہت متجسس تھا۔

"کمال ہے۔ ڈینش زبان بول لیتی ہو تم؟؟ ڈینش ناول افسانے ڈینش ہی میں پڑھے؟؟ بہت اچھا کیا کہ ڈینش ادب پر کام کیا۔"

یہ اسی کراچی کانفرنس کی داستان ہے جس کو لوکی صاحب ایک رقیب کو رسوا کرنے کے لیے استعمال کرنے کے جتن کر رہے تھے۔

یہ صرف صدف مرزا کی کامیابی نہیں تھی۔ یہ ہر اس عورت کے شانے پر ایک تھپکی تھی جس نے فرسودہ نظام کے خلاف اپنے قلم اور آواز سے جنگ لڑی ہو۔ صفِ اول میں رہنے کی ہمت کی ہو، سچ کہنے کی جسارت کی ہو اور سمجھوتہ نہ کرنے کی سزا کاٹی ہو۔ غلیظ زبانوں کے صنم خانے میں الزامات اور تہمتوں کے تمام بت الٹے منہ گر پڑے تھے۔ میرے ہاتھوں کا کنگن عصا ہو گیا۔

ڈینش ادب میں نسائی آوازوں پر دورِ ستم گزر چکا تھا جب مصنفات کنوارہ رہنے میں اپنی عافیت سمجھتیں، یا ازدواجی زندگی کے آتشیں دائرے سے باہر نکل آتیں یا پھر ذہنی عقوبت خانے کی قیدی ہو کر ذہنی امراض کے ہسپتال میں کسمپرسی کے عالم میں زندگی گزار کے اور ایک آخری احتجاج کے طور پر اپنی زندگی کا چراغ خود گل کر دیتیں۔ اردو ادب ابھی شاید کئی صدیاں پیچھے ہے۔ قلم تھامنے والی انگلیاں اگر نسائی ہوں تو ایک آسان ہدف ہیں لیکن یہ فیصلے کا دن تھا اور فتحِ مبین کا

بھی۔ اس لیے کہ اس دن ابا جی کی دی تربیت اور اعتماد میرے شانہ بشانہ تھا۔ اسی اعتماد کے سہارے میں نے دنیا کے بڑے سے بڑے سٹیج پر صرف وہ کہا جو زندگی نے سکھایا۔

''جانِ پدر! یہ سب تمھارے مفتوحہ علاقے ہیں'' ابا جی ہمیشہ کہتے۔ ''بس دوبارہ مطالعہ شروع کر دو۔''

اس رات۔۔۔ جب رات کے آخری پہر میں نے سونے کے لیے آنکھیں بند کیں تو ابا جی کو مخاطب کیا۔

''شکریہ ابا جی۔۔۔ میرے ہاتھوں میں میری تقدیر کا قلم دینے کے لیے۔
شکریہ ابا جی۔۔۔ مجھے بے باک فیصلوں کی جرات دینے کے لیے۔
شکریہ ابا جی۔۔ آج بھی میرے ہمراہ رہنے کے لیے۔
شکریہ ابا جی۔۔۔ مجھے ابھی تک دعاؤں کے حصار میں رکھنے کے لیے۔''

اس رات کی نیند کے سکون سے میری آنکھیں پہلی دفعہ آشنا ہوئی تھیں۔ جہاں خواب نہیں دیکھے جاتے، تعبیروں کے بلند زینے کا سفر کیا جاتا ہے۔

••

مجھے جب 2014ء میں انڈیا کانفرنس میں جانے کا موقع ملا تو لوکی صاحب کی مخاصمت مزید برہنہ انداز میں سامنے آئی۔ انھوں نے اپنے چند بھارتی دوستوں کو میرے بارے میں اہم معلومات دیں، ان کی سائٹ پر تحریریں لگائیں۔ اب معاملہ ٹی وی لنک کی ٹیم تک جا پہنچا۔ ساری ای میلز، خطوط اور ویب سائٹ کے مضامین پڑھنے کے بعد مینیجنگ ڈائریکٹر سرور چودھری نے سوشل میڈیا پر ایک تحریر لگائی

لوکی صاحب کو نوید ہو

''ڈنمارک کے ادبی حلقے میں محترمہ صدف مرزا کی آمد سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ پہلے سے جمے جمائے اور خود کو شاعر ادیب اور دانشور کہنے والے لوگوں کو سمجھ ہی نہیں آئی کہ یہ تبدیلی آ چکی ہے۔

ہاتھ میں قلم لے کر ایک خاتون کا آنا جو نہ صرف ان سے بہتر کہنے اور بولنے پر قادر ہے بلکہ جس کا خاندانی پس منظر ادبی دنیا کی بڑی شخصیات کو کھینچ کر ڈنمارک لاتا ہے۔ لوکی کو صدف مرزا نے جو ادبی شر پسندی کا نام دیا وہ تاحیات بلکہ مرنے کے بعد بھی ان کی صفت کو طور پر زندہ رہے گا۔

میں بحیثیت ڈنمارک ٹی وی ٹیم کے سربراہ اور نمائندے کی حیثیت میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ ڈنمارک میں ادبی دہشت گردی کے خاتمے کا وقت ہے۔ اب جو کوئی بدبودار بدشکل گلی کا کتا ہوگا اور سامنے آکر اپنے من گھڑنت، فحش افسانے بیان کرے گا اور جو بے غیرت اس کو چھاپے گا وہ اپنے نتائج خود بھگتے گا۔ شرپسند لوکی وہ شخص ہے جس نے اپنے کردار کی گندگی میں سفارتخانے کو بھی ملوث کیا۔ پہلی سفیر صاحبہ کو مشاورت اور گندی رپورٹیں دیتا رہا۔ نئے سفیر صاحب نے بھی فرما دیا کہ وہ لوکی سے ہی شہر کی رپورٹ لیتے ہیں۔ اس بیان کے ساتھ انھوں نے کمیونٹی میں اپنی ناپسندیدگی کی بنیاد رکھی۔ ٹی وی لنک ڈنمارک آنے والی ہر ادبی شخصیت کو خوش آمدید کہتا ہے اور ان کی میزبانی میں پیش پیش ہے۔ ہمیشہ کی طرح مائک اور سٹیج صدف مرزا ہی کی سلطنت ہے۔ جس کو اعتراض ہو وہ سامنے تشریف لے آئے۔''

ٹی وی لنک ہمیشہ میری شناخت رہا۔ اگرچہ میں نے ریڈیو، اخبارات اور رسائل کے ساتھ کام کیا لیکن ٹی وی لنک کا دفتر وہ آشیانہ ہے جہاں نہ صرف استراحت ملتی بلکہ آئندہ پرواز کا حوصلہ بھی ملتا۔ لوکی صاحب نے اپنے جیسے غلیظ اذہان کے لوگوں کو ساتھ ملا کر ٹی وی ٹیم کے بارے میں بھی بہت ہرزہ سرائی کی۔ لیکن رضا کاروں کا یہ گروہ آج بھی قائم ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے انٹرویو اور بعد ازاں اپنی کتاب ''ہیلو ہالینڈ'' میں اس کا تذکرہ کیا۔ بعد میں جو ادبی شخصیات آتی رہیں وہ ٹی وی ٹیم کی ادبی کاوشوں کو سراہتی رہیں۔

••

مغربی معاشرہ تو اپنے اساطیری اور دیومالائی تصورات سے آگے بڑھ چکا لیکن اس معاشرے میں باہر سے آکر بسنے والے اپنی تہذیب وتمدن اپنے ساتھ لے کر آئے۔ نظیر کے الفاظ میں، پتلون کے نیچے دھوتی ہے۔ گھر کے باہر مہذب پتلون پہن کر جانے والے ڈینش زبان بولنے والے اور ڈینش زبان کے ادب پر بقولِ خود عبور و دسترس رکھنے والے لوگ اپنا پس منظر اور ادبی تناظر ساتھ لے کر آئے۔ ان کا گھمنڈ ہے کہ یہاں پر صرف ان کے ہاتھ میں قلم معتبر ہوگا اور اگر کوئی عورت اس مقام پر کھڑی ہوگی تو اسے قیمت ادا کرنا ہوگی۔ یہی ایسے لوگوں کی فطرت ہے۔

بچپن میں جو عادت پڑتی ہے وہ دور بھلا کب ہوتی ہے
پاکٹ میں چنوٹی رکھی ہے پتلون کے نیچے دھوتی ہے

(اکبر الہ آبادی)

مجھے بخوبی علم تھا کہ مغربی دنیا میں ہمارے دانشور، بالخصوص ڈنمارک کے محدود علمی وادبی منظر نامے پر چھائی شخصیت بظاہر تو ڈنمارک جیسے ملک میں رہتی ہے، معاشرت اور ثقافت میں انضمام کی خاطر گوریوں سے شادیاں کرنا، مے نوشی کی بزم میں ساغر سے ساغر ٹکرانا ان کی مردانگی کی دلیل ہے لیکن اسی میدان میں کسی عورت کا قدم رکھنا اور اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنا ان کی برداشت سے باہر ہوگا۔ وہ خود عورتوں کے ساتھ کام کریں، بات چیت کریں، ان سے ادبی مراسلہ نگاری کریں تو سب جائز، لیکن جب کوئی خاتون اٹھ کر ان تمام اختیارات کا استعمال کرے تو اس کے لیے اردو زبان میں جتنی گالیاں ہوں وہ سب میزائل کی صورت میں اسے دے ماری جائیں۔

لوکی صاحب نے تو روزِ اول ہی سے خبثِ باطن اور ذہنی آلودگی کے زہر آلود تیر میری جانب پھینکنے کا آغاز کیا۔ ان کی اہلیہ بھی ان کے ساتھ شامل تھیں۔ پاکستانی سفارت خانے میں کمیونٹی کے سر پر ایک عذاب کی صورت میں ایک سفیر صاحبہ کو مسلط کیا گیا تھا جو محض اپنے دورانیے کو طویل کرنے، پاکستان کا سرمایہ لٹانے اور اپنے پالتو کتوں کی نگہداشت کے لیے اتنی بڑی عمارت میں بیٹھی تھیں۔ اگر مجھے یورپ میں پاکستان کی ہزیمت کا خیال نہ ہوتا تو میں ڈینش میں اس موضوع پر ضرور لکھتی۔ سفارت خانہ لوکی صاحب کی رپورٹوں، خطوط اور ریشہ دوانیوں کی اس جنگ میں شامل تھا۔

ڈاکٹر ساجدہ تک نے مجھے کہا کہ وہ پاکستان کے لیے جو بھی کریں گی، اس سفیرہ کی مدد کے بغیر کریں گی۔ انھوں نے مجھے بار بار منع کیا کہ ''ہمارے بچوں تک کو آپ کے خلاف ای میلز بھیجی جارہی ہیں۔ بچوں کی ددھیال تک غلیظ خطوط بھیجے جا رہے ہیں۔ آپ خاموش ہوجائیں۔ آپ ان لوگوں کی اصلیت نہیں جانتیں، میں عملی طور پر دیکھ چکی ہوں کہ یہ لوگ آپس میں متحد ہوکر آپ کو بدنام کر رہے ہیں۔ پاکستانی سفارت خانے کی محترمہ بھی اسی گروپ میں ہیں، لوکی سے رپورٹ لیتی ہیں، خدا کے واسطے لعنت بھیج دیں، بس چپ کر جائیے۔'' مجھے ان کی تشویش پر حیرت بھی ہوئی اور ہنسی بھی آئی، ''کیا کرلیں گے؟ ان کے خطوط کی وجہ سے ڈولی نہیں اٹھے گی میری؟ کیا کرلیں گی محترمہ سفیرِ پاکستان؟'' مجھے ڈینش میڈیا میں پاکستانی سفارت خانے کی توہین کا ڈر نہ ہوتا تو اسی دن جوابی طمانچہ لگا دیتی۔ پھر ایک دن آیا کہ پاکستانی کمیونٹی نے ان محترمہ سفیرہ صاحبہ کے خلاف سفارت خانے کے سامنے دھرنا دے دیا۔

ڈاکٹر ساجدہ اپنی جگہ پر درست تھیں کہ سگانِ آوارہ کے ٹولے کے سامنے ڈٹ جانے کی ضرورت نہیں، راستہ بدل لینے اور خاموش رہنے کا مشورہ مصلحت پر مبنی تھا، لیکن یہ خاموش ہوجانا

میری تربیت اور خون کی روانی میں دوڑتے اصولوں کے خلاف تھا۔ ان کی جیت کا مطلب تھا کہ ڈنمارک میں ہر ادبی پروگرام نمازِ جنازہ کی طرح ہوگا جس میں جو عورت قدم رکھنے کی کوشش کرے گی اس کی عزت کا جنازہ بھی ساتھ ہی نکال دیا جائے گا۔ مذہب کو بنیاد بنا کر عزت اور بے عزتی کے معیار قائم کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ وہ جس دین کے ٹھیکے دار بنے بیٹھے ہیں اس میں عزت و ذلت اسی کے ہاتھ میں ہے جس کے نام پر آپ کی یہ دکان داری چمک رہی ہے۔

••

پروفیسر وینڈیگو، The Wendigo

پروفیسر کرِس شیڈلر اپنی کتاب ''وینڈیگو'' میں اس لفظ اور اصطلاح کو صرف انفرادی سطح پر کسی ایک غاصب کے لیے نہیں بلکہ گروہی نفسیات پر تطبیق کرتا ہے۔ جس میں طاقت کے نشے میں سرشار کردہ کمزور گروہوں پر غلبہ حاصل کرتے ہیں۔ اس اصطلاح کو نو آبادیات کی چیرہ دستیاں یہاں کرنے کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ 1978ء میں جیک فوربیز کی ''کولمبس اینڈ اَدر کینیبلز (Columbus and other Cannibals) امریکن انڈین موومنٹ کے حوالے سے ایک اثر انگیز تحریر ہے۔

2000ء

ٹونی کورٹ لینڈیو ...... کے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں ایک سمسٹر پڑھنے کے دوران وینڈیگو کی لوک داستان سے تعارف ہوا۔

منی سوٹا (Minnesota) اور مشی گن کے شمال میں ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے اٹلانٹس کوسٹ میں پایا جاتا ہے۔ قتل، طمع اور حسد کے خصائص کی علامت ہے۔ آدم خور وینڈیگوز روایت کے مطابق پہلے انسان تھے لیکن قحط کی وجہ سے اپنے ہی خاندان کو کھانے لگے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ نروجی داستانوں کا آغاز تھا۔ میں نے اس پر تحقیق کا آغاز کیا گویا دبستان کھل گیا۔

1661ء میں فرانس میں عیسائیت کے مشن کے تحت جو سالانہ رپورٹ لکھی جاتی تھی اس میں اس شیطانی طاقت کا تذکرہ ملتا ہے جس کے مطابق انسانوں پر وینڈیگو کا قبضہ ہو جاتا ہے ((جنات اور آسیب کی مانند)۔ یہ شیطانی سایہ انسانوں کو وحشیانہ حرکات پر آمادہ کرتا ہے۔ قتل،

لالچ، جنون اور دھوکا دہی جیسے گناہ سرزد کرتے ہیں۔

وینڈیگو کی یہ تاریخ 1878ء میں البرٹا کے سوفٹ انر اور کری (Cree) کے جیک فڈلر کی کہانیاں بھی سناتی ہے جو انسانوں سے وینڈیگو بن گئے اور جن پر مقدمات چلے۔ مغربی نفسیات دانوں، علم البشریات کے ماہرین اور تہذیب و ثقافت کے محققین کے درمیان ان حقائق کی اسناد پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ کردار کہانیوں، ناولوں، فلموں اور کمپیوٹر اور ویڈیو گیمز کا حصہ بن چکا ہے۔

اس پس منظر سے ایک جدید اصطلاح سوشل کینیبلزم کی اختراع ہوئی۔ جیسے ایک بھوکا آدم خور دوسرے انسان کا گوشت کھاتے ہوئے نہیں ہچکچاتا اسی طرح بہت سے لوگ دوسروں کی تکالیف، مسائل اور ناکامیوں کو دیکھ کر مسرت محسوس کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ لوگ دوستوں میں ہی شامل ہوتے ہیں۔

پروفیسر وینڈیگو کو یہ نام دینے کی وجہ بھی یہی تھی کہ بظاہر سماجیات اور معاشرت کے ماہر کی اپنی نفسیاتی حالت ایک سماجی آدم خور سے زیادہ نہیں تھی جسے ہوس اور حسد کے درمیانی پُل پر کھڑے ہو کر نیچے انجام کی خندق دکھائی نہیں دیتی لیکن جس کی بھرپور کوشش ...... ایک خاتون کے کردار کی دھجیاں اُڑانے، اسے دھمکانے، ڈرانے، ورغلانے، بہلانے پھسلانے کے ناکام ہتھکنڈوں کے بعد ایک خاتون کے کردار کی دھجیاں اُڑانے، دھمکانے، دہلانے اور ڈرانے کی متحدہ کوششیں کرنے میں گزری۔ لوکی اور وینڈیگو، اساطیر اور لوک داستانوں کے دو شیطان، عفریت جو نقاب پہنے نوکیلے پنجے اور دانت دکھانے میں مصروف رہے۔

ٹی وی لنک کے پلیٹ فارم سے ہم نے علمی و ادبی استفادہ کیا اور بے شمار پروگرام کرائے۔ مستنصر حسین تارڑ، انور مسعود، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر سید تقی عابدی، رضا علی عابدی، سعود عثمانی، ڈاکٹر سید امجد حسین، ڈاکٹر عبداللہ اور ان کی بیگم ڈاکٹر صوفیہ عبداللہ وغیرہ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ سوشل میڈیا پر ان کی تصاویر اور رپورٹس دیکھ کر ڈنمارک کی ایک اور بزعمِ خود عالم و فاضل شخصیت (جسے میں نے بعد ازاں پروفیسر وینڈیگو کا نام دیا) نے فیس بک پر رابطہ کیا اور پروگرام میں شرکت کی خواہش ظاہر کی۔ ہم نے بصد احترام دعوت نامہ بھجوا دیا۔

محترم شعیب بن عزیز کے لیے منعقد کی گئی نشست میں انھیں بھی مدعو کر لیا گیا۔ میں نے لبنیٰ الٰہی سے کہا کہ ''پروفیسر صاحب کو بھی آنا تھا، ابھی تشریف نہیں لائے۔ میں تو جانتی نہیں آپ کو علم

ہوگا۔'' وہ ہنسنے لگیں اور کہا، ''یہ سامنے ہی تو بیٹھے ہیں۔''

ان کو عزت و اہمیت دیتے ہوئے ہمیں علم نہیں تھا کہ یہ ایک نئی ساگا شروع ہونے کو ہے جس میں لوکی صاحب کے سازشی ذہن کا مقابلہ کرنے میں وقت ضائع ہوگا۔

لوکی صاحب اور پروفیسر وینڈ یگو پرانے دوست تھے اور متحد ہوکر انھوں نے جو قلمی جہاد کیا اس کی تفصیلات پوری ایک کتاب کی متقاضی ہیں۔

لوکی صاحب کی پرانی دوستی اور مصاحبت کی وجہ سے میں نے ان کو پروفیسر وینڈ یگو کا نام دیا۔ یہ پروفیسر وینڈ یگو سے پہلی ملاقات تھی۔ لبنیٰ الٰہی کے ساتھ مل کر ٹی وی لنک کے دفتر تشریف لائے۔ رضا علی عابدی کے پروگرام میں شرکت کی۔ ان کا اور ٹی وی لنک ٹیم کا ناشتہ میرے گھر تھا۔ اس میں شمولیت کی خواہش ظاہر کی تو ہم نے مدعو کیا۔ کئی علمی و ادبی پروگراموں میں شمولیت کا موقع فراہم کیا۔

ساگا بہت عام سے انداز میں آگے بڑھی۔ اچانک ڈنمارک میں معروف پہلی پاکستانی صحافی سویٹا روبن نے فون کیا اور پروفیسر وینڈ یگو کا پیغام پہنچایا کہ ''ڈنمارک میں بہت لوگ اس خاتون کے خلاف ہیں۔ میں ان کی زندگی میں شامل ہوکر ان کو تحفظ دینا چاہتا ہوں۔''

یہ کوئی ایسی تعجب خیز بات نہیں۔ ایسے واقعات ہر تنہا زندگی گزارنے والے انسان کی زندگی میں آتے ہیں۔ لیکن بات بگڑنا تب شروع ہوئی جب پروفیسر وینڈ یگو کی دھمکیاں شروع ہوئیں۔ مغرب زدہ ہونے کا دعویٰ کرنے والے ایک شائستہ اور مہذب انکار سنتے ہی اپنی زخمی انا کو علم بنائے جنگ کی بساط بچھا لیتے ہیں۔ میں سویٹا اور اس کے گھرانے کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ اس ساری جنگ میں وہ علانیہ میرے ساتھ کھڑی رہیں۔ ان کے شوہر ہارون روبن جو ڈینش مسلم ہیں، بے حد حیرت زدہ ہوکر کہانی سنتے رہے۔ سویٹا ڈنمارک ریڈیو سے وابستہ اولین پاکستانی تھیں۔ انھوں نے مجھے ساری معلومات دیں کہ لوکی صاحب اور پروفیسر وینڈ یگو اس ٹیم کا حصہ تھے۔ اول الذکر کی شکایت پر آخر الذکر کو حالتِ مے نوشی میں خبریں پڑھنے پر نکال دیا گیا۔ خود سویٹا کو بھی مشکل صورتِ حال سے گزرنا پڑا۔ ایسے مردوں کے ساتھ ملازمت کرنا ہی مسلسل ذہنی آزمائش تھی جو خود تو گوریوں کے ساتھ شادی کرتے ہوئے سینہ پھلا کر دادِ شجاعت کے طالب ہوں لیکن جب کوئی عورت کسی گورے سے شادی کرے تو اسے بے حیائی کی سولی پر لٹکانے کی کوشش کریں۔

میں نے براہِ راست ان تمام ای میلز کے فاضل مصنف کو فون کیا۔ ان کے غرانے اور دھمکانے کا یہی ایک خلاصہ تھا۔ ''ہم آپ کو برباد کر دیں گے، آپ کو سمجھ آجائے گی کہ ہماری طرف

انگلی اٹھانے کی کیا سزا ہے۔'' میں نے عرض کیا،''بسم اللہ، شروع کیجیے، مجھے بچپن سے ہی شوق تھا کہ میں بڑی ہوں تو ایک لوکی اپنی تمام شرپسندی سمیت میرے خلاف کردارکشی کی مہم چلائے اور اس کی معاونت ایک نام نہاد، دینِ مصطفےٰ کو ماننے والا اور حسینؑ کی حق گوئی کا علمبردار مجھ پر کتاب لکھے۔ باؤ جی آجایئے میدان میں۔ لیکن یاد رکھیے وہی قلم میرے ہاتھ میں ہے، وہی ڈینش معاشرتی اقدار مجھے بھی میسر ہیں۔ آپ کے قلم اور کتاب کے جواب میں قلم، کتاب، مائیک اور میڈیا کا استعمال نہ کروں تو ان سب کو توڑ کر چوڑیاں پہن لوں گی۔''

اللہ فرعون کے گھر موسیٰ پیدا کر کے دنیا کو تعلیم دیتا ہے۔ میں نے اسی سیاست دان اور متحرک سماجی شخصیت کیرن ویسٹ کو اپنے گھر لنچ پر بلایا۔ جس کے ایک پروگرام میں شرکت کا دعوت نامہ پروفیسر وینڈ یگو نے ہی مجھے بھیجا تھا اور وہ تمام خطوط اس کے سامنے رکھے جو ای میلز اور موبائل پیغامات کے جواب میں خاموشی پر میرے گھر ڈاک کے ذریعے بھجوائے گئے تھے۔ مجھے آج بھی اس کا بے یقین اور پریشان چہرہ یاد ہے۔

''مائی گاڈ، یہ خط اس شخص نے لکھے ہیں جو خود کو ایک بے حد روشن خیال شہری اور سماج کی نبض شناسی کا علمبردار سمجھتا ہے؟''

میرا مقصد کسی کے ماضی کو کھنگالنا ہرگز نہیں تھا لیکن جب ان دونوں اصحاب نے پاکستان کی ہر یونیورسٹی، ہر تنظیم، آرٹس کونسل اور فیسبک پر موجود ہر دوست کو میرے بارے میں خطوط لکھنا شروع کیے تو پھر لازم ہو گیا کہ دشمن کو اسی میدان میں اسی چال اور اسی کے ہتھیار سے مارا جائے۔

جب میں نے جوابی کارروائی کی تو یہ قصہ پولیس تک گیا۔ ایک شام کو مجھے پولیس آفس جانا ہوا۔ دفتر میں داخل ہوئی اور اپنا تعارف کرایا۔ میز کی دوسری جانب بیٹھا پولیس افسر مسکرایا، پروفیسر وینڈ یگو نے میری رپورٹ درج کروائی تھی۔

''صدف مرزا، آپ نے ان صاحب کو جان سے مارنے کی دھمکی دی ہے۔ ان کو آپ سے جان کا خوف ہے۔ میں توقع کر رہا تھا کوئی بھاری بھرکم، گرانڈیل ہیبت طاری کر دینے والی خاتون ہوگی۔''

اس بات کا جواب میں نے بھی ایک مسکراہٹ سے دیا اور پھر بیگ کھول کر پہلے میز پر ترتیب وار ان کے محبت نامے رکھے۔ دوسری قطار میں دھمکی آمیز خطوط اور گالیاں جس میں پروسٹیٹوٹ کا لفظ استعمال ہوا۔

وہ دنگ بیٹھا اس پلندے کو دیکھتا رہا۔

''یہاں پرنٹر ہے ناں؟ میں آپ کو وہ تمام ای میلز بھی پرنٹ کر دیتی ہوں اور موبائل فون سے دھمکیاں دیتے ٹیکسٹ بھی، ایسے لوگوں کو مجھ سے جان کا خطرہ ہو نہ ہو، آبرو کا اندیشہ ضرور ہوسکتا ہے، اگر کوئی آبروئے سادات باقی ہو۔''

اس نے مجھے اپنا ذاتی فون نمبر دیا اور یقین دہانی کرائی کہ وہ کل ان صاحب کے گھر جا کر ملیں گے۔ اس کے بعد ان خطوط بازی کے بارے میں راوی چین لکھنے لگا لیکن فیسبک پر وہ اکثر ہوائی فائر کرتے رہے۔ میں نے چونکہ انھیں بلاک کر رکھا ہے لہٰذا ان کا اگلا زہر مجھ تک نہیں آتا۔ لوکی صاحب چونکہ لوکی جیسی مکاری اور بظاہر ملنساری کی ٹوپی اوڑھے تھے، انھوں نے بالواسطہ طور پر سفارت خانے میں خوب ریشہ دوانی کی۔ سوائے ایک عورت کو بدچلن ثابت کرنے کے ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہ شاید بھول گئے کہ جس سماج میں وہ رہ رہے تھے وہاں صنفی امتیاز کی بنا پر مرد کو نہایا دھویا گھوڑا اقرار دینے کا زمانہ گزر گیا ہے اور جس تعلق میں مرد ہر حد پار کرنے کے بعد بھی شملہ اونچا کر کے نام نہاد معاشقوں کے جھوٹے سچے فسانے سنا کر اپنی مردانگی کے ڈنکے بجاتا ہے اسی تعلق میں عورت کو بدچلن کہنے کا تصور ہی نہیں ہے۔

وہ یہ بھی بھول گئے کہ وہ خود اپنے عالمِ شباب میں یہاں کیا گل کھلا چکے ہیں۔ انھیں شاید یہ بھی یاد نہیں رہا کہ جس دن ڈینش زبان میں پورے شواہد کے ساتھ میں یہ کتاب تحریر کروں گی اس دن ان کا نام بھی تاریخِ (بدکردارانِ) ادب میں امر ہو جائے گا۔

پولیس کے سنجیدہ نوٹس نے نجانے کیا اثر کیا کہ میری ای میل کا نظام ہیک ہو گیا۔ میں ای میل کو صرف خط کتابت کے لیے نہیں بلکہ اپنے تمام تر نوٹس، شاعری اور کتاب کی فائلز محفوظ کرنے کے لیے بھی استعمال کرتی ہوں۔ سارا نظام میرے موبائل سے بھی منسلک تھا۔ چند دن کی پریشانی اور بھاگ دوڑ کے بعد ای میل ایڈریس واپس مل تو گیا لیکن اس میں سے پورے ایک سال کا ریکارڈ ڈیلیٹ کر دیا گیا تھا۔

میرے افسانوں کا مجموعہ جو تقریباً مکمل حالت میں تھا اور ٹائپ کرنے کے بعد میں افسانہ خود کو ای میل کر دیتی تھی، سارا غائب ہو چکا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ کچھ افسانے میں نے ویسے ہی کچھ احباب کو بھیج رکھے تھے اور ان سے فائلز مل گئیں لیکن طویل عرصہ تک میرے دل میں یہ ملال چھاؤنی ڈالے رہا کہ کاش یہ فائلز پرنٹ کر کے بھی رکھ لیتی۔ اس کے بعد میں نے اپنی تخلیقات مختلف

جگہوں پر محفوظ کرنا شروع کردیں۔

ایک دن اچانک ہی کسی نے پروفیسر وینڈ یگو کی ایک تحریر بھیجی جس میں میری افسانہ نگاری کے خلاف زہر اگلا گیا تھا کہ کہیں کتاب شائع نہیں ہوئی تو افسانہ نگار کیسے ہیں۔جس طرح یہ دونوں حضرات داؤ پیچ لڑا رہے اور تاؤ کھا رہے تھے اور مسلسل تحریری تیر زہر میں بجھا کر سکھا رہے تھے، بچپن میں سنی ایک کہانی کا اژدہا یاد آگیا جو کسی کسان کے گھر رکھی درانتی سے لپٹ گیا، جوں جوں اسے درانتی کے دندانے زخمی کرتے توں توں وہ اس کے گرد اپنی گرفت سخت کرتا۔صبحدم نہ اژدہا رہا نہ زہر۔صبح تاخیر سے ہی سہی، ہوتی تو ہے ناں۔اندھیرا جب اپنے عروج پر ہوتا ہے تو اسی ساعت میں اجالے کی بوند بھی شب کے بطن میں ٹپک پڑتی ہے۔

میرے آپریشن کے بعد یہاں کے طبی قوانین کے مطابق میری قبل از وقت ریٹائرمنٹ ہوچکی تھی جس کا سادہ مطلب یہ ہے کہ مجھے ملازمت کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اور مجھے ماہانہ پنشن دی جائے گی جو میری تنخواہ کے برابر نہیں ہوگی لیکن مجھے ٹیکس پچاس فیصد کے بجائے انتالیس فیصد دینا ہوگا۔اس کے علاوہ بھی کچھ سہولیات دی گئیں۔مجھے سفر کی مکمل اجازت ہے۔میں پروجیکٹ کے تحت اپنی مرضی سے کام کرسکتی تھی جس میں آمدنی ایک خاص حد سے آگے نہیں جانی چاہیے۔

ڈنمارک میں سب معاملات ڈیجیٹل ہیں اور کسی بھی وقت انھیں تاریخ وار دیکھا جاسکتا ہے۔

یہاں پر بھی لوکی صاحب اور پروفیسر گروپ نے مخبری کے اور شکایتی خطوط لکھے جن کی ایک کاپی مجھے بھجوا دی گئی۔میں یہ کاغذی بمباری دیکھتی رہتی۔

••

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے...

ڈینش زبان وادب پر میری کتاب شائع ہوئی اور پاکستان سے کلچر منسٹری کا وفد کتاب ''زبانِ یارِمن دانش'' لے کر آیا تو میں نے سفارت خانے کو مدعو نہیں کیا۔سلطان بھائی بطورِ خاص آئے،''آپا پلیز ان کو مدعو کرلیجیے۔اس میں پاکستان کی عزت کا بھی سوال اٹھتا ہے۔'' میں اپنے موقف پر ڈٹی رہی کہ پاکستان کی عزت میری کتاب اور قلم سے ہوگی۔جو لوگ ایک عورت کی کردار کشی میں شریک تھے وہ میری کتاب کی رسمِ اجراء میں نہیں آئیں گے۔

دنیا کا بادشاہ بھی ہوتا تو یہ اجازت اسے بھی نہیں دی جاسکتی تھی کہ وہ ایک بدچلن عورت کی تحریر کردہ کتاب کی تقریب میں آئے۔مجھے ان سہاروں کی ضرورت نہیں۔میں اپنی دھرتی اور اپنے

لسانی تشخص کے تحفظ کے لیے جو عزائم رکھتی ہوں وہ اربابِ اقتدار کے ساتھ سمجھوتہ کیے بغیر بھی پورے ہوں گے۔ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب پاکستان کے سفارت خانے میں کوئی ایسا روشن خیال، زیرک اور صاحب الرائے فرد آئے گا جسے کمیونٹی اور بالخصوص خواتین کے بارے میں رپورٹیں لینے کے لیے کسی لوکی صاحب کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس دن سارے روابط استوار ہو جائیں گے۔

زبانِ یارِ من تُرکی کی رسمِ اجراء اس خوبصورت دن میں اپنے خاندان کے ساتھ وہاں موجود تھی۔

مجھے تو معجزہ کوئی بچا لایا صدف ورنہ
کھنچے تھے تیر کیا کیا مہربانوں کی کمانوں میں

میری کتاب کے خلاف واویلا کر کے اسے سرقہ ثابت کرنے میں دن رات ایک کر دیا۔ چالیس سال ڈنمارک جیسے ملک میں رہ کر اور مغربی یونیورسٹی میں پڑھنے کے بعد جب اصلیت اور اوقات ظاہر ہوئی تو پروفیسر صاحب بیہودہ گوئی پر اتر آئے۔ رنگ برنگی ای میلز اور نمبر بدل بدل کر فون کرنے سے افاقہ نہ ہوا تو پوسٹ کے ذریعے گھر خط بھیجے۔ میں اپنے بیٹے اُسامہ کے ہمراہ ہسپتال کے چیک اپ کے طویل دن کے بعد گھر آئی۔ اس نے چابی گھما کر پوسٹ بکس کھولا تو سامنے ایک اور خط کنڈلی مارے ناگ کی طرح پڑا تھا۔

''یہ خط مجھے دے دو،'' میں نے سکول جاتی خوفزدہ لڑکی کی طرح کہا۔

''کیا ہو گیا ہے امی، ان بھونکنے والے کتوں سے ڈریں گے کیا ہم؟'' اس نے خط میرے ہاتھ میں پکڑایا۔

''سارے خطوط جمع کیجیے، ہم پولیس کے پاس جا رہے ہیں۔'' اس نے سٹرابری اور کیلا ڈال کر سمودی بنائی، پھر سکون سے اس میں سٹرا ڈالا، ''یہ پیجیے، موجاں کیجیے۔''

پھر وہ میری طرف دیکھ کر ہنسا، ''پاکستانی دانشور، اب سمجھ آئی کہ آپ نے ہمیشہ ہمیں ان حلقوں سے الگ تھلگ کیوں رکھا، ڈگریاں کمانے کے باوجود کچھ لوگوں کی گراوٹ کی اور پستی کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی، پاتال ہی نہیں آتا۔''

ہم پولیس کے پاس گئے۔ میری بیٹی نے سب ای میلز کی نقول تاریخ وار بنا رکھی تھیں۔ جب میں نے ساری تفصیل بتائی تو پولیس افسر نے کاغذات کی فائل بنائی اور پھر بالکل عام لہجے میں بولا، ''شاید ایسے لوگوں کا خیال ہے کہ انکار کی قیمت قتل ہی ہے۔ اس ماحول میں جسمانی قتل نہ ہو سکے تو

ذہنی اور جذباتی عقوبت دینے پر تل جاتے ہیں۔ سماجی طور پر قتل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ یقیناً ایک بہادر فیملی ہیں۔ پاکستان یا ساؤتھ ایشیا کے کسی ملک میں ہوتیں تو اب تک بے نام ونشان ہو جاتیں۔''

میں نے اپنے کاغذات سمیٹے،''اسی کلچر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ اگر اس نے یہ کرتوت پاکستان میں کیے ہوتے تو ایسے بزدل کو اب تک زمین کے چھ فٹ نیچے گاڑا جا چکا ہوتا یا پھر زمین سے چھ فٹ اونچا کسی درخت سے لٹکایا جا چکا ہوتا۔''

وہ ہنسنے لگا،''ہاں ایسے بھی ہو سکتا تھا۔ آنر کلنگ کے تحت، لیکن اکثر عورت کو ہی قصور وار ٹھہرایا جاتا ہے۔''

وہ کچھ عرصہ انڈیا گزار کر آیا تھا۔ بہت دوستانہ انداز میں اس نے ساری تفصیل لی اور کہا کہ پہلا قدم تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو ہر جگہ سے بلاک کر دیں۔ ضروری سمجھیں تو موبائل نمبر بھی بدل لیجیے۔ کوشش کریں کہ اس کی کوئی بات آپ تک نہ پہنچے کیونکہ اس سے انسان نفسیاتی طور پر آزردہ ہونے لگتا ہے۔

''خیر، اس آدمی کے ڈر سے میں موبائل نمبر تو ہرگز نہیں بدلوں گی۔ ہمیشہ سے میرے پاس یہی ایک نمبر رہا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ ایسے لگڑ بگھوں کے ڈر سے نمبر بدل دوں۔'' میں نے صاف معذوری ظاہر کی۔

''چلو، یہ تمھاری مرضی، بس ان دونوں کے نمبر بلاک کر دو۔ فیسبک اور ای میل پر بھی بلاک کر دینا ہی پہلا قدم ہے۔ اگر مزید حرکات کیں تو پھر دیکھ لیں گے۔''

اس نے ہمیں محتاط رہنے اور ان کی گھٹیا باتوں سے دلگیر نہ ہونے کی تاکید کی اور کاغذات سمیٹ لیے۔

پولیس کی مداخلت سے ان صاحبان کو کچھ افاقہ ہوا لیکن اب لوکی نے یورپ کے دوستوں کو میرے کوائف بھجوانا شروع کیے کہ کسی طرح اس خاتون کو بدنام کر دیں۔ ان کی بدقسمتی کہ قدرت نے ان کو اس عمر میں خوار کرنا تھا۔ ایک ای میل سویڈن کے ایک دوست کو کر دی جس نے فیسبک پر رابطہ کیا۔ ایسے رابطے اور گفتگو میرے لیے اب ایک معمول کی بات تھی۔ ٹی وی لنک اور سلطان بھائی کی ادبی تنظیم کے تحت سکینڈے نیویا میں ہمیں مسلسل پروگرام کرنے کا اعزاز حاصل ہوتا رہا۔

امجد شیخ اردو لائف.کام کے بانی ہیں۔ انھوں نے تعارف کرایا اور اپنے افسانوں کا ذکر کیا۔ اخلاقی تقاضوں کے مطابق میں نے عرض کیا کہ جب ڈنمارک تشریف لائیں تو ٹی وی لنک کو

شرفِ میزبانی دیں۔ ایسے ہی کچھ لوگ برطانیہ سے جمع کیے گئے جنھیں باقاعدہ اس بات پر تیار کیا گیا کہ ادبی دنیا سے اس عورت کا نام ونشان مٹانا ہے۔

اس مرتبہ لوکی صاحب نے جو جال پھیلایا اس میں باقاعدہ منصوبہ سازی کی گئی کہ کرائے کے قاتلوں کی طرح کچھ لوگوں کو میری فیسبک آئی ڈی اور موبائل نمبر دیا جائے تاکہ وہ ایک مبینہ بدچلن عورت پر عاشقانہ کمندیں ڈالیں اور جب مذموم مقاصد میں کامیاب ہوجائیں تو سارے پتے show کر کے بتایا جائے کہ صرف بدکردار عورتیں ہی ادبی دنیا میں قدم رکھتی ہیں، شاعری کے گھنگرو پہنتی ہیں، مردوں سے مکالمہ کرنے کی جرات رکھتی ہیں اور میڈیا کی حدود میں داخل ہوتی ہیں۔ ایسی جسارت کرنے پر ان کے پر راکھ کر دیے جائیں۔

کیسی دلخراش حقیقت ہے کہ بدعنوانی، بدقماشی اور بدکرداری کے تمام منصوبوں اور معرکوں میں مرد ہمیشہ مردوں کے لیے سینہ سپر ہوتے ہیں لیکن عورتیں کبھی عورت کی پاکدامنی ثابت کرنے یا چادر پر لگے داغ کو دھونے کے لیے ساتھ نہیں دیتیں بلکہ الٹا اپنی ذات سے وابستہ مردوں کو خوش کرنے کے لیے سینہ بہ سینہ قصے کو چٹخارے دار بنا کر تشہیر کرتی ہیں۔

لوکی صاحب نے شیطان کی مجلسِ شوریٰ کی طرح مجلس ترتیب دی اور کچھ ممکنہ عشاق پیدا کیے۔ کچھ مشتبہ عشاق سے رابطے کیے، انھیں ڈنمارک بلایا اور اپنی دانست میں رسوائی کا الاؤ جلا کر وِچ ہنٹنگ کے طریقے پر پورا گھیراؤ کیا۔ شاید شیطانوں کے اس ٹولے کو علم نہیں تھا کہ نار کو گلزار ہوتے دیر نہیں لگتی۔ بساط جمائی جا چکی تھی کہ ایک دن شاید پی کر لڑکھڑانے کے عالم میں پروفیسر وینڈیگو کا موبائل میسج آیا کہ ”ہمارے گروپ میں فلاں اور فلاں دوست شامل ہو چکے ہیں، اب آپ کا غرور خاک میں ملانے کا وقت آ گیا ہے۔ میں ایک کتاب لکھنے والا ہوں، ”شاعرہ اور میں“۔ تم ایک گاؤں سے اٹھی معمولی عورت ہم اکیڈمک مردوں کے مقابلے پر اترنے کا خواب بھی مت دیکھنا“

میں نے بے حد سکون سے اس کا سکرین شاٹ لیا، فیسبک پر ایک گروپ بنایا اور نام بنام اس سازش کو بے نقاب کر دیا۔ بے شمار خیر خواہ اٹھے۔

”چھوڑیں صدف، بس خاموش رہیں۔ اس طرح بدنامی صرف آپ کے حصے آ رہی ہے۔ آپ کچھ ثابت نہیں کر سکتیں۔ شراب کے نشے میں دھت ایک آدمی کے موبائل پر پیغام سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ پولیس ایک مرتبہ پھر اس کے گھر جائے گی۔ چند دن اس کا تعاقب کیا جائے

گا۔مگر کہانی گھر گھر سنی جائے گی۔"

الزامات کے تیروں کی اس بوچھاڑ سے شاید میں بھی خائف ہوجاتی لیکن میرے بچپن کی تربیت سرتان کر کھڑی ہوگئی۔ اباجی کی شانے تھپکتی تاکید "اگر حق پر ہو تو کسی انجام سے مت ڈرنا۔ یاد رکھنا بی بی زینب رضی اللہ عنہا کی ادنیٰ کنیز ہو۔"

میرے بچے میری اطراف میں آ کھڑے ہوئے، "امی بس اب لحاظ نہیں کرنا، ان دونوں کی سازش اردو دنیا کے سامنے رکھ دیں۔"

ڈاکٹر ساجدہ، پاکستان میں ہسپتال بنانے اور مفت علاج فراہم کرنے کی دھن میں ہلکان، ناروے میں سرجری کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ آرتھو پیڈک سرجن، جس کا کام ہی ایک ہڈی توڑ دی ایک ہڈی جوڑ دی ہے۔ان کا فون آیا۔

"بہت مصروف ہوں، مجھے مشکل سے لنچ بریک میں وقت ملا ہے۔ان لوکی صاحب کی تاریخ اور کارناموں کے بارے میں مزید تفصیلات مجھ سے سن لو۔ آپ واقعی ٹھیک کہتی تھیں کہ ان کو پٹہ نہ ڈالا گیا تو ہر طرف صرف غراہٹیں باقی رہ جائیں گی۔ یاد رکھنا صدف مرزا، سرجن تب علاج کر پاتا ہے جب وہ مریض کو برہنہ کرنے اور کاٹنے چیرنے سے نہیں ڈرتا۔ایک کہانی یا دس فسانے سب برابر ہیں۔ بس اب سرجری کر ڈالو۔ علاج معالجے کا مرحلہ گزر گیا۔ دس برس کی داستان اپنی خوبصورت نثر میں لکھو۔بس لکھ ہی ڈالو ورنہ مجھے آپ سے بھی جنگ لڑنی ہوگی۔"

سو میں نے علاج بالمثل تجویز کر کے قلم اٹھالیا۔

چند ہفتے گھمسان کا رن پڑا جس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔لوکی نے پورے یورپ سے اپنے جیسے چیاؤں چیاؤں کرنے والے جمع کر رکھے تھے جن کی ڈوریاں وہ پردے کے پیچھے سے ہلاتا رہتا۔ اچانک کووں کی اس کائیں کائیں میں ایک آواز صوتِ ہادی سی بلند ہوئی۔ سویڈن سے امجد شیخ نے جو خاموش سامع بنے سارے معرکے کی تفصیلات دیکھ رہے تھے، ایک مفصل تحریری اقرار کیا کہ لوکی صاحب نے انھیں صدف مرزا کو دام میں لانے اور رسوا کرنے کے لیے ہدایات دی تھیں۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ وہ محض تجسس اور ایڈونچر کے لیے شامل ہوگئے لیکن اب یہ تماشہ ایک حملے کی صورت اختیار کر گیا ہے اس لیے اب وہ مزید اس کھیل کا حصہ نہیں بن سکتے۔ انھوں نے مجھے وہ ای میل بھی مہیا کر دی جس میں میرے خلاف تحریری پورنو بھیجا گیا اور نصب العین ایک عورت کو اس قدر بدنام کرنا تھا کہ ادبی حلقوں میں اس پر پابندی لگ جائے۔ امجد

شیخ آج صرف ایک دوست نہیں ہمارے گھر کا غائبانہ فرد بن چکے ہیں لیکن اکثر جتانے سے باز نہیں آتے کہ "ماسی، میرا پرانا دوست تھا لوکی صاحب، اس فساد کے بعد چھوٹ گیا۔"

یہاں اس بات کا تذکرہ نہ کرنا ناانصافی ہوگی کہ امجد شیخ نے بھرپور کوشش کی تھی کہ کسی طرح اس معاملے میں صلح کا ایک پہلو نکل آئے۔ لیکن ان دونوں مردوں کے باطنی متعفن رویے نے تمام راستوں میں پانی بھر دیا تھا۔

میں نے ایک ڈینش دوست کے توسط سے قانونی مشاورت حاصل کی۔ ان دونوں روسیاہان کا منہ مزید کالا ہوجاتا لیکن یہ کتاب ڈینش میں ہوگی تاکہ ڈنمارک میڈیا کو جو ایشیائی عورت سے شکایات ہیں کہ وہ وسائل کا درست استعمال نہیں کرتی، گھر سے نہیں نکلتی، معاشرے کا فعال حصہ نہیں بنتی، ان کا پس منظر اور وجوہات ان پر واضح ہوجائیں کہ ایشیائی خصوصاً پاکستانی اور مسلمان عورتوں کو معاشرے میں فعال کردار ادا کرنے کی خواہش و کوشش کی کیا قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ میرے ڈینش احباب نے ببانگِ دہل میرا ساتھ دیا۔ "سخن کا سفر: ڈینش شاعرات کی جدوجہد کی تاریخ" اسی تعاون کا ثبوت ہے۔ چار سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کا انتساب بی بی زینب رضی اللہ عنہا کے نام ہے۔ پنجاب یونیورسٹی شعبہ اُردو کے ڈاکٹر کامران کی ممنون رہوں گی۔ پنجاب یونیورسٹی سے کتاب کا چھپنا میرے لیے ایک عظیم اعزاز ہے۔

ابا جی کے بظاہر چلے جانے کے بعد بھی مجھے اپنے سر پر ان کا ہاتھ محسوس ہوتا ہے۔ چچا جان کی معصوم مسکراہٹ داد دیتی دکھائی دیتی ہے، "دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ تم یورپی ادب پر کام کرسکتی ہو۔" بی بی زینب رضی اللہ عنہا کی کہانیاں اور خطبے سن کر پروان چڑھنے والی بقول ابا جی کے ایک ادنیٰ کنیز، سر کی رِدا اتار کر، اسے ہوا کے دوش پر اڑا تو سکتی تھی، اس کی دھجیوں سے علم تو بنا سکتی تھی، لیکن سمجھوتہ نہیں کرسکتی۔

••

لوکی صاحب ایک فردِ واحد کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ذہنیت کا نام ہے جس کے تحت مصنفات اور شاعرات کو الزامات اور مغلظات کے ذریعے خائف کیا جاتا ہے۔ نہ صرف لوکی بلکہ ان کے احباب اور خیر خواہوں کا بھی مقاطعہ کیا جائے گا۔ ڈنمارک کی جس ادبی محفل میں ان کی شمولیت ہوگی وہاں ٹی وی لنک ٹیم نہیں جائے گی۔

مری نمو کو زمانہ نہ روک پائے گا

کہ میرے عزم کی پرواز آسماں تک ہے
مری بقا ہے وہ سیلِ بے پناہ جس کو
دبا سکا نہ تشدد
نہ جبر و استبداد
نہ کوئی کششِ ثقل کر سکی زنجیر مجھے
مری اڑان، ترے آسماں کی وسعت سے
بہت ہی دور، بہت دور، لامکاں سے پرے

علمی و ادبی میدان میں تو بزعمِ خود پرانے شہسواروں نے ایک خاتون کو اپنی آمریت کی سلطنت میں ایک باغی آواز تو خیر سمجھا ہی، سماجی حلقے میں بھی، زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن، کے مصداق ایسے ہی بدباطن افراد کی حکومت تھی۔ پاکستان کے زلزلہ زدگان کے لیے بڑے پیمانے پر عطیات جمع کرنے کے لیے ایک رنگا رنگ پروگرام ترتیب دیا گیا۔ کوپن ہیگن کی تقریباً ساری کمیونٹی مدعو تھی۔ اس میں رضا کارانہ طور پر ڈنمارک کے معروف موسیقار محترم پرویز اختر کا صوفیانہ کلام بھی پیش کیا جا رہا تھا۔ میری ایک نظم، چلو ہم سودا کرتے ہیں، پر انفاق فی سبیل اللہ پر ایک ڈرامہ بھی پیش کیا جانا تھا جس میں میری بیٹی کی ایک سہیلی نے مرکزی کردار ادا کرنا تھا۔ ستم یہ تھا کہ اس پروگرام کی نظامت میرے حصے میں آ گئی۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہاں کڑی کمان میں کھنچا ایک زہر آلود تیر میرا منتظر تھا۔ شکاری مچان سنبھالے، شست باندھے انتظار میں تھا۔ کوپن ہیگن ہی کی ایک عظیم ادبی شخصیت جو مجھ سے قبل تدریس سے وابستہ تھی، اس نظامت کا فرض ادا کرنے اور سٹیج پر رہنے کی وجہ سے مجھ سے شدید متنفر ہو چکی تھی۔ انھیں سٹیج پر آنا تھا اور اصرار تھا کہ ڈرامہ موخر کر کے پہلے انھیں بلا لیا جائے۔ ان کے مطالبے کے احترام میں ایسا ہی کیا گیا۔

اکثر پاکستانی مقررین کی ایک مشترک خاصیت یہ ہے کہ جب انھیں سٹیج پر بلا کر مائیک ان کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو پھر ان کو سٹیج سے رخصت کرنا ایک معرکہ ہوتا ہے۔ میں نے ان کو مودب سی یاد دہانی کرائی کہ آپ کے حصے کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ ان کا دبا ہوا کینہ اور غیظ و غضب خفتہ آتش فشاں کی صورت پھٹ پڑا۔ چیختے چلاتے اور غراتے ہوئے اور مردوں کی محبوب گالیاں دیتے ہوئے فرمایا کہ میں یہاں تیس سال سے قیام پذیر ہوں، بچہ بچہ مجھے جانتا ہے، تم کہاں سے

اٹھ کر آ گئیں مجھے بتانے والی کہ وقت ختم ہو گیا ہے۔ بدقسمتی یہ تھی کہ وہ ہاتھ میں موجود مائیک کا بٹن بند کرنا بھول گئے۔ ہم پاکستانیوں کے لیے اس سے بڑی شرمندگی یہ تھی کہ وہاں ساؤنڈ سسٹم کو درست رکھنے کی ذمہ داری ہمارے ایک ڈینش استاد کی تھی۔ یہ بے حد خوبصورت ہال اس سکول کی عمارت میں تھا جس میں کئی برس میں نے تدریس کے فرائض انجام دیے تھے۔ ڈین مجھے اکثر کہا کرتا تھا کہ تمھاری آواز میڈیا ہی کے لیے بنائی گئی ہے۔ کوئی بھی بٹن ہلائے بغیر اس کی پچ برقرار رہتی ہے۔ وہ ہکا بکا اس ادبی دیوتا کے اشتعال کو دیکھتا رہا۔

میں نے پروگرام کے دوسرے حصے کی نظامت کرنے سے انکار کر دیا۔ محترم پرویز اختر یک سٹیج پر پہنچے اور مجھے کہا کہ ''اس وقت اگر آپ نے ہتھیار ڈال دیے تو یہ آپ کی انفرادی شکست نہیں ہوگی، یہ ہم سب دن رات محنت کر کے اس پروگرام کو سنبھالنے والوں کی اجتماعی ناکامی ہوگی۔ جائیے، شاباش، پروگرام دوبارہ جاری کیجیے۔ ایک انسان کے کیچڑ اچھالنے سے کیا ہوتا ہے؟ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔''

انھوں نے مائیک میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ڈین نے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے بلند کیے پھر بولا، ''دیکھو مجھے زبان تو سمجھ نہیں آتی، مجھے رویے سنائی دیتے ہیں۔ تم بہادر نوجوان خاتون، چلو سٹیج پر۔'' اس نے بھاری پردہ ہٹاتے کی رسیاں کھینچنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں پونچھیں، گندے بچوں کی طرح قمیص کی آستین سے ناک صاف کی اور سٹیج پر دوبارہ نمودار ہو گئی۔

دن کے دو بجے سے شام کے سات بجے تک سٹیج پر کھڑے رہنے کے بعد جب گھر پہنچی، جوتے اتارے، تو مجھے علم ہوا کہ میرے سوجے ہوئے پاؤں میں چھالے پڑ چکے تھے۔

صحرا میں مِرے حال پہ، کوئی بھی نہ رویا
گر پھوٹ کے رویا، تو مِرے پاؤں کا چھالا

(نظیر اکبر آبادی)

یہ واحد واقعہ تھا جو میں نے ابا جی کو نہیں سنایا کیونکہ اس کے ساتھ ایک عجیب سی ناامیدی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان کو اس واقعے سے صرف دکھ ہوگا۔ اس دن مجھے شدت سے احساس ہوا کہ شاید ڈنمارک کوئلوں کی کان ہے جس میں ہاتھ منہ سب کالے ہی ہوں گے۔ گلاب پرونے والی انگلیاں صرف فگار ہوں گی۔

اگلے کئی دن مجھے بھرپور شعوری کوشش کرنا پڑی کہ وہ چیختی ہوئی مغلظات سناتی آواز کو اپنی یادداشت کے کمپیوٹر سے مستقل طور پر مٹا ڈالوں، کسی طرح ڈسک فارمیٹ کردوں کہ پروگرام کی کامیابی تو یاد رہ جائے لیکن اس واقعے کے روح کو کاٹ دینے والے بے رحمانہ الفاظ بھول جائیں۔ آج لوگ کہتے ہیں کہ ان عظیم بزرگوں کو تاعمر علمی وادبی خدمات کے لیے اعزازات دیے جائیں۔ میں خاموشی سے دو افراد پر مشتمل عالمی پروگرام میں بٹتا ایوارڈ دیکھتی ہوں۔ چائے کی پیالی میں ادب کا سونامی بپھرتا ہے اور بے خواب آنکھوں میں بِتا دینے والی رات کو یاد کرکے میرے پاؤں سے پھوٹ کر رونے والے چھالے دُہائی دینے لگتے ہیں۔

••

عورت کو فاحشہ اور بدچلن ثابت کرنے کے لیے مردوں کا متحد ہونا اور شکاری اور ہرنی کا کھیل کھیلنا شاید کہیں نہ کہیں ان کی فطرت کا حصہ ہے۔ عجیب بات ہے کہ قدرت، طاقت اور عہدہ رکھنے کے باوجود ایک عورت کے خلاف صف آرائی کرنے کے لیے ایک مخصوص ذہنیت کی ضرورت ہوتی ہے، وہی ذہنیت جو لوکی صاحب کے پاس تھی۔ لیکن ایک ڈینش، اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب، بااختیار اور بارسوخ ڈاکٹر کی داستان سن لیجیے۔ ایک عورت کو بدکردار اور جھوٹی ثابت کرنے کے لیے جس کے ساتھ اس کے ہم پیشہ ڈاکٹر جھوٹ بولنے، دھوکہ دینے اور رسوا کرنے کی سازش میں شانہ بشانہ کھڑے ہوگئے۔ لیکن کبھی کبھی تیر پلٹ بھی تو جاتے ہیں ناں۔ میرا ایک کالم جو ڈنمارک میں ایک واقعہ کے بعد لکھا گیا۔ ایک ڈینش خاتون کا مقدمہ، جسے مغربی ماحول کے تناظر میں ہی دیکھا جائے۔

ایک بدچلن ضدی عورت اور ڈاکٹر ڈی این اے...

مشرقی ماحول کی پروردہ مغربی معاشرے کا حصہ بننے والی ایشیائی عورت کے لیے دوہرے سماج کا دوہرا معیار گلے میں پھانسی کے دو پھندوں کی طرح ہے۔ یعنی جھولتے ہوئے اپنے وجود کو برقرار رکھنا ہے۔ مگر یہاں کئی برس گزارنے کے بعد اندازہ ہوا کہ مرد بھلے ڈنمارک کا گورا ہی کیوں نہ ہو جب خود پر آجائے تو اپنی طرف کا ہی بھائی بند لگتا ہے۔ یعنی ایشین مرد کوئی جنس نہیں بلکہ ایک عالمی کیفیت ہے۔

اس تناظر میں ڈنمارک میں ''ڈاکٹر ڈی این اے'' کے نام سے ایک کیس مشہور ہوا۔ ایک انتالیس سالہ کامیاب خوبرو ڈاکٹر جس نے دائمی رفاقت کے پیمان کسی اور حسینہ سے باندھ رکھے تھے کہ ایک روز یونہی سرِ رہگزر کسی اور جادو طراز سے نگاہ اس زعم میں ٹکرائی کہ صنفِ نازک کے قدم

اکھیڑنے اور قدموں میں لا ڈالنے والے سارے ترپ کے پتے تو جیب میں ہیں لہٰذا ایک اضافی رومانوی تعلق بازیچہ اطفال ہی تو ہے۔

آشنائی سے دوستی، دوستی سے محبت اور پھر خلوت تک کا سفر مغربی معاشرے میں زیادہ وقت نہیں لیتا۔ تعلق کے سرسبز اور ہموار راستے پر چلتی عورت کے اعتماد کو پہلی ٹھوکر تب لگی جب اس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ ہماری مخمور خلوتوں کا ثبوت دنیا میں ظاہر ہونے والا ہے۔ ظاہر ہے ڈاکٹر صاحب چراغ پا ہو گئے اور کہہ ڈالا کہ یہ نشانی جانے کس کی اٹھا لائی ہو اور زبردستی میرے سر تھوپنے کی کوشش کر رہی ہو۔

خاتون ڈرپوک تو تھی نہیں کہ ہر الزام سے خائف ہو کر دفاعی مورچے کھودنے لگتی۔ وہ مصر رہی کہ بچہ تو تمھارا ہی ہے۔ مسیحا نے حکم دیا کہ اس نجاست سے فوراً جان چھڑا لو۔

جن لمحات کو اس معاشرے میں مقدس، الوہی اور ذات کی تکمیل کہا جاتا ہے انہی باثمر لمحات کا دھڑکتا نتیجہ نجس کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ کر خاتون ڈٹ گئی۔

''میرا جسم میری مرضی۔ مجھے میرا بچہ پیدا کرنے کے حق سے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔''

ڈاکٹر نے اسے اپنے مقابلے میں سماجی کم مائیگی کا احساس دلاتے ہوئے دھمکی دی کہ اگر وہ اپنے فیصلے پر قائم رہی تو بچہ چھینا بھی جا سکتا ہے۔ ''عورت کال بندھی نہیں مرتی بال بندھی مر جاتی ہے۔'' محاورہ تو یہ اردو کا ہے پر نوعیت آفاقی ہے۔ یونانی اساطیر کا عیاش دیوتا زیوس جب بہروپ بدل کر جب دیویوں اور فانی عورتوں سے جنسی تعلق قائم کرتا تو انھیں حاملہ ضرور کرتا تاکہ جسمانی و جذباتی طور پر مفتوح و مفلوج کر لے۔ بچہ چھن جانے اور رل جانے کا خوف ہر عورت کے دل میں افعی کی مانند کنڈلی مارے خفتہ پڑا رہتا ہے لیکن اس خود آشنا عورت پر یہ جذباتی دھمکی بھی کارگر نہ ہوئی۔ اب ڈاکٹر کی پٹاری سے علمی و سائنسی سنپولیہ پھنکارتے ہوئے نکلا۔ ''اپنی عمر دیکھو۔ تیس کے بعد تو عورت ویسے بھی زرخیزی کھوتی چلی جاتی ہے۔ یہ بچہ جسمانی طور پر معذور بھی پیدا ہو سکتا ہے۔'' اسے کہتے ہیں ''بیسی اور گھیسی'' کے مقابل ''ساٹھے پاٹھے'' کا غرور۔ ڈینش ڈاکٹر نے ڈینش عورت کو ڈرانے دھمکانے کے وہ تمام الزامیہ ہتھکنڈے مسلسل استعمال کیے جو بلاتخصیصِ رنگ و نسل و مذہب ہر جگہ مباح سمجھے جاتے ہیں۔ مگر عورت بھی ایشیائی معاشرے کی تربیت یافتہ تھوڑا تھی کہ اس عزت کی حفاظت کے لیے لبوں پر تالے لگا لے جو کبھی ملی ہی نہیں۔ تنگ آمد بجنگ، آمد خاتون نے عدالت کے دروازے پر دستک دی اور ڈی این اے ٹیسٹ کے ترازو پر پورا مقدمہ رکھ دیا گیا۔

مگر یہ کیا؟ عورت کے پیش کردہ شواہد جھوٹے نکلے۔ لیبارٹری کی ساری گواہیاں مسیحا کے دائیں طرف جا کھڑی ہوئیں۔ میڈیا میں ایک بار پھر طوفان اٹھا۔ بدچلن کہیں کی۔۔۔ تریا چلتر۔۔ خودغرض، مکار۔

مگر یہ عورت صرف عیار ہی نہیں ہٹ دھرم بھی نکلی۔ اس نے ڈی این اے نتائج کو چیلنج کر کے ازسرِ نو تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ ڈنمارک میں ڈی این اے ٹیسٹ رائل ہسپتال میں ہوتا ہے اور شناختی کارڈ اور تصویر کے ساتھ نتائج محفوظ کیے جاتے ہیں تا کہ کسی غلطی یا رد و بدل کا امکان نہ رہے۔ جب وہ ضدی عورت ہسپتال میں ان شواہد کی تصدیق کے لیے پہنچی تو علم ہوا کہ ڈی این اے کے نتائج کے ساتھ تصویر ''ڈاکٹر ڈی این اے'' کی نہیں بلکہ ڈاکٹر کے دوست کی ہے۔ اس ڈرامے میں دو دیگر ڈاکٹر بھی ملوث نکلے (جن میں سے ایک پاکستانی ہے)۔

تحقیقات سے علم ہوا کہ ڈی این اے ٹیسٹ میں ہیرا پھیری کی نیت سے ڈاکٹر نے پہلے تو اپنے ایک دوست ڈاکٹر سے میڈیکل ثبوت لکھوایا کہ وہ سر درد جیسے نفسیاتی عارضے کی وجہ سے ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے رائل ہسپتال حاضر ہونے سے قاصر ہے لہٰذا اس کی صحت کے پیشِ نظر یہ ٹیسٹ اس کے اپنے ڈاکٹر سے کرا لیا جائے۔ اور پھر اپنی جگہ اپنے ایک اور ڈاکٹر دوست کو ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے بھجوا دیا۔

یوں ایک بے بس صادق عورت کو ایک امین پیشے سے منسلک تین مردوں نے جھوٹا قرار دینے کے لیے منظم منصوبہ بنایا۔

یہاں تنہا ماؤں کو حکومت بچے کی پرورش کا دوگنا وظیفہ دیتی ہے۔ ڈاکٹر ڈی این اے کو نہ صرف لاکھوں کرونرز کا ہرجانہ بھرنا پڑا بلکہ سال بھر کی جیل بھی کاٹی اور عام قانون کے مطابق بچے کے اٹھارہ برس کی عمر تک پہنچنے تک طے شدہ رقم بھی دینا پڑے گی۔ باقی دو ڈاکٹروں کی شہرت اور پیشہ ورانہ دیانت ان کی پشت پر تاحیات ٹین کی طرح بجتی رہے گی۔

دیکھا آپ نے۔۔۔ یہ کمبخت بدچلن ہی نہیں آستین کا سانپ بھی تھی۔

شیکسپیئر نے صحیح تو کہا ہے،

The lady doth protest too much, methinks.

••

معرض القاہرۃ الدولی للکتاب 2018، یعنی قاہرہ کا عظیم الشان کتاب میلہ

''یار امی، قاہرہ چلیں'' ہمارے فرزندِ ارجمند نے پوچھا۔

''کیوں؟ ابھی پچھلے سال ہو کر آئے ہیں آپ؟''

''امی، وہ معرض الکتاب تو دیکھنے والا شہر ہوگا۔ پورا سال انتظار کیا ہے میں نے، چلیں، بہت مزہ آئے گا۔ ہوٹل سے اہرامِ مصر دکھائی دیتے ہیں، یہ دیکھیں، یہ دیکھیں، یہ دیکھیں'' اس نے لیپ ٹاپ میرے سامنے کیا۔ وہ دو مرتبہ قاہرہ جا چکا تھا۔

''نہیں، اس سال نہیں'' حالانکہ پچھلے سال وہ جو کتابیں چن چن کر لایا انھیں دیکھ کر بے اختیار میں نے سوچا کہ کاش ابا جی ہوتے۔ مثلاً امام شافعی کا شعری مجموعہ، دیوان شعر الامام الشافعی کامل قصائد شعر الامام الشافعی۔ پھر ابا جی کی طرح بیٹھ کر مجھے عربی پڑھانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

یہ غالباً 2006ء کی بات ہے۔ میں نے جب ڈنمارک کے محدود ادبی حلقے اور متعصب مردانہ ذہنیت کی بات کی اور شاید کہا کہ مجھے شدید غصہ آتا ہے، جی چاہتا ہے ان غلیظ اذہان کے مالک افراد کو ایک زبردست تھپڑ مارا جائے۔ انھوں نے ایک شعر پڑھا۔ مجھے اس کا صرف ترجمہ یاد تھا۔

مجھے جتنا برا بھلا کہہ لو، میری خاموشی ہی جاہلوں کا جواب ہے۔

میں جواب دینے پر قادر ہوں، لیکن شیر کو زیبا نہیں کہ کتوں کو جواب دے۔

''جانِ پدر، جب کوئی عورت مسلسل کامیابی سے حصولِ علم اور اشاعتِ علم کے زینے پر چڑھتی چلی جاتی ہے تو یہ تڑاتڑ زناٹے دار تھپڑ ہوتے ہیں جو ورق ورق پر تحریر حرف حرف سے ابھرتے ہیں۔ اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا۔ یہی ان مردودوں کا حربہ اور مقصد ہوتا ہے کہ عورت کو دفاعی مورچے کی طرف دھکیلتے رہو تاکہ اس کا تخلیقی وفور جوابی بیانیے لکھنے پر مامور ہو جائے۔ میرے بچے، بھونکنے والے کتوں کے جواب میں بھونکا نہیں جاتا۔ چاند طلوع ہوتا ہے تو سگانِ آوارہ غراتے ہیں تو کیا مہتابی کرنیں زمین کا ماتھا چومنے نہیں آتیں؟ وہ تو کوئے لعنت کے سگانِ آوارہ پر بھی پڑتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ماہِ تمام کچھ لوگوں کو دیوانہ کر دیتا ہے۔''

''توبہ، نانا ابو، آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔'' عالیہ ان کے بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتی، ابا جی پیر سمیٹ کر اس کے لیے جگہ بناتے،

''بس میرے بچے، یاد رکھنا کہ سگانِ آوارہ کی گلی سے راستہ بدل کر نکل جانا چاہیے۔''

کتنے سال کے بعد جب اُسامہ نے مجھے ان کے اشعار پڑھائے۔

''رکو رکو، یہ شعر آپ کے نانا ابو نے مجھے سکھایا تھا۔ انھیں کیسی فکر دامن گیر رہتی کہ کہیں ایسا نہ ہو بچوں کو اردو نہ آئے۔ اُسامہ عربی اشعار پڑھنے لگا۔

قل بماشئت فی مسبۃ عرضی *** فسکوتی عن اللئیم جواب

ما أنا عادم الجواب ولکن *** مامن الأسد أن تجیب الکلاب

ہمیشہ کی طرح میں نے سوچا، کاش آج ابا جی ہوتے۔ ہمارے گھر میں اُسامہ نے سب سے پہلے بی بی زینب کے روضے کی زیارت کی۔ وہ وہاں سے ویڈیو کلپ بنا کر لایا۔ صبح کے غالباً تین بجے کا وقت تھا۔ کوئی مجذوب وہاں عربی اشعار گا رہا تھا۔ وہ منظر دیکھ کر دل پر رقت طاری ہونے لگی۔ اُسامہ نے بتایا کہ اس روضے پر ایک عجیب سی فضا تھی۔ سکون اور زندگی کا احساس تھا۔ ظاہر ہے اس کے بچپن میں بھی یہی کہانیاں گھر میں گونجتی تھیں۔ شام کو جب میں بچوں کو لے کر بیٹھتی تو ہر روز کوئی منتخب داستان سنائی جاتی۔ میری شدید خواہش ہے کہ ایک دن مجھے بھی اس روضے پر حاضری نصیب ہو۔ اگرچہ ہمارے عرب دوست منعم الفقیر ہمیں باضابطہ میلے میں منعقد ہونے والے مشاعرے کی دعوت دے چکے ہیں۔

''سیدہ آپ کی شاعری کا عربی ترجمہ پیش کر دوں گا۔''

لیکن اس سال ہماری صاحبزادی کی تعلیم اور اولاد سنبھالنے کے فریضے نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ میں دو ہفتے نکال کر مصر جا سکوں۔

••

''سخن کا سفر'' چھپنے کے بعد میری ایک پوسٹ ملاحظہ فرمائیں۔

شیرِ خدا کی شیر دل بیٹی کے نام انتساب

دس محرم میرے لیے سوگ کا نہیں فتح کا دن ہے۔ ڈینش شاعرات پر میری اس کتاب کا انتساب زہرۃ الثانی بی بی زینب رضی اللہ عنہا کے نام ہے۔

بچپن کے انتہائی مبہم سرے پر چاندنی راتوں میں ابا جی جو کہانی سناتے وہ ''انصتوا'' (سنو) کے لفظ سے شروع ہوتی تھی۔ اس باوقار آواز کا گونجنا تھا کہ لوگوں کے سروں پر پرندہ بیٹھ گیا۔

دنیائے اسلام کی پہلی صحافی خاتون، جس کے نطق سے ان منافقوں نے بولنا سیکھا جو یزیدی استعمار کے سامنے مہر بلب تھے۔ مجھے بی بی زینب کے خطبے کا ترجمہ عربی زبان میں پڑھایا گیا۔ شعور کی آنکھ کھلتے ہی ذہن میں ایک رول ماڈل تھا۔

یہ چھٹی صدی عیسوی کی داستان ہے، ایک شجیع، بے خوف اور بے باک آواز کی بازگشت ہے جس کے سامنے خاندان کے افراد کٹے، خیمے جلے، سر سے ردا چھینی گئی، جس نے بھائی کے خون کے چھینٹوں سے حوصلے کی ردا کو قرمزی رنگ دیا۔ یزید کو مخاطب کر کے جو لقب دیا اس کے تیور دیکھیے،

اَمِنَ الْعَدْلِ یَابْنَ الطُّلَقَاءِ!

اے طلقاء کے بیٹے (آزاد کردہ غلاموں کی اولاد)... کیا یہی تیرا عدل ہے۔

تَخْدِیرُكَ حَرَائِرَكَ وَإِمَائَكَ، وَسَوْقُكَ بَنَاتِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ سَبَايَا، قَدْ هَتَكْتَ سُتُورَهُنَّ، وَ اَبْدَيْتَ وُجُوهَهُنَّ، تَحْدُو بِهِنَّ الْأَعْدَاءُ مِنْ بَلَدٍ إِلَى بَلَدٍ، يَسْتَشْرِفُهُنَّ اَهْلُ الْمَنَاهِلِ وَالْمَنَاقِلِ، وَ يَتَصَفَّحُ وُجُوهَهُنَّ الْقَرِيبُ وَالْبَعِيدُ، وَالدَّنِيُّ وَالشَّرِيفُ، لَيْسَ مَعَهُنَّ مِنْ رِجَالِهِنَّ وَلِيٌّ، وَلَا مِنْ حُمَاتِهِنَّ حَمِيٌّ، وَ كَيْفَ يُرْتَجَى مُرَاقَبَةُ مَنْ لَفَظَ فُوهُ اَكْبَادَ الْأَزْكِيَاءِ، وَنَبَتَ لَحْمُهُ مِنْ دِمَاءِ الشُّهَدَاءِ، وَ كَيْفَ يَسْتَبْطِأُ فِي بُغْضِنَا اَهْلَ الْبَيْتِ مَنْ نَظَرَ إِلَيْنَا بِالشَّنَفِ وَ الشَّنَآنِ وَ الْإِحَنِ وَ الْأَضْغَانِ، ثُمَّ تَقُولُ غَيْرَ مُتَأَثِّمٍ وَلَا مُسْتَعْظِمٍ: لَأَهَلُّوا وَاسْتَهَلُّوا...

اے طلقاء کے بیٹے! کیا یہ تیرا انصاف ہے کہ تو نے اپنی مستورات اور لونڈیوں کو چادر اور چار دیواری کا تحفظ فراہم کر کے پردے میں بٹھا رکھا ہوا ہے جب کہ رسول زادیوں کو سر برہنہ در بدر پھرا رہا ہے۔ تو نے مخدراتِ عصمت کی چادریں لوٹ لیں اور ان کی بے حرمتی کا مرتکب ہوا۔ تیرے حکم پر اشقیاء نے رسول زادیوں کو بے نقاب کر کے شہر بہ شہر پھرایا۔ (طبری)

آج کے دن انسانیت کو بالعموم اور نسائیت کو بالخصوص ایک تجدید کا موقع ملا۔ ہر وہ انسان جس کے سینے میں پتھر نہیں ایک دل دھڑکتا ہے، تاریخ کی خون چکاں داستان سے عزم و ہمت کی اس معجزانہ صفات بی بی کی جراتِ بیان کو سلام پیش کیے نہیں رہ سکتا۔

جب ڈینش دوست مصنفہ کو مختصر ترجمہ کر کے انتساب کا مفہوم سمجھایا تو اس کی آنکھیں برسنے لگیں۔ تیرھویں صدی میں ڈنمارک کی ملکہ مارگریٹ اول کو نو برس کی عمر میں شادی کی غرض سے ناروے بھیج دیا گیا۔ یورپ کی عورت لب بستہ رہنے پر مجبور تھی۔ ان ملکاؤں شاہزادیوں کو چھٹی صدی کی

ایک آواز کی داستان سنانا ایک مشن تھا۔ اگلے ہفتے یورپی پارلیمنٹ میں ایجوکیشن کانفرنس میں مجھے موقع ملے گا کہ میں تراجم کی طاقت استعمال کرتے ہوئے نور کی اس کرن سے نیا بیان متعارف کرا سکوں۔

خیریت دریافت کرنے والے عزیز دوستو، میری گوشہ نشینی بلاوجہ نہیں۔ مشاعرے گانا میرا منصب نہیں۔ میرا خواب تھا کہ صدیوں پرانے نور کی کرن ایک امید کی صورت پیش کروں۔ اس نور کو ظلم کا بلیک ہول نہیں نگل سکا۔ مجھے اعزاز حاصل ہے کہ یہ کتاب میری مادرِ علمی، پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہو رہی ہے۔ میں ڈاکٹر محمد کامران، اور وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی پروفیسر ڈاکٹر نیاز احمد اختر کی ممنون ہوں۔ جناب محمد مختار کا شکریہ جنھوں نے کمال تحمل اور انتہائے تخیل کو چھو کر سرورق بنایا۔

••

پریس ریلیز

پنجاب یونیورسٹی سے ڈنمارک کی شاعرات کے حوالے سے کتاب کی اشاعت

اردو ڈیویلپمنٹ کمیٹی (ادارہ تالیف و ترجمہ) پنجاب یونیورسٹی نے ڈنمارک میں مقیم معروف شاعرہ، مصنفہ اور براڈ کاسٹر محترمہ صدف مرزا کی کتاب ''ڈینش شاعرات: سخن کا سفر'' کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ ادارہ تالیف و ترجمہ کے ناظم پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران، ڈین کلیہ علومِ شرقیہ، پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر اور وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر نیاز احمد اختر نے محترمہ صدف مرزا کی کاوشوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب یورپ میں نسائی ادب کی روایت اور ڈنمارک سے تعلق رکھنے والی شاعرات کے فکر و فن کو عمدگی سے اجاگر کرتی ہے۔

کچھ نہ کچھ تو ہے، عجزِ ہنر ہی سہی
اک صدف ہی سہی، اک گہر ہی سہی
اب کے دیوار و در پر ہیں روشن دِیے
پھر سرنگوں کا زیست اک سفر ہی سہی
اب دِیا تو نہیں۔۔ خود اجالا ہیں ہم
راہ مشکل سہی۔۔ پُر خطر ہی سہی
دل میں تعمیرِ نو کے ہیں پھر ولولے

پھر شکستہ میرے بام و در ہی سہی
میرے ہاتھوں میں چابی ہے تحقیق کی
لاکھ تنہا سہی۔۔۔بے خبر ہی سہی

پریس ریلیز

پنجاب یونیورسٹی ڈنمارک کے ادب کے حوالے سے قابلِ قدر کام کر رہی ہے

کوپن ہیگن یونیورسٹی ڈنمارک کے فارسی کے استاد، ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر کلاؤس پیڈرسن (Dr. Claus Pedersen) نے اپنے پاکستان کے دورے کے دوران شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر اور ادارہ تالیف و ترجمہ کے ناظم ڈاکٹر محمد کامران سے ملاقات کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر محمد کامران نے انھیں ادارہ تالیف و ترجمہ سے ڈنمارک کی شاعرات کے فکر و فن کے حوالے سے شائع ہونے والی محترمہ صدف مرزا کی کتاب ''ڈینش شاعرات: سخن کا سفر'' پیش کی۔ ڈاکٹر کلاؤس پیڈرسن نے ڈنمارک کی شاعرات کے حوالے سے کتاب کی اشاعت پر پنجاب یونیورسٹی کو مبارک پیش کی اور اس امید کا اظہار کیا کہ ڈنمارک کی جامعات اور پنجاب یونیورسٹی کے مابین علمی تعاون کے سمجھوتوں اور اساتذہ و طلبہ و طالبات کے تبادلوں سے تعمیر و ترقی کے نئے راستے کھلیں گے۔ ڈاکٹر محمد کامران نے اس موقع پر بتایا کہ کلیہ علوم شرقیہ کے ڈین پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر اور وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر نیاز احمد اختر بین الاقوامی ادب کے فروغ اور دنیا کی بڑی جامعات کے ساتھ علمی روابط کے فروغ کے لیے عملی اقدامات اٹھا رہے ہیں۔

••

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جس سے خیر کر، اس کے شر سے ڈر۔ خیر کرنے اور احسان کرنے کے بعد انہی لوگوں کے شر سے ڈرنے کا حکم بظاہر عجیب سہی لیکن زندگی سکھاتی ہے کہ انسانی فطرت یہی ہے کہ احسان یاد رکھنے والے اور جواباً حسنِ سلوک کرنے والے بہت کم ہیں لیکن دنیاوی فوائد حاصل ہو جانے کے بعد جس سیڑھی پر قدم رکھ کر اوپر چڑھتے ہیں اسے پاؤں کی ٹھوکر سے نیچے ضرور گراتے ہیں۔ مجھے زندگی نے ابتدائی عمر میں ہی دو تجربات کے ذریعے یہ اسباق تازہ کر دیے۔
ہمارا پہلا مکان جو دو منزلہ تھا، ایک دوست صاحبہ نے خریدنا چاہا۔ منت، سماجت، خوشامد

اور دوستی کے دلفریب جال میں دو لاکھ کراؤن قرضے سے مسئلہ حل کیا۔ بس پانچ سال کی بات ہے اس میں آپ کی ادائیگی ہوجائے گی۔ وہ پاکستان گئیں تو ابا جی کا فون نمبر لے کر گئیں۔ ان سے مسلسل رابطہ رکھا۔ اپنی تہجد گزاری کے قصے سنائے۔ اگرچہ تعلیم ان کی واجبی سی تھی لیکن بعض لوگ علم حاصل کرنے کے بجائے شاطر اور ابن الوقت ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ابا جی کہنے لگے بہت اچھی بچی ہے۔ یورپ میں رہ کر اسلام کے اصولوں پر کاربند ہے۔ آپ لوگوں نے بھی تو یہ بحری بیڑا بیچنا ہی ہے۔ فریقین کے لیے اچھا ہے، سو ان کو قرضے کی سہولت ان کی آسانی تک دے دو۔ کاش اس وقت ابا جی کو اپنی ہی سکھائی ہوئی یہ بات یاد رہتی کہ جس سے احسان کر، اس کے شر سے ڈر۔

بعد میں وقت نے سکھایا کہ کم ظرفوں سے نیکی اہلِ ظرف کی حق تلفی ہے۔ وہ ایک دفعہ پھر تشریف لائیں کہ مجھے قرضے کی ضرورت ہے، کچھ پیسے دے دیں۔ اگرچہ عالیہ اس وقت اٹھارہ برس کی بھی نہیں تھی لیکن اس نے کہا امی، بظاہر وہ امیر کبیر بنی پھرتی ہیں لیکن ہم سے ادھار کیوں مانگ رہی ہیں، مت دیں۔ لیکن مجھ پر ان کے دلگداز انداز میں کہے الفاظ سوار تھے۔ میں نے بچوں کو بٹھا کر ان کے سامنے پیسے دے دیے۔ انھوں نے ہمارا خیال بھی بہت کیا۔ ہسپتال کے دنوں میں اکثر میرے پاس پہنچ جاتیں، کبھی کبھار کھانا بھی بنا لاتیں۔ اور ویسے بھی ان کا حسنِ سلوک مجھے خریدنے کے لیے کافی تھا۔ دوستی کے گلستانوں سے ہوتی مادیت پرستی کے تہہ در تہہ نقاب اوڑھے یہ داستان دو لاکھ کراؤن میں بک گئی۔

بس پیسے طلب کرنے کی دیر تھی کہ آیات کا وِرد کرنے والی زبان نے وہ پلٹا کھایا کہ جو سنے کان لپیٹ لے۔ ''آپ مجھ سے پاکستان میں پلاٹ لے لیں۔ بہت مجبور ہوں۔ حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ پیسے دینا ہمارے لیے ممکن نہیں۔'' میرا ہسپتال ان کے گھر کے قریب تھا۔ روز سویرے پہنچ جاتیں۔

''امی جی! ہم نے راولپنڈی میں پلاٹ کیا کرنے ہیں؟'' بچوں نے کہا۔ لیکن میں آج بھی ان کے آنسوؤں اور اداکاری کو داد دیتی ہوں کہ دو ہفتے کی محنت سے ہسپتال میں ہی مجھ سے منوانے میں کامیاب ہوگئیں کہ یہ پلاٹ کل کو سونے کے بھاؤ بکیں گے۔ بس ابھی چند سال مشکل ہیں۔ نہ میں نے زمین دیکھی نہ مجھے زر اور زمین سے کوئی دلچسپی رہی۔ ایک دن آئیں، ''یہ لیں جی، یہ ہے آپ کے پلاٹ کی رجسٹری، اسے بنک میں رکھ دیں۔ میں زندگی بھر آپ کا احسان نہیں بھولوں گی۔ آپ کے والد صاحب کے لیے تاحیات دعا گو رہوں گی۔ وہ انسان نہیں فرشتہ ہیں۔''

میں شمس الجہلاء بھول ہی گئی کہ ابا جی کہا کرتے تھے کہ فرشتہ بننا کوئی بڑی بات نہیں لیکن انسان بننا تو قدسیوں کے بس کی بھی بات نہیں۔ کاغذات بنک میں رکھے اور بات ختم۔ لیکن جب ابا جی دنیا سے گئے تو مجھے اچانک خیال آیا کیوں نہ ایک سکول ان کے نام پر کھولا جائے اور خواتین اور بچے وہاں مفت تعلیم حاصل کریں۔ اساتذہ کو تنخواہ ہم یہاں سے بھیجا کریں گے۔ چند ہم خیال دوست ساتھ ہو گئے۔ اب میں نے بنک سے زمین کے کاغذات نکالے۔ خود کو داد دی کہ اچھے وقتوں میں زمین مل گئی۔ لیکن بھائی نے وہ کاغذات دیکھے تو سر پیٹ لیا، ''او نالائق، بے وقوف، جاہل خاتون، یہ تو بیع نامہ ہے اور یہ زمین بمشکل ایک لاکھ پاکستانی روپے کی مالیت کی ہے۔ تمھیں لینڈ لارڈ بننے کا کس نے کہا تھا؟''

اب ان خاتون سے رابطہ کیا گیا تو زندگی ایک نیا درس ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ یہ سطور کسی کی بدنیتی کے اظہار کے لیے نہیں بلکہ دوستوں تک یہ پیغام پہنچانے کے لیے ہیں کہ دنیاوی حرص، طمع اور لالچ انسانوں کے دین داری کے تمام دعووں کو سیلاب کے ریلے کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ اب پنڈورا باکس کھل گیا۔ ڈاکٹر ساجدہ نے بھی ان سے بات کی۔ بمشکل رو پیٹ کر وہ ڈھائی لاکھ کراؤن کی رقم سے اسی ہزار دینے پر آمادہ ہوئیں۔ دونوں بچوں کے اکاؤنٹ میں چالیس چالیس ہزار منتقل کیے اور بات ختم۔ چونکہ ڈنمارک میں بینک سے تمام تفصیلات کسی بھی وقت نکلوائی جا سکتی ہیں، شواہد محفوظ رہتے ہیں، زمینی نامہ اعمال تیار رہتا ہے لہٰذا وہ جب بھی قرضہ مانگتیں، مجرمانہ ذہانت کے ساتھ گھر آ کر ہاتھ میں لیتیں۔ واپس دیتے ہوئے ڈرامے بازی سے ایک ایک کراؤن بینک میں بھیج کر دیتیں۔

ڈاکٹر ساجدہ کہنے لگیں کہ جو زبان اس عورت نے استعمال کی اس میں یہ بھی غنیمت سمجھو اور معاملہ خدا پر چھوڑ دو۔ پھر مجھے یاد آیا کہ زمین ہمارے سینے پر سوار ہو کر چلنے کے لیے نہیں ہے۔ بس چند برس، چند دہائیاں اس کے سینے پر انسان اکڑ کر چلتا ہے۔ میں نے حرص و ہوس کا وہ پنڈورا باکس اٹھا کر فراموشی کے اندھے کنوئیں میں پھینک دیا۔

دین دار ہونا ہمارے ہاں ایک عجیب سا نظریہ ہے۔ سر پر دوپٹے کی بکل مارے اپنے وضو اور تہجد کا اشتہار دیتی، مصلے پر بیٹھی وظائف پڑھتی وہ عورت دنیا کو کامیابی سے دھوکہ دے سکتی تھی اور مجھے بھی دیا۔ کیا دو لاکھ کراؤن کسی کے کردار کی قیمت ہو سکتے ہیں؟ مطالبہ کرنے پر جواب میں زمین کے چند ٹکڑے کاغذ پر لکھ کر ہاتھ میں پکڑائے۔ ہسپتال کی تاریک اور سرد فضا میں مجھے اتنا ہوش ہی کہاں تھا کہ اس بحث میں پڑتی۔ پانچ سال تک دو لاکھ کراؤن کی مقروض رہیں۔ پھر اس کی ادائیگی کا

وقت آیا تو ایسی چالبازیاں شروع کیں جیسے آبِ حیات پی رکھا ہو اور تا قیامت دنیا میں ہی رہیں گی۔

میں نے اپنے باپ کی طرح وہ کاغذی جائیداد کا پرزہ اڑا کر پھینک دیا۔ چلو بی بی پاک دامن لے جاؤ یہ چند لاکھ شاید تمھارے ساتھ قبر میں جائیں۔ میرے دل کو یہی اطمینان اور سکون رہے گا کہ میں نے دھوکہ کھایا ہے دیا نہیں۔ میں ریا کاری کے حجاب پہنے اپنی تہجد کو کیش نہیں کراتی۔ دین کو کاروبار نہیں بنایا۔ عقیدے کو ایک اندھی سرنگ نہیں بنایا جس کے اخیر میں روشنی کی رمق بھی نہ ہو۔

بہت دوستوں نے کہا کہ یہ پاکستان میں جس سیاسی خاندان سے نسبت کا اظہار کرتی ہیں ان سے بات کریں۔ پاکستان میں تعلقات چلتے ہیں۔ اس نے دھوکہ دہی اس عورت کے ساتھ کی جو مسلسل آپریشن کے دوران واضح سوچنے سے قاصر تھی۔ اب تو آپ بہت آرام سے یہ قصہ ختم کرا سکتی ہیں۔ بس حکم کیجیے اور تفتیش کا آغاز کریں۔ یہ پیسے بھی دیں گی اور ذلیل و خوار بھی ہوں گی۔ لیکن میرے دل کو بس اچانک ہی یہ آزمائش مقصود ہوگئی کہ جانے دیتے ہیں، کیا یاد کریں گی۔ دیکھتے ہیں کہ کیا پلاٹ اور پیسے یہ کفن میں لگی جیب میں رکھ کر لے جانے میں کامیاب ہو پائیں گی؟ اور اب تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں۔

سو آج تک وہ پلاٹ خدا کی زمین کے کسی نادیدہ کونے میں پڑے ہیں جن کے کاغذات پر اس فریب کاری سے قبل نجانے کس کس کا نام ہوگا۔ گز بھر زمین کی ضرورت ہے، وہ بھی کس کو کہاں ملتی ہے کسی کو اس کی خبر نہیں۔ زندگی میں ملے اس کردار سے یہ سبق ملا کہ قرآن کی آیات پڑھتے اور ماتھے پہ تہجد کے محراب کے نشان دکھاتے لوگوں کی ریا کاری پر کبھی یقین مت کیجیے۔

2012ء میں اپنے آخری آپریشن سے قبل میں نے بہت سے کاغذی کام مکمل کیے۔ اچانک ای میل سے وہ کاغذات بھی نکل آئے۔ اس دن میں نے بھی ابا جی کی طرح علیم بذات الصدور سے مکالمہ کیا۔ میں نے اپنے تمام تر معاملات کی طرح یہ معاملہ بھی تجھ پر چھوڑ رکھا ہے۔ تو اپنے وعدے سچ کرتا ہے تو زر اور زمین کی اس ہوس میں ذہین مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچا دینا تا کہ مزید لوگ دھوکہ دِہی سے بچ سکیں۔

اب میں خدائی انصاف کی منتظر ہوں۔

••

آتشزدگی کے بعد جب وہ گھر دوبارہ تعمیر ہوا تو اس میں رہنے کا خیال ہی روح فرسا

تھا۔ اس گھر کو جس خاندان نے اونے پونے خریدا وہ ایک الگ داستان ہے اور مکمل لالچ اور طمع کا پرانا درس نئے انداز میں تھا۔ لیکن اس وقت ذہنی کیفیت ہی ایسی تھی کہ چند لاکھ کراؤن قیمت کے پیچھے کاروبار ہم سے ناممکن تھا۔ ایک بچی جو عالیہ کی ہم جماعت تھی، ان کی والدہ نے ہمارے گھر پھیرے ڈالنے شروع کیے۔ آپ جب تک نیا مکان نہیں خریدتیں ہمارے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوجائیں۔ پھر اس کے بعد وہی سکرپٹ دوہرایا گیا جو تہجد گزار خاتون نے لکھا تھا۔ بلکہ مناسب ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ جب سے یہ دنیا بنی ہے، کہانی کا پلاٹ وہی ہے بس کردار اور مقامات بدل جاتے ہیں۔ یہاں پر لوگوں کی شکایات مقصود نہیں، ان تمام آزمائشوں کا ذکر ہے جو ہمیں مضبوط بنانے کے لیے آتی ہیں۔ جو سکھاتی ہیں کہ مال و دولتِ دنیا اور رشتہ اڑتے غبار سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آزمائش کے تاریک ترین دور میں بھی مذہبی لوگوں کا یقین نہ کیا جائے۔

آپریشن سے روبصحت ہونا تو ابا جی کی دعاؤں سے ممکن ہو ہی گیا لیکن مجھے یہ علم نہیں تھا کہ ہمارے معاشرے میں اصل آزمائش اب شروع ہے۔

ایک شادی میں دوسالہ بیٹے کو کھانا کھلا رہی تھی۔ عقب سے کسی نے گفتگو میں میرا نام لیا۔

''اس کو یہ بیماری شادی سے پہلے کی تھی؟۔۔ چچ چچ۔۔ ہاں لوگ اکثر بتاتے نہیں اور بیاہ دیتے ہیں۔''

میں نے دانستہ خود کو پیچھے مڑ کر دیکھنے سے باز رکھا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے پتھر ہوجانے کا خوف لاحق تھا بلکہ اس لیے کہ یہ خاتون چند دن پہلے مجھ سے مچھلی کے کباب بنانے کی ترکیب پوچھ چکی تھیں اور فرما چکی تھیں کہ ''لگتا ہی نہیں تم نے اتنی لمبی بیماری کاٹی ہے۔ کیسا ہنر ہے آپ کے ہاتھ میں، کتنی ہمت ہے۔''

تیرے بندوں کے کتنے چہرے ہیں میرے مولا۔ میں نے حیرت اور مایوسی سے سوچا کہ کس کس چہرے پر طمانچہ رسید کیا جائے۔ لیکن مجھے یہ نہیں پتہ تھا کہ یہ ابتدا تھی۔ عذابِ قبر کے منکر نکیر کی طرح سوال نامہ اب شروع ہوگا۔

''ارے ہم نے سنا تھا کہ اتنی جوانی میں موذی مرض لگنا اکثر گناہوں کی سزا ہوتا ہے۔''

''بادلوں کو برسات کی علامات اور بیماری کو موت سمجھنا چاہیے۔''

''اب یہ بچے کیسے پالے گی؟ گھر کا کام کاج کر لیتی ہے؟''

کچھ گفتنی ناگفتنی اور بود نبود کے درمیان سوالیہ نشان چھوڑ کر آنکھوں اور ہاتھوں کے اشاروں سے بات کی جاتی۔ میں نے بہت عرصے کے بعد ابا جی سے ذکر کیا۔ حالانکہ میرا انداز بالکل عام سا تھا لیکن وہ بستر سے اٹھ کر میرے پاس کرسی پر آبیٹھے، ''میرے بچے۔۔۔ صبرِ ایوب کی مثال سن رکھی ہے ناں آپ نے؟ آزمائشیں بیماریاں اللہ ان لوگوں پر ڈالتا ہے جن کو وہ کسی بڑے مقصد کے لیے تیار کرتا ہے۔ آپ نے اس معاشرے کو دو بہترین انسان دینے ہیں۔ لوگوں کے ذہن اندھے کنوئیں جیسے ہوتے ہیں اور زبانیں دو دھاری درانتی۔ آپ نے اپنی حد سے تجاوز کرتی حساسیت کو خود لگام ڈالنی ہے۔ کیا یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان کے تبصروں اور آرا کو ذہن میں جگہ دی جائے؟ قدرت ان کے پھینکے تیروں کو انہی کی طرف لوٹا دیتی ہے۔

جانِ پدر، دل میں کسی غم کو جگہ نہ دو۔ اللہ کے خاص بندے مغموم نہیں ہوتے۔ ان کے دل رنج اور خوف سے آزاد ہوتے ہیں۔ اپنے بچوں کے لیے عزم اور ہمت کا ایک ستون بن کر رہنا ہے آپ کو۔ میں تو نہیں ہوں گا لیکن دنیا دیکھے گی کہ اللہ ان کو نافع انسان بنائے گا۔ آپ کو ان تمام آزمائشوں سے بچائے گا جو ناخلف اولاد کی وجہ سے دل سہتا ہے۔ بس سگِ آوارہ کے آوازوں توازوں پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں۔''

لیکن شاید ابھی ابا جی اور مجھے ہم دونوں کو علم نہیں تھا کہ یہ اس طعنہ و دشنام کا صرف آغاز تھا۔ ہم ابھی آگ کے دریا کے پہلے کنارے پر کھڑے صرف شعلوں کا رقص دیکھ رہے تھے۔ گھر کی آتش زدگی کے بعد جب مجھے ڈپریشن اور شدید خوف کے علاج کی وجہ سے ذہنی سکون اور خواب آور ادویات دی گئیں تو ابا جی نے ہی کہا کہ ہمارے معاشرے میں بیماریوں کا نام نہیں لیا جاتا۔ ان کو چھپایا جاتا ہے جس سے مریض ذہنی گھٹن اور جذباتی حبس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن آپ بلاخوف و خطر اس بارے میں بات کریں۔ لوگوں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس سے ہزاروں کو تقویت ملے گی اور وہ اپنی بیماری کو قبول کر کے اس سے لڑنا سیکھیں گے۔

تو بس یہی ہدایات تھیں جن کے تحت میں نے بلاجھجک اس بارے میں بات چیت کی اور لکھا۔ لیکن اب کے جو تیر آئے وہ زہر آلود تھے۔ بیماری کا مذاق اڑاتے طعنے تھے۔

''یہ خاتون نفسیاتی مریضہ ہے، نیم پاگل ہیں، ساری رات جاگتی ہیں، ادویات لے کر سوتی ہیں۔ گھر جل گیا تھا ان کا۔ ڈپریشن کی ماری ہیں۔ ان کو تو ملازمت کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔''

ان میں کچھ تبصرے دوست نما دشمنوں اور دشمن نما دوستوں کے تھے۔ ایک بزعمِ خود نہایت مقدس بی بی نے جو سر پر سکارف پہن کر خود کو رابعہ بصری سمجھنے لگی تھیں، فیسبک کے ذریعے لوگی اور پروفیسر سے رابطے میں رہ کر خوب زہر اگلا۔

میں نے ہمیشہ ڈینش سسٹم میں سرکاری نوکری کی اور پاکستانیوں کے روایتی اندازِ فکر اور سوچ کے دائرے سے دور رہی۔ میں کسی پرائیویٹ پاکستانی تنظیم کے ساتھ کام کرنے کے حق میں کبھی نہیں رہی۔ اس میں مسائل کی بھرمار ہوتی ہے۔ میں گومگو کے عالم میں تھی۔ نواز بھائی نے کہا باجی آپ نے چار سال لگا کر ڈگری لی ہے۔ اتنا تجربہ ہے۔ اس کو ہماری نئی نسل کے کام آنا چاہیے۔ ایجوکیشن کنسلٹنٹ کے طور پر کام ہے۔ اپنی مرضی کے اوقات رکھیں۔ نصاب خود ترتیب دیں۔ نفیس فاطمہ باجی کا بھی یہی حکم تھا۔ کہنے لگیں کہ آپ کے مزاج کے مطابق کام ہے۔ ضرور کریں۔ آپ کا دل بھی لگا رہے گا اور بچوں کو فائدہ بھی ہوگا۔

یہ ایک رنجیدہ حقیقت ہے کہ مجھے پاکستانی نظام کے ساتھ کام کرنا کبھی پسند نہیں رہا لیکن اس پروجیکٹ میں نئی نسل کے ساتھ کام کرنا تھا اور ڈینش اردو کے مرکزی نقطے کو مدِنظر رکھتے ہوئے تدریس کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔

درس و تدریس میرا پیشہ ہی نہیں شوق بھی ہے۔ ڈینش تعلیم کی تدریس کی طرح میں اردو کمپیوٹر پڑھانا بھی شروع کیا۔ یونیکوڈ اردو میں اپنا ترتیب دیا اور ڈینش مصوتے اور حروفِ علت کے موازنے سے اردو کورس ترتیب دیے۔ بڑی جماعتوں کے بچوں نے فوراً اردو کے بنیادی الفاظ بنانے اور پڑھنے شروع کر دیے۔ ڈینش ثقافت کے گیت، کھیل، تھیٹر کو اردو میں کر دیا۔ یومِ آزادی منایا۔

اس جنت میں بی بی پردہ نشین نے سانپ پھینکا۔ تنظیم کے صدر نواز بھائی کو ملک سے باہر جانا تھا۔ اب اس تنظیم کو نیا صدر منتخب کرنا تھا۔ نواز بھائی نے مجھے کہا کہ آپ اس بات پر سوچیں کیونکہ آپ اس عہدے کے تقاضے پورے کرتی ہیں۔ میں تو خیر صدارت ودارت کے حق میں نہیں تھی۔ میرا کام محض تدریس تھا۔ محترمہ نے خود کو صدر کے لیے پیش کیا۔ ان کا مزاج اور فطرت صدارت کی اہل نہیں تھی۔ والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ جھگڑنے کی پریکٹس کے جوہر دکھانے کا آغاز کیا۔ تنظیم کے ایک اور صاحب کے ساتھ مل کر باقاعدہ تخریب کا کام شروع کیا۔ ان کو ہم منتظم کہہ لیتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ لوگی کا نسائی پیکر تھیں اور انجام بھی اس جیسا ہی تھا۔ انھوں نے بیانات جاری کرنا شروع کیے، ''باجی

بیمار ہیں، نفسیاتی عارضے ہیں، وہ تو ملازمت ہی نہیں کرسکتیں، وہ علانیہ بتاتی ہیں کہ وہ پیدائشی مریض ہیں۔''

مجھے ترکی جانا تھا۔ عین اس وقت جب میں ڈاکٹر خلیل طوقار کے دفتر بیٹھی تھی، زوباریہ کا فون آیا، ''باجی مجھے آپ کا پرسن نمبر چاہیے۔''

''خیریت ہے؟'' مجھے اندازہ تو تھا کہ اس مومنہ نے جاہلانہ انداز کی کینہ پروری شروع کر رکھی ہے۔ شاید اس سلسلے میں یہ معلومات چاہیے ہوں گی۔ لیکن گفتگو کا موقع نہیں تھا۔ میں نے تفصیلات فراہم کردیں۔

میری واپسی پر مجھے زوباریہ اور نواز نے بتایا کہ وہ صاحبہ اور منتظم صاحب، دونوں بڑھ چڑھ کر آپ کی بیماری کے بارے میں بات کرتے ہوئے نفسیاتی مرض کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ ڈنمارک میں اس کی باقاعدہ سزا ہے۔ انھوں نے میری ساری تفصیلات سامنے رکھ کر دونوں کو نتائج سے باخبر کر دیا۔ اس کا انجام وہی ہوا جو بزدلوں کا ہوتا ہے۔ پرسن نمبر یا سیکورٹی نمبر سے کسی بھی فرد کے متعلق تمام تر معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ کسی بھی جرم میں ملوث ہونے، کسی نفسیاتی ذہنی عارضے میں مبتلا ہونے یا ایسی ہی تمام تر تفصیلات جن کی وجہ سے آپ ملازمت کے قابل نہیں ہوتے۔ اگر آپ یہ بلاوجہ پروپیگنڈہ یا کسی کو سماجی طور پر رسوا کرنے کے لیے کوئی مہم چلا رہے ہیں تو اس کی سزا قید بھی ہوسکتی ہے۔ یہی حربہ میں نے لوکی اور پروفیسر وینڈ یگو پر آزمایا جس سے وقتی افاقہ ہوا۔

ایسے لوگ جنھیں والدین کی تکریم کے آداب نہیں آتے وہ حجاب اور عبایہ کے زعمِ پارسائی میں زیبِ داستان کے لیے بڑھا چڑھا کر کہانیاں گھڑنے لگے۔ سنی سنائی پر میں یقین نہیں کرتی۔ اور بقول سعدی جو دوست آپ کی کمر کے پیچھے کیا گیا برا تبصرہ آپ تک پہنچاتے رہتے ہیں وہ ان تیروں کو جو راستے میں گر گئے تھے، اٹھا کر آپ کے دل میں پیوست کرتے ہیں۔ لیکن جب براہِ راست میرے ساتھ بات کی گئی تو میں نے ایجوکیشن کنسلٹنٹ کا عہدہ ان کے منہ پر مارا۔ اپنا تحریر کردہ قاعدہ ان سے لیا اور اردو سکھانے کا نصاب واپس اٹھایا اور چند لمحوں میں ملازمت چھوڑ دی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ دین کے ریاکار دعوے دار جو اپنے حجاب اور باریش چہروں، دکھاوے کے سجدوں اور منافقت کی دینداری کا اشتہار دیتے ہیں قابلِ اعتبار ہی نہیں ہوتے۔ کتنے سال میں نے باقاعدہ ان سب سے عمومی طور پر نفرت کی اور بالخصوص روایتی انگشت نمائی کرنے والی پاکستانی ذہنیت کے لوگوں سے مکمل قطع تعلق اختیار کیا۔

لیکن میں یہ سطور کیوں لکھ رہی ہوں؟ مجھے یہاں ان خوبصورت اور عطر بیز اذہان کا تذکرہ کرنا چاہیے جن کو میں جانتی تک نہیں تھی اور جو میری غیر حاضری میں اس خاتون اور ان جیسے دوسرے ریاکار زاہدوں کے لیے شمشیرِ بے نیام بنے۔

محمد نواز بھائی اور زوبار یہ نواز اور ان کے والدین مجھے اپنے دوستوں کی طرح حاصل ہوئے جن پر آنکھیں بند کر کے یقین کیا جاسکتا تھا۔ یہ وہ خاندان تھا جس نے نہ صرف پاکستانی بچوں کے لیے اردو جماعت کا قیام یقینی بنایا بلکہ اس کو جاری رکھنے کے لیے مسلسل کوششیں کیں۔ ان کے والدین کے ساتھ بیٹھ کر ٹھیٹھ پنجابی میں گفتگو کرتے اور ہنسی کے فوارے اچھالتے ہوئے مجھے کبھی امی ابا جی کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ ایسے ہی غیر معمولی دوستوں کی ہمراہی نے مجھے راستے میں رکنے نہیں دیا۔ میری مٹھیوں میں فتحِ مبین کے جھلملاتے موتی تھمائے رکھے۔

تیر و تفنگ کے اس باب کا اختتام میں باجی نفیس فاطمہ اور نواز فیملی کے نام کرتی ہوں جن کی یاد کہر آلود موسم میں اچانک دمکنے والی کرن جیسی ہے۔

••

وہ التفات کہ الفاظ بے زباں ٹھہرے

امریکہ میں مقیم ہمارے بے حد عزیز دیرینہ محترم جناب منور احمد خالد جب کوئی تراشہ پڑھتے تو فوراً حکم کرتے ''صدف بی بی! یہ آپ کو لکھنا ہوگا۔ نہ اب ایسے بزرگ جو من وتو سے آزاد ہوکر اولاد کو انسان بنائیں۔ نہ اب ایسی اولادیں جو یہ یاد رکھیں کہ وہ کسی جڑ سے اٹھنے والے درخت اور شاخیں ہیں۔ آپ کے والدین کا آپ پر حق ہے کہ آپ ان پر لکھیں اور پھر ایسے والد جو صدیوں پرانی روایات کو کانچ کی چوڑیوں کی طرح توڑ کر کوڑے دان میں ڈال دیں۔ اولاد کو نئے بال و پر اور نئی اڑانوں کا عزم دے دیں۔ مہد سے لحد تک حصول علم کا درس دے کر ڈولی سے جنازے تک زندگی محدود نہ کریں۔''

ابا جی کا سایہ مجھ پر دراز ہوتا رہا۔ اگر میرا نام کہیں پر معتبر ہوا تو وہ ابا جی ہی کے نام سے پہچانا گیا۔ امریکہ کے دورے کے دوران جناب منور احمد خالد اور ڈاکٹر عبداللہ سے ملاقات ہوئی۔ اگرچہ ابتدا مشاعرہ پڑھنے سے ہوئی لیکن ڈاکٹر عبداللہ نے میری نثر بہت شوق سے پڑھی۔ برگد کے لیے میں جو بھی منتشر، شکستہ اور بے ربط اقساط لکھتی اسے ''ادب کی چاشنی'' کا نام دیتے اور کمال مہربانی سے مجھے قدم بڑھانے کا پیغام دیتے رہتے۔ میں اس بابِ تشکر کا آغاز ان ہی دو ناموں سے کرنا چاہتی ہوں جو میری ادبی زندگی کے آغاز سے تا دمِ تحریر میرے ہمراہ ہیں۔

ڈاکٹر عبداللہ اور ان کی اہلیہ سرجن ڈاکٹر صوفیہ عبداللہ جنھوں نے میری پہلی کتاب کی رسمِ اجراء پر ہمیں شرفِ میزبانی بخشا، ان کا خواتین کی صحت، زچگی ور امریکہ جیسے ملک میں رہ کر جسمانی، ذہنی اور جذباتی تشدد کا شکار بننے پر ایک اہم پروگرام ٹی وی لنک نے ریکارڈ کیا۔

ڈاکٹر صوفیہ بے انتہا روشن خیال، وضع دار، اخلاص کی مٹی گوندھ کر ان کی تخلیق کی گئی، ان

کی محبت میرے بچوں پر بھی نچھاور ہوئی۔ رکھ رکھاؤ اور شاہانہ انداز ان کا خاصہ ہے۔ میں جب بھی امریکہ گئی ان کی رہائش گاہ پر بھی قیام رہا۔آج میں وہ میری زندگی میں شامل ایک روشن چہرہ ہیں۔

2014ء انڈیا کانفرنس میں اکیسویں صدی میں اردو کے حوالے سے مجھے مقالہ تحریر کرنا تھا۔ اردو کمپیوٹر اور کن فیکون کی طرح دما دم بدلتی تیز رفتار انٹرنیٹ کی دنیا میں اردو زبان کی دستیابی، ترقی اور ترویج کے لیے کمپیوٹر اور دیگر ڈیجیٹل گیجٹس کا استعمال اور زبانِ اردو کے مستقبل پر لکھنے کے لیے مجھے اردو کارپس، اردو او سی آر اور دوسری تکنیکی معلومات کی ضرورت تھی۔ ان دنوں میں برمنگھم میں قیام پذیر تھی۔ ایک دن ایک کتب خانے کی خاک چھانتے ہوئے مجھے مطلوبہ مضامین انگریزی میں مل ہی گئے۔ ان میں حافظ صفوان محمد چوہان کا مضمون بھی شامل تھا اور ای میل بھی۔ میں نے فوراً انھیں ای میل بھیجی اور مشین ریڈ ایبل اردو اور اردو کارپس وغیرہ کے حوالے سے معلومات کی درخواست کی۔ یہ ہمارے رابطے کی ابتدا تھی۔ پھر فیسبک کے کمالات میں یہ بھی شامل ہے کہ تحریر آپ کا تعارف بن جاتی ہے۔ حافظ صفوان کی رہنمائی سے میرا مضمون کانفرنس کے بہترین مقالوں میں سے ایک گنا گیا۔ پھر انھوں نے میری کتاب ''زبانِ یارِمن دانش'' کے لیے جو دلچسپی دکھائی اور حوصلہ افزائی کی اور مضامین کو پڑھنے اور سنوارنے کی تمام تر ذمہ داریاں سنبھال کر مجھے ممنون کیا۔ احسان مندی کا یہ جذبہ اچانک ہی ایک نظم کا قالب اختیار کر گیا۔ تخلیق کا یہ لمحہ صرف ایک نظم گو کو ہی نہیں قصہ گو کو بھی اظہارِ تشکر پر آمادہ کرتا رہا۔

ایک نظم... صفوان محمد چوہان کے نام...

اجنبی سرزمین کے کتب خانے میں
''دی بینک آف انگلش''
میں بین اللسانی تعلق کی تحقیق میں
اور زبان کے بڑے مال خانے میں
میک ہارڈی کی سبھی کاوشوں کے قدم۔
اور بینک آف اردو کی تجویز بھی
ڈھونڈتے کھوجتے یک بہ یک
اک نام کی روشنی کا دریچہ کھلا میری تحقیق میں
اور کہنے کو یہ تو محض اک مقالا

تخیل بھری یہ صدی اپنی دہلیز پر
آج رکھے ہیں فرمانِ کُن فیکون
اردو کے سارے مشینی شناسائی پر مشتمل
یہ متون اور ان کی جمع بندی بھی
اردو کارپس اور معاصر نظائر
زباں کے ذخیرے کے اسرار تک
اور کُن فیکوں کا طلسم
از صدا تا بیاں
یا شبیہہ کو بدل کر نئے متن تک
علم ہی علم ہے اور اس علم کی کوئی حد ہی نہیں ہیں
اک نام کی روشنی
ایک محقق معلم سے اک دیر تک
مرحلے طے ہوئے مان بھی بڑھ گیا
اور صدف صاحبہ سے میں آپا ہوئی
دانش آموز میرے! سلامت رہو

(صدف مرزا)

تحریر اور تحقیق کے اس سفر نے مجھے اعزاز دیا کہ حافظ صفوان نہ صرف مجھے آپا کہنے لگے بلکہ مجھے ملنے سرائے عالمگیر تشریف لائے۔ ابھی پہلی کتاب کی اشاعت ہوئی ہی تھی کہ ڈینش شاعرات پر کام کرنے کا پیہم اصرار کرنے لگے، بلکہ اس کے خاکے اور مشمولات کے امکانات کی ابتدائی تجاویز بھی دیں۔ اسی دوران برگد کا مسودہ سب سے پہلے صفوان لالہ ہی نے پڑھا، مکمل خام حالت میں، اور پھر جو بے دھڑک تبصرے کیے اس نے میرے ذہن سے یہ خیال نکال پھینکا کہ اس ذاتی زندگی سے متعلق کتاب شائع نہیں ہونی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ حصولِ علم کی جستجو نے ادبی دنیا میں مجھے ایک ایسا بھائی عطا کیا جو استاد بھی ہے، سرزنش کرنے والا بزرگ بننے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگاتا، اور جسے مسلسل فکر دامنگیر رہتی ہے کہ کہیں آپا سفر میں پڑاؤ نہ ڈال لیں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ آپا آپ ذرا کی ذرا ٹھیکی ضرور لے لیا کریں لیکن پڑاؤ کہیں نہیں ڈالنا۔ میری باقی کتب کی

طرح اس کتاب پر آخری نظرِ ثانی بھی صفوان لالہ نے کی ہے۔ اس کتاب سے جذباتی وابستگی کی وجہ سے کئی مقاماتِ آہ وفغاں آئے جن سے جانبر ہونے کے لیے مجھے صفوان لالہ کی حوصلہ افزائی اور تاکید وتائید حاصل رہی۔ تین برس پہلے کراچی گئی تو صفوان لالہ کی خصوصی اعتنا سے یوسفی صاحب قبلہ سے شرفِ ملاقات اور نیاز پایا۔ یوسفی صاحب ہی نے میری کتاب کا نام ''زبانِ یارِ من دانش'' رکھا۔

••

جنہاں دکھاں چہ دلبر راضی اوہنا توں سکھ وارے
دکھ قبول محمد بخشا تے راضی رہن پیارے

اپنے پیارے اور ان سے ملنے والی بے لوث اپنائیت کبھی سمجھ نہ آنے والے جذبے ہیں۔ یہ خون بن کر آنکھوں سے بہتے ہیں اور درد بن کر دل کی بند مٹھی میں دھڑکتے رہتے ہیں۔ ان پیاروں سے نسبتوں اور قربتوں کے شیریں ثمر تاحیات ملتے ہیں۔ سات سمندر پار، دیارِ غیر میں اچانک ان کے تذکرے سے سارے فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ اجنبیت ایک لحظے میں انسیت میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ لوگ قریبِ دل وجاں ہوجاتے ہیں جو صرف چند ثانیے پہلے آپ سے متعارف ہوئے ہوتے ہیں۔

خام ہیں صدق سے خالی ہوں جو خوں کے رشتے
اور دائم ہیں محبت کے جنوں کے رشتے

ایسے ہی ایک 'جنونی' رشتے میں میرے پیاروں کے تذکرے نے مجھے اور ڈاکٹر ندیم کو باندھا۔ یہ دسمبر کی ایک برفانی رات کا ذکر ہے۔ اوسلو کی یخ بستہ ہوائیں شعر وسخن کی حدت سے نالاں ہو رہی تھیں۔ چند قریبی دوستوں کے ساتھ ہم ایک عشایئے پر مدعو تھے۔ طویل میز کے ایک کونے پر ڈاکٹر ندیم بیٹھے تھے۔ ہمارا تعارف ہوا تو بہت اشتیاق سے پوچھنے لگے، ''آپ جہلم سے ہیں؟'' اثبات میں جواب پا کر تعارف مزید بڑھا۔ پھر فلاں اور فلاں کا تذکرہ ہوا۔ ''آپ مرزا فیملی کو جانتی ہیں؟'' ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

''جی ہاں۔۔۔ بالکل جانتی ہوں۔''

''مشیت الرحمان مرزا کو؟''

''جی ہاں، بہت اچھی طرح۔''

''ڈاکٹر انعام مرزا؟''

''جی ہاں، ان سے بھی واقف ہوں۔'' میں نے بے حد آرام سے جواب دیا۔

''کیسے جانتی ہیں؟'' پرجوش لہجہ متجسس ہوا۔

''میرے بھائی ہیں'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

ان تین لفظوں کے جملے میں نجانے کیا پوشیدہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ سے چھری کانٹا گر گیا اور یقیناً وہ غیر ارادی طور پر اٹھ کر کھڑے ہوگئے، ''واقعی، آپ کے اپنے بھائی؟'' انھوں نے پوچھا۔

مجھے چند لمحوں کو ان کی اس اصطلاح کی سمجھ نہیں آئی، ''پرائے بھائی بھی ہوتے ہیں؟''

''نہیں، میرا مطلب ہے بعض اوقات قریبی لوگوں کو بھی ہم بہن بھائی کہہ کر پکارتے ہیں'' انھوں نے وضاحت کی۔

میرا جی چاہا کہ ان کو اپنی ماں کا زریں قول سناؤں جو انھوں نے ایک گھر سے بھاگی بچی کو کہا، جس نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر خفیہ نکاح کرلیا تھا۔ اس کے والدین اسے قتل کرنے کے درپے تھے۔ حسبِ معمول ابا جی پنچایت میں افہام و تفہیم کی کوشش کر رہے تھے اور اس بچی کو ہمارے گھر مہینہ بھر چھپایا گیا۔ میں ان دنوں شاید آٹھویں جماعت میں تھی لیکن آج بھی ان کی باتیں میرے کانوں میں ویسے ہی گونجتی ہیں، ''باپ وہ ہوتا ہے جس کا آپ خون ہیں۔ بھائی وہ ہوتا ہے جو آپ کا ماں جایا ہے۔ بیٹا وہ جس نے آپ کے خون سے زندگی پائی۔ اور زندگی کا ساتھی وہ جو دنیا بھر کے سامنے آپ کو اپنی عزت بنا کر لے جاتا ہے۔ باقی سب کوڑ، جھوٹ اور ہوس۔''

ڈاکٹر صاحب کا تجسس حیرت میں اور حیرت مسرت میں بدل گئی۔ بس چند لمحوں میں ساری اجنبیت سردی میں لہجوں کی بھاپ کی طرح ہوا میں تحلیل ہوگئی۔ انھوں نے مجھے ابا جی کی اور تایا جان کی باتیں سنائیں۔ لاہور تعلیم کے دوران بھائی کے ساتھ اپنی دوستی کی تاریخ دوہرائی۔ کیسے خوبصورت لمحے اور ان لمحوں میں جنون کے رشتے جنھوں نے اوسلو کو میرا 'پیکہ پنڈ' بنا دیا۔

مجھے میرے ان بزرگوں سے نسبت کے صدقے اتنا مان دیا کہ میں جو ڈھنگ کے چند الفاظ بھی نہیں لکھ سکتی، سکینڈے نیویا کی بڑی شاعرہ، ادیبہ، صحافی اور محقق شمار ہونے لگی۔ ڈاکٹر سید ندیم حسین ان ذہین و فطین اور محبِ وطن افراد میں شامل ہیں جو کسی بھی ملک و قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ اپنے فنِ مسیحائی میں یدِ طولیٰ، انسانیت سے محبت کو ایمان کا درجہ دینے والے مسیحا اور خوبصورت الفاظ کے گلدستے کو نظموں کی صورت پیش کرنے والے سید ندیم حسین میرے لیے ان سب رشتوں کا مان ہیں جو

میرے بزرگوں کی نسبت سے ربی انعامات کی صورت مجھے ملے، جو دیارِ غیر میں اپنے وطن کے حوالے سے ایک روشن مینار ہیں، ایک ایسا غیر رسمی سفیر جو مغربی میڈیا کی رائے بدلنے میں کامیاب ہے۔

لیکن ٹھہریے، یہ میرا ان سے پہلا رسمی تعارف تھا۔ میں نے پاکستان آکر بڑے بھائی جان کو بتایا۔ سب کو بے حد خوشی ہوئی کہ ہمارے وطن اور شہر کا نام بلند ہو رہا ہے لیکن بھائی جان تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولے، ''آپ کو یاد نہیں گھر میں ان کا ذکر ہوتا تھا؟''

''کب؟'' کیونکہ میری یادداشت اب اتنی کہنہ سالی کا شکار بھی نہیں تھی کہ گھر میں بطور خاص ان کا تذکرہ ہوتا اور میں بھول جاتی۔

''ہاں ۔۔۔ ان دنوں پریشانی ہی بہت تھی'' بھائی جان نے کہا، ''لیکن ۔۔ خیر آپ کو یاد ہے جب امی جی نے ہمیں چھوڑا تھا تو ان دنوں شہر میں ایک اور حادثاتی موت ہوئی تھی، ایک نوجوان بچی کی، جو کہیں باہر سے چھٹیاں گزارنے آئی تھی؟'' بھائی جان نے یاد دلایا۔

''جی''، مجھے مبہم سی یاد آئی، ''ان دنوں میری طبیعت بہت خراب تھی۔'' ابھی تو ابا جی کو بچھڑے چند مہینے گزرے تھے کہ امی جی نے بھی واپسی کی ٹھان لی۔ میں بچوں کو لے کر جہاز بدلتے ہوئے نجانے کن مشکلوں سے پاکستان پہنچی تھی۔ امی جی کی بات یاد آتی رہی کہ تمھیں تو اونٹ پر بیٹھے کتا کاٹ لیتا ہے۔ ڈنمارک سے فلائٹ نہ ملنے کی صورت میں ہم تینوں نے انگلینڈ سے فلائٹ لینی تھی۔ بورڈنگ پاس ہاتھ میں لیے ہم تینوں ویٹنگ روم میں بیٹھے تھے کہ اچانک اطلاع ملی کہ آئل ٹینکر جہاز کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے پر سے ٹکرا گیا ہے اور اب جہاز پرواز کے قابل نہیں رہا۔ سب مسافر گھروں کو جائیں۔ پاکستان سے اگلا جہاز آئے گا تو پھر اطلاع دی جائے گی۔ مجھے نہیں یاد کہ اگلے تین دن میں نے کیسے گزارے۔ لیکن امی جی، ابا جی کی طرح میرا انتظار نہ کرسکیں۔ میرا ذہن جولائی کے جلتے جھلستے ان دنوں کو اور اس سفر کو دوہرانا نہیں چاہتا۔ ہم تینوں رات بھر جہاز میں جاگنے والے ستاروں کی طرح ایک تکون کی صورت بیٹھے رہے۔

ان ہی ظالم اور طویل دنوں میں اس چھوٹے سے شہر کو ایک دلدوز خبر نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یورپ سے آئی ایک بچی اپنی کزن کے ساتھ جہلم کے دریا میں ڈوب گئی تھی۔ گھر میں مسلسل تذکرہ ہو رہا تھا کہ اس پھول سی بچی کو موت اٹھا کر لے آئی۔ کئی دن گھر سے خواتین تعزیت کے لیے جاتی رہی تھیں اور بے حد ملول ہو کر آتیں۔ دونوں بچیاں دریا کی سیر کو گئی تھیں۔ پتہ نہیں وہ معصوم کھیل ہی کھیل میں دریا کی شان میں کیا گستاخی کر گئیں۔ جنگل کی سیر کو نکلے اکلوتے شہزادے کی طرح بھول کر کسی

منہ زور عفریت کے علاقے میں قدم رکھ دیا جس نے اسے اندھے کنوئیں میں ڈال دیا۔ جانے دریا کو ان کی شرارتیں اور چہلیں اتنی ناگوار کیوں گزریں۔ ایسا کیا کر دیا ان چہچہاتی بلبلوں نے جو غیظ و غضب سے بپھری لہریں ان کو ساتھ ہی لے گئیں۔ لیکن شہزادے کو تو ایک نیک دل پری نے آ کر تاریکی کی دنیا سے کھوج نکالا اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔ ان بچیوں کو کسی نے اس خونی بہاؤ کے ظالم پنجوں سے نہ چھڑایا۔ انھیں کسی کی دلدوز صدائیں بھی واپس نہ لاسکیں، نہ ماتھے پر کوئی طلسمی بوسہ ان کی سرد سانسوں کو بحال کرسکا۔ بے قرار مامتا کی آہ و زاری اور صبر و استقامت کے مجسمے باپ کی سمندروں سے گہری شفقت بھی واپس نہ لاسکی۔ زندگی دینے والا جب خود ہی زندگی واپس لیتا ہے تو اس کی سنت ہے کہ وہ پھر خود بھی اسے واپس نہیں لوٹاتا۔ یہی ازل سے اس کا طریق ہے۔

مجھے ابا جی کی ایک بات بے طرح یاد آئی حالانکہ میں نے اپنی زندگی میں ان سے زیادہ صبر وتحمل کا پیکر کبھی نہیں دیکھا جس کی زبان سوتے جاگتے کلماتِ صبر سے اور شکرِ الٰہی سے تر ہو۔ ایک ملنے والی خاتون کے والد وفات پاگئے۔ ان سے جب بات ہوتی وہ بہت آنسو بہاتیں کہ میرے بے چارے بھائیوں نے ابو کو بدل بدل کے کاندھا دیا۔ کہنے لگیں ابا جی سے کہنا دعا کریں۔ ابا جی کا فون آیا تو میں نے وعدے کے مطابق ان سے تذکرہ کیا اور دعا کا کہا۔ ''ضرور کروں گا'' وہ بولے، پھر یک لحہ توقف کے بعد کہنے لگے، ''بیٹا ان سے کہنا شکر کرو تمھارے بھائیوں کے کندھے پر باپ کا آخری سفر تھا۔ خوش نصیب تھے وہ۔ شکر کرو تمھارے باپ کے بوڑھے جھکے ہوئے کاندھے پر جوان بیٹا سوار آخری آرام گاہ کو نہیں گیا۔ صبر کا مقام ہے اور شکر واجب ہے۔''

بھائی جان نے مجھے تفصیل سے ساری بات بتائی۔ ''اللہ الصمد۔ بے نیاز ہے وہ ذات۔ کیہہ کردا، کیہہ کردا دلبر کیہہ کردا۔ وہ صابر باپ کوئی اور نہیں، ہمارے ڈاکٹر سید ندیم حسین تھے۔ درد انسان کی ذات کو ایک گداز عطا کر دیتا ہے۔ یہ سوز اس کے قلم میں اور کلام میں روشنی بھر دیتا ہے جس سے دوسرے بھی راستہ دیکھ سکتے ہیں۔''

میری نظروں کے سامنے ندیم بھائی کا مسکراتا بے ریا چہرہ گھومنے لگا۔ مسکراتے چہرے والوں کی آنکھوں میں جو گداز اور لہجے میں جو سوز ہوتا ہے اسے صرف شکستہ دل محسوس کر سکتے ہیں۔ کتنے دن تو میرا ذہن مفلوج رہا لیکن بالآخر اس احساس کو الفاظ کی پوشاک مل ہی گئی۔ میں نے ایک مختصر تحریر لکھ کر فیسبک پر لگائی جس کے جواب میں ڈاکٹر سید ندیم حسین نے ایک تبصرہ تحریر کیا۔ میں اسے من وعن یہاں لگانا اپنی خوش نصیبی سمجھتی ہوں:

''نہایت قابلِ احترام صدف جی!

میں نے آپ کی یہ تحریر پڑھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میں اتنی عزت افزائی اور اتنا مان دینے کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ میرے پاس نہ تو اتنے خوبصورت الفاظ ہیں اور نہ مجھے بیان پہ وہ عبور حاصل ہے جس کی مالک آپ ہیں۔ آپ کی یہ تحریر اس خلوص اور اس محبت کا اظہار ہے جو آپ کی تربیت میں شامل ہے۔ میں ان خوش نصیبوں میں شامل ہوں جو اس خلوص سے مستفید ہوتا رہا ہوں اور ہوتا ہوں۔ آپ کی اس تحریر سے یادوں کا ایک دریچہ کھل گیا۔ بچپن سے لے کے اب تک یادوں کی لمبی قطار ہے۔ کس کس وقت کا ذکر کروں۔ آپ کے والد صاحب سے جب بھی ملاقات ہوتی، نہایت شفقت سے ملتے اور سب سے پہلے میرے نانا جی کا پوچھتے جن سے ان کی بہت اچھی دوستی تھی۔ مجھے آج بھی ان کی وہ باتیں یاد ہیں جو وہ نانا جی اور اپنی دوستی کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سب کو غریقِ رحمت کرے، کیسے کیسے نگینے لوگ تھے۔ نہ کوئی لالچ نہ غرض، صرف خلوص اور پیار ہی پیار۔ سوچتا ہوں کہ کہاں گئیں ہماری وہ قدریں۔ پھر آپ کے تایا جان غلام محی الدین صاحب انتہائی شفیق پیار کرنے والے اور شیریں گفتار شخص ہیں۔ وہ جب باتیں کر رہے ہوں تو جی چاہتا ہے آدمی بیٹھ کے سنتا ہی رہے۔ مجھے ان کے حوالے سے ایک واقعہ یاد ہے جو شاید میں نے پہلے بھی سنایا ہو۔ ہوا یوں کہ میں میٹرک میں پڑھتا تھا۔ ایک دن سائیکل پہ جا رہا تھا کہ ایک بزرگ شخصیت سامنے آ گئی۔ ان کا منہ دوسری طرف تھا اس لیے میں پہچان نہیں پایا۔ میں نے سائیکل کی گھنٹی بجائی اور زور سے آواز لگائی۔ ''بزرگو ذرا دیکھ کے۔'' انکل غلام محی الدین صاحب نے پیچھے دیکھا اور مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے انھیں پہچان لیا اور رک گیا اور اندر ہی اندر ڈرنے لگا کہ اب ڈانٹ پڑے گی۔ انھوں نے بڑی شفقت سے میرے منہ پہ ہاتھ پھیرا اور کہنے لگے...

''بیٹا جی مجھے اللہ تعالیٰ نے دو آنکھیں دے رکھی ہیں اور وہ میرے ماتھے پہ لگی ہوئی ہیں لیکن میں ان سے پیچھے نہیں دیکھ سکتا۔ بیٹا جی آپ کا مطالبہ غلط ہے۔'' اس بات کو تیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے لیکن میں اب بھی اپنے چہرے پہ ان کے ہاتھ کا لمس محسوس کرتا ہوں۔

زیادہ کیا بیان کروں، ان دونوں بھائیوں کی مثال برگد کے اس درخت جیسی ہے جس کی چھاؤں میں ہر کوئی آ کے بیٹھ جاتا ہے اور برگد ہر تعصب سے بالاتر اسے چھاؤں دیتا ہے۔ یہی خصوصیات آج ان کی اولاد میں بھی ہیں۔ انعام صاحب، احتشام صاحب، مشیت صاحب، آپ اور اپنا عرفان، سب آج محبت اور خلوص کی ان روایات کے امین ہیں۔ یہ صرف میں ہی نہیں کہتا

ہمارے علاقے کا ہر آدمی کہتا ہے۔ میں اپنے آپ کو نہایت خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ آپ سب میرے دوست ہیں۔ جب میرے ساتھ حادثہ ہوا تو میرے یہ سارے بھائی میری دلجوئی کرنے اور میرا حوصلہ بڑھانے بکثرت میرے پاس آتے تھے۔ اگر اتنے بڑے حادثے کے بعد میں اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو سکا ہوں تو یہ آپ جیسے دوستوں ہی کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

یہ جس مان کا آپ ذکر کرتی ہیں یہ مجھ پہ میرے ان بھائیوں اور بزرگوں کا قرض ہے جو آپ سود سمیت واپس لیتی ہیں۔ بلکہ اب تو آپ نے بھی اس میں اپنا حصہ ڈال دیا ہے۔ اوسلو واقعی آپ کا پیکہ ہے۔ یہاں آپ کا پیکہ گھر ہے۔ جب بھی تشریف لائیں۔ یو آر موسٹ ویلکم۔''

اللہ جب مجھے نوازنے پر آیا تو ''چوپڑیاں تے نالے دو دو''، ندیم بھائی کے ساتھ ان کے ہمزاد ادریس بھائی بھی مل گئے۔ بہترین شاعر، بے مثل نقیب و ناظم اور بااصول دوست جو ہر سرد و گرم میں آپ کے شانہ بشانہ نہیں چلتا بلکہ دو قدم آگے چل کر رہنمائی بھی کرتا ہے۔ یہ ادریس بھائی کا کمال ہے کہ جب بھی کوپن ہیگن کے ادبی مہمان رات بھر کروز کے سفر کے ذریعے صبح اوسلو پہنچتے ہیں تو بندرگاہ پر ادریس بھائی خندہ پیشانی سے منتظر ملتے ہیں۔ ندیم بھائی کو چھٹی نہ ملنے کی وجہ سے اکثر لنچ ان کے ہسپتال ہی میں جا کر کیا جاتا ہے۔ میں اکثر اس غیر مشروط بے لوث شفقت اور مان کا انعام پا کر سوچتی ہوں کہ آخر انسان زندگی سے مزید کیا طلب کر سکتا ہے؟

••

اردو زبان کا خلیلِ صادق، فارسی زبان کا عاشق اور اپنی ترکی زبان کی وسعتوں میں اضافے کا متمنی ہمارا ترک لالہ، جو دنیا کی نظر میں پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوق آر ہے۔ اردو کانفرنسوں کے مندوبین کی صورت ملنے والے اور پھر بعد ازاں ایک شفیق بھائی کی طرح نسبتوں کا اعزاز بخشنے والے خلیل طوق آر جیسے صرف تحصیلِ علم اور ترسیلِ علم کی مٹی سے تخلیق ہوئے ہیں۔ عام طور پر ہمارے دانشوروں کی کلاہ میں جوں جوں علم و ادب کے بلوں میں اضافہ ہوتا ہے، گردن میں پڑے سریے کی سختائی بھی بڑھنے لگتی ہے۔ لیکن ہمارے ترک لالہ کی فراخ پیشانی گویا خندہ پیشانی ہے۔ متبسم معصوم اندازِ گفتگو اور بے تکلف برابری کی سطح پر سادہ و پرکار دوستانہ گفتگو مخاطب کا دل جیت لیتی ہے۔ ہماری ملاقاتیں کانفرنسوں اور یونیورسٹیوں میں ہی ہوتی رہیں۔ پھر استنبول یونیورسٹی میں جا کر باضابطہ انٹرویو کرنے کا موقع ملا۔ خلیل بھائی کی شریکِ حیات ثمینہ پاکستانی ہیں لہٰذا ہم نے

انھیں پاکستان کا داماد قرار دیا۔

سوشل میڈیا کے ذریعے علمی و ادبی رابطہ قائم رکھا اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ ہم دونوں کو ہماری ٹی وی لنک ٹیم نے ''پاک ترک بہن بھائی'' پکارنا شروع کر دیا۔ خلیل طوق آر ہمارے ترک لالہ ہوگئے۔ ڈنمارک میں علامہ اقبال کا بین الاقوامی سیمنار منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا تو ہم نے فوراً خلیل طوق آر کو دعوت نامہ بھیجا۔ ترکی میں اقبال شناسی کی بنیاد ڈالنے اور پھر عزمِ مصمم کے ساتھ تراجم کے راستے سے اقبال فہمی کی عمارت تعمیر کرنے کا یہ دوسرا سہرا بھی پاکستان کے داماد ہی کے سر ہے۔

ہمیں شرفِ میزبانی حاصل ہوا۔ لندن سے رضا علی عابدی اور لارڈ شوکت صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ جرمنی سے ہائڈل برگ یونیورسٹی کی ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ ذاتی وجوہ پر نہ آسکیں۔ سو یہ اصحابِ ثلاثہ ہی ہمارے مہمانان تھے۔ خلیل طوق آر سب سے آخر میں آئے اور آ کر سو گئے۔ جب ہم اپنی بیٹی کے ہمراہ انھیں ملنے گئے تو سوئی ہوئی آنکھوں میں ناراضگی بھر کر کہنے لگے، ''دیکھیں صدف، رضا علی عابدی نے میرے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے۔''

''میں نے۔۔؟'' عابدی صاحب نے سینے پر ہاتھ رکھ کر مصنوعی حیرت سے پوچھا، ''میں نے کیا کر دیا۔ میں تو سب کو صبح چائے بنا کر دیتا ہوں۔''

''میں تو خود ہی چائے بنا سکتا ہوں'' شوکت صاحب مدافعانہ انداز میں بولے۔

خلیل طوق آر کی ناراضگی میں کوئی کمی نہ آئی۔ معصوم بچوں کی طرح منہ پھلائے مندھی مندھی آنکھوں سے عابدی صاحب کو گھورتے رہے۔

''کیا ہوگیا بھئی؟ ہمارے بھائی کو کیا کہا آپ نے عابدی صاحب؟'' ہم نے امن کی فاختہ بننے کی کوشش کی۔

''عابدی صاحب ہر وقت گانے گاتے رہتے ہیں'' ترک لالہ تنک کر بولے، ''میں سو رہا تھا تو میرے کمرے کے باہر آ کر گانا گانے لگے۔ میں سمجھا اذان ہو رہی ہے۔ پھر میں نے سوچا یہاں اذان کہاں سے، پھر یہ تو اذان کا وقت بھی نہیں تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد مجھے سمجھ آئی کہ عابدی صاحب گانے گا رہے تھے۔'' ہمارے داماد صاحب نے شکایت جاری رکھی۔ ہماری صاحبزادی جو چپ کر کے ساری باتیں سن رہی تھی، کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

''دیکھو اینجل!'' عابدی صاحب نے عالیہ کو مخاطب کیا، ''میں تو سب کو اینٹرٹین کرتا رہتا ہوں اور چائے بنا کر بھی دیتا ہوں، پھر بھی بہن کے آتے ہی شکایات کا دفتر کھول دیا۔''

••

شعر و سخن کی دنیا میں خواتین کے لیے ہزاروں مسائل سہی، لیکن میرے بچوں کے لیے ان رابطوں نے ایک مثبت اور خوشگوار روزن کھلا رکھا۔ ان کو ممتاز شعراء اور ادباء سے ملنے کے مواقع ملے اور وہ اپنی زبان اور ثقافت کے ساتھ ایک مضبوط ادبی اور تہذیبی ڈوری میں بندھے رہے۔ مجھے یہ بھی اعزاز حاصل ہوا کہ میری بیٹی کی شادی پر رضا علی عابدی بطورِ خاص لندن تشریف لائے۔ وہ عالیہ کو اپنی پہلی ملاقات سے ہی ''اینجل'' کہہ کر پکارتے ہیں اور ان دونوں کے مکالموں سے میں بہت محفوظ ہوئی۔ دیارِ غیر میں رہ کر بھی بچوں کو جتنا ادبی ماحول اور زبان سیکھنے کے مواقع ملے وہ پاکستان رہ کر بھی میسر نہیں آتے۔

رضا علی عابدی، جن سے میں نے گفتگو میں اختصار اور درست تلفظ سیکھنے کی کوشش کی، ان کی روایات کی پاسداری اور اقدار کے احترام سے معمور ہمراہی کا اعزاز میرے ادبی سفر میں ساتھ رہا جس میں ایک خاموش حوصلہ افزائی کی قندیل مسلسل روشن رہتی ہے جسے الفاظ کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔

ڈنمارک تشریف لائے ان کے عشاق ان کی تاک میں رہتے۔ نشست کے بعد خواتین بچے تصاویر بنانے پر اصرار کرتے۔ اتفاق سے ہی ایک کیفے میں ڈاکٹر اقبال صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے ایک دلچسپ بات کہی کہ ''تتلی کے پروں سے ہاتھ بندھے چلے آتے ہیں۔''

''عابدی صاحب، ڈاکٹر صاحب آپ کو ہاتھی کہہ رہے ہیں۔'' میں نے فسادِ خلق کی نیت سے کہا۔

''مرزا، اتنا بگڑ چکی ہو کہ اب سدھرنے کی امید ہی نہیں۔'' عابدی صاحب اپنے سلیس انداز میں بولے۔

••

خش خش جنھاں قدر نہ میرا صاحب نوں وڈیائیاں
میں گلیاں دا رُوڑا کُوڑا محل چڑھایا سائیاں

استنبول کے بین الاقوامی سٹیج پر اردو کی صد سالہ تقریبات پر آخری دن کے اجلاس کی نظامت میرے مقدر میں لکھی گئی۔ صرف بیس منٹ پہلے ڈاکٹر خلیل طوق آر نے مجھے بلایا۔ ان کی طبیعت ناساز تھی اور چہرے سے بھی نقاہت کے آثار مترشح تھے، ''میری بہن، کانفرنس کا آخری اجلاس بہت اہم ہوتا ہے۔ دنیا بھر کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور اعلیٰ عہدیداران یہاں موجود

ہیں۔آپ اس اجلاس کی نظامت کر دیں گی؟''

میرے لیے یہ ایک ناقابلِ یقین پیشکش اور غیر معمولی اعزاز تھا۔ دنیا بھر کے اردو دانوں میں سے مجھ سی نو آموز کا انتخاب جو اردو کے مرکزی دھارے سے دور چھوٹے سے ڈنمارک میں قیام پذیر تھی۔ اللہ نے ڈاکٹر خلیل طوق آر کے انتخاب کی اور میری بے مائیگی کی لاج رکھی۔ پروگرام کے آخر میں مبارک باد کے ہنگام میں ناروے کے یورپین اردو لٹریری سرکل کے ڈائریکٹر اور ہمارے بھائی ڈاکٹر ندیم میرے پاس آئے۔ بھائی محمد ادریس میری دائیں جانب کھڑے ہو گئے۔

''آپ کو شاید خبر بھی نہیں صدف مرزا۔آج آپ نے کون سی تاریخ رقم کی ہے۔سرائے عالمگیر کے ایک ستاروں بھرے آنگن میں کھیلتی اور جہلم کالج کے سٹیج پر سے آدابِ تکلم سیکھتی، ایک چھوٹی سی شرارتی لڑکی یورپ کے لٹریری سرکل کی صدر بنی اور دنیا بھر کی یونیورسٹیوں کے عالم فاضل اور قابلِ قدر معلمین کی گواہی میں دیارِ غیر میں پچیس برس گزارنے کے بعد بھی اپنے بچپن میں بزرگوں کے التفات کے طفیل ملنے والی تہذیب وثقافت اور زبان و ادب سے محبت کو منوا لیا۔''

میرے دونوں بھائی اور دوست ڈاکٹر سید ندیم حسین اور محمد ادریس میرے بال و پر کی طرح میرے دائیں بائیں کھڑے ہیں۔ڈاکٹر خلیل طوق آر کا خوشی سے چمکتا معصوم سرخ و سفید چہرہ ہمیشہ کی طرح بے ریا تھا۔ چند دن بعد انھوں نے فیس بک پر میری نظامت کی تصویر لگائی اور پوسٹ لکھی۔ ایک ترکی بولنے والے نے اردو میں میرے لیے اشعار کہے۔

''میری بہن مجھے علم تھا کہ آپ یہ کام بخوبی انجام دیں گی۔ اپنے خوبصورت انداز اور نظامت کے عمدہ طور طریقہ سے سامعین پر سحر طاری کرنے والی میری بہن صدف مرزا جنھوں نے مشکل وقت میں بلا جھجک میری گزارش قبول کر کے کانفرنس کی شان قائم رکھی ہے۔شکریہ میری بہن، اپنے بڑے بھائی کا کہنا ماننے پر۔

خاموشی میں بھی بہت کچھ سمجھاتی ہیں آنکھیں
چپ رہ کر بھی بہت کچھ کہہ سکتی ہیں ادائیں
دل میں ہے جو بات اسے دل میں ہی رہنے دیں
یوں تو کھل جاتی ہیں اس عالم بے وفا میں راہیں''

یقیناً مجھے یہ تبصرے انعامات اور اعزازات کی صورت میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔

••

علم و ادب کے اس سفر میں ڈاکٹر یوسف خشک اور ڈاکٹر صوفیہ خشک، ڈاکٹر نجیب جمال اور محترم رضا علی عابدی، ڈاکٹر خواجہ اکرام، ڈاکٹر تقی عابدی، میں کس کس احسان کے ہفت رنگ گوہرِ نایاب کو شکر گزاری کی مالا میں پروؤں؟

ڈاکٹر تقی عابدی سے میری ملاقات بزمِ اہلِ قلم کے پیارے دوستوں شہزاد ارمان اور ارم بتول نے کرائی۔ ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں اقبال اور نطشے پر مقالہ پڑھنے کے دوران مجھے علم تک نہ تھا کہ سامعین میں موجود ڈاکٹر تقی عابدی اس دن کے بعد میرے علمی و ادبی شوق کے اس سفر میں سالار کی حیثیت سے شامل ہوں گے۔

تقریب کے فوراً بعد انھوں نے کہا، ''بھئی صدف مرزا، کیا خوب بولیں تم۔''

میں نے شاید شکریہ اور ذرہ نوازی کے رسمی سے الفاظ کہنے کی کوشش کی، جو انھوں نے ناکام بناتے ہوئے کہا، ''بات یہ ہے صدف مرزا کہ جب کوئی مقرر مائک پر آ کر چند الفاظ بولتا ہے تو وہ اپنا تعارف دے دیتا ہے۔ آپ کو بہت کام کرنا ہوگا اقبال پر بھی اور فیض پر بھی۔ یورپ میں اردو ادب کو متعارف کرانا آپ لوگوں کا کام ہے۔'' پھر انھوں نے اس پر بس نہیں کیا۔ جونہی ان کی کتاب ''فیض فہمی'' آئی تو فیض کمیٹی یورپ کی وائس پریذیڈنٹ کی حیثیت سے انھوں نے میرے لیے نیا حکم جاری کیا، ''فیض کی ایک نظم ترجمہ کر دیجیے ڈینش میں۔''

''کون سی نظم۔۔۔۔۔؟''

''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ۔''

اس نظم کا ترجمہ انھوں نے اپنی کتاب میں شامل کیا۔ پھر جب لندن کے نہرو سنٹر میں اس کتاب کی رونمائی کی تقریب کا انعقاد کیا گیا تو ڈاکٹر صاحب کا فون آیا، ''صدف مرزا! بات یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں اس تقریب کی نظامت آپ کریں؟''

''میں۔۔۔؟'' میرے لیے یہ اعزاز ناقابلِ یقین تھا۔

''جی ہاں۔ کیونکہ آپ نے فیض پر سنجیدہ کام کیا ہے اور آپ ہی یہ فرض بخوبی پورا کر سکتی ہیں۔''

پھر لندن میں نہرو سنٹر کے بین الاقوامی سٹیج پر پہلی مرتبہ ایک پاکستانی خاتون نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ دنیا بھر کے دانشور سامعین میں شامل تھے لیکن چونکہ میرے ہمراہ مجھے میری صلاحیتوں کا یقین دلاتی ایک روشن خیال ہستی ڈاکٹر تقی عابدی کی تھی سو مجھے ایک لمحے کو بھی احساس نہ ہوا کہ میں عالمی سٹیج پر کھڑی دانشوروں کے سامنے اپنے محدود علم کے ساتھ فیض احمد فیض کو خراجِ

عقیدت پیش کر رہی ہوں۔ سنٹر کی ڈائریکٹر محترمہ سنگیتا نے فیض کی نظم گائی اور مجھے بالخصوص بہترین نظامت پر سراہا۔ پرتکلف عشائیے میں مجھے خصوصی توجہ سے نوازا اور بے حد خوب صورت خیر سگالی کے جذبات پر یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

ڈاکٹر تقی عابدی اس سٹیج تک آنے میں میرے شانہ بشانہ چلتے رہے۔ کبھی ستائش کے پھول نچھاور کرتے ہوئے تو کبھی سرزنش بھری رہنمائی کے انداز میں کہتے، ''یہ آپ سگانِ کوئے لعنت جیسے موضوع پر کیوں لکھ رہی ہیں؟ آپ کو ضرورت تھی آوازِ سگان پر کان دھرنے کی؟ بند کیجیے سب۔''

واقعی سگانِ کوئے لعنت کی آواز پر سنگ بدست ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ اس دن وہ مضامین تلف کرتے ہوئے میں نے سوچا۔ ''ابا جی! آپ تو کہیں نہیں گئے۔ بس یہیں ہیں اور ابھی مجھے راستہ دکھا کر گئے ہیں۔''

یہ سب لوگ جو مجھے راستے میں روشنی کے میناروں کی طرح ملتے ہیں، یہ ابا جی ہی ہیں۔ ابا جی ایک کردار نہیں ایک رویہ ہیں، ایک رجحان ساز عملی صورت کہ اس دنیا میں شاداب روحیں صرف اپنے کام سے کام رکھتی ہیں، صلے کی طلب کے بغیر، گِلے کی آلائش میں قدم رکھے بغیر صرف چلنا، چلنا، مدام چلنا۔

••

نیو دہلی کی جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سٹیج پر اکیسویں صدی میں اردو اور اردو کمپوٹر کا استعمال، یونیکوڈ اور اردو رسم الخط کے مسائل کا حل پیش کرتے ہوئے میں سامنے بیٹھے ڈاکٹر عبداللہ اور ڈاکٹر تقی عابدی اور ڈاکٹر اکرام خواجہ کو نہیں دیکھ سکی کیونکہ طویل سفر کے بعد اس اجلاس کے مقالے کی ذمہ داری میرے ذہن پر سوار تھی۔ لیکن جب ڈاکٹر عبداللہ نے فخر سے کہا کہ صدف مرزا آج آپ نے ثابت کر دیا کہ ہماری خواتین کیسی باصلاحیت، بااعتماد اور اکیسویں صدی کی ٹیکنالوجی لسانی ترقی سے باشعور ہیں تو یہ لہجہ، یہ شفقت میرے لیے نیا نہیں رہا۔ مجھے ریختہ کے دفتر میں جانے کا یادگار موقع ملا۔ میرے بے حد پسندیدہ مصنف جناب مشرف عالم ذوقی سے ملاقات ہوئی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ان کی اہلیہ اور جناب جاوید اختر سے ملنے کا حسین اتفاق بھی ہوا۔ ڈاکٹر عبداللہ اور ڈاکٹر اکرام خواجہ کی میزبانی اور ذرہ نوازی تاحیات ساتھ ساتھ چلے گی۔

مجھے زندگی نے ساون میں ٹوٹ کر برستی بدلیوں کی طرح انعامات عطا کیے۔ ڈاکٹر عبداللہ سے لاہور میں ملنے کا اتفاق بھی ہوا۔ سعود عثمانی کے ساتھ ان کی ہمراہی میں اقبال کی قبر پر حاضری

دی۔ قسمت کی یاوری دیکھیے کہ رات کو جب سارے دروازے بند کیا جا چکے تھے، سعود عثمانی کی جادو بیانی نے کسی طرح کھل جا سم سم کے اسم سے یہ خصوصی اجازت حاصل کرلی۔ ڈاکٹر عبداللہ تو نہال ہوگئے اور ہم میزبان بھی خوش ہوگئے۔

••

پروفیسر ڈاکٹر سید امجد حسین...

دلوں کی دھڑکنوں کے زیر و بم دستِ مسیحائی رکھنے والے ایک نابغہ سرجن ڈاکٹر جو ادیب، محقق، دانشور اور مقرر ہیں۔ صرف انگریزی کالم نویس نہیں بلکہ روزنامہ آج سے بھی وابستہ ہیں۔

ڈاکٹر سید امجد حسین امریکہ کی ریاست اوہائیو کے شہر ٹولیڈو میں گزشتہ کئی دہائیوں سے مقیم ہیں۔ بیک وقت معالج بھی ہیں اور معلم بھی یعنی علم الابدان اور علم الادیان کو مٹھی میں لیے پھرتے ہیں۔ مختلف یونیورسٹیوں میں مسلسل لیکچرز دیتے ہیں۔ ٹولیڈو کے معروف اسلامک سنٹر سے منسلک ہیں۔ ٹی وی لنک کو ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ ڈاکٹر ساجدہ نے بھی ان کی نشست میں شرکت کی اور ایک باثمر گفتگو میں شریک رہیں۔

ڈنمارک سے واپسی پر انھوں نے دو خوبصورت کالم لکھے۔ عالیہ ان دنوں کوپن ہیگن کے معروف میڈیکل میوزیم میں سٹوڈنٹ گائیڈ کے فرائض انجام دیتی تھی۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کو بطور خاص اتوار کے دن عجائب گھر کی سیر کرائی۔ میرے بچوں کو اس علم و ادب سے محبت کے صلے میں ہمیشہ شاندار لوگوں کی شفقت حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی پختون روایات کو برقرار رکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں عالیہ کو اور مجھے معروف ترک ریسٹورنٹ میں ظہرانے پر مدعو کیا۔ عالیہ نے یورپی آداب کے تحت منمنانے کی کوشش کی کہ آپ ہمارے ملک میں ہیں اور ہمارے مہمان ہیں لیکن اس کی ایک نہ سنی گئی۔

2016ء میں امریکہ کے پانچ ہفتے کے ادبی دورے پر مجھے ان سے ملنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ مسلسل سفر اور بے حد لگے بندھے، دنوں میں تقسیم شیڈول میں دو دن نکالنا آسان نہیں تھا لیکن ان سے ملاقات ایک سرمایہ ہے جسے میں نے عمرِ رواں کی گٹھڑی میں سنبھال رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک یادگار اور باوقار شام کا اہتمام کیا جس میں اکثریت ڈاکٹرز ہی کی تھی۔ میں نے 2013 میں ان پر لکھے گئے اپنے مضمون سے ایک اقتباس پڑھا اور شاعری بھی سنائی اور فیسبک پر ایک پوسٹ لگائی۔

ڈاکٹر امجد حسین، خانوں میں بٹے دنوں کے نام...

کل مردوں کا عالمی دن منایا گیا۔ شاید یہ ایک عالمی غلط فہمی بن چکی ہے کہ عشق، وفا، خدمت، ایثار اور احساس کو عورت سے وابستہ کر کے مرد کو جبر، بے حسی اور خود غرضی کا استعارہ بنا دیا گیا ہے۔ اب جب کہ دنیا عالمی دیہات بن چکی ہے اور صنفی امتیاز کو انسانیت کے درجے پر فائز کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سب جذبات بھی بطور انسان سب میں ایک جیسے ہیں۔

امریکہ کے مسلسل قیام اور سفر کے دوران مجھے سنسناٹی سے ٹولیڈو جانا تھا، اور ہر صورت جانا تھا کیونکہ وہاں ڈاکٹر سید امجد حسین رہتے ہیں۔ علی الصبح گرے ہاؤنڈ کوچ پکڑی۔ دلکش راستے نظر میں بستے گئے۔ ایک دن کا قیام، نشست، اور میزبانی، پذیرائی تو ایک تفصیل طلب سلسلہ ہیں اور ایک ایسا بیش قیمت تحفہ بھی جس کی قیمت وقت کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس شام ڈاکٹرز نے ''مشقِ ستم'' کے بجائے ''مشقِ سخن'' کی۔

مجھے تاعمر یاد رہے گا کہ واپسی کی صبح میں کوٹ پہن کر باہر نکلی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہاتھ سے ایک سینڈوچ، ایک چاکلیٹ ٹکی اور ایک سیب میرے لنچ کے طور پر پیک کیا۔ بہت اہتمام سے کاغذی تولیے میں چھری کانٹا لپیٹا گیا تھا اور میری ٹریول ٹرالی کے اوپر لفافہ رکھا گیا تاکہ میں بھول نہ جاؤں۔

میری آنکھوں کے گوشوں میں نمی آرکی۔ محبت کی کوئی صنف نہیں ہے۔ ''اپنا کھانا خود گرم کرنے'' کے تقاضے کرتی صداؤں کے نام، زندگی کو دو مختلف دریاؤں میں ڈال کر ایک دھارا نہیں بنایا جاسکتا۔ انتہا پسندی صرف نفرت کو جنم دیتی ہے۔ انسانیت کی طرف قدم بڑھانا ہی اس درد کا درماں ہے۔ جب تک ڈاکٹر سید امجد حسین جیسے لوگ کرۂ ارض پر موجود ہیں یہ دنیا شاداب ہی رہے گی۔

••

سپین کے محترم دوست راجہ شفیق کیانی کے تذکرے اور التفات کے تشکر کے بغیر یہ باب ادھورا رہے گا۔ راجہ شفیق کیانی کا تعلق جہلم سے ہے اور وہاں کے پانیوں کی طرح بلا کے مہمان نواز، اور ادب دوست ہیں۔ ابا جی کی طرح حقوقِ نسواں کے لیے کوشاں ہیں۔ اللہ نے انھیں چار ہونہار بیٹیوں سے نوازا ہے۔ جس طریقے سے کیانی صاحب نے ان کی تعلیم و تربیت اور شادیوں کا فریضہ انجام دیا وہ ہر باپ کے لیے ایک زندہ مثال ہے۔ ان کے ساتھ بات چیت کے دوران کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ آپ پاکستان کی روایتی حبس بھری ذہنیت سے محوِ کلام ہیں۔ راجہ شفیق کیانی نہ صرف یورپین اردو لٹریری سرکل کے ڈائریکٹر ہیں بلکہ میڈیا سیکرٹری بھی رہے ہیں۔ گزشتہ سال انھوں نے

اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس عہدے کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے سے معذوری ظاہر کی اور اس وقت سے ناروے کے مایہ ناز ڈاکٹر ندیم میڈیا سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ریڈیو پاکسلونا پر فیض کا پروگرام پیش کرنے کے تمام تر اختیارات مجھے سونپ کر وہ بے پروا ہو گئے کہ 'بھلے خرد اور جنوں کے ناموں کو ادل بدل کرتی رہو'۔ یورپ میں اس ریڈیو کو اعزاز حاصل ہے کہ اس پلیٹ فارم سے کتنے ہی لوگوں نے اپنے علمی و ادبی، صحافتی و سیاسی سفر کا آغاز کیا۔

جب سپین میں یورپ کمیٹی کا آخری شاندار پروگرام ترتیب دیا گیا تو بارسلونا میں گزارے چند دن ایسے ہی تھے جیسے ہم جہلم کے گلی کوچوں میں گھوم رہے ہوں۔ میرے لیے زندگی کے خوب صورت ترین دنوں میں سے چند دن جب یورپین فیض کمیٹی نے تقریبات کے آخری یادگار سیمینار کا انعقاد کیا۔ بارسلونا کی ہواؤں نے مجھے میرے پیاروں کی نسبتوں سے جس پذیرائی سے نوازا وہ کم ہی لوگوں کے حصے میں آتی ہوگی۔ ''صدف مرزا'' انھوں نے جیسے تنگ آ کر کہا، ''ایک تو ساری دنیا آپ کے ابا اور بھائیوں کو جانتی ہے اور آپ کو ڈنر دینا چاہتی ہے۔'' پاس بیٹھے انور مسعود اپنے روایتی بظاہر معصوم انداز میں بولے، ''توں کیہہ جانے بھولیے مجے، نارکلی دیاں شاناں۔'' ان ممالک میں چونکہ جہلم اور کھاریاں کے لوگ زیادہ ہیں سو جاننے والے اور محبت اور فخر سے ملنے والے لوگوں سے ملاقات انعام خداوندی کے طور پر ہوتی ہے۔

پھر فیض کمیٹی نے یورپین لٹریری سرکل کی شکل اختیار کی اور یورپ بھر سے انتہائی فعال، متحرک اور ادب پرور شخصیات نے اس میں شمولیت اختیار کی۔ کمیٹی کے بانی ارکان برسلز کے عمران چودھری، راجہ شفیق کیانی نے مجھے اس کی پہلی صدر ہونے کا اعزاز بخشا۔ اس سال پاکسلونا ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام ایک مرتبہ پھر بارسلونا نے یورپین لٹریری سرکل کی میزبانی کی اور دس ممالک کے مندوبین کا باوقار اور یادگار سیمینار کامیابی سے منعقد کیا جس کے معیار کی دھوم دنیا بھر میں مچی۔ راجہ شفیق کیانی نے ایک مرتبہ پھر ثابت کیا کہ بارسلونا کی ادبی دنیا میں گہما گہم ان کے دم قدم سے ہے۔ جرمنی سے یورپین اردو لٹریری سرکل کے بانی ممبر اور سرپرستِ اعلیٰ، فیض احمد فیض کے میزبان ادیب، شاعر اور صحافی محترم ڈاکٹر عارف نقوی، جو گزشتہ پانچ دہائیوں سے جرمنی میں فروغِ اردو ادب اور ثقافت کے جنون کو زندہ رکھے ہوئے ہیں، میرے لیے ایک دوست اور راہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دھیمے لہجے میں صرف داد ہی نہیں دیتے، پاس بلا کر شیرینی بھری فہمائش بھی کرتے ہیں۔ اکثر میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی الٹی سیدھی حرکت کروں اور عارف نقوی اپنے مخصوص جملے سے مٹھاس

بھری جھاڑ پلائیں ''برا مت ماننا، تم سرکل کی صدر ہو۔'' یہ وہ احباب ہیں جن کے تذکرے کے بغیر میری کامیابی کا سفر مکمل نہیں ہوسکتا۔

برگد کے اختتامی صفحات لاہور اورینٹل کالج میں بیٹھ کر لکھنے کے دوران ڈاکٹر نبیلہ نے کہا کہ میں اس کتاب کو سوانحی ناول کی صنف میں شامل کرتی ہوں کیونکہ یہ نہ صرف یادداشتیں ہیں بلکہ اس کا اسلوب ایک افسانوی رنگ لیے ہوئے ہے۔ یہ ایک والد اور اس سے منسلک تمام رشتوں اور سایہ دار اشجار جیسے لوگوں کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوا ناول محسوس ہوتا ہے جس میں کردار، کہانی، مقامات، عروج اور انجام سب کچھ موجود ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ جو کچھ بھی ہے اب میرے ذہن سے نکل کر کاغذ پر نقش ہو چکا۔ اسے قاری اپنے رشتوں کے پر پیچ زینے پر چڑھتے ہوئے کس مقام پر ملتا ہے، اس میں کیا جھلک پاتا ہے، یہ اب اس کے ذہن کی کارفرمائی ہے۔ سپردم بتو۔ میرا کام ختم ہو چکا۔ میری صرف یہ تمنا ہے کہ ان الفاظ کو پڑھنے والی آنکھیں میرے بابل کے لیے دستِ دعا بلند کریں اور اپنے پیاروں کی قدر دانی کر سکیں۔

اس کتاب کے ذریعے میں یہ بھی کلی طور پر واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ مجھے فیمنسٹ کہلانے پر کوئی اعتراض نہیں۔ عجیب بات ہے کہ اچھے بھلے روشن خیال لوگ بلا وجہ کی بحث میں الجھنے لگتے ہیں۔ تانیثیت کی جو تعریف کی گئی ہے اور اس تصور کے ساتھ جو منفی خیالات وابستہ کر دیے گئے ہیں ان کی تصحیح ازحد ضروری ہے۔ میں نے اپنی طرف سے کتاب مکمل کر لی تو ڈاکٹر نبیلہ نے مجھے دوبارہ بلایا۔ ''صدف، اس میں ہر وہ بات، ہر وہ مکالمہ اور واقعہ درج ہونا چاہیے جو آپ کے والد نے حقوقِ نسواں اور تعلیمِ نسواں کے لیے کہا۔ یہ کتاب نہیں یہ ایک مشرقی سوشلسٹ کے افکار ہیں۔ اور یہ صرف افکار نہیں، آپ کی صورت میں یہ عملی مثال ہے کہ انھوں نے آپ کو نہ صرف تعلیم دی بلکہ آپ کی ذات میں موجود قائدانہ صلاحتیں اور دنیا کے بڑے سے بڑے سٹیج پر اعتماد سے بات کرنے کی جرات ان کی دین ہے۔ چلیے شاباش ادھر کمرے میں بیٹھ جائیں اور چند صفحات مزید تحریر کریں۔ میں اس کتاب پر مکمل تبصرہ لکھنا چاہتی ہوں۔ کاش میں ان کو مل سکتی، ان سے بات کر سکتی۔''

اب میں ازسرِ نو سوچ میں ہوں کہ یہ ابا جی کی روح ڈاکٹر نبیلہ میں کیسے حلول کر گئی۔ ان کے ساتھ قیام بالکل پریوں کے مسکن میں ٹھہرنے جیسا تھا۔ یہ پریاں میرے منتشر کاغذات، چھڑی گھما کر پرنٹ کر کے ترتیب میں لے آتی تھیں۔ اگلے چند دن میں نے مسلسل کام میں گزارے۔ جب کمرے سے باہر آتی تو فرمائش کرتی کہ مجھے تندور کی روٹی کے ساتھ ماش کی دال کھانی ہے،

ساگ کھانے کو جی چاہتا ہے، بینگن تو بنوا دیں۔ بچیوں کی میرے ساتھ ٹھن جاتی۔ حلیمہ باقاعدہ آستینیں چڑھا کر کہتی، ''یا تو اس گھر میں بینگن اور کدو رہیں گے یا میں رہوں گی۔ خالہ کس قسم کی شاعرہ ہیں آپ؟ ساگ کھانے کو جی چاہتا ہے، کچھ اور نہیں چاہتا دل؟''

منہار تھکی ہاری صورت لیے آتی، ''او میری ماں سی۔۔۔ او ماسی، کبھی تو اچھے کپڑے پہن لیا کریں۔''

سب سے چھوٹی شاہ بانو صبح بہت جلدی اٹھ کر سکول جاتی۔ ایک دن اٹھی۔ میں ابھی تک لائبریری میں بیٹھی کام کر رہی تھی۔ پہلے کچھ دیر کھڑی دیکھتی رہی، پھر دیوار پر لگے کیمرے اور سکرین پر دیکھا۔

''خالہ آپ کو یہ سڑک نظر آ رہی ہے ناں، ابھی میں اس پر جاؤں گی۔ آپ مجھے دیکھیے گا۔''

''اچھا، لیکن میں نے تو آپ کو ابھی دیکھ لیا ہے ناں''، میں نے کتاب ہاتھ سے رکھ دی۔

''نہیں ناں خالہ، جب آپ کیمرے میں میری طرف دیکھیں گی تو میں آپ کا منہ چڑاؤں گی'' وہ بڑی ادا سے بولی۔

سب سے زیادہ گھاؤ میرے دل پر نبیلہ کی لاڈلی بیٹی اور کچن انچارج سحر نے لگائے۔ ''خالہ خود کیوں کچن میں آ جاتی ہیں۔ ناشتہ میں پہنچاتی ہوں۔ آپ سے اچھا بناتی ہوں۔ خالہ پلیز اچھے کپڑے پہنا کریں، ذرا ڈیسنٹ سے، یہ کیا رات کے کپڑوں میں گھومتی ہیں۔

خالہ پلیز انگریزی میں بھی بات کیا کریں، کہیں سے نہیں لگتا آپ باہر سے آئی ہیں۔ بہت شرمندگی ہوتی ہے۔ پتہ وہ صفائی کرنے آتا ہے ناں جو لڑکا، وہ حیران ہو گیا تھا سن کر کہ آپ فارن سے آئی ہیں۔ کپڑے تک تو استری نہیں ہوتے آپ کے۔''

''اچھا'' مجھے اس کی تقریر سن کر کوفت ہونے کے بجائے ہنسی آ گئی۔ میں جب بھی ڈینش شاعرات اور تراجم کی کتاب پر کام کرتے کرتے تھک جاتی، کچن میں سحر کے پیچھے جاتی۔ اس کا فلسفہ سن کر تازگی کے جھونکوں کے ساتھ واپس لائبریری آ جاتی۔ نبیلہ بہت ناراض ہوتیں، ''یہ کیا بگاڑ رکھا ہے تم نے انھیں، کیسے بات کرتی ہیں جیسے تیرے ہانڑ دیاں نیں (جیسے تمھاری ہم عمر ہوں)۔''

''نہیں، میں ان کے ہانڑ دی آں'' میں ان کی تصحیح کرتی۔

••

ممتاز شیخ صاحب کی کرم گستری اور تلطف اس طویل سفر کو سہل تر کرتا رہا۔ ان کی توجہ بھری شفقت نے مجھے مسلسل تراجم کی سرزمین پر تخم ریزی پر آمادہ رکھا۔

''لوح'' سے ایک ملاقات

شعر و ادب کا ایک اپنا قبیلہ اور اپنے ہی رسم و رواج ہیں۔ سچے اور پیدائشی تخلیق کار کے خمیر میں تحمل، علم کا سودا، محبت اور وفا شعاری ہوتی ہے۔ اس کے سر پر دھری عہد و پیمان کی دستار اس کے سر کے ساتھ ہی اترتی ہے۔

مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ ''لوح'' کے ساتھ میرا تحقیقی، ادبی اور قلمی سفر میری لوحِ محفوظ پر کہیں تحریر تھا۔ جنابِ ممتاز شیخ کا خصوصی التفات و اصرار میرے کاہل قلم کو مہمیز کرتا رہا۔ ان کی تجویز پر ہی میں نے لوح کے لیے ''ڈینش شعر و ادب اور سماجی ارتقاء میں اس کا کردار'' نیز تراجم کا سلسلہ شروع کیا۔

میں مسلسل فون پر بات کرنے اور لیپ ٹاپ پر کھنے میں مصروف تھی۔ ہماری صاحبزادی صوفے پر بیٹھی اپنی خاموش بیزاری کا اظہار پیر ہلا کر کیے جا رہی تھیں۔ بالآخر بولیں،

''امی، کھانے پر جانا ہے۔ پھر مجھے ہسپتال پہنچنا ہے۔ یہ لوح کیا بلا ہے؟ اب ختم کیجیے۔''

بہرکیف وہ کام تو شام سے پہلے مکمل ہوا لیکن لوح کا نام ہمارے گھر میں اجنبی نہیں تھا۔ مجھے کچھ ذاتی وجوہ پر پاکستان جلدی آنا پڑا۔ ہمارا پروگرام بنتے ہی ہماری صاحبزادی بھی پیچھے بھاگی آئیں۔ چھے مہینے کی بچی کو کنگرو کی طرح تھیلے میں ڈالے پی آئی اے کی اکلوتی ڈائریکٹ فلائٹ کے ساتھ تنہا سفر کرنے کا سہرا سر پر باندھے اسلام آباد آن اتریں۔ چند ہفتے کے قیام میں جو اعزاز حاصل ہوا ان میں سے ایک ممتاز شیخ صاحب سے ملاقات ہے۔ وہ اپنی فیملی کے ہمراہ میرے بھائی کے گھر ملنے کے لیے آئے۔ لوح کا تازہ شمارہ ان کے ساتھ تھا۔ ہماری صاحبزادی کا قصہ دوہرایا گیا جس پر وہ شرمندہ ہونے کے بجائے ہنستی رہی۔ الٹا اپنے ماموں کو بتانے لگی کہ ماموں آپ کی بہن بھی عجیب ''جنونی'' کام کرتی ہیں۔

لوح کا شکریہ کہ اس کے طفیل زندگی کے صحیفے میں آیات جیسی ایک شام کا اضافہ ہوگیا۔

••

ڈینش مصنف یوہنس مئول ہیو اس وقت ڈینش ادب کا درخشاں ترین ستارہ ہیں۔ مجھے انھوں نے لنچ پر مدعو کیا۔ میں مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے پہنچی۔ دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجائی۔

یونہیں موجود نہیں تھے۔ یہ بہت حیرت انگیز بات تھی۔ یورپ میں وقت کی پابندی بے حد اہم تصور کی جاتی ہے۔ میں نے انھیں فون کیا، کہنے لگے ''لڑکی! آپ کو غلط فہمی ہوئی، آپ کو فلاں ریسٹورنٹ میں مدعو کیا تھا جو میری رہائش سے پانچ منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔''

میں نے وضاحت اور تصحیح کی تکرار مناسب نہ سمجھی۔ ٹیکسی پکڑی اور مقررہ ریسٹورنٹ پہنچی۔ وہ میرے انتظار میں باہر کھڑے تھے۔ پہلے تو انھوں نے ٹیکسی کے کرائے کی ادائیگی کرنا چاہی، جو ظاہر ہے ناممکن بنا دی گئی۔ پھر کچھ دیر سوچتے رہے، ''بات سنو، تمھاری ڈاکٹر بیٹی کا کیا نام ہے؟''

''عالیہ'' میں نے مختصراً کہا۔ انھوں نے جیب سے 200 کراؤن کا نوٹ نکالا۔ اس پر عالیہ کا نام لکھا، اور بغیر کچھ کہے مجھے تھما دیا۔ مجھے گزشتہ سال ٹورنٹو میں ڈاکٹر تقی عابدی اور اپنے صاحبزادے کی شیریں سی تکرار یاد آ گئی۔ ہم سب چھٹیاں گزارنے امریکہ اور کنیڈا کے ٹرپ پر گئے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے بہت اصرار سے ظہرانے پر بلایا۔ کہنے لگے ٹریفک بہت زیادہ ہے اور میں شہر کے دوسرے کونے پر ہوں۔ آپ ٹیکسی پکڑ لیجیے۔ جب ہم دونوں ماں بیٹا لنچ پر پہنچے تو ڈاکٹر صاحب ریسٹورنٹ کے باہر منتظر تھے۔

اُسامہ ڈرائیور کو بل کی ادائیگی کر چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب تیر کی تیزی سے آئے اور خود ادائیگی کی کوشش کرنے لگے۔ ڈرائیور سے بولے کہ ''بچے کے پیسے واپس کرو۔''

بے چارہ کینڈین ڈرائیور حیران پریشان، صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چابی کے کھلونے کی طرح گردن گھما کر کبھی ڈاکٹر تقی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھتا کبھی اُسامہ کے نفی میں ہلتے سر کی طرف متوجہ ہوتا۔ ہمارے صاحبزادے مہذب انکار کیے جا رہے تھے اور ڈاکٹر تقی عابدی اپنے مخصوص لب و لہجے میں اسے بتا رہے تھے کہ ''آپ میرے مہمان ہیں اس لیے پیسے دینا میرا فرض ہے۔'' بالآخر انھوں نے ڈرائیور کے ساتھ نوٹوں کا تبادلہ کر کے کمال شفقت سے پیسے اُسامہ کو پکڑائے۔ لاکھ جغرافیائی اور سماجی ثقافتی رویے مختلف ہوں، اپنی اقدار اپنے ساتھ لے کر چلنے والے مشرق و مغرب میں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ میرے بچے بے انتہا بلند بخت ہیں کہ انھیں شرق و غرب کے شائستہ اہلِ قلم کی شفقتیں حاصل ہیں۔

••

عالیہ کی شادی کے بعد میں تین مہینے پاکستان رہی۔ میری زندگی میں ایسا پہلی دفعہ ہوا کہ مجھے بچوں سے دور رہنا پڑا۔ حالات ہی ایسے ہو گئے کہ گھر بھی چھوڑنا پڑا اور طبیعت ایسی خراب ہوئی

کہ بچے اکیلے رہنے نہ دیتے۔ چونکہ عالیہ نے اپنی نئی زندگی کا آغاز ہی کیا تھا، میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ بلاوجہ میرے لیے پریشان رہے یا میری صحت کو جواز بنا کر میرا طواف کرتی رہے۔ میں نے پاکستان جانے کا پروگرام بنالیا۔

کراچی کانفرنس میں گئی تو ہما بخاری بولیں،''لو جی صدف مرزا کے سارے کام اپنی ہی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ بیٹی کو بیاہ کر مزے کر رہی ہیں۔ لوگ مصیبتوں میں پڑے ہوتے ہیں۔ مائیں بچیوں کو صبح شام فون کھڑکاتی ہیں، دخل دیتی ہیں، مائیکے بلا بلا کر عادات خراب کرتی ہیں، اور یہ محترمہ مزے سے پوری دنیا گھومنے نکلی ہیں۔''

''صدف آپ نے تو مثال قائم کر دی، بچوں کو ایسے ہی خود مختار ہونا چاہیے۔'' مجھے ہما کے خراج تحسین پر ہنسی آ گئی۔

''میرا کیا ہے جی،'' مجھے ہنسی آ گئی،''یہاں امی جی ہوتیں تو بتاتیں اوقات۔ میری کیا مجال کہ کوئی مثال پیش کرسکوں۔ ہر نظر اپنی حد تک اپنے اجالے اور زاویے سے دیکھتی ہے۔ میں روایتی راستے پر نہیں چلنا چاہتی۔ اس کی نئی زندگی اور خاندان میں اسے خود اپنی صوابدید سے جگہ بنانی ہے۔ ان پر یقین کرنا محبت کا پہلا زینہ ہے۔ جس مسرت اور ارمان سے وہ اسے بیاہ کر لے گئے ہیں وہ خود کو منوا لے گا۔ مائیں دخل در معقولات سے باہر ہی رہیں۔

مثالیں قائم کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔ وہ ایک در بند کرتا ہے تو ہزار دروازے بانھیں پھیلائے ملتے ہیں۔ نیت صادق اور ارادے پختہ ہوں تو بلندیاں خود جھک کر انسان تک آ پہنچتی ہیں۔''

میں اس مشکل وقت میں ہما بخاری اور بچیوں کا ساتھ نہیں بھول سکتی۔ عالیہ کی شادی کی تیاریوں اور ملبوسات کی خریداری سے لے کر اس کی تصاویر کے البمز بنانے تک ہر کام کو یوں محبت اور ذمہ داری سے انجام دینا کہ مجھے محسوس ہوتا کہ اس خاتون کے پاس کوئی جادو کی چھڑی ہے جس سے پلک جھپکتے کسی پریشانی کے بغیر کام مکمل ہو جاتے ہیں۔

مجھے شام ہمیشہ اداس کرتی۔ بچے یاد آتے۔ لیکن شام کو ایسی محفل لگتی کہ سارے دن کی تھکن اتر جاتی۔ رنگ برنگے کھانوں کے تجربات، بیکنگ کرنے اور سیر سپاٹے کرنے میں خبر ہی نہ ہوئی وقت کب پر لگا کر اڑ گیا۔

مجھے واپس اسلام آباد جانا تھا لیکن تینوں میرے سر ہو گئیں کہ اب آئی ہیں تو رہیے ادھر

چپ کر کے۔ عالیہ باجی اور اُسامہ بھائی سے روز بات تو ہو جاتی ہے۔ اب اور کیا مسئلہ ہے؟ میں نے اپنے قیام کی مدت بڑھا لی۔

میں دن کو یونیورسٹی چلی جاتی اور ڈینش ادب کی کتاب مکمل کرنے کے جتن کرتی رہتی۔ اس کتاب کی تکمیل میں جتنا تعاون اور مدد ہما بخاری نے کی، شاید ہی کوئی اور کرسکتا۔ دفتر کی سہولت، کمپیوٹر، پرنٹر کی فراہمی، کتب خانے تک رسائی، گاڑی، ڈرائیور، غرضیکہ ہر طرح کی سہولت۔ بس ایک ہی بات پر زور دیتیں کہ میں صرف ذہنی سکون اور یکسوئی سے کام کروں۔

میں اپنے راستے اور سفر کو پتھریلی رہگزر اور خار زاروں کی وجہ سے یاد نہیں رکھنا چاہتی بلکہ انھیں سایہ دار اشجار کے التفات سے گنتی ہوں۔ ہما بخاری ان کڑے دنوں میں ایسا ہی ایک شجر ثابت ہوئیں۔ پھر یوں ہوا کہ کراچی میرا گھر بھی بن گیا اور میکہ بھی۔ تھکن کے بعد کا آشیانہ بھی اور عمر بھر کے سفر کے بعد ایک پڑاؤ بھی۔ شاہ عبداللطیف یونیورسٹی کا بلاوا آتا تو میرا پہلا قیام کراچی ہوتا۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور جانے کے لیے پہلا ٹھکانہ کراچی بن گیا۔ سندھی زبان سیکھنے کے شوق نے راستے مزید آسان کر دیے۔ زندگی میں ایسا وقت بھی آتا ہے کہ منزل اور راستے میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا۔

••

میں ڈنمارک کے بہت سے دوستوں کی بھی ممنون ہوں جن کا فرداً فرداً تذکرہ دشوار ہے لیکن میں چند بے حد محترم دوستوں کا تذکرہ احسان مندی تقاضہ سمجھتی ہوں۔

محترم اقبال اختر صاحب نے کمال اعلیٰ ظرفی سے میری کتاب پر مضمون بھی تحریر کیا اور بہت شفقت سے ڈنمارک کے شعری حلقے میں خوش آمدید کہا۔ انھیں امی اور ابا جی کے حوالے سے لکھی شاعری انسانی جذبات کا اظہار یہ محسوس ہوئی۔ اقبال اختر صاحب کے التفات کا سایہ آج بھی میرے سر پر قائم ہے۔

اقبال اکیڈمی سکینڈے نیویا کے صدر محترم غلام صابر کی زندگی میرے لیے مشعلِ راہ ہے۔ مسلسل تحصیلِ علم اور ترسیلِ علم کا جذبہ جو صاحبِ فراش ہونے کے باوجود ان کے قلم کو متحرک رکھتا ہے، آج بھی نوجوان نسل کے لیے ایک قابلِ تقلید مثال ہے۔ اقبال اور ڈینش فلسفی سؤرن کرکگارڈ کے افکار کی مماثلت پر ان کی تحریر کردہ کتاب کو شہرتِ عام حاصل ہوئی۔ ٹی وی لنک کی ٹیم ان کا انٹرویو کرنے ان کی رہائش گاہ پر جاتی رہی۔ مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ انھوں نے ہمیشہ

میری حوصلہ افزائی کی اور علامہ اقبال کے حوالے سے میری کاشوں کو سراہا۔

••

ٹی وی لنک کی ٹیم جس میں سرور چودھری، رائے زبیر اور ارشد صاحب کے ساتھ گھریلو مراسم ہوگئے۔ اور اسی ضمن میں بہت مزے کی باتیں اور تبصرے سننے کو ملتے کیونکہ ٹی وی کا پہلا دفتر ادارے کی بڑی عمارت کے اوپر بڑے کمروں میں قائم تھا۔

''ٹی وی لنک ٹیم والوں کو تو درست اردو نہیں آتی۔ جاہل ہیں سب۔ پتہ نہیں صدف مرزا ان کے ساتھ کیسے کام کرتی ہیں۔'' ایک مقامی شمس العلماء فرماتے۔

''میری زندگی میں جاہل کون ہے، اس کا فیصلہ میں خود کروں گی'' جواباً میں بھی فرمودات جاری کرتی۔ کیونکہ ڈنمارک میں 1971ء سے تاحال کسی نے ڈینش میونسپلٹی کے ساتھ اتنے مراسم نہیں رکھے تھے کہ وہ ایک ٹی وی چینل پر اپنا تعارف کرا سکتے۔ یہ ٹی وی لنک ٹیم کی کارکردگی تھی کہ اتنے سال تک باقاعدگی سے کام ہوتا رہا۔ پھر اسی ٹی وی لنک کے بنائے بلند چبوترے پر کھڑے ہو کر میں نے یورپ کے پہلے وومین اردو چینل کی ابتدا کی جس کا نام ہم نے ''ٹی وی نساء'' تجویز کیا۔ میں نے اس کی پہلی مینجنگ ڈائریکٹر کے عہدے پر دستخط کیے۔

میں اس کا نام دیوی 'اینھیا' کے نام پر رکھنے کا سوچ رہی تھی۔ اور ٹی وی نساء تو خیر پہلی ترجیح تھی۔ اب جناب عباس رضوی سے مشورہ کیا۔ عباس رضوی ڈنمارک کی ان چند مقتدر ہستیوں میں شامل ہیں جو معاشرے کی خیر و بھلائی کے کاموں میں صفِ اول کے مجاہد ہیں۔ بہترین معلم، ماہرِ تعلیم اور متوازن سیاست دان ہونے کے ساتھ ساتھ اردو فارسی پر مکمل عبور والی ایک ہفت پہلو شخصیت ہیں۔ جب ہم نے انھیں پروگراموں میں بلایا وہ خندہ پیشانی سے تشریف لائے۔ انھوں نے ایک لمحہ سوچے بغیر کہا کہ ''ٹی وی نساء'' بہترین نام ہے۔ میرا سوال تھا کہ ڈینش میڈیا کے لیے نساء نام مشکل ہوگا۔ ''یہی اس کا حسن ہے'' عباس رضوی نے کہا، ''لوگوں کے ذوقِ تجسس کی تسکین کرائیے گا کہ نساء قرآن کی ایک سورۃ ہے۔''

جب میری کتاب کی رونمائی ہوئی اور ڈاکٹر عبداللہ اپنی اہلیہ ڈاکٹر صوفیہ کے ساتھ کوپن ہیگن تشریف لائے تو اسی ادارے نے ان کی میزبانی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لوگوں کی چہ میگوئیاں سنیں۔ ''کہاں ایک باغی قسم کی شاعرہ اور مصنفہ اور کہاں ادارے کے ارکان۔'' لیکن میری ہر علمی و ادبی سرگرمی میں سب سے پہلے داد و تحسین کی کمک ادارے ہی کی طرف سے آئی اور بقول ابا جی

''انسانیت کو مساجد اور مسالک میں بانٹ کر، نفرتیں پھیلا کر اور دوسروں کے راستے میں گڑھے کھود کر اللہ کا پیغام نہیں دیا جاتا۔''

••

ڈاکٹر ساجدہ کے تذکرے کے بغیر میری زندگی کا یہ باب ادھورا ہے۔ ساجدہ نہ صرف ایک دستِ مسیحا کی مالک بہترین آرتھو پیڈک سرجن ہیں بلکہ پاکستان کی محبت میں سرتاپا غرق ایک عملی انسان ہیں۔ وہ پاکستان میں اپنا ہسپتال قائم کرنے کی دھن میں سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آگئیں۔ انھوں نے پاکستان کو درپیش ارضی وسماوی آفات میں دیوانہ وار نہ صرف خود رضا کارانہ کام کیا بلکہ ڈینش اتھارٹیز سے مذاکرات بھی کرتی رہیں۔ ان کے ہسپتال کے لیے سامان ڈنمارک نے عطیہ کیا لیکن ارضِ وطن کی سیاستوں اور غیر دانش مندانہ حکمتِ عملی نے ان کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ ڈنمارک سے بہترین شخصیت پر انعام پانے والی خاتون اور سیکنڈے نیویا میں آرتھو پیڈک سرجن کو پاکستان میں ہسپتال کی تعمیر سے روکنے کی جیسی کوششیں کی گئیں اس پر کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ ساجدہ بے حد عملی اندازِ فکر رکھتی ہیں، ہڈیاں توڑنے جوڑنے کی طرح۔ میں شاید خوابوں کی کونپلوں کو تن آور درخت بنا کر ان پر تعبیروں کے جھولے ڈالنا چاہتی ہوں۔ میری امید مجروح ہوتی ہے، مضمحل ہوتی ہے، لڑکھڑاتی ہے، کبھی گھٹنوں کے بل گر بھی جاتی ہے، لیکن مرتی نہیں۔ ابا جی کا لاتقنطو کا درس اس میں نئی روح پھونکتا رہتا ہے۔

پاکستانی بیوروکریسی نے ڈنمارک میں ایک ایسی سفیر کو تعینات کیا جس نے نیک نامی کی پیشانی پر کلنک کے ٹیکے لگائے۔ مقامی چاپلوس، خوشامدی ٹولے میں بیٹھ کر اور ان کی رپورٹیں لے کر سفارت خانے کے کردار کو داغدار کیا۔ روشن امکانات کے سارے دروازے بند کیے۔ میں نے لاکھ سر پٹخا کہ ساجدہ پاکستانی سفارت خانے کو استعمال کریں اور وہاں ڈینش ڈاکٹرز کو مدعو کریں۔ وزیرِ صحت کو بلائیں۔ کہنے لگیں ''میں گئی تھی۔ ویٹنگ روم میں بیٹھ کر واپس آ گئی۔ جن محترمہ کو سفیر بنا کر ہمارے سر پر مسلط کیا گیا ہے ان کو کسی بات کی ابجد کی بھی خبر نہیں۔ وہ ہر روز سفارت خانے میں آنے والے ماجھے گامے سے مشورے لیتی ہیں اور کروڑوں کا کرایہ دے کر بڑے سے گھر میں کتوں کے ساتھ رہتی ہیں۔''

ساجدہ مختصر ترین انداز میں بولیں، ''پاکستانی قوم پر دوزخ میں بھی کوئی دربان نہیں ہوگا۔ آپ کو ابھی تک سبق حاصل نہیں ہوا۔ جن ممالک اور زبانوں کا آپ نام لیتی ہیں، ان کی حکمتِ عملی

اور سفارتی تعلقات کی حقیقت بھی جانتی ہیں آپ۔ ہمارے ہاں کتے پالنے والی مخلوق مسلط کر کے عذاب جاری کر دیا گیا ہے۔ ان کی سفارت سے صرف کچرا گھر کھلیں گے۔ انتظار فرمائیے۔''

لیکن یہ دوٹوک جواب اور بالکل سچا اور کھرا انداز، اگرچہ نیندیں اڑانے پر قادر ہے لیکن میرے خوابوں کو چکنا چور نہیں کر سکا۔ میرے مستقبل کے لائحہ عمل میں اس خواب کے گھروندے کی تعمیر بھی شامل ہے۔ بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں گور پیا کوئی ہور۔

••

کوپن ہیگن یونیورسٹی میں ہندی زبان کا شعبہ چل رہا ہے۔ اتنے ''نامور'' اردو دانوں نے آج دن تک وہاں اردو کا شعبہ قائم نہیں کیا۔ پاکستانیوں کے مقابلے میں انڈیا اور بنگلہ دیشی افراد کی تعداد بہت کم ہے لیکن ہر میدان اور محاذ میں بہت آگے ہیں۔

کوپن ہیگن یونیورسٹی میں اردو شعبے کا قیام وہ روشن خواب ہے جس کی طرف جانے والے تمام راستوں میں بارودی سرنگیں کھودی گئیں پر وہ خواب اب بھی روشن ہیں جن کو مفاد پرستوں کی دنیا کی بحر و بر میں بھیڑیوں کے غول، مگرمچھوں اور کرگسوں کی منتظر گرسنہ نظریں اور خون بیچنے اور نوکیلے دانت بھی نہیں روک سکتے۔

ابا جی ہی کی طرح میری آنکھیں بھی خواب دیکھنے کے لیے بنی ہیں۔ میں کوپن ہیگن یونیورسٹی میں عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کے شعبے دیکھنے گئی۔ پروگرام میں سیکڑوں کی تعداد میں مختلف ممالک سے طلبہ و طالبات کی تعداد دیکھتی تو یہ خواب ضرور ابھرتا کہ کسی طرح پاکستان سے تعلیمی سفیروں کے تبادلے یہاں ہونے لگیں۔

''صدف، آپ کیوں تھکتی ہیں بلاوجہ؟ کہاں سفارت خانے میں بیٹھے مٹی کے مادھو اور ان کے گرد حلقہ کیے ہوئے لوکی صفت لوگ۔ میں جانتی ہوں ناں اس سارے گروہ کو۔ اتنے الزامات لگائے انھوں نے آپ پر۔ سدھر کیوں نہیں جاتیں؟''

''ساجدہ ہم نے ابھی تو مرنا ہی نہیں ناں۔ عمر کی شرح بڑھ گئی ہے۔ تعلیم اور طب کا ہمارا خواب ضرور پورا ہوگا اور کوپن ہیگن میں اپنے ہی سفارت خانے میں ہم وزیرِ صحت اور وزیرِ تعلیم اور وزیرِ ثقافت کو مدعو کریں گے۔'' جواب میں ساجدہ اپنی طنزیہ ہنسی سے تائید کرتی ہیں اور الفاظ سے تردید کرتی ہیں۔

''صدف مرزا، بہت مشکل ہے۔ ہم لوگوں کو اپنے ذہن سے سوچنے اور عمل کرنے والے

لوگ میسر آنا بہت مشکل ہیں۔"

"لیکن میں شاید بنیادی طور پر شاعرہ ہوں۔ میرے خواب اسی طرح چمکتے ہیں اور خوابوں کے محل پر نئے کنگرے ابھرنے لگتے ہیں۔"

2018ء کی ایک برفیلی صبح میں کوپن ہیگن یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے استاد کاؤس پیٹرسن کے ساتھ سفارت خانے میں سفیرِ پاکستان محترم سید ذوالفقار علی گردیزی کے دفتر موجود تھی۔ میز پر ملتانی سوہن حلوہ اور ڈینش کوکیز پڑے تھے۔ میرے ہاتھ میں پنجاب یونیورسٹی کی طلائی مہر لگا سربمہر خط بنام سفیرِ پاکستان موجود تھا۔ انھوں نے پیٹرسن کو چائے پلائی، اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے بے حد شائستہ لہجے میں پیٹرسن کو مبارک باد دی، مستقبل کے لیے نئے امکانات کے دروازے کھلنے کی امید ظاہر کی، اور ان کو پاکستان کا ویزہ لگا دیا۔

مجھے جناب انور مسعود کی بات یاد آگئی کہ "میری زندگی کا مسرور ترین دن وہ ہوگا جب کوئی گورا پاکستان جانے کے لیے ویزے کے کاغذات پر کرنے کے لیے میری مدد اور تعاون کا طلب گار ہوگا۔"

میری زندگی میں وہ مسرور ترین دن آچکا تھا۔

میں نے دفتر سے باہر نکلتے ہی ڈاکٹر ساجدہ کو فون کیا۔ میری آواز سن کر وہ پریشان ہوگئیں، "سب خیریت ہے ناں، آپ کی آواز لرز کیوں رہی ہے؟"

انھیں خبر نہیں تھی کہ میری آنکھوں میں میرے خواب بھی خوشی سے چھلکتے قطروں کی صورت لرز رہے تھے،

"ساجدہ، ڈاکٹر کلاؤس پیٹرسن کو ابھی ویزہ دیا ہے سفارت خانے نے، وہ پاکستان آرہے ہیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا ناں، اسی چھت کے نیچے، ان ہی دیواروں میں کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی دن ایسا ضرور آئے گا جو اپنی رائے سے، اپنے جذبے سے اور اپنی علمیت سے یہ تارِ عنکبوت جیسے سازشیوں کا پردہ چاک کر دے گا۔ سفارتی رابطے ضرور ہوں گے۔"

اس دن ساجدہ نے میرے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ طب کے میدان میں اپنی صلاحیتیں اور وسائل استعمال کریں گی، سفارت خانے کی مدد سے پاکستان کا نام یہاں ضرور بلند ہوگا۔

حقیقت کے تابناک سورج کو ماننے والی ڈاکٹر ساجدہ نے بالآخر میرے خوابوں کی چاندنی کو حقیقت مان ہی لیا۔ شاید ان کو یاد آگیا کہ یہ چاندنی بھی اسی حقیقت کے سورج کی خانہ زاد ہے۔

••

ساجدہ کے بیٹے کو میڈیکل میں ڈنمارک کی کوئین نے تمغہ دیا۔ میری بیٹی کو نیورولوجی میں پی ایچ ڈی کا داخلہ ملا۔ یہ دو مزدور ماؤں کی محنت تھی۔

''ساجدہ ہمارے خواب حاملہ ہو گئے۔''

''صدف مرزا، آپ نہیں باز آئیں گی۔''

میں لاہور کی حدت بھری دوپہر میں صوفے پر پاؤں رکھے بیٹھی تھی۔

''نہیں ساجدہ۔ وہ جو کہتے ہیں نا... بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں، گور پیا کوئی ہور''

''ہمارے خواب پھل دیں گے۔ خوابوں کی نئی نسل پروان چڑھے گی۔ ان خوابوں کے نئے نام ہوں گے۔ یہ خواب میری طرح بیٹھ کر خون آلود اشکوں کی سرخ سیاہی سے صرف نظمیں نہیں لکھیں گے نہ ہی یہ ساجدہ افضل کی طرح ایک ہسپتال سے دوسرے تک سرجری کرتے پھریں گے۔ وہ دن ضرور آئے گا کہ ان سڑکوں پر معصوم بچے کاروں کے شیشے نہیں دھوئیں گے۔ آپ کے ہسپتال میں کھڑے ہو کر مریضوں کو حوصلہ دیں گے اور میری درس گاہ میں اساتذہ کے ساتھ دھواں دار علم افروز باتیں کریں گے۔ ان کو کفر کے فتوے لگاتے ملّا کا خوف نہیں ہوگا، اور نہ ہی نامعلوم بیماریوں کے علاج کے بغیر مرنے کا خوف ہوگا۔ ان کے ہونٹوں پر موت اپنا ذائقہ رکھے گی تو ان کی زبانیں تب تک نئی زندگی کی پیدائش کے حکم نامے پر دستخط کا اقرار کر چکی ہوں گی۔''

ہم دونوں ڈنمارک کے محدود اذہان اور پاکستان کی بیوروکریسی پر جلنے کڑھنے کے بجائے ہنستی رہیں۔ ساجدہ کی چھوٹی بیٹی اب ہماری نیم دیوانی باتوں پر حیران ہوئے بغیر پڑھنے کے لیے دوسرے کمرے میں بیٹھی ہے۔ وہ اپنی ماں کی طرح ہنرِ مسیحائی سیکھ رہی ہے۔

ہمیں وہ سیاستدان چاہییں جو عالمی منظر نامے کو سمجھ کر اس کے مطابق ردِ عمل دینے کے قابل ہوں۔ ہمیں مغربی دنیا میں ایسے سفیروں کی ضرورت ہے جو جس ملک میں جائیں اس کی زبان، ثقافت اور مٹی سے علم و ادب کے خزینے واپس اپنے وطن میں منتقل کریں اور اپنے وطن کی کمیونٹی کے وسائل خوش اسلوبی سے استعمال کرنے کے قابل ہوں۔ اپنے وطن کا حوالہ دیں۔ لیکن طاقت کے ساتھ بدعنوانی ایسے ہی منسلک ہو گئی ہے جیسے تاریکی کے ساتھ جرم و گناہ۔

••

ڈاکٹر ساجدہ افضل، کرشماتی دستِ مسیحا...

فیسبک یاد دلا رہی تھی کہ ڈنمارک کی پاکستانی شخصیات میں سرکردہ فرد، جس نے ڈینش سماج کا پاکستانی عورت کے بارے میں تصور بدل دیا، انگلیاں منہ میں دابے وہ دھان پان سی ڈاکٹر ساجدہ افضل کو دیکھتے رہے جو وزیر کی مشیر تھی۔ جس نے سوات اور مظفر آباد کے زلزلے میں دن رات خیموں میں کھڑے ہو کر آپریشن کیے، جس کے عمر رسیدہ مریض اسے ہاتھوں سے بنے سویٹر اور مفلر دیتے رہے جسے وہ عمر بھر کی کمائی کہتی ہے۔ یہی عورت جب سر پر چادر پہنے، پیروں میں ربر کے بھاری بوٹ کہ سندھ کے سیلاب میں سانپ اور موذی حشرات کا نشانہ نہ بن جائے، اپنے ڈینش دوستوں کی ٹیم کے ساتھ شڑاپ شڑاپ کرتی مریضوں تک پہنچتی، وہ بھی سکتے میں آجاتے، ''ادی.. سچی مچی دی ڈاکٹر آھا۔''

زمین پر دھمکیاں دیتے سیلابی پانی کے سینے پر چار بانس کے ستونوں پر کھڑی چھت پر اپنی ٹیم کے ساتھ سونے والی ساجدہ جب لاہور سے بہترین تنخواہ پر بلائے گئے ڈاکٹروں کا واویلا سنتی تو ڈینش میں بڑبڑ کرتی۔ میں نے اس صاف گو عورت سے کہا، ''انھیں ڈینش کی کیا سمجھ؟''

''اردو میں ڈانٹا تو بھاگ جائیں گے۔ ہمارے مریض افورڈ نہیں کر سکتے ہمارا غصہ۔''

ساجدہ کی بے بسی قابلِ دید تھی، لیکن وہ اس اشتعال اور بے بسی کے بھیڑیے اور بھیڑ کو بیک وقت قابو میں رکھتی ہے۔

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانیے گا گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا

جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

جب اسی مزدور عورت کے بیٹے ڈاکٹر ماجد کو طبی تحقیق پر ملکہ مارگریٹ دوم کے ہاتھ سے تمغہ ملا تو میں مارے خوشی کے آنکھیں صاف کرتی رہی اور بچوں سے طعنے سنتی رہی، ''امی دیکھیے ساجدہ خالہ کو، آپ بس خوشی کی بات پر بھی شوں شوں کرتی رہتی ہیں۔''

اسی زنِ آہن نے جب پاکستان میں ہسپتال بنانے کے لیے ڈنمارک چھوڑا تو میڈیا میں شور مچ گیا۔ کمسن بیٹی کو پاکستان میں تعلیم حاصل کرنے بھیجا اور خود جد و جہد میں جت گئی۔ آج وہ بچی میڈیکل کے آخری سال میں ہے۔

ڈنمارک میں بہت سے لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ ہم تک یہ معلومات کیوں نہیں پہنچتیں، سادہ سا جواب ہے، ڈینو۔ پاکستانی کمیونٹی آج بھی سرکردہ شخصیات کے تذکرے میں صرف مرد حضرات کے نام پیش کرتی ہے۔ سفارت خانوں میں بھی عموماً ان ہی کی رائے سے ایوارڈز تقسیم

کیے جاتے ہیں۔ جب تک کوئی حق گو اور حق شناس نہیں اٹھے گا، علمیت، قابلیت اور دانش کا یہ سونا زمین میں ہی دبا رہے گا۔

••

ڈنمارک کے معروف موسیقار محترم پرویز اختر کی علمی، ادبی اور اخلاقی معاونت میرے اس طویل سفر میں روشن مینارے کی طرح میرے ہمراہ رہی۔

میری ہے بے اماں ہستی، صدائیں بے صدا ساری

یہ غزل امی جی کے داغِ مفارقت کے فوراً بعد گھر آتے ہوئے جہاز میں کہی اور چند ہفتے بعد ڈنمارک کے معروف موسیقار محترم پرویز اختر نے میرے پہلے شعری مجموعے، ''صحرا میں آبجو'' کی تقریبِ اجرا میں پیش کر کے محفل سے سوگوار داد قبول کی۔ اس کے فوراً بعد انھوں نے میری غزل

تم گھوم آئے بستی بستی، کبھی دیکھا ہے کوئی ہم سا بھی

پیش کی جس نے بزم کا رنگ بدل دیا۔ یہ وہ مقدس تحفہ ہے جسے حاصل کرنے کا اعزاز اور تشکر آخری دم تک میرے ساتھ رہے گا۔

••

میرا بیٹا اور پھر میرا قانونی بیٹا میرے دائیں بائیں کھڑے ہیں۔ ابا جی کا سایہ اٹھا تو ان کی دعاؤں کی بدولت ستار انکل نے آ کر میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ ان کے تینوں بیٹے سرفراز، وقار اور عمران ایک قطار میں میرے ادبی پروگراموں میں آتے ہیں۔ ڈینش پولیس افسر عمران تکنیکی طور پر ہمارا داماد ہے لیکن حقیقی طور پر بھائی بیٹے اور دوست کی تمام تر خصوصیات اس میں بستی ہیں۔ میں نے تاریخ کی کتاب ''زبانِ یارِ من دانش'' کی پہلی کاپی ستار انکل کو دی۔ ان کی وفورِ شفقت اور جذبات کی یلغار سے چھلکتی آنکھوں کے قطروں میں ابا جی کی شفاف آنکھیں مسکرائیں۔ میری مصروفیات اکثر اڑے آ جاتیں اور ان کے گھر حاضری نہ دے پاتی۔ ایک دن خالہ جان نے دھونس کے ساتھ عمران کو میرے گھر بھیجا، ''میں پولس بھیجی اے، چل انسان دیاں پتراں آر تھلے آ'' مجھے کپڑے بدلنے کا موقع بھی نہ دیا گیا اور گھر کے جوتوں میں ہی بالجبر گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔

''باجی آپ کتنی فراڈ ہیں۔ بس ہمارے لیے وقت نہیں بچتا آپ کے پاس۔'' عمران آرام سے پاس بیٹھ کر طعنے دیتا۔

''یہ مت بھولو کہ تکنیکی طور پر میرے داماد ہو، نتائج خطرناک ہو سکتے ہیں۔'' میں دھمکانے

کی کوشش کرتی۔

عمران نے نئی گاڑی لی تو مجھے اور خالہ جان کو ساتھ لے کر گیا۔

''باجی، پہلے چند میل آپ چلائیں، برکت کے لیے۔ برکت ٹکر مارنے میں نہیں کرنی باجی!'' اس نے چابی میرے ہاتھ پر رکھی۔ میری کامیابی میں میرے ساتھ میرا پورا خاندان کھڑا ہے۔ یہ ایک مثال ہے۔ کتابی باتیں نہیں، حقیقی زندگی کی اصل کہانی ہے اور اس بات کا ثبوت بھی کہ دنیا کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے، انسانی فطرت وہی ہے اور محبت سے بڑا کوئی تریاق نہیں۔

میرا چچا زاد بھائی شہزاد بیگ اور بھابی طاہرہ میرے ادبی مہمانوں کی میزبانی میں پیش پیش رہتے ہیں۔ رضا علی عابدی صاحب اس کے گھر کے لان میں بیٹھے پنجابی مہمان نوازی اور لطائف کے مزے لیتے ہوئے کہتے، ''مرزا، ذرا اس لطیفے کا ترجمہ بھی کر دو اب، اکیلے ہی ہنسے جا رہے ہو تم لوگ۔''

پھر یونہی ہنستے بولتے وہاں سے اٹھ کر سویڈن کے جڑواں شہر مالمو میں عمران کے گھر چل دیے۔ میں کہاں کہاں اور کیسے کیسے اللہ کا شکر ادا کروں۔ ہر اظہار میں ابا جی کا علم، میری ماں کا حلم اور میرے پورے خاندان کی تائید شامل ہے۔

••

اس کتاب کی ابتدا ابا جی سے کرنے کے بعد میں اس کی انتہا پر اپنی بچپن کی سہیلی، سلمیٰ ایوب اور اس کے رفیقِ زندگی ایوب بھائی کا ذکر ضرور کرنا چاہتی ہوں، اس لیے بھی کہ ابا جی کہا کرتے تھے کہ اپنے محسنوں کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے اور اس وجہ سے بھی کہ سلمیٰ میرے انتہائی بچپن میں جب ابھی شعور نے ذرا سی انگڑائی لے کر گھر کے محفوظ ماحول سے باہر نکل کر سکول کی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بستے اور تختی اٹھائے ہم سکول کے ابتدائی دنوں سے میٹرک تک ایک دوسرے کے ساتھ کھٹے میٹھے دن گزارتے ہوئے اکٹھے پہنچے۔ میٹرک کے بعد اس کی شادی ہوگئی۔ سلمیٰ کے والد، ماسٹر غلام نبی صاحب، سرائے عالمگیر بوائز سکول کی ایک معروف معزز شخصیت تھے۔ درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہونے کے باعث ہمارے خاندان بھی ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

حسنِ اتفاق یہ ہوا کہ سلمیٰ کے تعاقب میں مجھے بھی زندگی ڈنمارک ہی لے آئی۔ سلمیٰ کو اپنی امی کے خط سے علم ہوا تو وہ فوراً مجھے ملی۔ اس کی شادی اپنی پھوپھو کے گھر ہوئی تھی۔ اس کی پھوپھو جان اور پھوپھا جان ایسی ہستیاں تھیں جن کی ذات کی سادگی اور حسنِ سلوک کی مثال ملنی محال ہے۔

جب کبھی میں ان کے گھر جاتی مجھے اس کے پھوپھا جان میں ابا جی کی جھلک دکھائی دیتی۔ اپنے کمرے میں مطالعہ میں مصروف رہتے یا تلاوتِ قرآن ان کا مشغلہ تھا۔ ان کے کمرے سے خوبصورت لحن کے ساتھ قرات کی آواز سنائی دیتی جیسے پورے گھر میں نور اس آواز کی لہروں کے ساتھ پھیلتا جا رہا ہو۔

اپنی بہو پر حد درجہ شفیق تھے اور اس کے ہاتھ کے پکوان کی تعریف کر کے تشکر کے اظہار سے کھاتے۔ جب وہ پاکستان گئے اور طبیعت ناساز ہوئی تو گھبرانے کے بجائے کہنے لگے کہ میں واپس ڈنمارک جاؤں گا تو سلمیٰ کے ہاتھ کا کھانا کھا کھا کر بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔ اللہ کے منتخب بندے شاید دوسروں سے حسنِ سلوک سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ میں نوزائیدہ عالیہ کو لے کر سلمی کو ملنے گئی تو بطورِ خاص نیچے آ کر عالیہ کو گود میں اٹھایا اور دعا دی۔ شاید یہی دعا اس کی عمر پر پھیل گئی۔

پھوپھو جان پاکستان گئیں اور میری امی جی سے ملیں تو بے حد خوش ہوئیں۔ واپس آ کر کہنے لگیں اب مجھے سمجھ آئی ہے تم اتنی خوش باش اور میٹھی زبان والی کیوں ہو۔ تمھاری امی تو بندے کا دل فوراً مٹھی میں کر لیتی ہیں۔ پھوپھو جان جب تک زندہ رہیں مجھے بہت محبت سے نوازا۔ چند سال قبل میری ان سے ملاقات کافی عرصے بعد سلمیٰ کے بیٹے کی شادی میں ہوئی تو بہت خوش ہوئیں۔ بہت لاڈ سے کہنے لگیں، ''ادھر آؤ میری کبوتری، یہاں آ کر میرے پاس بیٹھو۔'' عالیہ کو پیار کیا، ''چلو اب تم ڈاکٹر بن کر ہمارا علاج کرنا۔'' پھر جاتے جاتے بولیں، ''اے میریے کبوتریے، دونویں ماں دھیاں اکو جیاں او، نظر لگ جاندی اے، صدقہ دیندی رہیا کر۔'' (اے میری کبوتری، دونوں ماں بیٹی ایک جیسی ہو، نظر لگ جاتی ہے، صدقہ دیتی رہا کرو۔)

پھر کہنے لگیں، ''ابھی کل کی بات ہے جب یہ پیدا ہوئی تھی تو یہ اتنی سی تھی'' انھوں نے ایک ہاتھ کی کہنی پر دوسرے ہاتھ سے اشارہ کیا، عالیہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی تو اسے دعائیں دینے لگیں۔ ایسے وضع دار لوگ جو میری زندگی کے ہر مرحلے پر میرے ساتھ رہے جن کی دعائیں میرے راستے کی روشنی رہیں، ان کا شکریہ ادا کرنا گو مجھ پر واجب ہے لیکن میری استطاعت سے باہر ہے۔ یہ سعید روحیں دنیا سے چلی جائیں تو روشنی کم ہونے لگتی ہے، کوئی نظر اس محبت سے نہ چومتی ہے، نہ دعا دیتی ہے۔

آج میں ان کے بارے میں لکھنے بیٹھی ہوں تو ایک سادہ سا سراپا، غلافی آنکھوں اور پروقار مسکراہٹ والا بے ریا چہرہ سامنے ہے۔ میری بے تکی باتوں پر کھلکھلا کر ہنستیں۔ جب کبھی سلمیٰ کا نام لیتیں، بے حد محبت سے دھیمے لہجے میں اس کی امی کو دعا دیتیں۔ ایک دن کہنے لگیں ''جب میں گاؤں سے شہر آتی تھی تو وہ بیٹیوں کی موجودگی کے باوجود میرے جوتوں کی دھول صاف کرتی تھیں۔

دروازے پر کھڑی مسکراتی ہوئی مجھے بسم اللہ کہتی تھیں۔ بیٹی کو بھی وہی تربیت دے کر بھیجا۔ اس گھر کو اسی نے سنبھالا ہوا ہے۔ اب شاید ایسی ماؤں اور ساسوں کا رواج نہیں رہا کہ گھروں کی بنیادیں لرزنے لگی ہیں۔"

سلمٰی ایوب نے مجھے کبھی تنہا ہونے کا احساس نہ ہونے دیا۔ میرے بچوں کی پیدائش سے لے کر میری طویل بیماری تک وہ میرے ہمراہ رہی۔ اکثر شام کو ہسپتال آتی اور ایوب بھائی کی میں ہمیشہ ممنون رہوں گی کہ انھوں نے دوستی نباہنے کے اس احسان میں ہمیشہ اس کا ساتھ دیا۔ اُسامہ جب پیدا ہوا تو وہ سب سے پہلے اسے دیکھنے پہنچی۔ پھوپھو جان بھی ساتھ تھیں۔ اس کی بے پناہ خوشی اور مسرت کے اظہار نے مجھے کبھی اپنی ماں اور بہن کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ پھر اُسامہ بمشکل دو برس کا تھا جب میرا آپریشن ہوا تو سلمٰی شام کو مجھے ملنے آتی تو اُسامہ کو پکڑ کر ہسپتال کے غسل خانے میں نہلا دیتی۔ پرہیزی کھانا بنا کر لاتی، گھنٹوں میرے پاس بیٹھی مجھے بچپن کی شرارتی اور بے امنی لڑکی یاد کراتی۔ پھر کہتی دیکھنا تم بہت جلد اٹھ کر پہلے کی طرح بھاگنے لگو گی۔ اس کی بےلوث رفاقت آج تک مجھے میسر ہے۔ عالیہ کا رشتہ اور شادی بھی سلمٰی اور ایوب بھائی کی اخلاقی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہوا۔

سلمٰی عالیہ سے پوچھتی، "اتنا کیا سوچنا۔ اللہ کا نام لے کر اقرار کرو۔ تمھاری ماں لوگوں کی مدد کرتی ہے۔ تمھاری تعلیم بھی مکمل کرا لے گی۔" مجھے خود چائے بنا کر دی، ہزار منع کرنے کے باوجود سوٹ دے کر بھیجا کہ ہم کپڑے سلوا لیں۔ رشتہ طے ہونے کے تمام معاملات میں پیش پیش، شادی کی خریداری میں ساتھ ساتھ اور پاکستان تک سے عالیہ کے لیے تحائف لانے کا اہتمام کرتی رہی۔ اس نے ثابت کر دیا کہ دوستی کے اعلیٰ ترین پیمانے کیا ہوتے ہیں۔ اس دن سے آج تک ان تیس برسوں میں اس خاندان کی رفاقت اور مصاحبت ہمیں حاصل ہے۔ میں ان کا شکریہ ادا نہیں کروں گی کیونکہ دنیا کی کسی لغت میں ایسے الفاظ موجود نہیں جو اس کے لیے میرے احساسات کو قلمبند کر سکیں۔ میں اس کتاب کا اختتام سلمٰی اور ایوب بھائی کی بے مثل محبت اور اعانت کے نام کرتی ہوں، اس دعا کے ساتھ کہ زندگی ان کے تمام راستوں میں کامرانی کی شمعیں روشن رکھے۔

••

آپ بیتی

عصمت چغتائی

کاغذی ہے پیرہن

عصمت چغتائی کے افسانوں کو غور اور توجہ سے دیکھیں تو ان تحریروں میں کہیں کہیں ان کی جھلک بھی نظر آتی۔ مگر ان کے افسانوں کو آپ بیتی نہیں کہا جا سکتا۔ ان کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ زندگی کے نامعلوم کتنے چھوٹے چھوٹے واقعات اور نامعلوم کتنے چھوٹے بڑے کرداروں کو انہوں نے افسانوں میں ڈھالا ہے۔ عصمت نے اپنے فلم ساز شوہر شاہد لطیف کی فلموں کے لیے بارہ کہانیاں لکھی تھیں۔ جن میں سے پانچ فلمیں انہوں نے خود بنائیں۔ ان کی سرگزشت 'کاغذی ہے پیرہن' کے نام سے منظرعام پر آئی۔ 24 اکتوبر 1991ء کو بمبئی میں عصمت چغتائی کا انتقال ہوا۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کے جسد خاکی کو نذر آتش کیا گیا۔ یہ ان کا آخری حرفِ بغاوت تھا جس کے اظہار میں وہ قطعاً نہ گھبرائیں۔ بک کارنر جہلم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے اپنے قارئین کے لیے عمدہ سے عمدہ کتابیں شائع کی ہیں خاص طور پر آپ بیتیاں۔ ''کاغذی ہے پیرہن'' بھی اس سلسلے میں ایک خوب صورت اضافہ ہے، اگرچہ معروف ادیبہ عصمت چغتائی کی یہ خودنوشت نا تمام رہ گئی اور انہیں اسے مرتب کرنے اور اس کی کانٹ چھانٹ کا بھی موقع نہ ملا۔ یہ نامکمل سوانح دہلی سے مشہور جریدہ ''آج کل'' میں مارچ 1979ء سے مئی 1980ء تک 14 قسطوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ''غبارِ کارواں'' (خودنوشت) کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے جو نومبر 1970ء میں ''آج کل'' میں ہی شائع ہوا تھا۔ اقساط میں لکھی گئی آپ بیتی جیسے جیسے صفحہ قرطاس پر آتی گئی ''آج کل'' میں شائع ہوتی رہی۔ مصنفہ کی خواہش اور ارادے کے باوجود یہ سوانحی حالات نامکمل رہ گئے۔ امید کرتے ہیں کہ دُنیائے ادب میں یہ سوانح نامکمل ہونے کے باوجود مقبولیت کا درجہ پائے گی۔ **امر شاھد**

شوروم: بالمقابل اقبال لائبریری بک سٹریٹ جہلم پاکستان

''گر یاد رہے...'' میں، بہت سے ''پچھلے پنے'' بھی شامل ہیں۔ کچھ ''سوانحی افسانے'' (Biographical Stories) بھی ہیں۔ جو صحیح واقعات پر صحیح ناموں کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اُن میں کوئی بات فکشن نہیں ہے۔ تخیلی نہیں ہے۔ West (مغرب) میں ایک روایت ہے Biographical ناول لکھنے کی۔ خیال آیا اگر ناول لکھے جاسکتے ہیں تو Biographical افسانے کیوں نہیں؟ .... اِس کتاب میں وہ بھی شامل ہیں۔ کچھ نظمیں جو مَیں نے دوستوں اور اپنے معزز اُستادوں کے نام لکھیں۔ وہ ہندوستان سے بھی ہیں اور پاکستان سے بھی۔ اور کچھ رشتے جو ''اُردو'' کے ناطے سے جُڑ گئے۔ کچھ لوگوں کو پڑھنے والے جانتے ہوں گے، کچھ جان جائیں گے۔ اِس کتاب میں ایک نوسٹیلجیا ہے۔ جو میرے اَندر مہکتا رہتا ہے۔ ؎

وقت کے سِتم کم حسیں نہیں
آج ہیں یہاں کل کہیں نہیں
وقت سے پَرے اگر مِل گئے کہیں
میری آواز ہی پہچان ہے، گر یاد رہے!

گلزار
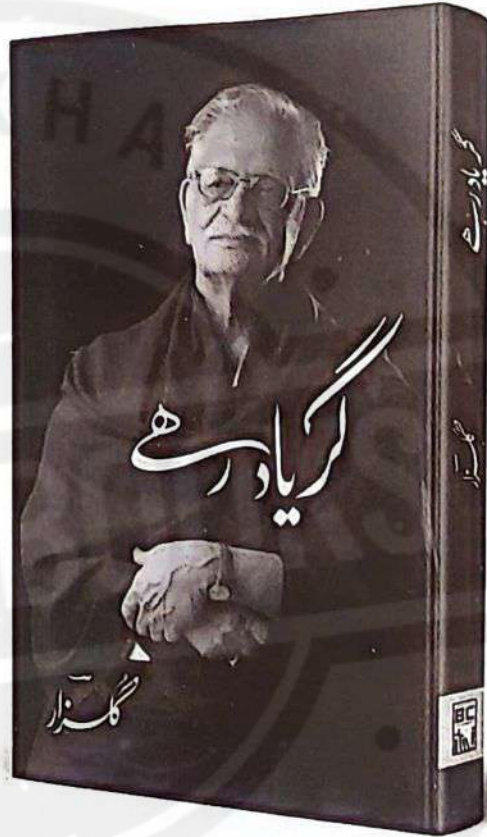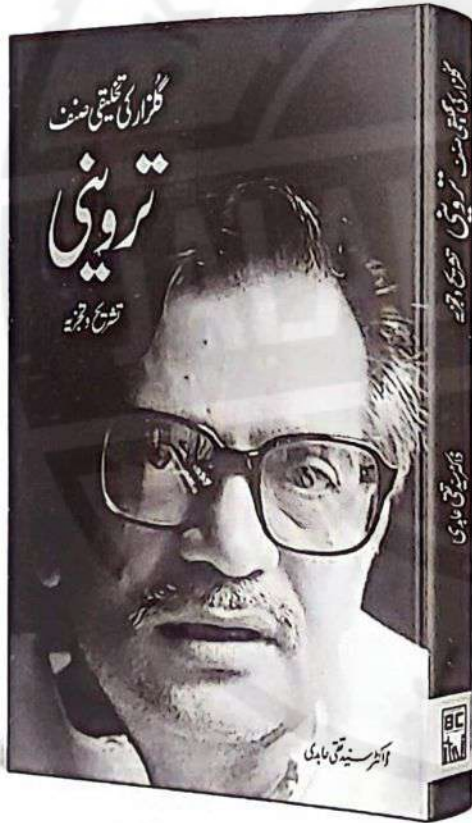
ناشران:

www.bookcorner.com.pk

اُردو کے ممتاز شاعر گلزار نے اُردو شاعری کے گلزار میں ایک نئے پھول ''تروینی'' کی کیاری سجائی ہے جو اگرچہ ایک خوبصورت تین پنکھڑیوں کا رنگ برنگا پھول ہے مگر اس کی شکل وقامت، ساخت و بافت، خوشبو اور خوش روی نے اُردو پرستاروں کو گرویدہ بنا لیا ہے۔ اس تخلیقی صنف میں تینوں مصرعے ایک ہی بحر میں ہوتے ہوئے بھی ردیف اور قافیے کی پابندیوں سے آزاد رہتے ہیں۔ یہاں اس سہولت سے مضامین کی کثرت اور مبتدی اور اساتذہ کے کمال وفن کی ندرت جلوہ گر ہوتی ہے۔ تروینی کے تیسرے مصرعے سے معنی آفرینی، وسعت بیانی اور مضمون میں تبدیل ہو جاتی ہے، کیوں کہ یہ سہل رائج الوقت اُردو میں جدید مضامین کی نقیب ہے اس لیے یہ ایجاز اور اختصار کی ریاضت کے ساتھ عام فہم اور پُرتاثیر ہے جس کا اثر اور سرور ذہن پر مدتوں چھایا رہتا ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی

صدف مرزا

مطبوعہ کتب:

- صحرا میں آب جو (شعری مجموعہ)
- زبانِ یارِ من دانش
- سخن کا سفر
- نیلز بوہر

زیرِ طبع:

- صنفِ نازک

یورپ کے عورت مخالف محاورات کے آئینے میں

- حکمِ سفر دیا تھا کیوں (افسانوں کا مجموعہ)
- اُردو اور پنجابی کے دو شعری مجموعے

صدف مرزا

مطبوعہ کتب:

- صحرا میں آب جو (شعری مجموعہ)
- زبانِ یارِ من دانش
- سخن کا سفر
- ٹیلو یوہر

زیرِ طبع:

- صنفِ نازک
  یورپ کے عورت مخالف محاورات کے آئینے میں
- حکمِ سفر دیا تھا کیوں (افسانوں کا مجموعہ)
- اُردو اور پنجابی کے دو شعری مجموعے

اپنی سوانح حیات ''برگد'' کی مانند صدف مرزا، بہ ذات خود بھی ایک ایسا برگد ہے جو عین جوانی میں، جب کہ اس کی ہر شاخ پر بلبلیں بولتی تھیں، حسن کی کوئلیں کُوکتی تھیں، اُکھڑا اور سات سرزمین پار کہاں بویا گیا... لٹل مرمیڈ کے ملک میں، ڈنمارک میں... عام طور پر کسی بھی پودے کو جڑ سے اکھاڑیں تو اُس کی جڑوں کو ہوا لگ جاتی ہے اور وہ کسی اجنبی سرزمین میں نہیں پنپتا... جب کہ اِس برگد کو ہوا تو لگی لیکن اُس نے پھر بھی اِس نئی مٹی میں جڑیں پکڑیں جو بہت گہرائی تک چلی گئیں اور یوں وہ پہلے کی نسبت زیادہ گھنا اور سایہ دار ہوتا گیا... اب اس کی شاخوں پر نہ صرف آبائی پکھیرو کُوکتے تھے بلکہ ڈنمارک کے ادب، شاعری، ثقافت اور فلسفے کے سورنگ پرندے بھی چہکنے لگے تھے... یہ برگد ہانز کرسچن اینڈرسن کی مانند داستان گو ہو گیا... صدف مرزا، ایک خودسری عورت ہے... ہر لمحہ مرنے مارنے پر تیار، خنجر بہ کف، لیکن وہ یہ خنجر اپنی ہی ذات کی تنہائیوں میں اتارتی ہے... خود اپنے آپ کو تخلیق کے کرب میں مبتلا کر کے مار ڈالتی ہے... ''برگد'' ایک ناول، ایک آپ بیتی، ایک اعتراف... رواں اور مؤثر نثر، اُردو ادب میں ایک چراغ کی مانند روشن ہو گیا ہے.

مستنصر حسین تارڑ

BOOK CORNER
Jhelum (Pakistan)
bookcornershowroom
bookcornerjhelum
bookcorner

Calligraphy & Artwork:
M. Shakeel Talat